شب خون

شمارہ ۲۹۳ تا ۲۹۹

قیمت (مکمل سیٹ) ۷۵۰ روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قلم اور روشنائی، عمل: محمد حنیف رامے
عطیہ از مصور۔ بشکریہ ''سویرا'' لاہور

کتابیں جو زندگی کا سرمایہ ہیں

آج، مدیر اجمل کمال شمارہ ۳۰ تا ۳۶، ۳۹، ۴۹ تا ۵۲ فی شمارہ ۱۲۵ روپے
آصف فرخی عالم ایجاد (تنقیدی مضامین) ۳۰۰ روپے
ابوالنصر خالدی مضامین خالدی (تنقید، تاریخ، تحقیق) ۳۰۰ روپے
احمد زین الدین رنگ شناسائی (شخصیات) ۲۷۵ روپے
احمد عثمانی زندگی تیرے لئے (ناول) ۱۰۰ روپے
احمد مشتاق کلیات ۲۵۰ روپے
اختر آزاد ایک سمپورن انسان کی گاتھا (افسانے) ۱۵۰ روپے
اختر یوسف جلتا ہوا سیارہ (افسانے) ۱۴۰ روپے
اردو چینل، مدیر قمر صدیقی، شمس الرحمن فاروقی نمبر ۱۰۰ روپے
ارشد عبدالحمید صدائے آب جو (مجموعۂ کلام) ۱۵۰ روپے
اسد محمد خاں نربدا اور دوسری کہانیاں ۲۲۵ روپے
اسرار گاندھی رہائی (اوسانے) ۱۰۰ روپے
اسلم فرخی لال سبز کبوتروں کی چھتری (خاکے) ۳۰۰ روپے
اظہار الاسلام واپسی (افسانے) ۱۴۰ روپے
اقبالیات کے سو سال (تنقیدی مضامین) ۵۰۰ روپے
اکرم نقاش، انیس صدیقی افلاک (گلبرگہ کے جدید ادیبوں کا انتخاب) ۲۰۰ روپے
الطاف فاطمہ جب دیواریں گریہ کرتی ہیں (افسانے) ۱۷۵ روپے
الطاف فاطمہ وہ جسے چاہا گیا (افسانے) ۲۰۰ روپے
انتساب، ایوب واقف نمبر ۵۰ روپے
انتظار حسین آگے سمندر ہے (ناول) ۳۲۵ روپے
انتظار حسین شہزادے کے نام (افسانے) ۲۲۵ روپے
انتظار حسین علامتوں کا زوال (مضامین) ۱۰۰ روپے
انعام حنفی وادی افکار: الہ آباد کے ۲۵ شعرا کا انتخاب ۱۰۰ روپے
انور خاں آئینوں کی نگری (افسانے) ۱۰۰ روپے
انور سین رائے چیخ (ناول) ۷۵ روپے
انور شعور اندوختہ (مجموعۂ کلام) ۲۵۰ روپے
انیس صدیقی کرناٹک میں اردو صحافت ۲۰۰ روپے
این گوپی (ترجمہ غیاث متین) گوپی کی سو نظمیں ۱۵۰ روپے
پرتپال سنگھ بیتاب موج رنگ (غزلیات) ۲۵۰ روپے
پرکاش فکری ایک ذرا سی بارش (مجموعۂ کلام) ۲۵۰ روپے
پرویز شاہدی تثلیث حیات، نیا ایڈیشن، ۲۵۰ روپے
مرتبین: مظہر امام اور یوسف امام
جمیل الرحمن زمین جب آنکھ کھولے گی ۱۲۰ روپے
جون ایلیا شاید (مجموعۂ کلام) ۲۰۰ روپے
جون ایلیا یعنی (مجموعۂ کلام) ۲۰۰ روپے

جینت پرمار اور (مجموعۂ کلام) ۱۵۰ روپے
چودھری محمد نعیم Ambiquities of Heritage ۲۲۵ روپے
حسن عابدی فرار ہوتا حروف کا (مجموعۂ کلام) ۲۰۰ روپے
حسن منظر ایک اور آدمی (افسانے) ۱۰۰ روپے
خالد حسن قرۃ العین حیدر کے خطوط ایک دوست کے نام ۲۲۵ روپے
خوشبیر سنگھ شاد ذرا یہ دھوپ ڈھل جائے (مجموعۂ کلام) ۲۰۰ روپے
خلیل تنویر گل لاجورد (مجموعۂ کلام) ۱۵۰ روپے
دنیازاد ۱۴ تا ۱۶ مدیر، آصف فرخی فی شمارہ ۲۲۵ روپے
ذکیہ مشہدی صدائے بازگشت (افسانے) ۱۲۵ روپے
راہی فدائی نبراس (مجموعۂ کلام) ۱۰۰ روپے
رحیل صدیقی فاروقی محو گفتگو (گفتگوئیں اور مکالمے) ۱۸۰ روپے
رفیق راز انہار (مجموعۂ کلام) ۳۳۰ روپے
روشنائی، مدیر احمد زین الدین ۲۳ تا ۲۵ ۱۲۵ روپے
روشنائی، مدیر احمد زین الدین۔ شمس الرحمن فاروقی نمبر غیر مجلد ۲۰۰ روپے
مجلد ۲۵۰ روپے
زاہد حسین عشق کے مارے ہوئے (ناول) ۱۷۵ روپے
زاہدہ حنا عورت: زندگی کا زنداں (مضامین) ۳۰۰ روپے
زہرہ فاروقی اودھ کے فارسی گو شعرا ۲۰۰ روپے
ساقی فاروقی غزل بے شرط (کلیات غزل) ۳۰۰ روپے
سعادت حسن منٹو منٹونما (مضامین، خاکے) ۹۵۰ روپے
سعادت حسن منٹو منٹوراما (افسانے) ۹۵۰ روپے
سید امین اشرف جادۂ شب (مجموعۂ کلام) ۱۰۰ روپے
سید رفیق حسین۔ آئینۂ حیرت اور دوسری تحریریں افسانے ۴۷۵ روپے
سید محمد اشرف باد صبا کا انتظار (افسانے) ۱۵۰ روپے
"شب خون" کا ضخیم شمارہ ۲۹۳ تا ۲۹۹ مع انتخاب ۷۵۰ روپے
شرجیل احمد خاں یونان کے اساطیری قصے ۱۵۰ روپے
شفق سوپوری موسیقی، شاعری اور لسانیات (تنقید) ۲۰۰ روپے
شفیع جاوید رات، شہر اور میں (افسانے) ۱۶۰ روپے
شفیع فاطمہ شعریٰ گلۂ صفورہ (مجموعۂ کلام) ۱۵۰ روپے
شمس الرحمن فاروقی سوار (افسانے) ۲۰۰ روپے
شمس الرحمن فاروقی شمس کبیر (مکاتیب فاروقی، بنام کبیر احمد جائسی) ۲۵۰ روپے
شمس الرحمن فاروقی اردو کا ابتدائی زمانہ (تنقید و تاریخ) ۱۵۰ روپے
شمس الرحمن فاروقی شعر، غیر شعر اور نثر (نیا ایڈیشن) ۲۵۴ روپے
شمس الرحمن فاروقی غالب پر چار تحریریں ۱۰۰ روپے
شمس الرحمن فاروقی کئی چاند تھے سر آسماں (تخمیناً) ۵۰۰ روپے

الآخر   قلم اور روشنائی، عمل: محمد حنیف رامے
عطیہ از مصور۔ بشکریہ ''سویرا'' لاہور

ماهم نشان آبلۂ پا گذاشتیم

''شب خون'' کا آخری شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ بھلا یا برا، لیکن ''شب خون'' گذشتہ کئی دہائیوں سے اردو کے جدید ادبی شعور کا حصہ بن گیا تھا۔ اس کی مخالفت بھی ہوئی، اور آخری چند برسوں میں بعض بااثر حلقوں کی طرف سے اس کی تحریری مخالفت نہیں تو اس کا زور توڑنے کے لئے متنوع کوششیں بھی ہوئیں۔ یہ تو عام طور پر کہا گیا کہ جدیدیت اب ''نمٹ چکی'' اور اب بھلا ''شب خون'' کا معاصر ادبی منظر نامے میں کیا کردار ہو سکتا ہے؟ لیکن اس سب کے باوجود ''شب خون'' کو پڑھنا ہم سب کی ضرورت بنا رہا۔ اس الزام کے باوجود کہ ''شب خونی جدیدیت'' نے ''قاری'' اور ''ادب'' کے درمیان رشتہ منقطع کر دیا تھا، ''شب خون'' کے پڑھنے والے ہمیشہ کی طرح سے کثیر تعداد میں رہے، اور تمام اردو دنیا میں پھیلے رہے، اور اس زمانے میں بھی وہ ''شب خون'' کے حامی اور معاون رہے جب سال میں اس کی بمشکل چھ اشاعتیں ممکن ہوتی تھیں، اور کتابت، طباعت، اور کاغذ کے لحاظ سے اس کا وہ معیار نہ رہا تھا جو شروع کے چند برسوں میں تھا۔ زیر نظر شمارے میں ''نقارۂ خدا'' کے عنوان سے دو حصوں پر مشتمل کوئی پچیس صفحات ''شب خون'' کے لئے پڑھنے والوں کی دلی محبت اور اس کے بند ہونے پر غم و رنج کے گواہ اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ نقادان ادب کچھ ہی کہیں، لیکن ''شب خون'' جس نظریۂ ادب کو لے کر اٹھا تھا اور جس قسم کے ادب کی اس نے ترویج کی، اس نے وقت کی اہم ضرورت کو پورا کیا اور وہ ضرورت اب بھی باقی ہے، کیونکہ اب تو وہ زمانہ ہے کہ جب ادب کے نام پر بے ادبیوں کی دوبارہ تلقین ہو رہی ہے۔ نااہلوں اور غیر ادیبوں کو محض ذاتی وفاداری نبھانے کے انعام میں آج کا نمائندہ ادیب قرار دینے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اب صارفیت کا زمانہ ہے۔ اچھا ادب پڑھنے اور اچھا ادب لکھنے کے بجائے اپنی تبلیغ اور اپنی تشہیر کے دن ہیں۔ اب تو یہ رواج ہے کہ جس طرح بھی ہو، اپنے بارے میں توصیفی مضامین یا کتابیں لکھوا لو، تعریفی نمبر نکلوا لو، یا اور کچھ نہیں تو جن لوگوں سے بغض رکھتے ہو ان کو گالیاں دلوا لو۔ (اگر ''شب خون'' نے کبھی کسی کا خاص نمبر نہیں نکالا تو اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔)

''شب خون'' نے اپنے قاری خود پیدا کئے اور وہ اچھے ادب کے اچھے قاری تھے۔ اور وہ قاری آج بھی موجود ہیں۔ پھر ''شب خون'' کیوں بند ہوا؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ''شب خون'' کے ان دوستوں کا شکریہ واجب ہے جنھوں نے یہ گمان کیا کہ شاید مالی مشکلات یا انتظامی مسائل اس کی مسلسل زندگی کی راہ میں حارج ہیں اور انھوں نے دل کھول کر مالی اور/یا انتظامی اعانت کی پیشکش کی۔ لیکن ''شب خون'' کو اب کچھ مالی مسئلہ درپیش نہیں۔ ''شب خون'' اگرچہ مطلق طور پر اب بھی خسارے میں ہے، لیکن دوستوں کی مالی اور کتابی اعانت، اور شمس الرحمن فاروقی کی کتابوں کی ساری آمدنی ''شب خون'' کی نذر ہونے کے باعث ''شب خون'' کو بفضلہ کوئی تنگی نہیں ہے۔ بعض دوستوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو کی مصروفیات نے شمس الرحمن فاروقی کے پاس ''شب خون'' کے لئے وقت نہ چھوڑا ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قومی کونسل کی ذمہ داریاں جز وقتی اور اعزازی ہیں اور وہ ایسی ہرگز نہیں کہ ''شب خون'' کے کام میں رخنہ پیدا کریں۔ اور ایسا بھی نہیں کہ ہم ماہ بماہ پرچہ نکالتے نکالتے اب تھک چکے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ شمس الرحمن فاروقی کی صحت اور عمر دونوں اب ساتھ چھوڑ رہی ہیں۔ ''شب خون'' بند کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کو اپنے معمولہ معیار اور پابندی کے ساتھ نکالنے کے لئے جو ذہنی اور اعصابی محنت درکار ہے وہ اب شمس الرحمن فاروقی کے بس میں نہیں۔

کئی دوستوں نے ہم سے پوچھا کہ ''شب خون'' بند کرنے کا افسوس کارکنان ''شب خون'' کو، یا کم از کم شمس الرحمن فاروقی کو ضرور ہوگا، اور ہونا بھی چاہیئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے بند کر کے یک گونہ راحت محسوس ہو رہی ہے۔ بعض دوستوں نے یہ بھی کہا کہ اس کا تو خیال کیجئے کہ ''شب خون'' بند ہوگا تو کچھ لوگ خوش ہوں گے۔ ایسوں کو خوش ہونے کا موقع کیوں دیجئے؟ لیکن ہم نے ''شب خون'' کسی کو خوش کرنے یا کسی کو ناخوش کرنے کے لئے نکالا ہی نہ تھا۔ ہم یہ ضرور جانتے تھے کہ ''شب خون'' اگر کامیاب ہوگا (اور اس کی کامیابی میں ہمیں کوئی شک نہ تھا)، تو جن لوگوں کے ادبی اور دنیاوی مفاد پر، یا کرسیوں پر ضرب پڑے گی، وہ ناراض ہوں گے۔ لیکن ہمیں یہ بھی یقین تھا کہ ادب میں یکے می رود و دیگر آید بجاے کا قاعدہ روز اول سے رائج ہے۔ اور ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ جو مخالفتیں ہوئیں وہ بر بناے دیانت و ادب دوستی ہی رہی ہوں گی۔ اب جب ہم پرچہ بند کر رہے ہیں تو ہمیں اس کے بند کرنے پر نہ رنج ہے نہ خوشی ہے، کہ کل امر مرھون باوقاتھا پر ہم ہمیشہ سے یقین کرتے آئے ہیں۔ ایک وقت اس پرچے کے نکلنے کا مقرر تھا تو ایک وقت اس کے بند ہونے کا بھی مقرر تھا۔ ہونے یا نہ ہونے کے باب میں ہم نے شیخ جامی سے سیکھا ہے ؎

جامی از فقر نسیمے بہ مشامت نہ رسد   تا خوش از بودہ و غمناک ز نابودہ شوی

''شب خون'' کا انتخاب ہماری توقع سے بہت زیادہ ضخیم ہوگیا۔لیکن اطمینان اس بات کا ہے کہ جہاں ان صفحات میں جدید اردو ادب کے بہترین رنگ صاف نظر آئیں گے، وہاں بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوگا۔قاری سے ''رشتہ منقطع ہوجانے'' کے الزام کو ہم ابھی رد کرچکے ہیں، یہ کہہ کر کہ ''شب خون'' کی اشاعت کسی بھی دور میں گھٹی نہیں، اور یہ رسالہ ساری اردو دنیا میں پہنچتا ہے۔اسی طرح، بعض دوست فرماتے ہیں کہ جدیدیت کے زمانے میں ادب کی سماجی معنویت کا فقرہ ''گالی'' کے طور پر برتا جاتا تھا اور جدید ادیب اپنے قاری ہی سے نہیں، اپنے معاشرے سے بھی بے نیاز تھے۔اس کے برخلاف، ان صفحات میں آپ کو معاصر دنیا اور ملک کے تمام سیاسی اور سماجی معاملات پر گفتگو اور ردعمل اور احتساب نظر آئے گا۔ہاں یہ احتساب اور ردعمل کسی پارٹی لائن، یا کسی سیاسی رہنما کے منشور، یا کسی مذہبی بزرگ کے فتوے، یا کسی طبقے کی خوشنودی کے ماتحت نہیں ہے۔اور نہ ہی یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ ہر مسئلے، یا ہر حادثے کے واقع ہوتے ہی اس پر نظم یا افسانہ لکھ دیا جائے۔اور یہ بات ہمیشہ ملحوظ رکھی گئی کہ ادب کے اقدار کو ہر چیز پر مقدم رکھا جائے۔بعض جھنجھلائے ہوئے لوگوں نے الزام لگایا کہ ''جدیدیوں'' نے ''افسانے سے کہانی پن'' غائب کردیا تھا اور (اب ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی سنسنی خیز خبروں سے مشابہ) افسانوں میں ''کہانی پن'' واپس آگیا ہے۔لیکن ''شب خون'' کے یہ صفحات پھر گواہی دیں گے کہ وہ افسانے بھی جو بظاہر مشکل یا مبہم تھے، آج بھی پڑھے جانے کا تقاضا کرتے ہیں اور پڑھے جائیں تو زندہ ''کہانی پن'' کی قوت سے دھڑکتے نظر آتے ہیں۔پھر یہاں ایسے افسانے بھی ہیں جن میں ''کہانی پن'' ہے، لیکن وہ کہانی پن کیا ہے، اس کی وضاحت مشکل معلوم ہوتی ہے، اور شاید یہی ''کہانی پن'' کا سب سے بڑا وصف ہے۔اور ایسے افسانے بھی یہاں ہیں جن کا بیانیہ کم و بیش خط مستقیم کی طرح ہے۔

یہ بات اکثر کہی گئی کہ ''شب خون'' دراصل ترقی پسندی کی دشمنی میں نکالا گیا تھا۔لیکن اس رسالے میں شروع ہی سے متعدد بڑے ترقی پسند ادیبوں کی موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ ''شب خون'' کا سروکار اچھے ادب سے تھا۔ترقی پسند دشمن ہونے سے اچھا ادب نہیں پیدا ہوتا۔یہ درست ہے کہ ''شب خون'' میں ترقی پسندی، جدیدیت، کلاسیکیت، وغیرہ کے موضوع پر بحثیں بہت ہوئیں اور ان بحثوں میں ترقی پسند ادب بیش از بیش ذکر میں آیا کیونکہ وہ ''شب خون'' کا فوری پیشرو ادب تھا۔ہم چاہتے تھے کہ ان میں سے بعض بحثوں کو انتخاب میں لے لیتے، خصوصاً وہ بحث جو پروفیسر سید احتشام حسین کے مضمون ''نئے تیشے، نئے کوہکن'' کے جواب میں عمیق حنفی کے مراسلے سے شروع ہوئی۔لیکن بحثوں کو شائع کرنے میں مشکل یہ تھی کہ ہر مراسلے میں غیر ضروری باتیں بھی ہوتی ہیں، یعنی ایسی باتیں جو رسالے کے دیگر مشمولات کے متعلق ہوں لیکن بحث سے متعلق نہ ہوں۔پھر بہت سی بحثیں کئی کئی مہینے چلیں۔تحریروں کے ان طویل سلسلوں سے انتخاب قریب قریب ناممکن ہوگیا تھا۔پھر بھی، ہم نے احتشام صاحب اور عمیق حنفی کی بحث کے باب میں ایک مضمون انتخاب میں لے لیا ہے، جس سے یہ بات بھی صاف ہوجائے گی کہ جدیدیت اور ''شب خون'' کو ایسی تحریریں چھاپنے سے بھی گریز نہ تھا جن میں جدیدیت پر نکتہ چینی ہو۔

''شب خون'' کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہاں تراجم بکثرت شائع ہوتے تھے۔ہم نے حتی الامکان تراجم سے بیش از بیش انتخاب کیا ہے۔ انتخاب میں مرتبین نے اپنی کوئی تحریر نہیں شامل کی ہے، اس کا اثر تنقید، شاعری، تبصرہ، ترجمہ، ہر شعبے پر پڑا ہے۔شمس الرحمن فاروقی کی تحریروں سے انتخاب نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہر شعبۂ ادب میں ان کی تحریریں بکثرت ''شب خون'' میں چھپی ہیں۔لہٰذا ان کا انتخاب بھی خاصا ضخیم ہوجاتا۔یہ زیادہ مناسب سمجھا گیا کہ وہی صفحات دوسرے معاونین قلم کے انتخاب کے لئے استعمال کئے جائیں تو تنوع کا حق بہتر طور پر ادا ہوگا۔

''شب خون'' کو آخر کبھی تو بند ہونا تھا۔ایک دوست نے لکھا کہ فاروقی کو چاہئے تھا کہ اسے اپنی زندگی تک تو قائم رکھتے۔لیکن پرچے کی عمر طبیعی شاید پوری ہوچکی تھی۔ ہم نے اپنی بساط پر اردو کی ادبی صحافت کی دشوار راہ باوجود آبلہ پائی طے کی اور کچھ نشان چھوڑ گئے۔اب آخر میں امیر خسرو کی زبان سے یہ کہنا اچھا معلوم ہوتا ہے

عمر تو اگر فزوں شود از پانصد افسانہ شوی عاقبت از روے خرد

بارے چو فسانہ می شوی اے بخرد افسانۂ نیک شو نہ افسانۂ بد

''شب خون'' کے پہلے مدیر ڈاکٹر سید اعجاز حسین تھے۔اس کے دفتر کا اجرا پروفیسر سید احتشام حسین کے دست مبارک سے ہوا تھا۔''شب خون'' کا یہ آخری شمارہ ان کے اسمائے سامی سے معنون کیا جاتا ہے۔

شب خون

حصۂ اول

جون تا دسمبر، ۲۰۰۵

مدیر، پرنٹر، پبلشر: عقیلہ شاہین
معاون مدیر : سید ارشاد حیدر
فون نمبر : 91-532-2622693
E-mail : srfaruqi@sancharnet.in
قیمت مکمل دو جلدیں : سات سو پچاس روپے
مطبع : انصاری آفسیٹ، الہ آباد

اول سرورق : شاداب مسیح الزماں، الہ آباد
سرمایۂ بہاراں کا سرورق : جاوید یوسف، ٹورانٹو
سرنامے کی خطاطی : عادل منصوری
کمپوزنگ : ریاض کمپیوٹرز، شارپ ٹریک کمپیوٹرز، مجتبیٰ حیدر قدر
سرورق کا مطبع : پربھات آفسیٹ، الہ آباد

جلد : ۴۰ شمارہ : ۲۹۳ تا ۲۹۹
ترسیل زر کا پتہ : ۳۱۳/۳، رانی منڈی، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
خط و کتابت کا پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۱۳، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
کوریئر کے لئے پتہ : 29C, Hastings Road Allahabad-211001
مہتمم : امین اختر

ماہم نشان آبلۂ پا گذاشتیم

۱

احمد مشتاق	غزل	۷
خالد اقبال یاسر	رخصتی	۸
انتظار حسین	وشی اور قصائی	۲۱
مختار الدین احمد	غالب کے تین نادر اردو خطوط	۲۳
منیب الرحمٰن	گرمی کی شام	۳۰
احمد جاوید	پانچ غزلیں	۳۱
ندا فاضلی	تین غزلیں	۳۶
عادل منصوری	غزل	۳۸
سید امین اشرف	دو غزلیں	۳۹
شہریار	چار نظمیں، دو غزلیں	۴۰
ناصر شہزاد	تین گیت، دو غزلیں	۴۲
ناصر شہزاد، جمال پانی پتی	غزلیں	۴۵
جاوید شاہین	چھ غزلیں	۴۶
پرکاش فکری	دو غزلیں	۴۹
بلقیس ظفیر الحسن	چار غزلیں	۵۰
بشر نواز	تین نظمیں	۵۲
سید محمد اشرف	دلاوران نیم شب	۵۳
باقر مہدی	غزل	۵۸
لدمیلا وسیلیوا	فیض کا آخری زمانہ : حیات اور شاعری کے پہلو	۵۹
عذرا عباس	یہ خیال	۶۷
خورشید رضوی	دو غزلیں	۶۸
عذرا عباس	میں اور موسی	۶۹
فضیل جعفری	عادل منصوری کی نظمیں، چند پہلو	۸۳
ظفر اقبال	تین غزلیں	۸۹
پرتپال سنگھ بیتاب	چار نظمیں، آٹھ غزلیں	۹۱
انور شعور	پانچ غزلیں	۹۸
ابرار احمد	چھ نظمیں، چھ غزلیں	۱۰۱
سحر انصاری، امجد اسلام امجد	غزلیں	۱۰۷
امجد اسلام امجد	دو نظمیں	۱۰۸
صدیق عالم	ٹرمینس لین	۱۰۹
قدیر زماں	افسانے کے دو کھونٹ	۱۱۷

خالد جاوید	مٹی کا تعاقب	۱۲۵
مخمور سعیدی	غزل	۱۳۷
کرشن کمار طور	دو غزلیں	۱۳۸
کرشن کمار طور، مصحف اقبال توصیفی	غزل، نظم	۱۳۹
مصحف اقبال توصیفی	بے کار کتابیں	۱۴۰
صابر ظفر	دو غزلیں	۱۴۱
مظہر امام	دو نظمیں، دو غزلیں	۱۴۷
ظفر گورکھپوری	سات غزلیں	۱۴۹
مظفر حنفی	چار غزلیں	۱۵۳
سرمد صہبائی	پانچ غزلیں	۱۵۵
مدحت الاختر	دو غزلیں	۱۵۸
مسعود اشعر	سوال کہانی	۱۵۹
ساجدہ زیدی	کیا ہے	۱۶۲
منشا یاد	چاہ در چاہ	۱۶۳
زبیر رضوی	دو نظمیں	۱۶۷
اختر یوسف	چار نظمیں	۱۶۹
مرزا حامد بیگ	لالہ جسونت کی حویلی	۱۷۱
صبا اکرام	آسرا	۱۷۶
مبین مرزا	قید سے بھاگتے ہوئے	۱۷۷
مبین مرزا	وہ دل حیراں نہیں ہوتے	۱۹۶
رشید کوثر فاروقی	رباعیاں	۱۹۷
رشید کوثر فاروقی	سات غزلیں	۲۰۲
سلیم الرحمٰن	دو نظمیں	۲۰۹
سہیل احمد خاں	چار غزلیں	۲۱۰
غلام مرتضیٰ راہی	دو غزلیں	۲۱۲
مہدی جعفر	عوض سعید، غیر معمولی زاویۂ نگاہ کا افسانہ نگار	۲۱۳
آصف فرخی	ناکافکا	۲۱۷
آصف فرخی	سمندر کی بیماری	۲۲۱
شمیم فاروقی	غزل	۲۲۵
شفق سوپوری	دو غزلیں	۲۲۶
آصف فرخی	نانو ہاؤس	۲۲۷
فرید پربتی	غزل	۲۳۱
غیاث متین	چار غزلیں، ایک نظم	۲۳۲
شاہین	دو نظمیں، چھ غزلیں	۲۳۵
رفیق راز	چھ غزلیں	۲۳۹
جینت پرمار	پندرہ نظمیں	۲۴۲
راشد طراز	چار غزلیں	۲۵۰
باقر نقوی	دو غزلیں	۲۵۲
جے پرکاش غافل	چار غزلیں	۲۵۳
یاسمین حمید	چار غزلیں	۲۵۵
نشتر خانقاہی	دو غزلیں	۲۵۹
راہی فدائی	دو غزلیں	۲۶۰
امجد طفیل	جدید ادبی تنقیدی نظریے اور متن کی تلاش	۲۶۱
رشید امجد	بے شناخت	۲۶۵
ارشد عبدالحمید	غزل	۲۶۶
محمد حمید شاہد	بدن برزخ	۲۶۷
شاہد عزیز	دو نظمیں	۲۷۹
شاہد عزیز، محمد اعظم	نظم، غزل	۲۸۰
محمد اعظم	دو غزلیں	۲۸۱
احمد محفوظ	تین غزلیں	۲۸۲
امنگ بالی	دو غزلیں	۲۸۳
علی محمد فرشی	ڈیڈ لیٹر	۲۸۴
عشرت ظفر	دو غزلیں	۲۸۵
غلام حسین ساجد	بیس غزلیں	۲۸۶
صدیق عالم	پہلا انسان	۲۹۶
سید عارف	دس غزلیں	۲۹۸
سراج اجملی	دو غزلیں	۳۰۲
حارث خلیق	الم ترکیف فعل ربک	۳۰۳
قربان آتش	دو غزلیں	۳۰۴

معراج رعنا	شاعری کا زمانی پہلو	۳۰۵
فرخ جعفری	دو غزلیں	۳۱۰
وارث کرمانی	گھومتی ندی	۳۱۱
سردار آصف	غزل	۳۲۵
عالم خورشید	چھ غزلیں	۳۲۶
راحت حسن	تین غزلیں	۳۲۸
سید محمد افضل	عالم کی گفتگو سے تو آتی ہے بوئے خوں	۳۲۹
نیر عاقل	غزل	۳۳۴
محمد عاصم بٹ	انکار	۳۳۵
محمد عاصم بٹ	دستک	۳۳۷
جعفر ساہنی	کھڑکی	۳۳۹
حنیف نجمی	دو غزلیں	۳۴۰
نسیم بن آسی	ندی پار کا شہر	۳۴۱
ابرار اعظمی	تین نظمیں	۳۴۵
زبیر شفائی	دو غزلیں	۳۴۶
خورشید طلب	چار غزلیں	۳۴۷
اتل اجنبی	چار غزلیں	۳۴۹
قمر رضا شہزاد	تین غزلیں	۳۵۱
مسعود مرزا نیازی	من آنگن	۳۵۲
تاج ہاشمی	تین نظمیں	۳۵۴
ذکیہ مشہدی	پلو کا ہاتھی	۳۵۵
علم الدین شیخ	صبح کو ملاقات	۳۵۸
عبدالماجد دریابادی	اکبر الہ آبادی	۳۵۹
اوم پربھاکر	دو غزلیں	۳۶۱
شاہین عباس	چھ غزلیں	۳۶۲
اکرام خاور	اک چنبیلی کے منڈوے تلے	۳۶۴
غلام مصطفیٰ فراز	چار غزلیں	۳۶۵
اسلم محمود	چھ غزلیں	۳۶۷
انور قمر	جہاز پر کیا ہوا	۳۶۹
مظہر مہدی	تین نظمیں	۳۷۱
فیصل ہاشمی	تین نظمیں	۳۷۲
اظہار الاسلام	وہ آدمی	۳۷۳
مہتاب حیدر نقوی	چھ غزلیں	۳۷۵
شفیع مہدی	سید کی حویلی	۳۷۷
شکیب ایاز	دو غزلیں	۳۸۰
عبدالصمد	ترہنواں پتہ	۳۸۱
قمر صدیقی	دوغزلیں	۳۸۶
اسلم فرخی	برصریر دل شاہم	۳۸۷
مشتاق اعظمی	کال یاترا	۳۹۱
مشتاق مہدی	ایک کہانی جاری ہے	۳۹۲
محمد حامد سراج	گھڑی، سمت، سوئیاں	۳۹۳
شمس فریدی	نظم، غزل	۳۹۶
محمد اطہر مسعود	استاد ولایت خاں	۳۹۷
مصطفیٰ شہاب	دو غزلیں	۴۰۴
محمد عابد علی عابد، خواجہ جاوید اختر	غزلیں	۴۰۵
مصطفیٰ ارباب	خصوصی پیشکش : اکتیس نظمیں	۴۰۶
عرفان ستار	خصوصی پیشکش : انتیس غزلیں	۴۱۷
علی حیدر ملک	فرار ہونا حروف کا	۴۳۴
انیس صدیقی	اشاریۂ مصنفین شب خون : شمارہ ۱ تا ۲۹۰	۴۳۵
باراں رحمٰن (مترجم)	چار قدیم تامل نظمیں	۴۵۷
آئرینا راتوشنسکایا، ترجمہ: سلیم الرحمٰن	نظمیں	۴۵۹
گوپی ناتھ مہانتی، ترجمہ: کرامت علی کرامت	نام یاد نہیں	۴۶۱
موکوتو ووکا، ترجمہ: مظہر مہدی	نغمۂ آتش	۴۶۶
شنتارو تانی کاوا، ترجمہ: مظہر مہدی	مجھے تنہا چھوڑ دو	۴۶۶
طارق قمر (مترجم)	چھ اطالوی نظمیں	۴۶۷
سوانحی گوشے		۴۷۱

اردو رسم الخط پر کچھ اہم اور بنیادی تحریریں : ۴۷۳
محمد الیاس برنی اردو ہندی رسم الخط ۴۷۵
پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب اردو زبان اور اس کا رسم الخط ۴۹۵
سید احتشام حسین اردو رسم خط، چند خیالات ۵۱۷
فرمان فتحپوری اردو رسم الخط : مسائل و مباحث کی روشنی میں ۵۲۲
شمس الرحمٰن فاروقی کچھ اردو رسم الخط کے بارے میں ۵۳۶
اردو اور اس کا رسم الخط: ایک مباحثہ ۵۴۴

شب خون از اول تا آخر :
جعفر رضا پہلے قدم کی یادیں ۵۴۹
مہر افشاں فاروقی ''شب خون'' اور میں ۵۵۱
آصف فرخی شب خون ۵۵۳
غلام حسین ساجد، ظفر احمد صدیقی، سید ارشاد حیدر، غلام مرتضیٰ راہی، شمس الرحمٰن فاروقی } کتابیں ۵۵۵

کہتی ہے خلق خدا ۵۷۴
نقارۂ خدا ۵۸۰
نقارۂ خدا (حصۂ دوم) ۶۰۴
اخبار و اذکار ۶۰۷
اس بزم میں ۶۰۸

فہرست مصورین و خطاطان

محمد حنیف رامے	میر عماد الحسنی
جاوید یوسف	فتح علی واشقانی
فاطمہ صوفیہ تاج	محمد ابراہیم زریں رقم
جینت پرمار	محمد حنیف رامے
شاداب مسیح الزماں	اسلم کمال
ودیشا مہاپاترا	استاد غلام حسین امیر خانی
سنکیت مہاپاترا	رسول ہرادی
	عادل منصوری
	محمد احرار ہندی

ترتیب و تہذیب
شمس الرحمٰن فاروقی

احمد مشتاق

پھر وہی رات پھر وہی آواز
میرے دل کی تھکی ہوئی آواز

کہیں باغ نخست سے آئی
کسی کوئل کی دکھ بھری آواز

ابھی چھایا نہیں ہے سناٹا
آرہی ہے کوئی کوئی آواز

پھڑپھڑاہٹ کسی پرندے کی
کسی کونپل کی پھوٹتی آواز

ابھی محفوظ ہے ترا چہرہ
ابھی بھولی نہیں تری آواز

میرے بستر پہ آکے لیٹ گئی
روشنی کی لکیر سی آواز

منھ اندھیرے جگا کے چھوڑ گئی
ایک صبح جمال کی آواز

دن سے فرصت کبھی ملے تو سنو
شام کا ساز رات کی آواز

گونجتا ہے ابھی ترانۂ شوق
وہی آہنگ ہے وہی آواز

ٹیڑھے میڑھے مڑے تڑے مکھڑے
ٹوٹی پھوٹی کٹی پھٹی آواز

بڑے دکھ جھیل کر کمائی ہے
جو بھی ہے یہ بری بھلی آواز

خالد اقبال یاسر

پر فضا روح پرور دالان کی سبز کیاری
ـــــ سے لہرا کے اٹھتی ہوئی
اور برآمدے کے مدور ستونوں سے لپٹی ہوئی
صبح کی حمد یہ ادس میں بھیگتی پنکھڑی ـــــ رخصتی

(۲)

ایک سے روز و شب، عکس در عکس لمحات،
تقدیر کی چھدری چھاؤں کی دھندلاہٹوں میں
کوئی مژدۂ جانفزا، باعث خیر و برکت مناجات کی یاوری
ـــــ رحمت ایزدی، داوری ـــــ رخصتی

(۳)

آسمانوں سے سارے میں
ساری کی سازی
ستاروں کی گوٹا کناری
خداوند قدوس کے اذن سے
تارا تارا اترنے کی،
آنگن سے دہلیز تک
روزنوں، در، دریچوں
سے دالان میں ہر طرف خوشبوؤں کی طرح
اک مسرت بکھرنے کی،
ہر ڈبڈبائی ہوئی واری واری نگاہوں
ـــــ میں تصویر، گھونگھٹ کی ایک اک لڑی
ـــــ کے سنورنے کی
سعد و مبارک گھڑی ـــــ رخصتی

(۴)

موتیے، یاسمن اور گیندے کے نازک گلوں کی تر و تازگی
اور پتلی کلائی میں نارنجی پھولوں کے گجروں،
حسیں گیسوؤں میں بھی، پیچ در پیچ گل پاش لڑیوں
ـــــ پہ اڑتی منقش رنگا رنگ تتلی
ـــــ کے بجرے پروں کی عجب سمفنی ـــــ رخصتی

(۵)

من ہی من میں معالڈوؤں کی طرح پھوٹتی
ماہتابی کوئی مضطرب الجھے اعصاب میں چھوٹتی
اور مدت سے آہو کے نافے میں سربند
خوشبو کی مانند یکبارگی جان و تن لوٹتی ـــــ رخصتی

(۶)

مخملیں کان کے چھید میں،
اولیں شب کے مہتاب کی قوس کی شکل میں
ـــــ جھومتی مندری
ریشمیں مست انگلیوں میں تازآفریں زرد سونے کی انگشتری
ـــــ اور اس میں زمرد کی صورت جڑی ـــــ رخصتی

(۷)

جگمگاتے ہوئے قمقموں
روشنی میں نہائے ہوئے شامیانوں
معطر قناتوں، ہمہ دا شادماں سیج کے درمیاں
ناز و انداز سے اک لجلجاتی ہوئی سندری ـــــ رخصتی
سر سے چہرے پہ ڈھلکائے زرتار گھونگھٹ
ـــــ کی معدوم سی اوٹ سے جھانکتی
سرمہ آلود اشکوں سے بھیگی ہوئی سرمئی روشنی ـــــ رخصتی

(۹)

چاند ماتھے پہ افسوں بھرے زاویے سے ٹکا
ترچھا ٹکا سجانے سے کچھ دیر پہلے
سنہری گھنی لمبی زلفوں کی چوٹی سے

—— آزاد، آوارہ لٹ کی طرح
شرم سے تمتمائے ہوئے رخ پہ
—— بے ساختہ، بے ارادہ گری —— رخصتی

(۱۰)
شاد آباد ایک اک سہاگن کے ہاتھوں
—— سے دلہن کی سیدھی ہتھیلی
—— پہ مہندی کی صورت سجی —— رخصتی

(۱۱)
آرزوؤں، امنگوں بھری عمر کی جی لبھاتی گھڑی
اور آئندہ کی ان گنت آس امیدوں بھرے
—— بندھنوں میں بندھی —— رخصتی

(۱۲)
گھر کی مانوس دیواروں، پیاروں سے منھ موڑ کر
اپنی دہلیز کو چھوڑ کر
اپنے شانے انجان شانہ بہم جوڑ کر
اونچی نیچی پراسرار پگڈنڈیوں پر کسی ناشناسا دیارِ طرب کے
—— سہانے سفر کے فقط وعدۂ دلنشیں،
زمزمہ ریز پیمان و عہد وفا کی غم آگیں خوشی —— رخصتی

(۱۳)
گڈے، گڑیاؤں کی منگنی، شادیاں
پیچ پینگیں، پہل، دوج تیج، اونچ نیچ، انگنائی
چھپا کی، لکن میٹیاں، کھوہ
اڈی چھڑپا، گھڑولی گھڑا، ککلیاں
کیڑی کاڑا، رمی، بھنگڑے، پہلیاں
سیڑھیاں سانپ، لڈو، شٹاپو
جھمر، تھال، گدے، سکھی، لڈیاں
چنگ، دف، سیٹیاں
تالیاں، گھوڑیاں، ڈھولکی
گیٹیاں، کوڑیاں، نوگٹی
بچپنا، کم سنی —— رخصتی

(۱۴)
دو کہاروں کے کاندھوں پہ رکھی صبا سے سبک پالکی
کوئی قالین جادو سے اڑتا ہوا
تختِ دوشِ ہوا پر سلیمان کا یا اڑن طشتری —— رخصتی

(۱۵)
دل کی ڈھلوان پر
برف کے دودھیا نرم گالوں کی مانند گرتی ہوئی
سردیوں میں کسی سونے کمرے کے کونے میں
—— جلتی انگیٹھی کی لپٹوں میں لپٹی ہوئی
اجلی، انمول، نایاب آسودگی —— رخصتی

(۱۶)
بھیگتی شب زفافی
دوپٹہ، نمازِ دوگانہ
حیا، حجلہ و توشک خسروانہ
شگن، رونمائی، شناسائی، چاہِ ذقن
حسن و لطفِ بیاں، خوشبوئے محرمانہ
مہکتی کلائی، چھنکتے زرافروز کنگن
دل و جاں کی نورستہ، خرسندوارفتگی
لعلِ یکتا کی ناسفتگی، باردوشیزگی —— رخصتی

(۱۷)
آشنا بام و در چھوڑ کر ہمرہ اجنبی، رخصتی
اجنبی اجنبی میں مگر باعث دوستی، رخصتی
مشفق آنکھوں کی پلکوں پہ مشکل سے ٹھہری نمی رخصتی
اور اچھی دعا سے پروئی ہوئی اوڑھنی، رخصتی
سائباں نوریں قرآن کا، ازلی پاکیزگی رخصتی
اور پہلا قدم ہم قدم، آرتا، آرتی رخصتی
ارغواں کہکشاں سے چھلکتی ہوئی روشنی رخصتی
چودھویں رات کے چاند کی دودھیا چاندنی رخصتی
ملتجمیں خواہشوں، خواب گوں آرزوؤں بھری رخصتی
شاخ پر اوس میں بھیگتی ایک نازک کلی رخصتی
ابر و بادِ بہاری کی سرمستیوں میں کھلی رخصتی
رنگ رس مہندیوں کی کچل خوشبوؤں میں رچی رخصتی
گیسوؤں کی گرہ در گرہ مینڈھیوں میں گندھی رخصتی

ساتھ کھیلی سہیلی کیاک رنگ افزا ہنسی رخصتی
ہر بن مو سے بے ساختہ پھوٹتی سرخوشی رخصتی
کان میں جھولتی بالیوں کی طرح نقرئی رخصتی
تیکھے ماتھے کے جھومر کی روپہلی تابندگی رخصتی
سامنے اک نیا مرحلہ اک نئی زندگی رخصتی
پر سکوں گھر کی دہلیز سے دوسری تک پہنچی رخصتی
کان رس، جانفزا، دل نشیں نغمۂ سرمدی رخصتی
منعکس دو بجلی، مضطرب صورتیں، آرسی رخصتی
پہلی پہلی جھلک، ابتدائی جھجک، ٹکٹکی رخصتی
کان میں گونجتی دھیمی شہنائی کی راگنی رخصتی
اور باجے کی ہر تان میں رخصتی، رخصتی، رخصتی

(۱۸)

شہر کی برجیوں، کنگروں، رنگ محلوں، چوباروں تلے
ٹیڑھے چوراہوں، بازاروں، گلیاروں میں اپلے گہلے
رنگارنگ قہوے کی پیالیوں میں طوفان اٹھاتے ہوئے
سگرٹوں کا دھواں دوسروں پر اڑاتے ہوئے
ملگجی گرد آلود شاموں
سلگتی دوپہروں
جنوں خیز اندھیاری راتوں کی
—— فکر اور فاقے سے آزاد آوارگی —— رخصتی

(۱۹)

ایک ہی وقت میں
عمر گھٹتی رہی اور بڑھتی رہی
عمر کے ہاتھ سے
قرض ملتا رہا واپسی کے لئے
کتنا رونا پڑا اک ہنسی کے لئے
ہر کوئی ہے کہاں ہر کسی کے لئے
منقسم ہو گئے زندگی کے لئے
منقسم زندگی کی طرح کچھ اضافہ مگر —— کچھ کمی —— رخصتی

(۲۰)

شہد کی، دودھ کی، ایک سی سطح پر دائمی بہتی نہروں
درختوں پہ اک ہاتھ کے فاصلے پر الوہی پھلوں
اور خوش رنگ انواع واقسام کے شیریں میووں

مقدس گلوں سے بھرے مستطیل اور چوکور تختوں
روش در روش حسن فطرت کے جلووں
—— سے معمور پاکیزہ جنت سے بھولی نہیں
—— اپنی نا وقت، بھیدوں بھری، عارضی —— رخصتی

(۲۱)

رات کی کوکھ سے پھوٹتی پو
افق سے نکلتے ہوئے دن کی ضو
اک پہر، دوپہر، سہ پہر،
جھٹپٹا، شام، بجھتا ہوا دن
اترتی ہوئی رات، اندھیرا
اماوس، پرنماشی، تارے
مہ و مہر کی منزلیں، مرحلے، برج
شب، شام کی تیرگی —— رخصتی
اور دن، صبح کی روشنی —— رخصتی

(۲۲)

نعرۂ حق، اناالحق کا اسرار
منصور، سرمد، گرفتاریاں
سولیاں، زہر کی چسکیاں
حلقۂ درس، بے ساختہ فکر
برجستہ اظہار پر قدغنیں
سوچ، سچ، زہر کا پیالہ
دو گھونٹ، سقراط
ڈلے، بھگت، ٹیل، ویلیس، جگے [۱]
بغاوت، حق خود ارادی کی تاریخ
اشرافیہ کی جبیں شکن
تیر انداز ساونت، شمشیر زن سورما، صوفیا، رہنما
دیو مالائی کردار
شاہان عالم کے دربار، للکار
زندان، زنجیر، تعزیر
کڑیاں، کٹہرا، پرایا قلم
طوق، بیڑی، رسن، آہنی ہتھکڑی

---

[۱] دلا بھٹی، سردار بھگت سنگھ، William Tell، William Wallace، جگا۔ یہ سب آزادی اور حریت کی تاریخ کے سورما ہیں۔

گھور اندھیری گھڑی، تنگ تر کوٹھری
درے، کوڑے، کڑے تازیانے، ٹکی ٹکٹکی
صبح صادق کی اجلی کرن
پہلی پہلی کلی کی بکل خوشبوئے دل گرفتہ کی
دانستہ توثیق کوتاہ بیں پر
زبردست جلاد کے کپکپاتے ہوئے کھردرے ہاتھ سے
دار کی چوب ناقدرے جھولتے جسم سے
جاوداں روح کی رخصتی

(۲۳)

اک طرف مال و دنیائے دوں
اک طرف نیلگوں آسماں، واژگوں
موج در موج پیاس اور بہتا فرات
آتشیں ریت میں جذب خوں
ایک معصوم حلقوم، تیر
اور جھوٹ اور سچ، بیچ خونیں لکیر
اسم شبیر ابن علی، بے بسی، صبر، بے چارگی
کربلا کربلا، تشنگی —— رخصتی

(۲۴)

سنگھاسن کا وارث
زمانے سے ناآشنا شہزادہ
سوئمبر میں جیتی ہوئی شاہزادی
مقدر کی رانی
تراشا بدن زعفرانی
فسوں زا کہانی، پرانی
وفا کیش حسن زمانی
مرادوں بھرے روز، راتیں سہانی
زرافشاں پنگھوڑے جھلاتی ہوئی
سنکھے جھلتی ہوئی کنیائیں
سکوں بخش سیجیں، بچھونے
نگر، راجدھانی، محل، بام
سنتان، ماتا پتا، راجگیر ی
مگر کھانستے ایک بوڑھے کی جھکتی کمر
ایک بیمار کی بجھتی چیخیں، کراہیں
اک ارتھی، چتا
دلگدازی میں گم
اپنی سوئی ہوئی پھول شہزادی
گلفام اولاد پر آخری اک نظر
مضطرب شاہزادے کے نروان کی پیش بیں
اونگھتی رات کی جاگتی —— رخصتی

(۲۵)

آپ میں گم، اکیلے میں
گاؤں کی دھندلی منڈیروں سے کچھ دور، بیلے میں
رنجیدہ لمحوں کے ریلے میں
مغموم لے سے
فسردہ و دلگیر رانجھے کے یکسو رگ و پے سے
خوشیاں چراتی ہوئی بانسری —— رخصتی

(۲۶)

رات، اندھیرا گھنا
اور مٹی کا بے جاں گھڑا
بپھرے دریا کی طوفانی لہریں
کڑکتی ہوئی برق
ڈھولک نہ باجا
نہ مہندی، نہ سکھیاں
نہ ڈولی، نہ بھائی کا کاندھا
نہ بابل کی پرآب انکھیاں
نہ ماں کی دعائیں
فقط کچی مٹی کی ڈولی گھڑا، ڈوبتی سوہنی —— رخصتی

(۲۷)

جنڈ کی ٹیک، [۲] ترکش، مقوس کماں
نیند میں بے خطر محو مرزا
سرہانے مگر پہرہ دیتی ہوئی صاحباں
اور بجلی کی بے چینیاں
اک طرف تیر اور اک طرف دیر اپنا ضمیر
اک طرف اپنے مرزے کے بالوں کا چیر
اک طرف اپنی مٹی، خمیر

---

[۲] ایک درخت جس کی ٹیک لے کر مرزا سویا تھا۔

آتے گھوڑوں کی ٹاپوں سے بڑھتا ہوا
اضطراب وتذبذب
وفا، بے وفائی کے دوراہے پر
ٹوٹتے تیر، ترکش، کماں
خاک کا رزق مرنے کا خوں
صاحباں کی وہیں اپنے محبوب پر جان وتن وارتی ـــــ رخصتی

(۲۸)
زہر کی ایک چٹکی، وہن
فصد، چاقو کی دھار
آبی لہروں کی پھنکار، خاکی جسد
ایک مضبوط رسی، گلا
نامراد محبت کی تنہا کہیں دور
یا بتنگ دونوں زمانے کے ہاتھوں
محبت کے ماروں کی اک ساتھ
ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہاتھ
ماتھے پہ سہرا
سجانے کی حسرت نظر میں لئے
گورے ہاتھوں پہ مہندی
رچانے کے ارمان دل میں رکھے
وقت کی حد سے باہر
کسی ماورائے زمانہ چمن میں
ملن کی تمنا لئے باہمی خودکشی ـــــ رخصتی

(۲۹)
بے خطر اپنے محفوظ رستے پہ چلتے ہوئے
ناگہانی کوئی حادثہ، سانحہ
گھات، شب خون، حملہ
نشانے بنا تیر، بھٹکی ہوئی کوئی گولی
لٹیروں کا جتھا
شب تیرہ تار میں، دن دہاڑے
چھرا، شاہ رگ پر کوئی
نیزہ بردار، برچھی
طمنچہ، خمیدہ ٹریگر پہ انگلی کا خم
ایک معصوم کی کنپٹی ـــــ رخصتی

(۳۰)
ایک میداں سے پسپائی
صلح وصفائی
خیام اور پڑاؤ، الاؤ
چڑھائی، لڑائی
ہراول کے تاؤ
کبھی میمنے، میسرے، قلب کے پیچ داؤ
کھلی تیغ کے پینترے، وار، گھاؤ
کبھی منجنیقوں، پیادوں، سواروں کی ہو ہاؤ
ـــــ پر عین گھمسان کے رن
ـــــ میں نصرت سے دو ہی قدم پہلے،
دارالخلافہ سے محضر بدست ایلچی ـــــ رخصتی

(۳۱)
اپنے قد سے بڑی کرسیاں
شان، رتبے، شرف
مسندیں، عہدے، انعام، دنیاوی منصب
حشم، جاہ، سطوت
مراعات، عیاشیاں، کارمختاریاں
کہنیوں کی کرامات، لفاظیاں
چور دروازے کی یاریاں
سازشیں، حرص، لالچ، خوشامد، لسانی تعصب، ریاکاریاں
اپنی باری سے پہلے
ترقی کی بجلی بھری سیڑھیاں
اقرباپروری، مصلحت، فرقہ بندی، حسد
ضابطوں سے تجاوز، زبانی ہدایات
زر، مال، املاک، رقبے، سواری
حصص، شراکتیں، کاروباری مفادات
روزینے، روٹی کی مجبوریاں
بوجھ سے ذمہ داری کے دوہری کمر
بے سبب نیچی نیچی نظر
کورنش، خم سے بے وجہ شرمندہ سر
اور انکار پر
سرزنش، بندشیں، جبری رخصت، اڑنگے
شبہے، تنزل، تعطل، سبکدوشیاں
قابلیت، دیانت، صداقت، قناعت کی معزولیاں

عرضیاں، عرضیاں سننے والوں کی معذوریاں
بے بضاعت قویٰ، ذہن شل، جوڑ مختل
شتی، موذی غاصب کی مختاریوں کی طوالت
مگر آخرش گردنوں کا اترتا تناؤ
اکڑتی رعونت، بکھرتی اکڑ
زرخرے کا ڈھلکتا کلف
خود بخود ابروؤں کی سلجھتی شکن
ارضی مستاجری، آجری، افسری
عارضی نوکری، مستقل چاکری ـــــ رخصتی

(۳۲)
تمغے، اعزاز، انداز،
حاجب کی آواز،
انجام، آغاز
طرے، کلف، ٹوپیاں، خان سامانیاں،
خلعتیں، کلغیاں، کرسیاں
باندیوں کی طرحداریاں
تخت، دربار، فانوس، درباں، جھروکے، کلس
چوبداروں کی ہر گام پر چھاؤنی، چوکیاں
قورچی، مورچے، دمدمے، برجیاں
مسندیں دس ہزاری،
محاصل، شقیں، پرگنے، صوبہ داری
قلم اور فرمان، پروانے، محضر
علم، مہر، سالاریاں، لاؤ لشکر، معسکر
جلال کئی، سطوت قیصری
توشہ خانہ، خزانہ، خزانے کی کنجی
خزانے کی ہر اشرفی ـــــ رخصتی

(۳۳)
تیر، ترکش، کماں
ہاتھی، گھوڑے، اشتر
خود، بکتر، زرہ
توپ خانے، رسالے، پیادے
کلہاڑے، گنڈاسے، چھرے
گولہ بارود، توپیں، فلیتے
کٹاریں، کٹاری دو دھاری

چمکتی ہوئی تیغ، کرپان، تلوار
ترشول، آکاش، اگنی
حتف، غزوہ، شاہین
انی، دھار، بھالے
سپاہی، کمانڈر، سالار، سینائیں، سیناپتی
اور بحری، زمینی، فضائی، خلائی جھڑپ
پوکھران، ناگاساکی، نواڈا، ہیروشیما، چاغی
دھمک، حملے، یلغار، دھاوے
گرانڈیل طیارے، سیارے پر ہول اوزار
صیہونی، اسلامی، نصرانی، بدھ، ہندو ہتھیار
بمبار، بم
خفیہ، اعلانیہ یورشیں، دھمکیاں
کیمیائی، حیاتی، طبیعاتی شب خون، بمباریاں
تارپیڈو، میزائل، جہاز، آبدوز، ایٹمی چھتریاں
تابکاری کی پچکاریاں
اسلحے جوہری ـــــ رخصتی

(۳۴)
ہیکٹر[1] کی کماں سے نکلتا ہوا تیر
ایڑی کی شست ایکلیز[2] کی
افراسیابی جھپٹ،
رخش کی جست درجست
رستم کی تا زندگی، رستمی
سمسن، سمسن کی لٹیں کنڈلی ـــــ رخصتی

(۳۵)
مچھلیوں، سیپیوں اور گھونگھوں
سے آباد گہری تہوں سے
سمندر کے پانی سے سانسیں ادھاری لئے
ساحلوں کی دھلی ریت پر
اپنے ہی ساتھ اک دو گھڑی کھیلتی جل پری ـــــ رخصتی

(۳۶)
گھات میں چھپ کے بیٹھے شکاری کے کھینچے ہوئے

---

[1] Hector، یونانی دیومالائی سورما۔
[2] Achilles یونانی دیومالائی سورما۔

—— تیر کی زد پہ آئے ہوئے
مرغزاروں میں بے خوف رم کرتی ڈاروں
—— کے ایک خوش تاب آہو کی
من موج میں آخری چوکڑی —— رخصتی

(۳۷)

سنگ دل دیو کی قید سے
ایک الفت کے مارے جری شاہزادے
—— کی جرأت کے بل پر
رہا ہو کے اس شاہزادے کے پہلو بہ پہلو
اس قاف کی رفعتوں کی طرف
اپنے براق پر کھول کر
پھر سے پرواز کرتی پری —— رخصتی

(۳۸)

ہاتھ میں گہری مہندی سجا ہاتھ، گلگوں کلائی
گلوبند، پازیب، سولہ سنگار اور سرمہ سلائی بھی
اونی سوئیٹر کی دلبر کی خاطر، بنائی بھی
رومال پر اک طرف
دو حرف مخفف کی دستی کڑھائی بھی
ماں باپ، ماں جائی، بھائی
سب، بے سبب جگ ہنسائی
وفا بے وفائی بھی
سرسبز تنہائی بھی
وقت کے قرض کی پائی پائی بھی
ذاتی کمائی بھی
پندار، انا، بے خوفی، فخر، کم مائیگی —— رخصتی

(۳۹)

گھر کی محراب پر منتظر
اک دیے پر نظر
واپسی کا سفر اور دہلیز، در
صبح دم پھر سے درپیش اگلا سفر
دل کے ساتھ آنکھ بھی آئی بھر
توتلے لفظ پر ملتوی —— رخصتی

(۴۰)

لوحِ تقدیر کی روشنائی بھی
اور ان پہ لکھی عبارت کی سرخی، خفی یا جلی
گردشِ مہر و مہ، زہرہ و مشتری، جوتشی
اور اچھا برا زائچہ، کنڈلی —— رخصتی

(۴۱)

ابرہہ
مست فیل اور اصحابِ فیل
اور ابابیل، ابابیل کی چونچ کی کنکری
تختِ بلقیس، قصرِ سلیماں
طالوت و جالوت
ہاروت و ماروت
یاجوج و ماجوج کی راہ میں سدِ اسکندری
خضرؑ، آبِ حیات
اور اصحابِ کہف
اور صالحؑ کی خاکستری اونٹنی
آستیں میں کفِ دستِ موسیٰؑ
عصا اور الواح کے
قدرتی معجزوں کے مقابل
فریبِ نظر ساحری، سامری —— رخصتی

(۴۲)

دیوتا، دیویاں
ایشور، کام دیو، اگنی، وشنو، ورن
کالی، اندر، گنیش
اور بجرنگ، درگا، مہادیو
آشور، مولاک[۵]
نمرود، فرعون
مریخ، زہرہ، زحل، چاند
یمراج، یم دوت، راما، کرشنا
عطارد، کیوپڈ

---

[۵] Moloch بابل کا ایک خونخوار دیوتا۔

اوڈیسیس[6]، تمس، عشتار[7]، عشترتی[8]، رمیشور
سائیکی، ایفرودائتی[9]، لکشمی، مشتری ——— رخصتی

(۴۳)

فرقہ، تحریک، مت

دین، ایمان، مذہب، عقیدہ، دھرم، نظریہ
گشت، اذکار، پرچار، تبلیغ، معکوس چلہ کشی، سادھنا،
سنگٹھن، شدھی، بھگتی
مہاویر، زرتشت، نانک، سدھارتھ، منو، کنفیوشس، ولی، پوپ، لامے
غنا، فقر، ارادت
فضائل، مناقب
طہارت، سلوک و ولایت
طریقت، شریعت
مبلغ، مجدد، مفسر، معلم، رشی، عبقری
سچے پیغامبر، احمدی، قادیانی، بہائی
فرقے ——— حنفیہ، مالکی، حنبلی، شافعی، جعفری
بدعتیں، مسئلے، معجزے، وسوسے
قادری، نقشبندی، سہروردیہ سلسلے، خواجگی
مالک ابن نویرہ، عطا بن مقنع،
حسن بن صباح، محمد علی باب وشداد کذاب
حجاج، چنگیز، بش جیسے سفاک،
طبقات، انسان کی ساختہ ذات پات
آریا، سام، منگول، حبشی، دراوڑ، ایکسیمو
تعصب، ستم، خوف، خونخواریاں
افتراق، ابنائے ستم
بے کسی، آہ، لاچاریاں
بھائی چارہ، مروت، صداقت، مساوات، ہنسا، اہنسا، رواداری
سکھ، شانتی، آشتی، برتری، کم تری، منعمی، مفلسی
فلسفہ، عقل، دیوانگی ——— رخصتی

(۴۴)

گرجے، معبد، پگوڈے
صنم خانے، استھان، تیرتھ، شوالے
سمادھی، جنم بھومی، آتش کدے، گردوارے
رواں آب زمزم، وضو، رودگنگا کا اشنان، بپتسمہ، گنگوتری
پاٹھ، دم، کیرتن، جاپ، تجوید، تسبیح، گانا، دھمالیں، بھجن
بھینٹ، نذرانے، صدقے، انگوگے[10]
بلیدان، خیرات، پرشاد، لنگر
گجر، گھنٹی، ناقوس، اذانیں، نفیری، طرم
نوبتیں، سنکھ، نقارے، نقارچی
چھاپ، قشقہ، تلک
صوف، صوفی، ریاضت، تپسیا، پرستش
عبادات، ویدانتی
گیان، نروان، سطعات، عرفان
دیوالیاں، ہولیاں، پنچمی
ایسٹر، عرس
عیدین، میلاد عیسیٰ، دسہرے
چٹائی، کٹورے، کڑے، منکے، مالائیں، کنٹھے
عبا، دلق، خرقے، قبائیں، قمیص، عمامے
جفر، فال، قرعے، قیافے
کتھائیں، اساطیر، قصے، دفینے
مہابھارت، وید، اشلوک، گیتا، اپنشد، گرنتھ، آیتیں، شاستر، عہدنامے
طبو[11]، خیر، طوطیم[12]، شر، زندقی
کشف، الہام، پیشین گوئی، اشارہ، نزول وحی ——— رخصتی

(۴۵)

سنت، ابدال، سادھو
مہاپرش، بھکشو، پروہت، گرودیو، اوتار، جوگی
گرنتھی، گیانی، پجاری، حواری
مہاراجے، راجے، برہمن
چندر ونشی ساونت، سمراٹ بھی، سوریہ ونشی بلوان، جمان بھی

---

[6] Odysseus مشہور یونانی دیومالائی کردار، اسے یولیسیس بھی کہتے ہیں۔

[7] Ashtar، دراصل Ashtoreth، جس کا یہ یونانی روپ ہے۔ بعض دیومالاؤں میں اسے چاند کی دیوی مانا گیا ہے۔

[8] Ashtarte، دراصل Ashtoreth یا Ashtaroth جسے بابل کے لوگ Ishtar کہتے تھے۔ کنعانیوں اور فنیقیوں کے یہاں یہ زرخیزی اور کثرت تولید کی دیوی تھی۔

[9] Aphrodite، یونانی دیومالا میں زہرہ یا Venus کا نام۔

[10] انگوگا = بھینٹ جو دیوتا کو دی جائے یا برہمن کو پیڑ میں سے دی جائے۔

[11] Taboo

[12] Totem

اور شودر ملیچھ، ان ملے ولیش
زائر، مقدس مقامات کے یاتری
تیغ زن کھشتری، کم نظر پادری، تنگ دل مولوی
انتری جنتری، منتری ــــ رخصتی

(۴۶)

راجباہوں کے پانی کی خاموشیاں
دور تک لہلہاتی ہوئی کھیتیاں
گیہوں، زیتون، جو، باجرے، دھان کی بالیاں
گھاس کی پتیاں
یاسمن، موتیا، ناز بو، رات کی رانیاں
سرخ، کالے، گلابی گلابوں کے گلدستے،
چوبی ستونوں، درختوں سے لپٹی چنبیلی کی شاخیں
چناروں کے کھلتے شگفتہ شگوفے
اناروں کی کلیوں کے لچھے
تر و تازہ چمپا کی بن بیلوی
ترمرائے گل لالہ کی گھٹی، نرگس کی بے نور تنہائی،
داؤدی، دوپہری، گیندے کے گچھوں
پہ خنداں، تبسم کناں تتلیاں
برف کے تاج پہنے ہوئے
کوہساروں کی آکاش چھوتی ہوئی
چوٹیوں کی بہم گہری سرگوشیاں
نیلگوں آسمانوں کی پہنائی میں
سنبلیں بادلوں کے شکارے
غلولی رواں ابر پارے
طبق در طبق ٹمٹماتے ستارے
زر کہکشاں، کہکشاں کی دراڑوں میں ٹھہری ہوئی تیرگی
چاند سورج گرہن، ارضی قطبین،
اجرام سیار و ثابت کے چھلے
درخشندہ دنبالے، ہالے
کہر، بھاپ، کہرا، دھواں، بلبلے
دھند، جھاگ، اوس، اولے، بخارات، گالے
سراب، آبی چکر، سموم، آب شرشر، بگولے
طلسماتی فوارے، فوارچے
دلدلیں، جھال، جھیلیں،
ترائی، تری، کھاڑیاں، خشکیاں، دشت، صحرا، بیاباں

گھمر گرد باد، آب شوریدہ،
پروا، نسیم و شمیم و صبا کی سنن سن سنن
منجمد هاریں، بھنور، بادِ صرصر کے تیتے جھکولے، پون
سوئے سوئے نگونسار درے، سکوت آشنا تنگنائیں،
اکیلے جزیرے، تلاطم کناں آبنائیں
جزیرہ نما، راس، ٹاپو، مگر، منبعے، ڈیلٹا، طاس، دریا، خلیجیں، بحیرے
بہار آفریں مرتفع، کوہی، میدانی رقبے
سدا منجمد، محرقہ، باردہ، معتدل موسمی منطقے
راہ پیا عمود و افق،
استوا، جدی، سرطان خط، خطے، ابلاد، اطراف، ابعاد
کھینچے ہوئے مستطیل و مربع، محیط مقعر، محدب
مثلث، قطر، دائرہ، زاویہ، قوس، بے شکل اشکال
گنتی، عدد، ضرب، تقسیم، اکائی، کمیت، اعادہ، حجم، قدر، اوزان، ہیئت
گرہ در گرہ، گنبدی، داخلی
کروی، ملفوف، قلمی چٹانیں،
ہرے، نیلے نیلے پہاڑ
اوندھے، خفتہ و بیدار، مردار آتش فشانوں
کے لاوے کے، گارے کے میدان، ڈھلوان، اکسار [۱۳]
جمتے، سرکتے سنگستانی تودے پھسلتے ہوئے برفشار
آبشاریں، خنک معدنی بہتے چرخاب، جھرنے
تہ بحر پوشیدہ زیریں رویں
گرم ٹھنڈی سر سطح جاری رویں
موج در موج جھاگیں اڑتی ہوئی رودباریں
گھمس، حبس، لو، مانسون، استوائی سکوں
دائمی ساحلی، گرد بادی، طبیعی مسلسل ہوا کا فسوں
ساگواں، دیودار، آبنوسی ذخیرے،
سدا سبز شیشم، صنوبر
لرزتے ہوئے بید مجنوں کی اجلی لچک،
نرسلوں، بانس کے جنگلوں کی لہک
صندلوں کی للک
نیم کی تلخی، پیپل کا سایہ، سفیدے کی اونچائیاں
آک، خار مغیلاں
گھنے بوڑھ [۱۴] کی بوڑھی شاخیں، تنے

[۱۳] اکسار = ہموار۔
[۱۴] برگد

سیب، لیچی، کھجور، آم، امرود، خوبانی، انگور، شہتوت
آلو بخارے، اناناس، آڑو کی دھیمی مہک
فالسے، ترش نارنگی، لیموں، چکوترے کے رس
میٹھے انجیر، شیریں عسل
تیکھے جامن کی شاخوں پہ کوئل کی کوکو
شریفے، ہری چھال کیلے، پپیتے، چکو، ناریل، سردے
تربوز، خربوزے کے مختلف ذائقے
طوطیاں، بولنے والی مینائیں، طوطے، شجر در شجر خوش گلو بلبلیں،
عنقا، سرخاب، ققنس، ہما
فاختہ، تیتری، لالی، چڑیا، کبوتر، پپیہے کی پی ہو
قطاروں میں سہمی ہوئی چیونٹیاں
سوسمار، اژدہے، کرگسیں
کیکڑے، کرم، جرثومے، پروانے، جھینگر
مگس، بھونرے، زنبور، جگنو، گلہری، ہرن
رینگتے کرلے[۱۵] جل تھلیے، خرطومے اور گرگٹ
خزندے، درندے، چرندے، پرندے
جماد و نبات و حیات و ثبات
ارتکاز، انعکاس، انعطاف، ارتقا
تقلم، تبخیر، تکثیف
لاسلکی، مشیرہ، منفیرہ، برقیرے، مقنیطے، بے تار مقناطی لہریں، شعاعیں
تسلسل، تناسب، توازن، ثقل،
سبزہ، پتھریلی کائی، پھپھوندی، خمیر
آب آئینہ، چقماق، پارس
تب و تاب زر
زنگ و زنگار، سکری[۱۶]
نفس در نفس سوکھتی جمتی بے جان پپڑی
نمود و نمو، خاک در خاک پوشیدہ روئیدگی
روپ، رنگینیاں، رنگتیں گندمی
ذہن انساں کی کاریگری
دست قدرت کی گلکاریاں قدرتی
حسن فطرت کی مشاطگی ـــــ رخصتی

(۴۷)

ایک پل زندگی کا تلاطم، تگ و دو
ابھی آگے اور آگے بڑھتے چلے جانے کی کاہش نو بہ نو
آسماں پار کرنے کی خواہش
زمیں پر ستارے اگانے کی لامختتم کوششیں
وسعتیں فرصتیں، حوصلوں، شوخیوں، چونچلوں کی
ارادوں میں دم، والہانہ قدم
اور ابھی اک معالج کی تشخیص
دم کی بجائے دمہ اور مہلت بھی کم
ملتہب، معدی، یرقان، طاعون، سرطان، صفرا، سل و دق، شقیقہ
سبب بے سبب، سانس کا منتشر زیر و بم
رگ، ورید اور شریان میں
خون کا انجماد، در بڑھتا فشار
اور وجع، لمف صل، جذام،
اور صفرادی، میعادی تاپوں کی پر ہول اقسام
سوز جگر، شکری، آہستہ رو لبلبہ
نوبتی تاپ الگ
ضعف دل، درد دل، درد سر
ریح، تبخیر، مادہ، ورم
نیشتر، زخم، ناسور، ٹانکے، رفو
گاز کی پٹیاں، بانس کی کھپچیاں، لیپ، پچ بے، پلستر
مسیحائی، چارہ گری
تیرہ و تار گودے کی آلودگی
زنگ سے بھری، کرکری، مرمری ہڈیاں
جھلیاں، تھیلیاں، گلٹیاں
گنٹھیا، سوزشیں، گانٹھ، گومڑ
غدودوں کی ناکردگی
چھوت، موروثی، مہلک مرض
ان گنت عارضے، مزمنہ روگ، بیماریاں
سرکے، چوعرقے، دوآتشے
کھرل کشتے، جواہر، مغز، مہرے، ست
وید، نباض، حاذق حکیم، اور بوڑھے طبیب
ادویہ، کڑوے میٹھے سفوف
آزمودہ جڑی بوٹیاں
قیف، انبیق، صد تجربوں کے ظروف
ان سی گولیاں، ٹکیاں، قرص، جھل ڈبیاں
اور تریاق، مسہل، مرکب، تری پھل
حبوب و لعوب و جوارش

[۱۵] چھپکلی کی طرح لیکن بڑی جسامت کے جاندار۔
[۱۶] سکری = خشکی، خاص کر سر کے بالوں کی خشکی۔

طلا، بام، تکمید
یک قطرۂ آبِ حیواں
گراں بار معجون، محلول، روغن، طباشیر
اکسیر نسخے، مقوی بدرقے، مجرب خمیرے
ولی، پیر، درویش، مجذوب، سنیاسی، باوے
مزارات، درگاہیں، دربار، تکیے
دعا، دھاگے، تعویذ، منتر، نیازیں، چڑھاوے
مناجات، منت، مرادیں
عمل، ٹوٹکے ٹونے، حرمل کی دھونی، وظیفے
مگر آخر کار چھپنے کو آتی مسہری
عزیز و اقارب کی، تیمارداروں کی مایوسیاں
اور بیمار آنکھوں کی زردی میں گھلتی
سمٹتی ہوئی جھریوں سے جھلکتی
قضا کی سیاہی
حزیں اترے چہرے کی پھیکی سفیدی
—— یہ سایہ کناں کتنی صدیوں کی افتادگی
حسرت آمیز افسردگی، دل کی آزردگی
برطرف قوت شامہ و ذائقہ
سامعہ، باصرہ، لامسہ، حافظہ، دافعہ
آخذہ، ماسکہ، نامیہ، مدرکہ
اور آپس میں جڑتی ہوئی پنڈلیاں
حاصلِ زندگی ایک لاحاصلی
بے دلی، جاں کنی، بے حسی، جسم کی مردنی —— رخصتی

(۴۸)
تختۂ غسلِ آخر
گلاب، آبِ زمزم سے نم
خاکِ نجد و نجف سے چھوئے ادھ سلے
اک کفن کی چٹکتی سپیدی
جتا گورکن، بیلچہ، پھاوڑا، ایک اندھا گڑھا
ارتھی، مرگھٹ، چتا
چار کاندھوں پہ رکھا جنازہ
بوئے عود و لوبان و کافور، اگربتیوں کا دھواں
تازہ پھولوں کی بکھری ہوئی چیاں
سورۂ فاتحہ کے چھتر، مغفرت کی دعاؤں کی چھاؤں تلے
سوندھی، بے روح، چپ گاچنی کے[۱۷] —— رخصتی

(۴۹)
دو گزی قبر کی شور کی سادگی
کردہ ناکردہ اعمال بارے
سوال و جواب، احتساب
ایک انوکھا کڑا ماورائے گماں، بے نہایت عذاب مسلسل
ہزاروں سے اٹھنے تلک
یا سفارش پہ منکر نکیروں کی
جنت کی جانب کھلے در، دریچے سے
مرقد کی تنگی کو آسان کرتی معطر ہوا کے ابد تک ہلاروں
—— سے سرشار کرتی ہوئی —— رخصتی

(۵۰)
سدا اسکندری چاٹتے چاٹتے
نحس لمحے میں اخراج یاجوج و ماجوج، بربادیاں
چوڑی گردن
سیہ حبشیوں سی گھنی گھنگھریالی لٹوں
سبز شیشے کی اندھی پتلی والے
یک چشم کذاب دجال کی
ناموافق دلوں،
ارضِ شط العرب، شام کی سرحدوں کے قریں
شرق میں اصفہان و خراساں کے اطراف آمد
نبوت، خدائی کا دعویٰ
شیاطین کو مردہ ماں باپ کی شکل دیتے
بظاہر سرِ آسماں بدلیوں کی طرح تیرتے
اور دنیا میں تیزی سے جگہیں بدلتے
کسی باغ کو اپنا فردوس، الاؤ کو دوزخ بتاتے
نظر بندیوں سے دھواں دھار بارش دکھاتے
درختوں پہ بے موسمی پھل لگاتے
مدینے سے اک دو منازل ادھر
حضرت خضر سے شعبدہ باز ملعون کا سامنا
حضرت خضر کو چیرنا اور پھر جوڑ کر زندہ کرنا
مگر قتل کرنے کی پھر ایک ناکام کوشش

---

[۱۷] چپ = خاموش؛ گاچی = وہ مٹی جس سے لکھنے والی تختی کو لیپتے ہیں، چکنی مٹی۔

فساد، ابتری، کال، فتنے
زکوٰۃ ایک تاوان
امانت بھی مالِ غنیمت
غنائم، وراثت
کہیں باپ پر ظلم، یاروں پہ احسان
شر وجہِ عزت
ہوس کار، عیار اہلِ حکومت
تہی وحی سے راہ گم کردہ کھوئی رسالت
فقط دل ہی دل میں اصولوں پہ اڑنا بہت
دل ہی دل میں برائی سے لڑنا بہت
اور آنکھوں سے نیکی کا دامن پکڑنا بہت
منفعل مبتدی، مبتذل مقتدی
شریروں کی امامت
اور ایسے میں دشتِ غیابت سے اک دن معاً رجعتِ مہدوی فاطمی
مہدی المنتظر مختصر عسکری
اوجِ مینارۂ مشرقی، رجعتِ عیسوی
ارضِ لد، ارمجیدون[18]، دجال کا قتل
انسان کی بیعتِ عیسوی
عظمتِ مصطفائی، رواجِ مسیحائی، یکجائی
نو سال فرماں روائی
جدائی کی نازک گھڑی ـــــ رخصتی

(۵۱)
حقیقت، علامت، نشانی، حکایت، گماں
بولتا جانور، انشقاق القمر اور بادیمن
لوطیوں، ایکیوں[19] اور عادوں، ثمودوں کی بربادیوں کا تسلسل
سرافیل کے صور کی پھونک
ناقوس کی گونج
پرہول آواز، بھونچال، کنکر،
مہیب آندھیاں،
بھاپ دریا، سمندر، بحیرے، خلیج
اڑتے روئی کی صورت کہستان، گرتی عمارات
آفاق و انفاس بے ہول

موقوف آنات، تقویم، اقلیدسی
علمِ تاریخ، جغرافیہ اور جیومیٹری
قرن، یگ، دن، مہینے، صدی
سال و سن، قمریہ، شمسیہ، عیسوی، بکرمی
خون کے رشتے ناتے، روابط، دلوں کے حوالے نلط
فکر شل، گنگ لب
شور سے بہرے ہوتے ہوئے کان
گرتے حمل، قبض روحیں
فقط ساعہ، الغاشیہ، حاقہ، القارعہ
وقتِ معصوم پر وقت کا خاتمہ
ابتلائے قیامت
کہاں اتنی آساں تھی
جنت سے نکلے ہوئے آدمی کی درازیِ کارِ جہاں سے خجل، مضمحل
اپنے رب کی طرف رجعتِ قہقری ـــــ رخصتی

(۵۲)
حشر کی سنسناتی ہوئی خامشی
جانبِ شرق سے اٹھتے شعلے، بگولے
سوئے عرب اولادِ آدم کی پسپائی
قیلولے کی رات
یومِ نشور، احتسابِ عمل، جدولیں، گوشوارے
نکوکاروں کے سیدھے ہاتھوں میں اچھائیوں کی کھتونی
مگر الٹے ہاتھوں میں بدنامیوں کی کھلی جمع بندی
حقوق و فرائض کی پستک
خسارے کے خسرے
بیاہی ہوئی، بن بیاہی ہوئی ماؤں کے نام شجرے
خدا، ربِ کعبہ، خداوند، یزدان، بھگوان، پرمیشور
ـــــ کی حضوری میں حاضر خدائی
گنہگار چہروں پر اعمال نامے کی کالک
خلاف اپنے بے قابو اعضا کی سچی گواہی
خجالت، ندامت، جہنم کی دہشت
مگر خاص بندوں کے نورانی، بشاش چہروں پہ رحمت
رسول، امتیں، امتوں کی شفاعت
مدارات کوثر
ادھر ختم شیطان کی شیطنت
حشر میں موت کی موت

---

[18] یہودیوں اور عیسائیوں کے خیال میں حق و باطل کا آخری معرکہ ارمجیدون کے مقام پر ہوگا۔
[19] ایکیوں = اصحاب ایکہ۔

ادھر پل صراط، اس کے پار ارض زقوم، اعراف، برزخ
در خلد، دار وغہ رضوان
لوح ازل سے مٹی زندگی
روح کی واپسی
خالق دو جہاں کی نیابت، خلافت سے حتمی سبکدوشی
فردوس گم گشتہ،
جنت کے باغوں کو انسان کی واقعی، دائمی ـــــ رخصتی

(۵۳)

دوہڑے، دوبیتے، قطعات، سانیٹ
ہجویں، رباعی، قصیدے، ترانے
کہستانی ٹپے بھی، صحرائی وائی بھی
مشکل پہیلی، حقیقت، سہیلہ، شہادت، ترالے
شمائل، سہاگن، لگن، ہائیکو، چیستاں
منقبت، مرثیے، رزمیے، شہر آشوبے، اوڈ[۲۰]، ہی حرفیاں
کہہ مکرنی، کبت، ساکھیاں، ذکریاں، بارہ ماسے
غزل، قافیے، مطلعے، مقطعے
زمزمے، جھولنے، رخصتی، سہرے
ضرب المثل، قول، میلاد، چوپائی، واراں،
ردیفیں، تعلی، تخلص، لقب، عرف، تلمیح، تمثیلچے
کافیاں، چکیاں، لوریاں، پنکھیاں، ڈھولیاں، چرخ نامے
شگوں، فال نامے
صنائع بدائع، فصاحت، بلاغت، سلاست، اضافت
زبان و بیاں، علتیں، جزم، تشدید، ترکیب، لکنت بھی
تان، انترا، مکھڑا، استھائی بھی
وزن، تقطیع، بحریں، زحافات بھی
حسن ترتیب، آہنگ، دھن، ٹنکری
تال، سر، ٹھمریاں، مرکیاں
انگ، اپ انگ، سم بھنگ، ابھنگ، تربھنگ
بھاؤ، نرت، تھاپ، تھیا،
کتھک، ناٹیم،
تھاتھئی، نرتکی ـــــ رخصتی

(۵۴)

بلدیے، صد عروس البلاد، آسمانوں کو چھوتی عمارات کی منزلیں
چار مینار، قلعے، کلس، کنگرے، برجیاں
اونچی اونچی فصیلیں، اکیلے دوکیلے ستون
مرمریں مقبرے، اونچی کرسی کے ایوان
سراپردہ و خواب گاہیں
طویل آبنائیوں پہ تانے ہوئے پل، بندھے بند، بندر گہیں، زیر آب و
زمیں راستے
بر سر خاک سہ رویہ، سہ منزلہ، شش جہت شاہراہیں
عجوبے، اجنتا، ایلورا، معلق گلستان، اہرام
پیسا[۲۱]، محل تاج، دیوار چیں، تخت طاؤس
ڈھلوان چھت، آہنی گھنٹیاں، بت، سنگھاسن کی اونچائیاں
شوکت منبر و شان محراب، گنبد کی گولائیاں
شوق تعمیر و صورت گری ـــــ رخصتی

(۵۵)

جستجو، شوق، تحقیق، اظہار
تخصیص، حیرت، تجسس
تلاش، آرزو
ذوق فن، سر تخلیق، مشق سخن
ذہن کی دسترس
گائکی، شاعری ـــــ رخصتی

(۵۶)

آہی لیتی ہے آخر
دبے پاؤں انسان کو دہر میں
گھر، گلی، شہر میں
ہر نہاں خانۂ ذات کے پھیر میں
گنبد ہفت افلاک کے گھیر میں گونجتی، سر پھری ـــــ رخصتی

(۵۷)

سست رو، تیز گام
اور خاص اور عام
اس طرف، اس طرف، یعنی چاروں طرف
ناک کی سیدھ میں
ایک ہی راستہ، راستی ـــــ رخصتی ـــــ رخصتی۔

☆☆☆

۲۰۔ Ode
۲۱۔ Pisa، اٹلی کا مشہور شہر جہاں کا مینار خمیدہ مشہور عالم ہے۔

انتظار حسین

ایک تھے کوشک رشی۔ تھے تو رشی، پر انھیں غصہ بہت آتا تھا۔ اور ایسا ویسا غصہ۔ ایسی قہر بھری نظر سے دیکھتے تھے کہ جسے دیکھتے وہ جل کر کوئلہ ہو جاتا تھا۔ بعد میں پچھتاتے بھی تھے کہ یہ میں نے کیا کیا، غریب کو جلا ڈالا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ ایک پیپل تلے بیٹھے تھے اور گیان دھیان میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ایک غریب ہنس کہیں دور سے اڑتا ہوا آیا اور ایک ہرا ابھرا پیپل دیکھ کر اس پر اتر پڑا۔ تھکا ہارا تھا۔ شاخ پہ بیٹھتے ہی اس نے بیٹ کر دی۔ قسمت کی بات کہ عین اس شاخ تلے رشی جی نے دھونی لگائی ہوئی تھی۔ وہ بیٹ ان کے سر پہ آ کر گری۔ اس سے ان کے دھیان میں کھنڈت پڑ گئی۔ بس انھیں غصہ آ گیا۔ اوپر نظر ڈالی۔ دیکھا کہ ایک ہنس بیٹھا ہے۔ اچھا تو اس ہنس نے میرے دھیان میں کھنڈت ڈالی ہے۔ ایسی قہر بھری نظر سے اس ہنس کو دیکھا کہ وہ دم کے دم میں جل کر کوئلہ ہو گیا اور ٹپ سے ان کے سامنے آن گرا۔ یہ دیکھ کر ان کا غصہ تو ہوا ہو گیا، ایک پچھتاوے نے انھیں آلیا۔ ہائے بیچارہ پنچھی۔ بیٹ ہی تو کی تھی۔ ایسا کون سا بڑا پاپ کیا تھا کہ جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھا۔ مجھ مورکھ کو ذرا بھی خیال نہ آیا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ غریب ہنس کی جان لے لی۔

تو کوشک رشی کو ہنس کے جل مرنے کا دکھ تو بہت ہوا۔ اپنے کیے پر بہت پچھتائے۔ پکا ارادہ کیا کہ اب غصہ نہیں کروں گا۔ مگر جب غصہ آنے لگتا تھا تو سب کچھ بھول جاتے تھے۔ بعد میں پچھتاتے تھے۔

ایک دفعہ کی سنو۔ ایک دن اپنے آشرم سے دکشنا لینے کے لئے نکلے۔ بستی میں جا کر ایک گھر کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ گھر والی اس وقت برتن مانجھ رہی تھی۔ اس نے ڈیوڑھی پہ نظر ڈالی تو دیکھا کہ کوئی بوڑھا ہے، سفید جٹائیں، ہاتھ میں کمنڈل۔ سوچا کہ کوئی جوگی ہے دکشنا لینے آیا ہے۔ پکار کے کہا کہ مہاراج تسلی سے بیٹھو۔ برتن بھانڈوں کو دھو مانجھ لوں۔ پھر تمھاری سیوا کروں گی۔

رشی مہاراج ڈیوڑھی میں دھرنا مار کر بیٹھ گئے اور انتظار کرتے رہے۔ کتنے برتن بھانڈے تھے کہ ان کا دھلنا منجھنا ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ جب ختم ہونے میں آیا تو اسی گھڑی گھر والا اپنا کام کاج کر کے واپس آن پہنچا۔ وہ بی بی سارے کام چھوڑ پتی کی سیوا میں لگ گئی۔ لگن لا کے پاؤں دھوئے۔ پھر رسوئی میں جا کے اس کے لئے کھانے کی تھالی بنائی اور اس کے سامنے لا کے رکھی۔ گرمی بہت تھی، کھڑے ہو کر پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ پانی مانگا تو ترت پھرت گئی اور ٹھنڈا جل لا کر رکھ دیا۔ پتی نے بھوجن بہت اطمینان سے کیا۔ وہ اس کی سیوا میں لگی رہی۔

پتی جب بھوجن کر چکا اور جا کر سو گیا تب اسے دھیان آیا کہ ارے ایک جوگی ڈیوڑھی میں آیا بیٹھا ہے۔ وہ دکشنا لے کر لپک جھپک ڈیوڑھی پہ گئی۔ بولی "مہاراج شما کرو۔ تمھیں بہت باٹ دیکھنی پڑی۔ میں تو پتی کی سیوا میں بھول ہی گئی کہ مہاراج ڈیوڑھی میں پدھارے ہوئے ہیں۔"

کوشک رشی اتنا لمبا انتظار کر کے ویسے ہی جھنجھلائے بیٹھے تھے۔ اس کی باتیں سن کر ان کا پارہ اور چڑھ گیا۔ غصے سے بولے "پتی کی سیوا اچھی بات ہے۔ پر گھر پہ آئے برہمن کی سیوا بھی دھرم کا کام ہے۔ میں کب سے اس ڈیوڑھی پر دھرنا دیئے بیٹھا ہوں۔ میں برہمن ہوں، بھکاری نہیں ہوں۔"

اس ناری نے غور سے اسے دیکھا۔ پہچان گئی کہ ارے یہ تو کوشک رشی ہیں۔ بلا کے غصیلے ہیں۔ اور اب انھیں غصہ آنا شروع ہو گیا ہے۔ اس نے ان کے چرن چھوئے اور منت سماجت سے کہا کہ "رشی جی، شما کر دو۔ چوک ہو گئی۔"

مگر رشی جی کا غصہ ایسے کہاں ٹھنڈا ہونے والا تھا۔ ان کا پارہ تو چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جب اس بی بی نے دیکھا کہ یہ تو آپے سے باہر ہونے لگے ہیں تو پھر اس نے بھی ترکی بہ ترکی سنانی شروع کیں۔ بولی، "رشی جی، آپے میں رہو۔ بہت غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کوئی ہنس نہیں ہوں کہ تمھارے غصے سے بھسم ہو جاؤں گی۔ میں ایک برہمن کی دھرم پتنی ہوں۔ پتی کی سیوا میرا دھرم ہے۔ اور پتی کی سیوا سے بڑھ کر کوئی دھرم نہیں ہے۔ سر پہ جھاڑ جھنکاڑ لئے پھرتے ہو ہنس نے اگر بیٹ کر دی تو کون سی قیامت آ گئی۔"

کوشک رشی کو بھلا کب توقع تھی کہ ان کے سامنے کوئی اس طرح بولے گا۔ حیران کہ یہ برہمنی کون بلا ہے؟ سب سے زیادہ وہ اس پر چکرائے کہ اسے ہنس کے جل مرنے کا پتہ ہے۔ حیران کہ اسے کیسے پتہ چلا۔ بولے:

"ہے ناری، تو تو بڑی غصیلی نکلی۔ اور یہ ہنس کے جل مرنے کا تجھے کیسے پتہ چلا۔"

بولی" او رشی جی، کوئی بات چھپی رہا نہیں کرتی ہے۔ تم نے کتنے بھولے پنچھیوں کو اپنے غصے سے جلا کر بھسم کر دیا۔ یہ بات چھپی کیسے رہتی؟ رشی جی، سارا گیان ویدوں پرانوں ہی میں بند نہیں ہے۔ کچھ آتم گیان بھی ہونا چاہئے۔ وہ کیا گیانی ہوا کہ ساری ویدیں پڑھ انھیں چاٹ ڈالیں۔ مگر اپنے آپ پر قابو نہیں ہے۔"

کوشک رشی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے" ہے برہمنی۔ تو جیتی میں ہارا۔ اب میں تجھ سے سکشا لوں گا۔"

"ابھی میں سکشک اپدیشک نہیں ہوں۔ مجھے پتی کی سیوا سے فرصت نہیں ہے۔ میں یہ کام کیا جانوں۔ سکشا لینی ہے تو متھلا جاؤ اور دھرم ویادہ کے چرنوں میں بیٹھو۔ وہ تمھیں بتائے گا کہ دھرم کیا ہے اور ادھرم کیا ہے۔"

بس یہ سن کر کوشک رشی اٹھ کھڑے ہوئے۔ دھرم ویادہ کا نام گرہ میں باندھا اور متھلا کی طرف چل پڑے۔

متھلا پہنچ کر رشی جی نے پوچھنا شروع کیا کہ دھرم ویادہ کا آشرم کہاں ہے؟ ایسا کوئی آشرم ہوتا تو اس کا کوئی پتہ بتاتا۔ جس سے پوچھا اس نے بے خبری کا اظہار کیا۔ ایک بوڑھے باسی نے کہا کہ تم دھرم ویادہ کو پوچھ رہے ہو نہ؟

"ہاں دھرم ویادہ کو پوچھتا ہوں۔"

"تو دھرم ویادہ تو قصائی ہے۔ اس کا آشرم کیوں ہونے لگا؟ اس کی دکان کا پتہ پوچھو۔ وہ یہاں سے اگلی گلی کے نکڑ پر ہے۔"

دھرم ویادہ قصائی ہے، اس پر رشی جی بہت چکرائے۔ انھوں نے یہ بات جاننے سے انکار کر دیا۔ بوڑھے باسی نے کہا کہ ہم نے تمھیں دھرم ویادہ کا پتہ بتا دیا ہے۔ آگے تم جانو۔

رشی جی دبدا میں تھے کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ پھر سوچا کہ چلو چل کر دیکھیں تو سہی کہ معاملہ کیا ہے، تو وہ اگلی گلی کے نکڑ پہ پہنچ گئے۔ گوشت کی ایک دکان نظر آئی۔ اور ایک قصائی جس کے ہاتھ میں بغدہ تھا وہ قیمہ کوٹ رہا تھا۔ انھیں یہ سارا منظر دیکھ کر بہت گھن آئی۔ دل میں کہا کہ یہ قصائی تو وہ دھرم ویادہ نہیں ہو سکتا جس کا برہمنی نے پتہ بتایا تھا۔ ابھی وہ ایسا سوچ رہے تھے کہ وہ قصائی انھیں دیکھ کر دکان سے اٹھا۔ آ کر رشی جی کے چرن چھوئے:

"رشی جی میں جان گیا۔ برہمنی نے آپ کو میرا پتہ بتایا ہے۔ میں تو مہاراج کی باٹ دیکھ رہا تھا۔ چلو میرے گھر چلو۔"

گھر پہنچ کر رشی کو لگا کہ وہ جیسے شانتی کے ڈیرے میں آ گیا ہے۔ وہ قصائی بالکل قصائی لگتا ہی نہیں تھا۔ جیسے پریم کا، شردھا کا، شانتی کا پتلا ہو۔ دھرم کی کیسی کیسی باریک باتیں اس نے رشی کو سمجھائیں۔ پھر بھی رشی کے دل میں ایک کانٹا کھٹک رہا تھا کہ ایسا دھرمی آدمی قصائی کیوں ہے؟ آخر یہ بات زبان پر آ ہی گئی۔

"مہاراج، ایک بات پہ مجھے بہت اچنبھا ہے۔"

"وہ کیا بات ہے؟"

"تم جیسا ودھوان، ویدوں شاستروں میں پیرا ہوا، روز تمھیں پشوؤں کے گلے پہ چھری پھیرنی پڑتی ہے۔ ان کا گلا کاٹتے ہو، ان کی بائیاں بناتے ہو، ان بوٹیوں کو بیچتے ہو۔"

دھرم ویادہ اس پر ہنسا اور بولا۔" رشی جی، یہ سارا سنسار، ہمارا تمھارا سب کا جیون اسی پرکار کا تماشا ہے۔ جڑی بوٹی، سبزی ترکاری، پشو پنچھی سب کا کسی نہ کسی کا کھاجا ہیں۔ اے رشی سن، پراچین کال میں ایک راجہ تھا، راجہ انت دیو۔ بہت نیک، بہت دیالو۔ اس کے رسوئی گھر کے لئے روز کتنے ہزار پشوؤں کے گلے پہ چھری پھرتی تھی۔ دو ہزار تو گائیں ذبح کی جاتی تھیں۔ مگر یہ گوشت اس کے رسوئی گھر میں کم پکتا تھا۔ غریبوں محتاجوں میں زیادہ بانٹا جاتا تھا۔"

"گوئیں بھی!" کوشک کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، "یہ تو بہت دکھ کی بات ہے!"

"ہے رشی، ہر جیو دوسرے جیو کو دکھ دیتا ہے۔ اسی میں جیون بھید چھپا ہوا ہے۔"

کوشک رشی دیر تک سوچ بچار میں ڈوبے رہے۔ پھر سوچ کر بولے

"ہے ودھوان، کیا تو برہمن نہیں ہے۔"

"تھا۔ اب نہیں ہوں۔ مگر پھر ہو جاؤں گا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"ہے رشی۔ میں پچھلے جنم میں برہمن تھا۔ ویدوں شاستروں میں پیرا ہوا تھا۔ پر راجہ سے میری دوستی ہو گئی۔ راجہ شکار پر جاتا تو میں بھی ساتھ جاتا۔ راجہ نے شکار میں بہت ہرن مارے۔ ایک دن اس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ایک ہرن پر تاک کر تیر چلا دیا۔ مگر جب اس نے چیخ ماری تو پتہ چلا کہ وہ تو آدمی تھا۔ کوئی رشی تھا۔ اس نے مجھے سراپ دیا کہ تو اگلے جنم میں قصائی بنے گا۔ میں بہت دکھی ہوا۔ پوچھا کہ میری کھال تو برہمن والی ہے۔ بولا پھر کیا ہوا، قصائی والی کھال بن جائے گی۔ میں نے پوچھا، پھر اپنی کھال میں کیسے واپس آؤں گا؟ بولا، جب تو ایک رشی کو سکشا دے گا تب پھر اپنی کھال میں آ جائے گا۔ سو میں نے پران چھوڑ دیئے اور اگلے جنم میں چلا گیا اور قصائی بن گیا۔ پر اب میں نے ایک رشی کو سکشا دی ہے۔ سو میں اپنی کھال میں واپس چلا جاؤں گا۔ سو اب قصائی تو بنے گا اور میں پھر برہمن بن جاؤں گا۔"

اس پر کوشک رشی بہت پریشان ہوئے۔ بولے،" پھر میں اپنی کھال میں کیسے واپس آؤں گا؟"

"تو اپنی کھال میں ایسے واپس آئے گا کہ تیری طرح کا کوئی برخود غلط رشی تیرے چرنوں میں آ کر بیٹھے گا، تو اسے سکشا دے گا۔ بس پھر تو اپنی برہمن والی کھال میں واپس آ جائے گا اور وہ رشی قصائی کا روپ لے گا۔"

یہ کہہ کر دھرم ویادہ نے جون بدلی، وہ پھر برہمن بن گیا اور کوشک رشی قصائی بن گئے ☆☆☆

غالب کے تین نادر اردو خط

(بنام سید مقصود عالم رضوی پہانی صدر جہانی)

مختار الدین احمد

میران صدر جہاں (متوفی ۱۰۲۰ ہجری/ مطابق ۱۶۱۱ / ۱۶۱۲) ایک ذی علم بزرگ تھے، اکبری عہد میں مدتوں شاہی لشکر میں قاضی کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ اکبر نے کچھ علما کو ہندوستان سے نکال کر مکۂ معظمہ بھیج دینے کا حکم دیا۔ بخشی نظام الدین احمد نے ان کی فہرست مرتب کی۔ ایک دن صدر جہاں کہنے لگے کہ اس فہرست میں کہیں میرا نام تو شامل نہیں ہے؟ بخشی نظام الدین احمد نے جواب دیا کہ آپ کو بادشاہ کیوں ملک سے باہر بھیجنے لگا کہ آپ کی زبان سے کبھی کلمۂ حق نکلا ہی نہیں جو اخراج کا سبب بنتا۔

عبدالقادر بدایونی نے ان کی دنیاداری اور حب جاہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ انھوں نے شعر گوئی سے توبہ کر لی ہے اور امید ہے کہ اس طرح وہ لاف و گزاف سے بھی توبہ کر لیں گے (''منتخب التواریخ'' ۳/ ۱۴۲)۔ جب جہانگیر کا عہد آیا اور حالات میں تبدیلی ہوئی تو انھوں نے بھی مذہبی بے راہ روی سے توبہ کر لی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ (۱۵۶۴ تا ۱۶۲۴) کے کئی مکاتیب ان کے نام ہیں جن میں انھیں مذہبی حمیت کا حامل بتایا گیا ہے جو ان کے تائب ہونے کا ثبوت ہے۔ ان مکاتیب کا تعلق عہد جہانگیری سے ہے(۱)۔

غالب کے مکتوب الیہ سید مقصود عالم رضوی انھی صدر جہاں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ اور ان کے خاندان کے کچھ اصحاب اپنے نام کے ساتھ صدر جہانی لکھتے تھے۔

''پہانی'' لکھنؤ کے مضافات کا ایک قصبہ ہے۔ اس سرزمین سے متعدد اہل علم و دانش پیدا ہوئے۔ یہاں کے بعض شعرا کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔ بعض کتابوں میں قصبہ ''پہانی'' کو ہائے مخلوط کے ساتھ لکھ کر ''پھانی'' بنا دیا ہے۔ مطبع نول کشور کی بعض مطبوعات ''سخن شعرا'' وغیرہ میں اسی طرح نظر سے گذرا۔ اسی طرح، ''خمخانۂ جاوید'' میں سید مقصود عالم کو ''تھانوی'' لکھ دیا ہے (۳/ ۸۲)۔

اب رہے سید مقصود عالم، تو ان کے بارے میں بعض تذکرہ نگاروں کے بیانات درج کیے جاتے ہیں:

سید علی حسن خاں ''صبح گلشن'' میں لکھتے ہیں (۲):

> مولوی مقصود عالم خلف مولوی سید عالم مسرور، وطن پہانی متعلقہ لکھنؤ۔ اسی قصبے میں صدر جہاں کا بھی وطن تھا جو اکبر بادشاہ کے منصب داروں میں مشہور ہیں۔ فارسی میں اپنے والد ماجد کے، اور اردو میں نواب عاشور علی خاں لکھنوی کے شاگرد تھے اور بڑھاپے میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شاگردی کی تمنا میں دہلی پہنچے اور پچاس سے زیادہ تصانیف مثلاً مثنوی ''شکرستان معنی''، ''سکندر نامہ''، ''مقصود الصنائع'' وغیرہ اپنی یادگار چھوڑ کر پچاس سال کی عمر میں انتقال کیا۔

کلب حسین خاں نادر تحریر کرتے ہیں (۳):

> مقصود۔ شمس الشعرا سید مقصود عالم رضوی پہانوی

شاگرد نواب عاشور علی خاں صاحب بہادر، صاحب دواوین ہندی و فارسی و مثنویات و انشا و عروض و شرح و دیگر تصانیف کثیرہ۔ ان کے خاندان میں علم و فضل ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔

پھر صاحب تذکرہ نے ان کے یہ اشعار درج کیے ہیں ۔

سرو و شمشاد سے ہے وہ قد آزاد الگ
جیسے مضموں کسی شاعر کا خدا داد الگ
دوست وہ ہے کہ رہے دوست کا مشکل میں شریک
مجھ سے فرقت میں نہ ہو اے دل ناشاد الگ
دیکھ کر تیرگیاں غمکدۂ عاشق کی
ڈر گیا یہ کہ ہوا جسم سے ہمزاد الگ
کشور ہند میں مقصود ہر اک شاعر سے
میرے استاد میں ہیں وصف خداداد الگ

عبدالغفور نساخ نے مقصود کے ترجمے میں صرف دو سطریں لکھی ہیں جن میں ان کی ایک مثنوی اور دیوان اردو و دیوان فارسی کا ذکر کیا ہے (۴)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دواوین اردو و فارسی مرتب تھے۔ افسوس کہ آج ان کا پتہ نہیں۔ نمونۂ کلام میں نساخ نے دو شعر، "خداداد الگ" اور "دل ناشاد الگ" درج کیے ہیں۔ تذکرۂ نادر میں اس غزل کے پانچ شعر نقل ہوئے ہیں۔

تذکرۂ "آفتاب عالمتاب" اور کچھ دوسرے معاصر تذکروں میں بھی تلاش سے ان کا ذکر مل سکتا ہے، لیکن قیاس غالب ہے کہ ان میں انھی معلومات کا اعادہ ہوگا۔ مالک رام نے ممکن الحصول تذکرے سامنے رکھ کر مقصود عالم کے حالات لکھے ہیں۔ یہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

> مولوی سید مقصود عالم رضوی پہانوی، خاندان سادات میں سے تھے۔ لکھنؤ کے مضافات میں قصبۂ پہانی کے رہنے والے تھے۔ یہ وہی پہانی ہے جہاں کے میراں صدر جہاں تھے جو اکبر بادشاہ کے عہد میں اول ممالک محروسہ کے منصب افتا پر اور بعد کو عہدۂ صدارت پر مقرر ہوئے۔ جہانگیر نے ایام شاہزادگی میں ان سے چہل حدیث کا درس لیا تھا۔
>
> مقصود نے فارسی میں اپنے والد بزرگوار سے اور اردو میں نواب عاشور علی خاں بہادر لکھنوی سے مشق سخن کی۔ سن کہولت میں غالب کی خدمت میں اصلاح کی درخواست لے کر دلی پہنچے۔ غالب نے انھیں "شمس الشعرا" کا خطاب دیا اور ان کا کلام بنظر اصلاح دیکھا۔ پچاس برس کی عمر میں وفات پائی۔ مثنوی "شکرستان معنی"، "سکندر نامہ"، "مقصود الصنائع" وغیرہ پچاس کے قریب کتابیں لکھیں۔ بقول نادر، صاحب دواوین ہندی و فارسی و مثنویات و انشا و عروض و شرح و دیگر تصانیف کثیرہ تھے (۵)۔

مقصود عالم، صاحب تصانیف کثیرہ تھے لیکن آج ان کی کتابیں عنقا کا درجہ رکھتی ہیں۔ فارسی و اردو دیوان مرتب تھے، آج ان کا بھی پتہ نہیں۔ مالک رام نے "تلامذۂ غالب" کے طبع اول (جالندھر، ۱۹۵۷) میں ان کے پانچ اردو شعر درج کیے تھے۔ پچیس تیس سال کے بعد جب اس کا دوسرا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن دہلی سے نکلا تو ان کے بائیس شعر درج تھے۔ حالات و اشعار کے لیے جن تذکروں کے حوالے انھوں نے دیے ہیں، ان کے مصنفین کو بھی مقصود کے دواوین نہیں ملے۔

ایسا لگتا ہے کہ مالک رام کو دیوان اردو کا ایک ناقص الاول نسخہ ملا تھا، کس واسطے کہ انتخاب اشعار میں اچھے خوبصورت شعروں کی جگہ حروف ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، کی ردیف کے خاصے بے مزہ اشعار درج ہیں (زلف سیہ فام سے غرض، بچھو سے ارتباط، زندگانی وقت نزع، پائے چراغ، قاتل کی طرف، شرماتے ہیں معشوق، خداداد الگ)۔ مالک رام کی مجبوری یہ رہی ہوگی کہ انھیں یہی شعر ملے۔ ہاں اس کے بعد ردیف یا کی ایک غزل (آدمی تم سے، پری تم سے) انھوں نے درج کی ہے، جو "خم خانۂ جاوید" یا کسی اور تذکرے سے انھوں نے لی ہوگی۔

مقصود کے سنین ولادت و وفات معلوم نہیں۔ معاصر تذکرہ نگاروں کے یہاں بھی نہیں ملتے۔ اودھ اخبار اور اس عہد کے دوسرے اخبارات میں ممکن ہیں تلاش سے مل جائیں۔

سید مقصود عالم کے والد سید صدر عالم بھی شاعر تھے، مسرور تخلص کرتے تھے۔ غالب سے عمر میں بڑے ہوں گے جبھی وہ انھیں "قبلہ و کعبہ" لکھتے ہیں: ("قبلہ و کعبہ جناب مولوی صدر عالم صاحب کی خدمت میں تسلیم عرض کرتا ہوں")۔ ان کے کچھ فارسی و اردو شعر میری نظر سے گذرے ہیں، یہ کسی موقع پر پیش کیے جائیں گے۔ ان کے ایک بیٹے سید خورشید عالم تھے جو بقول نساخ، مسرور تخلص کرتے تھے (۶)۔ سید صدر عالم مسرور کے ایک بیٹے، سید مقبول عالم مقبول تھے یہ سید مقصود عالم مقصود کے چھوٹے بھائی تھے۔ "سخن شعرا" میں ان کا یک سطری ترجمہ ملتا ہے اور ایک شعر (۷):

> مقبول تخلص، سید مقبول عالم خلف سید بدر عالم (۸) باشندۂ پہانی، شاگرد مقصود عالم مقصود (۹)۔
>
> رخ سے اک تازہ شگوفہ وہ کھلا جاتے ہیں
> غنچۂ گل ہوتے ہیں گل شرم سے کھلاتے ہیں (۱۰)

ان کی مرتب کردہ ایک کتاب کے سرورق پر جس کا ذکر آگے آ رہا ہے انھیں "نثار عدم المثال، ناظم بدیع الخیال، سلالۂ خاندان شرف و کرم، سید مقبول عالم زاد اللہ کمالہ و افضالہ" لکھا ہوا ملتا ہے۔ زیر نظر مضمون کی بنیاد انھی کی ایک کتاب پر ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

(۲)

سید مقصود عالم پہانوی کا نام پہلی مرتبہ میں نے آج سے بہت عرصہ

پہلے مولوی مہیش پرشاد، بنارس (متوفی ۱۹۵۱) کی ایک تحریر میں دیکھا۔ قاضی عبدالودود (۱۸۹۶ تا ۱۹۸۴) کے رسالۂ ''معیار'' کے شمارہ ۵، ۶ (جولائی اگست ۱۹۳۶) میں ''استفسارات'' کے تحت ان کی حسب ذیل آٹھ سطری تحریر چھپی تھی:

> مرزا غالب کے متعلق تحقیقات کے سلسلے میں کتب ذیل کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں، اگر کسی صاحب کے علم میں یہ کتابیں کہیں موجود ہوں تو براہ کرم براہ راست یا ''معیار'' کے ذریعے سے مجھے مطلع فرمائیں... مثنوی ''دمغ الباطل''، ''معارضۃ النثر'' از سید مقصود عالم پھانوی (کذا) نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۶۱، مثنوی ''خطاب فاصل''۔ مہیش پرشاد، ڈاکخانہ لنکا، بنارس۔

مولوی مہیش پرشاد کو ''معارضۃ النثر'' کی طباعت کا علم تھا (وہ سید مقصود عالم کو اس کا مصنف سمجھتے تھے، حالانکہ اس کتاب کے سرورق پر ''از تالیف نثار عدیم المثال، ناظم بدیع الخیال، سلالۂ خاندان شرف و کرم، سید مقصود عالم زاد اللہ کمالہٗ و افضالہٗ'' درج ہے)۔ لیکن کتاب سنہ ۱۹۳۶ میں ان کی نظر سے گزری تھی، نہ اس کے بعد، ورنہ اس میں غالب کے جو تین اردو خط نقل ہوئے ہیں، انھیں ''خطوط غالب'' جلد اول (الہ آباد ۱۹۴۱) میں وہ ضرور شائع کرتے۔ یہ خطوط اگر انھیں بعد کو بھی مل جاتے تو یہ دوسری جلد کے مسودات میں ہوتے، اور ''خطوط غالب'' مرتبہ مہیش پرشاد، مالک رام (سرفراز قومی پریس، لکھنؤ ۱۹۶۲) میں شامل ہو جاتے۔

سنہ ۱۹۵۰ اور اوائل ۱۹۵۱ میں مہیش پرشاد انجمن ترقی اردو ہند کے جلسوں میں شرکت کے لیے علی گڑھ آتے رہے اور قاضی عبدالغفار مرحوم (۱۸۹۰ تا ۱۹۵۶) کے ساتھ آفتاب منزل (نزد شمشاد مارکیٹ) میں مقیم ہوتے رہے۔ میری ان سے زیادہ تر ملاقاتیں وہیں ہوئیں۔ اس وقت تک کتاب ''معارضۃ النثر'' انھیں نہیں ملی تھی، اور وہ بدستور اس کی تلاش میں تھے۔ ۳۰ اگست ۱۹۵۱ کو وہ الہ آباد میں وفات پا گئے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (۱۸۸۵ تا ۱۹۷۲) کی توجہ سے غالب کے متعلق ان کا ذخیرۂ کتب و کاغذات ان کے اعزا سے حاصل ہوا اور کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ میں محفوظ کر دیا گیا۔ قاضی عبدالغفار صاحب کی عنایت سے مالک رام صاحب کی نظر سے یہ ذخیرہ گذرا تھا۔ اس میں کتاب ''معارضۃ النثر'' موجود نہ تھی۔

اس بات کے جاننے کا میرے پاس اب کوئی ذریعہ نہیں کہ ''معارضۃ النثر'' اور اس کے مندرجات کی اطلاع مولوی مہیش پرشاد کو پہلے ہوئی (جو اس زمانے میں غالب کے خطوں کی تلاش میں سرگرداں تھے) اور انھوں نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کو اس کی اطلاع دی (جو خطوط غالب کی جمع آوری، ان کی ترتیب و تصحیح و تکمیل میں ان کی مدد کر رہے تھے)، یا ڈاکٹر صدیقی جیسے محقق اور نوادر کے شائق کو اس کتاب کے وجود اور اس میں غالب کے خطوط کی شمولیت کی اطلاع تھی اور انھوں نے مولوی مہیش پرشاد کو اس کی اطلاع دی اور انھیں اس کی تلاش میں لگایا۔ بہر حال رسالۂ ''معیار'' میں ان کے استفسار کی اشاعت کے بعد قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، مالک رام بھی اس کتاب کی تلاش میں رہے، لیکن انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، سید احمد خاں، مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی اور دوسرے غالب کے متخصصین کو اگر اس کتاب کی اطلاع تھی اور وہ بھی اس کی تلاش میں تھے، تو قریب بہ یقین ہے کہ انھیں بھی یہ کتاب حاصل نہ ہو سکی ورنہ یہ اصحاب اس کا کسی مضمون میں ذکر ضرور کرتے اور خطوط تو بہر حال شائع کر دیتے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی مرتب کردہ ''غالب کے خطوط'' میں، جس میں غالب کے ۸۸۶ خطوط ہیں (''غالب کے خطوط''، مرتبہ خلیق انجم، ۴/ ۱۴۱۳)، غالب کے مکتوب الیہ سید مقصود عالم اور ان کے خطوط کا کوئی ذکر نہیں۔

(۳)

مجھے غالب سے دلچسپی ۱۹۴۰ میں شروع ہوئی۔ ''غالب کی تاریخ گوئی''، ''ادبی دنیا'' لاہور (مارچ ۱۹۴۰) میں، ''غالب کے چند غیر مطبوعہ اشعار''، ''ہمایوں'' لاہور (جنوری ۱۹۴۱) میں، اور ''مرزا غالب کا کچھ نایاب کلام'' ''سالنامہ ''ادبی دنیا'' ۱۹۴۱ میں شائع ہوئے۔ اسی زمانے میں میں کتاب ''معارضۃ النثر'' اور اس کے مولف کے نام سے آشنا ہوا اور اس کی تلاش شروع کی۔ عظیم آباد کے کتب خانوں اور اصحاب ذوق کے ذاتی ذخیروں میں نہیں ملی۔ سنہ ۱۹۴۳ میں علی گڑھ آیا، لٹن لائبریری، کتب خانۂ حبیب گنج، کتب خانۂ رضائیہ رام پور میں اس کا پتہ نہیں چلا۔ ۱۹۵۳ میں یورپ گیا تو برٹش میوزیم، انڈیا آفس لائبریری، باڈلیان (Bodleian) آکسفرڈ، میں اسے تلاش کیا۔ ہالینڈ، جرمنی اور فرانس کے کتب خانوں میں بھی اسے ڈھونڈتا رہا۔ کہیں نہیں ملی۔ جب پنجاب یونیورسٹی لاہور اور ڈھاکہ یونیورسٹی جانے کا موقع ملا تو وہاں بھی اس کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ کہیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔

کبھی کبھی کوئی نعمت، کسی دور علاقے سے اچانک بھی مل جاتی ہے۔

ابھی کچھ مہینے پہلے ایک قدیم کرم فرما ڈاکٹر محمد اقبال مجددی صدر شعبۂ تاریخ اسلامیہ کالج لاہور کا خط موصول ہوا:

> رسالہ ''معارضۃ النثر'' جو آنجناب کو عرصۂ دراز سے درکار ہے کا عکس بھیج رہا ہوں۔ افسوس کہ میرا نسخہ ناقص الآخر ہے۔ جس قدر موجود ہے اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بنوالی گئی ہے۔ اگر کہیں سے کسی دوسرے نسخے کا سراغ ملا تو اس کی تکمیل کی کوشش کروں گا۔ مجھے غالب سے کوئی مناسبت نہیں ہے، میرے پاس یہ رسالہ صرف اس لیے محفوظ رہ گیا کہ اس کے مرتب سید مقبول عالم مقبول ساکن بلدہ پھانی صدر جہانی کے خانوادے سے دلچسپی ہے۔ دراصل ان کے جد اعلیٰ میراں صدر جہاں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کے مکتوب الیہ تھے۔ بدایونی کے یہ الفاظ کہ انھوں نے شعر گوئی سے توبہ کر لی ہے، سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعر تھے اس لیے ان کے

خانوادے میں شعر و شاعری کا چرچا رہا۔ میں میراں صدر جہاں کے اور ان کے خانوادے کے حالات جاننا چاہتا ہوں۔ ان کے خاندان کے افراد میں سے کسی نے ان پر کوئی کتاب یا مقالہ لکھا ہوگا۔ اگر کوئی ماخذ میراں صدر جہاں کے حالات پر آپ کے پاس ہو تو نشان دہی فرمائیے۔ مقبول عالم مقبول کی نسبت "صدر جہانی" سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ان کی اولاد میں سے تھے۔ مجھے میراں صدر جہاں کے عقائد کے موضوع سے دلچسپی ہے۔ کیا وہ شیعہ تھے؟ لیکن حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوب سے تو ایسا عیاں نہیں ہوتا۔ انھیں حمیت دین کا احساس دلایا گیا ہے۔

اس طرح ساٹھ ستر سال کے بعد رسالۂ "معارضۃ النثر" کے دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ افسوس اس کا ہے کہ نسخۂ مملوکہ ڈاکٹر محمد اقبال مجددی ناقص الآخر ہے۔ مجھے صرف ابتدائی ۲۴ صفحوں کے عکس حاصل ہوئے۔ ان میں بھی آخری تین صفحات کے بیشتر حصے غائب ہیں، صرف چند سطریں پائی جاتی ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ صفحہ ۱۹، ۲۰، جن میں غالب کے خط درج ہیں، محفوظ ہیں، اگرچہ بعض الفاظ و فقرات دریدہ اور ضائع شدہ ہیں۔ لیکن جو کچھ موجود ہیں وہ غنیمت ہیں۔

کتاب ایک علیحدہ مضمون کی مقتضی ہے۔ یہاں چند ضروری امور درج کیے جاتے ہیں۔ کتاب بڑی تقطیع پر مطبع منشی نول کشور لکھنؤ میں ۱۸۶۱ میں چھپی ہے۔ سطور ۲۵ فی صفحہ، سال تالیف ۱۸۶۱۔ مولفہ سید مقبول عالم المتخلص بہ مقبول ساکن بلدۂ طیبۂ پہانی صدر جہانی۔ رسالے کا نام نواب احمد حسین خان جوش نے تجویز کیا تھا اور تاریخ تالیف "فخر شعرائے عرب و عجم، رشک افزائے کلام... طالب جناب مستطاب استادی نواب اسد اللہ خاں صاحب المتخلص بہ غالب" نے لفظ "رستخیز" سے نکالی ہے۔

وجہ تالیف، ایک ادبی و لغوی بحث ہے۔ منشی حبیب اللہ تارک تخلص خلف منشی حفیظ اللہ، ساکن سید بارہ کہ محلہ ایست از شہر شاہ آباد، مملو از صاحبان اہل ہنر و اہل استعداد، نے اپنے بھائی محراب علی کو ایک خط لکھا تھا جس میں لفظ "ابتشار" استعمال ہوا تھا۔ اب لکھنؤ میں یہ بحث چھڑ گئی کہ "بشارت" سے افتعال کا وزن "ابتشار" درست ہے یا نہیں؟ اس میں مقصود عالم اور ان کے خاندان کے لوگوں نے حصہ لیا اور استفسارات تیار کر کے علمائے کرام، مجتہد العصر سید محمد، مفتی محمد عباس، مدرس العلماء میرزا محمد علی، زبدۃ العلماء مولوی احمد علی، اطبائے کرام میں طبیب حاذق محمد جعفر خاں بہادر مہتمم دار الشفائے شاہی، حکیم علی حسنین، حکیم محمد علی، حکیم حیدر علی، حکیم علی اکبر، حکیم مظفر حسین خلف الصدق حکیم مسیح الدولہ، زبدۃ الحکماء حکیم سید مرزا خاں بہادر وغیرہ، اور شعرائے عظام میں مرزا عاشور علی خاں عاشور، حسین مرزا، مظفر علی خاں اسیر، مہدی علی خاں زکی، سلامت علی دبیر، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی کو بھیجے اور جواب منگوائے۔ "معارضۃ النثر" انھی استفسارات و جوابات کا مجموعہ ہے۔

سید مقصود عالم مقصود نے اپنے استاد میرزا غالب کی خدمت میں بھی یہ استفسار بھیجا تھا۔ میرزا کے تین خط اسی استفسار کے جواب میں ہیں۔ یہ تینوں خطوط اگلے صفحات پر درج کیے جاتے ہیں ☆☆☆

حواشی

(۱) ڈاکٹر محمد اقبال مجددی: "مقامات معصومی" ۱/ ۳۲ (لاہور ۲۰۰۴)۔ مرتب نے صدر جہاں کے حالات کے لئے حسب ذیل کتب کے حوالے دیئے ہیں، بختاور خان: "مرآۃ العالم" ۲/ ۴۳۵، محمد صادق ہمدانی کشمیری: "طبقات شاہجہانی" ۹/ ۴۷، بدایونی: "منتخب التواریخ" ۳/ ۱۴۱، عبدالحی حسنی: "نزہۃ الخواطر" ۵/ ۱۷۸

(۲) سید علی حسن خاں: "صبح گلشن" ص ۵۲ مطبع شاہجہانی بھوپال ۱۲۹۳ ہجری

(۳) کلب حسین نادر: "تذکرۂ نادر" ص ۱۵۰ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ ۱۹۵۷

(۴) عبدالغفور نساخ: "سخن شعرا" ص ۴۵۴ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۴

(۵) مالک رام: "تلامذۂ غالب" ص ۵۰۰ طبع دوم، دہلی ۱۹۸۴

(۶) "سخن شعرا" ص ۴۳۲۔ باپ بیٹے دونوں کا تخلص مسرور کس طرح ہوگا؟ "خمخانۂ جاوید" میں ان کا تخلص خورشید لکھا ہے (۳/ ۸۲) اور ان کے چار شعر (اشارہ ہوگیا، صف آرا ہوگیا) درج کیے ہیں۔ دوسری جگہ عبرتی لکھا ہے (۵/ ۵۷۳)۔ میرا خیال ہے کہ پہلے ان کا تخلص خورشید ہوگا، بعد کو انھوں نے اپنا تخلص عبرتی کر لیا ہوگا۔ لالہ سری رام، خورشید عالم خورشید اور خورشید عالم عبرتی کو بظاہر دو علیحدہ علیحدہ شخص سمجھتے ہیں اور ان کے حالات دو مقامات پر لکھے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ دو نہیں، ایک ہیں۔

(۷) عبدالغفور نساخ: "سخن شعرا" ص ۴۵۳

(۸) صحیح نام سید صدر عالم۔

(۹) غالب سے بھی انھیں شرف تلمذ حاصل ہوگا۔ وہ اپنی کتاب "معارضۃ النثر" میں انھیں "استاذی" لکھتے ہیں۔ ان کے غالب کے شاگرد ہونے کا ذکر کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔

(۱۰) "سخن شعرا" میں چھاپے کی غلطی سے شعر مسخ ہوگیا ہے۔ قیاسی تصحیح کر دی گئی ہے۔

مکتوب غالب بنام مقصود عالم

(۱)

سید صاحب جمیل المناقب رفیع الشان مولوی مقصود عالم صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ قبلہ وکعبہ،

خط کا سپاس گذار ہوں اور آپ کا منت پذیر کہ مجسا گوشہ... کس میرس... قابل خطاب گنا گیا۔ حضرت پر روشن ہے کہ اس مصرع مشہور کے موافق ۔ درعلم لغت فرشتہ عاری، یہ علم بیکراں ہے، قیاس بیکار ہے... پراس کا مدار ہے۔ میں کلکتہ میں تھا، مدرسۂ سرکار کمپنی میں بزم امتحان آراستہ ہوئی، پوچھا گیا کہ اشتقاق کا ثلاثی مجرد کیا ہے، ایک صاحب... کہلاتے تھے، بے تامل بول اوٹھے کہ شتق۔ کیا کہوں کیا اونکی ہنسی ہوئی۔ یہ خوبی قیاس کی ہے۔ قرطاس استفتا پر نواب مصطفیٰ خاں حسرتی شیفتہ جامع تذکرۂ گلشن بیخار کے دستخط ہیں، اور فقیر نے بھی کچھ لکھ دیا ہے۔ میں خانہ زاد علی بن ابیطالب کا بندہ ہوں، ہر سید و سید زادہ کو اپنا خداوندزادہ سمجھتا ہوں، آپ کا خط میرے واسطے سجل افتخار و توقیع نجات ہے۔

غالب یکرنگ مرقومہ صبح یکشنبہ ۱۸ نومبر [۱۸۶۱] و بحساب رویت ۴ جمادی الاول(۱) [۱۲۷۷](۲)۔

کتب لغات میں، جیسا کہ نواب مصطفیٰ خان لکھتے ہیں، ابتشار کا نشان نہیں۔ ظاہرا مدعی صحت لفظ کا ماخذ سوائے اوس کے قیاس کے اور نہ ہوگا۔ ہاں ابتشار تصحیف ہے انتشار کی، اگر حواس کے انتشار میں ابتشار [کی] صورت نظر آ گئی ہو تو کچھ بعید نہیں۔

نجات کا طالب، اسد اللہ خان غالب

۱۲۶۹
لب
یااسداللہ الغا

---

(۱) جمادی الاولیٰ ہونا چاہیئے، جمادی الاول کتابت کی غلطی نہیں ہے۔ میرزا غالب اسی طرح لکھتے تھے۔ دیکھئے عکس مکتوب غالب بنام نواب کلب علی خان ("خطوط غالب"، ۳/۱۳۰۲)۔

(۲) یہاں پر غالب نے نواب شیفتہ کی تحریر درج کردی ہے جو حسب ذیل ہے:

ابتشار مسموع نیست، وقیاس را در لغت دخل نے۔ والسلام، العبد الراجی محمد المدعو بمصطفیٰ خان ختم اللہ لہ بالخیر۔

(۲)

اشرف السادات سید العلما جناب سید مقصود عالم صاحب،

میری بندگی قبو[ل ہو]...آپ کی... پڑی ہے۔ وہ اعتراض کہ جس کو سعدی و نظامی بھی نہ اوٹھا سکیں بشرط فرصت اگر تکیہ [؟]...و بتکلیف، و سر، و دل، و چشم، و دست، و پا، ان کا اوٹھانا برداشتن ہے اور خاستن جو لازمی ہے...علم، یہ انگیختن کے تحت حکم میں [ہے؟]۔ ہندی میں یہ تفرقہ مرعی نہیں ہے، بار، و تکلیف، و زحمت، ہر چہ باشد اور...فارسی کو تابع ہندی کرنا... تکلیف انگیز ند مغلطہ اور مضحکہ بھی ہے (۱)۔ جمع کی خبر بہ صیغۂ مفرد غلط... محض غلط (۲)۔ محبوب القلبی (۳)...ہے وہ درست۔ قلب اسم جنس اور لام استغراق کا، اس تعمیم میں متکلم کی تخصیص غلط۔ دعائیہ فقروں....بہت مستحسن۔ سید مقبول عالم صاحب تاریخ کی فکر کیوں کریں۔ رستخیز کے ۱۲۷۷ ہوتے ہیں، اسی لفظ کو سال قرار دیں ۔ والی اقلیم [ولایت علی]، کیا اچھا سجع ہے۔ قبلہ و کعبہ جناب مولوی صدر عالم صاحب کی خدمت میں تسلیم عرض کرتا ہوں۔

جمعہ ۱۲ جماد[ی] الاول [۱۲۷۷ ہجری] و ۳۰ نومبر [۱۸۶۱]

---

(۱) یہ پانچ چھ سطریں صحیح طور پر پڑھی نہیں جاتیں۔ کاغذ بری طرح پھٹا ہوا ہے، الفاظ ضائع ہو گئے ہیں۔ لیکن غالب کے تیسرے مفصل خط کی عبارت محفوظ ہے اور مشتبہ کلمات وہاں واضح ہیں۔

(۲) سید محمد مقصود عالم نے ''علمائے اعلام و فضلائے کرام'' سے پہلے استفسار میں صرف لفظ ''ابتشار'' کی صحت و عدم صحت کے متعلق سوال کیا تھا (''معارضۃ النثر'' ص ۸)۔ دوسرا استفسار انھوں نے ''علمائے اعلام و فضلائے کرام'' کے ساتھ ''شعرائے شعری وقار و منشیان نثری نثار'' کی خدمت میں بھی بھیجا۔ اس میں منشی حبیب اللہ کے مکتوب بنام محراب علی کی عبارتوں کے دوسرے اسقام و اغلاط کی نشان دہی کر کے اصحاب علم و فن کی رائے دریافت کی گئی ہے۔

منشی حبیب اللہ نے لکھا تھا: ''آغا علی و عبد العلی و ولایتی بیگم بخدمات بزرگان تسلیمات می رسانند''۔ اعتراض مقصود عالم کا یہ تھا کہ آغا علی و عبد العلی و ولایتی بیگم، مبتدا ہے۔ اس کی خبر بصیغۂ جمع آنی چاہیے۔

(۳) منشی صاحب کے مکتوب میں یہ فقرہ تھا: ''بمطالعہ اعزی اعتصادی محبوب القلبی سید محراب علی صاحب موصول باد۔'' اس میں اعتراض تھا: ''محبوب القلبی، لفظ القلب معرف باللام واقع شدہ پس اضافت آں بجانب یاء متکلم بموجب قانون نحوی محظور و ممنوع۔''

مکتوب غالب بنام مقصود عالم

(۴)

مخدوم مکرم و معظم جناب سید مقبول عا[لم صاحب] دامت برکاتہٗ

حضرت، کل بروز جمعہ ۱۶ جمادی الاول کو آپ کا خط آیا۔ کل ہی اوسکا جواب کاغذ استفتا پر لکھ کر بھیج دیا۔ کاغذ بہت تنگ قماش [تھا]، دوسری طرف جو لکھا گیا ہے کیا عجب کہ اچھی طرح نہ پڑھا جائے۔ ناچار آج دو باتوں کو مکرر لکھتا ہوں اور ایک بات کی توضیح کرتا ہوں۔ مادۂ تاریخ رستخیز ہے۔ سجع یہ خوب ہے ۔ [وا]لی اقلیم ولایت علی۔ لطف اور تکلیف کے واسطے برداشتن ہے نہ انگیختن (۱)۔ گرد و غبار کے واسطے انگیختن ہے نہ برداشتن۔ علم ونشان کے واسطے انگیختن بھی ہے، افراختن اور اوسکا مبدل افراشتن بھی ہے۔ فتنہ و شور کا استعمال صرف انگیختن کے ساتھ ہے، برداشتن ٹکسال باہر۔ بوجھ کے واسطے برداشتن ہے، انگیختن ہرگز نہیں۔ دل اوٹھانا، اس کے واسطے دل برداشتن ہے نہ انگیختن۔ اگر کوئی کہے کہ سعدی کہتا ہے ۔

تولاے مردان این پاک بوم
برانگیختم خاطر از شام و روم

یہ اور بات ہے۔ یہاں برداشتن ہرگز درست نہیں ہے یہ محل انگیختن اور برانگیختن ہی کا ہے۔ تفصیل یہ کہ از جا برانگیختن روزمرہ ہے، یعنی آمادۂ حرکت کردن۔ تولا فاعل، خاطر مفعول، انگیختن فعل: تولای مردم شیراز خاطرم از مصر و شام برانگیخت۔ مصر و شام محل انگیختن۔ حاصل گفتگو یہ کہ لطف و زحمت کے ساتھ انگیختن بجاے برداشتن فردوسی کے عہد سے حزیں تک کسی نے نہیں لکھا اور قیامت تک کوئی نہ لکھے گا۔ اگر کوئی لکھے تو قیامت ہے۔ ایسا ہی حال ہے ذوی العقول کی جمع کا صیغۂ مفرد کے ساتھ۔

والسلام والاکرام صبح شنبہ ۱۸ جمادی الاول [۱۲۷۷ ہجری] و یکم دسمبر [۱۸۶۱] سال رستخیز

---

(۱) مکتوب حبیب اللہ: ''بشرط فرصت اگر ایں تکلیف بر خود انگیزند''۔

گرمی کی شام

منیب الرحمٰن

پیڑوں سے دھوپ پچھلے پہر کی پھسل گئی
سورج کو رخصتی کا افق سے پیام ہے

پھیلا ہوا ہے کمرے میں احساس بے حسی
خاموشیوں سے بے سخنی ہم کلام ہے

آہٹ ہو قفل کھلنے کی دروازہ باز ہو
آنکھوں کو اب یقین ہے یہ امید خام ہے

یہ عمر ست گام گذرتی ہے اس طرح
ہر آن دل کو وقت شماری سے کام ہے

رہتی ہے صرف اس سے تصور میں گفتگو
آرام گاہ روح میں جس کا مقام ہے

وہ ہم سفر جو چھوڑ کے آگے چلے گئے
اے موجۂ ہوا انھیں میرا سلام ہے

ہر اک کو ناگزیر ہوئی دعوت فنا
ٹھہراؤ ہے سحر کو نہ شب کو دوام ہے

ہیں ان کہے بہت سے سخن ہائے گفتنی
افسانۂ حیات سدا ناتمام ہے

دن جا رہا ہے جیسے جدا ہو رہے ہیں دوست
کیسی بجھی بجھی سی یہ گرمی کی شام ہے

غزل

احمد جاوید

تھا جانب دل صبحدم وہ خوش خرام آیا ہوا
آدھا قدم سوے گریز اور نیم گام آیا ہوا

رقص اور پاکوبی کروں لازم ہے مجذوبی کروں
دیکھو تو ہے میرا صنم میرا امام آیا ہوا

دریاے درویشی کے بیچ طوفان بے خویشی کے بیچ
وہ گوہر سیراب وہ صاحب مقام آیا ہوا

اے دل بتا اے چشم کہہ یہ روے دلبر ہی تو ہے
یا ماہ چرخ ہفتمیں بالاے بام آیا ہوا

ہے ذرہ ذرہ پر صدا اہلاً و سہلاً مرحبا
کیا سرزمین دل پہ ہے وہ آج شام آیا ہوا

تجھ پر پڑی یہ کس کی چھوٹ اے چشم حیراں کچھ تو پھوٹ
کیا حد بینائی میں ہے وہ غیب فام آیا ہوا

لرزاں ہے دل میں راز سا شعلہ قدیم آواز سا
یا لالۂ خاموش پر رنگ دوام آیا ہوا

ہے موسم دیوانگی پھر چاک ایجادی مری
لوٹا رہے ہیں پہلے کا خیاط کام آیا ہوا

میری طرف سے اے عزیز دل میں نہ رکھنا کوئی چیز
پھرتے بھی دیکھا ہے کہیں صاحب غلام آیا ہوا

خورشید سامانی تری اور ذرہ دامانی مری
ہے یہ عجوبہ دیکھنے ہر خاص و عام آیا ہوا

اک گرواڑی صحرا سمیت اک موج اٹھی دریا سمیت
دنیاے خاک و آب میں تھا کوئی شام آیا ہوا

یک عمر رفتاری کے ساتھ یک ماہ سیاری کے ساتھ
یک چرخ دواری کے ساتھ گردش میں جام آیا ہوا

صد چشم بیداری کے ساتھ، صد سینہ سرشاری کے ساتھ
سو سو طرح شہباز دل ہے زیر دام آیا ہوا

غزل

احمد جاوید

آمادہ رکھیں چشم و دل سامان حیرانی کریں
کیا جانیے کس وقت وہ نظارہ فرمانی کریں

بحر بلا ہے موج پر قہر قضا ہے اوج پر
ہیں کاہ ساماں مستعد تانا گریزانی کریں

آئی ہے رات ایسی دنی ہے ہر چراغ افسردنی
اے دل بیا، اے دل بیا، کچھ شعلہ سامانی کریں

ہاں ہاں دکھائیں گے ضرور ہم وحشت دل کا وفور
پہلے یہ شہر و دشت و در تکمیل ویرانی کریں

اے عاشقاں، اے عاشقاں، آیا ہے امر ناگہاں
جو لوگ ہیں نظارہ جو وہ مشق حیرانی کریں

وہ شمع ہے در طاق دل روشن ہیں سب آفاق دل
افتادگان خاک اٹھو افلاک گردانی کریں

ہے بسکہ تیغ اس کی رواں کم یاب ہیں نا کشتگاں
سب سرفروشوں سے کہو چندے فراوانی کریں

اک ناصحانہ عرض ہے دریاؤں پر یہ فرض ہے
دل کی طرح ہر لہر میں تجدید طغیانی کریں

ایسے گھروں میں اہل دل رہتے نہیں ہیں مستقل
تبدیل یہ دیوار و در اسلوب ویرانی کریں

غزل

احمد جاوید

کتنے میں بنتی ہے مہر ایسی
ناچیز احمد جاوید اوسی

میرے سخن میں ہے ایک شے سی
آواز اتنی، خاموشی ایسی

کل عاشقوں کا آتے ہی مذکور
کیا کیا نہ بہکے علامہ قیسی

اس منطقی پر اپنی نظر ہے
من وجہ ایسی من وجہ ویسی

یاں کا نہ ہونا بھی وہم ہی ہے
بطلان کس کا تحقیق کیسی

کھلتی نہیں ہے مجھ پر یہ دنیا
دل میں نہیں سی آنکھوں میں ہے سی

جتنی مسافت سر کر چکا ہوں
لگتی ہے وہ بھی ناکردہ طے سی

سوکھا پڑا ہے دریا تو کب کا
ہے موج خیزی ویسی کی ویسی

اب شہر سارا غرقاب جانو
اشکوں میں آئی یہ بوند کیسی

ساغر ملا ہے ساغر سا مجھ کو
اس میں بھری ہے مے کوئی مے سی

دیتا ہے ترک دنیا کی دعوت
جاوید کی تو ایسی کی تیسی

احمد جاوید

آمادہ رکھیں چشم ودل سامان حیرانی کریں
کیا جانیے کس وقت وہ نظارہ فرمانی کریں

بحر بلا ہے موج پر قہر قضا ہے اوج پر
ہیں کاہ ساماں مستعد تا نا گریزانی کریں

آئی ہے رات ایسی دنی ہے ہر چراغ افسردنی
اے دل بیا، اے دل بیا، کچھ شعلہ سامانی کریں

ہاں ہاں دکھائیں گے ضرور ہم وحشت دل کا وفور
پہلے یہ شہر و دشت و در تکمیل ویرانی کریں

اے عاشقاں، اے عاشقاں، آیا ہے امر ناگہاں
جو لوگ ہیں نظارہ جو وہ مشق حیرانی کریں

وہ شمع ہے در طاق دل روشن ہیں سب آفاق دل
افتادگان خاک اٹھو افلاک گردانی کریں

ہے بسکہ تیغ اس کی رواں کم یاب ہیں نا کشتگاں
سب سرفروشوں سے کہو چندے فراوانی کریں

اک ناصحانہ عرض ہے دریاؤں پر یہ فرض ہے
دل کی طرح ہر لہر میں تجدید طغیانی کریں

ایسے گھروں میں اہل دل رہتے نہیں ہیں مستقل
تبدیل یہ دیوار و در اسلوب ویرانی کریں

غزل

احمد جاوید

کتنے میں بنتی ہے مہر ایسی
ناچیز احمد جاوید اویسی

میرے سخن میں ہے ایک شے سی
آواز اتنی، خاموشی ایسی

کل عاشقوں کا آتے ہی مذکور
کیا کیا نہ بہکے علامہ قیسی

اس منطقی پر اپنی نظر ہے
من وجہ ایسی من وجہ ویسی

یاں کا نہ ہونا بھی وہم ہی ہے
بطلان کس کا تحقیق کیسی

کھلتی نہیں ہے مجھ پر یہ دنیا
دل میں نہیں سی آنکھوں میں ہے سی

جتنی مسافت سر کر چکا ہوں
لگتی ہے وہ بھی ناکردہ طے سی

سوکھا پڑا ہے دریا تو کب کا
ہے موج خیزی ویسی کی ویسی

اب شہر سارا غرقاب جانو
اشکوں میں آئی یہ بوند کیسی

ساغر ملا ہے ساغر سا مجھ کو
اس میں بھری ہے مے کوئی مے سی

دیتا ہے ترک دنیا کی دعوت
جاوید کی تو ایسی کی تیسی

غزل

احمد جاوید

آیا ہے بر میں وہ گلشن ایجاد
کر کے اصول ناچیدن ایجاد

کرلوں ابھی سے اپنے لیے میں
اک دشت اک مرگ اک مدفن ایجاد

کار عبث ہے چاک آفرینی
جب تک نہ کرلے وہ سوزن ایجاد

دل کی پہنچ ہے اس غیب رو تک
کر کے طریق نادیدن ایجاد

اس چشم تر کے آگے فلک نے
کر دیکھے کتنے ہی ساون ایجاد

تکمیل کر کے فن دریدن
کرنے چلا ہوں پیراہن ایجاد

جذب دلی نے اس کم نما سے
کروا لیا ہے اک روزن ایجاد

اے وحشت دل آخر کریں ہم
کتنے بیاباں کتنے بن ایجاد

پرسال شاید ہم کر چکے ہیں
چاک گریباں تا دامن ایجاد

اس ایک دل پر کب تک کرو گے
روز ایک طرز دل بردن ایجاد

کر ہی دکھایا ان ظالموں نے
اک تازہ روے برگشتن ایجاد

دل، ہاں یہی دل، ہاں ہاں یہی دل
برق آفریں ہے اور خرمن ایجاد

سینے میں دیکھا دل کی جگہ پر
تھا ایک شعلہ افسردن ایجاد

غزل

احمد جاوید

ہرگز نہ راہ پائی فردا و دی نے دل پر
رہتی ہے ایک حالت بارہ مہینے دل پر
سکتے میں ہیں مہ و مہر دریا پڑے ہیں بے بحر
ہے سخت غیر موزوں دنیا زمین دل پر
شعلہ چراغ میں ہے سودا دماغ میں ہے
ثابت قدم ہوں اب تک دین مبین دل پر
یا ایہا المجاذیب ہے بسکہ زیر ترتیب
مجموعۃ الفتاویٰ قول متین دل پر
لکھ لو یہ میری رائے کیا کیا ستم نہ ڈھائے
کل دل نے آدمی پر آج آدمی نے دل پر
یہ رنج ناکشیدہ یہ جیب نادریدہ
اے عشق رحم ہاں رحم ان تارکین دل پر
مانو یہ گھر نہ چھوڑو دنیا کو دیکھتے ہو
جو کچھ گذر چکی ہے اس تاکین دل پر
اک سر ہے ناکشودہ اک قول ناشنودہ
اک نغمہ ناسرودہ طرز نوین دل پر
پڑتا ہے جستہ جستہ مدھم سا اور شکستہ
اک ماہ نیلمیں کا پرتو نگین دل پر
سو بار ادھر سے گذرا وہ آتشیں چمن سا
اک برگ گل نہ رکھا دست یمین دل پر
خوں بستہ چشم حیراں پیوستہ لعن گرداں
بے دید بلکہ بے درد بلکہ کمینے دل پر
طوفان اٹھا رکھا تھا آنکھوں نے واہ وا کا
اس کی نظر نہیں تھی کل آفرین دل پر
رنگین تو بہت ہے دنیا مگر مہاشے
دھبے سے پڑ گئے ہیں کچھ آستین دل پر
وہ ماہ نازنیں ہے یا سرو آتشیں ہے
یا فتنۂ قیامت برپا زمین دل پر
سب ناملامتوں کو سب بے کرامتوں کو
سب سر سلامتوں کو لاتا ہے دین دل پر
جاوید کو دکھا کر کہتا ہے سب سے دلبر
اودھم مچا رکھا تھا ان بھائی جی نے دل پر
فاروقی اور احمد مشتاق کو تحیت
شاخ غمین دل پر حصن حصین دل پر(۱)

---

(۱) ہیں کیا یہ میری غزلیں طرز وزمین دل پر
یا طائر فسردہ شاخ غمین دل پر
(شمس الرحمن فاروقی)
لرزہ ہوا تھا طاری حصن حصین دل پر
رکھا تھا پاؤں تم نے جب سرزمین دل پر
(احمد مشتاق)

ندا فاضلی

(اکبر الہ آبادی)

کوئی کسی کی طرف ہے کوئی کسی کی طرف
کہاں ہے شہر میں اب کوئی زندگی کی طرف

سبھی کی نظروں میں غائب تھا جو وہ حاضر تھا
کسی نے رک کے نہیں دیکھا آدمی کی طرف

تمام شہر کی شمعیں اسی سے روشن تھیں
کبھی اجالا بہت تھا کسی گلی کی طرف

کہیں کی بھوک ہو ہر کھیت اس کا اپنا ہے
کہیں کی پیاس ہو جائے گی وہ ندی کی طرف

نہ نکلے خیر سے علامہ قولؔ سے باہر
یگانہ ٹوٹ گئے جب چلے خودی کی طرف

آرام کہانی ہے نہ یہ رام کہانی

ندا فاضلی

(قاضی محمود بحری)

پھر گویا ہوئی شام پرندوں کی زبانی
آؤ سنیں مٹی سے ہی مٹی کی کہانی

واقف نہیں اب کوئی سمندر کی زباں سے
صدیوں کی مسافت کو سناتا تو ہے پانی

اترے کوئی مہتاب کہ کشتی ہو تہ آب
دریا میں بدلتی نہیں دریا کی روانی

کہتا ہے کوئی کچھ تو سمجھتا ہے کوئی کچھ
لفظوں سے جدا ہو گئے لفظوں کے معانی

اس بار تو دونوں تھے نئی راہوں کے راہی
کچھ دور ہی ہمراہ چلیں یادیں پرانی

وضع اپنائے زمانہ ہے طبیعت کے خلاف

ندا فاضلی

(سید محمد خان رند)

میری تیری دوریاں ہیں اب عبادت کے خلاف
ہر طرف ہے فوج آرائی محبت کے خلاف

حرف سرمد خون دارا کے علاوہ شہر میں
کون ہے جو سر اٹھائے بادشاہت کے خلاف

پہلے جیسا ہی دکھی ہے آج بھی بوڑھا کبیر
کوئی آیت کا مخالف کوئی مورت کے خلاف

میں بھی چپ ہوں تو بھی چپ ہے بات یہ سچ ہے مگر
ہو رہا ہے جو بھی وہ تو ہے طبیعت کے خلاف

مدتوں کے بعد دیکھا تھا اسے اچھا لگا
دیر تک ہنستا رہا وہ اپنی عادت کے خلاف

عادل منصوری

آدھوں کی طرف سے کبھی پونوں کی طرف سے
آوازے کسے جاتے ہیں بونوں کی طرف سے

حیرت سے سبھی خاک زدہ دیکھ رہے ہیں
ہر روز زمیں گھٹتی ہے کونوں کی طرف سے

آنکھوں میں لئے پھرتے ہیں اس دربدری میں
کچھ ٹوٹے ہوئے خواب کھلونوں کی طرف سے

پھر کوئی عصا دے کہ وہ پھنکارتے نکلے
پھر اژدہے فرعون کے ٹونوں کی طرف سے

تو وہم و گماں سے بھی پرے دیتا ہے سب کو
ہو جاتا ہے پل بھر میں نہ ہونوں کی طرف سے

باتوں کا کوئی سلسلہ جاری ہو کسی طور
خاموشی ہی خاموشی ہے دونوں کی طرف سے

پھر بعد میں دروازہ دکھا دیتے ہیں عادل
پہلے وہ اٹھاتے ہیں بچھونوں کی طرف سے

سید امین اشرف

دل مشورۂ ناصیہ سائی نہیں دیتا
زیب اس کو یہ آشوب گدائی نہیں دیتا

کس دھند کی چادر میں ہے لپٹی کوئی آواز
دستک کے سوا کچھ بھی سنائی نہیں دیتا

ہے تاحد امکاں کوئی بستی نہ بیاباں
آنکھوں میں کوئی خواب دکھائی نہیں دیتا

عالم بھی قفس رنگ ہے ایسا کہ نظر کو
اس دام تحیر سے رہائی نہیں دیتا

یادوں کو سلا دیتا ہے سائے میں شجر کے
وہ حوصلۂ درد رسائی نہیں دیتا

دل اس کا ہتھیلی پہ ہے میرے لئے لیکن
ہاتھوں میں مرے دست حنائی نہیں دیتا

آرائش جاں کے لئے کافی نہیں وحشت
مجھ کو تو کوئی زخم دکھائی نہیں دیتا

اس عشق میں کچھ شائبۂ حرص بھی ہوگا
میں قوت باطن کی صفائی نہیں دیتا

روشن ہے شب ہجر یہ انداز تعلق
وہ مہر نظر داغ جدائی نہیں دیتا

ہوائے تند ہے بے سمت و بے قرینہ بھی
رواں دواں اسی عالم میں ہے سفینہ بھی

خراش ذہن بھی ہے زینت نگاہ بھی ہے
یہ زندگی خس و خاشاک بھی نگینہ بھی

یہ چشم نم کہ ہے دانائے غم بڑی شے ہے
چھپا ہوا ہے اسی خاک میں خزینہ بھی

کھلا گلاب تو منظر بدل گیا سارا
جمال صبح بھی حیرت بھی آبگینہ بھی

برس رہی ہے ہوائے طرب تو یاد آیا
مچل رہی ہے فضا میں نوائے سینہ بھی

ہزار لطف وعنایت بہ پائمالی دل
ملا ہے حسن خدا داد کو قرینہ بھی

شہریار

عرفان صدیقی

شیطاں نطفه

شیطاں نطفہ مری یہ دھرتی
تجھ سے خالی ہو سکتی ہے
میرے ساتھ اگر مجھ جیسے
اور بھی لوگ ارادہ کرلیں

میرے اس کے بیچ لگی تھی شرط کہ جینا ہے
پہلی بار میں اس سے جیتا اور وہ ہار گیا
کتنا بڑا یہ جھوٹا سچ ہے کوئی بتلائے
کیا سچ مچ وہ ہار گیا میں جیت گیا اس سے

اے زمیں زاد

اے زمیں زاد آسمان سے تو
منحرف دیر سے ہوا ورنہ
یہ زمیں اور بھی حسیں لگتی

آسماں زاد سے

آسماں زاد اس زمین کو تو
میری آنکھوں سے دیکھ اور بتلا
واپسی کا کوئی ارادہ ہے

دو غزلیں

شہریار

ترے قریب جو چپکے کھڑا ہوا تھا میں
بتاؤں کیسے کہ خود سے ڈرا ہوا تھا میں

جہاں سے آگے کہیں ہم بچھڑنے والے تھے
پلٹ کے دیکھا وہیں پر رکا ہوا تھا میں

اجاڑ شہر ہوں اور دیکھنے کے قابل ہوں
سنا گیا ہے کہ اک دن بسا ہوا تھا میں

بلا رہی تھی بہت ایک لمبی نیند مجھے
نہیں یہ یاد کہ کتنا جگا ہوا تھا میںؔ

فنا سے گذروں تو کچھ آشکار ہو شاید
کہ زندگی میں معما بنا ہوا تھا میں

کہتا نہیں ہوں لوگو میں کر کے دکھاؤں گا
پھر سے جنوں چراغ ہوا میں جلاؤں گا

آنکھوں نے نیند رخ نہ کیا جانتا تھا میں
تجھ خواب تک رسائی کبھی میں نہ پاؤں گا

سورج ستم نشانہ بنا ہوں اسی لئے
چاہا تھا دھوپ قہر سے تجھ کو بچاؤں گا

تنہا سفر پہ مجھ کو روانہ تو کر دیا
سوچا نہیں کہ تجھ کو بہت یاد آؤں گا

سچ سن نہیں سکے گا کوئی ورنہ جی میں تھا
دنیا کو جیسا دیکھا ہے سب کو بتاؤں گا

بیتے دنوں کے ننھے پرندوں کے سائے میں
جینے کا لطف اور بھی کچھ دن اٹھاؤں گا

دو گیت

ناصر شہزاد

(۱)

(راگ جے جے ونتی کا ایک روپ)

ہمرے انگنا آئیو
پھولن سیج سہائیو
ہمرے انگنا...
ہاٹ سے مجھ کو لا دو چھلا
مانگے نشانی یہ دل جھلا
کانی نکنا جھمکے جھومر
ہاتھ کا گجرا پاؤں کے گھونگر
نک سک سبھی سجائیو
ہمرے انگنا...

تو سوامی تو گردھر ناگر
روح میں رس کا بہتا ساگر
کوئی سلام نہ کوئی سلیہاں
کاہے لگائے تجھ سے نیہاں
نینن پیاس بجھائیو
ہمرے انگنا...

سر پر مور مکٹ کا جھالا
تو ہنوری بنسی والا
گھاٹ پہ چھپے، چھپا کر ساڑھی
چھنتی ہے تجھ مجھ میں گاڑھی
گاگر مار گرائیو
ہمرے انگنا...

(۲)

گوئیاں آج کھیلیں ہوری(۱)
سنگ سجن کے چوری چوری
گوئیاں آج....

عطر، عبیر، گلال میں بھیگیں
پریت کے وصل وصال میں بھیگیں
ندی کنارے باندھیں نیا
باٹ تکت ہیں کرشن کنہیا
منوا کرت ہے جورا جوری
گوئیاں آج...

رستے پر بادل لہرائے
سوندھی مٹی مہک لٹائے
مینا مور پپیہے بولیں
گیت کے درت نرت کو چھولیں
تھرکیں بیاں گوری گوری
گوئیاں آج...

دیور، جیٹھ سے آنکھ بچا کر
تن پر کیسری سوٹ سجا کر
پریتم کے چرنن میں جائیں
ماتھا ٹیکیں، سیس نوائیں
دل سے بندھی ہے دل کی ڈوری
گوئیاں آج...

---

(۱) پرانے سنگیت شاستروں میں "ہوری" کا ایک بول

گیت

ناصر شہزاد

(۳)

امبوا کی چھیا میں جھولا جھلائیں (۱)
آری سکھی مل کے ساون منائیں
امبوا کی چھیا...

ویٹر سے منگوائیں پاپڑ پکوڑے
برکھا کی سوغات ہیں یہ نگوڑے
برفیلی پیپسی کے ڈھکن کو کھولیں
باغوں میں بیتی کتھاؤں کو رو لیں
روحوں میں اتریں گھرتی گھٹائیں
امبوا کی چھیا...

گھر میں کریں فون کیا منگواؤ
لگوا کے تنور سے نان لاؤ
چٹنی مربے دہی کا ہو دوہنا
لاگا ہے سارے میں ساون سلونا
رم جھم پڑے پھوار جھومیں ہوائیں
امبوا کی چھیا...

ماتھے پہ جھومر ہے کانوں میں جھمکے
پاؤں میں چاندی کی پازیب ٹھمکے
پاگل پونیا عجب روپ دھارے
سینے سے لپٹے لگے پگ ہمارے
سجنا کے سنگنا میں رنگنا رچائیں
امبوا کی چھیا...

(۱) پرانے سنگیت ساشتروں "ملہار" کا ایک ٹکڑا

ناصر شہزاد

کٹے دن سن، کئی موسم، مہینے
تجھے جی میں بہت ڈھونڈا ہے جی نے
چھوا پھولوں نے جھک کر اس کا چہرہ
بھگوئے ہونٹ شبنم کی نمی نے
ابھی برچھی کے پھل رڑکیں بدن میں
ابھی سڑکن(۱) بھرے یہ سر یہ سینے
پڑھیں رگ وید کی پاکیزہ حمدیں
پیے نروان جل کے آبگینے
بتائی رات کی سب بات... آخر
کہیں کا بھی نہیں چھوڑا کسی نے
سکھی آ، چاند کی جانب پھلانگیں
کٹہرے رنگ کے، کرنوں کے زینے
جدائی کا تبھی مفہوم سمجھا
لگے جب چھوٹنے دل کے پسینے
یہ گانی لے کے آئیں اس کی میا
یہ انگوٹھی مجھے بھیجی ہے پی نے
سکھی کے دانت موتی جگمگتی جوتی
سکھی کے نین ترشیدہ نگینے
چنگ بوسہ تنے کیرے میں ہم تم
دکھائے ہائے کیا منظر مری(۲) نے

شبدوں کی مدھیرا سے بھگو کر تری چولی
کھیلی ہے سہیلی، ترے سنجوگ میں ہولی
در آئے دراڑوں کبھی دیواروں سے پالا
برسات میں ٹپکے ہے مرا گھر مری کھولی
خوشبو کو اٹھا کر رکھا دامان دعا میں
سورج کی کرن روح کے پردے میں پرولی
طوطے نے کہا کون تھا دریا پہ بتا دے
موئی ہے کہاں جا کے تو مینا مجھے بولی
اس آس کا اس پیاس کا دارو نہیں کوئی
دیا ری کنہیا سے کہو لائے نہ ڈولی
تو بھینسیں چرائے کہ کہیں تخت سہائے
یہ آن یہ جند جان، ترے نام پہ گھولی
صحرا میں ملا خاک کا ادراک بدن پر
کہسار پہ تہ ماس کی بو باس سے دھولی
سو بار لٹا چینا بہے بن ترے نینا
اشکوں سے بھری دیکھی ہے سو بار یہ جھولی
رگ وید میں اشلوک ہیں یا لوک ثنائیں
بادل گھرے، موسم پھرے، پستک جہاں پھولی
مقتل سے گذر کر جو بڑھے شاخ سناں تک
یہ زیست تجھے دیکھ کے اس راہ پہ ہولی

۱۔ رڑکنا اور سڑکنا کے لفظ اردو لغت سے نہیں یہ الفاظ کے پنجابی خاندان سے آئے ہیں۔

۲۔ کوہ مری

ناصر شہزاد

لہو میں سادہ ست کو بھر رہا ہوں
کوئی حجرہ چراغاں کر رہا ہوں

جھٹک کر دل سے سارے لوبھ لالچ
یہاں بن باس میں بہتر رہا ہوں

عذاب آخرت کی بات آگے
عتاب زندگی سے ڈر رہا ہوں

مری پہچان میرا گیان... ہجرت
سدا اوسان میں بے گھر رہا ہوں

کوئی دیکھے نہ آکر داغ حسرت
بدن پر اوڑھ کر چادر رہا ہوں

ملوث تھا میں ہر بے رہ روی میں
مگر الزام تجھ پر دھر رہا ہوں

تڑپتے تن کو مٹی پر گرا کر
سر صحرا بریدہ سر رہا ہوں

درکتے رنگ، بادل، خواب، خوشبو
سے کی سج سے بہرہ ور رہا ہوں

ڈرا ہوں تیرے خوف بے بہا سے
مصلے پر سر محشر رہا ہوں

تری بے اعتنائی سے گلہ کیا
میں اپنے آپ پر دوبھر رہا ہوں

جمال پانی پتی

وہ لہو روئی ہیں آنکھیں کہ بتانا مشکل
اب کوئی خواب ان آنکھوں میں سجانا مشکل

کتنی یادیں تھیں کہ گرد رہ ایام ہوئیں
کتنے چہروں کا ہوا دھیان میں لانا مشکل

کتنے شب خوں تھے اجالوں پہ جو مارے نہ گئے
کتنی شمعیں تھیں ہوا جن کا جلانا مشکل

کتنے دروازے دلوں کے تھے جو دیوار بنے
ایسی دیوار کہ در جس میں بنانا مشکل

رنگ جتنے تھے بہاروں میں بہاروں سے گئے
اس چمن زار میں اب جی کا لگانا مشکل

وہ بھی اے شہر نگاراں تھا کوئی موسم خواب
بیت جانے پہ بھی ہے جس کو بھلانا مشکل

رقص کرتے ہوئے کانٹوں پہ چلے ہم ورنہ
ہر قدم راہ میں تھا پھول کھلانا مشکل

یونہی چڑھتا رہا گر درد کا دریا تو جمال
کشتی جاں کو کنارے سے لگانا مشکل

جاوید شاہین

طرز میرے رزق کی تھوڑی بدل جانے کے بعد
ابتدا کرتا ہوں دن کی دن کے ڈھل جانے کے بعد

پھر چلی جاتی ہے دریا کی کھلی آغوش میں
موج ساحل پر کھڑی دو پل مچل جانے کے بعد

میں یوں ہی اس کو بھلا دینے کے دھوکے میں رہا
دل ہی میں تھا وہ مرے دل سے نکل جانے کے بعد

کام اپنا منھ اندھیرے ختم کرلیتی ہے رات
اک سیاہی صبح کے چہرے پہ مل جانے کے بعد

گھومنے پھرنے دے اس کو اک اداسی میں ابھی
خود حقیقت جان لے گا کچھ سنبھل جانے کے بعد

معجزہ فن کا یہی ہے اور یہی میرا کمال
پھر سے جی اٹھتا ہوں اک آتش میں جل جانے کے بعد

روک رکھا ہے مجھے شاہیں زمستاں نے کہیں
چل پڑوں گا برف تھوڑی سی پگھل جانے کے بعد

اک جگہ ہوں، وہ جگہ اک یاد رہ جانے کے بعد
کس قدر پانی کسی دریا میں بہ جانے کے بعد

پوچھتا کیا ہے مری غیرت کا اے بے ننگ و نام
دیکھ لے زندہ ہوں تیری بات سہ جانے کے بعد

اک جگہ خود مجھ کو اپنے سچ پہ شک سا پڑ گیا
پر یقیں کتنا تھا وہ اک جھوٹ کہہ جانے کے بعد

شام ہے اور جانے والا دن ہے میرے سامنے
رنج میں ہوں میرا سارا کام رہ جانے کے بعد

ہے یقیں مجھ کو کہ ہے رہنے کے قابل یہ جہاں
ہاں مگر کتنا خس و خاشاک بہ جانے کے بعد

اک نئی تعمیر کا سوچوں گا پھر، پہلے مجھے
صاف کرنی ہے زمیں اک شہر ڈھہ جانے کے بعد

سوچ لے شاہیں اسے پانا کہ کھونا ہے اسے
جا چکا ہے وہ تجھے اک بات کہہ جانے کے بعد

جاوید شاہین

ہے عجب شغل مرارات کے ڈھل جانے تک
دیکھتا رہتا ہوں تارا کوئی جل جانے تک

پھر سلا دے گا اسے بحر کا اک گہرا سکوت
مستی ہے موج میں ساحل پہ مچل جانے تک

کیا ہوا اس کی گرہ میں ہے اگر اک دوری
میں بھی تو اس کا ہوں بس اس کے بدل جانے تک

پھر وہی میں مرا پھر ہوگا وہی کار جہاں
بات ساری ہے کسی غم کے بہل جانے تک

وہ ضرورت سے زیادہ ہی فراغت تھی کہ میں
جس میں پھرتا رہا حسرت کے نکل جانے تک

میرا اک عذر وہ سنتا رہا خاموشی سے
اور میں بیٹھا رہا برف پگھل جانے تک

روک رکھنی ہے کہیں ایک جگہ درد کی رات
کسی بیمار کی حالت کے سنبھل جانے تک

رزق مٹی کا مرا خوں نہیں بننے والا
صبح کے چہرے پہ غازہ کوئی مل جانے تک

عین ممکن ہے ٹھہر جائے کہیں آج کا دن
اور یہ ٹھہرا ہی رہے یوں ترے کل جانے تک

ایک آتش ہے کہ دہکائے ہوئے رکھتی ہے
کسی زنجیر کے حلقوں تک پگھل جانے تک

میں بھی شاہیں اسے ملنے نہیں جانے والا
اس کے اندر سے کسی بل کے نکل جانے تک

نظارہ عجب اس کے گریباں کی طرف تھا
ہر آنکھ کا رخ سینۂ عریاں کی طرف تھا

میں دیکھ رہا تھا کہیں جلتی ہوئی شمعیں
اور دھیان مرا دود پریشاں کی طرف تھا

میں لیٹا رہا گھاس پہ سائے میں بڑی دیر
آگے کا سفر سارا بیاباں کی طرف تھا

دو راستے تھے ایک جگہ رزم جہاں میں
اک گھر کی طرف دوسرا زنداں کی طرف تھا

کچھ پڑ سا گیا دیدۂ مشتاق میں اس وقت
جب گرم تماشا کسی میداں کی طرف تھا

تارے کہ اتر آئے تھے اک وشت بلا میں
مہتاب کسی قریۂ ویراں کی طرف تھا

بیٹھا تھا کہیں حسن نمائش گہ غم میں
رجحان ذرا شہرت ارزاں کی طرف تھا

یہ کیسے ہوا کیوں میں نکل آیا سر راہ
جانا تو مجھے کوچۂ جاناں کی طرف تھا

محفل میں وہ کرتا رہا اک چور سے ہشیار
اور اس کا اشارہ مرے مہماں کی طرف تھا

آثار تھے آندھی میں بڑی چپ سی فضا میں
رخ وقت کے دھارے کا بھی طوفاں کی طرف تھا

وہ قافلۂ گل کے گذر جانے کی خبر تھی
اڑتا ہوا جو رنگ گلستاں کی طرف تھا

اک ہاتھ تھا دنیا کا مری جیب پہ شاہیں
جو دوسرا تھا میرے گریباں کی طرف تھا

جاوید شاہین

میں ایک آتشِ گم کی خبر کے پیچھے ہوں
اسی سے ٹوٹے ہوئے اک شرر کے پیچھے ہوں

بہت ہی اجنبی دستک ہے سن رہا ہوں اسے
اور ایک ڈر میں گرفتار در کے پیچھے ہوں

کسے تو ڈھونڈتا پھرتا ہے سرد کمروں میں
میں دھوپ سے بھرے میداں میں گھر کے پیچھے ہوں

زیادہ ٹھیک ہے واماندگی اسے کہنا
جو کہہ رہا ہوں کہ میں رہگذر کے پیچھے ہوں

ہیں ماہ و سال ہی ایسے سمجھ نہیں آتی
کہ آگے شام کے ہوں یا سحر کے پیچھے ہوں

یہ خونیں کھیل ہے روزِ ازل سے جاری ہے
وہ میری جان کے میں اس کے سر کے پیچھے ہوں

یہ تیرِ مرگ ہے ممکن نکلنا اس سے نہیں
یہیں کہیں میں کسی ایک در کے پیچھے ہوں

حسب سے، نام سے، عزت سے مجھ کو کیا لینا
ہوس کا بندہ ہوں بس مال و زر کے پیچھے ہوں

مرے کلام میں شاہیں نہ کر تلاش مجھے
چھپا ہوا کسی دستِ ہنر کے پیچھے ہوں

میں کہ تنہا اعتبارِ ذات کھونے سے ہوا
جو ہوا وہ دل میں شک کا بیج بونے سے ہوا

سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر خاک پر سویا تھا میں
خواب کا آغاز ہی رنگیں بچھونے سے ہوا

میں نے دیکھا ہے چمن سے رخصتِ گل کا سماں
سب سے پہلے رنگ مدھم ایک کونے سے ہوا

میں ہی بنتا ہوں فسادِ آب و گل کی وجہ بھی
کس قدر نقصان میرا میرے ہونے سے ہوا

دیکھتا رہتا اگر پھر سر کا بچنا تھا محال
بوجھ میرا کم اسے ہر آن ڈھونے سے ہوا

ایک ہنگامہ ہوا جو رات کے ایوان میں
روشنی کا خار ظلمت میں چبھونے سے ہوا

ہو رہا ہے جو یہاں پر دیکھتا کیسے اسے
اس مصیبت سے رہا میں خوب سونے سے ہوا

زندگی گھستی رہی شاہیں بسر ہونے کے ساتھ
پیرہن کا رنگ پھیکا روز دھونے سے ہوا

پرکاش فکری

ساتھ دریا کے ہم بھی جائیں کیا
زور لہروں کا آزمائیں کیا

پیڑ سارے اجڑ چکے کب کے
شور کرتی ہیں پھر ہوائیں کیا

کب وہ گذرے گی اس خرابے سے
فصل گل سے یہ پوچھ آئیں کیا

پھول باغوں میں جب نہیں کھلتے
پھول گملوں میں ہم کھلائیں کیا

رات جنگل کی شہر میں آئی
گھر چراغوں سے جگمگائیں کیا

جو خدا ہے کبھی تو سوچے وہ
ایک دنیا نئی بنائیں کیا

خوف کیسا ہے شام سے فکری
آج اتریں گی پھر بلائیں کیا

کہاں کہاں سے گذر رہا ہوں
میں آندھیوں میں بکھر رہا ہوں

کسی بھی صورت نہ چین پاؤں
یہ کس تجسس میں مر رہا ہوں

میں سرخیوں میں کہاں سے ہوتا
میں حاشیے کی خبر رہا ہوں

سبھوں کو جانا ہے پار لیکن
میں پار جانے سے ڈر رہا ہوں

نہ میری منزل نہ کوئی جادہ
ازل سے گرد سفر رہا ہوں

مجھے تو مرنا تھا غم میں فکری
میں غم میں جل کر نکھر رہا ہوں

بلقیس ظفیر الحسن

دامان آرزو کے کنارے سمیٹئے
ملتا ہے کب کسی کو وہ سب کچھ جو چاہئے

ہوتے ہیں کچھ شرر بھی چھپے راکھ میں کہیں
ہے دیکھنے میں سرد سنبھل کر کریدیئے

سب روشنی کے پھول تو کھلتے ہی بجھ گئے
کڑوا دھواں اب آنکھوں سے رو رو نکالئے

مشکل پسند اپنی طبیعت ہے کیا کریں
چن چن کے خار راہوں میں خود ہم نے دھر دیئے

ملتا ہے سرد روئی سے مہ تند خوہے مہر
اپنے لئے کرن کوئی اب کس سے مانگئے

حسرت سے سوے در یہ تکے جانا تا بکے
ان تھک کے چور آنکھوں کو اب سونے دیجئے

قندیل میں شگوفوں کے جلنے لگی ہوا
روشن ہیں شاخ شاخ پہ خوشبو بھرے دیے

ہاں مل لئے تھے اس سے کہیں اتفاق سے
دنیا نے کیسے کیسے فسانے بنا لئے

بلقیس لیجئے ہوش کے ناخن بہت ہوا
جذبات کو شعور کی حد دے کے روکئے

زندہ ہونا اور نہ جینا تم ہی کہو کیا ممکن ہے
خود کو کر دینا ان دیکھا تم ہی کہو کیا ممکن ہے

آس کی لو آنکھوں میں جلائے لڑتی جاؤں اندھیروں سے
رات ہے رات کا ہو نہ سویرا تم ہی کہو کیا ممکن ہے

تیز ہوا کا اک جھونکا شعلوں میں بدل کے رکھ دے گا
چنگاری کو دبائے رکھنا تم ہی کہو کیا ممکن ہے

جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اک روز تو پکڑا جائے گا
سچ کے ہاتھ کبھی نہیں آنا تم ہی کہو کیا ممکن ہے

کس کس کو چپ کوئی کرے ہیں جتنے منہ اتنی باتیں
آگ لگے اور دھواں نہ اٹھنا تم ہی کہو کیا ممکن ہے

ممکن ہے کھل کر نہ کہا ہو اس سے میں نے مگر بلقیس
اس جیسے کا کچھ نہ سمجھنا تم ہی کہو کیا ممکن ہے

غزلیں

بلقیس ظفیر الحسن

فسوں زدہ ہیں ہوائیں منظر تمام مسحور چپ پڑے ہیں
سیاہ نیرنگِ نیم شب کا ستارے جھک جھک کے دیکھتے ہیں

سحر کی لو میں جلا رہی ہے صبا کنول رنگ و بو میں تر ہیں
درخت سارے سجائے موتی کی تھالیاں صف بہ صف کھڑے ہیں

ہزار راتیں گذر گئیں اک ہمارے ہی غم کی شب نہ گذری
اجالے خائف سیہ کدے سے بدل کے رستہ نکل رہے ہیں

دھڑکتے دل جیسی ساعتوں والے روز و شب اب کہاں سے لائیں
گرے ہوئے خشک موسموں میں نہ جانے کب کے وہ کھو چکے ہیں

اس ایک ہی زندگی میں کتنے جنم لئے بار بار ہم نے
اور اب یہ روز جان دے دے کے کیوں جیے بیٹھے سوچتے ہیں

حقیقتیں یوں نہیں بدلتیں بخوبی معلوم ہے ہمیں بھی
فرار ہونے کو خود سے کچھ خواب زار پھر بھی بنا لئے ہیں

خود اپنی خواہش پہ جان دینے کا نام رکھا ہے عشق والفت
ہوا ہوس میں یہ خود فریبی کے جال کیا دلنشیں بنے ہیں

ایسا ہونے نہیں دینا تھا مگر ہونے کو ہے
زندگی اب تو نہ جینے میں بسر ہونے کو ہے

پر جو کاٹے گئے جا پہنچے ہواؤں میں تمام
اپنی پرواز بہ انداز دگر ہونے کو ہے

وحشتِ دل تجھے لے کر میں کہاں جاؤں بتا
رہتے رہتے تو یہ ویرانہ بھی گھر ہونے کو ہے

دل سے پھر کھیل رہی ہیں وہی ضدی یادیں
ذرہ ذرہ مرا پھر زیر و زبر ہونے کو ہے

شمع کی لو کی طرح جان ڈھلی جاتی ہے آج
شاید اپنی شبِ غم کی بھی سحر ہونے کو ہے

سرخ رو خونِ جگر سے ہی ہوا کرتے ہیں لوگ
کیا ہے بلقیس اگر جاں کا ضرر ہونے کو ہے

تین نظمیں

بشر نواز

محرومی

تم کاغذ پر لکھے ہی کو
آخری سچائی کہتے ہو
اور میں اپنی ساری باتیں
تپتے دن اور جاگتی راتیں
اپنی نفرت، اپنی محبت
اپنے غم اور اپنی مسرت
دھڑکن ہی میں کہتا ہوں
اور دھڑکن کا
رسم الخط ہی کوئی نہیں

سفر کی داستان

یہ تو نہیں کہ منزلیں
بے نام و بے نشاں ہوئیں
راستے بے خبر تمام
بچھ گئی دور دور تک
بے نام اسم کی سرد شام
یہ بھی نہیں کہ کھو گئیں
نور کی سب نشانیاں
بن گئیں دل کی دھڑکنیں
بھولی ہوئی کہانیاں
بس یہ ہوا کہ راہ کے
ایک عجیب موڑ پر
جادو کی بستیاں ملیں

اور ہم ان میں کھو گئے

برگد

شام آئی تو کتنے طوطے
برگد کی
سب سے اونچی ڈال پہ آکر بیٹھ گئے
ٹیں ٹیں ٹیں ٹیں شور مچا ہے
شاید کوئی بحث چھڑی ہے
دانے پانی، سر کو چھپانے کا ہے شاید مسئلہ کوئی
یا پھر اپنے اپنے حصے بخرے کا کوئی جھگڑا ہوگا
بحث چھڑی ہے

شور بپا ہے
تھوڑی دیر کا ہنگامہ ہے
پھر سب تھک کر سو جائیں گے
اگلی شام کے آنے تک
میری تمھاری نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے

دلاوران نیم شب

سید محمد اشرف

نذیر چچا دیر تک اکرم کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔

"تم اجمل صاحب کے لڑکے ہو؟"

"جی۔"

قصبے میں واپس آنے کے کئی ہفتے بعد آج اکرم نے بستی میں گھومنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس میں کچھ مصلحت تھی۔ نذیر چچا اچانک مل گئے تھے۔

"اجمل صاحب سے ہمارا تعلق جانتے ہو؟"

"خوب۔ آپ اور وہ منا چائے والے کی دکان پر بیٹھ کر گھنٹوں اخبار کی خبروں پر بحث کرتے تھے۔"

نذیر چچا سوکھ کر کانٹا ہو چکے تھے۔ گدی کے نیچے کمر کا اوپری حصہ بہت بے ڈول طریقے سے جھک گیا تھا اور انھیں سیدھے کھڑے ہونے میں بہت دقت ہوتی تھی۔

"میں تمھارے باپ سے بیس برس بڑا ہوں۔" پھر کچھ سوچ کر بولے۔ "مرحوم مجھ سے بیس برس چھوٹے تھے۔"

"جی میں واقف ہوں۔ وہ آپ کو نذیر چچا کہتے تھے۔"

"نذیر چچا تو مجھے قصبے کا ہر آدمی کہتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ افسردگی سے ہنسے۔ "ابا کہہ کر کسی نے نہیں پکارا۔ چچا کہنے والے سیکڑوں ہیں۔"

"نذیر چچا! آپ کی شادی ہوئی نہیں یا..."

"نہیں، شادی کی نہیں۔ آؤ کہیں اطمینان سے بیٹھتے ہیں۔"

نذیر چچا نے سڑک کے کنارے ایک دوکان پر دو عدد چائے بنوائیں۔ مٹی کے سکوروں میں چائے لے کر وہ اکرم کو اسکول کے پیچھے والے حصے میں لے آئے جہاں ٹوٹی ہوئی ایک بنچ پڑی تھی۔ وہاں دونوں آرام سے بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لینے لگے۔

"اس وقت ہندوستان پاکستان ہو رہا تھا... یعنی جب میری شادی کی عمر تھی۔ میں چاہتا تھا کہ سارے کفار ختم ہو جائیں تب اطمینان سے متاہلانہ زندگی شروع کروں۔" ان کے لہجے میں افسردگی تھی۔

"اس سلسلے میں آپ نے بہت کوششیں بھی تو کی تھیں۔ ابا بتاتے تھے۔"

"ہاں۔" ان کی بوڑھی میلی آنکھوں میں ایک لمحے کو چمک آگئی۔

"تمھارے باپ ہمارے بہت سے معاملات کے رازدار تھے۔"

"اس وقت کے کچھ کارنامے بتائیے۔" اکرم کا دل ان کی باتوں میں لگ رہا تھا اور ابھی ابھی اسے یہ بھی محسوس ہوا تھا کہ وہ نذیر چچا سے اپنے باپ کی رفاقت کا کچھ کچھ حق بھی ادا کر رہا ہے۔

"کفاروں کو اس بستی سے ختم کرنے کے میں نے بہت جتن کیے۔ تمھارے باپ الھڑ عمر کے تھے۔ انھوں نے میرا ساتھ نہیں دیا لیکن ہم اور لھسوا اپنے دھن کے پکے تھے۔ میاں تو اس وقت کم عمر تھے۔ ہم لوگ میاں کے بزرگوں کے پاس گئے اور کہا کہ ہمیں ایسے تعویذ دیجیے یا عمل بتائیے کہ اس بستی سے کفاروں کا نام ونشان ختم ہو جائے۔ بنس مٹ جائے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے خالی سکورے کو پوری طاقت سے زمین پر مارا۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

"میاں کے بزرگوں نے کہا ہم تو ہمیشہ سے ان کفاروں کے ساتھ رہتے آئے ہیں، ایسا کوئی تعویذ نہیں دے سکتے۔ ہاں اپنی مدافعت کے واسطے تعویذ دے سکتے ہیں اور پڑھنے کا عمل بھی بتا سکتے ہیں۔ مجبور ہو کر ہم نے اسی پر اکتفا کیا۔ لیکن ہمارا دل نہیں مانا۔ ہم اور لھسو رات کے وقت یعنی عشا کے وقت ملنگ سائیں کے تکیے پر پہنچے۔ سائیں اپنے خلیفاؤں کے ساتھ شغل میں مصروف تھے، ہمیں بھی دعوت دی۔ ہم نے کہا کہ ہم کوئی نشہ نہیں کرتے۔ پھر انھوں نے ہمیں اپنی کٹیا میں

بیٹھنے کو کہا۔ ان سارے ملنگوں کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ جب وہ چلم کا طویل کش لیتے تو چلم پر رکھی ہوئی چرس میں شعلہ سا بلند ہوتا۔ ایک ایک کے پاس تین تین شعلے تھے۔ جب وہ شغل کر کے ذکر میں مصروف ہوئے تو ہم اور لبھو وہیں ڈرے ڈرے بیٹھے رہے۔ سوچتے رہے کہ بیکار میں ان ملنگوں کے پاس آئے۔ تب سائیں نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا، کیوں آئے ہو؟''

''سائیں کفاروں کے خاتمے کا تعویذ چاہیے۔''

''''ملے گا، ضرور ملے گا۔ کل صبح کے بعد زوال کے وقت آؤ۔''''

''ہم دونوں زوال کے وقت پہنچے تو سائیں اکیلے بیٹھے تھے اور انھوں نے اپنے بال کھول رکھے تھے جو بانسوں کے جھولوں پر پڑے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ کوئی دس ہاتھ کے ہوں گے۔ سائیں نے اپنے شلوکے سے چار تہ کیے ہوئے زعفرانی کاغذ نکالے۔

''''انھیں شہر کے چاروں کونوں پر کسی درخت کی سب سے اونچی شاخ پر باندھنا ہے۔ عاملوں کے علاوہ کوئی جان نہ سکے کہ یہ کام کس کا ہے۔''''

''عامل کون؟''

''میں نے کچھ خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

''''تم دونوں۔ اور کون۔''''

''ہم دونوں نے اپنے عامل ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن ایک خلش سی تھی کہ بغیر کسی محنت کے ہم عامل کیسے ہو گئے۔ لبھو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا سائیں۔ ہم لوگوں نے کچھ پڑھا نہ عامل کیا۔ ہم عامل کیسے ہو گئے؟''

''سائیں بولے۔ 'عامل وہ ہوتا ہے جو عمل کرے۔ عمل کا مطلب کام۔ تم نے یہ کام کیا ہے کہ کفاروں کو اس بستی سے نکالنے کا ارادہ کیا ہے۔ بس تم عامل ہو گئے۔ سائیں کہتا ہے کہ تم عامل ہو گئے۔''''

''یہ کہہ کر سائیں نے ایک نعرہ لگایا:

تتی روٹی ایک ادھیلا

دھرکن پور پہنچا دے سویرا

''یہ نعرہ لگا کر جب سائیں خاموش ہوئے تو ان کی آنکھیں رات سے زیادہ سرخ تھیں۔ ہم عامل لوگ ڈر گئے۔ سائیں نے ہمارے ڈر کو بھانپ لیا اور بولے۔

''''ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ان تعویذات کو راتوں رات قصبے کے چاروں کونوں پر درختوں کے سب سے اونچی شاخ پر باندھ کر آنا ہے۔ کسی کو کانوں کان...''''

''''آپ نشا خاطر رہیں سائیں۔'' لبھو بولا۔ ہوشیار انسان تھا... ہا... جوانی میں ختم ہوا۔ ساٹھ کا بھی تو نہیں ہوا تھا کہ تپ دق اٹھا لے گئی۔'' نذیر چچا نے اپنے ساتھی الیاس عرف لبھو کی طرف رخ پھیر دیا تھا۔

''نذیر چچا۔ پھر آپ لوگوں نے وہ تعویذ باندھے؟''

''ہاں۔ سنتے رہو۔ دھیرج کے ساتھ سنا کرو ایسے معاملات۔'' نذیر چچا کے لہجے کی شفقت میں کچھ کچھ سختی کا عنصر بھی تھا۔ غالباً وہ کچھ دیر اور اپنے ساتھی کو یاد کرنا چاہتے تھے۔'' اکرم شرمندہ ہو گیا۔ ''جی چچا۔''

''ہم دونوں اسی رات عشا کے بعد... عشا کے بہت بعد قصبے کے چاروں کونوں پر سب سے اونچے درخت کی شاخ پر وہ تعویذ باندھ کر آئے۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ ایک تو ہم دونوں کو درخت پر چڑھنا نہیں آتا تھا۔ پھر یہ سب سے اونچی شاخ کا معاملہ بہت سخت تھا۔ اسٹیشن کی طرف سیدوں والے باغ کا معاملہ آسان تھا کہ وہ باغ تو ہم نے کئی سال رکھایا بھی تھا۔ شہر کی طرف چتو کے تالاب پر ہندوؤں کی چتائیں جلتی تھیں۔ لبھو نے کہا کہ ہم ان ہی لوگوں کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ کہیں کسی چتا سے ان میں کا کوئی بھوت نہ نکل پڑے۔

''میں نے آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم کی۔ چھوٹے موٹے عملیات سے تو میں بچپن سے ہی واقف تھا۔'' یہ کہہ کر نذیر چچا نے اکرم کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔ اکرم نے بھی ان کے دلخواہ تاثرات دیے۔

''بس۔ آیت الکرسی کا پڑھنا تھا کہ لبھو ہرن ہو گیا۔ چتاؤں سے پیر بچاتے، اب بھلا بلا وجہ جھگڑا مول لینے سے کیا فائدہ تھا، ہم لوگ آگے بڑھتے گئے۔ چتو کے تال پر سب سے اونچا درخت بیری کا تھا جس کی اونچی شاخ پر تعویذ باندھنا مشکل کام نہ تھا۔ میں نیچے کھڑا رہا، لبھو اوپر جا کر تعویذ باندھ آیا۔ جب وہ تعویذ باندھ کر نیچے اتر رہا تھا تو بیریا میں سے ایک تیتر پھر سے اڑا۔ لبھو ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ دوسرا تیتر بھی پھر سے اڑ گیا۔ لبھو بھد سے زمین پر آن گرا۔ میں نے ہنس کر اسے اٹھایا۔ میں تو جانتا تھا کہ وہ کوئی بدروحیں نہیں، بھورے تیتر تھے جو رات کو اسی بیریا پر بسیرا لیتے تھے۔''

''باقی دو طرف کے تعویذ؟'' اکرم نے بے چینی سے پوچھا۔

''سنتے رہو۔ تم جلدی بہت کرتے ہو۔ کیا دھوپ لگ رہی ہے؟''

''نہیں نذیر چچا۔ بہت دل لگ رہا ہے آپ کی باتوں میں۔ آج آپ سے برسوں بعد تو ملاقات ہوئی ہے۔ جلدی کیسی۔''

''ہاں تو دکھن طرف کے درخت کی چوٹی پر تعویذ باندھنا ایک بڑا مرحلہ تھا۔ میں نے لبھو سے کہا یہ کام تم نہ کر سکو گے۔ یہ کام نذیر کرے گا۔ اصل میں دکھن طرف کا باغ جج صاحب کا تھا اور جج صاحب کے باغ میں ہر موسم میں مالی رہتے تھے۔ اس کی ترکیب میں نے سوچ رکھی تھی۔ میں افیم کی دو تین چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر لے گیا۔ باغ میں جب ہم داخل ہوئے تو مالیوں نے شور مچایا۔ میں نے ڈپٹ کر کہا۔ خاموش جاہل قوم۔ میں نذیر چچا ہوں۔ بس اتنا سن کر مالی ہمارے پاس آ کر یوں کھڑے ہو گئے جیسے ہم ان سے آموں کا سودا کرنے آئے ہوں۔ بڈھے مالی نے کہا، نذیر چچا اتنی رات کو باغ میں کیسے آنا ہوا۔ تب، اللہ معاف فرمائے، میں نے ایک جھوٹ بولا۔ میں نے ان تینوں کو ان کی جھونپڑی میں لے

جا کر کہا کہ آج کل کے حالات بہت خراب ہیں۔ دور دور سے فسادات کی خبریں آرہی ہیں۔ تم لوگ جنگل میں رہتے ہو، تمھارے لئے خاص حفاظت کی گولیاں بنوا کر لایا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے تینوں کو پانی کے ساتھ جلدی جلدی وہ گولیاں کھلا دیں۔ وہ بولے یہ بہت کڑوی گولیاں ہیں جیسے افیم۔ میں نے کہا، ایسے عالم میں جب اسلام پر ادبار آیا ہے، کیا حفاظت کی گولیاں مصری ڈلی جیسی ہوں گی؟ یہ سن کر تینوں کے، خاص طور سے بڈھے کے، چہرے پر ڈھیروں اطمینان آگیا۔ تھوڑی دیر بعد انٹا غفیل ہو گئے۔ میں جھٹ پٹ سب سے اونچے سفیدے پر چڑھ کر سب سے اونچی شاخ پر تعویذ باندھ آیا۔ پھر ہم دونوں وہاں سے فوراً رفو چکر ہو لئے۔ اب سب سے مشکل مرحلہ تھا پچھم کی طرف کا تعویذ باندھنا۔ تم جانو پچھم طرف بھاؤ پوکھرے کا تالاب ہے۔۔"

بھاؤ پوکھرے کا نام سن کر اکرم کے بدن میں بھی سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

"بھاؤ پوکھرے میں۔۔" انھوں نے سرگوشیوں والے انداز میں کہا، حالانکہ اسکول کی شکستہ عمارت کے پیچھے اس ٹوٹی بنچ پر ہم دو متنفس کے علاوہ کوئی ذی روح نہیں تھا۔ "بھاؤ پوکھرے میں کھکھوسٹ کی شکل میں تالاب کا پرانا بھوت تھا جو بس حاجی میاں سے ڈرتا تھا۔۔۔ میاں کے نانا،" انھوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

"نہ پوچھو اس وقت کا کیا عالم تھا۔ میں آگے آگے اور تعویذ میرے ہاتھ میں۔ لسوا پیچھے پیچھے اور لاٹھی اس کے ہاتھ میں۔ جب ہم تالاب کے کنارے پہنچے تو وہاں کا سب سے اونچا درخت ایک پرانا شیشم تھا۔ اس شیشم کے درخت سے پہلے تالاب کے کنارے والے پرانے کجری پر کھکھوسٹ زور سے چلایا۔ لسوا تو قل ہو اللہ بھی بھول گیا مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر تمھارے نذیر چچا کو اپنا عمل یاد تھا۔ میں نے درود شریف پڑھ کر آیت الکرسی شریف کا ورد کیا اور لسوا کی لاٹھی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مجھے کوئی ڈر ور نہیں لگ رہا تھا بس اس کی لاٹھی اس لئے ہاتھ میں لے لی کہ کہیں لسوا خوف کے مارے لاٹھی ہی زمین پر نہ گرا دے۔ یہ کہہ کر انھوں نے اکرم کی آنکھوں میں جھانک کر اپنے سچ کا امتحان کیا۔ وہ امتحان میں پورے اترے، کیوں کہ اکرم کو معلوم تھا کہ ایسے موقعے پر آنکھوں میں تجسس کی چمک کا شائبہ تو بے شک ہونا چاہئے لیکن بے یقینی کا رنگ رتی برابر نہ ہو۔

"تب۔" نذیر چچا کھنکھارے جیسے دم لینا چاہتے ہوں۔ "تب میں نے لاٹھی اوپر کر کے اس کھکھوسٹ سے کہا کہ میں حاجی میاں ہوں اور یہ میری بندوق ہے۔ بس اتنا سن کر وہ کھکھوسٹ تالاب میں ڈبکی لگا گیا۔ اب ہم شیشم کے درخت پر چڑھنے کی جگہ تلاش کر رہے تھے کہ درخت کی ایک شاخ پر ایسی آواز ہوئی جیسے وہاں کوئی بیٹھا ہو۔ لسوا تو ڈر کے مارے اول فول بکنے لگا۔ میں نے اسے ڈانٹا۔ اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں وہم بھی بہت ہوتے ہیں۔ میں دھیرے دھیرے درخت پر چڑھ گیا اور سب سے اونچی شاخ پر جا کر دم لینے کو ٹھہرا۔ اور سب سے اونچی ایک پتلی ڈالی میں جیسے ہی تعویذ باندھا وہ ڈالی تعویذ سمیت ہوا میں اڑ گئی۔ وہ ڈالی نہیں، شیشم پر بیٹھا ایک پرانا گدھ تھا جو نیند میں تھا اور ہم اسے اندھیرے کی وجہ سے نہیں دیکھ سکے تھے۔"

گدھ کا نام سن کر اکرم مضطرب ہوا تھا۔ اس نے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں کیا۔

"دوسرے دن ہم صبح صبح سائیں کے تکیے پر پہنچے۔ سائیں کو پورا احوال سنایا۔ سائیں کچھ دیر چپ رہے پھر بولے۔ 'تعویذ باندھنے کی ایک شرط تھی کہ تم عاملوں کے سوا کسی کو پتہ نہ چلے۔ وہ شرط پوری کہاں ہوئی؟' ہم نے کہا سائیں، ہم دونوں عاملوں کے سوا بھلا کس کو معلوم ہوا کہ ہم نے شہر کے چاروں کونوں پر تعویذ کا حصار کیا ہے۔

"سائیں نے کہا، 'احمق۔ پتو کے تال میں دو تیتروں نے تیری کارگذاری دیکھی۔ بھاؤ پوکھرے پر بھتنے کھکھوسٹ نے تیرا احوال دیکھا اور شیشم کا گدھ تو سوچا تعویذ ہی لے اڑا اور تو کہتا ہے کہ ہم دو عاملوں کے علاوہ کس نے دیکھا۔ کیا تجھے معلوم نہیں وہ تیتر چتا کے بھوتوں کے ہیر تھے۔ وہ کھکھوسٹ انھیں کفاروں کا بھتنا ہے اور وہ بوڑھا گدھ انھیں لوگوں کا ہرکارہ ہے۔ تم لوگوں نے میری ساری ریاضت راکھ کر دی۔'

"یہ کہہ کر سائیں نے چلم کی راکھ کو زمین پر پھینک کر دوسری چلم تیار کی۔ ہم دونوں روہانسو ہو گئے تھے۔ سائیں نے ہم دونوں کے چہروں پر رات کی تکان اور ملال دیکھ کر کہا۔

"'پھر بھی۔۔ پھر بھی اثر ہوگا۔ نذیرے تو دیکھ، اثر ہوگا۔ ہونا ہی ہوتا ہے۔'"

"بس ہم دونوں کے چہرے کھل اٹھے۔ سائیں کو نذرانہ دے کر ہم لوگ اپنے اپنے گھروں میں آ کر انتظار کرنے لگے کہ کہاں سے خبر آتی ہے۔"

"پھر نذیر چچا۔ کیا اس دن کفار پر کوئی آفت آئی؟"

نذیر چچا نے اپنی گردن کے خم کو سیدھا کیا۔

"اے لو۔ ایک دو؟ برہمن پوری سے پنڈتوں کا لونڈا اچھا بھلا اپنے گھر سے نکلا، نالی پر پیر پھسلا۔ سڑک سے سر ٹکرایا اور وید کے پاس بھی نہیں پہنچ سکا۔ کن ٹولے میں کلوا دھوبی اپنی بھینس کو لے کر نہر کی طرف چلا۔ اب پوچھو بارش ہو رہی ہے تو بھینس کو نہر پر لے جانے کی کیا ضرورت ہے مگر تعویذ تو اندھا کر دیتا ہے نہ۔ بس پلیا تک پہنچا تھا کہ بادل گڑگڑائے، بجلی گری اور بھینس سمیت کلوا دھوبی فی النار والسقر۔ اسٹیشن سے ہتھیا یکے والے کو چاروں سواریاں ہندو ملیں۔۔۔ یہ بڑی بڑی مونچھیں۔ لوگوں نے بعد میں بہت تاویلیں کیں کہ بستی میں رشتے کے لئے لڑکی دیکھنے آ رہے تھے۔ لیکن حقیقت تو ہمیں معلوم ہے۔ وہ چاروں بری نیت سے قصبے میں آئے تھے کہ رات کو کسی مسلمان کے گھر پر دھاوا بولنا ہے۔ ہاں تو یکہ سیدوں والے باغ سے نکلتے ہی کنکر کی سڑک پر، جہاں پتھر اینٹ نام کو نہ تھی، ایسا پھسلا کہ

بیٹھنے کو کہا۔ ان سارے ملنگوں کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ جب وہ چلم کا طویل کش لیتے تو چلم پر رکھی ہوئی چرس میں شعلہ سا بلند ہوتا۔ ایک ایک کے پاس تین تین شعلے تھے۔ جب وہ شغل کر کے ذکر میں مصروف ہوئے تو ہم اور لبھو وہیں ڈرے ڈرے بیٹھے رہے۔ سوچتے رہے کہ بیکار میں ان ملنگوں کے پاس آئے۔ تب سائیں نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا، کیوں آئے ہو؟''

'''سائیں کفاروں کے خاتمے کا تعویذ چاہیے۔'

'''ملے گا، ضرور ملے گا۔ کل صبح کے بعد زوال کے وقت آؤ۔'''

''ہم دونوں زوال کے وقت پہنچے تو سائیں اکیلے بیٹھے تھے اور انھوں نے اپنے بال کھول رکھے تھے جو بانسوں کے جھولوں پر پڑے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ کوئی دس ہاتھ کے ہوں گے۔ سائیں نے اپنے شلوکے سے چار تہ کیے ہوئے زعفرانی کاغذ نکالے۔

'''انھیں شہر کے چاروں کونوں پر کسی درخت کی سب سے اونچی شاخ پر باندھنا ہے۔ عاملوں کے علاوہ کوئی جان نہ سکے کہ یہ کام کس کا ہے۔'''

''عامل کون؟''

''میں نے کچھ خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

'''تم دونوں۔ اور کون۔'''

''ہم دونوں نے اپنے عامل ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن ایک خلش سی تھی کہ بغیر کسی محنت کے ہم عامل کیسے ہو گئے۔ لبھو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا، سائیں۔ ہم لوگوں نے کچھ پڑھا نہ عامل کیا۔ ہم عامل کیسے ہو گئے؟''

''سائیں بولے۔ 'عامل وہ ہوتا ہے جو عمل کرے۔ عمل کا مطلب کام۔ تم نے یہ کام کیا ہے کہ کفاروں کو اس بستی سے نکالنے کا ارادہ کیا ہے۔ بس تم عامل ہو گئے۔ سائیں کہتا ہے کہ تم عامل ہو گئے۔'''

''یہ کہہ کر سائیں نے ایک نعرہ لگایا:

تتی روٹی ایک ادھیلا

دھرمکن پور پہنچادے سویرا

''یہ نعرہ لگا کر جب سائیں خاموش ہوئے تو ان کی آنکھیں رات سے زیادہ سرخ تھیں۔ ہم عامل لوگ ڈر گئے۔ سائیں نے ہمارے ڈر کو بھانپ لیا اور بولے۔

'''ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ان تعویذات کو راتوں رات قصبے کے چاروں کونوں پر درختوں کے سب سے اونچی شاخ پر باندھ کر آنا ہے۔ کسی کو کانوں کان...'''

'''آپ نشاخاطر رہیں سائیں۔'' لبھو بولا۔ ہوشیار انسان تھا..با جوانی میں ختم ہوا۔ ساٹھ کا بھی تو نہیں ہوا تھا کہ تپ دق اٹھا لے گئی۔''

نذیر چچا نے اپنے ساتھی الیاس عرف لبھو کی طرف رخ پھیر دیا تھا۔

''نذیر چچا۔ پھر آپ لوگوں نے وہ تعویذ باندھے؟''

''ہاں۔ سنتے رہو۔ دھیرج کے ساتھ سنا کرو ایسے معاملات۔'' نذیر چچا کے لہجے کی شفقت میں کچھ کچھ سختی کا عنصر بھی تھا۔ غالباً وہ کچھ دیر اور اپنے ساتھی کو یاد کرنا چاہتے تھے۔'' اکرم شرمندہ ہو گیا۔ ''جی چچا۔''

''ہم دونوں اسی رات عشا کے بعد... عشا کے بہت بعد قصبے کے چاروں کونوں پر سب سے اونچے درخت کی شاخ پر وہ تعویذ باندھ کر آئے۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ ایک تو ہم دونوں کو درخت پر چڑھنا نہیں آتا تھا۔ پھر یہ سب سے اونچی شاخ کا معاملہ بہت سخت تھا۔ اسٹیشن کی طرف سیدوں والے باغ کا معاملہ آسان تھا کہ وہ باغ تو ہم نے کئی سال رکھایا بھی تھا۔ شہر کی طرف چتو کے تالاب پر ہندوؤں کی چتائیں جلتی تھیں۔ لبھو نے کہا کہ ہم ان ہی لوگوں کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ کہیں کسی چتا سے ان میں کا کوئی بھوت نہ نکل پڑے۔

''میں نے آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم کی۔ چھوٹے موٹے عملیات سے تو میں بچپن سے ہی واقف تھا۔'' یہ کہہ کر نذیر چچا نے اکرم کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔ اکرم نے بھی ان کے دلخواہ تاثرات دیئے۔

''بس۔ آیت الکرسی کا پڑھنا تھا کہ لبھو ہرن ہو گیا۔ چتاؤں سے پیر بچاتے، اب بھلا بلا وجہ جھگڑا مول لینے سے کیا فائدہ تھا، ہم لوگ آگے بڑھتے گئے۔ چتو کے تال پر سب سے اونچا درخت بیری کا تھا جس کی اونچی شاخ پر تعویذ باندھنا مشکل کام نہ تھا۔ میں نیچے کھڑا رہا۔ لبھو اوپر جا کر تعویذ باندھ آیا۔ جب وہ تعویذ باندھ کر نیچے اتر رہا تھا تو بیریا میں سے ایک تیتر پھر سے اڑا۔ لبھو ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ دوسرا تیتر بھی پھر سے اڑ گیا۔ لبھو بھد سے زمین پر آن گرا۔ میں نے ہنس کر اسے اٹھایا۔ میں تو جانتا تھا کہ وہ کوئی بدروحیں نہیں، بھورے تیتر تھے جو رات کو اسی بیریا پر بسیرا لیتے تھے۔''

''باقی دو طرف کے تعویذ؟'' اکرم نے بے چینی سے پوچھا۔

''سنتے رہو۔ تم جلدی بہت کرتے ہو۔ کیا دھوپ لگ رہی ہے؟''

''نہیں نذیر چچا۔ بہت دل لگ رہا ہے آپ کی باتوں میں۔ آج آپ سے برسوں بعد تو ملاقات ہوئی ہے۔ جلدی کیسی۔''

''ہاں تو دکھن طرف کے درخت کی چوٹی پر تعویذ باندھنا ایک بڑا مرحلہ تھا۔ میں نے لبھو سے کہا یہ کام تم نہ کر سکو گے۔ یہ کام نذیر کرے گا۔ اصل میں دکھن طرف کا باغ جج صاحب کا تھا اور جج صاحب کے باغ میں ہر موسم میں مالی رہتے تھے۔ اس کی ترکیب میں نے سوچ رکھی تھی۔ میں افیم کی دو تین چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر لے گیا۔ باغ میں جب ہم داخل ہوئے تو مالیوں نے شور مچایا۔ میں نے ڈپٹ کر کہا۔ خاموش جاہل قوم۔ میں نذیر چچا ہوں۔ بس اتنا سن کر مالی ہمارے پاس آ کر یوں کھڑے ہو گئے جیسے ہم ان سے آموں کا سودا کرنے آئے ہوں۔ بڈھے مالی نے کہا، نذیر چچا اتنی رات کو باغ میں کیسے آنا ہوا۔ تب، اللہ معاف فرمائے، میں نے ایک جھوٹ بولا۔ میں نے ان تینوں کو ان کی جھونپڑی میں لے

جا کر کہا کہ آج کل کے حالات بہت خراب ہیں۔ دور دور سے فسادات کی خبریں آرہی ہیں۔ تم لوگ جنگل میں رہتے ہو، تمھارے لئے خاص حفاظت کی گولیاں بنوا کر لایا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے تینوں کو پانی کے ساتھ جلدی جلدی وہ گولیاں کھلا دیں۔ وہ بولے یہ بہت کڑوی گولیاں ہیں جیسے افیم۔ میں نے کہا، ایسے عالم میں جب اسلام پر ادبار آیا ہے، کیا حفاظت کی گولیاں مصری ڈلی جیسی ہوں گی؟ یہ سن کر تینوں کے، خاص طور سے بڈھے کے، چہرے پر ڈھیروں اطمینان آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد انا شغفیل ہو گئے۔ میں جھٹ پٹ سب سے اونچے سفیدے پر چڑھ کر سب سے اونچی شاخ پر تعویذ باندھ آیا۔ پھر ہم دونوں وہاں سے فوراً رفو چکر ہو لئے۔ اب سب سے مشکل مرحلہ تھا پچھم کی طرف کا تعویذ باندھنا۔ تم جانو پچھم طرف بھاؤ پوکھرے کا تالاب ہے۔"

بھاؤ پوکھرے کا نام سن کر اکرم کے بدن میں بھی سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

"بھاؤ پوکھرے میں..." انھوں نے سرگوشیوں والے انداز میں کہا، حالانکہ اسکول کی شکستہ عمارت کے پیچھے اس ٹوٹی بنچ پر ہم دو متنفس کے علاوہ کوئی ذی روح نہیں تھا۔ "بھاؤ پھوکھرے میں کھکھوست کی شکل میں تالاب کا پرانا بھوت تھا جو بس حاجی میاں سے ڈرتا تھا... میاں کے نانا۔" انھوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

"نہ پوچھو اس وقت کا کیا عالم تھا۔ میں آگے آگے اور تعویذ میرے ہاتھ میں۔ لہسوا پیچھے پیچھے اور لاٹھی اس کے ہاتھ میں۔ جب ہم تالاب کے کنارے پہنچے تو وہاں کا سب سے اونچا درخت ایک پرانا شیشم تھا۔ اس شیشم کے درخت سے پہلے تالاب کے کنارے والے پرانے فجری پر کھکھوسٹ زور سے چلایا۔ لہسوا تو قل ہو اللہ بھی بھول گیا مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر تمھارے نذیر چچا کو اپنا عمل یاد تھا۔ میں نے درود شریف پڑھ کر آیت الکرسی شریف کا ورد کیا اور لہسوا کی لاٹھی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مجھے کوئی ڈر ور نہیں لگ رہا تھا بس اس کی لاٹھی اس لئے ہاتھ میں لے لی کہ کہیں لہسوا خوف کے مارے لاٹھی ہی زمین پر نہ گرا دے۔ یہ کہہ کر انھوں نے اکرم کی آنکھوں میں جھانک کر اپنے سچ کا امتحان کیا۔ وہ امتحان میں پورے اترے، کیوں کہ اکرم کو معلوم تھا کہ ایسے موقعے پر آنکھوں میں تجسس کی چمک کا شائبہ تو بے شک ہونا چاہئے لیکن بے یقینی کا رنگ رتی برابر نہ ہو۔

"تب۔" نذیر چچا کھنکھارے جیسے دم لینا چاہتے ہوں۔ "تب میں نے لاٹھی اوپر کر کے اس کھکھوسٹ سے کہا کہ میں حاجی میاں ہوں اور یہ میری بندوق ہے۔ بس اتنا سن کر وہ کھکھوسٹ تالاب میں ڈبکی لگا گیا۔ اب ہم شیشم کے درخت پر چڑھنے کی جگہ تلاش کر رہے تھے کہ درخت کی ایک شاخ پر ایسی آواز ہوئی جیسے وہاں کوئی بیٹھا ہو۔ لہسوا تو ڈر کے مارے اول فول بکنے لگا۔ میں نے اسے ڈانٹا۔ اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں وہم بھی بہت ہوتے ہیں۔ میں دھیرے دھیرے درخت پر چڑھ گیا اور سب سے اونچی شاخ پر جا کر دم لینے کو ٹھہرا۔ اور سب سے اونچی ایک پتلی ڈالی میں جیسے ہی تعویذ باندھا وہ ڈالی تعویذ سمیت ہوا میں اڑ گئی۔ وہ ڈالی نہیں، شیشم پر بیٹھا ایک پرانا گدھ تھا جو نیند میں تھا اور ہم اسے اندھیرے کی وجہ سے نہیں دیکھ سکے تھے۔"

گدھ کا نام سن کر اکرم مضطرب ہوا تھا۔ اس نے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں کیا۔

"دوسرے دن ہم صبح صبح سائیں کے تکیے پر پہنچے۔ سائیں کو پورا احوال سنایا۔ سائیں کچھ دیر چپ رہے پھر بولے۔ 'تعویذ باندھنے کی ایک شرط تھی کہ تم عاملوں کے سوا کسی کو پتہ نہ چلے۔ وہ شرط پوری کہاں ہوئی؟' ہم نے کہا سائیں، ہم دونوں عاملوں کے سوا بھلا کس کو معلوم ہوا کہ ہم نے شہر کے چاروں کونوں پر تعویذ کا حصار کیا ہے۔

"سائیں نے کہا، 'احمق۔ چتو کے تال میں دو تیتروں نے تیری کارگذاری دیکھی۔ بھاؤ پوکھرے پر بھتنے کھکھوسٹ نے تیرا احوال دیکھا اور شیشم کا گدھ تو سموچا تعویذ ہی لے اڑا اور تو کہتا ہے کہ ہم دو عاملوں کے علاوہ کس نے دیکھا۔ کیا تجھے معلوم نہیں وہ تیتر چتا کے بھوتوں کے بیر تھے۔ وہ کھکھوسٹ انھیں کفاروں کا بھتنا ہے اور وہ بوڑھا گدھ انھیں لوگوں کا ہرکارہ ہے۔ تم لوگوں نے میری ساری ریاضت راکھ کر دی۔'

"یہ کہہ کر سائیں نے چلم کی راکھ کو زمین پر پھینک کر دوسری چلم تیار کی۔ ہم دونوں روہانسو ہو گئے تھے۔ سائیں نے ہم دونوں کے چہروں پر رات کی تکان اور ملال دیکھ کر کہا۔

"'پھر بھی... پھر بھی اثر ہوگا۔ نذیرے تو دیکھ، اثر ہوگا۔ ہونا ہی ہونا ہے۔'"

"بس ہم دونوں کے چہرے کھل اٹھے۔ سائیں کو نذرانہ دے کر ہم لوگ اپنے اپنے گھروں میں آ کر انتظار کرنے لگے کہ کہاں سے خبر آتی ہے۔"

"پھر نذیر چچا۔ کیا اس دن کفار پر کوئی آفت آئی؟"

نذیر چچا نے اپنی گردن کے خم کو سیدھا کیا۔

"اے لو۔ ایک دو؟ برہمن پوری سے پنڈتوں کا لونڈا اچھا بھلا اپنے گھر سے نکلا، نالی پر پیر پھسلا۔ سڑک سے سر ٹکرایا اور وید کے پاس بھی نہیں پہنچ سکا۔ سن ٹولے میں کلوا دھوبی اپنی بھینس کو لے کر نہر کی طرف چلا۔ اب پوچھو بارش ہو رہی ہے تو بھینس کو نہر پر لے جانے کی کیا ضرورت ہے مگر تعویذ تو اندھا کر دیتا ہے نہ۔ بس پلیا تک پہنچا تھا کہ بادل گڑگڑائے، بجلی گری اور بھینس سمیت کلوا دھوبی فی النار والسقر۔ اسٹیشن سے ہتھیا یکے والے کو چاروں سواریاں ہندو ملیں... یہ بڑی بڑی مونچھیں۔ لوگوں نے بعد میں بہت تاویلیں کیں کہ بستی میں رشتے کے لئے لڑکی دیکھنے آ رہے تھے۔ لیکن حقیقت تو ہمیں معلوم ہے۔ وہ چاروں بری نیت سے قصبے میں آئے تھے کہ رات کو کسی مسلمان کے گھر پر دھاوا بولنا ہے۔ ہاں تو یکہ سیدوں والے باغ سے نکلتے ہی کنکر کی سڑک پر، جہاں پتھر اینٹ نام کو نہ تھی، ایسا پھسلا کہ

پورا ایک پہلو کے بل زمین پر اور چاروں مسٹنڈوں کے اتنی چوٹیں آئیں کہ قصبے میں ہلدی چونا کم پڑ گیا۔"

اب نذیر چچا ٹھکنے سے لگے تھے۔

"نذیر چچا۔ اس دن قصبے میں کوئی مسلمان مرا کہ نہیں؟"

"ہاں بیٹا۔ بدو درزی کی ماں فوت ہوئی، دق کی پرانی مریضہ تھی۔ فقیرا کمنگر کا باپ اللہ کو پیارا ہو۔ بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔"

پھر نذیر چچا نے اکرم کی آنکھوں میں رنجیدہ نگاہوں سے کچھ تلاش کیا اور بولے۔

"قضا و قدر پر کس کو اختیار ہے۔ ان مسلمانوں کی موت اسی دن لوح محفوظ پر لکھ دی گئی تھی۔ لیکن کفار تعویذ کی برکت سے واصل"... وہ کہتے کہتے رک گئے اور زمین پر پڑے ٹوٹے سکوروں کو دیکھنے لگے۔

"ہم نے سائیں کے پاس جا کر ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

"سائیں بولے۔

"'بدبختو!! اگر تعویذ کسی کے علم میں آئے بغیر لگاتے تو آج کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔'

"ہم نے بڑی التجا کی کہ پھر سے تعویذ مل جائیں، لیکن سائیں راضی نہیں ہوئے۔ کہنے لگے کہ 'عامل کا امتحان ایک بار ہوتا ہے۔ بس۔'

"بیٹا! اس زمانے میں سیکڑوں ہندو مسلمان آپس میں کٹ مرے تھے۔ ہمارے بہت سے عزیز رشتے دار بھی کام میں آئے تھے، شہید ہوئے تھے۔ ان کے غم میں ہمیں چین نہیں آتا تھا۔ ہم نے سائیں سے کہا کہ کچھ نہ کچھ انتظام اور کرنا ہوگا۔ ہماری خاطر۔

"تب سائیں نے اپنے بال سمیٹے اور نعرہ لگا کر کہا۔

تتی روٹی ایک ادھیلا

دھر مکن پور پہنچا رے سویرا

"اور کہا کہ 'نذیر، اب میں ایسا انتظام کروں گا کہ تیرا دل خوش ہو جائے گا۔ بس یہ بتا کہ بڑی لان کا ایسا اسٹیشن کون سا ہے جس کے آس پاس صرف کفار رہتے ہوں۔'

"ہم اور لہسو بہت دیر تک سوچتے رہے۔ ہم لوگ تو زیادہ تر چھوٹی لان کی پسنجر گاڑیوں پر سفر کرتے تھے۔ بڑی لان کے اسٹیشنوں کی خبر نہیں تھی۔ لیکن قربان جاؤں مولا کے کہ فوراً روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔

"آگرہ میں راجا منڈی کا اسٹیشن!

سائیں اچھل پڑے، گلے سے لگا لیا۔ لہسو ابھی ہاتھ پھیلا کر ان سے گلے ملنے کو بڑھا۔ اسے روک دیا۔ وہ نہاتا کم تھا۔ بولے۔

"'دو چار دن میں اخبار میں پڑھ لینا۔'"

"کیا پڑھ لیں سائیں؟"

"'بس تم خود ہی سمجھ جاؤ گے۔ اب جاؤ، میرے شغل کا وقت ہو رہا ہے۔'"

"ہم دونوں کچھ سمجھے کچھ نہیں سمجھے۔ لہسو تو شاید بالکل نہیں سمجھا۔ لیکن تمھارا نذیر چچا کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سب روشن تھا۔

"کیا روشن تھا نذیر چچا؟"

"سنتے رہو۔ جلدی بہت کرتے ہو۔ تمھارے والد مرحوم میں یہ عادت نہیں تھی۔"

اکرم اپنی جلد بازی پر شرمندہ ہوا۔

"بس اس دن کے بعد میں منا چائے والے کی دوکان پر الجمعیۃ اخبار لے کر صبح سے شام تک پڑھتا رہتا۔ لہسو امیرے کولھے سے کولھا ملائے بیٹھا میری آنکھوں کی طرف دیکھتا رہتا کہ کب میری آنکھیں چمکیں۔ اخبار میں ہر طرح کی خبر چھپتی لیکن راجا منڈی اسٹیشن کے بارے میں کچھ نہیں چھپتا۔ ہم نے ایک ہفتے تک انتظار کیا۔ پھر ایک دن سائیں کے پاس مایوس مایوس سے گئے۔

"سائیں اپنے خلفاؤں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھ کر بولے۔

'مبارک ہو نذیرے مبارک۔'

"ہم نے قریب جا کر جوش کے ساتھ کہا۔

"آپ کو بھی مبارک سائیں۔ مگر ہمیں کچھ خبر نہیں لگ سکی۔"

'اب یہ خبر اخبار میں تو آئے گی نہیں۔ اخبار تو سارے کفار کے ہاتھ میں ہیں۔'

"نہیں سائیں۔ ہم تو "الجمعیۃ" پڑھتے ہیں۔ وہ تو خالص مسلمانوں کا اخبار ہے۔"

'بس نام بھر کو مسلمانوں کا۔ مسلمان بے چارہ دنیا جہان کی خبریں چھانٹتا ہے۔ محنت سے رات رات بھر بیٹھ کر لکھتا ہے لیکن کاتب تو سارے کے سارے کایستھ ہیں، پریس میں مزدور تو سارے کے سارے اہل کفار ہی ہیں۔ بھلا وہ خبر اخبار میں کیسے چھپ پاتی جس سے تمھارا دل باغ باغ ہو جاتا؟'

"تو سائیں آپ ہی بتا دیجیے کہ معاملہ کیا ہوا؟" ہم لوگ بے تاب ہو رہے تھے۔

"سائیں نے شام کے اندھیرے میں چاروں طرف خاموشی سے دیکھا اور پوچھا۔

'ہم لوگوں کے علاوہ کوئی اور تو نہیں ہے یہاں؟'

"ان کے خلیفہ لوگ بولے۔ 'کچھ کہہ نہیں سکتے۔ آج کل ہر طرف جاسوس لگا ہے۔ چپے چپے پر۔'

"سائیں نے ہم سب کو حکم دیا کہ ہم لوگ سو سو گز تک دیکھ کر آئیں کہ کوئی ذی روح قریب میں کھڑا ہماری بات تو نہیں سن رہا ہے۔

"ان کے پانچوں خلیفہ اور ہم دونوں دوست نکل کھڑے ہوئے۔ نکل کیا کھڑے ہوئے، وہیں کے وہیں تو دیکھتا تھا۔ ہم لوگوں نے چار پایوں کے نیچے گھوڑا بن بن کر دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے درختوں کو جھاڑ جھاڑ کے دیکھا۔ سڑک کنارے کھڑے خالی ٹیکوں کی ڈھبریاں تک کھول کر دیکھ لی گئیں۔ دور دور تک ہم لوگوں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ پھر ہم لوگ جلدی سے سائیں کے پاس آئے اور بتایا کہ اب یہاں ہمارے علاوہ کوئی بھی نہیں ہے۔ تب سائیں نے ہم سب کو اس طرح حلقے میں بٹھایا کہ ہم لوگوں کے درمیان اتنی جگہ بھی نہیں بچی کہ چوہے کا بچہ بھی نکل سکے۔ اب سائیں نے بتانا شروع کیا۔ ان کی آواز سرگوشیوں سے زیادہ نہیں تھی۔

'پرسوں جمعرات کی شام راجا منڈی پر بڑی لائن کا انجن پاگل ہوگیا۔ لائن سے کود کر راجہ منڈی محلے کے گھروں میں گھس گیا۔ چن چن کر کفاروں کے گھروں کو تہس نہس کر دیا۔ ایک بھی موجود آدمی زندہ نہیں بچ سکا۔'

"ہم سب نے زمین پر، اسی ننگی زمین پر گر کر سجدہ شکر ادا کیا۔

"تب سائیں بولے۔

'انجن کو پاگل کرنے والا عمل میں نے اسی دن شروع کر دیا تھا جب تم میرے پاس مایوس ہو کر آئے تھے۔'

"تب ہم سب نے اٹھ کر سائیں کے گھٹنوں پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔

"سائیں بولے، 'سرکار بہت پریشان ہے۔ اس نے اس خبر کو آگرہ سے باہر نہیں جانے دیا۔ سرکاری اعلان ہے کہ جو شخص بھی اس واقعے کے بارے میں زبان کھولے گا، قلعے کے دروازے پر سولی پر چڑھا دیا جائے گا۔'''

اکرم نے دیکھا، نذیر چچا اتنا کہہ کر تھک گئے ہیں اور اب آنکھیں نیم وا کئے اسی زمانے میں پہنچ چکے ہیں۔

"بیٹا! اس دن کے بعد میں جب بھی "الجمعیۃ" اخبار پڑھتا اور لہسوا میرے پاس ہوتا تو ہم دونوں دوسروں کی نظر بچا کر مسکرانے لگتے۔ لوگوں نے ہمارے مسکرانے کا سبب جاننے کے لئے سو سو جتن کئے مگر ہم نے کبھی حقیقت سے پردہ نہیں اٹھایا۔"

نذیر چچا کے تیور اس وقت اک ایسے جانباز سپہ سالار کے سے تھے جو دشمنوں کے نرغے میں کھڑا ہوا اعلان کر رہا ہو کہ چاہے میری گردن اتار دو، میں اپنے چھپے ہوئے ساتھیوں کا پتہ نہیں بتاؤں گا۔

"لیکن نذیر چچا اخباروں میں تو دنیا جہان کی خبریں چھپتی ہیں۔ آپ کس کس کو جھٹلا پائیں گے؟" اکرم نے بہت ادب سے پوچھا۔

"مثلاً؟" نذیر چچا کے لہجے میں ایک خاص طرح کا تیکھا پن تھا۔

"مثلاً... یعنی کہ..." اکرم کی سمجھ میں فوراً کوئی بات نہیں آئی۔

سورج اب بالکل ان کے سروں پر آ گیا تھا۔ اچانک اسے یاد آیا۔

"مثلاً یہ کہ انسان نے چاند پر قدم رکھ دیا۔"

بوڑھے اور کمزور نذیر چچا نے اپنی پوری طاقت سے قہقہہ لگایا اور اس قہقہے میں ان کی شعوری کوشش کا بہت کم دخل تھا۔

"واہ بیٹے! ہم نے سنا تھا کہ تم سائنسداں ہو گئے ہو۔ ہم تو قصبے میں تمہاری بڑی تعریفیں کرتے تھے۔ کیا تمہیں بھی اس بات پر یقین ہے کہ وہ لوگ چاند پر ہی اترے تھے؟"

اکرم سٹ پٹا گیا۔

"چچا ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ لوگ چاند پر ہی اترے تھے۔"

"کسی نے اپنی آنکھ سے دیکھا؟ کوئی عینی شاہد؟"

"ہاں ہاں چچا، لاکھوں انسانوں نے، میں نے خود۔"

"چاند تو آسمان پر ہے۔ بہت دور۔ تم نے اپنی آنکھوں سے کیسے دیکھ لیا؟"

"چچا میں نے اور تمام لوگوں نے ٹیلی ویژن پر دیکھا۔ براہ راست اپنی آنکھوں سے بھلا انہیں چاند پر اترتے دیکھ سکتا ہے کوئی؟"

"یہی۔ بالکل یہی بات میں بھی کہتا ہوں۔ چند مشرک ممالک ساری دنیا کے ساتھ ایک مذاق کر رہے ہیں اور ہمارے پڑھے لکھے نوجوان بھی اسی مذاق کا شکار بن رہے ہیں۔"

"میری بات غور سے سنو! تم لوگ شہروں میں رہ کر جو پڑھا لکھا تھا، اسے بھی گدھے پر لاد چکے ہو۔ پہلی بات تو یہ فرض کر لو کہ کوئی جہاز اپنی لمبی مسافت طے کر کے چاند کے پاس پہنچ بھی جائے تو اس پر اتر کیسے سکتا ہے، پھسل کر زمین پر نہیں آ رہے گا؟ دوسری بات یہ کہ جس دن یہ افواہ پھیلائی گئی تھی کہ انسان چاند پر پہنچ گیا اس دن ہم نے اور لہسوا نے خوب غور سے ادسرے کے میدان میں جا کر چاند کو دیکھا تھا۔ اگر اس وقت اس پر کوئی انسان ہوتا تو چاند میں تھوڑی بہت کپکپاہٹ تو ہوتی۔ چاند بالکل ویسا کا ویسا ہی تھا۔ تیسری بات ایک مثال کے ذریعے سمجھاتا ہوں۔ تمہارے پاس ٹارچ ہوگی۔ اس کے شیشے پر اگر ایک مکھی بیٹھ جائے اور تم ٹارچ کو اندھیرے کمرے میں روشن کر کے سفید دیوار پر اس کا فوکس ڈالو تو مکھی کی جسامت جتنا بڑا دھبہ دیوار پر بھی پڑے گا۔ پورا فوکس بغیر دھبے کے نہیں پڑے گا۔ اگر اس پر انسان تھا تو چاند کی چاندنی میں تو رتی برابر کا فرق نہیں آیا۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ چاند تو حضور کے زمانے میں شق ہو چکا ہے۔ اگر کوئی آدمی اس پر کسی طرح اتر بھی جاتا تو وہ اس درار میں سے کیسے بچ کر نکل پاتا؟"

"نذیر چچا آپ کو پتہ نہیں نیل آرم اسٹرانگ نے بتایا تھا کہ چاند پر بہت بڑے بڑے گڈھے اور دراریں ہیں۔ یقیناً وہ شق القمر کے وقت سے ہی ہوں گی۔"

"اکرم بیٹا! یہ سب ان مشرکوں کی سوچی سمجھی سازش ہے کہ ایک آدھ بات مسلمانوں کے مطلب کی بھی کہہ دو تا کہ وہ ان کے جھوٹ کا شکار بننے میں بے عزتی نہ محسوس کریں۔"

اب اکرم لاجواب ہونے کی منزل پر آ چکا تھا۔ اس نے نذیر چچا کا

چہرہ دیکھا۔ ان کے چہرے پر ابھی بھی جو سرخی چھلک کر آتی تھی اس نے انھیں جوان بنا دیا تھا۔

تب اکرم کو ایک بھولی بسری بات یاد آئی۔ ''نذیر چچا! وہ لوگ تو چاند سے ثبوت کے طور پر پتھر کے ٹکڑے بھی لائے تھے۔ اب آپ کیا کہیں گے؟''

''ہم وہی کہیں گے جو ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں اور جو اصل سچائی ہے کہ ان مشرکین نے امریکہ کے کسی دور دراز پہاڑ پر اپنا جہاز اتار دیا اور وہاں عجیب وغریب تصویریں کھینچ کھانچ کر اور وہیں کے پتھر توڑ تاڑ کر لے آئے۔''

''لیکن چچا وہ پتھر تو بالکل الگ طرح کے ہیں۔'' اکرم نے کہا۔

''دنیا کے ہر پہاڑ کے پتھر الگ طرح کے ہیں۔ کیا تم نے ہمالیہ اور وندھیا چل کے پتھروں کا فرق نہیں دیکھا؟ ہمالیہ کے اوپری حصے کے پتھر سلیٹی رنگ کے چکنے پتھر ہوتے ہیں۔ وندھیا چل کے پتھر گہرے بھورے رنگ کے کھردرے پتھر ہوتے ہیں۔ بولو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

اکرم سٹ پٹا گیا۔ اس نے تقریباً جھنجھلاتے ہوئے کہا:

''نذیر چچا کیسی باتیں کرتے ہیں؟ لاکھوں انسانوں نے ان کو چاند پر اترتے دیکھا۔ کیا سب جھوٹے ہیں؟''

''نہیں سب مظلوم ہیں۔ ظالم کے مذاق کا شکار۔ ان سب نے یہ منظر اپنے اپنے ٹیلی ویژن کے ڈبوں پر دیکھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں چچا آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔'' اکرم کو کچھ امید سی بندھی۔ اب وہ آگے بحث کر سکتا تھا کہ ٹیلی ویژن میں انسان وہی سب کچھ دیکھ سکتا ہے جس کا فوٹو کھینچ کر ریل بنائی گئی ہو۔

''ان نصاریٰ و یہود نے کیمروں کی مدد سے پہلے تو چاند کے فوٹو لئے۔ پھر راکٹ جہاز کا فوٹو لیا۔ پھر غباروں جیسا لباس پہنا کر دو تین فرنگیوں کے فوٹو لئے۔ پھر ایک دور دراز کے ان دیکھے پہاڑ کا فوٹو لیا۔ پھر ان سب کو قینچی سے کاٹ پیٹ کر جوڑ دیا اور ساری دنیا کو بیوقوف بنا دیا کہ ان کے آدمی عجیب وغریب لباس پہن کر، چاند گاڑی میں بیٹھ کر چاند پر اتر گئے۔ تف ہے آپ کی تعلیم پر کہ اتنی سی بات آج تک نہیں سمجھ پائے۔'' نذیر چچا کے چہرے پر حقارت سے بھرپور فاتحانہ جذبہ تھا۔

ظہر کی اذان شروع ہو گئی تھی۔ نذیر چچا آہستہ آہستہ اذان کا جواب دے رہے تھے۔ ان کے پورے وجود سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اکرم ان کے سامنے ایک بونے سے بھی کم حقیقت انسان ہے۔

جس وقت وہ اس شکستہ اسکول کے پیچھے سے نکل کر آبادی والی سڑک پر آئے تو کمزور جھکے ہوئے بوڑھے نذیر چچا کے پیچھے چلتے ہوئے اکرم نے محسوس کیا کہ نذیر چچا سر تا پا کوہ ہمالیہ ہیں اور وہ خود وندھیا چل پہاڑ کا ایک چھوٹا سا گہرا بھورا کھردرا پتھر ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے ☆☆☆

غزل

باقر مہدی

کوئی حرفِ نفی نہ کام آیا
کتنی سچی تھی دوستی اپنی

ٹھوکریں کھا کے سرخ رو ٹھہرا
اک دعا ہے یہ زندگی اپنی

اب کہاں ہے کوئی حریف اپنا
خوب ڈرتی ہے بے کسی اپنی

کیسے تاریخ کو بھلا ڈالوں
خوں میں ڈوبی ہے یہ صدی اپنی

کچھ نہ کھاتا ہوں کچھ نہ پیتا ہوں
بھوکی سوتی ہے مفلسی اپنی

خالی بوتل تکا ہی کرتی ہے
کتنی پیاسی ہے مے کشی اپنی

شاید اپنا خدا تراش لیا
اب کہاں ہے وہ بندگی اپنی

شاید اقبال سے ڈری ہوگی
پہلے سرشار تھی خودی اپنی

سارے الفاظ ساتھ چھوڑ گئے
سادہ کاغذ ہے شاعری اپنی

کارواں چھوڑ کے وہ آیا ہے
اک مسافر ہے رہبری اپنی

فیض کا آخری زمانہ: حیات اور شاعری کے پہلو

لدمیلا وسیلیوا

فیض احمد فیض کی باشعور زندگی کا زیادہ تر حصہ سوویت یونین سے وابستہ رہا تھا۔ اس ملک کے لئے ان کا جذبہ جس کو غالباً لگاؤ کہنا سب سے زیادہ مناسب ہوگا، ان کے نظریات سے منسلک تھا۔ سوویت روس سے فیض کا لگاؤ اور ان کے نظریات کی جڑیں بھی ان کے عہدِ جوانی، اور رشید جہاں، محمود الظفر اور دوسرے، ہندوستانی مارکسیوں سے فیض کی واقفیت جیسے مشہور حقائق میں پیوست ہیں۔ فیض کے نظریات ایک مختلف موضوع ہے جو اس مضمون کی حدود سے باہر ہے۔ یہاں فیض احمد فیض کی زندگی اور تخلیقات کے اس پہلو پر غور کیا جائے گا جو سوویت یونین سے ان کی براہِ راست آشنائی سے تعلق رکھتا ہے اور جس کی روشنی میں فیض کے آخری دور کے کلام پر غور کر کے کئی اہم نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

سوویت روس میں فیض کا نام خود فیض سے چند سال پہلے پہنچا تھا۔ پاکستان میں جمہوری قوتوں کی پسپائی اور ساتھ ہی ''راولپنڈی سازش'' کی گونج روس میں بھی سننے میں آئی تھی۔ فیض جیل میں ہی تھے جب ماسکو میں پہلی بار ان کے بارے میں سوویت اخباروں میں تحریریں آنے لگی تھیں، مثلاً ''سامراج کے خلاف دلیر مجاہد، جو اپنے ترقی پسند خیالات کی وجہ سے جیل کی مصیبتیں جھیل رہا ہے۔'' خود فیض صاحب کا سوویت یونین کا پہلا دورہ ۱۹۵۸ میں ہوا تھا۔ اس وقت وہ اور حفیظ جالندھری پاکستانی مندوبین کی حیثیت افروایشیائی مصنفین کی دوسری کانفرنس میں شرکت کے لئے تاشقند آئے تھے۔ اس زمانے میں بھی سوویت روس کے بارے میں مختلف طرح باتیں سننے میں آتی تھیں، اس لئے فیض اپنی آنکھوں سے یہ ملک دیکھنا بہت چاہتے تھے۔ روس جانے کی ان کی دلی مراد بر آئی تھی۔ اس زمانے سے سوویت ملک سے فیض کی براہِ راست واقفیت شروع ہوئی جو ان کے آخری دنوں تک قائم رہی۔ تاشقند کانفرنس میں افروایشیائی مصنفین کی انجمن قائم ہوئی تھی۔ تحریک اور اس کی انجمن میں سرگرم شرکت بھی آخر تک فیض کی زندگی کا ایک حصہ بنی رہی۔ اس تحریک کے اغراض و مقاصد انجمن کی تاشقند قرارداد کے ایک اقتباس سے ظاہر ہوتے ہیں: ''تحریک نے نوآبادیات کے ثقافتی دباؤ کا مقابلہ کرنے اور نوآبادیات کا روحانی جوا اتار پھینکنے کے مقصد سے دانشوروں کو ایک نئی بلند سطح پر متحد کیا (م۔ سلگانیک۔ ص ۲۸۷)۔ تاشقند قرارداد کے تخلیق کاروں کے سرفہرست فیض کا نام تھا۔

سوویت روس کا دوسرا دورہ فیض نے ۱۹۶۲ میں کیا جب ان کو لینن امن انعام سے نوازا گیا۔ یہ سوویت یونین کا سب سے اعلیٰ امتیاز تھا جو غیر ملکی شہریوں کو پیش کیا جا سکتا تھا۔ اب لینن امن انعام یافتہ فیض کے لئے سوویت ملک کے دروازے پوری طرح وا ہو گئے۔ وہ اکثر یہاں آنے لگے، ان کو سب سوویت جمہوریتوں میں جگہ جگہ جانے کا اور زیادہ قریب سے یہاں کی زندگی کا مشاہدہ کرنے کا موقع میسر ہوا۔

مختلف ممالک کے فن کاروں کی طرح فیض بھی سوویت یونین کے لئے پیار بھرا دل لے کر یہاں آئے تھے۔ یہ سب لوگ خلوص دل سے مانتے تھے کہ جو کچھ سوویت ملک میں ہو رہا ہے وہ عالمی پیمانے پر ایک بے نظیر تجربہ ہے اور یہ تجربہ ساری دُنیا کی بھلائی اور پوری انسانیت کی خوشی اور خوشحالی کے لئے کیا جا رہا ہے۔ مشہور عالم ادیبوں، مثلاً:

Bernard Shaw, Leon Feichtwanger, Nazim Hikmet, Romain Rolland, Henry Barbuse, Andre Gide

کے شائع شدہ تاثرات اس بات کا ثبوت ہیں۔ باہر سے آنے والے مہمانوں کو یہاں کی جن کامیابیوں سے روشناس کرایا جاتا تھا وہ واقعی قابل ستائش معلوم ہوتی تھیں اور ان کو دیکھ کر کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ سوویت دیس میں ایک نفسیاتی نوعیت کی کشش بھی تھی جو خصوصی طور پر افروایشیائی ممالک کے مصنفین کو سوویت یونین کی طرف کھینچتی تھی۔ کسی دوسرے ملک میں ان کو اتنی قدر و منزلت شاید ہی ملتی ہو۔ کسی اور ملک میں ان کی تصانیف بے شمار تعداد میں شائع نہیں ہوتی تھیں۔ یاد رہے کہ روسی زبان میں کسی کتاب کی اشاعت کے بعد اس کو ناگزیر طور پر سوویت ملک کی دوسری قومی زبانوں میں ترجمہ کیا جاتا تھا اور اس طرح پورے ملک میں یعنی دنیا کے چھٹے حصے میں اس کے مصنف کی شہرت پھیل جاتی تھی۔ پھر یہ بھی کہ سوویت سرزمین پر ادیبوں کو اپنے اپنے ملکوں میں آزادی اور انصاف کی خاطر جدوجہد میں ان کے ذاتی کردار اور ان کی انفرادی اہمیت کا پورا احساس دلایا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ ماسکو میں افروایشیائی مصنفین کو بڑا نفسیاتی صلہ بھی ملتا تھا۔ اس طرح کی قدر و منزلت سے شاید ہی کوئی انسان بے نیاز رہ سکتا۔ جہاں تک فیض کی بات ہے تو بے شک دوسرے ممالک میں بھی فیض کو چاہنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ لیکن وہاں زیادہ تر ان کی زبان سمجھنے والے ہی، اور ان کے ہم خیال لوگ ہی ان کو پلکوں پہ بٹھاتے تھے۔ روس میں ان کی مقبولیت اور طرح کی تھی۔ یہاں ان کو خواص اور عوام دونوں برابر سے چاہتے تھے۔

دوسری عالمی جنگ میں سوویت ملک نے بھاری نقصان اٹھایا تھا اور فسطائی جرمنی سے لڑائیوں کی خوفناک یادیں عمر رسیدہ لوگوں کے دل و دماغ میں آج بھی تازہ ہیں۔ سوویت عوام کی نظر میں امن کے لئے جدوجہد سے بلند تر مقصد نہیں تھا۔ اس لئے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ سوویت یونین میں لینن امن انعام یافتہ فیض احمد فیض کو خصوصی مرتبہ حاصل تھا۔ ان کی شاعری سے تفصیلی واقفیت حاصل ہونے کے بعد سوویت لوگ فیض کو اور زیادہ محبت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

فیض کی دو چار نظموں کے روسی ترجمے پہلے پہلے ۱۹۵۶ میں بعض اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئے تھے۔ ۱۹۶۲ کے بعد فیض کی نظموں اور غزلوں کے تراجم مجموعے کی شکل میں نکلنے لگے۔ ان کی تعداد اشاعت بہت بڑی ہوتی تھی۔ مثلاً ۱۹۸۳ میں پچاس نظموں پر مشتمل ایک مجموعہ یک لاکھ کی تعداد میں نکلا۔ یہ اس وقت تک سب سے بڑی تعداد اشاعت تھی۔ انتخاب کلام فیض ۱۹۷۷ اور ۱۹۸۵ میں دس-دس ہزار کی تعداد میں نکلا تھا۔ یہ سوویٹ یونین میں شعری مجموعوں کی عام تعداد اشاعت ہوتی تھی۔ اشاعت کی خاصی بڑی تعداد کے باوجود فیض کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھیں۔ اس مقبولیت کی وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس زمانے میں سوویٹ یونین میں عمومی طور پر شعر و شاعری کے، اور خصوصی طور پر مشرقی شاعری کے شائقین کی بہت بڑی تعداد تھی۔ ہر نیا نام فوراً باعث توجہ بن جاتا تھا۔

جب ۱۹۶۲ میں فیض کو لینن امن انعام ملا تو سوویٹ میڈیا میں فیض کو وسیع ترین پیمانے پر شہرت دی گئی تھی۔ "پاکستانی مجاہد امن فیض احمد فیض" کو سوویٹ دیس کے کونے کونے میں پہچانا گیا۔ اور جب ان کے کلام کا ترجمہ منظر عام پر آیا تو فیض نے بہ حیثیت شاعر بھی روسی قارئین کے دلوں میں گھر کر لیا۔ اس کا راز یہ بھی تھا کہ فیض کے کلام کا ترجمہ سوویٹ روس کے بہترین اور مقبول عام شعرا نے کیا تھا۔ وہ بڑی لگن کے ساتھ فیض کی نظمیں روسی غنائی شاعری کی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بے شک روسی زبان کے روپ میں فیض کی شاعری صوتیاتی کیفیت اور تغزل، رعایت لفظی اور تلازمات، اور ان سب سے بڑھ کر اردو شعری روایات سے منسلک زریں علامتی مفاہیم جیسے محاسن سے بڑی حد تک خالی ہو گئیں۔

فارسی-اردو شعری روایات سے نا آشنا کسی بھی غیر ملکی زبان میں غزل کی سب خوبیوں کو منتقل کرنا ناممکن ہے۔ لیکن فیض کی زیادہ تر نظموں کے روسی تراجم کو کامیاب ہی کہنا چاہیے، کہ زیادہ تر ترجمے پڑھنے میں اصل کلام ہی لگتے ہیں اور قاری کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ درحقیقت روسی شعرا نظریاتی طور پر فیض سے ہم آہنگ تھے اور فیض کے مضامین بھی ان کے لئے اجنبی نہ تھے۔ یعنی خیالات اور احساسات میں بڑی حد تک ہم آہنگی پائی ہی جاتی تھی، لیکن یہ بھی کہ روسی اہل قلم، فیض کے شعری پیرایوں، طرز بیان، اور غیر معمولی شعری پیکروں سے بہت متاثر ہوتے تھے اور اپنی زبان میں ان کو منتقل کرنے کی کوشش کو ایک اہم اور دلچسپ شعری تجربہ سمجھتے تھے۔ ترجمے کا طریقہ عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ اردو جاننے والا شخص اردو نظم کا روسی زبان میں لفظی ترجمہ کر کے روسی شاعر کو اصل پڑھ کر سناتا تھا تاکہ اسے اردو نظم کی آوازوں، آہنگ، وزن وغیرہ کا کچھ اندازہ ہو جائے اور اس کے بعد روسی شاعر اس لفظی ترجمے کو منظوم شکل دیتا تھا۔

روسی شاعروں اور عام قارئین میں فیض کے کلام کی مقبولیت کی ایک اور وجہ قابل ذکر ہے۔ ان سوویٹ شاعروں کے لئے، جو سوویٹ نظام کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے تھے فیض کی سیاسی نظموں کا ترجمہ ذہنی طور پر راحت بخش تھا اور وہ فیض کی سیاسی نظموں کا ترجمہ خصوصی جوش اور ولولے کے ساتھ کرتے تھے اور قارئین ان سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے کیونکہ وہ پاکستانی شاعر کی زبان کے پردے میں آزادی اظہار پر پابندی، جمہوری حقوق کی پامالی، اور ناجائز، آمرانہ مطلق العنان سیاسی طور طریقوں کے خلاف آواز اٹھا سکتے تھے۔ یہ باتیں وہ خود اپنی طرف سے نہیں کہہ سکتے تھے۔ سوویٹ نظام کی کسی بھی خرابی کا ذکر کرنا یا اس کی طرف اشارہ بھی کرنا یا کسی بھی اختلافی بات کا اظہار کرنا سوویٹ ملک میں ممنوع تھا۔ فیض کی شاعری اس طرح سوویٹ شہری کو خود اپنے ملک کے مسائل پر سوچنے کی دعوت دیتی تھی۔ لیکن شاید زیادہ تر روسی قارئین فیض کلام کے "رومانی" شاعرانہ محاسن سے سب سے زیادہ متاثر ہوتے تھے۔

پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ سوویٹ روس میں فیض احمد فیض اول اول لینن امن انعام یافتہ مجاہد امن کی حیثیت سے متعارف ہوئے تھے، اور جلد ہی انھوں نے ایک مشہور و مقبول شاعر اور دل فریب شخصیت کے مالک کی حیثیت سے سب کے دلوں میں گھر کر لیا۔

روس میں فیض کے دوستوں میں وہ ادیب، شاعر، اور دانشور بھی تھے جو سوویٹ نظام سے ناخوش تھے۔ وہ شکایت کے انداز میں فیض سے پوچھتے تھے کہ کیا تمھیں سوویٹ سیاست اور سماجی زندگی میں کوئی خامی، کوئی خرابی نظر نہیں آئی؟ کیا تم نے وہ کتابیں پڑھی ہیں جن کا نام لینا بھی سوویٹ ملک میں جرم سمجھا جاتا تھا؟ مثال کے طور پر، ایک اہل نظر اور منہ پھٹ فرانسیسی ناول نگار آندرے ژید (Andre Gide) سوویٹ یونین کے بارے میں اپنی کتاب میں سوویٹ نوکر شاہی کی مطلق العنانی، شک و شبہ کے ماحول، فرد کی ناقدری جیسی باتوں کا ذکر ایک دوسری عالمی جنگ سے پہلے ہی کر چکے تھے۔ اس کے فوراً بعد وہ سوویٹ دوستوں کے زمرے سے نکال دیئے گئے اور کٹر سوویٹ دشمن ٹھہرائے گے تھے۔ اسی طرح، جارج آرویل (George Orwell)، آرتھر کوسلر (Arthur Koestler) اور دوسرے مشہور عالم فن کار سوویٹ دشمن کیمپ میں ڈال دیئے گئے تھے جنھوں نے براہ راست، یا اشاروں کنایوں ہی میں سوویٹ نظام حکومت پر تنقید کی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فیض نے بہت کچھ دیکھا اور پڑھا بھی تھا۔ لیکن سب سے پہلی بات یہ ہے کہ فیض دوسروں کے تاثرات پر اپنی رائے قائم نہیں کرتے تھے۔

پھر ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ فسطائی جرمنی پر فتح کے بعد دنیا میں سوویٹ روس کا وقار بہت بڑھ گیا تھا اور وہ امن اور اشتراکیت کے کیمپ کے لیڈر کی حیثیت سے سامراجی دنیا کا مد مقابل سمجھا جاتا تھا۔ مغرب میں بائیں بازو کی ان قوتوں نے بھی جو جنگ سے پہلے سوویٹ نظام کے تئیں تنقیدی رویہ اختیار کر چکی تھیں، اب اپنے منہ بند کر لئے تھے کہ امن و اشتراکیت کے اس پاسبان کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور خود ان پر سامراج نواز ہونے کا الزام نہ لگے۔ فیض بھی یہی سمجھتے تھے کہ سوویٹ نظام کو تنقیدی نظر سے دیکھنا سامراج مخالف، اور عالمی امن تحریکوں اور تیسری دنیا کے ممالک کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔

دوسرے ممالک کے ان اہل قلم کی طرح جن کو اشتراکی نصب العین عزیز تھا، فیض بھی دنیا میں انصاف اور نیکی پر مبنی سماج کی کامیاب تعمیر پر یقین رکھتے تھے اور اپنی سماجی و سیاسی امیدوں کو بے شک سوویٹ یونین سے ہی وابستہ کرتے تھے۔

وہ سوویٹ ملک کی غلطیوں اور خامیوں کی طرف آنکھیں بند کر لینے کو تیار رہتے تھے کیونکہ انھیں خلوص دل سے یقین تھا کہ سوویٹ یونین اشتراکی منزل مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے لیکن اس کی راہ نہایت دشوار گذار ہے اور اس راہ پر چلنے والے کے قدم غلط بھی پڑ سکتے ہیں اور غلطی کی اصلاح بھی ہو سکتی ہے۔ عام طور پر فیض صاحب اس موضوع پر بحث میں پڑنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن ان کے بعض اشعار میں اس کی طرف اشارہ نظر آتا ہے؂

مثالِ زینۂ منزل بکارِ شوق آیا
ہر اک مقام کہ ٹوٹی جہاں جہاں پہ کمند

یہ نظم نما غزل جس کا عنوان ہے "ٹوٹی جہاں جہاں پہ کمند" ۱۹۷۰ میں ماسکو میں ایک نوجوان "باغی" شاعر سے ملنے اور اس کی شکایتیں سننے کے بعد لکھی گئی تھی۔ اس وقت اشتراکی انقلاب کی سال گرہ کی آمد آمد تھی اور اس تقریب کو منانے کے لیے دوسرے غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ فیض بھی ماسکو تشریف لائے تھے۔ لگتا ہے کہ کمند ٹوٹ جانے سے شاعر کی مراد روسی ساتھیوں کی غلطیوں سے ہے جن کو سدھار کر ہی آگے بڑھنا چاہیے۔ شاعر اپنے اشعار کے ذریعے سوویٹ دوستوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

سوویٹ ملک میں کئی چیزیں دکھاوے کی ہوتی تھیں جن کے پس پردہ جھانکنے کا اتفاق کم ہی غیر ملکی مہمانوں کو ملتا تھا۔ فیض ان میں سے ایک تھے۔ بے شک وہ سوویٹ زندگی کے منفی عناصر سے ناواقف نہیں رہ سکتے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باوجود وہ بنیادی طور پر سوویٹ ملک کو روسیوں کے بقول، "گلابی رنگ کا چشمہ لگا کر" دیکھتے تھے۔ اس سلسلے میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ تاریخ کے اس دور میں تقریباً آدھی دنیا سوویٹ یونین کو نہ صرف عالمی امن کا پاسبان، بلکہ محنت کش عوام کے خوابوں کی تعبیر، جبر و تشدد کی شکار قوموں کی راہِ آزادی کے لئے مشعل وغیرہ بھی سمجھ بیٹھی تھی۔

یہ بات بھی بہت اہم تھی کہ فیض بہر حال مارکسی تھے، مجاہدِ امن تھے۔ وہ قدرتی طور پر سوویٹ یونین کے بنیادی سرکاری نظریات، اور ان اقدامات کے بھی حامی تھے جو سوویٹ حکومت بین الاقوامی میدان میں اٹھاتی تھی۔ جہاں تک یہاں کے اندرونی معاملات کی بات تھی تو وہ ان میں دخل دینا غالباً مناسب نہیں سمجھتے اور اپنی افتادِ فطرت کے مطابق اسے پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں فیض ان کامیابیوں اور کامرانیوں کی طرف ہی دیکھنے کو ترجیح دیتے ہوں جو سوویٹ سرکاری حکام غیر ملکی مہمانوں کے مشاہدے کے لئے پیش کرتے تھے۔ شاید وہ سوچتے ہوں کہ بقول بہادر شاہ ظفر؂

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے سے اٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

فیض کو سوویٹ عوام سے پر خلوص لگاؤ تھا اور یہاں کے سارے واقعات سے ان کو نہ صرف یہ کہ گہری دلچسپی تھی بلکہ وہ دل و جان سے اپنے دوستوں اور رفیقوں کی خوشی اور غم میں بھی شریک بھی ہوتے تھے۔ اس کے باوجود دوسرے ترقی پسند مصنفین کے برخلاف، جن کے درمیان مشکل سے کوئی ایسا ہوگا جس کی تخلیقات میں ماسکو، لینن، سرخ میدان وغیرہ جیسے عنوانات پر نظم یا افسانہ نہ ہو، فیض نے ٹھوس "سوویٹ" موضوعات پر بظاہر بہت ہی کم لکھا۔ سوویٹ یونین سے اپنی آشنائی کے طویل برسوں کے دوران انھوں نے غالباً دو ہی ایسی نظمیں کہی ہیں۔ ان میں سے ایک "اکتوبر انقلابِ روس کی سالگرہ" ہے جو دراصل فرمائشی نظم ہے اور یہ ۱۹۶۷ میں اکتوبر انقلاب کی پچاسویں سالگرہ کے موقعے پر لکھی گئی تھی۔

مرغِ بسمل کی مانند شب تلملائی افق تا افق
صبحِ محشر کی پہلی کرن جگمگائی
تو تاریک آنکھوں سے بوسیدہ پردے ہٹائے گئے
دل جلائے گئے
طبق در طبق
آسمانوں کے در
یوں کھلے ہفت افلاک آئینہ سا ہو گئے
شرق تا غرب سب قید خانوں کے در
آج وا ہو گئے
قصرِ جمہور کی طرح نو کے لئے آج نقشِ کہن
سب مٹائے گئے
سینۂ وقت سے سارے خونیں کفن
آج کے دن سلامت اٹھائے گئے
آج پائے غلاماں میں زنجیرِ پا
ایسے چھنکی کہ بانگِ درا ہو گئی
دستِ مظلوم میں ہتھکڑی کی کڑی
ایسی چمکی کہ تیغِ قضا بن گئی

(مہ و سالِ آشنائی، ص ۱۰۷)

نظم کا تجزیہ کئے بغیر بھی اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ فیض نے حسبِ معمول روایتی استعاروں سے کام لے کر تازہ انداز میں آزادی کی خاطر برپا کئے گئے ایک عظیم تغیر کی جامع تصویر کھینچی ہے۔ صرف عنوان ہی نظم کو روس سے وابستہ کرتا ہے ورنہ پوری نظم کے استعارے عمومی و آفاقی ہیں۔ نہ جانے کس وجہ سے یہ نظم فیض کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئی۔ کئی برس بعد یہ نظم سوویٹ یونین پر مبنی فیض کی یادوں اور تاثرات "مہ و سالِ آشنائی" میں شائع ہوئی۔ ۱۹۹۲ میں، شفاق حسین کی مرتبہ ایک ضخیم کتاب "فیض کے مغربی حوالے" نکلی۔ انھوں نے اس کتاب کے "ماسکو چیپٹر" میں یہ نظم شامل کی ہے۔ لیکن یہ نظم ایک اور کتاب یعنی "نوائے لینن" میں بھی چھپی ہے جو اب تقریباً نایاب ہے اور جس کا ذکر خارج از دلچسپی نہ ہوگا۔ ۱۹۷۰ میں سوویٹ یونین میں لینن کی صد سالہ سال گرہ کے موقعے پر لینن کے بارے میں اردو شعرا کی نظموں کے ایک گلدستے کے لئے فیض سے لینن پر نظم لکھنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ لینن کے خیالات کے فیض بہت مداح تھے اور خود لینن سے وہ بہت عقیدت رکھتے تھے۔ لیکن لینن کو اپنی نظم میں ایک کردار بنانا فیض کو شاید کسی بھی طرح قبول نہ تھا۔ وہ اپنی شاعرانہ حیثیت پر جبر نہیں کر سکتے تھے۔

چونکہ سوویٹ اعلیٰ عہدہ داروں کی رائے میں لینن پر اردو نظموں کی کتاب اردو کے واحد لینن امن انعام یافتہ شاعر کی نظم کے بغیر نکل ہی نہ سکتی تھی، اس لئے ''نوائے لینن'' میں وہی اکتوبر انقلاب والی فیض کی نظم شامل کر لی گئی۔

سوویٹ یونین پر فیض کی دوسری نظم ''لینن گراد کا گورستان'' ہے۔ ایک دن فیض دوسری عالمی جنگ میں مقتول لوگوں کو خراج عقیدت پیش کرنے لینن گراد کے ایک قبرستان گئے تھے اور وہاں انھوں نے مقتولوں کی ایک مشترکہ قبر پر پھول بھی چڑھائے تھے۔ اس وقت یہ نظم انھوں نے تقریباً فی البدیہہ لکھی تھی۔ ''شامِ شہر یاراں'' میں یہ نظم شامل ہے۔

''سوویٹ موضوع'' پر نظمیں نہ لکھنے کی وجہ خود فیض نے یوں بیان کی تھی:

> سوویت یونین میں یہ ہے کہ گردش دوراں اور کشمکش روزگار سے چند روزہ نجات اور مصروفیتوں کے باوجود فرصت اور یکسوئی کے ایسے چند لمحے ہاتھ آ ہی جاتے ہیں اور اس فرصت کے ساتھ ساتھ غم دوراں اور غم جاناں دونوں سے وہ دوری اور فاصلہ بھی کہ آدمی ایک تماشائی کی طرح ان کا سکون سے نظارہ کر سکے... شعر لکھنے کے لئے غالباً محسوسات کی دنیا سے قرب اور دوری، ربط اور علاحدگی، فکر اور سرکشی دونوں ضروری ہے۔ اور وہ کیفیت جسے صوفیا کی اصطلاح میں ''انشراحِ قلب'' کہتے ہیں... یہاں کے لکھے ہوئے اشعار میں سوویت یونین کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن یہ سب اسی کیفیت پر گواہ ہیں،، (اشفاق حسین، مغربی حوالے ص ۸۱۴)۔

اس طرح، فیض کے اس بیان کے پیش نظر یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ فیض کے کلام میں سوویٹ یونین کا ذکر نہیں ہے۔ سوویٹ ملک، اور خصوصی طور پر ماسکو کا ماحول فیض کے متعدد تخلیقات میں سمویا ہوا ہے۔ اور یہ سب کی سب اردو شاعری کے شاہ کار ہیں، مثلاً:

رنگ ہے دل کا مرے؛ پاس رہو؛ منظر؛ احتساب؛
سوچنے دو؛ سرِ وادیِ سینا؛ دعا؛ خورشید محشر کی لو؛
ٹوٹی جہاں جہاں کمند

ان کے علاوہ بھی غزلیں، گیت اور سوویٹ شعرا کے تراجم ماسکو میں وجود میں آئے جن میں ماسکو اور سوویٹ دیس کا کوئی نہ کوئی سراغ ضرور ملتا ہے۔

اب فیض کی اس بات کو مدِنظر رکھ کر کہ سوویٹ یونین میں جو کیفیت ان پر گذرتی تھی وہ شعار میں منعکس ہوتی تھی، فیض کی آخری دور کی شاعری پر نظر ڈالیں۔ آخری دور سے میری مراد، فیض کی زندگی کے آخری آٹھ دس سے ہے۔ یہ مدت ''مرے دل مرے مسافر'' کی نظموں کے بعد سے ۱۹۸۴ تک کے عرصے کو محیط ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ ہر بڑا شاعر اپنی قسم کا پیغامبر ہوتا ہے جس کے اشعار میں شعوری، یا بے اختیار طور پر مستقبل کی پیش بینی کی جاتی ہے یا کم از کم اس کی طرف کچھ اشارے کئے جاتے ہیں۔ یہ مفروضہ غلط نہیں معلوم ہوتا کہ فیض کی آخری دور کے کلام کی بنیادوں میں شاعر کی وہ شاعرانہ حس کارفرما ہے جسے آج پورے وثوق سے اور براہِ راست طور پر اشتراکی نظام کے زوال سے وابستہ کیا جا سکتا ہے، یعنی ان عہد آفریں واقعات سے جو فیض کے انتقال کے سات سال بعد رونما ہوئے۔

اشتراکی نظام کے زوال کا مطلب نہ صرف سوویٹ یونین کی شکست تھی بلکہ سوویٹ یونین سے لاینفک طور پر وابستہ 'بلند نظریاتی نصب العین' پر شدید شک و شبہ کا بھی وجود میں آنا تھا۔ سب ترقی پسند مصنفین کی طرح فیض کی بھی پوری باشعور زندگی اس 'بلند نظریاتی نصب العین' سے منسلک رہی تھی۔ لیکن فیض کے آخری دور کے کلام پر آنے سے پہلے زیر نظر دور میں فیض کے چند سوانحی حقائق کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

متعدد منابع اور مآخذ میں کچھ اس طرح کی معلومات ملتی ہیں کہ گویا ۱۹۷۷ میں وطن سے چلے جانے کے بعد فیض احمد فیض مسلسل بیروت میں رہ کر ایفرو ایشیائی ادیبوں کے ترجمان رسالے ''لوٹس'' کی ادارت کا کام سنبھالتے رہے تھے۔ یہ بات صرف جزوی طور پر صحیح ہے۔ پاکستان چھوڑ کر فیض پہلے دلی پہنچے تھے اور وہاں سے ماسکو آکر خاصے عرصے تک یہیں رہے تھے۔ ''لوٹس'' کا دفتر کہاں قائم ہو، اس کا فیصلہ لمبی چوڑی بحثوں کے بعد بیروت کے حق میں ہوا۔ اس کے بعد ہی فیض بہ حیثیت مدیرِ اعلیٰ ماسکو سے بیروت چلے گئے تھے۔ ایلس فیض ان کے ساتھ تھیں اور ان کی سکریٹری مقرر کی گئی تھیں۔ بیروت میں قیام کے دوران بھی فیض مختلف ممالک کے سفر کرتے اور ماسکو بھی آتے جاتے رہے تھے۔

عرب اسرائیلی جنگ کے بعد جب اسرائیلی مداخلت کی بنا پر بیروت میں خوف ناک بمباریاں ہونے لگی اور بیروت کو گھیرے میں لے لیا گیا تو محض ایک حسن اتفاق کے باعث فیض اس محصور شہر سے نکل پائے اور سیدھے ماسکو پہنچے۔ یہاں وہ کچھ عرصے تک رکے۔ بعد میں انھوں نے لندن اور کئی اور ممالک کا سفر کیا پھر وطن لوٹے۔ لیکن بیچ بیچ میں وہ کئی بار ماسکو آ کر یہاں ٹھہرے بھی تھے۔

''لوٹس'' کے مدیرِ اعلیٰ کا کام جو ایک زمانے میں فیض کو مشکل لیکن اہم، ضروری اور دلچسپ معلوم ہوتا تھا اب اطمینان نہیں بخشتا تھا۔ ایک تو یہ کہ اب فیض سوویٹ نظام کی نوکر شاہانہ دیواروں سے ٹکرانے لگے اور اس کے حکمرانہ طور طریقوں، اس کی بدچلنی، رشوت ستانی وغیرہ کو زیادہ قریب سے دیکھاتے تھے۔ وہ خامیاں اور خرابیاں جن کو فیض گذشتہ برسوں میں دیکھ کر بھی، ندیکھا کر دیتے یا قابل اصلاح غلطی سمجھتے تھے، اب ان کی آنکھوں کو بہت کھٹکتی تھیں۔ چھٹی دہائی کے اواخر سے یہ ساری خرابیاں خاص طور پر زور پکڑنے لگی تھیں۔ پھر ایفرو ایشیائی مصنفین کی تحریک میں، جس کی باگ ڈور ماسکو کے ہاتھ میں تھی (اور تحریک کے اخراجات ماسکو ہی کی جیب سے جاتے تھے) بہت گڑبڑ ہونے لگی تھی۔ آج اس کی وجہ سب پر واضح ہے: نو آزاد ممالک کے قومی اغراض و مقاصد جو ماسکو کے موافق ہونے چاہیے تھے، حقیقت میں کچھ مختلف ثابت ہوئے۔ ان ملکوں کے ادیب ان باتوں کا با آواز بلند کرنے لگے جو ماسکو کو سخت ناگوار تھیں۔ تحریک اب ''بے قابو'' ہونے لگی تھی۔ فطرتاً امن و سکون پسند فیض پر ان بحثوں اور جھگڑوں کا بہت برا اثر پڑ رہا تھا،

خاص طور پر اس لئے کہ ان کو اس گڑبڑ کی اصلی وجہ معلوم تھی۔

"لوٹس" میں فیض کے کام کا ایک اور پہلو قابل ذکر ہے۔ مدیر اعلیٰ کی ذمہ داریوں کا بھاری حصہ، بے شمار دفتری کاغذات ودستاویزات، رپورٹ وغیرہ تیار کرنے پر مشتمل تھا جس پر بہت وقت صرف (بلکہ ضائع) ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ان تحریروں کی اصلاح پر بھی فیض اپنا بہت وقت دیتے تھے جو ایشیا اور افریقہ کے ممالک کے نوجوان ادیب اور شاعر "لوٹس" میں چھپنے کے لئے بھیجتے تھے۔ ان میں معیاری تصانیف بھی ہوتی تھیں لیکن ایسے شاہ کاروں کی بھی کمی نہ تھی جو کمزور طالب علم کی سطح کی معلوم ہوتی تھیں۔ اکثر مدیر اعلیٰ عملی طور پر ایسی چیزوں کو از سر نو تحریر کر کے قابل اشاعت تصانیف میں تبدیل کر دیتے تھے۔ غالباً نو آزاد وپسماندہ ممالک کے ادیبوں کی اس صورت میں مدد کرنا فیض اپنا بین الاقوامی فرض سمجھتے تھے، اور فیض تو فرض گذار انسان تھے:

تم اپنی کرنی کر گذرو
جو ہوگا دیکھا جائے گا

جو ہونا تھا وہ دسمبر 1991 میں، فیض کے انتقال کے سات سال بعد دیکھا گیا کہ نہ جنوں رہا، نہ پری رہی۔ سوویٹ یونین کے ٹوٹ جانے کے ساتھ ہی ایفروایشیائی مصنفین کی تحریک اور اس کی انجمن اپنے ترجمان "لوٹس" کے ساتھ نیست ونابود ہوگئیں۔ درحقیقت انھیں سب واقعات کا مبہم سا عکس موت سے کوئی آٹھ دس سال پہلے کے اشعار کے تشویش ناک لہجے اور السیاتی رنگ میں جھلکتا ہے۔ اب فیض کے آخری برسوں کے کلام سے چند مثالوں پیش کر کے ان باتوں کی وضاحت کرتی ہوں۔

اس بات کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے کہ زیر نظر دور میں ماسکو کی روزمرہ زندگی سے لے کر سوویٹ نظام تک ہر طرف منفی چیزوں کو دیکھ کر فیض کو بے شک تکلیف ہوتی تھی۔ اس وجہ سے ان کا موڈ اکثر خراب ہو جاتا تھا۔ وہ معمول سے بھی کم باتیں کرتے تھے اگرچہ اپنی ناراضگی یا افسردگی بہت ہی کم موقعوں پر ظاہر کرتے تھے۔ وہ اس طرح کی کیفیت کو اشعار میں ہی بیان کرتے تھے

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا
جو نفس تھا خارِ گلو بنا جو اٹھے تو ہاتھ قلم ہوئے
وہ نشاطِ آہِ سحر گیا وہ وقارِ دستِ دعا گیا
جو طلب پہ عہدِ وفا کیا تو وہ آبروئے وفا گئی
سرِ عام جب ہوئے مدعی تو ثوابِ صدق وصفا گیا
ابھی بادبان کو تہ رکھو ابھی مضطرب ہے رخِ ہوا
کسی راستے میں ہے منتظر وہ سکوں جو آکے چلا گیا

(نسخہ ہائے وفا، ص ۶۷۱)

عام روسی قاری بڑی آسانی سے ان اشعار کا اطلاق سوویٹ حقیقت حال پر کر سکتا ہے: لینن اور ان کے بعد کے کمیونسٹ پارٹی کے رہنما سوویٹ عوام کے اصنام بن گئے تھے۔ ان کے مجسمے سارے سوویٹ ملک کے شہروں اور دیہات کے میدانوں پر نصب تھے۔ تقریبات کے دنوں میں ان مجسموں کے دامن میں پھول چڑھائے جاتے تھے، یعنی ایک طرح ان کی پوجا ہوتی تھی۔ ہر تقریر کے آغاز میں لینن اور برسراقتدار "بت" کا نام لے کر اس کی مدح کرنا لازمی ہوتا تھا، وغیرہ۔

ان "دیوتاؤں/بتوں" کے "وسوسوں" کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ اشتراکی انقلاب کے بعد سوویٹ یونین میں مذہبی رسوم پر پابندی لگادی گئی تھی۔ دہریت کی تعلیم اور مذہب مخالف تبلیغ سرکاری سیاست کا ایک جزو بن گئی تھی۔ ایسے حالات میں عوام کے دلوں میں خوف خدا کیا، خدا کا نام بھی نہیں رہا تھا۔ فیض کے دوستوں میں کتنے ہی لوگ تھے جو اپنے ضمیر کے خلاف کچھ کرنے یا کہنے پر مجبور ہوتے تھے۔ مثلاً کئی لوگ صرف ترقی کرنے کے مقصد سے کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بن جاتے تھے، کیونکہ عام طور پر پارٹی کے ممبروں کے سامنے ہی ترقی کا راستہ کھلا رہتا تھا۔ ان لوگوں کی نظر میں اشتراکی نصب العین کی کوئی قدر نہیں تھی۔ یعنی "طلب پر" سوویٹ نصب العین سے عہد وفا قائم کیا جاتا تھا۔ یہ غزل ساتویں دہائی کے اواخر میں، یعنی اسی زمانے میں لکھی گئی تھی جب سوویٹ دانشوروں اور خاص کر نوجوانوں میں مخالفانہ جذبات ابلنے لگے تھے۔ چھٹے عشرے یعنی "خروشچوف کی بہار" میں سوویٹ ملک میں مختصر عرصے کے لئے بہت سی پابندیاں اٹھالی گئی تھیں، لیکن جلد ہی نظریاتی سختیاں پھر سے بڑھنے لگیں۔ جو وقتی طور پر ذہنی سکون ملا تھا، وہ قائم نہیں رہا۔ معاشرے پر دوبارہ پریشانی کا عالم طاری ہوگیا۔ فیض اس صورت حال سے بےخبر نہ تھے۔

زیر نظر غزل کے دوسرے شعر میں ترکیب "وقار دست دعا" کے سلسلے میں ایک بات قابل ذکر ہے۔ یوں تو "دست دعا" اردو شاعری کے لئے کوئی نئی ترکیب نہیں ہے، اور اگر مجھے غلط یاد نہیں تو خود فیض کے یہاں تین بار استعمال ہوئی ہے، اور تینوں بار ماسکو کے کلام میں۔ پہلی بار ۱۹۶۷ میں:

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں رسم دعا یاد نہیں...

(دعا)

یہ نظم پاکستان کے یوم آزادی کے موقعے پر لکھی گئی تھی، لیکن اس کی پیکرتراشی میں ماسکو کا ماحول کارفرما معلوم ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ فیض نے شعری پیکروں کو شعوری طور پر برتا ہو لیکن ان کا استعمال متعلقہ وقت کے ماحول سے ان کی لاشعوری وابستگی کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔ بڑے فنکاروں کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ اضطراری طور پر تاریخی حقیقت کو اپنے فن پاروں میں منعکس کرتے ہیں۔ ماسکو میں فیض ان لوگوں کے درمیان رہتے تھے جن کی غالب اکثریت دہریت کے پیرو تھی اور جن کو نہ خدا یاد تھا نہ ہی رسم دعا۔ اس پوری نظم کو اس روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

زیر نظر غزل میں اس بات پر توجہ دیں کہ سارے منفی حالات کے باوجود اس وقت (۱۹۷۷ / ۱۹۷۸ میں) فیض پوری طرح مایوس نہیں تھے، ابھی تک ان کے دل میں بہتری کی امید باقی تھی، یعنی اس وقت کے آنے کی جب رخ ہوا مضطرب نہیں رہے گا اور سکون جو کسی راستے میں منتظر ہے اپنی راہ چل پڑے گا

اور یہاں تک پہنچے گا۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ انھیں دنوں جب "وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے" وجود میں آئی فیض نے ایک اور غزل کہی جس میں اسی طرح کے پیکر برتے گئے ہیں۔ اس کا مطلع ہے۔

ستم سکھلائے گا رسمِ وفا ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہِ خدا ایسے نہیں ہوتا

(نسخہ ہائے وفا، ص ۶۷)

یہ غزل پچھلی غزل کی گویا تشریح معلوم ہوتی ہے۔ شاعر آپنے آپ کو گویا سمجھا رہا ہے کہ بتوں کا راج دائمی نہیں ہوتا۔ بت شکنی کا زمانہ بھی آتا ہے، اور بتوں کا بھی قبضہ سب پر نہیں ہوسکتا ہے۔

جہانِ دل میں کام آتی ہیں تدبیریں نہ تعزیریں
یہاں پیمانِ تسلیم و رضا ایسے نہیں ہوتا

پچھلی غزل کے آخری شعر میں جو "گئے ہوئے سکون" کے لوٹ آنے کی امید نظر آتی ہے، اس کی تصدیق یہاں اس طرح ہے۔

رواں ہے نبضِ دوراں گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو یہ سب ہو چکا ایسے نہیں ہوتا

اس شعر کا پہلا مصرع تو صریحاً غالب کے شعر پر مبنی ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

یہاں ان دونوں اشعار کا موازنہ مقصود نہیں، لیکن اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ فیض کا دوسرا مصرع اس زیرِ لب تبسم سے عاری ہے جو غالب کے شعر میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ فیض کے شعر میں وہ مبارز طلبی بھی نہیں جو پہلے ان کے بہت سے اشعار میں سنائی دیتی تھی:

چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

☆

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

☆

آج بازار میں پابجولاں چلو
دست افشاں چلو مست و رقصاں چلو

☆

اب بھی اعلانِ سحر کرتا ہوا مست کوئی
داغِ دل کر کے فروزاں سرِ شام آتا ہے

اس طرح کی بہت ساری مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

منفی حالات کے اثرات تیزی سے شاعر پر طاری ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کچھ ہی مدت میں امید کی جگہ گھبراہٹ نے لی اور مبہم شکوک نے پہلے کے یقین و اعتماد کو اپنی جگہ سے بے دخل کیا۔ ۱۹۷۹ میں سوویٹ ازبکستان کے دارالحکومت میں، جہاں چھوٹے بڑے سب فیض کے آگے آنکھیں بچھاتے اور عزیز مہمان کو خوش رکھنے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے، فیض نے نظم "یہ ماتم وقت کی گھڑی ہے" لکھی جس میں اس طرح کے اشعار ہیں:

...یہ وقت زنجیرِ روز و شب کی
کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے
یہ ماتم وقت کی گھڑی ہے
یہ وقت آئے تو بے ارادہ
کبھی کبھی میں بھی دیکھتا ہوں
اتار کر ذات کا لبادہ...
یہ جامۂ روز و شب گزیدہ
مجھے یہ پیراہنِ دریدہ
عزیز بھی، ناپسند بھی ہے
کبھی یہ فرمانِ جوشِ وحشت
کہ نوچ کر اس کو پھینک ڈالوں
کبھی یہ اصرارِ حرفِ الفت
کہ چوم کر پھر گلے لگا لوں

(نسخہ ہائے وفا، ص ۶۳۰)

اس نظم میں اس ذہنی کشمکش کی کیفیت ہے جو غالب کے مشہور شعر کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے میں بھی نظر آتی ہے۔ غالب کے شعر کی ایک تعبیر یہ ہے کہ اس میں ماضی اور حال دونوں سے وابستہ شاعر کے جذبات کی کشمکش منعکس ہوئی ہے۔ لیکن بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں، جب عالمی میدان میں سوشلسٹ ممالک کا اتحاد مضبوط اور طاقتور دکھائی دیتا تھا، اشتراکیت پسند شاعر کو اپنی طے کردہ راہ پر نظر ڈالتے ہوئے دل و دماغ میں کس قسم کی کشمکش محسوس ہو رہی تھی؟

انھیں دنوں اور وہیں سوویٹ ازبکستان میں فیض نے نظم "تین آوازیں" بھی لکھی۔ یہ نظم تین حصوں اور تین آوازوں پر مشتمل ہے: ظالم، مظلوم، ندائے غیب۔ ظالم اپنی قوت اور اقتدار کی شیخی مارتا ہے، مظلوم اپنی تقدیر کو روتا ہے اور اوپر سے صدا آتی ہے:

......
اٹھے گا جب جمعِ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچالے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
... ...
یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

(نسخہ ہائے وفا، ص ۶۳۹)

اردو شاعری میں بیشمار مثالیں ملیں گی جن کا ایک روایتی نقشہ ہے: مختلف آوازیں اپنا اپنا دعویٰ/نظریہ پیش کرتی ہیں اور ایک صدائے غیب اپنا فیصلہ سناتی ہے، جو خود شاعر کی رائے کا اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح کی متعدد مثالیں علامہ

اقبال کے کلام میں بھی موجود ہیں۔ فیض کی اس نظم میں پرانے انداز میں ایک گھسی پٹی بات کو پھر سے دہرایا گیا ہے کہ ظلم کی سزا ناگزیر ہوتی ہے، اور جب مظلوموں کی تاریک آنکھوں سے "بوسیدہ پردے" ہٹائے جاتے ہیں اور وہ جاگ اٹھتے ہیں تو ظالم کے جرائم کا پورا حساب کیا جاتا ہے۔

فیض کی اس نظم کے سلسلے میں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ عصر جدید کے شعری تکنیک اور منفرد طرز بیان کے ماہر فیض احمد فیض کا بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے اواخر (۱۹۷۹) میں اس قدیم بات کی طرف متوجہ ہونے کا کوئی خاص سبب تھا کیا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ظلم واستبداد، اور ہر شکل میں مطلق العنانی کا مسئلہ ہمیشہ فیض کی توجہ کے مرکز میں رہا ہے۔ یہاں یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس روایتی انداز پر لوٹ کر فیض یہ دکھانا چاہتے تھے کہ یہ پرانا مسئلہ اج بھی اپنی اہمیت سے خالی نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ سوویٹ ازبکستان میں اپنے قیام کے دنوں میں (یہ وہ وقت تھا جب ساری دنیا میں اور خود سوویٹ یونین میں افغانستان میں سوویٹ فوجوں کے داخلے کے خلاف وسیع پیمانے پر احتجاج ہو رہا تھا)، شاعر اس بات پر غور وخوض میں تھا کہ دور حاضر میں مطلق العنانی کی کیا کیا شکلیں دنیا میں موجود ہیں؟ یہ دونوں نظمیں اسی طرح کی سوچ کی آئینہ دار معلوم ہوتی ہیں۔

فیض کے آخری دور کی ایک اور نظم پر نظر ڈالیں:

مری تری نگاہ میں جو لاکھ انتظار ہیں
جو میرے تیرے تن بدن میں لاکھ دل فگار ہیں
جو میری تیری انگلیوں کی بے حسی سے
سب قلم نزار ہیں
جو میرے تیرے شہر کی ہر اک گلی میں
میرے تیرے نقش پا کے بے نشاں مزار ہیں
جو میری تیری رات کے ستارے زخم زخم ہیں
جو میری تیری صبح کی گلاب چاک چاک ہیں
یہ زخم سارے بے دوا، یہ چاک سارے بے رفو
کسی پہ راکھ چاند کی، کسی پہ اوس کا لہو

یہ ہے بھی یا نہیں، بتا
یہ ہے کہ محض جال ہے
مرے تمہارے عنکبوت وہم کا بنا ہوا
جو ہے تو اس کا کیا کریں، نہیں ہے تو بھی کیا کریں
بتا، بتا
بتا، بتا

(نسخہ ہائے وفا، ص ۶۵۳)

اس نظم پر سرسری نظر ڈالنے پر بھی اس کا ڈرامائی رنگ متاثر کرتا ہے۔ یہاں ہر شعری پیکر، ہر استعارہ ایک دبی ہوئی چیخ، درد کی ایک کراہ معلوم ہوتا ہے۔ وہی انگلیاں جو کبھی پہلے قلم چھین جانے پر خون دل میں ڈوب کر خود قلم بن جاتی تھیں، اب بے حس ہو گئیں اور ان میں قلم نزار ہو گئے۔ یہ کیوں ہوا؟ کیوں طے کردہ راہ پر نظر ڈال کر دل کو اتنی ٹھیس لگتی ہے کہ اس پر اپنے نقش قدم بے نشان مزار معلوم ہوتے ہیں؟ حقیقت کس وہم کے عنکبوت کا جال لگنے لگی ہے؟

بہت سارے سوال ہیں جن کے جواب کا انتظار ہے، نہ صرف شاعر اور اس کے مخاطب کو، بلکہ نظم کے قاری کو بھی۔ پوری نظم الجھنوں اور گھبراہٹ سے لبریز ہے۔ "بتا بتا" کی تکراروں میں کتنا تذبذب اور عدم اعتماد ہے۔ یہ نظم ۱۹۸۰ میں بیروت میں لکھی گئی تھی۔ یہ فرض کرنا شاید ہی مبالغہ آمیز ہوگا کہ "لوٹس" کے لئے موصول تحریروں کی اصلاحات کرتے وقت فیض یہ بھی سوچتے رہے ہوں گے کہ ان کے نظریات، نظام ہستی سے کہاں تک مطابقت رکھتے ہیں؟ ہو سکتا ہے اپنے نظریات پر نظر ثانی کرنے کا خیال فیض کے دماغ کو الجھن میں ڈالنے لگا ہو؟

اسی زمانے کی ایک اور نظم "مرے ملنے والے" پر غور کریں:

وہ در کھلا میرے غم کدے کا
وہ آ گئے میرے ملنے والے
وہ آ گئی شام، اپنی راہوں میں
فرش افسردگی بچھانے
وہ آ گئی رات چاند تاروں کو
اپنی آزردگی سنانے
وہ صبح آئی دمکتے نشتر سے
یاد کے زخم کو منانے
وہ دوپہر آئی، آستیں میں
چھپائے شعلوں کے تازیانے
یہ آئے سب میرے ملنے والے
کہ جن سے دن رات واسطہ ہے
یہ کون کب آیا کب گیا ہے
نگاہ و دل کو خبر کہاں ہے...

(نسخہ ہائے وفا، ص ۶۶۴)

یہ نظم فیض نے ۱۹۸۰ میں بیروت میں ماسکو سے لوٹنے پر لکھی۔ ان غم ورنج کے جذبات میں جو غبار دل کی صورت میں شاعر کے لئے مستقل تکلیف کا سرچشمہ بن گئے ہیں، بظاہر ماسکو کا نام ونشان تک نہیں۔ لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ بھاری دل، یہ ساری تشویش، یہ تکلیف وہ سوال جن کے جواب کا انتظار تھا اور جو ملے نہیں، یعنی دل کا یہ سارا بوجھ ماسکو سے لاد کر لایا ہوا سامان تھا؟... اور اب دیکھیں ان سوالوں کے جواب حاصل کرنے کی امید کہاں سے پیدا ہوئی ہے۔ نظم کے آخری مصرعے ملاحظہ ہوں:

خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے
ہزار وہم وگماں سنبھالے
کئی طرح کے سوال تھامے

اب شاعر کا خیال اپنے وطن عزیز ہی کی طرف ہی جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب اشتراکیت کے قلعے یعنی سوویت ملک میں شاعر کو جواب حاصل کرنے کی امید نہیں۔ وہیں تو ہزاروں سوال اور وہم پیدا ہوئے، وہیں رہ کر فیض کو احساس ہوا ہوگا کہ ان کے آدرشوں پر آنچ آنے والی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ فیض کو اپنے فلسفۂ حیات اور نظریاتی عقیدوں کے سلسلے میں کئی طرح کے سوال تنگ کرنے لگے تھے۔

اب ۱۹۸۲ / ۱۹۸۳ کے دنوں میں ماسکو میں لکھی ہوئی اس نظم "ہجر کی راکھ اور وصال کے پھول" کی ابتدائی سطروں پر توجہ دیں:

آج پھر درد و غم کے دھاگے میں
ہم پرو کر ترے خیال کے پھول
ترکِ الفت کے دشت سے چن کر
آشنائی کے ماہ و سال کے پھول...

(نسخہ ہائے وفا، ص ۷۰۶)

آخری دو مصرعے خاص طور سے قابل غور ہیں۔ ان کے سلسلے میں شاید یہ بھی یاد دلانا کافی ہوگا کہ "ماہ وسال آشنائی" سوویت یونین کے تاثرات پر مبنی فیض کی کتاب کا نام ہے۔ "ترکِ الفت کے دشت" کا فقرہ اب اور بھی توجہ انگیز ہو جاتا ہے۔ اگر ان باتوں کو مدِ نظر رکھا جائے کہ فیض بڑی حد تک کلاسیکی روایات، اور رعایت لفظی کے دلدادہ، کم گو اور اپنے پسندیدہ دائرۂ لفظیات کے شاعر ہیں، اور فیض کے ہر لفظ خصوصی وزن کا حامل ہوتا ہے تو شاید یہ بات معنی خیز نظر آئے گی کہ "ترکِ الفت کا دشت" اور "آشنائی کے ماہ و سال" کی ترکیبیں ساتھ ساتھ استعمال ہوئی ہیں۔

ایک اور نظم کے چند اشعار پر نظر ڈالیں جو غالباً ۱۹۸۳ کے اواخر میں لکھی گئی۔ عنوان ہے "آج شب کوئی نہیں":

آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت
کوئی امید، کوئی آس مسافر صورت
کوئی غم، کوئی کسک، کوئی شک، کوئی یقیں
کوئی نہیں ہے۔

(نسخہ ہائے وفا، ص ۷۱۲)

پوری نظم اسی بھاری، ماتمی کیفیت کی حامل ہے۔ یہ اس وقت کی نظم ہے جب فیض کئی برس کی مہاجرت کے بعد گھر لوٹے تھے۔ پھر اس قدر مایوسی کیوں؟ صحت بھی اتنی ناساز نہیں تھی کہ انسان زندگی سے بیزار ہو جائے۔ اسی دوران فیض نے ماسکو، لندن اور کئی اور جگہوں کے سفر کیے تھے۔ اس نظم میں "نقشِ فریادی" کی مشہور نظم "تنہائی" کی بازگشت سنائی دیتی ہے لیکن دونوں نظموں میں تنہائی کی کیفیت میں کس قدر فرق ہے۔ "تنہائی" میں بظاہر انسان کی مایوسی کا عروج ہے، ایسا انسان جسے انتظار کا کوئی ثمرہ نہ ملا، اس کے گھر کے بند دروازوں کے پیچھے گویا "شبِ غم کا جوش ہے"۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو سارا ماحول زندگی سے بھرا ہوا ہے۔ لفظیات کو ہی لیں۔ متعدد فعل ہیں جو بذاتِ خود حرکت، عمل اور زندگی کی علامت ہیں: کسی کا آنا، نہ آنا، راہرو کا چلا جانا، رات کا ڈھلنا، تاروں کے غبار کا بکھرنا، چراغوں کا لڑکھڑانا، راہگذار کا سو جانا، وغیرہ۔ بند دروازوں کے باہر تو پوری کائنات ہے جو انسان کے غم کی شریک بھی معلوم ہوتی ہے۔ پھر، اس تنہائی کے ماحول میں بے جان چیزیں بھی جان دار ہو گئی ہیں۔ راہگذار کو تھکنے کی اور سو جانے کی، چراغوں کو خوابیدہ ہونے کی، حتیٰ کہ لکڑی کے کواڑ کو بے خواب ہونے کی، یعنی ان سب کو جاندار شے کی صفات حاصل ہیں۔ ایک اور بات قابل غور ہے۔ جب رات ڈھل جاتی ہے تو واضح ہے کہ دیر یا سویر صبح ضرور آئے گی، اور اس کے ساتھ نئی امید، نیا انتظار بھی شروع ہوگا۔ اس طرح "تنہائی" میں بہر حال زندگی کی ایک صورت ملتی ہے۔ اس کے برخلاف "آج شب کوئی نہیں" اکتالیس مصرعوں میں صرف ایک ہی فعل استعمال ہوا ہے، "ہونا" اور وہ بھی زیادہ تر "نہیں ہے" کی شکل میں۔ ایک عجیب سے جمود، مایوس کن اور بے جانی کا عالم کا بیان کیا گیا ہے۔

فیض کے زیرِ نظر دور کے کلام سے متعدد اور مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مذکورہ بالا اشعار کو چھوڑ کر "غبارِ ایام" میں شامل، یعنی آخری تین برسوں کی تخلیقات کے صرف چند عنوان اور پہلے مصرعے ملاحظہ ہوں:

تم ہی کہو کیا کرنا ہے

☆

دار کی رسیوں کے گلوبند گردن میں پہنے ہوئے
گانے والے ہر اک روز گاتے رہے...

☆

گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا
یہ شہر اداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا
تھک کر یونہی پل بھر کے لئے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا

☆

دربار میں اب سطوتِ شاہی کی علامت
درباں کا عصا ہے کہ مصنف کا قلم ہے
جس نور سے ہے شہر کی دیوار درخشاں
یہ خونِ شہیداں ہے کہ زرخانۂ جم ہے

☆

...یہ کس دیارِ عدم میں مقیم ہیں ہم تم
جہاں پہ مژدۂ
دیدارِ حسنِ یار تو کیا
نویدِ آمدِ روزِ جزا نہیں آتی

☆

پھول مسلے گئے فرشِ گلزار پر
رنگ چھڑکا گیا تختۂ دار پر

☆

بے بسی کا کوئی درماں نہیں کرنے دیتے
اب تو ویرانہ بھی ویراں نہیں کرنے دیتے

☆

دشت میں سوختہ ساماں پہ رات آتی ہے
غم کے سنسان بیاباں پہ رات آتی ہے

☆

ایسا سناٹا کہ شمشانوں کی یاد آتی ہے
دل دھڑکنے کی بہت دور صدا جاتی ہے

ان سطروں اور مصرعوں سے ان تخلیقات کا رنگ اور ان کی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ہاں، اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ساتویں دہائی میں دنیا کے پرآشوب واقعات اور ناگوار حالات مثلاً ہندوستان سے جنگی تصادم، پاکستان کا ٹوٹنا، جنرل ضیاء الحق کا برسر اقتدار آنا، فیض کا وطن بدر ہونا اور طویل مدت تک گھر سے دور رہنا، عرب اسرائیلی جنگ کے دنوں کا خونی لا انسانیت کا چشم دید گواہ ہونا، سجاد ظہیر جیسے عزیز دوست سے محروم ہو جانا اور آخر میں کچھ ذاتی مسائل سے دوچار ہونا، یہ سب کچھ بھی فیض کے دور آخر کے کلام میں منعکس ہوا ہی ہوگا۔ ان معاملات کی چھاپ، خاص طور پر وطن سے دوری کی چھاپ بہر حال نمایاں ہے۔

لیکن یہ بھی ہے کہ اسی کلام میں کچھ پرامید اور حوصلہ افزا اشعار بھی ملیں گے اور کچھ ایسے بھی جن میں فیض کا پرانا رومانی رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن ایسے اشعار کی تعداد نہایت کم ہے۔

اس مضمون میں جو محدود شواہد پیش کیے گئے ہیں ان کی بنا پر یہ نتیجہ بہر حال اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں فیض کے شعری مزاج نے ان کو تغیرات کا احساس دلایا۔ ماسکو میں طویل مدت تک رہنے کے بعد فیض کو اس بات کا شدید احساس ہونے لگا کہ ان کے نظریاتی نصب العین کی بنیاد اتنی مضبوط نہیں ہے جتنی شروع شروع میں معلوم ہوتی تھی۔ بے شک ان کے لئے یہ ایک بڑا المیہ تھا۔ فیض نے دراصل ان واقعات کی گویا پیش بینی کی جن کا خیال اس زمانے میں کسی سوویٹ شہری کو خواب میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فیض احمد فیض کے آخری دور کے کلام میں، جس کی بنیادی خصوصیات سوالیہ یا متشکک لہجہ اور ڈرامائی اور کبھی کبھی المیاتی رنگ ہے، بیسویں صدی کے اواخر کے عالم گیر تغیرات کا، اور خاص طور سے اشتراکی نظام کی شکست کا عکس نظر آتا ہے جو شاعر کی پیغمبرانہ بصیرت کا ثبوت ہے ☆☆☆

حوالے

اشفاق حسین: "فیض کے مغربی حوالے"، جنگ پبلشرز، لاہور ۱۹۹۳
مریم سلگانیک: "خاتمۂ کلام، فیض احمد فیض، انتخاب (روسی زبان میں "رادوگا") اشاعت گھر، ماسکو، ۱۹۸۵
فیض احمد فیض: "نسخہ ہائے وفا" مکمل مجموعۂ کلام، کارواں پریس، لاہور، چوتھی بار ۱۹۸۵
فیض احمد فیض "سہ سال آشنائی" یادوں کا مجموعہ دارالاشاعت ترقیات، ماسکو۔

یہ خیال

عذرا عباس

نہیں
تم ایک خیال کی طرح میرے دل میں
نہیں اتر سکتے
نہ تم میری آنکھوں میں خواب بن سکتے ہو
ابھی تو میں تم کو دیکھ رہی ہوں
تم کو چھو بھی سکتی ہوں
تمھاری انگلیوں کی پوریں سامان
باندھتے ہوئے
میری پوروں سے ٹکرا بھی سکتی ہیں
لیکن جب
یہ سب کچھ نہیں ہوگا
میں تمھیں
ایک یاد میں بدل دوں گی
اور ملا دوں گی
اپنی ان یادوں میں
جنھیں میں بھلا بیٹھی ہوں

خورشید رضوی

فصیلِ ذات گری قید سے رہا ہوئے ہم
خیالِ غیر کی وسعت سے آشنا ہوئے ہم
حصارِ لفظ میں آتا نہ تھا ملالِ دروں
زبانِ حال سے آخر کہیں ادا ہوئے ہم
نظر کریں تہِ دل پر تو ہیں وہی کے وہی
کبھی جو آئینہ دیکھیں تو کیا سے کیا ہوئے ہم
چمن میں کھینچ کے لائی تھی جستجو جن کی
وہ نکہتیں نہیں باقی تو لو ہوا ہوئے ہم
یہ کس کا زہرِ جدائی لہو میں تیرتا ہے
ہمیں تو کچھ بھی نہیں یاد کب جدا ہوئے ہم
نہاں تھی سنگ میں آتش کہ جل کے خاک ہوئے
نہ ابتدا بھی ہوئی تھی کہ انتہا ہوئے ہم
کہاں سے لائیے خود کو کہ خود کو دیکھ سکیں
جب اپنے آپ سے گذرے تو رونما ہوئے ہم

وہی خوشبو کبھی گلشن سے کبھی بن سے نکال
وہی آتش کبھی گل سے کبھی آہن سے نکال
آنکھ کو وسعتِ صحرا کا تماشائی کر
نگہِ مردہ و افسردہ کو روزن سے نکال
کر کچھ ایسا کہ تری خاک میں پرواز آئے
اب کوئی اسپِ فلک سیر اسی توسن سے نکال
مجھ سے مرمر کا وہ ترشا ہوا بت کہتا تھا
فن مری راہ کا پتھر ہے مجھے فن سے نکال
قربِ منزل کی بشارت ہے، بہت دور کی بات
راہبر پہلے ہمیں پنجۂ رہزن سے نکال
تیری پہچان نہ بن جائے مرے خون کا داغ
یہ کوئی پھول نہیں ہے اسے دامن سے نکال
اک نگہ کر کہ کسی رنگ پہ ٹھہرے یہ حیات
آنکھ اٹھا اور شب و روز کی الجھن سے نکال

میں اور موسیٰ

عذرا عباس

موسیٰ میرا بہت اچھا دوست تھا...

موسیٰ سے ملنے سے پہلے زندگی ایک ملائم بستر کی طرح تھی جو میری ماں روز میرے کمرے میں نئی نئی چادریں بچھا کر ہموار کرتی تھی اور اس صحن کی طرح جس کو روز دھویا جاتا تھا جس کے چاروں طرف لگی کیاریوں میں رنگ برنگے پھولوں سے مہک اٹھتی رہتی تھی۔

صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا جو میری ماں مجھ سے پوچھ پوچھ کر پکاتی تھی، اور بہت اہتمام سے سجا کر مجھے کھلایا جاتا تھا۔ ہر وقت جوس، سوپ، اور نت نئی مٹھائیاں اور پھل مجھے کھلانے کے لئے میری ماں میرے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھی۔

میری الماری رنگین فراکوں سے بھری ہوئی تھی، جوتوں کا ایک انبار تھا جو میری ماں میرے لئے لا لا کر ڈھیر کرتی رہی۔

اور رات کو سونے سے پہلے بادشاہوں، شہزادوں اور پریوں کی کہانیاں، جنھیں سن کر میں زندگی کو اس قوس قزح کی طرح جان رہی تھی جو بارش کے بعد مجھے اپنی کھلی چھت سے آسمان پر پھیلی نظر آتی تھی، جو ماں مجھے روز سونے سے پہلے اپنی عادت سے مجبور ہو کر سناتی تھی، یا پھر باپ کی باتیں جو زندگی کے کسی ایسے رخ کو بیان کر رہی ہوتیں جنھیں کھوجنے کے لیے ابھی وقت پڑا تھا۔

لیکن موسیٰ سے دوستی کے بعد زندگی باسی روٹی کی طرح نظر آنے لگی تھی، جو ماں روز ایک کونے میں رکھ دیتی تھی جو ہاتھ لگاتے ہی کڑک سے ٹوٹ جاتے تھے، جن میں کبھی کبھی پھپھوندی لگ جاتی تھی اور اس کو سونگھنے سے جی متلانے لگتا تھا۔

☆

ماں مجھ سے کہتی رہتی تھیں: تم پڑھ لکھ جاؤ، زندگی پڑھنے لکھنے سے سمجھ میں آنے لگتی ہے، اور میں سوچ رہی ہوتی، موسیٰ کو کچھ پڑھنے لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

میرے علاقے کے سب لڑکے لڑکیاں پڑھ رہے تھے۔ میرے خاندان کے تمام بچے بھی، لیکن وہ تو کتنی بودی بودی باتیں کرتے تھے، ان کے نزدیک ابھی زندگی، ٹافیاں، چیونگم اور مختلف مشروبات کھانے پینے کا نام ہی تھی۔ لیکن موسیٰ اسکول جائے بغیر کتنی بڑی بڑی باتیں کرتا تھا۔ ننگے پیر ہونے کے باوجود وہ اپنے پاؤں زمین پر ایسے رکھتا تھا جیسے وزنی بوٹ پہنے ہوئے ہو، ابھی کچل دے گا سب کو۔

اس کی آنکھوں میں ایک ایسی فضا ہوتی جیسے کوئی کسی دشمن کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہو، لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ مجھے چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں۔

ایک بار میں نے موسیٰ سے پوچھا تھا، موسیٰ تم کو پڑھنا آتا ہے؟ تو وہ ہنسنے لگا۔ تم کیا سمجھتی ہو، صرف تم لوگوں کے نصیب میں ہی لکھنا پڑھنا ہے؟ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ مگر کیسے؟ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی، بغیر

اسکول جائے کوئی کیسے لکھنا پڑھنا سیکھ سکتا ہے۔ ہاں۔ میرے باپ نے مجھے اتنا سکھا دیا ہے کہ میں تمھاری کتابوں سے زیادہ اچھی کتابیں پڑھ لیتا ہوں۔

اس وقت تک میں یہ جان گئی تھی کہ موسیٰ کے لہجے میں یہ تلخی اور غصہ کیوں پیدا ہوا۔ اس کے پاس کوئی نرم بستر نہیں تھا اور نہ اسے پیٹ بھر روٹی ملتی تھی۔ اس کی ماں سب کے حصے میں برابر روٹی تقسیم کر کے جو بچ جاتی تھی، وہ کھاتی تھی۔ وہ پانچ بھائی بہن تھے، اس کا باپ روزانہ کی آمدنی پر نوکر تھا۔ وہ کبھی کبھی موسیٰ کو ساتھ لے جاتا تھا، جب کارخانے میں کام زیادہ ہو جاتا تھا۔

☆

موسیٰ اکثر کئی کئی دن مجھے نظر نہیں آتا تھا۔ جب ملتا تو میں اسے سے پوچھتی، موسیٰ تم کہاں تھے؟ میں پیٹ بھر روٹی کے لئے محنت کرنے گیا تھا، وہاں گدھوں کی طرح کام لیتے ہیں۔ لیکن جو پیسے دیتے ہیں اس میں یہ مٹھی بھی نہیں بھرتی، وہ اپنی ہتھیلی کی مٹھی بنا کر مجھے دکھاتا، ایسے وقت میں اس کس چہرہ رنج سے تملایا ہوا لگتا تھا۔ تم زیادہ پیسے کیوں نہیں مانگتے ہو؟ میں اس کے رنجیدہ چہرے سے ملول ہو کر کہتی۔ تو کیا ہوگا؟ وہ مجھے کام نہیں کرنے دیں گے، اس جگہ کسی اور کو کام پر رکھ لیں گے جو بھوک سے مجبور ہو کر اس سے بھی کم پر تیار ہو جائے گا۔ ارے! میرے منھ سے ارے ایسے نکلا جیسے کسی نے میری گدی پر انتہائی سردی میں برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہو۔ ہاں، یہی ہوتا ہے، وہاں تو بھوکوں ننگوں کی ایک قطار لگی ہوتی ہے۔ ہر آدمی ہر دن اپنی قسمت آزماتا ہے۔ اس دن اگر کام مل جائے، تو، تو؟ میں نے اس طرح پوچھا جیسے کوئی پہیلی ہو، تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ آج روٹی ضرور ملے گی۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو چبا کر کہا اور آنکھوں کو آسمان کی طرف، جیسے کوئی ہے میرے علاوہ جو اس کی سن رہا ہے۔ موسیٰ کی باتیں قطرہ قطرہ میرے دل میں گر رہی تھی، اور اس کا ایک ایک لفظ مجھے ہر روز ایک نئے ملال کا راستہ دکھاتا تھا۔

☆

میں ایک رات ابا کے پاس لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے ابا سے پوچھا تھا، ابا ہمارے سامنے جو بستی ہے اس میں رہنے والے لوگ کون ہیں، ان کی زندگی ہم سے مختلف کیوں ہے یہ ہماری طرح زندگی کیوں نہیں گذار سکتے؟ ابا کی آنکھیں ایک دم بڑی بڑی سی ہوئیں۔ حیرت ان میں تیرنے لگی تھی اور تشویش بھی، پھر وہ میرا چہرہ غور سے دیکھنے لگے۔ ہوں، انھوں نے ایک عجیب سے آواز، ٹھنڈی سی سانس لیتے ہوئے نکالی۔ طبقاتی تقسیم، میں نے اس لفظ کو اپنے ذہن میں یاد کرتے ہوئے، اسی طرح چبا کر سوال کی شکل میں دہرایا۔ ہاں، امیر اور غریب کا فرق۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کیوں ابا؟ میں اندر ہی اندر الجھنے لگی تھی۔ اس کیوں کا جواب مشکل ہے۔ یہ فرق کون پیدا کرتے ہیں؟ اب میں بستر پر اچھل کر بیٹھ چکی تھی، اور اپنے گھٹنوں پر اپنی ٹھنڈی رکھ کر کمرے کی ملگجی روشنی میں ابا کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے پھر اپنا سوال دہرایا، ایک ایسی آواز میں جو ڈری ہوئی تھی کہ ابا نہ جانے اب کیا کہہ دیں، جو نا ممکن ہو سلجھانے کے لئے۔ ابا یہ فرق کون پیدا کرتا ہے؟ ابا نے تکیے پر سیدھے رکھے ہوئے سر کو گھما کر میری طرف دیکھا، جیسے مجھے کھوج کر وہ کوئی جواب دیں گے۔ بس انسان، ہمارے تمھارے جیسے۔ یہ کہتے ہوئے ابا کے چہرے پر کچھ نہ معلوم ہونے کا احساس زیادہ تھا، وہ جانتے تھے کہ وہ مجھے مطمئن نہیں کر پا رہے ہیں۔ لیکن ابا ان انسانوں کو کوئی روک نہیں سکتا؟ نہیں! ابا نے ''نہیں'' اب اتنی زور سے اور سختی سے کہا تھا کہ جیسے مجھے سوال کرنے سے روک رہے ہوں۔ تو ابا کیا آپ اس تقسیم میں شریک ہیں؟ میرا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا اور سوالوں کا ایک ریلا تھا جو میرے دماغ میں ہلچل مچا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا ابا اس میں شامل نہیں ہیں، لیکن پھر بھی، ابا کیا آپ بھی اس تقسیم میں شامل ہیں؟ پتہ نہیں، ہو سکتا ہے مجھ سے بھی کوئی غلطی ہو رہی ہو۔ ابا نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ وہ کیسے؟ اور میں دکھ سے سوچ رہی تھی ابا بھی اس جرم میں شامل ہیں۔ اور ابا شاید اپنی صفائی میں کچھ کہہ رہے تھے۔ لیکن یہ سب تمھاری سمجھ میں جب آئے گا جب تم بڑی ہو جاؤ گی اور لکھ پڑھ جاؤ گی، تو خود بخود یہ باتیں تمھاری سمجھ میں آ جائیں گی۔

اس رات میں بہت بے اطمینان نیند سوئی تھی۔

☆

ایک دن موسیٰ اسی کونے میں بیٹھا مٹی کھودتے ہوئے نظر آیا تھا۔ میں چپکے سے اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی اور دیکھتی رہی دیر تک اس کو زمین کھودتے ہوئے۔ میں اب اس کی بیچارگی پر ترس کھا رہی تھی۔ موسیٰ کو پتہ نہیں تھا کہ ایک طبقاتی تقسیم بھی ہوتی ہے جس نے اس کا اور اس کے علاقے کے لوگوں کا یہ حشر کیا ہوا ہے۔ اس وقت میں اس تقسیم کو کوئی منصوبہ سمجھ رہی تھی جو کچھ انسانوں نے دوسرے انسانوں کے لیے بنایا تھا تا کہ وہ غریب رہیں۔ میں ہوا سے اڑتی فراک کو سمیٹ کر موسیٰ کے سامنے زمین پر بیٹھ گئی۔ موسیٰ نے میرے ہونے کی کوئی پرواہ نہیں کی، وہ انہماک سے زمین کھودنے میں جٹا ہوا تھا۔ موسیٰ، میں نے پکارنے کی آواز میں اس کا نام لیا تا کہ وہ مجھے دیکھ لے۔ موسیٰ، یہ سب فضول ہے۔ میں موسیٰ کو یہ بری خبر سنا دینا چاہتی تھی، اور یقین دلانا چاہتی تھی کہ اس کی حالت اب کبھی سدھر نہیں سکتی۔ کیا فضول ہے؟ اس نے چھوٹی انگلی سے، جو زمین کھود کھود کر اب سرخ اور آگے سے سخت اور سیاہی مائل ہو چکی تھی، مٹی جھاڑ کر پوچھا۔ یہی کہ یہ طبقاتی تقسیم ہے۔ وہ کیا ہوتی ہے؟ اس نے دھوپ سے چندھیائی آنکھوں کو میچے میچے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ امیر اور غریب کا فرق، اور یہ کہ تمھارے پاس کبھی پیسے نہیں ہوں گے، یہ ایک بہت بڑا منصوبہ ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہ بتاتے ہوئے میرے منھ سے یہ الفاظ ابا کی طرح نکل رہے تھے۔ کیا بک رہی ہو؟ اس نے اپنے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر کہا۔ ابا نے۔ ہوں، تو تمھارے ابا جانتے ہیں یہ سب؟ کیوں نہیں جانتے؟ بہت سے تو یہ سب بھی نہیں جانتے، اس نے پاؤں سے مٹی اڑا کر کہا، میرا باپ اٹھارہ گھنٹے کی محنت کا معاوضہ دو گھنٹے کی محنت کے

برابر لیتا ہے، اگر اسے اٹھارہ گھنٹے کی محنت کا معاوضہ مل جاتا تو ہم بھی غریب نہیں ہوتے۔ یہیں سے شروع ہوتی ہے یہ تقسیم۔ وہ سامنے درخت پر بیٹھی چڑیوں پر ننھا سا پتھر پھینک کر بولا۔ لیکن میں اس نا انصافی سے بوجھل ہو رہی تھی جو موسیٰ کے لفظوں نے مجھے سمجھائی تھی۔

اب مجھے معاوضے کا مطلب سمجھ میں آ گیا تھا۔ میں نے رسان سے موسیٰ سے پوچھا، پھر تم کو کتنا ملتا ہے یہ معاوضہ؟ مجھے؟ میں تو باپ کے ان گھنٹوں کو پورا کرنے کے لیے بلایا جاتا ہوں، جن میں وہ تھک کر بیٹھ جاتا ہے، یا جب وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ وہ اب بالوں پر ہاتھ ایسے پھیر رہا تھا، جیسے ان کو نوچ کر پھینک دے گا۔

اور میں اپنی چھوٹی انگلی سے اس زمین کو کھودنے لگی تھی جس کا گڑھا ابھی ایک بالشت سے بھی زیادہ گہرا نہیں ہوا تھا۔ کیوں نہ ہم اس گڑھے کو جلدی جلدی گہرا کر لیں؟ میرے لیے اب موسیٰ کی باتیں سن کر کوئی چارہ نہیں بچا تھا، میں اب موسیٰ کی اس حیثیت پر میں اب صرف مایوس ہو رہی تھی۔

میں خوش بھی تھی کہ موسیٰ کو جلدی اس خزانے کی سوجھی تھی، اب اگر وہ یہ واقعی کھود لیتا ہے اور سچ مچ یہ خزانہ نکل آتا ہے تو موسیٰ بھی ایک بہتر زندگی گزارے گا۔ چلو موسیٰ تم بھی نہ کبھی تو یہ خزانہ کھود نکالو گے جس کی تم کو تلاش ہے، میں نے زمین کھودتے ہوئے سر اٹھا کر موسیٰ سے کہا۔ موسیٰ ہنسنے لگا شاید وہ میری بے خبری پر ہنس رہا ہو۔ اسے جو معلوم تھا، اس کا دکھ اس کی ہنسی میں شامل تھا۔

☆

موسیٰ کے ساتھ کھیلتے ہوئے اور میدان میں اکثر گھومتے پھرتے باتیں کرتے ہوئے جہاں میرا وقت گذر رہا تھا، اور جو مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا، وہاں مجھے زندگی کی پیچیدگیوں سے بھی آگاہ کر رہا تھا۔ اور وہ سہولتیں جو ہر وقت مجھے مہیا تھیں، میں اب انھیں حیرت سے دیکھتی تھی۔ اور ان کا موازنہ میں موسیٰ کی حالت سے کرتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں یہ سوچتے ہوئے اتنی بے چین ہو جاتی کہ اماں پریشان ہو جاتی۔ وہ اب اکثر میری اس حالت کو غور سے دیکھتی تھیں۔ ایک دن میں نے اماں کو ابا سے کہتے سنا تھا۔ تم جانتے ہو یہ اپنا زیادہ وقت بری بستی کے ایک لڑکے کے ساتھ گذارنے لگی ہے۔ اسکول سے آنے کے بعد اسے صرف اس کے ساتھ کھیلنے کی دھن سوار رہتی ہے۔ بہانے بہانے سے، وہ اپنا ایک جملہ پورا کرتیں تھیں اور اس کے تسلسل میں ہی دوسرا شروع کر دیتی تھیں۔ اور ابا نے اماں کے ہونٹوں کو مسلسل ہلتے ہوئے دیکھتے ہوئے سنا اور پھر بڑی دل جمعی سے میری طرف متوجہ ہوئے۔ ہاں تو وہ لڑکا کون ہے؟ کیا نام ہے؟ کیا کرتا ہے؟ ابا بھی اماں کی طرح تسلسل سے سوالوں پر آمادہ تھے۔ میں نے بچنے کی کوئی صورت نہ پا کر آخر ابا کو سب بتانے پر ہی اکتفا کیا۔ ابا وہ موسیٰ ہے، بیچارہ، وہ آپ اس دن بتا رہے تھے، طبقاتی تقسیم۔ اس کا مطلب اس دن میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن موسیٰ نے مجھے بتا دیا۔ میں موسیٰ کے تعارف کے ساتھ ساتھ ابا کو متاثر بھی کرنا چاہتی تھی تاکہ ایک ہی وقت میں ابا سمجھ لیں کہ موسیٰ کوئی معمولی لڑکا نہیں ہے، جیسا کہ اماں سمجھتی ہیں۔ میں نے پھر بولنا شروع کیا۔ میں اس سے اکثر کچھ نہ کچھ سیکھ لیتی ہوں۔ اچھا تو وہ تم کو پڑھاتا ہے! ابا کے لہجے میں سوال بھی تھا اور اچنبھا بھی، یہ تو بہت اچھا ہے۔ اماں میری بے وقوفی پر تالاں ہو رہی تھیں۔ انھیں قطعاً یقین نہیں تھا کہ موسیٰ کوئی اچھی بات بھی کر سکتا ہے۔ تو پھر کیا پتہ چلا تم کو، کیا بتایا اس نے طبقاتی تقسیم کے بارے میں؟ ابا اب دلچسپی لیتے نظر آ رہے تھے اور اماں کی باتوں کو نظر انداز کر رہے تھے۔ ابا، وہ کہہ رہا تھا، اس کے ابا کو محنت کی پوری رقم نہیں ملتی، وہ آدھی سے بھی آدھی ملتی ہے۔ اگر پوری ملنے لگے تو وہ سب پیٹ بھر کر روٹی کھائیں اور ہماری طرح آرام سے گذاریں۔ ابا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کون ہے بھئی وہ، ہم کو بھی ملواؤ۔ وہیں انھیں جھونپڑیوں میں، جہاں ہر وقت گندگی ہے۔ اماں نے پھر لقمہ دیا۔ نہیں اماں موسیٰ گندہ نہیں ہے میں تڑپ اٹھی۔ ابا آپ کہتے ہیں جو جھوٹ بولتا ہے اور دوسروں کو دھوکا دیتا ہے وہ گندہ ہوتا ہے، موسیٰ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ ابا اپنے کرتے کے بٹن ٹھیک سے بند کرتے ہوئے مجھے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ کیا لکھتا پڑھتا ہے؟ پتہ نہیں، اسکول تو نہیں جاتا، میں نے افسردگی سے کہا، شاید اس کا باپ اس کو پڑھاتا ہے۔ اماں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا، پاؤں میں جوتا نہیں ہے اسکول کہاں سے جائے گا۔ ابا تاسف سے اماں کو دیکھنے لگے۔ تو اس میں اس کا قصور تو نہیں ہے۔ نظام میں جب تک تبدیلی نہیں آئے گی یہ ظلم جاری رہے گا۔ پھر وہ اماں کی طرف دیکھ کر بولے لڑکا ذہین ہے، باتیں سننے سے تو پتہ چلتا ہے۔ ہاں ابا، وہ بہت ذہین ہے۔ میں اب خوشی سے جھوم رہی تھی۔ ابا موسیٰ کی تعریف کر رہے تھے اور میں ابا کو بتا رہی تھی کہ موسیٰ بھی کبھی ان کی طرح باتیں کرتا ہے، اچھی اچھی۔ ابا ہنسنے لگے، اچھا تو تم کو میری باتیں اچھی لگتی ہیں؟ وہ ہنستے ہوئے مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ اماں، میری اور ابا کی باتوں کے درمیان سے اب اٹھ کر چلی گئیں تھیں۔ میں دیر تک ابا کو موسیٰ کے بارے میں بتاتی رہی۔ ابا بہت غور سے سنتے رہے، پھر ایک لمبی آہ بھر کر بولے۔ ہاں بیٹا، انسان ایک عرصے سے اس چکی میں پس رہا ہے۔ اب یہ کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن ابا یہ کب تک ہوتا رہے گا؟ میں کسی حتمی نتیجے تک پہنچنا چاہتی تھی۔ پتہ نہیں بیٹا، جیسے سمندر میں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھاتی رہیں گی، اس طرح۔ وہ یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور میں ابا کے آخری جملے کو یاد کرنے لگی، بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھاتی رہیں گی۔ واہ! میں ابا کو دل ہی دل میں داد دے رہی تھی، ابا نے کتنا اچھا جملہ کہا تھا۔ جب موسیٰ مجھے ملے گا میں اس کو سناؤں گی، کہ صرف وہی بہت کچھ نہیں جانتا میں بھی بہت کچھ جانتی ہوں۔

☆

اس دن میں چپکے سے دوپہر میں اسکول سے آنے کے بعد اس گڑھے کی طرف چلی گئی تھی جو موسیٰ کھود رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہاں موسیٰ اس وقت

نہیں ہوگا۔ میں موسیٰ کی مدد کرنا چاہتی تھی تاکہ گڑھا جلدی جلدی گہرا ہو جائے۔ دھوپ اس کونے کو جلا رہی تھی میری انگلی اس زمین پر رکھتے ہی اس طرح جلی جیسے جلتے توے پر روٹی چھونے سے جل اٹھتی ہے۔ اس کھودے ہوئے گڑھے میں بھربھری مٹی بھری ہوئی تھی میں نے قریب سے ایک لکڑی کا ٹکڑا اٹھا کر اس مٹی کو نکالا اور مزید اس گڑھے کو گہرا کرنے لگی۔ گڑھا تھوڑا اور گہرا ہو گیا تھا لیکن میں زیادہ دیر تک وہاں نہیں ٹھہر سکی۔ گرمی اور دھوپ نے مجھے جلا سا دیا تھا۔ میں موسیٰ پر ترس کھاتی ہوئی اٹھی، کب تک موسیٰ یہ زمین کھودتا رہے گا۔ میں آہستہ آہستہ گھر کی طرف چل دی، ذرا دور جا کر میں نے پلٹ کر اس گڑھے کی طرف دیکھا، ہوا چل رہی تھی اور رہے سہے گڑھے کو اس کے آس پاس کی بھربھری مٹی دوبارہ بھرے دے رہی تھی جو موسیٰ نے اور آج میں نے کھود کر چاروں طرف پھینکی تھی۔

☆

ابا ایک شام مجھے سمندر کے کنارے ٹہلانے لے گئے تھے۔ وہ میری انگلی تھامے آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے اور میں اپنے چھوٹے قدموں سے بھاگ رہی تھی۔ ابا نے سمندر کی ہوا سے جو ان کے منھ پر زور زور سے پڑ رہی تھی، اپنا منھ پھیر کر کہا، بیٹیا تمھاری ماں خاصی خفا ہو رہی تھیں۔ انھیں تمھارا موسیٰ کے ساتھ کھیلنا یوں اچھا نہیں لگتا۔ تم روز اس کے ساتھ مت کھیلا کرو۔ میں ابا کے جملے ...جو تیز ہوا میں میرے منھ پر پڑ رہے تھے اور گونج میں تبدیل ہو رہے تھے... میں ابا کو سن رہی تھی اور وہ اب اپنے ہاتھوں کو چھتری کی طرح بنائے ہوئے تھے جو ان کے چہرے کو ہوا سے بچائے ہوئے تھی۔ اور آج ابا کا چہرہ بھی معمول کے مطابق مجھے نظر نہیں آیا جو ہمیشہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ لئے ہوتا تھا۔ میں سمجھ گئی تھی اماں نے اپنی باتوں سے ابا کو بھی اسی طرح سوچنے پر مجبور کر دیا ہے، جس طرح وہ سوچ رہی تھیں۔ میں اب رک گئی، میرے قدموں کی آواز ابا نہ سن کر پلٹے۔ کیا ہوا، کیوں رک گئیں؟ میں روہانسی ہو رہی تھی۔ میں نے روندھی ہوئی آواز میں کہا: میں کھیلتی نہیں ہوں، بس ہم دونوں باتیں کرتے ہیں۔ مجھے اس کی باتیں سننا اچھا لگتا ہے، ہم دونوں میدان میں گھومتے ہیں اور وہ بولتا جاتا ہے میں سنتی رہتی ہوں۔ آپ میرے ساتھ ایک دن میدان میں چلیں۔ موسیٰ ایک بہت اہم کام کر رہا ہے۔ وہ کیا؟ ابا اہم کام پر چونکے۔ ان کے قدم جو آگے کی طرف بڑھ رہے تھے، اب رک گئے تھے۔ ابا، وہ زمین کھود رہا ہے اپنی چھوٹی انگلی سے۔ خزانہ نکالے گا اور اس خزانے سے اپنی بستی کے لوگوں کی زندگی بدل دے گا۔ ابا کے ہاتھوں کی چھتری کھل گئی تھی اور وہ حیران آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے، اب ان کے ہاتھ میرے شانوں پر تھے۔ وہ تھوڑی دیر مجھے دیکھتے رہے اور پھر سمندر کو اس طرح گھورنے لگے جیسے میری باتوں کا جواب اسے دیں گے۔ کیسے؟ انھوں نے مجھے دیکھے بغیر جواب دیا۔

وہ کہتا ہے وہ اسکول بنائے گا، ہسپتال اور لوگوں کے کچے گھروں کو پکا کرے گا۔ اور خزانہ کہاں سے آئے گا؟ ابا اب بھی مجھے نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ ان آبی پرندوں کو دیکھ رہے تھے جو سمندر پر غول بنا کر اڑ رہے تھے، لیکن ان کے چہرے پر ایک عجیب و غریب مسکراہٹ تھی۔ کیا کوئی نقشہ اس کے ہاتھ لگا ہے؟ ابا کی مسکراہٹ اب ہنسی میں بدل رہی تھی۔ نہیں اس نے سوچ لیا ہے کہ ایسا ہی ہوگا یعنی وہاں خزانہ ضرور ہوگا۔ تو کیا مزدور لگائے ہیں؟ نہیں ابا۔ وہ اپنی چھوٹی انگلی سے زمین کھود رہا ہے، کہتا ہے ایسا خزانہ آہستہ آہستہ ہی نکلتا ہے۔ ابا کے چہرے کا رنگ یک لخت بدل گیا تھا، ان کے چہرے پر اب افسردگی پھیل چکی تھی۔ اچھا تو تم اس لڑکے کے ساتھ کھیلتی ہو۔ ابا نے اس پر بہت زور دے کر جملہ پورا کیا۔ ٹھیک ہے، ہمیں بھی ملانا۔ لیکن یہ سب اس نے سیکھا کہاں سے؟ ابا سوال کر رہے تھے اور میں دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی، ابا بھی موسیٰ سے مرعوب ہو رہے تھے۔ یہی تو میں کہتی ہوں موسیٰ سے کہ اس نے یہ سب کہاں سے سیکھا؟ ہاں۔ ابا نے میری تائید میں سر ہلایا۔ جیسے کسی اچھے اسکول میں پڑھا ہو۔ میں ابا کے قدموں کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش میں اب بھاگ رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر سمندر کی جانب دیکھ رہے تھے جہاں سورج اب بالکل سمندر پر ٹکا ہوا تھا اور ساحل پر سرمئی رنگ گھل رہا تھا جس پر اڑنے والے پرندے اب سیاہ نقطوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ لیکن زندگی بھی ایک اسکول ہی ہے۔ یہ بھی ہمیں بہت کچھ سکھا دیتی ہے، اور پھر کوئی اس سے سیکھنا بھی چاہے تو پھر وہ بہت کچھ سیکھ لیتا ہے۔ ابا اب جیسے اپنے آپ سے ہی باتیں کرنے لگے تھے۔ پھر وہ رک کر میرے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ تم اچھا کرتی ہو اس کے ساتھ کھیلتی ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں تم بھی کچھ سیکھ رہی ہو۔ ہاں ابا۔ موسیٰ بہت پڑھا لکھا لگتا ہے، اماں بلا وجہ میں خفا رہتی ہیں۔ خیر، وہ اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ انھیں کیا معلوم موسیٰ پڑھا لکھا ہے۔ اور ابا! اماں نے اس سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کی، میں نے شکایتی اور دکھی لہجے میں ان سے کہا۔ بھئی ان کی نظروں میں تو صاف ستھرا ہونا بھی ضروری ہے۔ تم موسیٰ سے کہو کہ صاف ستھرا رہا کرے۔ وہ کیسے ابا؟ اس کے پاس تو شاید ایک دو جوڑے کپڑے ہی ہیں، اس کے گھر میں پانی کا نلکا بھی نہیں ہے، کچھ بھی تو نہیں ہے۔ انھیں تو پینے کا پانی بھی بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ ابا ایک بار پھر چلتے چلتے رک گئے۔ تم کو کیسے پتہ چلا؟ میں نے ایک دن اس سے کہا تھا کہ صاف ستھرے رہا کرو۔ وہ بھڑک اٹھا تھا۔ کہہ رہا تھا ہمارے حصے کا پانی تم لوگ لے لیتے ہو، اپنے بڑے بڑے لان کے پودوں کو پانی دیتے ہو، ہمارے پاس آتے آتے پانی ختم ہو جاتا ہے۔ ابا نے تفکر سے سر ہاں میں یا نہ میں ہلایا، یہ مجھے اندھیرے میں نظر نہیں آیا۔ اور ابا، وہاں پانی اور بجلی بھی نہیں ہے۔ ابا ریت میں پاؤں دبا دبا کر چل رہے تھے، اور ان کی مدھم آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ میں بھی ابا کی طرح ریت کو پاؤں سے دبا دبا کر چل رہی تھی اور ابا کو کہتے سن رہی تھی۔ ہاں، وہ جگہ بستی کے لیے نہیں ہے۔ وہ شاید کسی سرکاری عمارت کی ہے، یہ لوگ اس پر بسے ہوئے ہیں۔ ابا کی آواز میں غصہ تھا، لیکن مدھم اور نیچے سروں میں،

مجھے پتہ نہیں چل سکا۔ مگر میں اداس ہو رہی تھی۔ شاید کسی دن یہ یہاں سے بھی اٹھا دیئے جائیں۔ ابا اپنے باتوں سے میرے دل کو دہلا رہے تھے۔ میں چلتے چلتے رک گئی۔ ابا کے آخری جملے نے تو میرا دل جیسے اچھال کر سمندر میں پھینک دیا تھا۔ ابا کو پتہ ہی نہیں چلا کہ میری کیا حالت ہوئی۔ مجھے رکا دیکھ کر ابا پلٹے۔ اس وقت ابا ملگجی روشنی میں ایک ایسے سائے کی طرح نظر آئے جس کی آواز مجھے ڈرا رہی تھی۔ اب چلو! رک کیوں گئیں؟ میں نے ابا کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا اور بات وہیں سے شروع کی۔ لیکن کیوں اٹھا دیئے جائیں گے؟ بھئی یہ بے گھر لوگ ہیں، جہاں خالی جگہ دیکھی، سر چھپانے کے لئے لکڑیاں کھڑی کیں اور چھت ڈال لی، اور بس، پھر انہیں گھر کہنے لگتے ہیں۔ حکومت اگر چاہتی ہے تو انہیں دے دیتی ہے، ورنہ... ورنہ، ورنہ کیا؟ میں ابا کے ساتھ قدم ملا کر چل رہی تھی کہ کہیں تیز ہوا میں کوئی لفظ میرے کانوں میں پڑنے سے رہ نہ جائے۔ ورنہ انہیں کہیں اور پھینک دیا جاتا ہے ابا یہ کہتے ہوئے اپنے قدموں کو اس طرح آگے بڑھانے لگے جیسے مجھ سے منہ چھپا رہے ہوں۔ اور میرا دل اب ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح تھا۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ ابا گھر چلیں، مجھے اب اپنا بستر یاد آ رہا تھا، جس کے تکیے میں منہ چھپا کر میں رونا چاہتی تھی۔

☆

اس دن موسیٰ مجھے وہاں ملا جہاں وہ خزانہ نکالنے کی مہم پر لگا ہوا تھا۔ میں اس کے پاس خاموشی سے جا کر کھڑی ہو گئی اور غور سے موسیٰ کے گھونگریالے بالوں کو ہوا میں جھولتے ہوئے دیکھتی رہی۔ موسیٰ نے چہرہ اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میرا دل ڈوب رہا تھا۔ موسیٰ نے اپنا کام ختم کیا اور کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہوا۔ کیا بات ہے تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟ بیمار ہو؟ نہیں۔ پھر؟ کل ابا کے ساتھ سمندر پر گئی تھی۔ وہ تو تم جاتی رہتی ہو، کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ نئی بات ہے، میں نے تلملا کر کہا۔ تم سنو گے تو، میں نے تو، کو خوب کھینچا اور خود کو اس بات سے روکا کہ میں موسیٰ کو نہ بتاؤں جو ابا کہہ رہے تھے۔ ابا نے کچھ کہا؟۔ کہا ہوگا کہ تم میرے ساتھ مت کھیلو۔ مت کھیلو۔ جاؤ اپنے ان دوستوں کے پاس جو تمہاری طرح شاندار کپڑے پہنے ہوتے ہیں۔ اور ہم تو بھئی ایسے ہی رہیں گے، تم کو ہمارے ساتھ کھیلنا ہے تو۔ میں موسیٰ کو خاموش کرنے کے لیے چیخ اٹھی۔ بند کرو اپنی یہ بکواس۔ سنو ابا کیا کہہ رہے تھے۔ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں۔ یہ جملہ میرے ذہن میں جما ہوا تھا، پھر موسیٰ کو سنانا بھی تھا۔ موسیٰ میری چیخ سن کر ابھی تک کانوں پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا، جھٹکے سے مڑا۔ یہ بھی کوئی نئی بات ہے۔ جب سے دنیا بنی ہے یہ ہو رہا ہے۔ مجھے یہ بات سن کر مزا نہیں آیا، نہ ہی مجھے برا لگا، ہاں میرا دل اداس ہو گیا۔ موسیٰ سب کچھ جانتا تھا جبھی وہ ہر وقت کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ ہاں تو اور کوئی نئی بات؟ موسیٰ جیسے جان گیا تھا کہ میں کچھ چھپا رہی ہوں۔ چلو میدان کی طرف چلتے ہیں، یہاں ہوا رکی ہوئی ہے۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ موسیٰ کو یہ بتانے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ موسیٰ سے یہ گھر چھین لیا جائے گا۔ وہ آگے آگے چلنے لگا۔ مجھے بتائے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ موسیٰ اگر یہ گھر تم سے چھین لیا جائے تو۔؟ تو کے بعد میرے حلق میں جیسے کچھ پھنس گیا تھا۔ موسیٰ نے رک کر ایک پتھر کو زور سے اپنے پاؤں سے اچھالا، پتھر ہوا میں گھومتا ہوا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم لوگ اس پتھر کی طرح ہیں، پاؤں کی ٹھوکروں میں پڑے ہیں۔ میں ڈر گئی۔ موسیٰ بات کو اتنا سمجھ رہا تھا۔ یہ سب تو پہلے بھی ہوا ہے، ہمیشہ ہوتا آیا ہے، ہوتا رہے گا۔ اب میرے آنسو بہنے والے تھے۔ تم اتنا کچھ جانتے ہو۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ وہ کیا؟ یہی کہ تم لوگ کبھی نہ کبھی یہاں سے ہٹا دیئے جاؤ گے۔ وہ تو ہے۔ پہلے ہم جہاں تھے وہاں سے بھی ہٹائے گئے تھے۔ وہاں میری ماں نے بہت اچھا سا ایک کمرہ بنایا تھا، ہمارے پاس سب کچھ تھا۔ باورچی خانہ بھی، میرے باپ نے اپنی محنت کی کمائی سے اس گھر کو بنایا تھا۔ کمرے میں بچھی چٹائی کو میں رنگتا تھا جو لالٹین کی روشنی میں بہت خوبصورت لگتی تھی۔ وہاں پانی کا بھی بہت اچھا انتظام تھا۔ ہمیں پانی یہاں کی طرح کم نہیں ملتا تھا۔ وہاں ایک اسکول بھی تھا جس میں میرے بہن بھائی پڑھتے تھے، وہاں مفت پڑھائی ہوتی تھی۔ یہ جملے بولتے بولتے موسیٰ مجھ سے کئی قدم آگے نکل گیا تھا۔ پھر، میں نے پھر، موسیٰ کے کسی جملے کو جلدی سننے کے لیے بولا۔ پھر وہ گردن موڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں بھی اسی اسکول میں جاتا تھا۔ اس اسکول کا ایک ٹیچر مجھ سے بڑی محبت کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا تم کو پڑھنے کا موقع ملتا رہا تو تم ایک دن اچھے آدمی بنو گے۔ لیکن ایک دن سب ختم ہو گیا، ہمارے گھر اکھاڑ دیئے گئے اور ہمیں یہاں اتنی دور پھینک دیا گیا۔ میری ماں بہت دنوں تک اپنا وہ گھر یاد کرتی رہی جس کو اس نے محنت سے بنایا تھا۔ یہاں تو ہمارے سر پر صرف ایک چھت ہے، جو ہر موسم میں ہمیں تکلیف پہنچاتی ہے۔ میری ماں تمام دن پانی کے لئے دوڑتی پھرتی ہے۔ یہاں ہم جیسے لوگوں کے لئے قریب میں کوئی اسکول بھی نہیں ہے۔ میں آگے کچھ سننا نہیں چاہتی تھی میرے قدم گھر کی جانب اٹھنے لگے۔ موسیٰ مجھے آواز دیتا رہ گیا۔

☆

ابا اس رات برآمدے میں بیٹھے تھے۔ میں ان کے پاس اس تخت پر بیٹھ گئی جس کو اماں نے بڑی ہنر مندی سے سجایا تھا اور جس پر رکھے گو تکیوں پر روپہلے گوٹے کا کام دمک رہا تھا۔ میرے چہرے پر اس دن سے ہی ہوائیاں اڑ رہی تھیں جب سے میں نے ابا سے سنا تھا کہ کسی بھی وقت موسیٰ جہاں رہتا ہے اس بستی کو خالی کرا لیا جائے گا۔ ابا نے میرا چہرہ دیکھ کر پوچھنا شروع کر دیا، کیا ہوا؟ اماں نے کچھ کہا؟ کیا موسیٰ سے لڑائی ہو گئی؟ ابا نے موسیٰ کو نہیں دیکھا تھا لیکن وہ موسیٰ کے بارے میں اس طرح بات کرتے تھے جیسے بہت ملے ہوئے ہوں۔ ابا، میں اداس ہو رہی ہوں۔ کیوں بھئی؟ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میری کوئی قیمتی چیز ٹوٹ گئی ہو۔ ارے! اتنی بڑی بات۔ تم کو تو واقعی میں موسیٰ سے دوستی رکھنا چاہئے۔ تم تو بہت عجیب باتیں کرنے لگی ہو۔ لیکن ایسا کیوں لگ رہا ہے؟ بس ابا، میرا دل دکھی ہو رہا ہے جب سے

میں نے سنا ہے موسیٰ جس بستی میں رہتا ہے وہ بھی خالی کرالی جائے گی۔ ہاں۔ ابا سر ہلاتے ہوئے میرا چہرہ دیکھ رہے تھے ان کے چہرے پر بھی مجھے ملال نظر آیا۔ جاؤ اماں کے پاس جا کر سو جاؤ۔ نہیں ابا۔ اماں ہمیشہ بادشاہوں کی کہانیاں سناتی ہیں جس میں محل، پریاں اور شہزادے شہزادیاں ہوتے ہیں جن کی خدمت کے بہت سے غلام اور کنیزیں ہوتی ہیں۔ غلام، ابا نے غلام کہتے ہوئے تھوڑا سا منھ بنایا۔ ہاں ابا غلام، شاید یہ غلام بھی موسیٰ کی بستی جیسے ہوتے ہیں جو محل میں ایک طرف رہتے ہیں۔ ابا کو اچھو سا لگ رہا تھا۔ بس بس جاؤ، سو جاؤ، کیسی باتیں کرنے لگی ہو۔ لیکن ابا شاید اس رات میری باتیں سن کر خوفزدہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے قریب کر کے تھپک کر سلانا چاہا تھا۔ لیکن میں نہ جانے کب تک اماں کی سنائی ہوئی کہانیوں سے غلاموں کے قصے الگ کر کر کے یاد کرتی رہی جو ہر وقت ایک جیسی حالت میں بادشاہوں کے حکم پر سر جھکا دیتے تھے۔ لیکن موسیٰ غلام نظر نہیں آتا ہے وہ تو ہر وقت غصے میں رہتا ہے، اس کے بس میں ہوتا تو وہ ان بادشاہوں کے سر اڑا دیتا جو غلاموں پر ظلم کرتے ہیں۔ میں دیر تک یہ سوچتے سوچتے سو گئی۔

☆

مجھے اپنے اور موسیٰ کے فرق کا کبھی پتہ نہ چلا۔ وہ کیسے رہتا ہے، وہ کیا پہنتا ہے، وہ کہاں رہتا ہے۔ اماں کے بار بار یہ فرق سمجھانے کے بعد بھی مجھے موسیٰ صرف اپنا دوست نظر آیا جس سے باتیں کر کے میرا دل ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔ میرے لئے اس وقت ان تمام باتوں کا جاننا بھی ضروری نہیں تھا کہ موسیٰ کی ماں اور اس کا باپ کیا کرتا ہے۔ ضروری تھا تو بس موسیٰ کے ساتھ گھومنا اور باتیں کرنا۔ موسیٰ، جو باتیں کرتے ہوئے مجھے بہت بڑا نظر آتا تھا۔ اور اب تو اس کی آواز بھی بھاری بھاری سی لگنے لگی تھی۔ میں نے ایک دن موسیٰ سے کہا تھا، موسیٰ تمھاری آواز پھٹے ڈھول کی طرح ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ہنسنے لگا تھا۔ ہاں، ماں کہتی ہے میں اب بڑا ہو رہا ہوں۔ تو کیا بڑے ہونے سے آواز بھاری ہو جاتی ہے؟ پھر مجھے ابا کی آواز دھیان میں آئی۔ ہاں ہاں، ابا کی آواز بھی تو بھاری ہے۔ سب مردوں کی آواز بھاری ہو جاتی ہے جب وہ بڑے ہوتے ہیں۔ پھر میری تو نہیں ہوگی؟ جب تم بڑی ہونے لگو گی تو تمھاری آواز بھی بھاری ہو جائے گی۔ توبہ، اتنی بری آواز میں تو میں نہیں بولنا چاہوں گی۔ تو کیا خاموش رہو گی؟ وہ زور زور سے ہنس رہا تھا، میں اپنا مذاق اڑاتے ہوئے اسے ہنستا ہوا دیکھ رہی تھی۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ موسیٰ اس طرح دل کھول کر ہنستا ہو۔ وہ ہنستے ہوئے پھر بولا تم پاگل ہو۔ عورتوں کی آواز ایسی ہی رہتی ہے، جب تم بڑی ہو جاؤ گی میری عمر جتنی تب بھی۔ اور میں موسیٰ کے ہنستے ہوئے چہرے کو آج غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کے اوپر ننھے ننھے چمکتے ہوئے بال اگ رہے تھے۔ اور ناک، وہ تو اور لمبی اور نوکیلی ہو گئی تھی۔ میں نے موسیٰ کے ہونٹوں کو قریب سے دیکھا۔ موسیٰ منھ کھولے میری طرف دیکھنے لگا۔ کیا دیکھ رہی ہو؟ تم واقعی بڑے ہو رہے ہو، ابا کی طرح تمھاری بھی مونچھیں اگ رہی ہیں۔ چلو بس کرو ریڈنگ۔ ریڈنگ؟ ہاں ہاں، فیس ریڈنگ۔ ایک تو تم اسکول میں پڑھنے کے بعد بھی نالائق ہو۔ میں ہکا بکا رہ گئی، موسیٰ تم اتنا پڑھے ہوئے ہو! نہیں میں تمھاری طرح جاہل ہوں، اسکول میسر نہیں ہوا تو کتابیں تو مل ہی جاتی ہیں۔ میں اس دن بہت مایوس ہوئی، مجھے موسیٰ اپنے سے زیادہ پڑھا لکھا نظر آیا۔

ایک دن اس نے کھیل کے دوران مجھ سے پوچھا تھا تم اخبار پڑھتی ہو؟ نہیں۔ صرف ابا پڑھتے ہیں اخبار۔ جبھی تو تم جاہل ہو۔ ارے اخبار جو آدمی نہیں پڑھتا اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا، کیا ہو رہا ہے اس دنیا میں۔ خبریں پڑھا کرو روز مرہ کے واقعات سمجھ میں آتے ہیں۔ تم پڑھتے ہو؟ میں اندر ہی اندر کھولنے لگی تھی۔ موسیٰ مجھ سے کئی ہاتھ آگے تھا۔ اور نہیں تو کیا؟ اس نے میلے پاؤں زمین میں رگڑ کر کہا۔ اخبار نہیں پڑھوں گا تو اور کورا رہ جاؤں گا۔ اوہو! جبھی تم اتنی بڑی بڑی باتیں کرتے ہو۔ بڑی بڑی باتیں، اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ ہاں، تمھاری کچھ باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آتیں۔ کب پڑھتے ہو اخبار؟ جب کام پر جاتا ہوں۔ فیکٹری میں جب کھانے کا ٹائم آتا ہے، وہاں مزدوروں کے لئے ایک جگہ ہوتی ہے۔ ایک میز پر اخبار بھی ہوتا ہے۔ باقی تو سب کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں میں اسی میں وقت نکال کر اخبار بھی پڑھ لیتا ہوں۔ حد ہوتی ہے، تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں، میں بھی اخبار پڑھنا شروع کر دیتی۔ یہ باتیں بتانے کی نہیں ہوتیں، تمھاری کھوپڑی میں یہ آنا چاہئے کہ اخبار کتنا ضروری ہے۔ اور روز کیا ہو رہا ہے۔ اور یہ کہ تمھارے گھر اور اسکول کے علاوہ بھی ایک دنیا ہے۔ اچھا بس کرو۔ میرا دل پھنک رہا تھا، اپنے پر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ موسیٰ اتنا پڑھ لیتا ہے۔ تو میں جو پوچھ رہا تھا اس کی وجہ تھی۔ کیا؟ یہی کہ ہماری جیسی ایک بستی کو خالی کرانے کے بجائے اس میں آگ لگا دی۔ بہت سے لوگ جل گئے، اور باقی بے گھر ہو گئے۔ میری ساری دشمنی جو موسیٰ کی قابلیت کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی اچھل کر دوسری طرف جا پڑی۔ اب میں موسیٰ کی جھونپڑی کو جلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اور موسیٰ کا ایک اور جملہ میرے کانوں سیسہ انڈیل رہا تھا۔ شاید ہمیں بھی جلدی یہاں سے نکال دیا جائے۔ اچھا موسیٰ، میں گھر چلتی ہوں۔ اب میں کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ بس گھبرا گئیں، یہی ہوتا ہے ہمیشہ ہمارے ساتھ، تم کو اب پتہ چلا۔ وہ گھر کی طرف مجھے پلٹتا دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اور میں ایک ایسے عالم میں تھی خود مجھ پر واضح نہیں تھا۔

☆

اب میں نویں کلاس کا امتحان دے رہی تھی۔ موسیٰ کسی فیکٹری میں کام کر رہا تھا۔ اسکول کی طرف جاتے اور آتے ہوئے میری اسکول بس موسیٰ کے علاقے کے قریب سے گذرتی تھی۔ میں موسیٰ کی جھونپڑی کی طرف دیکھتی اور سوچتی موسیٰ اپنی ماں کے پاس کوئلوں کی انگیٹھی کے پاس بیٹھا چائے پی رہا ہوگا۔ اس کی ماں توے سے گرم گرم روٹی اتار رہی ہوگی اور موسیٰ وہ گرم گرم روٹی کھاتے ہوئے یا چائے کا گرم گھونٹ لیتے ہوئے اپنا منھ جلا بیٹھا ہوگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو

بیٹھے لگے ہوں گے۔ پھر میں ہنسنے لگتی ہوں۔ میری ہنسی کی تان ٹوٹتی ہے یہ سوچتے ہوئے کہ شاید ایسا کچھ بھی نہ ہو۔ اس کی ماں صرف پانی گرم کر رہی ہو اور موسیٰ اور اس کے بہن بھائی آج بھوکے ہی رہ گئے ہوں۔

موسیٰ کبھی کبھی میرے ساتھ میدان میں گھومتے ہوئے پوچھتا تھا، رابعہ تم نے آج کیا کیا کھایا؟ میں ماں کا زبردستی اڑھایا ہوا ڈوپٹہ گردن سے کھولتے ہوئے صبح کے ناشتے کے اور دوپہر کے کھانے کے بارے میں سوچتے ہوئے کہتی۔ آج ماں نے مجھے خوب ٹھنسایا ہے۔ دودھ پی لو، انڈا کھالو، ڈبل روٹی، مکھن، یہ، وہ۔ میں بولے جاتی ہوں۔ اماں گلے تک بھر دیتی ہیں۔ وہ میرا چہرہ منہ کھولے حیرت سے تکتا رہا، پھر آسمان کی طرف، پھر اس کی تیوریوں پر بل پڑنے لگے، اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ایک لمبی ہوں کھینچی۔ اس کی ہوں پر میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اوپر کیا دیکھ رہے ہو؟ بس خدا کی شان، تم کو اتنا کھلاتا ہے کہ تم اگلنے لگتی ہو۔ ایک ہم ہیں، آج ماں نے صرف چولھا جلایا تھا، پکایا کچھ نہیں تھا۔ تو! تم اب تک بھوکے ہو، نہیں، کچھ تو کھایا ہے۔ کیا؟ میں موسیٰ کی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سیاہ پتلیوں کے اردگرد سفیدی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ مجھے بھوک کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ صبح، دوپہر، رات، میرے لئے ماں نت نئے کھانے پکا پکا کر رکھتی تھیں۔ ان کا اصرار رہتا، دن بھر کھاؤ۔ قد بڑھنے کے دن ہیں۔ اور میں بھی کھائے جاتی۔ جبھی تمہارا چہرہ کچھ اترا اترا لگ رہا ہے، جیسے جب کبھی اماں مجھے روزہ رکھواتی ہیں تب میرا ہوتا ہے۔ موسیٰ جیسے تڑپ اٹھا۔ بس بھوک کا سال میں ایک ہی تجربہ کرتے ہو تم لوگ۔ میں سوس سی گئی۔ تمہیں تکلیف ہو رہی ہو گی۔ ہاں، ظاہر ہے۔ بھوکا ہوں۔ ماں نے کہیں سے آٹے کا انتظام کیا تھا۔ اسے گھول کر اس میں گڑ ملا کر پکایا تھا پھر اسی سے سب نے پیٹ بھرا۔ اس نے پاؤں میں پڑے ہوئے پتھروں کو زور سے اچھال کر اور لفظوں کو زبان کے نیچے رگڑ رگڑ کر کہا جیسے یہ میرا قصور ہے کہ وہ بھوکا رہا ہے۔ میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اسکول بس ایک جھٹکے سے رکی۔ تمام لڑکیاں اترنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

☆

میری دنیا محدود تھی۔ میری کسی سے موسیٰ جیسی دوستی نہ ہو پائی تھی۔ ماں کی بہت کوشش رہی کہ میں اپنے دوست بناؤں۔ لیکن میرے پاس فرصت نہیں تھی۔ اسکول سے واپسی کے بعد اماں کی سختی کے باوجود میں کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر تھوڑی دیر کے لئے باہر چلی جاتی۔ موسیٰ یا تو اس کونے میں بیٹھا ہوتا جہاں وہ خزانہ نکالنے کے لئے اپنی چھوٹی انگلی سے زمین کھودنے میں جتا ہوتا، یا پھر کسی اور کونے میں میرے انتظار میں کھڑا ہوتا۔ اکثر تو یہی ہوتا کہ میں ہی اس کونے کی طرف چلی جاتی جہاں مجھے یقین ہوتا کہ وہ بیٹھا ہوا ملے گا۔ اور پھر باتیں، باتیں جو مجھے موسیٰ نت نئی سناتا۔ کبھی اپنی فیکٹری کے لوگوں کی کبھی ان لوگوں کی زندگی کی جو اس کے ساتھ اسی طرح پس رہے ہیں۔ لیکن ابھی تک میں اس نتیجے تک نہیں پہنچی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور کب تک ہوتا رہے گا؟ لیکن میں اس غم میں موسیٰ کے ساتھ برابر کی شریک تھی جو گاہے بگاہے مجھے کسی ناانصافی کی اطلاع دیتا رہتا تھا، جو اس کے جیسے لوگوں کے ساتھ ہو رہی تھی۔

وقت گذرتا جا رہا تھا اور موسیٰ کے خزانہ نکالنے کی مہم مجھے ناکام ہوتی نظر آ رہی تھی۔ ابھی وہ گڑھا جو موسیٰ کھود رہا تھا صرف دو یا تین بالشت ہی کھدا ہو گا۔ شاید موسیٰ روز اس کو گہرا کرتا ہو گا لیکن میدان کی ہوائیں اور وہاں چلنے پھرنے والے قدم روز اس کو پاٹ دیتے ہوں گے۔ اب تک مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ موسیٰ کو کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ لہٰذا ابا جب میرے لئے کوئی کتاب لاتے تھے میں اسے موسیٰ کے پاس لے جاتی۔ وہ کبھی وہ کتاب پڑھے ہوئے ہوتا اور کبھی مجھ سے لے کر پڑھتا۔ لیکن کتاب کے بارے میں موسیٰ کی باتیں، مجھے موسیٰ کے ساتھ گھومنے اور باتیں کرنے پر کبھی وقت کے زیاں کا احساس نہیں ہوا۔ میں ابا سے جب موسیٰ کے کتاب کے بارے میں جو خیالات ہوتے بتاتی۔ ابا نہایت حیرانی سے مجھے سنتے۔ اماں ایسے وقت میں ابا سے کہتی نظر آتیں، اب اس کو کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں رہی سوائے ان کتابوں کے اور اس لڑکے کے ساتھ وقت ضائع کرنے کے، لڑکیوں والی کوئی بات نہیں رہی۔ اس سے پہلے کہ ان کا دماغ بالکل خراب ہو جائے ہمیں ہی یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔ میں اماں کی باتوں کا برا نہیں مانتی تھی۔ مجھے معلوم تھا جس دن اماں موسیٰ سے خود ملیں گی اور اس سے باتیں کریں گی ان کا غصہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن ایسا موقع کبھی نہیں آیا۔ پلک جھپک کر بہت سا وقت گذر گیا۔

☆

وہ صبح اداس ہواؤں سے بھری ہوئی تھی۔ صبح اسکول بس میدان سے گذرتی ہوئی جب موسیٰ کے گھر کے قریب سے گذرنے والی سڑک پر پہنچی تو میں نے دیکھا وہاں کچھ بل ڈوزر ایک منحوس چال سے ادھر سے ادھر متحرک تھے اور موسیٰ کی بستی میں اداسی اور بدنصیبی کی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ میری آنکھیں جو دیکھ رہی تھیں وہ دل قبول نہیں کر رہا تھا۔ پہلے میرا دل چاہا کہ بس سے کود جاؤں، لیکن بس ایک زناٹے سے اس علاقے سے نکل چکی تھی۔ اسکول میں میرا سارا دن بے چینی کی نذر ہو گیا تھا۔ وہ دن انتہائی دشوار تھا میرے لئے گذارنا۔ میں سارا دن یہی سوچتی رہی کہ یہ واہمہ ہے۔ لیکن جوں جوں وقت گذر رہا تھا واہمہ خوف کی شکل اختیار کر رہا تھا۔

اسکول بس اب اسی راستے سے واپس جا رہی تھی۔ میں بالکل کھڑکی سے جڑی بیٹھی تھی اور اماں کی یاد کرائی ہوئی تمام دعاؤں کو دل ہی دل میں پڑھ رہی تھی۔ لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ موسیٰ کی بستی کو اکھیڑا جا چکا تھا۔ لوگوں کے بھاگنے، دوڑنے اور بل ڈوزر کی آوازوں نے کچھ دیکھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ دھول اور اس کے درمیان اٹھتا ہوا دھیما دھیما بین کرتا سا شور اور تپتی ہوئی دھوپ۔

میرے پیٹ میں درد کے گولے سے اٹھ رہے تھے۔ میرے دل کا اندیشہ مجھے حتمی پر اکسا رہا تھا۔ چاروں طرف اس میدان میں بستی کے لوگ اپنے اپنے سامان اٹھائے ہوئے بے چارگی کے عالم میں پھر رہے تھے۔ میں بس کے گھر تک جانے کا انتظار نہیں کر سکی۔ بس کوڑ کوا کر کود گئی۔ میں نے دوڑ کر موسیٰ کی جھونپڑی کا رخ کیا۔ وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا، اکھڑی ہوئی جھونپڑی اور ٹوٹے پھوٹے سامان کے ڈھیر کے سوا۔ میں ادھر ادھر بھاگتے ہوئے موسیٰ کو تلاش کرنے لگی لیکن اتنے بہت سے حواس باختہ، افراتفری سے گھرے ہوئے مجمع میں موسیٰ کو تلاش کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ میرا دل آج نئے غم سے آشنا ہو رہا تھا۔ وہ جیسے پانی میں بہتی ناؤ کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہوں۔ بہت دیر تک میں اپنا بستہ کندھے پر ٹانگے ادھر سے ادھر بھاگتی رہی، پھر ایک کونے میں جا کر کھڑی ہو گئی کہ شاید موسیٰ مجھے تلاش کرتا ہوا یہاں آ جائے۔ میں دکھ کی دلدل میں دھنس رہی تھی۔ موسیٰ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا میں جلد اس ڈراؤنے خواب سے نکل جانا چاہتی تھی اور اس بدخوابی سے، کہ موسیٰ جا رہا تھا۔ لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ اڑتی ہوئی دھول کے درمیان بدحواس چہروں کو ایک دوسرے کو پکارتے ہوئے۔ تھوڑی دیر میں کھڑی رہی۔ پھر اچانک مجھے نہ جانے کیا ہوا، میں بھی پکارنے والوں میں شامل ہو گئی۔ میں موسیٰ کو چیخ چیخ کر آواز دے رہی تھی جو اس بھیڑ میں گم ہو رہا تھا جن کو ڈھونڈا جا رہا تھا۔ لیکن میں صرف چیختی ہی رہ گئی۔ موسیٰ نے میری آواز نہیں سنی۔ موسیٰ وہاں نہیں تھا۔ دھول اور دھواں اب چھٹ رہا تھا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں گھر کی طرف بھاگی، یہ سوچ کر کہ بستہ رکھوں گی، پانی پیوں گی اور واپس یہاں آ جاؤں گی۔ ہو سکتا ہے کہ موسیٰ مجھے ڈھونڈ رہا ہو۔

گھر میں گھستے ہی اماں نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ بس تو کب کی آ کر چلی گئی۔ تم کہاں تھیں؟ میں نے اماں کے سوالوں کا جواب دیئے بغیر ان سے سوال کرنا شروع کر دیئے۔ اماں یہ گھر کیوں توڑے جا رہے ہیں؟ یہ اسی قابل تھے۔ جہاں چاہتے ہیں گھر بنا لیتے ہیں۔ اماں کے ہونٹوں کی بناوٹ جوان جملوں کو بولتے ہوئے بن رہی تھی، میرے دل میں احتجاج پیدا کر رہی تھی۔ اماں، ان میں انسان رہتے تھے، ہمارے جیسے لوگ۔ نہیں! وہ ہمارے جیسے نہیں ہیں، پھر بھی گورنمنٹ نے ان کو اتنے دن یہاں ٹھہرائے رکھا اور اب دوسری جگہ مکان بنا کر دے گی۔ بنا کر دے گی اماں، ابھی بنائے تو نہیں ہیں، پتہ نہیں کہاں لے جا کر پٹخیں گے ان لوگوں کو۔ اماں اپنی لمبے بالوں کی چوٹی گوندھ رہی تھیں جسے انھوں نے لہرا کر پیچھے اس طرح کیا جیسے اس خیال کو بھی ڈھکیل رہی ہیں۔ کون سے پکے گھر تھے۔ لیکن اماں، وہ کتنے عرصے سے بسے ہوئے تھے یہاں۔ میں تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ ہاں ہاں، ان کا کیا ہے۔ وہ پھر کہیں گھر بنا لیں گے ایسے ہی۔ مجھے اماں کا لہجہ آج سے پہلے اتنا سخت اور تکلیف دہ کبھی نہیں لگا تھا۔ چلو بس کرو! اب بحث بند کرو کھانا کب سے ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ لیکن میرا دل تو پانی پینے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا حالانکہ میرے حلق میں کانٹے سے پڑے ہوئے تھے۔ میں تھوڑی دیر تک گھر کی بالکونی میں کھڑی رہی اور انتظار کرتی رہی کہ اماں اپنے کمرے میں جائیں اور میں ان کی آنکھ بچا کر باہر کا رخ کروں۔ باہر، جہاں موسیٰ جانے سے پہلے مجھ سے ضرور ملنا چاہے گا۔ اس سوچ کے ساتھ ہی میں باہر کی طرف بھاگی۔ اماں نے میرے باہر جاتے قدموں کی آواز کو سن لیا تھا۔ وہ میری طرف لپکیں، یہ کہتے ہوئے، اب باہر مت جانا! لیکن میرے قدم ان کی آواز نہیں سن سکے۔

باہر ایک ایسی خاموشی تھی جو اکثر شام کے بعد رات سے پہلے جب آسمان پر ابابیلیں اپنا راج کرتی ہیں، محسوس ہوتی ہے۔ دھول ابھی بھی اڑ رہی تھی۔ افراتفری میں تھکن نمایاں تھی۔ اب سب کو پتہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ لوگ اپنا سامان لاد کر ان نامعلوم سمتوں کی طرف جا رہے تھے جہاں ان کو لے جایا جا رہا تھا۔ بہت سی سوزوکیوں اور گدھا گاڑیوں کی آوازیں میدان کے اس سرے سے آ رہی تھیں جہاں جھونپڑیاں اکھڑی پڑی تھیں۔ میں آگے بڑھی، اور آگے، شاید موسیٰ اور اس کے گھر والے کسی گاڑی میں بیٹھے ہوئے جاتے نظر آ جائیں۔ اب سڑک آ چکی تھی جس پر سے وہ گاڑیاں جا رہی تھیں۔ سہ پہر ختم ہو رہی تھی۔ میں ہر گاڑی کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میرا دل آنے والی شام کی طرح ملگجا سا ہو رہا تھا۔ میں کڑھ بھی رہی تھی، موسیٰ جو روز میرا انتظار کرتا تھا آج مجھ سے ملے بغیر چلا جائے گا۔ اور اس کا وہ خزانہ اب کون کھودے گا، وہ زمین۔ میں کڑھ رہی تھی اور میرے حلق سے میرے سینے تک کڑوا گاڑھا سا مائع جم رہا تھا۔ جو مجھے درد کی اجنبی فضا میں لے جا رہا تھا۔

اچانک میں نے دیکھا۔ بہت سی تیز رفتار سوزوکیوں اور گدھا گاڑیوں کے بیچ موسیٰ اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی ماں سب سے آگے سر نہوڑائے ہوئے بیٹھی تھی۔ خود موسیٰ سڑک پر مڑتی ہوئی گاڑی میں مجھے سب سے آخر میں نظر آیا۔ میں نے اپنی تمام طاقت لگا کر آواز لگائی۔ موسیٰ جو زمین تکتا ہوا جا رہا تھا، شاید گاڑی کی پہیوں کی آوازوں نے میری آواز اس تک نہیں پہنچائی۔ میں گاڑی کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگی۔ موسیٰ نے مجھے سر اٹھا کر دیکھا، پھر اس کی آنکھیں بیچ میں ہی ٹک گئیں۔ وہ مجھے بھاگتے ہوئے نہیں دیکھ رہا تھا، وہ زمین دیکھ رہا تھا جو میرے اور اس کے درمیان فاصلے بنا رہی تھی۔ میں چلا رہی تھی، موسیٰ تم جا رہے ہو! تم مجھ سے ملنے آیا کرو گے! موسیٰ تم کہاں جا رہے ہو؟ میرے تمام سوالات، جو یکے بعد دیگرے میرے حلق سے چیخوں کی شکل میں میرے منہ میں سے اٹھتے ہوئے جھاگ کے ساتھ باہر نکل رہے تھے۔ میں بھاگ رہی تھی۔ موسیٰ کی تیز رفتار گاڑی مجھے تیزی سے پیچھے چھوڑ رہی تھی۔ میں بھاگ رہی تھی موسیٰ کی گاڑی کے پیچھے جو میرے بھاگتے ہوئے قدموں سے آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔ اور شام کے جھٹپٹے میں اتر گئی۔

یہ سب کچھ نیا تھا۔ وہ درد بھی، جو میرے حلق کو پکڑ رہا تھا، اور وہ حالت

جس سے میں گذر رہی تھی۔ پہلی بار میں اندھیرا خوف بن گیا تھا۔ میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ میں میدان کے بیچوں بیچ اکیلی کھڑی تھی۔ ایک ایسی اداسی میں گھری ہوئی جو میرے لئے بالکل نئی تھی، جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ پہلی ہی بار مجھے سناٹے کا احساس اپنے چاروں طرف محسوس ہوا۔

گھر پہنچ کر میں اماں کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکتا تھا، دروازہ تو اماں نے ہی کھولا تھا۔ ان کی آنکھوں میں غصہ اور ان کے ہونٹ کچھ بولنا چاہتے تھے لیکن اماں کی آنکھیں میرا چہرہ دیکھتے ہی تبدیل ہو چکی تھیں۔ اب وہ مجھے ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے میں جب بیمار ہوتی تھی تب ان کی یہ کیفیت ہوتی تھی۔ اماں مجھ سے کچھ پوچھ رہی تھیں، میرے آگے کھانا رکھ رہی تھیں، نوالہ بنا کر میرے منہ میں ڈال رہی تھیں اور میں جو وہ کہہ رہی تھیں اور کر رہی تھیں اس سے یکسر غافل تھی۔ میرے دل میں ایک دکھ سر اٹھا رہا تھا۔ یا یوں کہ ایک پودا پھوٹ چکا تھا اور اس کی کونپلیں میرے جسم میں پھیلنے کے لیے تیار ہو رہی تھیں جن سے میں ابھی بے خبر تھی۔

اماں کھانا کھلا کر کمرے میں بستر پر مجھے لٹا کر دبے قدموں باہر جا چکی تھیں۔ میں پہلی بار تنہائی کے آسیب سے مل رہی تھی۔ اس میں کون میرا ساتھ دیتا، کس سے میں کہتی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں بالکونی کی طرف چلی گئی اور رات گئے تک اس میدان کی طرف دیکھتی رہی جہاں اب ننھے جگنو ٹمٹماتے نظر نہیں آ رہے تھے۔

رات گئے میں یہ سوچ سوچ کر مضمحل ہو رہی تھی کہ موسیٰ مجھ سے مل کر کیوں نہیں گیا۔ اس کے یہاں سے جانے کی ذمہ دار میں تو نہیں تھی۔ وہ مجھے یہ بھی بتا کر نہیں گیا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ میں یہ سوچ کر تڑپ رہی تھی اور اس اجنبی دکھ سے الجھ رہی تھی جو میرے دل کو آنسوؤں میں بہائے لیے جا رہا تھا۔ وہ رات ایسے ہی گذری جیسے اماں رات میں موم بتی جلا دیتی تھیں جب کبھی لائٹ چلی جاتی تھی اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ سسک سسک کر جل رہی ہو۔

یہ نئے دن کی صبح تھی، ایک ایسا دن جس کی شروعات آنکھ کھلتے ہی میرے سینے میں بھرے ہوئے دکھ کی پہلی سسکی سے ہوئی تھی۔ اماں مجھے جگانے آئی تھیں۔ اماں کے چہرے پر میرے چہرے کا عکس تھا۔ وہ میری آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ میں نے اماں کو بے بسی سے دیکھا اور میرے آنسو بہنے لگے جن کو میں اماں سے چھپانا چاہتی تھی۔ میں تیزی سے غسلخانے کی طرف چلی گئی جہاں میں نے اپنے آنسوؤں کو پانی سے دیر تک دھویا۔

☆

جیسے کوئی بھیانک خواب کو یاد رکھنا نہیں چاہتا، میں بھی اس میدان کی طرف دیکھنا نہیں چاہتی تھی جہاں موسیٰ اب نہیں تھا۔ میری اسکول بس ادھر سے گذر رہی تھی جہاں سے روز گذرتی تھی۔ وہاں سناٹا اور ہو کا عالم تھا۔ کچھ آوازیں تھیں، ایسی آوازیں جوان ہواؤں کے ساتھ چلتی ہیں جو سب کچھ اڑا کر لے جاتی ہیں جو دلوں کو غموں سے بھر دیتی ہیں۔ اور میرا دل جس غم سے آشنا ہو رہا تھا اسے میں اب تک کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں تھیں جب تک وہ میدان ختم نہیں ہو گیا تھا۔ جانے کب اسکول آیا۔ ایک نئے غم کی دھند میں، میں اسکول میں داخل ہوئی۔ میرا سارا دن اسی دھند میں گذرا۔ سارا دن کسی بھی کلاس میں کسی بھی ٹیچر کا کوئی لفظ میرے کانوں سے نہیں ٹکرایا۔ میرے کانوں میں بس ان ہواؤں کی آوازیں تھیں، جو اس میدان میں چل رہی تھیں جہاں موسیٰ اب نہیں تھا۔

ایک بار پھر میری بس وہاں سے گذر رہی تھی اسکول سے واپسی پر جہاں اب کچھ نہیں تھا۔ بگولے بناتی ہوا اور وہ سناٹا جسے میں پہلی بار دیکھ رہی تھی، جو میرے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا اور نامعلوم فضا میرے اردگرد ایک ایسا منظر بنا رہی تھی جو بہت اندھیرے میں ٹٹولنے جیسی ہو۔ میں پھر رو پڑی تھی۔ میرے برابر میں بیٹھی لڑکیاں، مجھ سے میرے رونے کا سبب پوچھ رہی تھیں۔ میں انھیں کیا بتاتی۔ کیا یہ کہ موسیٰ مجھ سے ملے بغیر چلا گیا یا یہ کہ موسیٰ نے یہ بھی نہیں بتایا کہ کہاں جا رہا ہے؟

اماں آج میری خوب آؤ بھگت کر رہی تھیں، ہمیشہ سے زیادہ۔ ابا مجھے ایسے بہلا رہے تھے جیسے جب بہلاتے تھے جب میں بیمار ہوتی تھی۔ وہ مجھے کہیں گھمانے لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن میں بالکونی سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتی تھی اس بالکونی سے جہاں سے مجھے وہ ٹمٹماتے ہوئے جگنو نظر آتے تھے، جب شام ہونے لگتی تھی اور میں بلاوجہ میں اس بالکونی سے اس علاقے کی جانب دیکھتی رہتی تھی جہاں موسیٰ رہتا تھا۔ ابا کے بہت اصرار پر میں گھر سے نکل پڑی۔ لیکن میں ابا کے راستے پر نہیں چلی، ان کا ہاتھ پکڑ کر اس جگہ لے گئی جہاں موسیٰ زمین کھود رہا تھا۔ میں نے اس گڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ ابا، یہ وہ گڑھا ہے جو موسیٰ خزانے کے لیے کھود رہا تھا۔ ابا حیرت سے مجھے دیکھنے لگے گویا ان کو میرے حواسوں پر شک سا ہوا۔ یہ تو وہ زندگی بھر نہیں کھود سکتا تھا۔ پاگل تھا کیا؟ باتیں تو تم اچھی اچھی سناتی تھیں اس کی، لیکن یہ کام تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ یہ کہانیوں میں ہو سکتا ہے، خواب دیکھا جا سکتا ہے، لیکن حقیقت میں ناممکن تھا۔ اچھا ہوا وہ یہاں سے چلا گیا۔ وہ ذہنی بیمار تھا۔ ابا نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے اور میں اسے زمین پر اس جگہ ابا کی باتوں سے بے پروا اپنی چھوٹی انگلی سے وہ زمین کھود رہی تھی جو موسیٰ نامکمل چھوڑ گیا تھا۔ ابا نے باتیں ختم کر کے میری طرف دیکھا۔ پھر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے اٹھنے کے لیے کہا، چلو بیٹا کہیں اور چلیں۔ مجھے معلوم تھا ابا میری اس حالت سے آگاہ ہو رہے تھے جواب مجھ پر طاری ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر ابا کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں مجھے بھیگی لگیں۔ میں جلدی سے اپنے کپڑے جھاڑ کر کھڑی ہوگئی اور ابا کے آگے آگے چلتی ہوئی گھر کی سمت بڑھنے لگی۔ شام تو ہو ہی چکی تھی۔ میں یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ جوں جوں وقت گذر رہا تھا، وہ دکھ جو موسیٰ کے جانے کے بعد مجھے ملا تھا آہستہ

آہستہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اور میرے چہرے پر اس کی تپش اپنی شدت دکھا رہی تھی۔ اور جو میرے ماں باپ کے دلوں پر بھی منعکس ہو رہی تھی۔

☆

میں زندگی کے سفر میں آگے بڑھتے ہوئے اور سن بلوغت کو چھوتے ہوئے موسیٰ کی جدائی کے المیے سے لپٹی رہی۔ موسیٰ زمین کھودتے ہوئے اور خزانہ نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی چھوٹی انگلی گنوا بیٹھا۔ اور جب میں نے اپنی چھوٹی انگلی سے وہ خزانہ کھودنا چاہا تو مجھے بہت ہنسی آئی۔

اس دن میں بہت دوپہر میں اس جگہ چلی گئی تھی مجھے یہ یقین تھا کہ موسیٰ آئے گا، لیکن جب تک وہ نہیں آتا مجھے اس کا کام کرنا چاہئے۔ اس کے وہ خواب جو وہ اپنے لوگوں کے لیے دیکھ رہا تھا آخر ایک دن پورے ہوتے ہیں۔ میں دیر تک اس جگہ کو کھودتی رہی۔ بہت دیر تک ان یادوں کے درمیان جو میں نے اور موسیٰ نے باتیں کرتے ہوئے گذاری تھیں۔ میرا یہ روز کا معمول بن چکا تھا۔ اپنی پڑھائی کے بعد میں اس کونے میں خود کو سمیٹ لیتی تھی۔ وقت گذرتا چلا گیا لیکن موسیٰ کی کھودی ہوئی زمین جہاں کی تہاں رہی۔ وہاں گڑھے کی گہرائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میری چھوٹی انگلی اس زمین کو کھودتے کھودتے آگے سے سیاہ اور نیلی ہو چکی تھی۔

اماں اور ابا اب میرے اس کام میں کوئی مداخلت نہیں کرتے تھے۔ ان کی تمام کوششوں کے باوجود میری حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میرے پاس وقت گذارنے کے لیے ایک اہم کام تھا، اپنی پڑھائی کے بعد اس گڑھے کے ارد گرد رہنا۔ خزانہ نکالنے کی مہم میں اب میں جتی ہوئی تھی۔ ان تمام ارادوں کے ساتھ جو موسیٰ کے دماغ میں تھے۔

☆

یہ کہانی لکھتے ہوئے میں سوچ رہی ہوں، موسیٰ مجھے کہاں کہاں ملا۔ وہ مجھے کئی بار ملا تھا۔ کئی موڑوں پر میری اس سے مڈ بھیڑ ہوئی تھی لیکن اس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اس کو آواز دیتی رہی لیکن وہ چشم پوشی کر کے نکل گیا۔ موسیٰ کی نہ پہچاننے کی ادا مجھے پسند نہیں آئی۔ وہ مغرور ہو رہا تھا۔ اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ پہلی بار مجھے وہ اس بھیڑ میں نظر آیا تھا جب ایک جگہ بہت سے لوگ ہنگامہ آرائی کر رہے تھے وہ اپنی مانگیں پوری کروانے کے لیے حکومت کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے۔ اس جلسہ گاہ کے باہر سے گذرتے ہوئے میں نے موسیٰ کو دیکھا تھا۔ وہ اس مجمع میں گم سم کھڑا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی، اس کو غور سے دیکھنے لگی۔ یہ موسیٰ ہو سکتا ہے! مجھے زیادہ دیر نہیں لگی موسیٰ کو پہچاننے میں۔ تم موسیٰ ہو؟ میں نے بھیڑ میں دھکے کھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں کسی اور سے مخاطب ہوں۔ ہاں ہاں تم موسیٰ ہی ہو۔ وہ تھوڑی دیر مجھے گھور کر دیکھتا رہا، پھر اس بھیڑ میں جو پہلے ہی ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھی ٹکراتا ہوا مڑا اور غائب ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے دوڑی لیکن مجھے آگے بڑھنے کا راستہ نہیں ملا۔ میرا دل بھربھری مٹی کے ڈلے کی طرح جو کسی کے پاؤں میں آ کر پس جاتا ہے، پس رہا تھا۔ یہ موسیٰ تھا۔ میں نے موسیٰ کو پہچان لیا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں، پتلی نوکیلی ناک اور گھونگھریالے بال، ہاں بالکل موسیٰ ہی تھا۔ موسیٰ اگر مجھ سے مخاطب ہوتا تو میں اس کو یاد دلاتی کہ میں کون ہوں۔ لیکن وہ تو مجھے بالکل ہی بھول گیا تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ میں بھیڑ کے دھکوں سے نکل کر اب گھر کی طرف جا رہی تھی۔

ایک دن پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ خالی سڑک پر چلتے ہوئے ان قدموں کی چاپ نے مجھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ میرا دل حلق میں آ گیا تھا۔ موسیٰ سر پر ایک بھاری گٹھر رکھے اپنے بھاری بوجھ میں دبا ہوا، آہستہ آہستہ وہ میرے پیچھے سے آگے نکل رہا تھا۔ میں رک گئی۔ اس بار بھی میں نے پہچان لیا تھا۔ تم موسیٰ ہو؟ میں نے بے چین آواز میں اپنے قریب سے گذرنے والے سے پوچھا۔ بھاری بوجھ تلے دبے چہرے نے مجھے کن انکھیوں دیکھا۔ وہ بوجھ کے مارے سر گھما نہیں پا رہا تھا لیکن اس نے میری طرف دیکھنا نہیں چھوڑا۔ پھر وہ رک گیا۔ تم موسیٰ ہو نہ؟ میرا دل اب ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ وہ مجھے پہچان رہا تھا۔ تمھیں یاد ہے وہ بستی، وہ میدان اور میں؟ یہ میں نے اتنی زور سے کہا جیسے وہ بہرا ہو۔ اس نے یہ سنتے ہی اپنا سر نہیں میں ہلانا چاہا، لیکن اس کے سر کے بوجھ نے اس کا سر ہلنے نہیں دیا۔ وہ آگے کی طرف بڑھ گیا۔ تم ہی ہو موسیٰ! میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ وہ آگے آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن خالی سڑک پر مجھے لگا جیسے میری آواز مجھ سے ہی کچھ پوچھنے لگی ہے۔ جس سے میں پوچھ رہی تھی وہ بہت آگے نکل چکا تھا۔

میں نے سوچ لیا تھا موسیٰ اب ملے گا تو میں اس کو نہیں دیکھوں گی اور نہ اسے آواز دوں گی۔ اپنے آپ کو سمجھنے کیا لگا ہے؟ جس دن اس نے مجھے پہچان لیا میں بھی بتاؤں گی کہ نہ پہچان کر کیا دکھ ہوتا ہے۔ وہ کتنی بار مجھے ملا میرے قدم سے قدم ملا کر چلا۔ ہم کئی کئی قدم ایک ساتھ چلتے رہے لیکن پیچھے سے کوئی ریلا ایسا آتا جو ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیتا اور اتنی مہلت نہیں ملتی کہ میں اسے کچھ یاد دلا سکوں۔

اب میں نے اس دھوپ میں چلنا شروع کر دیا تھا، وہ دھوپ جو میرے جسم کو جلا رہی تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی کی طرف آتے ہوئے موسیٰ کی یاد اب ایک تناور درخت بن چکی تھی جس نے میرے دل میں اپنی جڑیں پھیلا دیں تھیں۔ اس کی یاد نے میرے دل کو میری ہی بربادی کے راستے پر ڈالا تھا۔ میرے ماں باپ آہستہ آہستہ میرے غم میں گھلتے جا رہے تھے اور اپنی تمام وہ خوشیاں جو انھوں نے مجھ سے وابستہ کیں تھیں، ان سے بھی دستبردار ہوتے جا رہے تھے۔ انھوں نے میرے اس غم کو ایک ایسی بیماری کی طرح میرے اندر پھیلتے ہوئے دیکھا تھا جو ناقابل علاج تھی۔ میں نے اپنی تعلیم ان کی خواہش کے مطابق ہی پوری کی تھی

لیکن اس سارے وقت میں میری زندگی کا ایک ایک دن اپنی مصروفیت کے ساتھ ساتھ کسی ایسے پنچھی کی طرح تھا جو اپنی ڈار سے نکل کر دور بہت دور اڑتا جا رہا ہو۔ اتنی دور کہ پلٹے تو واپسی کا راستہ بھی بھول جائے۔ میری ماں نے میرے لیے جو خواب دیکھے تھے اب ان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ اس کی اس تمام کوششوں کو میں نے ضائع ہوتے دیکھا تھا جو اس نے اپنی محبت اور اس کی ملائمیت سے مجھ پر صرف کیے تھے۔ میرے باپ کے مضمحل ہوتے قویٰ میری زندگی کی بے اطمینانی سے اور بھی جلدی کمزور ہو رہے تھے۔ لیکن میں بھی اپنی تمام تر مصروفیت میں خود کو پیوست کرنے کے باوجود اس بھول سے کبھی دوستی نہیں کر سکی جو مجھے میرے ان لمحوں کو بھلانے میں مدد دیتی جو موسیٰ کے خیال سے جڑے تھے۔

☆

موسیٰ کا خیال اب اس کی باتوں کے ساتھ جڑا ہوا تھا، وہ باتیں جو اس میدان میں میرے ساتھ چلتے پھرتے ہوئے کرتا تھا اور وہ زمین کھودتے ہوئے جہاں سے خزانہ نکالنا چاہتا تھا۔ اگرچہ میں اس کی شکل بھلائے دے رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے وہ تیور مجھے ہمیشہ یاد رہے، وہ تیور جو کوئی کہانی سناتے ہوئے اس کے چہرے پر پھیل جاتے تھے، اور اس کے وہ لفظ جو کسی کہانی کو سناتے ہوئے مجھے اچنبھے میں ڈالتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اس طرح شروع کرتا تھا۔ یہ کہانی تم جیسے لوگوں کی نہیں ہے۔ یہ کہانی ہماری ہے اس لیے کہ تم لوگ نرم بستروں پر سوتے ہو۔ یہ ان کے لیے ہے یعنی ہمارے لیے۔ ہمارے سروں کے نیچے تکیے نہیں ہوتے ہم اپنی اپنی قمیصیں اتار کر اکثر اپنے سر اونچے کرتے ہیں۔ وہ کہتا، یہ کہانی تمھارے لیے نہیں ہے۔ یہ کہانی ہماری ہے۔ ہمیں روٹیاں گن کر ملتی ہیں، ہم کبھی پیٹ بھر روٹی نہیں کھاتے۔ ہمیں حساب سے کھانا ملتا ہے اور تم لوگ ہمارے دروازوں کے آگے اپنا بچا ہوا کھانا پھینک دیتے ہو۔ موسیٰ کے تیوروں میں جو خود سری اور بغاوت کی بو آتی تھی وہ اس کے حالات نے اس میں پیدا کی تھی اور بغاوت جو اپنی زندگی پر قناعت نہ کرنے پر آمادہ رکھتی تھی جو اس کی جیسی زندگی گذارنے والوں میں ہوتی ہے۔

مجھے موسیٰ کی یہ خود سری اچھی لگتی تھی۔ میں نے اب جان لیا تھا کہ موسیٰ سے میری دوستی کیوں ہوئی تھی اور موسیٰ کی باتیں مجھے کیوں اچھی لگتی تھیں۔ موسیٰ، جس کے تیور سرکش گھوڑے کی طرح بگڑے رہتے تھے۔ لیکن اس دن کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا جب اس کے علاقے کے گھروں پر بلڈوزر پھیرا جا رہا تھا اور نہ وہ خود کو وہاں روک سکا تھا جب اس کو وہاں سے لے جایا جا رہا تھا۔ موسیٰ کا بات بات پر تلملانا مجھے اب سمجھ میں آ رہا تھا اور اس کی بغاوت کی وجہ لحظہ لحظہ مجھ پر کھل رہی تھی۔

موسیٰ سے میری ملاقات کئی بار ہوئی تھی۔ کبھی کسی جلسہ گاہ میں جہاں بھوک اور نفرت کے خلاف نعرے لگائے جا رہے تھے اور لوگ ایک دوسرے کو ظلم اور ناانصافی کے خلاف اکسا رہے تھے، میں نے موسیٰ کو دیکھا تھا۔ وہ گہرے دھویں میں لپٹا ہوا چیخ رہا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ ایک مخصوص آواز اس کے حلق سے نکل رہی تھی جس کے پیچھے بہت سی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ میں اس بھیڑ کو چیرتی ہوئی اس کے قریب پہنچی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھے دیکھے، ایک بڑے ٹرک نے اسے اچک لیا تھا اور موسیٰ دھویں کے مرغولے بناتے ہوئے ٹرک پر بیٹھ کر چلا گیا تھا۔ اور میرے پاؤں سست پڑ رہے تھے۔ میرے آنسو بہہ رہے تھے، اور میں سوچ رہی تھی میں کب تک موسیٰ کے پیچھے دوڑتی رہوں گی، وہ موسیٰ جو مجھے پہچانتا نہیں تھا، وہ موسیٰ جس نے جاتے جاتے مجھے یاد رکھا تھا کہ نہیں۔

☆

آہستہ آہستہ میرے ذہن میں موسیٰ کی ایک ایک ادا کا مفہوم کھل رہا تھا۔ زمانہ آہستہ آہستہ ہی گذر رہا تھا۔ ایک بار لیمپ کی روشنی میں پڑھتے ہوئے میرا ہاتھ جل گیا تھا۔ میں صبح موسیٰ سے ملی۔ میں نے اس کو اپنا جلا ہوا ہاتھ دکھایا۔ دیکھو موسیٰ میرا ہاتھ جل گیا۔ کل میں نے بہت پڑھا تھا، میں نے اس پر رعب جمانے کی کوشش کی۔ تو وہ بہت ہنسا، دیر تک ہنستا رہا۔ میں جھنجھلائی ہوئی اس کو ہنستے ہوئے دیکھ رہی تھی، میرا دل جل رہا تھا۔ میرے رعب کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا، میرے جلے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر یہ کیوں ہنس رہا ہے؟ میں روہانسی ہونے لگی۔ کیوں ہنس رہے ہو؟ بس سوچ رہا ہوں تم پڑھ لکھ کر کیا کرو گی، آخر تو تم کو چولھا جھونکنا ہے۔ تو؟ تو تمھاری ماں چولھا جھونک ہی رہی ہے۔ وہ پڑھی لکھی نہیں ہے۔ تم جھونکو گی۔ تم پڑھ لکھ کر بھی جھونکو گی۔ کیا بکواس ہے! مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ ہاں ہاں سچ، عورتوں کو اور کرنا کیا ہوتا ہے، یہی ان کی تقدیر ہے۔ یہ سب کچھ وہ اب انتہائی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ تم بکتے ہو! میرا دل جل رہا تھا۔ ہاں عورت کا مقدر یہی بنایا گیا ہے کہ وہ جتنا چولھا پھونکے اتنا ہی اچھا ہے۔ اچھے اچھے کھانے پکا پکا کر سب کو خوش کرے۔ یہی اس کا معیار ہے۔ جو عورت اچھے کھانے پکا پکا کر کھلاتی ہے وہی اپنے گھر والوں کے دل جیتتی ہے۔ میں اس کی اس بکواس سے قطعاً متفق نہیں تھی۔ گھر آ کر میں نے اماں سے پوچھا جو اس وقت باورچی خانے میں ہی تھیں۔ انھوں نے مجھے ایسے پلٹ کر دیکھا جیسے موسیٰ مجھے ان کے خلاف اکسا رہا ہے۔ ہاں، ہاں۔ اماں نے ایسے کہا جس میں ان کا سر زیادہ ہلا۔ یہ ٹھیک ہے، یہی ہمارا راج پاٹ ہے۔ یہی ہماری خوشی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ یعنی عورتیں، موسیٰ نے جس انداز میں کہا تھا وہ تو یوں تھا جیسے یہ سب عورت کو جبراً کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اماں اسے بڑے اطمینان سے زندگی سے جوڑ رہی تھیں۔

☆

میری آنکھیں اس وقت دیر تک لبریز رہیں۔ اس دن بھی میں نے اسے تیز روشنیوں میں ڈھونڈھ نکالا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں وہ ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ وہ تصویروں کی ایک نمائش تھی۔ آرٹسٹوں، مفلوک الحال مزدوروں، اور افلاس سے مارے لوگوں کے چہرے مختلف زاویوں سے بنائے گئے تھے۔ میں

ایک ایک چہرے پر ان تاثرات کو ڈھونڈھ رہی تھی جو آرٹسٹوں نے اپنی تصویروں کے عنوانات سے بتائے تھے۔ اچانک میری نگاہ اس کونے پر پڑی جہاں وہ کھڑا تھا۔ مجھے لگا ان تصویروں میں سے وہ ایک چہرہ ہے، میں ٹھٹک گئی۔ وہی تیور، جو میری یاد میں مجھے جال کی طرح الجھائے ہوئے تھے۔ میں تیز چلتی ہوئی وہاں پہنچنا چاہتی تھی۔ ایک فوٹوگرافر مجھے آگے بڑھنے سے روکتے ہوئے میری تصویر اتارتا ہے۔ میں کیمرے کی روشنی میں آنکھیں جھپکا کر اس کونے کی طرف دیکھتی ہوں جہاں اس سے پہلے میرے پاؤں رواں تھے، لیکن وہ کونا خالی ہوتا ہے۔ میں چندرا چندرا کر سارے ہال میں گھومتی ہوں، اس چہرے کو دوبارہ تلاش کرنے کے لئے، سارے ہال میں لوگوں سے الجھتی ہوئی ادھر ادھر بھٹکتی ہوں۔ لیکن بے سود ہوتا ہے۔ اچانک میری نظر سامنے ایک دیوار پر ایک تصویر کے چہرے پر پڑتی ہے۔ میں گم سم ہو جاتی ہوں۔ کچھ دھندلے نقوش میرے ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں۔ بے ساختہ یادوں کا ریلا مجھے پیچھے لے جاتا ہے۔ کون ہے یہ؟ میں پہلے اپنے آپ سے سوال کرتی ہوں۔ کس کا چہرہ ہے؟ پیچھے بھاگتے ہوئے خیالوں کے ساتھ رلتی ہوئی میں بہت پیچھے چلی جاتی ہوں جہاں موسیٰ کے نقوش مجھے ایسے نظر آ رہے ہیں جیسے کوئی رتوندی میں کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایک دھواں میرے سامنے آجاتا ہے۔ میں آرٹسٹ کو ڈھونڈتی ہوں اور پوچھتی ہوں۔ کس کی تصویر ہے، کون ہے یہ؟ میں اس پوٹریٹ اور میرے درمیان جو دھواں آ گیا تھا اس میں داخل ہو رہی تھی۔ یہ ایک راہ گیر کی تصویر ہے۔ میں سڑک پر بیٹھا کسی پورٹریٹ کی تلاش میں تھا کہ اچانک یہ مجھے نظر آیا۔ میں سوال کر رہی ہوں۔ کوئی نام؟ نہیں ہمیں نام سے کیا غرض؟ اس تصویر کی قیمت میں بیتاب ہو کر پوچھ رہی ہوں۔ یہ سولڈ ہے۔ میں بیٹھے ہوئے دل سے باہر نکل آتی ہوں۔

☆

موسیٰ اور میرے درمیان یہ آنکھ مچولی موسیٰ کے دھیان کو اور تر و تازہ رکھے ہوئے تھی۔ درمیان میں کوئی ایسی کڑی نہیں تھی جو وقت سے نکل جاتی اور موسیٰ کی یاد مجھ سے دور ہو جاتی۔ وہ اپنی یاد میں میرے چاروں طرف منڈلاتا رہتا تھا۔ میں کبھی کبھی سوچتی، موسیٰ کیسا ہو گیا ہو گا، وہ کیسا نظر آتا ہو گا؟ لیکن وہ ہیولا جو موسیٰ کے نقش کے ساتھ پہلے دن سے میرے ذہن میں بن گیا تھا، وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ بگڑے ہوئے سرکش تیوروں کے بیچ، اس کی چمکتی ہوئی نوکیلی ناک، بڑی بڑی، دودھیا آنکھیں، اور تمسخر اڑاتے ایک طرف کو مڑے ہوئے اس کے ہونٹ۔

میں کبھی کبھی یہ بھی سوچتی تھی کہ موسیٰ اگر ایسے اسکول میں پڑھتا جیسا کہ میرا اسکول تھا تو آج وہ بڑا آدمی بنتا۔ اس کی تصویریں، ہو سکتا ہے اخباروں میں چھپتیں۔ اور کچھ نہیں تو وہ کامیاب انسان ضرور ہوتا۔ لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا ہو گا۔ موسیٰ کسی نچلے درجے کی محنت پر جوت دیا گیا ہو گا اور کہیں واہی تباہی زندگی گذار رہا ہو گا، نچلے درجے کے انسانوں کی طرح۔ لیکن یہ سچ نہیں ہے کہ وہ مجھے بھول گیا ہو گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ میں آج تک زندگی کے کسی بھی دور میں اس کو بھلا نہیں سکی۔ لیکن پھر وہ مجھے پہچان کیوں نہیں رہا ہے؟ وہ بھی مجھے ڈھونڈتا کیوں نہیں ہے جس طرح میں اس کی تلاش میں ہوں؟ اس کہانی کو شروع کرنے سے پہلے بھی میں نے موسیٰ کو کتنی بار اپنی آنکھوں کی گرفت میں لیا، میں اس کی طرف لپکی لیکن ہر بار ناکام رہی۔ جوں جوں وقت گذرتا جا رہا تھا موسیٰ کی تلاش میری زندگی کی مہم بنتی جا رہی تھی۔

☆

اور اب میری انگلیاں خزانے والی زمین کو تیزی سے کھودنے لگیں تھیں، وہ خزانہ جو موسیٰ اپنی چھوٹی انگلی سے کھود رہا تھا۔ روز بھر بھری مٹی کا ایک ڈھیر میرے پاؤں پہ جمع ہو جاتا، روز ہوائیں اس میدان میں چلتیں اور دوبارہ پاٹ دیتیں اس گڑھے کو جو میں موسیٰ کو یاد کرتے ہوئے کھود رہی تھی۔ صبح اور شام کے اترنے اور چڑھنے کے بیچ، وقت کے بہتے ہوئے سمندر میں، میں آگے بڑھ رہی تھی، ایک ہی خیال کے ساتھ، آگے اور آگے، یہاں تک کہ میں اپنے آپ سے بچھڑنے لگی تھی، میں اپنے نام کو بھولتے ہوئے صرف ایک نام کے تسلسل کے ساتھ، صرف ایک دکھ کے بہاؤ کے ساتھ، جو موسیٰ کی یاد سے لپٹا ہوا تھا۔ ان گنت لمحوں کی بازگشت جن میں ایک نام کی گونج، اور اس کے بیچ میری زندگی قطرہ قطرہ دن اور رات کے درمیان مجھے بے حال کرتی ہوئی، میں ایک قید میں خود داخل ہوئی تھی۔ میں نے اپنے چاروں طرف دیواریں کھڑی کیں تھیں اور ان سے نکلنا اب میرے بس میں نہیں تھا۔ باہر کی دنیا میں بندھی ٹکی زندگی کی چہل پہل اب میرے لئے نہیں تھی۔ جو تھی تو وہ صرف روزمرہ کے معمولات کے ساتھ زندہ رہنا۔ لیکن اس کا خمیازہ میرے ماں باپ اٹھا رہے تھے۔

ان کی ڈھلتی ہوئی عمریں میری حالت کو دیکھ رہی تھیں، وہ سہ نہیں پا رہے تھے میری اس چپتا کو جو مجھ پر گذر رہی تھی۔ ان کے لئے یہ ایسا ہی تھا جیسے میں کسی مہلک بیماری کا شکار ہوں اور میرا علاج ناممکن ہو چکا ہے۔ وہ کڑھ رہے تھے اور جی رہے تھے۔ میں ان کی حالت دیکھ رہی تھی لیکن خود میری حالت میرے بس میں نہیں تھی۔ گھر کی خاموشی اور سناٹے میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اماں کے تمام خواب جو انھوں نے میرے لئے دیکھے تھے اب ان کی آنکھوں میں ہی جھول رہے تھے۔

☆

وہ تمام فاصلے جو میرے اور موسیٰ کے بیچ پھیل گئے تھے، ان کی کتھا لکھتے ہوئے میں سوچ رہی ہوں، کیا موسیٰ یہ کتھا پڑھ پائے گا؟ کبھی اچانک اس کے ہاتھ میری یہ کہانی لگ جائے اور وہ سب یاد کر لے، سب جو وہ پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس طویل مدت میں وہ، وہ سب بھلا بیٹھا ہو۔ مجھے بھی۔ لیکن وہ گڑھا وہ کیسے بھول سکتا ہے جس سے اس کے خواب جڑے ہوئے تھے، جسے کھود کر وہ خزانہ

نکالنے کی مہم پر مجھے جتا گیا تھا؟ میں آج بھی وہ خزانہ کھو رہی ہوں۔ مجھے لگتا تھا میری انگلیاں ایک ایک کر کے ضائع ہو رہی ہیں اور میں جلد ہی ایک معذور زندگی گذارنے کے راستے پر چل نکلوں گی۔ اب میرے چاروں طرف تنہائی کی پراسراریت پھیل رہی تھی، ایک انجانی بساندھ جو میرے جسم کو کس رہی تھی اور ہر وقت میری ناک کے راستے کچھ اس طرح میرے پیٹ میں داخل ہوتی رہتی جیسے قیمتی اور پسندیدہ کپڑوں کو محفوظ رکھنے کے لئے کوئی ایسی دوا ڈالی جاتی ہے جو ان سے ہمیشہ کے لئے چپک جاتی ہے۔

اس تنہائی کے بیچ میں اب یہ سوچ سوچ کر بھی کڑھتی تھی کہ اس کا ذمہ دار موسیٰ ہے، جو اپنا پتہ بتائے بغیر چلا گیا تھا، جو پھر مجھ سے ملنے بھی نہیں آیا، جس نے اپنی یاد کی ذمہ داری بھی مجھے سونپ دی، جس نے مجھے تنہائی کی دلدل میں لا پھینکا تھا۔ وقت کی بے مہری میرے ساتھ جو چال چل گئی تھی میں اس میں اب اس طرح پھنس گئی تھی کہ خود کو نکالنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک بھنور تھا میں جس میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھی لیکن اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

☆

وہ اداسی جو بچپن میں موسیٰ کے کھو جانے سے ملی تھی، اس نے مجھے دوسری لڑکیوں جیسا نہیں چھوڑا تھا۔ دوسری لڑکیوں کو جب میں شور مچاتے ناچتے گاتے دیکھتی، انھیں ان خوابوں میں دیکھتی جو ان کو زندگی کی خوبصورت شاہراہوں پر لے جانے والے تھے، ایسے سمے میں کسی کونے میں ان سے علیحدہ ہو کر موسیٰ کے خیال کے پیچھے بھاگنے لگتی۔ ایسے ہی کسی شور میں مجھے موسیٰ کی ٹھہری ٹھہری باتیں یاد آنے لگتیں جب ایک دن ایسی ہی شور مچاتی سڑک پر ہم دونوں نکل گئے تھے۔ میں نے موسیٰ سے پوچھا تھا، یہ سڑک کہاں ختم ہوتی ہے؟ موسیٰ نے کہا تھا مجھے نہیں معلوم، مجھے صرف اتنا معلوم ہے یہ سڑک واپس اسی جھونپڑی میں ختم ہوگی جہاں میری ماں اداس بیٹھی ہوگی اور اس کے ارد گرد میرے بہن بھائی بیٹھے ہوں گے۔ کیوں، اداس کیوں؟ میں نے سوال اس طرح کیا تھا جیسے میں اداسی کا مطلب بھی پوچھنا چاہتی ہوں، کیونکہ جب مجھے نہیں پتہ تھا اداسی کیسی ہوتی ہے۔ اس وقت اس نے اپنی دودھیا آنکھوں سے مجھے جل کر دیکھا تھا۔ بس شام ہوتے ہی مجھے وہ سب اداس نظر آنے لگتے ہیں۔ ٹمٹماتی ہوئی لالٹین کی روشنی کے بیچ ان کے چہرے مجھے تکلیف پہنچاتے ہیں۔ ان کی آنکھیں جہاں کوئی خواب نہیں ہے۔ اس نے سر جھکا کر کہا تھا۔ میری سمجھ میں اس وقت موسیٰ کی یہ بات نہیں آئی تھی۔ پھر بھی میں نے اس سے پوچھ لیا تھا۔ تم خواب دیکھتے ہو؟ ہاں وہ گڑھا جو میں کھود رہا ہوں وہ ایک خواب ہی تو ہے۔ میری سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا تھا۔ مگر میں خواب نہیں دیکھتی، مزے سے سوتی ہوں، بس صبح آنکھ کھلتی ہے۔ اس وقت موسیٰ اپنی آنکھوں میں چنگاریاں بھر کر بولا تھا۔ ہاں، خواب دیکھنے کی زحمت تم کو کیوں کرنی پڑے گی جب وہ خود طشتری میں تمھارے سامنے لا کر سجا دیئے جائیں گے۔ میں احمقوں کی طرح منہ کھولے اس کی بات سنتی رہی تھی۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ وہ ہر وقت کھیلتے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے، درشتگی اور سنجیدگی سے اپنی نگاہیں ایسی گھماتا تھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ یہ باتیں جو مجھے ایک ایک کر کے یاد آتی ہیں اگرچہ میرے لئے ان کا بیان بہت مشکل ہے کیوں کہ اتنے واقعات کی بھیڑ میں سے اس کی باتیں اور اس کی یاد کو الگ کرنا میرے اختیار سے باہر ہے۔ وہ سب آپس میں اس طرح گھل مل گیا جیسے میں کوئی پانی کا قطرہ ہوں جو موسیٰ کی یاد کے سمندر میں گر گیا ہو۔

☆

میں گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہی تھی اور تنہائی کا دائرہ ایک شکنجے کی طرح مجھے دبوچ رہا تھا۔ میں یہ بھی جان گئی تھی کہ موسیٰ کی یاد ایک داہے کی شکل اختیار کر چکی ہے، جو میری زندگی کو بھی داہے میں بدل رہی ہے۔

☆

میرے ماں باپ اب ملتجی نگاہوں سے مجھے دیکھتے۔ شاید میں ان کے غموں کو جان کر ہی اس حالت سے باہر نکل جاؤں۔ لیکن یہ دکھ انتہائی خود غرضی سے مجھے بھی خود غرض بنا رہا تھا۔

اس دن میری پڑھائی ختم ہونے کا آخری دن تھا۔ میں امتحان دے کر گھر آ کر بیٹھی تھی۔ اماں میرے نزدیک بیٹھی ہوئی تھیں۔ بیٹا تم نے اب کیا سوچا ہے؟ اب تم کیا کرو گی؟ میں جانتی تھی اماں مجھ سے کیا چاہتی ہیں، اور میں یہ بھی جانتی تھی میرے دکھ کا کوئی انجام نہیں ہے، وہ اب سفر کرتا رہے گا۔ وہ بے چین نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں اور میں ان کی بے چین نظروں کا جواب اپنی نظروں سے دے رہی تھی۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں اپنے دکھ کو لفظ دے دوں۔ لیکن مجھے معلوم تھا میرے لفظ ماں کے دکھ کو اور بڑھا دیں گے۔ میں خاموشی سے ان کی شکل دیکھ رہی تھی، اماں جواب نڈھال ہو رہی تھیں۔ میری خاموشی ان کی بے بسی میں اضافہ کر رہی تھی۔ میں جانتی تھی ماں باپ کی تمام خوشیوں کو میں نے اپنی یاد کی چھلنی میں چھان دیا تھا۔ اماں پوچھ رہی تھیں، تمھیں آگے جانے کے لئے کوئی سمت تو اختیار کرنی ہے، اکیلے کب تک رہو گی۔ اماں اب التجا کر رہی تھیں اور میرا دل کٹ کٹ کر گر رہا تھا۔ آپ کیا چاہتی ہیں؟ میں نے بے اختیار ہو کر ان سے پوچھا۔ شادی کر لو۔ میں اماں کے چہرے پر پھیلی ہوئی آس پر پسیج رہی تھی۔ کس سے؟ بس تم ایک بار ہاں کر دو۔ کب تک یہ زندگی گذارو گی؟ جس راستے پر تم چل رہی ہو اس کا کوئی انت نہیں ہے۔ اور میں اپنے دل سے پوچھ رہی تھی، کیا ایسا ہی ہے، کیا یہ پراسرار دھند کبھی چھٹے گی جس میں، میں پھنسی ہوئی ہوں؟ اب تو یہ دکھ مجھے اپنا عادی بنا چکا تھا، اس کے بغیر بھی رہنا مشکل تھا۔ میں اماں کو کیسے سمجھاتی۔ اب اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن میں اماں کو کوئی جواب نہیں دے سکی۔ ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی آس نے مجھے صرف خاموشی سے ان کا چہرہ تکنے پر مجبور کر دیا۔ میری خاموشی نے اماں کا

حوصلہ بڑھا دیا تھا۔ میں دیکھ رہی تھی اماں کے چہرے کی پژمردگی آہستہ آہستہ ایک بے چین کر دینے والی خوشی میں بدل رہی تھی۔

☆

میری ماں اور باپ اپنے فیصلے پر میرا سر جھکا ہوا دیکھ کر خوش تھے۔ ان کی خوشی ایسی ہی تھی جیسے کوئی مریض آپریشن تھیٹر میں موت اور زندگی سے لڑ رہا ہو اور اس کے زندہ رہنے کے آثار ختم ہو جائیں اور پھر اچانک پتہ چلے کہ مریض بچ گیا۔ یہی حالت میرے ماں باپ کی تھی۔ اور میں صرف سوچ رہی تھی کہ میں کہاں ہوں، جس یاد کی دلدل میں گردن تک پھنس گئی ہوں کیا یہ مجھے کوئی اور زندگی گذارنے دے گی، وہ جو موسیٰ کی یاد سے خالی ہو؟ یوں لگتا تھا جیسے کہ اب آنے والا وقت ہی مجھے اپنے بہاؤ میں لے کر چلے گا۔ مجھ میں سوچنے کی سکت ختم ہو رہی تھی ایک ان ہونی مجھے اپنی زد میں لے رہی تھی۔ حالات کے اس شور شرابے میں میرا صرف ایک ہی کام تھا۔ چپکے سے کسی بھی وقت سناٹے کی طرف نکل جاتی جہاں وہ گڑھا میرا منتظر ہوتا اور میں اس گڑھے کو کھودنا شروع کر دیتی۔ اور اپنی انگلیاں دیکھتی جو اب اس گڑھے کی نذر ہو چکی تھیں۔

☆

میری ماں اپنی مصروفیت میں سرشار تھی۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ اماں نے تمام رشتے داروں کو بلا چھوڑا تھا۔ ڈھول رات بھر بجایا جاتا تھا۔ لڑکیاں جھوم جھوم کر دلہن کا بابل کے گھر سے چلے جانے کا گیت گاتی تھیں۔ اس وقت میرا دل ہر بول پر اس رسی پر چلنے لگتا تھا جو دونوں طرف نہ جانے کہاں سے بندھی تھی۔ اس کے کنارے مجھے نظر نہیں آتے تھے۔ اور نیچے بہت گہری کھائیاں جن میں گرنے کے خوف سے میرا دل تھوڑی دیر کو خاموش ہو جاتا تھا۔ لڑکیوں کا ہے بگاہے میرے چاروں طرف آ جاتیں اور مجھے اس نام سے چھیڑتیں جو آئندہ زندگی میں میرے نام کے ساتھ جڑنے جا رہا تھا۔ میری آنکھیں ان کی چھیڑ چھاڑ پر مسکرا دیتیں لیکن میرا آئینہ ان مسکراتی آنکھوں سے آنسو پونچھتا رہتا۔ دن بھر کے شور اور غوغا میں اور رات میں ڈھولک کی تھاپ میں، میں صرف اسی کوشش میں رہتی کہ اپنی یادوں کے جال کو کاٹتی چلی جاؤں اور جال میں الجھے اپنے جسم کو ان سے باہر لا سکوں۔ میری اس حالت سے کوئی واقف نہیں تھا۔ صرف اماں کبھی کبھی میرے پاس سے گذرتے ہوئے ٹھٹک کر کھڑی ہو جاتی تھیں، لیکن پھر خود کو ہی تسلی دیتی ہوئی آگے بڑھ جاتی تھیں۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ لوگ گا بجا کر تھکے ہارے سو رہے تھے۔ میرے ماں باپ کے کمرے کی بتی ابھی تک جل رہی تھی۔ میں خاموشی سے دبے قدموں باہر آئی۔ صحن میں کنارے کنارے لگے میری ماں کے لگائے ہوئے موتیا کے پھول ابھی تازہ تازہ کھلے تھے اور خوشبو پھیلا رہے تھے۔ لڑکیاں بیچ صحن کی دری پر ایک دوسرے پر سر رکھے گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ میرے قدم آہستہ آہستہ اس دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے جو باہر جاتا تھا۔ باہر اندھیرا تھا۔ سناٹا تھا۔ اور ہوائیں تیز تھیں۔ میں اس کونے کی طرف جا رہی تھی، اس گڑھے کو کھودنے کے لئے، جسے کھودتے کھودتے میری انگلیاں زخمی ہو چکی تھیں۔ میں گڑھے کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ گڑھا ابھی اتنا ہی کھدا ہوا تھا جتنا موسیٰ چھوڑ گیا تھا۔ میں دیر تک وہاں بیٹھی رہی اور اس گڑھے سے آخری بار اپنے تعلق کو جوڑنے کی کوشش کرتی رہی۔ میرے آنسو بہہ رہے تھے اور اوس میں بھیگی نم مٹی کو اور نم کر رہے تھے۔ میرے چاروں طرف پراسرار ہوائیں اس طرح میرے جسم کو چھو رہی تھیں گویا مجھے دلاسا دے رہی ہوں۔ میں دیر تک سر نہوڑائے بیٹھی رہی، اس خاموشی اور سناٹے کے درمیان، جہاں صرف میں تھی، جہاں موسیٰ بھی نہیں تھا۔

☆

صبح پھر ایک نیا ہنگامہ تھا۔ بارات کو خوش آمدید کہنے کی تیاریوں میں میرے ماں باپ لگے ہوئے تھے اور میں بھی خود کو دلہن بننے پر آمادہ کر رہی تھی۔ تمام کارروائیاں شادی میں ہونے والے جھمیلوں کی طرح ہی ہو رہی تھیں۔ بارات بھی آئی، اسی تام جھام سے جیسے تمام باراتیں آتی ہیں۔ مجھے بھی سجایا گیا تھا، جس طرح کسی بھی دلہن کو سجایا جاتا ہے۔ اسی اہتمام کے ساتھ تمام رسومات ہونا شروع ہو گئیں تھیں جن میں اس بات کا خیال ہر لمحے رکھا جاتا ہے کہ ہر شوق پورا کیا جائے۔ میرے ماں باپ بھی اپنی مرادوں کو عملی جامہ پہنا رہے تھے۔ اس میں شاید آرسی مصحف بھی شامل تھا۔ ایک شور میرے چاروں طرف بھنبھناہٹ کی شکل میں تھا۔ اور میں سکتے کے عالم میں تمام رسوم سے گذر رہی تھی۔ وہاں ایک آئینہ تھا۔ آئینے میں میرا چہرہ دیکھنے والی آنکھیں۔ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے ان گھورتی ہوئی آنکھوں میں اپنی آنکھیں گڑو دیں۔ بھنبھناتا ہوا شور اب بڑھنے لگا تھا جیسے میرے چاروں طرف شہد کی مکھیاں دائرے میں گھوم رہی ہوں۔ شور میں تیزی بڑھ رہی تھی اس کے ساتھ ہی وہ میدان تھا اور اس کی ہوائیں اس شور میں شامل ہو رہی تھیں۔ میں نے اس چیخ کو روکنے کی کوشش کی جو میرے دل سے اٹھنا چاہتی تھی۔ موسیٰ، تم موسیٰ ہو۔ میرے ہونٹ ہلے تھے وہ آواز سنائی دی گئی تھی۔ وہ آواز خود میں نے سنی تھی۔ اپنی آواز، جو خود میں نے بھی سنی تھی جو میرے دل کو چیرتی ہوئی باہر آئی تھی۔ چہرہ آئینے سے غائب ہو گیا تھا۔ آرسی مصحف کی رسم ختم ہو گئی تھی۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ یکلخت جامد ہو گئی تھی۔ میری ماں میرے برابر میں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس اندھیرے سے باہر جو آرسی مصحف کے چھتر میں تھا۔ کچھ بھی نہیں ہوا، سوائے ایک خاموشی کے جو سب کے ہونٹوں پر چپک گئی تھی۔ لڑکیوں کے قہقہے، بارات میں آئے ہوئے لوگوں کی مسکراہٹیں سب خاموشی سے چپک کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ پھر بھی رخصت کا وقت آ گیا تھا۔ اور میرے قدم اس گھر سے دور جا رہے تھے جہاں وہ گڑھا میرا منتظر ہوتا تھا کہ میں اسے کھودوں اور اس خزانہ کو نکالنے کی مہم جاری رکھوں جو موسیٰ جاتے ہوئے نامکمل چھوڑ گیا تھا ☆☆☆

عادل منصوری کی نظمیں : چند پہلو

فضیل جعفری

جدیدیت کی طرح جدید اردو ادب کی تاریخ بھی خاصی پرانی ہو چکی ہے۔ اسے ایک خوشگوار ادبی اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۰ والی دہائی کے آخر میں اور ترقی پسندی کے دور شباب میں جدیدیت کا جو رجحان ابھر کر سامنے آیا اس کے خد و خال اور سر و کار آج بھی اتنے ہی واضح، موثر اور تر و تازہ ہیں جتنے اس وقت تھے۔ جدید لکھنے والے ایک طرف اگر اس کٹر اور تنگ نظر ادبی ماحول کے لئے ایک بڑا چیلنج بن گئے جس کا تعلق مارکسزم سے نہیں اسٹالنزم سے تھا تو دوسری طرف انھوں نے راشد، منٹو، میرا جی، بیدی اور اختر الایمان وغیرہ کو از سر نو دریافت اور مستحکم کیا۔

یہاں ہم ضمنی طور پر یہ بھی لکھتے چلیں کہ جدید نقادوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں نے اپنے بڑے سے بڑے پیش رو کی بھی تقلید نہیں کی۔ انھوں نے اپنے انفرادی موضوعات کو خود شناخت کیا، اپنے لئے نئے اسالیب ایجاد کئے، اور نئی لفظیات کی مدد سے روایتی لسانی سانچوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسٹالینی ترقی پسندی کی واپسی کا امکان ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ ہمیں اس بات کی بھی خوشی ہے کہ آگے چل کر مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری اور جاں نثار اختر جیسے اہم ترقی پسند شاعر بھی اپنے ذہن میں رویوں میں تبدیلی کرنے اور جدیدیت سے ہم آہنگ ہونے پر مجبور ہو گئے۔ کہنے کو تو آج بھی کچھ لوگ اپنے نام کے ساتھ ''ترقی پسند'' کا لیبل چسپاں کرتے ہیں ان کی اصل حیثیت ادبی چٹکلوں اور تابوت برداروں سے زیادہ نہیں ہے۔ تا حال جدیدیت ہی اردو کا غالب محاورہ بنی ہوئی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے خصوصاً اور دیگر کئی جدید نقادوں نے عموماً غالی ترقی پسندی کے جس طرح پرخچے اڑائے وہ جگ ظاہر ہے۔ عادل منصوری غالباً ایسے واحد جدید شاعر ہیں جنھوں نے اس موضوع پر بڑی عمدہ اور بھرپور نظم لکھی ہے۔

کھوکھلے لفظوں کی دیوار بنانے والو
کب کا وہ ٹوٹ چکا سرخ خطیبانہ طلسم
اور تم صبح کے رستے میں پڑے سوتے ہو
فکر کے بالوں پہ بے عقل سفیدی چھائی
منتشر کر گئیں گمنام ہوائیں تنکے
شیروانی سے ہوئے اور بھی موزوں قامت
پہلے اک چوکھٹا بنوا لو نئے دانتوں کا
تاکہ تم آئینہ دیکھو تو ذرا ہنس تو سکو

عادل کا شمار اس دور کے ان درجنوں بالکل نئے شاعروں میں ہوتا ہے جو ۱۹۶۸ میں ''نئے نام'' (مرتبہ شمس الرحمٰن فاروقی اور حامد حسین حامد) نامی انتخاب کی اشاعت کے ساتھ سامنے آئے تھے۔ فاروقی نے ان کے مجموعے ''حشر کی صبح درخشاں ہو...'' کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ عادل منصوری ہمارے عہد کے ''سب سے زیادہ تازہ کار اور سب سے زیادہ مہم جو اور باہمت شاعر'' ہیں۔ جو بات فاروقی نے نہیں کہی مگر جو بین السطور کے پردے کے پیچھے سے جھانک رہی ہے وہ یہ ہے کہ کئی دوسرے اہم جدید شاعروں کے یہاں سے مہم جوئی اور تازہ کاری جیسے عناصر رخت سفر باندھ چکے ہیں۔ ابتدا تو سبھی شاعروں نے بڑی ہمت سے کی تھی، پھر آخر یہ لوگ اتنی جلد کیوں تھک گئے؟ سیدھا سا جواب یہ ہے کہ ہمارے بیشتر نمائندہ شاعروں نے حالات سے گھبرا کر اور اعزاز و انعام کے چکر میں پڑ کر اپنی شاعری کو سماجی مصروفیتوں میں بدل دیا۔ سستی قسم کی شہرت اور بہت ہی معمولی مادی مفادات ان کی تخلیقی قوت کو موقع ملتے ہی کسی نہ کسی حد تک ہڑپ کر گئے۔ ہم یہاں خوف فساد خلق کی وجہ سے کسی کا نام نہیں لے رہے ہیں۔ آپ خود ان ناموں کو یاد کر لیجیے۔ آپ کو پتہ چلے گا کہ ہمارے اہم شاعروں کے یوں تو اب تک کئی کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مگر ان کے پہلے مجموعے کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی تھی وہ دوسرے تیسرے یا چوتھے کے حصے میں نہیں آئی۔

عال منصوری چونکہ ان جھمیلوں میں نہیں پڑے اس لئے وہ تخلیقی تھکن کا شکار ہو جانے کے بجائے برابر اور خاموشی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ بالکل یہی بات قاضی سلیم اور شفیق فاطمہ شعریٰ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ عمیق حنفی نے زیادہ عمر نہیں پائی لیکن وہ بھی جب تک جئے شاعرانہ بانکپن اور بے نیازی کے ساتھ زندہ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب اور دنیاداری کبھی بھی ہم سفر نہیں ہو سکتے۔ دنیادار شاعر ہو یا افسانہ نگار وہ بہت جلد اپنے آپ کو دہرانے لگتا ہے۔

عادل کے یہاں شروع سے آخر تک جو تازگی اور ندرت ملتی ہے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ خود اپنے ہی موضوعات کے جنگل میں پھنس کر رہ جانے کے بجائے ان سے آزادی حاصل کرنے کی سعی پیہم میں مصروف نظر آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان کی شعری رینج یعنی ان کے موضوعات کا دامن بہت

وسیع ہے۔ عادل کی نظموں کو باقاعدہ خانوں میں تقسیم کرنا ہی ناممکن ہے۔ تنقیدی سہولت کی خاطر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری پر مذہب سیاست، شہر، سماج، ثقافت، تاریخ، اسطور، خارجی واقعات، شخصی دکھ درد سبھی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس طرح ان کی شاعری میں بڑی لچک پیدا ہو گئی ہے۔

عادل منصوری کے سلسلے میں ہمیں فاروقی کے اس خیال سے بھی مکمل اتفاق ہے کہ وہ اردو کے واحد سرریلسٹ (Surrealist) شاعر ہیں۔ ہمیں اگر ان کی شاعری میں داداازم (Dadaism) کی بھی جھلکیاں نظر آتی ہیں تو شاید اس کا سبب یہ ہے کہ دونوں کے طریق کار میں بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جدید شاعروں نے سمبلوم اور امیجزم سے جو استفادہ کیا اور جس انداز میں نئے اسالیب کو متعارف کرایا وہ ہر اعتبار سے قابل قدر ہے۔ عادل کی مادری زبان گجراتی ہے۔ ان کا شمار گجراتی کے نمائندہ جدید شاعروں میں ہوتا ہے۔ چونکہ گجراتی میں سرریلسٹ شاعری پہلے سے ہو رہی تھی اس لئے عادل کے لئے سرریلسٹ تکنیک سے فائدہ اٹھانا نسبتاً آسان تھا۔ انھیں آندرے برتین اور اس کے ساتھیوں تک جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ آگے چل کر یہی ان کی انفرادی شناخت بن گئی۔

سرریلسٹ تکنیک کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ مختلف امیجز کو ایک دوسرے میں پیوست کر کے ان کے درمیان ایک ایسا رشتہ پیدا کر دیتے ہیں جو بظاہر غیر منطقی نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی کم و بیش سبھی نظموں میں منطقی تسلسل سے احتراز کیا ہے کیوں کہ منطق بطور اصول خیال اور تخیل کو محدود کر دیتی ہے۔ ان کے یہاں لامحدود انسانی دماغ کے اندر جھانک کر دیکھنے اور روحانی آزادی سے لطف اندوز ہونے کا عمل ملتا ہے۔ عادل کی نظموں میں ایک علامت دوسری علامت سے، ایک امیج دوسرے امیج سے اور ایک استعارہ دوسرے استعارے سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ انھوں نے غیر شعوری طور پر یہ دکھایا ہے کہ انسانی دماغ اور دنیا بظاہر دو اکائیاں ہونے کے بجائے جو ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ حساس اور تخلیقی ذہن انھیں الگ الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا۔

یہ خصوصیات عادل کی سبھی نظموں، حتیٰ کہ ان نظموں میں بھی ملتی ہے، جن پر مذہب کی چھاپ ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ انھوں نے مذہب کے سلسلے میں ایلیٹ کے نظریئے کی پیروی نہیں کی۔ ایلیٹ نے عہد حاضر کے تمام مسائل کا حل چرچ میں ڈھونڈا ہے۔ عادل نے "حشر کی صبح درخشاں ہو مقام محمود"، "قلم اٹھا لئے گئے"، "الف سیریز" کی نظمیں اور "تبوک آواز دے رہا ہے" وغیرہ میں تلمیحوں، استعاروں اور علامتوں کی مدد سے اسلامی تاریخ کی اعلیٰ ترین شخصیت کے علاوہ بعض بے حد اہم شخصیتوں اور واقعات کا ذکر کر کے موجودہ معاشرتی ماحول کی تشریح کی ہے۔ اردو میں ایسی نظمیں پہلے نہیں لکھی گئی تھیں۔ ان نظموں میں بلند ترین انسانی اقدار اور اخلاقیات کو اتنے تخلیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ تاریخ زندہ اور موجود لمحے کے طور پر پوری روحانی قوت کے ساتھ اجاگر ہو جاتی ہے۔ ان کا ایقان ہے کہ ان اقدار سے عدم واقفیت آج کے انسان کے حق میں عذاب بن گئی ہے۔ یہ وہ عظیم انسانی اور تاریخی روایات ہیں جن کا سوتا خشک نہیں ہوا ہے۔ البتہ موجودہ دور میں اس سے سیراب ہونے کے حوصلے کا فقدان ضرور ہے۔

"حشر کی صبح درخشاں ہو مقام محمود" میں عادل نے حضرت محمدؐ، خلفائے راشدین اور کئی اہم صحابہ کرام کی جلیل القدر اور مثالی شخصیتوں کے ساتھ ساتھ بہت سے یادگار تاریخی واقعات کو بڑی خوبی اور نفاست سے سمیٹ لیا ہے۔ واقعات کی ترتیب وار اور تفصیلی پیش کش ان کی عادت نہیں ہے :

فتح مکہ سے مگر لوگ ہدایت پائیں
خون جم جائے جو نعلین میں چلتے چلتے
عرش کی آنکھ سے رحمت کا سمندر ابلے

مسجد نبوی میں انبار غنیمت روشن
لوگ روتے ہوئے نکلے ہیں پریشاں منظر
روشنی پہنچی ابوجہل کی دیواروں تک

علم کے باب علی عمر میں سب سے چھوٹے
چاند کا نام ترے چاک گریبانوں میں

جان دی جا دواں لمحات تلاوت مشغول
خون کے دھبے ہیں قرآن پہ تابندہ نظر

نور مجسم ہوا گنبد خضرا مرکوز
حشر کی صبح درخشاں ہوں مقام محمود
ہاتھ روشن رہے کوثر سے قرابت منظر

اسی طرح جنگ تبوک میں شریک ہونے والے صحابہ سے متعلق نظم کا اختتام بھی ان دعائیہ مصرعوں پر ہوا ہے :

تمہارے اونٹوں کی گردنوں سے
تمام دنیا میں نور پھیلے
تمہارے گھوڑوں کی ہنہناہٹ
تمہاری منزل کی راہ کھولے

تبوک کو اسلامی تاریخ میں اس لئے بھی اہمیت حاصل ہے کہ یہ وہ آخری غزوہ تھا جس میں حضور اکرمؐ خود شریک ہوئے تھے۔ فتح کے بعد بھی بارہ نقاب پوش منافقین نے آپ پر قاتلانہ حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اگر چہ وہ منافق بعد میں خوف زدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ مگر نبی کریم نے انھیں پہچان لیا تھا اور ان سب کے نام حضرت حذیفہ بن یمان کو بتا دیئے تھے۔ اسی لئے انھیں 'محرم اسرار نبوت' بھی کہا جاتا ہے۔

عادل منصوری کی ایسی نظموں میں جو روحانی کیفیت اور مابعد الطبیعیاتی جلا ملتی ہے وہ ان کا ذاتی سرمایہ ہے۔ ایسی نظموں میں عادل نے کہیں بھی خود کو مذہبی

جذباتیت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اس سلسلے کو ختم کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ عادل نے متذکرہ بالا نظموں کے علاوہ ''پرش''، ''سوریہ کا رتھ''، ''اسی'' اور ''شراپ'' جیسی نظمیں بھی لکھی ہیں جن کا تعلق اسلامی تاریخ اور اخلاقیات سے نہ ہو کر ہندو دھرم اور بدھ دھرم سے ہے۔

جذباتیت کی پرچھائیں ان کی اس نظم پر بھی نہیں پڑتی جو انھوں نے والد کی موت پر لکھی ہے۔ یہ نظم ان کی زخمی روح کی نمائندگی تو کرتی ہے مگر اس میں ذاتی اور جذباتی نقصان سے زیادہ اس کرب کو اجاگر کیا گیا ہے جو کسی شخص کو اپنی آنکھوں کے سامنے قسط وار مرتے دیکھ کر حساس انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ دراصل انھوں نے خود پر شخصی غم کو حاوی کرنے کے بجائے انسانی وجود کی اس معنویت کو ابھارا جو بالآخر معنویت میں بدل جاتی ہے۔

وہ چالیس راتوں سے سویا نہ تھا
وہ خوابوں کو دانتوں میں لادے ہوئے
رات کے ریگزاروں پہ چلتا رہا
چاندنی کی چتاؤں میں جلتا رہا

میز پر
کانچ کے ایک پیالے میں رکھے ہوئے
روح کا ہاتھ چھلنی ہوا
سوئی کی نوک سے
خواہشوں کے دیے
جسم میں بجھ گئے

پوری نظم میں شاعر کے مطالعے کی صحت (Accuracy) قابل داد ہے۔ بستر مرگ پر پڑے ہوئے باپ کی ہر جسمانی اور ذہنی اذیت شاعر کے لئے ناقابل فراموش روحانی تجربے میں بدل گئی ہے۔ رات کے رہگذاروں پہ چلنے اور چاندنی کی چتاؤں میں جلنے کا صاف مطلب ہے کہ بیمار کے لئے ایک ایک پل کاٹنا مشکل ہے۔ کانچ کے پیالے میں رکھے ہوئے دانتوں کے ہنسنے سے مراد ضعیف العمری کا خندہ زن ہونا ہے۔ مسلسل لگنے والے انجکشنوں نے بیمار کے نحیف ہاتھوں کو ہی نہیں اس کی روح کو بھی چھلنی کر دیا ہے۔ آخر نتیجہ جسم میں خواہشوں کے چراغوں کے بجھ جانے یعنی موت واقع ہونے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

عادل منصوری کی نظموں کے دیگر موضوعات میں شہر اور شہری زندگی کا موضوع خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ سب جانتے ہیں کہ شہر اور شہری زندگی کا عذاب جدید شاعروں کا مشترکہ اور پسندیدہ موضوع ہے۔ اس رجحان کا تعلق کسی فیشن سے نہیں بلکہ اس حقیقت سے ہے کہ جدید دنیا بنیادی طور پر شہروں سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ جدید شاعروں نے با معنی ماضی سے اپنا رشتہ برقرار رکھتے ہوئے شہری زندگی کے عذابوں، پیچیدگیوں، اعصابی تناؤ، زندہ رہنے کے لئے کی جانے والی مسلسل بھاگ دوڑ، نیز صنعتی ترقی کے سیلاب میں تنکوں کی طرح بہہ جانے والی مہذب اور نفیس اقدار کا نہ صرف موثر اور حقیقت پسندانہ اظہار کیا ہے بلکہ ہر شاعر نے شہر کو اپنے انفرادی زاویے سے دیکھا ہے۔

عادل منصوری اردو کے اکیلے شاعر ہیں جنھیں بین الاقوامی حسیت کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ ''ایک منظر''، ''تنہائی''، ''لہو جس کا معصوم ہے اس کو رد کو''، ''دشت ابہام''، ''نقرئی رات''، ''شعور نیلی رطوبتوں سے الجھ گیا ہے''، ''وقت کی ریت پر'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن کا اطلاق جتنا ممبئی، دلی اور کلکتہ پر ہوتا ہے اتنا ہی لندن، ٹوکیو، شنگھائی اور نیویارک جیسے شہروں پر بھی ہوتا ہے۔ ایک مثال پیش خدمت ہے :

وہ آنکھوں پر پٹی باندھے پھرتی ہے
دیواروں کا چونا چاٹتی رہتی ہے
خاموشی کے صحراؤں میں اس کے گھر
مرے ہوئے سورج ہیں اس کی چھاتی پر
اس کے بدن کو چھو کر لمبے سال بنے
سال کئی صدیوں میں پورے ہوتے ہیں

(تنہائی)

اس قبیل کی سبھی نظموں کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ موجودہ عہد میں انسان کا وجود بے معنی سا ہو کر رہ گیا ہے۔ خود اس کا داخل اس کے خلاف سازش کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کبھی انسانی سائکی پر مکمل بے حسی طاری ہو جاتی ہے۔ یقین اور خود اعتمادی پر کوئی انجانا خوف غالب آ جاتا ہے۔ ہر گذرتا ہوا لمحہ حساس انسانوں کی رگوں سے خون نچوڑنے کا کام کرتا ہے۔ عام شہریوں کی حیثیت خستہ حال فرنیچر سے زیادہ نہیں رہ گئی۔ ایک اور مثال :

زوال سبزوں پہ رینگتا ہو تو
لوگ سایوں کی سیڑھیوں پر
سفید بیلوں کے سینگ میں خواب دیکھتے ہیں
لہو میں موسم کا زہر تحلیل
کس خرابے میں ڈال آئیں

(زمین سر سے بندھی ہوئی ہے)

جہاں تک ممبئی کا تعلق ہے یہ شہر بیسویں صدی کی ابتدا سے ہی شاعروں کا محبوب موضوع رہا ہے۔ بنگلہ شاعروں نے جو غیر معمولی توجہ کلکتہ پر کی ہے وہی توجہ اردو، مراٹھی اور گجراتی شاعروں نے ممبئی پر مبذول کی ہے۔ بحیثیت مجموعی مراٹھی شاعر نارائن سروے کی طویل نظم ''ماجھی ودیا پیٹھ'' (میری یونیورسٹی) کو اس موضوع پر بہترین اور کامیاب ترین نظم کہا جا سکتا ہے۔ بیحد غریب طبقے سے تعلق رکھنے والے ساہتیہ انعام یافتہ شاعر سروے نے ماجھی ودیا پیٹھ، میں ممبئی کی زندگی کے تمام پہلوؤں اور سارے دکھ درد کو جس خوبی اور فنکارانہ چابک دستی سے سمیٹ لیا ہے اس کی کوئی اور مثال کسی اور ہندوستانی زبان میں نہیں ملتی۔ کم و بیش سبھی زبانوں میں اس نظم کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو ترجمہ رفیعہ شبنم عابدی نے کیا ہے۔

جن جدید شاعروں نے ممبئی پر نظمیں لکھی ہیں ان میں ندا فاضلی کی نظم

"مہانگر" اہم بھی ہے اور اسے کافی شہرت بھی ملی ہے۔ عادل نے ممبئی پر عمومی انداز میں لکھنے کے بجائے یہاں کے چند ایسے علاقوں اور مقامات کو موضوعِ سخن بنایا ہے جنھیں کئی اعتبار سے سنگ میل کا مرتبہ حاصل ہے۔ ایسی نظموں میں "فاک لینڈ روڈ"، "میرین ڈرائیو"، "کولاٹی کی نیم عریاں شام"، چوپاٹی سے متعلق ایک مختصری نظم "رات چھ بجے نیوز میں" وغیرہ خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان نظموں کو اگر ان کی کچھ دوسری تخلیقات مثلاً "کم سپٹمبر کی دھن پر"، "ایلین گنس برگ" اور "جیسلمیر کے کھنڈر دیکھ کر" وغیرہ کے ساتھ پڑھیں تو وہی لطف ملتا ہے جو عالمی جدید شاعروں پیٹر ریڈ گرو (Peter Redgrove)، نارمن میک کیگ (Norman MacCaig)، چارلس ٹاملنسن (Charles Tomlinson)، اسٹیون کلارک (Steven Clarke) اور ہنری ریگو (Henry Rego) جیسے شاعروں کی شاعری میں ملتا ہے۔

گرانٹ روڈ اسٹیشن سے قریب واقع فاک لینڈ روڈ نامی علاقہ سستی قسم کی عورتوں کا بہت بڑا بازار ہے۔ منٹو کے "ممو بھائی" اور "شاردا" جیسے مشہور افسانے اسی علاقے کی دین ہیں۔ اردو میں عادل کے علاوہ کسی شاعر نے فاک لینڈ روڈ کو موضوع نہیں بنایا حالانکہ ماضی قریب کے کئی جانے پہچانے ادیب و شاعر اس بازار میں گھومتے پھرتے دیکھے جاتے رہے ہیں:

زنگ آلودہ لہو کی نہر
گوشت کا جلتا ہوا اک شہر
نیلے جسموں سے ابلتا خواہشوں کا زہر
بستروں پر ٹوٹتی لذت کی آہٹ
موت کے ہونٹوں پہ کالی مسکراہٹ

دیکھئے چند مصرعوں میں ہی کس طرح ان عورتوں کا سارا جسمانی اور روحانی کرب سمٹ آیا ہے جو نو عمری میں ہی جسم فروشی پر مجبور کر دی جاتی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے جسموں کی تمام تازگی اور شادابی ختم ہو جاتی ہے۔ انھیں ایسی خطرناک بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں جو ان کے جسمانی نظام کو ہی نہیں ذہنی نظام کو بھی بے ترتیب کر دیتی ہیں۔ گاہک آتے ہیں اور ان کے جسموں میں اپنے آتشک زدہ خون کا زہر انڈیل چلے جاتے ہیں۔ فاک لینڈ روڈ ایک بدبودار جلتے ہوئے شہر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ موت کی کالی مسکراہٹ سے مراد یہ ہے کہ ان جسم فروش عورتوں کی عمر زیادہ نہیں ہوتی اور ناقابلِ علاج بیماریاں انھیں دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہیں۔ آخر کار وہ اس جگہ پہنچ جاتی ہیں جہاں سے واپسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

"فاک لینڈ روڈ" کے بعد "میرین ڈرائیو" پر نظر ڈالنا ایک قطعاً متضاد صورت حال سے دوچار ہونا ہے:

شہریوں سے تنگ آکر
شور سے دامن چھڑا کر
اونچی اونچی بلڈنگیں
خودکشی کرنے کی خاطر
صف بہ صف دریا کنارے
دیر سے آ کر کھڑی ہیں

"فاک لینڈ روڈ" پر اگر وہ بدقسمت عورتیں رہتی ہیں جنھیں سماج نے پستی اور ذلت کی عمیق ترین کھائیوں میں ڈھکیل دیا ہے تو میرین ڈرائیو پلید حد تک امیر (Filthy rich) خاندانوں کا مسکن ہے۔ بحیرۂ عرب کے مقابل ایک ہی قطار میں بنی ہوئی اور یکساں اونچائی والی بلڈنگوں میں رہنے والے بڑے بڑے سرمایہ کاروں، صنعت کاروں اور شیئر مارکیٹ (سٹہ بازار) کے دلالوں کے دن اگر آس پاس کے علاقوں میں واقع عالی شان، ایرکنڈیشنڈ دفتروں میں گذرتے ہیں تو راتیں پانچ ستارہ ہوٹلوں، کلبوں اور ڈسکوز کی رونق بڑھاتی ہیں۔

ممبئی میں جنوبی ممبئی کے نام سے مشہور یہ علاقہ بجائے خود ایک جزیرہ ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کو شہر اور شہریوں کے مسائل سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ لوگ تہذیبی اور ثقافتی یعنی بنیادی انسانی اقدار کے زوال کی چلتی پھرتی، کھاتی پیتی اور جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ہمارے اس مفروضے کا تازہ ثبوت ۲۶ جولائی ۲۰۰۵ کو اس وقت سامنے آیا جب اچانک بارش کے سبب پوری شمالی ممبئی میں سیلاب آ گیا تھا۔ بلا مبالغہ کئی سو افراد سیلاب میں بہہ گئے۔ ہزاروں لوگ بے گھر ہو گئے، مگر جنوبی ممبئی کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ شراب خانوں ہوٹلوں کے علاوہ سٹہ بازار بھی کھلا رہا۔ جنوبی ممبئی میں رہنے والوں کی یہ ذہنیت کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اب اس پس منظر میں عادل منصوری کی یہ مختصری طنزیہ نظم دیکھئے:

شہریوں سے تنگ آکر
شور سے دامن چھڑا کر
خودکشی کرنے کی خاطر
صف بہ صف دریا کنارے
دیر سے آ کر کھڑی ہیں

پہلے دو مصرعے واضح ہیں اور اسی ذہنیت کے غماز ہیں جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ اونچی اونچی بلڈنگیں اپنے مکینوں کا استعارہ ہیں۔ آخری تین مصرعوں کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ شہر کے مرکزی دھارے اور عام شہریوں سے الگ تھلگ تعیش کی زندگی گذارنے والے، میرین ڈرائیو کے باشندے ایک طرف اگر ثقافتی اور تہذیبی اعتبار سے خودکشی پر مائل ہیں تو دوسری طرف بحری تموج کا معمولی سا جھٹکا بھی ان بلڈنگوں کو زمیں دوز کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ سمندر کو 'دریا' غالباً گجراتی کا اثر ہے کیوں کہ گجراتی میں سمندر کو دریا ہی کہتے ہیں۔

میرین ڈرائیو کی طرح اور اس سے قریب چوپاٹی بھی ممبئی کا ایک مشہور ساحلی علاقہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ چوپاٹی نامی ساحل کافی چوڑا ہے اور بلڈنگیں سمندر سے خاصے فاصلے پر تعمیر کی گئی ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں فلموں کی شوٹنگ ہوتی تھی اور شرفا، سرِ شام، بال بچوں سمیت تفریحاً آتے تھے۔ اب اس پورے ساحل پر آئس کریم فروشوں، بریانی پوری کے اسٹالوں اور طوائفوں کا راج ہے۔

سورج ڈھلتے ہی سارا کاروبار دھڑلے سے شروع ہوجاتا ہے۔ عادل نے محض تین مصرعوں پر مشتمل اپنی نظم "رات" میں اس تلخ حقیقت کو یوں بیان کیا ہے :

رات چوپاٹی کی ٹھنڈی ریت میں
خواہشوں کے گرم سائے سو گئے
لذتوں کے جنگلوں میں کھو گئے

عادل نے یوں تو متعدد ہوٹلوں اور ریستورانوں پر نظمیں لکھی ہیں مگر ہم یہاں صرف دو ایک مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ چرچ گیٹ اسٹیشن سے قریب واقع ہوٹل نٹ راج اب سے ۲۰۔۲۵ سال پہلے تک آج کی طرح مہنگا نہیں تھا۔ اس کے پر فضا اور خوبصورت ریستوراں میں اوسط آمدنی والے شوقین لوگ بھی اپنی شامیں گذار سکتے تھے۔ عادل کی یہ نظم غالباً اسی زمانے کی یادگار ہے :

موم کی دو انگلیاں
کالی کافی کے کپوں میں گھل گئیں
کوکا کولا میں
اکیلی شام کے سورج کی کرنیں بجھ گئیں
پانی کے جگ میں سمندر چیخ اٹھا
سینڈوچ کے دل میں کانٹے گھپ گئے
پلیٹ میں بیٹھے ٹماٹر ہنس پڑے
کیتلی سے شام کی کالی اداسی بھاپ بن کر اڑ گئی
آنکھ مٹکاتی ہوئی وہ دوسرے ٹیبل کی جانب مڑ گئی

اگر ہم نظم کے موضوع کی حد بندی کرنا ہی چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ایک ایسے نوجوان کو پیش کیا گیا ہے جو تنہا بھی ہے، پریشان بھی ہے۔ اسے کسی کا انتظار بھی نہیں ہے اور اس کے دل میں یہ موہوم سی امید بھی ہے کہ شاید کوئی بھولی بھٹکی لڑکی اس کی طرف آنکلے اور کالی، تنہا شام، تھوڑی دیر کے لئے ہی خوشگوار بن جائے۔ اس نظم کی تکنیکی اور فنی خصوصیت یہ ہے کہ تقریباً ہر منظر اور ہر احساس کو ٹھوس بصری پیکروں (Visuals) کے ذریعے قاری تک منتقل کیا گیا۔ کافی کے پیالوں میں گھل جانے والی موم کی انگلیاں دراصل شکر کی ٹکیاں (Cubes) ہیں۔ کوکا کولا کی گہری سیاہی مائل رنگت اس اندھیرے کی طرف اشارہ کرتی ہے جو سورج ڈھلتے ہی چھا جاتا ہے۔ جگ میں سمندر کا چیخ اٹھنا اور پلیٹ میں رکھے ہوئے ٹماٹر کے قتلوں کا ہنس پڑنا، علامتوں اور استعاروں پر شاعر کی آنکھ اور اس کے کان کی فتح کے مصداق ہے۔

لڑکی کو ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے اگر شام کی کالی اداسی کیتلی سے بھاپ کی طرح اڑ جاتی ہے تو اس کا مطلب شاعر کا وہ موہوم سا یقین ہے کہ لڑکی اس کی میز کی طرف آرہی ہے۔ نظم کلائمکس تک پہنچتے پہنچتے اس وقت اینٹی کلائمکس بن جاتی ہے۔ جب لڑکی ہیرو صاحب کو گھاس ڈالنے کے بجائے کسی اور میز کی طرف بڑھ جاتی ہے۔ 'آنکھوں کا مٹکانا' علامتی طور سے یہ اشارہ کرتا ہے کہ موصوفہ ممبئی کی زبان میں خاص 'چالو' قسم کی چیز ہیں۔ اب عادل کی ایک اور نظم "کم سپٹمبر" سے یہ چند مصرعے دیکھئے :

کم سپٹمبر کی دھن پر تال دیتی انگلیاں
واز کے پھولوں پہ اڑتی تتلیاں
ٹیبلوں پر کالے سایوں کی جواں سرگوشیاں
سگرٹوں سے جھوم کر اڑتا دھواں

ان مصرعوں میں بھی کان اور آنکھ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوگئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ساز سے نکلنے والی دھنیں گلدان میں رکھے ہوئے پھولوں پر رقص کر رہی ہیں۔ نیم روشن ریستوران میں بیٹھے ہوئے نوجوان جوڑوں کو پوری طرح دیکھنا تو مشکل ہے مگر ان کی محبت بھری سرگوشیوں کو ضرور محسوس کیا جاسکتا ہے۔

عادل کی دوسری اہم نظموں میں "کون ہے؟"، "میں تمہارا منتظر ہوں"، "پنسل کا سورج چکاڈ"، "دو گھڑی کے درمیان"، "دھواں" وغیرہ ان کے سر ریلسٹ اسلوب اور اچھوتے موضوعات سے ان کی فطری رغبت کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ عادل کی نظموں کو Categonse نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان نظموں میں فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی ادراک کی بھی فراوانی ملتی ہے، ان سے صحت مند جنس کی خوشبو آتی ہے، ان میں بڑی حد تک ناقابل فہم پراسراریت کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور کہیں کہیں خالص عشق کا بانکپن بھی دکھائی دیتا ہے۔

جہاں تک سماج کا سوال ہے اسے ہر عہد کے ادب میں 'بادہ و ساغر' والی اہمیت حاصل رہتی ہے۔ عادل منصوری بھی سماج سے الگ تھلگ نہیں ہیں۔ ان کے ہاں موجودہ سماج کے تعلق سے ناراضگی اور برہمی کا جذبہ ملتا ہے۔ وہ سماج کے آسمان پر چھائے ہوئے کالے بادلوں کو دیکھ کر اعصابی تناؤ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کی نظم 'اجداد' کا لب لباب یہ ہے کہ موجودہ عہد کے انسان نے مادی، سائنسی اور ٹکنولوجیکل سطح پر تو بہت ترقی کر لی ہے مگر عملی سطح پر وہ دور وحشت میں سانس لے رہا ہے۔ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو بالکل بری طرح ختم کر رہی ہیں جس طرح ماقبل تاریخ والے دور کے لوگ دوسروں کے "سرخ کچے گوشت" کو صفاچٹ کر جاتے تھے۔ وہ دن دور نہیں جب استعاراتی طور پر لوگ چاہنے لگیں گے کہ شام ہوتے ہی :

سب اچھلتے کودتے واپس چلیں
دوسری ٹھوکر کے خوابوں کو جگا کر
غار کے دروازے میں جا کر سو رہیں

یوں تو عہد جدید کے اس غار کے کئی دروازے ہیں مگر وہائٹ ہاؤس اور ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ نامی دروازے سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ "بوسنیا" سیریز والی نظموں کے ٹھیٹ سرریلسٹ دبیز پردوں کے پیچھے سے ہی روشن حقیقت جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ "کون ہے" اور 'وہ مر گئی تھی' جیسی نظموں میں انہوں نے ہم عصر زندگی کو اپنے مخصوص اسلوب میں پیش کیا ہے۔ "کون ہے" میں انہوں نے زندگی، یا یوں کہئے کہ انسانی وجود کو ایک پراسرار اور خوف ناک چار دیواری سے تعبیر کیا ہے، جس کے اندر کا ماحول حساس انسانوں کے لئے ناقابل برداشت ہے:

کون ہے

اس چار دیواری کے اندر کون ہے؟
کس کے پیلے دانت
چھت پر چل رہے ہیں
کس کا خالی سر ہوا میں تیرتا ہے
کس کا نیلا خون، بستر میں پڑا چلا رہا ہے
کس کے وحشی قہقہوں سے
بند کمرہ گونجتا ہے

"کون ہے" کے عنوان سے عادل نے ایک اور نظم بھی لکھی لیکن اس کا مضمون بالکل مختلف ہے۔ "دل کا چور"، "دور افق پر" اور "میں تمہارا منتظر ہوں" جیسی نظموں میں جنس سے جو کام لیا گیا ہے مگر جنس زدگی نہیں ملتی۔ انھیں پڑھتے ہوئے جسمانی لذت کا نہیں بلکہ یہ احساس ہوتا ہے گویا شاعر اپنی کھال کے باہر اپنے جسم کو تلاش کر رہا ہو۔ یہ نظمیں در حقیقت، جنسی خواہشات اور دوسرے بہت سے انسانی تقاضوں کی آپسی کشمکش کا نتیجہ ہیں:

کس کے جلتے لمس سے
پگھلا ہے یخ بستہ لہو
کروٹیں لیتی ہے دل میں
کس کے تن کی آرزو
کس نے میرے ہونٹ پر
کون ہے جو لذتوں کے
آئینوں کو توڑ دے
کون ہے؟

کون ہے؟
شہوت کو شیشے میں
پیتل کے جسموں کے اندر
تنہائی کا جال بنو
ٹیلیفون پہ حال سنو
لفظوں کے گورکھ

مختصر یہ کہ عادل منصوری مذہب سے لے کر سیاست تک جس موضوع پر بھی لکھیں ان کا انداز نرالا اور انوکھا ہوتا ہے۔ اگر وہ ہمارے سب سے زیادہ منفرد جدید شاعر ہیں تو اس کی وجہ ان کا وسیع شعری کینوس ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے لئے ایک بالکل نئی زبان خلق کی ہے۔ انھوں نے جو تراکیب، علامتیں، استعارے اور امیجز تراشے ہیں وہ کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتے۔ ان ہی چیزوں نے عادل کی شاعری کو پیچیدہ اور بسا اوقات مبہم بنا دیا ہے۔ غالباً اسی لئے وہ اہم نقاد جو معمولی شاعری اور اس سے زیادہ معمولی افسانوں سے متعلق بلا تکلف صفحات کے صفحات سیاہ کرنے کے فن میں درجۂ کمال تک پہنچ چکے ہیں، عادل منصوری کی شاعری کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

آخر میں یہ معذرت آمیز اعتراف ضروری ہے کہ ہم اس مختصر سے مضمون میں عادل منصوری کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے۔ ان کی نظموں کے کئی دوسرے پہلو تشنۂ تشریح رہ گئے۔ عادل جدید غزل کے بھی صاحب طرز شاعر ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری ایک علٰحدہ اور تفصیلی مطالعے کی متقاضی ہے۔ یہ کام انشاء اللہ کسی اور موقع پر کیا جائے گا ☆☆☆

شمس الرحمن فاروقی
تعبیر کی شرح
(نئے تنقیدی مضامین، پاکستانی ایڈیشن)
قیمت : ۲۵۰ روپے

سوار
اور دوسرے افسانے
شمس الرحمن فاروقی
(ہندوستانی ایڈیشن)
قیمت : دوسو روپے
شب خون کتاب گھر، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

شمس الرحمن فاروقی
تنقیدی افکار
(نیا اضافہ شدہ ایڈیشن)
قیمت : ۱۸۶ روپے
شب خون کتاب گھر، الہ آباد

ظفر اقبال

سچ پوچھیے تو صبح سے شام انتظار تھا
آنکھوں میں خواب خواب دوام انتظار تھا

گھر انتظار گاہ گماں تھی جہاں تہاں
ایسا ہی کوئی وہ در و بام انتظار تھا

کچھ شوق سے کیا تو کبھی بے دلی سے بھی
بیگار تھی کہیں کہیں کام انتظار تھا

اب کوئی اس سے بچ کے نکلتا بھی کس طرف
پھیلا ہوا جو راہ میں دام انتظار تھا

بزم صدا میں طرۂ خاموش تھی
باغ ہوا میں طرز خرام انتظار تھا

منصب ملا تھا چشم براہی کا خاص کر
دربار دل میں ایک مقام انتظار تھا

نکلا نہیں تھا کوئی نتیجہ کسی بھی طور
اپنا تو سب سلام و پیام اانتظار تھا

پردہ وہ جیسے اٹھنے ہی والا ہو اب کہیں
اس جلوہ گاہ خاص میں عام انتظار تھا

پہچان تھی اسی سے مری سر بسر ظفر
میرا نشان تھا مرا نام انتظار تھا

ظفر اقبال

یوں بھی نہیں کہ شام و سحر انتظار تھا
کہتے نہیں تھے منہ سے مگر انتظار تھا
مدت کے بعد پھول کی صورت کھلا تھا دل
شبنم کی طرح تازہ و تر انتظار تھا
بالوں میں دھول پاؤں میں چھالے نہ تھے مگر
پھر بھی کچھ ایک رنج سفر انتظار تھا
کوئی خبر تھی اس کی پرندوں کے شور میں
رنگ ہوا میں شاخ و شجر انتظار تھا
یوں تھی جواہرات لب و چشم کی جھلک
جیسے یہ کوئی لعل و گہر انتظار تھا
دالان و در میں ایک توقع تھی موج موج
دیوار و بام تھے کہ بھنور انتظار تھا
ایسے میں اعتبار کسی پر نہ تھا مجھے
میں بھی تھا ساتھ ساتھ جدھر انتظار تھا
آنکھیں تھیں خشک تو دل بھی تھا بند بند
کھل ہی نہیں رہا تھا کدھر انتظار تھا
مایوس ہونے والے نہ تھے ہم بھی اے ظفر
آیا نہیں تو بار دگر انتظار تھا

ایسا وہ بے شمار و قطار انتظار تھا
پہلی ہی بار دوسری بار انتظار تھا
خاموشی خزاں تھی چمن در چمن تمام
شاخ و شجر میں شور بہار انتظار تھا
دیکھا تو خلوت خس و خاشاک خواب میں
روشن کوئی چراغ شرار انتظار تھا
باہر بھی گرد امید کی اڑتی تھی دور دور
اندر بھی چاروں سمت غبار انتظار تھا
پھیلے ہوئے وہ گھاس کے تختے نہ تھے وہاں
دراصل ایک سلسلہ وار انتظار تھا
کوئی خبر تھی آمد و امکان صبح کی
اور اس کے ارد گرد حصار انتظار تھا
کس کے گمان میں تھے نئے موسموں کے رنگ
کس کا مرے سوا سروکار انتظار تھا
اڈا ہوا ہجوم تماشا تھا دائیں بائیں
تنہا تھیں آنکھیں اور ہزار انتظار تھا
چکر تھے پاؤں میں کوئی شام و سحر، ظفر
اوپر سے میرے سر پہ سوار انتظار تھا

کوئی اس خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو

پرتپال سنگھ بیتاب

گھر میں شادی کا سا ماحول ہے
سجی سنوری لڑکیاں بالیاں
ہرنیوں کی طرح ادھر سے ادھر
اچھل کود کر رہی ہیں
نوجوان بھنگڑے کے تال پر
ڈھول کے اردگرد ناچ رہے ہیں
بڑے بوڑھے کسی نہ کسی کام میں مصروف
ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر
دوڑ بھاگ رہے ہیں
کوئی پھولوں کے ہار سجا رہا ہے
کوئی جگمگاہٹ کا انتظام کر رہا ہے
کوئی سامان لا رہا ہے
کوئی سامان اتروا رہا ہے
میں اپنے اس حویلی نما گھر میں
تن تنہا دھیمی رفتار میں ہوں
اترتا ہوں تو سیڑھیاں مجھے دیکھ کر
سنسان اور خاموش ہو جاتی ہیں
چڑھتا ہوں تو چھت
مجھے دیکھ کر خالی ہو جاتی ہے
داخل ہوتا ہوں تو کھچا کھچ دیوان خانہ
مجھے دیکھ کر دور دور تک پھیلے ہوئے
اک ریگزار میں بدل جاتا ہے
جس میں سرابوں کی شکلیں
انسانوں جیسی ہوتی ہیں
قمقموں کی طرف دیکھتا ہوں
تو وہ جگمگانا چھوڑ دیتے ہیں۔

دور کوئی ریل گاڑی
سیٹی بجاتی ہوئی
مجھے اپنے ساتھ
کہیں لئے جا رہی ہے
عین میرے سر کے اوپر
میرے گھر سے بہت اونچائی پر
ایک ہوائی جہاز
مجھے اپنے ساتھ لئے
حدِ نظر سے آگے کے لئے
اونچی اڑان بھر رہا ہے

پرتپال سنگھ بیتاب

ہندوستان میں بیٹھی میری بیٹی اکثر
دوسرے ملکوں کے بچوں سے
انٹرنیٹ پر گفتگو کرتی رہتی ہے۔

ایک پاکستانی بچے نے جب اس سے کہا
ہم لوگ خداترس ہیں
اللہ سے ڈر کر رہتے ہیں
ہر کام
اللہ کے قہر کو دھیان میں رکھ کر
کرتے ہیں بہر طور
اللہ ہی اللہ کہتے ہیں
اللہ ہی اللہ کرتے ہیں،
تو میری بیٹی نے جواباً کہا
ہاں مانتے تو ہم بھی ایک خدا کو ہی ہیں
نام الگ الگ ہو سکتے ہیں
رام، بھگوان، واہگورو، اللہ، یا خدا
یا کچھ بھی
لیکن ہم لوگ اس سے ڈرتے نہیں
بلکہ اس کے ساتھ دوستوں کی طرح ہیں

آتے جاتے اسے ہائے، ہائے کہہ کر پکارتے ہیں
کبھی کبھی تو اس کو چڑا بھی دیتے ہیں
امتحان میں کلاس میں یا کہیں اور
کچھ گڑبڑ ہو جائے
تو اس سے کہتے ہیں
کیا کر رہے ہو یار؟
بچا نہیں سکتے تھے کیا؟
کبھی کبھی تو غصے میں ہم
اس سے کہتے ہیں
دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟
کہاں سوئے رہتے ہو؟
جب بھی تمھاری ضرورت ہو
تم غائب رہتے ہو!
اور وہ
ہماری باتوں کا برا نہیں مانتا
بلکہ آئندہ کے لئے
ہمارا
اور بھی زیادہ
خیال رکھتا ہے

---

(۱) بلھے = حضرت بلھے شاہ؛ دھنے = عہد وسطیٰ کی بھگتی تحریک کے سنت شاعر دھنا بھگت۔

نظم

پرتپال سنگھ بیتاب

آسمانی جنگیں جیتنے کے جنون میں
میں وہاں برسرپیکار رہا
یگوں یگوں لڑتا رہا۔
آگے پیچھے سب کچھ بھول بھلا کر
میدان پر میدان مارتا رہا
تمام تر دشمنوں کو مات دینے کے بعد
جوش ٹھنڈا ہونے پر
جب میں زمین پر واپس آیا
تو دیکھا
کہ پیچھے سب کچھ بدل چکا ہے
میری آئندہ کئی کئی نسلوں کی
کئی کئی آئندہ نسلیں گذر چکی ہیں
اور منظرنامے پر جو نسلیں ہیں
وہ تو مجھے پہچانتی بھی نہیں
ایک مدت سے اپنی اجنبی نسلوں میں
اپنے وجود کو
قائم کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں
میرے ہمراہ کوئی ہے تو محض
میری آسمانی تسخیروں کی یادیں،
اور تو کوئی مجھے جانتا ہے نہ پہچانتا ہے
کچھ لوگ جن کو میں زبردستی
اپنی بات سنانے کے لئے
روک لیتا ہوں
کہتے ہیں کہ میرا وقت گذر چکا ہے
اور یہ بھی کہ میں خود بھی
کب کا گذر چکا ہوں
کچھ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں
کہ مجھے اپنے زمانے میں
لوٹ جانا چاہئے
اور وہیں جا کر
اپنے وجود کو
قائم کرنے کی
کوشش کرنی چاہئے

ماضی اور حال کے درمیان
بھٹکتا ہوا میں
اپنے مستقبل کی فکر میں ہوں

بابا بوهڑ کبھی کچھ نہیں بولتا (۱)

پرتپال سنگھ بیتاب

بابا بوہڑ خاموش رہتا ہے
کبھی کچھ نہیں بولتا
عورتیں بالیاں بچے بوڑھے
سب اپنی اپنی منتوں کے دھاگے
اس کے تنے کے اردگرد باندھتے ہیں
رنگ برنگے ڈوپٹوں اور
کئی قسم کے کپڑوں کی دعائیں
اس کی شاخوں پر لٹکاتے ہیں
اس کے اردگرد گھومتے ہیں
اس کی پریکرما کرتے ہیں
اور یہ خاموش رہتا ہے
بالکل خاموش
کسی کی منت پوری ہو رہی ہے
کسی کی نہیں
کسی کا مریض ٹھیک ہو رہا ہے
کسی کا نہیں
کسی کا بچہ امتحان میں
کامیاب ہو رہا ہے
کسی کا نہیں
کسی کی شادی اپنے پریمی
یا پریمکا سے ہو رہی ہے
کسی کی نہیں
کسی کا کچھ ہو رہا ہے کسی کا نہیں
وغیرہ وغیرہ ہو رہا ہے
یا نہیں ہو رہا ہے
لیکن بابا بوہڑ
اپنی ٹہنیاں اور پتے دور دور تک
پھیلائے ہوئے بدستور خاموش ہے۔

خدا جانے بابا بوہڑ کچھ کرتا بھی ہے
یا پھر یہ سب
خود بخود ہو رہا ہے
ہاں مگر
دنیا کا طواف
اس کے گرداگرد
جاری ہے

(۱) بابا پنجاب میں دادا (باپ کے باپ) کو کہا جاتا ہے۔ بوہڑ = بڑ کا درخت (پنجابی)

پرتپال سنگھ بیتاب

سر جزیروں کے پھر سے ابھرنے لگے
وہ جو پانی چڑھے تھے اترنے لگے
اب کسی دوست سے کوئی شکوہ نہیں
وقت کے ساتھ سب زخم بھرنے لگے
ہم نے ماضی میں ٹھکرائی ہیں منزلیں
راستے میں کہاں ہم ٹھہرنے لگے
موج در موج خشکی تھی پیش نظر
شور اندر کے دریا بھی کرنے لگے
ایسے کیا جرم سرزد ہوئے ارض پر
لوگ اپنے ہی سائے سے ڈرنے لگے
آج پھر آپ لاغر ہیں سورج میاں
دھوپ میں لوگ پھر سے ٹھٹھرنے لگے
کون سے منصبوں کی محبت میں ہم
اپنے منصب سے نیچے اترنے لگے
تم نے صحرا میں چھوڑے تھے جو نقش پا
آج وہ آندھیوں میں بکھرنے لگے

(نذر غالب)

اس کا کمال ہے کہ خزاں پر بہار ہے
حد نظر تلک جو طلسمی حصار ہے
آگے بھی صبح تک نہیں روشن کوئی سراغ
پیچھے بھی دور دور یہ تاریک غار ہے
جھونکے کہیں سے آتے ہیں تازہ ہواؤں کے
کنج قفس کہیں کوئی راہ فرار ہے
ان آبلوں کو پاؤں سے نسبت ہے دائمی
آگے یہی سفر ہے یہی خارزار ہے
تھا اک شجر بلند جو آندھی میں گر گیا
بستی تمام اس کے لئے سوگوار ہے
بیتاب تم فقیر کہاں آگئے میاں
اس شہر میں اک ایک بشر شہر یار ہے

یہ زندگی سفر ہے ٹھہر ہی نہ جایئے
یہ بھی کہ بے خیال گذر ہی نہ جایئے

صحرا ے ہول خیز میں رہیئے لئے دیئے
ریگ رواں کے ساتھ بکھر ہی نہ جایئے

جب ڈوبنا ہی طے ہے ابھرنا محال ہے
دلدل ہے دل فریب اتر ہی نہ جایئے

ان راستوں میں رات بھٹکتی ہے بے سبب
ایسا بھی خوف کیا ہے جو گھر ہی نہ جایئے

اب کے سفر میں ہے یہ نیا ضابطہ جناب
جانا جدھر ہے آپ ادھر ہی نہ جایئے

بیتاب موت کی یہ للک زندگی بھی ہے
یوں انتظار موت میں مر ہی نہ جایئے

پرتپال سنگھ بیتاب

کیا لامکاں سے آگے زمیں آسماں ہیں اور
کیا کچھ مکیں بھی اور ہیں کیا کچھ مکاں ہیں اور

ساحل نہیں ملا مگر اتنا پتہ چلا
اس بحر میں جزیرے کئی بے نشاں ہیں اور

جھکتی ہیں جن کے آگے مخالف ہوائیں بھی
وہ کشتیاں ہی اور ہیں وہ بادباں ہیں اور

صحرا جو موج ریگ ہوا کچھ بھی غم نہیں
دریا میں بھی تمھارے قدم کے نشاں ہیں اور

ان سے مکالمہ تھا مقدر تمام عمر
اپنی زبان اور وہ اہل زباں ہیں اور

بیتاب کامیاب ہوئے ہم ہزار بار
ہر بار یہ سنا کہ ابھی امتحاں ہیں اور

(نذر غالب)

کس کی تصویر سے آئینہ ڈراتا ہے مجھے
کون مجھ سا ہے آنکھیں جو دکھاتا ہے مجھے

نت نئے ساحل و امواج دکھاتا ہے مجھے
اک سمندر ہے کہ ہر لحظہ بلاتا ہے مجھے

ہے نہاں خانۂ غم اس کی ہنسی کے پیچھے
ہنستا رہتا ہے وہ خود اور رلاتا ہے مجھے

رات بھر کوہ ندا سے مجھے دیتا ہے صدا
صبح ہوتے ہی بلندی سے گراتا ہے مجھے

اشک یہ اور کسی کا ہے سر شام امید
میری آنکھوں میں اتر کر جو رلاتا ہے مجھے

کسے اچھا کہوں اب کس کو برا اے بیتاب
ہر کوئی اپنے ہی جیسا نظر آتا ہے مجھے

پرتپال سنگھ بیتاب

بس کہ اک دربدری رہتی ہے
خود سے ہی دوڑ لگی رہتی ہے

منجمد ہم کو نہ جانو صاحب
اندر اک آگ لگی رہتی ہے

کچھ طبیعت ہی ملی ہے ایسی
ساتھ اک غمزدگی رہتی ہے

برے آثار کی سر پر گویا
کوئی تلوار تنی رہتی ہے

کوئی موسم ہو مرے پربت پر
سال بھر برف جمی رہتی ہے

دو کناروں کی طرح ہیں دونوں
درمیاں ایک ندی رہتی ہے

ظاہر میں بھی کیا کیا پردہ داری ہے
دنیاداری پرکاری عیاری ہے

پاؤں تلے خوش وادی اور سفر آگے
رک نہیں سکتے ہم کیسی لاچاری ہے

ایک مسلسل دوڑ میں شامل ہم بھی ہیں
شوق نہیں یہ اک ذہنی بیماری ہے

بادِ مخالف پورے زور سے بہتی جائے
اس جانب سے بھی پوری تیاری ہے

ماضی میں تم جیت گئے مجھ سے بیتاب
مستقبل کی جنگ ابھی تک جاری ہے

صبح جستجو ہے تو
شام آرزو ہے تو
میں تو خشک صحرا ہوں
میری آبجو ہے تو
زیور تخیل اور
حسن گفتگو ہے تو
کچھ الگ ستاروں سے
چاند ہو بہو ہے تو
صبح ہے بنارس کی
شام لکھنؤ ہے تو
گرچہ اب نہیں بیتاب
پھر بھی رو بہ رو ہے تو

غزل

انور شعور

نہیں خستہ حالی پہ نامطمئن ہم
یہی ٹاٹ مخمل یہی ٹاٹ ریشم

ہم اچھی طرح جانتے ہیں یہ ناصح
کہ سچائی کا اجر ہے ساغر سم

کسی حال میں بھی رکھے رکھنے والا
بھلا دہر میں کیا خوشی اور کیا غم

نہیں اپنی غائب دماغی پہ حیرت
محبت میں ہوتا ہے اکثر یہ عالم

کوئی شور سا دل میں رہتا ہے برپا
دمادم دمادم دمادم دمادم

رہے تذکرے امن کے آشتی کے
مگر بستیوں پر برستے رہے بم

کہاں چین سے آج دنیا میں کوئی
یہ جنت بنا دی گئی ہے جہنم

نہ گذرا کبھی ایک لمحہ سکوں سے
محبت میں آئے وہ دن رات پیہم

کبھی کوئی رونا کبھی کوئی رونا
کبھی ایک ماتم کبھی ایک ماتم

نہ کیوں دل سے باتیں کریں ہم مسلسل
یہی ایک مونس یہی ایک ہمدم

ہمیں خوف آتا ہے اب دوستی سے
مگر آپ ارشاد کر دیں تو سر خم

بھلا شیخ صاحب ہمیں کیوں پلائیں
بڑی مشکلوں سے ہوئی ہے فراہم

اسے غور سے دیکھنا چاہتا ہوں
زمانے کی گردش ذرا رک، ذرا تھم

مری طرح ہوکا نہیں شیخ جی کو
لہٰذا وہ یہ شوق کرتے ہیں کم کم

شعور ایک دن پیش ہونا پڑے گا
کہاں تک بچو گے عزیز مکرم

انور شعور

مشتاق بدستور زمانہ ہے تمھارا
آنے سے فسوں خیز نہ آنا ہے تمھارا

لیلیٰ کی حکایت بھی حکایت ہے تمھاری
شیریں کا فسانہ بھی فسانہ ہے تمھارا

اس دل کی خبر تم سے زیادہ کسے ہوگی
انداز مگر بے خبرانہ ہے تمھارا

تم حسن مجسم ہو بلا شرکت غیرے
نا قابل تقسیم خزانہ ہے تمھارا

دل میں کوئی آجائے تو واپس نہیں جاتا
دشوار یہاں سے کہیں جانا ہے تمھارا

تم سے متاثر ہیں نئے ہوں کہ پرانے
اسلوب نیا ہے کہ پرانا ہے تمھارا

کیوں روشنی و رنگ سے معمور نہ ہو دل
سنسان سہی آئینہ خانہ ہے تمھارا

سمجھایا بجھایا نہ کرو دل کو شعور اب
کم بخت نے کہنا کبھی مانا ہے تمھارا

سرگذشت اپنی رقم کرتے رہے
آپ کہتے اور ہم کرتے رہے

بزم ساقی سے اٹھانے کی ہمیں
کوششیں دنیا کے غم کرتے رہے

صبح و شام و روز و شب اللہ سے
تیری باتیں اے صنم کرتے رہے

زندگی بھرتی رہی جام سفال
ہم اسے پی پی کے کم کرتے رہے

ڈالتے آنسو کسی پر کیا اثر
بیشتر دامن ہی نم کرتے رہے

بے بس و مجبور کر دیتا ہے عشق
ہم گوارا ہر ستم کرتے رہے

ہنس کے ٹرخانا کبھی بھولے نہیں
وہ ہمیشہ یہ کرم کرتے رہے

انور شعور

انور شعور دن میں کہیں رات میں کہیں
رہتا ہے خوار شہر خرابات میں کہیں

آئے ہزار بار بلانے کے بعد اور
گم ہو گئے وہ اپنے خیالات میں کہیں

ممکن ہے بادہ خانے گئے ہوں جناب شیخ
گھر سے نکل گئے ہیں وہ برسات میں کہیں

ہم منتظر ہیں اور بھلائے ہوئے ہیں وہ
کیا گفتگو ہوئی تھی ملاقات میں کہیں

ملتے ہیں روز بار میں ہم عصر تا عشا
جاتے نہیں وہاں سے ان اوقات میں کہیں

گو سخت ناگوار ہے گھر بیٹھنا ہمیں
کیا جائیں اس خرابی حالات میں کہیں

ساماں تو بے حد ہے دل میں
سب کچھ کار آمد ہے دل میں
آپ کبھی تشریف تو لائیں
ایک اعلیٰ مسند ہے دل میں
بائے بسم اللہ کھولے گی
جو قفل ابجد ہے دل میں
عشق کی اوسط کم نہیں ہوتی
آج بھی صد فی صد ہے دل میں
کوئی بحث نہ کوئی حجت
تو بے رد و کد ہے دل میں
تکتا رہتا ہوں صحرا سے
ایک ہرا گنبد ہے دل میں
عشق ہو جیسے جان کی بازی
ایسی شد و مد ہے دل میں
اس گھر کی وسعت کیا کہنا
تم جیسا خوش قد ہے دل میں
یہ جنت بھی ہے دوزخ بھی
نیک ہے دل میں بد ہے دل میں
بے لوثی سے آئے ہو سچ سچ
یا کوئی مقصد ہے دل میں
سر پہ ضروری کام پڑے ہیں
اور آمد آمد ہے دل میں
ہم جاتے ہیں فاتحہ پڑھنے
پرکھوں کا مشہد ہے دل میں
کیوں کھنچتے ہیں شعور آپ آخر
کیا ہم سے کچھ کد ہے دل میں

ابرار احمد

لوری سنا

مٹی اب ان قدموں تلے بے چین ہے
لوری سنا
اے ماں ہمیں لوری سنا

وہ جو دن بھلے تھے گذر گئے
وہ جو دن کڑے تھے گذر گئے
وہ جو پہلی رت کے گلاب تھے
انھی راستوں میں بکھر گئے
ہمیں بے کلی ہے نہ چین ہے

لوری سنا
یہ وہ شہر خواب و نظر نہ تھا
یہاں خاک میں وہ ہنر نہ تھا
یہاں دل زدوں کا گذر نہ تھا
پس گرد راہ رواں رہے
یونہی در پئے دل و جاں رہے
جو رہے بھی ہم تو کہاں رہے

ترے ناز ہم نے اٹھائے تھے
ترے پھول ہم نے کھلائے تھے
ترے زخم دل سے لگائے تھے
ہمیں اذن رنج سفر تو دے
ہمیں واپسی کا ثمر تو دے
ہمیں اپنی گود میں گھر تو دے

ہوا ہر اک سمت بہ رہی ہے

ہوا ہر اک سمت بہ رہی ہے
جلو میں کوچے مکان لے کر
سفر کے بے انت پانیوں کی تھکان لے کر
جو آنکھ کے عجز سے پرے ہیں
انھی زمانوں کا گیان لے کر
ترے علاقے کی سرحدوں کے نشان لے کر
ہوا ہر ایک سمت بہ رہی ہے
زمین چپ
آسمان وسعت میں کھو گیا ہے
فضا ستاروں کی فصل سے لہلہا رہی ہے
مکاں مکینوں کی آہٹوں سے دھڑک رہے ہیں
جھکے جھکے نم زدہ دریچوں میں
آنکھ کوئی رکی ہوئی ہے
فصیل شہر مراد پر
نامراد آہٹ اٹک گئی ہے
یہ خاک تیری مری صدا کے دیار میں
پھر بھٹک گئی ہے
دیار شام و سحر کے اندر
نگار دشت و شجر کے اندر
سواد جان و نظر کے اندر
خموشی بحر و بر کے اندر
ردائے صبح خبر کے اندر
اذیت روز و شب میں
ہونے کی ذلتوں میں نڈھال صبحوں کی
اوس میں بھیگی، ٹھٹھرتی
خموشیوں کے بھنور کے اندر
دلوں سے باہر
دلوں کے اندر
ہوا۔ ہر اک سمت بہہ رہی ہے

تم جو آتے ہو

موت دل سے لپٹ گئی اس شب

ابرار احمد

تم جو آتے ہو

دن نکلتے ہیں، بکھر جاتے ہیں
شہر بستے ہیں، اجڑ جاتے ہیں
دستکیں، آہنی دروازے پر
سر کو ٹکرا کے پلٹ جاتی ہیں
گنبدِ خامشی گرتا ہی نہیں
چلتی رہتی ہے ہوا
کھیتوں میں، دالانوں میں
اور اپنے ہی تلاطم میں اتر جاتی ہے
ہر طرف پھول بکھر جاتے ہیں
دل کی مٹی پہ کوئی رنگ اترتا ہی نہیں
"آنکھ نظارۂ موہوم سے ہٹتی ہی نہیں"
ذہن اس حجلۂ تاریکی و تنہائی میں
اپنے کانٹوں پہ پڑا رہتا ہے
وقت آتا ہے گذر جاتا ہے

تم جو آتے ہو تو ترتیب الٹ جاتی ہے
دھند جیسے کہیں چھٹ جاتی ہے
نرم پوروں سے کوئی ہولے سے
دل کی دیوار گرا دیتا ہے
ایک کھڑکی کہیں کھل جاتی ہے
آنکھ اک جلوۂ صد رنگ سے بھر جاتی ہے
کوئی آواز بلاتی ہے ہمیں
تم جو آتے ہو
تو اس حبس، دکھن کے گھر سے
رنجِ آئندہ و رفتہ کی تھکاوٹ سے
نکل لیتے ہیں

تم سے ملتے ہیں
تو دنیا سے بھی مل لیتے ہیں

موت دل سے لپٹ گئی اس شب

ایک خوابِ ہزیمتِ دنیا
ایک آہٹ دوامِ خواہش کی
ایک جوڑی قدیم ہاتھوں کی
اور آنکھوں کے بند فرغل میں
ایک خواہش ہمیشہ رہنے کی
ایک بستر، پرانی یادوں کا
اور سویا ہوا دلِ وحشی
آہنی انگلیوں کے پنجے میں
اک گھنی تیرگی کے رستے میں
ذائقہ، بھولی بسری بارش کا
ایک سایہ جھکا ہوا دل پر
دیر تک آسماں سے گرتی ہوئی
ایک مدھم صدا دریچوں میں
ایک پرشور سیل کی آواز
سانس کی سلوٹیں ڈبوتی ہوئی
کون تھا، اس سمے کے آنگن میں
جاگتی رات کو تھپکتا ہوا
کون تھا، رات دن کے پھیرے میں
گئی دنیاؤں سے ابھرتا ہوا
رو رہا تھا دیارِ غربت میں

اور معدوم کے علاقے میں
اپنی آنکھوں میں ڈال کر مٹی
خواب تکتا ہوا میں بچپن کے
ایک ہنستا ہوا، گذشتہ میں

ابرار احمد

آخری دن سے پہلے

بہت دن رہ لیے کوے ندامت میں
ہزیمت کے بہت سے وار ہم نے سہ لئے
ترا یہ شہر، شہر جاں نہیں ہے
ترے اس شہر میں اب اور کیا رہنا
ہمارے خواب
تیرے خار وخس میں تھے
ہمارے لفظ
تیری پیش وپس میں تھے
کہ ہم ہر سانس تیری دسترس میں تھے
ترے اجلے دنوں سے
ہم کو کیا حصہ ملے گا
گدا کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا کاسہ رہے گا
ہمیشہ کے لئے شاید یہی قصہ رہے گا
اب اس دھوکے میں کیا رہنا
بہت دن رہ لیا کوے ندامت میں

بارش

تو آفاق سے قطرہ قطرہ گرتی ہے
سناٹے کے زینے سے
اس دھرتی کے سینے میں
تو تاریخ کے ایوانوں میں در آتی ہے
اور بہا لے جاتی ہے
جذبوں اور ایمانوں کو
میلے دسترخوانوں کو
تو جب بنجر دھرتی کے ماتھے کو بوسہ دیتی ہے
کتنی سوئی آنکھیں کروٹ لیتی ہیں
تو آتی ہے
اور تری آمد کے نم سے
پیاسے برتن بھر جاتے ہیں
تیرے ہاتھ بڑھے آتے ہیں
گدلی نیندیں لے جاتے ہیں
تیری لمبی پوروں سے دلوں میں گرہیں کھل جاتی ہیں
کالی راتیں ڈھل جاتی ہیں
تو آتی ہے
پاگل آوازوں کا کیچڑ
سڑکوں پر اڑنے لگتا ہے
تو آتی ہے
اور اڑا لے جاتی ہے خاموشی کے خیموں کو
اور ہونٹوں کی شاخوں پر
موتی ڈولنے لگتے ہیں، پنچھی بولنے لگتے ہیں
تو جب بند کواڑوں اور دلوں پر دستک دیتی ہے
ساری باتیں کہہ جانے کو جی کرتا ہے
تیرے ساتھ ہی بہ جانے کو جی کرتا ہے

غزلیں

ابرار احمد

اور کیا رہ گیا ہے ہونے کو
ایک آنسو نہیں ہے رونے کو

خواب اچھے رہیں گے ان دیکھے
خاک اچھی رہے گی سونے کو

یہ مہ و سال چند باقی ہیں
اور کچھ بھی نہیں ہے کھونے کو

نارسائی کا رنج لائے ہیں
تیرے دل میں کہیں سمونے کو

چشم نم ، چار اشک اور ادھر
داغ اک رہ گیا ہے دھونے کو

بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی
کیا کریں اوڑھنے بچھونے کو

تو کہیں بیٹھ اور حکم چلا
ہم تو ہیں تیرا بوجھ ڈھونے کو

یاد بھی تیری مٹ گئی دل سے
اور کیا رہ گیا ہے سونے کو

ہمارے بیچ اگرچہ رہا نہیں کچھ بھی
مگر یہ دل ہے ابھی مانتا نہیں کچھ بھی

ہم اس کے غم کو ان آنکھوں میں لے کے پھرتے ہیں
مگر وہ شخص ہمیں جانتا نہیں کچھ بھی

یہ کیسی دھول سی راہوں میں اڑتی پھرتی ہے
تو اے مسافر جاں، کیا بچا نہیں کچھ بھی

ہم اپنے اپنے دل و جاں کی خیر مانگتے ہیں
یہ عجز کچھ بھی نہیں ہے، انا نہیں کچھ بھی

بس ایک منظر خالی میں اونگھ لیتا ہوں
وہ خوش نظر ہے، مگر دیکھتا نہیں کچھ بھی

تو بول اٹھتا ہے، ہم کو بھلا بھی لگتا ہے
مگر تو یار مرے، سوچتا نہیں کچھ بھی

کہیں پہ ہو کہ نہ ہو عزت گنہ گاراں
مگر یہاں کوئی تیرے سوا نہیں کچھ بھی

گماں تو خیر محبت کا تھا، پر اب اس سے
سوائے رنج طلب واسطہ نہیں کچھ بھی

ہمارے حال پہ تم کو ملال تک بھی نہیں
تو کیا جو ربط ہمارا تھا، تھا نہیں کچھ بھی

کبھی جو آؤ تو ہم کو جو تم سے کہنی ہے
یونہی سی بات ہے اب مدعا نہیں کچھ بھی

غزلیں

ابرار احمد

کہ جیسے کنج چمن سے صبا نکلتی ہے
ترے لئے مرے دل سے دعا نکلتی ہے

قدم بڑھاؤں، تری رہگذار ہے آخر
مگر یہ راہ کہیں اور جا نکلتی ہے

یہیں کہیں پہ ہے رستہ دوام وصل کا بھی
یہیں کہیں سے ہی راہ فنا نکلتی ہے

ہم اپنی راہ پکڑتے ہیں دیکھتے بھی نہیں
کہ کس ڈگر پہ یہ خلق خدا نکلتی ہے

یہاں وہاں کسی چہرے میں ڈھونڈتے ہیں تمھیں
ہمارے ملنے کی صورت بھی کیا نکلتی ہے

جو ہوسکے تو سنو زمزمۂ خموشی کو
کہ اس سے کھوئے ہوؤں کی صدا نکلتی ہے

اجاڑ رکھا تھا اس رنج تنگ دستی نے
ہزار شکر کہ گھر سے بلا نکلتی ہے

گمان ہوتا ہے جس بھی جگہ پہ منزل کا
ٹھہر کے دیکھیں تو وہ راستہ نکلتی ہے

ہوس کو دابتا ہوں دل میں اب کروں بھی تو کیا
وہ سامنے ہو تو آنکھوں سے آ نکلتی ہے

گریزاں تھا مگر ایسا نہیں تھا
یہ میرا ہم سفر ایسا نہیں تھا

یہاں مہماں بھی آتے تھے ہوا بھی
بہت پہلے یہ گھر ایسا نہیں تھا

یہاں کچھ لوگ تھے ان کی مہک تھی
کبھی یہ رہگذر ایسا نہیں تھا

رہا کرتا تھا جب وہ اس مکاں میں
تو رنگ بام و در ایسا نہیں تھا

خبر لوں جا کے اس عیسیٰ نفس کی
وہ مجھ سے بے خبر ایسا نہیں تھا

مجھے تو خواب ہی لگتا ہے اب تک
تو کیا تھا وہ اگر ایسا نہیں تھا

یوں ہی نمٹا دیا ہے جس کو تو نے
وہ قصہ مختصر ایسا نہیں تھا

غزلیں

ابرار احمد

یہ جو سر ہم تری چوکھٹ سے لگائے ہوئے ہیں
یہ سمجھ لے کہ زمانے کے ستائے ہوئے ہیں
ہم نے اس دل کو کہیں اور لگایا ہوا ہے
اور یہ ہاتھ کہیں اور اٹھائے ہوئے ہیں
تجھے دیکھوں تو مجھے یاد یہ کون آتا ہے
تو نے یہ رنگ بھلا کس کے چرائے ہوئے ہیں
کار دنیا نے ہمیں مہلت یک خواب نہ دی
سو کہیں کھوئے ہوئے ہیں نہ ہی پائے ہوئے ہیں
ہم ہی کچھ گوش برآواز نہیں تھے ورنہ
تم نے پہلے بھی یہی بول سنائے ہوئے ہیں
کس لئے یاد دلاتے ہو ابھی رہنے دو
کیا ہوا ہم جو کوئی بات بھلائے ہوئے ہیں
کام جو ہم سے نہیں ہوگا کئے جاتے ہیں
ہم سے اٹھتا جو نہیں بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں
دیکھنے کی تجھے کچھ دل میں ہے حسرت بھی ابھی
اور یہ بھی کہ ترے شہر میں آئے ہوئے ہیں

دل میں کیا تھا جو کھو گیا ہے کہیں
میرا نقصان ہو گیا ہے کہیں

وہ تری کھوج میں رہا اور پھر
غالباً تجھ کو رو گیا ہے کہیں

رنگ وہ لے گیا مگر مجھ میں
اپنی خوشبو سمو گیا ہے کہیں

تیری آواز بھی نہیں سنتا
کیا مرا بخت سو گیا ہے کہیں

ہمرہ صد ملال ہے وہ بھی
اور ہر رنج دھو گیا ہے کہیں

یوں تہی دست و دل گرفتہ نہ تھا
کچھ نہ کچھ مجھ کو ہو گیا ہے کہیں

سحر انصاری

مرحلے زیست کے دشوار ابھی ہوجائیں
تاکہ ہم جینے کو تیار ابھی ہوجائیں

یہ جو کچھ لوگ مرے چار طرف ہیں ہر وقت
یار ہوجائیں کہ اغیار ابھی ہوجائیں

جس کی تعبیر ہے اک خواب میں چلتے رہنا
کیوں نہ اس خواب سے بیدار ابھی ہوجائیں

جانے پھر کوئی ضرورت بھی رہے یا نہ رہے
جن کو ہونا ہے وہ غم خوار ابھی ہوجائیں

کوئی تصویر سجالے گا تو کوئی تحریر
کیوں نہ ہم نقش بہ دیوار ابھی ہوجائیں

زندگی خود کو بچانا ہے کہ جاں دینا ہے
فیصلے یہ بھی ہیں کہ وار ابھی ہوجائیں

ایک لمحے میں بدل سکتے ہیں حالات سحر
آپ اگر شامل دربار ابھی ہوجائیں

امجد اسلام امجد

ہوا ہی لو کو گھٹاتی وہی بڑھاتی ہے
یہ کس گمان میں دنیا دیے جلاتی ہے

بھٹکنے والوں کو کیا فرق اس سے پڑتا ہے
سفر میں کون سڑک کس طرف کو جاتی ہے

عجیب خوف کا گنبد ہے میرے چار طرف
مری صدا مرے کانوں میں لوٹ آتی ہے

وہ جس بھی راہ سے گذرے جہاں قیام کرے
زمیں وہاں کی ستاروں سے بھرتی جاتی ہے

یہ زندگی بھی کہیں ہو نہ شہر زاد کا روپ
شبانہ روز کہانی نئی سناتی ہے

امجد اسلام امجد

یہ کون لوگ ہیں

یہ کون لوگ ہیں جسموں سے آگ باندھے ہوئے
کہ موت چل کے جنھیں دیکھنے کو آتی ہے

خود اپنے شہر کی سڑکوں پہ چل نہیں سکتے
گھروں کے ہوتے انھیں بے گھری ستاتی ہے

کبھی بہار کے قاصد، کبھی ہیں دہشت گرد
جو چاہے ان کو تری زرگری بناتی ہے

ڈرو غضب سے خدا کے کہ اس کی ایک نظر
پلک جھپک میں پہاڑوں کو یوں اڑاتی ہے

کہ سب یہ نخوت و حشمت تمام شان و سپہ
غبار خاک میں تبدیل ہوتی جاتی ہے

نہیں یقین جو آتا تو مڑ کے خود دیکھو
تمھارے جیسوں کو تاریخ کیا سکھاتی ہے

مرے چاروں طرف تم ہو

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کئی گذرے ہوئے منظر
(کہ جن کی یاد بھی دھندلا چکی ہوتی ہے)
کچھ ایسے پلٹتے ہیں
کہ ان کے ساتھ وابستہ سبھی کچھ لوٹ آتا ہے
حقیقت اور گماں کی سرحدیں
کچھ اس طرح آپس میں ملتی ہیں
کہ دریا ساتھ چلتا ہے کنارہ چھوٹ جاتا ہے۔
مری جاں آج اس لمحے
مرے چاروں طرف تم ہو
مرے حصے میں جتنا آسماں تھا اس کی وسعت سے
تمھیں نکلے بہت عرصہ ہوا لیکن
میں اب بھی ہر ستارے میں تمھیں موجود پاتا ہوں
کچھ ایسے دیکھ سکتا ہوں
کہ جیسے وصل کے اس آخری لمحے میں دیکھا تھا،
جہاں چاروں طرف تم تھے، ہمارے خواب تھے
اور روشنی کا ایک دریا تھا۔
وہ دریا جس میں بہتے وقت کی کشتی
کچھ ایسے ایک لمحے کو ہمارے ساتھ ٹھہری تھی
کسی دیوار پر لٹکی کوئی تصویر ہو جیسے
وہی لمحہ، اسی صورت
ہمارے درمیاں جاناں، ایسے آ کے ٹھہرا ہے
کہ ہر جانب ہمیں ہم ہیں ہمارے خواب ہیں
اور روشنی کا ایک دریا ہے۔
تمھارے وصل کی خوشبو میں بھیگی رات ہے تم ہو
زمیں سے آسماں تک رنگ کی برسات ہے تم ہو
مگر یہ شعبدہ تو اس ستم گر رات سے اب تک
جدائی کی ہر اک برسی مجھے یونہی دکھاتی ہے
"مرے چاروں طرف تم ہو
کہاں گم ہو۔"

ٹرمینس لین

صدیق عالم

۱۔

اس ٹرمینس لین میں ہم آپ کا استقبال کرتے ہیں۔ خوش آمدید! اب آپ آخری سانس تک ہمارے مہمان ہوں گے۔ ایک خاص مہمان جسے ہم دھیرے دھیرے اس کے آخری لمحے کے لیے تیار کریں گے۔ اگر آپ واپس جانا چاہیں تو اس کی آپ کو اجازت ہے۔ صرف میں اتنا بتا دوں زندگی کے اس آخری کنج سے آج تک کسی نے واپس جانے کے بارے میں نہیں سوچا، یا شاید اس سے پہلے ہی اس کا آخری لمحہ آن پہنچا۔ اکثر اس کوچے میں آنے کے بعد لوگوں کو حیرانی ہوتی ہے کیوں کہ یہاں ایسا کچھ بھی نہیں جو اسے کسی دوسرے کوچے یا پڑاؤ سے الگ کر سکے۔ یہاں کے گھروں کے دروازے اور دریچے آپ کے جانے پہچانے ہیں جنھیں آپ روز دیکھتے آئے ہیں۔ یہاں درختوں کے نیچے بچے گیند یا کرکٹ کھیلتے یا کہیں کہیں کسی لان میں ٹریمپولن پر اچھلتے بھی نظر آئیں گے۔ مگر آپ ان کی آنکھوں میں نہ جھانکیں۔ ان میں آپ کو خود اپنی آنکھیں جھانکتی نظر آئیں گی۔ اگر ایک آدھ لڑکے لڑکیاں کسی پبلک پارک کے محفوظ گوشے میں کہیں رومانس کرتے نظر آئیں تو اس سے فریب کھانے کی ضرورت نہیں۔ اس ٹرمینس لین میں اس کی اجازت ہے۔ آپ جب یہاں آتے ہیں تو سماج اور حکومت کی ساری ان تمام زنجیروں کو توڑ کر آتے ہیں جنھوں نے آپ کو زندگی بھر قید رکھا تھا۔ ایک آزاد انسان کی طرح جسے کہیں پہنچنے کی جلدی نہیں ہوتی۔ یہاں کسی پولیس یا ٹیکس کنسلٹنٹ یا اسٹیٹ ایجنٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ کے پاس مڑ کر تاکنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا اور سامنے جہاں تک آپ دیکھتے ہیں آپ سب کچھ اپنے مطابق پاتے ہیں۔ صرف آپ سے اتنی امید رکھی جاتی ہے کہ وقت کو گھوڑے کے نعل کی طرح اپنی طرف موڑنے کی کوشش نہ کریں۔ آپ دیکھیں گے وقت آپ کا بہترین ساتھی ہے۔ وہ تو آپ کے مزاج کا خاص خیال بھی رکھتا ہے، وقت جس کے لئے آپ کے پاس کبھی وقت نہ تھا، اس وقت کو آپ خود مہربان دیکھیں گے۔ یہاں سورج کے طلوع ہونے سے لے کر غروب ہونے تک اور پھر دوبارہ طلوع ہونے تک جو کچھ ہوتا ہے کسی طے شدہ پروگرام کے تحت نہیں ہوتا۔ یہاں لوگوں کو اجازت ہے کہ وہ نئی چیزیں ایجاد کریں، ان دنوں کو پھر سے جینے کی کوشش کریں جو ان کی انگلیوں سے ریت کی طرح نکل گئے۔ انھیں اس کی کھلی اجازت ہے کہ اپنی غلطیوں کو شعوری طور پر دہرائیں، وہ چاہیں تو رو سکتے ہیں۔ مگر اس ٹرمینس لین میں رونے کی آواز خود رونے والے کو سنائی نہیں دیتی اور اکثر لوگ اس بیکار کے عمل سے اکتا کر اپنی تھوڑی اپنے ہاتھوں کے باپیڈ پر رکھ کر دریچے سے گذرتے لوگوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کے پاس چھتریاں ہوتی ہیں کچھ بچے جو سائیکلوں پر ہوتے ہیں، کچھ بوڑھے ہیں جنھوں نے کتابیں کھول رکھی ہیں۔ یہاں ایک چینی جوڑا نظر آئے گا جو بانس پر گگرے اگانے کے آسان طریقے آزما رہا ہے۔ ایک اداکار، وہ بتائے گا کہ ایک ہی مکالے کو مختلف موڈ میں کس طرح ادا کیا جائے، یہاں تک کہ لفظوں کے بغیر بھی انھیں ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ ایک خاکروب جس نے اس کوچے کو آئینے کی طرح صاف رکھا ہوا ہے۔ ایک نٹ، ایک فوجی کرنل، جس کا دماغ تھوڑا سا سنک گیا ہے، جو موسم کوئی بھی ہو ہمیشہ اپنی بھاری بھرکم وردی کے ساتھ اپنی چھڑی ٹیکتا ہوا آ دھمکتا ہے جیسے وہ اب بھی شیا چن کی برفیلی وادیوں میں ہو۔ آپ دیکھ سکتے ہیں، یہاں پر ہر کسی کا پاس کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ ہے۔ اس ٹرمینس لین میں صرف ایک چیز کی اجازت نہیں۔ یہاں کسی ڈاکٹر کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے کیوں کہ یہاں معالج اور مریض کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ نہیں، وہ آسکتا ہے بشرطیکہ وہ اس ٹرمنس لین میں صحیح طور پر آیا ہوا ہو، پھر ہم اسے بھی خوش آمدید کہتے ہیں، عالی جناب سابق ڈاکٹر، اس ٹرمنس لین میں خوش آمدید، اب آپ آخری سانس تک ہمارے مہمان ہوں گے، ایک خاص مہمان، جسے دھیرے دھیرے ہم اس کے آخری لمحے کے لئے تیار کریں گے۔

۲۔

"میگھ مالا..... ہمیں وقت کا احترام کرنا چاہیے۔" میگھ مالا اس لڑکی کا نام ہے جس نے ایک خوبصورت ساڑی پہن رکھی ہے۔ یہ ساڑی میگھ مالا کی پسندیدہ ساڑی ہے۔ اس میں منطقہ حارہ میں کھلنے والے بڑے بڑے بجز کیلے رنگ کے پھول بنے ہیں۔ اس سے وہ لڑکا مخاطب ہے جس نے ایک خاکی جینس پر لہردار لکیروں والی ایک چرمی جیکٹ چڑھا رکھی ہے، اور اس کے لئے ایک پیلا گلاب لایا ہے۔ "ہمارے محلے میں ایک جگادری کتا گھوما کرتا جس سے ہم بچے بہت خائف رہتے۔ پھر میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اسے سبق سکھانے کی ٹھانی۔ مگر ہم صرف سوچتے رہے سوچتے رہے۔ ہم نے وقت کا احترام نہ کیا اور وہ کتا اور بھی بھیانک ہوتا گیا اور بڑا ہوتا گیا اور بڑا ہوتے ہوتے وہ آسمان تک پہنچ گیا اور ہم اس کے پنجوں کے درمیان للی پٹ کے بونوں کی طرح کھڑے رہ گئے۔"

میگھ مالا نے اپنے پیر کی انگلیوں پر کھڑے ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

"ہر بار تم ایک ہی کہانی دہراتے ہو۔" وہ بولی۔ "جو مجھے اچھا لگتا ہے۔

مگر اس ٹرمینس لین کا پتہ تمہیں کس نے دیا؟"

"میں... میں بس نکل آیا۔" لڑکے نے جواب دیا۔ "کیا اسے ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔ کیا یہ کوچہ خود ہمیں نہیں ڈھونڈ نکالتا؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن میں تمہیں بتاؤں۔" اور اس نے آواز بالکل دھیمی کرلی جیسے اسے کسی سازش میں شریک کررہی ہو۔ "کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ ٹرمینس لین خود میری ایجاد ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ ہر اس آدمی کی ایجاد ہے جو اسے ایجاد کرسکتا ہے۔ اور اگر وہ اسے ایجاد نہیں کرسکتا تو گھبرانے کی ضرورت نہیں، یہ ٹرمینس لین خود اسے ایجاد کرلے گی۔"

پھر لڑکے نے اس کی کمر کے گرد باہیں حمائل کردیں۔ "لیکن میں تمہیں بتا رہا تھا کہ ہمیں وقت کا احترام کرنا چاہئے۔ یوں بھی تمہارے کولہے بہت خوبصورت ہیں۔"

۳۔

بوڑھا چینی جے ہونگ، اس نے اپنے گرمتے سے سر اٹھا کر کھڑکی سے تھوڑا اندر سڑک کے عین بیچ نصب اس بھاری بھرکم چوبی کھونٹے کی طرف دیکھا ہے جسے ایک دوسرا چینی چوب تراش جس کا نام تکاماسا ہے روز بروز تھوڑا تھوڑا تراش رہا ہے، منقش کر رہا ہے، اسے ایک ڈریگن کی شکل دے رہا ہے جو اپنے جبڑوں سے کسی بھی وقت آگ اگل سکتا ہے۔ تکاماسا کو یقین ہے کہ چاند کے تہوار تک پہنچتے پہنچتے وہ اسے مکمل کرلے گا۔ تکاماسا کینٹن کا رہنے والا ہے۔ وہ کربلا روڈ پر ایک فرنیچر کی دکان میں صندل کی الماریوں پر چینی پیکرات منقش کیا کرتا تھا۔ مگر پھر ان قیمتی الماریوں کا دور ختم ہوگیا اور کربلا روڈ کی تمام الماریاں پارک اسٹریٹ کے نیلام گھروں میں رکھ کر بھلا دی گئیں۔ مکڑیوں نے ان پر جالے بن دیئے، کربلا کا نام بدل دیا گیا۔ کچھ برسوں تک تکاماسا ٹنگرا کی مہکتی گلیوں میں سگریٹ پھونکتے ہوئے بےکار گھومتا رہا۔ پھر ایک دن اسے لگا اس کا سر بہت بڑا ہوگیا ہے۔ وہ کئی ہفتوں تک اپنے بڑے سے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ایک بدبودار نالے کے کنارے بیٹھا رہا۔ اس کے لوگوں نے سوچا تکاماسا پاگل ہوگیا ہے۔ وہ اسے ایک دماغی امراض کے ماہر کے پاس لے گئے، جس نے اسے ایک نیورو سرجن کے پاس بھیجا۔ تکاماسا کے بڑے سے سر کو اس سے بھی بڑے، ایک مشین کے نیچے رکھ کر دیکھا گیا اور لوگوں کو اس کے مغز کے اندر ایک بڑی رسولی کے بارے میں پتہ چلا جو ناقابل علاج ہوچکی تھی۔ اس ٹرمینس لین میں تکاماسا کا نام کوئی نہیں جانتا۔ کچھ لوگ اسے پاگل سمجھتے ہیں کیوں کہ اب وہ کسی سے کوئی بات نہیں کرتا، صرف اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھا رہتا ہے یا اپنے کام میں مصروف رہتا ہے، ایک ایسا کام جس کے لئے اسے کسی نے نہیں کہا ہے۔

"یہ گرمتا زہریلا ہے جسے کھا کر تم بیمار پڑسکتی ہو۔" جے ہونگ نے اپنی بیوی سے کہا جو چھوہارے کی طرح سوکھ گئی ہے۔ اس نے لانبا اسکرٹ اور بغیر بٹنوں والی پوری آستین کی قمیص پہن رکھی ہے۔ اس کی قلیل آنکھوں پر ہاتھی دانت کے فریم والی ایک عینک رکھی ہے۔

"کیا ہم بیمار نہیں؟"

"نہیں۔" بوڑھے نے کہا۔ "اس ٹرمینس لین میں کسی قسم کی بیماری کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہاں آنے سے قبل ہم لوگ اپنی تمام بیماریاں پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ تم نہیں دیکھتیں یہاں ڈاکٹروں کی اجازت نہیں ہے۔ ہم اس قید سے آزاد ہوچکے ہیں۔"

"اور یہ پابندیاں ہم پر کوئی عائد نہیں کرتا۔" بوڑھی عورت ملوث ڈھنگ سے مسکراتی ہے۔ "دونوں چینی میں باتیں کر رہے ہیں۔ شاید اسے پتہ ہے۔ "اگرچہ اس کے باوجود ہم ان پابندیوں کو قبول نہ کریں تو خود اپنے سمجھوتے کے تحت خود کو اس کوچے سے باہر پائیں گے، تم یہی کہو گے نا؟"

"میں کچھ بھی نہیں کہتا۔" بوڑھے نے کہا۔ "میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ لڑکی نہ صرف معصوم ہے بلکہ اس کے لئے بالکل انجانی ہے اور اس لڑکے کو کیپ استعمال کرنا چاہیے۔"

"تو اپنے گرمتے کو زہریلا کہنے سے تمہارا مطلب یہ ہے۔ کیا اس ٹرمینس لین میں اس طرح کی حفاظتوں کی ضرورت ہے؟" بوڑھی عورت نے بانس سے کچھ گرمتے ان کے تنوں سمیت اکھاڑ کر انھیں زمین پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ تمام زہریلے ہوچکے ہیں؟"

"باقی کے بارے میں مجھے تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔ گرمتے اپنی پوری شکل میں تو آجائیں۔ لیکن کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، اگر پوری زمین ہی زہریلی ہوچکی ہو تو..."

پھر...

۴۔

آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس ٹرمینس لین میں کہانیاں اپنے ڈھنگ سے بنتی ہیں۔ بالکل دھیرے دھیرے، جیسے زندگی واپس پرانے دنوں کو دہرا رہی ہو۔ کتنا کچھ ہوتا ہے پانے کے لئے جنھیں ہم اس وقت کوئی وقعت نہیں دیتے اور وہ ہماری لاعلمی میں گذر جاتے ہیں۔ پھر ہم مڑ کر دیکھتے ہیں اور ہمیں صرف ریت پر ان کے گذر جانے کا نشان دکھائی دیتا ہے جو زیادہ دنوں تک قائم بھی نہیں رہتا۔ پھر اچانک ہم دیکھتے ہیں ہم نے جیسے تیسے ایک صحرا کو پار کرلیا ہے اور اب ہمارے سامنے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ مگر اس سمندر سے گذرنے کے لئے ہمارے پاس کیا ہوتا ہے، صرف گذرے ہوئے لمحوں کے فرعون جو ہمارا پیچھا کرتے ہیں اور ہمیں زیر کرلیتے ہیں اور واپس اس صحرا میں لے آتے ہیں جس سے ہم جیسے تیسے نکل بھاگے تھے۔ اور ایک دن ہمیں پتہ چلتا ہے یہ ٹرمینس لین اس صحرا میں ایک ٹھنڈے پانی کے چشمے اور خمیدہ پیڑوں والے نخلستان کی طرح اگ آیا ہے۔ آپ مسکرا رہے ہیں۔ شاید میں نے آپ کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے۔ آہ، جب شروعات ہو ہی گئی ہے تو آیئے ہم آپ کو اس ٹرمینس لین کی سیر کرائیں۔ اس کی حدود اربعہ کو آپ ذہن نشین کرلیں، گرچہ یہ حدبندیاں اتنی سختی سے قائم رہنے والی چیزیں بھی نہیں، کیوں کہ ان پر کسی بین الاقوامی سمجھوتے کے تحت ریزر کے تار نہیں لگائے گئے ہیں۔ دراصل یہاں سب کچھ آپ پر منحصر کرتا ہے۔ تو آپ کا پہلا قدم

اس ٹرمینس لین کے اندر بھی ہے اور باہر بھی اور آپ جس تیزی سے چلتے ہیں اتنی ہی تیزی سے قدم واپس بھی لیتے رہتے ہیں۔ یہ سفر اور قیام کا ایک انوکھا تجربہ ہے جو صرف اس جگہ اس ٹرمینس لین میں ممکن ہے۔ اور یہ گھر، ان کے دریچے، یہ خوشنما ٹائل کے چھپر، یہ کھمبے یہ پیڑ، یہ چینی، یہ سائیکل دوڑاتے ہوئے بچے، آپ ان کے توسط سے خود تک پہنچتے ہیں۔ صرف آپ کو چند اصولوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اور یہ سارے اصول وضوابط آپ کے بنائے ہوتے ہیں۔ مگر میں آپ کو بتادوں، آپ ان اصولوں سے تجاوز کرنا چاہیں تو اس کی بھی آپ کو اجازت ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، یہ ٹرمینس لین آپ کو صحیح آزادی دیتی ہے۔ آپ کو اس کی حفاظت کرنی چاہئے۔

اس ٹرمینس لین کی ایک لمبی کہانی ہے۔ ایک بہت ہی انوکھی کہانی جو ہمیں پریوں کے دیس میں لے جاتی ہے۔ کیا آپ اس کے لئے پیٹر پین (Peter Pan) کی طرح اڑنے کے لئے تیار ہیں؟ مگر ٹھہرئیے، میں نے آج تک یہ کہانی خود سے بھی بچا رکھی ہے۔ مجھ سے کہا گیا ہے یہ کہانی صرف ایک بار سنائی جاسکتی ہے، جس کے بعد یہ حقیقت میں بدل جاتی ہے، حقیقت جو انسان کے کسی کام کی نہیں ہوتی، صرف درد سر پیدا کرتی ہے۔ اسی لئے میں اپنے مہمانوں سے استدعا کرتا ہوں، خوشامد کرتا ہوں کہ وہ اس کہانی کے لئے ضد نہ کریں۔ شاید اس کے بعد یہ ٹرمینس لین نہ رہے، اور یہ زمین خدا کی بنائی ہوئی یہ زمین آہوں اور فریادوں سے ڈھک جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میرے مسئلے کو سمجھا ہے۔ اس کے عوض میں آپ کو اس ٹرمینس لین میں ایک خاص دن ودیعت کرتا ہوں جس کی صرف مجھے اجازت ہے۔ اور اس خاص دن کا انتخاب آپ کریں گے۔ تو ہم نے ٹرمینس لین کا یہ پہلا مسئلہ حل کرلیا ہے۔ کہانی نہ سننے کا۔ اور اس ٹرمینس لین میں دوسرا قدم؟ آہ یہ تو پہلے سے بھی زیادہ اہم ہے، جب ساری کنجیاں آپ کے قدموں میں ڈھیر کردی جاتی ہیں۔ اور یہ وہ کنجیاں ہیں جن سے ہر وہ دروازہ آپ کھول سکتے ہیں جن سے ساری عمر آپ گذرنے کے لئے ترستے رہے، ہر وہ قفل کھول سکتے ہیں جنھوں نے آپ کو پنجڑا در پنجڑا قید رکھا۔ ان ساری کنجیوں کو سینے سے لگا کر آپ کس قدر خوش ہیں۔ آپ کا کمزور سینہ کانپ رہا ہے۔ آپ اس لوہے کے بینچ پر بیٹھ جائیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کبھی آپ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی خوش نہیں تھے اور آج کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی آپ کی آنکھوں میں خوشیوں کے موتی لرز رہے ہیں۔

۵۔

خاکروب ابھی ابھی اپنے گھر سے باہر آیا ہے۔ وہ زہریلے لگرمتے اس کے دماغ میں چبھ رہے ہیں۔ خاکروب نے ایک مانگی ہوئی پتلون اور کرتا پہن رکھا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بانس کے تنکوں کا جھاڑو ہے جو ایک ڈنڈے سے بندھا ہے۔ وہ لگرمتے کو جھاڑو لگاتا ہوا کوڑادان تک لے جاتا ہے جسے اس نے اپنے ساتھ اس ٹرمینس لین میں لایا ہوا ہے۔ مگر آخر میں اسے پتہ چلتا ہے کہ لگرمتے تو چور چور ہو کر زمین سے کب کے مل چکے ہیں۔ خاکروب کے حلق میں سوراخ ہے۔ وہ اپنی آواز کھو چکا ہے اور اب صرف اپنے دونوں کان اور جسمانی ردعمل کے ذریعے اس دنیا سے وابستہ ہے۔ وہ کوڑے دان کی کنکریٹ کی دیوار سے پیٹھ لگائے سرخ آسمان کی طرف تکتا رہتا ہے جس سے ایک جیٹ ہوئی جہاز اپنا دودھاری دھواں چھوڑتا ہوا گذر رہا ہے جو دھیرے دھیرے زائل ہوتا جارہا ہے۔ اسے اس پر حیرت ہوتی ہے کہ آسمان ہر بار کس تیزی سے اپنی گندگی خود بخود صاف کرلیتا ہے جب کہ انسانوں کو زمین پر اتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اسے ریٹائرڈ کرنل کی وردی نظر آتی ہے جس کے بٹن چیتل کے ہیں۔ کرنل کی موچھوں کا ہر بال باغیانہ لہجے میں ہر سمت نکلا ہوا ہے۔ اس کی صفاچٹ داڑھی کو دیکھ کر خاکروب مسکراتا ہے۔ بیچارا کرنل خود اپنا خاکروب ہے۔

"برف باری کے موسم میں ایک بار ایسا ہوا کہ دشمنوں کا دور دور تک پتہ نہ تھا اور ہمارے صرف تین خیمے رہ گئے۔ مگر ہمیں پیچھے ہٹنے کا حکم نہیں تھا۔ شاید ہماری علامتی موجودگی وہاں ضروری سمجھی گئی تھی۔" ہر بار کی طرح کرنل نے اسے بتانا شروع کیا، اس بات سے لاپروا کہ خاکروب کو اس سے دلچسپی ہے کہ نہیں۔ "مہینے میں دوبار ہیلی کاپٹر رسد کا سامان، خوردنی اشیا، مشروبات، بیڑی اور گیس سلنڈر دے جایا کرتا۔ ایک بار ٹھنڈ سے ہمارا ایک ساتھی مرگیا۔ مگر اس بار برف کا طوفان اتنا شدید رہا کہ وہاں تک کوئی ہیلی کاپٹر آنہ پایا۔ ہم اس کی لاش کو اس کے کیمپ کی چارپائی پر رکھے اس کا انتظار کرتے رہے۔ اس کا چہرہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہر تیسرے دن اس کا شیو بڑھ جاتا اور ہمیں گرم پانی سے اس کا شیو بنانا پڑتا۔ ہم کھانا کھاتے، شیو بناتے، ریڈیو پر گیت سنتے اور اپنی تنہائی کو آسان بنانے کے لئے ایک دوسرے کو لطیفے سناتے رہتے اس شرط کے ساتھ کہ کسی نے ہنسنے میں کنجوسی کی تو اگلے دن سنانے والے کے حصے کا پورا کام اسے کرنا پڑے گا۔ اور اس پورے عرصے میں وہ مرا ہوا ساتھی ہمارے درمیان آنکھیں کھولے پڑا تھا۔ کبھی کبھی تو ہمیں اس پر حیرت ہوتی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ کیوں نہیں جاتا۔ مگر ہم نے پورا خیال رکھا تھا کہ تابوت میں اس کی لاش ڈالنے سے قبل اس کے بال اور اس کے ہاتھ اور پیر کے ناخنوں کو جو اس پورے عرصے میں کہیں زیادہ تیزی سے بڑھ چکے تھے تراش دیں۔

"وہ مرگیا ہوگا۔" خاکروب کی آواز سنے بغیر بھی کرنل کو اس ردعمل کا پتہ تھا۔

"کیا پاگلوں جیسی باتیں کررہا ہے خاکروب۔" کرنل بھڑک اٹھا۔ "اتنی ٹھنڈ اور برف باری میں؟ ارے تمہارا تو پیشاب تک فق کے اندر برف بن جاتا۔"

"آہ، مجھے کیا پتہ۔" خاکروب نے نہ سنائی دینے والی آواز میں کہا۔

"میں تو ساری زندگی شہر میں اور اب اس گلی میں جھاڑو لگاتا رہا جہاں جاڑے میں بھی دھوپ کبھی کبھی اتنی گرم ہوجاتی ہے کہ لوگوں کے پسینہ آجاتا ہے۔ میں برف کے بارے میں کیا جانوں۔"

۶۔

ٹرمینس لین میں کبھی کبھی دن کافی روشن اترتا ہے جب ایک شخص کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کی جاتی ہیں اور اس کے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ اور یہ تو ایک بہت ہی خاص دن ہے۔ میگھ مالا کی بند مٹھی ایک پیلا گلاب تھامے ہوئے ہے اور اس کی بند آنکھوں میں ایک دائمی مسکراہٹ کا گلاب ہے۔ اس کا عاشق وہاں نہیں ہے۔ کسی نے اس کے لئے نہیں سوچا ہے۔ ٹرمینس لین کے لئے یہ ایک خاص دن ہے۔ بوڑھی چینی عورت جھک کر اپنا ٹھنڈا ہاتھ اس کے

سر پر رکھتی ہے۔ بوڑھا ایک گگرمتا جو بہت بڑی جسامت کا ہے اور ارغوانی رنگ لئے ہوئے ہے، اس کے پائینتی رکھ دیتا ہے۔

"قسمت ہر انسان کو ایک ہی سمت لے جاتی ہے۔" وہ چینی میں کہتا ہے۔ "ہمیں اس سے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں۔"

جے ہونگ اور اس کی بیوی سو یانگ کی کہانی بہت اہم ہے۔ کلکتہ کے چائنا ٹاؤن میں ایک تنگ سڑک پر جہاں سے ہر دس منٹ پر ایک بوسیدہ ٹرام گذرتی ہے ان کے جوتے کی ایک بڑی دکان اور ورک شاپ ہے۔ سات برس قبل جب جے ہونگ پر دل کا دورہ پڑا تو ڈاکٹروں نے اسے انجیو پلاسٹی کا مشورہ دیا۔ بیلون کے ذریعے اس کے دل کی گرہیں کھول دی گئیں۔ پھر اس کے چھ ماہ کے اندر اندر اس کی بیوی پر دل کا حملہ ہوا۔ پہلے ڈاکٹروں نے اوپن ہارٹ سرجری کے لئے کہا۔ پھر انھوں نے اسے غیر محفوظ پا کر کلوزڈ ہارٹ سرجری کے بارے میں سوچا، پھر انھوں نے یہ ارادہ بھی ترک کر دیا۔ جے ہونگ نے اپنے کمزور دل کے ساتھ اپنے آباؤ اجداد کی روحوں کے سامنے گھٹنے ٹیک کر لوبان جلائے، اگر بتیاں روشن کیں، اپنی بیوی کی زندگی کے لئے دعائیں مانگیں۔ دو سال تک دونوں ایک دوسرے کی محبت کے سہارے جیتے رہے۔ پھر وہ ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لئے گئے تو ڈاکٹر نے مایوسی سے سر ہلایا۔ انھوں نے ایک کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں سات سمندر پار کے کچھ ٹرنک کال بھی شامل تھے اور آخر کار اعلان کیا، چلتے رہو، اب یہی علاج رہ گیا ہے۔ جے ہونگ جوڑا بے اولاد ہے۔ ان کی دکان اور ورک شاپ اب اس کے آباؤ اجداد کی روحیں چلاتی ہیں جس نے ایک چڑچڑے بنگالی منیجر کی شکل دھار رکھی ہے، جس کی عینک کے شیشے دھندلے پڑ گئے ہیں اور جو گاہکوں کو دیکھتے ہی اپنی تیوری چڑھا لیتا ہے اور اس دکان اور ورک شاپ کو دھیرے دھیرے تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ ٹرمینس لین میں اس طرح کی کہانیاں عام ہیں۔ مگر عالی جناب کیا اس سے کچھ فرق پڑتا ہے ان کو جو اس کوچے میں آتے ہیں یا ان کو جنھیں وہ پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔ شاید یہی چیزیں ہیں جو جے ہونگ جیسے لوگوں کی کہانی کو اہم بناتی ہیں۔

جے ہونگ کہاں رہتے ہیں؟ آپ بھی جاننا چاہتے ہیں نہ؟ چینی اپنے مکانوں کو بہت ہی بھڑکیلے رنگوں سے رنگتے ہیں، آپ سوچ رہے ہوں گے۔ شاید آپ کو بھی یہ تجسس ستا رہا ہو کہ اس ٹرمینس لین میں آپ کا ٹھکانا کہاں ہے، یا خود میں کدھر سے نمودار ہوتا ہوں۔ آہ، میں یہ تو بتانا بھول گیا کہ ٹرمینس لین کا چہرہ ہر روز بلکہ ہر پل بدلتا رہتا ہے۔ اس میں نئے نئے دریچے کھلتے ہیں، دروازے نمودار ہوتے ہیں، روشندان جاگتے ہیں، معدوم ہوتے رہتے ہیں، غائب ہوتے جاتے ہیں، پھر سے نظر آنے لگتے ہیں۔ ان گھروں کے اوپر کا آسمان بھی بدلتا رہتا ہے۔ چاند اور تارے، صرف وہ نہیں بدلتے۔ شاید اس لئے کہ ہم ان کے ٹائم اسکیل پر ٹھیک نہیں بیٹھتے، یا شاید وہ آخری جگہ ہے جہاں ہر شے کو ہر انسان کو اپنی آخری شکل میں لوٹنا پڑتا ہے، اس لئے ان کا دائمی طور پر بنے رہنا لازمی ہے۔ آپ ایک آرام کرسی کو دریچے کے سامنے کھینچ کر گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں۔ مگر ان کا سفر اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ آپ کے کمرے کی دیواروں پر سائے رینگتے ہیں، ہوا ایک آدھ پتے اڑا کر دریچے کے مستطیل خلا سے گذر جاتی ہے۔ ایک دو قدموں کی چاپ، ایک آدھ پرندے کی پکار، کسی سائیکل کی ٹن ٹن، کتنا کچھ ہے آپ کے پاس اور سب سے اہم بات یہ کہ یہ گھونسلہ خود آپ کا بنایا ہوا ہے۔ تنکا تنکا، اور آپ اپنی دسوں انگلیوں کو آپس میں باندھ کر انھیں سر کی پشت پر لے جاتے ہیں اور ایک لذیذ ٹھنڈی سانس بھر کر سوچتے ہیں، ٹرمینس لین، آہ، ساری عمر میں تو اسی کا خواب دیکھتا رہا۔

۷۔

ٹرمینس لین کی ہزاروں کہانیوں میں ایک کہانی میری بھی ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ ایک آواز کی شکل میں میں اس کوچے میں اس سے پہلے سے موجود ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا اس ٹرمینس لین کے بغیر ہمارا وجود ممکن ہے؟ یہ تو اگر آپ آسمانی صحیفوں میں یقین رکھتے ہیں تو یہ ٹرمینس لین آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارے جانے سے قبل موجود تھی اور اس کا انتظار کر رہی تھی بلکہ میرا خیال ہے کہ آدم حوا کی تخلیق بھی اسی کے سبب ہوئی تھی۔ کیا حوا صرف جنت کے لئے بنائی گئی تھیں؟ پھر انھیں رحم مادر سے کیوں نوازا گیا؟ تو آپ دیکھ رہے ہیں اس ٹرمینس لین کے وجود و عدم کا سوال ہی غلط ہے۔ ہمیں ان افواہوں پر دھیان نہیں دینا چاہئے۔ صرف کچھ لوگ ادھر سے گذرے اور انھوں نے اسے نظر انداز کر دیا اور کچھ لوگوں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا اور دروازے دریچے، آسمان، پیڑ، پرندے، پہیے سب اپنی جگہ نظر آنے لگے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، یہاں جو کچھ بھی ہے وہ ہماری ذات کے بغیر ممکن نہیں بلکہ شاید خود اس کی اضافی شکلیں ہیں، آپ اپنی شخصیت کو واپس سمیٹ لیں ٹرمینس لین کہیں دکھائی نہ دے گی۔ تو آئیے، ہم ہاتھ پر ہاتھ ڈال کر ایک لمحہ کے لئے سوچیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس ٹرمینس لین کے دن رات ہماری زندگی سے الگ کر دیئے جائیں؟ کیا یہ ایک انتہائی احمقانہ تصور نہیں ہے؟ کیا اس کے بعد بھی کسی قسم کے سوالات کے لئے کسی طرح کی گنجائش رہ جاتی ہے؟

مگر اس ٹرمینس لین کو آپ ہمیشہ محفوظ نہ سمجھیں۔ اکثر نقاب پوش ڈاکٹر زہریلے انجکشن اٹھائے یا خدائی فوجدار جو انسانی اذیت کو جنت جانے کا واحد وسیلہ قرار دیتے ہیں، یا کم ظرف سیاست دان اور بے حس سرکاری عملے جو آپ کے زیر جاموں تک کے لئے قانون بنانے سے نہیں جھجکتے، انھوں نے اس ٹرمینس لین کے خلاف ایک سازش، ایک جہاد، ایک دھرم یدھ کا اعلان کر دیا تھا، اور وہ آج بھی اپنی کوشش میں مصروف ہیں۔ ان دنوں ہم لوگ اس کوچے میں کتنے اکیلے تھے۔ ڈرے سہمے، اپنے سائے سے ہراساں، اور یہ وہ وقت تھا جب ہمیں اپنے چاروں طرف موت اور زندگی کے فرشتے متصادم نظر آتے۔ بچوں نے سائیکل چلانا چھوڑ دیا تھا اور چینی جوتا ساز کے گگرمتے اگنا بند ہو گئے تھے یا ایک خاص دن تک سارے کے سارے زہریلے ہو جاتے۔ کئی دریچے تو خود بخود مندمل ہو گئے اور کئی دروازوں کے قبضے پگھل کر دائمی طور پر منجمد ہو گئے۔ ان دنوں سورج کتنے کم وقت کے لئے نکلتا، یا کتنے زیادہ وقت کے لئے، کتنے عجیب سے پرندے تھے جو نہیں پر نظر آتے اور بے جان ہو کر ٹپکتے رہتے اور بیچارا خاکروب ٹرمینس لین کو ان منحنی

جسموں سے صاف کرتے کرتے تھک جاتا۔ مجھے یاد ہے میگھ مالا کا عاشق پیلے گلاب کے لئے مارا مارا پھرتا، مگر پھولوں میں اب وہ رنگ کہاں تھے۔ لیکن ایک دن وہ سب کچھ ٹھیک ہوگیا۔ نقاب پوش کا نقاب اتار دیا گیا اور خدائی فوجدار کسی دوسری سمت مڑ گئے اور سیاست دان اور سرکاری عملے، ان کا وقت گذر گیا، یا شاید انھوں نے اس ٹرمینس لین کے باہر انسانوں کو زدوکوب کرنے کے نئے راستے دریافت کر لئے۔ اور آج ہم اس لائق ہیں کہ اس ٹرمینس لین میں کھلی باہوں کا استعمال کریں اور کہہ سکیں، خوش آمدید۔ یہ ٹرمینس لین آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہے۔ اب آپ آخری سانس تک ہمارے مہمان ہوں گے۔ ایک خاص مہمان جسے دھیرے دھیرے اس کے آخری لمحے کے لئے تیار کیا جائے گا۔

۸۔

ایک کہانی نٹ کی بھی ہے۔ نٹ ایک تیس سال کا آدمی ہے، جسے نیکر اور ہاف پینٹ پہنا کر، بالوں کو چھوٹا چھوٹا تراش کر، اس کے کوتاہ قد کا فائدہ اٹھا کر ایک لڑکا بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ سب کو اس کا پتہ ہے کہ نٹ بچہ نہیں ہے۔ وہ تو نٹ بھی نہیں ہے۔ نٹ تماشا دکھا کر آخر میں زمین پر اتر آتے ہیں۔ یہ نٹ تو جب دکھائی دیتا ہے رسی پر ہی دکھائی دیتا ہے، ایک بانس اٹھائے، اس کے سہارے اپنا توازن برقرار رکھے ہوئے۔ اس کے لئے کوئی مداری ڈھولک تک نہیں بجاتا وہ ہمیشہ بجا کر جا چکا ہوتا ہے۔ زیادہ تر بچے اس کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اس پر نظر ڈالے بغیر اپنی سائیکلوں پر گذر جاتے ہیں۔ نٹ کے وارد ہونے کے بعد بہت سے گھروں سے رسیاں خود بخود تن گئی تھیں۔ شاید لوگ نہیں چاہتے تھے کہ وہ زمین پر اترے۔ دراصل نٹ نے ایک بچی کی عصمت دری کی تھی اور پھر اس کا خون کر دیا تھا۔ اس کی سزائے موت کی سپریم کورٹ نے توثیق کر دی ہے۔ اب اس کے لئے رحم کی درخواست عزت مآب صدر مملکت کے حضور پیش ہے۔ اس معاملے کو ہیومن رائٹس والوں نے اپنے ذمے لے رکھا ہے جو اصولی طور پر سزائے موت کے خلاف ہیں۔ شاید یہ قانونی طور پر بھی ہے کہ اسے زمین پر اترنے کی اجازت نہیں، اور جہاں تک قوانین کا تعلق ہے، ٹرمینس لین ان کا پورا پورا احترام کرتی ہے۔ ظاہر ہے اب نٹ رسی پر ہی اپنی زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔ اور مداری جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہمیشہ اس کے لئے ڈھولک بجا کر جا چکا ہوتا ہے اس لئے وہ کبھی نظر نہیں آتا۔ بلکہ اب یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اس انتظام سے نٹ خود بھی مطمئن ہے۔ کسی کو اس کا علم نہیں کہ رسی پر چلتے چلتے اس نے آسمان میں کچھ نئے ستارے ڈھونڈ نکالے ہیں جو ایک عام آدمی کو نظر نہیں آتے، جو مغرب سے مشرق کی بجائے، جیسا کہ خاک زادوں کو عام طور پر چلتا دیکھنے کی عادت ہوتی ہے، مشرق سے مغرب کی طرف سفر کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ گھنٹوں ان نئے ستاروں کے طلسم میں گرفتار رہتا ہے۔ اس وقت اسے توازن کے لئے بانس کی ضرورت نہیں ہوتی، جیسے ان سیارگان فلک کی کشش نے اسے رسی پر پوری طرح سنبھال رکھا ہو۔ نٹ کے لئے ایک دن معین ہے، جس طرح ہر شخص کے لئے ایک دن معین ہے۔ مگر نٹ اس سلسلے میں زیادہ خوش نصیب ہے کہ نٹ کے شانوں پر اس دن ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ وہ کام ہے جسے بہت سارے لوگوں نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ مجسٹریٹ، جیلر، عدالت، ڈاکٹر، پروہت، ہیومن رائٹس کے لوگ، ٹی وی اور اخبارات کے رپورٹر، ور مبصران۔ نٹ تو ان فکروں سے پوری طرح آزاد ہے۔ یہ لوگ اس خاص دن کی تیاری میں مصروف ہیں اور اس کے لئے جواب دہ ہیں۔ نٹ جب رسی پر چلتے چلتے تھک جاتا ہے تو بانس کو زمین پر ٹکا کر اپنے آپ کو بھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس خود فریبی کے لئے ٹرمینس لین میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ٹرمینس لین میں ہر طرح کے فریب سے احتراز کیا جاتا ہے۔ یہاں ہر انسان اپنے اندر سے ابھرتا ہے اور واپس اپنی ذات کے اندر لوٹتا ہے۔ اور خدا، اسے تو ٹرمینس لین کے باہر کے لوگوں کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔

''آپ میرا کھیل دیکھنے کے لئے یہاں کھڑے ہیں۔'' نٹ تماشائیوں سے کہتا ہے جو نیچے سڑک اور فٹ پاتھ پر بکھرے ہوئے ہیں۔ ''مگر آپ بہت جلد اکتا جائیں گے، شریمان حضور مائی باپ حکم، اور پھر یہ بھی ہے کہ منھ کا مزا بدلنے کے لئے آپ کو ایک نئے تماشے کی ضرورت ہوگی۔ مگر میرے پاس صرف ایک تماشا ہے اور یہ بھی ہے کہ دیکھتے دیکھتے میں یہاں سے جا چکا ہوں گا۔''

لوگوں کے پاس زیادہ تر اس کی باتوں کے لئے وقت نہیں ہوتا نہ اس کے تماشے کے لئے۔ وہ تو اسے دیکھنے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اب وہ انھیں نظر بھی نہیں آتا۔ بس ایک رسی کو وہ لوگ آسمان پر لکیر کھینچتے دیکھتے ہیں جو کبھی کبھار ایک دراڑ کی شکل اختیار کر لیتی ہے، ایک پتلی سی دراڑ جو بہت زیادہ صاف بھی نظر نہیں آتی ہے مگر پھر بھی سارا آسمان دو حصوں میں منقسم نظر آتا ہے جیسے یہ دونوں حصے کسی بھی وقت سر پر آن گریں گے۔

''شاید ابھی میرے کھیل کا وقت نہیں آیا۔'' نٹ مایوسی سے سوچ رہا ہے۔ ''میں ہمیشہ وقت سے پہلے آجاتا ہوں یا وقت کے بعد پہنچتا ہوں۔ میں اس بدنصیبی کے ساتھ جی رہا ہوں اور اسی کے ساتھ مرجاؤں گا۔ اس بچی کی طرح جس کا گلا میں خوف کے عالم میں دیر تک دباتا رہا دباتا رہا اس کے باوجود کہ وہ بہت پہلے مر چکی تھی۔''

نٹ، ابھی اس کے بارے میں سوچنا بیکار ہے۔ ابھی تو اس نے اپنے آخری کھیل کا اعلان بھی نہیں کیا ہے۔

۹۔

اس ٹرمینس لین میں نیشنل انسانی حقوق کمیشن کی طرف سے ایک وفد آیا ہوا ہے جو تمام کے تمام حساس مگر ناکامیاب سیاست دان، عمر دراز وکیل، بوڑھے دانش وروں، مذہبی رہنماؤں، جن کا خدا ہمیشہ الٹا پڑا ہوتا ہے اور ڈاکٹروں پر مشتمل ہے جنھیں لوگ صرف اس کے لئے جانتے ہیں۔ یہ دل کے اچھے لوگ ہیں جو کبھی کبھار اپنی لاعلمی میں برے لوگوں کے ذریعے استعمال کر لئے جاتے ہیں، کبھی واقعی کسی نیک مقصد کے لئے کبھی محض دنیا کو فریب دینے کے لئے۔ ٹرمینس لین میں لوگ ان سے لاپروا اپنے روز مرہ کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ خود میں اپنی وکٹوریہ کے پہیوں کی مرمت کرتا رہتا ہوں یا گھوڑوں کے ساز میں نئی زریاں اور موتیاں پروتا رہتا ہوں۔ ابھی فی الحال میں پٹرولیم کی چکنائی انگلیوں میں لپیٹ کر

پہیوں کے بال بیئرنگ پر ڈال رہا ہوں، پہیے کو چکر دے رہا ہوں جب کہ گھوڑے زمین پر پڑی ہوئی گھاس کے ڈھیر پر منھ مار رہے ہیں۔ میں نے ابھی ابھی ایک دوست کو پبلک ٹیلی فون بوتھ سے فون کیا ہے۔ مجھے اس کے پیسے لوٹانے ہیں جنھیں میں نے ایک سیف میں ڈال رکھا ہے جو دیوار میں چنا ہوا ہے۔

"پیسے میرے پاس زیادہ دنوں تک نہیں رہتے، وہ پر لگا کر اڑ جاتے ہیں۔" میں فون میں کہتا ہوں۔ "تم دیر نہ کرنا ورنہ خالی ہاتھ لوٹنا پڑے گا۔"

خالی ہاتھ، وہ میرا دوست کبھی اپنا پیسہ لینے نہیں آتا۔ مجھے یاد ہے میں اس وکٹوریہ کا کتنا شوقین تھا۔ اس کے لئے میں نے جانے کتنی رقم اکٹھی کی ہوگی اور اسے گھوڑے کی لید اور باسی چارے سے مہکتے ہوئے ایک گلی کے نکڑ سے خریدا تھا جہاں کے مکانوں کی کھڑکیاں سب کی سب چوکور اور سرخ تھیں اور جہاں بوڑھے گھوڑے ایک بڑے سے بیف ریستوران کے باہر آنکھوں پر پٹیاں باندھے، ساز پہنے کھڑے رہتے کیوں کہ انھیں ہمیشہ کسی برات یا سیر کے شوقین کسی سیلانی یا کسی پیشہ ور فوٹو گرافر کے لئے تیار رکھا جاتا۔ میں نے اس وکٹوریہ پر کافی خرچ کیا ہے، ریس کورس سے اس کے لئے دو گھوڑے خریدے ہیں جو ریس کے لئے اب غیر کارآمد قرار دیئے گئے ہیں۔ کوچوان بوڑھا ہے اور اس کا حلقوم غیر فطری طور پر کام کرتا ہے۔ اس کے نتھنوں سے بال تنکوں کی طرح باہر نکلے ہوئے ہیں جن کی نوکوں پر رطوبت کے ننھے گیند چمکتے ہیں۔ اس کی آنکھوں پر ایک دبیز عینک والا چشمہ چڑھا ہوا ہے جس کے شیشوں پر اس کے بالوں سے خشکی گرتی رہتی ہے۔ اس شہر کی کثافت کے سبب اس کی آنکھیں دائمی طور پر دھندلی ہو چکی ہیں۔ وہ وکٹوریہ میں اپنی اونچی جگہ پر بیٹھا چابک سنکتا رہتا ہے اور گھوڑوں کے نعل ٹرام کی پٹریوں کی اینٹوں سے ٹکراتے ہوئے چنگاریاں چھوڑتے رہتے ہیں۔ مگر گھوڑے اپنی تمام تر تیز رفتاری کے باوجود ٹرمینس لین کی حدود اربعہ سے باہر نہیں جا پاتے۔ ان معنوں میں نہیں کہ آپ وکٹوریا کے پہیوں کو ٹرمینس لین سے باہر نہیں دیکھتے۔ دراصل یہ ٹرمینس لین وکٹوریہ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی رہتی ہے، پھیلتی رہتی ہے، واپس سمٹتی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ اس پر سوار دنیا کے کسی بھی گوشے سے گذریں ہمیشہ خود کو اس ٹرمینس لین کے اندر پاتے ہیں۔ یہ گھوڑے جانے کتنے افق سے گذر جاتے ہیں، کتنے آسمان اس کے راستے میں حائل ہو جاتے ہیں، کتنے ستارے ان کی ٹاپوں سے بکھرتے رہتے ہیں مگر وہ ہمیشہ اس ٹرمینس لین کے اندر ہی نظر آتے ہیں۔

"کیا یہاں لوگ اپنی مرضی سے... میرا مطلب ہے کیا یہاں جینا آسان ہے اور لوگوں کو ہر طرح کی آزادی میسر ہے۔" وفد کا چیئرمین پوچھتا ہے۔ وہ ایک بھاری چہرے والا آدمی ہے جو ایک ناواجب دنیا کا بوجھ اپنے ضمیر پر اٹھائے ہوئے ہے۔ "ٹرمینس لین کے خلاف آس پاس کے علاقوں سے بہت ساری شکایتیں آئی ہیں جنھیں ہوم منسٹری نے ہمارے حوالے کیا ہے۔ انھیں شبہ ہے کہ یہاں معاملہ قدرے پیچیدہ ہے اور بہت سے سوالات ابھی تک تشنہ ہیں۔"

"لوگوں کو ہمیشہ جلدی ہوتی ہے۔" میں کہتا ہوں۔ "اور اس ٹرمینس لین میں جو کچھ بھی ہے یا اس کی جو بھی صدائیں ہیں یہ اس کی اپنی ہیں۔ آپ انھیں ریکارڈ کر سکتے ہیں۔ یہ تو کسی بھی طرح باہر کی دنیا سے تجاوز نہیں کرتیں۔ مگر ممکن ہے کہ چونکہ ایک بلیک ہول کی طرح اس ٹرمینس لین کے اندر لوگ تو رہے ہیں مگر انھیں واپس لوٹتے ہوئے کوئی نہیں دیکھ پاتا، یہ دیکھنے والوں کے اندر شبہات پیدا کرتے ہیں۔ اور وہ انگلیاں اٹھا کر کہتے ہیں، وہ رہی ٹرمینس لین، اسے تلاش کرو، اس کے خط و خال واضح کرو۔ مگر ٹرمینس لین تو اپنی جگہ موجود ہے اور جناب چیئرمین اور وفد کے دوسرے معزز ممبران، اس ٹرمینس لین میں آپ کا استقبال کرتے ہوئے ہمیں انتہائی شادمانی اور ایک لامحدود طمانیت کا احساس ہو رہا ہے۔ یہاں ایک رستوران بھی ہے جہاں دبیز پردوں پر زمانہ قدیم کی تصویریں کشیدہ ہیں۔ ہم اس رستوران کے داخلے پر آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اس رستوران میں کوئل کا گوشت کافی لذیذ بنتا ہے اور یہاں ویٹر ٹپ قبول نہیں کرتے۔ یہاں ٹرمینس لین کے باشندوں کے لئے میزیں مخصوص ہیں اور ویٹر کو پتہ ہے وہ دو ایک جام کے بعد ہی لڑھک جائیں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، اس ٹرمینس لین میں اپنے انداز سے سب کچھ پیش آتا ہے۔

"جناب چیئرمین، میں نے ایک بار ایک باربر کو اس ٹرمینس لین کے بارے میں بتانے کی کوشش کی جو میرے بال تراش رہا تھا۔ وہ ایک بوڑھا شخص ہے جس کی دونوں آنکھیں ایک دوسرے کو تاکتی ہیں۔ جب اس نے اس ٹرمینس لین میں اپنا بہت ہی کامیاب کاروبار سجایا تو کسی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی حجامت کی دکان کے سامنے ایک لکڑی کا کھونٹا گاڑ دے جو لوگوں کی رہنمائی اس کی دکان تک کرے۔ اور آپ یقین نہیں کریں گے، یہ دیو قد چوبی کھونٹا جو دراصل ایک قدیم پیڑ کا بدنما گانٹھوں سے ڈھکا ہوا شہتیر تھا دھیرے دھیرے اس ٹرمینس لین کا مرکز بنتا گیا اس کے باوجود کہ یہ اس کی سرحد پر نکڑ سے تھوڑا ہی اندر استادہ ہے۔ اب میرا کوچوان میری وکٹوریہ اس کھونٹے سے موڑتا ہے جیسے وہ کوئی ٹریفک آئی لینڈ ہو، نٹ اس کھونٹے سے تھوڑا اوپر ری پر کھڑا رہتا ہے اور اپنا زیادہ وقت اسی کے آس پاس گذارتا ہے۔ چوب تراش تکاما سانے، جس کے اندر کا فنکار اس ٹرمینس لین کے اندر آ کر پھر سے زندہ ہو گیا ہے، اس کو تراش کر اس سے ایک ڈراگن کا سر اور دھڑ نکالنا شروع کر دیا ہے۔ اس کھونٹے کی اب اپنی ایک الگ شناخت ہے، ایک الگ شخصیت ہے اور لوگ اب اسے اس باربر کی دکان سے الگ متصور کرنے لگے ہیں۔"

مگر اس ٹرمینس لین میں اس باربر کی آمد بجائے خود ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ کسی نے اسے اس ٹرمینس لین کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ خود اس نے کبھی اس کے بارے میں نہیں سوچا تھا (جب کہ یہ ٹرمینس لین اس کرۂ ارض پر کھڑے ہر فرد کے ذہن کے نقشے پر محیط ہے۔) مگر جیسا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، اسے دھیرے دھیرے اپنی تنہائی کا احساس ستانے لگا۔ وہ جب گھر لوٹتا تو وہ ایک دوسرا انسان ہوتا جسے اس کے گھر والے سمجھ نہیں پاتے۔ ہر بار اس کے بچے اس کا انتظار کرتے نظر آتے اور اسے اس پر حیرت ہوتی۔ وہ اس انتظار کو سمجھ نہ پاتا اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ اس کی بیوی جب کبھی رات کی تنہائی میں کپڑے اتار کر اس کے پاس آتی وہ اس کی قرمزی گھنڈیوں کو حیرانی سے تکتا رہتا جن کی ساری دلکشی بچے سالوں سال چوس گئے تھے۔

"تمھیں تو یہ بے حد پسند تھے۔" اس کی بیوی پستانوں کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھتی ہے مگر پستان ہیں کہ ہر بار ڈھلک جاتے ہیں۔

"ہاں۔" وہ ہاتھ بڑھا کر چھوتا ہے۔ وہ اسے اپنی انگلیوں میں ربڑ کی طرح مگر سانپ کے جسم کی طرح ٹھنڈے محسوس ہوئے۔ "آئندہ تم میرے پاس اس طرح مت آیا کرو۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ... کیوں کہ..." وہ خاموش اپنی بیوی کی طرف تاکتا رہتا ہے جو حقارت کے ساتھ اپنے کپڑے پہن لیتی ہے اور دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔

"کیوں کہ..." اپنا آخری جملہ وہ خود سنتا ہے۔ "ہارا ہوا انسان ہمیشہ اپنی خلش چھوڑ جایا کرتا ہے۔"

اس باربر کے بعد فی الحال اس ٹرمینس لین میں کچھ نہیں بچتا۔ آئندہ آپ اس ٹرمینس لین کے بارے میں سوچنے سے قبل اس باربر کے بارے میں ضرور سوچیں۔ باربر جس کا کھوکھا ڈریگن کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے اور اب اس دور کی پہچان بن چکا ہے، بلکہ اس ٹرمینس کے بالکل کنارے ہوتے ہوئے بھی اس کا مرکز بن چکا ہے۔

۱۰۔

وکٹوریہ تیزی سے پہاڑی راستے پر دوڑ رہی ہے۔ ٹرمینس لین سے نکل کر اچانک دنیا بدل گئی ہے، پیڑ پودے، چٹان، سنگ میل سب کچھ اجنبی سے لگ رہے ہیں۔ میرا کوچوان ایک جگہ میری ہدایت پر لگام کھینچتا ہے، گھوڑا نتھنوں سے پھنکارتے ہوئے، جھاگ اڑاتے ہوئے، ہمیں نظر انداز کرنا چاہتا ہے، مگر اسے اس کی اجازت نہیں ہے۔ وکٹوریہ کے چاروں پہیے ایک ساتھ تھم گئے ہیں میں کود کر نیچے آتا ہوں۔

معزز حضرات، وقت آگیا ہے کہ ہم ایک تلخ سچائی کا سامنا کریں۔ یہ نیچے پھیلا ہوا میدان جس میں یہ اپنا تاریخی شہر بسا ہے اور دور ابلتا سمندر جس میں شہروں کی غلاظت سے سیاہ ہو چکی ایک ندی ضم ہو رہی ہے ان سب کے باوجود ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم صحیح اور غلط کا فیصلہ کر سکیں۔ اس لئے الوداع، ہم آج کے بعد ٹرمینس لین واپس لوٹ کر اس بات کا تہیہ کریں گے کہ ہم سچائی کو محض اس کے اندر ہی دریافت کریں۔

ٹرمینس لین جہاں جو کچھ ہوتا ہے اپنے ڈھنگ سے ہی ہوتا ہے۔

۱۱۔

شاید میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ اس ٹرمینس لین کی پوری کہانی بیان کر سکوں۔ واپسی پر میں وکٹوریہ کو اچھی طرح سجا سنوار کر شہر کے سب سے بھیڑ بھاڑ والے علاقے سے گزرتا ہوں۔ وکٹوریہ کے پہیے ٹرام کی پٹریوں سے ٹکراتے ہوئے ہمیشہ کی طرح چنگاریاں چھوڑ رہے ہیں۔ گھوڑا ٹریفک کانسٹبل کی سیٹی کی آواز کو پہچانتا ہے، مگر اب اس کی یادداشت اس سلسلے میں کچھ گڈمڈ ہونے لگی ہے اسی لئے وہ کبھی کبھار اسے نظر انداز بھی کر دیتا ہے، اور سرپٹ دوڑتا چلا جاتا ہے، سیاسی جلوس اس کے راستے سے ہٹتے جاتے ہیں کیوں کہ یہ ٹرمینس لین کی گاڑی ہے اور لوگ اپنی آنکھوں میں خوف لئے نظر آتے ہیں۔ عزت مآب وزیر اعظم کی گاڑی بہت پہلے گذر چکی ہے۔ ہمیں بہت دور ٹرمینس لین پہنچنا ہے، مگر میں ایک پل کے لئے رک گیا ہوں۔

"ابھی ابھی ہمارے وزیر اعظم کی سواری ادھر سے گذری ہے اور اگلے موسم تک سارے معاملات سدھر جائیں گے۔" ایک راہگیر مجھ سے مخاطب ہے۔ اس نے ایک مختی کاغذی ترنگا تھام رکھا ہے۔ "اس ضمن میں حضور عالی کی رائے کیا ہے؟"

"کیوں کہ مجھ سے اس شہر کے معاملات کے سلسلے میں کبھی کوئی رائے نہیں لی گئی۔" میں کہتا ہوں اور واپس وکٹوریہ کے اندر بیٹھ جاتا ہوں۔ کوچوان گھوڑوں کو چابک لگاتا ہے، ان میں سے ایک کی دم کی ایال ارغوانی ہیں۔ وہ بار بار ریح خارج کرتا ہے۔

راستے میں خود سے پوچھتا ہوں، کیا اسی طرح ہر چیز اپنے اختتام تک پہنچتی ہے؟

۱۲۔

خزاں اپنے آخری مرحلے پر ہے۔ زیادہ تر پیڑ ننگے ہو چکے ہیں، ان کے اکے دکے گھونسلے نظر آنے لگے ہیں۔ خاکروب مردہ پتوں کو جھاڑو لگا کر ایک کنارے کر چکا ہے جہاں انھیں تا ابد سلگتے رہنا ہے۔ ٹرمینس لین کے مکانات کی کھڑکیوں پر دھوپ کی ملمع کاری ہے۔ کل تک اس سورج کی طرف لوگ تاک سکتے تھے۔ اب وہ آنکھوں کے لئے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ ٹرمینس لین کے لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے ہیں۔ آسمان میں گدھوں کی پرچھائیاں منڈلا رہی ہیں۔ یہ مردار خور، ان کے بغیر یہ انسانوں کی دنیا نہیں چل سکتی۔

"کہیں پر کچھ ہو گیا ہے۔" رسی پر کھڑا ہوا نٹ چھتوں کے بے رنگ اور ناہموار سلسلوں کے اوپر تاک رہا ہے جہاں مختلف جگہوں سے گاڑھا دھواں ابل ابل کر آسمان میں ضم ہو رہا ہے۔

"اور یہی انسانی تاریخ ہے، ایک دھوئیں سے دوسرے دھوئیں تک کا سفر، ایک جنگ سے دوسری جنگ تک کی داستان۔" جانے یہ کس کی آواز تھی۔ "اور مرنے کے بعد انسان کا کوئی مصرف نہیں ہوتا۔ صرف اس کی یاد کا لوگ جشن مناتے ہیں، اس کا کچھ مر نکالتے ہیں، اس کا بت ڈھالتے ہیں تا کہ کوؤں اور کبوتروں کو بیٹ کے لئے آسانی ہو۔"

کچھ لوگ لڑکی کو ایک تختے پر رکھے نظر آ رہے ہیں۔ اس کا عاشق یک پیلا گلاب تھامے اس کی قیادت کر رہا ہے۔ اس بھیڑ میں کچھ نئے چہرے ہیں۔ کون ہیں یہ؟ کیا اس ٹرمینس لین میں آنے کا یہ بھی ایک آسان راستہ ہے؟ اس کے وداع کے لئے ڈریگن کے سامنے لوگ کھڑے ہیں جو اب مکمل ہو چکا ہے۔ جج ہوگ، اس کی بیوی، رٹ گرڈ کرل، خاکروب، باربر اور بھی دوسرے سینکڑوں لوگ، نہیں آپ جہاں تک چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔ مردے کو ٹرمینس لین کے داخلے پر رکھ دیا گیا ہے۔ پیچھے دور تک ٹرمینس لین کے دروازے اور کھڑکیاں دھوپ میں روشن ہیں۔ سامنے وہ شاہراہ ہے جو مڑ کر ایک دھند سے لپٹے ہوئے شہر کی طرف چلی گئی ہے

جیسے مصور کے پاس رنگ اچانک کم پڑ گئے ہوں اور اس نے رنگوں میں پانی ملا کر کینوس کا باقی کام پورا کرلیا ہو۔ صرف اس شہر سے ابلتا ہوا دھواں حقیقی ہے جو اب مختلف جگہوں سے نکلنے لگا ہے، بل کھاتا ہوا، ہوا کی زد پر بکھرتا ہوا۔ بلکہ اب تو دھوئیں تعداد میں بڑھتے جارہے ہیں، اور بھی گہرے ہوتے جارہے ہیں، کسی شیر خوار کے کجلائے ہوئے آنسوؤں کی لکیروں کی طرح۔ اس شاہراہ کے کھمبے اونچے ہیں۔ دونوں طرف کے فٹ پاتھ پر ایک بھی راہگیر نہیں جو اس وقت کے لئے غیر فطری ہے۔ دو رویہ دوکانیں بند پڑی ہیں، صرف ان کے سامنے کتے اور بلیاں لوٹ رہے ہیں۔ وہ انڈر ٹیکر (Undertaker) کا انتظار کررہے ہیں جو اپنی تابوت گاڑی کے ساتھ نظر نہیں آتا۔

"اس شہر کو کچھ ہوگیا ہے کہ وہ ٹرمنس لین کا مردہ قبول کرنے میں اتنا وقت لگا رہا ہے۔" کوئی سرگوشی کرتا ہے۔ بچے جو اپنی سائیکلوں پر ٹرمنس لین کے دہانے تک آگئے ہیں، للچائی ہوئی نظروں سے سنسان شاہراہ کو دیکھ رہے ہیں۔ مگر ان کی سائیکلوں کے پہیے اس شاہراہ کے لئے نہیں بنے ہیں اور انھیں اس کا پتہ ہے۔ وہ اپنی گھنٹیوں کو رک رک کر بجا رہے ہیں، ان کی سائیکلیں ڈریگن کے کھمبے کے گرد رہ رہ کر چکر لگا رہی ہیں۔ یہ زمین ان کی اپنی ہے، یہ آسمان، ایک دن انھیں وہاں اپنے نادیدہ پروں کے ساتھ لوٹنا ہے۔

"اس گلی کے بچے اس کائنات کی مسکراہٹ ہیں۔" سویا نگ کہتی ہیں۔

"مگر یہ بچے..." اس کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو جھلملا اٹھتے ہیں۔

"یہ غلط ہے۔" بے ہونگ ان موتیوں سے نظریں ہٹا کر کہتا ہے۔ "اس ٹرمنس لین میں آنسو کے لئے اجازت نہیں ہے۔"

شہر دم سادھے خاموش ہے۔ اس کے آسمان پر سورج چمک رہا ہے، گدھ اور چیل منڈلا رہے ہیں، دھوؤں کے بادل گذر رہے ہیں۔ نٹ اپنی رسی پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ پھر اسے دور شاہراہ کے بطن سے کوئی چیز نمودار ہوتی نظر آتی ہے اور وہ انگلی سے اس طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ ایک گاڑی کا ہیولا ہے جو سنسان سڑک کو تیزی سے پار کرتا ہوا ٹرمنس لین کی طرف آرہا ہے جہاں ڈریگن آسمان کی طرف اپنا دہن کھولے کھڑا ہے۔ لوگ راحت کی سانس لیتے ہیں۔ آخرکار... عاشق ایک دوسرا پیلا پھول لڑکی کے کنگھی شدہ بالوں میں پرو دیتا ہے۔ لوگ تالیاں بجاتے ہیں۔ بچے سائیکلوں پر تھم گئے ہیں اور اپنی ایک ٹانگ زمین پر ٹکائے کھڑے ہیں۔ وہ تیز آنکھوں سے شاہراہ حیات کی طرف تاک رہے ہیں جس پر گاڑی کا ہیولا بہت حد تک صاف ہوچکا ہے اور اب دیکھتے دیکھتے ایک پک اپ وین میں بدل گیا ہے۔ وین آکر ٹرمنس لین کے سامنے رکتی ہے، انجن ابھی بند نہیں ہوا ہے، اس کا exhaust پائپ رہ رہ کر خاکی مائل قرمزی دھواں چھوڑ رہا ہے۔ وین سے دو اشخاص کود کر باہر آتے ہیں۔ وہ سفید چغوں میں ہیں، سر پر سفید کیپ، چہرا ناک تک ماسک سے ڈھکا ہوا۔ وہ اونچے گم بوٹ پہنے ہوئے ہیں اور انھوں نے کہنیوں تک ربڑ کے دستانے چڑھا رکھے ہیں جو گیلے اور غلیظ ہو رہے ہیں۔ وہ گاڑی کے اندر سے ایک اسٹریچر نکالتے ہیں اور اسے اٹھائے ہوئے لڑکی کے مردے کے پاس آتے ہیں۔ ٹرمنس لین کے اندر ایک تیز سناٹا بول رہا ہے۔ اسٹریچر پر خون اور کالک کے نشان ہیں اور پک اپ وین سے ایک بدبو نکل کر ٹرمنس لین کے اندر آنا چاہتی ہے۔

"یہ مردہ گاڑی ہے۔" رسی پر ڈولتے ہوئے نٹ کی چیخ نکل گئی ہے کیوں کہ اپنی اونچائی کے سبب اس نے وین کو لبالب مردوں سے بھرا دیکھ لیا ہے۔ لیکن دونوں اسٹریچر برداروں کے پاس اس طرح کی جذباتیت کے لئے وقت نہیں ہے۔ وہ جلدی جلدی لڑکی کے مردے کو اٹھا کر اسٹریچر پر ڈالتے ہیں یہاں تک کہ اس کا سر ایک طرف ڈھلک جاتا ہے، بال کھل جاتے ہیں اور عاشق کا پیلا گلاب زمین پر گر جاتا ہے۔ اسے کوئی نہیں اٹھاتا۔ یہ خاکروب کا مسئلہ ہے، یا شاید سب لوگ سکتے میں ہیں۔ دونوں اسٹریچر کو اٹھائے ہوئے پک اپ وین کے پاس پہنچتے ہیں۔ اسٹریچر کو انھیں اپنے کندھوں تک اٹھانا پڑتا ہے جس کے بعد مردوں کے ڈھیر میں لڑکی کا مردہ منھ کے بل جا گرتا ہے۔ دونوں وین کے اندر چلے جاتے ہیں جہاں ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے اسٹریچر کے رکھنے کی جگہ ہے۔ دروازہ بند ہوجاتا ہے۔ وین ہائی گیئر پر دوڑتی ہوئی شہر کی طرف چلی گئی ہے۔ اب اس کی جگہ سڑک پر وہ مستطیل نشان رہ گیا ہے جو وین کے اندر سے ٹپکتے ہوئے لہو کے قطروں سے بن چکا ہے۔ وین کے اندر سے لڑکی کے لہراتے بال نظر آرہے ہیں، اور وہ چیل اور گدھ جو اس کا پیچھا کررہے ہیں۔ بلکہ ایک دو تو ان مردوں پر اتر بھی چکے ہیں۔

"یہ شہر اب پہلے جیسا نہیں رہا۔" کسی نے سرگوشی کی۔ "اب اس میں مردار خوروں کی حکومت آچکی ہے۔"

"سب کچھ بدل چکا ہے۔"

وہ لوگ کھڑے دور شاہراہ حیات پر مردہ گاڑی کو ہیولا میں بدلتے دیکھ رہے ہیں کہ ایک دھماکا ہوتا ہے اور بچے خوشی سے سائیکل کی گھنٹیاں بجانے لگتے ہیں۔ انھوں نے سائیکلوں کو ڈریگن کے گرد تیزی سے گھمانا بھی شروع کردیا ہے۔ اور ڈراگن...

وہ اپنے منھ سے شعلے اگل رہا ہے۔

"آخرکار... آخرکار... میں اس میں کامیاب ہوگیا۔" تکاما سا اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ڈریگن کے نیچے ناچ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ممنونیت کے آنسو ہیں۔ ناچتے ہوئے وہ بہت مضحکہ خیز نظر آرہا ہے کیوں کہ اس کے کشادہ دہن کے اندر تھوڑے سے ہی دانت بچے ہیں۔ یہ چینی کمال کا فنکار ہے، اس نے ایک گیس کا سلنڈر نچلے راستے سے ڈریگن کے شکم میں ڈال دیا ہے۔

اب اس ٹرمنس لین میں آنے کے لئے لوگوں کو اس ڈریگن سے اجازت لینی ہوگی، اس کی آگ کے نیچے سے گذرنا ہوگا۔ یہ آگ اگلتا ڈریگن اس ٹرمنس لین میں آنے والوں کی رہنمائی کے لئے ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں، اس ٹرمنس لین میں ہر واقعہ ایک خاص ڈھنگ سے اپنے انجام تک پہنچتا ہے ☆☆☆

افسانے کے دو کھونٹے

قدیر زماں

تمہید

داد دیتا ہوں میں اس قاری کو جس کا تخیل فن کار کے ذہن تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور اس تجرید اور ان علامتوں، تلازموں، اشاروں، کنایوں کو سمجھ پاتا ہے جو تخلیق میں شعوری اور غیر شعوری طور پر در آتے ہیں۔ میں اس قاری کو بھی داد دیتا ہوں جو فن کی بعض باریکیوں تک رسائی حاصل نہیں کر پاتا لیکن اس پر ابہام کا اتہام نہیں لگاتا، بلکہ وہ رجوع کرتا ہے کسی صاحب علم اور صاحب بصیرت سے تاکہ اس مفہوم تک پہنچ سکے جو الفاظ کی تہ میں اور ان کے گرد و گرد ہے۔

انجیل مقدس نے کہا کہ ابتدا میں لفظ تھا، لفظ خدا کے ساتھ تھا، لفظ خدا تھا۔ قرآن کریم نے بتایا کہ اللہ نے آدمؑ کو چند اسما سکھائے۔ پھر انسان نے قیاس لگایا کہ ایک بڑی آواز نے دنیا کو قائم کیا۔ پھر آوازیں ہی آوازیں تھیں، انھیں آوازوں سے موسیقی پھوٹی، آوازوں کو اشکال میں ڈھالا گیا تو علامتیں اور الفاظ بنے۔ لفظ جو بنا تو اس کے پیچھے ایک واقعہ، ایک کہانی پوشیدہ رہی۔ واقعے نے احساس جگایا، وہ نہ جاگتا تو واقعہ پہچانا نہ جاتا۔ واقعے کی تفہیم کے لئے احساس نے مزید لفظ ایجاد کیے، گویا واقعہ، کہانی، لفظ، احساس، ان چاروں کھونٹوں کے اطراف انسانی زندگی طواف کرتی رہی اور کرتی رہے گی۔

کہانی کا جنم

پھر ایک دن لفظ نے کہانی سے پوچھا: "ماں یہ تو بتاؤ کہ تم سے پہلے اس دنیا میں کیا تھا؟ میں تو تمھارے پیٹ سے پیدا ہوا، لیکن تم نے کس کے بطن سے جنم لیا، ہمارا کوئی شجرہ، اتہ پتہ ہے کہ نہیں؟" ماں نے جواب دیا: "سنو بیٹا! میری ماں ایک کہانی تھی، اس کی ماں بھی کہانی تھی، ہماری پیڑھیاں در پیڑھیں سب کہانی تھیں۔ میں ٹھیک سے بتا نہیں پاؤں گی کہ یہ سلسلہ کہاں سے شروع ہوا۔ جیسا سوال تم نے کیا ویسا ہی سوال ایک بار میں نے اپنی ماں سے کیا تھا۔ میری ماں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر جھانکنے کے لئے کہا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک راستے سے بے شمار اونٹ قطار در قطار گذر رہے ہیں۔ اس نے اپنی انگلی کے اشارے سے ایک اونٹ کو روکا۔ اس کے کوہان کے دونوں طرف بڑے بڑے صندوق جھول رہے تھے۔ ایک صندوق اونٹ کی پیٹھ سے اتار کر اس نے کھولا، صندوق خشخاش کے دانوں سے لبالب بھرا تھا۔ ماں نے کہا "ایک خشخاش کا دانہ اٹھا ؤ۔" دیکھا تو اس کے اندر ایک چھید ہے، جھانکا تو وہاں ایک دنیا آباد تھی۔ ماں نے کہا، میں نہیں جانتی کہ یہ اونٹ کہاں سے آ رہے ہیں اور کدھر کو جا رہے ہیں، لیکن کہانیاں اتنی ہی ہیں جتنے خشخاش کے دانے ہیں۔ ایک کہانی میں بھی ہوں۔ ایک کہانی تم بھی ہو۔ سب سے پہلے کہانی ہی تھی۔"

کلیم الدین احمد نے کہا تھا کہ تمام کہانیاں درمیان سے شروع ہو کر درمیان ہی میں ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر اس مفروضے کو مان لیا جائے تو کائنات کا کوئی وجود ایسا نہیں ہے جو درمیان سے شروع ہو کر درمیان ہی میں ختم نہ ہو جاتا ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ کائنات کے بارے میں ہم نہیں جانتے۔ ہر وجود کا آغاز و انجام ہے۔ وہ اپنے میں مکمل ہے۔ اسی طرح ہر کہانی کا آغاز و انجام ہوتا ہے۔ وہ اپنے میں مکمل ہوتی ہے ورنہ وہ ادھوری رہتی ہے اور ادھوری کہانی انجام تک نہیں پہنچتی۔

افسانہ نگار لکھنا شروع کرتا ہے تو وہ آغاز سے واقف ہوتا ہے لیکن بیشتر انجام سے واقف نہیں ہوتا، اس لئے کہ کہانی جب جنم لیتی ہے تو وہ شروع ہی سے اپنی پہچان اور اپنی شناخت رکھتی ہے۔ اسے اپنے طور پر پروان چڑھنے کا موقع نہ دیا جائے اور بے جا مداخلت ہو تو پھر وہ اپنی شناخت کھو کر کمزور پڑ جاتی ہے۔ کوئی واقعہ جب وقوع پذیر ہوتا ہے تو اس کے اطراف میں کچھ اندھے، بہرے اور گونگے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ حاضرین میں جو جس قدر چوکنا ہوگا، جس کا احساس زیادہ بیدار ہوگا، وہی اس واقعہ کو بہتر سمجھ سکے گا اور اس میں جتنی بہتر صلاحیت ہوگی اسی عمدگی سے، اسے دوسروں کے سامنے پیش کر سکے گا۔ احساس بیدار نہ ہو تو واقعہ کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔

پریم چند اور نیا افسانہ

سترہویں اور اٹھارویں صدی کا دور تو اردو زبان کے ارتقا کا دور تھا۔ انیسویں صدی کے اختتام تک زبان پوری طرح بالغ ہو چکی تھی۔ جن کی حس زیادہ بیدار تھی انھوں نے شاعری میں اپنے جوہر دکھائے۔ نثر میں داستانیں، تذکرے، سوانح، انشائیے، نکاہیے لکھے جا سکے۔ ولی، سودا، میر، مصحفی، ذوق، غالب، نظیر، اور انیس نے شاعری کے اعلیٰ نمونے چھوڑے۔ افسانے کا آغاز بیسویں صدی سے ہوا۔ اس سے قبل اردو افسانے کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا یا پھر وہ ابھی پیٹ کے بل رینگنے کے دور میں تھا۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جن افسانہ نگاروں نے نام پیدا کیا ان میں راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم، وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ اسی دہائی کے آخر آخر میں منشی پریم چند بھی منظر عام پر آئے۔ بعض تنقید نگاروں اور ادیبوں کا خیال ہے کہ "پریم چند افسانے کی ترقی معکوس کے ذمہ دار ہیں" کیونکہ انھوں نے افسانے کا گلا گھونٹ دیا۔ اعتراض کرنے والے ادیبوں میں انتظار حسین جیسے نامور ادیب بھی شامل ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے کہا، "پریم چند کا فسانہ عکس حیات تک محدود تھا۔ آج کے افسانے میں تنقید حیات شامل ہو گئی ہے۔" عکس حیات کے بغیر تنقید حیات کہاں سے شروع ہو۔ یہی تو ارتقا کا اصول ہے۔ جز، پیڑ

اور شاخوں کے بغیر کوئی درخت پھول اور پھل نہیں دیتا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں اردو افسانے کی مثال ایک بچے کی تھی جسے ابھی چلنا نہیں آتا تھا۔ پریم چند نے اس بچے کو انگلی پکڑ کر نہ صرف کھڑا کیا بلکہ اسے چلنا بھی سکھایا۔ اگر پریم چند نے نیا افسانہ نہیں لکھا ہے تو کسی اور نے کیوں نہیں لکھا؟ پریم چند نے اپنے دور میں جس مقدار اور جس معیار کا فکشن لکھا شاید کوئی اور نہیں لکھ سکتا تھا۔ بیسویں صدی کا کوئی فکشن نگار ایسا نہ ہوگا جس نے پریم چند کو نہ پڑھا ہو۔ اگر نئے افسانے کا انکھوا پھوٹا ہے تو وہ پریم چند کی تحریروں سے پھوٹا ہے۔ بعض ادیبوں نے ان کے فن کو کمزور ٹھہرایا تو شاید اس سبب کہ "ترقی پسندوں نے انھیں اپنی تحریک کا معبود بنالیا تھا۔"

ترقی پسند تحریک

اس کے بعد ایک چھوٹا سا اختلافی مسئلہ "انگارے" کی اشاعت کے بارے میں ہے۔ ۱۹۳۲ میں "انگارے" شائع ہوا۔ اس میں سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر شامل تھے۔ کوئی چوتھائی صدی تک اس کتاب کا چرچا رہا اور آج بھی کسی نہ کسی جگہ اس کا نام لیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں شامل افسانے رجحان ساز افسانے قرار دیئے گئے۔ بیشتر ادیبوں کا خیال یہی تھا کہ ان سے "ترقی پسند تحریک کو ہوا ملی" اور "تحریک نسواں نے زور پکڑا۔" لیکن ان میں احمد علی ہی ایسے افسانہ نگار تھے جن کی تخلیقات کا اثر دیرپا ثابت ہوا۔ سجاد ظہیر تحریک کے علم بردار تھے اور ان کی شریک حیات رضیہ سجاد ظہیر ان کی شریک کار تھیں۔ دونوں کی شخصیتوں نے اگلی نسل پر گہرا اثر چھوڑا۔

"انگارے" کے بارے میں انتظار حسین نے کہا ہے کہ اس نے "غلط روایت کی طرح ڈالی۔ بعد میں آنے والوں نے یہ سمجھا کہ افسانے میں سنسنی کی ضرورت ہے"۔ ۱۹۳۶ میں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس ہوئی۔ ۱۹۳۹ میں حلقۂ ارباب ذوق کا قیام عمل میں آیا تو اس کے بعد دونوں طرف کے ادیب، وہ جو تحریک سے وابستہ نہ تھے اور دوسرے جو تحریک سے وابستہ تھے، متوازی چلنے لگے۔ اس دور میں چونکہ کمیونزم کا ساری دنیا میں بول بالا تھا اس لئے ترقی پسند تحریک کے ادیبوں کا پلڑا بھاری رہا۔ اس تحریک سے وابستہ یا ناوابستہ جن افسانہ نگاروں نے کثرت سے لکھا یا قارئین کو متاثر کیا ان میں خواجہ احمد عباس، اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، سدرشن، کرشن چندر، عصمت چغتائی، رام لعل، اقبال متین، اختر اورینوی، مہندر ناتھ، سہیل عظیم آبادی، دیویندر ستیارتھی، بلونت سنگھ، جیلانی بانو، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ ان میں کرشن چندر اور عصمت چغتائی کو جو مقام حاصل ہوا وہ کسی اور کو نہ ملا۔ سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی اپنی ہی طرح کے ادیب تھے۔ منٹو ترقی پسند تحریک سے ابتدا میں وابستہ رہے تھے لیکن وہ اس کے ہو کر نہ رہ سکے۔ بیدی اپنے کو ترقی پسند کہتے رہے لیکن قارئین نے انھیں اور ان کے بعد آنے والی فکشن نگار قرۃ العین حیدر کو ہمیشہ الگ خانے میں رکھا۔ غلام عباس نے بھی اسی دور میں لکھا اور کہا کہ "میں صرف اپنے لئے لکھتا ہوں۔"

جدید رجحان

۱۹۶۰ تا ۱۹۸۵ ربع صدی کا عرصہ اردو والوں کے لئے مکمل طور پر جدیدیت کا دور تھا۔ میں یہاں مغربی ممالک کے ادب کے اثرات کا ذکر نہیں کروں گا کہ اس کے اثر کو کسی نے قبول کیا اور کسی نے نہیں کیا، وہ ایک الگ گفتگو ہوگی۔ ادھر حیدرآباد دکن کی محفلوں میں حلقۂ ارباب ذوق کے اراکین کی تخلیقات پر بار بار بحث ہوتی رہی۔ میراجی اور ن۔م۔ راشد نے تو نئی نظم کی بنیاد ڈالی تھی۔ جن افسانہ نگاروں کا کثرت سے نام آتا رہا وہ منٹو، بیدی اور قرۃ العین حیدر، پھر انتظار حسین اور ان کے بعد سریندر پرکاش، احمد ہمیش، انور سجاد، مین را وغیرہ تھے۔ ویسے منٹو، بیدی اور قرۃ العین حیدر کو صرف جدید رجحان کے تحت نہیں رکھا جا سکتا۔ آگے چل کر ان ناموں میں کئی اور نام شامل ہو گئے۔ خالدہ اصغر، اسد محمد خاں، علی امام نقوی، حسین الحق، الیاس احمد گدی، جوگندر پال، بلراج منیرا، کمار پاشی، اقبال مجید، شفق، رشید امجد، سریندر پرکاش، سلام بن رزاق، اکرام باگ، حمید سہروردی، انور خاں، شوکت حیات، مشتاق مومن، زاہدہ حنا، دیویندر اسر، اے حمید، شہزاد منظر، انور سجاد، مسعود اشعر، منشایاد وغیرہ۔ ۱۹۸۳ تک حیدرآباد میں ان محفلوں کے روح رواں عالم خوند میری اور مغنی تبسم ہوا کرتے۔ ان دونوں کی سرپرستی میں جدید رجحان کے تحت لکھنے والوں کی ہمت افزائی ہوئی۔ احمد ہمیش "مکھی" اور "چھپکلی بے دیوار" جیسے افسانے لکھ کر پاکستان چلے گئے، لیکن حیدرآباد کے افسانہ نگار اسی رجحان کے تحت لکھنے لگے۔ ابتدائی دور میں عوض سعید کا نام نمایاں رہا۔ انور رشید نے افسانوں کا صرف ایک مجموعہ شائع کیا اور دوسرا مجموعہ حیدرآباد لٹریری فورم کے حوالے کر کے عین شباب میں رحلت کر گئے۔ میں نے مرحوم سے ایک بار کہا تھا "تمھارے افسانوں میں تسلسل نہیں ہے۔ ایک افسانے کا کوئی بھی پیراگراف دوسرے افسانہ کا حصہ بن سکتا ہے"۔ انھوں نے فوراً جواب دیا "جی ہاں۔ یہی میرا ذہنی تسلسل ہے۔"

عوض سعید اور انور رشید کے بعد مظہر الزماں خاں اس افق پر ایسے نمودار ہوئے کہ نامور نقادوں اور مستند ادیبوں کو ان کا نام لیتے ہی بنی۔ اسی دوران بیگ احساس کے افسانوں کے دو مجموعے سامنے آئے۔ ان افسانوں میں علامت، تجرید اور بیانیہ تینوں اسلوب شامل ہیں۔ بعض افسانے جیسے "ملبہ"، "دخل"، "خس آتش سوار" جدیدیت کے رجحان کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے کہا، یہ "جدیدیت" کا دور تھا، شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ جیسے نقادوں نے اس رجحان کی بھرپور حمایت کی اور اسے پروان چڑھایا۔ اسی دور کے افسانوں کے حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا:

> انسانی سائیکی کی جتنی باریکیوں کا جتنی باریکی کے ساتھ افسانہ خبر لاتا ہے، اتنی گہری خبر شاعری سے ممکن نہیں...
> نیا افسانہ نئی شاعری کے مقابلے زیادہ حیران کن ہے۔

گوپی چند نارنگ نے کہا:

> علامتی افسانے میں افسانہ نگار لفظ کو محض لغوی یا

منطقی معنی میں استعمال نہیں کرتا ہے، علامتیں تیز روشنی کی
طرح سامنے آتی ہیں اور ایک ساتھ ان گنت معنوں کے
امکانات جھلمل جھلمل کرنے لگتے ہیں۔

بعض ایسے نقاد جنھیں کسی وجہ سے علامت اور تجرید کا فرق نہیں معلوم، انھوں نے علامت کی اصطلاح کی جگہ تجرید استعمال کرتے ہوئے جدید افسانے میں ابلاغ کا المیہ ڈھونڈ نکالا، حالانکہ ابلاغ کا المیہ تو زبان اور اسلوب کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ علامت اور تجرید کے ناموزوں استعمال یا قاری کی بصیرت میں کوتاہی کے سبب افسانہ میں ترسیل کا المیہ تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس سے قطع نظر اگر ہماری وابستگی ادب سے ہے تو ہم اس اسباب کے بارے میں غور کریں گے کہ کس لئے ۱۹۶۰ کے قریب تک پہنچتے پہنچتے ہمارے ادیبوں نے حقیقت نگاری سے گریز کیا اور کیوں ہمارے ادب میں علامت اور تجرید کا کثرت سے استعمال ہونے لگا۔

دنیا جانتی ہے کہ پاکستان نے کمیونسٹوں اور ترقی پسندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا اور جب فیلڈ مارشل ایوب خاں نے ۱۹۵۹ میں عنان حکومت سنبھالی اور نام نہاد بنیادی جمہوریت کا نظام رائج کیا تو ملک میں جو حق پرست ادیب و شاعر تھے، ان کی کیا گت بنی۔ احتجاج کے لئے انھوں نے اپنے اظہار کے پیرائے بدلے۔ ایڈگر ایلین پو اور کافکا کی تخلیقات بہت سے ادیبوں کے مطالعے میں آ چکی تھیں۔ خود ہمارا ادب استعاروں اور تمثیلوں سے مالا مال تھا، تلازموں اور اشاروں، کنایوں کا استعمال تو شاعری میں کثرت سے ہو چکا تھا، اب نثر کی باری تھی۔ انور سجاد، رشید امجد، منشایاد، مسعود، شعر جیسے فن کاروں نے اپنے افسانوں میں علامت اور تجرید کا استعمال کیا اور حکومت کی گرفت سے بچتے رہے۔

ہندوستان کی صورت حال ذرا بدلی ہوئی تھی۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت آئی ان میں جواہر لال جیسی چند شخصیتوں کو چھوڑ کر سب نے ایڈلٹ فرنچی ئز (Adult Franchise) کے نام پر، کنٹرول اور لائسنسنگ پالیسی کے بہانے، آفیشل سیکرٹس ایکٹ (Official Secrets Act) کا سہارا لے کر ملک و قوم کا خوب استحصال کیا۔ یہاں صدیوں پرانا راجہ اور پرجا کا نظام حکومت ابھی جاری تھا۔ اکیسویں صدی میں بھی ایک نامور فلم آرٹسٹ کو گاندھی گھرانے کے بارے میں کہنا پڑا، ''آپ کا تعلق حکمران طبقہ سے ہے اور ہم آپ کی رعایا ہیں، ہم آپ کے حکم کے تابع ہیں۔'' جمہوریت کا نعرہ صرف نعرہ ہی رہا۔

کسی بھی ملک کے عوام کو پر آشوب حالات سے نپٹنے کے لئے جنگ، ڈکٹیٹرشپ یا ایمرجنسی کی ضرورت نہیں۔ آزادی کے بعد ایک طویل عرصے تک عوام کی توقعات پوری نہ ہوئیں۔ جس ماحول میں وہ جی رہے تھے وہ جھوٹ، بے ایمانی، بے روزگاری، عدم مساوات، ناانصافی، پولیس مظالم اور سرخ فیتے کے چلن کا ماحول تھا۔ مزدور یا کسان تو دور رہے، پڑھا لکھا آدمی بھی نوکر شاہی کے سامنے بے بس تھا۔ حکومت کی لائسنسنگ پالیسی نے اسے اور بھی بے بس کر دیا۔ اسی دور میں خاندان کے آپسی رشتوں میں توڑ پھوڑ ہونے لگی۔ روزگار کی تلاش میں کثرت سے ہجر وطن کا سلسلہ بھی چل پڑا۔ تنہائیاں بڑھتی گئیں۔ دستور میں سال میں دو تین بار ترمیمات ہوتی رہیں۔ کئی ایسے ذیلی قوانین بنے جن سے فرد کی آزادی سلب ہوئی اور بنیادی حقوق دھرے رہ گئے۔ برطانوی تسلط سے تو ہندوستان نکل چکا تھا لیکن ہمارے حکمرانوں نے آزادی کی برکتوں سے عوام کو محروم رکھا۔

پچیس تیس سال سے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو حقیقت پسند اظہار تھا وہ نہ اپنوں کی اور نہ پرایوں کی عدالت میں جوہر دکھا سکا۔ پاکستان اور ہندوستان کی حیثیت دو علیحدہ سیاسی مملکتوں کی ضرور رہی لیکن برصغیر کے سماجی حالات ایک جیسے تھے۔ ۱۹۷۹ میں پاکستان کے سربراہ کو فوجی حکومت نے پھانسی دی تو اس سے متعلق دونوں ملکوں میں علامتی افسانے لکھے گئے۔ سوال یہ ہے کہ اس واقعے کو براہ راست بیانیہ انداز میں افسانہ کیوں نہیں کر دیا گیا؟ اگر کسی نے بیانیہ لکھا تو وہ پھسپھسا صحافتی بیانیہ بن کر رہ گیا۔ ۱۹۸۴ میں ہندوستان میں ایمرجنسی کا نفاذ شاید پاکستان میں مستقل آمریت کی دیکھا دیکھی رہا ہو۔ جس طرح ایک حکمراں دوسرے حکمراں سے عوام پر تسلط پانے کے اصول ہاتھ بدل لیتا ہے اسی طرح ایک ملک کے عوام دوسرے ملک کے عوام سے جابرانہ تسلط کے خلاف احتجاجی طریقے سیکھتے ہیں۔ جو ادیب زیادہ حساس تھے اور جن میں علامت اور تجرید کے استعمال کی اہلیت تھی ان کے قلم خود بہ خود اس راہ پر چل پڑے۔ کچھ کمزور اور ناتواں قلم کار بھی ان کے پیچھے دوڑے۔ ہر شخص نے اپنا حق ادا کیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کس کا قدم ارادی تھا اور کس کا غیر ارادی۔

بہر حال علامتوں کے کثرت استعمال کے چند اور بھی اسباب تھے، سائنسی ایجادات، ذرائع ابلاغ کی سہولتیں، جنگ عظیم کی تباہ کاریاں، نوآبادی نظام کا خاتمہ، مذہبی اور نظریاتی کٹر پسندیاں، بین الاقوامی تنظیموں کا کئی سطحوں پر قیام، فلسفۂ وجودیت کی مقبولیت، مختلف ممالک کے باشندوں کا ایک دوسرے سے ربط، فنون لطیفہ کا تبادلہ، فیشن پرستی اور مذہب سے بیگانگی یا بیزاری۔ یہ سب اسباب ایسے تھے کہ ادیبوں نے اپنے موثر پیرائے اظہار کے لئے علامت اور تجرید کا سہارا لیا۔ یہ بھی سچ ہے کہ جس طرح ترقی پسند دور کے بعض فنکاروں نے افسانے کی روح کو مجروح کیا اسی طرح بعض جدید لکھنے والوں نے ایسا ہی کیا۔

مابعد جدیدیت

آدمی کی جبلتیں تو فطرت سے ودیعت ہوتی ہیں۔ نہ تو اس پر حقیقتوں کے اظہار کا کچھ اثر ہوا اور نہ ہی علامت و تجرید نے اس کا کچھ بگاڑا۔ اس کے مسائل جوں کے توں رہے، بلکہ کٹر مذہب پرستی کے احیا نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر مزید بگاڑ پیدا کیا۔ پس ساختیات کے پس منظر سے ہندوستان و پاکستان کے ادیب واقف تھے ہی، ۱۹۹۵ میں گوپی چند نارنگ کی تالیف سے یہ منظر نامہ مزید کھل کر سامنے آیا۔ اس میں ردتشکیل اور گلوبلائزیشن کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔ جدیدیت کی عمر پچیس تیس سال سے آگے نہ بڑھ پائی تھی کہ عین شباب میں اسے قتل assasinate کرنے کی کوشش کی گئی۔ جدیدیت جب فروغ پر تھی تب ترقی پسند تحریک کے چند ادیبوں نے جن کا ذکر آگے آئے گا، علامتوں اور تجرید کا سہارا لینا چاہا۔ اب مابعد جدیدیت کی اصطلاح ابھی پوری طرح واضح نہیں ہوئی تھی کہ

جدیدیت کے بعض اچھے ادیب بخیال خود بیانیہ کی طرف مراجعت کر گئے۔ گوپی چند نارنگ نے کہا: ''تنقید قرأت کا استعارہ ہے اور سماجی عمل کا حصہ ہے، اس کی اصل آزمائش اسی میں ہے کہ وہ ہر طرح کے کلیت پسندانہ تصورات کے خلاف ہو اور قومیت کے اعتبار سے غیر مقلدانہ ہو کہ فکر و نظر کی راہ کھلی رہے۔''

ادب میں رجحانات تو بدلتے رہتے ہیں اور انھیں بدلنا چاہئے، زبان کے بدلنے میں وقت لگ جاتا ہے، ادب کے رجحانات بھی کیلنڈر کی طرح تو نہیں بدلتے، لیکن پچیس تیس سال کا وقفہ ایک نسل کا وقفہ ہے۔ اکیسویں صدی میں اگر ادبی رجحانات تیزی سے بدلنے لگے تو حیرت کی کوئی بات نہیں۔ حیرت تو اس وقت ہوتی ہے جب ہمارے دانشور تبدیلی کے اسباب پر قطعی لیبل لگا دیتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کو زوال آنے لگا تو بعض ادیبوں اور نقادوں نے منادی کر دی، ''جدیدیت ترقی پسندی کے خلاف ردعمل تھی، ترقی پسند تحریک کے یہ آخری دن ہیں۔'' لیکن وہ مری نہیں، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ ''ذرا آگے چلیں گے دم لے کر'' پر عمل کرتی رہی اور اب وہ ماڈرنزم سے زیادہ ماڈرنٹی کی اصطلاح میں اپنی کارکردگی میں اضافہ کر رہی ہے۔

یہ موقع نہیں کہ میں ان دو اصطلاحوں کی وضاحت کروں اور تفصیل میں جاؤں۔ ابھی تک اردو میں صرف ایک ''جدیدیت'' کی اصطلاح ہی ماڈرنزم اور ماڈرنٹی دونوں اصطلاحوں کی قائم مقام ہے۔ مابعد جدیدیت کی اصطلاح کانوں میں پڑتے ہی یہ کہنا کہ جدیدیت کا جنازہ نکل چکا ہے، غلط تصور ہے۔ یہاں میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ژاک دریدا کا ردتشکیل کا جو نظریہ ہے وہ خود اس کے ذہن میں واضح نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے یہ کہا کہ اس کا یہ نظریہ آگے چل کر دنیا کے پچھڑے ہوئے پس ماندہ عوام کی امانت بنے گا۔ بعض دانشوروں نے شبہ ظاہر کیا کہ یہ نظریہ کرما کی تھیوری کے سہارے اقوام کا اقتدار کسی ایک شخص یا ایک قوم کو سونپ سکتا ہے۔

ترقی پسند تحریک ہو کہ جدیدیت یا مابعد جدیدیت، ادبی رجحانات میں تبدیلیاں آتی رہیں گی۔ ایک ادبی رجحان کے قیام کے لئے کسی دوسرے رجحان کا ردعمل بننے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ ادب کی کسی تحریک یا اس کے رجحان کے آغاز اور اختتام کی تاریخیں مقرر کرنا بھی بے معنی بات ہے۔ اگر ہم یہ مفروضہ قائم کریں کہ ۱۹۳۶ تا ۱۹۶۰ کے دور میں اردو ادب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر رہا اور ۱۹۶۰ تا ۱۹۸۵ کے دور پر جدید رجحان حاوی رہا، اور اس کے بعد مابعد جدیدیت کی اصطلاح عام ہونے لگی، تو ان ادوار کی چند خصوصیات کے بارے میں بھی ہمیں بات کرنی ہوگی۔ اپنے دور میں ترقی پسند ادب کا مقبول عام ہونا اور اس کے بعد جدیدیت کے رجحانات کا اتنی تیزی سے اٹھان کے باوجود ست پڑ جانا دونوں اسباب مختلف ہیں۔ ان اسباب پر لمبی چوڑی بحث ہو چکی ہے لیکن مجھے ان سے کہیں کہیں اختلاف ہے اور میں اپنی بات آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ ۱۹۴۰ کی دہائی کے اختتام تک ترقی پسند ادب مستحکم ہو چکا تھا۔ مارکسی نظریات، انقلاب روس، سوویت یونین کا امریکہ کے مقابلے میں ایک بڑی طاقت بن کر ابھرنا، مغربی ممالک میں کمیونسٹ تحریک کے اثرات کا پھیلنا، ماؤزے تنگ کا لانگ مارچ، سامراجی طاقتوں کے خلاف ویت نام اور کیوبا کی جیت، یہ سب ایسے حقائق تھے جن میں صدیوں سے کچلے ہوئے غریب عوام کو اپنے خوابوں کی تعبیر پوری ہوتی ہوئی نظر آنے لگی۔ خواندگی کی شرح کم ہونے کے باوجود پریم چند، سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، جوش ملیح آبادی، اسرار الحق مجاز، سردار جعفری اور کیفی اعظمی جیسے ادیبوں اور شاعروں کو پڑھنے والوں کی تعداد بہت تھی۔ ۱۹۵۰ کے آس پاس نوآبادیاتی نظام معدوم ہو چکا تھا، سائنسی ایجادات کی وجہ جہاں انسان کو کئی راحتیں نصیب ہوئیں وہاں اسے بھیانک تباہی سے بھی گذرنا پڑا۔ ساتھ ہی، معاشی حالات عام طور پر بہتر ہوئے، غریب طبقہ ذرا تیزی سے اوسط طبقے میں شامل ہوتا گیا۔ یہ طبقہ مزید امیر بننا چاہتا تھا۔ پڑھنے لکھنے سے زیادہ یہ لوگ معاشی تگ و دو میں لگے رہے، صارفیت کا زور بڑھتا گیا۔ دولت مند چالاک طبقے نے تعلیم یافتہ اور کاریگر طبقے کو مسلسل کام پر لگائے رکھا۔ وہ کام کی یک رنگی سے اکتانے لگے۔ زندگی سے بیزاری، بیگانگی اور وجود کی بے یقینی کے احساسات کے ساتھ تنہائی کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔

بعض افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جنھوں نے ۱۹۶۰ کے بعد لکھنا شروع کیا لیکن انھوں نے جدیدیت کی تقلید نہیں کی۔ علامتوں کا استعمال، جو کسی بھی ادب کا وصف ہے ان کی تحریروں میں در آیا۔ چند نام ہیں: سید محمد اشرف، بیگ احساس، طارق چھتاری، عبد الصمد، ال ٹھکر، معین الدین جینابڑے، انیس رفیع، شموئل احمد، ساجد رشید، مشرف عالم ذوقی، یوسف عارفی۔ ۱۹۸۰ کے بعد ابھرنے والے چند افسانہ نگاروں کے بارے میں یہاں مختصراً چند باتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

طارق چھتاری کے افسانوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ نہایت شگفتہ اور دلچسپ ہیں لیکن ان میں عموماً سماجی معنویت کی کمی ہے۔ اس کے برخلاف شموئل احمد کے افسانوں میں سماجی معنویت کی شدت ہے۔ انھوں نے جنسی نفسیات کو بھی بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ عبد الصمد سیاسی لیڈروں، سرمایہ داروں اور نوکر شاہوں کی چیرہ دستیوں کو کھول کھول کر پیش کرتے ہیں۔ ال ٹھکر نے مذہبی پیشواؤں کی کارستانیوں کو آشکار کیا ہے۔ یوسف عارفی نے نقل مکان اور فسادات کی تصویر بڑی نزاکت سے کھینچی ہے۔ معین الدین جینابڑے سے امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں کہ وہ مستقبل میں ایک اہم افسانہ نگار کی حیثیت سے ابھریں گے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ادھر چند ایسے مجموعے بھی منظر عام پر آئے جنھیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اگر ہم اسی طرح کے افسانے لکھتے اور پڑھتے رہیں تو شاید خود اپنا اسلوب باقی نہ رکھ سکیں گے۔ ایسے بیانیے کس کام کے جنھیں پڑھ کر یہ احساس ہو کہ ان سے بہتر تو اخبارات کے کالموں میں چھپے ہوئے وہ واقعات ہیں جن کا مطالعہ معلومات میں اضافے کا باعث ہو سکتا ہے۔

ادیبوں کی الجھنیں

انگریزی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے مقامی زبانوں پر گہرا اثر چھوڑا۔ وہ سکڑتی گئیں۔ وہ لوگ جو اپنی معیشت سدھارنے میں لگے ہوئے تھے، انھوں نے ادب سے بے اعتنائی برتنی شروع کی، یا انھیں اتنا وقت نہیں ملا کہ وہ ادب کا

مطالعہ کرتے۔ جدیدیت کے رجحان کے تحت زبان و بیان کے مروجہ سانچے بدلے تو بعض لوگوں کے نزدیک قارئین کی تعداد بھی گھٹ گئی، بار بار دہرایا جانے لگا کہ "افسانے سے کہانی غائب ہوگئی، جدیدیوں نے علامتوں اور تجرید کا سہارا لے کر افسانے کو چیستاں بنا دیا ہے۔" ہم یہ بھول گئے کہ تحریک کسی طرح کی ہو، رجحان کیسا ہی ہو، ادب میں جمود قارئین کے گھٹنے سے نہیں آتا، جمود تو تب آتا ہے جب قوم بے حس ہو جاتی ہے، کرپشن، عدم مساوات، ناانصافی اور طرف داری کے خلاف احتجاج کرنے سے محروم ہو جاتی ہے۔ کئی معاملات میں خود ہم ان ناانصافیوں کے شریک کار رہے، ہمارے تخلیق کار اس رویہ کی وجہ اپنے کو تنہا تنہا محسوس کرنے لگے۔ وہ بے حس ہو جاتے تو ادب میں بھی جمود آ جاتا، لیکن انھوں نے ایسا ہونے نہیں دیا۔ جن سچے قلم کاروں میں لکھنے کی لگن تھی انھوں نے نقادوں کی پروا نہیں کی اور قاری کی ذہانت پر بھروسا کیا۔ اس میں ان کا نقصان ضرور ہوا لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔

ترقی پسند تحریک کے خلاف ہوا چلی تو بعض مشہور و معروف ادیبوں نے اپنی تحریروں کا اسلوب بدلا۔ میں یہاں دو ایک مثالیں دے سکتا ہوں کہ جیلانی بانو نے ابتدائی دور میں "موم کی مریم" سے شہرت حاصل کی تھی 'اودُ' اور "بارش سنگ" جیسا فکشن تحریک کے دور میں لکھا تھا۔ حالات بدلے اور جدیدیت نے زور پکڑا تو ان کے ہاں اظہار کی تبدیلی آئی۔ انھوں نے "دور بین" اور "کھیل کا تماشائی" جیسے جدید طرز کے افسانے لکھے۔ فنکار کا نام جانے بغیر عابد سہیل نے "کھیل کا تماشائی" کا تجزیہ کیا تو انھیں لکھنا پڑا کہ مصنف کو افسانہ نگاری شروع کئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا، یا یہ کہ جان بوجھ کر مختلف افسانہ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح اقبال متین نے "گریو یارڈ" جیسے افسانوں کو چھوڑ کر "شعلہ پوش" کا رخ کیا۔ انھوں ۱۹۹۳ میں "میں بھی فسانہ تم بھی کہانی" افسانوں کا مجموعہ چھپوایا۔ ابتدائی تین افسانوں "یہ کس کی تصویر ہے"، "کمڑکیاں"، "کنول اور گندم" میں تجریدی اسلوب حاوی ہے۔ "شعلہ پوش" میں مجہول شخص کس طرح مینار کی بلند ہوتی ہوئی سلاخوں سے اپنا جسم لگاتا جا رہا تھا پڑھیے تو پورا پیراگراف تجریدی اسلوب میں ہے۔

یہی حال جدیدیت کے تحت لکھنے والوں کا ہوا۔ جب چاروں طرف سے ایک ہی صدا بلند ہوئی کہ افسانے سے کہانی (واقعہ) غائب ہوگئی اور قاری نے افسانہ پڑھنا چھوڑ دیا ہے تو چند کمزور دل کے افسانہ نگاروں نے اپنی پٹری بدلی۔ عصمت چغتائی کا "سانپ کے تکوے" کیا کم تھا کہ آصف فرخی جیسے ادیبوں نے مزید ان کا پیچھا کیا۔ انھوں نے لکھا ہے "آئینے بڑھتے جا رہے ہیں اور عکس سمٹتے جا رہے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اکیلے پن کے ڈر کی یہ جھرجھری افسانہ ہے۔ بدلی ہوئی دنیا میں جدید افسانہ" اور یہ کہ "ایک بے عقیدہ شخص کی دعا جدید افسانہ بن جاتی ہے۔" اس طرح کے بیانات سے انیس اشفاق جیسے افسانہ نگار گھبرا گئے اور انھوں نے کہا کہ میں اور قمر احسن جدیدیت سے بیانیہ کی طرف جا رہے ہیں۔ اس کا اثر یہ بھی ہوا کہ انور خاں جیسے مضبوط اور طاقتور افسانہ نگار کو "جل ترنگ" کے افسانوں کا اسلوب اختیار کرنا پڑا۔ اس کا تجزیہ کرتے ہوئے محسن خاں نے پہلا ہی جملہ لکھا۔

"جل ترنگ بیانیہ طریق اظہار کا افسانہ ہے۔"

بعض وقت افسانے کے اسلوب کا کسی تحریک یا رجحان کے زیر اثر آنے کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ماحول کے خارجی دباؤ کی وجہ تخلیق کار کا اسلوب متاثر ہو جاتا ہے۔ وہ خود بھی نہیں جانتا کہ اس میں یہ تبدیلی کیوں اور کیسے آئی ہوگی۔ تخلیق کس تحریک یا رجحان کے تحت لکھی گئی یہ اہم نہیں ہے۔ فی نفسہٖ تخلیق کی جو اہمیت ہے اس کا استحسان فنکار کو ملنا چاہئے۔ ہماری آنکھوں پر تعصب کا چشمہ نہ ہو تو پھر تخلیق کا کسی تحریک یا رجحان سے تعلق ہمارے لئے اہم نہیں رہ جاتا۔ کسی نے کہا کہ جدیدیت کے دور کے صرف دس فیصدی افسانے اچھے ہیں۔ لیکن کسی بھی دور میں اگر دس فیصدی افسانے اچھے ہیں تو اسے بہت بڑا کارنامہ قرار دیں گے۔ ترقی پسندوں کے تو بمشکل تین فی صدی افسانے اچھے نکلیں گے اور نام نہاد مابعد جدید رجحان کا حال تو کوئی افسانہ ہی نظر نہیں آیا، اچھا یا برا۔ اچھے افسانے تو مشکل ہی سے لکھے جاتے ہیں۔ کبھی تو کسی ادیب کا ایک ہی افسانہ بڑا ہوتا ہے جیسے اشفاق احمد کا "گڈریا" یا غیاث احمد گدی کا "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" یا غلام عباس کا "آنندی"۔

جب سماج میں تہذیبی معیار گھٹنے لگتا ہے تو اس کو ادب اور فنون لطیفہ ہی سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زوال کی طرف لے جانے والی طاقتیں خود پسند، خود غرض ہوتی ہیں اور کمزور کا استحصال کرتی ہیں۔ احتجاج سے معمور ادب اور فنون لطیفہ ہی ان طاقتوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ یہ فریضہ ترقی پسندوں نے انجام دیا۔ لیکن ان میں کمزوری آنے لگی تو جدید رجحان نے فنکار کے قلم کو جلا بخشی اور اس نے ظلم اور استحصال کے خلاف چوکھی لڑائی لڑی۔

"شب خون" شمارہ ۲۸۶ میں مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

> سنہ ستر کی دہائی میں لکھے گئے افسانے کی بڑی پہچان اور قوت ہی یہ ہے کہ اس نے قاری کے تعصبات کو مجروح کیا، نظری سطح پر بھی اور تکنیکی سطح پر بھی۔ ان افسانوں میں نشان سے پیچھے ہٹ کر تمثیل، علامت اور استعارے کے ور تارے کے ساتھ ساتھ آزاد تلازمۂ خیال، سرریلسٹ رویہ اور تجریدی حوالے بھی دیکھنے کو ملیں گے اور ٹھوس صورت حال بھی۔ لیکن ہمارے سہل پسند قاری اور قلب دوراں نقاد نے اس مختلف النوع تدبیر کاری کو محض ایک نام دیا "علامتی افسانہ"۔ لیکن یہ محض علامت نگاری کہاں تھی؟... ہم نے بیک وقت تین کہانیوں کو ایک کہانی کی صورت رقم کیا۔ ان میں سے ایک تو بڑی انسانی ہجرت کے نتیجہ میں جنم لیتی ہوئی زندگی کے تال میل کی کہانی تھی، دوسری تہذیبی اور روحانی ٹوٹ پھوٹ کی، اور تیسری بے چہرہ اور گم شدہ آدمی کی شناخت کی کہانی۔

اب مابعد جدیدیت کہیں یا اسے بیانیہ کا دور کہیں، آج کے فنکار نے موجودہ دور کی استعماریت کے خلاف لکھنا شروع کیا ہے تو اس کے اظہار کے

پیرائے یقیناً بدل گئے ہیں۔ ہمارے ادب سے نہ ترقی پسندی پوری طرح سے غائب ہوئی اور نہ جدید رجحان ہی مٹ سکا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور معتبر قاری منظر نامے سے کبھی غائب نہ ہوا۔ یہ وہی قاری ہے جو ارتقائی عمل کا ساتھ دیتا رہا ہے۔ ادب کے اعلیٰ معیارات کا میلان فنی معیارات کے ساتھ ہمیشہ رہا ہے۔ انھیں میں سے تخلیق کار جنم لیتے رہے ہیں۔

مدیروں کی نوازشیں

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض مدیر فنکار کی تخلیقات کو سنوار سکتے ہیں، چمکا سکتے ہیں، چھاپنے سے انکار بھی کر سکتے ہیں، مصنف کی اجازت سے تحریر میں اصلاح و ترمیم کر سکتے ہیں۔ یہ باتیں تو اخلاقی معیار پر پوری اترتی ہیں لیکن کسی کا مضمون چھاپ کر پھر خود ہی اس مضمون کے خلاف لکھنا ادبی دیانت داری نہیں ہو سکتی۔ یا تحریر میں من مانی کاٹ چھانٹ یا اپنے ذہنی تحفظات کے سبب بعض مصنفوں سے اجتناب برتنا، یا کسی کی تخلیق چھاپ کر اس سے مالی منفعت حاصل کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ ممتاز شیریں جیسی مشہور ادیبہ کو شکایت تھی کہ ایک مدیر صاحب ان کے ایک انگریزی مضمون کا مسودہ لے گئے کہ اس کا اردو ترجمہ چھاپیں گے۔ اس کے بعد نہ انھیں ترجمہ ملا نہ مسودہ۔ عبادت بریلوی نے "ساقی" میں اردو کی پچیس سالہ تنقید پر مضمون چھاپا تو ممتاز شیریں کا نام نہیں لیا، حالانکہ ان کا خیال یہ بھی تھا کہ پاکستان میں محمد حسن عسکری اور ممتاز شیریں ہی بڑے نقاد تھے۔ وحید اختر کے ساتھ یہ ہوا کہ ان کا مضمون "سوغات" میں چھاپ کر ایڈیٹر نے اس کے خلاف ادارتی نوٹ لکھا۔ وحید اختر نے احتجاج کیا کہ ایڈیٹر کو یہ نہ چاہئے کہ اپنے جریدے میں مشمولات کے بارے میں فیصلہ کن انداز میں رائے دے۔ نہ چھاپنا ہو تو نہ چھاپے۔ چند برس قبل ایک مدیر نے کئی ادیبوں سے اپنے سوال نامے کے جوابات حاصل کئے، لیکن جواب انھیں لوگوں کے چھاپے جن سے مدیر کی کچھ غرض وابستہ تھی۔ مدیر کو جب کوئی فنکار پسند آجاتا ہے یا کچھ اور مقاصد اس کے ہوتے ہیں تو وہ ناقدین یا قارئین کی پروا کئے بغیر اس فنکار کی تمام ہی تخلیقات شائع کر دیتا ہے۔

میں یہاں اپنا ایک تجربہ ایک ادبی واقعے کے طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی دس سال پرانی بات ہے۔ "سوغات" (کتاب ۴) میں سید محمد اشرف کا افسانہ "قربانی کا بکرا" میری نظر سے گذرا۔ سید محمد اشرف کے چند اچھے افسانوں کا تاثر میرے ذہن پر تھا۔ اس لئے میں نے اسی افسانے کو فوراً پڑھنا شروع کیا۔ افسانہ پڑھ کر اس پر وارث علوی کی تنقید اور اس پر کوئی پندرہ صفحات پر مشتمل سید محمد اشرف کی وضاحت پڑھ چکا تو عجیب سا لگا کہ اس قدر کمزور افسانے پر مدیر نے اتنی محنت کیوں کی اور قارئین کا وقت کیوں ضائع کیا۔ طرفہ تماشا یہ کہ افسانے کی توصیف میں مدیر نے ادارتی نوٹ بھی لکھا۔

"سوغات" ہی کی نویں کتاب میں "میراجی، ہمارا جوگی شاعر" کے عنوان سے حمید نسیم نے ایک مضمون لکھا۔ اس شمارے میں یہ پہلا مضمون تھا۔ حمید نسیم کے اس تنقیدی مضمون کا ایک بیان ملاحظہ ہو:

میں نے اپنی زندگی کی شمع کو دونوں طرف سے جلا
رکھا ہے اور وہ قطرہ قطرہ میری انگلیوں میں سے بہے جا رہی ہے۔

مضمون پڑھ کر میرے ایک دوست نے کہا۔ "بقول محمود ایاز، حمید نسیم نقاد ہیں۔ اگر یہ تنقیدی مضمون ہے تو پھر ان تمام تنقیدوں کو رد کرنا ہوگا جو حالی سے فاروقی تک لکھی گئی ہیں۔"

"سوغات" کے آخری دور کے شماروں میں جن افسانہ نگاروں کو خاص طور پر پیش کیا گیا ان میں ضمیر الدین احمد، سید رفیق حسین، نیر مسعود اور آصف فرخی نمایاں ہیں۔ "سوغات" ہی کے صفحات پر نیر مسعود کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں کہ "اس قدر خوبصورت compact اور organised نثر کوئی دوسرا (بیدی اور انتظار حسین کے علاوہ) نہیں لکھ رہا ہے۔" ساتھ ہی فاروقی کا یہ بھی کہنا ہے: "ہمیشہ یہ کرید ہوتی رہی کہ ان میں کیا ہے، یہ کیا ہے، وہ کیا ہے، وہ کیوں ہے لیکن کچھ نہیں ہے۔ بعد میں بھی کچھ نہیں ملتا۔ لیکن یہ کیوں ہو رہا ہے میرے لئے دلچسپ ہے۔" بیگ احساس نے کہا۔ "نیر مسعود اردو افسانے کی دنیا میں ذرا دیر سے داخل ہوئے، ان کا افسانوی مجموعہ "سیمیا" دس برس قبل شائع ہوا تو ادبی حلقے چونک گئے۔ یہ افسانے منفرد تھے۔ یہ فیشن زدہ تجریدی اور علامتی افسانوں سے مختلف تھے۔ ہمارے نقادوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان افسانوں کی تنقید کس طرح کی جائے... جو تنقیدی مضامین ہیں وہ گنجلک اور انگریزی اصطلاحوں کے سہارے لکھے گئے ہیں۔" ایک اور اہم نقاد فضیل جعفری نے لکھا "مجھے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ لوگ نیر مسعود کو اردو کا وزیر آغا بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔" نیر مسعود کے بارے میں ایک اور دلچسپ اظہار بیان محمد علوی کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "نیر مسعود کا افسانہ "تحویل" پڑھ کر سمجھ نہ پایا تو سلام بن رزاق کا سہارا لیا۔ انھوں نے جو سراغ لگائے ہیں وہاں تک نیر مسعود بھی نہ پہنچ پائے ہوں گے۔ ہم جیسے تو سات جنم لے کر بھی اندھیرے ہی میں رہیں گے۔"

خیال رہے کہ جدیدیت کے عروج میں جن افسانہ نگاروں کا نام آتا رہا ان میں نیر مسعود شامل نہیں ہیں۔ اسی طرح سید رفیق حسین کے بارے میں کسی اور کا نہیں بلکہ فضیل جعفری ہی کا بیان پڑھئے: "ان افسانوں میں انسانی گہرائیوں میں اترنے اور ان میں سے متعلق پیچیدگیوں کو سمجھنے کی کوشش کا فقدان ہے۔ شاید یہ میری بدقسمتی ہے کہ مجھے رفیق حسین کے جانور بھی زیادہ متاثر نہیں کر سکے۔"

نقادوں کی مہربانیاں

آصف فرخی نے ادھر بہت کچھ لکھا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے سارے اہم رسالوں میں ان کی تحریریں چھپتی ہیں۔ "سوغات" کتاب (۵) کے بارے میں گیا (بہار) کے منصور عالم نے لکھا ہے: "اس کا بڑا عیب آصف فرخی کا مضمون ہے۔ ان کا بے لگام "لکھاڑیا پن" ہے۔ وہ کیا لکھتے ہیں آئینے کو بھی حیرت ہوتی ہے۔ وہ ایک پاؤ دودھ میں اتنا پانی ملا دیتے ہیں کہ بس پانی دودھ میں دھلا ہوا

دکھائی دے۔ آپ اس کو متھتے رہیے ملائی ہرگز نہ نکلے گی۔" کوئی اور نہیں قمر احسن جیسے اہم افسانہ نگار نے آصف فرخی کو "آشوب اور تومہ کا افسانہ نگار" قرار دیا ہے۔ "سوغات" میں یہ مضمون چھپا۔ "شاعر" کے ہم عصر اردو ادب نمبر میں اس کا حوالہ دیا گیا۔ "حضرت علی نے ایک بار اپنے خطبہ کے دوران فرمایا کہ آنے والا دور اتنا پرآشوب ہوگا کہ اس دور میں وہی پرسکون رہے گا جو تومہ ہو۔ کسی نے اٹھ کر سوال کیا یا امیرالمومنین یہ تومہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا تومہ وہ جو کسی کو نہ جانتا ہو اور جس کو کوئی نہ جانتا ہو۔" حضرت علی نے یہ بات ایسے شخص کی توصیف میں کہی جو گمنام رہنا پسند کرے۔ یہاں آشوب کا محاورہ تو سمجھ میں آتا ہے لیکن تومہ کی اصطلاح کا کوئی دوسرا مفہوم سمجھنے سے میں قاصر ہوں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب لوگ کسی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں تو وہ دوسروں اور خود اپنی حدود کو پار کر جاتے ہیں۔ وارث علوی کی چٹخارہ دینے والی زبان کا میں دلدادہ نہیں ہوں، لیکن کبھی کبھی وہ درون میں جھانکنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے آصف فرخی کی تحریر کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ان کی "تحریر معمولی ہے جس میں ریڑھ کی ہڈی نہیں ہوتی۔"

اب آتے ہیں ضمیرالدین احمد کے افسانوں کی طرف۔ اگر میں کہوں کہ مجھے ضمیرالدین احمد کے افسانے پسند نہیں ہیں تو پھر مجھے افسانے لکھنا تو دور رہا افسانے پڑھنے کا بھی حق نہیں پہنچتا۔ شمیم حنفی اور بلراج مین را جنھوں نے ضمیرالدین احمد سے مجھ کو متعارف کروایا، "سوغات" کے ایڈیٹر محمود ایاز جنھوں نے دور سوم کی پہلی کتاب میں ضمیرالدین احمد کے ایک ساتھ چھ افسانے چھاپے، "شب خون" جیسے نامور جریدے کے ایڈیٹر ہی نہیں، انتظار حسین، نیر مسعود اور عرفان صدیقی جیسے ادیبوں نے بھی ضمیرالدین احمد کے فن کو دل کھول کر سراہا ہے۔ ان سب سے مرعوب ہو کر میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں بھی ان افسانوں کو پسند کرتا ہوں بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں ان افسانوں کو اردو کے درجۂ اول کے افسانوں میں ہرگز نہیں رکھ سکتا جیسا کہ ان میں کے بعض مدیروں اور نقادوں نے کیا ہے۔ جہاں تک پیشکش، زبان اور فنی نزاکتوں کا تعلق ہے ان کے خلاف ایک لفظ بھی کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن ایسا کیوں ہوا کہ جب ضمیرالدین احمد کے افسانوں کا مجموعہ "سوکھے ساون" ان کی رحلت کے ایک سال بعد ۱۹۹۱ میں چھپ کر آیا تو پاکستان میں کوئی خاص چرچا نہ ہوا۔ ممتاز شیریں کے مطابق وقار عظیم کا مضمون "ساقی" میں چھپا تو انھوں نے ضمیرالدین احمد کا سرسری ذکر کر دیا۔ کم و بیش ہندوستان میں بھی یہی ہوا جب "سوغات" کی پہلی کتاب میں ضمیرالدین احمد کے چھ افسانے ایک ساتھ چھپ کر منظر عام پر آئے۔ "سوغات" کے مدیر کو ان افسانوں پر مذاکرے کا اہتمام کرنا پڑا۔ شمس الرحمٰن فاروقی، نیر مسعود اور عرفان صدیقی نے حصہ لیا اور کتاب نمبر ۲ میں اس مذاکرے کو شائع کیا گیا۔ پھر بھی ان افسانوں کو وہ شہرت نہ ملی جو منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، انور سجاد، سریندر پرکاش، مظہر الزماں خاں اور چند دوسرے افسانہ نگاروں کو ملی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ضمیرالدین احمد کے افسانوں میں حسن، جنس، اور مرد و عورت کے باہمی رشتوں کی ہماہمی اور پیچیدگی کو تو بڑی خوبصورتی اور بڑی نزاکتوں سے بیان کیا گیا ہے لیکن ان میں سماجی اور معاشی مسائل کے بیان کی کمی ہے جو کسی بھی معاشرے کے قیام کی بنیاد ہیں۔

ضمیرالدین احمد کے ایک اور افسانے "گلبیا" کے بارے میں مشفق خواجہ نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ "کراچی میں "گلبیا" کی بڑی دھوم مچی ہے۔ چند جملے تو لوگوں نے زبانی یاد رکھے ہیں۔ بہرحال بڑی خوبصورت اور مزے دار کہانی ہے۔" اس افسانے کو "نقوش" نے نہیں چھاپا، "نیا دور" میں چھپا تو کراچی کے ایک صاحب اے۔ ایچ۔ خان نے ایڈیٹر کو لکھا: "یہ اتنا عریاں ہے کہ کوئی شریف آدمی اس کو نہیں پڑھ سکتا، اس کا ہر مکالمہ عریاں نویسی کے عروج کو چھوتا ہے ...میرے لیے ایک قیامت بپا ہو گئی جو اسے گھر میں لانے کا ذمہ دار تھا۔"

ادب میں عریانیت کیا ہوتی ہے اور کیا نہیں ہوتی اس فیصلے کا حق کسی مدیر کو پہنچتا ہے نہ کسی ادیب کو اور نہ کسی نقاد کو، چہ جائے کہ ایک ایسے قاری کے الزام کو قبول کیا جائے جو جنسی تہذیبی لطافتوں سے نابلد ہے۔ لیکن کسی ادیب کی ساری تحریروں میں عورت ہی عورت ہو اور جس کے بیان سے سماجی حس بیدار نہ ہوتی ہو اور نہ ہی وہ انسان کے دکھوں میں شامل ہو کر اس کے زخموں پر پھاہا رکھ سکتا ہو تو ایسی تخلیقات بہرحال ادب عالیہ میں جگہ نہیں پا سکتیں۔ اپنے طور پر چاہے آپ اس کے سر پر ہیروں جواہرات کا تاج ہی کیوں نہ رکھ دیں۔

بعض وقت نقادوں کے تعصبات (Prejudices) بھی ایسے شدید ہوتے ہیں کہ کسی رجحان یا شاعر یا ادیب کے ساتھ بغض للہی رکھتے ہیں اور وہ تنقیدی معیارات کو بھول کر بیان جاری کر دیتے ہیں۔ میں یہاں صرف ایک ہی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وارث علوی نے فکشن کا چاہے وہ مغربی ہو چاہے مشرقی سارا ادب کھنگال لیا ہے۔ ادب میں علامتوں اور تجرید کے استعمال کے خلاف وہ فرماتے ہیں "میرا معاملہ بیالوجیکل ہے کہ جو عورت مجھے پسند نہیں میں اس کے ساتھ سو نہیں سکتا۔" آپ بیالوجیکل ہیں۔ یہ آپ کی جسمانی ترجیحات ہیں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ علامتوں اور تجرید کا استعمال کرنے والا فنکار اگر دنیا کی ساری عورتوں میں حسن تلاش کرتا ہے تو آپ خوش نہیں ہونا چاہیے۔ نہ ہوئیے۔ آپ کسی فنکار کے وسعت قلب و ذہن کو ملزم نہیں قرار دے سکتے۔ شمس الرحمٰن فاروقی تخلیقی تجربات کی مکمل آزادی کی بات کرتے ہیں تو آپ اسے گناہ کہتے ہیں۔ آپ فنکارانہ آزادی کو بھی ڈسپلن کے چوکھٹے میں بٹھانا چاہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ڈسپلن سماج کا عائد کردہ ایسا اوزار ہے جو ہر آزادی پر اپنا پہرہ بٹھانا چاہتا ہے۔ ویسے بیالوجی کی باتیں سائنس یا سماجیات کا موضوع ہو سکتی ہیں، لیکن یہ تنقید کی زبان ہرگز نہیں ہے۔

اس مرحلے پر یہ بات بے موقع نہ ہوگی کہ ہمارے اہم نقادوں کے درمیان کسی فن پارے کے بارے میں اتفاق رائے کا نہ ہونا بھی تنقید کو دوسری اصناف کے مقابلے میں غیر معتبر ٹھہراتا ہے۔ یوں بھی تنقید تخلیق کے بعد کا مرحلہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ نقادوں کے بیچ بھی وہی اختلاف رائے ہے جو قارئین میں

ہے۔ بلراج کومل کی ایک نظم ہے "جواز"۔ اس پر وزیر آغا، اختر الایمان اور محمود ایاز کی رائے ایک سی ہے جب کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس سے شدید اختلاف کیا ہے۔ اول الذکر تینوں کی رائے ہے کہ نظم دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے اور الفاظ کا دروبست اس میں بے ہنگم ہے۔ فاروقی ان اعتراضات کو رد کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نظم ڈبلیو۔ بی۔ یے ٹس کی نظم Sailing to Byzentium کے رتبے کی نہ ہو کر بھی اس سے مشابہ ہے۔ اسی طرح سلام بن رزاق کے افسانے "انجام کار" کے بارے میں گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ وہ ایک اہم افسانہ ہے جب کہ وارث علوی کی نظر میں وہ ایک کمزور افسانہ ہے۔ بحیثیت قاری میں نہ شمس الرحمٰن فاروقی سے متفق ہوں اور نہ گوپی چند نارنگ سے۔ سید محمد اشرف کے افسانے "قربانی کا بکرا" کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ محمود ایاز نے اسے بہت ہی اہم افسانہ قرار دیا تو دوسرے نقادوں نے اسے کمزور افسانہ پایا۔

میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ انسانی زندگی چاروں کھونٹوں کے اطراف طواف کر رہی ہے۔ ان میں کا ایک کھونٹ "احساس" ہے۔ آپ چاہیں تو "واقعہ" اور "کہانی" کو ایک ہی کھونٹ مان لیں۔ میرا بھی جی یہی چاہتا ہے۔ واقعہ اور کہانی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کہانی واقعہ ہی ہے اور واقعہ ایک کہانی۔ اب رہ جاتے ہیں صرف تین کھونٹ۔ واقعہ، لفظ اور احساس۔ واقعہ (یا کہانی) جو داستانوں سے ہو کر پریم چند کے ہاتھوں میں آیا تو نیا افسانہ بنا۔ صرف افسانہ تو راشد الخیری، یلدرم، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری اور دیگر لوگ لکھ رہے تھے۔ باقاعدہ فکشن کا آغاز تو پریم چند ہی سے ہوا۔ اسی لئے میں نے ان کے افسانوں کو نیا افسانہ کہا ہے۔ "عشق دنیا و حب وطن" سے لے کر "کفن" تک انھوں نے شاید دو سو سے زائد افسانے لکھے۔ انھیں پڑھ کر لوگوں نے اپنی راہیں نکالیں۔ جنھوں نے راست انھیں نہیں پڑھا ان ادیبوں کو ضرور پڑھا جو پریم چند کو پڑھ چکے تھے۔ اس طرح دیے سے دیا جلتا رہا اور روشنیاں پھیلتی گئیں۔ کبھی یہ روشنیاں مدھم پڑ گئیں اور کبھی تیز۔

لیکن مجھے یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں ہے کہ اگر منٹو نے "پھندنے" نہ لکھا ہوتا جب بھی جدیدیت کا رجحان جس کی داغ بیل حلقۂ ارباب ذوق نے ڈالی تھی، چل پڑا ہوتا۔ ادب کی تخلیق کے لئے کسی منشور کی یا کسی مجوزہ رجحان کے اعلامیہ کی ضرورت نہیں ہے۔ انسانی زندگی ایک ایسا درخت ہے جس کی تہ میں فنون لطیفہ کی جڑیں پیوست ہیں۔ کونپلیں پھوٹتی رہیں گی۔ پیڑ بنتے رہیں گے۔ پھول پتوں اور پھلوں کی افزائش ہوتی رہے گی۔ یہ کہنا کہ تحریک، رجحان یا مابعد رجحان ان میں کوئی بھی روایت سے کٹا ہوا ہے، ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ کوئی پیڑ کسی جڑ کے بغیر ہی زمین پر اگ آیا ہے۔

انتظار حسین کے لئے بہت کچھ مباح ہے اور وہ کہہ سکتے ہیں کہ "ایم۔ اسلم کا ذکر آگے سے پیچھے لے جائے گا۔" یا یہ کہ "منٹو کا افسانہ پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نقارہ بج رہا ہے۔ بیدی کے افسانے میں عام اپیل کم ہے اور منجھے ہوئے ادبی ذوق کی ضرورت زیادہ۔" "عینی کے یہاں امام باڑہ کی زبان نہیں بلکہ نئے لکھنؤ اور وہ بھی کافی ہاؤس کی زبان ہے۔"

محمد طفیل کا خیال ہے کہ "انتظار حسین کی افسانوں کی یکسانیت عیب بن گئی ہے۔" اس طرح کے اظہار کی تنقید میں مکمل گنجائش ہے لیکن جو بلند پایہ تخلیقات ادب عالیہ میں جگہ پا چکی ہیں انھیں ماننا ہی پڑے گا۔

اپنے دور کے افسانہ نگاروں کے بارے میں جن کی تخلیقات میں نے کبھی بڑے سکون سے اور کبھی ادھر ادھر سے پڑھی ہیں، میں اپنی رائے حتمی نہیں سمجھتا۔ بات اعتماد کی کمی یا زیادتی کی نہیں ہے۔ ادب کا معاملہ مفروضات کا ہے، عقیدے کا نہیں۔ اس کا کینوس وسیع ہے کہ وہ کسی مذہب سے وابستہ نہیں ہوتا۔ کہانیاں تو بزرگ خواتین کے پہلو میں لیٹ کر سنی جاتی تھیں۔ ادھر کہانی ختم ہوئی ادھر نیند آگئی۔ کبھی کہانی سنتے سنتے بھی نیند آجاتی تھی۔ افسانے لکھے جاتے ہیں بالغوں کو جگائے رکھنے کے لئے۔ صرف ایک حوالہ رشید امجد کی کہانی کا یہاں دے سکتا ہوں۔ چار صفحات کی کہانی سے صرف تین سطریں درج ہیں۔

"دھند دبے پاؤں زینہ زینہ اس طرح اتری کہ شہر اس کی لپیٹ میں آگیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔"

"...لیکن قفس کے باہر بھی قفس ہی تھا اور اندر کی گھٹن اور تنگی داماں باہر بھی تھی۔"

"دروازے کے باہر دھند تھی اور اندر تیز روشنیوں میں چمکتی چیزیں۔ دھند گہری ہو جائے تو چیزوں کے درمیان ایک خاموش سمجھوتا ہو ہی جاتا ہے۔"

سماجی معیارات کیسے ہی ہوں استحصالی قوتوں کی موجودگی میں دھند ہر دور میں چھائی رہتی ہے۔ اسے نظر انداز کرتے ہوئے ہم چمکتی روشنیوں کی طرف دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ انجام کار یہ دھند گہری ہو جاتی ہے اور سب پر چھا جاتی ہے۔ تب ہمارا گھر سے باہر نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ باہر کے ماحول کا نقشہ ہمارے دور کے شاعروں نے کیا خوب کھینچا ہے۔

یہ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

دھوپ ساون کی بہت تیز ہے دل ڈرتا ہے
اس سے کہہ دو کہ ابھی گھر سے نہ باہر نکلے

(احمد مشتاق)

اداس شام اکیلی کھڑی ہے چوکھٹ پر
جو لوگ صبح کے نکلے ہوئے تھے گھر نہیں آئے

(عرفان صدیقی)

ایسے سماں میں اگر کوئی افسانہ نگار اس موضوع کو اپنے کسی افسانے کا مرکزی تھیم قرار دیتا ہے تو اس کے واقعات میں صداقت ہو کہ نہ ہو، ہمارا احساس جاگ پڑتا ہے۔ تب واقعے کی اہمیت اس کا احساس میں ڈھل جاتا ہے۔ اب واقعہ کی جگہ احساس نے لے لی ہے اور اس طرح افسانہ میں صرف دو کھونٹ رہ جاتے ہیں۔ "لفظ" اور "احساس"۔ لفظ ایک علامت ہے اور احساس اس علامت کی شناخت ☆☆☆

مٹی کا تعاقب

خالد جاوید

شمیم حنفی کے نام

اور وہ دن
وہ دھندلکا، وہ ویران موڑ
جس میں کسی کا ہارا ہوا دل تیاری کرتا ہے۔
مرنے کی

(پابلو نرودا)

یہ آندھی کے آنے سے ٹھیک پہلے کا اجالا تھا۔ خوب صورت مگر مٹتا ہوا اجالا۔ آندھی کا کالا مٹیالا غبار آ کر آسمان کے ایک ٹکڑے پر ٹھہر گیا تھا، اسی چھوٹی سی ندی کے کنارے بنے ہوئے پوسٹ مارٹم ہاؤس کی تمام اشیا اس خاموش اجالے میں اچانک زیادہ بامعنی، انوکھی اور پاکیزہ نظر آئیں۔ سورج ویسے بھی ڈوبنے ہی کو جا رہا تھا۔ سیاہ ہونے سے پہلے کی اداس سفیدی میں وہ لاش بھی زیادہ بامعنی بن گئی تھی۔

ابھی ہوا بالکل ساکت ہے، ندی کے کنارے اگے ہوئے درخت پتھروں کے مجسموں کی طرح قائم اور دائم کھڑے ہیں۔ قطار سے کھڑے، وہ ایسے اداکار نظر آتے ہیں جنھیں بس ایک اشارے کا انتظار ہے۔ آندھی کا ایک جھونکا اس منظر کو بدلنے ہی والا ہے۔ ایک کالی لکیر، سفیدی اور اجالے کی طرف رینگتی ہوئی آئے گی اور اسے پونچھ کر رکھ دے گی۔ سب کچھ قابل رحم حد تک اکیلا، بلکتا ہوا اور اجاڑ نظر آئے گا۔

لاش کسی ادھیڑ عمر کے آدمی کی تھی، صبح سے اسی جگہ، مردہ گھر کے پتھریلے چبوترے پر پوسٹ مارٹم کے لیے پڑی ہوئی تھی۔ مرنے والے کے جسم پر وہی لباس تھا جو اس نے کل رات پہنا تھا اور پھر ریلوے پلیٹ فارم پر سے نیچے اتر کر ایک ریل گاڑی کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

بھورے رنگ کی سوتی قمیص، اور کالی گھسی ہوئی پتلون جس کی دونوں جیبوں کے بدرنگ استر خالی تھیلیوں کی طرح باہر لٹک رہے تھے۔ پیروں میں ناپ سے بڑی ہوائی چپلیں، سر گنجا ہونے لگا تھا۔ ماتھے پر ایک بڑا سا گومڑا ابھر آیا تھا۔ سینہ غیر معمولی طور پر چوڑا مگر کلائیاں بے حد پتلی پتلی سی تھیں، ہاتھوں کی انگلیاں بھی چھوٹی مگر فربہ تھیں جن کے تقریباً سارے ناخن غائب تھے۔ اسے انگلیوں کے ناخنوں کو ہر وقت دانتوں سے کترنے کی عادت تھی۔

لاش کے کانوں اور ناک سے خون رِس رہا تھا۔ مردہ گھر کے سامنے ندی کے دوسرے کنارے پر شمشان گھاٹ بھی تھا مگر اس وقت وہاں کسی چتا کی روشنی نہ تھی۔ دو سور لاش کے آس پاس بھٹک رہے تھے۔ کچھ مکھیاں اپنے گندے سبز پروں کے ساتھ بار بار بھنکتی ہوئی لاش کے منھ پر بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں، مگر لاش کے سرہانے بیٹھا ایک اداس اور کمزور بندر بار بار دانت نکوس کر انھیں ہراساں کر دیتا تھا۔

کل رات تقریباً گیارہ بجے وہ شہر کے اس مضافاتی علاقے میں ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر کھڑا اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا۔ پلیٹ فارم ویران تھا اور وہاں بہت عمدہ ہوا چل رہی تھی جو کہ اس قسم کے اسٹیشنوں پر ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔

سگریٹ پھینک کر وہ لنگڑاتا ہوا پلیٹ فارم پر لگے ہوئے نل پر گیا اور اس کی ٹونٹی سے گرتی ہوئی ٹھنڈے پانی کی دھار سے اپنے حلق کو جی بھر کر تر کیا پھر زور زور سے کلیاں کیں۔ اسی وقت ریلوے لائن پر لگے سگنلوں کے رنگ میں تبدیلیاں ہوئیں اس نے اپنی بھوری قمیص کی آستین سے اپنے ہونٹ اور ٹھوڑی پونچھا، پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا پلیٹ فارم کے سرے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

دور روشنی کا ایک نقطہ چمک رہا تھا۔ لوہے کی پٹریوں کی جیومیٹری واضح ہونے لگی۔ وہ آہستگی اور وقار کے ساتھ پلیٹ فارم سے نیچے اتر کر پٹری پر کھڑا ہو گیا۔ پٹری کے ارتعاشات نے اس کے پیروں کو وہاں ٹکنے نہ دیا۔ اسے اس وقت وہاں غور سے دیکھنے والا کوئی نہ تھا، سوائے سیاہ رنگ کے ایک بڑے سے کتے کے۔

وہ ریل سے کٹ نہ سکا۔ دھواں اگلتے ڈیزل انجن نے اسے پتہ نہیں کس زاویے سے چھوا کہ پٹری سے ہٹ کر بائیں طرف وہ فٹ بال کی طرح لڑھکتا چلا گیا۔ اس کا سر زمین سے دو بار ٹکرایا۔ پھر وہ ساکت ہو گیا۔ اس کی لاش کے ساتھ تقریباً وہی سلوک ہو رہا تھا جو لاوارث لاشوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کا کوئی رشتہ دار شاید زندہ نہ تھا۔ وہ جس ادارے میں کام کرتا تھا، اس کے دو لوگ لاش کے ساتھ ضرور رہے۔ پولیس ضابطے کی کارروائی اور تفتیش مکمل کر چکی تھی۔

آج صبح پو پھٹ رہی تھی جب اس کی لاش کو ریلوے لائن سے اٹھا کر باہر کھڑے ایک ٹرک میں ڈال دیا گیا۔ جیسے ہی یہ ٹرک پوسٹ مارٹم ہاؤس جانے کے لیے اسٹارٹ ہوا، جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل کر ایک کمزور اور چھوٹا سا بندر ٹرک کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔

پورا دن گذر گیا مگر پوسٹ مارٹم کرنے کے لیے ڈاکٹر کا پتہ نہیں ہے۔ آس پاس چند اور لاشیں بھی رکھی ہوئی ہیں، ماحول میں مذبح جیسی بو اور بساندھ سرسرا رہی ہے۔ لاشوں پر بغدے اور کلہاڑیاں چلانے والے پوسٹ مارٹم ہاؤس کے ملازمین اپنے بے حس یا وحشی چہروں کے ساتھ صبح سے ہی شراب پی رہے ہیں۔ نشے میں دھت ہو کر وہ آپس میں دھینگا مشتی کرتے ہوئے ایسے فحش چٹکلے بھی سنا

رہے ہیں جو کہ مردوں کے پوشیدہ اعضا سے متعلق ہیں۔ اس دھینگا مشتی میں بار بار ان کے گندے چیکٹ تہبند کھل کھل جاتے ہیں جن سے گھٹیا شراب اور کچے گوشت کی بدبو از کر چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔

پوسٹ مارٹم کے لیے لائی گئی دوسری لاشوں کو گھیرے میں لیے ان کے لواحقین بیٹھے ہوئے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کی عورتیں آہنی آواز میں بین کرنے لگتی ہیں۔ ان کے رونے کی یہ آہنی صدائیں اس پتلی سی ندی کے پانی میں کوئی ہلچل نہیں پیدا کرتیں۔

اس لاش کے سرہانے صرف وہ کمزور اداس بندر بیٹھا ہے جو نشے میں دھت، فحش لطیفے اور گندی باتیں سناتے ہوئے وحشی چہروں والے ملازمین کو کبھی حیرت اور کبھی ملال کے ساتھ دیکھ لیتا ہے۔

آندھی آگئی ہے۔ میرے ناخنوں اور آنکھوں میں ریت بھرنے لگی۔ میں جس لاش کے سرہانے بیٹھا ہوں میرے مالک کی ہے۔ وہ میرا دوسرا مالک ہے۔ اس نے مجھے مرنے سے بچایا تھا۔ مرنے سے تو مجھے ایک معصوم فرشتے نے بھی بچایا تھا۔ میرے پہلے والے مالک نے مجھے زہر دیا تھا۔ وہ ایک سرکس چلایا کرتا تھا۔

یہ بالکل ویسی ہی آندھی ہے۔ ویسی ہی آندھی جو ایک بار، بہت سال گذرے آئی تھی۔ اور ہمارے سرکس کا پنڈال اکھڑ کر دور جا گرا تھا۔ وہ رات کا شو تھا۔ جھولے والے خطرناک، مقبول اور جان لیوا کرتب کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اچانک اس آندھی نے سب کچھ تہس نہس کر دیا۔ سارے فنکار اور جوکر اپنی اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر زمین پر اوندھے لیٹ گئے۔ زمین کانپ رہی تھی۔ چاروں طرف دل اور سینے کو چاک کرتا ہوا آندھی کا بھیانک زناٹا تھا۔ سارے جانور، ہاتھی، شیر، جس میں جوکروں کے منھ پر پتا ہوا سفید رنگ کچی مٹی میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔
طوطے اور بندر سہم گئے تھے۔ سب نے اپنی گردنیں ڈال دی تھیں اور کانپنے لگے تھے۔ میرا دل بھی بھیانک اندیشوں میں گھر کر اچھلنے لگا۔ کیا آدمی کیا جانور، سب کے چہرے فق تھے۔ ایک پل کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ ہمارا سرکس ڈوب رہا ہے۔ بالکل اس مشہور زمانہ عظیم سرکس کی طرح جس کے بارے میں، میں نے سنا تھا کہ وہ سمندر کے اس جہاز کے ساتھ ہی پانی کی تاریک گہرائیوں میں غرق ہو گیا تھا جس پر سوار ہو کر وہ اپنے تمام فن کاروں اور جوکروں اور جانوروں کے ساتھ سمندر پار کہیں جا رہا تھا۔

پھر نہ جانے کب وہ آندھی تھم گئی تھی۔ مگر ہمارا سرکس دوبارہ اپنا پنڈال زمین پر نہ گاڑ سکا۔ پنڈال کے اندر سمائی ہوئی دھول اور آندھی کا گرد و غبار ٹیلہ بن کر کھڑا ہو گیا۔ بدرنگ اور خاک سے اٹی، میلی، دھجیاں کمزور رسیوں کے جھولے اور سیڑھیاں دوبارہ چمکائی اور درست نہ کی جا سکیں جانوروں کے پنجرے زنگ کھا کر گلنے اور ٹوٹنے لگے۔ سرکس کی سرچ لائٹ جو اس چھوٹے سے شہر کے آسمان کو رات میں روشن کرتی تھی، ہمیشہ کے لیے اندھی ہو گئی۔

سب بھوکوں مر رہے تھے۔ میرے سننے میں آیا کہ ہماری سرکار اب سرکس کو بڑھاوا دینے کے لیے کوئی امداد نہیں دے گی۔ بلکہ یہ بھی کہ اب تو دنیا کا وہ دوسرا بڑا اور طاقتور ملک بھی سرکس کو نظرانداز کر چکا تھا جہاں سرکس کو غریب مزدوروں اور بچوں کی تفریح کا ایک واحد اخلاقی ذریعہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ دنیا کے حالات اور معاملات میں کیا تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ کون سی ایسی تفریحات کھیل اور تماشے وجود میں آگئے تھے جو سرکس کو حاشیے پر دھکیل چکے تھے۔ مگر کوئی خطرناک تماشا تھا ضرور جو سب کچھ مسمار کیے دیتا تھا۔ اس کا پراسرار اور بے رحم حملہ پتہ نہیں کون سے نادیدہ مقامات سے جاری تھا۔

تب مالک نے ایک دن سرکس کا سارا سامان، اشیا اور جانور نیلام کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کنگال ہو چکا تھا۔ مجھے گرمیوں کی وہ سخت دوپہر یاد ہے، سرکس کا تنبو دھول سے اٹا ہوا زمین پر بے چارگی سے پڑا تھا۔ اس میں جگہ جگہ بڑے بڑے سوراخ تھے۔ میلی رسیوں کے جھولے اور ان کے کچھے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ سب سے زیادہ قابل رحم وہ سرچ لائٹ ہی تھی۔ وہ روشنی جو رات میں گھوم گھوم کر شہر کے آسمان کو چند لمحوں کے لیے روشن کر دیتی تھی ڈھلتی دوپہر میں، ٹوٹی پھوٹی سی اور زنگ سے خستہ حال ہو کر، زمین پر ادھر ادھر لڑھک رہی تھی۔

ہمارے فنکاروں اور جانوروں کے پیٹ میں روٹی نہ تھی، ان کے تن کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ رہے تھے۔ ایک ہاتھی کی آنکھوں سے تو ہمیشہ آنسو بہتے رہتے تھے۔

یہ سب دیکھ کر میرا دل بھر آیا، میں ایک معمولی چھوٹا سا غریب بندر کسی کے لیے کر بھی کیا سکتا تھا۔

پتہ نہیں کیا کیا نیلام ہوا۔ شیر اور ہاتھی عجائب گھر والے لیکر چلے گئے۔ اس عرصے میں چھوٹے چھوٹے جانور جیسے بندر، طوطے اور کبوتر بہت بیمار پڑ گئے تھے۔ خاص طور سے طوطوں کی لیس دار بیٹوں سے سارا خیمہ بھرا پڑا تھا۔

سرکس کے مالک نے بیمار جانوروں کو زہر دے کر مارنے کا منصوبہ بنایا۔ میں بھی بیمار تھا۔ مجھے اس قسم کی الٹیاں آرہی تھیں جو بچپن میں مجھے اس وقت آئی تھیں جب مجھے سڑکوں پر مداری کے ساتھ تماشا دکھانے والے اپنے ماں باپ سے جدا کر کے سرکس لایا گیا تھا۔ میں بخار میں جل رہا تھا۔

اس شام خیمے میں زہر ملا کر آٹا گوندھا گیا۔ بیمار طوطوں اور کبوتروں کو کھلانے کے لیے آٹے کی گولیاں تیار کی گئیں اور میرے لیے خاص طور پر ایک بڑی سی ملائم گول چپاتی پکائی گئی۔ جب وہ چپاتی میرے سامنے لائی گئی تو میں نے اپنا سر گھما لیا۔ مجھے قے آنے لگی۔ تب سرکس کے مالک نے غصے سے میرے پیٹ پر اپنے جوتے کی نوک سے لات رسید کی۔

سرکس کا مالک ایک قوی ہیکل عیسائی تھا۔ اس کی آنکھیں اور سر کے بال قطعی طور پر بھورے تھے مگر حیرت انگیز حد تک اس کے جسم کی رنگت بالکل سیاہ تھی۔ اس وقت میں نے اس کی آنکھوں میں جو شدید بے رحمی دیکھی وہ شاید پہلے کبھی سامنے نہ آسکی تھی۔ اس بے رحمی سے ڈر کر میں اپنے بخار زدہ جسم کے ساتھ دو پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ہاتھ سونگھ کر میں نے دو تین قلابازیاں کھا کر اسے خوش کرنے کی کوشش کی پھر اس کے سامنے پھوہڑ پن کے ساتھ وہ تمام کرتب دکھانا

شروع کر دیے۔ جن کی وجہ سے سرکس میں میری شہرت تھی۔ مگر ایک تو وہاں اب ایسی اشیا نہیں تھیں جو کرتب دکھانے میں میری ساتھی اور مددگار ہوتی تھیں، دوسرے اب میں نے صاف طور پر یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس بار مار کھانے سے بچنے کے لیے کرتب دکھانا بیکار تھا۔ اب تو مجھے زہر بھری چپاتی ہی کھانا تھی۔

سرکس کا وہ نوکر جو جانوروں کو ہمیشہ کھانا ہی کھلانے آتا تھا، اس وقت بیمار طوطوں اور کبوتروں کی چونچیں چیر کر ان کے حلق میں زہریلے آٹے کے گولے ٹھونس رہا تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں میں مچل رہے تھے اور ان کے پر جگہ جگہ سے ٹوٹ کر خیمے میں اڑتے پھر رہے تھے۔

اچانک وہاں سرکس کے مالک کی چھوٹی سی بچی آکر کھڑی ہوگئی۔ اس کے بال بکھر کر ماتھے پر آگئے تھے اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔

"ڈیڈی۔ اس بندر کو مت مارو۔" بچی نے اپنے سخت گیر باپ کی پتلون کا پائنچہ کس کر پکڑ لیا۔

"چپ رہو۔ یہ جانور بیمار ہیں۔ میرے پاس ان کے علاج کے لیے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ یہ سسک سسک کر مریں اس سے اچھا ہے کہ ایک بار ہی میں ان کا خاتمہ ہو جائے۔"

"نہیں۔ یہ بندر میرا ہے۔ میں اسے پالوں گی۔" بچی رونے لگی۔

"خیمے کے ایک گوشے میں دم توڑتے ہوئے طوطوں اور کبوتروں کا ڈھیر ابھرنے لگا۔ سرکس کے مالک نے ایک زور کا طمانچہ بچی کے گال پر رسید کیا۔ میں نے اس طمانچے کی بے رحم، سخت اور کریہہ چوٹ سے اپنی تھوتھنی کو ڈھلکتے پایا، میں زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور سر جھکا کر زہریلی روٹی کھانے لگا۔

سرکس کا مالک روتی بلکتی بچی کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ بچی روتے روتے بار بار مجھے مڑ کر دیکھے جاتی تھی۔

آندھی کے غبار بھرے جھکڑ بارش میں تبدیل ہوگئے تھے۔ فضا میں چھائی ہوئی ساری دھول دھل کر شفاف اور مٹی بہہ کر زمین میں جذب ہونے لگی۔ بھیگتے ہوئے سور بے ہنگم انداز میں ادھر ادھر بھاگے۔ مردہ گھر کی گاتھک (Gothic) طرز کی بنی چھوٹی سی عمارت دھند بھری بارش کے شور میں ڈوبنے لگی۔

لاش بارش میں بھیگ رہی تھی۔ لاش کا چہرہ پانی سے دھل دھل کر شفاف اور تر و تازہ نظر آیا جیسے اس نے ابھی ابھی شیو کیا ہوا۔ لاش کے کانوں اور ناک سے نکلا ہوا خون بارش کے پانی میں بہہ بہہ کر گم ہو رہا تھا مگر صبح سے رستے ہوئے خون نے جم کر پتھریلے چبوترے پر سیاہ رنگ کا جو بڑا سا دھبہ بنا لیا تھا وہ اپنی جگہ بدستور تھا۔ اس دھبے کی شکل کچھ کچھ تاش کے پتے سے ملتی تھی۔

چھتری لگائے ہوئے ایک دراز قد عیسائی ڈاکٹر عمارت میں داخل ہوا۔ اس کی سیاہ رنگت پر اس کی قطعی بھوری آنکھیں اور بال غیر مناسب اور خطرناک نظر آتے تھے۔ ڈاکٹر کے قدم نشے میں لڑکھڑا رہے تھے۔

دو لوگوں نے مل کر لاش کو اٹھایا جس طرح کسی وزنی بوری کو اٹھاتے ہیں۔ پھر وہ اسے پوسٹ مارٹم کے لیے اندر کے کمرے میں لے جانے لگے۔ لاش کے سرہانے بیٹھا بھیگتا ہوا بندر خاموشی سے اٹھا اور سامنے ایک گھنے سے درخت کے نیچے تاریکی میں جا کر بیٹھ گیا۔ بارش کے شور میں دور کسی لاش کے آس پاس سے کچھ عورتوں کے رونے کی آوازیں ابھریں پھر ہوا کے رخ نے انھیں معدوم کر دیا۔

مرنے والے کے ادارے میں کام کرنے والے دو آدمیوں نے اطمینان کی سانس لی۔

"اب زیادہ وقت نہیں لگے گا" ایک نے سگریٹ سلگایا۔

"ہاں اب تو بس مشکل سے پندرہ بیس منٹ۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"یار۔ یہ لوگ بڑی بے دردی سے اوزار چلاتے ہیں۔"

"ان کا روز کا کام ہے، اسی لیے تو نشے میں دھت رہتے ہیں۔" دوسرا بولا۔

"ہاں کیا کریں۔ مگر سننا ذرا کیا اندر کمرے میں کوئی فلمی گانا بھی گا رہا ہے؟"

"شاید دھیان بٹانے کے لیے وہ گانا گا رہے ہوں۔"

"ویسے ان لوگوں کو کرنا کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ یہ بس جگر کا معائنہ کرتے ہیں۔ اسی سے رپورٹ تیار کی جاتی ہے۔" پہلے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تم دیکھ لینا۔ رپورٹ میں ریبیز (Rabies) کی بات ضرور نکل کر آئے گی۔"

"احمق ہوگئے ہو۔ ریبیز کے دورے اس طرح نہیں پڑا کرتے۔ کتے نے تو اسے شاید کبھی بچپن میں کاٹا تھا۔"

"نہیں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ اکثر وہ اس طرح کا برتاؤ کرتا تھا۔ بہکی بہکی باتیں۔ چہرہ لال۔ اور پانی پینا بالکل بند کر دیتا تھا۔" دوسرا تیزی سے بولا۔

"خیر جو بھی ہو۔ اگر ہمیں بھی تھوڑی شراب مل جاتی تو کیا خوب تھا۔ دیکھ رہے ہو آج موسم کتنے مزے کا ہو گیا ہے۔" پہلے نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ مگر آج ہمارے نصیب ایسے کہاں۔" دوسرے نے ٹھنڈی سانس لی۔ "کل کو داہ سنسکار بھی ہمیں ہی کرنا پڑے گا۔ ویسے بڑے صاحب نے اپنی جیب سے کافی مال دے دیا ہے۔ ورنہ چندے کی نوبت آجاتی۔"

"آج کل لکڑی بہت مہنگی ہے۔ کفایت سے کام لیں گے" پہلے نے مشورہ دیا۔

"یہ تو پن کا کام ہے۔ اس میں تو ویسے بھی کفایت ہی کرنا چاہیے۔"

دوسرا ہنس پڑا۔ بارش رک گئی۔ صرف پیڑوں سے بوندیں گر رہی تھیں۔ رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ سناٹے میں اندر کے کمرے سے کچھ عجیب سی آوازیں آئیں۔ جیسے کسی سخت شے پر لوہے کی وزنی شے سے وار کیا جا رہا ہو۔

وہ دونوں خاموش ہوگئے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

اچانک مردہ گھر کی بجلی فیل ہوگئی۔ اندر سے آنے والی آوازیں بھی

ختم گئیں۔

تھوڑی ہی دیر میں دھواں اگلتا ہوا، بے ہنگم شور برپا کرنے والا جنریٹر اسٹارٹ ہوگیا۔ جنریٹر کے اس مہیب شور میں اگر پھر وہ آوازیں ابھری ہوں تو دب گئی ہوں گی۔ کم از کم ان دونوں نے اب ان آوازوں کو نہیں سنا۔

یہ جو میرے سینے پر لگاتار پوری طاقت کے ساتھ لوہے کا سیاہ، سخت اور بدہیئت بغدہ چلایا جارہا ہے، کیا آپ کو لگتا ہے کہ مجھے تکلیف نہیں ہورہی ہے؟

آپ تمام لوگ یہی سمجھتے ہیں بلکہ یقین کرتے ہیں کہ روح میرے جسم سے پرواز کر چکی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر روح نام کی کوئی شے ہے تو ابھی وہ میرے جسم سے نکل کر باہر نہیں گئی ہے۔ نہ ہی اس کا میرے جسم کے مساموں سے دھواں بن کر نکلنے، حقیقت مطلق بن جانے اور کسی درخت پر بے نیازانہ بیٹھ کر میرے جسم کا نظارہ کرتے رہنے کا اس کا کوئی ارادہ ہے۔

دراصل آتما نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ یہ مجھے اب معلوم ہوا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں ایک لاش ہوں۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لاش بھی ایک جسم ہے اور جسم کبھی مرتا نہیں۔ اسے فنا نہیں آتی۔

مجھے بغدے کے ان بھیانک واروں سے بہت تکلیف ہورہی ہے۔ مگر میرا یہ جسم اب تکلیف دکھ اور سکھ کا ردعمل دوسری طرح کرتا ہے۔ آپ کے لیے یہ صرف خاموشی ہے۔ اصل میں جس چیز کو آپ موت کا نام دیتے ہیں وہ آپ جیسے نام نہاد زندہ انسانوں سے ان کا ایک آلۂ حواس چھین لیتی ہے۔ نقصان آپ ہی لوگوں کا ہوتا ہے۔ ایک خوفناک کمی آپ لوگوں میں واقع ہوتی ہے یعنی زندوں میں مردوں میں ہرگز نہیں۔

ہر انسان کی موت کے بعد آپ زیادہ معذور ہوجاتے ہیں۔ ایک حس سے محروم میرے ساتھ یہ جو بے رحمانہ برتاؤ ہورہا ہے وہ اسی لیے کہ پوسٹ مارٹم ہاؤس کے تمام عملے کے اشخاص یہی سمجھتے ہیں نہ کہ میں مر گیا ہوں اور میری آتما مجھ سے الگ ہوگئی ہے۔

حضرات۔ مجھے کہنے دیں کہ آپ تو ہمیشہ سے ہی جسم کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرنے کے عادی تھے۔ جب آپ کی نظروں میں میں زندہ تھا اس وقت بھی آپ نے میرے جسم کو ہی دکھ یا سکھ پہونچائے تھے۔ روح کے لیے آپ کیا کر سکتے تھے جبکہ اس کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ وہ جسم ہی تھا جو لنگڑاتا تھا، کھانا کھاتا تھا، ذلیل ہوتا تھا اور روتا تھا۔

جسم کوئی ٹین کا کنستر نہ تھا جس میں آتما نام کی کنکریاں پڑی بجتی رہتی تھیں۔ میرے لیے دنیا اب بھی تقریباً ویسی ہی ہے جیسی کہ ریلوے کی پٹری پر کھڑے ہونے سے پہلے تھی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ بس نظر میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ لیکن یہ بھی کچھ اس طرح ہے جیسے کوئی شخص مدتوں بعد اپنا کھویا ہوا چشمہ حاصل کرے اور اسے لگا کر دیکھنے پر اشیا اسے ایک ساتھ پراسرار اور سپاٹ نظر آئیں۔

میں یہ قبول کرتا ہوں کہ اس مادی دنیا سے فرار حاصل کرنے کے لیے ہی میں پٹری پر جا کر کھڑا ہوا تھا۔ مگر اب مجھ پر یہ زیادہ بڑی مصیبت آن پڑی ہے یعنی یہ کہ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ موت اور زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ یہ تو بس ایک تبدیل شدہ جیومیٹری ہے۔ صرف لکیریں ہیں جو بدل رہی ہیں۔ جس طرح ایک دائرہ بے مرکز ہو کر ناقص بنتا ہے اور جب یہ بے مرکزیت اور بڑھتی ہے تو وہ مکانی زاویہ بن کر ہماری ریاضی کا امتحان لینے لگتا ہے۔ مگر یاد رکھئے کہ اس میں کسی فلسفے، عرفان یا آگہی اور آتما جیسی کسی شے کا دخل ہرگز نہیں ہے۔ یہ بہت معمولی واقعہ ہے سب کے ساتھ گزرنے والا۔ میں اب بھی زندہ جسم ہوں اگرچہ اپنی پرانی جیومیٹری تک واپس پہونچنے کے لیے فی الحال میرے پاس وہ لکیریں مٹانے والا ربڑ نہیں ہے۔

دراصل مجھے مرا ہوا تصور کر لینا آپ کی اسی طرح کی مجبوری ہے جس طرح جیومیٹری کے طالب علم کی مجبوری فرضی نقطوں کو تصور کرنا ہے۔ مگر کیا کوئی ذہین سے ذہین طالب علم بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ فرضی نقطہ دائرے پر ہی واقع ہے؟

اب انھوں نے میرا جگر باہر نکال لیا ہے جو گاڑھے خون میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس خون سے ان کے ہاتھوں پر چڑھے ہوئے سفید دستانے سرخ ہوتے جا رہے ہیں۔

کیا آپ میری درد بھری چیخوں اور آوازوں کو سن رہے ہیں؟ مجھے علم ہے کہ آپ ہرگز نہیں سن رہے کیونکہ میرے منہ کے اندر پڑا وہ لمبا سا گوشت کا کھردرا چھچھڑا قطعی طور پر سوکھ کر اوپر کی جانب مڑ چکا ہے۔ افسوس کہ آپ کا سارا علم، سارا زور بیان اور بدیعیات اس غلیظ گوشت کے چھچھڑے کے بری طرح محتاج ہیں۔

آپ کو پتہ ہی نہیں ہے کہ کس کس طرح بولا جا سکتا ہے اور مرنے سے پہلے کبھی آپ کو یہ معلوم ہی نہ ہو سکے گا۔ مجھے حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ ہم سب مرنے سے پہلے ہی موت کے بارے میں اتنے یقینی فلسفے، مذہبی اور سائنسی نظریات وغیرہ کو کیسی بے شرمی کے ساتھ گڑھتے رہتے ہیں۔ یہ معنی خیز ہے۔

اب قدرے درد کم ہوا ہے۔ وہ توڑی ہوئی پسلیوں اور چیرے ہوئے سینے کو ایک بڑے اور موٹے سوئے سے باندھ کر ٹانکے لگا رہے ہیں۔ ان کے منہ سے نکلتے شراب کے بھبکوں کو میں خاص اپنی ناک کے بانسے پر محسوس کر رہا ہوں۔ آپ ہمیشہ سے ہی اس طرح کے کام کرتے آئے ہیں۔ آپ کو پتہ ہی نہیں کہ جسم کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے۔ عہد قدیم میں آپ جسم پر مسالے لگا لگا کر ممیاں بناتے رہے، جو ایک بچکانہ شوق تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ آتما کے تخیل کا انتقام آپ نے جسم سے اس کے ساتھ غیر اخلاقی، بے رحمانہ، اور بے تکا برتاؤ کر کے ہی لیا ہے۔ مزے کی بات یہ بھی ہے کہ اس طرح "مادہ" کو اہمیت دینے کے باوجود بھی آپ لوگ "مادہ" کے ساتھ کبھی انسانی اور
ہمدردانہ سلوک نہ کر سکے۔

اب مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نشے کی کیفیت کی طرف بڑھتا جا رہا ہوں۔ میرا جسم زندہ ہے۔ آپ سے زیادہ زندہ۔ ہاں مگر مجھے یقین ہے کہ آپ

چند ہی دنوں میں مجھے مکمل طور پر فراموش کر دیں گے۔ مرنے والوں کے تئیں یہ فراموش کرنے والا احمقانہ مگر بے رحمی سے بھرا ہوا رویہ آپ ابتدائے آفرینش سے کرتے آئے ہیں۔ دراصل آپ اپنی ہی تصویر کے قیدی ہیں۔ کچھ کچھ اس اندھے موسیقار کے مانند جو اپنی آنکھوں کی بے نوری کا ازالہ دوسروں کے جسموں کی روشنی کو اپنے بڑے بڑے چمگادڑ کے ڈینگوں جیسے سیاہ ہاتھوں سے روک روک کر اندھیرا کرتا رہتا ہے۔

میری کیفیت اب کچھ اور ہے مگر دکھ اور سکھ برقرار ہیں۔ وہ کہیں نہیں گئے ہیں۔ وہ انسان کے جسم کا ازلی مقدر ہیں وہ یہیں آس پاس ہی بھٹک رہے ہیں۔

آپ میرے جسم کو مردہ سمجھ رہے ہیں؟

نہیں۔ یہ محض ایک کاہلی اور بقول آپ کے نکماپن ہے جو آپ کے لیے قطعی طور پر ناقابل فہم ہے۔

میں سن رہا ہوں کہ آپ لوگ خودکشی کے بارے میں اظہار خیال کر رہے ہیں۔ مگر کیا میں خودکشی کر سکتا تھا؟

میں تھوڑا پریشان رہنے لگا تھا۔ یا تو نیند آتی ہی نہیں تھی یا نیند میں بھیانک خواب آتے تھے۔ اپنے اوپر ہلکی سی نامردی کا بھی گمان پیدا ہونے لگا تھا۔ دل ہمیشہ اندیشوں میں گھرا رہتا تھا۔ تو ایک دن میں نے واقعی مرنے کی ٹھان لی۔ یونہی چلتے چلتے۔ اور پھر ایک ٹرین کے آگے جا کر کھڑا ہو گیا۔

مگر ہوا یہ کہ ریل کے ٹھنڈے لوہے نے میرے پاؤں کو ہلکے سے چھوا اور ایک سیاہ کتے کی پرچھائیں کی طرح میرے پاس سے نکل گئی۔

اب میں ایک ایسی کیفیت میں ہوں جیسے میں نے بہت پی رکھی ہو۔ جس طرح آپ کا کمپیوٹر کبھی کبھی سیاہ مست ہو کر چپ لیٹ جاتا ہے یا کسی ایسے پروگرام میں پہنچ جاتا ہے جس سے پہلے آپ کبھی واقف نہ تھے۔

ممکن ہے کہ یہ بہت ہی زیادہ درد اور تکلیف کا ریلا ہو جیسے میرے جسم نے مدافعت کے طور پر نشے اور خاموشی میں بدل دیا ہو۔ ابھی جو وار میرے اوپر اس سیاہ دھاردار بغدے سے کیے گئے تھے، انھیں نظرانداز کر دوں تو ایمان کی بات یہ ہے کہ اب کسی تکلیف کا احساس نہیں ہے۔

میرے کان ناک سے خون باہر آ رہا ہے مگر یہ سرشاری کی وہ حد ہے جب آپ بہت شراب پینے کے بعد اپنے وجود کی تاریک گہرائیوں میں بھنور کی طرح گھومتی الٹیوں کو نالیوں میں انڈیل دیتے ہیں۔

مجھے اس بات کا مجرمانہ احساس ہے کہ یہ جو میں لگاتار بولے جا رہا ہوں، اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اب میرا جسم اس کمینی اور چھچھوری مسرت سے یکسر خالی ہے جو یہ پہلے کسی کو اپنی بات سنا کر یا لکھ کر حاصل کرتا ہے۔ اب میری یہ تمام بک بک نہ تو کوئی احساس ہے نہ کوئی جذبہ بلکہ ایک خالص جسمانی جبلت ہے۔ عظیم مسرت اور عظیم دکھ دونوں سے محروم۔ یہ کسی کیچوے کے رینگنے جیسا ہے۔ ویسے کیا کبھی آپ نے کیچوے کی آتما کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا؟

میری لاش کو اب مکمل طور پر سی دیا گیا ہے اور ایک چادر میں لپیٹ کر باہر لایا جا رہا ہے۔ میرے کپڑے اور جوتیاں الگ ایک گٹھری میں باندھ دیے گئے ہیں۔ میرا یہ جسم اب سڑنے کے بہت قریب آ چلا ہے۔ کل تک اس کی ہر شے بالکل الگ الگ بہ کر بکھر جائے گی۔ اجزا کا پریشان ہونا اور پھر یکجا ہونا شاعری، فلسفہ، مذہب اور سائنس سب کے لیے ہی ایک کلیشے (Cliche) کی صورت اختیار کر چکا ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ شاید اجزا کا اپنا ایک مادہ ضرور ہوتا ہے۔ اس مادے کے ذریعے اجزا اپنے حصے کا پراسرار لطف اور مسرت حاصل کرتے ہیں۔

بچپن میں مجھے اپنے چچا کی سائیکل پر بیٹھ کر چنڈو کھانے کا بہت شوق تھا۔ اب میں سو فیصد یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرا جسم چنڈو کھانے کو جا رہا ہے۔ میرے جسم کو کاندھے پر لاد کر باہر لایا جا رہا ہے۔ اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ بارش میں بھیگی زمین کچی دلدل میں بدلتی جا رہی ہے اس اندھیرے اور دلدل میں میرا بندر بھٹک رہا ہوگا جسے میں نے بڑی محنت کے ساتھ اپنی زبان اور تھوڑی سی ابتدائی جیومٹری پڑھائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہر بندر کو جیومٹری کا کچھ نہ کچھ علم ضرور حاصل کرنا چاہیے۔

میں اب پھر اس کے سرہانے آ کر بیٹھ گیا ہوں۔ اس پتھریلے چبوترے سے تھوڑا ادھر جو زمین کا قدرے اٹھا ہوا سا حصہ ہے۔ وہیں وہ لوگ لاش کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ رات بھر میرے مالک کی لاش اس اندھیرے میں سڑتی رہے گی۔ گرمی بہت ہے۔ میری زبان سوکھ رہی ہے۔ معدے میں جیسے آگ سی بھر گئی ہے۔ مردہ گھر سے باہر بارش بھی نہیں ہوئی ہے۔ بھیانک سوکھا پڑا ہے۔ اس قسم کے موسم میں کوئی انسان یا حیوان صحیح سلامت نہیں رہ سکتا۔ صرف اونٹ ہی ایسے موسم اور ماحول میں پھل پھول سکتے ہیں یا پھر خاردار کانٹوں والے بول۔

میرے مالک کے جسم کا پوسٹ مارٹم کیا جا چکا ہے۔ پتہ نہیں اس کے نظام ہضم کا مطالعہ کیا گیا یا نہیں۔ میں نے جو ایک دو سائنس کی کتابیں دیکھی ہیں ان میں لکھا ہے کہ انسان کی بڑی آنت ہم جانوروں کے مقابلے بہت بڑی ہوتی ہے۔ انسان کو گوشت ہضم کرنے میں یہ مشکل درپیش آتی ہے اور وہ اسی کی بڑی آنت میں پڑا ہمیشہ سڑتا رہتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ میرا یہ مالک ہمیشہ دستوں کی بیماری میں مبتلا رہا۔ اگرچہ میں اور میرا مالک دونوں اس خوبصورت اور خونی دنیا کے بیٹے ہیں مگر دونوں کے درمیان بڑی آنت کا یہ فرق ایک بہت بڑی گتھی کو حل کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ دنیا میں بڑھتے ہوئے زلزلوں کے واقعات، طوفان، حادثات اور یہ بھیانک سوکھا... ان سب کے اسباب بڑی آنت میں ہی پوشیدہ ہوں گے۔

مگر اب یہ سب علم اور معلومات بے معنی ہیں۔ اب میں آگے لکھنا پڑھنا کیونکر جاری رکھوں گا؟ مجھے اب یہ بھی علم ہو گیا ہے کہ اپنی تمام خواہشات کے باوجود نہ تو انسان اور نہ ہی کوئی بندر اپنے مقدر کو بدل سکتا ہے۔

اس انسان نے پانچ سال میری خدمت میں گذارے ہیں۔ اس نے میری فالج زدہ ٹانگ پر نہ جانے کون کون سے تیلوں سے مالش کی تھی۔ اس نے مجھے ہمیشہ میری مرغوب غذائیں ہی فراہم کیں۔ کیلے، مونگ پھلیاں، عمدہ گیہوں

کی سفید روٹی اور ابلے ہوئے آلو۔ اب تو خیر میرے دانت بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ میں ہر چیز نہیں کھا سکتا۔ میرے بال بہت جھڑنے لگے ہیں۔ قد بھی سکڑ سا گیا ہے اور تھوتھنی کمزور ہو کر زیادہ مضحکہ خیز اور قابلِ رحم لگنے لگی ہو گی۔

میرے مالک کی بھی ایک ٹانگ خراب تھی۔ مگر اس کے باوجود اس کا تمام جسم اس عمر میں بھی پھرتیلا، لچک دار اور چاق و چوبند تھا۔ سرکس میں کام کرنے کے لیے انتہائی مناسب اور موزوں۔

اس نے نہ صرف میری جان بچائی بلکہ مجھے اولاد کی طرح رکھا۔ اس نے مجھے جاہل ہونے سے بھی بچالیا۔ اس کے گھر پر بہت کتابیں تھیں۔ دھول سے اٹی ہوئی۔ خود تو اس کا وقت زیادہ تر جوا کھیلنے اور لاٹری کے ٹکٹ خریدنے میں ہی گزرتا تھا مگر مجھے وہ صبح و شام پابندی کے ساتھ، زبان، ابتدائی ریاضی اور جیومیٹری پڑھایا کرتا تھا۔ مجھے اس کی زبان بولنا تو کبھی نہ آسکا۔ میں نے کوشش تو بہت کی مگر وہ میرے گلے کی خرخراہٹ کے ساتھ مل کر ناقابلِ فہم اور تکلیف دہ بن کر رہ گئی۔ مگر میں انسانوں کی بولی خوب سمجھ گیا ہوں اور کتابوں کو بھی الٹا سیدھا پڑھ سکتا ہوں۔ ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ انسانوں کی زبان کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ کیونکہ کائنات کی تمام زبانوں میں کچھ مشترک اور آفاقی عناصر ہوتے ہیں۔

ہاں، جیومیٹری کی کتابوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میں باقاعدہ اپنے پنجوں میں پرکار، اور پنسل دبا کر مشق کیا کرتا تھا۔ بندر کے لیے یہ بہت مشکل نہیں ہے، اگر اسے اس میں دلچسپی پیدا ہو جائے۔ اب میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر مجھے پہلے اتنی جیومیٹری آتی ہوتی تو سرکس کی دنیا میں انقلاب آجاتا۔ سرکس کے اس آخری خطرناک کرتب میں مہارت حاصل کرنے کے لیے تو جیومیٹری کا علم ناگزیر ہے کیونکہ پنڈال میں لٹکی ہوئی رسیوں کی سیڑھیوں، جال اور پھندوں کے زاویے، ان کی آپسی ڈوریاں، بنتے بگڑتے دائرے، دائروں کے خطوط اور جذبی محور وغیرہ سے اپنے جسم کو مکمل طور پر ہم آہنگ کرنا ہی اس جان لیوا تماشے سے زندہ اور صحیح سلامت باہر آجانے کی واحد شرط تھی۔

رات بھر تو میں اس کے گھر کی دیوار پر بیٹھ کر کتے کی طرح رکھوالی کرتا، شام کو جب وہ کام سے واپس آتا تو میں اس کے پیر دباتا، اس کی خراب ٹانگ کو اپنی تھوتھنی سے رگڑتا جس پر ایک بھیانک نشان تھا۔ گرمی لگنے پر اسے اپنے ہاتھ سے پنکھا جھلتا۔ کبھی کبھی اس کے سر کی جوئیں بھی دیکھا کرتا۔ اس کے سر اور بال میلے رہتے تھے۔ میں نے غور کیا ہے کہ وہ نہانے سے کتراتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاید اسے پانی سے ہی کچھ خوف آتا تھا۔

جب تک میں اس کے ساتھ رہا، میں نے ہمیشہ اس کا پیٹ خراب ہی دیکھا۔ اسی وجہ سے اس کا وزن لگاتار کم ہو رہا تھا۔ چند برسوں سے اس کی سگریٹ نوشی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ انسانوں کی نقل کرنا کچھ تو ہم بندروں کا محبوب مشغلہ ہے، کچھ اس دن میرا جی واقعی سگریٹ پینے کو چاہ بھی رہا تھا۔ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کا ایک ''پاسنگ شو'' سگریٹ نکال کر اپنے منہ میں دبایا۔ پھر دیاسلائی جلانے کی کوشش کی۔ ایک زور کا شعلہ لپکا اور میری آنکھوں کو جھلساتا ہوا چلا گیا۔ میں نے زور سے چیخ ماری اور آنکھوں کو بری طرح اپنے پنجوں سے رگڑنے لگا۔ جب جلن کچھ کم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ دروازے میں ساکت و جامد کھڑا مجھے گھورے جا رہا ہے۔

''اگر تم اندھے ہو جاتے تو میں تمھیں اس وقت قتل کر دیتا۔'' اس کا لہجہ زندگی میں پہلی بار سرد تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

وہ تھوڑی دیر تک اسی طرح کھڑا رہا پھر الٹے پاؤں واپس مڑ گیا۔

ہم بندر سمجھتے ہیں کہ انسان کی نقالی کر سکتے ہیں اور ان کے رویوں کو سمجھ سکتے ہیں مگر اس دن مجھے یہ احساس ہوا کہ انسانوں کی دنیا میں بہت کچھ ایسا ہے جس کی نہ تو نقالی کی جاسکتی ہے اور جسے نہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

اس درخت کے اوپر الو بول رہا ہے۔ اس کی آنکھ اندھیرے میں سب کچھ دیکھ رہی ہو گی۔ وہ آنکھ سے زیادہ ایک ناخن کی طرح ہے۔ زمین کو رگڑتا ہوا اور چھیدتا ہوا ایک خوفناک ناخن۔ کچھ آنکھیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

میری ناک کے نتھنوں میں ہلکی ہلکی سی ناگوار بو آرہی ہے۔ کیا میرے مالک کی لاش سڑنا شروع ہو گئی؟

دس سال کی عمر کے بعد اسے اس کے ایک رشتے کے چچا نے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ چچا کی دہلیز پر وہ اپنی اسی ٹانگ سمیت گھسٹتا ہوا گیا تھا جسے کتے نے بری طرح بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ پنڈلی سے گوشت اور کھال کے چیتھڑے ادھر ادھر لٹک رہے تھے۔ کتے کے دانتوں کے سوراخ نما زخموں سے خون رس رس کر اس مٹی میں جذب ہو رہا تھا جس میں اس کی پنڈلی اور پنجے بری طرح لتھڑے ہوئے تھے۔ چچا نے جب اس زخم پر لال مرچیں تھوپ دیں تو وہ چیختا بلکتا ہوا زمین پر لوٹیں لگانے لگا۔

پھر چچا اسے لے کر اس نابینا عامل کے پاس گیا جو جادو ٹونا کرنے کے علاوہ کتے کے کاٹے کا علاج بھی کرتا تھا۔ شہر سے دور جنگل کے قریب ایک ندی کنارے اس کی کٹیا تھی۔

''تمھیں دس دن تک برابر صبح صبح میرے پاس آنا پڑے گا۔'' تازہ گندھے ہوئے آٹے کا ایک پیڑا بنوا کر اپنے ساتھ لیتے آنا۔'' عامل کی آواز بہت باریک تھی، عورت کی باریک سے باریک آواز سے بھی زیادہ باریک۔ اسے اس عجیب و غریب آواز سے خوف محسوس ہوا۔

عامل نے آٹے کے پیڑے پر کچھ پڑھا، پھر اسے زخم پر رکھ کر زور سے دبایا اور اٹھا لیا۔

''یہ دیکھو۔''

اس نے دیکھا کہ آٹے کے پیڑے پر کتے کے کالے بال چپکے ہوئے تھے۔ عامل پراسرار انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے سفید تھے۔

وہ پھر ڈر گیا مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ اسے کتے کے بالوں سے ڈر لگ رہا تھا یا پھر عامل کی اس مسکراہٹ سے جو اس کی اندھی آنکھوں سے نیچے نیچے، بس ناک کے بانسے تک ہی آکر مر گئی تھی۔ وہ مسکراہٹ سے زیادہ ایک دھمکی یا ایک پھسلاوے کی طرح تھی۔ شیطانی بساندھ سے بھری مسکراہٹ۔

تین دن وہ اپنے چچا کے ساتھ عامل کے پاس جاتا رہا۔ چوتھے روز چچا اس کے ساتھ نہ جا سکا۔ وہ اکیلا ہی گیا۔ بس آٹے کا ایک پیڑا اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اس وقت عامل کی کٹیا کے آس پاس کوئی نہ تھا۔

صبح کے وقت عامل کے منہ سے بدبو آ رہی تھی۔ ایسی بدبو رات کو چکنا گوشت کھانے کے سبب سے آسکتی ہے۔ عامل نے کلی بھی نہ کی تھی۔

آٹے کے پیڑے کو زخم پر رکھ کر دباتے دباتے اچانک عامل نے دوسرے ہاتھ سے اس کی شرمگاہ کو چھوا۔ عامل کے منہ سے پانی جیسی رال بہ کر اس کی ٹھوڑی پر آ گئی تھی۔

وہ گھبرا کر پیچھے کی طرف ہٹا۔

عامل نے اسے دبوچ لیا اور اپنے بدبودار منہ سے اس کے گال پر پیار کرنے لگا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس جدوجہد میں عامل کی گندی سی دھوتی کھل کر نیچے آ رہی۔ دھوتی پر جگہ جگہ انسانی کھوپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔

"ارے بات تو سن۔ اگر نہیں مانے گا تو پھر سے اسی کتے سے کٹوا دوں گا۔"

عامل کی باریک شیطانی اور نسوانی سی آواز بجائے منہ کے، اس کی آنکھوں کے بے نور اور بظاہر قابل رحم دھنسے ہوئے غاروں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی پنڈلی پھر کتے کے جبڑوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ کتے کے دانت گوشت اور کھال میں پیوست تھے۔ شاید ازل سے ہی۔

گھر آ کر جو پہلا کام اس نے کیا وہ یہ تھا کہ آنگن میں لگے ہوئے نل سے پانی بہتا دیکھ کر زور کی چیخ ماری۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ جسم بخار کی شدت سے تپنے لگا تھا۔ ناک اور منہ سے لیس دار پانی نکل رہا تھا۔

گھر میں موجود مٹکے، گھڑے، بالٹیاں، یہاں تک کہ پانی کے جگ اور گلاس بھی اس کے سامنے سے ہٹا دیئے گئے کیونکہ انھیں دیکھ کر وہ بری طرح خوف زدہ ہو کر چیخیں مارنے لگتا تھا۔

شام آتے آتے اسے الٹیاں آنا شروع ہو گئیں۔ الٹیاں کرتے وقت اس کے حلق اور منہ سے ایسی آوازیں نکلتیں جیسے کوئی کتا بھونک رہا ہو۔ ان الٹیوں میں ننھے ننھے، مٹر کے دانے جیسے گوشت کے گلابی لوتھڑے بھی شامل تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اب وہ مر جائے گا کیونکہ یہ لوتھڑے دراصل کتے کے چھوٹے چھوٹے پلے ہیں جو اس کے پیٹ میں سینکڑوں کی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں۔

آخرکار اس کا چچا اسے اسپتال لے گیا جہاں اس کے پیٹ میں کتے کے کاٹے کے لمبے اور بڑے بڑے انجکشن ٹھونکے گئے۔

وہ بے حد سخت جان ثابت ہوا۔ ایک ماہ کے اندر ہی نہ صرف یہ کہ وہ بالکل ٹھیک ہو گیا بلکہ اس کا وزن بھی حیرت انگیز طور پر بڑھ گیا۔ جب وہ چلتا تو محسوس ہوتا جیسے کوئی گیند لڑھکتی چلی جا رہی ہو۔

بس افسوس کہ اس کی وہ ٹانگ کسی نس کے بیکار ہو جانے کی وجہ سے مفلوج ہو چکی تھی۔ موٹا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے جسم میں کچھ سنسنی خیز تبدیلیاں بھی پیدا ہوتا دیکھ رہا تھا لڑکیوں کو دیکھ کر یہ نا قابل فہم مگر لذت آمیز سنسنی کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی تھی۔

شانتی اس کے محلے میں ہی رہنے والی ایک لڑکی کا نام تھا۔ شانتی کا باپ اس اسکول میں چپراسی تھا جس میں وہ پڑھنے جایا کرتا تھا۔ اسکول کا گھنٹہ ہمیشہ شانتی کا باپ ہی بجایا کرتا تھا۔

شانتی کی آنکھیں قطعی طور پر بھوری اور باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ اس کے سانولے رنگ پر یہ غیر فطری بھوری آنکھیں دوغلی سی نظر آتی تھیں جن سے اس کے جسم کا کوئی گہرا رشتہ نہ تھا یہ کبھی بھی وہاں سے نکل کر کہیں اور جا سکتی تھیں۔

شانتی کی عمر تو اتنی نہ تھی۔ وہ اس سے چھوٹی ہی رہی ہوگی مگر اس کی چھاتیاں بہت بڑی بڑی تھیں۔ اس کے چھوٹے سے قد پر ان غیر معمولی طور پر بڑی اور بھاری چھاتیاں دیکھ کر کسی گٹھری کا سا گمان نظر آتا تھا جسے اس نے اپنے پیٹ اور سینے سے کس کر باندھ رکھا ہو۔

وہ شانتی کو دیکھنے کے لیے گھنٹوں اس کے دروازے پر بیٹھا رہتا جہاں خود شانتی کا باپ اپنے دوسرے ساتھیوں سمیت بیٹھ کر جوا کھیلا رہتا تھا۔ مگر شانتی کی بھوری آنکھیں ہمیشہ اس پر حقارت کے ساتھ ہنستی رہتی تھیں۔

انھیں دنوں شہر میں سرکس آیا۔

سرکس کی سرچ لائٹ جب رات کو تمام شہر کے آسمان پر روشنی کا دائرہ سا کاتتی تو وہ مسرت اور حیرت سے بھر جاتا۔ ایک دن وہ اپنے چچا کے ساتھ سرکس دیکھنے گیا۔ سرکس کے تماشوں نے اس کے دل و دماغ پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ جوکروں کا تو وہ دیوانہ ہی ہو گیا اور ان کی نقلیں اتارنے لگا۔

گرمی کی سخت دوپہر تھی۔ راستے سنسان پڑے تھے۔ وہ اپنے چچا کی بڑی بڑی ہوائی چپلیں پہن کر وہاں کھڑا ہوا تھا جہاں سے شانتی کے گذرنے کا وقت تھا۔ بھورے رنگ کی سوتی قمیص اور کالی گھسی ہوئی نیکر میں ملبوس اس نے اپنے سر پر سرکس کے جوکروں جیسا ہیٹ بھی لگا رکھا تھا۔

شانتی گذری اور وہ سامنے آ گیا۔

"تم نے سرکس دیکھا؟"

وہ رک گئی۔ اس کی بھوری آنکھیں حلقوں میں تیزی کے ساتھ گھومیں مگر اس کے سانولے جسم پر کوئی عکس نہ چھوڑ سکیں۔

"ہاں۔ دو بار دیکھ لیا۔" وہ قدرے منمنی سی آواز میں بولی۔

دراصل شانتی کو ناک سے بولنے کی عادت تھی۔ اس کی ناک شاید حال ہی میں چھدی تھی کیونکہ اس میں اس نے نیم کا ایک تازہ تنکا ڈال لیا تھا۔ پھر بھی ناک پک رہی تھی اور اس کا ایک نتھنا سرخ ہونے کے ساتھ سوجا ہوا بھی تھا۔

شانتی کی منمنی آواز اور سوجی ہوئی سرخ ناک نے اس کے جسم میں لذت کی لہریں پیدا کیں۔

"تمھیں کس کا تماشا پسند آیا؟" وہ احمقانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

شانتی کی بھاری چھاتیاں پتہ نہیں کیوں ہلنے لگیں۔ پھر اس نے کہا "ہاتھی کا۔"

"شانتی تمھیں پتہ ہے۔ وہ سب میں بھی کر سکتا ہوں۔" وہ آہستہ

سے بولا۔

"کیا؟"

"جوکر کی طرح۔" وہ شرما کر کہنے لگا۔

"کر کے دکھاؤ۔" شانتی ناک سے بولی۔

اس نے ایک بار ادھر ادھر دیکھا پھر بے حد سنجیدہ سا چہرہ بنا کر شانتی کی طرف تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ شانتی گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ مگر وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی بائیں ایڑی پر گھوم گیا اور پھرتی سے وہی تھپڑ اپنے گال پر رسید کرتے ہوئے زمین پر اکڑوں بیٹھ کر بھدی آواز میں رونے لگا سرکس کے جوکر کی طرح۔

خلاف توقع شانتی کے چہرے پر ہنسی کے کوئی آثار تک نمودار نہیں ہو سکے۔ صرف اس کی آنکھوں میں ایک بے رحمی سی عود کر آئی تھی۔

وہ مایوس مایوس سا زمین سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے تہیہ کر لیا کہ یہی تو وقت تھا اظہار محبت کا۔

"شانتی سنو۔" کرتب دکھانے کے بعد اب اس کی سانس پھول رہی تھی۔

"مجھے... مجھے... تم بہت اچھی لگتی ہو۔" اس کے سر پر لگا ہوا جوکروں کا ہیٹ کانپنے لگا۔

شانتی کی ناک میں پڑا ہوا نیم کا تنکا اچانک کالا پڑ گیا۔ اس کی باہر کو نکلی ہوئی بھوری آنکھیں بے مروتی کی حدوں کو پہونچ کر اچانک لمبے لمبے ناخنوں میں بدل گئیں۔

"سن بے او لنگڑے ہیجڑے! تم جتنا موٹا ہے اس سے زیادہ کھوٹا ہے۔" شانتی کی غیر انسانی ناک سے نکلتی ہوئی آواز چمگادڑ کے سیاہ بازوؤں کی طرح اس کی آنکھوں سے ٹکرائی۔ اس کے اور شانتی کے درمیان اندھیرا ہو گیا۔ بڑی بڑی ہوائی چپلوں میں اس کے تلوے ٹھنڈے پڑنے لگے۔ وہ اپنے پسینے میں نہایا اس اندھیرے میں جھومتا رہا۔ دور اسکول میں شانتی کا باپ گھنٹہ بجا رہا تھا۔

میں سڑ رہا ہوں۔ میرا جسم بدبو چھوڑ رہا ہے۔ میرے جسم کے اندر جو پانی تھا وہ آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے، جسم کے کناروں کو ڈبوتا ہوا باہر آ رہا ہے۔ کچی زمین کی طرف۔ اس بدبو کو صرف میرا ابندر خوش دلی کے ساتھ برداشت کر سکتا ہے۔ آپ سب کو تو ناک پر کپڑا رکھنا ہی پڑے گا۔

آپ اسے سڑنے کا نام دیتے ہیں۔ مگر میرے لئے یہ بہت مزیدار سا تجربہ ہے، اور میرے جسم کی قوت مدافعت میں بے حد مددگار بھی۔ پہلے جب کوئی ذلیل کرتا تھا، چال میں ہلکی سی لچک کا مذاق اڑاتے ہوئے، میرے لنگڑے پن پر ہنستا ہوا، تو کیسے میرے کانوں کی لکیریں اچانک آنکھوں سے جا ملتی تھیں۔ آنکھوں میں پانی بھرنے لگتا۔ لکیریں رکتی نہ تھیں۔ وہ دائرے بناتی ہوئی کھال تک جا پہونچتی تھیں۔ کھال کے مساموں سے پسینہ باہر آنے لگتا تھا۔ پرانے دوست کی طرح مہربان پسینہ۔ مصیبت کے وقت ہاتھ تھامنے کے لیے۔

ہاں مگر ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب مجھے پانی سے ڈر لگنے لگا تھا۔ میں پانی کے گھڑے کو دیکھ کر بھیانک چیخیں مارنے لگتا تھا۔ پانی کے گھڑے کو خاص طور پر پوجا جاتا ہے۔ اس پوجا میں دنیا کی تمام مقدس ندیوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ گھڑے میں آئیں اور نواس کریں۔ ساتوں سمندر بھی چلتے ہوئے آتے ہیں اور گھڑے میں آ کر رہنے لگتے ہیں۔ میری بھیانک اور دردناک چیخوں کو کوئی دریا، کوئی تالاب اور کوئی سمندر اپنے اندر جذب نہ کر سکا۔ وہ گہرے تاریک پانیوں سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹتی رہیں۔ وہ المناک اور احمقانہ یا سنکی چیخیں جو اس شے سے ٹکراتی ہیں جس سے وہ خوف زدہ ہو کر پیدا ہوتی ہیں۔ دنیا کی بنیادی سچائی یا عنصر سے آپ کا رشتہ جب ایک خوف کا رشتہ بن جاتا ہے تو انجام یہی ہوتا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے اس وقت آپ سب مجھے مرا ہوا سمجھ رہے ہیں اور میری آتما کو شانتی وغیرہ دینے کی جھوٹی پرارتھنائیں کر رہے ہیں جبکہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری آتما کو نہیں بلکہ شریر کو ضرورت ہے شانتی کی۔ اور وہ بھی وہ شانتی جس کی بڑی بڑی چھاتیاں ہیں، بھوری آنکھیں ہیں اور جس کی سوجی ہوئی پکتی سرخ ناک میں شہوت انگیز نیم کا کالا تنکا پڑا ہے۔ کیونکہ میں آپ سے زیادہ زندہ ہوں۔ جسمانی طور پر زیادہ زندہ اور شہوت سے بھرا ہوا۔

درحقیقت ایک مکمل جسم تو میں اب بن پایا ہوں۔ جب میں آپ سب کی طرح تھا تو ہرگز ایک مکمل اور آدرش جسم نہ تھا۔ میں بھی سمجھتا تھا کہ آتما ہی تو ہے جو پیار کرتی ہے، پھر پیار میں دکھ اور ذلت اٹھاتی ہے پھر پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے۔ مگر اب میں اپنے خالص جسم سے سوچ رہا ہوں۔ خالص جسم سے ہی پیار کر رہا ہوں۔ اگر اس بھری دوپہر میں نے شانتی کے آگے سرکس کے جوکر کی طرح کرتب نہ دکھا کر اس کی بھوری بھاری چھاتیوں کو چھوا ہوتا تو اس وقت اسکول میں بجائے جانے والے گھنٹے کی آواز بدل سکتی تھی۔

اب آتما جیسی کوئی شے میرے لیے صرف وہ خرگوش ہے جس کے دو سینگ ہوں۔ میں عرفان و آگہی کی اس منزل پر ہوں جہاں مجھے شانتی کا شہوت بھرا جسم چاہئے۔ اب جسم ہی میرا راجا ہے اور جو خود میں ہی ہوں۔ یعنی ایک راجا۔

افسوس کہ آپ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اپنے منھ کی بساندھ بھری چکنائی صاف کرنے اور منھ لال کرنے کے لیے جو پان چبا کر آپ نے سڑک کنارے تھوک دیا تھا، اس کا مزہ اور نشہ صرف آپ کے منھ میں ہی تھا۔ آپ کو چونے کتھے، چھالیہ اور پان کے ہرے کچلے ہوئے پتے کا مطالعہ ایک بار پھر کرنا چاہئے۔ مگر اس کے لیے آپ کو سڑک کنارے نالی میں تھوکی گئی پان کی پیک کو اپنے گھٹنوں کے بل جھک کر بغور دیکھنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ایسا ہرگز نہیں کر سکیں گے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ناستک ہوں۔ آتما کو نہ مان کر آپ کچھ زیادہ ہی ایشور وادی ہو جاتے ہیں۔ ایشور کو ماننے کے لیے روح میں یقین کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کم از کم جسم سے نکل کر واپس جاتے ہوئے روح کے افسردہ قدم مجھے تو نظر نہیں آتے۔ ہو سکتا ہے کہ جسم کے اندھیرے اور پراسرار غار میں کوئی خونی درندہ چھپا بیٹھا ہو جو روح کو چیر پھاڑ کر نکل جاتا ہو۔

اس لیے روح واقعتاً اگر ہے بھی تو اطمینان رکھیں کہ وہ نکل کر کہیں نہیں گئی ہے۔ وہ کسی درخت پر جا کر نہیں بیٹھی بلکہ وہ تو شاید جسم میں اور بھی زیادہ سکڑ کر

کنڈلی مار کر بیٹھ گئی ہے۔ پیوست ہو گئی ہے۔ جسم کے تاریک بل سے کبھی باہر نہ نکلنے والی ایک سہمی ہوئی، مریل سی بیمار چوہیا کی طرح۔

یہ جو آپ لوگ منہ پر کپڑا رکھ کر میرے پاس آ رہے ہیں، کیا یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ میرے جسم کی ہی سڑاند ہے۔ اگر آپ واقعی آتما جیسی کسی شے میں وشواس رکھتے ہیں تو جناب۔ کہیں آپ دھوکہ تو نہیں کھا رہے؟ کہیں یہ بدبو اس مریل بیمار چوہیا کے جسم سے تو نہیں آ رہی!

خیر چلئے۔ صبح ہو گئی۔ آپ مجھے چارپائی پر ڈال کر آخر شمشان گھاٹ کی طرف لے ہی چلے۔ مگر مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ اگرچہ میرا منھ، زبان، ہونٹ اور گلا سب مل کر، مرجھا کر ایک پوٹلی سی بن گئے ہیں مگر کیا آپ واقعی سمجھتے ہیں کہ پیاس کا ان اشیا سے کوئی تعلق ہے؟

اگر آپ مجھے دو گھونٹ پانی پلا دیتے تو میں تھوڑا سو لیتا۔ پھر جتنی دیر آپ مجھے چتا میں جلاتے، اتنی دیر میں آرام سے ایک میٹھی نیند لے لیتا۔ کیونکہ میرے پیٹ کے اندر اب شاید آنتیں پھٹ رہی ہیں۔ آنکھوں میں خون بھر رہا ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔ اس سنگلاخ حقیقت سے تو میرا دل بھر گیا۔

چارپائی کو اس طرح اٹھا کر لے جانے میں مجھے بہت جھٹکے لگ رہے ہیں۔ پھر بھی مجھے نیند کے جھونکے آ رہے ہیں۔ نیند کا سب سے بڑا کمال تو یہی ہے کہ وہ جسم کو اور زیادہ فعال بنا دیتی ہے۔ جسم نیند کے جادو سے اچانک اتنا سبک رفتار بن جاتا ہے کہ بستر پر پڑے پڑے ہی وہ تمام کائنات کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ بغیر اپنے پیروں کے چھالوں پر روئے ہوئے۔

کاش کہ میں سو جاؤں اور خواب بھی دیکھوں۔ خواب میں شانتی کے ساتھ ہم بستری کروں۔ اس طرح کہ شرافت نام کا وہ مسلمان درزی سامنے بیٹھا بے چارگی سے یہ نظارہ دیکھتا رہے۔ شانتی سولہ سال کی عمر میں اس درزی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی جو اکثر اس کے غیر معمولی بڑے بڑے پستانوں کو اس کے بلاؤز کا ناپ لینے کے بہانے چھوتا رہتا تھا۔

بس پھر آپ اطمینان کے ساتھ مجھے چتا کی آگ میں جھونکتے رہئے گا۔

رات کی آندھی اور بارش نے صبح کی دھوپ کو تکلیف دہ حد تک چمکیلا بنا دیا ہے۔ شمشان گھاٹ ابھی سے جل رہا ہے۔ دھوئیں سے آلودہ، زنگ لگا وہ ٹین کا شیڈ ہوا میں ہل رہا ہے، جس کے نیچے اس کی چتا جلائی جائے گی۔

بندر اس کی چارپائی کے پیچھے پیچھے اپنی معذور ٹانگ کو اٹھائے بھاگا چلا آ رہا ہے۔ یہ بندر بہت پہلے اسے عجیب و غریب حالات میں ملا تھا۔

وہ روز کی طرح اپنی ڈیوٹی ختم کر کے بینک سے واپس آ رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف لمبی لمبی جھاڑیاں تھیں۔ جھاڑیوں کے پار وہ میدان تھا جہاں وہ خیمہ لگا تھا جس میں کسی اجڑے ہوئے سرکس کے آثار تھے۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ اچانک جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ وہ ٹھٹک گیا۔

بڑی بڑی اداس آنکھوں والی ایک چھوٹی سی بچی جھاڑیوں کی اوٹ سے باہر آئی۔ بچی کی بوسیدہ سی فراک پر جگہ جگہ گیلی مٹی سنی ہوئی تھی۔ اس کے روکھے سے بال بکھر کر ماتھے پر آ گئے تھے۔

بچی کی گود میں ایک بیمار اور بے ہوش بندر تھا۔

"آپ اسے پالیں گے"؟ بچی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں"؟ وہ حیرت میں پڑ گیا۔

"ہاں۔ یہ سرکس کا بندر ہے۔ اس نے زہریلی روٹی کھالی ہے۔ یہ مر جائے گا۔"

سرکس کا نام سنتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے جلدی سے بندر کو اپنی گود میں لے لیا۔

"آپ اس کا علاج کرائیں گے نہ۔" بچی کا لہجہ ایک افسردہ سی امید سے بھر گیا۔

"ہاں۔" وہ اور کچھ نہ بول سکا۔

بچی یکبارگی آگے بڑھی، بندر کے سر پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا، پھر کسی جادو کی پری کی طرح جھاڑیوں میں غائب ہو گئی۔

بہت دیر تک وہ لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے بندر کو، اپنی گود میں اٹھائے اسی طرح اس راستے پر کھڑا رہا جو اچانک اسی طرح ویران ہو گیا تھا جیسے وہ سارے راستے جن سے گزر کر ننھے فرشتے جھاڑیوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ ہمیشہ کے لیے۔

وہ ایک بینک میں نوکری کرتا تھا۔ ملازمت کے علاوہ اپنی تمام زندگی اس نے جوئے اور سٹے بازی میں گزاری تھی۔ اس کی تعلیم یوں تو معمولی تھی مگر جیومٹری میں اسے خاصی مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ اسے یہ وہم تھا کہ جیومٹری کی مہارت اسے کسی دن کوئی بہت بڑا جوا جیتنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ ایک پرانا مشغلہ اور بھی تھا۔ سرکس کے کلاکاروں کی بھونڈی اور ناکام نقلیں اتارتے رہنا۔

اسے جانے کیوں یہ محسوس ہوتا رہتا تھا کہ سرکس ابھی غائب نہیں ہوا ہے۔ بس اس کی ایک خوفناک قلب ماہیت ہوئی ہے۔ سرکس انسانی سرشت میں شامل ہے۔ سرکس کے پھٹے ہوئے ہال تمبو بینکوں اور اسٹاک ایکسچینج کی عالیشان عمارتوں میں بدل گئے تھے۔ سرکس کے ڈھول پڑے ہوئے پنڈال کے اندر دبی کچلی کوئی آندھی رہ گئی تھی، جب وہ باہر آئی تو یکایک سارے جوکر اور مسخرے چولا بدل کر، بینکوں کے چمکدار شیشوں والے کیبن میں بیٹھ کر ایک دوسرے کے منہ پر فرضی طمانچے مارنے لگے۔

اسٹاک ایکسچینج کی فلک بوس شاندار عمارت کے سامنے کھڑے ہو کر لوگ سیل فون کان سے لگائے بھیانک اچھل کود کرتے تھے۔ انگلیوں سے پوشیدہ اشارے کرتے ہوئے وہ کسی ناقابل تشریح زبان میں کچھ بڑبڑاتے تھے۔ یہ سرکس کے جھولے والے آخری کرتب سے زیادہ خطرناک تھا۔ ان اشاروں کو صحیح طور پر سمجھ پانے پر ہی ان کی زندگی اور موت کا دارومدار تھا۔ وہ بلندی سے گرتے تھے، کبھی تو اٹھ پاتے اور کبھی اپنی ریڑھ کی ہڈی کو ہمیشہ کے لیے توڑتے ہوئے زمین میں دفن ہو جاتے۔

دوسری طرف ایک تنہا بھیڑ تھی جو بینکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں کی طرف بے تحاشا بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اس بھیڑ کا ہر فرد، کوئی بھی فیصلہ اپنے وجود کی گہرائیوں اور ضمیر کی آواز پر نہیں بلکہ دوسروں پر اس کا ردعمل دیکھنے اور انھیں متاثر کرنے کے لیے ہی کرتا تھا۔ اس بھیڑ کا ہر فرد دراصل اکیلا تھا وہ اصل میں اس شیخی باز جلاد کی طرح تھا جو کسی مجرم کو پھانسی کے تختے پر چڑھا دینے کے بعد دوسروں پر اپنے اس دلیرمندانہ فعل اور فرض شناسی کا ردعمل دیکھنے کے لیے گنگناتا ہوا واپس آتا ہے۔

یہ ایک طرح سے اندھوں کی بے رحم اور تنہا بھیڑ تھی۔ افسوس کہ اندھوں کو بے حد کوشش کے بعد جب آنکھ نصیب ہوتی ہے تو وہ ایک بھوری آنکھ ہوتی ہے۔ تشدد سے بھری۔ چہرے پر نکل آئے ایک کریہہ ناخن کی طرح۔

اس بھیانک اور شیطانی سرکس میں وہ اپنے اعلیٰ سے اعلیٰ کرتب کے مظاہرے کی بھی داد نہ پا سکا۔ کوئی تالی، کوئی واہ واہ اس کے لیے نہ تھی۔ کافی دنوں سے وہ لگاتار جوئے کی بازی ہار رہا تھا۔ پولیس کو اس پر شک ہو گیا تھا کہ شاید وہ کوئی جوئے کا اڈہ بھی چلاتا تھا۔ اسے خوف تھا کہ پولیس کبھی بھی آ کر اسے گرفتار کر سکتی تھی۔ اس کا دل طرح طرح کے اندیشوں میں گھرنے لگا۔ شادی کے بارے میں سوچتے سے ہی اسے گھبراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ اس کے دل میں یہ وہم گھر کر گیا تھا کہ شاید وہ نامردی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک ایسی بھیانک نامردی جو ان تمام لوگوں کا ازلی مقدر ہے جنھیں بچپن میں ہی کسی خوفناک کتے نے کاٹ لیا ہو۔

وہ بینک میں کیشیئر تھا، اس لیے ہر وقت اسے دوسرے لوگوں کے نوٹ ہی گنتے رہنا پڑتا تھا۔ ممکن ہے کہ غیروں کے نوٹوں کو شمار کرتے رہنا ہی اس کی خودکشی کا اصل سبب رہا ہو اگرچہ اس بارے میں وثوق کے ساتھ کوئی کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ جوئے کی لت نے ادھر آ کر اسے مفلس بھی بنا دیا تھا اور اچھی خوراک وہ صرف اپنے بندر کے لیے ہی مہیا کر پاتا تھا۔

دو چار دن سے وہ شدت سے یہی سوچ رہا تھا کہ دوسروں کی کمائی ہوئی دولت ان کے روپے پیسے کی حفاظت ان کے نوٹوں کے نمبروں کا بے حس اور بے معنی مطالعہ، ان کی جانچ پرکھ کرتے ہوئے ایک جوکر کی نقلی مگر جھنجھلائی ہوئی مسکراہٹ سے چہرے کو پوتے رہنا دراصل ایک قسم کا ٹچا پن تھا۔ وہ امین ہونے کے کسی بلند اخلاقی منصب پر مقرر نہیں تھا۔ وہ روز بروز چھوٹا اور گھناؤنا ہوتا جا رہا تھا یہ گھناؤنا پن نہیں تھا تو اور کیا تھا کہ کبھی اپنی انگلیوں کی پوروں میں پاؤڈر لگا کر کبھی نوٹوں کے کناروں کو منھ کے لعاب سے گیلا کر کے، وہ دوسروں کے دھن دولت کا مکمل حساب لگایا کرتا۔

ایک دن جب اس نے اپنے کاؤنٹر پر تقریباً دو لاکھ سڑے گلے اور بدبودار نوٹ گنے تو اس کی انگلیاں اینٹھ کر رہ گئیں۔ سر درد سے پھٹنے لگا۔ شام کو وہ بینک سے باہر نکلا۔ کل رات سے اس نے کچھ کھایا نہیں تھا۔ اسے شدت کی بھوک لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا سا آتا اور جاتا تھا۔ اس نے جیب ٹٹولی تو صرف پاسنگ شو سگریٹ کا پیکٹ باہر آیا۔ آج اس کی جیب میں اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ وہ اپنے بندر کے لیے تھوڑی سی مونگ پھلیاں ہی خرید لیتا۔

اسے محسوس ہوا جیسے وہ خود بھی کسی گندے، غلیظ، بدبودار اور پھٹے ہوئے نوٹ کی کترن میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اس کے بعد وہ واپس کبھی بینک کی طرف نہیں گیا۔

اس رات وہ شہر سے دور ایک مضافاتی علاقے کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والے ایک اکیلے اور ویران راستے پر اپنے پاؤں پٹک پٹک کر اس طرح چلا جیسے وہ راستے کو چور چور کر دینا چاہتا ہو۔ مگر بالآخر جو چور چور ہوا وہ راستہ نہیں اس کا پاؤں تھا۔

نہیں۔ مجھے نیند نہیں آئی۔ ہو سکتا ہے کہ جسم کی اس صورت حال میں سونے کے اب کوئی معنی نہ رہے ہوں۔ لوگ مجھے جتنی دیر چتا میں جلاتے رہے اتنی دیر مجھے صرف پیاس لگتی رہی۔ آپ لوگوں کے حساب سے پورے تیرہ دن گزر گئے ہیں۔ آپ کتنے خوش قسمت ہیں کہ تیرہ راتیں آپ سب نے سو کر گزاریں۔ مگر یہ بور اور اجاڑ دنیا میرے سامنے برابر موجود رہی ہے۔

اسی طرح جاگتے رہنا یقیناً ایک زائد زندگی ہے۔ یہ زائد زندگی حاصل کر کے میں دراصل ترپ کی چال ہار گیا ہوں۔ اس مکروہ دنیا کی اشیا اب اور زیادہ واضح اور نحوس بن کر میرے سامنے آ گئی ہیں۔ یہ کتنا بڑا گھاٹا ہو گیا کہ دنیا بہر حال ویسی کی ویسی ہی رہی اور میں اس میں تقریباً اسی طرح شامل رہا جیسا استھیوں کے اس ڈھیر میں بدل جانے سے پہلے تھا جسے کلس میں بھر کر سہرا دینے کے لیے آپ کسی دریا کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

افسوس کہ دوسرے کی موت آپ سے آپ کی ایک حس اغوا کر کے لے جاتی ہے اور آپ ''حقیقت مطلق'' یا کسی ''واحد سچ'' کے جابرانہ تصور کے قیدی بن کر رہ جاتے ہیں اب دیکھیے نہ کہ دنیا کیسی بری طرح مجھے اکتاہٹ میں مبتلا کرنے لگی۔ اب تو یہ کم بخت بالکل ہی ڈھیٹ بن کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ اب جا کر پتہ چلا ہے کہ حقیقت اور التباس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہر وقت میں، ہر مقام پر اور ہر صورت حال میں وہی ایک سنگلاخ اور کتے کی طرح کاٹتی بھنبھوڑتی وحشی حقیقت۔ کاش کہ آپ بھی یہ اہم بات جان پاتے کہ کاغذ پر پنسل سے کھنچا ہوا ایک دائرہ اتنا ہی حقیقی ہے جتنا کہ سرکس میں لوہے کا وہ گولا جس پر پیر رکھ کر مشاق کلاکار فرش کے اس سرے سے اس سرے تک دوڑتے چلے جاتے ہیں۔

ایک اہم بات اور واقع ہوئی ہے، میرا جسم حواس و اعصاب کے معاملے میں تو آپ سے بہت آگے نکل ہی چکا ہے، وہ پہلے سے کہیں زیادہ صابر اور مضبوط بھی ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے عمل و ردعمل اور جبلتوں کے سلسلے کو حقارت سے ٹھکرا دیا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں جلتا رہا۔ اور مجھے تکلیف نہیں ہوئی؟ نہیں بہت تکلیف ہوئی تھی شاید اسی لیے میں سو نہ سکا ہوں۔ مگر اب میرا جسم ردعمل کے طور پر چیخے گا، چلائے گا نہیں۔ نہ ہی اچھلے کودے گا۔ اب اس درد کو وہ کہاں، کس گوشے میں سنبھال کر رکھے گا اور اس کا کس طرح جواب دے گا یہ تو بس اب میں ہی جانتا ہوں۔

یہ جو آپ مجھے کلس میں رکھ کر تیزی سے چلتے جا رہے ہیں، اس سے میرے بندر کی سانس پھول رہی ہے۔ اس نے اب تک نہ کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے۔ وہ بھوکا ہے۔ وہ اپنی تین ٹانگوں سمیت کب تک میرا تعاقب کرتا رہے گا؟

جھٹکوں سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ آپ کی دانست میں تو میری لاش مٹی گئی ضائع ہوتی گئی۔ اس لیے یہ آپ کے لیے ایک اسرار سے بھری شے بن گئی ہوگی۔ مگر میرے لیے نہیں۔ میں اپنے جسم کو اپنے جسم کے ذریعے ہی دیکھ اور محسوس کر رہا ہوں میرے جسم پر میرے جسم ہی کی روشنی کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ اس کے لیے مجھے کسی چیتنا یا آتما جیسی سنکی اور فرضی شے کی مدد کی ضرورت ہرگز نہیں ہے۔

دراصل سچ کہوں تو اب جا کر یہ لاش (لاش کا لفظ آپ کی سہولت کے لیے) ایک آرٹ پورٹریٹ میں بدل سکی ہے۔ کسی بھی پورٹریٹ میں کتنی چیزوں کو دیکھنا ممکن ہے۔ ایک چہرہ جو ایک ساتھ نیک، پروقار مگر پاگل اور دھوکے سے بھرا ہوا بھی ہے۔ آپ ان آڑی ترچھی جیومٹری کی لکیروں میں کوئی ''واحد سچ'' جان لینے کے لیے ہمیشہ بھٹکتے رہیں گے۔ کیونکہ سارا وقت میرے اندر اسی طرح بہہ رہا ہے جس طرح کسی فلم کے فریم کے اندر بہتا رہتا ہے۔ اس لیے یہ ہرگز دھوکا مت کھائیے گا۔ میں وہیں کا وہیں ٹھہر کر رہ گیا جہاں ریل گاڑی مجھے چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ میں مکت کہاں ہوا۔ میں تو اور بھی بندھ گیا ہوں۔ میری عمر بھی لگاتار بڑھ رہی ہے۔ عمر کے بڑھتے رہنے کے عذاب سے کبھی چھٹکارا نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ یہی سچ ہے اور سچ کو کھوجنے میں انسان کے احساسات کے بہرحال کوئی معنی نہیں ہیں۔

میں ایک بچکانہ جیومٹری سے نکل کر ایک زیادہ سخت اور بے رحم جیومٹری کی طرف آ گیا ہوں۔ یہاں اشیا تصویروں کی طرح نہیں ہیں۔ وہ تین جہتی بن چکی ہیں۔ اس لیے ان کے کنارے زیادہ نکیلے اور سخت ہیں، یہ جسم کو زور زور سے چبھتے ہیں۔ سب کچھ کڑوا ہونے لگتا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ اس سے کبھی کبھی سرور کی سی کیفیت بھی آتی ہے، آخر کچھ لوگ اپنے جسم کو سانپ سے ڈسوا کر بھی تو نشہ حاصل کرتے ہیں۔ مگر یہ سب سمجھنا اتنا آسان نہیں۔ اس لیے میرے اندر زندگی کے بہاؤ کا صحیح علم حاصل کرنے کے لیے پہلے آپ کو کسی ندی کنارے جا کر وہاں اگے ہوئے سرکنڈوں کی تھرتھراہٹ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس سے آپ کو یہ سراغ مل سکتا ہے کہ ندی میں پانی کا بہاؤ آخر ہے تو کتنا؟

المیہ یہ ہے کہ میں جسمانی طور پر ایک نسبتاً بڑی کلا میں بدل چکا ہوں مگر وہی دنیا میرے منھ پر اور بھی ٹھوس ہو کر چڑھی آ رہی ہے، جو دنیا آپ کے سامنے ہے سرکس کا بھوتوں والا کھنڈر زمین کے نیچے سے ابھر کر اوپر آ رہا ہے۔ اور وہی نجی بھیڑ امڈی آ رہی ہے جو اب تالیاں اسی وقت بجائے گی اور انصاف پر مبنی فیصلے اسی وقت کرے گی جب اس کا مقصد صرف دوسروں کو خوش کرنا ہوگا۔

تو میں نے کہا نہ کہ بس لکیریں ہی لکیریں ہیں۔ ادھر سے ادھر جاتی ہوئی آپس میں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی بڑھتی ہوئی، واپس آتی ہوئی۔ زندگی کا سلسلہ رکتا نہیں۔ کچھ ختم نہیں لکیریں ہی برفیلا آبشار بناتی ہیں اور لکیریں ہی آگے کا طوفان۔

لو اب ندی بہت قریب آ گئی۔ ایسے سخت سوکھے موسم میں جب چرند پرند، انسان و حیوان سب بارش کے لیے تڑپ رہے ہیں، مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے کہ اس ندی میں اتنا بہت سا پانی کہاں سے آ گیا؟

یہ تو باڑھ کا سا سماں نظر آتا ہے۔ پانی ندی کے اونچے کراڑوں سے باہر آ رہا ہے۔ آپ نے مجھے یہاں تک لا کر واقعی بڑے پن اور نیکی کا کام کیا ہے۔ اور اب آخری نیکی جو آپ میرے جسم کے ساتھ کرنے والے ہیں وہ یہی ہے کہ اب مجھے پانی کی لہروں کے سپرد کر دیں۔

مگر میں اچانک ندی کے اس منظر سے خوف محسوس کرنے لگا ہوں۔ وہی پرانا خوف۔ شاید مجھ پر پھر ریبیز (Rabies) کا دورہ پڑ رہا ہو۔ لیکن اب مجھے اس پر کوئی ملال نہیں ہے۔ ریبیز (Rabies) نے تو میرے جسم کو زیادہ بلند، ارفع و اعلیٰ بنا دیا تھا۔ اخلاقی اعتبار سے بھی اور صلاحیت کے اعتبار سے بھی۔ ممکن ہے کہ یہ کتے کے کاٹنے کا ہی اثر ہے کہ میں تمام زندگی بڑے بڑے فیصلوں پر ہمیشہ پرسکون رہا۔ ریلوے لائن کے کنارے کھڑے ہو کر بھی پرسکون۔

ظاہر ہے کہ آپ میرا ایک لفظ بھی نہیں سن سکے ہیں۔ آپ کو تو صرف شور سننے کی عادت ہے۔ آپ صرف وہی سن پاتے ہیں جو دیکھ پاتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا بہرا پن ہے۔ دنیا کو گونگا کر دینے والا ایک سیاہ شور۔

کاش کہ آپ کی دنیا میں باہر کی آوازوں کے لیے بھی تھوڑی سی جگہ ہوتی۔ موسیقی کی ابھر کر سطح پر آنے کے لیے یہی ایک واحد شرط تھی۔ تب شاید آپ میرے جسم کی ان آوازوں کو بھی سن سکیں جو ابھی نہیں سن پائے۔ میرے جسم کی کوئی سرسراہٹ، کوئی کراہ، کوئی ہنکارا یا کوئی اعتراف۔

اب جب کہ آپ ندی کنارے آ کر رک گئے ہیں اور کلس کو سنبھال کر نیچے رکھ رہے ہیں تو میں آپ کو ایک بے حد راز اور پتے کی بات بتاتا چلوں۔

ایک تو یہ کہ براہ کرم جیومٹری میں فرضی نقطے ذرا ہوشیاری سے لگائیں، اس ذلیل، کمینی، بور اور کلیشے حقیقت سے مفر ممکن نہیں۔ دنیا میں بے رحمی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس بے رحمی کا سلسلہ ایک پراسرار نادیدہ زنجیر کی طرح ہے۔ جس طرح شیرخوار بچے پر ہر اس اچھی بری چیز کا اثر پڑتا ہے جو اس کی ماں کھاتی یا پیتی ہے۔ اسی طرح ہر شے دوسری شے سے پیوست ہے۔ ایک خاموش زنجیر کی طرح۔ اندھیرے پر لگے ہوئے اندھیرے کے استر کی طرح۔

جہاں تک ماں کا سوال ہے تو اس سے صرف شیرخوار بچوں کا ہی نہیں، ہر انسان کا مقدر جڑا ہوا ہے۔ اس سے جادو ٹونا اور تنتر منتر کرنے والے عامل کسی شخص پر عمل کرنے سے پہلے اس کی ماں کا نام ضرور دریافت کرتے ہیں۔

میری ماں کا نام کیا تھا؟ میری ماں کا نام؟

وہ دس سال کا رہا ہوگا جب اس کی ماں نے ایک اندھے سنگیت کار سے گانا سیکھنا شروع کیا۔ عام طور پر سماج میں ایک بیوہ کا اس قسم کی چیزوں میں دلچسپی لینا معیوب سمجھا جاتا ہے مگر اس کی ماں ایک مشہور سماجی اور سیاسی کارکن بھی تھی۔ اس پر سماج کی ان گیدڑ بھبکیوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے ماتھے پر

بندیا بھی سجاتی تھی۔ ادھیڑ عمر کا گنجا اور نابینا سنگیت کار سارنگی بجانے میں شہرت رکھتا تھا۔ سارنگی ایک خطرناک ساز ہے۔ وہ انسانی آواز کی نقل سی کرتی ہے اور گانے والے کی آواز میں ایک بے تکا سا جھا کر لیتی ہے۔ وہ جب بھی سارنگی بجاتا تو اسے خوف محسوس ہوتا۔ اسے اس کا گانا بجانا کبھی پسند نہیں آیا۔ طبلے پر تھاپ دیتے وقت جب وہ الاپ کرتا تو اس کی موسیقی کے تاروں سے کوئی بری شے باہر نکل کر اپنے نہ دکھائی دینے والے ارتعاشات سے ماحول کو بوجھل بنا دیتی۔ پھٹی پھٹی سی گلے سے نکلی ہوئی آواز، سامنے مودب بیٹھی اس کی ماں کے جوڑے، بندیا لگے ماتھے کو بے شرمی سے چھوتی ہوئی گزرتی تھی۔ سر اور لے کے ساتھ، اس کے ہاتھ کسی بدنیتی کی طرف بڑھتے ہوئے خلا میں بازاری انداز میں کھلتے اور بند ہوتے رہتے اس کی بے نور آنکھوں کے ساتھ ہونٹوں پر ایک کینہ اور شیطنت بھری مسکراہٹ سانپ کی طرح رینگتی رہتی تھی۔

دراصل بے چارے اندھے اپنی تاریک دنیا کو جن لکیروں سے بھرتے اور سجاتے رہتے ہیں اس کے لیے صرف ذہانت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انھیں آنکھوں کے علاوہ اپنے پورے جسم سے دیکھنا پڑتا ہے۔ آنکھوں کے علاوہ جسم کے کسی حصے یا دوسرے آلات حواس کے ذریعہ دیکھنا خوفناک بات ہے۔ یہ خوفناک پن کبھی ان کے چہرے پر اترتا ہے۔ اور کبھی ان کی آواز میں۔

وہ گرمیوں کی سخت اور لو سے بھری ہوئی دوپہر تھی۔ اسکول میں کوئی بچہ مر گیا تھا اس لیے وقت سے پہلے ہی چھٹی کی گھنٹی بج گئی۔ وہ بہت بھوکا تھا۔ اس نے صبح اسکول روانہ ہوتے وقت اپنی ماں سے دوپہر میں دال چاول کی فرمائش کی تھی۔ اسکول کی فاختئی رنگ کی یونیفارم پہنے، کندھے پر عمر سے زیادہ بھاری کتابوں کا بستہ لادے اور بغل میں پانی کی خالی رنگین بوتل دبائے وہ دوڑتا ہوا گھر کی طرف چلا آ رہا تھا۔ بھری دوپہر میں چیل انڈا چھوڑ رہی تھی۔ دھوپ چمکیلی نہیں تھی۔ لو کھا کر دھندلی اور مٹیالی ہو گئی تھی۔ جیسے ہی وہ اپنی گلی کے سرے پر پہونچا ایک کالے رنگ کا طویل قامت کتا اس کے پیچھے غراتا ہوا دوڑا۔

اس کے ہوش اڑ گئے۔ حواس باختہ ہو کر وہ اپنی پوری جان لگا کر گھر کی طرف بھاگا۔ کتا اس کے تعاقب میں تھا۔ اس کے پنجوں سے سڑک پر دھول اڑنے لگی۔ سڑک سنسان تھی۔

مگر گھر کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ زور زور سے ماں کو آواز دیتے ہوئے اس نے ٹین کے کواڑ بری طرح جھنجوڑ ڈالے پھر دروازے کو بری طرح پیٹنے لگا۔ ٹین کے دروازے کو پیٹنے کی مہیب اور کھنکھناتی آواز گلی کے اس سرے سے اس سرے تک پھیلنے لگی۔ مگر گلی ویران پڑی تھی۔

اتنی دیر میں کتا اس تک پہونچ چکا تھا۔ کتے نے اس کی بائیں ٹانگ کو اپنے منھ میں لے لیا اور کوڑے کے ڈھیر سے اٹھائی ہوئی کسی جھوٹی ہڈی کی طرح اسے بھنجھوڑنے لگا۔ وہ اپنے ہی گھر کی چوکھٹ پر گرا پڑا تھا۔ اسکول کا بستہ کندھے سے پھسل کر دور جا گرا اور پانی کی خالی نیلی بوتل سڑک پر ادھر ادھر لڑھکنے لگی۔

وہ اپنی پوری طاقت سے چیختا اور روتا رہا۔ چیختے چیختے اس کا حلق بیٹھ گیا اور دھونکنی چلنے لگی۔ دروازہ نہیں کھلا۔

کتا اس کی ٹانگ کو وحشی انداز میں بھنجھوڑے جا رہا تھا۔ اس کے کالے سخت بال اس کی پنڈلی کو چھیل رہے تھے۔ کتے کے بالوں میں لگی کلیاں اس کے سارے جسم پر چڑھ آئیں۔

پتہ نہیں کتے نے اس کی ٹانگ کب اور کیسے چھوڑی۔ لو کے جھکڑ تیز ہونے لگے۔ گلی میں دھول کا بگولا اڑتا ہوا چلا گیا۔ آسمان زرد ہونے کی طرف جھکا۔

ایک پل کو اسے محسوس ہوا جیسے وہ ایک کالی گندی نالی میں رینگ رہا تھا جس میں دال چاول بہتے چلے جا رہے تھے۔

تب شاید صدیوں کے بعد گھر کا دروازہ کھلا۔ پہلے جو باہر آیا وہ ایک اندھا سنگیت کار تھا جو کسی سہمی ہوئی مگر چالاک بلی کی طرح خاموشی سے اسے پھلانگتا ہوا گھر کی دہلیز پار کر گیا۔

اس کے بعد ایک عورت کا شرمندہ سا سایہ باہر آیا۔ عورت جس نے اپنے جوڑے سے ماتھے پر بندیا سجا رکھی تھی۔ عورت کے ہاتھ اسے اندر اٹھا کر لے جانے کے لیے بڑھے وہ شاید آہستہ آہستہ سسک رہی تھی۔

مگر وہ گھر میں نہیں گیا۔ وہ تمام عمر کبھی اس چوکھٹ پر نہیں چڑھا جہاں کتا اس کی ٹانگ چبا رہا تھا۔ وہ تو اس کالی نالی میں اور آگے رینگتا چلا گیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ وہ کتا ابھی تک مرا نہیں ہے۔ کتوں کی آخر کتنی عمر ہوتی ہے؟ وہ اسے اچھی طرح پہچانتا ہے۔ وہ کالے رنگ کا ہے۔ اس کی بھوری آنکھیں ہیں۔ اس کے بالوں پر بے شمار موٹی کلیاں چمٹی ہوئی ہیں۔ وہ جب دوڑتا ہے تو اس کے پنجوں سے سڑک پر دھول اڑتی ہے۔ آسمان زرد ہونے لگتا ہے۔

اس رات اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھی وہ ٹہل رہا تھا۔

دریا کے پاٹ کے بیچوں بیچ، میرے مالک کی استھیوں کا کلس بہتا چلا جا رہا ہے۔ ہم بندر بھی تیر سکتے ہیں مگر تین ٹانگوں سے یہ ممکن نہیں۔ دوسرے یہ بھی کہ اب اس تعاقب کا کوئی مطلب نہیں۔ گذرا ہوا وقت اب کبھی واپس نہیں آئے گا اور اگر آئے گا تو میرے یعنی بندر کے مردہ بچے کی طرح یا ذریعے ہی آئے گا۔ ایسا گزرا وقت جب واپس آتا ہے تو وہ ہمیشہ نحس ہوتا ہے۔ ایک بدشگونی کو اپنے کاندھوں پر لیے ہوئے۔

مجھے اس بات کا بے حد ملال ہے کہ یہ ساتھ بے معنی ہی ثابت ہوا۔ انسانوں کی زبان سیکھ لینا یا ان کی نقالی کر لینا کافی نہ تھا۔ انسانوں سے محبت یا نفرت کرنا بھی کافی نہیں تھا۔ اس کے آگے ایک پر اسرار زبان تھی جسے میں جان نہ سکا، انسان اپنے کاندھوں پر کون سے ناقابل فہم اور پوشیدہ دکھوں کی صلیب لادے لادے پھرتا ہے۔ یہ میں نہ سمجھ سکا۔ وہ کیوں جیتے جیتے اچانک خود ہی مر جاتا ہے یہ ایک اسرار ہے اور مرنے کے بعد وہ اس سے بھی بڑا اسرار بن جاتا ہے۔

آج مجھے یہ وہم بھی ہو رہا ہے کہ جیسے میں ابھی بھی سرکس کے پنڈال کے نیچے بے تکی اور مایوس کن قلا بازیاں کھا رہا ہوں اور اس شخص کے پراسرار کرتبوں کے آگے میری کوئی حیثیت نہیں۔ استھیوں کا یہ بہتا ہوا کلس شاید اس شخص کا سب سے بڑا اور عظیم کرتب تھا۔

کاش کہ میں ڈگڈگی بجا کر تماشہ دکھانے والے کسی مداری کا ایک معمولی سا بندر ہوتا۔ میری شکل بھی تماشے کے مسخرے پن کے لیے ہمیشہ سے بہت مناسب رہی ہے۔ تب میرے ذہن میں اتنی الجھن اور مایوسی شاید نہ ہوتی۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں ایک حقیر اور معمولی بندر کسی کے آباواجداد میں اپنا نام بھی شامل کر سکوں گا یا نہیں مگر پتر پکش میں یہ جو کش سے تالاب میں کھڑے ہو کر ترپن کیا جاتا ہے اور سورگ میں مقیم پرکھے اپنی پیاس بجھاتے ہیں تو اس شخص کے لیے یہ سب کون کرے گا؟

کتابوں میں کہیں لکھا ہے کہ میں انسان کا پرکھا ہوں۔ کوئی سلسلہ ہے ضرور اگرچہ ٹوٹا ہوا۔ کوئی زنجیر ہے مگر گلتی ہوئی۔ افسوس کہ یہ سب انسان ہی بہتر جانتے ہیں۔ اگر میں ہی انسان کا پرکھا ہوں تب میں اس کے پیچھے پیچھے کیوں چل رہا ہوں؟ اس کی آنکھوں، اس کی خاک اور اس کی مٹی کا تعاقب کیوں کر رہا ہوں؟

اب اس مقام سے آگے بڑھنے کی سکت میرے تین کمزور پیروں میں نہیں ہے۔ میری گردن بری طرح ٹیڑھی ہونے لگی ہے۔ بھوک اور پیاس کا احساس میرے حافظے سے غائب ہو چکا ہے۔ تیرہ دنوں میں میرے بال اتنے جھڑ گئے ہیں کہ میری کھال کالے چمڑے کی بدرنگ پانی کی خالی پچکی ہوئی مشک کی طرح نظر آنے لگی ہے۔

دریا کے اوپر کوؤں کا جھنڈ شور مچاتا ہوا منڈرا رہا ہے۔ یہ دریا آگے چل کر شاید کسی دوسرے بڑے دریا سے جا ملتا ہے جس کے کنارے اس سے بھی زیادہ چوڑے اور بلند ہیں۔ لال کپڑے میں بندھا استھیوں کا کلس سہارا پانے کے لیے دور پانی کی دھند میں گم ہو رہا ہے۔

میں اسی جگہ۔ کنارے پر ہی اپنی ٹیڑھی گردن سمیت بیٹھ جاتا ہوں۔

دریا کے گیلے ویران کنارے پر ایک اداس بیمار اور تھکا بندر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی اگلی معذور ٹانگ کنارے کی نیم گیلی مٹی میں دھنس گئی تھی۔ بارش کہیں نہیں ہو رہی تھی۔ ایسے موسم میں صرف اونٹ زندہ رہ سکتے تھے یا ببول۔

ہوا ساکت تھی۔ مگر ندی کے کنارے کسی نادیدہ بارش سے چوڑے اور مہیب ہوتے جا رہے تھے۔ درخت اس بارش میں ڈوب رہے تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے باڑھ آنے والی ہو۔ ممکن ہے کہ یہ بارش نہ ہو کر کوئی دوسری زیادہ خطرناک شے ہو۔ کوئی بھی آفت کبھی بھی آسکتی تھی۔ ندی کا پانی تاریک ہوتا جا رہا ہے۔ موسم کسی بدشگونی کی طرف تیزی کے ساتھ جھک رہا ہے۔

اس نادیدہ بارش اور باڑھ کے سامنے خاموشی سے بیٹھا یہ بندر دور سے دیکھنے پر ایک بدرنگ کچے پتھر کی مورتی کی طرح نظر آتا ہے۔ ہمیشہ کے لیے وہیں نصب یہاں سے کبھی نہ اٹھنے کے لیے کیونکہ وہ شاید ہمیشہ سے اسی جگہ موجود تھا اور اسی لیے ہمیشہ یہیں بیٹھا رہے گا ☆☆☆

غزل

مخمور سعیدی

شہر اجڑے ہوئے خوابوں کے بسائے کیا کیا
نیند میں ہم نے در و بام سجائے کیا کیا

ہر قدم پر کسی منزل کا گذرتا تھا گماں
راہ چلتے ہوئے منظر نظر آئے کیا کیا

ہم کہ پھر تیری حقیقت پہ نظر کر نہ سکے
زندگی تو نے ہمیں خواب دکھائے کیا کیا

اک ستارہ کہ چمکتا ہے بہت دور کہیں
ظلمت شب میں ہمیں پاس بلائے کیا کیا

موسم گل میں ترا ہم سے جدا ہو جانا
یاد آئے تو ہمیں خون رلائے کیا کیا

کھو سے جاتے ہیں کہیں اس کا خیال آتے ہی
ہم اسے بھول کے بھی بھول نہ پائے کیا کیا

مندمل ہو گئے سب زخم پرانے تو مگر
دل کی اک تازہ کسک ہم کو ستائے کیا کیا

کیا مسافت ہے کہ حیران کیے دیتی ہے
ہر گذرتا ہوا پل سامنے لائے کیا کیا

آنسوؤں نے تری تصویر بھی دھندلی کر دی
نقش پانی پہ مگر ہم نے بنائے کیا کیا

لکھنے بیٹھیں جو کبھی عمر گذشتہ کا حساب
ایک اک لمحہ ہمیں یاد دلائے کیا کیا

کیا کہیں وہ بھی ہمیں راس نہ آئی مخمور
اک خوشی جس کے لیے رنج اٹھائے کیا کیا

کرشن کمار طور

ظاہر ہے جیسے عالم مفقود سے الگ
موجود ہوں میں لحۂ موجود سے الگ

ہر آنکھ ہے لگی ہوئی دہلیز خواب سے
مشکل ہے ہونا گوہر مقصود سے الگ

ہونا نہ ہونا دہر میں ہے کھیل وقت کا
رہتا بھی کیا ہے شاہد و مشہود سے الگ

جاتی نہیں اندھیرے سے آنکھوں کی روشنی
منزل ہوئی ہے کیا رہ مسدود سے الگ

کیا زندگی الگ ہے محبت کی آنچ سے
روشن ہوئی ہے آگ کسی دود سے الگ

نا ہست اگر دلیل ہے نا ہست کی یہاں
نابود بھی نہیں یہاں نابود سے الگ

ہر دم ہمارے ورد زباں ہے خدا کا نام
ہم طور کب ہیں ساعت مسعود سے الگ

کتاب عشق میں سارا بیاں وصال کا ہے
میں زندہ ہجر میں ہوں اور گماں وصال کا ہے

ہم ایسے فرق تعلق سے خود بھی حیراں ہیں
زمیں ہے ہجر کی اور آسماں وصال کا ہے

عجب تضاد کے پیش نظر ہوں ہستی میں
ہے دھوپ ہجر کی اور سائباں وصال کا ہے

ہے جاگنے پر ہی پڑتا تمام چابک ہجر
ہوں آنکھیں بند تو سارا سماں وصال کا ہے

چلو یہ ہجر سہی کچھ تو دسترس میں رہے
جو وقت آتا ہے وہ بھی کہاں وصال کا ہے

غرض سے چپ ہیں مگر اہل دل سمجھتے ہیں
کہ لفظ ہجر سے روشن بیاں وصال کا ہے

کشید کرتے ہیں عرفان اپنے ہجر سے طور
یہ خطہ چھوڑ کے سارا جہاں وصال کا ہے

غزل

کرشن کمار طور

نہ اس کو دیکھا نہ تاب وتواں روانہ کئے
تمام عمر کی مٹی میں ٹھکانا کئے

نہ اس سے وصل کیا اور نہ ہائے ہو ہی کی
زمانہ گذرا کوئی کار عارفانہ کئے

دلوں کو زخم دیے اور عذاب آنکھوں کو
جو کام اس نے کئے سارے منصفانہ کئے

میں اپنے آپ کو پہچانتا نہیں ہوں ابھی
میں آنکھ موند کے لیٹا ہوں یہ بہانہ کئے

یہ ایسا داؤ ہے جب پھینکو الٹا پڑتا ہے
سمیٹے بیٹھے ہو کیا عشق کو خزانہ کئے

ہو اس سے وصل کے طالب بھری سبھا میں طور
کہاں یہ ہوش وحواس آپ نے روانہ کئے

ابن انشا کی طرح

(بستر مرگ پر)

مصحف اقبال توصیفی

ابن انشا کی طرح میں بھی یہی سوچتا ہوں
کاش میں پھر سے جنم لیتا
(ایک بستی کے اسی کوچے میں)
اور یوں ہوتا...تو... یوں ہوتا
کوئی دیکھے یہ مرے خواب
میری ناکام تمنائیں ادھر
ایک کونے میں کھڑی ہیں چپ چاپ
رات نے پاؤں رکھا ہے نیچے
خواب کے ٹوٹے ہوئے زینے پر
میری پلکوں پہ، مرے سینے پر

ابن انشا کی طرح
ہم نفس کوئی نہیں ہو جس کا
(ابن انشا بھی نہیں، قدرت اللہ شہاب؟
نہیں کوئی نہیں)
سر بالیں پھر وہی خواب؟
نہیں۔ کوئی نہیں۔

مصحف اقبال توصیفی

نہ جانے ایسی کتنی کتابیں ہوں گی
جو کسی میوزیم
کسی لائبریری میں
کسی ہارڈ ڈسک (۱) پر محفوظ نہیں

ایسی ہی ایک کتاب میں لکھ رہا ہوں
رات دن
بے تکان
لکھتے لکھتے سو جاتا ہوں
کچی نیند سے بیدار ہو کر
پھر لکھنے لگتا ہوں

اس مصروف زندگی میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں
کہ اس کتاب کو پڑھے، مجھ سے ملے
(خود میرے پاس اتنا وقت کہاں)

حیران ہوں
جس کتاب کے اوراق پر
میرے آنسوؤں کے دھبے تازہ ہوں
اور روشنائی ابھی گیلی
اس کتاب کو دیمک کیسے لگ گئی؟
لفظ کاغذ پر اترنے سے پہلے
کیوں زرد ہو کر فضا میں تحلیل ہو رہے ہیں؟
میرے اندر باہر
ہر طرف چیونٹیاں سی رینگ رہی ہیں
میں اور تیز لکھنے لگتا ہوں... میں ہانپ رہا ہوں
جیسے میں کوئی قبر کھود رہا ہوں
لیکن میں تو کتاب لکھ رہا ہوں

ایک ایسی کتاب جسے پڑھنے کے لئے کسی کے پاس وقت نہیں
جسے رکھنے کے لئے
قبر کے سوا کوئی جگہ نہیں

---
(1) Hard Disk

صابر ظفر

دوبارہ ہونے لگے منظروں میں منظر گم
کہاں ہے تو کہ ہے موجود گم میسر گم

اجل گرفتہ ہیں ہم آ ادھر ردالی(۱) آ
جو نوحہ گر تھے ہمارے ہوئے وہ یکسر گم

نہ جل پری ہی وہ آئی نہ بادبان کھلا
اور اپنے آپ میں دیکھا گیا سمندر گم

میں تیرے دھیان کے دامن کو تھام کر نکلا
وگرنہ دیکھا گیا خضر گم سکندر گم

یہ کون لے گیا پانی ہماری جھیلوں سے
پرندے ڈھونڈ رہے ہیں کہاں ہے لنیجھر(۲) گم

میں اس کو ڈھونڈنے نکلا ہوں طاق راتوں میں
انھی شبوں میں کہیں ہے شب منور گم

کروں نثار دل و جاں لگاؤں مہر کہاں
تجھے حلف کی پڑی ہے یہاں ہے محضر گم

بچھونا رلی کا اور سائبان اجرک کا
اسی جہان میں دیکھا جہان دیگر گم

بٹھائے رکھتی ہے پورے دنوں کی تنہائی
سہاگنوں سے کہیں ہو گیا ہے جھومر(۳) گم

جب اس کا ذکر کرو گے تو کھوئے جاؤ گے
کہ اس کی مدح میں ہیں دفتروں کے دفتر گم

مرا بھی لال کہیں کھو گیا ہے اے گردوں
ہوئے نہ صرف تمھارے ہی ماہ و اختر گم

بس اتنا یاد ہے جنگل کے بعد جنگل تھا
پھر اس کے بعد تھا سارا ہی لاؤ لشکر گم

کنول کے سامنے تحفے تھے ہیچ رانیوں کے
تھی نوری جام تماچی(۴) کے دل میں بہتر گم

ہوا نہ بوریا جس طرح گھر میں غالب کے
اسی طرح ہوا اک رات میرا بستر گم

ہمیشہ ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ہوں گے
تری جدائی کی جھیلوں میں میرے کنکر گم

دوبارہ آئی ادھر ایک صبح کجری گجر(۵)
سو شام تک رہی پیہم مرے برابر گم

مجھے پناہ میں رکھتی ہے میری تنہائی
کہ جیسے اپنی ہی خوشبو میں ہو گل تر گم

رکھا ہے زندہ شہادت کی آرزو نے مجھے
میں ہونا چاہوں وہاں گم جہاں بہتر گم

میں اس گلی میں اگر ہار آیا دل تو ہے کیا
کہ سورما ہوئے کیا کیا نہ بیچ کھیتر(۶) گم

ہر ایک بھٹکی ہوئی بھیڑ ہے ہمہ تن گوش
اگرچہ شور میں ہیں عاصیان منبر گم

بس ایک غیب کا احساس جاوداں احساس
کہ جس کی راہ میں دیکھا ہر ایک محوز گم

بنائی شاہ عنایت(۷) نے جیسے جھوک شریف(۸)
بسائی میں بھی کہیں دل مگر ہے دلبر گم

لیے لیے پھروں سانسوں کی آخری گوٹیں
لگاؤں بازی کہاں جب ہر ایک چوسر گم

وہ ایک پل کہ جدائی کا پل جسے کہیے
اس ایک پل میں ہوئے عرصہ ہائے محشر گم

مرے نصیب میں تعطیل کا نہیں کوئی دن
ہے ماہ و سال سے میرے ہر ایک آچر (۹) گم

بس ایک ہجرت دائم بس ایک فرصت غم
ہمارا گھر ہی نہیں تھا سو کیا کہیں گھر گم

کرو قیام کبھی تم بھی لاڑ (۱۰) میں آکر
کہ جیسے تال ترائی میں کونجیں بے پر گم

نظر اٹھا کے جدھر چاہو تم ادھر دیکھو
مگر ہر ایک نظارہ ہے روح پرور گم

وہ رات بھی کسی قزاق کی طرح آئی
کہیں لباس تھا گم اور کہیں تھا زیور گم

تو میری پیاس بجھا دے اسی جہنم میں
بہشت میں بھی مبادا ہو آب کوثر گم

ہر اک بہار ہے ٹھٹھے (۱۱) کے موہیے پہ نثار
خزاں میں ورنہ سبھی سرو گم صنوبر گم

چلو کہ ساتھ چلیں ہے اگر بساط چلیں
تمھاری سیپیاں گم ہیں ہمارا گوہر گم

ہزار بار ہو رقص اور ایک آخری رقص
ترے ہی دل میں ہے لیلا (۱۲) ترا چنیسر (۱۳) گم

وہ زندگی کہ جو نکلے نہ اپنے حلقے سے
کبھی کبھی لگے حلقے سے اپنے باہر گم

حکایتوں سے ہماری نہ سرسری گذرو
کہ ان کے سامنے دیکھو گے پنج تنتر گم

یہ واقعہ ہے کہ میں جب بھی اس گلی میں گیا
ہوئی ضرور وہاں میری کوئی سدھر (۱۴) گم

زمانہ دیکھ چکا دوری و حضوری کو
ہے کائنات وہاں گم جہاں قلندر (۱۵) گم

نمو پذیر ہے کوئی نہ بے نمو کوئی
عجیب شکل میں زرخیز گم ہے بنجر گم

ہوا نڈھال میں ایسے تجھے پکار پکار
کہ بول بول کے جیسے ہو کالا تیتر گم

اٹھایا جو بھی گیا خاک میں دبایا گیا
کوئی ہوا نہ کسی بھی فلک میں جا کر گم

شہادتوں کا ابھی سلسلہ ہے کیوں جاری
جو کربلا میں ہوا تھا ہر ایک خنجر گم

میں رل بھی جاؤں ترے عشق میں تو رنج نہیں
کہ اس نواح میں ہوتے رہے ہیں اکثر گم

دوبارہ اس کی محبت کو جیتنا چاہوں
کہ میرے دل سے تو سب کچھ ہوا مسخر گم

تری جدائی نے طوفاں عجب اٹھائے ہیں
کہ اس کی لہروں میں کیا کیا ہوئے شناور گم

اور اب دکھائی نہ دیں دور دور تک جنگل
جگہ جگہ تھے کبھی جنگلوں میں اژدر گم

وہ اس کے ہونٹ کہ کچنار کی کلی جیسے
ہمارا دل ہے اسی پنکھڑی کے بھیتر گم

زمیں پہ ہے نہ پتا کوئی درختوں پر
وہ آندھیاں ہیں کہ ہے دور تک پتاور گم

لگا کچھ ایسے کہ جیسے ہو مت ہی ماری گئی
سو اس کے آگے ہوئے کیسے کیسے چاتر (۱۶) گم

کسے فراغ کہ حال اس کا جا کے پوچھے کوئی
وہ شخص ان دنوں رہتا ہے غم زدہ اور گم

اسی لیے تو ہے لا حاصلی کا پچھتاوا
کہ اولیں کی طرح آخری ہے جوہر گم

پڑے پڑے یونہی پتھرا گیا ہے سایہ بھی
کہ راستہ ہی نہیں ہو چکا ہے رہبر گم

دعائیں ہوتی ہیں گذرے ہوئے بزرگوں کی
کہ جو کبھی نہیں ہوتے ہیں کچھ سخنور گم

کسی طرح نہیں سو سکتا کوئی جاگا ہوا
کہ خواب میں ہے کہیں قرص خواب آور گم

چھڑا رہا ہے کوئی جان اپنے دشمن سے
کسی کا کوئی طرفدار کوئی یاور گم

سہارا دیں ترے گرتے رواق کو کیسے
کہ ہو رہا ہے ہمارا تو اپنا چھپر گم

کسی کے واسطے چارہ نہیں کہیں بھی کوئی
کہیں اناج ہے گم اور کہیں ہے چوکر گم

بہانہ بنتا ہے کوئی نہ کوئی کھونے کا
کہ چھوکری سے ہوئی پہلے اس کی چوزر گم

کسی نے ہاتھ چھڑایا جو میرے ہاتھوں سے
لکیریں ہو گئیں ہاتھوں کی گم مقدر گم

خلیفہ گل(۱۷) ہو کہ سائگی(۱۸) لطیف(۱۹) ہو کہ ایاز
خدا کرے کہ ہوں میری غزل کو سن کر گم

پنھل کو یہ بھی نہ سسی بتا سکی افسوس
اگر وہ سوئی کریں گے تجھے برادر گم

عطا انھیں بھی ہو کچھ دھول ہی کا پھول سہی
جو تیری راہ میں رہتے ہیں تیرے چاکر گم

درخت سوکھ گئے طائروں نے ہجرت کی
وہ قحط ہے کہ ہوئی اژدہے کی شوکر(۲۱) گم

دیے کی لو میں رہا رات بھر میں کھویا ہوا
سحر ہوئی تو ہوا تر مرے(۲۲) کے رخ پر گم

ترس رہا ہوں میں ایماں کی اس حرارت کو
بلند ہوتے ہی نعرہ علی کا خیبر گم

بھنور میں بے اثری کے جو ہو گئے نابود
انھی کے ساتھ ہیں میرے بھی چند اکھر گم

زمین ماں کی طرح سب کو گود میں لے لے
جہاں ہے گم کوئی مفلس وہیں تونگر گم

یہ کیا ستم ہے کہ سر پھوڑنا اگر ٹھہرے
تو دور دور تلک ہوں تمام پتھر گم

خموش ہو گیا ہر کوئی لو کے چلتے ہی
نمی کو چاٹنے والی ہوا میں جھینگر گم

نہ جانے کس لیے چکرا رہا تھا سر میرا
ہوا جو سر مرا گم ہو گئے ہیں چکر گم

کنارے اور سہارے وہ سارے کھو بیٹھے
کہیں ہے گم کوئی کشتی کہیں ہے لنگر گم

وصال ہوگا تو اس کی حدود میں ہوگا
حیات دیکھ رہا ہوں میں کاک (۲۳) اندر گم

خدا کی مار پڑی ایسی ایک حاکم پر
اجڑ گئے سبھی مے خانے اور ساغر گم

میں عاملوں کی طرح ڈھونڈتا پھروں اس کو
کہ حاضرات میں جیسے ہو وہ مرا بر گم

وہیں سے چاہیے مرا عشق رونما ہونا
جہاں سے فقر جنید اور شکوہ سنجر گم

وگرنہ دل تو تھا میرا ہمیشہ زنجیری
کئی دنوں سے کہیں ہوگئی ہے سانکر گم

پیمبری کے بھی ہوتے ہیں خشک یوں سوتے
کہ جس طرح سے کہیں ہووے شیر مادر گم

ابھی گرفت میں آیا ہے ایک آدھ ہی فرد
ابھی تو ہوگا مری جان سارا ٹبر گم

دھری ہی رہ گئیں وہ پاک بازیاں ساری
بھٹک گئے تو سبھی ہو گئے پوتر گم

شفق کی اڑ گئی لالان دل ہوا ویران
اجل نے کر ہی دیا زندگی کا پیکر گم

خموش ہوں کہ یہ باتیں نہ ختم ہوجائیں
اور اپنی ذات میں ہونا پڑے مکرر گم

ہر ایک اصل کے پہلو میں اصل کی جا ہے
کہاں ہے دیکھو وہ نور خدا کا مظہر (۲۴) گم

یہ راز بھی گل و بلبل کی گفتگو سے کھلا
اسی چمن میں کہیں ہے کوئی سمن بر گم

پلٹ تو آیا مری سمت ٹھوکریں کھا کے
مگر وہ ساری ادائیں وہ سارے تیور گم

ہمارا حال ہوا ہے یہ جس کی غفلت سے
اسی کی روح میں ہو کاش روح مضطر گم

اجڑ گیا ہے جو گاؤں اسے اجڑنا تھا
کہ اس کی گلیوں میں اپنا ہوا تھا متر گم

شہید کر دیں مجھے اور چھوڑ یں سرمد کو
میں ڈھونڈتا ہوں کہاں ہیں وہ سب ستم گر گم

جو اس کی سمت گیا لوٹ کر نہیں آیا
کوئی ہے بر سر در گم کوئی پس در گم

میں ڈھونڈ لاؤں اسے یا میں خود بھی کھو جاؤں
بتا کہ ہے کہاں اے زندگی ترا زر گم

ہے کون زندہ کہ سب کچھ ہی مر چکا جیسے
اجل ہے چاروں طرف اور خیر گم شر گم

حساب شام وسحر مانگیں مجھ سے آدجگاد (۲۵)
کہ رات بھر تھے کہاں اور کہاں تھے دن بھر گم

برہنگی کا نہ درماں ہوا کسی صورت
جہاں تھی گم کوئی مخمل وہیں تھا کھدر گم

بجھا کے پیاس روانہ کیا اسے میں نے
کہ ہو چکی تھی کہیں تھر میں اس کی گاگر گم

وہ بادلوں کو جسیں چھتریاں سمجھ بیٹھے
اسی لیے تو کئی ہو گئے کبوتر گم

نشانیاں ہیں جہاں گم وصال کی باقی
شکن شکن سے اٹھی بستروں میں سیکر (۲۶) گم

اب آگے راستے گمراہیوں کے رستے ہیں
چلے چلو کہ جہنم تلک ہے ٹھوکر گم

یہ مجھ سے بے سری اب زندگی نہیں کٹتی
سنوں نہ کس لئے بیجل (۲۷) کو اور کروں سر گم

ہوں انتظار میں مژگان یار کھلنے کے
میں اس کی آنکھوں میں ہو جاؤں گا سراسر گم

یہ سن کے آگے بڑھا ابر ستر پوشی کو
جو کوئی بولا کہ بی بی تری ہے چادر گم

زبان سوکھتی جاتی ہے اس شکایت سے
کہ ہو رہے ہیں تری حمد کے بھی خوگر گم

حواشی:

(۱) بین کرنے والی عورت (۲) صوبہ سندھ کی ایک جھیل
(۳) ایک رقص کا نام (۴) سندھی لوک گیت کے دو کردار
(۵) سندھی میں خوبصورت عورت کو کہتے ہیں
(۶) میدان جنگ (۷) سندھ کے ایک صوفی جنھیں شہید کر دیا گیا تھا
(۸) شاہ عنایت کی بسائی ہوئی بستی
(۹) اتوار (۱۰) جنوبی سندھ (۱۱) ٹھٹھہ، سندھ کا قدیم شہر
(۱۲) سندھی لوک داستان "لیلا چنیسر" کی ہیروئن، لیلا
(۱۳) سندھی لوک داستان "لیلا چنیسر" کا ہیرو
(۱۴) خواہش (۱۵) حضرت لال شہباز قلندر
(۱۶) چالاک (۱۷) سندھی غزل کے بنیادگذار شاعر
(۱۸) سندھی شاعر میر عبدالحسین سانگی
(۱۹) شاہ عبداللطیف بھٹائی (۲۰) شیخ ایاز
(۲۱) پھنکار (۲۲) آئینے سے منعکس ہونے والا سورج کا عکس
(۲۳) سندھ کی لوک داستان "مومل رانو" کی ہیروئن مومل کا طلسماتی محل
(۲۴) حضرت داتا گنج بخش (۲۵) ازل ابد (۲۶) سسکی
(۲۷) سندھ کا دیومالائی مغنی بیجل جو نغمے کے عوض سننے والے کا سر مانگتا تھا

غزل

صابر ظفر

وہ صدائیں دیتا رہا ہو میں نے سنا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو
مجھے لگ رہا ہو جدا مگر وہ جدا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

نہیں کوئی راز یگانگی نہیں کوئی ساز فسانگی
مگر ایک ساز فسانہ راز یگانہ ہو کہیں یوں نہ ہو

میں سمجھتا ہوں اسے خوش نصیب کوئی چومتا ہے اگر صلیب
کہ یہ ساز مرگ ہی زندگی کا ترانہ ہو کہیں یوں نہ ہو

میں دیا سلائی کی روشنی میں تلاش کرتا رہا تمہیں
مگر اپنا مقصد اندھیری رات بتانا ہو کہیں یوں نہ ہو

میں تمہارے عشق میں رات دن جو دکھائی دیتا ہوں مطمئن
مرا گھر ہی صرف لٹا ہو دل تو لٹا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

وہ شمار ماہ و نجوم ہو کہ خمار ترک رسوم ہو
کوئی بار سوچ بچار ہی کا پڑا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

کسی ہونٹ سے کوئی رس ملے کوئی دم فرشتہ نفس ملے
وہ ملا بھی ہو تو مجھے دوبارہ ملا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

ترے پاؤں چھوتی وہ ساعتیں وہ تغیرات کی سبقتیں
کسی پل کا جیسے کہیں بھی کوئی سرا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

جو ہے اپنے رنگ میں صندلی جو ہے اپنے لمس میں مخملی
مری خلوتوں کو اسی نے جیسے لبھانا ہو کہیں یوں نہ ہو

وہ اساس عزم سے آشنا وہ لباس نظم سے رونما
کسی قافیے یا ردیف سے وہ کھلا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

کوئی آبشار نہ آبجو کسی اور لہر کی آرزو
مری پیاس بجھنے کا اور کوئی ٹھکانا ہو کہیں یوں نہ ہو

کہیں یوں نہ ہو کوئی پل صراط کے پار ہو مرا منتظر
مگر اس کو جا کے ادھر تلاش کیا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

کسی عید پر یا بسنت پر وہ ملے گا عمر کے انت پر
میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ بھی کوئی بہانہ ہو کہیں یوں نہ ہو

وہ افق بنفشی جو کھو چکا کوئی آفتاب جو سو چکا
انھیں رنج میرے اکیلے پن کا رہا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

مجھے ناز اپنے خیال پر مجھے ناز اس کے جمال پر
میں سمجھ رہا ہوں جسے نیا وہ نیا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

مرے دل کے دین کو بیچ کر کوئی لے گیا مجھے کھینچ کر
مرے انگ انگ میں اپنا رنگ جمانا ہو کہیں یوں نہ ہو

یہی ہم قدم کی ہیں لغزشیں یہی زیر و بم کی ہیں لرزشیں
جسے بھولنا نہ ہو وہ ہی یاد رہا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

کوئی شعلہ سا جو بھڑک اٹھا کوئی درد سا جو چمک اٹھا
مرے درد دل کا یہ عارضہ بھی پرانا ہو کہیں یوں نہ ہو

میں دیے جلاؤں منڈیر پر کہ ضرور آئے گا وہ ادھر
اسی شام وہ کسی اور سمت روانہ ہو کہیں یوں نہ ہو

کبھی سرمئی کبھی آتشی کبھی نقرئی کبھی کاسنی
کسی ایک رنگ میں رہ کے جی ہی لگا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

کسی فرش و عرش میں کچھ نہیں میں جھکا رہا ہوں یونہی جبیں
جسے ڈھونڈوں میں وہ قدم ہی اس نے رکھا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

ہمیں سرکشی سے مقدروں کو بدلنا آیا نہیں ابھی
مگر ایسا کرنا محبتوں میں روا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

جو تھی کل وہ آج ہے زندگی ابھی لاعلاج ہے زندگی
کہ مسیح عصر کے پاس اس کی دوا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

وہ مصوری ہوئی شاعری کسی کام آئے یہ ساحری
دل پاکباز بھی مہ رخوں کا دوانہ ہو کہیں یوں نہ ہو

شب وصل جلوۂ طور سا وہ بدن چمکتا تھا نور سا
کوئی لازوال وفور رنگ شبانہ ہو کہیں یوں نہ ہو

میں کہاں سے لاؤں وہ زندگی جو سراسر اس کی ہو بندگی
مری روح کی جو طلب ہے اس کی رضا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

مرا آخرت پہ تو ہے یقیں کہیں زہر ہو نہ یہ انگبیں
میں حقیقت اس کو سمجھ لوں اور وہ فسانہ ہو کہیں یوں نہ ہو

یہ ستیزہ کاری نہ ہو شروع ہے کہاں غروب کہاں طلوع
جو ترا زمانہ ہو وہ ہی مرا زمانہ ہو کہیں یوں نہ ہو

میں گذر کے آیا ہوں قبر سے کہ علاقہ رکھتا ہوں صبر سے
مری روح میں کوئی اضطراب فنا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

یہ گریز تو ذرا کم کرو مری کائنات میں رم کرو
سو کرم کرو کہ دوبارہ پر یہ خلا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

نہ سہاگ رات چمک سکی یونہی کسمساتے سحر ہوئی
کوئی دیپ گمشدہ تھالیوں میں جلاتا ہو کہیں یوں نہ ہو

مجھے اس کی شکل دکھائی دے نہ ہی اپنی شکل دکھائی دے
مرا آئینہ مرے شیشہ گر کی عطا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

مجھی تیرہ بخت کی بات ہے کہ یہ وقت وقت کی بات ہے
جسے یاد کر کے جیوں اسی کو بھلاتا ہو کہیں یوں نہ ہو

جو ہے میرے دل کا معاملہ جو ہے نظم دہر سے ماورا
کہیں اس کے واسطے حرف کن ہی کہا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

وہ برہنگی کا قصیدہ کہتے ہوئے ادھر نکل آیا تھا
مگر اس کی آنکھوں میں ستر پوش حیا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

نہ وہ یار تھا نہ وہ داشتہ میں کہاں پناہ تراشتا
مجھے لے کے دل مرا در بدر ہی پھرا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

سر راہ سینہ نکالتا ہوا آیا تھا جو وہ خوش نگاہ
دل عشق خو کو وہ پر غرور لگا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

ہو عبث یہاں اسے دیکھنا ہو عبث یہاں اسے ڈھونڈتا
مرا یار میرے بغیر جی ہی سکا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

وہ خیال کھول کے دیکھنا وہ سوال تول کے دیکھنا
کہ سمجھ رہے ہو جسے خفا وہ خفا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

مری زندگی تری بندگی سے جدا نہیں کبھی غور کر
مرے اجتہاد پہ تو نے غور کیا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

اسی واسطے ابھی زندگی ہوں کہ تمھارا چہرہ ہے سامنے
کوئی اور شخص مری نظر میں بچا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

وہ کوئی وغا کوئی معرکہ وہ شجاعتیں وہ محاصرہ
وہ کوئی قدیم رجز سنا ہی گیا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

جو عزیز جاں سے ہے کافرہ اسے زیب دے نہ منافرہ
یہ نہیں بعید کہ اس کو پاس وفا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

ترا حسن اسیر نہ کر سکا نہ میں تیرے واسطے مر سکا
کہیں میرا ساتھ مرے خدا نے دیا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

کوئی ہجرتی غم دہر میں ہو رواں دواں کسی لہر میں
کوئی رہ رہا تھا جہاں وہاں وہ رہا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

وہ قرون اصل کی ساعتیں وہ جنون وصل کی راحتیں
مرے واسطے ہوں مجھے پتہ ہی چلا نہ ہو کہیں یوں نہ ہو

کسی اور کے لیے ہو چھپا کے ہنسی وہ اس نے رکھی ہوئی
ظفر اک مجھی کو ہمیشہ خون رلاتا ہو کہیں یوں نہ ہو

مظہر امام

شام کے ساحلوں پر

مجھے سب پتہ ہے
کہ تو شام کے ساحلوں پر چراغاں کئے
دیر تک ریت کے گھر بناتی رہی ہے

کبھی ریت پر
تیری تحریر سے وہ نیا نام ابھرا
جسے میری امید کے ساتھ پانی کی لہریں بہالے گئیں

کبھی ریت پر
تو نے وہ نام لکھا
جسے میری آنکھوں نے دیکھا تو ان کو یقیں ہی نہ آیا
کہ میں خود سر شام
اکثر دیے لے کے نکلا ہوں
اور ریت کے گھر بناتا رہا ہوں

شکست خواب کے بعد

خواب دیکھنے والو
خواب دیکھتے رہنا
رات جا بھی سکتی ہے
صبح آ بھی سکتی ہے

مظہرامام

جو زیاں دل کا ہوا اس کا ازالہ ہوجاؤں
اب تو اظہار محبت کا سلیقہ ہوجاؤں

کھینچتا ہے ترے دامن کو حریفانہ مجھے
اک ذرا رک مرے یوسف میں زلیخا ہوجاؤں

میں ستارے کی طرح وقت پہ ہوتا ہوں غروب
شب ترا ساتھ رہا اب میں سویرا ہوجاؤں

تیرے بیمار کا ہوتا ہے مرض اور سوا
تو جو بیمار ہو میرا تو میں اچھا ہوجاؤں

میں شناور ہوں زمانے کے بھرے دریا کا
پار اترنا ہو تجھے گر تو سفینہ ہوجاؤں

اتنا بے درد ابھی دل تو نہیں ہے میرا
ساتھ کیوں چھوڑ دوں اپنا میں زمانہ ہوجاؤں؟

وقت رخصت تو چمک اپنی دکھائی ہے مجھے
چاند بننے سے رہا صبح کا تارا ہوجاؤں

رخصت شام ہے اور وعدے کا سایہ بھی نہیں
اب تکلف نہ کروں جا کے تقاضا ہوجاؤں

کب سے ہوں ماہی بے آب زمانے کی طرح
کوئی نیکی ہو ترے پاس تو دریا ہوجاؤں

کتنے پیچیدہ مسائل کی تھکن ہے مجھ میں
اک ذرا سوچ لوں تجھ کو تر و تازہ ہوجاؤں

کتنے پہلو ہیں کئی رنگ چھپے ہیں مجھ میں
ابھی ایسا ہوں جو تو چاہے تو ویسا ہوجاؤں

اپنے سینے میں ہیں ٹھہری ہوئی سانسیں کب سے
زلزلہ بن کے تو آ میں تہ و بالا ہوجاؤں

وہ رفاقت پہ رضامند نہیں ہے تو نہ ہو
کیا میں اس شخص کے ہوتے ہوئے تنہا ہوجاؤں

بے یقینی ہے کچھ امروز میں اتنی مظہر
جی میں آتا ہے کہ اندیشۂ فردا ہوجاؤں

ظفر گورکھپوری

رہے نہ گھر کے ہوئے خوار یہ تو ہونا تھا
تری تلاش میں اے یار یہ تو ہونا تھا

قطار جلتے چراغوں کی برسر دیوار
سیاہیاں پس دیوار یہ تو ہونا تھا

زمین بانٹنے والوں کے ہم مخالف تھے
ہمیں پہ آ گری تلوار یہ تو ہونا تھا

گذر کے اک رہ پرخار سے یہاں پہنچے
یہاں سے پھر رہ پرخار یہ تو ہونا تھا

افق سے پوچھ رہے ہیں کہاں گیا سورج
ہوئے تھے دیر سے بیدار یہ تو ہونا تھا

ہمیں نے اس کے لئے راستے بنائے تھے
کہ گھر تک آ گیا بازار یہ تو ہونا تھا

تعلقات کی تعمیر میں خلوص تھا کم
بلندتر ہوئی دیوار یہ تو ہونا تھا

ظفر گورکھپوری

طریق گریہ اب اس سے بہتر نہیں ملے گا
کہ ایک آنسو بھی کوئی باہر نہیں ملے گا

یہ شہر بھیدوں بھرا یہاں آدمی ملیں گے
مگر کسی کے بھی دوش پر سر نہیں ملے گا

ملے گا دفتر تو چھوٹ جائے گا گھر کہیں پر
جو گھر ملے گا کہیں تو دفتر نہیں ملے گا

زمیں پہ پکی عمارتیں اگ رہی ہیں ایسے
دوانے سر پھوڑنے کو پتھر نہیں ملے گا

چھلکتی آنکھوں ہری بھری مسکراہٹوں بن
ملیں گے دیوار و در یہاں گھر نہیں ملے گا

ملے گی دنیا ملو گے تم سب ملیں گے لیکن
ہمارا وہ گم شدہ مقدر نہیں ملے گا

بیچ منجدھار دیا بڑھ کے سہارا کس نے
ہم تو تنہا تھے ہمیں پار اتارا کس نے

زندگی تجھ کو شب و روز کے دوزخ میں ترے
جس طرح ہم نے گذارا ہے، گذارا کس نے

حال اب یہ کہ اندھیرا مرے خوں کا پیاسا
رکھ دیا ہے مری مٹھی میں ستارہ کس نے

سر بریدہ کوئی بچہ مرے اندر ہر روز
پوچھتا رہتا ہے مجھ سے مجھے مارا کس نے

پاؤں لگ جائیں تصور کو تو ہم چل نکلیں
ہم کو خوابوں کی گذرگہ سے پکارا کس نے

عشق نقصان کا سودا تھا ظفر میرے بعد
جانے برداشت کیا میرا خسارہ کس نے

ظفر گورکھپوری

یقین کو سینچنا ہے خوابوں کو پالنا ہے
بچا ہے تھوڑا سا جو اثاثہ سنبھالنا ہے

سوال یہ ہے چھڑالیں مسئلوں سے دامن
کہ ان میں رہ کر ہی کوئی رستہ نکالنا ہے

جہان سوداگری میں دل کا وکیل بن کر
اس عہد کی منصفی کو حیرت میں ڈالنا ہے

جو مجھ میں بیٹھا اڑاتا رہتا ہے نیند میری
مجھے اب اس آدمی کو باہر نکالنا ہے

زمین زخموں پہ تیرے مرہم بھی ہم رکھیں گے
ابھی گڑی سوئیوں کو تن سے نکالنا ہے

کسی کو میدان میں اترنا ہے جیتنا ہے
کسی کو تا عمر صرف سکہ اچھالنا ہے

یہ ناؤ کاغذ کی جس نے ندی تو پار کر لی
کچھ اور سیکھے اب اس کو دریا میں ڈالنا ہے

بلندی سے اتارے جا چکے ہیں
زمیں پر لا کے مارے جا چکے ہیں

دکھائے بیچ دریا کون رستہ
فلک خالی ہے تارے جا چکے ہیں

معانی کیا رہے خودداریوں کے
کہ دامن تو پسارے جا چکے ہیں

یہ پورا سچ ہے تم مانو نہ مانو
کہ اچھے دن تمھارے جا چکے ہیں

بھنک تک بھی نہ پہنچی اس کی ہم تک
ہمارے دن گذارے جا چکے ہیں

اب اس اندھے کنوئیں کو بند کر دو
کئی بچے ہمارے جا چکے ہیں

ظفر گورکھپوری

نہ بھول پائے تمھیں حادثہ ہی ایسا تھا
نہ بھر سکا کوئی اس کو خلا ہی ایسا تھا

وہ مجھ میں رہ کے مجھے کاٹتا رہا پل پل
زباں پہ آ نہ سکا ماجرا ہی ایسا تھا

نظر نہ آئی کہیں دور دور تک کوئی موج
میں غرق ہوگیا طوفاں اٹھا ہی ایسا تھا

نہ آیا لطف کسی اور غم کو جھیلنے میں
غم حیات ترا ذائقہ ہی ایسا تھا

کھلے تو لب مگر الفاظ دونوں سمت نہ تھے
مکالمہ نہ ہوا مرحلہ ہی ایسا تھا

اب اس کا رنج بھی کیا کیوں لہولہان ہیں پاؤں
چلے تھے جس پہ ظفر راستہ ہی ایسا تھا

تھی الگ راہ مگر ترک محبت نہیں کی
اس نے بھی سوچا بہت ہم نے بھی عجلت نہیں کی

تو نے جو درد کی دولت ہمیں دی تھی اس میں
''کچھ اضافہ ہی کیا ہم نے خیانت نہیں کی''

زاویہ کیا ہے جو کرتا ہے تجھے سب سے الگ
کیوں ترے بعد کسی اور کی حسرت نہیں کی

آئے اور آ کے چلے بھی گئے کیا کیا موسم
تم نے دروازہ ہی وا کرنے کی ہمت نہیں کی

اپنے اطوار میں کتنا بڑا شاطر ہوگا
زندگی تجھ سے کبھی جس نے شکایت نہیں کی

ایک اک سانس کا اپنے سے لیا سخت حساب
ہم بھی کیا تھے کبھی خود سے بھی مروت نہیں کی

مظفر حنفی

ہاتھوں میں سجتے ہیں چھالے جیسی تیری مرضی
سکھ داتا دکھ دینے والے جیسی تیری مرضی

بستی بستی گھور اندھیرا یا انگارے برسیں
صحرا صحرا نرم اجالے جیسی تیری مرضی

برحق ہے تو پتھر پتھر پھول کھلانے والے
زرخیزی میں بنجر ڈالے جیسی تیری مرضی

بھرتے ہیں ہنکاری تیری آتے جاتے بادل
گونج رہے ہیں ندی نالے جیسی تیری مرضی

تیرا ہی اعلان کروں میں تیرے ہی گن گاؤں
میرے ہی ہونٹوں پر چھالے جیسی تیری مرضی

اس نے ہم کو جھیل ترائی اور پہاڑ دیے
ہم نے ان سب کی گردن میں پنجے گاڑ دیے

زنجیروں میں جکڑی اس منہ زور ہوا نے پھر
توڑ دیے کھڑکی دروازے پردے پھاڑ دیے

شبنم شبنم موتی بو کر آشا بیٹھی تھی
لشکر آیا کھیت جلائے پیڑ اکھاڑ دیے

ریت بھری نہروں کو دیکھو بہنا بھول گئیں
نفرت کی آندھی نے کتنے شہر اجاڑ دیے

ہم تو گیلی ریت تھے جس کو روندا جانا تھا
اس نے بھی کچھ نقش بنائے اور بگاڑ دیے

مظفر حنفی

اب دو بدو تجھ سے بات ہووے
جو کچھ بھی ہمارے ساتھ ہووے
ق
بازیچہ بنی ہوئی ہے دنیا
تو چال چلے تو مات ہووے
چہرے پہ گرا کے اپنی زلفیں
تو حکم کرے تو رات ہووے
شرمائے تو کیفیت سے لبریز
پیمانۂ کائنات ہووے
تجھ نور صفات کے مقابل
ہووے تو ہماری ذات ہووے

ہے قید حیات پیچ در پیچ
مرجائیں اگر نجات ہووے
وہ شعر کہو میاں مظفر
آیئنۂ شش جہات ہووے

یہ سچ ہے کوئی رہنما ٹھیک نہیں
مرے بھائی تو بھی چلا ٹھیک نہیں
ادیبوں کو سچ بولنا چاہیے
سیاست کی آب و ہوا ٹھیک نہیں
نگاہوں سے میلا نہ ہوجائے وہ
اسے دیر تک دیکھنا ٹھیک نہیں
ہمیں تو وہی سمت مرغوب ہے
بلا سے ادھر راستہ ٹھیک نہیں
چلو دھوپ سے آشنائی کریں
یہ دیوار کا آسرا ٹھیک نہیں
نمی آنکھ میں ہاتھ میں تھرتھری
ترے مانگنے کی ادا ٹھیک نہیں
زمانہ مخالف تھا قسمت خراب
مظفر یہاں کچھ بھی تھا ٹھیک نہیں

سرمد صہبائی

ہر سفر کے بعد ویسا ہی سفر رکھا گیا
اور پھر مقسوم میرا در بدر رکھا گیا

عرصۂ دشت طلب کو انتہا بخشی گئی
مہلت عمر رواں کو مختصر رکھا گیا

ہم کہاں سینے کی تہ میں یہ سمندر تھامتے
ایک اس خاطر تجھے اے چشم تر رکھا گیا

حاصل جاں پر خس و خاشاک حسرت کھینچ کر
درمیاں اس دل کے خواہش کا شرر رکھا گیا

بوسۂ خورشید سے کھولا سحر کا پیرہن
زانوے شب پر مہ کامل کا سر رکھا گیا

دن کے رستوں پر بچھائی نارسائی کی تھکن
نیند کی دہلیز پر خوابوں کا پر رکھا گیا

مضطرب رہتی ہے کوہ و دشت میں جیسے ہوا
اس طرح سینے میں سانسوں کا گذر رکھا گیا

آتے جاتے ہر نفس میں موت کا تھا ذائقہ
رائیگاں جینے میں مرنے کا ہنر رکھا گیا

خواہشیں جاگیں جمال یار کے دیدار سے
پانیو ں پر ماہ عریاں کا اثر رکھا گیا

عمر بھر سرمد تھی جس کو یاد رکھنے کی سزا
سامنا اس شوخ سے اک لمحہ بھر رکھا گیا

سرمد صہبائی

حصار ہوش میں خوابوں کے در رکھے گئے ہیں
کوئی رستہ نہیں ہے اور سفر رکھے گئے ہیں

گہر آتا ہے آغوش صدف میں بوند بن کر
زمین و آسماں میں نامہ بر رکھے گئے ہیں

بسنتی دھوپ آنگن میں سمٹ کر سو رہی ہے
ہوا کے دوش پر پیڑوں کے سر رکھے گئے ہیں

ازل سے بھاگتا ہوں اپنے ہی سائے کے پیچھے
تعاقب میں مرے شام و سحر رکھے گئے ہیں

یہ کیسا کھیل ہے دشوار جینے کے جتن ہیں
مگر مرنے کے گر آسان تر رکھے گئے ہیں

ادا ہوں گے ہماری بے بہا لا حاصلی میں
وہ سارے قرض جو اس جان پر رکھے گئے ہیں

چڑھا ہے دن نکل آئے ہیں بازاروں میں سائے
مگر جو جسم تھے سارے وہ گھر رکھے گئے ہیں

چنا ہے ریزہ ریزہ ہم نے اپنی خواہشوں کو
یہ ٹوٹے آئینے تھے جوڑ کر رکھے گئے ہیں

لکھے گا کون یارب لذت بے اختیاری
سروں پر کاتبین خیر و شر رکھے گئے ہیں

ہے تعویذ سخن کا معجزہ سرمد کہ ہم پر
طلسم جاہ و منصب بے اثر رکھے گئے ہیں

آنکھوں سے پرے نیند کی رفتار میں رہنا
ہر پل کسی نادید کے دیدار میں رہنا

کھو جانا اسے دیکھ کے عریاں کے سفر میں
چھوتے ہی اسے حجلۂ اسرار میں رہنا

اک خواب دریدہ کو رگ حرف سے سینا
پھر لے کے اسے کوچہ و بازار میں رہنا

خود اپنے کو ہی دیکھ کے حیران سا ہونا
نرگس کی طرح موسم بیمار میں رہنا

مرنا یونہی ابریشم و کمخواب ہوس میں
دم توڑ کے زندہ کبھی دیوار میں رہنا

حسرت سی لیے خلقت معصوم میں پھرنا
سازش کی طرح گردش دربار میں رہنا

ہے بخت ستاروں کا ان آنکھوں میں چمکنا
اور گل کا مقدر لب و رخسار میں رہنا

رونق سی لیے شہر کے رستوں پر بکھرنا
تنہائی کی صورت در و دیوار میں رہنا

سرمد تپش نار سخن میں ہوں کہ مجھ کو
گل کرتا رہا شعلہ و انگار میں رہنا

سرمد صہبائی

وہی زمین وہی سر پہ آسماں نکلا
سفر کے پار بھی اک دشت رائیگاں نکلا

جو اس کو دیکھا تو تصویر بن گئیں آنکھیں
یہ جاگتا ہوا پل خواب بے کراں نکلا

رواں تھے ہم تو سفر پر چراغ ہوش لیے
مگر ثبات جہاں کار ناگہاں نکلا

اڑی قبائے سکندر غبار نسیاں میں
طلوع ساغر جم شعلۂ گماں نکلا

کہیں تھا شور تکلم کہیں تھی خاموشی
جو ہم کلام تھا ہم سے وہ درمیاں نکلا

اسے چھوا تو وہ گم ہو گیا ہوا کی طرح
عجب نظارہ تھا ظاہر میں بھی نہاں نکلا

فسون عشق قمار ہوس گری ٹھیرا
تمام گریۂ جاں زیب داستاں نکلا

کہیں ہے دشت ہلاکت کہیں ہے حیرانی
تری تلاش میں یہ راستہ کہاں نکلا

بس اک گلیم سخن دوش عمر تھی سرمد
اسی کے تار شکستہ سے لعل جاں نکلا

دم جنوں کی حد انتہا پہ ٹھیرا ہے
یہ میرا دل ہے ابھی ابتدا پہ ٹھیرا ہے

اسی کے لمس سے آب و ہوا بدلتی ہے
تمام منظر جاں اک ادا پہ ٹھیرا ہے

کنار کن سے پرے ہے کہیں وجود اپنا
یہ کارواں تو غبار صدا پہ ٹھیرا ہے

کچھ اور دیر نمائش ہے شور و شر کی یہاں
یہ اک حباب ہے موج فنا پہ ٹھیرا ہے

شعاع صبح بن گوش میں اترتی ہے
زوال مہر کہ دست حنا پہ ٹھیرا ہے

شب سیاہ سر خال میں سمٹتی ہے
ستارہ ٹوٹ کے بند قبا پہ ٹھیرا ہے

نفس نفس میں بھڑکتی ہے دل کی لو سرمد
عجب چراغ ہے بام ہوا پہ ٹھیرا ہے

مدحت الاختر

میں نے جو کچھ کھو دیا اب اس کو پا سکتا نہیں
دل سے یہ احساس بھی لیکن مٹا سکتا نہیں

وہ کنار آب بیٹھے چاند اگتے دیکھنا
جھیل کی تہ سے وہ منظر اب اگا سکتا نہیں

سب در و دیوار اس کے لمس کے مقروض ہیں
اپنے گھر سے اس کی تصویریں مٹا سکتا نہیں

مت ملو اس سے تمھاری بات میں نے مان لی
اس کے غم میں چار آنسو بھی بہا سکتا نہیں

شہر بھر میں پھول کی چادر بچھانا ہے مجھے
اپنے شہزادوں کو کانٹوں پر چلا سکتا نہیں

کچھ بنانا چاہتا ہوں اور بن جاتا ہے کچھ
میں خود اپنے گھر کو نقشے سے ملا سکتا نہیں

وہی زمین وہی دور آسمانوں کے
دنوں کی بات نہیں کھیل ہیں زمانوں کے

دیا سلائی کی تیلی بھی اب ڈراتی ہے
نظارے یاد ہیں جلتے ہوئے مکانوں کے

ہمارے پاؤں کی زنجیر بنتے جاتے ہیں
سجے سجائے ہوئے سلسلے دکانوں کے

زمین بال برابر نہیں ہمارے نام
بناتے رہتے ہیں نقشے نئے مکانوں کے

اداس کر گیا وہ اسعد(۱) جوانا مرگ
کہ اس عزیز میں کچھ طور تھے دوانوں کے

(۱) اسعد بدایونی

سوال کھانی

مسعود اشعر

یہ کہانی کس کی ہے؟ میری؟ اس لڑکی کی جو کالے برقعے میں لپٹی میرے دفتر آئی تھی؟ خاں صاحب کی؟ یا ہم تینوں کی؟ اس واقعے کو پچیس تیس سال ہوگئے ہیں اور ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ اگر مجھے اس کہانی کا ایک کردار بنا ہی دیا گیا تو مجھے اپنا رول کس طرح ادا کرنا چاہئے تھا، اور کیا میں نے جو کیا وہ صحیح تھا؟ یہی میری الجھن ہے جو مجھے وقفے وقفے سے بے چین کرتی ہے۔ جی ہاں، وقفے وقفے سے، کہ چاہے کتنا ہی بڑا صدمہ ہو زندگی کی دوڑ میں اسے بھول جانے کے وقفے آتے ہی رہتے ہیں۔

دونوں ہی لڑکیاں پیاری شکل کی تھیں۔ اب ہم نے خوبصورتی کا جو معیار بنا رکھا ہے، اس میں چونکہ رنگ گورا ہونا ایک لازمی شرط ہے، اس لئے وہ گوری بھی تھیں۔ بلکہ گوری چٹی چمپئی رنگ کی۔ قد بھی اچھا ہی تھا۔ باپ کا قد تو کوئی ایسا لمبا نہیں تھا، مگر وہ دونوں ہی کھلتے قد کی تھیں۔ اور بھائی تو اچھا خاصا لمبا تھا۔ اور وہ تینوں ہی دبلے پتلے بھی تھے۔ ماں بہت پہلے مر چکی تھیں، اس لئے میں نے انھیں نہیں دیکھا۔ لیکن ان تینوں کی شکل صورت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی خوبصورت ہوں گی۔ بڑی لڑکی ہوگی یہی کوئی انیس بیس سال کی اور چھوٹی ہوگی کوئی سولہ سترہ سال کی۔ بھائی ان سے چھوٹا تھا۔ خاں صاحب، ان کے باپ، بہت ہی دلچسپ آدمی تھے، محفل باز اور یاروں کے یار۔ کھانے پینے کا بہت شوق تھا۔ خود بھی کھاتے اور دوسروں کو بھی خوب کھلاتے۔ ہر سال جاڑے شروع ہوتے ہی ان کے ہاں نہاری کی دعوت ہوتی، اور یہ نہاری واقعی نہاری ہی ہوتی کہ سویرے سویرے نہار منہ کھائی جاتی۔ اس کے لئے شرط یہ تھی کہ آپ فجر کی نماز پڑھتے ہوں یا نہ پڑھتے ہوں مگر فجر کی نماز کے فوراً بعد ان کے گھر پہنچ جائیں۔ ذرا دیر ہوئی اور خاں صاحب کا موڈ خراب۔ ٹھنڈی نہاری وہ کسی کو نہیں کھلاتے تھے۔ اور ٹھنڈی ہونے کے بعد نہاری گرم کرنا ان کے ہاں بہت بڑا جرم تھا۔ دیر سے آنے والے کو خالی پیٹ واپس آنا پڑتا۔

اب میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ پہلے میں ان لڑکیوں کی کہانی لکھوں یا خاں صاحب کی۔ کہانی تو مجھے ان لڑکیوں بلکہ ایک لڑکی ہی کی لکھنا ہے، لیکن جب تک خاں صاحب کی بات نہیں ہوجاتی اس وقت تک کہانی بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ خاں صاحب کو کھانے کے علاوہ فلمیں دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ اور ان کا یہی شوق ہماری دوستی کا سبب بنا کہ میں بھی فلمیں دیکھنے کا بہت ہی شوقین ہوں۔ خاں صاحب عمر میں تو ہم سے کافی بڑے تھے مگر مزاج اور عادتوں میں وہ ہم سے بھی چھوٹے لگتے تھے۔ فلموں کے علاوہ خاں صاحب سے ملاقات ان دعوتوں میں بھی ہوتی تھی جو ایک دوسرے کے گھر میں ہوتی رہتی تھیں۔ چھوٹا سا شہر تھا اس لئے جو بھی دعوت ہوتی اس میں وہی لوگ ہوتے جو بار بار ملتے رہتے تھے۔ ان دعوتوں میں خاں صاحب ہی محفل کی جان ہوتے۔ ایسے ایسے قصے سناتے کہ سب کا ہنسی کے مارے برا حال ہوجاتا۔ میرا تو ہنس ہنس کر پیٹ دکھنے لگتا تھا۔ ان کے ہر قصے میں ان کی مرحوم بیوی ضرور موجود ہوتی تھیں۔ کہتے تھے ان کی بیگم کو کوئی بیماری تھی۔ بیٹھے بیٹھے وہ ایک دم جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ اٹھاتیں اور پھر اسے ایسے لہراتیں جیسے کسی کے تھپڑ مار رہی ہوں اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ تھپڑ ساتھ بیٹھے ہوئے کسی شخص کے منہ، بازو یا پیٹھ پر پڑ بھی جاتا۔ بیوی کی اس بیماری نے بھی خاں صاحب کو بہت سے قصے دیئے تھے جنھیں سناتے وہ کبھی نہیں تھکتے تھے۔ ایک بار وہ بیوی کے ساتھ فلم دیکھنے گئے۔ اوپر گیلری میں بیٹھے تھے، فلم چل رہی تھی کہ اچانک بیوی کو جھٹکا لگا اور ایک زور کا تھپڑ خاں صاحب کے منہ پر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ایک طرف سے آواز آئی: "مار سالے کو، سنیما میں بیٹھ کر بدمعاشیاں کرتا ہے۔" وہ تو انھوں نے بڑی مشکل سے لوگوں کو سمجھایا کہ یہ میری بیوی ہیں اور انھیں یہ بیماری ہے، ورنہ اس دن ان کی سچ مچ پٹائی ہوجاتی۔

اپنی شادی کا قصہ بھی وہ مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ جب ان کی شادی ہوئی تو ان کا ایک دوست ریلوے میں افسر تھا۔ خاں صاحب ہنی مون منانے کا پروگرام بنا رہے تھے تو اس دوست نے پیشکش کی کہ میں تمھارے لئے پسنجر ٹرین میں فرسٹ کلاس کا ایک پورا ڈبہ بک کرائے دیتا ہوں۔ تم ٹرین میں بیٹھو اور راستے بھر قدرت کے نظارے کرتے اور عیش اڑاتے آرام آرام سے راولپنڈی پہنچ جاؤ۔ اور پھر وہاں سے کوئی ٹیکسی یا بس پکڑو اور مری چلے جاؤ۔ سیر کی سیر ہوجائے گی اور ہنی مون کا ہنی مون۔ ہر اسٹیشن پر ریلوے کا عملہ تمھاری خوب خاطر مدارات بھی کرے گا۔ انھوں نے اس کی بات مان لی۔ اب پسنجر ٹرین تو ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر رکتی ہے، اور ہر چھوٹا بڑا اسٹیشن گھنٹے آدھے گھنٹے بعد آجاتا ہے۔ اس لئے ابھی وہ ہنی مون منانے کی تیاری کر ہی رہے ہوتے کہ کوئی اسٹیشن آجاتا اور ان کی خاطر مدارات کرنے والے فرشتے نازل ہوجاتے اور اس وقت تک نہ ٹلتے جب تک ٹرین چل نہ پڑتی۔ یہ تین ساڑھے تین سو میل اور ایک دو دن کا سفر تھا۔ مری پہنچتے پہنچتے نئے دولہا دلہن کی نیند اور تھکن کے مارے بری حالت ہوچکی تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچتے ہی دونوں بستر پر ایسے گرے کہ چوبیس گھنٹے بعد بھی بیرے نے دروازہ کھٹکھٹا کر انھیں اٹھایا۔ دراصل یہ ان کے دوست کی شرارت تھی۔ اس نے راستے کے تمام اسٹیشنوں پر اپنے عملے کو ہدایت کردی تھی کہ ہمارے ایک دوست اس ٹرین میں سفر کررہے ہیں۔ ان کا خاص خیال رکھا جائے۔ اس کے بعد خاں صاحب نے اس دوست کا جو حشر کیا وہ بھی ایک داستان ہے جسے بیان کرنے کے لئے خاں صاحب کی زبان ہی چاہئے۔

بہت تعریف کرتے تھے وہ اپنی بیوی کی۔ اور ان کے قصوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی خاصی خوش مزاج خاتون تھیں۔ ایک دن بتانے لگے کہ انھوں نے بیگم سے کہا: "کہتے ہیں جنت میں مردوں کو تو حوریں اور غلمان ملیں گے مگر عورتوں کے حصے میں ان کے شوہر ہی آئیں گے۔ فرض کرو اگر تمھیں اس بات کی اجازت مل گئی کہ تم اپنے لئے کوئی بھی مرد چن لو تو تم کیا کروگی؟" جواب ملا "میں تمھیں ہی لے لوں گی۔ کیا خبر دوسرا مرد تم سے بھی برا ہو۔"

ابھی چھوٹا بیٹا چند سال کا ہی تھا کہ ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ انھوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ تینوں بچوں کو خود ہی پالا۔ میری بیوی ان سے بہت متاثر تھیں۔ کہتی تھیں۔ "دیکھا، یہ ہوتا ہے پیار۔ جوان تھے، بڑے افسر تھے۔ پیسے اور اثر و رسوخ والے تھے۔ چاہتے تو کہیں بھی شادی کر سکتے تھے۔ مگر اسی بیوی کی یاد میں ساری زندگی گذار دی۔" وہ تینوں بچوں کے ساتھ ہمارے گھر آتے تھے اور گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ ان کے بچے ہمارے بچوں کی ہی عمر کے تھے اس لئے ان میں بھی خوب دوستی ہو گئی تھی۔ میری بیوی بھی ان بچوں کا بہت خیال کرتی تھیں۔

اب یہاں مجھے ایک فلم یاد آرہی ہے۔ دوسری فلموں کی طرح یہ فلم بھی ہم نے اکٹھے ہی دیکھی تھی۔ یہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ اس شہر میں سنیما گھر تو اور بھی تھے مگر ایک سنیما گھر نیا نیا بنا تھا۔ اس کا نوجوان مالک بھی ہماری طرح اچھی فلموں کا رسیا تھا، ایسی فلموں کا رسیا جو عام لوگ نہیں دیکھتے۔ اسے ہمارے شوق کا علم بھی تھا۔ اس لئے وہ ہم سے مشورے کرتا رہتا تھا کہ اب کون سی فلم منگائی جائے۔ ہم اسے فلم بتاتے اور وہ منگا لیتا۔ اس نے ہمارے لئے ایک باکس بھی محفوظ کر رکھا تھا۔ اس میں خاں صاحب ہوتے، ہمارا دوست صدیقی ہوتا اور میں۔ کبھی کبھی مالک کا کوئی مہمان بھی آجاتا۔ ہاں، تو وہ فلم ہماری فرمائش پر ہی دکھائی گئی تھی۔ اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ یہ محض اتفاق تھا یا کوئی اشارہ کہ وہ فلم بھی ہمیں اسی زمانے میں دیکھنا رہ گئی تھی۔

وہ فلم تھی Guess Who's Coming to Dinner۔ معاف کیجئے، میں نے غلط کہا۔ فلم تھی نہیں، فلم ہے۔ کوئی بھی فنی شاہکار کبھی "تھا" نہیں ہوتا، ہمیشہ "ہے" ہی رہتا ہے۔ اسے گذرے ہوئے واقعے کے طور پر یاد نہیں کیا جاتا۔ وہ ہمیشہ حال میں ہی موجود رہتا ہے کہ ہر وقت اور ہر زمانہ اپنے لحاظ سے اس کی نئی نئی تعبیریں کرتا رہتا ہے۔ مجھے وہ فلم اتنی پسند آئی تھی کہ فلم ختم ہوتے ہی میں نے اس کی تعریفیں شروع کر دی تھیں۔

"فلم کا موضوع ایسا نیا نہیں ہے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دنوں امریکہ میں گوروں اور کالوں کو قریب لانے اور نسلی فرق ختم کرنے کی جو مہم چلی ہوئی ہے یہ فلم بھی اسی کا حصہ ہے۔ مگر جس خوبصورتی سے اسے پیش کیا گیا ہے، اور جس مہارت کے ساتھ اس کے اداکاروں نے اپنے کردار نبھائے ہیں اس نے اس فلم کو ایک عام فلم سے اونچا اٹھا کر، ایک شاندار تخلیقی اور فنی شاہکار بنا دیا ہے۔" میں اپنی ہی رو میں بولے چلا جا رہا تھا: "گوری لڑکی ایک کالے لڑکے سے شادی کر رہی ہے تو کیا ہوا؟ وہاں تو ہر لڑکے لڑکی کو اپنی پسند سے شادی کرنے کی آزادی ہے۔ مگر اس واقعے سے لڑکی کے ماں باپ کے دل پر جو گذری ہے، اور جو گذر رہی ہے، اصل میں فلم ان سلگتے جذبات کی سچی اور کھری عکاسی کرتی ہے۔ اور خدا بھلا کرے کیتھرین ہیپبرن (Katherine Hepburn) اور اسپنسر ٹریسی کا (Spenser Tracy) کہ ان دونوں نے ذہنی اور جذباتی الجھن میں پھنسے ہوئے ماں باپ کی ایسی اداکاری کی ہے کہ دیکھنے والوں کو بھی ٹھنڈے پسینے آجاتے ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ میں تو بولے چلا جا رہا ہوں مگر خاں صاحب خاموش ہیں۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اس قسم کی بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے، چپ رہنا انھوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ فلم دیکھتے ہی سب سے پہلے تو وہ ایکٹریسوں کی خوبصورتی یا بدصورتی کی بات کرتے۔ پھر فلم کی کہانی کی باری آتی۔ اس کے بعد ایکٹنگ اور پروڈکشن کی بات کرتے تھے۔ فلموں کے بارے میں ان کی معلومات اتنی زیادہ تھیں کہ گھنٹوں بولتے رہیں اور بات ختم نہ ہو۔ اور پھر یادداشت بھی بلا کی تھی۔ کسی زمانے کی کسی بھی فلم، کسی بھی ڈائریکٹر یا ایکٹر کے بارے میں پوچھ لو، ان کی معلومات کا بھنڈار افوراً کھل جاتا۔ مگر اس دن وہ خاموش تھے۔ میں نے تھوڑا مذاق کرنے کی کوشش بھی کی۔ مگر جب دیکھا کہ میں جتنا مذاق کرتا ہوں اتنا ہی ان کا چہرہ لٹکتا چلا جاتا ہے تو میں بھی چپ ہو گیا۔ میں نے انھیں اتنا کھویا ہوا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

لیکن یہ بعد کی بات ہے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے بعد کی بات۔ وہ لمبی چھٹی کاٹ کر واپس آئے تھے۔ جیسے میں نے پہلے بتایا کہ وہ ہمارے گھر جب بھی آتے اگر لڑکا ساتھ نہ بھی ہوتا تو دونوں لڑکیاں ضرور ساتھ ہوتیں۔ اس شام وہ آئے تو اکیلے تھے۔ بلکہ وہ خود نہیں آئے تھے، انھیں میں نے بلایا تھا۔ ہمارے ایک ساتھی کا ٹرانسفر ہوا تھا اور میں اسے الوداعی دعوت دے رہا تھا۔ پہلے تو راضی نہیں ہوتے تھے کہ بہت تھکا ہوا ہوں۔ آخر میری بیوی نے بہت اصرار کیا تو راضی ہو گئے۔

وہ آئے، مگر اکیلے۔ میری بیوی نے پوچھا۔ "بچیاں نہیں آئیں؟"

کہنے لگے "ان کی شادی کر دی۔"

"شادی؟ کب اور کہاں؟" یہ سوال میں نے کیا۔ عجیب بات تھی۔ یہ کیسی شادی تھی کہ کسی کو خبر ہی نہیں ہوئی؟

"کراچی میں۔" ان کا جواب تھا۔ مختصر اور دوٹوک۔ ہم بھی خاموش ہو گئے۔ اگر وہ خود ہی نہیں بتانا چاہتے تو ہم کیوں اصرار کریں۔ ہاں، مجھے یہ خیال ضرور آیا کہ کسی بھی جگہ، یا کسی بھی چھوٹے شہر میں بھی سب باتیں سب کو معلوم نہیں ہوتیں۔ اور یہ خیال بھی غلط ہے کہ ہم اپنے دوستوں کو جانتے ہیں۔

اور بھی مہمان آچکے تھے اس لئے بھی زیادہ کریدنے کا موقع نہیں ملا۔ میری بیوی مہمانوں کی خاطر تواضع میں لگ گئیں اور میں دوسرے مہمانوں میں مصروف ہو گیا۔ ہاں بعد میں میری بیوی نے مجھ سے شکایت کی کہ کیسے دوست ہیں تمھارے، ہمیں شادی کی خبر تک نہیں کی۔ اور میں نے کہا۔ ہوگی کوئی مصلحت۔ بن ماں کی لڑکیاں تھیں۔ کراچی میں اچھے رشتے مل گئے ہوں گے، بس شادی کرادی۔

اس دن بھی میں ہی انھیں فلم میں لے گیا تھا۔ میں اور صدیقی، جو ہمارا فلموں کا ساتھی تھا۔ خاں صاحب نے بہت کہا میری طبیعت خراب ہے۔ مگر ہم نہیں مانے اور زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ اتنے مہینے وہ کراچی میں گذار کر آئے تھے۔ ہم نے کہا اسی طرح کچھ وقت ساتھ گزر جائے گا۔ صدیقی کو اس فلم کا موضوع بالکل

پسند نہیں آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پڑھی لکھی لڑکیاں لڑکے پسند کرنے میں بہت ہی تنک چڑھی اور بد دماغ ہوتی ہیں۔ اپنی حیثیت سے کم کا لڑکا وہ کبھی پسند ہی نہیں کرتیں۔ ہاں، کچی عمر کی لڑکیاں وقتی جذبات کی رو میں بہ سکتی ہیں اور سوچ سمجھے بغیر یہ کام کرسکتی ہیں۔ مگر اب کچی عمر کی لڑکیاں بھی کچی عمر کی نہیں ہوتیں۔ زمانے نے انھیں بھی سمجھدار بنادیا ہے۔"

خاں صاحب یہ بھی خاموشی سے سنتے رہے۔

پھر معلوم ہوا کہ خاں صاحب کا تبادلہ ہوگیا اور تبادلہ بھی سندھ کے کسی علاقے میں ہوا ہے۔ ون یونٹ کا زمانہ تھا اور کسی بھی افسر کا کسی بھی علاقے میں تبادلہ ہوسکتا تھا۔ لیکن جس انداز سے یہ تبادلہ ہوا اور جس خاموشی سے خاں صاحب اس شہر سے گئے اس نے ہم سب دوستوں کو پریشان کردیا۔ ایسی بھی کیا جلدی تھی انھیں جانے کی، نہ کوئی الوداعی دعوت اور نہ الوداعی ملاقات۔ مگر یہ پریشانی بھی کچھ دن کی ہی تھی۔ خاں صاحب تھے ہی ایسے۔ ان سے کسی قسم کی بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ پھر ہم جیسے انھیں بھول ہی گئے۔ سرکاری افسر آتے جاتے رہتے ہیں۔ انھوں نے بھی ہم میں سے کسی سے رابطہ نہیں رکھا۔

اب یہاں میری اپنی کہانی شروع ہوتی ہے۔ خاں صاحب کی دونوں لڑکیوں میں سے کسی ایک لڑکی کی وہ کہانی مجھے معلوم نہیں جس کا تانا بانا ان کے گھر میں بنا گیا تھا، اس لئے میں وہ بیان نہیں کرسکتا۔ ہاں، اس دن میرے اوپر جو بیتی اور جو وقفے وقفے سے اب تک بیتتی رہتی ہے اس وقت میں اسے بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ وہ بھی اگر بیان کرسکا، کہ آج تک کوئی بھی انسان اپنی جذباتی الجھن پوری طرح لفظوں میں بیان کرسکا ہے اور نہ کبھی بیان کرسکے گا۔ ہر ایک کا صدمہ اس کا ذاتی صدمہ ہوتا ہے جسے صرف وہی محسوس کرسکتا ہے، کسی اور کو نہیں سمجھ سکتا۔ کہنے کو تو الفاظ ہمارے غلام ہوتے ہیں آقا نہیں، مگر یہ غلام بھی اکثر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

چپراسی نے اندر آکر بتایا کہ ایک عورت اور مرد آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا بلالو۔ سوچا، ہوں گے کوئی۔ کسی کام سے آئے ہوں گے۔ وہ دونوں اندر آئے۔ عورت نے سر سے پاؤں تک کالا برقع ایسے لپیٹا ہوا تھا کہ انگلیوں کے پورے تک نظر نہیں آرہے تھے۔ مرد اپنی شکل وصورت سے خانساماں یا ڈرائیور نظر آتا تھا۔ کالا، لمبا، دبلا پتلا، اور ملیشیا کی شلوار قمیص پہنے ہوئے۔ میں نے اشارہ کیا اور وہ دونوں میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ برقع پوش عورتوں سے مجھے ویسے بھی بہت کوفت ہوتی ہے کہ اگر برقع لپیٹنا ہی ہے تو اس طرح غیر مردوں سے کیوں ملتی پھر رہی ہو۔ میں نے بیزاری سے اس مرد کی طرف دیکھا۔ "جی؟"

وہ ذرا سا آگے جھکا اور بولا "میں خاں صاحب کا ڈرائیور تھا۔ اور یہ خاں صاحب کی بیٹی ہیں..."

اس نے خاں صاحب کا نام لیا اور میرے دل کو ایک جھٹکا لگا۔ میں کچھ سمجھ، کچھ نہیں سمجھا۔ مگر نہیں۔ میں سمجھ گیا تھا۔ کیونکہ ایک دم مجھے محسوس ہوا تھا کہ میری سانس رکنے لگی ہے۔ پھر میں سنبھلا اور برقع کو دیکھا۔

"... ہماری شادی... مہینے پہلے ہوئی تھی۔ مگر وہ... کہتا پھر رہا ہے کہ ہماری شادی سے پہلے اس کا نکاح اس کے ساتھ ہوگیا تھا۔ اور وہ ہمیں دھمکیاں دے رہا ہے۔ آپ"

اس نے کتنے مہینے بتائے تھے شادی کو ہوئے؟ اور کس آدمی کا نام لیا تھا جو انھیں دھمکیاں دے رہا ہے؟ میں نے کچھ بھی نہیں سنا۔ میں تو اپنے دل کی دھڑکن سن رہا تھا جو تیز ہوتی جارہی تھی۔

اس کے بعد بھی وہ کچھ کہتا رہا مگر میرے کان بند تھے اور حیرت اور صدمے سے دھندلائی ہوئی آنکھیں اس لڑکی کو دیکھ رہی تھیں جو اپنے آپ کو ایسے چھپائے بیٹھی تھی جیسے میں نے اسے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ ڈرائیور بول رہا تھا اور وہ چپ بیٹھی تھی۔ مجھے اتنا ہوش تو تھا کہ وہ مجھ سے مدد مانگنے آیا ہے کہ میں اس علاقے کا بڑا افسر ہوں اور ان کی مدد کرسکتا ہوں۔ لیکن اس ڈرائیور کی شکل اور اس لڑکی کے برقعے نے جیسے میرے ہوش وحواس چھین لئے تھے۔ میری زبان گنگ ہوگئی تھی۔

پھر وہ دونوں اٹھے اور چلے گئے۔ اس ڈرائیور نے دوبارہ مجھ سے مدد کرنے کو نہیں کہا۔ شاید اس نے بھی میرا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ اس نے یہ انتظار بھی نہیں کیا کہ میں کچھ بولوں۔

بس اتنا واقعہ ہے۔ اگر اسے 'بس اتنا واقعہ' کہا جاسکتا ہے؟ اور اب میں سوچتا ہوں کہ اس وقت مجھے کیا ہوا تھا؟ میں اس سے یہ تو نہیں پوچھ سکتا تھا کہ اس شادی سے خاں صاحب پر کیا بیتی کہ اس کے ساتھ ہی فلم کا وہ قصہ میرے دماغ میں گھوم گیا تھا۔ مگر یہ تو معلوم کرسکتا تھا کہ یہ خاں صاحب کی بڑی بیٹی ہے یا چھوٹی؟ اور دوسری بیٹی کہاں ہے؟ اس کا کیا ہوا؟ یہ بات میں خود اس لڑکی سے بھی معلوم کرسکتا تھا۔ وہ ہمارے گھر آتی تھی تو مجھ سے خوب باتیں کرتی تھی۔ میں اتنا اختیار بھی رکھتا تھا کہ اس ڈرائیور کو لڑکی کے اغوا کے الزام میں گرفتار کرادیتا اور پھر لڑکی سے پوچھتا کہ اس ڈرائیور نے تمھیں کیسے ورغلایا؟ اور کیا تم اس شادی سے خوش ہو یا یہ تمھیں بلیک میل کررہا ہے؟ مگر یہ سب کرسکنے اور نہ کرسکنے کی باتیں تھیں۔ اور اس وقت میں کچھ بھی نہ کرسکنے کے بھنور میں پھنسا ہوا تھا۔ میرا دماغ اور میرا جسم دونوں سن ہوگئے تھے۔

اور یہ بات میں نے اپنی بیوی کو بھی نہیں بتائی۔ بلکہ آج تک نہیں بتائی ہے۔ میں نے کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہیں ہونے دی۔ صدیقی اور دوسرے دوستوں سے بھی میں نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ ان میں سے بھی کسی نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے یہ معلوم ہوتا کہ انھیں اس شادی کا علم ہے۔ میں نے خاموشی سے اس پورے واقعہ کو اپنے دل میں دبالیا۔ اور تیس سال سے اسے اپنے دل میں دبائے پھر رہا ہوں۔ کیوں؟ یہ میں نہیں جانتا۔ شاید اس لئے کہ یہ بہت شرم کی بات تھی خاں صاحب کے لئے؟ ایک بڑے اور عزت دار خاندان کے لئے؟

مگر کیا یہ صرف خاں صاحب کے لئے ہی شرم کی بات تھی؟ اور شاید اسی سوال نے آج تک میری زبان پر قفل ڈالے رکھے ہیں۔

تو پھر اب تیس سال بعد میں اس واقعے کو کہانی کی شکل کیوں دے رہا ہوں؟ کیا اس لئے کہ شاید خاں صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے ہوں گے؟ اور کیا اس لئے کہ اس لڑکی نے اب تک اس ڈرائیور کو چھوڑ کر کسی اچھی جگہ شادی کرلی ہوگی؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا ☆☆☆

ساجدہ زیدی

یہ دردِ ہجر ہے یا اک طلسم جاوداں ہے
مکان ولامکاں کا رازداں ہے
عجب سا اضطراب جاں ہے
(شاید لازماں ہے)
دل وحشی یہ کہتا ہے، قرار جاں کہاں ہے...؟

کہاں احساس کے ٹکڑے سمیٹوں؟
کیا... کسی بے نام رشتے کا پتہ ڈھونڈوں؟
کتابوں کی گذرگاہوں میں کھو جاؤں
کہ فکر و فلسفہ کے ریگ زاروں میں نکل جاؤں؟
طرب کے جام چھلکاؤں،
غموں کے رمز بتلاؤں،
نشاطِ زیست کے اک جام میگوں میں بکھر جاؤں؟
کہ... اس سیل روان وقت کی ہم رقص ہو جاؤں؟

تلاش آگہی میں جستجوے لفظ و معنی میں
ردائے نیلگوں کے پار جاؤں،
رازِ ہستی کا پتہ ڈھونڈوں

کہ... اس دار فنا کے رمز پا جاؤں
عدم کے بن میں کھو جاؤں؟
جو روح عشق لرزاں ہے فضائے دہر میں،
اس میں سما جاؤں...
رموز غم میں دل کا مدعا پاؤں؟
کہاں جاؤں؟

یہ دردِ ہجر جو احساس کا تار گریباں ہے
اسے کس طرح سلجھاؤں
دل وحشی بھی حیراں ہے
قرار جاں کہاں ہے؟ یہ حیرانی
جو میرے درد کی ہمراز ہے
شاید یہی تو آرزو کی آخری آواز ہے
اس کاروبار رائیگاں میں زندگی کا ساز ہے۔ یا
وقت کے سیل رواں میں
نغمہ و نور و نوا کا نقطۂ آغاز ہے
...کیا ہے؟

چاہ در چاہ

منشا یاد

وہ دونوں سیاحت کی خاطر اسلام آباد سے بیجنگ جا رہے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ اس کا ساتھی علی اور تقریباً سبھی مسافر سو رہے تھے۔ صرف وہ اکیلا جاگ رہا تھا۔

وہ پوری دنیا گھوم چکا تھا مگر اسے ہوائی سفر میں، خواہ وہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہوتا نیند نہیں آتی تھی۔ اس کی وجہ محض ہوائی جہاز کے سفر کا خوف نہیں تھا بلکہ وہ اسے زمینی سواریوں، بسوں ویگنوں اور فلائنگ کوچوں کے مقابلے میں، جو ڈرائیوروں کی حماقت، ضد یا لالچ کی وجہ سے آئے روز حادثات کا شکار ہوتی رہتی ہیں، محفوظ ترین ذریعہ سفر سمجھتا تھا مگر اس کے باوجود اسے نیند نہ آتی تھی اور زمین پر دوڑنے والی خطرناک سواریوں میں سفر کرتے ہوئے اسے جھکوں کے پیچھے اور ٹو کرے بھر بھر کے نیند آتی، جیسے ننھے بچوں کو پنگوڑے میں۔ ادھر بس، ویگن یا ریل گاڑی روانہ ہوتی ادھر اسے نیند آ دبوچتی۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ موسم گرما کی تعطیلات کے دوران میں اتوار کو اکثر سینما دیکھنے گاؤں سے شہر چلا جاتا اور آتے جاتے، کتاب یا رسالہ پڑھتے پڑھتے لاری میں سو جاتا اور بعض اوقات اس کے گاؤں کا اسٹاپ پیچھے رہ جاتا اور اسے کسی دوسری بس یا تانگے سے واپس آنا پڑتا۔

اب یہ تو کسی ماہر نفسیات ہی کو معلوم ہوگا کہ بچوں کو پنگوڑے اور جھولے میں ڈال کر جھونک دیتے ہیں تو وہ کیوں جلدی سو جاتے ہیں اور بڑوں کو بھاگتی اور شور مچاتی سواریوں میں اس قدر نیند کیوں آتی ہے۔ ریل گاڑی میں تو اسے بہت ہی نیند آتی ہے۔ جونہی وہ شاہدرہ یا چکلالہ سے نکلتی، اس کی آنکھیں بند۔ یہ فراٹے بھرنے لگتی اور وہ خراٹے۔ گھر میں ذرا سی آہٹ یا کھٹکے سے آنکھ کھل جاتی مگر ریل گاڑی کی مسلسل کھٹ کھٹ اور ہچکولے اسے تھپکیاں دے دے کر سلاتے۔ انجن کی کرخت سی کوک اور گارڈ کی تیز وسل اسے میٹھی لوری معلوم ہوتیں۔ چندا کے ہنڈولے میں، اڑن کھٹولے میں۔ مگر یہ عجیب سا خمار ہوتا کہ وہ سوتا بھی رہتا اور اسے راستے کے اسٹیشنوں اور اسٹاپوں کا بھی پتہ چلتا رہتا اور ہاکروں، خوانچے والوں اور بھکاریوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی رہتیں جن کے الفاظ کثرت استعمال سے پوری طرح سمجھ میں نہ آتے اور یہ اندازہ بھی ہوتا رہتا کہ کب انجن نے گاڑی کو جھنجھوڑا اور کوک ماری۔ بلکہ نیند اور ریل گاڑی میں ایک ایسا تعلق سا پیدا ہو گیا تھا کہ جب کبھی گھر میں بھی نیند کا وقت گذر جاتا یا ستانے والے کسی خیال کی وجہ سے نیند اچٹ جاتی تو وہ آنکھیں بند کر کے فرض کر لیتا کہ آرام دہ بستر پر نہیں ریل گاڑی کے سخت پھٹے پر لیٹا ہوا ہے اور اس کی یہ ترکیب اکثر کارگر ثابت ہوتی اور وہ خراٹے

لینے لگتا۔ آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی اور ہر پل سکڑتی جا رہی تھی کیونکہ وہ اجالے کی سمت سفر کر رہے تھے۔ بڑے جہاز کے ٹی وی اسکرین پر ایک چھوٹا جہاز ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر پرواز کرتا لمحہ بہ لمحہ سحر کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا مگر ابھی گھپ اندھیرا تھا۔ برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑی سلسلوں کے درمیان کہیں کہیں کوئی اکا دکا چراغ ٹمٹماتا نظر آتا تو وہ انسانی جدوجہد اور جستجو کے بارے میں سوچنے لگتا کہ دشوار گذار پہاڑوں، بے پایاں سمندروں اور لق و دق صحراؤں میں انسانی قدم کہاں کہاں نہیں پہنچے۔ پھر اسے اولین دور کے انسانوں کا خیال آنے لگا وہ اس تاریک، ویران اور خطرات سے پر زمین پر کیسے زندگی بسر کرتے ہوں گے اور اس کے جد امجد کی کیا شکل و صورت اور حلیہ ہوگا؟

پھر پو پھٹی اور پھٹتی ہی چلی گئی۔ اسے یوں لگا جیسے لٹھے کے کائناتی سائز کے تھان کو دو طرف کے کونوں سے پکڑ کر درمیان سے پھاڑا جا رہا ہو۔ اس نے زندگی میں کئی بار رات کو صبح، آمریت کو جمہوریت اور ظلمت کو روشنی میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن اتنی خوبصورت، اجلی اور طویل صبح طلوع ہوتے ہوئے شائد ہی پہلے کبھی دیکھی ہو۔ اسے لگا جیسے اب تک وہ اجالے کا استقبال کرتا آیا تھا مگر آج اجالا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

نہایت عجیب اور دلکش منظر تھا۔ زمین پر وادیوں میں ابھی رات تھی مگر پہاڑی چوٹیوں پر برف مسکرا رہی تھی اور اوپر آسمان روشن تھا۔ جہاز کے پر اب صاف نظر آنے لگے تھے اور فضا میں جگہ جگہ دھنکی ہوئی روئی کے مانند بادلوں کی بستیاں دکھائی دینے لگی تھیں جو لمحہ بہ لمحہ زیادہ اجلی اور سفید ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ ان بستیوں کے نام سوچنے لگا۔ چینگ پورہ، خمار کوٹ، نیند نگر، خواب گڑھ، سپنوں کا گاؤں، نور آباد وغیرہ۔

پھر ان نقرئی بادل بستیوں کے گرد سونے کی فصیلیں تعمیر ہونے لگیں۔ اسے کہیں آسمانوں سے گیتا رائے کی آواز سنائی دی۔ دھرتی سے دور گورے بادلوں کے پار آ جا۔ آ جا بسا لیں نیا سنسار آ جا۔ گیت ختم ہوتا تو وہ ذہن کے ریکارڈ پلیئر پر اسے پھر نئے سرے سے لگا دیتا۔ یوں ہی کئی ہزار میلوں تک وہ متواتر ایک ہی گیت بار بار سنتا رہا۔

پھر اس نے اپنی یادداشت کا وہ فولڈر کھولا جس کی ایک فائل میں اس نے اپنے حصے کی موعودہ حوروں کو زمینی قصے سنانے کے لئے اپنی یادداشتیں محفوظ کی ہوئی تھیں۔ اس کا خیال تھا وہ لاکھوں برس تک عرش کے مقدس، حول میں رہتے اور پارسائی کی بے رنگ زندگی گذارتے گذارتے اکتا گئی ہوں گی اور زمینی قصے انھیں

بہت دلچسپ اور اچھوتے معلوم ہوں گے۔ اس فولڈر میں کئی مناظر بند تھے۔

پہلا منظر کچے آموں کی رت کا۔ اس روز آندھی کے ساتھ بارش آئی اور رات بھر باد و باراں کا سلسلہ جاری رہا۔ باغبان کی طرف سے بارش اور آندھی سے گر جانے والی کیریاں چننے اور لے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اس کا گھر گاؤں کے دوسرے سرے پر اور عام گذرگاہ سے ہٹ کر تھا اس لئے وہاں جانے کا کوئی موقع یا بہانہ نہیں ملتا تھا۔ وہ جانتا تھا اور اسے کیریاں پسند ہیں اور وہ علی الصبح آموں والے باغ میں ضرور جائے گی۔ وہ منہ اندھیرے اٹھ کر پہنچا تو وہ دوسری کئی لڑکیوں کے ساتھ سچ مچ وہاں موجود تھی۔ جلدی جاگ جانے کی وجہ سے اس کے چہرے پر نیند کا عجیب سا خمار تھا۔ ٹھنڈی اور تیز ہوا چل رہی تھی اور اس کے سوکھے سیاہ بال اڑ رہے تھے۔ جنھیں وہ بار بار پیشانی سے جھٹکتی سمیٹتی مگر وہ بار بار اس کے چہرے کو ڈھانپ لیتے۔

دوسرا منظر۔ پڑوس میں اس کی سہیلی کا بیاہ تھا۔ وہ رات کو دیر تک سہیلیوں کے ساتھ شادی کے گیت گاتی اور گیتوں میں اس سے مخاطب رہتی۔ یہ گیت اسے بے قراری میں مبتلا رکھتے اور وہ عقبی گلی میں رات رات بھر ٹہلتا رہتا۔ اس کی آواز بھی بہت خوبصورت تھی اور اسے گیت بھی بہت یاد تھے اور وہ گیت خود بھی گھڑ لیتی تھی۔ ماہیے کے بول گھڑنے میں تو اسے خاصی مہارت حاصل تھی۔ ایک رات وہ کسی بہانے چھت پر آئی اور منڈیر پر بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتی رہی۔ پھر پتہ نہیں اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے دس بارہ فٹ اونچی چھت سے گلی میں چھلانگ لگادی اور کئی روز تک لنگڑا کر چلتی رہی۔ اسے اس کے پاگل پن سے خوف بھی آتا تھا مگر اچھا بھی لگتا تھا۔

تیسرا منظر گرمیوں کی ایک دوپہر کا، جب وہ بائیسکل پر کہیں سے لوٹ رہا تھا اور وہ خربوزوں کے کھیت کی رکھوالی کرتے اپنے باپ کو دوپہر کی روٹی دینے جارہی تھی کہ وہ دونوں ایک بگولے کی لپیٹ میں آ کر ٹکرا گئے تھے۔ بہتے ہوئے کھال میں گر کر ان کے کپڑے گیلے ہوگئے۔ وہ باہر کے بگولے سے تو بچ نکلا تھا مگر اس کے بدن کے چھوٹے چھوٹے بگولوں سے، جو بھیگنے سے نمایاں تر ہوگئے تھے نہ بچ سکا اور ہمیشہ کے لئے اس کی نیلگوں آنکھوں میں ڈوب گیا۔ اور اگرچہ کتابیں بھیگ گئیں، کھانا خراب ہوگیا اور کپڑے مٹی سے لت پت ہوگئے تھے مگر وہ اس کے منہ پر لگی کیچڑ دیکھ کر بے اختیار ہنسے جارہی تھی۔

آہستہ آہستہ بادلوں کے گرد کارزرگری تمام ہوگیا۔ نیچے وادیاں، بستیاں اور درختوں کے جھنڈ نظر آنے لگے۔ پھر علامہ اقبال کی آواز گونجی: گراں خواب چینی سنبھلنے لگے، ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے۔ دوری اور بلندی کی وجہ سے ہمالیہ کے ابلتے چشمے تو دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن کہیں کہیں کسی پہاڑی یا میدانی گھر سے اٹھنے والے دھوئیں سے معلوم ہو رہا تھا کہ چینی جاگ اٹھے ہیں۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر سبزے کے قالین بچھے تھے اور کالے بادل امڈے ہوئے تھے۔ اگرچہ اتنی دور سے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا مگر وہ تصور تو کرسکتا تھا، ہرے بھرے جنگلوں میں بلند اور گھنے، طرح طرح کے پھلوں سے لدے اشجار کا، جن کے درمیان طوطوں، میناؤں اور کوئلوں کی چہکاریں گونج رہی ہوں گی۔ فضا میں تتلیاں بھٹکتی اور چڑیاں اڑتی پھر رہی ہوں گی۔ ابابیلوں کی ڈاریں ایک دم تیزی سے نیچے کو جاتی پھر اسی تیزی سے واپس پلٹتی ہوں گی اور نسیم سحری کے چلنے سے درختوں کے پتے اور ٹہنیاں آہستہ آہستہ جھولے جھولتی ہوں گی مگر ذہن کی فلاپی میں حوروں کے لئے یہ منظر محفوظ کرتے ہوئے اسے تامل ہوا کہ کہیں وہ نیک بخت یہ نہ کہہ دیں کہ ہم لاکھوں برس سے عرش پر بیکار بیٹھی یہی زمینی مناظر دیکھ کر تو وقت گذارتی رہی ہیں۔

سورج ابھی کہیں بحرالکاہل کے جزیروں پر گل پاشی کر رہا تھا لیکن اس سے ہمالیہ کی ترائیاں روشن اور معطر ہونے لگی تھیں۔ مگر دور تک کوئی آدم زاد نظر نہ آتا تھا۔ اس نے گھبرا کر اپنے آس پاس دیکھا۔ علی سمیت سب لوگ سو رہے تھے۔ کیا پتہ بعض اس کی طرح چپکے چپکے جاگ رہے ہوں۔ پھر اجالا اور بڑھا۔ سورج نے بحرالکاہل کے پانیوں سے سر نکالا اور نیند نگر، نور آباد اور سپنوں کا گاؤں سبھی بادل بستیاں روشن ہوگئیں۔ سورج کا سونا ہر طرف پھیل گیا اور روشنی کھڑکی سے اندر گھس آئی۔

"تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟" علی کی آنکھ کھل گئی۔

"ہاں۔"

"اچھا کیا کسی کو جہاز کی نگرانی بھی تو کرنا تھی۔"

"تم تو خوب سوئے۔"

"ہاں۔ کتنا اچھا خواب تھا۔" علی بولا۔

"کیا دیکھا؟"

"اپنے مرحوم والدین کو۔" وہ بولا۔ "پہلی بار خواب میں آئے۔"

"کس حال میں تھے؟"

"خوش تھے اور جوان۔"

"یقیناً جنت میں ہوں گے۔"

"اماں کی گود میں دو تین برس کی صغریٰ تھی۔"

"صغریٰ کون؟"

"میری چھوٹی بہن۔ حال ہی میں جس کا تینتالیس برس کی عمر میں انتقال ہوا۔"

"تو تم نے چالیس برس پہلے کے زمانے کو خواب میں دیکھا؟"

"ہاں۔"

"یا پھر اگلے جہان کی ایک جھلک؟"

"یار کتنا اچھا ہوتا جو اگلا جہان اسی دنیا، اسی گلوب پر کہیں واقع ہوتا اور جو لوگ ہم سے ایک سرزمین میں بچھڑ جاتے ہیں وہ کسی دوسرے ملک یا خطے میں مل جاتے۔"

"ہم چاہیں تو اب بھی ایسا ہوسکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"سنا نہیں تم نے؟ یہ تو ہم کا کارخانہ ہے۔ یاں وہی ہے جو اعتبار کیا۔"

"مجھے بھی احسان اکبر کی نعت کا ایک شعر یاد آگیا ہے۔"

"سناؤ۔"
"رکھو مجھے نظروں میں، مجھ پر ابھی گذرے گا۔ اک اور زمیں اندر اک اور زمانہ بھی۔"
"بہت اچھا ہے۔"
"چلو کچھ دنوں کے لئے ایک نیا نظریہ ایجاد کرتے ہیں۔"
"نظریہ یا مفروضہ؟"
"ایک ہی بات ہے، ہر نظریہ شروع میں مفروضہ ہی ہوتا ہے۔"
"تو کیا کسی اور زمین اور زمانے میں جانے کا ارادہ ہے؟"
"ہاں۔"
"مجھے بھی نظروں میں رکھنا۔"
"فکر نہ کرو۔"

یہ اسی سہ پہر یا شاید اس سے اگلے روز کا واقعہ ہے۔ ہم فلائنگ کوچ میں ایک کشادہ سڑک پر سیر کو جا رہے تھے۔ میں شور سن کر چونک پڑا۔

"روکو، روکو!" ایک بوڑھا چلا رہا تھا۔ "میں مریض ہوں زیادہ دیر تک ضبط نہیں کر سکتا۔"

فلائنگ کوچ ہری بھری فصلوں اور درختوں کے درمیان رک گئی۔ سبھی اتر پڑے اور منتشر ہو گئے۔

کچھ فاصلے پر سیبوں کا مہکتا ہوا ایک باغ تھا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے اس کے دروازے پر آ گئے۔ سیب کے درختوں کے درمیان مور اور مونال آنکھ مچولی کھیلتے پھرتے تھے۔ کیاریوں میں جیسے نغمے بو دیئے گئے تھے۔ طرح طرح کے خوشنما پرندے اپنی اپنی منقاروں سے ساز نئے بجا رہے تھے۔ وہی کچی کیریاں لوٹنے والی صبح کی سی ٹھنڈی اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ بڑے دروازے کے قریب دو عورتیں جو ماں بیٹی یا ساس بہو معلوم ہوتی تھیں، اپنے اپنے سامنے ایک ایک ٹوکری رکھے سیب بیچ رہی تھیں۔ وہ اشاروں سے بھاؤ تاؤ کرنے لگے۔ علی نے تصویر بنانے کی کوشش کی تو بڑھیا نے اشارے سے منع کر دیا۔ چھوٹی کے سوکھے سیاہ بال ہوا سے اڑ رہے تھے۔ وہ انھیں پیچھے ہٹاتی سمیٹتی مگر وہ بار بار چہرے کو ڈھانپ لیتے۔

"چھوٹی تمھیں بڑے غور سے دیکھ رہی ہے،" علی بولا۔ "جیسے پہچانتی ہو۔"
"مجھے بھی اس کی صورت اور منظر جانے پہچانے لگتے ہیں۔"
"مگر تم تو یہاں پہلی بار آئے ہو؟"
"ہاں مگر لگتا ہے یہ کوئی دوسری زمین ہی نہیں زمانہ بھی اور ہے۔"
"اسی جہان میں اگلا جہان؟"
"نہیں، مفروضہ۔"

اچانک اسے یاد آ گیا۔ اس نے پوچھا:
"تم جمیلہ ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا مگر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ گھبرا کر بڑھیا اس کی طرف دیکھنے لگی اور اسے یقین ہو گیا وہ جمیلہ ہی تھی۔ اتنے برسوں بعد قدرتی طور پر شکل و صورت میں کچھ تبدیلی آ گئی تھی۔ مگر اس کی کرنجی آنکھوں کی نیلاہٹ اور چہرے کی ملاحت ابھی تک برقرار تھی۔ یوں بھی وہ اس سے کئی برس چھوٹی تھی۔

اس کے ایم اے فائنل کا امتحان دے کر یونیورسٹی سے گاؤں لوٹنے تک وہ بھی عشق کے کئی نوماہی ششماہی امتحان پاس کر چکی اور اڑوس پڑوس میں آنے جانے اور اٹھنے بیٹھنے کے ٹھکانے تلاش کر چکی تھی۔ اس کا سب سے بڑا ٹھکانا بی بی جی کا گھر تھا جن سے وہ سیف الملوک کا سبق لینے آتی اور کسی نہ کسی بہانے اس کے گھر کے چکر بھی کاٹتی اور سیف الملوک کے شعروں کے بہانے اپنے جذبات کا اظہار کرتی رہتی۔ مگر وہ اب اس سے بات کرنے سے گریز کرنے لگا تھا کیونکہ نہ صرف اس کا رشتہ طے ہو چکا تھا بلکہ عنقریب شادی ہونے والی تھی۔ یوں بھی اس کا منگیتر اور بھائی گنوار لٹھ مار قسم کے لوگ تھے اور وہ پڑھا لکھا اور ڈرپوک لڑکا۔ مگر وہ بیوقوفی کی حد تک جذباتی لڑکی تھی، عزت یا جان کسی چیز کی پروا نہ کرتی۔

ملازمت کی تلاش اور انٹرویو دینے کی خاطر اس کا ہر دوسرے تیسرے روز شہر آنا جانا رہتا تھا۔ اس کے والدین اور رشتے دار عورتیں بھی اکثر خرید و فروخت کے لئے شہر آ جا رہی تھیں۔

پڑھا لکھا اور سمجھدار جان کر وہ شادی کے زیورات اور کپڑوں کے انتخاب اور خریداری میں اس سے مدد لیتی رہتی تھیں۔ وہ اس بات پر بہت خوش ہوئی۔ ایک روز کہنے لگی:

"میرا شادی کا جوڑا تم نے پسند کیا؟"
"ہاں۔ میرا مشورہ شامل تھا۔"
"کاش تم مجھے یہ جوڑا پہنے بھی دیکھ سکتے۔"
"مکلاوہ جاؤ گی تو پہن کر آ جانا، میں دیکھ لوں گا۔" اس نے اس کا دل رکھنے کو کہہ دیا۔
"تب تک تو وہ میلا ہو جائے گا۔"
"پھر تو ممکن نہیں ہوگا۔"
"تم مجھے رخصت کرنے نہیں آؤ گے؟"
"بالکل نہیں۔"

وہ اس کی رخصتی والے روز شہر چلا گیا۔ حالانکہ اس روز کوئی انٹرویو تھا نہ ہی کوئی اور کام تھا۔ اس نے سینما کا ٹکٹ بھی لیا، مگر پہلا ہی سین جدائی کا تھا۔ وہ فلم دیکھے بغیر اٹھ کر باہر آ گیا اور دن بھر جھک مار کر شام کو گھر لوٹ آیا۔

اس کے گاؤں پہنچنے سے پہلے وہ ڈولی میں بیٹھ کر سسرال جا چکی تھی۔ تانگہ اس کے مائکے کے قریب سے گزرا تو اس نے دیکھا جہاں تھوڑی دیر پہلے تک شادیانے اور رخصتی کے گیت گونجتے رہے ہوں گے وہاں اب خاموشی چھائی ہوئی تھی اور کتے ہڈیاں چچوڑ رہے تھے۔

کاتک کا مہینہ تھا اور پورے چاند کی رات۔

گلابی جاڑے کی خنک چاندنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی اور اوس سے بوجھل

ہوا چل رہی تھی۔ بھورے شاہ کے مزار پر قوالی ہو رہی تھی اور گیت دھمالیں ڈال رہے تھے۔

"چھتی بوہڑیں وے طبیبا نہیں تے میں مرگیاں۔ تیرے عشق نچایاں کر کے تھیا تھیا۔"

ملنگوں ملنگنیوں کے قدموں کی دھمک اور گھنگھروؤں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ گھر والے اس شور کی وجہ سے جمعرات کو چھت پر نہیں سوتے تھے مگر وہ چھت پر ہی سوتا تھا کیونکہ اسے قوالیاں اور گیت اچھے لگتے تھے اور اگر سونا چاہتا تو لوری کا کام دیتے اور سپنوں میں رنگ بھرتے رہتے۔ اور آج تو دل کے زخموں پر مرہم کا کام دے رہے تھے۔

گاؤں بھر کی چھتیں ایک دوسری سے ملی ہوئی تھیں اور بڑی گلی کے دونوں طرف کسی بھی ایک چھت پر چڑھ کر پورے گاؤں میں گھوما جا سکتا تھا۔ قوالی کے بول بھی بانس کی سیڑھیاں لگا کر ہر چھت پر چڑھ آئے تھے اور پورے گاؤں میں گھوم رہے تھے۔

ابھی اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ خوشبو کا ایک جھونکا سا آیا اور اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اور یہ دیکھ کر اسکی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ زیورات سے لدی، سہاگ کے اسی جانے پہچانے سرخ جوڑے میں ملبوس وہ چاند کی طرف رخ کیے پائینتی کی طرف کھڑی تھی۔ اس کا سسرال تین چار کوس دور تھا اور اس کی رخصتی ہوئے بمشکل ایک پہر گزرا تھا۔ اتنی رات گئے اس کا اکیلے واپس آ جانا ممکن نہیں تھا۔ یقیناً یہ خواب تھا یا کوئی اسرار۔ کیا پتہ بھورے شاہ کے مزار کی کوئی ڈائن یا چھل پائی اپسرا اس کا روپ بھر کر آ گئی ہو۔

اس نے تھوڑی دیر کو آنکھیں بند کر لیں اور جب دوبارہ کھولیں تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ یقیناً یہ سوتی یا جاگتی آنکھوں کا خواب ہی تھا ورنہ وہ اتنی جلدی بہت سی چھتیں پار کر کے غائب نہ ہو جاتی۔ مگر ہوا میں اب تک اس کی خوشبو موجود تھی۔ اگر وہ صرف گمان تھی تو یہ خوشبو کہاں سے آئی؟

اگلے روز پتہ چلا اس نے سسرال پہنچتے ہی شور مچا دیا تھا کہ اس سے سخت بھول ہو گئی ہے۔ اس نے شوہر کا منہ دیکھنے سے پہلے بھورے شاہ کو سلام کرنے کی منت مانی ہوئی تھی۔ اس کا شوہر اور سسرال والے بھورے شاہ کے معتقد اور مرید تھے وہ اس کے فریب میں آ گئے۔ انھوں نے کہاروں سے کہا کہ وہ اسے فوراً لے جائیں اور سلام کروا کر واپس لے آئیں۔ اس کے ہوش اڑ گئے۔ مزار سے نکل کر اتنی دور آتے جاتے اسے ضرور کسی نہ کسی نے دیکھ لیا ہوگا اور بات پھیل جائے گی۔

اس کا اندیشہ درست نکلا۔ بات نہ صرف پھیل گئی تھی بلکہ اس کے سسرال والوں نے خفیہ طور پر اس کا بھورے شاہ کے مزار تک پیچھا کیا تھا۔ اگلے روز اس کے بھائیوں نے بھی تفتیش شروع کر دی۔ اس کے لئے اب گاؤں چھوڑ دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا وہ ایک روز شہر اور کچھ عرصہ بعد بیرون ملک چلا گیا۔

شروع شروع میں اس کے بارے میں خبریں ملتی رہیں کہ سسرال والوں نے دوسرے صوبے میں زمین خرید لی اور وہاں منتقل ہو گئے۔ پھر ایک روز پتہ چلا کہ وہ بیمار ہو کر فوت ہو گئی ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کو شبہ تھا اسے قتل کر دیا گیا تھا اور اس کے بھائی اور دوسرے رشتہ دار بھی اس واردات میں شامل تھے۔

اور اب اتنے برسوں بعد وہ اس کے سامنے زندہ اور سلامت موجود تھی مگر جیسے اس کی قلب ماہیت ہو چکی تھی۔ شاید زندگی کے تلخ تجربات اور ٹھوکروں نے اس کے مزاج کو تبدیل کر دیا تھا اور اس کی ساری شوخی، بہادری اور جوش چھین لیا تھا ورنہ وہ اتنے عرصے بعد اور ایک اجنبی سرزمین میں اسے اچانک دیکھ کر بے اختیار لپٹ نہ جاتی؟

"تم نے مجھے پہچانا جمیلہ۔ میں طاہر ہوں۔ پتہ نہیں تم یہاں کیسے پہنچیں اور کس حال میں ہو مگر شکر ہے تم زندہ ہو۔ ہم نے تو سنا تھا تمھیں قتل کر دیا گیا تھا۔"

اس نے پریشان ہو کر پہلے بڑھیا کو اور پھر اپنے اردگرد دیکھا پھر بولی:

"تم نے ٹھیک سنا تھا۔ انھوں نے میرے پاؤں کے ساتھ پتھر باندھ کر مجھے اندھے کنویں میں پھینک دیا تھا۔"

"پھر تم یہاں کیسے پہنچیں؟"

"مجھے جس کنویں میں پھینکا گیا تھا اس کی تہ نہیں تھی۔ وہ چاہ در چاہ کی صورت اندر سے دنیا بھر کے کنوؤں سے ملا ہوا تھا۔ میں نیچے ہی نیچے گرتی چلی گئی اور اس بڑھیا کے بیٹے نے مجھے اپنے گھر کے کنویں سے باہر نکال لیا۔"

"اب تم میرے ساتھ واپس چلوگی؟"

"نہیں،" وہ بولی۔ "لیکن ایک اجنبی کے ساتھ بات کرنے کے جرم میں اب یہ بھی مجھے کنویں میں پھینک دیں گے۔ تم مجھے تلاش کر کے وہاں کسی کنویں سے نکال لینا۔"

بڑھیا اپنی زبان میں زور زور سے کچھ بولنے لگی۔ گائڈ بھاگا بھاگا آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے فلائنگ کوچ میں لے گیا۔ اچانک فلائنگ کوچ جہاز میں تبدیل ہو کر فضا میں اڑنے لگی۔ پھر ایئر ہوسٹس کی آواز سنائی دی۔

"خواتین و حضرات، حفاظتی بند باندھ لیجئے۔

ہم تھوڑی دیر میں بیجنگ کے بین الاقوامی ایئر پورٹ پر اترنے والے ہیں" ☆☆☆

شمس الرحمن فاروقی

افسانے کی حمایت میں

(نیا اضافہ شدہ پاکستانی ایڈیشن)

قیمت : ۳۰۰ روپے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

صادقہ

زبیر رضوی

صادقہ!
میں ضمیر کی آخری کشت زعفراں
وقت کے پیرہن پہ ہوں صورت ماہ و کہکشاں
درد کے ریگزار میں، میں ہوں صدائے سائباں
شاہ نے اور وزیر نے ساری زمین گھیر لی
اور ہمارے واسطے ٹکڑا زمین چھوڑ دی
جسم پہ زخم چن دیئے درد کے بیج بو دیئے
ایسا سلوک بد کیا حرماں نصیب رو دیئے
ظلم جہاں کی تیرگی پی گئی ساری روشنی
اس کے لبوں پہ جم گئی میرے لہو کی چاشنی
مسند اقتدار تک ان کو رسائی مل گئی
خاک میں جو ملا گئے میری بہشت عنبریں

دشمن قیس و کوہکن بام عروج تک گئے
ہجر کی دھوپ چھوڑ دی باد وصال لے گئے
تیرہ فروش عاشق ماہ و نجوم بن گئے
میرے تمھارے واسطے دار و صلیب دے گئے
قید قفس سنا گئے
صادقہ میرے ہاتھ میں اپنا حنائی ہاتھ دو
عرصۂ کارزار میں تم میری ہم قدم رہو
آؤ کسی پہاڑ سے آدم خاک کے لئے
دست دعا اٹھائیں ہم
صوت و صدا کی مشعلیں
چاروں طرف جلائیں ہم

سری نگر، سری نگر

زبیر رضوی

سری نگر
اب میں تجھے دیکھتا رہتا ہوں
اخبار کی سرخیوں اور تصویروں میں
کبھی تو نظر آتا ہے
خون میں نہائی ہوئی لاشوں کے درمیان
ہاتھ میں بندوق اٹھائے۔ کبھی لکڑی اور ٹین کے
مکانوں کی کھڑکیوں سے
سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے
باہر سڑک پر پھیلے کرفیو کے سناٹے کو...
کبھی کانگڑی میں چنار کے سوکھے پتوں
کو بے دلی سے جلاتے ہوئے
اور کبھی
جہلم کے یخ پانیوں میں شکارا چلاتے ہوئے
اور ہاؤس بوٹوں کے اندر
بوسے بھرے خالی پن کو
اپنے گیلے رومال سے صاف کرتے ہوئے

سری نگر
اب میں اخبار کی سرخیوں میں
تیری گل پوش جنتوں کو دوزخ بنتے دیکھتا ہوں
تیرے گلاب جیسے شاداب چہرے کو
بے شمار نوکیلے ناخن کھرچتے رہتے ہیں
میں دیکھ رہا ہوں تجھے
رقابتوں کی بارود سے لہولہان ہوتے ہوئے
محاذ جنگ بنتے ہوئے
میں دیکھ رہا ہوں
برف باری میں تیرے در و بام کو سفید پوش ہوتے ہوئے
بچوں کے ہاتھوں میں برف کے گولے دیتے ہوئے
اور وازوان کے دسترخوان پر
چھکری اور سنتور سنتے ہوئے
میں دیکھ رہا ہوں تجھے لال چوک میں گھومتے سیاحوں کے ہاتھوں
اپنی بے مثال ہنرمندیوں کا اندوختہ بیچتے ہوئے
میں دیکھ رہا ہوں تجھے بانہال کے اس طرف
اپنی بے گھری کے ساتھ
دلی شہر کی بھیڑ میں شامل ہوتے ہوئے
بے پہچان پھرتے ہوئے
سری نگر سری نگر!

شہر تو رات کی طرح پھیلا ہے

کانچ کے دریچے کے باہر

اختر یوسف

شہر تو رات کی طرح پھیلا ہے اور چاند کہیں دور دور بے رنگ آسماں پہ ہے بھی نہیں بھی کہ دریا بھی کہیں بہتا ہے اور ناگ سیاہ تیز تیز لہراتا ہے اور کہیں الماس پگھلتا قاش قاش چھتراتا ہے اور شہر تو رات کی طرح پھیلا ہے دور اک کشتی پانی اوپر ایک اکیلی کشتی جلتی بجھتی آتی ہے یا اور کہیں جاتی ہے تیز سواری گاڑی ایک پل اوپر سے سن سن کرتی ہے اور کوئی پھر کئی کئی پھر ایک ساتھ کاریں ٹیکسیاں اکادکا جل تھل شور میں عورت ایک پاگل جیسی عورت پاگل عورت بالکل مادرزاد عورت چیختی چلاتی سر کو اپنے نوچتی ہے کون کیا پتہ کہ پانی اوپر ایک اکیلی کشتی جلتی بجھتی آتی ہے یا اور کہیں جاتی ہے اور چاند کہیں دور بے رنگ آسماں پہ ہے اور نہیں بھی ہے کون مگر وہ دھیرے دھیرے درد کو اپنے دل سے پکڑے روتا ہے کہ کشتی بس ڈوبی کہ بس ڈوبی نہ کہیں ڈور نہ چوار جاتی ہے کہ آتی ہے سایہ کب سے ایک کنارے دریا کے آتا ہے کشتی کے ساتھ کہ جاتا ہے اور شہر تو رات کی طرح پھیلا ہے دور بے رنگ آسماں پہ چاند کہیں ہے بھی اور نہیں بھی سایہ چاند اور کشتی ہے کہ نہیں ہے کہ نہیں ہے کہ ہے شہر تو بالکل رات سمان پھیلا ہے

دھندلایا آسماں اور دھواں دھواں بارش دور دور جیسے بجھتی ہوئی پلیا پہ تر بتر کون ہے بھیگتا سوال سا کھڑا ٹوٹ گئے کانچ کے دریچے کے باہر دھند اور دھند سے گذرتی ہوئی آنکھیں بارشیں ایسی بھی کہ جیسے ان نے کبھی رکنا جانا نہیں بس برستا ہی جائیں کب سے مادری وقت سے کیا پتہ شہر تو سارا آدمی اور چکوں سے پٹا ہے ڈیزل اور پٹرول اور آدمی کی بو باس تو چاروں طرف پھیلی ہے فرصت یہاں کسی کو کوئی مجھے جانتا میں بھی نہیں ہائی ویز اور اونچے اونچے برج بھی دھند میں ڈوبے ہوئے معدوم ٹوٹے ہوئے کانچ کے دریچے کے باہر آنکھیں دور دور اک پلیا پہ ٹکی ہیں کون وہ کون ہے جو بھیگ کر بے طرح تر بتر کھڑا ہے انتظار کس کا ہے اس کو سانس تلک جان تلک تر بتر دھند سے گذرتی ہوئی آنکھیں حیران و ہلکان دھندلایا آسماں اور دھواں دھواں بارش اک تیز بہت تیز ٹھنڈایا برفایا جھونکا ہوا کا ہاں جی ہوا کا چہرے پہ آ کر ٹھہر ٹھہر جاتا ہے چونک کر پلٹتا ہوں حیرت میں غرق بس سنتا ہوں سنسان ویران کمرے میں ابھی ابھی کس نے پکارا تھا مجھ کو مجھے ہی پکارا تھا دھواں دھواں بارش بجھتی ہوئی دور دور ایک پلیا پہ جانے کون سانس تلک جان تلک تر بتر یوں بس جانے کیوں بے طرح کھڑا ہے بارشاں کے بیچ اگنی پریکشا میں جلتا ہے دھند سے گذرتی ہوئی آنکھیں میری سنسان ویران کمرے میں گونجتا نام میرا کانچ کے دریچے کے باہر بارش دھند اور دھند اور دھند کچھ ٹھیک سے یاد یاد

رات کے ویرانے میں

اختر یوسف

رات کے ویرانے میں   کس کی چاپ اٹھتی ہے
کون سونی گلیوں میں دھیرے دھیرے   چلتا ہے

بند

پڑے دروازے جیسے   چونک چونک اٹھتے ہیں
سانکلوں کی آنکھ بھی دھند میں کھو جاتی ہے   رات کے
ویرانے میں   کون   سونی گلیوں میں
کیسی سونی گلیوں میں   کب کی سونی گلیوں میں
کس کی چاپ اٹھتی ہے
کون   بس دھیرے
دھیرے   سایہ رنگ چلتا ہے   سانکلوں کی آنکھ کیا
دھند کے پار جانے   دیر اور دیر تک
دیکھتی ہی رہتی ہے   کس کی چاپ اٹھتی ہے   رات کے
ویرانے میں   بند پڑے   دروازے بھی
چونک چونک اٹھتے ہیں   دھند کے پار
بس کون سونی گلیوں میں   کس کی چاپ اٹھتی ہے

ایک شہر میں

اچانک جب جھیل کے پانیوں کا رنگ لال بنا تو دیکھتے ہی دیکھتے
حیران پیڑوں پہ بیٹھے ہوئے گدھوں نے سوچا
سمجھا   دیکھا اک دوسرے کو مسکرا کے   اور
تیز تیز جاپڑوں کے بجنے اور آدمی کے بے طرح
رونے سسکنے کا ڈوبتا پاتال میں   ابھرتا آکاش میں
چیت کار سن کر   بس دوسری طرف   چپ
شہر کی منڈیروں پہ غول
نیلے سبز سرمئی اور سرخ کبوتروں کا
ختم ہو گیا
آسماں سمیت

لالہ جسونت کی حویلی

مرزا حامد بیگ

واگہہ سے کلیرنس کے بعد جب سمجھوتا ایکسپریس لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچی تو چرونجی اور کاجو کے پیکٹ، پان چھالیہ کے تھیلے، بناری اور زردوزی کے بوری بند تھان تھیلوں پر لادے قلیوں اور پھیری بازوں کی دھکم پیل میں ایک وہ بھی تھا۔

وہ، جو لاہور میں اپنے پرکھوں کی حویلی اور گلی محلہ دیکھنے آیا تھا، تاکہ دلی واپس جا کر اپنے بوڑھے اور بیمار باپو کو بتا سکے کہ اس نے جو کچھ ان کی زبانی سنا تھا، سب ویسا ہی ہے یا بدل گیا۔ اور باپو کی چند ایک چھوٹی چھوٹی فرمائشیں تھیں جنھیں پورا کرنا تھا اسے۔

واگہہ میں کلیرنس کے الجھیڑے ازحد تھکا دینے والے تھے اور اسے کسی بات کی جلدی نہ تھی۔ گاڑی سے اتر کر وہ لاہور ریلوے اسٹیشن کے دور تک پھیلے ہوئے آہنی شیڈ کے ایک محرابی ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا دیر تک اپنے باپو کی ہدایات یاد کرتا رہا تھا۔

دہلی ریلوے اسٹیشن پر جب ٹرین کے ڈبے جوڑے جا رہے تھے تو باپو نے تاکید کی تھی کہ پاکستان پہنچ کر سب سے پہلے پولیس اسٹیشن میں اپنی آمد کی رپورٹ کرنا، پھر ریلوے اسٹیشن سے بیب ہی کسی صاف ستھرے ہوٹل میں کمرہ لینے کے بعد خیریت کا فون کر دینا۔

"جی۔"

"کچھ دیر آرام کر کے ہی نکلنا کہیں۔"

"جی باپو۔"

"لاہور ریلوے اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں ہے اپنی حویلی۔ تمھیں تانگہ، ٹیکسی لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پیدل کا راستہ ہے حویلی کا۔"

"جی۔"

"اگر اب بھی تانگہ چلتا ہے، تو بھاٹی لوہاری کی آواز لگائے گا کوچوان۔ جی چاہے تو پکڑ لینا تانگہ۔ لنڈا بازار اور سرائے سلطان والی سڑک کے متوازی ریلوے روڈ نکلتی ہے۔ اسی روڈ پر اسلامیہ کالج اور عرب ہوٹل ہیں۔ چوک برف خانہ سے گوالمنڈی کی طرف وہی سڑک جاتی ہے۔ تم چوک دالگراں میں اتر جانا، بس قریب ہی ہے سرائے سلطان کا پچھلا گیٹ۔ چوک دالگراں سے گذر کر ساری لاریاں سرائے سلطان ہی میں جا کر رکتی ہیں۔ پھر ریلوے اسٹیشن، نولکھا اور دو موریہ پل کی طرف نکل جاتی ہیں۔

"کہیں پاتھی گراؤنڈ کی طرف نہ نکل جانا۔ یا بعد میں بے شک ادھر بھی چلے جانا لیکن حویلی سے ہو کر۔ ادھر گجر گوالے رہتے ہیں۔ میرے یار، بالے کا گھر وہیں تھا۔ چوک دالگراں سے ہی پوچھ لینا لالہ جسونت کی حویلی۔ قریب ہی تو ہے۔ جو کوئی بھی وہاں رہتا ہو، مل لینا۔ پرنام، نمستے نہیں، سلام کرنا۔

"انھیں بتانا کہ میں لالہ جسونت کا پوتا ہوں۔ بیٹھنے کو کہیں تو بے شک تھوڑی دیر بیٹھ جانا، شرمانا نہیں۔ پھر، اگر وہ اجازت دیں تو صحن میں سے ضرور ہو آنا۔ ان دنوں صحن میں برآمدے کی پرچھتی کے نیچے لکڑی کا کا بھاری تخت پوش دھرا رہتا تھا۔ میں جب چھوٹا سا تھا تو رام گلی والے اسکول میں پڑھتا تھا اور تختی اسی تخت پوش پر بیٹھ کر لکھا کرتا تھا... صحن میں بازو والے گھر کی سانجھی دیوار کے عین نیچے ایک کنواں تھا۔ ادھر سے ہم چرخی کی رسی سے بندھا ہوا ڈول ڈالتے، ادھر سے وہ۔ کون پانی سے بھرا ڈول پہلے کھینچ نکالتا ہے، اس کا مقابلہ ہوتا تھا چند لوگوں کے ساتھ۔ اوپر چھت پر جانے کی ضرورت نہیں بے شک صحن میں سے ہی کھڑے کھڑے چھت پر نظر ڈال لینا۔ چھجے پر کبوتر ہوئے تو وہیں سے دکھائی دے جائیں گے۔ ہم نے ان دنوں شیرازی، لقا اور لوٹن پال رکھے تھے۔ بالے اور چند لوگوں نے بھی ہمارے دیکھا دیکھی کبوتر پال لئے تھے اس لئے برابر والی چھتیں بھی شاید کبوتروں سے خالی نہ ہوں۔ اگر اپنی حویلی کے چھجے پر بیٹھے کبوتر دکھائی دے جائیں نا تو باتوں باتوں میں حویلی والوں سے یہ ضرور پوچھ لینا کہ کبوتروں کو ٹکڑی میں کیا دیتے ہیں۔ جو کچھ بتائیں، کاغذ پر لکھ لینا۔ بھولنا نہیں۔"

"جی اچھا۔"

"حویلی کسی خاندانی آدمی ہی کو الاٹ ہوئی ہوگی۔ شاید وہ تمھیں اپنے ہاں ٹھہرنے کے لیے کہیں۔ لیکن بیٹا، ان پر بوجھ نہ بننا۔ ہوٹل ہی میں رہ لینا۔ پیسے ہیں نہ؟ لو اور رکھ لو۔"

"باپو، پیسے ہیں میرے پاس۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"بچت کرنے کی ضرورت نہیں۔ ذرا دیکھ بھال کر بیٹا۔ پاسپورٹ کو قمیص کے نیچے بنڈی میں ہی رکھنا، احتیاط سے۔"

"جی باپو۔"

"حویلی سے نکل کر رشی بھون بھی ہو آنا۔ قریب ہی تو ہے۔ رشی بھون کی دیکھ ریکھ کیسی ہو رہی ہے، واپسی پر بتانا۔"

"جی اچھا۔"

جب ٹرین نے وسل دی تھی تو قلیوں کی بھاگ دوڑ میں اضافہ ہو گیا تھا اور سامان سے لدے پھندے ریڑھوں کا شور بڑھ گیا تھا۔ باپو اونچی آواز میں بات نہ کر سکتے تھے لیکن اس سے اتنے شور میں ان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"ہاں بیٹا، حویلی سے ہو کر گوالمنڈی کی طرف نکلو گے نہ تو رام گلی والے اسکول کے سامنے سے ہو کر گذرنا۔ بے شک باہر ہی سے ایک نظر ڈال لینا اور ہاں، عرب ہوٹل میں ضرور جھانک لینا۔ بڑے بڑے ادیب شاعر بیٹھتے ہیں وہاں۔ بہت ادب احترام سے بیٹا..."

"جی باپو۔"

اس وقت باپو آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی ٹرین کے ساتھ لگے ہوئے چل رہے تھے اور شور بہت تھا۔

"چوک برف خانے سے ناک کی سیدھ میں گوالمنڈی کی طرف نکلو گے تو وہیں پر بہت بڑا پستک بھنڈار ہے۔ واپسی پر اگر کچھ پیسے بچ گئے تو میرے لیے وہیں سے کوئی پرانا ناول خرید لانا... پتا جی ناستک سے تھے، ہمارے ہمسائے تھے نہ بالا لوگ، ان کے گھر سے منگوا کر ہر طرح کے ناول پڑھا کرتے تھے۔ بہت سے ناول تھے، نام یاد نہیں لیکن بس انھی میں سے کوئی ایک لیتے آنا۔ ہاں، نام تو لکھوا دیئے تھے تمھیں؟"

"جی باپو سب کچھ کاغذ پر لکھ رکھا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"دیکھو، ہو سکے تو لاہور کی ٹھنڈی سڑک پر ریگل سینما ہو آنا... میں نے ریگل ہی میں سہگل اور جمنا کی "دیوداس" دیکھی تھی۔ ٹھنڈی سڑک پر چیرنگ کراس... ایک طرف چڑیا گھر اور دوسری جانب وائسرائے کا دفتر۔ اسی چوک میں ملکہ وکٹوریہ کا بڑا سا پیتل کا مجسمہ رکھا ہے۔ ملکہ، وائسرائے کے دفتر کی جانب مونہہ کیے بیٹھی ہو گی۔ میں اکثر گرمیوں کی دوپہروں میں نکل جاتا تھا۔ ملکہ کے قدموں میں لیٹ جاتا تھا۔ سو جاتا تھا وہیں... اور گھر والے..."

باپو وہی باتیں دہرا رہے تھے، جنھیں وہ بچپن سے بار بار سنتا چلا آیا تھا۔

"اور ہاں بیٹا!"

"جی باپو۔"

پھر چلتی ہوئی ٹرین کے ساتھ مسلسل دوڑتے چلے آنے سے ان کا سانس پھول گیا اور وہ پیچھے رہ گئے۔ کھڑکی سے مڑ کر دیکھا تو وہ سب سے الگ پلیٹ فارم پر اکڑوں بیٹھے، جھک کر کھانستے ہوئے صاف دکھائی دے رہے تھے اور پس منظر میں مسافروں کو الوداع کہنے والے بقیہ لوگ کھڑے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ اس کے بعد ٹرین نے رفتار پکڑ لی اور سب کچھ پیچھے رہ گیا۔

"توجہ فرمایئے۔ کراچی سے آنے والی ایکسپریس..." اس نے اپنا چرمی تھیلا اور سوٹ کیس اٹھا کر باہر کا رخ کیا۔ لاؤڈ اسپیکر پر کراچی سے لاہور آنے والی کسی گاڑی کے لیٹ ہو جانے کا اعلان ہو رہا تھا۔ لاہور ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے اس نے ویزا آفس سے ملنے والی پرچی دکھا کر معلوم کر لیا کہ بھارت سے پاکستان آمد کی رپورٹ کہاں کرنا ہے۔

باہر ابھی اچھی خاصی روشنی تھی اور شام سے پہلے پہلے یہ معاملہ نمٹا دینا ضروری تھا۔ واگہہ سے پہلے اٹاری میں اس نے پانچ سو روپے کی کرنسی تبدیل کروائی تھی جو فوری ضرورت کے لیے کافی تھی۔ اس نے آٹو رکشا پکڑنے میں دیر نہیں کی اور رپورٹنگ سینٹر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

ایس ایس پی آفس، ضلع کچہری میں داخل ہوتے وقت وہ قدرے گھبرایا ہوا اور تھکا تھکا سا تھا۔ اس کے کاغذات ہر طرح سے مکمل تھے۔ پاسپورٹ درست تھا۔ ویزا صحیح لگا تھا، اس کے باوجود ایک انجانا سا خوف تھا جیسے سر پر آسمان موجود نہ ہو۔

رپورٹنگ آفیسر کے سامنے بچھی ہوئی بڑی سی میز کے برابر میں اپنا سامان رکھ کر وہ ایک خالی کرسی پر بیٹھ تو گیا لیکن جیسے ملزم بیٹھتے ہیں۔

رپورٹنگ آفیسر نے ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے لحظہ بھر کے لیے اس کی جانب لاتعلقی سے دیکھا۔ پھر اس نے فون بند کر دیا اور کرسی سے اٹھتے ہوئے سرد مہری سے بولا:

"جی، فرمایئے۔"

"میں آج ہی دہلی سے لاہور پہنچا ہوں۔"

"جی دکھایئے کاغذات۔"

رپورٹنگ آفیسر نے اتنا کہا اور باہر نکل گیا۔ کمرے کا دروازہ از خود بند ہو گیا تھا۔ اب وہ کمرے میں تنہا تھا اور اس کے لیے اکیلے میں ایک ایک پل گذارنا مشکل ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا تو رپورٹنگ آفیسر نے جلد ہی سارا کام نمٹا دیا۔ "واپس جاتے ہوئے بھی آپ کو یہیں رپورٹ کرنا ہو گا۔ اس وقت تک آپ کے یہ کاغذات ہمارے پاس رہیں گے۔"

"بالکل صاحب... میں تو بہت گھبرایا ہوا تھا۔ آپ کی کرپا۔ نمسکار۔"

جب وہ دوبارہ ریلوے اسٹیشن کی حدود میں پہنچا تو شام گہری ہو چلی تھی۔ لاہور ریلوے اسٹیشن کے سامنے بہت سے چھوٹے بڑے ہوٹل تھے، جن کے نیون سائن جل بجھ رہے تھے۔

وہ آٹو رکشا سے اتر کر ہوٹلوں کا جائزہ لینے کی خاطر پارک کے ساتھ فٹ پاتھ پر ہو لیا۔ پارک میں بیٹھے اور لیٹے ہوئے بہت سے لوگ اس وقت مٹھی چاپی کروا رہے تھے اور پارک کے گرد چکر کھاتی ہوئی موٹر کاریں اور منی بسیں چہار جانب روشنی کی کندیں پھینکتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

"بھائی صاحب، یہاں سے چوک دالگراں کتنی دور ہو گا؟" اس نے پارک کی ریلنگ کا سہارا لیے ہوئے ایک بھلے مانس سے پوچھا۔

"قریب ہی تو ہے جی۔ ان ہوٹلوں کے سامنے سے وہ جو سڑک دائیں ہاتھ جا رہی ہے، اس پر ہو جائیں۔ یہاں سے چند ہی قدم ہی ہوگا۔"

"جی، اچھا۔" وہ آگے بڑھ آیا۔

باپو سچ کہتے تھے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ اسٹیشن سے چند قدم پر چوک دالگراں۔ رشی بھون کے قریب لالہ جسونت کی حویلی۔ اسی سڑک پر سارا کچھ اور آخر میں پستک بھنڈار۔ سارا پیدل کا راستہ۔

قیام کے لیے اس نے جو ہوٹل چنا تھا اسی کے سامنے والے منی چینجر سے اس نے مزید کرنسی تبدیل کروالی اور ہوٹل کا رخ کیا۔ اس وقت پارک میں مٹھی چپی کرنے والے لڑکوں کے ہاتھوں میں تل کے تیل کی بوتلوں کی جھنکار صاف سنائی دے رہی تھی۔ دوسری منزل پر ہوٹل کا کمرہ خاصا کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ فوم کے گدے، کھڑکیوں پر بھاری پردے، ٹھنڈے گرم پانی کی ٹونٹیاں اور ٹائل کا باتھ روم۔ ایسا ہوٹل تو جامع مسجد کے قرب و جوار میں ایک نہ ہوگا، ہاں البتہ کناٹ پلیس میں ضرور ہوں گے۔ نہا دھو کر ہال میں کھانا کھاتے ہوئے اس نے سوچا۔

ہوٹل کے باہر اور لاؤنج میں چکا چوند روشنی کے سبب وہ اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ زیادہ وقت نہیں گذرا، لیکن جب اس نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ رات کے دس بج رہے ہیں۔ بہت دیر ہوگئی۔ باپو تو نو بجے سو جاتے ہیں اور اس وقت ہندوستان میں آدھے گھنٹے کے فرق کے ساتھ ساڑھے دس ہوں گے۔ میں نے ابھی تک خیریت کا فون تو کیا نہیں، اس نے سوچا اور تیزی سے باہر نکلا۔ پبلک کال آفس کے آپریٹر نے جب گھر کا نمبر ملا کر دیا تو باپو جاگ رہے تھے۔

"باپو! ہیلو! باپو۔ جی پہنچ گیا۔ آپ ابھی تک جاگ.... جی بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ پلیٹ فارم پر کھانس رہے تھے، طبیعت تو....؟ جی رپورٹ کردی۔ آپ ٹھیک کہتے تھے، سب ویسے کا ویسا ہی ہے۔ جی، ہوٹل سے چند قدم کے فاصلے پر.... ماتا جی سے بات.... جی مجھے یاد ہے چوک دالگراں سے سیدھی نکلے گی۔ تاج کمپنی، اسلامیہ کالج اور عرب ہوٹل۔ پھر چوک برف خانہ اور گوالمنڈی سے پہلے دواخانہ حکیم اجمل خان۔ جی مجھے یاد ہے، اب تو صبح ہی نکلوں گا۔ جی حویلی سے ہو کر نکلوں گا۔ فکر نہ کریں۔ فون لمبا ہو رہا ہے.... سب ویسے کا ویسا ہی ہے باپو۔ بس باپو اب رکھتا ہوں۔ نمستے۔"

اس نے کریڈل پر ریسیور رکھ دیا۔ فون کا اچھا خاصا بل بن گیا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں باپو کی پریشانی تو ختم ہوئی۔ پبلک کال آفس سے ہوٹل تک آتے آتے اس نے سوچا۔

کمرے میں آیا تو دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے اسٹیشن کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے قریب کھڑا ہوگیا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ اب نیچے سڑک پر ٹریفک کم ہوگئی تھی اور اسٹیشن کے سامنے والے پارک کے گرد روشنی کی کمندیں پڑ تو رہی تھیں پر ذرا رک رک کر۔

اچانک اس کی نظریں پارک کے بیچوں بیچ ایستادہ روشن پہاڑ پر جم گئیں۔ ارے، یہ کیا ہے؟ پارک کے بیچ روشن پہاڑ تھا اور اس کے برابر میں ایک بہت بڑا میزائل آسمان کی سمت سر اٹھائے کھڑا تھا۔ یہ سب دن کے اجیارے میں تو نہیں تھا یہاں۔ یا شاید دن کو ہنگامہ بہت تھا اس لیے نظر نہیں پڑی۔ دن کو یہ پہاڑ.. یہاں پر تھا بھی یا نہیں؟ وہ مخمصے میں پڑ گیا۔ پارک میں پہاڑ اور میزائل چہار جانب سے پڑنے والی سرچ لائٹوں سے روشن تھے اور پارک کی مدھم روشنی میں جو لوگ شام کو چادریں تانے مٹھی چپی کروا رہے تھے، اب پہاڑ کے دامن میں بے حس و حرکت گٹھڑیوں کی صورت پڑے تھے۔ مٹھی چپی کرنے والے لڑکوں کے ہاتھوں میں تیل کی بوتلوں کی جھنکار اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوگیا؟ وہ سخت چکرایا ہوا تھا۔ پھر وہ کھڑکی سے دور ہٹ آیا کمرے کی روشنی بجھا کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ باپو نے اسے پاتھی گراؤنڈ کی طرف جانے سے منع کیا تھا لیکن وہ ان دیکھے چوک دالگراں سے سیدھا ادھر ہی کو ہولیا۔ رام گلی والے اسکول میں چھٹی کے بعد سارے بچے پاتھی گراؤنڈ میں فٹ بال کھیل رہے تھے۔

"او بالے، اے چندو!" ان کی مائیں چلا چلا کر انھیں کھانا کھانے کے لیے بلا رہی تھیں اور بچے، پسینے میں شرابور، جواب میں کہہ رہے تھے کہ نہیں کھانا، بس کھیلنے دو۔ اور سرائے سلطان کی جانب نکل جانے والی بسیں تھیں کہ بھونپو بجاتی ہوئی، قطار اندر قطار چلی جاتی تھیں۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ ہوٹل کی لابی میں ناشتہ کرنے کے دوران منیجر سے بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ ریلوے اسٹیشن کے سامنے والے پارک میں چاغی کے اس پہاڑ کا نمونہ دیا گیا ہے جو پاکستان کے پہلے ایٹمی تجربے میں اپنا رنگ بدل گیا تھا۔

"اوہ۔" اس نے گہرا سانس لیا۔

پھر منیجر نے اسے لاہور کے تمام قابل دید مقامات کے نام کاغذ پر لکھوا دیے۔ بھاٹی گیٹ، مینار پاکستان، شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد۔ غرض کہ بہت سے نام تھے۔ ہوٹل کی لابی سے اٹھ کر جب وہ اپنے کمرے میں کپڑے تبدیل کرنے گیا تو اس نے سوچا حویلی تو قریب ہی ہے، محض چند قدم کے فاصلے پر۔ کسی بھی وقت وہاں جایا جا سکتا ہے۔ کیوں نہ آٹو رکشا پکڑ کر پہلے چند قابل دید مقامات سے ہو آؤں۔

پھر یوں بھی بہت دن چڑھ آیا تھا۔ مارچ کا اخیر تھا اور دھوپ کی حدت بڑھ چلی تھی، اس نے سوچا اور آٹو رکشا پکڑ کر نکل کھڑا ہوا۔

بھاٹی گیٹ کا علاقہ تو جامع مسجد پرانی دلی جیسا ہی تھا۔ جب گھومتا گھومتا وہ مینار پاکستان پہنچا تو سورج عین سر پر آ گیا تھا۔ رنجیت سنگھ کی سمادھی سے ہو کر اس نے شاہی قلعہ کا چکر لگایا اور حضوری باغ میں بادشاہی مسجد کے سامنے بیٹھ گیا۔

بھاٹی گیٹ سے مینار پاکستان پیدل چل کر آنے اور قلعے کی سیر کے بعد وہ تھک سا گیا تھا۔ واپسی پر آٹو رکشا پکڑتے ہوئے اس نے انارکلی بازار اور پنجاب یونیورسٹی جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ البتہ عجائب گھر جانے کی خواہش ضرور تھی۔ "بھائی عجائب گھر چلو۔"

وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ملکہ وکٹوریہ کا ایک بہت بڑا اسٹیچو کا مجسمہ عجائب گھر کے اندر رکھا ہے۔ کیا باپو بچپن میں عجائب گھر آیا کرتے تھے یا کوئی اور مجسمہ ہے یہ؟ وہ تھوڑا سا گڑبڑایا۔ وقت بھی تو بہت گذر گیا۔ بہت ممکن ہے باپو بھول کر غلط جگہ بتا گئے ہوں۔ اس نے سوچا۔ "بھائی، وائسرائے کا دفتر کہاں ہوگا؟" اس نے

قریب ہی کھڑے عجائب گھر کے ایک اہلکار سے پوچھا۔ "وائسرائے کا دفتر؟ نہیں معلوم کون سے دفتر کا پوچھ رہے ہیں آپ۔"

غلطی ہو گئی، پہلے کیوں نہ ہوا آیا ٹھنڈی سڑک کے چیرنگ کراس سے۔ اس نے احساس ندامت کے ساتھ سوچا۔ اچھا کوئی بات نہیں۔ اب چلتا ہوں ٹھنڈی سڑک کے چیرنگ کراس پر۔ اس نے عجائب گھر سے نکل کر آٹو رکشا روکا۔

"ٹھنڈی سڑک جانا ہے بھائی۔ چیرنگ کراس لے چلو۔"

"جی؟ ٹھنڈی سڑک کا تو مجھے معلوم نہیں۔ چیرنگ کراس پہنچا دیتا ہوں آپ کو۔ وہاں سے معلوم کر لیجئے گا۔"

"ٹھیک ہے، چلو۔"

ابھی سورج نہیں ڈوبا تھا لیکن اس کے باوجود سڑک کے دونوں اطراف جیسے روشنیوں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ چیرنگ کراس پہنچے تو وہاں نہ ٹھنڈی سڑک تھی نہ وائسرائے کا دفتر۔ چیرنگ کراس پر کھڑے کھڑے اس نے اکا دکا راہگیروں سے پوچھا۔ سبھی اس روشنیوں کے سیلاب میں نہائی ہوئی بڑی سڑک کو شاہراہ قائداعظم یا مال روڈ بتاتے تھے اور وائسرائے کے دفتر کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ چڑیا گھر کی موجودگی تو ثابت تھی لیکن چیرنگ کراس کی ایک جانب واپڈا ہاؤس کی فلک بوس عمارت تھی اور دوسری جانب پنجاب اسمبلی ہال۔ چیرنگ کراس کے تکونے احاطے میں پارک تو تھا لیکن اردگرد کا نقشہ وہ نہیں تھا جو باپو نے بار بار ذہن نشین کرایا تھا۔

پھر اس نے چیرنگ کراس کے اس نیم روشن تکونے احاطے کے اندر جا کر دیکھا تو ملکہ وکٹوریہ کا مجسمہ غائب تھا اور اس کی جگہ سنگ مرمر سے تراشی گئی ایک بہت بڑی رحل دھری تھی اور اس کے اوپر سنگ مرمر ہی سے تراشا گیا قرآن۔

وہ پیچھے ہٹ آیا۔

اب وہ اس بات پر حیران تھا کہ اگر یہی چیرنگ کراس ہے تو وہ ٹھنڈی سڑک کیا ہوئی جس کے دونوں اطراف میں گھنے درخت تھے اور وائسرائے کا دفتر کدھر گیا؟ تو کیا باپو کی یادداشت گڑبڑ ہو گئی؟ آج کسی طور پر باپو کو فون کرنا نہیں بنتا، اس نے سوچا۔ ٹھنڈی سڑک، ملکہ وکٹوریہ کے مجسمے اور وائسرائے کے دفتر کا چیرنگ کراس سے غائب ہو جانا یقیناً ان کے لیے صدمے کا باعث ہوگا۔

کل کر دوں گا فون۔ کوئی بہانہ بنا دوں گا۔ کہہ دوں گا کہ فون کی لائن نہیں مل رہی تھی، اس نے سوچا اور دیر تلک چیرنگ کراس پر ششدر کھڑا رہا۔ ہوٹل کی لابی میں رات کا کھانا کھاتے ہوئے اس نے منیجر سے کہا:

"بھائی صاحب مجھے وائسرائے کے دفتر جانا تھا، بہت ڈھونڈا پر نہیں ملا۔"

"کہاں جانا تھا؟"

"بھئی وہیں ٹھنڈی سڑک پر، جہاں وائسرائے کا دفتر ہے۔"

"جی، کون سا دفتر؟ ابھی معلوم کیے دیتا ہوں۔ میں تو یہ نام پہلی بار سن رہا ہوں۔" پھر منیجر نے کام میں منہمک ایک ایک ویٹر سے پوچھا اور سوچ میں ڈوبا رہا۔

"مجھے لاہور میں رہتے آٹھ دس برس تو ہو گئے، پر اس دفتر کا نام نہیں سنا میں نے۔ خیر معلوم کر لیں گے۔ اور سنائیں آپ ہو آئے مینار پاکستان اور شاہی قلعے سے؟"

"جی وہاں تو ہو آیا۔ اب کسی طرح معلوم کر کے بتائیے۔ میں نے ضرور ہی جانا تھا ادھر۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

رات کو سوتے وقت اس خیال نے ڈھارس بندھائی کہ کل حویلی کا چکر لگے گا تو گلی محلے اور حویلی کی خیر خبر سن کر باپو خوش ہو جائیں گے۔ رات سوتے وقت اس نے گھڑی پر الارم لگا دیا تھا تا کہ صبح اٹھنے میں تاخیر نہ ہو اور دھوپ کی حدت بڑھنے سے پہلے ہی حویلی سے ہو آئے۔

صبح اٹھ کر اس نے دیر نہیں کی، جھٹ تیار ہو کر نکلا اور ہوٹل کی لابی میں چلا آیا۔ اس وقت منیجر اپنی سیٹ پر نہیں بیٹھا تھا۔ اس نے ہلکا سا ناشتہ کیا اور ہوٹل سے نکل کر باپو کے بتائے راستے پر ہو لیا۔

باپو کی ہدایت کے عین مطابق اس نے لنڈا بازار والی سڑک کے متوازی نکل جانے والی ریلوے روڈ ہی کو چنا۔ لیکن دور تک اسے ادھر کو جاتا ہوا نہ تو کوئی تانگہ دکھائی دیا نہ سرائے سلطان کی جانب سے ریلوے اسٹیشن کی سمت آتی ہوئی کوئی لاری ہی دکھائی دی۔

"وقت بھی تو بہت گذر گیا۔" اس نے سوچا۔

اس کے باوجود راہ چلتا وہ کئی بار ٹھٹک کر رکا لیکن اس وقت سب جلدی میں تھے اور فٹ پاتھ کے برابر والی دکانیں ابھی کھلی نہ تھیں۔ وہ کس سے پوچھتا۔ بس چلتا گیا۔

جب وہ ایک چورستے میں پہنچا ہے تو نان چنے کی ریڑھی کے گرد گرد ناشتہ کرنے والوں کا ہجوم دیکھ کر رک گیا۔

"بھائی صاحب! کیا یہی چوک دالگراں ہے؟ میں نے جانا تھا ادھر۔"

یہ سن کر ناشتہ کرتے ہوئے ایک بھاری تن و توش والا شخص خوش طبعی سے بولا:

"جانا نہیں تھا۔ آپ خیر سے چوک دالگراں پہنچ گئے۔ آؤ بسم اللہ، ناشتہ کرو۔"

"جی، جی شکریہ۔ میرا مطلب ہے، سرائے سلطان کا لاری اڈہ قریب ہی ہے کیا؟"

"سرائے سلطان کا لاری اڈہ؟"

سب حیرانی سے بڑبڑائے اور اک دوجے کی جانب استعجابیہ انداز میں دیکھنے لگے۔

"چلیے یہ بتا دیجئے لالہ جسونت کی حویلی کس طرف کو ہے؟"

"لالہ جسونت کی حویلی؟"

ایک بار پھر سب کے سب حیرانی سے بڑبڑائے۔

"اچھا کوئی بات نہیں۔ رشی بھون تو قریب ہی ہوگا۔"

"رشی بھون؟"

اب تو سارے ہی کے سارے تعجب بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

وہ بوکھلا کر تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ آیا۔

پھر جب تنگ چور رستے کی ساری دکانیں نہ کھل گئیں وہ اسی بدحواسی میں کبھی دائیں اور کبھی بائیں اسی بازار میں بھٹکتا پھرا۔ دوبارہ کسی سے پوچھنے کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

وہ مایوس ہو چلا تھا کہ اچانک اس کی نظریں ایک کباڑ خانے کے پیچھے سے ملحق بڑے سے محرابی گیٹ پر جم گئیں۔ اس گیٹ کی کائی زدہ دیوار پر "سرائے سلطان" درج تھا اور اس کے نیچے کوئی تاریخ بھی لکھی تھی جو پڑھی نہیں جاتی تھی۔ خوشی کی ایک لہر سی اٹھی، جس نے اس کے بدن میں بجلی سی بھر دی۔

وہ کباڑ خانے کی جانب یوں بڑھا جیسے کچھ پالیا ہو۔

سرائے سلطان کے محرابی دروازے کے اندر نیم تاریک کباڑ خانے میں ایک خمیدہ کمر بڈھا کباڑ کے ڈھیر سے اشیا کی چھانٹی کا کام کر رہا تھا۔

"بابا جی سلام! یہی سرائے سلطان ہے؟"

"ہاں کبھی تھی۔"

خمیدہ کمر کباڑی نے اس کی جانب مڑ کر دیکھے بغیر جواب دیا۔

"بابا جی، کیا یہی لاری اڈہ تھا پہلے؟"

"ہاں تھا۔ پرانی بات ہے۔"

"میں لالہ جسونت کا پوتا ہوں بابا جی۔ دلی سے آیا ہوں۔"

"کیا کہا، لالہ جسونت؟"

بڈھا کباڑی کام چھوڑ کر مڑا اور اس کے بیٹھنے کو موڑھا آگے کو سرکاتا ہوا بولا "ارے تو یہاں کیسے؟"

"جی میں لالہ جسونت کا پوتا ہوں۔ حویلی جانا تھا۔ باپو نے بتایا تھا کہ رشی بھون کے قریب چوک ہی میں ہے کہیں۔" اس نے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ لالہ جسونت کی حویلی... پر اب کیا جاؤ گے حویلی... وہاں تو خرادیے بیٹھ گئے۔ اس چوک سے بائیں ہاتھ امام باڑے کا علم دکھائی دے گا۔ اس سے ذرا پہلے خراد کا کارخانہ ہے۔ وہی حویلی تھی لالہ جسونت کی۔"

"اوہ... کیا سب کچھ ختم ہو گیا بابا جی؟"

"نہیں۔ عمارت موجود ہے۔ پر اب وہاں کوئی رہتا نہیں۔ خرادیے جو بیٹھ گئے۔ چائے پیو گے؟"

"اور رشی بھون بابا جی؟"

"پی لو چائے، دور سے آئے ہو۔ کوک، فانٹا پیو گے؟"

"بابا جی، بہت مہربانی آپ کی۔ ابھی ناشتہ کر کے آیا ہوں۔ اب چلوں گا آپ کام کیجیے۔ آگے بھی جانا ہے مجھے، گوالمنڈی کی طرف۔ رشی بھون کا تو بتایا نہیں آپ نے۔"

"بیٹا، بتایا تو ہے۔ تمھاری حویلی کے برابر والا امام باڑہ ہی کبھی رشی بھون تھا۔ سنہ سینتالیس کے بعد محکمہ اوقاف والوں نے بڑی مدت بند رکھا۔ پھر امام باڑہ بن گیا۔"

یہ سن کر وہ اٹھ کھڑا ہوا لیکن ٹانگوں میں جیسے جان نہ تھی۔

"بیٹھو نہ بیٹا"

"بس بابا جی۔ کچھ کام ہیں چھوٹے موٹے۔ اب چلتا ہوں۔ نمسکار۔"

"جیتے رہو۔"

کباڑی بابا نے دوبارہ کباڑے کے ڈھیر سے چھانٹی کا کام شروع کر دیا۔

جب وہ سامان سے لدے پھندے ریڑھوں اور دھواں اگلتے آٹو رکشوں میں سے رستہ بناتا، ڈولتا سنبھلتا چوک سے بائیں ہاتھ مڑا تو سامنے امام باڑہ تھا۔

اس نے وہ چند قدم کا فاصلہ صدیوں میں طے کیا اور امام باڑے کی برابر والی بوسیدہ حویلی کی ڈیوڑھی کے سامنے دیر تک کھڑا رہا۔ اندر مشینوں پر خرادیے جھکے ہوئے تھے اور مشینوں سے چنگاریاں اٹھ رہی تھیں۔ لوہے کو لوہا کاٹ رہا تھا۔

اس نے وہاں کھڑے کھڑے رشی بھون پر نگاہ کی۔ امام باڑے کے اوپر سیاہ علم لہرا رہا تھا اور پرانی عمارت نئے سرے سے پلستر کر کے رنگ دی گئی تھی۔ وہ پلٹا اور چوک دالگراں سے ہوتا ہوا گوالمنڈی کی جانب چل دیا۔

سامنے والے ایک خستہ مکان کی ممٹی پر کبوتر بیٹھے تھے۔ کیا پتہ ان کبوتروں میں شیرازی، لقا اور لوٹن کبوتر بھی ہوں۔ اس نے سوچا۔ چلتے چلتے تاج کمپنی کے صدر دروازے پر نگاہ پڑی تو اس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ میں سے شادمانی کی ایک لہر اٹھی اور ساتھ ہی دم توڑ گئی۔ اس نے تاج کمپنی کی گرانڈیل بلڈنگ کی بیرونی دیوار پر آویزاں نیلامی کا اشتہار پڑھ لیا تھا۔

آگے دائیں ہاتھ اسلامیہ کالج تو موجود تھا لیکن اس کے سامنے عرب ہوٹل کا نشان تک نہ تھا۔ جستی پائپ، سینیٹری اور ربڑ کی دو طرفہ دکانیں تھیں اور بس۔ معلوم کیا تو پتا چلا کہ برس ہا برس ہو گئے عرب ہوٹل کو ختم ہوئے۔ ساتھ ہی رام گلی تھی۔ وہ ادھر کو مڑ گیا۔

رام گلی کی وہی پرانی بالکونیاں، جو باپو کی یادوں میں آباد تھیں، اب منہدم ہونے کو تھیں۔ چوک برف خانے سے آگے دواخانہ حکیم اجمل خاں تو موجود تھا لیکن دور، تک کسی پستک بھنڈار کا وجود نہ تھا۔ اسی علاقے کے دکانداروں سے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ گذشتہ برس دارالاشاعت پنجاب کی عمارت گرا دی گئی جو ایک مدت سے اجاڑ پڑی تھی۔

اب دارالاشاعت کی جگہ ایک نوتعمیر شدہ پلازا کھڑا تھا، "حمزہ سینٹر" کے نام سے۔ اس کے اندر جستی پائپ، سینیٹری کے سامان اور ربڑ کی شیٹوں کے انبار لگے تھے۔ ذرا فاصلے سے کھڑے ہو کر اس نے نوتعمیر شدہ عمارت پر نظر ڈالی تا کہ باپو کو بتا سکے کہ وہ جگہ کیسی تھی۔ پھر اچانک اس کی نظریں حمزہ پلازا کی بیرونی دیوار اور بجلی کے کھمبے کے بیچ جھولتے ہوئے کینوس کے ایک بہت بڑے اشتہار پر جم گئیں۔ پر اردو میں کمزور ہونے کے سبب اس سے پورا اشتہار پڑھا نہیں گیا۔ لکھا تھا:

چلو چلو، ملتان چلو!

تین روزہ سنتوں بھرا اجتماع!

شیر شاہ بائی پاس صحرائے مدینہ، ملتان!!

فرزندانِ اسلام کے قافلوں کا سلسلہ جاری ہے!!!

وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتا ہوٹل کی جانب پلٹ پڑا، یہ سوچتے ہوئے کہ آج باپو کو فون بھی کرنا ہے۔ اب اس کی مشکل یہ تھی کہ باپو کو کیا بتائے اور کیا نہ بتائے۔

ہوٹل کی لابی میں پہنچا تو وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"آج تو آپ سویرے سویرے ہی نکل لیے۔ کہاں کہاں کا چکر

لگا؟" منیجر نے خوش مزاجی سے پوچھا۔

"سبھی جگہوں سے ہو آیا منیجر صاحب۔ بہت تھک گیا۔ آج بیٹھوں گا نہیں۔ کھانا اوپر ہی بھجوا دیجیے گا۔"

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟"

"ہاں، ٹھیک ہوں۔ بس ذرا تھک گیا۔" اس نے کمرے کے چابی وصول کرتے ہوئے اوپر کا رخ کیا۔

سارا دن کمرے ہی میں گذار کر جب وہ نیچے آیا تو شام گہری ہو چلی تھی۔ منیجر نے اسے دیکھ کر دور سے ہاتھ ہلایا لیکن وہ لابی میں نہیں رکا اور باہر نکل آیا۔

جب پبلک کال آفس کے آپریٹر نے اسے دہلی فون ملا کر دیا تو گذشتہ کل، فون نہ کرنے پر باپو ناراض ہو رہے تھے۔

"لیکن باپو، آج میں ہو آیا حویلی سے۔ سب ویسے کا ویسا ہے باپو۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا! میں تو حیران ہوں باپو کہ چوک دالگراں اور رام گلی کے سارے ورشٹ ناگرک، دادا جان کو ابھی تک نہیں بھولے۔

"اقبال گجر جنہیں آپ بالا کہتے ہیں نہ، وہ زندہ اور صحت مند ہیں۔ بڑی محبت سے ملے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ تیرے پتا جی تو مجھ سے دو چار ماہ چھوٹے ہی ہوں گے، وہ بوڑھے اور کمزور کس طرح ہو سکتے ہیں۔ پھر انھوں نے آپ کی صحت کے لیے بھگوان سے پرارتھنا بھی کی۔ حویلی والے خاندانی لوگ ہیں۔ مجھے اپنے ہی ہاں ٹھہرنے کو کہہ رہے تھے پر میں ہوٹل ہی میں ٹھہروں گا۔ باپو سچے، میں اندر گیا تھا حویلی کے صحن میں۔ برآمدے کی پرچھتی کے نیچے اب تخت پوش تو نہیں پر صحن کا کنواں ویسے کا ویسا ہی ہے، جیسا آپ نے بتایا تھا۔ بس کنویں پر موٹر لگا لی گئی ہے۔ اوپر چھجے پر کبوتر بھی تھے۔

"رشی بھون کی سندرتا دیکھنے کے قابل ہے۔ مندر میں پرارتھنا اور دین دھرم کے معاملے میں کوئی پابندی نہیں، دان پن بھی بہت کیا جاتا ہے۔ سب ویسے کا ویسا ہی ہے باپو۔ واپسی پر سب بتاؤں گا۔ دو چار دن میں سیر کر کے آ جاؤں گا۔"

"زیادہ نہیں رکنا، سمجھے؟"

"نہیں رکنا۔ جی۔ ٹھیک ہے باپو۔"

بات جاری تھی پر اس نے خود ہی فون بند کر دیا۔

"ایک بوجھ اتر گیا۔" وہ بڑبڑایا۔

ہوٹل پلٹ کر اس نے لابی میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور کچھ دیر منیجر سے گپ شپ کرنے کے بعد اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دوپہر سے شام تلک سوچ بچار کرنے اور بے کلی سے کمرے میں ٹہلتے رہنے کے باعث وہ تھک گیا تھا۔ بستر پر لیٹنے کے کچھ ہی دیر بعد سو گیا۔

اس نے دیکھا کہ گرمیوں کا موسم ہے اور ہر طرف گرم لو چل رہی ہے۔ ایسے میں ٹھنڈی سڑک پر دور دور درختوں کی چھاؤں میں لوگ بیٹھے ستا رہے ہیں اور چیرنگ کراس کے تکونے احاطے کے بیچ ٹھنڈے سائے میں باپو کروٹ لیے لیٹے ہیں۔ اس بات سے بے نیاز کہ وہ ٹھنڈا سایہ ملکہ وکٹوریہ کے مجسمے کا ہے یا سنگ مرمر سے تراشی گئی رحل کا ☆☆☆

آسرا

صبا اکرام

چلو چل کے ڈھونڈھیں
کوئی در دایسا
جو زندہ کرے ہم کو اور تم کو بھی
کہ بے سمت راہوں کی بے سمتیاں
ایک منزل کی جانب بڑھیں
ہم اپنی رگوں کی گپھاؤں میں کھوئے ہوئے
ہڑپا کی
موئن جو داڑو کی
تاریک مٹی میں جو ہاتھ ڈالیں
تو اس میں
چمک جائے کوئی چاندی کا شاید
شکستہ پیالہ کہ مٹی کا برتن
کہ جس پر منقش
نئی بھولی بسری محبت کی اک داستاں
جو ہمارے تمھارے لئے
کھوئے رشتوں کی پہچان کا آسرا ہو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (قلم اور روشنائی) عمل: جینت پرمار عطیہ از مصور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (روغن) عمل: محمد حنیف رامے عطیہ از مصور۔ بشکریہ ''سویرا'' لاہور

یہ زندگی کے میلے (واٹر کلر) عمل: وودیش مہاپاتر (عطیہ از مصور)

قید سے بھاگتے ہوئے

مبین مرزا

اس ڈھنڈار کمرے اور بلب کی مدقوق روشنی سے میری وحشت اب آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ چھت، دیواروں اور روشن دان کا بار بار جائزہ لینے کے باوجود یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ مجھے بجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کمرے کے بیچوں بیچ جس تخت پر میں اس وقت براجمان تھا، اس کے دائیں طرف کوئی بیس قدم کے فاصلے پر ایک بڑا سا دروازہ تھا جو باہر سے مقفل تھا۔ کواڑ اتنے دبیز اور بھاری تھے کہ ان پر ہاتھ سے دستک تک نہیں دی جا سکتی تھی۔ خطرے کا احساس تو میری چھٹی حس نے اسی وقت دلا دیا تھا جب ملکوں کا ملازم مجھے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے کمرے سے باہر نکلا اور کواڑ چرخ چوں اور گڑگڑاہٹ کی ملی جلی آواز کے ساتھ بند ہوا اور ساتھ ہی زنجیری کھٹکا بجا۔ میں اس حویلی میں درجنوں مرتبہ آچکا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ کون سے کمرے بیٹھنے اٹھنے کے لیے ہیں اور کن پر مستقل تالا پڑا رہتا ہے۔ مجھے پہلے کبھی اس کمرے میں نہیں لایا گیا تھا۔ لہٰذا یہاں پہنچنے اور دروازہ بند ہونے کے کچھ دیر بعد تک تو یہ سمجھ ہی میں نہ آیا کہ مجھے یہاں کیوں بٹھایا گیا اور دروازہ کس لیے باہر سے مقفل کیا گیا ہے؟ لیکن پھر فوراً ہی میری توجہ اردگرد کی صورت حال کی طرف گئی اور میرا دل گواہی دینے لگا کہ میں مصیبت میں پھنس چکا ہوں۔ تب مجھے ملکاں بی بی یاد آئی اور میں نے سوچا، کیا اسے خبر ہے کہ ریل والی حویلی میں ایک کمرہ میرے لیے بازداشت گاہ بنا دیا گیا ہے؟

صبح اس کمرے میں قید ہونے کے بعد سے اب تک میں یہ سوال خود سے کئی بار کر چکا تھا، لیکن میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کشادہ کمرے کے عین وسط میں لمبی تار سے لٹکے ہوئے بلب نے وقت کو منجمد کر دیا تھا۔ کچھ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کمرے سے باہر دن ہے یا رات۔ وہ یقیناً شام کا عمل ہوگا۔ میں اس وقت تکیہ دہرا کر کے کہنی کے نیچے دبائے تخت پر نیم دراز تھا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا جیسے میرے آس پاس کوئی ہے۔ میری چھٹی حس چونکہ بچپن ہی سے بہت تیز ہے اور زندگی کے مشکل لمحوں میں اکثر میری مددگار رہی ہے، اس لیے میں اس کی طرف سے ملنے والے کسی اشارے کو سرسری نہیں لیتا۔ جوں ہی کسی دوسرے کی موجودگی کا احساس ہوا، میں تخت پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور چوکنا ہو کر اس طرح دائیں بائیں دیکھنے لگا جیسے کوئی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سراسیمگی کی حالت میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا، ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ مجھے دوپہر کا کھانا دے کر شبو جب گئی تھی، اس کے بعد سے دروازہ نہیں کھلا تھا۔ اس کے باوجود مجھے لگ رہا تھا کہ یہیں کہیں کوئی اور بھی موجود ہے۔ تھوڑی دیر میں یہ الجھن دور ہو گئی اور میری چھٹی کے قریب شمالی رخ پر بنے ہوئے روشن دان پر گئی تو مجھے وہاں ایک سایہ سا لہراتا محسوس ہوا۔ میری نگاہیں وہیں ٹھہر گئیں۔ سائے نے مجھے اپنی طرف متوجہ پایا تو اس میں ذرا سی جنبش ہوئی۔ اگلے ہی لمحے روشن دان کی جھری سے گرد سی اڑی اور اس کے پیچھے ایک چھوٹی سی پتنگ چھت کے قریب ڈولتی محسوس ہوئی۔ میں بلا ارادہ اٹھا اور اس پتنگ کے عین نیچے آ کھڑا ہوا۔ یہ کاغذ کا ایک پرزہ تھا جو بندرگاہ پر لگی کشتیوں کی طرح ہچکولے کھاتا، تیرتا نیچے آ رہا تھا۔ میری نظریں روشن دان کی طرف پلٹیں، سایہ وہاں سے ڈھل چکا تھا۔

کاغذ کا پرزہ ہاتھ میں آنے سے پہلے میری چھٹی حس اعلان کر چکی تھی کہ یہ ملکاں بی بی کی چٹھی ہے۔ اس کا مطلب ہے اسے میرے یہاں قید

ہونے کی خبر مل چکی ہے، میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کاغذ کے پرزے نے میرے خیال کی تائید کی۔ یہ ملکاں بی بی کا بھیجا ہوا پیغام تھا۔ اس نے لکھا تھا... لیکن نہیں... ذرا ٹھہریئے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ میں نے یہ قصہ غلط جگہ سے شروع کر دیا ہے۔ مجھے سب سے پہلے اس کہانی کے بنیادی کرداروں یعنی ملکاں بی بی، شبو اور اپنا تعارف کرانا چاہیے، تاکہ آگے چل کر بل کھاتی اور جھکولے لیتی اس کہانی اور اس کے کرداروں کے مسائل اور معاملات کو آپ ٹھیک طرح سمجھ سکیں۔

تو سب سے پہلے آپ ملکاں بی بی کو جان لیجیے کہ کم کم سامنے آنے کے باوجود اس کہانی کا مرکزی کردار وہی ہے۔ آج بیان کرتے ہوئے، اس کہانی اور اس کے کرداروں سے میں برسوں بلکہ دہائیوں کے فاصلے پر ہوں اور انھیں بہتر طور پر بیان کر سکتا ہوں، لیکن اس وقت جب یہ کہانی جنم لے رہی تھی تو میں ملکاں بی بی کے بارے میں صرف دو باتیں جانتا تھا۔ ایک یہ کہ وہ ملکوں کے خاندان کی ایک حسین اور کنواری لڑکی ہے اور دوسری بات یہ کہ وہ مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے بارے میں جو کچھ میرے علم میں اور میرے ذہن میں تھا، وہ سب میرے اندازوں پر مشتمل تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ آنے والے وقت نے ایک کو چھوڑ کر میرے سب اندازے درست ثابت کیے لیکن وہ جو ایک جگہ میں نے منھ کھایا، اندازے کی اسی ایک غلطی نے آگے چل کر میری زندگی کی پوری بساط الٹ کر رکھ دی اور میرے سارے ارادوں اور امیدوں پر پانی پھیر دیا... بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ میرے اندازے کی اسی ایک غلطی نے ملکاں بی بی کی زندگی کی بھی کایا پلٹ دی اور شبو کی تو جان ہی لے لی۔

ہاں تو میں ملکاں بی بی کے بارے میں بس یہی دو باتیں جانتا تھا۔ رہ گئی شبو... تو اس کے بارے میں صرف ایک ہی بات مجھے معلوم تھی کہ وہ ملکاں بی بی کی وفادار ملازمہ ہے۔ ہاں بس یہیں میرے اندازے نے ٹھوکر کھائی تھی۔ اصل میں شبو کی اس وقت میرے نزدیک کچھ زیادہ وقعت بھی نہیں تھی کہ میں اسے اس سے زیادہ اہمیت دیتا، اس کے بارے میں مزید سوچتا اور ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانے کی کوشش کرتا۔ جس طرح شطرنج میں ہوتا ہے کہ بالکل نظر انداز کیا ہوا مہرہ دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرتے ہوئے آگے بڑھ کر فیل یا گھوڑا بن بیٹھتا ہے، کچھ ایسا ہی شبو کے ساتھ ہوا تھا۔ اس نے ایک دن اچانک ملکاں بی بی کی جگہ لے لی اور پھر... لیکن خیر، یہ سب باتیں تو آگے چل کر کہانی میں اپنے مقام پر آپ کے سامنے آ ہی جائیں گی۔

تیسرا کردار میں خود ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کہانی سے پہلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کہانی نے مجھے میری ذات سے روشناس کرایا اور شناخت عطا کی۔ یوں تو کہانی کی بساط پر میں ایک پٹا ہوا مہرہ ہوں لیکن میرے لیے اس سچائی سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ زندگی کی اگلی منزلوں میں مجھے جو کچھ بھی ملا، وہ اسی ہار کی بدولت ملا۔ اگر یہ کہانی رونما نہ ہوتی تو شاید میں ساری زندگی بسوں کے اڈے پر ایک گھٹیا وجود کے ساتھ بے شناخت زندگی گزار کے مر جاتا۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ نہیں ایسا سوچنا درست نہیں ہے۔ یہ احساس اس کہانی میں ہونے والی شکست نے میرے اندر پیدا کیا ہے ورنہ میرے جنون میں پکی سڑک کا سفر تو اس سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ جب بھی میں سوچتے سوچتے یہاں تک آتا ہوں تو ایک سوال میرے اندر سر اٹھاتا ہے، یہ کہ اگر کہانی ویسے ہی چلتی جیسے میں نے سوچی تھی تو آج میں کیا ہوتا؟ بس یہ سوال میرے پورے وجود کو اس کی روح کے ساتھ ایک بہت بڑے سوالیہ نشان میں تبدیل کر دیتا ہے۔ خیر، یہ تو میری بعد کی زندگی کا الجھاوا ہے، جو پھر کبھی سناؤں گا۔ اس وقت تو میں آپ کو اس سے پہلے کے دور کی کہانی سنا رہا ہوں۔

ہاں تو اس مقام پر آ کر میں الجھن میں پڑ گیا ہوں کہ کہانی کا سرا کہاں سے پکڑوں۔ بات کیوں کہ اب میری ذات پر آ گئی ہے، اس لیے اپنے ہی حوالے سے آگے بڑھاتا ہوں۔ ہم گیارہ بہن بھائی تھے۔ ایک تو میں سب بہن بھائیوں میں بڑا تھا اور دوسرے گھر کی غربت... یہ دونوں باتیں مل کر مجھے روز بروز تیزی سے بڑا کر رہی تھیں۔ میں نے جب ہوش سنبھالا، اس وقت میری عمر چھ برس بھی نہیں تھی لیکن میں زندگی کی مشکلوں کو اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ میرے باپ جنھیں ہم سب بہن بھائی باؤ جی کہتے تھے، دق اور دمے کے مریض تھے۔ عمر تو ان کی زیادہ نہیں تھی اس وقت، مشکل سے چالیس بیالیس کے رہے ہوں گے لیکن دیکھنے میں بڈھوں کے بڈھے لگتے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ ہر وقت کھانسی آتی رہتی اور اکثر کھانسی کے ساتھ خون بھی آتا۔ ان کے کرتے کی بغلی جیب میں ایک بڑا سا کپڑا ہر وقت رہتا۔ کھانستے ہوئے یہ کپڑا وہ منھ پر رکھ لیتے۔ کھانسی انھیں دوروں کی شکل میں دیر دیر تک آتی۔ کھانستے کھانستے وہ دہرے ہو جاتے، بالکل ایسے جیسے بیٹھ کر نماز پڑھنے والا رکوع میں جاتا ہے۔ کھانسی جب تھمتی تو وہ منھ سے کپڑا ہٹا کر جیب میں ٹھونس لیتے۔ پہلے وہ جی ٹی ایس (۱) کے ورکشاپ میں ہیلپر تھے، لیکن بیماری اور بار بار کی چھٹی کے سبب نوکری سے نکال دیئے گئے۔ بعد میں انھوں نے ریوڑی، گزک، ٹافیوں، مسواک اور دنداسے کا خوانچہ لگا لیا تھا۔ روز صبح نکلتے اور رات گئے گھر لوٹتے۔ کبھی کبھی دوپہر یا سرِ شام بھی لوٹ آتے۔ لیکن ایسا عام طور پر جاڑوں میں ہوتا جب دمہ زور کرتا یا پھر ان دنوں جب بخار سے وہ بالکل نڈھال ہو جاتے۔

باؤ جی کے صبح گھر سے نکلنے کے بعد ماں ہم سب بہن بھائیوں کا منھ دھلاتی اور ناشتہ کراتی۔ اس کے بعد وہ سلائی مشین لے کر بیٹھ جاتی۔ رات کو باؤ جی کے آنے تک وہ مشین میں جتی رہتی۔ محلے پڑوس سے ہی نہیں بلکہ دوسرے محلوں سے بھی اس کے پاس کپڑے سلنے کے لیے آتے تھے۔ ماں کڑھائی بنائی کا کام بھی کرتی تھی۔ شادی بیاہ کے دنوں میں اس کے پاس کروشیے کی کڑھائی کا بھی بہت کام آتا تھا۔ شروع شروع کے دنوں میں مجھے یاد ہے، کڑھائی کا کام لانے والے تلے اور ریشم کی لچھیاں خود دے کے جایا کرتے تھے۔ ماں ان لچھیوں کو ایک ایک کر کے گھٹنے پر چڑھاتی اور دھاگے کا سرا پکڑ کر کھولتی اور موٹے سے سرکنڈے پر لپیٹتی جاتی۔ ہم بہن بھائی وہیں اس کے پاس کھیلتے رہتے۔ ایک دن میں اور مجھ سے چھوٹی بہن پاس ہی بیٹھے ماں کو لچھیاں سلجھاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ میں نے

ماں سے کہا، "ماں! گچھی تو میں بھی سلجھا سکتا ہوں۔"

"نہیں بیٹا، تجھ سے نہیں سلجھے گی اور الجھ جائے گی۔"

"میں سنبھال لوں گا ماں۔ ایک کر کے دکھاؤں۔" ماں چپ رہی۔

میں نے ایک گچھی اٹھا کے گھٹنے پر چڑھائی لیکن ڈوری کی ہی نہیں، پھسل گئی۔

ماں بولی، "رہنے دے بچے دھاگا برباد ہو جائے گا۔"

"نہیں ہو گا ماں، میں ٹھیک کر لوں گا۔" میں نے گچھی اٹھائی اور چھوٹی بہن سے کہا کہ دونوں بازو سیدھے کرو اور گچھی اس کے بازوؤں میں ڈال کر ہاتھ گھٹنوں پر رکھوا دیئے۔ اب میں نے سرا پکڑا اور دھاگا سرکنڈے پر لپیٹنے لگا۔ ماں نے دیکھا تو بہت ہنسی۔ بس اس کے بعد میں اور چھوٹی بہن ماں کا ہاتھ بٹانے لگے۔ ہم بہن بھائیوں میں کسی نے بھی شاید ماں کو زیادہ تنگ نہیں کیا۔ غربت کے احساس نے یقیناً ہم سب کو لاشعوری طور پر بہت کم عمری میں ہی یہ بات سمجھا دی تھی کہ اگر ہم ماں کو پریشان کریں گے تو وہ کام نہیں کر سکے گی اور ماں کام نہیں کرے گی تو گھر میں روٹی کے لالے پڑ جائیں گے۔ ماں نے ہمارے کھانے پینے، سونے جاگنے کا ایک حساب رکھا ہوا تھا، ہم سب اسی حساب کے مطابق چلتے تھے۔ ایک بات اور بھی تھی، ماں اور باؤ جی دونوں صبر والے تھے۔ ہم نے نہ تو باؤ جی کو کبھی اپنی بیماری، آزاری اور پریشانیوں کا رونا روتے سنا اور نہ ہی ماں کی زبان سے کبھی دکھوں اور تقدیر کے شکوے کی کوئی بات ہمارے کانوں میں پڑی۔ دونوں راضی برضا جیون بھوگ رہے تھے۔ یہی بات ہم بہن بھائیوں میں بھی بچپن سے آ گئی۔

صبح ناشتے کے بعد روزانہ ایک بوڑھی خاتون ہمارے گھر آ جاتیں۔ انھیں محلے کے سب چھوٹے بڑے بوا جی پکارتے تھے۔ اسکول تو ہم بہن بھائیوں میں سے کوئی جاتا نہیں تھا لیکن ہم پانچ بہن بھائی جو ذرا سمجھ دار ہو گئے تھے، بوا جی سے بیٹھ کر پہلے قرآن مجید پڑھتے پھر وہ اردو اور حساب پڑھاتیں اور آخر میں تختی لکھواتیں۔ بوا جی بڑے دھیمے لہجے اور نرم طبیعت کی عورت تھیں۔ انھیں ہماری ماں سے ایک انس تھا۔ ماں بھی ان کا خیال رکھتیں بلکہ بوا جی شاید وہ واحد ہستی تھیں جن سے ماں اپنی کوئی بات کرتی، ورنہ اسے تو جیسے کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی۔ ماں بتایا کرتی کہ پہلے پہل بوا جی نے ہی اسے سلائی کڑھائی کا کام لا کر دیا تھا بلکہ سلائی مشین بھی بوا جی نے قسطوں پر دلائی تھی۔ بوا جی کو دنیا جہاں کی باتیں اور بہت سارے قصے یاد تھے۔ وہ روزانہ ہمیں اچھی باتیں بتاتیں اور اچھے لوگوں کے قصے سناتی تھیں۔ ان کی باتیں سن کر میرے دل میں اچھا آدمی بننے اور جلدی بڑا ہونے کی خواہش روز پیدا ہوتی۔ میرا جی چاہتا، میں بہت ساری کتابیں پڑھوں اور جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں تاکہ اپنے ماں باپ کی خدمت کروں۔ ارے لیکن میں یہ کیا قصہ لے کر بیٹھ گیا ہوں۔ میں تو آپ کو ملکاں بی بی اور شبو کے ساتھ اپنا ماجرا سنا رہا تھا۔

تو بس یوں ہے کہ تقدیر کے دھکوں اور جلدی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی خواہش نے مجھے کم عمری میں ہی روزی روٹی کے چکر میں ڈال دیا تھا۔

ملکاں سے میری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب میں بسوں کے اڈے پر ٹکٹ بابو بن چکا تھا۔ میں کئی ایک نوکریاں کرتے کراتے بسوں کے اس اڈے پر پہنچا تھا۔ یہ ملتان شہر میں پرائیویٹ بسوں کا سب سے بڑا اڈہ تھا۔ یہاں سے ادھر اپنے لاہور، سرگودھا، لائل پور (۲) اور ادھر بہاول پور، سمہ سٹہ، خان پور کی بسیں بھی چلتی تھیں لیکن ان روٹوں پر جانے والی بسوں کے صبح اور شام کے مخصوص اوقات ہوا کرتے تھے جب کہ قریب کے مضافات، مظفر گڑھ، بصیرہ، شجاع آباد، سکندر آباد اور کبیر والا، خانیوال کی (۳) بسیں گھنٹے گھنٹے کے وقفے سے باری باری بھرتی رہتیں اور چلتی رہتیں۔

اس وقت ملتان شہر اس طرح بے ہنگم نہیں پھیلا تھا جیسا آج ہے۔ شہر کے مغربی رخ چاہ بوہڑ والا سے آگے کچھ دور تک خانہ بدوشوں کی جھونپڑیاں تھیں اور اس سے آگے سناٹا تھا۔ داہنے ہاتھ پر فوجی چھاؤنی تھی، یہ راستہ آگے جا کر ٹھنڈی سڑک سے ملتا تھا۔ ادھر الٹے ہاتھ پر بجلی گھر کے سامنے جہاں اب ڈبل پھاٹک کا پل بنا ہوا ہے، یہ بھی اس وقت نہیں تھا۔ ریلوے اسٹیشن کے عقب میں محکمے کے لوگوں کے کوارٹر تھے، اس سے ذرا سا آگے کچی آبادی تھی اور پھر بی سی چوک تک کالی میدان اور کھیت تھے۔ ڈبل پھاٹک پل کے نیچے ریلوے کراسنگ ہے جس سے آگے الٹے ہاتھ پر کچی آبادی تھی، ہم اسی میں رہتے تھے۔ سیدھے ہاتھ پر روڈ کے ادھر آگے جا کر بھٹے تھے جہاں اینٹیں تیار ہوتی تھیں۔ ان بھٹوں سے آگے ایک بڑی سی حویلی تھی جو ریل والی حویلی اور ملکوں کی حویلی کے نام سے مشہور تھی۔ ریل والی حویلی اس کا نام اس لیے پڑا تھا کہ اس کے صدر دروازے کے اوپر حویلی کے چوڑے ماتھے پر نیلے رنگ کے نقشوں کی جو ٹھائیاں (اس زمانے کی ceramic tiles) لگی ہوئی تھیں ان میں سب سے اوپر ماشاءاللہ لکھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ملکوں کی حویلی اور اس کا سنہ تعمیر درج تھا اور اس کے نیچے ایک ریل گاڑی بنی ہوئی تھی۔ ریل گاڑی وہاں کیوں بنوائی گئی تھی، یہ تو لوگوں کو نہیں پتہ تھا، شاید بڑے ملک صاحب جو فوت ہو چکے تھے، اب ان کے پوتوں کو بھی نہ پتہ ہو لیکن بس اس ڈیزائن کی وجہ سے یہ حویلی ریل والی حویلی کہلانے لگی تھی۔ میں نے ملکاں بی بی کو پہلی بار یہیں دیکھا تھا۔

بسوں کے کاروبار میں اس وقت دو طبقے تھے، ایک مالکان اور دوسرے ملازمین۔ مالکان چاہے پڑھے لکھے ہوتے یا ان پڑھ، رویہ سب کا ویسا ہی ہوتا تھا جیسا جاگیرداروں کا اپنے ملازموں سے ہوتا ہے۔ ملازموں میں اکثریت انگوٹھا چھاپوں کی ہوتی تھی جو ڈرائیور، کنڈیکٹر، خاکروب، مالشیے، چوکیدار اور صفائی والے لڑکے ہوتے۔ ان میں ٹکٹ بابو اور منشی بس یہی دو آدمی پڑھے لکھے ہوتے تھے۔ منشی کا کام عام طور پر شام میں دو گھنٹے کا ہوتا تھا، جب وہ آ کر حساب کتاب کھاتوں میں درج کرتا اور ملازموں کی رپورٹ بناتا۔ ٹکٹ بابو کے کام میں ٹکٹ بیچنا، گاڑیوں اور ڈرائیوروں کی باری لگانا، اڈے کی صفائی کا خیال رکھنا، مالشیوں اور صفائی والے لڑکوں کی ڈیوٹی لگانا شامل تھا۔ کیوں کہ اڈے کے یہ سارے کام ٹکٹ بابو کی زیرِ نگرانی ہوتے، اس لیے وہ مالکوں کی عدم موجودگی میں اڈے کا

بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔

میں جب اڈے پر آیا تو میٹرک کر چکا تھا اور کئی طرح کی ملازمتوں کا تجربہ بھی رکھتا تھا، اس لیے آتے ہی ٹکٹ بابو بنا دیا گیا۔ میں نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ مجھے بہت آگے جانا ہے، بہت ترقی کرنی ہے اور اپنے گھر کے حالات بدلنے ہیں۔ اس لیے جہاں بھی کام کیا، پوری محنت اور ایمان داری سے کیا۔ میری صورت اچھی اور ہاڑ چوڑا تھا اور ساتھ ہی مجھے صاف ستھرا رہنے کا بھی بہت شوق تھا۔ ان سب باتوں سے فرق پڑا۔ مجھے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کسی مفلوک الحال اور فاقہ زدہ گھر کا لڑکا ہوں۔ اس اڈے پر آ کر میں نے چند دن میں ہی کام بھی سمجھ لیا اور اپنے ماتحتوں سے گھل مل بھی گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی تنخواہ ملنے سے پہلے ہی اڈہ پوری طرح میری عمل داری میں آ گیا۔ میری دلچسپی اور کارکردگی کو دیکھتے ہوئے ایک طرف مالک مجھ سے خوش تھے تو دوسری طرف وہاں کام کرنے والا عملہ بھی میرے سلوک کی وجہ سے میرا گرویدہ ہو چکا تھا۔

ہمارے اڈے سے ویسے تو مسافر بسیں چلتی تھیں لیکن کبھی کبھی ان بسوں پر سامان بھی آتا جاتا رہتا تھا۔ یہ سامان صرف ملک، چودھری، خاکوانی اور کھر خاندانوں کا ہوتا تھا۔ یہ چاروں خاندان ملتان کے بڑے گھرانے تھے۔ دوسرے شہروں کو جانے والا سامان تو خیر خود اڈے پر پہنچا دیا جاتا، جسے میں اپنی نگرانی میں گاڑی پر لوڈ کراتا اور پرچی کنڈیکٹر کو تھماتے ہوئے ہدایات دیتا۔ لیکن جو سامان کسی دوسرے شہر سے ملتان آتا، وہ میں خود ٹرالر پر لدوا کر گھر پہنچانے جاتا۔ یہ میری ڈیوٹی کا حصہ تھا۔ اس دن لاہور سے آنے والی پیٹیاں، ٹوکرے اور ٹرنک ملکوں کے لیے آئے تھے جنھیں پہنچانے کے لیے میں ریل والی حویلی گیا تھا۔ دور ٹیلوں پر شام ڈھل رہی تھی، دونوں وقت مل رہے تھے۔ آسمان کے مغربی رخ پر آگے تک لالی کھنڈی ہوئی تھی۔ سامان پہنچنے کی اطلاع حویلی کے اندر بھیج دی گئی تھی۔ میں گیٹ کے ساتھ والے دالان میں ٹہلتے ہوئے چاچا فضل دین کا انتظار کر رہا تھا۔ فضلو چاچا ملکوں کی حویلی کا سب سے پرانا ملازم تھا۔ سامان کی وصولی وہی کیا کرتا تھا۔ سامنے والی مسجد میں مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ برآمدے کے دروازے کا جالی دار پٹ کھلا اور ایک آواز باہر کو لپکی، "چاچا نماز پڑھنے گیا ہے، ہنتریں آوے ہی آپ بیٹھ جائیں۔"(۴)

میں نے ٹرالر پہ ساتھ آنے والے لڑکے کو اشارہ کیا اور خود بھی برآمدے کے سامنے والے پرانے پیپل کے نیچے رکھی ہوئی بان والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہمیں بیٹھے ہوئے دو منٹ گزرے ہوں گے کہ دروازے کی اوٹ سے وہی آواز پھر باہر جھانکی، "ہاسیں! بی بی ہنتریں کہتے ہیں، ہتساں بشک سمان لہاکے ونجو۔"(۵)

"نہیں، کوئی بات نہیں۔ میں فضلو چاچے کا انتظار کر لیتا ہوں۔"

آواز نے میرا جواب سنا، اس کے بعد کھٹکے سے دروازہ بند ہوا گویا آواز لوٹ گئی۔ نماز کے بعد فضلو چاچا واپس آیا تو میں نے سامان اس کے حوالے کیا اور واپسی کی راہ لی۔ حویلی کے گیٹ سے نیم دائرے کا چکر کھا کر سڑک باہر نکلتی تھی یعنی سڑک پر آنے سے پہلے حویلی کے پچھواڑے کے آگے سے گزرنا پڑتا تھا۔ ٹریکٹر کے مڈگارڈ پر بیٹھے ہوئے سامنے اچانک نظر اٹھی تو میں نے بلب کی پیلی روشنی میں حویلی کے عقبی برآمدے میں دو عورتوں کو کھڑے دیکھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ ان میں سے ایک ملازمہ ہے اور دوسری مالکن۔ یہ جھٹپٹے کا نظارہ تھا۔ میں نے اگلے ہی لمحے نظریں جھکا لیں۔ ملکاں بی بی کی یہ پہلی جھلک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے دل میں اتر گئی۔ اس وقت میں نوجوان تھا اور خواب بھی ضرور دیکھتا تھا لیکن یہ بات مجھے ان دنوں بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ ملکوں کی عورتوں کی طرف ہی نہیں حویلی کی طرف بھی آنکھیں اٹھا کر دیکھنا موت کو دعوت دینا ہے۔ اس لیے میں نے آگے اڈے تک کا سارا راستہ خاموشی سے سر جھکا کر طے کیا۔ میں تو سر جھکا کر راستہ کاٹ آیا تھا لیکن میرا دل سر جھکانے پر آمادہ نہیں تھا۔

اب میرے ہاتھ نرالا کھلونا آ گیا تھا۔ دن میں نہ جانے کتنی بار میرے دل میں ملکاں بی بی سے ملنے اور بات کرنے کی خواہش زور کرتی اور میں اس کے لیے دل ہی دل میں ہزار بہانے سوچتا لیکن آخر میں ہر بہانہ بیکار اور ناکافی معلوم ہوتا۔ لیکن کہتے ہیں، شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے۔ اس واقعے کے کچھ دن بعد شام کے وقت میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ لاہور کی بس آ کر رکی۔ یہ معمول کی بات تھی۔ میں اڈے پر اترنے والی سواریوں کو دیکھ رہا تھا۔ بس کے اگلے دروازے سے دو عورتیں اتریں۔ پہلے اترنے والی نے بعد والی کو سنبھالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن اس کے سنبھالتے سنبھالتے دوسری عورت جیسے چکرائی اور زمین پر آ گری۔ مجھے سمجھ تو کچھ نہ آیا لیکن میں اٹھ کر لپکا۔ دوسری زنانہ سواریوں کی مدد سے گرنے والی عورت کو اٹھا کر زنانہ مسافر خانے کی ایک بینچ پر لا کر لٹایا۔ اس کے چہرے سے چادر سرکی تو مجھے جیسے کرنٹ لگا۔ یہ تو وہی حویلی والی مالکن تھی۔ ملازمہ اپنے پلو سے مالکن کو پنکھا جھل رہی تھی اور ہیجانی انداز میں "بی بی۔ بی بی جی... بی بی... بی بی جی۔" پکار رہی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا، گھبراؤ نہیں اور نہ ہی اس طرح شور مچاؤ۔ وہ گھڑی بھر خاموش رہی لیکن پھر ویسے ہی "بی بی... بی بی جی" کی رٹ لگانے لگی۔ میں نے اتنی دیر میں حکیم صاحب کو بلوا بھیجا جن کا مطب ہمارے اڈے کے قریب ہی تھا اور ایک لڑکے کو دوڑایا کہ وہ لیمن سوڈا کی بوتل اور نمک لے آئے۔ لیکن حکیم صاحب اور بوتل کے آنے سے پہلے ہی ملکاں بی بی اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ اس نے سب سے پہلے اپنے کپڑے درست کیے، سر پر چادر ٹھیک کی اور چادر سے منہ صاف کیا، پھر دھیرے سے بولی، "چکر آ گیا تھا مجھے۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے پیٹرول کی بو چڑھ گئی۔" اس نے ابکائی لی۔ لڑکا بوتل لے آیا تھا۔ "آپ یہ پی لیں، طبیعت فوراً ٹھیک ہو جائے گی۔" میں نے بوتل آگے بڑھائی اور اس میں نمک کی چٹکی ڈال دی۔ ملکاں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ملازمہ فوراً بولی، "بی بی جی! اے ٹکٹ بابو ہیں، انھاں ہی تہا کو چوا کے اتھاں بلھایا ہئی۔"(۷) نمک ڈالنے کی وجہ سے بخارات تیزی سے اٹھے اور بوتل چھلک گئی۔ ملکاں بی بی نے ایک بار پھر مجھے دیکھا، اس کے بعد میرے ہاتھ میں چھلکتی ہوئی بوتل کی طرف نگاہ کی پھر نرمی سے بولی، "بوتل گلاس میں ڈلوا دیں۔" میرے اشارے پر لڑکا گلاس لے آیا، میں

نے بوتل انڈیل کر گلاس ملکاں بی بی کی طرف بڑھایا اور اس میں ایک چٹکی نمک اور ڈال دیا۔ بخارات سے بوتل پھر چھلکنے لگی۔ ملکاں بی بی نے تیزی سے گلاس خالی کیا اور ساتھ ہی دو ڈکاریں لیں۔ ذرا سی دیر میں اس کی طبیعت بحال ہو گئی۔ اتنی دیر میں یہ خبر حویلی بھی پہنچ چکی تھی۔ فضلو چاچا اور حویلی کے دوسرے ملازم اڈے پر آ گئے تھے۔ میں نے انھیں تسلی دی۔ فضلو چاچا نے آ کر ملکاں بی بی کا حال پوچھا اور بتایا کہ تانگا لے کر آیا ہوں۔ ملکاں بی بی اٹھ کھڑی ہوئیں تانگے میں سوار ہوتے ہوئے وہ پل بھر کے لیے رکی، مڑ کر میری طرف دیکھا پھر ملازمہ سے پوچھا، ''ٹکٹ بابو کا نام کیا ہے؟'' ملازمہ نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''مراد ہے جی... مراد'' میں نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''آپ کا شکریہ... آپ نے ہماری مدد کی۔'' ملکاں بی بی نے کہا اور تانگے میں سوار ہو گئی۔

''خادم ہوں بی بی جی... میری خوش قسمتی ہے۔'' میں آنکھیں نیچی کیے کھڑا تھا۔

تانگا چلا گیا۔

اس کے بعد وہ پہلی جھلک جو میرے دل پر تصویر کی طرح نقش ہو گئی تھی، اس میں جان پڑ گئی۔ اب میں اس تصویر سے باتیں کرنے لگا۔ اپنا حال کہنے اور اس کا حال پوچھنے لگا۔ ملکاں بی بی کے بارے میں میرا تاثر یہ بنا کہ وہ نہایت حسین اور نرم مزاج کی ہیں۔ عمر ان کی زیادہ نہیں تھی، میرے ساتھ کی ہو گی یا مجھ سے بمشکل سال بھر چھوٹی بڑی ہوں گی۔ اس تاثر نے بھی میرے خوابوں خیالوں کو بہت ہوا دی۔

اس واقعے کے چند ہی دن بعد حویلی سے بلاوا آ گیا۔ گرمیوں کے دن تھے اور دوپہر کا وقت۔ میں پہنچا تو ملازمہ نے آ کر برآمدے میں بیٹھنے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں وہ چھاچھ کا گلاس بھر کے لے آئی۔ میں اب تک حویلی کے بلاوے کا مقصد نہیں سمجھ پایا تھا۔ اسی شش و پنج میں بیٹھا تھا کہ داخلی دروازے کے جالی دار پٹ کو جنبش ہوئی، ''آپ نے پانی نہیں پیا۔'' ملکاں بی بی کی نرم آواز ابھری۔

''جی بی بی جی! بس لیتا ہوں ابھی۔''

''آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ ہمیں اپنی گاڑی دکھانی ہے۔ اس دن بھی ہمیں لاہور سے بس پر آنا پڑا۔ گاڑی خراب تھی، وہیں چھوڑ آئے تھے۔ بھائی جان نے ٹھیک کرا کے بھیجی ہے۔ یہاں پہنچ گئی ہے تو ہم نے سوچا کہ یہاں بھی ذرا کسی مکینک کو دکھا لیں۔ آپ خود گاڑی کو دیکھ سکتے ہیں؟''

''جی میں ابھی دیکھ لیتا ہوں اور آپ اجازت دیں تو میں گاڑی بھی لے جا کر اپنے اڈے کے مستری کو بھی دکھا لوں۔''

''ہاں، آپ کسی اچھے مکینک کو دکھا لائیں تا کہ ہمیں اطمینان ہو جائے۔ ڈرائیور آپ کے ساتھ ابھی چلا جاتا ہے۔''

''جی بہتر ہے، بی بی جی!''

''آپ پانی لیں، ہم ڈرائیور کو بھجواتے ہیں۔'' دروازہ کھٹکے سے بند ہوا۔ لیکن اگلے ہی لمحے پھر کھلا۔ ''آپ خود آ کر ہمیں گاڑی کا بتایئے گا تا کہ ہمیں اطمینان ہو جائے۔''

''جی، جی ہاں بی بی جی، جو حکم۔''

گاڑی مستری کو دکھا کر میں حویلی دوبارہ گیا، ملکاں بی بی کو اطمینان دلایا اور واپس چلا آیا۔

اگلے ہفتے پھر بلاوا آ گیا۔ اب ٹریکٹر کی خرابی کا مسئلہ تھا۔ لیکن اس بار حویلی سے واپس جاتے ہوئے میری چھٹی حس نے اعلان کر دیا کہ مسئلہ ٹریکٹر کا نہیں کچھ اور ہے۔ اس دن میں نے بے یقینی اور سرشاری کے ملے جلے احساس کے ساتھ پہلی بار اندازہ لگایا کہ ملکاں بی بی مجھے پسند کرنے لگی ہیں۔

یہ اندازہ درست تھا، اس کی تصدیق تھوڑے ہی دن بعد ہو گئی جب ملکاں بی بی نے مجھے اپنے ٹیوب ویل کے مسئلے میں مشورے کے لیے بلایا۔ اس دن مجھ سے میرے خاندان کی بہت تفصیلات پوچھی گئیں اور مجھے آگے پڑھنے کا مشورہ بلکہ حکم دیا گیا۔ میں نے بتایا کہ میں تو پڑھنے کا بہت شوقین ہوں لیکن حالات سے مجبور ہو کر ملازمت کر رہا ہوں۔ لیکن پڑھنے کا سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے، روزانہ باقاعدگی سے اخبار پڑھتا ہوں، لائبریری سے ڈائجسٹ اور کتابیں نکلوا نکلوا کر پڑھتا ہوں۔ ملکاں بی بی نے مجھے تاکید کی کہ میں باقی سب چیزیں چھوڑ کر ایف۔ اے۔ کے امتحان کی تیاری کروں اور پڑھائی کے اخراجات کی فکر نہ کروں۔ اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو واقعی ملکاں بی بی نے مجھے بلوایا اور میرے بہت انکار کے باوجود پڑھائی کے اخراجات کے لیے روپے تھما دیے۔ ل یہ رقم میری مہینے بھر کی تنخواہ سے زیادہ تھی۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ ہفتے میں حویلی کے کم سے کم دو چکر میرا معمول بن گئے۔ ملکاں بی بی کے دونوں بھائی لاہور میں رہتے تھے۔ اب ہر ہفتے لاہور سے کچھ نہ کچھ سامان آنے لگا اور اگر سامان نہ آتا تو کسی نہ کسی کام سے بی بی کا بلاوا آ جاتا۔ اس کا اظہار تو لفظوں میں کسی طرف سے نہیں ہوا تھا لیکن یہ بات ملکاں بی بی اور میں دونوں جانتے تھے کہ ہمارے بیچ جذبے کا ایک رشتہ پیدا ہو چکا ہے۔ ملکاں بی بی پتہ نہیں اسے کیا نام دیتی ہو گی مگر میں نے اسے اس وقت تک عشق نہیں سمجھا تھا۔ لیکن آدمی سمجھے یا نہ سمجھے، مانے یا نہ مانے... کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔

میں ایف۔ اے۔ کا امتحان دے چکا تھا اور اب امتحان کے نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ میری آنکھیں آنے والے روشن دنوں کو صاف دیکھ سکتی تھیں۔ خوابوں کے ہزاروں سلسلے میری زندگی میں شامل ہو چکے تھے۔ وہ بھی ایسا ہی ایک اجلا اور امید افزا دن تھا جب صبح سویرے مہندیا رنگ کی مارک ٹو (Mark II) اڈے پر آ کر رکی۔ گاڑی کو دیکھ کر چوکی دار میری طرف لپکا، ''ملک فیاض صیب آئے ہیں۔'' اس نے کاندھے پر لٹکی ہوئی بندوق کے دستے پر ہاتھ جماتے ہوئے کہا۔ گاڑی سے گاڑھی کھادی کے قمیص شلوار میں ایک لحیم شحیم شخص دھوپ کا چشمہ لگائے برآمد ہوا۔ چوکی دار کی انکھیوں کے اشارے پر میں آگے بڑھا اور گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا، ''آئیے ملک صاحب آئیے!'' ملک فیاض نے اپنے مضبوط

ہاتھ میں میرا ہاتھ تھا۔ "تمھارا نام مراد ہے؟"

"جی جی ملک صاحب، خادم ہوں۔"

"بھئی تم کو شکریہ کہنا تھا۔ تم ہماری حویلی والوں کی بڑی خدمت کرتے رہتے ہو۔ تمھاری مہربانی۔ حویلی والوں نے ہمیں بتایا ہی نہیں ورنہ ہم چار ملازم اور رکھ چھوڑتے، کیا مسئلہ تھا۔ خیر، تمھارا شکریہ۔ ہم نے بندوبست کر دیا ہے بندوں کا، اب تمھیں نہیں جانا پڑے گا حویلی۔" ملک فیاض نے میرا ہاتھ بھینچ کر چھوڑ دیا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے گاڑی میں جا بیٹھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اس ملاقات پر غور کیا تو فوراً سمجھ میں آ گیا کہ ملک فیاض اصل میں مجھے آئندہ حویلی جانے سے منع کر کے گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک اہم واقعہ تھا۔ میں نے سارا دن اسی شش و پنج میں گذارا کہ ملکاں بی بی کو اس واقعے کی خبر کس طرح ہو لیکن کوئی صورت سمجھ نہیں آئی۔ رات بھی اسی ادھیڑ بن میں گذری لیکن صبح جب میں گھر سے نکل کر اڈے کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں مجھے شبو مل گئی۔

"بی بی ہنڑیں کہتے ہیں کہ پیشی اپلے پھیرا کرائے... تے بہاجپڑا پچھلا یو ہا ہیوے ہوں تو آ وائے۔" (۷)

اس پیغام پر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور دوپہر کا انتظار کرنے لگا۔ میں حویلی کئی بار آیا تھا لیکن اس دن پہلی بار دھڑکتے دل اور بوکھلاہٹ کے ساتھ حویلی میں داخل ہوا۔ شبو دروازے پر ہی میری منتظر تھی۔ وہ مجھے عقبی برآمدے سے لے کر ایک بڑے ہال نما کمرے میں داخل ہوئی جہاں بائیں دیوار کے ساتھ رکھے صوفے پر ملکاں بی بی بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکان آئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے سامنے والے صوفے پر بیٹھنے کو کہا اور پھر شبو کی طرف رخ کر کے ہاتھ سیدھا کر لیا۔ شبو سر جھکا کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ چند لمحے کمرے میں مکمل خاموشی رہی۔ میں چپ چاپ گردن ڈالے بیٹھا تھا۔

"کیسے ہو مراد؟" ملکاں بی بی کی آواز ابھری۔

"بھلا ہوں بی بی جی!"

"کل بڑے بھائی جان تمھارے پاس آئے تھے؟"

"جی آئے تھے۔"

"کیا کہتے تھے؟"

"میں نے سر اٹھا کر ملکاں بی بی کی طرف دیکھا پھر سر جھکا لیا اور خاموش رہا۔

"ہیں مراد... کچھ کہا ہے انھوں نے تم سے؟"

"جی۔"

"کیا کہا ہے؟"

میں پھر چپ رہا۔

"ہیں مراد! بولتے کیوں نہیں، کیا کہا ہے انھوں نے تم سے؟"

"کہتے تھے..." میں نے سر اٹھا کر ملکاں بی بی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ "کہتے تھے تمھارا شکریہ، تم نے حویلی والوں کی خدمت کی۔"

"ہوں... اور... بس یہی کہا تھا؟"

"نہیں... اور کہا تھا کہ اب تمھیں حویلی نہیں جانا ہے۔"

"لیکن کیوں...؟" ملکاں بی بی نے قدرے تلخی سے پوچھا۔

"کہا تھا بندے رکھوا دیے ہیں سارے کام وہ کر لیں گے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔

"پھر... تم اب نہیں آؤ گے حویلی؟"

میں چپ رہا۔

ملکاں بی بی بھی چپ رہی۔

"کچھ اور کہا تھا... کوئی ڈراوا... دھمکی... تم ڈر گئے ہو؟"

"نہیں جی۔"

"آج کیوں آئے ہو؟"

"آپ نے بلایا تھا۔"

"آئندہ بھی بلاؤں گی تو آؤ گے؟"

"ہاں جی۔"

"وہ تمھیں روکیں گے پھر بھی آؤ گے؟"

"آپ بلائیں گی تو میں ضرور آؤں گا۔"

"وہ تمھیں مار ڈالیں گے۔"

"کوئی پروا نہیں ہے بی بی جی!"

"کیا مطلب کوئی پروا نہیں...؟ وہ تمھاری جان لے سکتے ہیں۔ تمھیں نہیں پتہ، وہ کتنے سور ہیں؟"

"لیکن میں پھر بھی آؤں گا بی بی جی... اگر آپ نے بلایا تو۔" اور بس اسی پل مجھے لگا جیسے میں سر سے پاؤں تک ملکاں بی بی کی محبت میں ڈوبا ہوا ہوں۔ میں صوفے سے اٹھا اور ملکاں بی بی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "ہاں بی بی جی! چاہے میری جان چلی جائے مگر میں آؤں گا۔"

"مراد...!" ملکاں بی بی کی آواز بھیگی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر چپ رہی پھر نرمی سے بولی، "ہاں... سچ بول رہے ہو تم، میرا دل کہتا ہے۔ اچھا بیٹھو۔" ملکاں بی بی نے ایک طرف سرک کے اپنے برابر میں جگہ بنائی۔ "سنو، میں تمھیں پوری بات بتا دیتی ہوں۔ اس کے بعد تم کوئی فیصلہ کرنا.. ابھی نہیں، ابھی رکو۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔"

"آپ مجھے جو چاہے بتائیں لیکن فیصلہ میں نے کر لیا ہے، بی بی جی۔"

"نہیں، پہلے آرام سے میری بات سنو۔ دیکھو، میرے دو بھائی ہیں، دونوں خنزیر ہیں، پکے خنزیر... بہن کوئی نہیں ہے۔ دونوں بھائی لاہور میں رہتے ہیں، ہر مہینے ان میں سے ایک یہاں کا پھیرا لگاتا ہے، اس لیے کہ ہماری ساری زمینیں یہاں ہیں۔ تمھیں پتہ ہے ہماری کتنی زمینیں، کتنی جائداد ہے؟"

اوں ہوں۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے بھی نہیں پتہ۔ ہاں پوری زمینوں اور جائداد کا نہیں پتہ مجھے

بھی... پر میرے پتہ ہے کہ بہت کچھ ہے.. اتنا کچھ کہ ہم تینوں، بہن بھائیوں کے الگ الگ ٹبر (۸) ہوں تو بھی ساری عمر بیٹھ کر کھا سکتے ہیں، تنکا بھی توڑے بغیر۔ لیکن میرے بھائیوں کے دلوں میں طمع بھر گیا ہے، وہ سب کچھ خود ہضم کر لینا چاہتے ہیں، مجھے میرا حصہ دینے کو تیار نہیں ہیں، اسی لیے میری شادی نہیں کر رہے۔ وہ چاہتے ہیں، میں ساری عمر اسی حویلی میں پڑی سڑتی رہوں، میرا اپنا کوئی گھر نہ ہو۔ تاکہ کل کلاں بہنوئی ان سے زمینوں کا بٹوارا نہ کرائے۔ اتنی بڑی ہوگئی ہوں میں۔ میرے ساتھ والیاں دو دو تین تین بچوں کی مائیں بن گئی ہیں اور میں بابل کی دہلیز پر بیٹھی ہوں۔ ہمارے خاندان میں تو پندرہ سولہ سال کی لڑکیاں مائیں بن جاتی ہیں۔"

"ملکاں بی بی! آپ کے والد یا والدہ کچھ کیوں نہیں کرتے؟"

"وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ فوت ہو چکے ہیں دونوں۔"

"اور... خاندان کے دوسرے کوئی بڑے بوڑھے نہیں ہیں جو اس مسئلے میں کچھ کریں؟"

"ایک ماموں ہیں، وہ بیٹے کے پاس امریکہ میں جا بیٹھے ہیں۔ دو چاچے ہیں لیکن ان کے بیٹے تو خود بھی کر رہے ہیں، اپنی بہنوں کا حق دبا کے بیٹھے ہیں، چاچاجی بے چارے تو اپنی بیٹیوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے، میرے لیے کیا کریں گے؟"

"آپ کو حویلی میں کوئی تنگی ہے؟"

"نہیں کوئی تنگی نہیں۔ گھی، دودھ، اناج، جانور سب کچھ اپنی زمینوں کا ہے۔ خرچہ پانی بھائی مجھے بھیجتے ہیں۔ گاڑی اور ڈرائیور رکھ چھوڑے ہیں، میں جب چاہوں جہاں چاہوں ڈرائیور کے ساتھ جا سکتی ہوں۔ کوئی پابندی نہیں ہے... بلکہ ڈرائیور کے ساتھ، ملازموں کے ساتھ یا کسی کے بھی ساتھ میں جو چاہے تعلق رکھوں، انھیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بس شادی نہیں کر سکتی۔"

"آپ کا کوئی رشتہ وغیرہ نہیں آتا ہے؟"

"مجھے کیا پتہ، آتا ہے کہ نہیں... آتا ہے تو وہ کیا جوب دیتے ہیں؟ ظاہر ہے میرا رشتہ خود میرے پاس تو نہیں آئے گا۔"

"آپ نے خود نہیں کہا کبھی ان سے کہ آپ کی شادی وغیرہ..."

"کہا ہے، بے غیرت بن کر یہ بھی کیا ہے۔ کہتے ہیں، کر دیں گے کوئی اچھا رشتہ تو آئے۔ اور اگر کوئی آدمی دو چار دفعہ حویلی آجائے تو اس کے ساتھ بھی کرتے ہیں جو تمھارے ساتھ کیا ہے۔ اگر منع کرنے پر باز نہ آئے تو مار پٹائی کروا دیتے ہیں۔ اب تو لوگ میرے کسی کام سے حویلی آتے ہوئے ڈرنے لگے ہیں، فوراً مخبری ہو جاتی ہے۔"

"لیکن بی بی جی! میں نہیں ڈرتا ہوں کسی سے۔" میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

خاموشی چھا گئی۔ ملکاں بی بی نے میری طرف دیکھا، جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ سر کو کئی بار سوالیہ انداز میں جھٹکا پھر بولی، "مراد! تم مجھ سے شادی کرو گے؟"

یہ سوال میرے ذہن میں بھی ہزار مرتبہ آچکا تھا اور ہر بار خواہش بن کر آیا تھا اور میں نے خود کو ہر بار مثبت جواب دیا تھا لیکن ملکاں بی بی کے منہ پر آیا ہوا یہ سوال اس وقت اتنا اچانک تھا کہ میں گڑبڑا گیا اور کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا جواب دوں۔ میں سر جھکائے چپ بیٹھا رہا۔

"ہیں مراد...؟" ملکاں بی بی سراپا سوال تھی۔

"ملکاں بی بی! یہ بہت بڑا... بہت بھاری خواب ہے۔ پتہ نہیں... اسے میری آنکھ سہار بھی سکتی ہیں کہ نہیں؟" میں نے سنبھل کر جواب دیا۔

"یہ خواب نہیں ہے مراد۔ حقیقت ہے۔ میں سچ مچ تم سے پوچھ رہی ہوں۔"

میں نے سر اٹھا کر ملکاں بی بی کی آنکھوں میں جھانکا اور پورے وثوق سے جواب دیا، "ہاں۔"

"چاہے تمھاری زندگی داؤ پہ لگ جائے۔" ملکاں بی بی کی نظریں میری آنکھوں کے راستے دور کہیں، بہت اندر تک مجھ میں اتر آئی تھیں۔

"ہاں... اب مجھے کوئی پروا نہیں ہے ملکاں بی بی!"

ملکاں بی بی ایک ٹک مجھے دیکھتی رہی پھر یک بیک اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے پلکیں جھکالیں آنسوؤں کی لڑی اس کے رخساروں پر ڈھلتی چلی آئی۔

"ملکاں بی بی...!" میں نے گھبرا کے اس کا ہاتھ تھاما۔

اس نے نرمی سے میرا ہاتھ دبایا، دوپٹے کے پلو سے چہرہ پونچھا اور دھیرے سے مسکرائی، "تم مجھے صرف ملکاں بلایا کرو۔ بی بی تو مزارے ملازم بلاتے ہیں۔"

میں بھی مسکرایا... پھر خاموشی چھا گئی جیسے کہنے سننے کی ساری باتیں ہوگئی ہوں۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا، دن ڈھل چکا تھا۔ سورج منڈیر تک اتر آیا تھا۔

"اچھا مراد! اب دو باتیں سن رکھو۔" ملکاں بی بی نے ملائمت سے بولنا شروع کیا، "ایک تو یہ کہ جب تک میں نہیں بلاؤں گی تم حویلی نہیں آؤ گے، کسی کام سے نہیں، سامان لے کر بھی نہیں آؤ گے۔ تم سمجھو ابھی حویلی کا دروازہ تم پر کچھ دن کے لیے بند ہو گیا۔ دوسری بات یہ کہ میرا کوئی ذکر کسی سے نہیں کرو گے۔ تم سے کوئی کچھ پوچھے، کچھ کہے تم ایسے رہو گے جیسے بالکل لاتعلق ہو، کچھ نہیں جانتے۔ ٹھیک ہے۔ یہاں کھلے عام آنا، اب تمھارے لیے خطرے سے خالی نہیں ہے۔ مجھے بلانا ہوگا تو میں شبو کو بھیج دوں گی، تب تم اسی پچھلے دروازے سے آجانا۔"

ہوں۔ میں نے سر ہلایا۔

"مراد! تم سچ مچ کسی بات سے پریشان نہیں ہوگے نا؟"

میں نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"کسی بات سے نہ ہونا... بالکل بھی۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ آزمائش تو ضرور آسکتی ہے لیکن میرے جیتے جی کوئی تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ تم اطمینان رکھنا۔" ملکاں نے میرے دونوں ہاتھ تھامے، انھیں پل بھر اپنے ہاتھوں کی نرمی سے گرمایا اور پھر بولی، "اب تم جاؤ۔"

باہر شام نے سائے کھینچنے شروع کر دیے تھے۔ شبو نے حویلی کے عقبی دروازے سے مجھے نکالا۔ کوئی پچاس قدم چل کر میں پکی سڑک پر آگیا۔ اس دن میں نے پورے یقین کے ساتھ سوچا کہ اب میری زندگی کی گاڑی پکی سڑک سے بھی نکل کر بڑی شاہراہ پر آگئی ہے، آگے کا سارا سفر آسان ہوگا۔ سورج میری پشت

پر غروب ہو رہا تھا لیکن مجھے لگ رہا تھا جیسے میری زندگی میں نیا دن طلوع ہو رہا ہے۔ سامنے ملتان چھاؤنی کے ریلوے اسٹیشن پر لاہور کی طرف سے آنے والی کوئی گاڑی پلیٹ فارم پر لگ رہی تھی۔ پھاٹک کے شمالی رخ پر واپڈا کے بجلی گھر سے پانی کا شور آ رہا تھا۔ جنوبی رخ پر ریلوے گراؤنڈ میں بچے کھیل رہے تھے۔ اس لمحے مجھ پر خوشی، بے یقینی، بہادری اور خوف کی ملی جلی کیفیت طاری تھی اور میرے لیے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ مجھ پر اس وقت کس احساس کا غلبہ ہے۔ میرا حال اس شخص کا سا تھا جس نے زندگی میں پہلی بار شراب پی ہو اور یہ نہ سمجھ پا رہا ہو کہ شراب نے اسے سرور دیا ہے یا اس کیا اندر اداسی بھر دی ہے، کسی احساس کے بوجھ تلے وہ جسم کو نڈھال ہوتا ہوا تو محسوس کرے لیکن اسے کوئی نام نہ دے سکے۔ روڈ پر آ کر میرے سامنے سے تانگے گزر رہے تھے لیکن میں اپنے آپ میں مگن پیدل چلا جا رہا تھا۔

اس کے بعد پندرہ بیس دن تک ملکاں بی بی سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ میں خود جا نہیں سکتا تھا اور اس کی طرف سے کوئی بلاوا نہیں آیا۔ میں روز اس امید کے ساتھ اڈے پر آتا تھا کہ آج ضرور پیغام آئے گا لیکن روز مایوسی کے ساتھ دن ختم ہو جاتا۔ اس عرصے میں لاہور سے دو بار حویلی کے لیے سامان بھی آیا جو میں نے اڈے کے دوسرے لڑکوں کے ہاتھ حویلی بھجوا دیا۔ تقریباً تین ہفتے بعد بلاوا آیا تو میری جان میں جان آئی ورنہ مجھے تو یہ لگنے لگا تھا جیسے میں نے وہ سب کچھ خواب میں دیکھا ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

ملکاں بی بی سے ملاقات مختصر سی ہوئی لیکن میرے لیے یہ بھی غنیمت تھا کہ ملاقات تو ہوئی۔ اس درمیان میں میرا ایف۔ اے۔ کے امتحان کا رزلٹ آ گیا تھا۔ ملکاں بی بی نے سب سے پہلے اس کامیابی پر مبارک باد دی، منہ میٹھا کرایا۔ آگے بی۔ اے۔ کی تیاری کے لیے کہا۔ پھر بتایا کہ جلد کچھ بہتر صورت بننے والی ہے۔ وہ خوش تھی، اس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ لگتا تھا اس کی آنکھیں منزل کو قریب دیکھ رہی ہیں۔ اس کے چند دن بعد ایک صبح بالکل اچانک ملک عنایت حسین ہمارے اڈے پر آ گئے۔ وہ ملکاں کے دوسرے بھائی تھے، ملک فیاض حسین سے چھوٹے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی مجھ سے ملنے اور مجھے حویلی سے دور رہنے کی ہدایت کرنے آئے ہیں، حالانکہ انھوں نے براہِ راست ایسی کوئی بات نہیں کی۔ وہ گندم کی کٹائی کے دن تھے اور ملک عنایت حسین ہمارے اڈے پر کٹائی کے بعد گندم کے کچھ بورے لاہور بھجوانے کو کہنے آئے تھے لیکن اس دوران انھوں نے حویلی کی طرف جانے والے دو تین لوگوں کے حشر کے جو واقعات سنائے، ان میں میرے لیے دھمکاوے کا پورا بندوبست تھا۔ اگلے دن میرا خیال تھا کہ ملکاں بی بی کی طرف سے مجھے بلاوا آئے گا اور اس بار بھی میرا اندازہ درست نکلا۔ عین ظہر کی نماز کے وقت اڈے کے سامنے عورتوں کے سامان والی دکان پر مجھے شبو دکھائی دی۔ میں اٹھ کر باہر لپکا۔ شبو نے مجھے آنے کا اشارہ کیا۔ اس دن بھی ملاقات مختصر سی ہوئی۔ ملکاں بی بی نے ملک عنایت حسین کی آمد اور گفتگو کے بارے میں پوچھا۔ میں نے ساری بات بتا دی۔ ملکاں بی بی نے مجھے اطمینان دلایا اور جانے کو کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ جلد ہی دوبارہ اور ذرا تفصیلی ملاقات ہوگی۔ لیکن پورا مہینہ گزر گیا، تفصیلی کیا مختصر ملاقات تک کا بلاوا نہ آیا۔

ایک روز جب میں اڈے پر صبح کی گاڑیاں بھیج کر اس گومگو میں بیٹھا تھا کہ آج خود ہمت کر کے حویلی کا چکر لگا کر آتا ہوں، ایک شخص میرے پاس آیا اور نہایت رازداری سے بولا، ''حویلی چلنا ہے۔''

بلاوا میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا مگر مجھے اچنبھا ہوا کہ شبو کی بجائے یہ آدمی کیوں بلانے آیا ہے۔

''کب؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی چلیے۔'' اس نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

''اچھا تم چلو، میں نکلتا ہوں پیچھے پیچھے۔''

وہ خاموشی سے اڈے سے نکل گیا۔ میں نے اڈے کے لڑکوں کو بلا کر کام سمجھایا اور کہا کہ تم لوگ اپنی اپنی ڈیوٹی دیکھو، میں ذرا ابھی ایک آدھ گھنٹے میں آتا ہوں۔

اڈے سے باہر آ کر دیکھا، وہ آدمی چوک پر دودھ کی بوتلوں والی دکان کے قریب کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ سرکنے لگا۔ میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ چوک سے آگے نکل کر الٹے ہاتھ کی سڑک پر جو اسٹیشن کی طرف جاتی تھی، ایک تانگا کھڑا تھا، وہ اس میں کوچوان کے ساتھ اگلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا لپکا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ہم حویلی کے دروازے پر تھے۔ میں کئی مہینوں بعد حویلی میں صدر دروازے سے داخل ہوتے ہوئے ایک انجانی خوشی محسوس کر رہا تھا لیکن اس خوشی کے عقب میں کہیں خوف کی ایک لہر بھی تھی۔ میری چھٹی حس مجھے آنے والی کسی الجھن سے آگاہ کر رہی تھی لیکن اس وقت میرا دھیان اس کی بجائے کسی اور ہی طرف تھا۔ وہ آدمی مجھے برآمدے سے لے کر اندر داخل ہوا اور دو تین کمروں سے گھماتا ہوا ایک بڑے سے کمرے میں جا رکا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ میرے کمرے میں داخل ہونے پر اس نے مجھے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میرے کچھ پوچھنے کہنے سے پہلے وہ کمرے سے باہر جا چکا تھا اور اس کے نکلتے ہی کمرے کا کواڑ چرخ چوں اور گڑگڑاہٹ کی ملی جلی آواز کے ساتھ بند ہوا اور ساتھ ہی زنجیر کا کھٹکا بجا۔ بس تبھی میری چھٹی حس نے ایک بار پھر مجھے خطرے میں گھرے ہونے کا احساس دلایا۔

ہاں اس ڈھنڈار کمرے اور بلب کی مدقوق روشنی سے میری وحشت آخری حد کو پہنچ چکی تھی، جب مجھے اپنے آس پاس کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا اور پھر میں نے چھت کے ساتھ لگے روشن دان سے کاغذ کا ایک پرزہ تیرتا ہوا نیچے اترتا دیکھا۔ تو کاغذ کا پرزہ ہاتھ میں آنے سے پہلے میری چھٹی حس نے بتا دیا کہ یہ ملکاں بی بی کی چٹھی ہے۔ تب میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اسے خبر ہے کہ مجھے قیدی بنا لیا گیا ہے۔ اب چٹھی میرے ہاتھ میں تھی اور میرا اندازہ سو فی صد درست تھا۔ اس نے لکھا تھا، ''گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کسی کو کچھ نہیں بتانا، چاہے وہ کچھ بھی کہیں۔''

اس خط میں میرے لیے تسلی بھی تھی اور پریشانی بھی کہ میں دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا ہوں۔ لیکن میرے پاس صبر اور حوصلے کے ساتھ حالات کا سامنا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس وقت میں نے اپنے دل کو ٹٹولا، کیا میں واقعی

ملکاں کے عشق میں آنے والے امتحان کے لیے تیار ہوں؟ اس سوال کا جواب تو میرے اندر سے اثبات میں آرہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ خوف کے بگولے بھی اندر ہی اندر اٹھنے لگے تھے۔ اس وقت تو خیر میں اس طرح نہیں سوچ سکتا تھا لیکن آج جب کہ یہ سارے منظر میری آنکھوں کے سامنے سے فلم کی طرح گذر رہے ہیں اور میں ان کا حصہ ہوتے ہوئے بھی خود کو ان سے الگ کر کے دیکھ سکتا ہوں... اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ وہ یک طرفہ اور آدھا عشق تھا اور اس کے ساتھ آدھا عشق کا دعوکا تھا۔ ملکاں مجھ پر مرتی تھی۔ اسے واقعی مجھ سے محبت تھی۔ بے پناہ.. تباہ کن محبت۔ لیکن میں ملکاں کے سہارے اپنی زندگی کی گاڑی کو اونچی نیچی ہچکولے دیتی، بل کھاتی پگڈنڈیوں سے نکال کر کامیابی اور آسائش کی شاہراہ پر لانا چاہتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کی معصوم، موہنی صورت نے میرے دل پر اپنا نقش جما لیا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسے میری طرف سے کسی بھی طرح عشق کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ہاں، واقعی مجھے اس وقت ملکاں سے عشق نہیں تھا... لیکن آج جب وہ میری زندگی میں نہیں ہے تو میں قسم کھا کر یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں برسوں سے اس کے عشق میں ڈوبا ہوا ہوں... سر سے پاؤں تلک۔ آج میں سوچتا ہوں کہ میں نے اس وقت ملکاں سے منھ موڑ کر واقعی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ لیکن اس حقیقت کا احساس مجھے بہت بعد میں ہوا۔

خیر، تو پھر یہ ہوا کہ ملکاں کی چٹھی پڑھ کر میں واپس اسی تخت پر دراز ہو گیا جس پر صبح سے پڑا تھا۔ کمرے میں صرف ایک بلب روشن تھا جس کی روشنی اس کمرے کی کشادگی کے لحاظ سے بالکل ناکافی تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے روشنی کو یرقان ہو گیا ہے۔ ملکاں کی چٹھی ملنے سے پہلے مجھ پر وحشت طاری ہو رہی تھی لیکن اب اس وحشت میں ایک خوف بھی شامل ہو گیا تھا۔ میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ ہاں یہ اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ میں کسی بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ شبو جو کھانا دوپہر میں دے کر گئی تھی، میں نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں تھا۔ لیکن اب بھوک چمک اٹھی تھی۔ کھانا وہیں دروازے کے قریب زمین پر رکھا ہوا تھا۔ میں اٹھ کر گیا اور روٹی والی چنگیری لے کر واپس تخت پر آ بیٹھا۔ چنگیری میں دو روٹیاں تھیں اور تام چینی کی پلیٹ میں ثابت مسور کی دال ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ روٹیاں اور دال بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں نے اس سے پہلے دو بار حویلی میں کھانا کھایا تھا اور دونوں بار بڑے اہتمام سے کھانا سامنے لایا گیا تھا۔ اس لیے اس کھانے کو دیکھ کر بھوک جیسے ایک دم ماند پڑ گئی۔ میں نے چنگیری اٹھا کر واپس اسی جگہ رکھ دی۔ یہ تو قیدیوں والا کھانا ہے، میں نے سوچا اور اگلے ہی لمحے مجھے اپنی بات پر خود ہنسی آ گئی۔ میں اس وقت یہاں قیدی ہی تو ہوں... لیکن یہ خیال آتے ہی کہ میں قیدی ہوں، میری نظریں ایک بار پھر اس کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ چھت بہت اونچی تھی اور پورے کمرے میں صرف شمالی رخ پر بنا ہوا ایک چھوٹا روشن دان تھا۔ کواڑ اتنے دبیز تھے کہ ان کے ساتھ کسی طرح کی زور آزمائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ روشن دان تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس لیے کہ کمرے میں اس تخت کے سوا جس پر میں براجمان تھا، کچھ اور تھا ہی نہیں۔ غرض کہ فرار کی ساری راہیں مسدود تھیں۔ یہ کمرہ میرے لیے واقعی بازداشت گاہ بن گیا تھا۔ لیکن صبح سے اب تک کوئی تفتیش، کوئی سوال جواب، کسی قسم کی پوچھ گچھ شروع نہیں ہوئی تھی۔ آخر مجھے یہاں کیوں قید کیا گیا ہے؟ میں نے خود سے پوچھا۔ یہ کس کے حکم پر ہوا ہوگا؟ بڑے ملک صاحب کے حکم پر یا چھوٹے ملک صاحب کے حکم پر؟ ویسے اگر وہ مجھے کوئی سبق دینا چاہتے تھے تو اس کے لیے مجھے یہاں بلانے اور یوں قید کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کام تو وہ خود میرے اڈے پر یا میرے اپنے گھر کے دروازے پر بھی کروا سکتے تھے یا شہر کی کسی بھی گلی میں یا سڑک پر بھی۔ اس لیے کہ ان کے سامنے میری حیثیت ہی کیا تھی؟ میں تو ان سے کسی طرح ٹکر نہیں لے سکتا تھا۔ ملکوں کی طاقت سے شہر میں کون واقف نہیں تھا اور کس میں یہ ہمت تھی کہ ان کی کسی کارروائی کے خلاف اور میری حمایت میں بولتا۔ ملتان کے باسیوں نے ان کی بہادری کے کئی تماشے دیکھ رکھے تھے۔ ٹھکوں[۹] سے جب ان کا جھگڑا ہوا تھا تو لڑنے کے لیے ملک فیاض صاحب کا بڑا بیٹا اکیلا گیا تھا۔ اکیلا تو نہیں تھا، دس بارہ مزارعے اس کے پیچھے تھے، ہاں گھر کا کوئی آدمی ساتھ نہیں تھا۔ وہ اور اس کے مزارعے ٹھکوں کے گھروں میں گھس کر ان کی عورتوں کے سامنے مردوں کے ہاتھ پاؤں توڑ کر آئے تھے۔ اسی طرح جب ان کی لڑائی رانا برادران سے ہوئی تھی تو بھی چھوٹے ملک صاحب اپنے بندوں کے ساتھ ان کے علاقوں میں اکیلے گئے تھے اور وہیں انھیں مار کے آئے تھے۔ تین بندے انھوں نے موقعے پر مارے تھے لیکن کسی بھی واقعے کے بعد ان کے خلاف کہیں کوئی پرچہ کٹا تھا اور نہ ہی وارنٹ جاری ہوئے تھے۔ تو میری ان کے سامنے کیا حیثیت تھی... جیسے ایک چیونٹی بلکہ چیونٹی سے بھی کم۔ اگر وہ مجھے ٹھکانے لگانا چاہتے یا سبق پڑھانا چاہتے تو اس کے لیے حویلی بلانے اور قید میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ انھی سوالوں سے الجھتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی۔

دروازے کی چرچراہٹ سے میری نیند ٹوٹی تھی۔ شبو کھانے کی چنگیری لیے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ اسے رکھ کر اس نے پہلی چنگیری اٹھائی تو اس میں دال روٹی کو جوں کا توں دیکھ کر اس نے مجھ پر سوالیہ نظر ڈالی لیکن منھ سے کچھ نہیں بولی۔ میں سمجھ گیا کہ کیا پوچھنا چاہتی ہے، اس لیے خود ہی جواب دیا، ''دل نہیں چاہا میرا کھانا کھانے کو۔'' وہ کچھ نہ بولی اور خاموشی سے واپس مڑ گئی۔

''شبو!'' میں نے اسے جاتا دیکھ کر پکارا۔

وہ رک گئی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے قریب آنے کو کہا۔

وہ چند قدم آگے آ گئی۔ میں بھی تخت سے اٹھ کر اس کے قریب گیا، ''ایک بات پوچھنی ہے۔''

اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''بی بی ہنزریں ٹھیک ہیں؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مجھے یہاں کس کے حکم پر بند کیا گیا ہے؟''

اس نے دھیرے سے شی ی ی کیا، ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ

رہنے کو کہا اور واپس مڑ گئی۔

"مجھے پیشاب لگا ہے زور کا۔" میں نے اسے جاتا دیکھ کر کہا۔

اس نے ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور باہر نکل گئی۔ میں نے جا کر کھانے کی جو چنگیری وہ لائی تھی، اٹھا لی۔ اب بھی دو روٹیاں اور سبزی کا سالن آیا تھا۔ دونوں چیزیں گرم تھیں۔ بھوک ایک بار پھر چمک اٹھی۔ میں چنگیری لیے واپس تخت پر آ کے بیٹھا ہی تھا کہ دروازہ پھر چرچراہٹ اور گڑگڑاہٹ کی ملی جلی آوازوں کے ساتھ کھلا۔ اس بار وہی آدمی اندر آیا جو مجھے یہاں بلا کر لایا تھا، بولا، "پیشاب لگا ہے تم کو، آؤ کرلو۔"

میں اس کے ساتھ کمرے سے باہر آیا تو برآمدے میں دائیں طرف دو کمرے چھوڑ کر اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا اور بولا، "بڑا پیشاب لگا ہو تو اس سے بھی فارغ ہو جانا۔ اب میں صبح ہی آؤں گا۔"

میں نے ہنس کر اس کی طرف دیکھا اور سر ہلاتا ہوا اندر چلا گیا۔ اندر جا کر میں نے غور کرنا شروع کیا کہ یہ حویلی کا کون سا حصہ ہے؟ مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔ میں اس طرف پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ باہر آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ میں اطراف کا جائزہ لوں اور پتہ دیکھنے کی کوشش کروں کہ یہاں سے فرار کی کوئی راہ نکلتی ہے کہ نہیں۔ میں دیر تک اندر بیٹھا ہوا حویلی کے نقشے اور باہر جانے والے راستوں کو ذہن میں دہرانے کی کوشش کرتا رہا لیکن یہ بات طے ہو گئی کہ میں فی الحال جس جگہ ہوں وہاں سے خود نہیں نکل سکتا، اس لیے کہ مجھے راستہ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ باہر نکلا تو وہ آدمی بالکل دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑا ہوا نظر آیا جیسے اندر سے کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ میری آہٹ پر وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا اور بولا، "بہت دیر لگا دی تم نے۔"

"ہاں، تم نے ہی تو کہا تھا کہ اب صبح آؤ گے۔ میں نے سوچا فارغ ہو کر..."

"ہشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ یہاں سے بھاگنے کا کوئی رستہ تمھیں نہیں ملے گا۔ کتے بھی ہیں اور چوکی دار بھی، دونوں سے بچ کر نہیں نکل سکتے تم۔"

"پر میں بھاگنے کی کوشش کیوں کروں گا، پاگل ہوں میں؟" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا جیسے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ پھر میں نے ذرا رازدارانہ انداز میں اس سے پوچھا، "مجھے یہاں کس نے بلوایا ہے اور کیوں بلوایا ہے؟"

اس نے مجھے ٹیڑھی نظروں سے دیکھا اور بازو پکڑ کر مجھے کمرے کے اندر دھکیلتا ہوا بولا، "پتہ لگ جائے گا۔" اس کے بعد اس نے کھینچ کر کواڑ بند کیے اور زنجیری کھٹکا ڈال دیا۔

میں نے سوچا کھانا کھا لیتا ہوں ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ ابھی چار چھ لقمے ہی کھائے ہوں گے کہ دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ ایک لمبا تڑنگا آدمی اندر داخل ہوا اور ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا میرے سامنے آ بیٹھا۔ بڑی بڑی اور موٹی مونچھیں اس کے چہرے کی کرختگی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ میں نے اطمینان سے اپنا کھانا جاری رکھا۔ وہ چند لمحے خاموش بیٹھا مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے ایک بار مسکرا کر اسے دوستی کا تاثر دیا مگر اس کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔

"کیوں پھیرے لگاتا ہے حویلی کے؟" اس نے اپنی باریک چبھتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ آواز اس کے جثے کے بالکل برخلاف اور غیر متاثر کن تھی۔ یوں لگا جیسے کوئی چودہ پندرہ سال کا لڑکا بول رہا ہے۔ میں نے ہنسی کو روکتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا، "کام ہوتا ہے تو آتا ہوں۔ ویسے کوئی شوق تھوڑی ہے مجھے یہاں آنے کا۔"

"ہر دیہاڑی کم پیندے تیں کوں؟ ماں بیٹھی ہے اتھاں تیری؟ (۱۰)"

اس نے کڑک کر کہا۔

میں سمجھ گیا کہ کارروائی شروع ہو چکی ہے لیکن کسی قسم کے خوف کا تاثر دیے بغیر میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا، "کام سے آتا ہوں جب بھی آتا ہوں میں یہاں... اور ماں تک نہ پہنچ... میری نہیں تیری ماں بیٹھی ہے یہاں۔"

میں نے یہ جملہ ابھی پورا ہی کیا تھا کہ ایک زوردار جھاپڑ پڑا۔ یہ حملہ قطعی غیر متوقع تھا۔ میں چونکہ بالکل تیار نہیں تھا، اس لیے غفلت میں ضرب بھی کاری لگی۔ جھاپڑ آدھا منہ پر پڑا تھا اور آدھا کنپٹی پر جو بری طرح سنسنا رہی تھی۔ میں نے سنبھلنے میں چند لمحے لگائے اور سنبھلتے ہی سبزی کی پلیٹ اٹھا کر پوری قوت سے سامنے بیٹھے ہاتھی کے منہ پر جما دی۔ جھاپڑ کی قوت نے مجھے اچھی طرح بتا دیا تھا کہ اس وقت میرا واسطہ واقعی ہاتھی سے پڑا ہے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ لڑائی میں جو پہلے دبا لے اور دھاک بٹھا دے، وہی پالا مارتا ہے، اور یہ کہ دھاک بٹھانے کے لیے قوت اتنی اہم نہیں ہوتی جتنی اہم جرأت ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہاتھی طاقت میں مجھ سے بہت زیادہ ہے، پسپائی قبول کرنے کی بجائے جارحانہ جواب دیا تھا۔ میرا جواب بھی ہاتھی کی توقع کے بالکل خلاف تھا اور سالن کی پلیٹ اس کے منہ پر اس طرح پڑی تھی کہ آنکھوں میں مرچیں بھر گئیں۔ اس نے پہلے ہاتھ سے منہ پر لگنے والا سالن صاف کیا، اس کے بعد آگے سے قمیص کا دامن اٹھا کر آنکھیں اس سے رگڑیں۔ کئی بار یہ عمل دہرانے کے بعد اس کی آنکھیں کھلنے کے قابل ہوئیں۔ میں چاہتا تو غفلت کے اس وقفے میں اس کی اور ٹھکائی کر سکتا تھا لیکن مجھے یہ پتا تھا کہ میں یہاں لڑ کر جیت نہیں سکتا۔ ایک آدھ آدمی مار کھا کر چلا گیا تو اس کے بعد کئی آدمی میری درگت بنانے کے لیے آ جائیں گے۔ یوں بھی اس وقت میں ہاتھی کو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ مجھے کمزور اور مجبور نہ سمجھے بلکہ اسے جو بات کرنی ہے آرام سے کرے۔ میں خود بھی اس کی باتوں سے صورت حال کی سنگینی کو سمجھنا چاہتا تھا۔ اس لیے جب تک وہ اپنا منہ پونچھ کر صاف کرتا رہا، میں تماشا دیکھتا رہا۔ بظاہر تو میں بہت آرام سے بیٹھا تھا لیکن اس کے جوابی حملے کے لیے پوری طرح چوکس تھا۔ ہاتھی نے کئی بار آنکھیں پٹپٹائیں اور اپنی باریک آواز میں چلایا، "حرامی پلے! دکھیاں بھن چھڑیساں میں تیری۔ (۱۱)" اس نے میری طرف ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن آنکھوں میں مرچیں لگ رہی تھیں، وہ پھر انھیں صاف کرنے لگا۔

"ہتھ میرے ہی بدھے کوئی نہیں۔ بتھاڑ تیرا ئی نہ سلامت رہسی۔ میں ای تیں کوں پہلے ڈیہناں کھڑاں۔ اونوے توں کوئی گال کرنی اے تے بندے دا پتر بنڑ کے کر۔ (۱۲)"

آنکھیں پونچھتے ہوئے ہاتھی بڑبڑایا۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں اس کی اس کیفیت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ بس اسی میں میری نگاہ چوک گئی اور اگلے ہی لمحے وہ اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ میرے اوپر تھا۔ میں اس طرح سے گرا تھا کہ صرف گردن اور ایک بازو باہر تھا، باقی سارا جسم اس کے نیچے تھا۔ میں نے سنبھلنے اور اس کے نیچے سے نکلنے کی پوری کوشش کی لیکن اس کے ہاتھ کا وزن اور شکنجہ دونوں نے مجھے بری طرح دبوچ کیا تھا۔ میرے سینے پر اتنا وزن تھا کہ سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ میں نے کسمسا کر بل کھانے کی کوشش کی تو ہاتھ کا شکنجہ سخت ہو گیا اور ساتھ ہی میری پسلیوں میں تابڑ توڑ کئی زوردار گھونسے پڑے۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا اور ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے۔ ہاتھی نے شاید میری متغیر ہوتی ہوئی حالت کو محسوس کیا اور گرفت ڈھیلی کر دی۔ اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ بس وہی لمحہ تھا جب میں نے اپنے حواس قائم کیے اور قوتوں کو مجتمع کرتے ہوئے ہاتھی کے منہ پر ٹکر اور گردن پر گھونسا رسید کیا۔ ہاتھی کی گرفت ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے دونوں ٹانگیں پوری قوت سے سمیٹیں، ہاتھی ایک لمحے کے لیے میرے گھٹنے پر جھولا اور دھڑام سے چوکی سے نیچے سیمنٹ کے فرش پر جا پڑا۔ اس کے منہ سے چیخ نما کراہ نکلی۔ میں تخت پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہاتھی اب میرے سامنے زمین پر چت پڑا ہانپ رہا تھا۔ حالت میری بھی اچھی نہیں تھی، جسم بالکل نڈھال ہو گیا تھا۔ ٹکر مارنے کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے بار بار تارے ناچ رہے تھے اور سر مسلسل گھوم رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گول گھومنے والے جھولے میں بیٹھا ہوں۔ لیکن اب میں کسی غفلت کے بغیر نظریں ہاتھی پر مرکوز رکھنا چاہتا تھا تاکہ اس کے اگلے حملے سے خود کو بچا سکوں۔ ہاتھی تخت کا سہارا لے کر بمشکل اٹھ کر بیٹھا۔ کئی بار آنکھیں ملیں اور سر جھٹکایا، گردن پر جس جگہ میرا گھونسا پڑا تھا، اسے دبا کر گردن دائیں بائیں گھمائی پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"میں تیکوں ڈس ڈیناں..." وہ رک کر بولا، "چنگی نہ تھیسی تیرے نال۔" (۱۳)

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کراہتے ہوئے اٹھا، ایک لمحے کے لیے سیدھا کھڑا ہوا۔ میں اس کے کسی بھی ممکنہ حملے سے بچنے کے لیے پوری طرح چوکس تھا، لیکن وہ الٹا گھوما اور پورے دنوں کی حاملہ عورت کی طرح ٹانگیں چوڑی کر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے کمرے سے باہر جانے کے بعد میں اب اپنی طرف متوجہ تھا۔ پسلیوں میں سخت دکھن تھی، سر گھوم رہا تھا اور تھکن کی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ جسم خود بخود ڈھیر ہو رہا تھا۔ میں تخت پر دراز ہو گیا۔ مجھے نہیں اندازہ کہ کب تک میں اس کیفیت میں رہا اور کب غنودگی مجھ پر سوار ہو گئی۔

چرخ چوں کی آواز میں نے سنی تھی اور اٹھنا چاہا تھا لیکن جسم اس بری طرح دکھ رہا تھا کہ ہلنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ دروازہ کھلا۔ میں نے دیکھا کہ شبو اندر داخل ہوئی ہے۔ پہلے وہ کھانے کے برتن وہیں دروازے کے قریب رکھ کر جانے لگی لیکن جب اس نے دیکھا کہ میں اس کے آنے پر ہلا جلا بھی نہیں ہوں تو وہ رک گئی۔ اس نے مجھے دور سے دیکھا جیسے میرے بولنے، کچھ کہنے کا انتظار کر رہی ہو۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھی اور تخت کے قریب آ گئی۔ شبو کے پیچھے دروازے سے دھوپ کی موٹی لکیر اندر تک کھنچ آئی تھی۔ اس کا مطلب ہے صبح ہو گئی ہے، میں نے سوچا قریب آ کر شبو نے پہلے میری طرف دیکھا اور پھر نیچے فرش کی جانب۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا دیکھ کر حیران ہو رہی ہے لیکن جب میری نگاہ فرش پر گئی تو میں نے اس سے کہا: "یہ سب اس ہاتھی کی کارستانی ہے، جو رات کو کمرے میں آیا تھا۔"

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"مجھے اس کا نام نہیں پتہ لیکن وہ ہاتھی کی طرح پلا ہوا ہے اور ہاتھی کی طرح جھولتے ہوئے چلتا ہے۔" میں نے اسے بتانے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے بدستور سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"نام تو مجھے... میں نے اسے پہلی بار دیکھا ہے... ہاں آواز اس کی بالکل بچوں جیسی ہے۔" میں نے شبو کو سمجھانے کی کوشش کی۔

اس فقرے پر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی: "وساپا ہے اوندھا نا، او آیا ہئی؟" (۱۴)

میں نے سر ہلایا۔

"پراے بھانڈ فرش تے کینے سٹے ہن؟" (۱۵)

"میں اور وہ لڑے تھے۔ جب وہ آیا تو میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے آتے ہی بدتمیزی شروع کر دی اور لڑائی ہو گئی، لڑائی میں برتن نیچے گر گئے۔"

شبو زمین سے برتن اور روٹی کے ٹکڑے سمیٹتے ہوئے بولی: "تے ول اینداے مطلب ہے توں رات دی ٹکر کوئی نی کھادا۔" (۱۶)

"بس تھوڑا سا کھایا تھا، پھر وہ آ گیا۔"

"ول تیکوں تے بڑی بھک لگی ہوسی۔" (۱۷)

"نہیں، بہت زیادہ نہیں ہے۔"

دروازے کے پاس جو ناشتہ اس نے ابھی لا کر رکھا تھا وہ جا کر اٹھا لائی۔ میں کہنی ٹکا کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جسم جیسے بالکل ناکارہ تھا، ہمت ہی نہیں بندھ رہی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر سہارا دیا۔ جب میں اٹھ کر بیٹھ گیا تو اس نے پہلے میرا ماتھا چھوا، پھر گردن پر ہاتھ لگاتے ہوئے بولی: "ہاہ شہدا... تیکوں تے تپ چڑھی کھڑی ہے۔ پنڈا ای پیڑاں مریندا ہوسی۔" (۱۸)

"ہاں، جسم بہت دکھ رہا ہے۔"

"توں ناشتہ کر، تے میں کئی دوائی چا آواں۔" (۱۹) وہ تیز تیز چلتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ کواڑ چرچراہٹ کے ساتھ بند ہوا۔ دھوپ کی لکیر بھی باہر نکل گئی۔ میں نے ناشتے کی ٹرے قریب کی۔ وہی رات والی سبزی پلیٹ میں تھی، ساتھ میں روٹیاں اور ایک بڑے سے مگ میں چائے تھی۔ کھانے کی خواہش بالکل نہیں ہو رہی تھی لیکن یہ سوچ کر کہ میں نے چوبیس گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا ہے، یک بیک مجھے نقاہت محسوس ہونے لگی۔ دو چار نوالے سبزی سے بمشکل حلق سے اتارے اور دو چار نوالے چائے کے ساتھ نگلے۔ بس طبیعت بھر گئی۔ میں چائے پی رہا تھا کہ دروازہ پھر کھلا شبو دوا لیے ہوئے آئی۔

"اے گولیاں کھا کمن، بخار لہہ ویسی۔"[20] اس نے دوا دیتے ہوئے کہا۔

میں نے وہ گولیاں چائے سے ہی نگل لیں۔ جسم بالکل نڈھال تھا، میں پھر لیٹ گیا۔ شبو برتن سمیٹ کر جاتے ہوئے پھر میرے پاس رکی، ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار دیکھا پھر منہ ہی منہ میں کچھ کہتی ہوئی نکل گئی۔ مجھے تھوڑی دیر میں نیند آ گئی۔

دروازہ ایک بار پھر شور کرتے ہوئے کھلا۔ میں نے لیٹے لیٹے دیکھا، ایک آدمی اندر داخل ہوا اور کواڑ بھیڑ کر بڑے بڑے قدم اٹھاتا میرے پاس آیا۔ میری پسلیوں میں کوئی چیز چبھی تو میں نے غور کیا کہ اس کے ہاتھ میں چھڑی ہے۔ میرے منہ سے کراہ نکل گئی۔

"ہاں ہاں ہاں ہاں۔ کیا ہوں گیاں ہئیں سورماں کو سوہنیاں؟" وہ ناک میں بول رہا تھا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے پھر پسلیوں میں چھڑی چبھوئی اور بولا، "ابھی بولتیں کیوں بند ہو گئیں ہیں؟ چھینٹی تو بڑی لگائیں ہیں توں نیس ہماریں بندیں کیں۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور آرام سے جواب دیا، "پہل اس نے کی تھی۔ آرام سے بات کرتا تو میں بھی آرام سے رہتا۔"

"کیوں، کیاں کیاں تھاں اس نے؟ تیری سجھن[21] میں ہاتھ ڈالاں تھاں؟" اس نے چھڑی میری گھٹنے پر ماری۔

میں جانتا تھا کہ اس وقت لڑائی میرے بس کا روگ نہیں ہے، اس لیے پی گیا اور کوئی جواب نہ دیا۔

"اوئے رانجھاں بنڑنیں کا بوہت شوق ہیں تیرے کوں۔ بڑے اشک مشک کے چکر چلائیں ہویں ہیں توں نیں۔ ہیں... کیوں؟" اس نے چھڑی میری کاندھے پر بجائی۔

میں اس بار بھی چپ رہا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اس نے چھڑی سے میری ٹھوڑی اٹھائی اور بولا، "ہاں، کیوں بولتاں کیوں نیں؟ ساریں سورمائی واپس ڈھوئی[22] میں چلیں گئیں ہیں کیاں؟ ویسے تو توں خود ابھی تا کر اشک کے کامل ہیں... ہیں کیاں خیال ہیں؟"

بس اب بات میری برداشت سے باہر ہو گئی۔ میں نے ٹھوڑی کے نیچے لگی چھڑی کو پکڑ کر جھٹکا دیا، وہ میرے ہاتھ میں آ گئی۔ وہ سالا حرامی گنگنا کونگلو شاید اس ردعمل کے لئے تیار نہیں تھا۔ ایک پل کے لیے اس نے مجھے ٹکٹک کر دیکھا۔ میرا لڑائی کا کوئی ارادہ نہیں تھا، اس لے آرام سے بیٹھا رہا۔ اس نے مجھے بڑ تالا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور پھر ایک دم مجھ پر پل پڑا۔ گھونسے میری پسلیوں اور پیٹ میں بری طرح پڑ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا اور بچاؤ کی کوئی تدبیر کرتا، ایک زوردار لات میری ٹانگوں کے بیچ پڑی۔ آنکھوں کے آگے ایک دم درجنوں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ سر پنکھے کی طرح گردش کرنے لگا۔ پیٹ میں ایک گولا سا گھوما اور تیزی سے حلق کی طرف بڑھا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔

آنکھ کھلی تو میرے منہ میں کچھ ٹپکایا جا رہا تھا۔ یہ نمک ملا ترش سا کوئی شربت تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دائیں بائیں دیکھا۔ میرا سر ایک بوڑھی عورت کی گود میں تھا، دائیں ہاتھ پر شبو کھڑی تھی۔

"خیر اے، خیر اے... سب خیر اے پریشان نہ تھی۔" بوڑھی عورت نے میرے ماتھے پر ہاتھ پھیرا، سر سہلایا اور بولی، "تھوڑا جیہاں پی گھن، چنگا رہسی۔"[23] اور میرا سر ذرا سا اٹھا کر ایک پیالہ میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ذائقہ برا نہیں تھا۔ میں نے دو تین چھوٹے چھوٹے سے گھونٹ لیے۔ بڑھیا نے پیالہ شبو کو دیتے ہوئے کہا، "ویگوی چاڑے۔"[24] شبو نے سرھانے کی طرف رکھی پتیلی اس کی جانب بڑھا دی۔ بڑھیا نے اس میں سے نیم گرم گیلا کپڑا نکال کر میرے منہ پر کئی بار پھیرا۔ کپڑے میں سے لیموں اور سونف کی ملی جلی سی خوشبو آ رہی تھی۔ منہ اچھی طرح صاف کرنے کے بعد بڑھیا نے وہی کپڑا میری گردن پر پھیرا۔ اس کے بعد اس نے میری دونوں کنپٹیاں سہلائیں، سر میں انگلیاں پھیریں پھر ہنس کر میری طرف دیکھا اور بولی، "ہن کیا حال اے... چنگا ہیں وے؟"[25]

میں نے سر کے اشارے سے ہاں کہی۔

بڑھیا نے شبو کی طرف دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا اور مجھے آگے سرکاتے ہوئے، اٹھ کھڑی ہوئی۔ پتیلی اور شربت والا پیالہ لے کر وہ دروازے کی طرف چل دی۔ شبو اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ دروازے کے پاس جا کر بڑھیا نے شبو سے کچھ بات کی اور باہر چلی گئی۔ شبو واپس میرے پاس آئی۔

"بورا پنڈا اپڑا اپڑ ہوی تیرا، ہیں ناں؟ کینے اکھے تیں کوں، ہر کئی نال لڑی آ؟"[26] اس نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

اس کے لہجے میں اتنی نرمی اور محبت تھی یا میرے اندر بیماری اور بے بسی کا احساس تھا کہ میرا دل بھر آیا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تخت پر میرے پاس ہی بیٹھ گئی اور دوسرے ہاتھ سے میرے کاندھے اور بازو دبانے لگی۔ پھر اس نے آہستگی سے ہاتھ میرے ہاتھ کے نیچے سے نکالا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر میرا جسم دبانے لگی۔ دبانے سے مجھے سکون محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی گرمی دھیرے دھیرے مساموں میں داخل ہو رہی تھی۔ مجھے اس سے پہلے کبھی عورت کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ ہمارے اڈے کے دولڑکے ہیرا منڈی جاتے رہتے تھے۔ انھوں نے مجھے کئی بار ساتھ چلنے کی دعوت بھی دی مگر کبھی ان کے ساتھ جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اڈے پر بھی کوئی نہ کوئی خراب عورت آجایا کرتی تھی لیکن سب جانتے تھے کہ مجھے یہ لت لگی ہوئی نہیں ہے۔ شرافت کی بات نہیں تھی، بس کبھی اس خواہش نے ایسا زور ہی نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے بچپن ہی سے ماں ایک بات کہا کرتی تھی، "تو بڑا بھائی ہے، جو تو کرے گا وہی تیرے سارے بہن بھائی کریں گے۔ تو اچھا کرے گا تو یہ بھی اچھا کریں گے اور برا کرے گا تو یہ بھی برا کریں گے۔" پھر وہ میرا بازو تھام کر ذرا سا مسکراتی اور کہتی،

"ہیں لال سن رہا ہے نہ تو... بڑے بھائی نے ڈالا پاؤں، سارے نکلے اس کے داؤں۔" بچپن ہی سے یہ بات میرے کانوں میں پڑ رہی تھی اور نفسیاتی طور پر اس طرح میرے اندر اتر گئی تھی کہ کسی الٹے سیدھے کام کی طرف میرے قدم اٹھتے ہی نہیں تھے۔ لیکن اس وقت جب شبو میرا جسم دبا رہی تھی تو ایک گدگداتی ہوئی گرمی میری رگ رگ میں سرسرانے لگی اور جی چاہا وہ دیر تک یوں ہی دباتی رہے۔ اس کے ہاتھوں نے میرے بدن کی جیسے ساری دکھن نچوڑ لی تھی۔ مجھ پر ایک سرور کی کیفیت طاری تھی۔ اس کیفیت میں، میں نے شبو کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔

"تو بہت اچھی ہے شبو۔"

شبو کے ہاتھ جہاں تھے گھڑی بھر کے لیے وہیں رک گئے۔ اس نے حیرت چھلکاتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

"ہیں شبو... تو بہت اچھی ہے۔" میں نے اپنے سینے پر دھرا ہوا اس کا ہاتھ سہلایا۔ شبو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میری طرف دیکھتی اور پل بھر میں نظریں ہٹا لیتی۔ میں آنکھیں موند لیتا تھا لیکن جیسے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ شبو کی ہتھیلیوں کی گرمی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"شادی ہوگئی ہے تیری؟" میں نے پوچھا۔

"اوں ہوں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں نہیں ہوئی؟"

شبو چپ رہی۔

میں نے پھر پوچھا، "ہیں کیوں نہیں ہوئی؟" میری آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جو تپے ہوئے تانبے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

"میں کوں کیا پتہ؟"(۲۷)

"تو پھر کس کو پتہ ہوگا؟"

"اے کو پتہ ہوسی یا ول بی بی جی ہتریں کو پتا ہوسی۔"(۲۸)

اس نے کسمسا کر میرے سینے پر سے اپنا ہاتھ کھینچا۔ اتنے میں دروازے کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ شبو کو جیسے کرنٹ لگا۔ اس نے سرعت کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے مجھے دوسری طرف کروٹ کر دی اور خود ایک دم تخت سے نیچے اتر گئی اور سرہانے کی طرف آ کر میرا سر دبانے لگی۔ دروازہ کھلا۔ میرے کان اسی طرف لگے ہوئے تھے۔ دو آدمیوں کے چلنے کی آواز تھی جو آپس میں کچھ کھسر پھسر کرتے آ رہے تھے۔ قریب آ کر ایک نے شبو سے پوچھا،(۲۹) "سیم اپے؟"(۳۰)

"ہا... دیری تھی گئی اے سم اپے۔"

"چل توں ونج... آؤ سئیں مہمان نال گال کروں۔"(۳۱)

میں آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ شبو کے باہر جانے اور پھر دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ آنے والے چپ چاپ کھڑے تھے۔ میں انتظار میں تھا کہ وہ مجھے کب اور کس انداز میں جگاتے ہیں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پانی کا جگ جو سرہانے کی طرف رکھا ہوا تھا، میرے سر پر انڈیل دیا گیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"اٹھو سرکاراں، اٹھو... ذری یہہ تھیوو۔"(۳۲) گورے رنگ اور ناٹے قد کے آدمی نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کا ساتھی جو اس کے برعکس پکے رنگ اور نکلتے قد کا تھا، وہ بھی ہنس رہا تھا۔ جگ میں پانی خاصا تھا۔ میرا اوپر کا دھڑ تقریباً سارا ہی بھیگ گیا۔ میں نے غصے کو ضبط کیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"سئیں فکر آلی گال کوئی نی۔ تھوڑی دیر تو توں آپی سک وے سی۔" ناٹے آدمی نے مسخرے پن سے کہا اور اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر مسکرایا پھر بولا، "بے کئی پریشانی ہیوے تے سا کوں آکھو، اساں چولا لہا کے سکا ڈیندے آں۔" اس نے گریبان کے پاس سے میری قمیص پکڑ کر کہا، پھر اپنے ساتھی کو دیکھ کر دیدے مٹکائے اور بولا، "آکھو تے تساں ہی لہا ڈیندے آں جے اوای گل تھی گئی اے تاں۔"(۳۳)

میں نے منہ سے کوئی جواب نہ دیا البتہ اس نے میری قمیص جو پکڑی ہوئی تھی، اسے جھٹکے سے چھڑا لیا۔

"ارام ارام مولا ارام۔ نہ سوہنا نہ... ایویں نہ... اساں لڑائی بھڑائی آستے کونی آئے۔ پرایوں نے لڑائی تھی دے سی۔"(۳۴) اس نے میرا داہنا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا۔ میں نے پھر کوئی جواب نہ دیا لیکن ہاتھ جھٹک کر اس کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔

"اچھا بئی اچھا... شاوا۔" وہ جھنجھلا کر میری طرف بڑھا۔

اس کے ساتھی نے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا، "اوئے زوبے! خوامخواہ بات نہ بڑھا، جو بات کرنے آئے ہیں، وہ کر اور چل۔ ٹیم نہ خراب کر۔"

زوبا رک گیا۔ اس نے تیز نظروں سے ساتھی کی طرف دیکھا اور بولا، "ہاں تو پھر پوچھ لے، تو نے جو کچھ پوچھنا ہے۔"

"ہاں بھئی منیجر بابو! جو میں پوچھتا ہوں، صاف صاف بتاتے جاؤ تاکہ ہم جلدی نمٹ جائیں۔" لمبا آدمی مجھ سے مخاطب ہوا، میں نے اس کی طرف دیکھا اور خاموش رہا۔

"بھئی تمہارا چکر کتنے دنوں سے چل رہا ہے بی بی جی کے ساتھ؟"

"میرا کوئی چکر نہیں چل رہا بی بی جی کے ساتھ۔"

"دیکھو، میں نے تم سے کہا ہے کہ سیدھے سیدھے جواب دو، میں جو بھی پوچھوں۔ گھما پھرا کر باتیں کرو گے تو ٹیم خراب ہوگا تمہارا بھی اور ہمارا بھی۔" لمبے نے شہادت کی انگلی نچاتے ہوئے کہا۔

"میں سیدھا جواب ہی دے رہا ہوں۔"

"اویار! یہ تو ساری دنیا جانتی ہے کہ تمہارا ٹانکا بھڑا ہوا ہے بی بی جی کے ساتھ۔ تم ہمیں چل دے رہے ہو، کہتے ہو کوئی چکر..."

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیز آواز میں جواب دیا، "میں نے کہا نہ کہ کوئی چکر وکر نہیں ہے۔ دنیا کیا جانتی ہے اور کیسے جانتی ہے مجھے کیا پتہ۔"

"دیکھو باؤ! ایویں گرمی کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تمہارے پاس تمہارے فیدے کی بات کرنے آئے ہیں۔ مان جاؤ گے تو فیدے میں رہو گے۔ نہیں مانو گے تو اتنی بات یاد رکھنا، تمہیں حویلی میں آتے ہوئے کسی نے نہیں

دیکھا، کسی کو خبر بھی نہیں ہے کہ تم یہاں بند ہو۔ تمھاری ساری حیاتی اسی کمرے میں بھی گذر سکتی ہے... یا...'' اب وہ دھیمی آواز اور رازدارانہ انداز میں بولا، ''یا پھر باؤ سوہنے! تمھارے ٹوٹے اس حویلی کے کسی کونے کی کچی مٹی میں داب دیے جائیں تو بھی کسی کو کنو کن خبر نہ ہوگی۔''

''ہاں میڈا سوہنا... ایویں تھی سکدے۔'' (۳۵) ناٹے نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

میں یوں بیٹھا رہا جیسے ان دونوں کی بات میں نے سنی ہی نہیں۔

''پر ہم تمھیں ڈرانے دھمکانے نہیں آئے ہیں۔ ناں... ناں یہ بات نہیں ہے۔ ہم تو تمھیں یہ سمجھانے آئے ہیں کہ تم اس چکر وکر سے نکل آؤ۔ اپنی جوانی کو دیکھو، تمھارا باپ بیمار شیمار آدمی ہے، بہن بھائی چھوٹے ہیں۔ ایسے کاموں میں کیوں پڑتے ہو... کیوں دشمنیوں کا منٹا پالتے ہو؟'' لمبے نے ہمدردانہ لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں ایسا کچھ نہیں کر رہا... کہا نہ میں نے۔''

''یار باؤ!'' لمبے نے قریب آ کر آرام سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا، ''دیکھو تم سوچ لو۔ شام تک آرام سے سوچ لو۔ تم یہ شہر چھوڑ کے کہیں اور چلے جاؤ۔ گھر والوں کو لے کر کسی بڑے شہر چلے جاؤ۔ خرچا پانی مل جائے گا... زیادہ مل جائے گا۔ باپ کا علاج کرا لینا۔ ورنہ...'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر بولا، ''میں تو تمھیں سمجھا ہی سکتا ہوں۔ ویسے وسایا اور پیکا دونوں کل واپس آ رہے ہیں۔ تم مل چکے ہو دونوں سے۔ میں تو دوبارہ نہیں آؤں گا۔ اب وئی دونوں آئیں گے تمھیں ملنے کے لیے۔'' اس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ کمرے میں چند لمحے مکمل خاموشی رہی پھر لمبا اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا، ''چلا ہئی زوبے چلیں۔'' وہ دونوں دروازے کی طرف چل دیے۔ دروازہ کھلا مگر لمبا باہر جانے کی بجائے تیز تیز چلتا ہوا واپس میرے پاس آیا اور بولا، ''روپے پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، ابھی مل سکتے ہیں، اسی وقت... یا شام کو... جب کہو۔ میں تو کہتا ہوں لے لو... جان بخشی کراؤ اپنی۔'' اس نے میرا ہاتھ دوستانہ انداز میں دبایا، آنکھ ماری اور چلا گیا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد میرا ذہن ان کی کہی ہوئی باتوں میں الجھ گیا۔ یہ بات میں قید کے ان دنوں میں اچھی طرح جان چکا تھا کہ میرے پاس یہاں سے نکل بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ جب تک یہ لوگ نہ چاہیں۔ میں حویلی تو دور کی بات ہے، اس کمرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ ہاں واقعی میری پوری زندگی اسی کمرے میں گذر سکتی تھی اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ میرے ٹکڑے کر کے حویلی کے کسی کونے میں دبائے جا سکتے تھے جہاں کوئی قیامت تک ان کا سراغ بھی نہ پا سکتا۔ پھر مجھے وہ ہاتھی وسایا اور ناک میں بولنے والا گونگلو یاد آئے۔ ان دونوں سالے حرامیوں نے میری ایسی مرمت کی تھی کہ اب میں ناکارہ جسم لیے اس تخت پر پڑا تھا۔ کیا ملکاں کو میری حالت کا نہیں پتہ؟ اگر پتہ ہے تو وہ مجھے بچانے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی؟ کیا اس کے بس میں کچھ ہے بھی یا نہیں؟ کہیں اس نے خود کو حالات کے دھارے پر تو نہیں چھوڑ دیا؟ کیا میری محبت اس کے لیے کھیل تو نہیں تھی؟ اگر وہ خود بے بس ہے تو میرے لیے کیا کر سکتی ہے؟ میں یہ کس چکر میں پڑ گیا ہوں؟ ریل والی حویلی کا یہ کمرہ جو اس وقت میرا قید خانہ بنا ہوا ہے، کہیں میرے لیے کال کوٹھڑی یا پھر قبر کا گڑھا نہ بن جائے۔ اس کے نام پر ہی تو پڑا ہوں میں اس عقوبت خانے میں، اس نے پلٹ کر میری خبر کیوں نہیں لی... مجھے دوبارہ کوئی چٹھی کیوں نہیں بھیجی؟

بس انھی خیالات کے دوران وہ کمزور لمحہ آیا جب میں نے ایک بار پھر خود سے سوال کیا، کیا واقعی مجھے ملکاں سے عشق ہے؟ اس بار میرے اندر سے فوراً جواب آیا۔ تذبذب... سوچ بچار... غور و فکر کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی جیسے... سیدھا اور صاف جواب آیا فوراً... نہیں مجھے ملکاں سے عشق نہیں ہے۔ میں تو زندگی بنانے کے چکر لگا ہوا ہوں۔ اس گھڑی ایک آن کے لیے خود مجھ پر... ملکاں سے میری بے وفائی کا پہلی بار انکشاف ہوا تھا۔ میں نے اپنے حافظے میں محفوظ ان دنوں کا جائزہ لیا جب ملکاں اور میرے درمیان یہ قصہ شروع ہوا تھا... اس کے بعد کے بھی سارے دنوں کو میں نے یاد کیا۔ میری طرف سے خود اس عشق کا اظہار ایک بار بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ اظہار تو ملکاں نے کیا تھا اور میں تو اس کے بہکاوے میں آ کر اس دریا میں کود گیا تھا۔ میرا اور ملکاں کا بھلا کیا جوڑ...؟ میرا تو حویلی کی کسی ملازمہ سے بھی کوئی جوڑ نہیں بنتا۔ تب مجھے پہلی بار اپنی حماقت کی سنگینی کا شدید احساس ہوا۔ تو اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ یہ جو دو آدمی آئے تھے، انھوں نے جو رقم کی آفر کی ہے، کیا ان سے بات... دماغ عجیب سوالوں کے گرداب میں تھا اور میں ہاں اور نہیں کے درمیان جھول رہا تھا۔ میری چھٹی حس جیسے ایک دم بیدار ہوئی۔ نہیں، ان پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ حویلی والوں کو کیا پڑی ہے کہ وہ مجھے رقم کی آفر کریں۔ ان کی کون سی کمزوری میرے ہاتھ میں ہے جس سے وہ دب جائیں۔ میرا ان کا مقابلہ ہی کیا ہے۔ ان کے سامنے میری حیثیت اس کیڑے مکوڑے سے زیادہ نہیں جسے وہ جب چاہیں مسل کے رکھ دیں۔ نہیں، رقم کی آفر کوئی چال بھی ہو سکتی ہے؟... لیکن وہ میرے ساتھ کوئی چال کیوں چلنے لگے؟ میں تو ان کا قیدی ہوں وہ جو چاہیں میرے ساتھ سلوک کریں۔ لیکن رقم کی یہ آفر... اس طرف سے میں کھٹک گیا۔ چھٹی حس اس آفر کو شک کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن اب میرے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کیسے نکل سکتا ہوں میں اس بازداشت گاہ سے؟ اس سوال کے ساتھ ہی دماغ میں جھپاکا ہوا اور شبو کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ ہاں شبو میرے کام آ سکتی ہے، میں نے سوچا۔

بھوک لگ رہی تھی۔ میں کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن کون سے وقت کا کھانا آئے گا دوپہر کا یا رات کا؟ میں نے غور کیا لیکن کچھ دھیان نہ آیا۔ میری جو ملازمت تھی، اس میں وقت کا کڑا حساب رکھنا پڑتا تھا، کون سی گاڑی کب جائے گی اور کون سی کب آئے گی، فلاں روٹ کی گاڑیوں کا ٹائم ٹیبل یہ ہے اور فلاں روٹ کی گاڑیوں کا یہ ہے۔ صبح اڈہ اتنے بجے شروع ہوگا اور رات کو اتنے بجے بند ہوگا اور رات کو اتنے بجے ختم ہوگا، فلاں لڑکا اتنے بجے آئے گا اور اتنے

بجے جائے گا... یعنی سب کچھ وقت کے حساب سے ہوتا تھا... لیکن اس کمرے میں آکر مجھے پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ کون سا پہر بیت رہا ہے، دن ہے کہ رات؟ میں ملکوں کا قیدی ہوں کہ وقت کا قیدی ہوں؟ میں نے خود سے دریافت کیا؟ نہیں... میں اصل میں تقدیر کا قیدی ہوں۔ اس عقوبت خانے میں مجھے تقدیر نے پہنچایا ہے۔ تو کیا میں خود کو تقدیر کے حوالے کر دوں؟ اب تک کی زندگی میں تو تقدیر اپنا کام کرتی رہی ہے اور میں اپنا کام۔ ہم دونوں کبھی آپس میں نہیں ٹکرائے... بلکہ تقدیر نے میری تدبیر کو تقویت پہنچائی تھی۔ مجھے اب بھی تدبیر کرنی چاہیے۔ اس نتیجے پر پہنچ کر ایک بار پھر مجھے صبح کا واقعہ یاد آ گیا۔ دروازے پر آہٹ سن کر کس طرح اس نے مجھے فوراً کروٹ دی اور خود تیزی سے اتری، سرہانے کی طرف کھڑی ہو کر سر دبانے لگی اور جب انھوں نے پوچھا کہ میں سو رہا ہوں، تو اس نے آرام سے جواب دیا، ہاں دیر سے سو رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے اس کے دل میں میرے لیے جگہ ہے، اسے مجھ سے ہمدردی ہے۔ یہی ہمدردی میرے کام آ سکتی ہے، میں نے سوچا۔ میں اپنے خیالوں میں اس طرح مگن تھا کہ مجھے بالکل اندازہ نہ ہوا کب دروازہ کھلا اور شبو کھانا لے کر آئی۔ اب وہ کھانا دروازے کے پاس رکھ کر نہیں جاتی تھی بلکہ میرے پاس تخت پر لے آتی تھی۔

"حال ڈے... چنگی ہی ہوے طبیعت؟"(۳۶) شبو نے کھانا میرے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہوں۔ بڑی تاثیر ہے شبو تیرے ہاتھوں میں۔" میں نے دیکھا اس کے چہرے پر نسوانی کیفیت کا ایک رنگ سا چمکا، "تو بہت اچھی ہے شبو۔" میں نے سوچا اس موقعے کو ضائع نہ ہونے دوں۔

"چل چل، بہوں کوڑ نہ مار۔"(۳۷)

"نہیں میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ تو واقعی بہت اچھی ہے شبو۔ اگر تو نہ ہوتی تو یہ حرام زادے کتے مجھے مار چکے ہوتے اب تک۔ تیری وجہ سے بچ گیا ہوں میں۔" اس کے چہرے کا رنگ گہرا ہو گیا۔

"بیٹھ جا شبو... یہیں بیٹھ جا میرے قریب۔ ویسے بھی تھوڑا ٹائم رہ گیا ہے میرے پاس؟"

"پر کیوں... اے توں کیا آدھیں؟"(۳۸)

"ہاں غلط نہیں کہہ رہا میں۔ لگتا ہے اب چھوڑیں گے نہیں یہ مجھے۔"

"پر کیوں! اے تا نہ آ کھا گیا ہوسی اتھاں کو۔"(۳۹)

"شبو! ملکاں بی بی کہاں ہے؟ کیا اسے معلوم ہے کہ میرے ساتھ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"ہا... ہا... سب ملوم اے اوں کو۔ پر جیہا(۴۰) ایلے بندہ کہیں نال محبت کریندے تے دل ازمیشاں آندن اوں تے۔"

"محبت... یہ کس محبت کی آزمائشیں ہیں شبو؟" میں نے بہت حیرت سے کہا۔

"ہا... تے کیا میں کوں کئی شے دی خبر کوئی نی؟"(۴۱) اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

"ہاں ہاں... مجھے پتہ ہے کس محبت کی ہیں یہ آزمائشیں؟"

"ہا ہائے... بی بی دے نال ہور کہیں دے نال؟"(۴۲)

"ہیں... ارے توبہ توبہ۔ کیا کہہ رہی ہے شبو؟" میں جیسے حیرت سے اچھل پڑا۔

شبو نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اسے بالکل یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ وہی سن رہی ہے۔

"شبو! تو خود بتا! ملکاں بی بی کا اور میرا بھلا کیا جوڑ؟ میں تو خواب میں بھی ان سے... توبہ توبہ۔ محبت تو اپنے جیسوں سے کرتا ہے آدمی۔ زمین بھلا چاند سے محبت کر سکتی ہے؟ نہیں کر سکتی۔ اس لیے نہیں کر سکتی کہ اسے پتہ ہے، چاند اسے نہیں مل سکتا۔ میں بھی جانتا ہوں کہ... میں تو نوکر ہوں ان کا۔"

شبو ہکا بکا میری شکل دیکھ رہی تھی۔ اسے اس وقت کچھ بھی نہیں آ رہا تھا ہوگا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

"پر... پر... وہ جو..." اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کچھ نہ کہہ سکی۔

"تجھے کس نے کہا ہے کہ میں بی بی سے..."

"خود بی بی بتڑیں۔"(۴۳)

"نہیں... ہرگز نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں نے تو ان سے کچھ اور کہا تھا یہ کہ..."

"تو اتھاں کوں کیا آ کھا ہئی؟"(۴۴)

"تجھے... تجھے... خود نہیں بتایا انھوں نے کچھ بھی۔"

"ناں... پر کیا آ کھا ہئی توں؟"(۴۵)

"اور میرے خدا میں کیا کروں؟ میں تو بے موت مارا جاؤں گا۔ بی بی کے بھائی کچھ اور سمجھ رہے ہیں... اور بی بی کچھ اور سمجھ رہی ہیں... لیکن میں نے تو کچھ اور ہی کہا تھا۔" میں نے شبو کے دونوں ہاتھ تھامے اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، "میں نے تو بی بی سے یہ کہا تھا، مجھے شبو اچھی لگتی ہے۔ میرا اس سے بیاہ کرا دو۔"

"ہیں..." شبو نے کئی بار جلدی جلدی پلکیں جھپکیں، جیسے یقین کر رہی ہو کہ وہ جاگ رہی ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھے اور میں اس کی ہتھیلیوں میں ابھرتی ہوئی نمی کو محسوس کر رہا تھا۔

"ہاں... یہی کہا تھا میں نے۔" میں نے اس کا ہاتھ بھینچا۔ پہلی بار اس کی طرف سے بھی ایسا ہی ہوا، جیسے وہ اثبات میں جواب دے رہی ہو۔

"پر... وہ..." اس نے تذبذب اور الجھن میں کئی بار سر جھٹکا، "کہیں ایس وجہ توں تے تیرے نال... نہ... پر نہ میں بہا کچ نہ تیسوں ڈیساں تیرے نال۔ ہا... توں پریشان نہ تھی۔"(۴۶)

اس نے میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھام کر انھیں بوسہ دیا اور اٹھتے ہوئے بولی، "تم بے فکر ہو کے روٹی کھاؤ، میں پھر آؤں گی۔"

"کیا مطلب... ارے شبو! تم کیا اردو بول لیتی ہو؟" میں واقعی اچنبھے میں تھا۔

"ش...ش...ش...!" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ دھیرے سے مسکرائی، "کہنا نہیں کسی سے، اچھا۔ اور اب تم کسی شے کی پروا نہ کرو۔ کچھ نہیں ہوگا تمھیں۔ میں نکال لوں گی تمھیں یہاں سے۔" اس نے میرا گال تھپتھپایا اور لوٹ گئی۔

میں سمجھ گیا کہ میرا تیر بالکل صحیح جگہ پر شبو کے دل میں پیوست ہوا۔ اس وقت میں عورت کے بارے میں زیادہ تو کچھ نہیں جانتا تھا لیکن اتنا ضرور مجھے پتا تھا کہ عورت محبت اور رقابت کے معاملے میں چٹان کی طرح ہوتی ہے، ریزہ ریزہ ہوسکتی ہے، لیکن اپنی جگہ چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ جوان عورت دماغ سے نہیں دل سے سوچتی ہے اور آنکھوں سے نہیں جذبات سے دیکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک بار وہ کسی رستے پر چل نکلتی ہے تو پھر مرتوں مرجاتی ہے لیکن رستہ نہیں بدلتی۔ بے چاری شبو کے ساتھ بھی اس کہانی میں یہی ہوا تھا۔ میرے سامنے رکھا ہوا کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا مگر میں سکون سے اسے کھانے بیٹھ گیا۔ اس لیے کہ ایک بار پھر میرے اندر زندگی کی وہ لہر دوڑنے لگی تھی جو آدمی کو جینے کا رستہ دکھاتی اور امید بندھاتی ہے۔ کھانا کھا کے میں پھر انھی خیالوں میں منہمک رہا۔ روشن دان کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ گویا یہ رات کا وقت ہے۔ میں تخت پر لیٹا ہوا دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

دروازہ جیسے گھنٹی بجانے والی گھڑی تھا جس کی آواز پر میں صبح اٹھ بیٹھتا۔ اس دن بھی دروازے کی چرچراتی گڑگڑاہٹ پر میری آنکھ کھلی تھی۔ شبو ناشتہ لے کر آئی تھی۔ میں اسے دیکھ کر مسکرایا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا اور دھیرے سے بولی، "نہیں، ابھی نہیں۔"

وہ ہنسی، ناشتے کے برتن میرے سامنے رکھے اور جاتے ہوئے بولی، "پریشان نہ ہونا۔" میں نے بھی مسکرا کے سر ہلایا۔ جب وہ دروازے کے پاس پہنچ گئی تو میں نے بلند آواز میں کہا، "آدمی کو بھیج دو، پیشاب لگا ہے۔" وہ کوئی جواب دیے بغیر کمرے سے نکل گئی اور دروازہ بند ہوگیا لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے پیشاب کے لیے لے جانے والا آدمی دروازے پر نمودار ہوا اور مجھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو صبح کی روشنی بہت بھلی معلوم ہوئی۔ سورج کی کرنوں میں تازگی اور امید کا رنگ تھا۔ وہ مارچ کا مہینہ تھا۔ ملتان کے آسمان پر یہ مہینہ یوں بھی بہار کا لمس لیے ہوئے طلوع ہوتا ہے۔ مجھے سب کچھ اس لیے بھی اچھا لگ رہا تھا کہ سر پہ منڈلاتی موت اور اذیتوں کا خوف یک بیک ختم ہوگیا تھا اور میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ ملکوں کے چنگل سے زندگی بہت جلد مجھے اچک لے جائے گی۔

میں ابھی ناشتہ کر کے بیٹھا ہی تھا کہ وہ کالا ہاتھی جس کا نام وسایا تھا، آگیا۔ اس کے ساتھ وہ ناک میں گھوں گھوں کرنے والا گونگلو بھی تھا۔ دونوں میرے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ دونوں کے چہروں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

"ہا بھئی تے دل ڈسنیں کھل کے یا اساں آپڑی کروائی پاؤں؟" (۴۷) کالے ہاتھی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"یار بھائی میں نے بتایا تو ہے میرا کوئی چکر شکر نہیں ہے۔ میں غریب آدمی ہوں، تم لوگ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ مجھے معاف کر دو بھائی، جانے دو یار۔ میں نے کیا بگاڑا ہے تمھارا؟" میں لڑائی کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس وقت لڑائی کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ میں ان دونوں کو ایک بار پھر اپنی ٹھکائی کا موقع فراہم کر دوں۔

"او یار! تم توں بالکل ماں معصوم آدمی بن گئیں ہوں۔" گونگلو بولا۔

"اویں مظلوم نہ بنڑ۔ سدھی طرا دس، توں بی بی ہنڑیں کوں کھسجاں وے لارے ڈتی آیاں ایں؟" (۴۸)

"نہیں بھائی نہیں، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میں تو ان کا نوکر ہوں، خادم ہوں۔ آنکھیں نہیں اٹھاتا ان کے سامنے۔ میری کیا مجال۔ تم میری بات کا یقین کرو... میری تو ایک جگہ بات بھی ہو چکی ہے، شادی بھی ہونے والی ہے۔"

"بڑی کتی شے ہیں توں۔ دل ای اویں دے چکر چلینداایں۔" (۴۹)

ہاتھی نے ایک زوردار ہاتھ میری گردن پر جمایا۔ میں منھ کے بل زمین پر آرہا، ٹھوڑی زمین پر لگنے کی وجہ سے زبان دانتوں میں آگئی۔ میں نے منھ میں خون کا ذائقہ محسوس کیا۔ ایک لمحے کے لیے کھوپڑی گھومی اور جی چاہا کہ اٹھتے ہوئے بھرپور قسم کی ٹکر ہاتھی کے مثانے پر لگادوں جو اس وقت عین میرے سر کی سیدھ میں تھا۔ ہاتھی اگر اکیلا ہوتا تو شاید میں ایسا کر بھی گزرتا لیکن وہ دو تھے اور کوئی امکان نہیں تھا کہ میں ان دونوں کو پچھاڑ سکوں۔ سو عافیت اسی میں تھی کہ ضبط کروں، اس لیے آرام سے اٹھ کر دوبارہ تخت پر بیٹھ گیا۔

"کیاں بات ہیں، آج تم زاداں ہی مسکین بن رہیں ہوں۔" گونگلو نے چھڑی میری پسلیوں میں گڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سر جھکالیا۔

"ہیں اوئیں بولتیں کیوں بھیں... آج کیا ہواں ہیں تمھیں؟" گونگلو نے اب چھڑی میرے سر پر بجائی۔

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری۔" میں نے سر سہلاتے ہوئے کہا۔

"اوئیں پہلیں کیوں نہیں بتایاں۔ ہم تو یوں طبیت ٹھیک کر دیتیں تمھاریں!" اس نے چٹکی بجائی۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور کسی نے سر اندر کر کے "وسایا!" پکارا۔ دونوں نے اس طرف دیکھا اور کوئی اشارہ پا کر واپس چلے گئے۔ زمین پر گرنے کی وجہ سے میری ٹھوڑی پر بھی چوٹ آئی تھی اور زبان بھی کٹ گئی تھی۔ دونوں جگہ جلن ہو رہی تھی۔ مجھ پر ایک بار پھر مایوسی کی کیفیت عود کر آئی۔ میں نے شبو کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ میری کس طرح مدد کر سکتی ہے۔

دوپہر کے وقت جب شبو کھانا لے کر آئی تو اس نے کھانا رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا، "کھانا تھوڑا کھانا۔ آدھا۔ بس۔ پھر اپنی قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر

پرانا پھٹا ہوا ڈوپٹہ نکال کر میری طرف بڑھایا اور بولی، "یہ سر پہ باندھ لینا اور بس لیٹے رہنا جیسے بیمار ہو، اٹھنے کی ہمت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے، رات کو آؤں گی اب۔"

میرے اندر جینے کی امنگ ایک بار پھر بیدار ہوگئی۔ اس کا مطلب ہے میں بہت جلد یہاں سے نکل جاؤں گا۔ شاید آج ہی رات کو۔ شبو میرے بھاگنے کے بندوبست میں لگ چکی ہے۔ اس خیال سے ہی میرے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کھانا میں نے شبو کی ہدایت کے مطابق آدھے سے بھی کم کھایا، حالانکہ مجھے تیز بھوک لگ رہی تھی مگر میں نے ہاتھ روک لیا۔ اس کے بعد میں نے سر پہ شبو کا دیا ہوا ڈوپٹہ باندھ لیا۔

کھانے کے بعد اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ یہ سوچ کر کہ میں اس قید خانے سے نکلنے والا ہوں، میرے جسم کی کسل مندی دور ہوگئی تھی۔ معاً میں نے روشن دان پر ایک پرچھائیں کو سرسراتے ہوئے دیکھا۔ یہ ضرور ملکاں ہوگی... مجھے خیال آیا۔ لیکن اب میں ملکاں سے دور ہو چکا تھا۔ اس کے لیے میں نے اپنی جان عذاب میں ڈال لی تھی... اور وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اگر واقعی وہ اتنی بے بس ہے تو اس نے مجھے اس عذاب میں کیوں جھونکا؟ اگر اسے واقعی مجھ سے محبت ہے تو اپنے بھائیوں کی اس قید سے مجھے نکال کیوں نہیں لے جاتی۔ کیا اسے نہیں پتا کہ وہ میری جان بھی لے سکتے ہیں؟ اس نے محبت کا کھیل صرف یہ سوچ کر رچایا ہوگا کہ اگر واقعی وہ مجھ سے شادی کرنے میں کامیاب ہوگئی تو کورٹ کچہری کے ذریعے مجھے آگے کر کے بھائیوں سے زمینوں اور جائداد میں حصہ لے لے گی اور نہ ہو سکی تو کوئی بات نہیں، اس کا کیا جائے گا... جان تو میری جائے گی۔ میں نے بالآخر ملکاں اور اس کی محبت کے بارے میں یہی اندازہ لگایا اور یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ تقدیر نے مجھے شبو کی شکل میں یہاں سے نکلنے اور زندگی کی طرف لوٹنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔

پرچھائیں کچھ دیر بعد روشن دان سے ڈھل گئی۔ تھوڑی دیر ٹہل کر میں تخت پر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے کی آواز پر چونکا اور فوراً لیٹ گیا۔ وہی بڑھیا جو پہلے شبو کے ساتھ آئی تھی، اب اس گونگلو کے ساتھ اندر آ رہی تھی۔ قریب آ کر اس نے میرے ماتھے کی پٹی پر ہاتھ رکھا اور پوچھا، "کیا گال اے سر تے پٹی کیوں بدھی ہی وے؟"(۵۰)

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری۔ سر میں بہت درد ہے۔ الٹی بھی آ رہی ہے۔"

بڑھیا نے میرے پپوٹے اٹھا کر آنکھوں میں جھانکا، پیٹ دبا کر دیکھا۔ پھر سر ہلا کر کچھ سوچنے لگی۔ ہاتھ میں دبی ہوئی تھیلی سے اس نے دو چٹکی سفوف لے کر مجھے چٹایا اور گلاس میں ایک گھونٹ پانی انڈیل کر دیا، "اے پی گھن، رب چنگائی کر سی۔"(۵۱) میں نے مشکل سے اٹھ کر وہ پانی پیا اور پھر فوراً ہی لیٹ گیا۔

"نے نیندر آ دے تے چنگا ای وے سم پو۔"(۵۲) بڑھیا نے میرا سر سہلایا اور پھر وہ دونوں چلے گئے۔ اس کے بعد رات تک میرے پاس کوئی نہیں آیا۔ بڑھیا نے مجھے جو سفوف چکھایا تھا اس سے تھوڑی دیر میں بھوک چمک اٹھی تھی لیکن میں نے ضبط سے وقت گزارا۔ رات کو شبو پھر کھانا لے کر آئی تو آرام سے میرے پاس بیٹھ گئی۔

"سب لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ تو بیمار ہے۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، "سر دبا دوں تیرا؟"

میں ہنس دیا، "نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ تمھیں دیکھ کر میری طبیعت ویسے ہی ٹھیک ہو جاتی ہے۔"

"مراد!" شبو ایک دم سنجیدہ ہوگئی، "ایک بات بتا... تو سچ مچ محبت کرتا ہے میرے ساتھ؟"

"شبو! کیا محبت جھوٹی موٹی بھی ہوتی ہے؟"

"نہیں... محبت جھوٹی تو کبھی نہیں ہو سکتی مگر..."

"مگر کیا؟"

"مگر ملکاں بی بی کو یہ بھلیکا کیسے لگ گیا کہ تو اس سے محبت کرتا ہے اور وہ..."

"شبو! تو خود ہی بتا، بھلا میرا اور ملکاں بی بی کا کوئی جوڑ ہے... میں تو یہ بات سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"ہاں یہ تو تو ٹھیک کہتا ہے پر... اچھا خیر، اب تو جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" اس نے سر جھٹکا۔ پھر میری ٹھوڑی پکڑ کر بولی، "اگر تیری خاطر مرنا ہی لکھا ہے قسمت میں، تو مر جائے گی شبو... کوئی بات نہیں۔"

"کیسی بات کرتی ہے تو شبو۔ نہ رہنے دے... میری قسمت میں ہوگا تو میں خود ہی نکل جاؤں گا یہاں سے۔ تو اپنی جان کو مصیبت میں نہ ڈال، رہنے دے۔"

"جب آدمی محبت کرتا ہے تو جان تو مصیبت میں ڈالنی پڑتی ہے۔ تو پریشان نہ ہو سب خیر ہوگی۔"

"شبو کہیں یہ نہ ہو..."

"نہیں، اب آگے کچھ نہ کہہ۔" اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، "سب ٹھیک ہوگا، اطمینان رکھ۔ اچھا اب تو کھانا کھا... لیکن اسی طرح آدھا کھانا آدھا چھوڑ دینا۔ ٹھیک ہے، میں اب چلتی ہوں۔ سونا نہیں، جاگتے رہنا۔ میں رات کو آؤں گی تجھے لینے کے لیے۔"

"کیا مطلب! ہم رات کو نکل جائیں گے یہاں سے؟" میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ آج ہی رات کو۔"

"لیکن رات کو رستے کا کیسے پتہ چلے گا؟"

"تو فکر نہ کر، چپہ چپہ دیکھا ہوا ہے میں نے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاتے ہوئے اس نے میرے گال پر نرم ہاتھ سے چٹکی لی، "بی بی سمجھ رہی ہوگی کہ میں اتنی دیر سے تیرا سر دبا رہی ہوں۔" دھیرے سے مسکرائی، میرا گال سہلایا اور چل دی۔

رات کا ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔ وہ آدھی رات نہیں گزری تھی... آدھی

صدی گذری تھی۔ لیکن خیر گذر گئی۔ میں نگاہیں دروازے پر جمائے لیٹا تھا۔ دروازہ بغیر کسی آواز کے دھیرے دھیرے کھلا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ یہ بغیر شور کیے کیسے کھل گیا؟ سردی کی ایک لہر سی میرے جسم پر گذر گئی۔ میں نے جھرجھری لی۔ دروازے پر شبو نمودار ہوئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔

میں دبے قدموں اس کے پاس پہنچا۔ اس نے دروازے پر رک کر دائیں بائیں دیکھا اور مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے چل پڑی۔ ڈیوڑھی سے نکل کر ہم پھر ایک کمرے میں تھے۔ وہ کمرہ اندر ہی اندر کئی کمروں میں کھلتا چلا گیا۔ ان کمروں سے نکل کر ہم پھر ایک ڈیوڑھی میں تھے۔ یہاں ایک محرابی ستون کے پیچھے کچھ دیر رک کر شبو نے سامنے کا جائزہ لیا اور سرگوشی کی، ”میں سامنے جا رہی ہوں۔ اگر کوئی آواز نہ آئے تو دو منٹ بعد تم بھی آ جانا۔ دس قدم چل کر سیدھے ہاتھ پر چھوٹی سی کوٹھڑی ہے، بھوسا بھرا ہوا ہے اس میں۔ تم وہیں رکنا۔ میں خود آ کر تمھیں لے لوں گی۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ چلی گئی۔ میں نے انتظار کیا، کوئی آواز نہیں آئی۔ اس کا مطلب ہے، سب خیر ہے۔ میں بھی سامنے کی طرف بڑھ گیا۔ آگے گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔

چند قدم اٹھا کر مجھے یاد آیا کہ شبو نے دس قدم بعد کوٹھڑی میں جانے کے لیے کہا تھا، لیکن اب میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ کتنے قدم اٹھا چکا ہوں۔ ایک لمحے کے لیے میں گڑبڑا گیا لیکن پھر سوچا، اس نے کوٹھڑی سیدھے ہاتھ پر بتائی تھی، میں اندازے سے اسی وقت سیدھے ہاتھ پر ہو گیا اور کوٹھڑی کا دروازہ ٹٹول ٹٹول کر ڈھونڈنے لگا۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ دو قدم ہی آگے بڑھا ہوں گا کہ بری طرح کسی چیز سے ٹکرایا۔ ٹکر اتنی زوردار تھی کہ میرا سر گھوم گیا اور آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ میں اسی چیز کو تھام کر کھڑا ہو گیا۔ یہ چوڑا سا گول ستون تھا۔ چند لمحوں بعد اوسان بحال ہوئے تو ہاتھوں سے ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا۔ تین چار قدم چلنے کے بعد محسوس ہوا کہ دروازہ ہے۔ میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ یہ یقین کرنے کے لیے کہ میں ٹھیک جگہ پہنچا ہوں، میں نے آس پاس بھوسا چھو کر دیکھنے کی کوشش کی، لیکن جہاں میرا ہاتھ پڑا وہ انسانی جسم تھا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں مجھے اپنے ہاتھ کے نیچے بیتابی سے دھڑکتے ہوئے دل کی دھمک محسوس ہوئی۔ اس سے پہلے کہ میں ٹھٹک کر ہاتھ کھینچتا، کسی نے مجھے بانہوں میں بھر کے بھینچ لیا، ”اتنی دیر کیوں لگی؟“ میرے کان میں شبو نے سرگوشی کی، پھر وہ آہستہ سے الگ ہوئی اور جواب سنے بغیر میرا ہاتھ پکڑ کر آگے چل پڑی۔ کوٹھڑی سے نکل کر وہ دائیں طرف گھومی اور تیزی سے آگے بڑھی اور سامنے دیوار سے جا کر چپک گئی۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ دیوار میرے قد سے بھی کم تھی۔ ”اس طرف کودنا ہے...“ شبو میرے کان میں بولی، ”مگر آہستہ سے... بالکل شور نہ ہو۔ پہلے تو کود جا۔“ میں نے دیوار پر ہاتھ رکھا اور آرام سے دوسری طرف اتر گیا۔ میرے پیچھے پیچھے شبو بھی اتر آئی۔

”اب ہم حویلی سے باہر ہیں۔“ شبو نے میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا، ”لیکن دیر نہیں کرنی، آ میرے ساتھ۔“ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر چل پڑی۔ چاند کی نویں یا دسویں رات ہو گی۔ چاندنی سارے میں چٹکی ہوئی تھی۔ بائیں طرف اینٹوں کے بھٹے نظر آ رہے تھے۔ لیکن علاقہ میں ابھی تک نہیں پہچان سکا تھا۔ دور سے الو کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ شبو میرا ہاتھ پکڑے تیزی سے چلی جا رہی تھی۔

”شبو! ابھی جب تو آئی تو دروازہ شور کے بغیر کیسے کھل گیا تھا؟ اس میں سے تو چرخ چوں اور گڑگڑاہٹ کی آواز آتی ہے؟“ باہر آ کر خوف ختم ہوا تو مجھے وہ بات یاد آئی جو میں شبو سے پوچھنا چاہتا تھا۔

وہ ہنسی، ”میں نے پہلے سے اس کے قبضوں میں تیل ڈال دیا تھا اچھی طرح۔“

”بہت سیانی ہے تو۔“

”دیکھ لے۔“ وہ دھیرے سے ہنسی۔

”ہم کس طرف ہیں شبو؟“

”ہائے... ابھی نہیں پتہ چلا تجھے۔ دیکھ سامنے اسٹیشن کی لیٹیں نظر آ رہی ہیں۔“

”اچھا اچھا... اب ٹھیک ہے، سمجھ گیا۔ بیچ میں اب وہ سڑک آئے گی، بجلی گھر والی۔ آگے کو پھر ریلوے کالونی شروع ہو جائے گی۔ اب ہمیں آگے چل کر مڑنا ہے نہ، الٹے ہاتھ کی طرف؟“

”ہاں، سمجھ آ گئی نہ۔“

”اس کا مطلب ہے میں ملکوں کے قید خانے سے نکل آیا ہوں۔“ میں نے آسمان کی طرف دیکھا جو اس وقت، بہت دور نظر آ رہا تھا۔ تاروں کی روشنی چاندنی کی وجہ سے ماند پڑ گئی تھی۔

میری نظر ابھی اوپر ہی تھی کہ میں نے قریب سے پٹاخے کی آواز سنی، شبو کا ہاتھ ایک جھٹکے سے میرے ہاتھ سے نکلا اور یوں لگا جیسے وہ اچھل کر پیچھے گری ہے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اگلے ہی لمحے دوسرا پٹاخا چھوٹا، اس کے ساتھ ہی میں نے چنگاری کی چمک بھی محسوس کی۔ میری نظریں آگے کو لپکیں۔ سامنے پانچ سائے کھڑے تھے، ان کے عقب میں ایک کار نظر آ رہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا آ گیا... لیکن میں پہچان سکتا تھا کہ ان پانچ میں سے ایک سایہ نسوانی تھا۔ ملکاں بی بی میرے سامنے کھڑی تھی، اس کے ساتھ باقی سائے چار مردوں کے تھے... وسایا، گونگو اور لمبے ناٹے کی جوڑی۔ وسائے کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، تین چار قدم پیچھے شبو گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ مجھے لگا، میرا دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔ پاؤں زمین میں دھنس گئے تھے۔ کچھ سمجھ نہ آیا کیا کروں، کہاں جاؤں؟ میں اپنی جگہ بت بنا کھڑا تھا۔

ملکاں چلتی ہوئی میرے پاس آئی۔ بالکل اجنبی اور کرخت آواز میں بولی، ”تم اگر ملکوں کی قید میں ہوتے تو تمھیں موت بھی وہاں سے نہیں نکال سکتی تھی۔ میں نے رکھا تھا تمھیں حویلی میں... یہ دیکھنے کے لیے کہ میں نے کسی مرد کو پسند کیا ہے یا نہیں، مگر نہیں... تم مرد نہیں نکلے۔“

وہ رکی تو جیسے ہوا ایک دم بہت شور کرنے لگی۔ اس نے پھر بولنا شروع کیا، ”جاؤ، سیدھے چلے جاؤ... مڑ کر نہ دیکھنا ورنہ چھلنی ہو جاؤ گے۔“

اس نے کچھ توقف کیا۔ پھر بولی، ”آئندہ بھی ملکوں کی حویلی کی

طرف منہ اٹھا کر نہ دیکھنا... دیکھا تو منہ پر آنکھیں نہیں بچیں گی سلامت۔ جاؤ... اب دفع ہو جاؤ۔" آخری الفاظ شیر کی دہاڑ کی طرح تھے۔

میں خواب سے بیدار ہوا اور چابی والے کھلونے کی طرح سیدھا چل دیا☆☆☆

حواشی

۱؎ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس... پنجاب کے شہروں میں چلنے والی بس سروس۔

۲؎ فیصل آباد کا پرانا نام۔

۳؎ خانیوال اس وقت ملتان کے مضافات میں شمار ہوتا تھا۔

۴؎ ابھی آ جائے گا۔

۵؎ آپ چاہیں تو سامان اتار کر چلے جائیں۔

۶؎ انھوں نے ہی آپ کو وہاں سے اٹھوا کر یہاں بٹھایا ہے۔

۷؎ بی بی صاحبہ نے کہلوایا ہے کہ ظہر کے وقت چکر لگائیے گا... اور ہاں وہ جو پچھواڑے والا دروازہ ہے اس سے آئیے گا۔

۸؎ کنبہ

۹؎ ایک قوم

۱۰؎ روزانہ کام ہوتا ہے تجھے، کیا تیری ماں رہتی ہے یہاں پر؟

۱۱؎ حرامی کتے، میں تیری پسلیاں توڑ دوں گا۔

۱۲؎ میرے ہاتھ بھی بندھے ہوئے نہیں ہیں، تیری صورت بھی سلامت نہیں رہے گی، میں بھی تجھے بتا دیتا ہوں، ویسے اگر تجھ کو کچھ پوچھنا ہے یا بات کرنی ہے تو انسان بن کے کر۔

۱۳؎ میں تجھے بتا رہا ہوں، اچھا نہیں ہوگا تیرے ساتھ۔

۱۴؎ اس کا نام وسایا ہے، کیا وہ آیا تھا؟

۱۵؎ لیکن یہ برتن کس نے زمین پر گرائے ہیں؟

۱۶؎ تو اس کا مطلب ہے تم نے رات بھی کھانا نہیں کھایا۔

۱۷؎ تو پھر تمھیں تو بہت بھوک لگ رہی ہوگی۔

۱۸؎ ارے بچارہ۔ تمھیں تو بخار ہو رہا ہے، جسم بھی دکھ رہا ہوگا۔

۱۹؎ تم ناشتہ کرو میں کوئی دوا لے کر آتی ہوں۔

۲۰؎ یہ گولیاں کھا لو، بخار اتر جائے گا۔

۲۱؎ شلوار

۲۲؎ مقعد

۲۳؎ تھوڑا سا اور پی لو، اچھا رہے گا۔

۲۴؎ پتیلی اٹھا دو۔

۲۵؎ اب کیا حال ہے، ٹھیک ہو؟

۲۶؎ پورا جسم درد سے بے حال ہو رہا ہوگا۔ تمھیں کس نے کہا ہے کہ ہر ایک سے لڑنا شروع کر دو؟

۲۷؎ مجھے کیا پتہ۔

۲۸؎ ابا کو پتہ ہوگا یا پھر بی بی جی کو پتہ ہوگا۔

۲۹؎ سو رہا ہے کیا؟

۳۰؎ ہاں بہت دیر سے سو رہا ہے۔

۳۱؎ چلو تم جاؤ، آ یار ذرا مہمان سے باتیں کریں۔

۳۲؎ اٹھیے جناب عالی اٹھیے، ذرا اٹھ کر بیٹھیے۔

۳۳؎ سرکار! پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، تھوڑی دیر میں خود ہی سوکھ جائے گی۔ اگر کوئی پریشانی ہے تو ہم سے کہو، ہم قمیص اتار کے سوکھا دیتے ہیں تمھاری۔ اگر شلوار گیلی ہوگئی ہے تو بتاؤ وہ بھی اتار کے سوکھا دیں گے۔

۳۴؎ آرام سے بھائی آرام سے۔ پیارے اس طرح نہیں ہم لڑائی جھگڑے کے لیے نہیں آئے۔ اس طرح تو جھگڑا ہو جائے گا۔

۳۵؎ ہاں میرے پیارے! ایسا ہو سکتا ہے۔

۳۶؎ کیا حال ہے... طبیعت ٹھیک ہے؟

۳۷؎ اچھا اچھا، زیادہ جھوٹ نہ بول۔

۳۸؎ مگر کیوں... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

۳۹؎ مگر کیوں... ایسا کرنے کو تو انھیں نہیں کہا گیا ہوگا۔

۴۰؎ ہاں ہاں سب معلوم ہے انھیں لیکن جب آدمی محبت کرتا ہے تو اس پر آزمائشیں تو آتی ہیں۔

۴۱؎ ارے تو کیا مجھے کچھ معلوم نہیں ہے؟

۴۲؎ ارے واہ بی بی کے ساتھ اور کس کے ساتھ۔

۴۳؎ خود بی بی جی نے۔

۴۴؎ تو نے ان سے کیا کہا تھا؟

۴۵؎ نہیں... لیکن تو نے کیا کہا تھا ان سے؟

۴۶؎ کہیں اسی وجہ سے تو تیرے ساتھ... نہیں... لیکن نہیں اب میں تیرے ساتھ کوئی اور زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔

۴۷؎ ہاں بھئی صاف صاف بتا رہے ہو یا ہم اپنی کارروائی شروع کریں۔

۴۸؎ یوں مظلوم نہ بنو۔ سیدھی طرح بتا دو، تو بی بی جی سے محبتوں کا راگ الاپتے رہے ہو نا؟

۴۹؎ بڑے ذلیل آدمی ہو تم اس کے باوجود یہ کھیل کھیلتے رہے ہو۔

۵۰؎ کیا بات ہے سر پہ پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟

۵۱؎ یہ پی لو، اللہ اچھا کر دے گا۔

۵۲؎ اگر نیند آئے تو سو جانا۔

وہ دل حیراں نہیں ہوتے

مبین مرزا

ہوااور دھوپ کا قرنوں پرانا ساتھ ہے
اور زندگی موج رواں ہے
وہ کسی پل رک نہیں سکتی
نہ جانے کتنے برسوں کی یہ پراسرار تنہائی
مرے دل میں
کھجوروں کے درختوں کی طرح یوں ایستادہ ہے
کہ اجڑے قرطبہ کے سارے منظر
میری آنکھوں میں لرزتے ہیں...
نہ جانے کتنے برسوں کی اداسی کے
اندھیرے گنبدوں میں گونجتے جاں سوز اندیشے
مسلسل مجھ پہ یورش کرتے ہیں
اور اندلس کے کوچہ و بازار اور باغوں کو
فولادی سموں سے روندتے گھوڑوں کی ٹاپوں سے
مرا سینہ دھمکتا ہے۔
مرے احساس کی یہ رنجشیں اور روح کے یہ دکھ
کسی اک ساعت سفاک نے مجھ کو نہیں سونپے
...کہ یہ تو اصل میں وہ جال ہے
تاریخ کی مکڑی جو صدیوں سے مرے اندر کہیں
چپ چاپ...بنتی ہے

ہوااور دھوپ میری زندگی کے منظروں میں
بے ثباتی کی علامت ہیں۔
زمیں کی گردشوں سے تیز ہے حالات کی گردش
اسی نے میرے سر میں خاک ڈالی ہے
یہی تو میری آنکھوں میں
پگھلتی برف کی دیوار چنتی ہے
یہ کس کی بات سنتی ہے
مرے سانسوں میں غرناطہ کی دھول اڑتی ہے
اور خاموش دہلی کی ہوائیں سرسراتی ہیں
مرے اندر ہزاروں میل تک گہرا دھواں پھیلا ہوا ہے
سارے منظر جو کبھی روشن تھے، اب وہ بجھتے جاتے ہیں
نہ جانے کتنی موجیں چشم طوفاں میں امڈتی ہیں
مجھے معلوم ہے لیکن
...کہ صدیوں کے دکھوں پر جو نہ چھلکے ہوں
وہ آنسو اس قدر ارزاں نہیں ہوتے
جو سرد و گرم دنیا دیکھ بیٹھے ہوں
ہوا کا رخ بدلنے پر وہ دل حیراں نہیں ہوتے۔

رشید کوثر فاروقی

۱

اودھو سے یہ ایک دن کنھیا نے کہا
ناری کے لیے پریم ہی سب کچھ ہے سکھا
اب ہم تو دوارکا پری کے ہیں نریش
مدھوبن میں الکھ جگا رہی ہے رادھا

۲

انگنائی میں نیل کنٹھ اترا بھی تو کیا
کاگا کوٹھے پہ آ کے بولا بھی تو کیا
برسوں کا بروگ روگ جاں لے کے ٹلا
للنی جاتی ہے لالن آیا بھی تو کیا

۳

کوئل پھر اکسمات کہیں کوک اٹھی
پھر میرے کلیجے میں سکھی ہوک اٹھی
پاتی پاکر پیا کی جی ٹھہرا تھا
پھر چین گیا پیاس اڑی بھوک اٹھی

۴

بیلا، چمپا، گلاب، جوہی پھولے
امریوں میں جھولتی ہیں سکھیاں جھولے
ہتھیا کے جھکورے بن پیا ایسے میں
جیسے کوئی میرے من میں ہاتھی ہولے

۵

نرموہی پیا کی یاد آئے ہے سکھی
برکھا کیا کیا لہور لائے ہے سکھی
گر جائے کہیں مجھ پہ تو چھٹی مل جائے
بجلی آ آ کے لوٹ جائے ہے سکھی

رشید کوثر فاروقی

۶

بے بس ہے خدا کے آگے بندہ کیسا
ساجن نہ رہا دل کا بہلنا کیسا
دکھیا جیتی ہے جب تلک جیتی ہے
بچھڑے ہوئے سارس کو دلاسا کیسا

۷

دنیا دکھیا کے ساتھ کیا کر گذری
کس حال میں تھی غریب کیونکر گذری
بجنی پر کیا بیتی کچھ فکر نہیں
بس ہم کو وہ ہے یاد جو ہم پر گذری

۸

بازار میں سج سنور کے آ بیٹھی ہے
حوا کی آبرو لٹا بیٹھی ہے
لیکن یہی ناری بہ تقاضاے وفا
ہنس ہنس کر خود چتا میں جا بیٹھی ہے

۹

چلتا تو جہان میں ہے سب سے مل کے
لیکن کچھ فاصلے ہیں دل سے دل کے
مجبور ہے آدمی کہ سوچے یہ بھی
ساتھی یہ سفر کے ہیں کہ ہیں منزل کے

۱۰

دنیا سے غیورانہ کریمانہ گذر
دریوزہ طلب نہیں فقیرانہ گذر
مل بانٹ کے کھالے جو کہیں کچھ مل جائے
اور کچھ نہ ملے تو بے نیازانہ گذر

رشید کوثر فاروقی

۱۱

کس کام کی دوربینی و دیدہ وری
کیا کنج مقابر میں اذان سحری
رشک آنے لگا ہے اب تو دنیا پہ مجھے
دے دے کوئی مجھ کو بھی یہی بے خبری

۱۲

محبوب کو مٹی میں دبا دیتی ہے
پھر جلد بہت جلد بھلا دیتی ہے
مرنے والے کا کوئی قصہ دنیا
ہنس ہنس کے کبھی کبھی سنا دیتی ہے

۱۳

لے لیتی ہے محصول مشیت کہ نہیں
سکھ پاتی ہے ایثار سے فطرت کہ نہیں
اغراض و مفادات کے اس دور میں بھی
ہے ہر کوئی مجبور محبت کہ نہیں

۱۴

سرکار ابوالقاسم و جد الحسنین
دربار امیر عسکر بدر و حنین
میں اور مدینۂ امام کونین
بوسہ مری آنکھوں کا اور ان کی نعلین

۱۵

قندیل جلایئے تو جلتی ہی نہیں
کچھ بویئے تو سوئی نکلتی ہی نہیں
اس قوم کا درجۂ برودت کیا ہے
یہ برف کسی طرح پگھلتی ہی نہیں

رشید کوثر فاروقی

۱۶

جب کوئی نئی چوٹ لگی گانے لگے
دیکھا جس نے ہم اس کو دیوانے لگے
کیا یہ بھی کوئی قسم ہے مایوسی کی
رونے کے مقام پر ہنسی آنے لگے

۱۷

کر دے گا اشارہ تو جدھر ہو لوں گا
میں نامہ سیاہ خاک منھ کھولوں گا
گونگے کے حال پر ترس کھا مالک
کچھ پوچھ لیا تو نے تو کیا بولوں گا

۱۸

ناکام تو ہر حال میں صیاد رہا
کب صید اسیر حکم و ارشاد رہا
کرلا چہکا جب اس کے جی میں آئی
پنچھی پنجرے میں تھا اور آزاد رہا

۱۹

دنیا ہے کہ فتنہ پیشگاں کی جنگاہ
بندوں سے خدا کے بس خدا ہی کی پناہ
جنگل میں نگل رہے ہیں سانپوں کو سانپ
لاحول ولاقوۃ الا باللہ

۲۰

جس گھر میں گھسی وہاں محبت نہ رہی
اللہ کا ڈر گیا دیانت نہ رہی
دولت آئی اور آدمی مست ہوا
نشہ نہ چڑھا اگر تو دولت نہ رہی

رشید کوثر فاروقی

۲۱

اوروں کو جتاتا ہوں کہ اونچا ہوں میں
کہہ لیتا ہوں دل میں بھی کہ اچھا ہوں میں
یہ بھی دھوکا ہے اور وہ بھی دھوکا
میں خوب سمجھتا ہوں کہ کیسا ہوں میں

۲۲

یہ جابر و قاہر بھی تو بچہ ہوگا
یہ بھی تو کسی سے پیار کرتا ہوگا
ہوگا کبھی شیرخوار اور اول بار
ماں کے پہلو میں مسکرایا ہوگا

۲۳

ہر گام کو شوق نے دکھائی منزل
لگتا تھا کہ اب آئی اب آئی منزل
بچپن سے یہ حسرت تھی افق تک چلتے
چلتے رہے عمر بھر نہ پائی منزل

۲۴

کنبہ کس کا خدا کا ساری دنیا
سر چشمۂ خلق دوجہاں کون خدا
ہے کوئی مسلمان جو کہہ دے کہ کیا
ہندو کو کسی اور خدا نے پیدا

۲۵

ہاتھوں میں سرسوتی قلم دیتی ہے
جمنا گیتوں کو تال سم دیتی ہے
گنگا میا ہمیں پلاتی ہے دودھ
بھارت ماتا ہمیں جنم دیتی ہے

غزل

رشید کوثر فاروقی

غم پیہم کی زندگی بھی ملی
غم میں اک لذت خفی بھی ملی

عمر نوحہ کناں رہی ساری
اسی نوحے میں نغمگی بھی ملی

غرفشیں شورشیں گہار دہاڑ
اسی جنگل میں سمفنی بھی ملی

گھپ اندھیروں کی رہگذاروں میں
کبھی چھن چھن کے چاندنی بھی ملی

اک نہ اک راستہ تو سب کا ہے
یہ نہ پوچھو کہ راستی بھی ملی

یوں بھی کیا کم تھے رہزنان حواس
راہ میں بیسویں صدی بھی ملی

اس اندھیرے کا شکریہ جس میں
ہم جو ڈوبے تو روشنی بھی ملی

ہم نے مانگی شگفتگی پائی
بے طلب پھر فسردگی بھی ملی

عمر بھر قسط قسط مرتے رہے
مرچکے جب تو زندگی بھی ملی

ایسے منتر بھی ہو گئے ایجاد
لکشمی بھی سرسوتی بھی ملی

وہ جو ہم منزلی نہیں بھولے
ان کو توفیق ہم روی بھی ملی

دشمنوں ہی سے دشمنی بھی ملی
اور درپردہ رہبری بھی ملی

دوست ہی جان کو بھی آتے رہے
دوستوں ہی سے زندگی بھی ملی

اپنے پیاروں سے پیار ہم کو تو تھا
رنج پائے مگر خوشی بھی ملی

جستجو کی مزید بخشی دیکھ
گل جو ڈھونڈا بکاولی بھی ملی

زندگی تھی فقط نشیب و فراز
یا کبھی سطح مستوی بھی ملی

موسلا دھار نعمتیں برسیں
ان میں کوتاہ دامنی بھی ملی

غزل

رشید کوثر فاروقی

سنگیں نہیں کہ تاج محل مرمریں نہیں
کیا زلزلے کا دیو بھی زیرِ زمیں نہیں

وہ دن گئے کہ ہوتے تھے مرغان ترنواز
اب کون ہے چمن میں جو غنچہ نشیں نہیں

کس کا کرشمہ ہے یہ تنوع نگاہ کا
ایسا نہیں کوئی جو کسی کا حسیں نہیں

تعویذ مول لائے ہیں سالوسیاں سے ہم
اصحاب اعتقاد ہیں صاحب یقیں نہیں

چھپ چھپ کے وہ بھی میری طرف دیکھتا ہے کیوں
انشا کی طرح میں تو کوئی نازنیں نہیں

مرغان ہم صفیر کی عمریں دراز ہوں
میری بھی اک نوا ہے نوائے نویں نہیں

اے عشق سب کو ہے تری یورش کا انتظار
جو جو قلم رویں ترے زیرِ نگیں نہیں

زندہ ہوں اس جہان میں آخر کوئی جواز
ان بستیوں کا خواب جو اب تک بسیں نہیں

تم شوخ ہو تو پیار بھی میرا شریر ہے
ہاں ہاں مرے لئے ہے تمھاری نہیں نہیں

دل ہو کہ سر یہاں تو سراپائے درد ہیں
ایسا نہیں کہ درد کہیں ہے کہیں نہیں

اعلان حق شعار بھی ہے پھر گلہ بھی ہے
نفرین ہر کہیں ہے کہیں آفریں نہیں

کی عمر نے وفا تو انھوں نے وفا نہ کی
دل میں جو آرزوئیں کبھی تھیں رہیں نہیں

پسپائی پہلے ہی ترا مقسوم ہے اگر
تجھ کو مصافِ زیست یہ انگبیں نہیں

قریوں کے ستر پوش جنوں کو سلام شوق
دامن نہیں ہے جیب نہیں آستیں نہیں

ان دوستاں میں مشک فروشاں میں مست ہوں
خلوت میں آکے بھی جو مرے عیب چیں نہیں

غزل

رشید کوثر فاروقی

ہاں خود آزار ہیں دانستہ سزا چاہتے ہیں
ایسی دنیا سے تو ہم کرب و بلا چاہتے ہیں

ہم پہ کھا کھا کے ترس پوچھ رہا ہے قاتل
تختہ ہے تیغ ہے فرمایئے کیا چاہتے ہیں

کیا کوئی بیت چکے غم کے بدلتے موسم
سانحے جو نہ ہوئے وہ بھی ہوا چاہتے ہیں

نور مہتاب سے ہم موند کے آنکھیں اپنی
آتش افشانی خاور کی ضیا چاہتے ہیں

وہ کہ ٹھکراتے ہیں معصوم فرشتوں کا لباس
اپنے شیطان سے اک چست قبا چاہتے ہیں

کون کہتا ہوا زندان بدن سے نکلا
قید میں رکھ کے بھی ہم سے یہ وفا چاہتے ہیں

اپنی روداد کا راوی ہے یہ سوتا ہوا گھر
اک پلک نیند نہیں چار بجا چاہتے ہیں

مر مٹا جن کے لئے جمع کیا مال و منال
وہی جیتا نہ رہے اب ورثا چاہتے ہیں

موت کا خوف بھی ہوتا تو مفر کب ملتا
پھر یہ ہم کس لئے درمان و دوا چاہتے ہیں

بند کرنے دو ہمیں بند ہوا کے پنکھے
اس فراخیز سے جنگل کی ہوا چاہتے ہیں

زندگی تجھ کو بہت کچھ تو سمجھ ہی گئے ہم
کچھ حجابات ہیں باقی سو اٹھا چاہتے ہیں

نو بہاراں کی نزاہت پہ طراوت پہ نہ جا
کچھ شگوفے ہیں نئے بھی جو کھلا چاہتے ہیں

کج رواں نقش کف پا کو مٹانے کے بعد
کتنے سادہ ہیں کہ نقش کف پا چاہتے ہیں

معرکہ ہو تو یہاں کوئی مرض لاحق ہے
لشکری بھی ہیں تو کیا بانگ درا چاہتے ہیں

جیت جاؤ ان اجالوں کو پس انداز کرو
کچھ دیے ہیں جو کوئی دم میں بجھا چاہتے ہیں

آسماں پر وہی رہ جائیں نہ تارے ہوں نہ چاند
اور تو اور یہ شمس العلما چاہتے ہیں

سب سے ممتاز رہے کاخ معلیٰ ان کا
چار سو جھونپڑیاں بھی رؤسا چاہتے ہیں

گھر سے نکلے ہیں کفن پوش سمجھ بوجھ کے ہم
کہ وہی سب سے بڑے ہیں جو بھلا چاہتے ہیں

یہ زمیں دیجے ہمیں کچھ فلک پیمائی
ہم ہوا چاہتے ہیں آپ خلا چاہتے ہیں

خوش کروں کتنوں کو کس کس کو بناؤں دشمن
سارے بھگوان مری پرارتھنا چاہتے ہیں

دست کش بھی رہے خوشنودی دنیا سے تو کیا
وہی کب خوش ہے میاں جس کی رضا چاہتے ہیں

خود فریباں کی پرستاری گم کردہ رہاں
کہ پرکاہ ہیں اور کاہ ربا چاہتے ہیں

ہم جہاں گیر ہیں اک نور جہاں رکھتے ہیں
اس کی چالیں تو نہیں اس کی ادا چاہتے ہیں

خدمت شعر و ادب کا تو ہمیں دعویٰ ہے
کوئی کیا جانے کہ تسکین انا چاہتے ہیں

غزل

رشید کوثر فاروقی

کتنے دردوں میں دواؤں کی سی تاثیر بھی ہے
تن بہ تقدیر ہی رہ جا کہ یہ تدبیر بھی ہے
سن کے اک خواب حسیں میرے معبر نے کہا
یہ ترا خواب ترے خواب کی تعبیر بھی ہے
مستوی اپنے لئے کس نے کہا کیسے چنا
اسی دنیا میں ہمالہ بھی ہے پامیر بھی ہے
وصل مدہوش کناں سے غم ہجراں خوش تر
کہ تصور میں ہے تو بھی تری تصویر بھی ہے
شوخی حسن نے چھوڑی نہ کوئی راہ فرار
ایک ہی سانس میں انذار بھی تبشیر بھی ہے
تم خدا کو نہیں مانتے لیکن صاحب
لاکھ تدبیر کرو تاک میں تقدیر بھی ہے
دوش صیاد کے ترکش سے فضا سہم گئی
دیکھتا کون کہ ترکش میں کوئی تیر بھی ہے

یہ گرہ ناخن تدبیر سے کھلنے کی نہیں
پھر بھی نومید نہ ہو ناخن شمشیر بھی ہے
صلح للہ نہیں جنگ بھی فی اللہ نہیں
نعرہ بازاں کوئی شبر کوئی شبیر بھی ہے
اب تو بس گذری ہوئی عمر بسر کرتا ہوں
میری تنہائی خموشی بھی ہے تقریر بھی ہے
خود کلامی بھی نہ دے ساتھ اگر منہ سے کہوں
ایک اندوہ جو گہرا بھی ہے گمبھیر بھی ہے
امتحاں ہے کہ سزا اور سزا ہے جو یہ عمر
کتنی تقصیر ہے یا سچ کوئی تقصیر بھی ہے
اسی بیت نبوی کے فقرا ہم بھی ہیں
خلد بھی جس کے لئے آیۂ تطہیر بھی ہے
ہم نے بازار جدیداں میں بہت دن ڈھونڈا
کوئی غالب بھی ہے، اقبال بھی ہے، میر بھی ہے

غزل

رشید کوثر فاروقی

عجب فقیر ہو تاج جہانیاں تم ہو
حصیر خاک پہ مسجود آسماں تم ہو
ہجوم نور میں کھویا ہوا ہے میرا وجود
سوائے روح وہاں کیا ہوں میں جہاں تم ہو
دروں نگاہ کو تنہا روی کا وہم نہیں
ورائے پردہ تو سرخیل کارواں تم ہو
حجاب مانع اشکال خیرگی ٹھہرا
نہاں ہوئے ہو تو کچھ اور بھی عیاں تم ہو
جنوں ہزار زباں ہے مگر کسے معلوم
کہ جوہر سخن و حاصل بیاں تم ہو
کبھی بلا کا تحیر کہاں نہیں ہو تم
کبھی تجسس زہرہ شکن کہاں تم ہو
یہی کشندۂ اعدا یہی ہے باز پسیں
تمھارا ناوک سر تیز میں، کماں تم ہو
مجھے تمھیں نظر آتے ہو اور کوئی نہیں
مرے لئے سبھی محجوب ہیں عیاں تم ہو

مری نگاہ میں آفاق رنگ و بو لاشے
مری زمین وہ ہے جس کا آسماں تم ہو
پس از حیات بھی ہیں کتنی وادیاں باقی
ابھی جہاں کو خبر کیا کہاں کہاں تم ہو
ہمیں تمھاری اٹریا کی چھاؤں کافی ہے
سبھی کے سب ہیں ہمارے تو بس میاں تم ہو

تمھیں سناؤ جو یاد آئے مجھ پہ کیا گذری
کہ داستاں تو مری میرے دوستاں تم ہو
علاج پستی امروز لاؤ تب جانیں
امین رفعت ادوار باستاں تم ہو
تمھیں گلہ تھا کہ اک نسل خوابناک تھے ہم
سو لو کہ ہم تو چلے کل کے پاسباں تم ہو
نہ پوچھے کوئی تو یوں اپنے دل کو پھسلا لو
درفش لشکر فردا تو بے گماں تم ہو

رشید کوثر فاروقی

روک دے اس کو بھلا کس کی مجال آتا ہے
ہر ترقی کے تعاقب میں زوال آتا ہے
لرزہ انگیز سہی تمکنت تخت شہی
لیک جب عرش معلّیٰ کو جلال آتا ہے
ایک دل پیار بھرا سب کے لئے لایا ہوں
نہ مجھے اور کوئی فن نہ کمال آتا ہے
میں نے مرشد سے دعا چاہی تو ہنس کر یہ کہا
پیار گھر چھوڑ کے جاتا ہے جو مال آتا ہے
جب یہ افتاد پڑی مجھ پہ سمجھ میں آیا
ایک شیشے کی طرح دل میں بھی بال آتا ہے
ناگ کا زہر بھی شیریں ہے ذرا یاد رہے
سر منبر کوئی نوشینہ مقال آتا ہے
دیکھتے جایئے سامع نظر آنے کے نہیں
انجمن میں وہ کوئی خیر سگال آتا ہے
ستم ایجاد نہ کر اے ستم ایجاد بہت
تیرے سر کتنی ہی نسلوں کا وبال آتا ہے
دونوں پیدا تو کھنکتی ہوئی مٹی سے ہوئے
تال پر تم کو مجھے قال پہ حال آتا ہے
دل تو پھر دل ہے میاں ذہن بھی قابو میں کہاں
جس کو چاہو کہ نہ آئے وہ خیال آتا ہے
اب تو پنگھٹ کی وہ دوشیزہ تلاشو جس کو
نہ بھر آتا ہے نہ مشکیزہ سنبھال آتا ہے
اک مجانین کی دنیا ہے یہ جادو نگری
بس یہ دیکھو کہ کیسے سحر حلال آتا ہے
خود فریباں تو ہیں مشتاق کہ اس دشت میں کب
آسماں رنگ فسوں ساز شغال آتا ہے
منتظر بیٹھے ہیں ہم بھی کہ پئے داد غزل
ضیغم آتا ہے کوئی کوئی غزال آتا ہے
ہنسنے والے کہیں کچھ سوچ کے رونے نہ لگیں
بزم میں کوثر آشفتہ خیال آتا ہے

غزل

رشید کوثر فاروقی

کیا شوخ و شنگ شے نگہ شرمگیں بھی ہے
چلمن سے جھانکتی بھی ہے چلمن نشیں بھی ہے

غنچے شگوفے چھوڑنے والے ہیں عنقریب
اس عہد خورد بیں میں کوئی دور بیں بھی ہے

اپنے مزاج ہی کے تعاقب میں ہوں ہنوز
فرش سفال بھی فلک چارمیں بھی ہے

ہم آپ پر نہ آپ کریں ہم پہ اعتماد
دامن کے ساتھ ساتھ یہاں آستیں بھی ہے

تکیہ کرم پہ کیسے کروں میں کہ ناز حسن
نکتہ نواز ہے تو سہی نکتہ چیں بھی ہے

کرتے ہو اپنے شہر کو کیا کیا ملامتیں
جس کی کمی ہے جاکے تو دیکھو کہیں بھی ہے

دیتا ہے آدمی کو سہارا قدم قدم
اک طائف الخیال جو ہے بھی نہیں بھی ہے

روپوشی سجود میں بھی نیت نمود
ٹیکا کلنک کا مرا داغ جبیں بھی ہے

نقل وطن بھی کرکے کہاں جایئے گا آپ
بندوں کی زد پہ اب تو خدا کی زمیں بھی ہے

اپنے کو کتنی چونپ سے ڈسوا رہے ہیں ہم
مسحور ہیں کہ وقت کی ناگن حسیں بھی ہے

کیا آپ جھٹپٹے کو بھی پہچانتے نہیں
ڈستی ہے جو صباح وہ کیا راستیں بھی ہے

جینا ادھر محال ہے مرنا ادھر محال
زہراب بھی وہی ہے وہی انگبیں بھی ہے

ہم طائران عرش کو پیچھے سے مت پکار
ماضی کی یادگار تو دیوار چیں بھی ہے

شاید جناب نوح بھی ہوں گے گلہ گذار
افسانہ ناتمام دم واپسیں بھی ہے

سلیم الرحمٰن

چیخ

کبھی وہ صدا گنگناتی سبک رو ہواؤں کی آہٹ تھی
دھیرے سے گرتی ہوئی نیند میں چور پلکوں کی لرزش تھی
گنگ اور نیلی فضاؤں میں
اڑتے ہوئے
ایک پنچھی کی مستی بھری پھڑ پھڑاہٹ کا نغمہ
کلی کے چٹکنے کی آواز تھی
اب وہی اک صدا
گونجتے گونجتے باولی رات کی چیخ میں ہے
ہواؤں کی روتی ہوئی بانسری، بادلوں کی گرج
کبھی میرے ویران سانسوں میں چلتے ہوئے
تیز جھکڑ کی آواز ہے
میری سلگتی ہوئی خواہشوں کا اٹھتا ہوا شور ہے

یادداشت

مجھے پھر سے ہوا کے ہاتھ پر لکھی ہوئی تحریر
پڑھنا ہے
گذرتے بادلوں میں
پانیوں پر
ریت کے ذروں میں
بنتی اور پھر مٹتی ہوئی تصویر پڑھنا ہے
مجھے اب ذہن کے ہر کونے کھدرے میں
نئی کونپل کو بونا ہے
مجھے پھر حرف اول ڈھونڈنا ہے
پھر سے ہر سر، اور ہر آواز اور ہر شور سننا ہے
مجھے پھولوں، ستاروں، پتیوں کو نام دینا ہے
مجھے قوس قزح کے رنگ جگنوں میں سجانے ہیں
فضا کی وسعتوں پر
پھر مجھے حیران ہونا ہے
ہر اک احساس کو پھر سے سمجھنا ہے، سمونا ہے
مجھے رشتوں کی، قدروں کی اکائیاں
جوڑنا ہے
پھر سے اپنی ذات کو ایجاد کرنا ہے

سہیل احمد خاں

دور سے ہم کو لگا تھا بے زباں آب رواں
اگلے ہی پل تھا صداؤں کا جہاں آب رواں

اک سہانی شام کے رنگوں کے گھیرے میں کہیں
میں، مری تنہائی، یاد رفتگاں، آب رواں

شاخ سے پھولوں کو کھینچا ان کے اپنے عکس نے
جانے اب لے جائے گا ان کو کہاں آب رواں

میں بھی راہی ہوں مجھے اپنے سفر کا راز دے
کس کی خاطر یہ تلاش جاوداں آب رواں

اے سفر کی رو، مجھے دم بھر کی فرصت چاہیے
ایک لمحے کے لیے رک جا یہاں آب رواں

لرز لرز تو گیا اک چراغ نیم شبی
مگر سنبھل کے جلا اک چراغ نیم شبی

سبھی دلوں میں عجب خوف تھا اندھیرے کا
مگر ذرا نہ ڈرا اک چراغ نیم شبی

میں سوچتا تھا اکیلا ہی جل رہا ہوں یہاں
مرا رفیق ہوا اک چراغ نیم شبی

نہ جانے کہنا تھا کیا اس نے سونے والوں سے
پکارتا ہی رہا اک چراغ نیم شبی

تپش حروف کی شاید اسی کی لو سے ملی
مری غزل میں جلا اک چراغ نیم شبی

دو غزلیں

سہیل احمد خاں

کر چکے نوحے بہت گذرے زمانے کے لیے
کچھ نئے شہروں کے دکھ بھی ہیں سنانے کے لیے

اس طرح تیزی سے بھاگا جا رہا ہے ہر کوئی
جیسے چھپنا ہو کہیں خود کو بچانے کے لیے

ایک لمحے کے لیے بھی خود سے ہم نہ مل سکے
زندگی تھی شہر والوں کو دکھانے کے لیے

تھی خبر بستی ملے گی آج نفرت اس جگہ
خلق ٹوٹی ہے مقدر آزمانے کے لیے

کون سنتا تھا نگر کے شور میں دھیمی صدا
دل سے اٹھتی تھیں نوائیں ڈوب جانے کے لیے

یوں اپنے ایک خواب میں گم ہو گیا تھا میں
نکلی ہوئی تھی دھوپ مگر سو رہا تھا میں

کوئی مقام نیند کے باغوں میں تھا کہیں
ٹھنڈی ہواؤں میں وہاں دو پل رکا تھا میں

کچھ اجنبی مکان تھے کچھ اجنبی مکیں
آنکھیں تھیں بند پھر یہ کہاں جھانکتا تھا میں

اک سمت چاندنی تھی تو اک سمت دھوپ تھی
جیسے کوئی طلسم تھا جس میں گھرا تھا میں

غلام مرتضیٰ راہی

زمیں کے بعد ہم اب آسماں نہ رکھیں گے
خلا رہے گا قدم ہم جہاں نہ رکھیں گے
جواب دینا پڑے گا ہمیں خموشی کا
سوچے کیا ہے کہ منھ میں زباں نہ رکھیں گے
کہیں اضافہ کہیں حذف تو کہیں ترمیم
کہیں کی اب وہ مری داستاں نہ رکھیں گے
تلے ہیں ہاتھ جو ورثے پہ صاف کرنے پر
کسی بھی دور کا باقی نشاں نہ رکھیں گے
بتا رہے ہیں ہم احساں جتانے والوں کو
جو سر پہ بوجھ ہو وہ سائباں نہ رکھیں گے
نمو کے واسطے کوشاں ہیں اس یقین کے ساتھ
بڑے ہوئے تو ہم اس کا گماں نہ رکھیں گے
اگر ہو وجہ تعلق تو ہم سے دور رہو
کوئی بھی فاصلہ ہم درمیاں نہ رکھیں گے
جب اپنے گھر میں ہی اپنی انا کو خطرہ ہے
ہم اپنے پاس یہ جنس گراں نہ رکھیں گے
کسی نے مارا ہے شب خون ایسا راہی پر(۱)
کہ اب وہ صبح تلک تن میں جاں نہ رکھیں گے

چھت پہ بدلی جھکی سی رہتی ہے
کب سے بارش تھمی سی رہتی ہے
کوئی شب دھوپ کی سی کیفیت
کوئی دن چاندنی سی رہتی ہے
ایک ہستی مری عناصر چار
ہر طرف سے گھری سی رہتی ہے
کیسے جی بھر کے دیکھیے اس کو
دیکھنے میں کمی سی رہتی ہے
کوئی اک ذائقہ نہیں ملتا
غم میں شامل خوشی سی رہتی ہے
جب سے مائل ہوئے ہیں میرے قدم
راہ مجھ سے کھنچی سی رہتی ہے
اک نہ اک شغل چاہیے اس کو
مجھ میں دیوانگی سی رہتی ہے
تیر اندھیرے میں جب چلاتا ہوں
دھیان میں روشنی سی رہتی ہے
شاخ امید کو خزاں نہ بہار
یہ تو سب دن ہری سی رہتی ہے
ایک خطے کے بوجھ سے راہی
ساری دنیا دبی سی رہتی ہے

(۱) "شب خون" کا آخری شمارہ۔

عوض سعید، غیر معمولی زاویۂ نگاہ کا افسانہ نگار

مہدی جعفر

(۱)

عوض سعید کے تحیر خیز افسانے ان کی فنی چابک دستی کی غمازی کرتے ہیں۔ بیانیہ سادگی پر محمول ان افسانوں کا دامن عجیب وغریب پرکاری سے مملو ہے۔ اسلوب نگارش ایسا ہے کہ علامت ہو یا استعارہ، رمز ہو یا سریت، سب ایک متحد کیفیت کی طرح گھل مل کر نیا اور اچھوتا ذائقہ فراہم کرتی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر افسانہ نگار بہ سہولت غیر معمولی تہ داری پیدا کرتا ہے اور افسانوی سطح کو واضح حکایتی، مکالماتی یا منظری کینوس پر منتقل کر دیتا ہے۔ عوض سعید کی تخلیقات میں نفسیاتی تناؤ (نفسی کیفیت)، کرب اور گھٹن اور دوسری شدتیں سریت یا رمزیت کے وسیلے سے گذر کر افسانے کا زیر و بم اختیار کرتی ہیں جس کی بنا پر یہ صورتیں قاری کی مقناطیسی توجہ اور افسانوی ارتکاز کی کشش سے اپنی شناخت پیدا کرتی ہیں۔ افسانوں کو پڑھتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ عہد حاضر کے انسان کی موہوم اور دشوار گذار فطرت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا کر اپنے مخصوص انداز میں برتنا اور قاری کو راغب کر لینا، روایت سے اختلاف کی راہ پر چلتے ہوئے سنجیدہ ادراک کی نئی حسیت کا تعین کر لینا ایک پیچیدہ مرحلہ تھا جسے انھوں نے مدبرانہ سہولت سے افسانوی فن میں منتقل کیا۔ عوض سعید ان فنکاروں میں ہیں جن کی مضبوط بیانیہ تحریریں معاصر افسانے کی جلا میں اپنا اہم کردار ادا کرتی رہیں۔ آج عوض سعید ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں (وفات 1995 عمر ۷۳ سال، حوالہ "شب خون" شمارہ نمبر ۱۸۵) لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے وہ ایسے تازہ افسانے چھوڑ گئے ہیں جو اپنی موجودگی سے مصنف کے وجود کو زندہ اور ناقابل فراموش بنا دیتے ہیں۔

(۲)

عوض سعید کے یہاں نہ تو مذہبیت ہے نہ ان کا سروکار کسی مخصوص معاشرے سے ہے۔ نہ ہی ان کے افسانوی کرداروں کے نام علاقائی معلوم ہوتے ہیں نہ اس اعتبار سے برتے جاتے ہیں۔ علاقائی زبان (حیدرآباد کی زبان) یا مشرقی علاقائیت (Orientalism) ان کی تحریری شناخت نہیں بنتی۔ مخصوص معاشرتی بیان تو ایک طرف، ان کے افسانوں کو عام معاشرتی افسانوں کی ذیل میں بھی رکھا نہیں جا سکتا۔ ان کے یہاں دیہی منظر نامہ نہیں ہوتا (بلکہ پیچیدہ مدنی بافت اکثر ان کی تخلیق کا کینوس بن جاتی ہے)۔ رمز اور اسرار کی تخیل آزمائی کے باوصف ان کے یہاں تخیلاتی اڑان والی فینٹسی بھی نہیں ہے۔ زیادہ تر ان کے افسانوی کرداروں کے نام نہیں ہوتے (بلکہ مجرد ہوتے ہیں، میں، تم، وہ، ہم وغیرہ)۔ گویا مصنف کردار کے نام کو اہمیت نہیں دیتا۔ نہ ہی کوئی نام استعاراتی ہوتا ہے (بلکہ کبھی کبھی، جہاں کہیں غیر مجرد نام آئے ہیں، وہی نام دوسرے افسانوں میں دہرائے گئے ہیں مثلاً ظفر، جمیل وغیرہ)۔ "جلا وطن" میں ان کا ایک کردار کہتا ہے "بھئی نام سے کیا ہوتا ہے۔ شکلیں تو بالکل جدا ہیں۔" گویا عوض سعید کے نزدیک نام محض نام ہے اور شکل غالباً علامت کا درجہ رکھتی ہے۔ اکا دکا جزوی افسانوں کو چھوڑ کر عوض سعید اظہاریت پسند (Expressionist) نہیں ہیں، ان معنوں میں کہ وہ موضوعی اور داخلی عندیہ رکھتے ہوئے بھی اس طریق کار کی بنیاد پر افسانہ طرازی نہیں کرتے۔ ان کا اسلوب بیان واضح طور پر معروضی اور خارجی ہوتا ہے، جس کی زیریں سطح سے داخلیت کا چشمہ شور کرتا ہوا بہتا ہے۔ عوض سعید کے برتاوے کے برخلاف اظہاریت پسندی میں خارجی حقیقت کی نمائندگی سے احتراز کیا جاتا ہے اور دنیا کو انتہائی ذاتی شکل (یا عنوان) سے پیش کیا جاتا ہے۔

(۳)

عوض سعید کی فنکارانہ نوعیت جدید افسانہ نگار کی ہے۔ یہاں جدت بھی ہے، انکشاف بھی، تلاش (Exploration) بھی اور ایجاد بھی۔ یہ شق آواں گارد (Avant Garde) ادب سے ملتی جلتی ہے، جس میں کچھ نئے پن کے حصول کی سعی ہے جس سے ادب کو آگے بڑھایا جا سکے۔ عوض سعید کے افسانے مبہم طور پر نہیں بلکہ واضح طور پر جدید ہیں۔ خیال خاطر رہے کہ جدید تحریک عموماً دارالحکومتوں اور بڑے بڑے شہروں میں پروان چڑھی تھی۔ اس رجحان نے تمام تخلیقی فنون (شاعری، فکشن، ڈرامہ، مصوری، مجسمہ طرازی، موسیقی، فن تعمیر وغیرہ) کو اپنے دائرۂ اثر میں لے لیا تھا۔ عوض سعید کے فکشن میں یہ بیشتر صورتیں لامحالہ طور پر اسلوب، برتاؤ یا ہیئت کی تشکیل میں نظر آتی ہیں۔ مگر ان کا فنی رویہ جس بات سے سروکار رکھتا ہے وہ ہے انسان کی بنیادی بساط اور پوزیشن۔ عوض سعید انسان کی جگہ

(Placement) اس کے دنیاوی رویے، اس کے عمل اور ردعمل کا اپنے غیر معمولی زاویہ نظر سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہی ان کے افسانوی اسلوب اور ہیئت کا جدید انداز ہے، تجربہ ہے۔

عوض سعید کے افسانے عموماً کسی سچے (True) جذبے کے معروضی تلازموں (Objective Correlatives) کو منکشف کرتے ہیں۔ مثلاً ان جانے جذبات، اجنبی احساسات، وہ غیر معمولی شکلیں / چیزیں جو ہمارے اردگرد نظر آتی ہیں مگر عام خیال ان کی طرف نہیں جاتا، وہ باتیں وہ حرکتیں جو لا اظہار اور لاکلام ہیں، انسان کی نفسی حالت جو متغیر ہے، عجیب وغریب ارتباط، عجیب وغریب انتشار۔ یہ سب کے سب کہیں نہ کہیں افسانوی بیان یا اس کے پس پردہ رونما ہیں۔ بیانیہ کی سطحیں جست لگاتی ہیں (Quantum Jump) مگر سب ملا کر ایک مربوط تخیلی بیان تشکیل پاتا ہے، افسانے کی اکائی بن جاتا ہے۔ قاری خود ہی محسوس کرسکتا ہے کہ سب کچھ کس قدر سچ ہے۔

چنانچہ عوض سعید کے ہر افسانے کا اپنا ایک جذبہ ہوتا ہے جس کا کوئی مرکزی یا بنیادی تلازمہ ہوتا ہے۔ چونکہ معاشرتی وجود کے ساتھ اس جذبے کے دوسرے انسلاکات پرت دار ہوتے ہیں اس لئے اس اکثر بنیادی معروضی تلازمے کی نمائندگی کے لئے دوسرے متغائر تلازموں کے تقابلی برتاؤ یا ایک کے اوپر ایک رکھ کر (Superimposition سے) افسانوں کی شکل نمایاں کی جاتی ہے۔ "رات والا اجنبی"، "وہ لڑکی" اور "نامراد" جیسے افسانوں میں بنیادی کردار معروضی تلازمہ ہے۔ "تیسرا انگٹ" اور "ایک زہریلی کہانی" میں غیر موجود کردار کا خالی پن، معروضی تلازمہ بنتا ہے۔ "تولیہ" میں معروضی تلازمہ ضمیر ہے۔ "خواب میں ہنوز" میں واقعہ کا آڑا پن ہے۔ "بھیتر بھیتر آگ" میں جنسی رویہ کے طبعی اختلافات ہیں۔ یہ سبھی جذبہ کے اظہار کے لیے مضبوط بنیادی معروضی تلازمہ تشکیل کرتے ہیں۔

بنیادی معروضی تلازمہ افسانے کا فارم طے کرتا ہے، جس کی تشکیل میں مصنف منہمک ہو جاتا ہے تاکہ مخصوص جذبے کی تہ دار خواندگی تمام متعلق امکانات کو بروئے کار لاسکے اور قاری کو افسانہ نگار کے عندیہ تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہ ہو۔ عوض سعید نے اس ضرورت کو بدرجۂ اتم ملحوظ خاطر رکھا ہے اور اسی مناسبت سے ترسیل کا قدرتی انداز بیان خلق کر کے افسانوی طول وعرض کو مسخر کرنے کی کوشش کی ہے جہاں تلاش وجستجو (Exploration) ہے، قاری کی حسیت کو ابھارنے یا مشتعل کرنے (Evocation) کے لیے مصنف خارجی حقیقتوں کا سہارا لیتا ہے۔ جگہ جگہ نظر، منظر یا زاویہ نظر قائم کرتے ہوئے، تبدیلی یا جست اختیار کرتے ہوئے، شدت سے متوجہ کرتے ہوئے، غیر معمولی پیکر یا کیفیت کی صنعت گری کرتے ہوئے افسانوں کی تلازماتی گیرائی سے اپنے مقصد کو حاصل کرتا ہے۔

اس طرح عوض سعید خیال احساس اور عمل کا دلچسپ توازن قائم کرتے ہیں۔ متوازن افسانوی ہیئت میں جا وبیجا لفظیاتی طوالت یا قلت نہیں ہوتی۔ یعنی جذبہ کا تجرباتی بیانیہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے، لفظیاتی دباؤ تحریری سیلاب یا بیان کی دباہٹ کی آڑ میں چھپ نہیں جاتا۔

(۴)

افسانہ "جنازہ" بے حد مختصر سا افسانہ ہے۔ یہ محض دو صفحوں میں آگیا ہے۔ ایک جنازہ ہے اس کے ساتھ کل چار آدمی ہیں۔ سبھی مرنے والے سے لاتعلق سے ہیں، غیر دلچسپ، خاموش، ایک دوسرے سے بے خبر، کسی سے یہاں تک کہ نعش سے کوئی سروکار نہیں۔ ایک اونگھ ایک اکتاہٹ طاری ہے۔ یہ سب بے نام کردار ہیں۔ یہاں تک کہ گورکن بھی بے نام ہے۔

گورکن قبر کھودتے کھودتے بے دم اور پژمردہ ہو جاتا ہے۔ وہ قبرستان کے جنگلی خودرو پودوں، کھردری زمین اور مٹی میں دھنسے ہوئے پتھروں کے درمیان رہتے ہوئے، پھولی ہوئی سانسوں سے نڈھال، قبر کھودتے کھودتے اکتا جاتا ہے، تھک کر سو جاتا ہے۔ یہ سب تلازمے ہیں۔ یہ غیر دلچسپی ماحول اور ایبسرڈ (Absurd) صورت حال زندہ بشریت کی عبث حالت کی غماز ہے۔ یہ انسانی حالت بھی ہے، ملکی صورت حال بھی ہے اور بین الاقوامی بے توجہی اور بے اعتنائی بھی ہے۔ ایسے ماحول کی صنعت گری کرتے ہوئے عوض سعید کا حیرت خیز دلچسپ مختصر بیان متوجہ کرتا ہے۔ عجب پراسرار کیفیت ہے۔ گورکن تھک کر سو جاتا ہے اور بالآخر جاگتا ہے اور قبر کھودنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ ادھوری کھدی ہوئی قبر اب بالکل تیار ہے۔ مصنف اس قبر میں دھنسی ہوئی ایک تازہ نعش کو نمایاں کرتا ہے (شاید یہ وہی جنازے والی نعش ہے)۔ افسانہ اس تحیر زا جملے پر ختم ہوتے ہوئے قاری کو اچانک چونکا دیتا ہے۔ "ارے یہ تو یہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔"

یہاں بقول شمس الرحمٰن فاروقی ("ایک سینگ والا آدمی" اور "موذی" کی طرح عوض سعید کا) وہ غیر متوقع نفسیاتی یا پراسرار پہلو موجود ہے جو افسانے کو دفعتاً ابھار دیتا ہے۔

(۵)

فنی اعتبار سے دنیا کی عبث صورت حال کے درمیان جہاں اور دوسرے عوامل لائق توجہ ہیں، وہیں جنس کی نفسی حالت زندگی کی شدید سچائی کے طور پر فنکارانہ جہت رکھتی ہے۔ چنانچہ عوض سعید نے بھی جنس کے قدرتی منظر کو فرویت کی قوت مند حقیقت یا زندگی کی مخصوص حیاتی جہت گردانتے ہوئے اسے خوش سلیقگی سے نبھایا ہے۔ یوں بھی عوض سعید کے پیش کردہ تمام غیر معمولی (Abnormal or Above Normal) کردار، عوامل یا واقعے غیر حقیقی نہیں ہوتے اور نہ ان میں مصنوعیت ہوتی ہے۔ "کھلاڑی"، "مہمان"، "گیندے کے پھول"، "فیرنی"، "دیوداسی" وغیرہ میں جنس کی حسیاتی یا جذباتی انسلاک کی نمائندگی ہوئی ہے۔ "بھیتر بھیتر آگ" ان کا طویل مختصر افسانہ ہے، جس میں عوض سعید نے اسلوبیاتی تحلیل کا نقشہ پیش کیا ہے اور ایک بڑے کینوس کے ذریعے قرأت پذیری کا نمونہ بنا دیا ہے۔ افسانے میں ملتانی نام کا باہری کردار گھر کے کردار اسد (جو گھر کا ذمہ دار سربراہ بھی ہے) کے چھوٹے کنبے پر بیرونی حیثیت سے جنسی دباؤ کا مظہر بن جاتا ہے، جس

سے خلفشار جنم لیتا ہے۔ ایک انتشار کی سی کیفیت سر ابھارتی ہے۔ ملتانی جان بوجھ کر اس انتشار کو باہری باہری پوشیدہ کوششوں (سازشوں؟) سے خلق کرتا رہا ہے۔ وہ اسد کی لڑکی کو اپنے حصول کے لیے (Manipulate) کرتا ہے۔ گھر کی ذمہ دارانہ حیثیت افسانوی آئینے میں اسد کا فرسودہ رویہ نظر آتی ہے۔ چنانچہ اسد کے گھر والوں کے ساتھ ملتان کی جنسی دلچسپی عمل اور ردعمل اختیار کرتے ہوئے اسد کے ذمہ دار رویے کے برعکس ہے۔ افسانہ سوال اٹھاتا ہے۔ کون خسارے میں ہے؟ بہرحال اسد کا خسارہ واضح ہے اور اس راہ سے افسانہ جنسی وجود پر طنز کا نشتر لگاتا ہے۔ اب اگر ملتانی (کی جنسیت) کے زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو آتش کا یہ شعر راسخ آتا ہے۔

فکر اشعار کو لازم ہے دماغی قوت
سونگھنا چاہیے وہ سیب زنخداں مجھ کو

یہ شعر بڑا ہے یا عوض سعید کا افسانہ، یہ آپ طے کر لیجیے۔

(۶)

کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ عوض سعید کا کوئی بھی افسانہ بغیر جنسی سلوک کے مکمل نہیں ہوا۔ فنکار نے متعدد ایسے نفسیاتی افسانے بھی تخلیق کیے ہیں جن میں جنسی رنگ مفقود ہے اور فردیت کی چھاپ اسی طرح سے گہری ہے۔ دراصل (جنس یا غیر جنس) توجہ کھینچنے کی شدت فنکار کا تخلیقی میلان ہے اور یہ میلان لازمی طور پر جنسی نہیں ہے۔ "رات والا اجنبی" عوض سعید کی انفرادیت کی واضح مثال ہے۔ یہ انفرادیت اہمیت توجہ اور کشش کے مقناطیسی برتاوے پر قائم ہے۔ فنکاران عوامل سے فرد کی روح تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے فنکار کے غیر جنسی افسانے فرائڈ کی جنسی نفسیاتی بنیاد کا تتبع نہیں کرتے۔ بے توجہی اور توجہ کا تصادم کبھی منظر نامہ بن جاتا ہے ("تماشا"، "کمرہ نمبر ۲۸"، "اداس نسل کا آخری آدمی")، کبھی مظہراتی علامت ("شام"، "موذی"، "گیندے کے پھول")، کبھی بیانیہ صورت گری ("نسخہ"، "کھلاڑی"، "نامراد"، "دیوداسی")، کبھی نفسیاتی کشمکش ("خاکِ دل"، "جلا وطن"، "تولیہ")۔ غرض طرح طرح کی جلوہ نمائیاں ہیں۔ مصنف معمول کے درمیان سے غیر معمولی صورت نقش کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ عام حالات اور روزمرہ کے ماحول کے اندر سے غیر معمولی حالت کو برآمد کر کے اس کی پرتو جہ نمائندگی پر تحریری قدرت ان کی تخلیقی روش میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ افسانوں کا راوی اصرار کرتا ہے کہ اس پر بھروسا کیا جائے۔ وہ معتبر راوی ہے۔

(۷)

عوض سعید عجیب و غریب انداز میں ماحول سازی کرتے ہیں۔ معنی خیز ترچھے مکالموں، روزمرہ کی حجت و حکایت، نوک جھونک، کڑوے کسیلے جملوں کے تخلیقی استعمال سے گھر باہر کی فضا قائم ہوتی ہے مگر پھر بھی یہ عام سی فضا نہیں ہوتی۔ بیانیہ کا مجرد خیال کہیں پیچیدگی اختیار کرتا ہے کہیں اضطراب انگیز صدمہ پہنچاتا ہے۔ "ایک زہریلی کہانی" میں عورت اور مرد کے درمیان پنپنے والے ازلی فاصلوں کا آڑا پن (Lopsidedness) دراصل شوہر کے رویے پر بھرپور تنقید ہے اور اس کی طبعی کمینگی کی جانب انگشت نما ہے۔ سوال اٹھتا ہے، کیا اسے تعمیم (Generalise) کہا جاسکتا ہے؟ "وہ آدمی" میں اجنبی شخص سے منافرت کا ردعمل ہے۔ افسانے کا اختتامیہ تکنیک کی غیر معمولی کمزوری کو ظاہر کر دیتا ہے اور وہ آدمی حقیقتاً کوئی ضرورت مند انسان نکل آتا ہے۔ شاید ہمارے اردگرد کا ماحول ایبسرڈ (Absurd) اور ہمارا رویہ ایبنارمل (Abnormal) ہو گیا ہے۔

"وہ آدمی" کے علاوہ دیگر ایبسرڈ کہانیوں میں "چوتھا آدمی"، "جونک"، "تنہائی اور تنہائی" نمایاں حیثیت کی حامل ہیں۔ "سائے کا سفر" ذات کی شکستگی سے عبارت ہے۔ "سٹیٹ" کا ریٹائر کردار عجیب سے مضمحل، بوجھ سے بھرے، بیزار کن اور ناقابلِ فہم حالات کا عکاس ہے۔

"مردہ گاڑی" میں عوام الناس کا عجیب و غریب رویہ منکشف ہوتا ہے۔ لوگوں کو مرے ہوئے یا مرتے ہوئے آدمی میں بے انتہائی دلچسپی، تجسس اور سروکار رہتا ہے۔ مگر جیسے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرا نہیں تھا بلکہ زندہ ہے، تو اچانک انھیں غیر دلچسپ ہو جانے کا رویہ اپناتا ہے۔ یہ (Irony) ہے۔ انسان کے ساتھ انھیں شقاوت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ توجہ تو زندہ رکھنے اور زندہ دیکھتے رہنے پر ہونا چاہیے، یہاں معاملہ الٹا ہے۔ 'چاہیے' اور 'ہے' کا تکلیف دہ افتراق جو مجموعی طور پر انسانوں کا خاصہ ہے، توجہ کا طالب ہے۔ افسانہ انھیں کی نفسیات کو بخوبی ابھار دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح "اداس نسل کا آخری آدمی" کی راہ سے معاشرے کی عجیب سی نفسیات نمایاں کی گئی ہے۔ مصنف پل پر سے موت کی چھلانگ لگانے والے شخص کی راہ سے معاشرے کے ناکارہ رویے پر سوالیہ نشان قائم کرتا ہے۔ افسانہ تحفظ اور تازگی پہنچانے کی معاشرتی نااہلی پر بلیغ طنز ہے۔

(۸)

عوض سعید کی تحریری گیرائی اعلیٰ سطح کی ہے۔ کبھی کبھی ان کا تخیل اس حد کو پہنچ جاتا ہے کہ اکثر جملے بھرپور مفکرانہ چمک کے ساتھ یا ضرب المثل کی طرح یا شعری آہنگ اختیار کرتے ہوئے بے اختیار سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

شیلٹر کے لیے ہم سب بھاگ رہے ہیں، ایک جگہ سے دوسری جگہ، دوسری جگہ سے تیسری جگہ، اس سائبان کی تلاش میں جہاں کوئی ایسا آدمی نہ ہو جو ہمارے قہقہوں کا گلا گھونٹ نہ دے۔ (موذی)

موت ناگ بن کر ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ (موذی)

جب چاہت حد سے سوا ہو جاتی ہے تو جا و بیجا امیدیں سر نکالا کرتی ہیں۔ (تولیہ)

ایک جانور دوسرے جانور کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ (نیرنی)

گہری نیند سے بیدار ہونا بھی گیان کی ایک منزل ہے۔ (مردہ گاڑی)

میں نے تمھیں بچالیا ہے تا کہ تم زندگی جیسے عذاب کا مزا چکھ سکو۔ (دشمن)

لہو کی بوندیں
گورے کالے
نیلے پیلے
چہروں کی تفسیریں
عقاب کے نکیلے پنجے
سڑی بسی نعشوں پر
بھوکے گدھوں کا ازدحام
کیا یہی وہ عذاب ہے
جس کے لیے ہمیں زمین ملی تھی
اپنی قبروں کے دروازے
مقفل کرلیں

(زمین کا عذاب)

غور طلب بات یہ ہے کہ ایسے جملے (یا شعری پارے جو بہت کم ہیں) الگ سے پیوست کیے ہوئے معلوم نہیں ہوتے بلکہ افسانوی بیان کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔

(۹)

اب آیئے "شال" کو بہ نظر غائر دیکھیں۔ یہ ایک علامتی افسانہ ہے جس میں قدم قدم پر کچھ اسی طرح کے جملے ملیں گے۔ ان کا بنیادی علامت "شال" سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تلازماتی تعلق ایک جال سا بن دیتا ہے۔

ہم تو سمندر میں پھینکی ہوئی وہ بادبانی کشتیاں ہیں جو ہوا کے اشارے پر چلتی ہیں۔ ہمارا کوئی ملاح نہیں ہے۔

ادھار مانگی ہوئی زندگی کے چہرے پر کوئی منچلا اگر (Paid) لکھ دے تو ہمیں شرمسار نہیں ہونا چاہیے۔ ندامت کا بار اٹھانے کیلئے تو ساری زندگی پڑی ہوئی ہے۔

اندرونی طور پر ہم سب موت کے بدصورت پرندے سے خائف ہیں۔ نہ جانے کب وہ پر پھیلائے اپنی نوکیلی چونچ ہمارے جسم میں داخل کردے۔

جملوں کے ٹریٹمنٹ کے حساب سے دیکھیے تو افسانے میں ایک پارہ ایسا بھی ملے گا جس میں پے درپے چھ جستیں (Jaunts) موجود ہیں۔

ایک نامعلوم نوجوان سلیٹی رنگ کی گرم اونی شال میں لپٹا ہوا سڑک عبور کر رہا تھا اچانک اس نے سینے میں سخت تکلیف کی شکایت کی اور طبی امداد ملنے سے پہلے ہی مر گیا۔ نعش مردہ خانے میں شناخت کے لیے رکھی گئی ہے میں کل سے اب تک مارا مارا پھر رہا ہوں تاکہ خود اپنی نعش کی شناخت کرسکوں میں اپنے وجود کی کرچیوں کو جمع کرتے کرتے اب لہولہان ہو چکا ہوں حرام زادو! کیا یہاں میری نعش کو چبانے آئے ہو... وہ دیوانگی کے عالم میں اپنے ایک ساتھی پر جھپٹ پڑا۔

یہ جستیں (Jaunts) نہ صرف افسانے کا اسلوب متعین کرتی ہیں بلکہ علامت کو قائم کرنے میں حددرجہ معاون ہیں۔ یہاں دیکھیے کہ 'نامعلوم نوجوان' میں۔وہ۔میں۔وہ کے رنگوں میں تبدیل ہوتا جاتا ہے۔

افسانے میں جگہ جگہ "شال" کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ مکالماتی فقرہ:

ارے میرے پاؤں تلے کوئی چیز دب کر رہ گئی ہے... کچھ بھی تو نہیں۔ فرش ہے جس پر ہم چل رہے ہیں۔

شہاب جعفری کے شعر ؎

چلے تو پاؤں کے نیچے کچل گئی کوئی شے
نشے کی جھونک میں دیکھا نہیں کہ دنیا ہے

پر طرح بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کا یہ فقرہ "شال" سے مربوط ہوتے ہوئے زندگی کی اصلیت پیش کر رہا ہے جہاں خبری ہی بے خبری نہیں بلکہ باخبر طرز زندگی بھی ہے۔

ہمیشہ کی طرح یہاں "شال" کا اختتامیہ بھی چونکاتا ہے۔ "یار میری شال کہاں گم ہوگئی؟" آغاز ہی سے شال کی نمائندگی اس کی تفہیم بھی پیدا کرتی ہے۔ شال کی تفہیم کو اچانک پن میں بدل دینا فنکار کا کمال ہے۔ شال کا نظر آنا پھر غائب ہو جانا اپنی طرح کی سریت خلق کرتا ہے۔ سرمئی شال، جو زندگی اور موت کے درمیان جھولتے رہنے کی علامت تھی معاً معدوم ہوگئی۔ شال کا غائب ہو جانا موت کا اعلانیہ بن جاتا ہے۔ مغنی تبسم کے بقول "واہمی شبیہ اور نفسی علائم کے استعمال سے (یہاں) ایک پراسرار فضا پیدا ہوگئی ہے۔" فقرے ہی نہیں افسانوی تشکیل کے سارے اجزا علامتی تلازموں کا ایک جال بن کر شال کی علامت پر مرتکز ہو جاتے ہیں۔

(۱۰)

اپنے افسانوں میں عوض سعید خود اپنی شخصیت کے حصار سے گریزاں ہو کر دوسری فردیت یا ذات (The Other) کے تقاضوں کی پرورش کرتے ہیں یا ان کی علامت بناتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی نجی علامت نگاری، ایک مشکل شخصی ترجمانی ہے۔ ٹھوس شے کی تصویریت ("گیندے کے پھول"، "سانپ"، "شال"، "آدمی"، "سینگ" وغیرہ) قاری کے تئیں ایسا ستمرا جذباتی ادراک پیدا کرتی ہے جسے پوری طرح بیان نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اکثر صدماتی انداز میں فردیت کے خالص مزاج (Mood) کی اس ہنرمندی سے مصوری کرتے ہیں کہ بیان ذاتی حد نظر سے نکل کر وسیع تر سرحدوں کے سفر کا عزم کرتا ہے ☆☆☆

آصف فرخی

بستر پر کوئی کیڑا نہیں تھا۔

جو چھونے سے پتہ چل رہا تھا، وہ میں تھا۔

سوتے سوتے میں چونک پڑا۔ ایک سرسراہٹ رینگ کر بستر میں غائب ہوگئی۔ میں نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھایا اور ٹٹول کر دیکھا۔ سفید چادر کی شکنیں ٹھنڈی تھیں، اتنے حصے کو چھوڑ کر جہاں میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ پھر میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ تکیہ ایک طرف سے مسک گیا تھا جہاں میرے سر کا نشان بن گیا تھا۔ گول اور خالی۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔

بے آرام نیند کے خوابوں سے آنکھ کھلی تو کیڑے نے دیکھا کہ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے وہ فرانز کافکا میں تبدیل ہو چکا ہے۔

رات میں کئی بار آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں چونک پڑتا ہوں۔ اٹھ اٹھ کر دیکھتا ہوں اور اطمینان کر لیتا ہوں کہ میں ہوں نہ۔۔۔ اپنے بستر پر پیٹھ کے بل لیٹا ہوں جو زرہ بکتر کی طرح سخت ہے اور گردن ذرا سی اٹھا کر دیکھتا ہوں کہ پیٹ اسی طرح جھلی دار اور بھورا ہے جو قوس کی طرح اٹھی ہوئی پسلیوں کی وجہ سے خانوں میں بٹا ہوا ہے اور اس بے طرح پھولے ہوئے پیٹ پر سے چادر پھسلی جا رہی ہے اور پتلی پتلی بہت ساری ٹانگیں، جو باقی بدن کے سامنے شرم ناک سی لگتی تھیں، آنکھوں کے سامنے بے یار و مددگار لہرا رہی ہیں۔ میں یہ روز دیکھتا تھا اور اطمینان سے آنکھیں موند لیتا تھا۔

اس مانوس قالب کی جگہ پیٹ اندر دھنسا ہوا تھا اور سینہ سانس لینے میں ہلتا تو اس پر بال نظر آتے۔ ٹانگیں دو تھیں اور شب خوابی کے دھاری دار لباس کے اندر کسی درخت کی دو ٹہنیوں کی طرح پڑی ہوئی تھیں۔ ایسی ٹہنیاں جن پر کوئی ہرا پتہ نہ تھا اور نہ چڑیوں کے آنے کا امکان۔ پیٹھ کے پیچھے کوئی ہموار روک نہیں تھی۔ ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرسراہٹ تھی اور اتنی جگہ خم آیا ہوا تھا۔

"یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟" میں نے سوچا۔ یہ خواب نہیں تھا۔

جیسا پہلے بھی ہوا تھا، میری آنکھیں پھر کھڑکی کی طرف اٹھیں، جس میں وہی امس بھرا موسم تھا۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ بوندوں کے ٹکر سے ٹکرانے کی کوئی آواز نہیں تھی۔ وہی بند ہوا کے گھٹے گھٹے گرم سانس... کیوں نہ چند لمحوں کے لیے دوبارہ سو جاؤں اور اس فضول بکواس کو بھول جاؤں؟ میں نے دل میں سوچا۔ مگر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ مشکل ثابت ہوگا۔ پہلے میں مضبوط پیٹھ کے بل، ہوا میں ٹانگیں اٹھائے اٹھائے سو جاتا تھا لیکن اس وقت مجھے لگ رہا تھا کہ میں چت لیٹا ہوا ہوں اور سانس کے ساتھ میرا پیٹ، میرا سینہ اوپر نیچے ہو رہا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا کمرہ ایک عام انسانی کمرہ ہے، بس قدرے مختصر ہے اور ان چار مانوس دیواروں کے درمیان ایک میز ہے جس کے ساتھ ایک تصویر لگی ہوئی ہے جو کسی رنگین رسالے سے کاٹ کر وہاں چپکائی تھی۔ ہر چیز اسی طرح تھی جیسے ہونی چاہیے تھی تصویر میں وہی عورت تھی جو پوستین والی ٹوپی اوڑھے بیٹھی تھی اور اس کا ایک بازو دستانے میں غائب ہوا جا رہا تھا۔

ہر چیز اسی طرح تھی اور مختلف۔ پیٹ پر کھجلی ہونے لگی اور میں نے کھجایا... وہ بہت دور معلوم ہو رہا تھا تو اس نامانوس لمس پر جھرجھری نہیں آئی۔ کیا اسے ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا؟ تب مجھے احساس ہوا کہ مجھے اٹھ جانا چاہیے۔ سستی کے عالم میں بدن کو... کس کے بدن کو؟... ڈھیلا چھوڑے میں کچھ دیر اور لیٹ رہنے کے بہانے ڈھونڈتا رہا اور وہ گڈمڈ خیالات میرے دماغ میں یورش کرتے رہے جن کو میں تھوڑا تھوڑا پہچانتا تھا... جانے کا وقت ہونے والا ہے، سواری چھوٹ نہ جائے۔ مجھے دفتر میں پہنچنا ہے، اگر جانے سے رہ گیا تو وہاں چیخ پکار مچے گی۔ میں یہ بھی بہانہ نہیں کر سکتا کہ میں بیمار پڑ گیا ہوں۔ پیسے تو مجھے حاصل کرنے ہی ہیں۔ ایک دفعہ اتنی رقم جوڑ لوں پھر پائی پائی چکا دوں گا۔ ابھی تو اس میں چند سال اور لگیں گے، اس کے بعد سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنی مرضی سے چلا جاؤں گا... لیکن ابھی تو اٹھ جاؤں، گاڑی کا وقت سر پر آ گیا ہے۔

میں ابھی بستر سے اٹھ بھی نہیں پایا تھا اور یہ خیالات آندھی کے جھکڑ کی طرح ذہن میں تیزی کے ساتھ باقاعدہ چل رہے تھے کہ دروازہ چرچرایا... وہی

دروازہ جو بستر کے سرہانے کے ساتھ تھا۔ پونے سات بج گئے ہیں۔ فرانز، کیا آج جانا نہیں ہے؟ کسی نے پکار کر کہا۔ یہ اس نے پہچان لیا کہ ماں کی آواز تھی۔ فرانز کی ماں... اس کی ماں؟

فرانز... ماں صبح سویرے اٹھا رہی ہے، تو یہی ہوں گا میں؟ اور اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہوں؟ میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا میں نے فوراً اسے پہچان لیا۔ وہ مریض، زرد رو، وقت سے پہلے بوڑھا ہو جانے والا چہرہ جس پر مسکراہٹ کا شائبہ تک نہ تھا اور جسے ہمیشہ ہاف ٹون کی تصویروں میں دیکھا، پینگوئن بکس Penguin Books کے نشان کی طرح جس میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے آئینہ دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

تو آخر کار میرا نام مل ہی گیا۔ نہ وہ خوف تھا اور نہ خوشی بلکہ دونوں کی ملی جلی کیفیت جس نے مجھے پہچان لیے جانے کے احساس کے ساتھ آلیا۔ اچھا، تو پھر میں فرانز کافکا بن گیا ہوں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں ایسا ہو جاؤں گا۔ کون ستارے چھو سکتا ہے، راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے... خیالات بہت تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں گھوم رہے تھے... تو کیا میں نے ستارہ چھو لیا ہے؟ وہ میرے لیے ایک ناممکن الحصول آدرش نہیں تھا؟ وہ میرے لیے نہیں بلکہ ان بدلے ہوئے حالات کے مطابق، میں اپنے لیے... مگر میری یہ سوچ تو اردو ہے۔ مجھے اب ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے اب اس کی ضرورت بھی نہیں... آنکھ کھلنے کے بعد سے پہلی بار میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ تیسری دنیا کے ایک پس ماندہ ملک کا ادیب جس کی زبان کوئی اور نہیں سمجھتا اور یہ سب الم غلم، فضول بکواس، نہ اب یورپی زبانوں میں ترجمہ ہونے کی حسرت اور نہ یہ گلہ کہ میری تحریروں کو پڑھنے والے نہیں ملتے۔ محاورے کی فکر اور زبان کے نیال کی بھی ضرورت نہیں... اب مجھے کیا فکر کہ اردو پڑھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں، جو پڑھ سکتے ہیں وہ پڑھتے نہیں۔ رسم الخط ہندوستان میں مٹتا جا رہا ہے اور زبان پاکستان میں۔ اردو کے بارے میں کڑھنے کی اب مجھے کوئی ضرورت نہیں، میں تو جرمن کا ادیب ہوں... جیسے بند کمرے سے نکل کر کھلے میدان میں سانس لینے لگا ہوں۔ میں نے دو چار لمبے لمبے سانس بھرے۔ لیکن یہ خوشیوں بھرا اطمینان زیادہ دیر میرے ساتھ نہیں چلا۔ جرمن ادیب تو ٹھیک ہے مگر وہ جس شہر میں رہتا تھا، وہ اور اس کی برادری کے علاوہ تو سب لوگ ایک اور زبان بولتے تھے۔ چیک زبان۔ لیجیے، ایک اور مشکل۔ یک نہ شد دو شد۔ یہ محاورے یا ضرب الامثال وغیرہ کیا مجھے خود بھول جائیں گے یا اس کے لیے محنت کرنا ہو گی؟ اور یہ کیسے سوچ لیا کہ جس شہر میں وہ رہتا تھا... جس شہر میں، میں رہتا ہوں۔ شہر کے لوگ، پراگ، دوسری زبان جرمن... مگر جرمن میں کون سی عافیت ہے، مجھے خیال آیا۔ اس کے لیے کچھ کم جتن کرنے ہوں گے۔ وہ CH کے صحیح تلفظ کے لیے خ اور شین کے درمیان کی آواز کیسے نکلے گی؟ اور وہ تقسیم ہو جانے والے افعال کے جملے کیسے بناؤں گا جن میں آدھا فعل شروع میں آتا ہے اور باقی آدھا بعد میں کہیں؟ مجھے یاد تھا کہ میں نے جرمن پڑھنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ Das hst gutt۔ اور Auf wiederselun اور Na Ja (بیک وقت ہاں اور نہ!) اور Bittl اور اسی قسم کے ریزگاری جیسے الفاظ میں آگے بڑھنے کا موقع آیا تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ جرمن زبان پر گرفت حاصل کرنے کے لیے میری زندگی بہت تھوڑی ہے۔ اب کیا ہوگا؟ کاش میں نے اس وقت دل لگا کر سبق یاد کر لیے ہوتے۔ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ والوں نے تو کئی بات منھ پھوڑ کر مجھ سے کہا بھی... اوہ خدایا، پھر وہی اردو کا محاورہ، بھلا کوئی جرمن ادیب ہو سکتا ہے جو جرمن پڑھنے سے بھاگ کھڑا ہوا ہو؟ یہ میں ہوں، کافکا کے کیڑے سے بھی زیادہ مشکل... اب کیا کروں؟ لوگ مجھ سے جرمن بولیں گے تو میں کیا جواب دوں گا؟ ایسی کوشش کروں گا:

Mani Damen und Herren.Mein name ist Asif Farrukhi, Naja Na Ja Enschul diging. Bitte Sohoon. leh bin ein Franz Kafka ja ja Kafka, Kaf Ka میں نے زور سے نام ادا کیا۔ پھر مجھے ایک اور بات پر اطمینان ہوا اردو کے ساتھ ساتھ اپنے نام سے چھٹکارا ملا۔ چھپکلی کی دم کی طرح آن کر مجھ سے چپک گیا تھا۔ کاٹنے پر بھی الگ نہیں ہوتا تھا۔ ہر ایک کو صحیح تلفظ بتانا نہیں پڑے گا۔ جی نہیں، فاروقی نام نہیں ہے۔ فرخی، فرخ، فوخ سے فرخی وہ گیا ہے، اصل میں میرے والد فرخ آباد سے آئے تھے، تو انھوں نے اپنا نام فرخی رکھ لیا۔ جی نہیں، خاندانی نام تو ہمارا اصل میں صدیقی ہے...

فرخ آباد اور یہ سب بھی گیا۔ جیسے میرے کاندھوں سے بڑا بھاری بوجھ اتر گیا۔ فرخ آباد۔ میں نے اس نام کو ذہن سے یوں جھٹک دیا جیسے کوئی ریت پر سے لکیریں مٹا دیتا ہے۔ مجھے اب اس سے دلچسپی لینے کی کوئی ضرورت نہیں رہی اور میں نے یہ شہر کبھی نہیں دیکھا تو اب کوئی مضائقہ نہیں۔ دور دراز کے اتر پردیش کی دھند میں لپٹے ہوئے چھوٹے سے شہر کو میں نے ذہن سے یوں ہٹا دینا چاہا جیسے کوئی چیونٹی یا مچھر کو جسم پر سے الگ کر دیتا ہے۔ مجھے اب اس سے بھلا کیا سروکار؟ رہے وہ اپنے حال میں اور سمیٹے رہے ان سب لوگوں کو جن کے ذکر سے میں یوں بھی اوبھ چکا تھا۔

"آئیں اچھی آپا، تمھیں فہمن یاد ہیں؟ اور ہنتو؟ اور وہ جوئس جس کی ماں ٹڈوائف تھی؟"

میرے چچا اور پھپھیاں خاندانی اجتماعات کے موقع پر ایک دوسرے سے اس طرح کے مذاق کیا کرتے تھے۔ نہ کہیں! تم کو ایسے تکے بے تکے نام یاد آئے چلے جاتے ہیں... وہ ہمارے کیا لگتے تھے؟ کوئی نہ کوئی اس مذاق کو برا بھی مان جاتا۔ اور اختر باجی کی وہ سہیلی جو یکہ بھجوایا کرتی تھی ان کو بلانے کے لیے... پاکستان آنے کے بعد تک تو خط آتے تھے۔ پھر اس نے کہلوا بھیجا کہ اب ہمیں خط نہ لکھنا، ہماری شادی ایک فوجی سے ہو گئی ہے... ہونہہ، چھوڑو بھی، کہاں پرانے قصے لے بیٹھے... اب میں بھی بیزاری اور لاتعلقی سے کندھے جھٹک کر اٹھوں گا اور اپنی جگہ بدل لوں گا۔ اب مجھ پر اس ذکر کو سننے کی اخلاقی پابندی بھی نہیں رہی۔ اور نہ خاندان کا دباؤ۔ اب میں آزاد ہوں دنیا کے چمن میں... نہیں نہیں، پراگ کے شہر میں!

یوں بدل جانے سے اور بھی تو کئی چیزوں سے چھٹکارا مل گیا، مجھے خیال آیا۔ نام کے ساتھ پچھلا بدن بھی گیا اور اس کے رنگ ڈھنگ بھی۔ اب مجھے

ذیابیطس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ آموں سے بھری قابیں اور حلوے کی پلیٹیں میری آنکھوں کے سامنے سے گذرنے لگیں۔ اب ان پر ہاتھ روک کر اور کلیجہ مسوس کر رہ جانے کی ضرورت نہیں۔ کافکا کو ذیابیطس نہیں تھی تو ٹی بی تو تھی اور مجھے کافکا کی اسی بیماری سے مرنا بھی پڑے گا۔ آموں کی قاب اور حلوے کی پلیٹوں پر خون کے سرخ سرخ چھینٹے ابھر آئے۔ اسٹرپٹو مائسین (Streptomycin) کافکا کے بعد کی ایجاد ہے؟ میں نے غور کرنا چاہا مگر اس کا جواب یاد نہیں آیا۔ ویسے بھی یاد اس وقت بہت گڈمڈ ہو رہی تھی۔

اچھا، تو یہ ہو گیا۔ میں وہ بن گیا، فرانز کافکا۔ میں نے اپنے ذہن کو واضح اور مرتکز کرنا چاہا۔ فرانز کافکا کا نام کیا میری مدد کر سکے گا؟ فرانز کافکا، میں نے اپنے نام کا ورد کرنا چاہا۔ اندر ہی اندر، مجھے اس نام پر ایک اطمینان تھا۔ جیسے میں نے کچھ حاصل کر لیا ہو۔ شادم از زندگانی خویش کہ کارے کردم، وغیرہ وغیرہ۔ جیسے میں نے کچھ بن کر دنیا کو دکھا دیا ہو۔ اگر کافکا نہ ہوتا تو میں دنیا کو کیا منہ دکھاتا؟ اگر مجھے کچھ بننا ہوتا تو میں کون سا ادیب بنتا؟ کامیو؟ نہیں۔ میں اتنی جوان موت مرنا نہیں چاہتا۔ سارتر نہیں۔ ژاں ژنے (Jean Genet) کی وجہ سے۔ ورجینیا وولف بھی نہیں۔ وہ تو لیزبین (Lesbian) تھی، رہی سہی مردانگی سے ہاتھ الگ دھونے پڑتے۔ لارڈ بائرن ٹھیک رہتا۔ شاعری بھی ٹھیک اور عشق کے مواقع بے شمار۔ اور ہنری جیمز کیوں نہیں؟ اور پھر انگریزی کا ادیب ہی کیوں بنوں؟ فرانسیسی، روسی بلکہ اب تو لاطینی امریکی... مگر میں اپنے حالات کی تقدیر کہاں بدل سکتا ہوں؟ ورنہ پہلے تو یہ عالم تھا کہ شام ہوئی اور طبیعت اس جون میں گھبرانے لگی۔ روح اجنبی مکان میں آ گئی۔

''اٹھ جاؤ، فرانز! صبح ہو گئی ہے۔ دفتر کو دیر ہو رہی ہے!'' یہ آواز امی کی نہیں ہے۔ ایک لحہ لگتا ہے اور میں پہچان جاتا ہوں۔ بھلا ان کو بھول بھی کیسے سکتا ہوں؟ یہ میری کہانی کے اتنے اہم کردار ہیں۔

''میں اٹھ گیا ہوں، ابو۔'' میں جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے ان کو ابو کے بجائے کچھ اور کہنا چاہیے۔ احترام اور خوف کے ساتھ۔ جرمن میں کیا لفظ ہوگا۔ فرانز کافکا اپنے باپ کو کیا کہتا تھا؟

"Dearest Father,

You asked me me recently why I maintain I am a Friend of yours.

مجھے یاد آ گیا۔ کیا میں نے اپنے باپ کے نام وہ خط لکھ ڈالا تھا جو اب کتابوں میں چھپتا ہے؟ میرا مطلب ہے، اس کے باپ کے نام ایک بیٹے کی حیثیت سے؟ میں نے وہ خط بہت پہلے افسانوں کی کتاب میں پڑھا تھا۔ تب میں، میں تھا۔

اس وقت میرے ابو اور تھے، میرے آصف فرخی والے ابو۔ کافکا کے ابا کی آواز سن کر مجھے وہ پہلے والے ابو یاد آنے لگے۔ وہ صبح اس طرح تو نہیں اٹھاتے تھے۔ اور رات کے وقت پانی مانگنے پر یوں بند دروازے کے باہر کھڑا بھی نہیں کر دیتے تھے۔ مگر میں نے بھی تو ان سے ضد کرنے اور تنگ کرنے کے لیے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ تو بہت سی باتیں کہتے ہیں (کہتے تھے، جب وہ میرے ابو تھے) مگر مجھے سب یاد نہیں کہ بہت بچپن میں، میں کیسا تھا۔ ضدی، بے کہنے، مرکھنا، سوکھا، رریاتا ہوا۔ اور کیسا ہوں گا؟ کافکا کے بچپن میں؟ کیا اس کے ذمہ دار وہ ہیں، جن کی وجہ سے میں ایسا ہو گیا؟

Something is wrong in our relationship. کافکا نے میرے ابو کے نام خط میں صاف لکھ دیا تھا.

I'm not going to say,of course, that I have become what I am only as a result of your influence.

اس خط کے فقرے حفظ ہو گئے تھے جب میں نے اسے پہلی بار پڑھا۔ پھر متواتر پڑھتا گیا۔ کافکا نے یہ خط اس لیے لکھا تھا کہ وہ ان کا سامنا نہیں کر سکتا تھا (بزدل کہیں کا، میرے ابو کا سامنا نہیں کر سکتا تھا)۔ مجھے ہی دیکھتا اور ان کے سامنے دلیل کے ساتھ بات نہیں کر سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ کافکا کے دروازے پر میرے ابو آن کر کھڑے ہوئے ہیں۔ سامنے کے رخ سے کم ہوتے ہوئے بال جھٹک کر وہ وہاں آئے ہیں۔ سفید براق کرتا پاجامہ پہنے ہوئے۔ آدھی رات کے بہت بعد کی کوئی نماز پڑھ کر مجھ پر دم کر رہے ہیں۔ یا پھر حسب عادت کسی پرانے استاد کی غزل کے اشعار زیر لب پڑھ رہے ہیں۔ میں نے فارسی کیوں نہیں پڑھی، مجھے اشعار یاد کیوں نہیں رہتے۔ میں اتنا موٹا کیوں ہو گیا، میرا رنگ کیوں جل گیا؟ میری زندگی ان سے جہاں مختلف ہوئی، کیا وہ انحراف ہے؟ کیا میں اس زندگی کا مجرم ہوں؟ مجھ پر ایک بار پھر ''مقدمہ'' چلایا جائے۔ میں ''قلعے'' سے باہر نہیں آ رہا۔ نہیں، نہیں، میں اس کا اہل نہیں۔ یہ سب کافکا کے لیے ہی رہنے دو...

No, I am not prince Hamlet,
Nor was I meant to be

یہ کہاں سے یاد آ گیا؟ میں ٹی ایس ایلیٹ کیوں نہیں بن سکتا؟ یا پھر شیکسپیئر... وہ تو سب کچھ تھا اور کچھ نہیں۔ شیکسپیئر کے ابو اس کے ساتھ کیسے تھے؟ کیا میں یہ خط اپنی امی کے نام لکھ دوں؟

نہیں، نہیں، مجھے اس کی زندگی (دراصل اپنی زندگی) کے کردار اور حالات میں ایسی تبدیلی لانے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے کیا حق پہنچتا ہے اس کی زندگی میں تحریف کرنے کی؟ اگر میں اس کی زندگی بدل سکتا تو کیا میں ساری کتابوں کے مسودے جلا ڈالنے کی وصیت کرتا؟ کیا میں میلینا سے منگنی دوسری بار بھی توڑ ڈالتا؟ کیا میں یہ کافکائی زندگی لیے کراچی آ جاتا؟

(۸)

دروازے پر ماں کی نرم، پہلی دستک ایک درشت اصرار میں بدل گئی تھی اور ابا پکارے جا رہے تھے۔ ''صبح ہو گئی ہے، فرانز تمھیں دفتر بھی جانا ہے۔'' مگر میری تو جیسے ٹانگیں بے جان ہو گئی تھیں۔ ان میں اتنا دم نہیں تھا کہ سہارا دے کر مجھے

اٹھائیں اور بستر سے غسل خانے کی طرف لے جائیں۔ ہاتھوں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اگر میں اٹھ بھی جاؤں تو منھ دھولوں۔ بستر سے اٹھ کر میں زندگی کا سامنا کیسے کروں، اپنی زندگی، فرانز کافکا کی زندگی... بستر میں لیٹے رہنے میں عافیت تھی، مگر کب تک؟ اٹھوں گا تو فرانز کافکا کے گھر والوں کا سامنا کرنا پڑے گا جو اب میرے گھر والے بن چکے ہیں۔ مجھے معلوم ہے انھوں نے گریگر سامسا (Gregor Samsa) کے ساتھ کیا کیا تھا۔ نفرت بھری گھن، پھر باقی سب کی نظروں سے دور ایک کمرے میں بند، جہاں ملازمہ آسکتی ہے یا ماں اور پھر آخر میں اکتائی ہوئی اور بیزار لاتعلقی۔ ایک ستم ناک باقاعدگی سے وہ اپنے روزمرہ کے معمول نبھا رہے تھے جب کہ اس کمرے کی ایک دیوار کے پیچھے، محض ایک دروازے کے بازو وہ کیڑا بن کر رہ گیا تھا۔ ''میں ان کا بھی سامنا کر سکتا ہوں'' میں نے اپنے آپ کو تسلی دینا چاہی۔ مگر فوراً ہی ایک اور خیال نے جکڑ لیا۔ ایک بار سامنا کر لیا تو پھر ان کے بارے میں لکھنا پڑے گا۔ لکھنا، یہ اپنانے کی سب سے زیادہ تکلیف دہ شکل ہے۔ میں ان کے بارے میں کیسے لکھوں گا؟ میں ان کو اتنا جانتا ہی کہاں ہوں۔ میرا یہ خاندان دراصل غیر ملکی ہے۔ یہ کوئی اور زبان بولتے ہیں اور ان کے رسم و رواج، عقیدے بھی مختلف ہیں۔ میں تو اپنے ہی آپ میں اس قدر گلے گلے ڈوبا ہوا ہوں کہ ان کے کسی کے بھی بارے میں کیا لکھ سکتا ہوں؟ خالی، کھوکھلے لفظ، اتاری ہوئی کینچلیاں جن کے اندر کا کیڑا رینگتا ہوا کہیں اور چلا گیا ہے۔ وہ رینگتا ہوا اور سرسراتا ہوا دراصل میں ہی ہوں جسے یہ بھی ٹھیک طرح سے نہیں معلوم کہ وہ کس ذات کا کیڑا ہے۔

آدمی کا کیڑا بن جانا کافی نہیں ہے۔ میرے واسطے یہ تلخ حقیقت.. .بلکہ کوئی ایک مخصوص کیڑا۔ اپنی مخصوص وضع قطع کا کیڑا جو ایک زندہ حقیقت ہے۔ محض کیڑا نہیں بلکہ مکھی، مچھر، مکڑی، جوں، ٹڈا اور پھر مچھر میں بھی اینوفیلیز (Anopheles) یا کیولکس۔ اور اینوفیلیز میں نر یا مادہ۔ جس کے ہونے نہ ہونے پر ملیریا کا دارومدار ہوتا ہے۔ ہاں، اس عالم میں بھی میں درسیات کو بھولا نہیں ہوں۔ مگر یہ فتح بہت ادنیٰ درجے کی ہے، اگر اسے فتح کہا بھی جا سکے۔ محض ایک کیڑا... مگر کافکا کی مراد واقعی کون سے کیڑے سے تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہیں پڑھا تھا کہ ولادی میر نابوکوف (Vladimir Nabokov) نے اس پر بحث کی تھی کہ یہ دراصل beetle ہے مگر نہ گریگر سامسا (Gregor Samsa) نے اور نہ کافکا نے اس کو پوری وضاحت کے ساتھ دیکھا ہے۔ نابوکوف مابعد کافکا کا ماہر فن افسانہ نگار ہی نہیں، حشرات الارض کا ماہر بھی تھا۔ کیا پرلطف کتابیں ہیں اس کی اور خاص طور پر ''لولیتا''! میں نابوکوف کیوں نہ بن گیا؟ جلاوطنی کے باوجود اس نے بہت دولت کمائی، سوئٹزر لینڈ کے ایک ہوٹل میں مستقل کمرہ لیے رہتا تھا۔ اس کی بیوی بھی خوبصورت تھی اور ایک آدھ تتلی کا نام بھی اس کے نام پر رکھا گیا ہے، اس لیے کہ وہ تتلیاں پکڑتا تھا۔ اس لیے تو اس نے اعتراض کیا کہ وہ کیڑا پردار تھا مگر کافکا کو اس کے پر نظر نہیں آئے۔ اور یہ صبح سویرے اٹھ کر نامانوس کمرے میں تحیر اور خوف کی ہلکی سی لہر اور کچھ نہیں ٹریولنگ سیلز مین کی گھبراہٹ ہے، اس لیے کہ پیشے کے اعتبار سے کافکا بھی یہی تھا۔ یہ بھی میں نے کہیں پڑھا تھا۔ ایک زمانے میں کافکا کے بارے میں تنقیدی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھا کرتا تھا۔ کافکا پر لکھی جانے والی تنقید کے انبار سے نبٹنا کسی بھی لکھنے والے کو کیڑا بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ محض ایک کیڑا جس کی شناخت واضح نہیں ہے، اور پر کچلے جا چکے ہیں۔

پچھلے جنم کی بات کی طرح سے ایک دھندلی، مٹی مٹی سی یاد ہے وہ ساری زندگی ایک دھبے کی طرح جس پر کوئی اور تصویر بنا دی گئی ہو۔ اب مجھے یہی زندگی گزارنا ہے۔ ایک بار میری کایا کلپ ہو چکی ہے۔ جب میں آصف فرخی تھا، تبھی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کیڑا ہونا لغوی اعتبار سے غلط ہے۔ سارے مترجمین نے میرے ساتھ غداری کی ہے اینٹا مورفوسس (Metamorphosis) کا نام ہی غلط ہے اور کافکا نے کیڑے کو بہت واضح اور ایک مخصوص کیڑا لکھا تھا۔ وہ بھنگا نہیں، جل چٹا نہیں، لال بیگ نہیں۔ نقاد طے کریں گے کہ آیا وہ man-sized wood louse ہے یا vermin جس کے بہت سارے علامتی اور استعاراتی مضمرات ہیں۔ مگر اپنی اس حالت کو علامت یا استعارہ کیسے کہہ دوں؟ میری تکلیف تو احوال واقعی ہے۔ میری کہانی، فرانز کافکا کی زبانی یا vice-versa۔

اس کا فیصلہ ہم دونوں میں سے کون کرے گا، میں یا فرانز کافکا؟ امی دستک دے رہی ہیں، ابو پکار رہے ہیں۔ فرانز کافکا کی صبح میں بیدار ہوتا ہے۔ ایک حقیر سا کیڑا بننے بنے دعا مانگی تھی، میں بڑا کیوں ہوا۔ ابھی اٹھتا ہوں۔ ذرا دیکھ لوں کہ مجھے دیکھ کر فرانز کافکا کے گھر والوں کا کیا ردعمل ہوگا، اس سے مختلف جو کافکا کو دیکھ کر میرے گھر والوں کا تھا... افق کی دو لکیروں کی طرح میری اور کافکا کی تقدیریں کہاں الگ ہوں گی اور کیا اس مقام پر، اس بستر پر حیران پریشان ایک کیڑا ہوگا جو دراصل اب کیڑا نہیں رہا ہوگا... ☆☆☆

حریم دورنگ

شمس الرحمٰن فاروقی شاعر اور افسانہ نگار

معاصر ادب کے تنقیدی اور تجزیاتی مطالعات میں ایک نمایاں اضافہ، بے لاگ محاکمے کی اعلیٰ مثال

از

محمد منصور عالم

قیمت : ۲۰۰ روپئے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

آصف فرخی

شہر کے ساتھ سمندر پہلی مرتبہ اپنی ماں کی طرح اس دن لگا جب اس نے میرا گلا دبانا شروع کیا۔

آدھی سے زیادہ رات گذرنے کے بعد ڈھائی، پونے تین بج رہے ہوں گے۔ یعنی وہ گھڑی گذر چکی تھی جب میرے بے خوابی عام راتوں میں عروج پر ہوتی ہے۔ پورے دن کی تھکن اور نیند سے محروم باقی ماندہ رات کے تصور سے بے آرام بستر میں کروٹیں لیتے رہنے، کبھی چادر اوڑھنے کبھی اتارنے، تکیے میں منھ دے کر دیکھنے کی بے سود کوشش کرتے رہنے کے بعد میں اپنے سر کے بال نوچنے کے لے تیار ہو جاتا ہوں۔ نیند کسی طور آ کے نہیں دیتی اور اس گھڑی یہ پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ ہو کر رہے گا۔ لیکن وہ گھڑی آئی اور آ کر گذر گئی۔ مجھے اونگھ آ گئی ہو گی، اس لیے کہ مجھے اس وقت پڑے جاگتے رہنا یاد نہیں ہے۔ ورنہ باقی تمام راتوں کے ایک ایک لمحے کی اذیت، آنکھوں میں چبھتی ہوئی سوئیوں کی طرح میرے ذہن پر مرتسم ہے۔

بے خوابی کی ریت آنکھوں میں بھری رہتی ہے۔ نیند کا سمندر آتے آتے پلٹ جاتا ہے۔ میں دیکھتا رہ جاتا ہوں۔

اس رات نیند کا جھونکا آ گیا۔ جانے کیسے۔ اور اسی کی یہ سزا ملی۔

سوتے جاگتے، اونگھتے ٹہلتے کی جانے کون سی گھڑی تھی کہ آنکھ گھبرا کر کھل گئی۔ ایسا لگا کہ کوئی گلا دبا رہا ہے۔ معاً مجھے امی جان کا خیال آیا۔ نہیں، امی، ایسا تو مت کیجیے... یہ لمس ان کی انگلیوں کا نہیں تھا... کوئی میرے سینے پر چڑھا بیٹھا ہے اور مضبوط ہاتھوں سے میرا گلا دبوچے ہوئے ہے۔ میرے گردن پر کسی ہاتھ کی گرفت نہیں تھی، مگر خیال امی کا آیا۔ کانوں بھری ٹہنی سے کسی نے میرا چہرہ لہولہان کر ڈالا۔ میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ لیکن اٹھ بھی نہ سکا، نڈھال ہو کر فوراً بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ سینے پر بوجھ سا تھا۔ گلے میں ایک ٹیس اٹھی اور چبھتا ہوا درد گھونٹ گھونٹ حلق میں کڑواہٹ گھولنے لگا۔ اترتے اترتے زور سے لپکا اور پھر رک گیا۔ مگر درد تھما نہیں۔ پھر لوٹ کر آیا۔ پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ۔ جیسے کسی نے میری گردن کو دو کڑے کھردرے ہاتھوں میں گھیر رکھا ہے اور اس زور سے بوجھ ڈال رہا ہے کہ گردن ٹوٹ جائے گی۔ نرخرہ پھٹ جائے گا۔ گردن کی رگیں تن کر پھولیں گی۔ پھر چٹک جائیں گی۔ میں نے گھبرا کر چیخنا چاہا۔ امی! امی جان! یہ مت کریں، آپ کو خدا کا واسطہ یہ مت کریں! لیکن میری آواز گھٹ کر رہ گئی۔ حلق سے خرخراہٹ کے سوا کوئی آواز نہیں نکلی، اور یہ گھٹی ہوئی آواز پھنس کر میری گردن میں بل ڈالنے لگی، اسے بھینچنے لگی۔

مگر امی نے میری آواز نہیں سنی۔ انھوں نے میری بات نہیں مانی۔ گردن جیسے اس بوجھ سے اکڑنے لگی، اب یہ میری برداشت سے باہر ہوا جا رہا تھا۔

کچی نیند کا شائبہ کب کا اچٹ چکا تھا۔ میں نے چادر اتار کر ایک طرف ڈال دی اور بستر سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرے کا گدلا اندھیرا دھند کی طرح آنکھوں میں پھیل رہا تھا۔ اٹھ کر کمرے کی بتی جلانا بھی بہت مشکل لگ رہا تھا۔ گردن تھی کہ اس پر کھنچاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر مجھے کچھ بھی کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میری خرخراہٹ سے بستر کی دوسری طرف وہ چونک گئی۔ اس کی آنکھ میری کراہ سے نہیں کھلی، کیونکہ وہ تو پہلے سے جاگی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند نہیں، مرچیں سی بھری ہوئی تھیں اور وہ آنکھوں کو مسلے جا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے گردن گھما کر میں نے اس کی طرف منھ کیا۔ گدلے اندھیرے میں بھی وہ آنکھیں سرخ نظر آ رہی تھیں اور ڈبڈبائی ہوئی... وہ ہانپ رہی تھی۔

سینے میں سانس سمیٹتے ہوئے اس نے اٹک اٹک کر کہا، "یہاں کچھ ہے!"

اس کی آواز ٹوٹ کر اندھیرے میں بکھر رہی تھی۔ "یہاں کچھ ہے۔ یہاں سے نکلو، بھاگو!"

اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے میں اس کی طرف دیکھے گیا۔ اس کے خدوخال بھی صاف نہیں تھے۔ پھٹی پھٹی آواز اور ہاتھوں سے مسلی ہوئی وہ لال لال آنکھیں۔ آواز گونج رہی تھی، "بھاگو! کچھ ہے..."

نام سے بھی پہلے، اس کی ایک موجودگی تھی۔ امی جان کے علاوہ....

اس کی آواز کھوکھلی ہوئی، پھر چٹک گئی۔ اسے دوبارہ نہ سننا پڑے، اس خوف نے مجھے بستر سے دھکیل دیا۔ میں نے اپنی گردن کو ٹٹولا۔ اس پر کسی کی انگلیوں کی گرفت نہیں تھی لیکن دباؤ اسی طرح تھا۔ اور چیزوں سے ٹکراتے ہوئے چپل پہننے کے لیے میں نے پاؤں بڑھایا لیکن پیر کا انگوٹھا اس کی پٹی کی سیدھ میں نہیں آتا تھا، بار بار باہر نکل جاتا تھا۔ ہلکورے لیتا ہوا یہ درد... رک کے تو چیزیں بھی اپنی جگہ قائم رہیں۔ مگر وہ گھٹن جاری رہی اور اسی طرح چپل آدھی اٹکا کر آدمی گھسیٹتا ہوا اٹھا، کمرے کی دہشت اور التجا بھری نصف طوالت طے کرتا ہوا اس کے بستر تک آیا۔ میری وہاں موجودگی سے بے خبر وہ آنکھیں ملے جا رہی تھی اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائے جا رہی تھی۔ میں نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔ ٹھنڈی مٹی کے بے جان ڈھیر کی طرح وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی گرنے لگی۔ میں نے سہارا دے کر اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ جہاں دروازہ ہونا چاہیے تھا، وہاں اندھیرا دبیز تھا۔ چابی قفل میں ہی لگی ہوئی تھی اور اس کی ٹھنڈی دھات الگ سے نظر آ رہی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی ایک بھبھکا سا آیا اور ہم کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے کمرے سے باہر آئے۔ تام سے پہلے، یہاں اس کی ایک موجودگی تھی۔ امی جان کے علاوہ... ہمیں اس سے بچنا تھا۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے، اس کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ ہم کہاں جا سکتے تھے، یہ معلوم نہیں تھا۔ کسی طرح اس سے بچ سکیں جو کمرے میں آ گئی تھی، جو گھر میں بھر رہی تھی۔

میں کھانس رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہ رہا تھا۔ سوتے ہوئے بچوں کو کپڑوں کی گٹھڑی کی طرح پچھلی سیٹ پر ڈالا اور گاڑی کو دیوانہ وار چلانا شروع کر دیا۔ مجھے ہوش بھی نہیں تھا کہ میں نے کہاں کہاں تالا لگایا ہے اور کہاں گھر کو یوں ہی کھلا چھوڑ دیا ہے۔ بس اتنا اندازہ تھا کہ گاڑی کا رخ خود ہی شہر کی طرف تھا، سمندر کے مخالف رخ پر۔

ہوا میں کاٹ سی تھی، ہم ابھی گھر سے نکلے ہی ہوں گے کہ مجھے احساس ہوا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کا شیشہ اوپر کر لیا۔ ہر حرکت میں اس طرح کر رہا تھا جیسے نیند میں چل رہا ہوں۔ آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی پوری طرح عادی بھی نہ ہوئی تھیں اور گاڑی کی رفتار نے تیزی بھی اختیار نہ کی تھی کہ بہت قریب سے ہو کر نکلنے والی ایک گاڑی کے ہارن نے مجھے چونکا دیا۔ تیزی سے بریک لگانے سے سڑک کی بجری پر ٹائر چرچرائے اور ہارن بج اٹھے۔ میں گاڑی چلاتے چلاتے ٹھٹھک گیا۔ تب مجھے بدبو کا احساس ہوا۔ ایک بھبھکا سا سانس کے ساتھ آیا۔ پھر جیسے نتھنے مرچوں سے بھر گئے۔ میری آنکھوں میں بھی جلن ہونے لگی اور ان سے پانی بہنے لگا۔ بدبو کا بھبھکا اتنا تیز تھا کہ ناک اور حلق میں ٹھنس گیا تھا۔ میں نے منہ بند کر لیا اور ہونٹ بھینچ لیے۔ بدبو گاڑی میں بھر رہی تھی، اس سے بچ کر نکلنا مشکل لگ رہا تھا۔ گھنی، گاڑھی بدبو، اتنی دبیز کہ چاقو سے کاٹ لو۔ مگر وہ خود ہی چاقو کی طرح ناک اور حلق کو کھرچ کر رکھ دے۔ نہیں، وہ گھنی بھی نہیں تھی، اس کے مرغولے تھے جو رہ رہ کر ہوا میں پھیل رہے تھے اور ناک میں اترے جا رہے تھے۔ میرے دونوں ہاتھ اسٹیرنگ وہیل کو تھامنے کے بجائے آنکھوں کو مسل رہے تھے کہ برابر میں ایک گاڑی نے تیزی سے بریک لگائے اور زور سے رکی ورنہ میری گاڑی تو اس سے بھڑ ہی گئی تھی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ اتنے ہی قریب ایک گاڑی اور تھی، اس کے برابر ایک اور... سامنے والی گاڑی ابھی چلی ہی نہ تھی اور پیچھے سے ایک اور آ رہی تھی۔ اس کے ڈرائیور نے بھی جیسے ہارن پر ہاتھ رکھ کر باقی سب کچھ بھلا دیا تھا۔

سڑک گاڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ سب لوگ سمندر کی طرف پیٹھ کر کے شہر کا رخ کر رہے تھے۔ ہوا بوجھل تھی اور بدبو ناقابلِ برداشت۔ میں اب امی جان کے بارے میں بالکل نہیں سوچ رہا تھا۔ گاڑی کے آگے گاڑی آ گئی تھی۔ سڑک سے اتر کر کچے میں لوگوں نے گاڑیاں ڈال دی تھیں۔ ہارن چیخ رہے تھے، دونوں طرف سے گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ پولیس کے سپاہی کا پتہ تھا نہ ٹریفک والوں کا۔ لوگ دیوانہ وار نکل پڑے تھے اور کسی کو پتہ نہ تھا کہ راتوں رات کیا ہو گیا ہے۔ سی ویو اور کلفٹن کی طرف سے آنے والی سڑکیں گاڑیوں اور لوگوں سے بھرتی جا رہی تھیں اور جیسے ان کی ہی رفتار سے وہ دبیز بدبو بھی امڈی چلی آ رہی تھی، دھوئیں کی طرح پھیلتی ہوئی، سانس میں گھل کر جی متلا دینے اور آنکھیں جلا دینے والی بدبو۔ یہ اسی طرف سے آ رہی تھی جدھر سے وہ سب آ رہے تھے۔

''انھوں نے سمندر کو گندہ کر دیا ہے۔'' کسی نے چلتی گاڑی کی کھڑکی میں سے منہ نکال کر کہا۔ میں نے اس کی آواز آدھی سنی، آدھی نہیں سنی۔ کوئی بچہ ہو گا۔ برافروختہ اور برہم، جیسے معلوم بھی نہیں کہ اس سے اس کے بچپن کا سمندر چھین لیا گیا ہے۔

مگر مجھے اس بات پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ٹریفک کا سپاہی نہ جانے کہاں سے نمودار ہو کر سیٹی بجا رہا تھا اور آڑی ترچھی پھنسی ہوئی گاڑیوں کو ایک ہی سمت مڑنے کے لیے اشارہ کر رہا تھا، وہ سمت جہاں بہت پہلے سے پھنسی ہوئی گاڑیوں کی قطار کی وجہ سے مڑنا ممکن ہی نہیں تھا۔ گاڑی چند انچ کھسکتی تو پتہ چلتا کہ سی ویو اور درخشاں کے اندر اندر والی گلیوں سے لوگ اتنی تیزی اور اس تعداد میں نکلے ہیں کہ سڑکیں گاڑیوں سے بھر گئی ہیں۔ سپاہی سیٹی بجاتا ادھر سے ادھر بھاگے جا رہا تھا۔ کوئی اس پر خاص توجہ نہیں دے رہا تھا، لوگ ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ یہ زہریلی گیس کا فوجی حملہ ہے نہ غیر مرئی آسیب۔ دراصل کلفٹن کے ساحل پر پھنسے ہوئے اس جہاز سے تیل رس رہا ہے، جس کی تصویر کل رات بی بی سی ٹی وی پر دکھائی گئی تھی یا شاید کسی انڈین چینل پر۔ ٹی وی کی تصویر حقیقت بن گئی، اس پر غور کرنے کا کس کے پاس وقت تھا۔ اصل بات تو یہ تھی کہ اس جگہ سے نکلیں، ٹریفک کے اس پاگل کر دینے والے رش سے باہر آئیں۔ لوگ چیخ رہے تھے، شور مچا رہے تھے، ہارن بے تحاشا بجائے جا رہے تھے۔ دو آدمی جن کی گاڑیاں ٹکرا گئی تھیں، ہاتھا پائی پر اتر آئے تھے اور سامنے والی گاڑی میں سے ایک عورت کی ابکائیوں اور قے کرنے کی آواز آ رہی تھی۔

میں شہر کے ساتھ ساتھ سمندر کے کنارے کنارے چلاتا چلا آ رہا تھا۔ شہر اور سمندر مجھے ان دو بیماروں کی طرح لگے جن کو بستروں کی کمی کی وجہ سے اسپتال میں ایک ساتھ لٹا دیا گیا ہو۔ کسے پروا کہ ان کی چھوت کی بیماری بھی مشترک ہے کہ نہیں اور کیا دونوں کا جنازہ اسپتال سے ساتھ ہی اٹھایا جائے گا؟ پھیکا چہرہ، جھلسا ہوا رنگ

اور خون نچڑے ہوئے دق زدہ بدن۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بیمار ڈال دیا تھا اور اب ایک ہی بستر پر ایک دوسرے کے بوجھل سانس گن رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کتنے ہی دنوں کے لیے میری یہ سمندر کی آخری جھلک تھی۔

اب میں اسے نہیں دیکھ سکوں گا جو سمندر میری شاموں میں گھلا ہوا تھا اور جس پر پھیلتی ہوئی اجالے کی کرن سے میرا دن روشن ہوتا تھا، جس کی ہواؤں میں میرے بال بکھرتے تھے اور جس کے جزر و مد میں مجھے اپنے مڈ ڈز کا Swing نظر آتا تھا۔ جیسے یہ دوست بچھڑ رہا ہے اور پتہ بھی نہیں چل رہا ہے کہ کیوں، کتنے دن کے لیے۔

مگر مجھے فکر سمندر کی نہیں، امی کی تھی۔ میرے یوں واپس آجانے پر وہ کیا کریں گی۔ گھر میں مجھے قبول تو انھوں نے کر لیا تھا، اس لیے کہ اس وقت اس کے سوا چارہ نہ تھا اور کراچی کے ساحل پر تیل بردار جہاز سے Oil Spill کی خبر بڑے بڑے حروف میں اگلی صبح کے اخباروں میں پہلے صفحے پر چھپ چکی تھی۔ اتنی رات گئے مجھے سرخ آنکھوں، بکھرے بالوں کے ساتھ دروازے کی گھنٹی بجاتے ہوئے دیکھ کر انھوں نے کچھ نہیں کہا، دروازہ کھول کر ایک طرف ہو گئیں۔ وہ کیا چیز ہے جو مجھے یہاں لے کر آئی ہے، انھوں نے نہیں پوچھا تو میں نے بتایا بھی نہیں۔ میرے لیے بتانا یوں بھی مشکل تھا کہ مجھے خود اس وقت نہیں معلوم تھا (پوری طرح تو اب بھی نہیں معلوم) اور بس یہی غنیمت لگ رہا تھا کہ انھوں نے یہ نہیں کہہ دیا کہ فالتو آدمی گھر کے اندر نہ آئیں۔ سر جھکائے میں اندر آ گیا اور اس کونے میں بیٹھ گیا جو ٹیلی ویژن کے سامنے میری مستقل نشست سی بن گیا تھا۔ یہاں ایک فائدہ یہ تھا کہ ہر گھنٹے خبریں سننے کے ساتھ ساتھ میں جان سکتا تھا کہ سمندر کے روگ نے مجھے گھر کی دہلیز پر دوبارہ پہنچا دیا ہے۔

سمندر کے ہاتھوں زک پہنچنے سے پہلے میں امی جان کا پہنچایا ہوا صدمہ جھیل چکا ہوں۔ مگر میں اس کا قصوروار انھیں کسی طرح نہیں ٹھہرا سکتا۔ انھوں نے تو کتنی بار موقع دیا۔ میں ہی بدل کے نہ دیا۔

"پھر آ گئے محلے والوں کی جان کو رو کے؟" وہ رات گئے دروازہ کھولتے ہی شروع ہو جاتی تھیں۔ "اے میں کہتی ہوں یہ آوائی تو آئی پھرنا چھوڑ دو۔ کسی کام دھندے سے لگو۔ چار پیسے کما کے لانے کا ہنر سیکھو۔ کب تک جوتیاں چٹخاتے رہو گے اور چھوٹے بھائی کا منھ دیکھتے رہو گے؟"

ایک ریلا سا آتا اور میں شرابور ہوتا چلا جاتا۔ اب تو اس کا ایک ایک لفظ مانوس ہو چلا تھا۔ "سویرے سے یہی روتی صورت لیے پھر رہے ہو کہ کوئی دیکھ لے تو دن بھر روٹی نصیب نہ ہو۔ بال بناؤ، داڑھی صاف کرو۔ رات کے کپڑے بدلو۔ یاد نہیں؟ دو دن ہو گئے۔ کیا چیکٹ اتروائی کا جوڑا لو گے؟ آج چھوٹے بھائی کے سسرال والے آنے کو ہیں۔ آئے گئے کا لحاظ نہیں کرتے تو سمدھیانے کی شرم کر لو۔ خود تو کسی کرم کے تھے نہیں۔ کتنی بار کہا خیالی ہیولے کو زندگی کا ساتھی سمجھنا چھوڑ دو اور یہ دلدر وہاں اولاد کی جگہ نہیں لے سکتے۔ یہ جی کا روگ ہیں۔"

میں ٹی وی کے آگے اسی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ خیال تو ان لوگوں کو کرنا چاہیے تھا جو مہمان بن کر دوسرے گھر میں آئے تھے۔ خبر نہیں انھوں نے ناک بھوں چڑھائی یا امی جان نے پیش بندی کر ڈالی۔

"ابھی تھوڑی دیر میں جگہ کھل جائے گی۔ فالتو آدمی باہر چلے جائیں گے۔"

میری طرف رخ کر کے وہ کہہ رہی تھیں۔ میں اٹھا اور اس دن بھی سمندر کی طرف چلا گیا۔ سمندر میری عادت نہیں تھا۔ میرے لیے ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ وہاں جانا میں نے دوبارہ شروع کیا تھا کہ بے کار، بے مصرف قدم اٹھانے اور پلٹنے کے لیے گنجائش بہت تھی۔ سمندر بھی بے محابا تھا۔ وہی بچپن کا دیکھا بھالا اور ساتھ کھیلا ہوا سمندر۔ اس وقت سمندر سے ابو وابستہ تھے۔ ہاکس بے کی اسی ایک ہٹ کے برآمدے میں دھوپ سینکنا، پتھر کی سیڑھیوں سے اتر کر ریت پر آنا، دھنستے ہوئے پیروں سے جھلستی ہوئی ریت پر چلنا، انگلیوں سے ریت پر نام لکھنا اور حروف کے پیچ و خم میں پانی بھرتے ہوئے دیکھنا، ریت کے گھروندے بنانا، بالٹی سے ان میں پانی انڈیلنا اور ریت کی دیواروں پر سیپیاں سجانا، اونٹ کی سواری کرنا اور لہروں پر اچھلتی ہوئی گیند کے ساتھ دور تک پانی میں چلے جانا یہاں تک کہ چیختی ہوئی امی جان ذرا سا دھبہ بن جائیں۔ تھرماس میں چائے اور ٹوکری میں سینڈوچ بھر کر اتوار کے اتوار ابو کے دفتر کی ہٹ پر کتنی ہی شاموں کا سورج سمندر کی لہروں میں ڈوبتے ہوئے دیکھا ہے کہ اس کا پگھلتا، لرزتا عکس اب بھی آنکھوں میں سمایا ہوا ہے۔ ابو کی انگلی تھام کر اسی سمندر کے کنارے دور تک چلا جاتا۔ ہنستے مسکراتے ابو طرح طرح کے منھ بنائے جاتے، گالوں میں ہوا بھر کر آوازیں نکالتے، بے تکے مزاحیہ شعر پڑھتے اور گانے سناتے۔

اینا مینا ڈیکا

ڈائی ڈا نیکا

رام بام پوچ، رام بام پوچ

لہروں کے پیہم شور کے ساتھ اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ مجھے اب بھی یاد ہے اور ہر بار لہریں یہی گیت مجھے سناتی رہتی ہیں۔ ابو کی موت کے بعد سمندر نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ امی جان کو اتنے بے پناہ پانی سے ہول اٹھتے تھے اور یوں بھی وہ شہر کی آدمی تھیں۔ تنگ، اندھیری، پر پیچ گلیاں، ایک دوسرے سے جڑی ہوئی آڑی ترچھی عمارتیں، بہت سارے لوگ، ہجوم، تل دھرنے کو جگہ نہیں، فالتو لوگ باہر جائیں...

مگر کہاں جائیں؟ سمندر نے بھی بلانا چھوڑ دیا۔

اس شام بھی میرے پاس جانے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی، اس لیے میں نے سمندر کا رخ کیا۔ میں اس سے پہلے ٹی وی کے سامنے والے مانوس، آرام دہ کونے سے اٹھ جانا چاہتا تھا کہ امی جان کی چیختی ہوئی آواز اور چھوٹے بھائی کو گھورتی ہوئی نظریں مجھے فالتو آدمی ہونے کا احساس دلاتیں۔ ابو کی پرانی جھولنے والی کرسی چپ تھی، بالکل چپ، جیسے دم بخود رہ گئی ہو۔ میں بھی چپ چاپ، خاموش، نظریں بچا کر سمندر کے پاس آ گیا حالانکہ میں نے ٹی وی پر بار بار دہرایا جانے والا

یہ اعلان سن لیا تھا کہ پورا ساحلی علاقہ کارڈن آف (cordon off) کر دیا گیا ہے اور فضائی آلودگی کی وجہ سے عام شہریوں کا داخلہ وہاں بند ہے۔

میں سڑک چھوڑ کر کچی زمین پر آیا اور پیدل چلتا چلا گیا یہاں تک کہ قدموں تلے زمین بدل کر بھربھری ریت بن گئی، ساحل کی نشانی، سمندر سامنے تھا۔

شام کا اندھیرا سمندر میں گھلنے لگا تھا۔ سمندر کی رنگت پہلے ہی تبدیل ہو چکی تھی۔ نیلگوں سبز اور سفید پانی پر تیل کے کالے کالے چکتے تیر رہے تھے۔ ان کا حجم بڑھ رہا تھا اور تعداد بھی۔ سمندر کے اوپر جیسے ایک اور سمندر... سیاہ فام، وزن دار، دم گھونٹ دینے والا، زندگی کا دشمن... آنکھوں میں جلن ہونے لگتی اور بدبو بڑھتی جاتی جوں جوں ہم سمندر کے نزدیک آتے۔ مگر میں جان بوجھ کر ہوا کے مخالف سمت میں کھڑا تھا۔ جہاں جہاں سے پانی اترا تھا، وہاں ریت پر بھی سیاہ دھبے تھے۔ ریت بھی آلودہ ہوئی تھی اور ٹیلی وژن کی خبروں میں، میں نے دیکھا تھا کہ اس ریت کی ٹوکریاں بھر بھر کر ہٹائی جا رہی ہیں اور ٹرک میں لادی جا رہی ہیں۔ شہر کے مضافات میں جس بستی کے پاس یہ ریت دفن کی جا رہی تھی وہاں کے لوگ بھی احتجاج کرتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ ڈوبتے سورج کے سامنے غیر ملکی جہاز نظر آ رہا تھا جو خلیج کی کسی بندرگاہ سے تیل لاد کر لا رہا تھا اور ساحل پر بھٹک کر کسی چٹان سے ٹکرا گیا تھا۔ یا پھر وہ پہلے ہی سے نقصان رسیدہ جہاز تھا جو پوری احتیاطی جانچ پڑتال کے بغیر، ایک بڑی رقم کی فراہمی کے بعد حکام سے اجازت حاصل کر کے ادھر آ گیا تھا اور پھر حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ کیا ہوا تھا، یہ پوری طرح کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ شہر کے لوگ بھی خبروں سے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر بس اندازہ ہی لگا سکتے تھے۔ ان کو محض اتنا معلوم تھا کہ اس سے تیل رس رہا ہے اور بہہ کر یہ تیل ساحل پر تباہی مچا رہا ہے۔ ان سب قیاس آرائیوں اور اندازوں سے دور، سمندر کے بیچ میں کھڑا ہوا، موجوں سے ٹکراتا ہوا جہاز کسی بدروح کا ہیولا معلوم ہو رہا تھا، اکیلا، خالی، اندھیرا...

ساحل پر اس کو دیکھنے کے لیے جمع ہو جانے والوں کا وہ ہجوم بھی چھٹ گیا تھا جو شروع کے ایک آدھ دن رات گئے تک وہاں جمع ہونے لگا تھا۔ شہر والوں کو جو نیا تماشا مل گیا تھا، پولیس نے اسے روک دیا۔ میں اکیلا ہی اس طرف ٹہلتا گیا جس طرف پولیس نہیں تھی۔ بوجھل ہوا اب بھی دم گھونٹ رہی تھی اور پانی کی چمک سیاہی مائل تھی۔ ریت میں قدموں کے نشان بن رہے تھے اور میں ان کی ترتیب دیکھتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں کسی نرم چیز سے ٹکرائے۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ کوئی پرندہ تھا۔ وہیں مرا ہوا پڑا تھا۔ اس کی چونچ مضبوطی سے بند تھی اور جوڑے جوڑے پروں پر تیل کی سیاہی جھلک رہی تھی۔

وہ اڑ سکا نہ تیر سکا۔ کتنی تکلیف سے مرا ہو گا، میں نے سوچا اور واپس مڑ گیا۔

"لوگ سمندری تفریح گاہوں کا رخ نہ کریں، متبادل مقامات کا ارادہ کریں جب تک کہ سمندر کو تفریح کے لیے دوبارہ کھول نہیں دیا جاتا..."

حکومت کا یہ اعلان ریڈیو اور ٹی وی سے بار بار نشر ہونے لگا۔ ایک لمحے کے لیے بھی میں اس پر یقین نہ کر سکا۔ ماحولیاتی آلودگی اور سمندری حیات کو نقصان کی تفصیل تو میری سمجھ سے باہر تھی، اتنا مجھے معلوم تھا کہ یہ محض تفریح گاہ کی عارضی بندش کا معاملہ نہیں ہے۔ مجھے ان بے شمار لوگوں کا دھیان آیا جو اس سمندر کے ذریعے اپنا روزگار حاصل کرتے ہیں، بالواسطہ ہی سہی... ساحل سے ملحق بنے ہوئے ہوٹلوں کے بیرے، مداری، بندر کا تماشا دکھانے والے، گھوڑے کی سواری کرانے والے، فقیر، غبارے والے، بندوق کا نشانہ لگوانے والے، جیب کترے، طوائفیں، ہیجڑے، قسمت کا حال بتانے والے، جوتے پالش کرنے والے، آئس کریم بیچنے والے، رکشہ ٹیکسی چلانے والے... اب یہ اپنی روزی کے لیے کیا کریں گے سمندر کے بغیر؟ لوگوں کو وہاں جانے سے روکنے کے لیے پولیس موبائل پر سے میگافون کی یہ آواز اور کچھ نہیں تھی۔ مجھے لگا کہ شہر کا سمندر ان سے امی جان کی آواز میں کہہ رہا ہو: فالتو آدمی باہر چلے جائیں، ادھر کا رخ ہرگز نہ کریں۔ یہ اعلان سن کر ان کے جسم کی بھی ساری طاقت سلب ہو جائے گی۔ نہ چلنے کی طاقت رہے گی نہ اٹھنے کی مجال۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں روز اس کے پاس جاؤں گا کہ سمندر بیمار ہے۔ سمندر سے ملاقات کا وقت کوئی نہیں ہے۔

مجھے جب موقع ملتا میں سمندر کی ملاقات کو چلا جاتا۔ امی جان آتے جاتے دیکھ رہی تھیں مگر اس وقت تک انھوں نے کچھ کہا نہیں۔ میں نے منھ پر باندھنے کے لیے وہ سفید کپڑا لے لیا جس کے بغیر سمندر کے قریب کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ عجیب سا لگا مجھے، جیسے طاعون یا کسی متعدی مرض میں مبتلا آدمی کو دیکھنے جا رہے ہوں۔ مگر میں نے لگا لیا اور بدبو سے بچنے کے لیے ناک سکیڑتا ہوا اپنے گھر جا پہنچا۔

گھر خالی پڑا تھا۔ آس پڑوس کے مکانوں میں اکا دکا کوئی آدمی تھا۔ لوگ جیسے اس بستی کو چھوڑ گئے تھے۔ میں اپنے مکان کی بالکنی میں بیٹھ گیا اور خالی بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔ میں نے دیکھا سمندر قریب آ رہا ہے۔ اس میں سے بدبو نہیں اٹھ رہی ہے... بلکہ اس میں کشش ہے۔ میں نے ایک بار پھر خواب دیکھا کہ میں اس کام میں مصروف ہوں جسے انگریزی میں محبت کرنا کہنے لگے ہیں۔ اردو میں جو کہتے ہیں وہ اتنا برا معلوم ہوتا ہے کہ اسے چھوڑ دیں تو اچھا۔ سمندر خوبصورت اور زور آور۔ اس میں سپردگی تھی، بانکپن تھا۔ وہ نرم ہو کر دب جاتا، سخت ہو کر چھلکتا تھا، بدمست ہو کر آگے بڑھا آتا تھا، والہانہ پن کے ساتھ لپٹ جاتا تھا، اس کے لب وا ہو جاتے، آغوش وسیع ہونے لگتی۔ سینہ کشادہ ہو جاتا اور نچلا بدن کپکپانے لگتا۔ یہ سمندر محبت کرنے کے لیے بہت تھا۔

دستک سن کر میں نے بالکنی سے جھانکا۔ اس اجاڑ بستی میں کون آئے گا؟ سمندر دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ میرے گھر پہنچ گیا تھا۔ میں نے نکل کر دیکھا، گلی میں دور دور کوئی نہ تھا۔ میں نے جلدی سے دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی دعوت دیتی ہوئی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ میں اس کی طرف بڑھا تو اس کے لب پیوست ہو گئے۔ جیسے وہ ایک بہت بڑا دہانہ تھا، گیلا اور گہرائی میں کھلتا ہوا، جو بوسوں کی نمی سے بھر جانے کو بے تاب تھا۔

مگر ان لوگوں کا انکار مبہم اور بے حد اصرار کے ساتھ تھا۔ ایک کے

بعد ایک اعلیٰ افسر کا انٹرویو ٹی وی پر نشر ہوتا۔ وہ مسلسل کہے جاتے کہ یہ وقتی حادثہ ہے، تفریح گاہیں جلد ہی کھول دی جائیں گی۔ ایک بڑے افسر نے لوگوں کی تشویش کی ساری ذمہ داری غیر ملکی نشریات پر ڈال دی۔ ان کا دعویٰ غلط ہے۔ لوگ بیمار ہو کر نہیں بھاگے۔ چند مچھلیوں اور پرندوں کے سوا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ایک ہی کچھوا ہے جسے وہ بار بار دکھائے جا رہے ہیں۔ سرکاری تحقیقات جاری ہیں۔ عوام سے اپیل کی جاتی ہے...

میرے پاؤں خود بخود اٹھ گئے۔ میں بالکنی کی سیڑھیاں اتر کر میں ساحل کی طرف چلا آیا۔ دم گھونٹ دینے والی بدبو اور آنکھوں کی جلن والی تیزی ہوا سے چھٹی نہیں تھی۔ مگر اب کی بار کوئی اور ہی چیز مجھے وہاں لیے جا رہی تھی۔ شہر سے الٹے رخ، سمندر کی جانب۔ جہاں جہاں سے ریت اٹھائی گئی تھی وہاں گڑھے سے بن گئے تھے جو دھوپ میں اور بھی بدنما لگتے۔ کسی گڑھے میں پانی بھر گیا تھا۔ کسی ایک میں مردہ مچھلیاں۔ سمندر کے مد کے ساتھ آنے والی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں۔ واپس پلٹتا ہوا سمندر انھیں ریت پر ہی چھوڑ جاتا۔ جیسے سمندر اپنے مردے اگل رہا ہو۔ ساحل پر ہر وقت منڈلانے والے چیل کوے انھیں کھاتے نہ جنگلی کتے۔ ان کے گلتے ہوئے ڈھیر سے بساند اٹھ رہی تھی۔ اس گڑھے سے ذرا آگے ہی میں نے ایک کچھوا مرا ہوا دیکھا۔ وہ بھی مٹی میں آدھا دھنسا ہوا تھا۔ اور اس سے آگے ایک جنقلہ (Seagull)۔

میں نے ماسک ہٹا کر اپنا ننگا چہرہ ان کے سامنے کر دیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ مجھے کہاں ہونا ہے اور کس حالت میں۔ اب مجھے اس بیمار سمندر کی نگہ داری پر مامور کر دیا گیا ہے۔ میں نے جان لیا کہ میں مر گیا۔ میرا شہر مر گیا۔ میرے شہر کا سمندر مر گیا۔ اس کے ساحل مر گئے۔ سینکڑوں مچھلیاں، کچھوے، بحری پرندے، کیکڑے، آبی پودے... مرنے کے بعد بھی ہم برسوں ایڑیاں رگڑتے، سسکیاں بھرتے، دم توڑتے رہیں گے اور امی جان کی آواز گونجتی رہے گی۔ فالتو آدمی، باہر...

ایک بار پھر میں نے سمندر کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے ایک مار کھائے ہوئے بچے کی طرح لگ رہا تھا جو جھڑکی مار کھاتے کھاتے رونے لگا ہو۔ سسکیاں بند نہیں ہو رہی ہیں۔ آنسوؤں نے چہرے پر میلی لکیر ڈال دی ہے اور ناک بہہ بہہ کر منھ میں جا رہی ہے جس پر مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ اس بیمار بچے کے آنسو کون پونچھے گا؟ سمندر کی طرف میری امی جان تو آنے سے رہیں۔

میں نے شہر کی طرف سے پیٹھ موڑ لی اور سمندر کا رخ کر کے آگے بڑھتا گیا۔ اب سمندر میرے سامنے ہے، شہر پیچھے ☆☆☆

غزل

شمیم فاروقی

کتاب کون سی ہے اور کس زبان میں ہے
سنا ہے ذکر ہمارا بھی داستان میں ہے

اسی نے دھوپ میں چلنے کی جیت لی بازی
وہ ایک شخص جو مدت سے سائبان میں ہے

زمیں کو جو بھی اگانا ہے وہ اگائے گی
مجھے پتہ ہے مرا رزق آسمان میں ہے

وہ لوٹ آئے تو اپنی بھی کچھ خبر دوں گا
مرے لہو کا پرندہ ابھی اڑان میں ہے

اسے بھی چھوڑ کہ اب حوصلہ نہیں باقی
وہ ایک تیر جواب تک تری کمان میں ہے

یہیں کہیں نہ کہیں ہے شمیم فاروقی
اگر یقیں میں نہیں ہے تو پھر گمان میں ہے

یہ اعلان سن لیا تھا کہ پورا ساحلی علاقہ کارڈن آف (cordon off) کر دیا گیا ہے اور فضائی آلودگی کی وجہ سے تمام شہریوں کا داخلہ وہاں بند ہے۔

میں سڑک چھوڑ کر کچی زمین پر آیا اور پیدل چلتا چلا گیا یہاں تک کہ قدموں تلے زمین بدل کر بھربھری ریت بن گئی، ساحل کی نشانی، سمندر سامنے تھا۔

شام کا اندھیرا سمندر میں گھلنے لگا تھا۔ سمندر کی رنگت پہلے ہی تبدیل ہو چکی تھی۔ نیلگوں سبز اور سفید پانی پر تیل کے کالے کالے چکتے تیر رہے تھے۔ ان کا حجم بڑھ رہا تھا اور تعداد بھی۔ سمندر کے اوپر جیسے ایک اور سمندر... سیاہ فام، وزن دار، دم گھونٹ دینے والا، زندگی کا دشمن... آنکھوں میں جلن ہونے لگتی اور بدبو بڑھتی جاتی جوں جوں ہم سمندر کے نزدیک آتے۔ مگر میں جان بوجھ کر ہوا کے مخالف سمت میں کھڑا تھا۔ جہاں جہاں سے پانی اترا تھا، وہاں ریت پر بھی سیاہ دھبے تھے۔ ریت بھی آلودہ ہوئی تھی اور ٹیلی وژن کی خبروں میں، میں نے دیکھا تھا کہ اس ریت کی ٹوکریاں بھر بھر کر ہٹائی جا رہی ہیں اور ٹرک میں لادی جا رہی ہیں۔ شہر کے مضافات میں جس بستی کے پاس یہ ریت دفن کی جا رہی تھی وہاں کے لوگ بھی احتجاج کرتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ ڈوبتے سورج کے سامنے غیر ملکی جہاز نظر آ رہا تھا جو خلیج کی کسی بندرگاہ سے تیل لاد کر لا رہا تھا اور ساحل پر بھٹک کر کسی چٹان سے ٹکرا گیا تھا۔ یا پھر وہ پہلے ہی سے نقصان رسیدہ جہاز تھا جو پوری احتیاطی جانچ پڑتال کے بغیر، ایک بڑی رقم کی فراہمی کے بعد حکام سے اجازت حاصل کر کے ادھر آ گیا تھا اور پھر حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ کیا ہوا تھا، یہ پوری طرح کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ شہر کے لوگ بھی خبروں سے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر بس اندازہ ہی لگا سکتے تھے۔ ان کو محض اتنا معلوم تھا کہ اس سے تیل رس رہا ہے اور بہہ بہہ کر یہ تیل ساحل پر تباہی مچا رہا ہے۔ ان سب قیاس آرائیوں اور اندازوں سے دور، سمندر کے بیچ میں کھڑا ہوا، موجوں سے ٹکراتا ہوا جہاز کسی بدروح کا ہیولا معلوم ہو رہا تھا، اکیلا، خالی، اندھیرا...

ساحل پر اس کو دیکھنے کے لیے جمع ہو جانے والوں کا وہ ہجوم بھی چھٹ گیا تھا جو شروع کے ایک آدھ دن رات گئے تک وہاں جمع ہونے لگا تھا۔ شہر والوں کو جو نیا تماشا مل گیا تھا، پولیس نے اسے روک دیا۔ میں اکیلا ہی اس طرف ٹہلتا گیا جس طرف پولیس نہیں تھی۔ بوجھل ہوا اب بھی دم گھونٹ رہی تھی اور پانی کی چمک سیاہی مائل تھی۔ ریت میں قدموں کے نشان بن رہے تھے اور میں ان کی ترتیب دیکھتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں کسی نرم چیز سے ٹکرائے۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ کوئی پرندہ تھا۔ وہاں مرا ہوا پڑا تھا۔ اس کی چونچ مضبوطی سے بند تھی اور چوڑے چوڑے پروں پر تیل کی سیاہی جھلک رہی تھی۔

وہ اڑ سکا نہ تیر سکا۔ کتنی تکلیف سے مرا ہوگا، میں نے سوچا اور واپس مڑ گیا۔

''لوگ سمندری تفریح گاہوں کا رخ نہ کریں، متبادل مقامات کا ارادہ کریں جب تک کہ سمندر کو تفریح کے لیے دوبارہ کھول نہیں دیا جاتا...''

حکومت کا یہ اعلان ریڈیو اور ٹی وی سے بار بار نشر ہونے لگا۔ ایک لمحے کے لیے بھی میں اس پر یقین نہ کر سکا۔ ماحولیاتی آلودگی اور سمندری حیات کو نقصان کی تفصیل تو میری سمجھ سے باہر تھے، اتنا مجھے معلوم تھا کہ یہ محض تفریح گاہ کی عارضی بندش کا معاملہ نہیں ہے۔ مجھے ان بے شمار لوگوں کا دھیان آیا جو اس سمندر کے ذریعے اپنا روزگار حاصل کرتے ہیں، بالواسطہ ہی سہی... ساحل سے ملحق بنے ہوئے ہوٹلوں کے بیرے، مداری، بندر کا تماشا دکھانے والے، گھوڑے کی سواری کرانے والے، فقیر، غبارے والے، بندوق کا نشانہ لگوانے والے، جیب کترے، طوائفیں، ہیجڑے، قسمت کا حال بتانے والے، جوتے پالش کرنے والے، آئس کریم بیچنے والے، رکشہ ٹیکسی چلانے والے... اب یہ اپنی روزی کے لیے کیا کریں گے سمندر کے بغیر؟ لوگوں کو وہاں جانے سے روکنے کے لیے پولیس موبائل پر سے میگافون کی یہ آواز اور کچھ نہیں تھی۔ مجھے لگا کہ شہر کا سمندر ان سے امی جان کی آواز میں کہہ رہا ہو: فالتو آدمی باہر چلے جائیں، ادھر کا رخ ہرگز نہ کریں۔ یہ اعلان سن کر ان کے جسم کی بھی ساری طاقت سلب ہو جائے گی۔ نہ چلنے کی طاقت رہے گی نہ اٹھنے کی مجال۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں روز اس کے پاس جاؤں گا کہ سمندر بیمار ہے۔ سمندر سے ملاقات کا وقت کوئی نہیں ہے۔

مجھے جب موقع ملتا میں سمندر کی ملاقات کو چلا جاتا۔ امی جان آتے جاتے دیکھ رہی تھیں مگر اس وقت تک انھوں نے کچھ کہا نہیں۔ میں نے منھ پر باندھنے کے لیے وہ سفید کپڑا لے لیا جس کے بغیر سمندر کے قریب کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ عجیب سا لگا مجھے، جیسے طاعون یا کسی متعدی مرض میں مبتلا آدمی کو دیکھنے جا رہے ہوں۔ مگر میں نے لگا لیا اور بدبو سے بچنے کے لیے ناک سکیڑتا ہوا اپنے گھر جا پہنچا۔

گھر خالی پڑا تھا۔ آس پڑوس کے مکانوں میں اکا دکا کوئی آدمی تھا۔ لوگ جیسے اس بستی کو چھوڑ گئے تھے۔ میں اپنے مکان کی بالکنی میں بیٹھ گیا اور خالی بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔ میں نے دیکھا سمندر قریب آ رہا ہے۔ اس میں سے بدبو نہیں اٹھ رہی ہے... بلکہ اس میں کشش ہے۔ میں نے ایک بار پھر خواب دیکھا کہ میں اس کام میں مصروف ہوں جسے انگریزی میں محبت کرنا کہنے لگے ہیں۔ اردو میں جو کہتے ہیں وہ اتنا برا معلوم ہوتا ہے کہ اسے چھوڑ دیں تو اچھا۔ سمندر خوبصورت اور زور آور۔ اس میں سپردگی تھی، بانکپن تھا۔ وہ نرم ہو کر دب جاتا، سخت ہو کر چپکتا تھا، بدمست ہو کر آگے بڑھا آتا تھا، والہانہ پن کے ساتھ لپٹ جاتا تھا، اس کے لب وا ہو جاتے، آغوش وسیع ہونے لگتی۔ سینہ کشادہ ہو جاتا اور نچلا بدن کپکپانے لگتا۔ یہ سمندر محبت کرنے کے لیے بہت تھا۔

دستک سن کر میں نے بالکنی سے جھانکا۔ اس اجاڑ بستی میں کون آئے گا؟ سمندر دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ میرے گھر پہنچ گیا تھا۔ میں نے نکل کر دیکھا، گلی میں دور دور کوئی نہ تھا۔ میں نے جلدی سے دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی دعوت دیتی ہوئی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ میں اس کی طرف بڑھا تو اس کے لب پیوست ہو گئے۔ جیسے وہ ایک بہت بڑا دہانہ تھا، گیلا اور گہرائی میں کھلتا ہوا، جو بوسوں کی نمی سے بھر جانے کو بے تاب تھا۔

مگر ان لوگوں کا انکار پیہم اور بے حد اصرار کے ساتھ تھا۔ ایک کے

بعد ایک اعلیٰ افسر کا انٹرویو ٹی وی پر نشر ہوتا۔ وہ مسلسل کہے جاتے کہ یہ وقتی حادثہ ہے، تفریح گاہیں جلد ہی کھول دی جائیں گی۔ ایک بڑے افسر نے لوگوں کی تشویش کی ساری ذمہ داری غیر ملکی نشریات پر ڈال دی۔ ان کا دعویٰ غلط ہے۔ لوگ بیمار ہو کر نہیں بھاگے۔ چند مچھلیوں اور پرندوں کے سوا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ایک ہی کچھوا ہے جسے وہ بار بار دکھائے جا رہے ہیں۔ سرکاری تحقیقات جاری ہیں۔ عوام سے اپیل کی جاتی ہے...

میرے پاؤں خود بخود اٹھ گئے۔ میں بالکنی کی سیڑھیاں اتر کر میں ساحل کی طرف چلا آیا۔ دم گھونٹ دینے والی بدبو اور آنکھوں کی جلن والی تیزی ہوا سے چھٹی نہیں تھی۔ مگر اب کی بار کوئی اور ہی چیز مجھے وہاں لیے جا رہی تھی۔ شہر سے الٹے رخ، سمندر کی جانب۔ جہاں جہاں سے ریت اٹھائی گئی تھی وہاں گڑھے سے بن گئے تھے جو دھوپ میں اور بھی بدنما لگتے۔ کسی گڑھے میں پانی بھر گیا تھا۔ کسی ایک میں مردہ مچھلیاں۔ سمندر کے مد کے ساتھ آنے والی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں۔ واپس پلٹتا ہوا سمندر انھیں ریت پر ہی چھوڑ جاتا۔ جیسے سمندر اپنے مردے اگل رہا ہو۔ ساحل پر ہر وقت منڈلانے والے چیل کوے انھیں کھاتے نہ جنگلی کتے۔ ان کے گلتے ہوئے ڈھیر سے بساند اٹھ رہی تھی۔ اس گڑھے سے ذرا آگے ہی میں نے ایک کچھوا مرا ہوا دیکھا۔ وہ بھی مٹی میں آدھا دھنسا ہوا تھا۔ اور اس سے آگے ایک جنگلہ (Seagull)۔

میں نے ماسک ہٹا کر اپنا ننگا چہرہ ان کے سامنے کر دیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ مجھے کہاں ہونا ہے اور کس حالت میں۔ اب مجھے اس بیمار سمندر کی نگہ داری پر مامور کر دیا گیا ہے۔ میں نے جان لیا کہ میں مر گیا۔ میرا شہر مر گیا۔ میرے شہر کا سمندر مر گیا۔ اس کے ساحل مر گئے۔ سینکڑوں مچھلیاں، کچھوے، بحری پرندے، کیکڑے، آبی پودے... مرنے کے بعد بھی ہم برسوں ایڑیاں رگڑتے، سسکیاں بھرتے، دم توڑتے رہیں گے اور امی جان کی آواز گونجتی رہے گی۔ فالتو آدمی، باہر...

ایک بار پھر میں نے سمندر کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے ایک مار کھائے ہوئے بچے کی طرح لگ رہا تھا جو جھڑکی مار کھاتے کھاتے رونے لگا ہو۔ سسکیاں بند نہیں ہو رہی ہیں۔ آنسوؤں نے چہرے پر میلی لکیر ڈال دی ہے اور ناک بہہ بہہ کر منھ میں جا رہی ہے جس پر مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ اس بیمار بچے کے آنسو کون پونچھے گا؟ سمندر کی طرف میری امی جان تو آنے سے رہیں۔

میں نے شہر کی طرف سے پیٹھ موڑ لی اور سمندر کا رخ کر کے آگے بڑھتا گیا۔ اب سمندر میرے سامنے ہے، شہر پیچھے ☆☆☆

غزل

شمیم فاروقی

کتاب کون سی ہے اور کس زبان میں ہے
سنا ہے ذکر ہمارا بھی داستان میں ہے

اسی نے دھوپ میں چلنے کی جیت لی بازی
وہ ایک شخص جو مدت سے سائبان میں ہے

زمیں کو جو بھی اگانا ہے وہ اگائے گی
مجھے پتہ ہے مرا رزق آسمان میں ہے

وہ لوٹ آئے تو اپنی بھی کچھ خبر دوں گا
مرے لہو کا پرندہ ابھی اڑان میں ہے

اسے بھی چھوڑ کہ اب حوصلہ نہیں باقی
وہ ایک تیر جواب تک تری کمان میں ہے

یہیں کہیں نہ کہیں ہے شمیم فاروقی
اگر یقیں میں نہیں ہے تو پھر گمان میں ہے

شفق سوپوری

تو نے نظر سے پیاس کی دیکھا بھی ہے کہیں
گرد جبین دشت میں دریا بھی ہے کہیں

پھرتا رہا ہوں جس کے تعاقب میں عمر بھر
کیا نقش اس خیال نے چھوڑا بھی ہے کہیں

یا سب ہی میری طرح کے آوارہ گرد تھے
دل میں کوئی قرار سے بیٹھا بھی ہے کہیں

ہم بھی عجب تھے غاروں میں اترے یہ دیکھنے
بچ کر نکلنے کا کوئی رستہ بھی ہے کہیں

کچھ دیکھتے کہ خاک میں ہیں دفن خواب کیا
یہ گرد باد لمحے کو ٹھہرا بھی ہے کہیں

پھولوں کی سمت ہاتھ بڑھاؤ یہ سوچ کر
افعی سیاہ شاخ سے لپٹا بھی ہے کہیں

ساری صدائیں غیب سے آتی نہیں شفق
کوئی ضرور دشت میں بیٹھا بھی ہے کہیں

پہلے باتیں پیاری پیاری کرتا ہے
پھر وہ دلوں پر دہشت طاری کرتا ہے

میں اس کی ہر چال سے واقف ہوں لیکن
بعض اوقات یہ دل غداری کرتا ہے

دل میں بھلے اس فتنے کے کھوٹ بھرا ہے
باتوں سے لیکن دلداری کرتا ہے

میں بھی ناشائستہ حرکت کرتا ہوں
اور وہ بھی باتیں بازاری کرتا ہے

میرا بھی کوئی دین و ایمان نہیں
وہ بھی سارے شہر سے یاری کرتا ہے

ایک ادا روز نئی کرتا ہے ایجاد
روز نئے ڈھنگ سے عیاری کرتا ہے

سنتے ہیں سب ہی کی باری آتی ہے
سب کو ذلیل وہ باری باری کرتا ہے

نانو ہاؤس

آصف فرخی

دروازہ پورا کھلنے بھی نہیں پاتا کہ اس اتنی سی ایک جھری میں سے جھلک اٹھتی تھی۔ ان کی عینک کے موٹے موٹے، چکرا دینے والے نیلے نیلے شیشوں اور پوپلے منہ کی لپلپاتی زبان والی بے دانت کی مسکراہٹ۔

ایسا لگتا تھا چہرہ کھل اٹھا ہے، یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ذہن اس وقت نہ پہچان رہا ہے، نہ سمجھ رہا ہے۔ بالکل خالی ہے۔ ان کی آنکھوں کی طرح۔ ان کی عمر کے اتنے برسوں کی طرح۔

خالی آنکھوں سے بھی وہ جھانکتی ضرور تھیں۔ ویسے سر پر ڈھول بجا لو خبر نہ ہوگی، مگر ہر آہٹ پر چونکتی ضرور تھیں۔ باہر کے دروازے پر کھٹکا ہوا یا گیٹ کی کنڈی پر کسی کا ہاتھ پڑتا، وہ بیٹھے سے اٹھ جاتیں۔ متوحش ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگتیں، پھر اٹکل سے یہ سمجھ کر کہ کمرے میں ان کے علاوہ اس وقت کوئی اور نہیں ہے۔ وہ پلنگ کے ساتھ کا دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھاتیں۔ دروازے کے قفل میں چابی گھماتیں، بے آواز اور بے احساس، پھر دروازے کو پلنگ کی طرف اتنا سا سرکانے سے جو ذرا سی جھری کھل جاتی، اس میں سے گول گول دیدے گھماتی ہوئی جھانکنے کی کوشش کرتیں ساتھ ہی آپ سے آپ کہتی جاتیں۔

خبر نہیں کون آ گیا؟ ان کے یہاں آنے والوں کا بڑا نہیں ہے۔ دن دیکھیں نہ شام۔ بھری دوپہر کی گرمی میں چلے آتے ہیں منہ اٹھائے ناس پیٹے!

پتلی ٹھہرے اور آنکھ بچے تو نظر بھی سنبھلے تو مگر پہچاننے کی کوششیں ناکام ہو کر وہ اتنی ہی بیزاری کے ساتھ دروازہ بھیڑ دیتیں۔ اب کی بار پورے زور سے اور آواز کے ساتھ۔ جیسے نکیل دھوپ کو باہر دھکیل رہی ہوں۔

دھوپ باہر سے بھی جا چکی تھی، ان کو پتہ نہ چلتا تھا۔ نانو کے ساتھ ایک مسئلہ، اور بہت سے مسئلوں کے علاوہ، یہ تھا کہ ان کے گھر میں اور ہمارے گھر میں دوپہر کے تصور میں بہت فرق تھا۔ ان کے گھر سے مراد یہ کہ جب ان کا گھر تھا۔

وہاں دوپہر بہت اہتمام سے جھم جھماتی آتی۔ سارے دروازے بند کر کے کھڑکیوں کے پردے گرا کے اور پلنگ والے حصے میں بالکل اندھیرا کر کے وہ منہ پر دوپٹہ ڈھانپ لیتیں۔ وہ باقاعدگی سے دوپہر کے کھانے کے بعد لیٹنا فرض سمجھتی تھیں۔ بچوں کی مجال نہیں تھی کہ اس وقت چوں بھی کر سکیں۔ نیند نہ بھی آئے تب بھی آنکھیں میچ کر لیٹنا پڑتا تھا اور کھوں کھوں کھوں، ہنسی دبانے پر ایک زور دار گھر کی آتی۔ ہوں اونہہ۔ اس پر سب چپ۔ ہم بچوں کو ہنسی اس وقت اور بھی آتی جب کوئی بھولا بھٹکا فون آ جائے اور آواز میں نیند کے خمار سے اندازہ لگا کر فون کرنے والا خود ہی شرمندگی میں پوچھ لے، نانو سو تو نہیں رہی تھیں؟

وہ فوراً کھڑاک سے توڑ کر ہاتھ پر رکھ دیتیں۔ خشکی کے مارے مجھے نیند ہی کہاں آتی ہے۔ ذرا سی جھپکی آ گئی ہوگی۔ خدا خدا کر کے چار بجتے اور وہ چائے کا پانی رکھنے اٹھتیں تو ہم لوگ بھی بستروں، پلنگوں سے کود کر یوں اچھلتے جیسے ڈھابے میں سے مرغی کے چوزے نکل کر بھاگ رہے ہوں۔

اب چار بج رہے ہیں۔ نانو ہاؤس میں چائے بن رہی ہے۔ اور چائے کے ساتھ کچھ نمکین، کچھ میٹھا، کچھ تلن۔ کچھ بھی نہیں تو چکنے کے بے چیوڑا اور نہیں تو پاپے جو مکھن لگا کر بھی کھائے جا سکتے تھے اور چائے میں ڈبو ڈبو کر بھی۔

پاپے کی کٹر کٹر یہ اعلان تھی کہ نانو ہاؤس میں شام ہونے والی ہے۔

"نانو ہاؤس میں دوپہر بھیانک ہوتی ہے، کتنی بھیانک۔" چھوٹی خالہ کا سب سے چھوٹا بیٹا جب بالکل ہی چھوٹا تھا، تب سے یہ بات کہتا تھا۔ وہ ان کے گھر، نانو ہاؤس کہتا تھا اتنے چھوٹے تو اب اس کے اپنے بچے بھی نہیں ہوں گے۔ اتنے برس ہو گئے ہیوسٹن میں ہے جہاں اس طرف کی دوپہریں نہیں ہوتیں، بس زندگی کی دوپہر ہوتی ہے، یا شاید مجھے ایسا لگتا ہے۔

دوپہر ہمارے گھر بھی دھما چوکڑی مچاتی ہوئی اترتی تھی۔ ہمارے گھر میں سارے کاموں کو لپیٹ کر اس سکون کے ساتھ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر سر منہ اوندھائے نیند کے سمندر کی گدلی تہ میں بیٹھ جائیں، ایسا کہاں ہو سکتا تھا۔ کوئی اور نہیں تو ڈاکیہ آ جاتا۔

"اس کو بھی خدا کی مار ہے..." وہ جھنجھلا کر کہتیں۔ مگر ہر دوپہر کو جھانک کر ضرور دیکھ لیتیں۔ گھنٹی پر ہاتھ مارتا ہے تو سانس نہیں لیتا۔ سڑی گرمی چیل انڈا

چھوڑ دے، یہ سائیکل پر پھرتا رہتا ہے۔ ڈھائی بجے نہیں کہ آ کر اس طرح گھنٹی بجائے گا کہ قبر کے مردے اٹھ بیٹھیں۔ دل میں ایسے برے برے خیالات آنے لگتے ہیں کہ اس زور سے گھنٹی بجی ہے جانے کیا ہوا۔ دروازہ کھول کر دیکھو تو آپ کھڑے ہیں کھیسیں نکالے ہوئے۔ کمبختی مارا دیکھو تو جانے کہاں سے چلا آیا ہے۔ قمیص بھی پسینے میں بھیگ کر چپک گئی ہے اور خط پکڑانے کے لیے سامنے آتا ہے تو اتنی سی دیر میں کھٹی بو آنے لگتی ہے۔ توبہ ہے، جی متلائے جاتا ہے۔ جنم جلا کتنے دن سے نہایا نہیں ہوگا...''

نانو کے ہاؤس میں کمروں کمروں روشن دان تھے۔ دیوار کے اوپری حصے میں، چھت کے ساتھ۔ اندھیرے میں یوں لگتا اوپر سے کوئی منھ ڈالے جھانک رہا ہے۔ اتنے بڑے بڑے دانت ہیں اور منھ کھلا ہوا ہے۔ اندھیرے بند کمرے میں ایک دم سے آ جاؤ تو دل دھک سے ہو جاتا تھا۔

اور غسلخانوں کی کھڑکی کے شیشوں پر ہرا رنگ پتا ہوا تھا۔ دور سے دیکھو تو کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ شیشے پر آنکھ رکھ کر جھانکو تو گول گول چکر گھمر گھمر کرتے اور سائے سے آنکھوں کے سامنے سے گذر جاتے، دبیز ہری چادروں میں کہیں لپٹے پڑے کہیں کھلے ہوئے، بالٹیوں کی کھڑ کھڑاہٹ اور ڈونگے کی شپاشپ میں پانی کی موٹی سی دھار اور نالی میں صابن ملے پانی کی شرر شرر۔ ہم پتہ چلا سکتے تھے کہ اندر کون ہوگا۔ ایک دفعہ ادھ بھڑا دروازہ میرے ہاتھ لگانے سے کھل گیا تھا۔ میں چونک کر جلدی سے ہٹ گیا تھا ورنہ سفید جھماکے سے آنکھیں چندھیا جاتیں۔

اور نانو کی ڈانٹ سننی پڑتی، سو الگ۔ میں بھی ایسا بن گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ نانو کے ہاؤس میں سارے غسل خانے ٹھنڈے رہتے تھے، ان میں نہانے کے لیے ہم بچوں کی باری بندھتی تھی۔

میں نے سوچا کہ ان سے پوچھوں، آپ کو وہ دالان اور اس کے سرے پر غسل خانے یاد ہیں۔

پوچھتے پوچھتے ٹھٹھک گیا۔ امی جان ان کے پلنگ کی پٹی پر ٹکی بیٹھی تھیں۔

''ڈاکیے کو کیا ٹوک رہی ہیں۔ آپ خود جو نہانے کی چور ہو گئی ہیں۔ خود نہلانے کی کوشش کر کے ہار گئی تو میں نے ماسی کا بھی انتظام کر دیا۔ ادبدا کر روز روز کوئی بہانہ کر دیتی ہیں کہ نہانے سے بچ جائیں۔ کپڑوں میں سے بھبکے اٹھنے لگتے ہیں۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا؟''

جمعے کا دن دھوبی کے آنے کا ہوتا تو صبح ہی سے نانو کے نہانے کا اہتمام ہونے لگتا تھا۔ دس گیارہ بجے گھڑی دیکھ کر ایک پیالی چائے اور پی، پھر گھٹنوں پر ہاتھ رکھتی ہوئی اٹھیں۔ کھولتا ہوا پانی پتیلی سے بالٹی میں انڈیلا گیا، بالٹیاں کھڑکھڑائیں۔ ڈونگے پیلے مانجھے گئے۔ پھر گھنٹوں غسل خانے کی چھٹی۔

اول جاڑے کی سہتی سہتی دھوپ میں بھی ہلکے سے سسکاری بھرتی ہوئی اور تولیہ دوپٹے کی جگہ اوڑھے ہوئے، پانی کی دھار سے غرارہ بچاتی ہوئی آتیں اور گیلے بال جھٹک کر کچے صحن میں بوندوں کی بوچھار کرنے لگتیں تو ہم بچے سمجھ جاتے، آج دھلی ارد کی کھچڑی پکائی ہوگی اور گرم گرم بیٹھ کر کھائیں گے، اصلی گھی ڈال کے۔

بڑی خالہ یہ کھچڑی اچار کے بغیر نہیں کھاتی تھیں۔ ''تم بڑی خالہ کو دیکھ آئے؟'' ایسا لگا نانو مجھ سے سوال کر رہی ہیں۔ ''ایک بار تو جا کر دیکھ آؤ۔ پھر تمھاری واپسی کے دن آ جائیں گے۔''

''ہاں، ہاں۔ ضرور دیکھ آؤں گا۔'' میں اپنے آپ سے وعدہ کرتا ہوں، نانو کی خاطر۔

بازوؤں کا گوشت ڈھلک گیا تھا۔ ڈھیلے گوشت کے بوٹے لٹکے ہوئے نظر آتے تھے۔ کان کی لویں بھی لمبی ہو کر لٹکنے لگی تھی۔ چھوؤ تو جگہ جگہ سے نرم۔ ''اوئی، ابھی یہ نہ کرو، میرے گدگدی ہوتی ہے...'' چھوئے بغیر ہی وہ ہنسنے لگتیں، پیٹ ہلتا رہتا اور آنکھوں کے کونوں سے پانی بہنے لگتا۔ وہ نرمیوں کا ایک ڈھیر تھیں جس پر گدگدیوں کے آڑے ترچھے راستے تھے دکھتی رگیں۔ ارے یہاں نہ ہاتھ لگ جائے، اپنے ہاتھ پیر سنبھالو۔ کل شام سے یہاں ایسی تھکن ہو رہی ہے، میں جانوں وہ دوڑا نکل رہا ہے۔ دیکھو، کھال کیسی لال ہو رہی ہے اور تن گئی ہے۔ کل سے چمک ہو رہی ہے۔ ہاتھ پیر کانپ رہے ہیں، دل بیٹھا جاتا ہے، کھایا پیا جاتا نہیں... اچھی ذرا دیکھنا کیا وقت ہو گیا ہے؟ وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا اس گھر میں...''

ہر وقت، ہر موقعے کے لیے ان کے پاس ایک کہانی تھی۔ ڈلیا سامنے رکھ کر پیار کی گھٹلیاں چھیلتی جاتیں یا ترکاری کاٹتی جاتیں اور کہانی کہتی جاتیں:

''ایک ماں کی بیٹی تھی۔ ماں بڑھیا پھونس ہو گئی۔ کام دھام ہوتا نہیں تھا۔ بیٹی کو پکارتی جاتی تھی۔

اے بیٹی کہاں، وہ پکارتی جاتی تھی۔
ہائے ری اماں، بیٹی جواب دیتی۔
پانی تو بھر دے۔
جو میں بھیگ جاؤں تو؟
اے بیٹی کہاں!
ہائے ری اماں!
ذرا چولھا تو جلا دے!
جو میں جل جاؤں تو؟
اے بیٹی کہاں!
ہائے ری اماں!
روٹی تو پکا دے!
جو میں تھک جاؤں تو؟
اے بیٹی کہاں!
ہائے ری اماں!
روٹی تو کھا لے!
آئی ری اماں!

بیٹی آئی اور کھانا سب چٹ کر گئی، اماں بیٹھی منہ دیکھتی رہی۔ بیٹی کی، بات پر ہکا بکا ہم بھی ان کی طرف دیکھے جاتے۔

"چلو اچھا کیا بڑی آپا کو دیکھ آئے۔ پہچانی تو وہ کیا ہوں گی تمھیں۔ اب کس کو کس پہچانتی ہیں۔ آنکھیں بے نور سی ہو گئی ہیں، جو آئے اس کو دیکھتی رہتی ہیں۔ میں تو ایک بار گئی تھی سب اگلی پچھلی باتیں بھول کر۔ دل ایسا خراب ہوا پھر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ چار چار تو نلکیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس سے غذا اتاری جا رہی تھی۔ ہاتھ کے اشارے سے بتا بھی نہیں پاتی ہیں۔ بو ایسی ہے کہ متلی ہو جائے۔ لیٹے رہنے سے سارے بدن پر گھاؤ ہیں۔ اور بے چینی ایسی کہ بار بار سر پٹکیں۔ پھر بستر نیچے کیا۔ بستر کا بھی وہ پلنگ ایسا ہے جو گھمانے سے اونچا نیچا ہو جاتا ہے۔ ان کا تو یہ حال ہے، اماں ضد کر رہی ہیں کہ مجھے لے چلو، اسپتال جاؤں گی اسے دیکھنے۔ یہ کہے جاتی ہیں، میرا ماں کا دل ہے۔ اس کی آئی مجھے آ جائے۔ میں نے کہا، اماں گھر بیٹھ کر دعا کیجیے۔ وہاں وہیل چیئر پر کیسے لے جاؤں؟ اتنی بھاری ہوتی ہے، ایک دفعہ بٹھا کر لے گئی تھی۔ پوری طاقت سے اسے دھکیلنا پڑا ہے۔ میرے کندھے شل ہو گئے۔"

چھوٹی خالہ کا سب سے چھوٹا بیٹا، جواب اتنا چھوٹا نہیں رہا، اگر واپس آئے تو وہ دیکھے گا کہ امیگریشن کاؤنٹر کی لائن لمبی ہو گئی ہے اور آہستہ آہستہ سرکتی ہے، کراچی زیادہ گھنا اور زیادہ بے ترتیب ہو گیا ہے، اور نانو...

نانو اونچی آواز سے قرأت کا کیسٹ لگا کر نانو اونگھ جاتی ہیں۔ کسی کو آ کر ٹیپ بند کرنا پڑتا ہے۔

باتھ روم جانے کے بعد وہ فلش کرنا بھول جاتی ہیں۔

ایک دن غسل خانے میں شلوار کا کمر بند ہاتھ سے پھسل گیا تو انھوں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

وہ آنکھ بچا کر کھانا ڈسٹ بن میں پھینک دیتی ہیں۔ پھر وہی چیز فریج میں سے نکال کر اس طرح جلدی جلدی نگل لیتی ہیں کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔

نانو اب نانو ہاؤس میں نہیں رہتیں۔

نانو کو نہیں معلوم کہ نائن الیون کا مطلب کیا ہے۔

وہ اپنی بات میں میں ذرا سی تبدیلی بھی نہیں برداشت کرتیں۔ جس دن گھر والے برگر (Burger) یا پیزا (Pizza) کا ٹیک اوے (Take Away) لے کر آئیں، وہ کھانے کے نام پر منہ پھیر لیتی ہیں۔

بچے ان کی باتوں پر ہنستے ہیں۔

"طویل عمر بھی ایک عذاب سے کم نہیں۔" بڑے خالو کسی کو سمجھانے کے انداز میں بتا رہے تھے۔ "یہ بے چاری اس عذاب کو گھسیٹ رہی ہیں۔ آپ کو اندازہ ہے کہ اب ان کی عمر کیا ہو گئی ہو گی؟"

"بھگتنا تو مجھے پڑا۔ سب اپنے اپنے الگ ہو گئے۔" کچن سے منجھلی خالہ کے بڑبڑانے کی آواز چائے کی پیالیوں کی کھنک میں پوری طرح دب نہیں پاتی۔ مہمان طریق سب آ جاتے ہیں اماں کو سلام کرنے کو۔ چائے پانی بھی تو مجھے دیکھنا پڑتا ہے۔ یہاں کون سے نوکر لگے ہوئے ہیں۔"

"ہاں باجی بول رہی ہوں۔ آ گیا صبح صبح ہماری بھاوج صاحبہ کا فون، دس بجے۔ رات بھر انگاروں پر لوٹی ہوں گی جو دس بجے اٹھ گئیں۔ اپنے حساب سے منہ اندر پھیرے۔ فون اٹھاتے ہی چیخنا شروع کر دیا۔ وہی جاہل، نیچ عورتوں والی کمینی آواز میں چیخنے لگیں۔ آپ کو پتہ ہونا چاہیے۔ میری کوئی انڈر اسٹینڈنگ نہیں رہ گئی ہے آپ کے بھائی کے ساتھ۔ پھر بھی آپ اماں کو ہمارے سر پر تھوپ رہی ہیں۔ آپ سے رکھا نہیں جاتا، سارے خاندان میں کہتی پھر رہی ہیں۔ آپ میں سے کس نے سسرال والوں کا نہیں کیا۔ کس نے ساس کے ساتھ گزارا کیا ہے۔ وہ تو میں ہی ہوں... یہاں ان کو کون کھانا کھلائے گا اور رات کو اٹھ اٹھ کر باتھ روم لے جائے گا... ہاں، ٹھیک کہتی ہو۔ بیٹے ہو کے آگے اماں بھی دم بخود ہیں۔ ورنہ یہاں تو اٹھتے بیٹھتے شکایتیں۔ اللہ میاں اٹھا کیوں نہیں لیتا؟ کیا دیکھنے کو جلائے جا رہا ہے۔ جوان جوان موتیں ہو رہی ہیں ہمارے سامنے کے بچے اٹھتے جا رہے ہیں، ایک ہم بیٹھے رہ گئے قیامت کے بوریے سمیٹنے کو... ارے بھئی کہاں تک ٹوکوں اور کس کس چیز پر؟ کھانے کے لیے آ کر بیٹھتی ہیں اور جب اٹھ کر جاتی ہیں اور قالین میں بھورے ہی بھورے ہوتے ہیں۔ اس دن گرا دیا اور دیکھا نہیں۔ پیروں سے خود ہی کچل دیا۔ قالین کا ستیاناس ہوا جا رہا ہے۔ جو نوکر رکھو اس سے بیر باندھ لیتی ہیں۔ اس کے ہاتھ میں صفائی نہیں ہے، فلاں گندہ ہے۔ نہلوانا کپڑے بدلوانا ایک مصیبت ہو جاتا ہے۔ الماریوں میں ڈھیر کپڑے پڑے ہیں، یہ آٹھ آٹھ دن جوڑا نہیں بدلتیں۔ انھی میلے کپڑوں میں بیٹھی رہتی ہیں۔ میرا تو سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ ابا جی بھی تو منہ پیٹ پیٹ لیتے تھے..."

ہیلو باجی؟ کیسی ہیں آپ؟ اچھا بتانا یہ تھا کہ میرے یہاں بھی پہنچ گئے ہمارے بھائی صاحب۔ آرڈر داغ گئے کہ میری بیوی تو تمبولا کھیلنے جاتی ہے، رات کو دیر سے واپس آتی ہے۔ جمعہ کو اماں کو بھیج دوں گا منیجر کے ساتھ۔ میرے بچے اور بیوی تو کل رات دبئی چلے گئے اور میں بھی جانے والا ہوں۔ کیا حال ہے تمھارا، بس یہ ایک جملہ کہا۔ اور یہ کہ کسی عورت کو رکھ لو۔ ڈھونڈ لو، تمھاری طرف تو بہتیری مل جائیں گی، ہمارے یہاں کوئی کرنے والا نہیں ہے۔ عورت کتنے پیسے لے گی، مجھ سے لے لینا، مجھے اللہ نے بہت دیا ہے۔ ایک تو ہر وقت یہی جتائے جاتے ہیں کہ بہت دیا ہے، اللہ نے بہت دیا ہے۔ بس یہی سنے جاؤ۔ میری بچی آئی پردیس سے اتنے سال بعد تو اسے چھلا تک نہ دیا۔ بلانا کھلانا تو کیا، لفافہ ہی پکڑا دیتے۔ داماد کے سامنے عزت رہ جاتی کہ اکلوتے ماموں ہیں.. میری تکلیف کا تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ پیر مارے درد کے پھٹے جاتے ہیں۔ ادھر سے ان کا نہلانا دھلانا.. کھینچنے بھی پڑتے ہیں تو جان نکلی جاتی ہے۔ بچ بچ کے کام کرتی ہوں کہ کھلے زخم میں انفیکشن نہ ہو جائے۔ نہلانا دھلانا تو عورت کر لے، ایک اماں سے پورے گھر میں کام بڑھ جاتا ہے۔ کہنے کو اکیلی جان ہیں۔ انھیں تو روزانہ شوربہ چاہیے۔ کہتی ہیں میرا کیا کام ہے، میرا کیا پکنا، تھوڑا سا سہی شوربے کا پکنا تو ہوگا، ہانڈی کا انتظام تو کرنا ہوگا۔ ورنہ میرے ہاں دوسرے، تیسرے دن کا پکتا ہے۔ پکا کر رکھ لیا اور کھاتے رہے۔

اب ان سے ہی ہر وقت کا بیر باندھ لیا ہے۔ یہ لحاظ نہیں کہ داماد ہیں۔ صبح ہوتے ہی ان کی ٹوہ میں لگ جاتی ہیں اور بڑبڑاتی رہتی ہیں۔ لو، اٹھے اور پیخانے چلے گئے۔ جا کر بیٹھ جائیں گے۔ گھنٹوں کو چھٹی ہوگئی۔ یہ باورچی خانے میں گئے نہیں کہ ادھر سے جھانکنے لگیں کہ کیا کھا رہے ہیں اور پھر کہے بھی جائیں گی، خوراک بھی ماشاءاللہ اچھی ہے، بھوک بھی کھل کر لگتی ہے۔ ایک داڑھ چلے اور ستر بلا ٹلے۔ جبھی تو دیکھو، کھا کھا کر چکنے چوڑے ہو رہے ہیں۔ میری بیٹی ہی کو کھائے جاتے ہیں۔ ہم نے تو ساری زندگی ایک روٹی کھائی ہے، پتہ نہیں لوگ کیسے کھاتے ہیں، ہم سے کھایا نہیں جاتا، جس پہ ہمیں سنائے جاتی ہیں۔ بھیا جی تو کہہ گئے عورت رکھ لو۔ جو عورت رکھی اس سے اماں کے جھگڑے قصے بھگتنے تو مجھے پڑتے ہیں۔ اس کو ہر وقت جتاتی رہتی ہیں، میرے بیٹے کے پیسے سے یہ سب ہو رہا ہے۔ اس عورت کو ہر وقت ٹوکے جاتی ہیں۔ ان کو خالی بیٹھنے کی تنخواہ دی جا رہی ہے، ہاتھی کا سا پاؤں تنخواہ دی جا رہی ہے۔ بھر مٹھی خرچ کیا جا رہا ہے اور یہ بیٹھی کھا رہی ہیں اپنے مزے سے۔ اب یہ نہائے گی بھی نہیں، کپڑے بھی دھوئے گی، سنگھار پٹار کرے گی۔ عورت ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے کھڑی ہوئی تو اماں بڑبڑائے جائیں گی، الٰہی کتنی لمبی نماز پڑھی جا رہی ہے، اے بی قضائے عمری کیا آج ہی پڑھو گی۔ عورت بھی مجھ سے کہہ کر چلی گئی، تو مرنے دے رہی ہے نہ جینے دے رہی ہے۔ میں تو اماں کی اس ڈیوٹی کو چھاڑ کر کہیں جا بھی نہیں سکتی۔ میں تو ماں کی خدمت کرتی رہی، حدیث شریف میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ سب لوگ کہتے تھے، اماں کی عمر پندرہ سال کم ہوگئی، تم نے کیسے کیا۔ میں تو اماں کے آگے ہاتھ جوڑتی رہی اور اماں جہاں جائیں میری برائی کر کے آئیں کہ بیٹی ایسی، داماد ایسے، منی نے بھی کہا، لے لے کر پھرنا چھوڑ دو۔ میں نے سوچا باہر نکلتی ہیں، کپڑے بدلتی ہیں، لوگوں میں ہنستی بولتی ہیں، دل بہلے گا۔ گھر میں بند کر کے تو نہیں رکھا جا سکتا۔ پہلے تو ماسی، نوکرانی کو بتاتی تھی، پھر محلے پڑوس میں باتیں پہنچنا شروع ہوئیں، سارے خاندان میں میرے گھر کا احوال پھونک دیا۔ کسی کو کیا پتہ میں کیسے گھر چلاتی ہوں۔ انھوں نے نوکروں تک کو بتا دیا کہ یوں شادی ہوئی، اتنے سال بعد بچے ہوئے، ایسے گذارا کیا، کچھ کہو تو رونے بیٹھ جائیں گی، اسپتال سے مجھے کیوں لے آئیں، وہیں مرنے دیتیں۔ میں نے بھی ایک دن جل کر کہہ دیا، اماں اسپتال میں بھی ایک وقت تک رکھتے ہیں، اس کے بعد گھر بھجوا دیتے ہیں...

"گھر؟"

"ہاں، ہاں گھر... یہی تو میں نے کہا...

"پہلے تو یہی ضد کرتی رہیں کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ یہیں رہنے دو۔ اتنا سمجھانا پڑا کہ ڈھنڈار گھر میں اکیلی کیسے رہیں گی۔ کوئی مار کاٹ کے ڈال دے گا اور کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔ اتنا سمجھایا کہ منی کے یہاں کیوں نہیں رہ لیتیں؟ نام سن کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ منی؟ اس سے بات کر کے چونڈا منڈوانا ہے، نا بابا نا! اس حال میں بھی اماں کو یہ سمجھ ہے۔ منی بھی کیا مجال کہ معمول میں فرق آنے دیں۔ اماں خود کہتی ہیں، شام کو گھر آئیں بھنویں نچوا کر بال سیٹ کروا کے۔ وہی پھچر پھچر کرنے والے جوتے چڑھائے اور دوڑنے کے لیے نکل پڑیں۔ یہ خوب دوڑنا ہے۔ جس میں ننا گا ڈھنگا ہے نہ پیچھا۔ جاگنگ کو کہہ رہی تھیں کچھ کہہ دو تو ابھی رونے بیٹھ جائیں گی کہ یہاں تمھاری اماں ہی میری نہیں، ساری خرابیاں مجھ میں ہیں۔ تم دعا کرو اماں مر جائیں

"منی کو دیکھو، اس حال میں بھی اماں کے کندھے پر بندوق چلانے سے باز نہیں آئیں گی۔ وہ کوئی ان کے ساتھ کی ہیں، انھوں نے بتایا ہے کہ ایک کوئی ہیں، چار چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، مصیبت زدہ اور بے سہارا نہیں۔ منی نے یہ کہنا شروع کیا ہے کہ ان کو ایک فلیٹ لے کر دیا جائے، وہ ہم لوگ سب مل کر لے کر دیں اور اس میں اماں ان کے ساتھ رہیں۔ بڑی قسمیں کھا رہی ہیں کہ بہت خیال سے رکھیں گی، اماں کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کریں گی۔ میں نے کہا بھی دنیا کیا کہے گی۔ ہمارے جنم پر تھوکے گی کہ ماں کو نہ رکھ سکیں، دربدر کر دیا۔ ان کا جواب سنو، کیا کہنے لگیں۔ یہ کہا کہ اماں عزت سے تو رہیں گی... میری تو عقل جواب دے گئی ہے کہ اب ان کا کیا کریں۔ کہیں چھوڑ کر بھی تو نہیں آ سکتے۔ کوڑے کے ڈھیر پر نہیں ڈال سکتے۔ ایدھی والوں سے نہیں کہہ سکتے کہ انھیں لے جائیں۔ ان کا ٹھکانا کہاں ہوگا۔ کب تک پوٹلیا میں گھر لیے پھریں گی؟

"ان چھوٹی صاحبہ کو کچھ کہنا ہے تو وہ آگے سے دو چار بات سنا دیں گی۔ میرے میاں گنوار تھے تو کیوں نرے گنوار کو ہاتھ پکڑا دیا گیا تھا؟ کوئی میں گھر سے بھاگ کر گئی تھی؟ مجھے تو طلاق اور نکاح کی بھی خبر نہیں تھی۔ امی خود ہی فاضل کو، وہ کھانا پکانے والا تھا نہ، پرچے لکھ لکھ کر دیتی تھیں کہ دوپہر میں آپا کے یہاں دے کر آئے اور ان سے پوچھے وہ لڑکے والے دیکھنے آئے تھے ہماری لڑکی کو۔ ان کے یہاں سے اب تک پیغام نہیں آیا۔ مجھے بیٹی بیاہنی ہے۔ پانچویں بیٹی سمجھو سینے پتھر کی سل دھری ہے..."

رات رات کو سوتے میری آنکھ کھل گئی۔ ایسا لگا کوئی میرے بستر کے پاس کھڑا ہے، زور زور سے سانس لے رہا ہے۔

کون ہو سکتا ہے۔ اندھیرے میں گھبراہٹ ہونے لگی۔

وہاں وہ کھڑی تھیں، میرے سرہانے۔ جیسے بچپن میں مجھے بخار ہو جاتا تھا تو وہ تھوڑی دیر کے بعد ماتھا چھو کر دیکھنے کے لیے آیا کرتی تھیں۔ اسی طرح دبے پاؤں کہ میری غفلت بھری نیند نہ ٹوٹ جائے۔ یا عشا کی نماز کے بعد دم کرنے آتی تھیں... الٰہی نور، ہر بلا دور، یا اس قسم کے کچھ اور الفاظ۔ میں ان کے لمس اور آہٹ کو پہچانتا تھا۔ نانو ہی تھیں۔ ان سے تو غسل خانے کے لیے اٹھا نہیں جاتا، یہ یہاں کیسے آ گئیں؟ میں نے ذرا حیران ہو کر دیکھا، تصدیق کرنی چاہی۔ ان کے چہرے کی مسکراہٹ کو پہچاننے میں غلطی کرنا مشکل تھا۔ وہی خالی خالی آنکھوں والی، دانت ٹوٹی ہوئی مسکراہٹ۔

وہ مسکراہٹ مجھے نظر آ رہی تھی، چہرے کے خد و خال نہیں۔ کیا یہ بھی ایلس ان ونڈر لینڈ کی Cheshire Cat کا معاملہ تھا جس میں مسکراہٹ تو تھی، مگر بلی غائب۔

نانو مگر Cheshire Cat بھلا کہاں ہو سکتی تھیں۔ وہ تو وہی تھیں نرم

مجبور، مسکراتی ہوئی۔ اور وہ کچھ کہہ رہی تھیں۔ میں نے کان لگا کر غور سے سنا۔

ان کی آواز دھیمی تھی، سانس سے بھی مدھم "... گھر چھوڑ آؤ۔" الفاظ گول ہوتی ہوئی زبان سے لڑھکتے آرہے تھے۔

ایک لمحے کے لیے تو میں سناٹے میں آگیا۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ کیا یہ واقعی نانو ہیں؟ ذہن میں سب سے پہلے برا خیال آیا۔ اس طرح اور اس عالم میں وہ لوگ نظر نہیں آیا کرتے جو ابھی زندہ ہوں... تو کیا نانو بھی...؟

وہ الفاظ پھر دہرائے گئے۔ یہ میرا وہم تھا، یا میں خواب دیکھ رہا تھا؟ سانس بھی اکھڑی اکھڑی سی تھی اور اس کے بیچ میں پھر وہی الفاظ...

وہ کہاں جانا چاہ رہی ہیں؟ اور میں ان کو وہاں کیسے لے جاؤں؟

میں نے ذہن پر زور ڈالنا چاہا مگر مجھے نانو کے گھر کا پتہ یاد نہیں آیا۔ نانا ابا کے انتقال کے بعد ہی بک گیا تھا، اب خدا معلوم وہاں کیا ہوگا۔ مدت سے اس علاقے میں جانا بھی نہیں ہوا۔ اس مکان کا سامنے کا رخ اور باہر لگا ہوا املی کا پیڑ مجھے یاد تھا جس کے پھول توڑ کر نانو قمیص میں لگاتی تھیں اور دیوار کے ساتھ رکھا ہوا پتھر کا بنچ... وہ علاقہ اب کتنا بدل گیا ہوگا۔ میں نانو کے گھر کو پہچانوں گا کیسے؟ خوف کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی کو سرد کر گئی۔ وہ وقت مجھ سے بچھڑ گیا، وہ گھر مجھ سے چھوٹ گیا۔ اب اتنی رات گئے میں نانو کو کیا جواب دوں؟

انگلیوں کو ایک نمبر یاد تھا جو بن دیکھے ملایا جا سکتا تھا۔ میں نے ہیوسٹن میں چھوٹی خالہ کے بیٹے کو فون کیا۔ "تمھیں نانو کا گھر یاد ہے؟"

وہ میری بات سنتے ہی ہنس دیا۔ اتنی دور سے آپ نے یہ پوچھنے کے لیے فون کیا ہے؟ اور آپ بھی میری طرح نانو کہنے لگے؟ آپ تو ان کو نانی امی کہتے تھے جو زور سے پکارنے میں نانیمی ہو جاتا تھا۔ مجھے تب بھی ہنسی آتی تھی۔" یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ کوئی ایمرجنسی نہیں ہے جو لانگ ڈسٹنس کال کی ہے، وہ بے تکان بولے جا رہا تھا۔

وہ بولے چلے گیا... آخر بیٹا کس کا ہے، میں نے جھنجلا کر سوچا اور فون رکھ دیا۔ "ہیلو" اس کی آواز دب کر گھٹ گئی۔

"نانو بھی اپنے ہاؤس کی طرح ہیں۔" وہ کہا کرتا تھا۔ نانو کو نانو تو ہم اس کی دیکھا دیکھی کہنے لگے تھے۔ وہ اب یہاں سے دور ہے مگر میں یہاں سے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔

زیرو بلب کی نیلی روشنی نے گیسٹ روم کے اندھیرے کو اور گدلا کر دیا تھا۔ میرے بستر کے سرہانے کسی کے کھڑے ہونے اور سانس لینے کا احساس چھایا ہوا تھا۔ اگر وہ نانو ہیں تو میں ان کی بات کا کیا جواب دوں۔ اب کیا کروں، ہاؤس کے بغیر نانو کہاں جائیں؟

میں نے گھٹنے پیٹ کی طرف موڑ لیے اور سختی سے آنکھیں بھینچ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

مگر میری نیند کہاں ہے، وہ پتہ مجھے تب بھی یاد نہیں آیا۔☆☆☆

غزل

فرید پربتی

اور کچھ اس کے سوا اہل نظر جانتے ہیں
پگڑیاں اپنی بچانے کا ہنر جانتے ہیں

اک ستارے کو ضیا بار دکھانے کے لئے
وہ بجھائیں گے سبھی شمس و قمر جانتے ہیں

خواب میں دیکھتے ہیں کھڑکیاں ہر گھر کی کھلی
دور ہوجائے گا اب شہر سے ڈر جانتے ہیں

میزبانی تھی کبھی جن میں میسر تیری
پلٹ آئیں گے وہی شام و سحر جانتے ہیں

تری جھولی میں ستارے یہ نہیں گرنے کے
ہر طلب گار کا وہ طرز نظر جانتے ہیں

یہ جو ستانے یہاں آتے ہیں صاحب اک دن
سائے کے ساتھ وہ مانگیں گے شجر جانتے ہیں

تیز آندھی سے دیے سارے بچانے کو فرید
خود کو رکھے گا سر راہ گذر جانتے ہیں

غیاث متین

تمھارا رنگ رنگ آسماں جیسا بدلتا ہے
کسی کو چاہنے والا کہیں اتنا بدلتا ہے

صبا، شبنم، شفق، رخسار گل، مہتاب، ان سب کا
تمھارا نام لیتا ہوں تو کیوں چہرہ بدلتا ہے

صبا گفتار، شیریں لب، ستارہ چشم ہیں تو کیا
بدلتے ہم بھی ہیں جب سامنے والا بدلتا ہے

کبھی جاتی نہیں جنگل کی بو صندل کے پیکر سے
کہ صورت کے بدلنے سے کہیں رشتہ بدلتا ہے

یہ شہر بے صدا اندر سے شہر آرزو نکلا
دھواں ہر دم یہاں بجھتے چراغوں کا بدلتا ہے

اترتے وقت پانی میں ذرا یہ دیکھ لینا تھا
کہ اندر بیچ میں جا کر یہی دریا بدلتا ہے

رہو دیوار کے سائے میں لیکن دیکھتے رہنا
ہمیشہ رخ یہاں دیوار کا سایہ بدلتا ہے

سخن رستہ لکیروں سے نہیں لفظوں سے روشن ہے
لکیریں پیٹنے سے بھی کبھی رستہ بدلتا ہے

متین آؤ چلیں خیمے کی جانب اک ذرا سولیں
وہ دیکھو صبح کا تارا لباس اپنا بدلتا ہے

نصیبہ جاگ اٹھا اور مقدر بن گیا اپنا
جہاں دیوار ہے اس کی وہیں گھر بن گیا اپنا

نہ جانے دھوپ نے اپنی زباں میں کیا کہا اس سے
شجر کے جسم سے سایہ نکل کر بن گیا اپنا

ہماری آنکھ سے نیندوں کا رشتہ توڑنے والے
کوئی تجھ سے سوا خوش رنگ پیکر بن گیا اپنا

ہمارا سر سلامت ہی رہا سنگ حوادث میں
جو پتھر بھی ادھر آیا وہ پتھر بن گیا اپنا

سفر میں ساتھ اپنے دھوپ دریا اور سمندر تھے
ہماری خوش نصیبی تھی سمندر بن گیا اپنا

ہوا بارش سمندر کا کنارہ اور ہم دونوں
کچھ ایسے کھو گئے منظر میں منظر بن گیا اپنا

یہی بارش کا موسم تھا ہوائیں تیز تھیں اس دن
بہت بھیگا ہوا تھا وہ سمٹ کر بن گیا اپنا

متین اک عمر گزری ہے سخن کو آب دینے میں
تبھی الماس لہجہ سب سے ہٹ کر بن گیا اپنا

غیاث متین

ہوا بہت تیز چل رہی ہے چراغ جاں پھر بھی جل رہا ہے
یہ کون ہے جو ہمارے پیچھے ہوا کے ہمراہ چل رہا ہے

گماں کی بستی میں رہنے والو ذرا پہاڑی پہ چڑھ کے دیکھو
ادھر ندی ہے وہیں سے شہر یقیں کا رستہ نکل رہا ہے

سراب اندر سراب تم ہو چراغ اندر چراغ ہم ہیں
ہمیں سے تاریکیاں ہیں خائف ہمیں سے خورشید جل رہا ہے

ہمارے بچے یہاں رہیں گے تو آندھیوں میں گھرے رہیں گے
انھیں یہاں سے نکلنا ہوگا یہاں کا منظر بدل رہا ہے

پرانی قبروں پہ آج کتنے نئے مکانوں کی زندگی ہے
جو آج ہے بس اسی کو دیکھو وہ بھول جاؤ جو کل رہا ہے

کسی نے شانے پہ ہاتھ رکھ کر جو نام پوچھا متین اپنا
چراغ آنکھوں میں جل بجھے ہیں، وجود سارا پگھل رہا ہے

بارش ہوگی تو بارش میں دونوں مل کر بھیگیں گے
ریت پہ ایک مسافر کا گھر اور سمندر بھیگیں گے

اچھا میں ہارا تم جیتے آگے کی اک بات سنو
اب کے برس جب بارش ہوگی سوچ سمجھ کر بھیگیں گے

دھوپ کا اک ٹکڑا کیوں میرے سر پر سایہ کرتا ہے
کیا مجھ کو منظر سے ہٹا کر سارے منظر بھیگیں گے

کاغذ کی اک کشتی لے کر بارش میں کیوں نکلے ہو
بھولے بسرے بچپن کی یادوں کے پیکر بھیگیں گے

اچھے لوگوں کی بستی میں تم کیوں رہنے آئے ہو
یاں ہونٹوں پر پھول کھلیں گے خون میں خنجر بھیگیں گے

اک ہلکی سی چوٹ پہ میری آنکھیں پھر بھر آئیں گی
جیسے شبنم کے قطروں سے تتلی کے پر بھیگیں گے

اس دن کی جب بارش ہوگی کون بچے گا ہم سفرو
پھول، پرند، چراغ، جزیرے، کنکر پتھر بھیگیں گے

اک فانوس ہے جس میں اپنی روح متین سلگتی ہے
بھیگنا جب ٹھہرا تو اسی فانوس کے اندر بھیگیں گے

غیاث متین

اس کے چہرے پر
مسکراہٹ اس طرح کھنچی تھی
جیسے پتھر پر لکیر
اس کی آنکھوں میں
دور دور تک ریت ہی ریت بچھی تھی
اس کی سانسوں کا زیر و بم
ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کی طرح تھا
لیکن جب نظم سناتا تھا
تو اک گونج پیدا ہوتی تھی
جس کی لہریں
اس کونے سے اس کونے تک
پھیلتی ہی چلی جاتی تھیں
وہ اسرار میں غرق
پہاڑوں کے دامن میں پھیلی ہوئی گھاس پر
پتی پتی کی تحریر پڑھتا تھا
اس نے کتنے ہی پہاڑوں کو سر کیا تھا
کتنے ہی دریا پار کیے تھے
اس کی ''روح نئی نئی نظموں میں جنم لیتی تھی''

جن کی چمک آنکھوں کو خیرہ کیے دیتی ہے
اس نے عمر کو اک چیخ کی معیاد کہا تھا
اور یہ بھی کہا تھا
''سیل کو روک رکھو
مرے سیل کو
ورنہ پھیلی دشاؤں کی حد سے گذر جاؤں گا
بکھر جاؤں گا۔''
مگر یہاں کون تھا
جو اس کے سیل کو روک سکتا
خلاؤں میں چھپی آنکھیں
نم ہو گئی ہیں
اس کی نگاہوں میں
افق کے پار جاتے ہوئے جو ستر اونٹ تھے
وہ اوجھل ہو گئے
اس کے گلے میں پھنسی ہوئی اک چیخ
کا کانٹا تھا، نکل گیا
آواز اور اس کی گونج باقی رہ گئی ہے

شاہین

بہت دیر ہوگئی

کبھی ایسا ہوا جو مسئلہ ہے اس کی کوئی اہمیت واضح نہ ہو پائی تو یہ سوچا ذرا کچھ وقت مل جائے تو ہم تہ تک اتر جائیں گے باتوں کی۔ پھر اندازہ ہوا سارے عمل میں دیر اتنی ہو چکی ہے اہمیت ہی اب نہیں باقی رہی کچھ مسئلے کو طول دینے کی۔ تو یوں ہے زندگی یوں ہی گذرتی جا رہی ہے تجزیے اور فیصلے کی بے یقینی میں۔ ہم اپنے آپ کو رستے میں کھو دیتے ہیں کچھ ایسے کہ خود کو ڈھونڈ کر پھر راہ پر لانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ بس اک خاکہ سا بچ رہتا ہے، اک دھندلا سا خاکہ، ذہن میں جس کی طرف گر دھیان جائے بھی کبھی تنہائی شب میں تو آنکھیں موند کر ہم اپنی چادر تان لیتے ہیں۔

نیا بدن

مرا ملک نیا
مرا شہر نیا
مرے ہمسائے مرے یار نئے
مرا فرش نیا
مرا عرش نیا
مرے سارے در و دیوار نئے
ہر روز سویرے کرتا ہوں تخلیق میں اپنی دنیا کی
رہتی ہے حکومت آٹھ پہر جس میں بے تاج رعایا کی
میں اپنی آگ میں جل جل کر
جب خاکستر ہو جاتا ہوں
پھر دوسرے دن ہی تیشہ بکف
اک نئے بدن میں آتا ہوں

شاہین

نظر شائستۂ غم ہورہی ہے
مگر پہچان اپنی کھو رہی ہے
فراق دوست کی یہ آخری شب
نہ جانے کب کی نیندیں سورہی ہے
جسے گستاخ ہوجانا روا تھا
وہ آنکھ اب تک قصیدہ گورہی ہے
بڑی جوکھم ہے تھوڑا فاصلہ بھی
مسافت جاں بہ جاں طے ہورہی ہے
یہ سارا تجزیہ یہ بحث و تکرار
ہوس پشتارے کیا کیا ڈھورہی ہے
یہاں سے اٹھ کے جانا سانحہ تھا
یہاں آکر بھی وحشت ہورہی ہے
زمستاں ہے تری یادوں کا موسم
بہت مصروفیت ہم کو رہی ہے
لپیٹے عذر میں اپنے مہ و سال
گئے موسم کی چاہت سو رہی ہے
ترے غم سے کہ ہے اب یوں گریزاں
ہماری واقفیت تو رہی ہے
جہاں میلوں نہیں کوئی پڑوسی
خزاں کیوں کشت لالہ بو رہی ہے
سر آب رواں بد احتیاطی
دھلے دھبوں کو پھر سے دھو رہی ہے
اکیلے تھے تو جی لگتا نہیں تھا
مگر اب شام رسوا ہورہی ہے
ہلا کر شور گریہ سے زمیں کو
پس دیوار خلقت سو رہی ہے
بدل کر رنگ رخ شاہین اپنا
یہ شب بے مایہ کتنی ہورہی ہے

بجلی گرتی ہے ایسی بے بہا شے قدردانوں پر
جوانی مفت میں برباد ہوتی ہے جوانوں پہ
فلک تو بجلیوں کی تربیت کر ہی نہیں پاتا
زمیں زادے بھی پتھر پھینکتے ہیں آشیانوں پر
جہاں ہم ہیں وہاں ہونا، نہ ہونا خوش گمانی ہے
خدا کی رحمتیں نازل ہوں ہم سے خوش گمانوں پر
دکانیں پھیل کر دیوار بن جاتی ہیں رستے میں
لگی رہتی ہیں لیکن رونقیں کیا کیا دکانوں پر
سوا نیزے پہ سورج آ بھی جائے ہم نہ بولیں گے
قیامت بے سبب ہی ٹوٹتی ہے خستہ جانوں پر
زباں کو کاٹ دیتے ہیں کہ دل کا حال کہتی ہے
یہ کیسا وقت نازک آپڑا ہے ترجمانوں پر
کہستانی مہم ہو یا مسافت دشت و صحرا کی
پہنچ جاتے ہیں سارے راستے اپنے ٹھکانوں پر
اترتے ہی بلا جن میں الجھ کر بے اماں ہوگی
لگا رکھی ہیں ایسی سانگیاں ہم نے مچانوں پر
یہ کیا شاہین ہر صورت مجسم ہو کے رہ جائے
کبھی تو آگ برسے سال دیدہ سرد خانوں پر

شاہین

دنیا نے بس تھکا ہی دیا کام کم ہوئے
تیری گلی میں آئے تو کچھ تازہ دم ہوئے

عقدہ کھلا تو درد کے رشتے بہم ہوئے
دامن کے ساتھ اب کے گریباں بھی نم ہوئے

جب سے اسیر سلسلۂ بیش و کم ہوئے
ہم کو صلیب اپنے ہی نقش قدم ہوئے

بدلی ذرا جو طرز خرام ستار گاں
لفظوں میں آنکھ بیچ صحیفے رقم ہوئے

تھے منتظر ہمارے بھی گل چہرگان شہر
لیکن رہا گرفت جہاں سے نہ ہم ہوئے

رہ کر جن انتہاؤں میں اپنی گذر گئی
اس طرح جینے والے تو جاں بر ہی کم ہوئے

دیوار پر گڑے ہوئے ٹکڑے ہیں کانچ کے
یہ کس حصار رنگ میں محصور ہم ہوئے

چشمک یہ دھوپ چھاؤں کی اور ایک زرد پھول
اک جان ناتواں پہ ہزاروں ستم ہوئے

یکتا و بے نظیر ہے وہ کیا اسے غرض
خارج ہوئے کہ داخل کعبہ صنم ہوئے

شاہین تھے کمال کے رتبہ شناس دہر
پر اپنی منزلت سے خود آگاہ کم ہوئے

وہ عالم تھا کہ خطرے سے الجھ جانا ضروری تھا
مگر جی کو کسی صورت تو بہلانا ضروری تھا

ہماری بے زبانی ورنہ اک آزار بن جاتی
یہ وحشت ہی سہی دنیا کو جتلانا ضروری تھا

نپٹ کر دشمنوں سے دوستوں سے بھی لڑائی کی
رہا اک دل تو بے چارے کو سمجھانا ضروری تھا

بدن مٹی کا ٹھہرا اور مٹی ایک ہوتی ہے
جہاں بھی تک گئے مٹی سے یارانہ ضروری تھا

اداسی بام و در کی دل میں ایسے ٹوٹ کر برسی
بدن پر موسموں کے نقش لہرانا ضروری تھا

شمالہ ہاتھ میں، لب پر غزل، اور رات بھیگی سی
مرا خود اپنے ہی رستے سے ہٹ جانا ضروری تھا

امیر شہر تو ہلتا نہ تھا اپنے ٹھکانوں سے
ہمیں ہر حال میں پتھر سے ٹکرانا ضروری تھا

بچا لے آئے اپنے آپ کو غول شغالاں سے
جسے کھو آئے تھے اس شخص کو پانا ضروری تھا

چلے ہو جانب کعبہ جو یوں شاہین با وحشت
تمھیں پہلے تو خود اپنے ہی بت ڈھانا ضروری تھا

شاہین

احوال چھپاتے ہیں کیا جانئے کیا جی کا
چہرے سے بڑی عینک ماتھے سے بڑا ٹیکا
اب عمر کے خیمے میں پیوند ہی لگنے ہیں
صحرائے عرب ہو یا بازی گہ امریکہ
شرمندۂ ہستی ہیں پہچان ہماری کیا
کاسہ ہی تو ہوتا ہے چہرہ بھی سوالی کا
میری ہی کہانی ہے میرا ہی حوالہ ہے
یا تان ہو میرا کی یا شعر ہو سعدی کا
میں اپنی سیہ روزی پر حرف نہ آنے دوں
قصہ جو کبھی نکلے تابندہ لیالی کا
بس میں تو نہیں اس کے تدبیر تدارک کی
احساس اسے ہو بھی گر میری تباہی کا
جنگل میں ہوں شاید ہم کچھ کم ہی سراسیمہ
شہروں میں تو نافذ ہے قانون سفاری کا
گھر جس نے کیا دل میں شاہین عجب شے ہے
مٹی سا ہے رنگ اس کا اور نام اناسیکا

خزاں کی شام کے منظر کو بھر ڈالا پرندوں نے
افق کو اور بھی تاریک کر ڈالا پرندوں نے
مجھے پھر کون سی مٹی میں اب کے سر اٹھانا ہے
یہ اک قرعہ بھی میرے نام پر ڈالا پرندوں نے
لہو میں کچھ نہ ہو پھر بھی لہو کی بو تو ہوتی ہے
خود اپنے ہی لہو کو خوار کر ڈالا پرندوں نے
تھکے ہارے جہاں شب بھر بسیرا کرنے آئے تھے
چرندوں کی طرح وہ کھیت چر ڈالا پرندوں نے
وہ رت آئی ہوا سب ہو گئے پتے درختوں کے
مگر یوں بھی ہوا شاخوں کو بھر ڈالا پرندوں نے
یہ کوشش تھی کہ باہم دام کو ہی لے اڑیں لیکن
تنے حلقوں کو اتنے میں کتر ڈالا پرندوں نے
ہمیں معلوم ہے کب کون دہشت گرد بنتا ہے
شکم کی آگ کو ہتھیار کر ڈالا پرندوں نے
وہاں شاہین چھاجوں دیر تک رحمت برستی ہے
سر گلزار دھیان اپنا جدھر ڈالا پرندوں نے

غزل

رفیق راز

تمام شہر تھا جنگل سا اینٹ پتھر کا
غضب وہ دیکھ کے آیا ہوں بادِ صرصر کا

صدائیں چشمے ابلنے کی آرہی ہیں مجھے
کسی نے توڑ دیا کیا سکوت پتھر کا

ملا ہے خاک نشینی سے یہ مقام مجھے
زمیں ہے تخت فلک تاج ہے مرے سر کا

مجھے تو کوئی بھی موسم اڑا نہیں سکتا
کہ میں تو رنگ ہوں اس کے ادھورے منظر کا

رواں کیا ہے مجھے کن بلندیوں کی طرف
کہ آسمان بھی لگتا ہے سایہ شہپر کا

میں اپنا گھر تو جلا کے سفر پہ نکلا تھا
خیال دشت میں آیا فقط ترے در کا

سنائی دیتی نہیں ہے اب اپنی آہٹ بھی
رواں ہوا ہے ہر اک سمت شور اندر کا

جب آفتاب سا مجھ پر ہوا تھا روشن تو
مجھے ہے یاد وہ یخ بستہ دن دسمبر کا

ہوائے لمس میں اک آگ بھی تھی پوشیدہ
کہ تابناک ہوا جسم سنگ مرمر کا

زہے نصیب محمد کا نام لیوا ہوں
ہے لاکھ شکر خدائے بزرگ و برتر کا

رفیق راز

چھیڑا ہے نیا نغمہ حیات ابدی نے
اس بار تبسم نہ کیا سن کے کلی نے

لفظوں میں اترنے کا ہنر سیکھ رہا ہوں
خطرے میں ہیں الفاظ کے سینوں میں دفینے

وہ ہیں کہ بھٹکتے ہیں ابھی پیاس کے مارے
ہم ہیں کہ ڈبو آئے سرابوں میں سفینے

سنتا ہوں تڑپتے ہوئے پانی کا فقط شور
حساس بنایا ہے مجھے تشنہ لبی نے

افلاک کے منظر ہیں مرے سامنے عریاں
بخشی یہ بلندی مجھے بے بال و پری نے

شاداب نظر آتے ہیں اشجار ہر اک سمت
کیا شہر میں جنگل کی ہوا لائی کسی نے

پہلو میں دھڑکتا ہے تڑپتا ہے شب و روز
بے چین کئے رکھا ہے مجھ کو مرے جی نے

جو راستے جاتے ہیں ترے عرش کی جانب
وہ رستے بھی دکھلائے مجھے دربدری نے

رنگوں سے ٹھنڈے پانی کے چشمے بنا دیئے
کاغذ پہ سایہ دار شجر بھی لگا دیئے

لاؤں گا اب کہاں سے نظارے کی تاب میں
اس نے تو میری آنکھ سے پردے ہٹا دیئے

باغ حروف و گلشن معنی میں دیکھنا
کس نے یہ خامشی کے نئے گل کھلا دیئے

چھوٹے سے ابر پارے نے آ کے سر فلک
اہل نظر کو دن ڈھلے پیغام کیا دیئے

بس ہم تو ایک چھوٹی سی ضد پہ اڑے رہے
دستار کو بچانے میں سر ہی کٹا دیئے

آنکھوں میں رہ گئے ہیں فقط آس کے سراب
دریا وہ یاس کے تھے جو ان میں بہا دیئے

دن کو سفر کچھ اور بھی آسان ہو گیا
راتوں کو سبز خواب یہ کس نے دکھا دیئے

ترتیب سے لئے ہیں تمھارے تمام نام
اک اور ہی فلک پہ ستارے سجا دیئے

طوفاں کا روپ دھار لیا تیز سانس نے
اتنا کہ خواب گاہ کے پردے ہلا دیئے

رفیق راز

اے دل زار کہیں نیند نہ ہو طاری
چشم درویش بھی خوابوں سے نہیں عاری

جسم کا دشت بھی سنسان ہے برسوں سے
ملک دل پر بھی نہیں روح کی سرداری

چاند سے کم نہ تھی ہم ہجر کے ماروں کو
اس شب تار میں موہوم سی چنگاری

یک بیک کون مری فکر میں در آیا
نہر خوشبو سی بیاباں میں ہوئی جاری

راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے کوئی رقصاں
میرے اندر ہے ابھی تک کوئی انکاری

زلف پیچاں تری زنجیر بنے گی کب
کب عمل میں، مری آئے گی گرفتاری

اے ہوائے دیار درد و ملال
مرحبا، مرحبا، تعال، تعال[1]
لفظ گم سم ہیں اور ان میں ہے گم
میری خاموشیوں کا جاہ و جلال
عقل سے کسب روشنی کر کے
ملک دل ہوگیا ہے رو بہ زوال
تو بھی اس میں ہے تیری دنیا بھی
کتنا گہرا ہے سوچ کا پاتال
پکی سڑکوں پہ یاد آتا ہے
کچے رستوں کا سبزۂ پامال
کس پہ اب ہے چنار کا سایہ
این جیرانتا و کیف الحال[2]
کھول دیوان حافظ شیراز
فال تو اب رفیق راز نکال

کھینچ لائی تھی مجھے خوشبو ہی تیرے پیرہن کی
پر تری آنکھوں میں ہے وحشت بھی آہوے ختن کی

عشق کی آتش کہاں بارود کے شعلے ہیں رقصاں
اب کہاں وہ زلف اور وہ داستاں دارو رسن کی

کیا ہوئے وہ دن کہ جب اکثر میسر تھی مجھے بھی
دن کو ظلمت زلف کی اور دھوپ شب کو سیم تن کی

آتش فرقت سے میں شب کو اجالا مانگتا ہوں
عشق میں ہوتی نہیں ہے حد کوئی دیوانہ پن کی

روشنی جس کی مری آنکھوں کو خیرہ کر چکی ہے
راکھ کر کے چھوڑ دے گی اب حرارت اس بدن کی

دیکھ کر رستے کے منظر سب کے سب تھے غرق حیرت
یاد ایسے میں بھلا آتی کسے اپنے وطن کی

---

[1] مرحبا مرحبا آجا آجا۔ یہ مصرع حافظ شیرازی کا ہے۔

[2] ہمارے پڑوسی کہاں ہیں اور کیا حال ہے؟ یہ مصرع بھی حافظ شیرازی کا ہے۔

جینت پرمار

لینڈ اسکیپ

بارش میں
نہاتے اونچے اونچے پیڑ
ناریل کی اک شاخ پہ
اپنے پر پھیلا کر
بھیگتا سرخ پرندہ
اس کے پروں سے نکلا
پھیلتا بھورا بھورا آسمان
آسمان سے گرتا پانی
اپنی صراحی میں بھر لیتا
سبز سمندر!

نظم

(الکسانڈر بلاک (۱) کے لئے)

ہمیشہ تم اپنے آپ سے ہی
فرار ہونے کے لئے تڑپ رہے تھے
وہی جنوں، کرب کی سیاہی
کہ جس طرح کوئی زخمی انسان ڈر کے مارے
خود اپنے زخموں سے بھاگتا ہو
کہ جس طرح اک مریض
اک ملک سے کسی دوسرے ملک میں
پھر ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک
اخیر میں
کروٹیں بدلنے کو لحہ لحہ تڑپ رہا ہو

اے میرے ہمدم
جنم سے ہی بھاگتے رہے تم
عذاب کی آندھیوں کے پیچھے
تمھارے ہم عصر اک جگہ پر کھڑے رہے تھے
تماشائے زیست دیکھتے تھے
مگر تمھاری جبیں پہ اک دن
سحر ستارے نے آنکھ کھولی
فرار ہونے میں کامیابی نے چوم لی تھی جبیں تمھاری
اندھیری راتوں کو چیر کر
امیدوں کے جگنو سے جیب بھر کر
نکل پڑے تھے
عظیم کرانتی کی شاہراہوں پہ تم اکیلے

---

(۱) Aleksander Blok (1880-1921) عظیم روسی علامت نگار شاعر۔

جینت پرمار

پیش لفظ

ہم تم مل کر
رنگ برنگے خواب دیکھتے رہتے ہیں
جو روشن ہیں

دست سحر میں
شفق صراحی کی مانند
رات کی کالی اوڑھنی میں جگنو کی طرح
چشم شبنم میں جیسے
آکاش سمندر

میرے بھیتر
دل کی گیلی مٹی میں
دبی ہوئی اور چھپی ہوئی
اک چیز ہے بکسے میں
زبان کے ذریعے
جو کھلتی ہے اور عیاں ہوتی ہے
بھیگے کاغذ پر
وہی ہے میری نظم کا میں
وہی ہے میرے خواب کا میں

نظم سے

تو نے مجھے مرنے نہ دیا تھا
بادِ صبا کا ہاتھ تھام کر
کلی سے جب میں نکلا تھا
جب میرے کمزور بازوؤں پر سورج تھا
میرا سایہ بھی جب میرے ساتھ نہیں تھا
جب مجھ میں جینے کی خواہش سرد پڑی تھی
تو نے مجھے مرنے نہ دیا تھا

گڑ میں سرپٹ بھاگتے کیڑوں
اور بھنبھناتی مکھیوں کے درمیان میں
زندہ لاش ہونے سے بچایا تھا تو نے ہی
ماضی کی گہری گھاٹی سے
ہاتھ پکڑ کر تو نے نکالا تھا باہر
ردیف قافیوں کی بانہوں میں مجھے اٹھا کر
اپنے گھر لے آئی تھی
تو نے مجھے مرنے نہ دیا تھا

مری دھمنیوں میں بہتی تھی زرد اداسی
تھا کالے کشکول میں ناامید ستارہ
میرے بھیتر اندھکار کے خیموں میں
تو نے جلائی تھی قندیل
پکے ہوئے بالوں کا استقبال کیا تھا
(راکھ تھے جو ایمان اور نراشا کی)
تو نے مجھے مرنے نہ دیا تھا

خوفزدہ راتوں میں
پیٹھ پہ دستِ ہمت رکھا تھا
جیون کے ہر موڑ پہ حوصلہ افزائی کی
چہرے کی تاریک جھریوں کے صحرا میں
ہنسی کے تو نے پھول کھلائے
خشک لبوں پر
نئے نئے ہی گیت سجائے

جینت پرمار

جے سوامی ناتھن کی چڑیا(۱)

کالی چڑیا
کینوس سے باہر نکلی
سوامی ناتھن کے پیلٹ پہ جا بیٹھی (۲)
حیران کن تھے سارے رنگ
پھر چپکے سے
بھورے سمندر کے پانی میں اڑنے لگی
اس کی ننھی سی پرچھائیں
تیر رہی تھی
نیلے نیلے آسمان پر

(۱) مشہور مصور اور سنگ تراش J Swaminathan
(۲) Palette

جڑیں تو انسان کے لئے ہوتی ہیں

(غلام محمد شیخ(۱) کے لئے)

تو ہے مصور
اور شاعر
رنگ اور برش میں بات جو کہنا مشکل ہو
اسے کویتا میں کہتا ہے
سکوں سمندر مزاج تیرا
فن میں لیکن
سطحی سکوں سا لگتا ہے
چشمے کی عینک کے پیچھے خواب پریشاں
داڑھی میں پوشیدہ رنگوں کی پرتیں

''لوٹ کے آتے رستے'' میں
پیڑ کے پاس
گھر کی چھت پر
ایک ٹانگ لٹکائے دیکھتا ہے تجھ کو
لوگوں کی سوانح عمری
میں نے پڑھی ہیں کینوس پر
خود کو دہرانے سے دور ہی رہتا ہے

بریٹین (۲) میں کینوس کے ساحل سے تجھ کو
صاف نظر آیا تھا گھر
وطن کی مٹی تجھے ستایا کرتی تھی

تو نے سچ ہی لکھا تھا:
جڑیں تو انسان کی ہوتی ہیں

(۱) مشہور گجراتی نژاد مصور اور شاعر۔
(۲) Britain

سفید کاغذ پہ کالی پنسل تڑپ رہی ہے

جینت پرمار

زمیں کے گیلے بدن میں
نظموں کے بیج بونے کا وقت ہے یہ
کہ ایک عرصے سے دل کا آنگن
شبد کی چڑیوں کے شور و غل سے
ہے سونا سونا
یہ راستہ ٹیڑھا میڑھا رستہ
سیاہ دشت جنوں سے ہو کر گذر رہا ہے
خلا کے صحرا میں کھو نہ جاؤں
بھٹک نہ جاؤں
طرف طرف بے سکوں سمندر
یہ وقت ہے
نیلگوں ستاروں کے آسمانوں کے چومنے کا
یہ وقت ہے
ہجر کی صراحی میں ڈوبنے کا
سفید کاغذ پہ پہلا مصرع
مجھے کسی آشنا کی مانند دیکھتا ہے
یہ معجزہ، ڈر، دعاؤں کے ہفت رنگ سائے
دل شکستہ پہ حملہ کرتے ہیں شام ہی سے

حروف کاغذ پہ پھیلنے کو
یوں کھلبلی سی مچا رہے ہیں
کچن میں انڈا ابل رہا ہے
میں لفظ کی ویدنا سے آزاد ہونا چاہوں
یہ درد رستہ نکالتا ہے
شفق شجر ہڈیوں کی نیلی رطوبتوں میں

لگام گھوڑے کی ہاتھ میں ہے
یہ نظم کا آخری سفر ہے
میں جانتا ہوں ——
یہ سچ نہیں ہے
میں آخری سانس تک لکھوں گا
مجھے یقین ہے

سفید کاغذ پہ کالی پنسل تڑپ رہی ہے
سیاہ لفظوں کی چیونٹیوں کا
لہو میں آدا گمن پریشاں
ابھی سفر میں ہیں سبز بحریں
ابھی وہ ہمراہ چل رہی ہیں
کنارے لگنے کو ہے یہ کشتی
اکیلا پڑنے کے خوف نے
اپنے تیز ناخن بڑھا لئے ہیں
یہ نظم جب ختم ہو گی اے دل
تو اس کا شاعر نہ میں رہوں گا
یہ نظم قاری کے ہاتھ میں کھلکھلا اٹھے گی
میں اس کا حصہ نہیں رہوں گا
نہ میں اکیلا ملوں گا خود سے
کہ جس طرح
ٹرین سامنے سے گذر رہی ہو
کسی کو پلیٹ فارم سے پکاروں
تو ریل کی سیٹیوں میں کوئی نہ سن سکے گا

جینت پرمار

صبح اب بھی ہوتی ہے
رات کا حسیں ناٹک
روز کھیلا جاتا ہے

بھر گیا ہے دل میرا
حیرتوں کے جگنو سے
آج صبح کو میں نے
خود کو زندہ پایا تھا

میری سانس کو چھوکر
بھورا چاند گذرا تھا
اب بھی اس زمیں پر کیا
ایسے لوگ بستے ہیں؟

صبح اب بھی ہوتی ہے
رات کا حسیں ناٹک
روز کھیلا جاتا ہے

پھول جیسے بچوں کے
ہاتھ میں ہیں بندوقیں
ہاتھ ننھے منے سے
آشنا نہ ہو پائے
گیند اور کتابوں سے

میں یقیں کروں کیسے؟
اب خدا کے ہونے کا

سٹار(۱) پر میں سنتا ہوں
جنگ اب بھی جاری ہے

ایک ایک مصرے کی
پیٹھ پر ہے بیونٹ(۲)
گل کی پتی پتی پر
کاربن کی پرتیں ہیں
اب عراق میں کوئی
پھول ہی نہیں کھلتا
قیدی تن کی چمڑی کو
یوں ادھیڑ لیتے ہیں
پاؤں سے کوئی اپنے
جوں اتار لے موزے ۔
پھر بھی کیوں دل ناداں
چاہتا ہے انساں کو

مارینا تسویتائیوا(۳)
نیند میں کبھی آکر
میرے دل سے کہتی ہے
اشک کو بچا رکھنا
کل وہ کام آئیں گے

لفظ پر جمی ساری
گرد پونچھ لیتا ہوں
چاند پر اگی کالی
گھاس نوچ لیتا ہوں

رات کا حسیں ناٹک
روز کھیلا جاتا ہے
صبح اب بھی ہوتی ہے

---

(۱) Star News
(۲) Bayonet
(۱) روسی شاعرہ Marina Tsvetaeva

جینت پرمار

مری موت کے بعد
لکھیں گے وہ
اگر میری سوانح حیات

تو اس میں فقط
تیرگی کی کھنکتی ہوئی سخت زنجیر،
اہمان ونفرت، دھتکار
اور ٹھوکریں دربدر کی
میری پیٹھ پران کے چابک کے نیلے نشان کے سوا
کیا ملے گا انھیں؟

میرا جنم دن
ماں کو کب یاد تھا
میں کب فانی دنیا سے رخصت ہوا تھا
یہی ایک تاریخ لکھی تھی
میں نے کبھی ڈائری میں
انھیں دو پلوں میں

جیا اور مرا بھی کئی بار میں
جڑیں میری پیوست تھیں جس زمیں میں
جنوں کی طرح میں نے چاہا اسے
نیند کے پیڑ پر
خواب کے پھول ٹانکے تھے میں نے کئی
ہر اک بار ہاتھوں میں
سوکھی ہوئی ٹہنیاں ہی ملی تھیں

ہمیشہ کی مانند
خود کو سمجھنے کی کوشش نہ کی
میں فقط گندی نالی کا کیڑا ہی تھا
جسے پاؤں تلے ہی کچلا گیا
ہیں صدیوں پرانی
یہ لفظوں کی قاشیں
میری یاتنائیں
سمائیں گی کیسے
کسی نظم میں

جینت پرمار

مونے(۱)

بڑے کینوس پہ لکھی ہیں
بہت ہی خوبصورت
دھوپ کی نظمیں
چمکتی روشنی کی
بازگشت سنتا ہوں
آنکھوں سے
کہیں تصویر میں
ہیں رقص کن
پھولوں کی خوشبو،
سوریہ کی کرنیں
ترا دم گھٹ رہا ہے بند کمرے میں
ندی، میدان، جنگل اسٹوڈیو تیرا
تجھے ہے زندگی سے عشق

خدا بستا ہے
تیرے ہاتھ میں
اور تیری آنکھوں میں

مانے(۲)

گرتی ہوئی روشنیوں کو
پینٹ کیا ہے کینوس پر
پرکاش کے رنگوں کو دی ہے
اک رفتار
(بہتے جھرنوں کے مانند)
جل رنگوں سے
سمندروں کی نظمیں لکھیں
عورت میں عورت کو دیکھا
دیوی نہیں!
جب بھی تیرے اسٹوڈیو میں
داخل ہوتا ہوں
مجھے نہیں لگتا کہ میں
قبر میں داخل ہوتا ہوں

نظم
(عادل منصوری کے لئے)

ٹرین کے کمپارٹمنٹ
کی کھڑکی کے آگے
بیٹھا ہوں بت کی مانند
اور باہر پٹری کے پاس
ٹیڑھی میڑھی اونچی نیچی
دوڑتی ٹرین کی پرچھائیں

بھاگتی پرچھائیں میں
خود کو ڈھونڈ رہا ہوں
یا پھر مجھ کو ڈھونڈ رہی ہے
ٹرین کی پرچھائیں
یا میں خود اک ٹرین ہوں
دوڑ رہا ہوں
پرچھائیں کے پیچھے

(۱) کلود مونے (Claude Monet, 1840-1926) فرانسیسی امپریشنسٹ (Impressionist) مصور

(۲) ایدوار مانے (Edouard Manet, 1832-883) فرانسیسی امپریشنسٹ (Impressionist) مصور۔

ماں کی موت پر تین نظمیں

جینت پرمار

(۱)

ٹین کی چھت سے ٹکرائے
آخری لفظ
سیاہ بادل کی مانند
کانپ اٹھی تاریک ہوا
گم صم کھڑکی کے پردے
بدن برف
پتھر کے پاؤں
آسمان، تارے چاند
آخرکار
لفظ نے اپنے معنی کو آزاد کیا
آنگن میں تلسی نے پتوں کو مرجھایا

(۲)

فجر میں لیکن
نیند کو تہ کر کے رکھی الماری میں
اور برآمدے میں
جلتی بتی کو بجھایا
چولہا پھونکا
چائے بنائی
شرٹ پہ ٹوٹا بٹن لگایا
لنچ بکس رکھا جھولے میں
ٹیبل سے گم
پیکٹ اس نے ڈھونڈ نکالا

اور آخر میں
چرپائی پہ اس نے پھینکی
تن کی پھٹی ہوئی چادر

(۳)

جلتی دھوپ میں
بانس کے جنگل نے اس کو
سینے سے لگایا
آگ نے چومے کھردرے پاؤں
دھیرے دھیرے خاک ہوا
ٹکڑا آکاش

شام ہوتے ہی
گھر کے اک کونے میں پایا
گدڑی پہ پیوند لگاتا
اک سایہ
چٹنی پیسنے والے
پتھر آئینے میں
میں نے دیکھا
بجھا بجھا سا اک تارا

راشد طراز

چاک دامن سے گریباں اور کتنی دور ہے
اے مری وحشت بیاباں اور کتنی دور ہے
اے شب غم گردش ایام کی تجھ کو قسم
کچھ بتا صبح بہاراں اور کتنی دور ہے
آگیا ہوں سرحد امکان تک لے کر لہو
جانے اب صحن گلستاں اور کتنی دور ہے
آزمائش سے گذرتا جا رہا ہوں جوش میں
کیا پتہ دریائے امکاں اور کتنی دور ہے
بوسۂ زنجیر میری آخری منزل ہے اب
دیکھتا ہوں مجھ سے زنداں اور کتنی دور ہے
میں مشقت کر رہا ہوں اب زمین دل پہ بھی
وہ ترا عکس فروزاں اور کتنی دور ہے
روح کی تطہیر کر کے دیکھتے جانا طراز
مطلع انوار عرفاں اور کتنی دور ہے

روح کے زخم کو لازم ہے نہاں ہو جانا
غیر ممکن ہے اس اک شے کا بیاں ہو جانا

خون دے کر بھی انھیں کیسے بچایا جاتا
جن چراغوں کا مقدر تھا دھواں ہو جانا

دیکھتا رہ گیا ویرانۂ ہستی میں کوئی
اپنے زخموں کا بہاراں کی زباں ہو جانا

چلنا پڑتا ہے ہر اک راہ میں اک عمر طراز
اتنا آساں نہیں منزل کا نشاں ہو جانا

غزلیں

راشد طراز

شہادت میں ظفر روشن جبیں کو دیکھ لے آکر
سن اے قاتل مری فتح مبیں کو دیکھ لے آکر

مری یادوں میں ہیں آباد مظلوم جہاں سارے
کہاں تک عدل ہے دل کی زمیں کو دیکھ لے آکر

ملا ہے یک جہاں غم مجھ کو تیری بے وفائی سے
یہ کیسا اوج ہے جان حزیں کو دیکھ لے آکر

مجھے فکر جہاں کتنی ہے اپنی ذات میں راشد
ملے فرصت تو اس خانہ نشیں کو دیکھ لے آکر

پاسباں بن کے ارادہ مرے آگے ہوگا
ہوگا پایاب جو دریا مرے آگے ہوگا

زیر ہوجائے گی ہر تیرہ شبی آخر کار
تیری صورت کا اجالا مرے آگے ہوگا

اب تو میں آگ سے کھیلوں گا چراغاں کر کے
شہر تاریک یہ سارا مرے آگے ہوگا

میں گذر جاؤں گا رکھے ہوئے آنکھوں پر ہاتھ
لاکھ راہوں میں تماشا مرے آگے ہوگا

اب میں اس راہ پہ چل نکلا ہوں راشد کہ جہاں
کچھ نہ ہونے کا نظارہ مرے آگے ہوگا

باقر نقوی

کوئی تو تھا دھنک دھنک خواب میں یا خیال میں
رنگ عجیب گھل گئے کیفیت ملال میں

مہر تھی میرے نطق پر تیرے لبوں کی نغمگی
ورنہ جواب تھے چھپے تیرے ہر اک سوال میں

بول تو سوچ سوچ کر چل تو سنبھل سنبھل کے چل
کی ہے بہت غلو کی بات ہم نے تری مثال میں

سرد دنوں کی طرح گم ہوگئی اپنی زندگی
فرق کہاں رہا کوئی ماہ میں اور سال میں

میرے رواقِ دل میں تو چلتا تھا کتنے ناز سے
آگئی کیسے اب لچک تیری صبا سی چال میں

میرے فراق میں تری عمر ٹھہر گئی تھی کیا
بال سفید ہوگئے میرے ترے خیال میں

موسم تازہ ہو کبھی میری طرف بھی اک نظر
اترے کوئی نیا پرند میرے غموں کے تال میں

ایسے کنارہ کر نہ اب باقر خوش مثال سے
بے ہنری شریک تھی اس کی ترے کمال میں

جیسا حضور کہیں گے بالکل ویسا ہوگا
یعنی پھر گڑیوں کا کھیل تماشا ہوگا

محل تو ہولی دیوالی کے لئے بنے ہیں
آگ کا رزق تو لاوارث کا خیمہ ہوگا

کھاری پانی کی جھیلیں سب بچ جائیں گی
لقمہ سیاہ سمندر کا بس دریا ہوگا

میری تیری آنکھ کی قسمت کنکر مٹی
ان کی آنکھ کی زینت ہوتو سرمہ ہوگا

دوزخ کے سب دروازے تو کھلے ہوئے ہیں
جنت کے دروازے پر کیا تالا ہوگا

ساحل پر جب سبز فرشتے ہی رہتے ہیں
دریا میں پھر کس نے زہر ملایا ہوگا

میرا سلام اس شہزادے کو پہنچا جس کے
بے سر جسم پہ اک بوسیدہ کرتہ ہوگا

جے پرکاش غافل

ہے نوک خار میں کچھ وہ تو سبزہ زار میں کچھ
خزاں میں کچھ ہے مگر موسم بہار میں کچھ

گہر تھا ماہ تھا جگنو تھا یا ستارۂ شام
چمک رہا تھا تری چشم اشک بار میں کچھ

کہاں کے وہم و گماں کا ہے سلسلہ مری زیست
کہ اس کے پار ہی کچھ ہے نہ اس حصار میں کچھ

تمام عمر وہی مثل خار چبھتے رہے
گذر گئے تھے جو پل سایۂ بہار میں کچھ

پھر اس کے بعد ہے خود پر یقیں نہ دنیا پر
تھی ایسی بات ہی اک پل کے اعتبار میں کچھ

میں اس کی یاد سے دامن چھڑا لوں مجھ کو خیال
تب آیا جب نہ رہا میرے اختیار میں کچھ

نہ چاہتا وہ تو روشن نہ ہوتی کوئی بھی شے
ہے نور اس کا بھی کیا شام انتظار میں کچھ

کنار دریا جنون طوفاں ہر ایک گوہر کی آب میں ہوں
بغیر میرے سبھی ہیں پانی کہ موجوں کا اضطراب میں ہوں

یہ وقت کا بیکراں سمندر میں اس کی حد تک پہنچ نہ پایا
گرا تھا ساحل پہ ٹوٹ کر جو ہوا تھا جو غرق آب میں ہوں

نہ جانے کیا ہے کہ میری ہستی کسی کی آنکھوں کا میکدہ ہے
سبو بھی میں ہوں ہوں میں ہی ساقی ایاغ میں ہوں شراب میں ہوں

ترے کرم کی کرن نے مجھ کو اٹھایا پستی سے آسماں پر
کبھی یہ شک آفتاب میں ہوں کبھی گماں ماہتاب میں ہوں

جہاں نہیں تھا وہاں بھی میں تھا تو دیکھ کر بھی نہ دیکھ پایا
کلام بھی میں سکوت بھی میں سوال میں ہوں جواب میں ہوں

اسی نے ہر شب کی صبح کی ہے ہر اک دیئے کی وہ روشنی ہے
کبھی مجسم بھی ہو کے کہہ دے کہ دیکھ تیرا ہی خواب میں ہوں

جے پرکاش غافل

میں ترے پاس ہوں مجھ سے یہ کہہ رہا کوئی ہے
تمام شب مری آنکھوں میں جاگتا کوئی ہے

دیا امید کا بجھتا ہے جلتی آنکھوں میں
کسی کے لب پہ مرے واسطے دعا کوئی ہے

پرانی باتوں کی یادیں بھکاریوں کی طرح
سوال کرتی ہیں ایوان دل پہ کیا کوئی ہے

گماں گذرتا ہے ہوتے ہوئے نہ ہونے کا
تری نگاہ میں جادو مگر نیا کوئی ہے

یہ خواب کا ہے سفر میں ہوں خواب رو کی طرح
نہ ابتدا ہی تھی کچھ اور نہ انتہا کوئی ہے

نہ وہ فضا نہ وہ چشمے نہ وادیاں نہ وہ لوگ
مگر یہ وہم مری راہ دیکھتا کوئی ہے

شکستہ دل تو اسے چھوڑ کر نہ جا غافل
کہ تیرے ساز میں مضراب بھی صدا کوئی ہے

سراغ مجھ سے ملے گا نہ رونق شب کا
چراغ تو ہوں مگر بجھ چکا ہوں میں کب کا

کہوں زمین تو وہ آسماں سمجھتا ہے
کبھی کھلا ہی نہیں آدمی ہے کس ڈھب کا

عجیب ڈھنگ سے تھی جستجوے زیست مجھے
پیالہ جیسے کوئی تشنہ گرمی لب کا

خیال یار کے پردے میں رنج دنیا تھا
سنا گیا ہے کچھ ایسا ہی قصہ ہم سب کا

اٹھے جو محفل دنیا سے تو ہوا معلوم
کہ داغ دار ہے دامن یہاں تو ہم سب کا

کیا ہے جس نے مجھے در بہ در وہ غافل ہے
کہ میں ورق ہوں اسی عالم مرتب کا

غزل

یاسمین حمید

یہ دنیا دور تک کا سلسلہ نہیں
ہمیں اس کے لئے کچھ سوچنا نہیں

یہ پتلا اس قدر مغرور کیوں ہے
تو کیا یہ آسمانوں سے گرا نہیں

بہت پہلے، یہ دن آنے سے پہلے
جو ہونا تھا ابھی تک بھی ہوا نہیں

سبھی حق فیصلے کے منتظر ہیں
کسی نے خون کا بدلہ لیا نہیں

ابھی سورج میں تھوڑی روشنی ہے
زمیں کا رنگ بھی پھیکا پڑا نہیں

درودیوار کے معمار دیکھیں
یہ گھر بنیاد سے اب بھی ہلا نہیں

یہ رستہ شہر کے نقشے میں ہوگا
یہ رستہ صرف آنکھوں میں کھلا نہیں

یہ دنیا اس لئے آدمی ہے اب تک
پیالہ درد سے پورا بھرا نہیں

وہی آنکھیں وہی چہرہ وہی بات
کسی تصویر میں کچھ بھی نیا نہیں

ہمیں کچھ کام کرنے ہیں یہاں پر
یہ مانا کام کا کوئی صلہ نہیں

اسی کے مشورے کو مانتے ہیں
یہ دل جیسا بھی ہے اتنا برا نہیں

بدن کی خاک پر چھینٹے لہو کے
کہاں سے آئے ہیں ہم نے کہا نہیں

مسلسل رونے والے ہنس رہے ہیں
یہ کوئی چھوٹا موٹا واقعہ نہیں

کسی کے دکھ کا چرچا ہو رہا ہے
کوئی دکھ ایسے دکھ سے تو سوا نہیں

یہ بات اک روز دنیا مان لے گی
ہمارے جرم کی کوئی سزا نہیں

کوئی سوتا نہیں ہے کیا سرِ شام
کوئی بھی منہ اندھیرے جاگتا نہیں

نہیں معلوم ان کو یاد ہے کیا
ہمیں تو ایک دن بھی بھولتا نہیں

بھلا ہو گر کوئی سمجھائے ان کو
نمک پاشی میں تاثیر شفا نہیں

کہاں پر کون تھا جو اب نہیں ہے
کسی سے پوچھنے کا حوصلہ نہیں

کسی کا سوچنا رک رک کے چلنا
مناسب تھا مگر اچھا لگا نہیں

—

کوئی تسلیم کرتا ہی نہیں کچھ
ابھی شاید کوئی اتنا بڑا نہیں

ہمیں جیسے کوئی ضد ہوگئی تھی
جو دنیا نے کہا ہم نے کیا نہیں

خود اپنے واسطے مشکل ہوئے جب
ہمیں آسان پھر کچھ بھی ملا نہیں

لباس و وضع شاید ایک سے ہوں
مگر اندر سے کوئی ایک سا نہیں

ابھی تو ذہن صیقل ہورہا ہے
جو لکھنا ہے ابھی ہم نے لکھا نہیں

ابھی ٹکڑے اکٹھے ہورہے ہیں
ابھی ٹوٹا ہوا رشتہ جڑا نہیں

یہ منظر اس جگہ پہلے نہیں تھا
تو کیا ہے پھر اگر یہ معجزہ نہیں

نئی بستی میں آبادی بہت ہے
مگر کوئی کسی کو جانتا نہیں

ہم اک تنہا صدی کے پیش رو ہیں
ہمارا ایسا ویسا مرتبہ نہیں

شجر پھوٹے گا پھر اک دن زمیں سے
ہے دعویٰ زندگی کا موت کا نہیں

خدا سے رابطہ کرکے تو دیکھو
پھر اس کے بعد کہہ دینا خدا نہیں

چہار اطراف ایسی تھی چکاچوند
کسی کی آنکھ سے پردہ ہٹا نہیں

یہ لگتا ہے مگر یہ سچ نہیں ہے
کہ پوری بات کوئی جانتا نہیں

یہی طوفان بھی برپا کریں گے
ہمارے دوست، پانی اور ہوا نہیں

اسی مٹی میں مٹی ہورہیں گے
اسی مٹی کو کوئی پوچھتا نہیں

انھی شعلوں سے بچے کھیلتے تھے
لگی پھر آگ تو کچھ بھی بچا نہیں

عناصر حکم کی تعمیل میں ہیں
دعا کی دسترس سے ماورا نہیں

اگر مبہم رہا انسان تو کیا
یہاں تو آسمانوں کا سرا نہیں

ہے مشکل خوف کو تسخیر کرنا
سمندر پار کرنا مرحلہ نہیں

وہاں کے پھول چننا چاہتے ہیں
ہمارا جس زمیں سے رابطہ نہیں

اسی کے دھیان میں الجھے ہوئے ہیں
ہمیں جو آنکھ اٹھا کے دیکھتا نہیں

ہمیں اپنی خبر بس اس قدر ہے
کہ اگلی سانس تک کا بھی پتہ نہیں

نہ جانے کیا ہے پھر جو مانگتا ہے
یہ دل کچھ بھی تو اس سے مانگتا نہیں

تمام آسودگی، آسودگی بس
مگر ایسے بھی جینے کا مزا نہیں

برابر اضطراب اور بے یقینی
بہت بڑھ جائے تو یہ بھی بھلا نہیں

تو پھر ہم کس طرح سے خوش رہیں گے
مگر خوش اس طرح کوئی رہا نہیں

یہ سب بیکار کی باتیں ہیں شاید
ہمارا اصل میں یہ مسئلہ نہیں

یہ ہم کیا توڑتے ہیں جوڑتے ہیں
نہ جانے کیا ہے، جواب تک بنا نہیں

غبار وقت ہیں پر مانتے ہیں
قصور اس میں ذرا بھی وقت کا نہیں

بتانا سوچ کر تعبیر اس کی
معبر، یہ اشارہ رات کا نہیں

ہماری سانس اکھڑ جائے تو کیا ہے
یہی تو زندگی کی انتہا نہیں

زباں چھالوں سے بھر جائے تو کیا ہے
کبھی منہ سے ہمیں کچھ بولنا نہیں

ادھوری بات رہ جائے تو کیا ہے
ادھوری بات کو بھی کیا بقا نہیں

نہ آنی تھی نہ آئی دنیا داری
مگر شرمندگی اس کی ذرا نہیں

بہت ہی دور سے آواز آئی
ہمیں ایسے لگا ہم نے سنا نہیں

کبھی لگتا ہے ہم ویسے نہیں ہیں
کبھی لگتا ہے ہم اس سے جدا نہیں

جو ظاہر تھا اسے تو کیا چھپاتے
چھپانا چاہتے تھے، جو چھپا نہیں

مسافر، تھوڑی مہلت ہے ترے پاس
سفینہ اتنی جلدی ڈوبتا نہیں

بہت کچھ ہے جو پانی پہ لکھا ہے
کسی نے آج تک بھی جو پڑھا نہیں

کسی کی موت کا مطلب فنا ہے
کسی کی موت کا مطلب فنا نہیں

یاسمین حمید

کتنا مشکل تھا یہ رستہ کون لکھے گا
پوری بات اور پورا قصہ کون لکھے گا

دن اور رات کے آدھے آدھے بٹوارے میں
کتنا کم تھا کس کا حصہ کون لکھے گا

کن ہاتھوں نے کیسے کیسے پتھر کاٹے
کیسے دن کا بوجھ اٹھایا کون لکھے گا

کتنی دیر کو ہریالی نے آنکھیں کھولیں
کتنی دیر کو بادل برسا کون لکھے گا

جنگل میں گم ہو جانے والے رستے پر
کتنی دھوپ تھی کتنا سایہ کون لکھے گا

شہر جلا تو کس نے اس کی راکھ سمیٹی
کتنا تھا کس کا سرمایہ کون لکھے گا

گرتی دیواروں میں سانس کہاں تھی باقی
اور کہاں تک بکھرا ملبہ کون لکھے گا

کوئی سایہ سا پٹ جاتا ہے دل سے آکر
کھڑکیاں کھولی پڑتی ہیں مجھے گھبرا کر

بے ثمر پیڑوں کی خواہش بھی عجب خواہش ہے
بیج بوتی ہوں کہیں دور سے مٹی لا کر

خاک پر پھول جو کھلتا ہے تو میں سوچتی ہوں
کوئی خوش ہوتا تھا کس رنگ مجھے پہنا کر

اپنے گہنوں میں کسی اور کا چہرہ دیکھا
زندگی مجھ پہ ہنسی میرے ہی گھر میں آ کر

جیسے دنیا سے بہت دور چلی آئی ہوں
مطمئن رہتی ہوں کس جھوٹ سے جی بہلا کر

جاگتے سوتے ہوئے لکھتے ہیں
شعر ہم روتے ہوئے لکھتے ہیں

جب بھی لکھتے ہیں مکمل خود کو
کہیں کم ہوتے ہوئے لکھتے ہیں

صبح سے شام تلک بھاگتے ہیں
زندگی ڈھوتے ہوئے لکھتے ہیں

کبھی اڑتے ہیں ستاروں کی طرف
ان میں گم ہوتے ہوئے لکھتے ہیں

خود بخود سونا اگلتی ہے زمین
ہم تو دکھ بوتے ہوئے لکھتے ہیں

غزلیں

نشتر خانقاہی

اپنا بیمار ہے دل، عشق کا بیمار نہیں
خود تشفّی کے سوا، ہجر کا آزار نہیں

تیرگی ایسی غضب کی کہ عیاذاً باللہ
ایسا لگتا ہے کہ گھر ہے در و دیوار نہیں

حشر کے بعد بھی ویراں ہی رہے گی جنت
کون حقدار ہے، کوئی بھی حقدار نہیں

تہ میں کچھ اور ہیں اوپر سے ہیں خبریں کچھ اور
باخبر تم بھی نہیں، میں بھی خبردار نہیں

جس کی چوکھٹ پہ بھی رکھتا ہوں یہی لگتا ہے
یہ در یار نہیں، یہ بھی در یار نہیں

نیکیوں کے لئے ماحول موافق بھی تو ہو
کون کہتا ہے کہ میرا کوئی کردار نہیں

وصل ارزاں، وقت کی لیکن فراوانی گئی
بڑھ گئی جتنی سہولت، اتنی آسانی گئی

معصیت کا ذکر کیا ہے، معصیت پہلے بھی تھی
رنج تو یہ [illegible] پشیمانی گئی

عشق بھی دل سے کیا، جوگی بنے، وحشت بھی کی
کیا ہوا؟ کچھ تو کہو، کیا وضع حیوانی گئی

ایک لمبا فاصلہ ہے، جان سے پہچان تک
شکل جو جانی گئی وہ بھی نہ پہچانی گئی

پہلے بھی سیلاب آتے تھے مگر کیا اس قدر؟
اب کے تو برسات میں ہر فصل، بارانی گئی

زیر لب اک لفظ نے کیسا ہمیں چونکا دیا
پل ہی پل میں خانقاہی سب ہمہ دانی گئی

راہی فدائی

ثمر سے پوچھ لو ذوق تراش کیسا ہے
وہ دل جو تم نے کیا قاش قاش کیسا ہے
کوئی تو ثقل گرا ہوگا بحر ساکت میں
وگرنہ پھر یہ دلی ارتعاش کیسا ہے
نہ تعزیت کی ضرورت نہ فکر غمزدگاں
حنوط جس نے بھی کی اپنی لاش کیسا ہے
نقوش مسلک و منہاج ہی بتائیں گے
وہ خوش مزاج ہے یا بد قماش، کیسا ہے
حواس باختہ جس سے ہیں آسمان و زمیں
بتا وہ سانحۂ دل خراش کیسا ہے
وہ جی رہا تھا دعاؤں کے سخت نرغے میں
حصار ذات ہوا پاش پاش کیسا ہے
وجود اس کا تھا آئینۂ طلسماتی
وہ عکس جس نے کیا راز فاش کیسا ہے
قمار خانۂ دل میں خیال رنگیں سے
جو شخص کھیلتا رہتا تھا تاش کیسا ہے
کہیں تو وہ بھی تمھاری طرح نہ ہو راہی
بتاؤ جس کی ہے تم کو تلاش کیسا ہے

نہ ستارہ نہ ہی ہم شمس و قمر چاہتے ہیں
ہم درختوں سے فقط شاخ و ثمر چاہتے ہیں
نہ زمیں چاہتے ہیں اور نہ زر چاہتے ہیں
ہم فقیران خدا ایک ہی در چاہتے ہیں
دشت و دریا کے امیں بھی تو ہیں آوارہ نصیب
سائباں کوئی بھی ہو اپنا ہی گھر چاہتے ہیں
منتقل اپنی ندامت نہ کرو غیروں تک
تجربہ ہم بھی کہاں بار دگر چاہتے ہیں
شیشہ و چوب کے دانوں سے نہ بہلیں گے کبھی
دور حاضر کے یہ بچے تو گہر چاہتے ہیں
منصب و جاہ حقیقت میں ہیں محتاجی دل
سوچئے خوب یہ کیا علم و ہنر چاہتے ہیں
بن بلائے ہی مسافر یہ چلے آئے تھے
دسو سے آپ سے اب اذن سفر چاہتے ہیں
تم تو اخبار سناتے ہو جہاں کے راہی
ہم کہ درویش ہیں باطن کی خبر چاہتے ہیں

جدید ادبی تنقیدی نظریے اور متن کی تلاش

امجد طفیل

گذشتہ آٹھ دس برس سے اردو ادب میں تنقیدی نظریوں کی بھرمار ہو گئی ہے۔ ایک کے بعد ایک نظریہ مغرب سے درآمد شدہ کتابوں اور خیالوں کی مدد سے مضمون کے روپ میں تیار کیا جاتا ہے۔ لوگوں سے داد وصول کی جاتی ہے کہ فلاں صاحب بہت پڑھے لکھے ہیں، جدید مغربی علوم تو انھوں نے گھوٹ کر پی رکھے ہیں، جدید فکری سوالوں کو نہایت سلیقے سے بیان کرتے ہیں، وغیرہ۔ مگر اس کے کچھ ہی دن بعد وہی صاحب کسی دوسرے نظریے کی وضاحت کرتے دکھائی دیتے ہیں، اور بعض اوقات تو متضاد تصورات رکھنے والے افراد کے خیالات کو وہ برابر کی خوش عقیدگی سے پیش کرتے ہیں۔ چلیں یہ بھی غنیمت ہے کہ اب اردو ادب کے ایوان میں مغربی خیالات کی آمد زیادہ وقت نہیں لیتی۔ ادھر مغرب میں کسی صاحب نے کوئی نظریہ بیان کیا، ادھر ہم نے اسے اردو تنقید میں رائج کرنا شروع کر دیا۔

یہ سب ٹھیک، مگر اس سارے عمل میں دو تین باتیں نظر انداز ہو جاتی ہے۔ پہلی بات یہ کہ نقاد موصوف جس موضوع سے آپ کا تعارف کرا رہے ہیں اس کے ساتھ ان کی کوئی ذہنی اور فکری مناسبت بھی ہے یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ جن نظریات کو آپ درآمد کر رہے ہیں ان کی کچھ مناسبت ہمارے یہاں کی صورت حال سے بھی ہے یا نہیں۔ تیسرے یہ کہ آپ سارا نظری تانا بانا کسی مجسم بنیاد یعنی ادبی متن سے وابستہ بھی ہے یا نہیں۔

جدید ادبی تنقیدی نظریوں کا تعارف اردو میں وزیر آغا کی کتاب ''تنقید اور جدید اردو تنقید'' (۱۹۸۹) سے ہوتا ہے۔ گوپی چند نارنگ کی کتاب ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ تیسرا اہم نام قمر جمیل کا ہے جن کے رسالے ''دریافت'' نے ۱۹۹۰ کی دہائی میں جدید ادبی نظریوں کو اردو قارئین کے لیے روزمرہ بنانے کی راہ ہموار کی۔ فہیم اعظمی کا رسالہ ''صریر'' بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔

اردو میں جدید تنقید پر نظر دوڑائیں تو ہمیں ۱۹۴۰ کی دہائی میں ایک طرف انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اثر مارکسی تنقید، تو دوسری طرف حلقۂ ارباب ذوق کے زیر اثر ''نئی تنقید'' کی روش نظر آتی ہے۔ مارکسی تنقید اور نئی تنقید میں تنقیدی اصولوں اور ادبی سانچوں کی وضاحت کی گئی اور اردو شعر و ادب سے واضح مثالیں بھی پیش کی گئیں۔ مثلاً ترقی پسند تنقید نے نظیر اکبر آبادی کی بازیافت کی اور نئی تنقید نے ''نئی نظم'' کے تنقیدی مطالعے کا طریقہ کار وضع کیا۔ تنقید کی اکثر صورتوں میں اس سانچے کی کارفرمائی آج بھی دکھائی دیتی ہے۔

مارکسی تنقید فن پارے کا مطالعہ اس سیاسی اور سماجی ماحول کی روشنی میں کرتی تھی جس میں وہ فن پارہ تخلیق ہوا تھا۔ یہ تنقید سماج کے مختلف طبقات کے حوالے سے پوچھتی تھی کہ فن پارہ کون سے طبقے کے مفادات کی خدمت اور نمائندگی کرتا ہے، کس طبقے کے مفادات کی تکثیر کے خلاف ہے، انقلاب کی ترغیب دیتا ہے یا نہیں، وغیرہ۔ یہاں فن پارے کے جمالیاتی پہلوؤں کو ثانوی حیثیت تھی لیکن اس تنقید نے فن کار کو ادبیت کے حامل متن کی ترتیب و تشکیل کی بھی ترغیب دی۔ فیض کی شاعری، بیدی کے افسانوں، اور بلونت سنگھ کے ناولوں کے مطالعے سے ترقی پسند تنقید کا پورا سانچا تیار ہو سکتا ہے۔ ان فن کاروں کے ادبی مقام اور مرتبے سے انکار نہیں کیا گیا۔

نئی تنقید متن کے گہرے مطالعے سے عبارت ہے۔ یہاں ہم فن پارے کے لسانی محاسن کو مدنظر رکھتے ہیں تو نفسیاتی، سماجی اور جمالیاتی رویوں سے استفادہ کرتے ہوئے تخلیق میں چھپے ہوئے معنی تک بھی رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ نئی تنقید نے زبان کی صوتی، حرفی اور نحوی خوبیوں کے ساتھ الفاظ کے درمیان تال میل پر بھی زور دیا۔ نئی تنقید، تخلیق کو خود مکتفی قرار دیتی ہے۔ وہ فن کار کے سماجی، سیاسی، اور سوانحی پس منظر کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔

نئی تنقید کے پس منظر میں ۱۹۴۰ اور ۱۹۵۰ کی دہائیوں کے امریکہ اور مغربی یورپ کے فکری حالات کارفرما ہیں۔ مارکسی تنقید کے خلاف ردعمل نئی تنقید میں پوری طرح نمایاں ہے۔ اردو میں میرا جی کی کتاب ''اس نظم میں'' ایک طرح سے نئی تنقید کی بوطیقا مرتب کرتی ہے۔ اس تنقید نے بھی شعر و ادب سے زندہ رابطہ استوار کیا۔ نئی تنقید نے نہ صرف ادب کی تفہیم میں مدد دی بلکہ فن کاروں کو یہ بھی بتایا کہ فن پارہ کس طرح تخلیق کرنا چاہیے۔

اب ہمیں یہاں ''لسانی تشکیلات'' کو زیر بحث لانا ہوگا۔ ''لسانی تشکیلات'' اردو تنقید کا ایسا باب ہے جس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ مگر نئی تنقید اور جدید ادبی تنقیدی نظریوں کے درمیان یہ ایک ایسی کڑی ہے جس کو نظر انداز کر کے ہم اردو تنقید کے سفر کو نہیں سمجھ سکتے۔ ۱۹۶۰ کی دہائی میں افتخار جالب کے زیر اثر ''لسانی تشکیلات'' کے مباحث کا آغاز ہوا۔ افتخار جالب اور ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ اگر ہم ادب میں نئے موضوعات لانا چاہتے ہیں تو ان کے لیے ہمیں نیا

سانی ڈھانچا بھی تیار کرنا ہوگا، تحقیقی زبان کے مستعمل نمونوں کو رد کرنا ہوگا تاکہ نئی لسانی قماشیں تخلیق ہو سکیں۔ افتخار جالب نے منٹو اور انور سجاد کے افسانوں کے تجزیے نئے لسانی تشکیلاتی اصولوں پر کیے اور اپنے مجموعۂ کلام ''ماخذ'' میں نئی لسانی تشکیلات قائم کرنے کی کوشش کی۔ افسانے میں اس کام کو انور سجاد، سمیع آہوجا اور رشید امجد نے آگے بڑھایا۔ غزل کی بات کریں تو ہمیں ظفر اقبال کا نام دکھائی دیتا ہے کہ انھوں نے غزل کے موجود و مقبول لسانی نمونوں کو توڑتے ہوئے غزل کے نئے لسانی امکانات دریافت کیے۔ ''لسانی تشکیلات'' کے نقائص اپنی جگہ مگر یہ بات ظاہر ہے کہ اس نظریے نے ادبی متن کی تخلیق اور مطالعہ، دونوں کے لیے ایک نیا طریقہ کار ضرور دیا۔

جدید ادبی تنقیدی نظریے سے فکری مباحث لے کر آئے ہیں۔ ان تنقیدی نظریوں کا فروغ فلسفہ، لسانیات، نفسیات، اور دیگر سماجی علوم کے زیر اثر ہوا ہے۔ جدید تنقیدی نظریات اپنے طریقہ کار میں سماجی علوم میں رائج تجزیاتی طریقوں اور تجربے کا دھیان رکھتے ہیں۔ اسلوبیاتی تنقید میں تو بعض اوقات شماریاتی طریقہ بھی اپنایا جاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ نئے طریقے ہمیں کہاں لے جاتے ہیں؟ کیا نظریہ (Theory) تخلیق کے بنیادی سوتوں تک ہماری راہنمائی کرتا ہے؟ کیا یہ تخلیق کے عمل کی تفہیم میں ہمیں مدد دیتا ہے؟ کیا یہ فن پارے کے بارے میں ہمیں کوئی ایسی آگاہی دیتا ہے جس سے ہم پہلے سے بہرہ مند نہ تھے؟ مغربی تنقید کے بارے میں کوئی حکم میں نہیں لگاتا، لیکن اردو کی حد تک تو میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ ایسا کوئی اشارہ نظریے (Theory) میں ہمیں نہیں ملتا جو مندرجہ بالا سوالوں کے تسلی بخش جواب مہیا کرتا ہو۔

سماجی علوم کے طریقہ کار کو ادب کی تفہیم کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے لیے ہمیں سماجی علوم کے طریقۂ کار سے گہری واقفیت کے ساتھ ساتھ ادب کے بنیادی طریقۂ کار سے بھی آگاہی ہونا چاہیے۔ اور یہ بھی واضح کرنے کی لیاقت ہم میں ہونی چاہیے کہ اگر کسی فن پارے میں کوئی پہلو یا عنصر ایسا ہے جو سماجی علوم کے اعتبار سے دلچسپ ہے، تو یہ ادبی طور پر بھی معنی خیز یا مستحسن بات ہے۔ مثلاً سماجی محرکات (social stimuli) کو بنیاد بنا کر بعض اوقات ادبی تخلیقات خاص طور پر افسانوں میں نفسیات کو بہت خوبی سے استعمال کیا گیا ہے۔ پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات نے پاکستان میں مقبول عوام ادب (Popular literature) کے تجزیے سے معاشرے میں طاقت، حصول اور وابستگی کے تال میل کو سمجھنے کی بہت اچھی کوشش کی تھی۔ اس مطالعے کے نتائج ہمیں بتاتے ہیں کہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں طاقت (Power) کا محرک (stimulus) زیادہ شدید ہوتا جا رہا ہے اور خاص طور پر صوبہ سندھ میں اس محرک کی شدت غیر معمولی ہے۔ اس تحقیق میں اس خدشے کا اظہار کیا گیا تھا کہ صوبہ سندھ میں چونکہ لسانی تفریق بہت گہری ہے اس لیے طاقت کے محرک کی شدت گروہی فسادات کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ ان نتائج کی روشنی میں اس طریقہ کار کی افادیت سے انکار ممکن نہیں، لیکن یہ مطالعہ ہمیں ادب کے جمالیاتی معیارات یا تخلیق کے بنیادی عمل پر نہیں مطلع کرتا، بلکہ ادب کے تجزیے کے لیے ایک راہ دکھاتا ہے اور اس کی ادبی تنقیدی حیثیت کچھ بھی نہیں۔

اسی طرح نفسیات اور دیگر سماجی علوم میں ہم مواد کے تجزیہ (Content Analysis) کے لیے جو کمیتی اور کیفیتی طریقے اختیار کرتے ہیں وہ ادبی تنقید کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان طریقوں کے استعمال میں مندرجہ بالا اشکالات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ہمیں جدید نظریے میں یہی غلطی نظر آتی ہے کہ وہ ادب کی تفہیم نہیں کرتا، سماجی یا فلسفیانہ تصورات کی تفہیم ادب کے حوالے سے کرتا ہے۔ ادب کیوں پڑھیں؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں۔

ساختیاتی تنقید کی بنیاد سوسیور (Saussure) کے تصورات پر ہے۔ وہ ماہر لسانیات تھا اور وہ مختلف لسانی روایات کے پس منظر میں ایک نظام کو کارفرما دیکھتا تھا۔ لسان کے دو حصوں کی نشاندہی سوسیور نے کی ہے کہ ایک Langue ہے اور دوسرا Parole۔ ایک عمومی زبان ہے اور ایک وہ زبان جو کسی وقت زیر استعمال رہتی ہے (Parole)۔ زبان کے طریق استعمال کی ایک تفریق کی طرف آئی۔ اے۔ رچرڈس (I. A. Richards) نے اشارہ کیا تھا اور وہ تفریق Langue اور Parole کی تفریق سے کم اہم نہیں، کیونکہ رچرڈس زبان کے ادبی اور عمومی استعمال میں امتیازی فرق کی وضاحت تو ضرور کر دیتا ہے اور فن کار سے توقع رکھتا ہے کہ وہ زبان کے عمومی استعمال سے آگے نکل کر زبان کے ادبی استعمال کے ذریعے اپنے تخلیقی عمل کو متشکل کرے گا۔ ساختیاتی تنقید ہمیں اس طرح کی کوئی آگاہی فراہم نہیں کرتی، بلکہ ساختیاتی تنقید تو ادبی متن اور غیر ادبی متن میں تفریق بھی نہیں کرتی۔ اگر آپ کسی مخصوص فن پارے میں دلچسپی نہیں لیتے بلکہ اسے Parole کے اظہار کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور اس کے پس پشت کارفرما لسانی نظام کی دریافت کرنا چاہتے ہیں تو پھر ادبی متن اور غیر ادبی متن آپ کے لیے یکساں اہمیت کے حامل ہوں گے۔

ساختیاتی تنقید کا دوسرا پہلو لیوی سٹراوس (Levi Strauss) سے منسوب ہے۔ لیوی سٹراوس ماہر بشریات (Anthropology) تھا، اس نے نام نہاد ''غیر ترقی یافتہ'' تہذیبوں کے مطالعے کے لیے ایک طریقہ کار وضع کیا تھا۔ سماجی ڈھانچوں میں ''مشابہت'' اور ''قربت'' کے اصولوں کے حوالے سے لیوی سٹراوس نے جو باتیں کہیں ان کا انطباق اسطوری کہانیوں کے اسٹرکچر پر بھی ممکن دیکھا گیا۔ اس کے طریقہ کار کا استعمال مصنف کے رویوں اور احوال کی تفہیم کے لیے ضرور کر سکتے ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ساختیاتی تنقید تو مصنف کے کسی کردار کو تسلیم کرنے پر تیار ہی نہیں۔

ساختیات کی بحث نفسیات میں انیسویں صدی کے ربع آخر میں سامنے آئی تھی۔ ساختیات کے بعد پس ساختیات کا مکتب فکر ہے جس میں رد تشکیل (Deconstruction) اور قاری اساس تنقید کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ رد تشکیل میں دریدا (Derrida) اور لاکاں (Lacan) کے خیالات کو خصوصی اہمیت کا حامل کہا گیا ہے۔ دریدا فلسفی تھا اور لاکاں ماہر تحلیل نفسی۔ رد تشکیل اس بات پر

زور دیتی ہے کہ کلام Discourse میں خود کو تبدیل کرنے یعنی خود کو رد کرنے کی صفت بنیادی ہے۔ ادبی متن کے معنی متعین نہیں، کسی ادبی متن کے جو معنی متعین کیے جاتے ہیں اور/یا وہ اپنے اندر اس سے متضاد معنی کا بھی حامل ہوتا ہے۔ لہٰذا ادبی متن بیک وقت ایک سے زیادہ معنی اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ادبی فن پارے کے بارے میں یہ کوئی نیا نقطہ نظر نہیں ہے بلکہ اصلاً وہی ہے جو میر نے کہا تھا

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر
کیا کیا کہا کریں ہیں زبان قلم سے ہم

کیا یہ معنی کے تکثر کی طرف واضح اشارہ نہیں تھا؟ دریدا جب معنی کے تکثر کی بات کرتا ہے تو وہ مغرب کے اعتبار سے تو شاید نئی بات کر رہا ہے لیکن مشرقی شعریات کے اعتبار سے یہ کوئی نئی بات ہے۔ مسلمانوں نے اس تصور کو برتا ہے۔ میں یہاں ایڈورڈ سعید کی کتاب The World, The Text and the Critic کا اقتباس نقل کرتا ہوں۔

Several years ago I had the leisure to explore the relatively untrapped field of Arabic linguistic speculation. At that time I was interested, as I still am, about in speculation about language in Europe, that is, in that specialcombination of theoritical imagination and empirical abservation characterizing romantic philology, the rise of linguistics in the early nineteenth century, and the whole rich phenomenon of what Foucault has called the discovery of linguage. I was staggered at my discovery that there had existed among Islamic linguists, during the eleventh century in Andalusia, a remarkably sophisticated and unexpectedly prophetic school of philosophic grammarians, whose polemics anticipated in an uncanny way twentieth-century debates between structuralists and generative grammarians, between descriptivists and behaviorists. Nor was this all. I discovered a small group of linguists whose energies were directed against tendencies amongst rival linguists to turn the question of meaning in language into esoteric and allegorical exercises (p. 36)

مندرجہ بالا عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ لسان اور معنی کی اکثر بحثیں، جنھیں ہمارے علمائے تنقید مغرب کا تازہ ترین مال سمجھ رہے تھے، دراصل اندلسی عربوں نے کوئی ایک ہزار برس پہلے ہی بیان کر دی تھیں۔

لاکاں کی بنیادی تربیت تحلیل نفسی میں تھی۔ ... تاہم وہ [illegible] کے تصورات سے متاثر تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے عہد کے لسانی تصورات سے بھی آگاہ تھا۔ اس نے اپنے نظام فکر میں ان دونوں کو ملانے کی کوشش کی۔ اپنی کتاب Language of Self میں لاکاں نے فرد کے لاشعور کو لسانی ساخت کے حوالے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

رولاں بارتھ کے مضمون The Death of the Author نے بہت زیادہ بحث مباحثے کو جنم دیا۔ فوکو نے What is an Author? میں اس تصور کو نئے پہلو سے دیکھا۔ بارتھ کا اصول کہ "تصنیف لکھتی ہے مصنف نہیں" صرف اس کلیے کو بیان کرتا ہے کہ مصنف کا تحریر میں کوئی کردار نہیں، اصل کردار زبان کا ہے۔ لیکن اس سے ادب کی تفہیم میں سیاسی اور سماجی تناظر کی تو کسی حد تک نفی ہو جاتی ہے، لیکن یہ بات پھر بھی باقی رہتی ہے کہ زبان بھی تو کسی نہ کسی سیاسی سماجی تناظر ہی میں جنم لیتی اور زندگی گذارتی ہے۔ چلیے مصنف کے حوالے سے نہ سہی زبان کے حوالے سے سہی، آپ تخلیق کے سماجی تناظر سے تو پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔

اگر ہم اس ساری بحث سے صرف نظر بھی کر لیں تو پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ تخلیق کی تفہیم اور تجزیے میں اس مفروضے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مصنف کا کوئی وجود نہیں؟ تصنیف کا تو وجود ہے۔ تصنیف کو آپ مصنف سے کس حد تک الگ کر سکتے ہیں؟ تنقید میں تخلیقی عمل کی بھی اہمیت ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ساختیات، پس ساختیات، رد تشکیل، قاری اساس تنقید سب متن ہی کو بنیاد بناتے ہیں۔ جدید نظریے اور نقاد سب اس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ادب سے یا فن پارے سے ان کی کیا مراد ہے۔ اکثر لوگ بات کا آغاز مارٹن ہائیڈیگر (Martin Heigegger) سے کرتے ہیں۔ ہائیڈیگر کا خیال ہے کہ "زبان کسی چیز کی نمائندگی کے لیے نہیں ہے۔ یہ وجودوں کی دنیا میں حقیقی اعمال سرانجام دیتی ہے۔" یہ ایک اہم نکتہ ہے کیونکہ اس کی رو سے تفہیم ایک متحرک سرگرمی ہے، ایک نوع کا تسلسل یا مکالمہ جو کبھی بھی پوری طرح مکمل نہیں ہوتا، ختم نہیں ہوتا، بند نہیں ہوتا۔ "تفہیم کوئی ایسی بات بھی نہیں جو ہو چکی ہے۔ یہ وجود کا موجود کا اور زبان کا حصہ ہے۔" اگر اس مفہوم میں دیکھیں تو زبان ایک غیر عقلی، تقریباً اسراری کیفیت اختیار کر لیتی ہے اور فن و ادب ایک ایسے درجے پر فائز ہو جاتے ہیں جہاں دنیا کا سچ خود بخود اپنا اظہار کرتا ہے۔

متن کی تفہیم کے باب میں دریدا نے مارٹن ہائیڈیگر کا اثر قبول کیا۔ دریدا کے لئے بھی متن میں معنی ایک مستقل عمل سے پیدا ہوتے ہیں جس میں differing اور deferring بیک وقت عمل میں آتے رہتے ہیں۔ دریدا (Differance) کی اصطلاح وضع کر کے اس عمل کی تعبیر کرتا ہے۔ وہ اس تصور کو رد کرتا ہے کہ متن میں معنی کے مراکز متعین ہیں۔ اس طرح مذہب، فلسفہ، کسی بھی چیز میں متعین معنی، لہٰذا خود معنی کا وجود مشکوک ہو جاتا ہے۔ دریدا کا خیال ہے کہ

معنی کی بہتر تفہیم مکمل اور نامکمل کے درمیان تعلقات کو سمجھنے سے عبارت ہے۔ اس عمل سے متن لامرکز (Decentred) ہو جاتا ہے۔ اس کا خیال ہے چونکہ معنی کا التوا جاری رہتا ہے اور معنی کے مرکز کا تعین نہیں کیا جا سکتا، اس لیے متن کے واحد معنی جس پر سب کا اتفاق ہو، ممکن نہیں ہیں۔

کسی متن کے واحد معنی پر اصرار کم از کم جدید ادبی تنقید میں تو کبھی بھی روا نہیں رکھا گیا، اس میں دریدا کی کوئی تخصیص نہیں۔ جہاں تک فلسفہ اور مذہب کا تعلق ہے، ان میں بھی مختلف تشریحات ہوتی ہیں اور تشریح کرنے والا اگرچہ اس گمان میں مبتلا ہوتا ہے کہ صرف اسی کی تعبیر یہی ہے لیکن اختلافات موجود رہتے ہیں۔ اس کے باوجود کسی مذہب یا فلسفہ کے ماننے والوں کے درمیان چند بنیادی اصولوں باتوں پر اتفاق اور فروعی باتوں کے بارے میں اختلاف رائے ہوتا ہے۔ یہی کیفیت ادبی متن کی ہے۔ آپ دنیا کا مشکل ترین اور مبہم ترین متن لے لیں۔ اس میں پوشیدہ بعض مفاہیم پر لوگوں کا اتفاق ہوگا اور بعض پر نہیں۔ لہٰذا یہاں بھی کوئی ایسی انقلابی بات سامنے نہیں آ رہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تاریخ میں ایک خاص وقت پر اس مسئلے کو اس انداز سے کیوں اٹھایا جا رہا ہے کہ معنی، یا سچائی، کا وجود ہی نہیں ہے؟ کیا اس کے پیچھے موجودہ نوآبادیاتی فکر رکھنے والوں کے سیاسی عزائم تو جھلک نہیں مار رہے ہیں جو ایک بار پھر سے دنیا کا سیاسی اور جغرافیائی نقشہ ترتیب دینا چاہتے ہیں؟ موجود تسلیم شدہ معنی کو دھندلائے بغیر آپ نئے معنی کیسے مسلط کر سکتے ہیں؟

دریدا اور اس کے ماننے والوں سے ایک سوال تو کیا ہی جا سکتا ہے کہ کسی متن کے کچھ نہ کچھ معنی تو آپ کو متعین کرنا ہی پڑیں گے ورنہ آپ استحصال کو رد کرنے اور انصاف کو قائم کرنے کے لئے کوئی اقدام نہیں کر سکتے۔ زبان اس وقت وجود میں آتی ہے جب آوازوں کی معنویت پر لوگوں کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب ایک فرد لفظ ''پانی'' بولتا ہے تو زبان کے بولنے والے افراد سمجھ جاتے ہیں کہ بولنے والا کس چیز کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ بڑے سے بڑا متن بھی چھوٹے چھوٹے جملوں سے پروان چڑھتا ہے۔ اس لیے جب آپ متن بنائیں گے تو مقررہ زمان و مکان میں وہ بامعنی بھی ہو سکے گا۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر آپ زبان کے وجود کو ہی خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ دریدا اور اس کے ماننے والے جس شاخ پر بیٹھے ہیں اسی کو کاٹ رہے ہیں اور یہ بات نہیں جانتے کہ شاخ سے نیچے ایک گہری کھائی ہے۔

آج اردو تنقید میں بڑا مسئلہ یہ ہے کہ نظریوں کی فکری بحثیں تو بہت ہیں لیکن یہ بحثیں متن کی زندہ مثالوں سے خالی ہیں۔ وزیر آغا کی کتاب ''تنقید اور جدید اردو تنقید''، گوپی چند نارنگ کی ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات''، قمر جمیل کی دو جلدوں میں کتاب ''جدید ادب کی سرحدیں''، قیصر الاسلام کی کتاب ''فلسفے کے جدید نظریات'' اور یونس خان کی ''لسانی فلسفہ اور فکشن کی شعریات'' میں اردو سے مثالیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ظلم یہ ہے کہ جہاں جہاں مغربی مفکرین کا ذکر ہے وہاں بھی ان کی نظری باتیں تو درج ہیں لیکن متن کی مثالیں ناپید ہیں۔ اگر ایک آدھا جگہ ذکر ہے بھی تو وہ اتنا سرسری کہ آپ اس سے کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے۔ متن کے مجسم حوالے کے بغیر جدید تنقیدی ادبی نظریے ہوا میں کتنے دیر معلق رہیں گے؟

وزیر آغا کی کتاب ''معنی اور تناظر'' میں اعلیٰ تنقید کے نمونے ضرور مل جاتے ہیں لیکن وہاں وزیر آغا کا طریقۂ کار ساختیاتی یا پس ساختیاتی نہیں بلکہ وہی ہے جسے انھوں نے ''امتزاجی'' طریقۂ کار سے موسوم کیا ہے اور جس پر وہ ایک عرصے سے کاربند ہیں۔ اسی طرح، قمر جمیل کی متذکرہ کتاب میں جو عملی تنقید کے مضامین ہیں اس میں تجزیے کا طریقۂ کار نئی تنقید والا ہے۔ اردو ادب کے جاپانی طالب علم سویاما نے غلام عباس پر اپنے تحقیقی مطالعے کے حصے دوم میں ساختیاتی طریقۂ کار برتنے کی کوشش کی ہے۔ غلام عباس کے بارے میں یہ کتاب تحقیق کے اعتبار سے یقیناً قابل قدر چیز ہے مگر جب وہ غلام عباس کے افسانوں کا تجزیہ کرتا ہے تو مختلف اصطلاحات اور تصورات یا کرداروں کے تعداد گنوا کر رہ جاتا ہے۔ نیا طریقۂ کار ہمیں نئے معنی سے روشناس نہیں کرتا تو پھر اس کی افادیت کیا رہ جاتی ہے؟

اب تک اردو میں جو بھی ''تھیوری'' ہے (اور اس کی نظری افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا) اس میں تنقید کے اہم ترین عنصر یعنی ادبی متن کو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا ہے۔ جب تک آپ ادبی متن کے حوالے سے تھیوری کی افادیت ثابت نہیں کرتے، یہ دیوانے کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہ رکھے گی۔ گوپی چند نارنگ کے مداحوں نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے الطاف حسین حالی کے ''مقدمۂ شعر و شاعری'' کے سو سال بعد اردو میں نیا ''ڈسکورس'' قائم کیا ہے تو مجھے خدشہ ہے متن سے تہی اس ''ڈسکورس'' کی موت کہیں نارنگ صاحب کی زندگی ہی میں واقع نہ ہو جائے۔ (اب تو وہ خود بھی ''مابعد جدیدیت'' کی بحث میں الجھ گئے ہیں۔ میں نے اس مضمون میں مابعد جدیدیت کے قصے کو ہاتھ نہیں لگایا کیونکہ وہ بحث میرے ایک دوسرے مضمون ''مابعد جدیدیت: دراز خالی ہے'' میں آ رہی ہے۔)

اردو میں تھیوری اور مابعد جدیدیت کے مبلغین کی صورت حال مجھے ایک کہانی کی یاد دلاتی ہے: ایک لڑکا نیا نیا فلسفہ پڑھ کر اپنے گھر واپس آیا۔ صبح کو جب وہ اپنے باپ کے ساتھ ناشتہ کر رہا تھا تو رکابی میں ابلے ہوئے انڈے کو دیکھ کر اس نے اپنے والد پر رعب جمانا چاہا اور کہا، ''ابا سامنے جو انڈا نظر آ رہا ہے وہ دراصل ایک انڈا نہیں۔ دو انڈے ہیں۔'' سادہ لوح والد نے حیرت سے پوچھا، ''کیسے؟ سامنے تو ایک ہی انڈا ہے۔'' اس پر بیٹے نے فخر سے بتایا کہ ایک انڈا تو سامنے نظر آ رہا ہے اور دوسرا انڈا اس کی ماہیت ہے۔ باپ نے انڈا اٹھا کر منہ میں رکھا اور بیٹے سے بولا، ''بیٹے، ایک انڈا تو میں کھائے لیتا ہوں۔ ماہیت تم کھا لو۔'' میرا بھی یہی خیال ہے۔ نقاد کو اپنی تنقید کے لیے اصل متن کو منتخب کرنا چاہیے اور ''ماہیت'' کی رو سے جو دوسرا متن ہے اسے جدید تھیوری کے لیے چھوڑ دینا چاہیے ☆☆☆

بے شناخت

رشید امجد

ایک عجب مخمصہ چند دنوں سے اسے اندر ہی اندر ادھیڑے جا رہا تھا۔

اسے اپنی ماں سے بڑی محبت تھی۔ اس نے اسے جس طرح پالا تھا اور اپنا آپ اس پر وار دیا تھا، وہ بھلانے والی بات نہ تھی۔ ماں مری تو یوں لگا جیسے وہ بھی اس کے ساتھ دفن ہو گیا ہے، لیکن زندگی بڑی ڈھیٹ ہے۔ چند دنوں میں سب کچھ معمول کے مطابق چل پڑتا ہے، لیکن اس معمول میں اس کے دل میں ہمیشہ ماں سے بچھڑنے کی کسک رہی۔ یہ کسک کبھی کبھی اس وقت بڑھ جاتی جب خیال آتا کہ اس کے پاس ماں کی کوئی تصویر نہیں۔ ان دنوں تصویر کھینچنے کا رواج بھی نہیں تھا، کیمرے ہوتے کہاں تھے، بس کسی خاص موقع پر تصویر بن گئی تو بن گئی۔ شاید کسی ایسے موقع پر ماں کی تصویر بھی بنی ہو لیکن اس زمانے میں تصویریں سنبھالی بھی کہاں جاتی تھیں۔ ماں یوں بھی پرانے خیالات کی تھی، شاید اس نے تصویر کبھی کھنچوائی ہی نہ ہو۔ باپ کی تصویر موجود تھی۔ وہ اسے دیکھتا تو خیال آتا، کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس کے ساتھ ماں کی تصویر بھی ہوتی۔ لیکن تصویر ملتی کہاں سے۔

وہ ان کے بڑے برے دن تھے۔ زندگی بسر نہیں ہو رہی تھی۔ لمحے لمحے کے ساتھ ان کی چنڈیاں کٹ رہی تھیں لیکن ماں نے کبھی احساس نہ ہونے دیا۔ وہ جوں توں کر کے اس کی ہر خواہش پوری کرتی، اور اب جب اس کے پاس سب کچھ تھا، ماں نہیں تھی۔ اسے خیال آتا، کم از کم اس کی تصویر ہی ہوتی، یہ تصویر ہی دیکھتی کہ اب اس گھر میں کیا کچھ نہیں ہے، پھر سوچتا دور خلاؤں سے شاید ماں کبھی کبھی جھانک لیتی ہو، اور شاید کبھی علم اتنا پھیل جائے کہ وہ جھانکتے ہوئے اس کی تصویر لے لے، لیکن اس وقت تک وہ کہاں ہوگا، وہ بھی شاید کسی ایسے ہی جھروکے سے جھانک رہا ہو، وقت کے جھروکوں سے جھانکنا بھی عجب ہے، نسلیں نسلوں کو جھانکتی ہیں، لیکن کیا ان میں کوئی رشتہ ہوتا ہے، مگر یہ تو ماں ہے اور ماں بھی ایسی جس نے اپنی ساری ہوگی اس پر قربان کر دی۔

وہ وقت کے منہ زور گھوڑے کی طنابیں کھینچ کر اس کو روکے رکھنے کی قوت تو نہ رکھتا تھا کہ ماں کو لمبے سفر پر جانے سے روک لیتا، لیکن کم از کم تصویر ہی...؟ زندگی کی نعمتوں، بچوں کی کلکاریوں اور زندگی کی رنگا رنگیوں میں تھم کر، مڑ کر دیکھنے کی فرصت ہی کہاں ہوتی ہے، لیکن ایک لمحہ، کوئی ایک لمحہ ایسا ہوتا ہے جو اپنا ہے اور اس اپنے لمحے میں مڑ کر دیکھتا تو ماں ہی نظر آتی اور خیال آتا اس کی کوئی تصویر میرے پاس نہیں۔ کبھی کبھی سوچتا کاش کوئی ایسا کیمرہ ہوتا جو میرے ذہن میں موجود ماں کے ہیولے کو تصویر میں بند کر دیتا۔

ان ہی لہروں میں ڈوبتا ابھرتا، زندگی کا سفر کٹتا جا رہا تھا کہ ایک دن ایک پرانی کتاب میں سے چھوٹا سا لفافہ مل گیا جس میں ماں کی تصویر تھی۔ لگا جیسے اب تک جو کچھ اس کے پاس تھا، بے معنی تھا۔ تصویر چھوٹی سی تھی۔ ایک ہی دن میں scan ہو کر تصویر بڑی ہو گئی۔ پرنٹ نکل آیا تو وہ اسے فریم والے کے پاس لے گیا۔ لیکن فریم والے کو تصویر دیتے ہوئے ایک شک نے اس کے وجود میں کہیں آنکھ کھولی۔

"کیا یہ ماں ہی کی تصویر ہے؟"

"اس کا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ وہ واپس مڑا اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا... کچھ دیر چپ بیٹھا رہا۔ پھر تصویر لفافے میں سے نکالی اور غور سے دیکھنے لگا۔

"یقیناً۔ یہ ماں ہی کی تصویر ہے!"

لیکن اطمینان کی قوس قزح لمحے بھر ہی میں گھنے کالے بادل تلے ڈوب گئی۔

"شاید یہ ماں کی تصویر نہ ہو؟"

وہ اسی تذبذب میں اسٹیئرنگ کے آگے بیٹھا، کبھی تصویر نکالتا، کبھی اسے دوبارہ لفافے میں رکھ دیتا۔

رات گئے گھر لوٹا تو بیوی نے پوچھا۔ "دیر کیوں کر دی؟"

پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی۔ "کچھ پریشان لگ رہے ہو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، بس تھکاوٹ سی ہے۔"

یہ کیسی تھکاوٹ تھی، اسے رات بھر نیند نہ آئی۔ جس تصویر کے لیے وہ تڑپتا تھا، اب ملی تھی تو شک کی چلمن بھی ساتھ ہی چلی آئی تھی۔

کروٹیں بدلتے بدلتے خیال آیا کہ کسی سے پوچھ لینا چاہیے اور اس کے لیے سب سے مناسب بڑی بہن ہی ہے۔ صبح وہ دفتر جانے سے پہلے ہی بہن کے گھر جا پہنچا۔ وہ اسے دیکھ کر کھل گئی اور بچوں سے کہنے لگی۔ "آج تو عید ہے، تمھارے ماموں صبح صبح ہی آ گئے ہیں۔"

وہ کچھ نہ بولا، چپکے سے لفافہ بہن کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بہن نے حیرت سے اسے دیکھا، لفافے میں سے تصویر نکالی اور خوشی سے اچھل پڑی۔

"ارے! ماں کی تصویر!"

اطمینان کے پرندے نے اپنے رنگ برنگے پر پھیلائے، اس نے جھجکتے جھجکتے پوچھا۔

"یہ ماں ہی کی تصویر ہے نہ؟" بہن کی کچھ سمجھ نہ آیا اور وہ عجیب سی

نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

وہ سنبھلا۔ ''میں نے سوچا تمھیں دکھادوں۔ اچھا، چلتا ہوں دیر ہورہی ہے۔''

وہ بیٹھنے کو کہتی ہی رہ گئی لیکن وہ لفافہ ہاتھ میں پکڑے پکڑے دروازہ غصّے میں پٹختا باہر نکل آیا۔ اس نے سوچا اس وقت فریم کی دکانیں کھلی نہیں ہوں گی، واپسی پر کرا لوں گا۔ سارا دن دفتر میں فائلوں پر پھول کانٹے بناتے گذر گیا۔ سیٹ سے اٹھا تو ملگجا اندھیرا دبے پاؤں رقص کر رہا تھا۔ وہ دفتر سے سیدھا فریم کی دکان پر پہنچا۔ گاڑی سے نکلتے دفعتاً خیال آیا۔ ''کہیں آپا سے غلطی تو نہیں ہوگئی اس کی عمر میں مغالطہ ہو ہی جاتا ہے۔ یہ ماں کی تصویر ہے بھی کہ نہیں؟''

ایک پاؤں اندر ایک باہر... کتنی ہی دیر وہ اس حالت میں رہا، پچھلی گاڑی والے نے ہارن دیا تو وہ چونکا اور اندر ہوتے ہوئے دروازہ بند کر کے بیٹھ گیا۔

اس رات پھر وہی کشمکش رہی... ہاں، نہیں... نہیں، ہاں... نیند آنکھوں میں چیونٹیاں بن کر رینگنے لگی تو اس نے سوچا، چھوٹی بہن سے پوچھ لینا چاہیے، اس کی یادداشت ٹھیک ہے۔

چھوٹی بہن صبح صبح ہی اسے دیکھ کر حیرت سے بولی:

''بھیا خیریت ہے نا، دفتر نہیں گئے؟''

اس نے کچھ کہے بغیر لفافہ بہن کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ بہن نے لفافہ کھولا، ایک لمحہ تصویر دیکھتی رہی، پھر بولی، ''ماں!'' اس نے دوسری بات نہ کی اور تصویر اس کے ہاتھ سے لے کر لفافے میں ڈالی اور اسے حیرت زدہ چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ دفتر سے نکل کر فریم والے کی طرف جاتے ہوئے اطمینان سا تھا، لیکن تصویر دیتے ہوئے خیال آیا، بہن کچھ دیر چپ کیوں رہی تھی، شاید پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی، اس کا مطلب ہے کہ اس نے فوراً نہیں پہچانا... تو کیا؟

شک ساری رات اس کے وجود کو ادھیڑتا رہا۔

''یہ تصویر کس کی ہے؟ میں کون ہوں۔ میری ماں کون تھی؟ میری کوئی ماں تھی بھی کہ نہیں؟'' پھر خود ہنس پڑا، ماں نہیں تھی تو میں کہاں سے آیا۔ ماں تو تھی مگر مجھے اس کا چہرہ یاد کیوں نہیں رہا۔ اسے اپنے آپ سے گھن سی آئی، اتنی مہربان ماں اور میں ایسا احسان فراموش کہ اس کا چہرہ بھی یاد نہیں۔

اب وہ روز سونے سے پہلے تصویر لفافے میں سے نکالتا ہے، کچھ دیر دیکھتا رہتا ہے، پھر لفافے میں رکھ دیتا ہے۔ رات بھی نیند نہیں آئی، دفتر میں بھی فائلوں پر پھولوں کی جگہ کانٹے اور کانٹوں کی جگہ پھول بن جاتے ہیں۔ بیوی اور بچے شہر کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو دکھا لائے ہیں۔ حکیموں کا علاج بھی ہو چکا۔ لیکن اس کی بیماری کی تشخیص نہیں ہو سکی۔ روز بروز وزن کم ہوتا جا رہا ہے۔ آنکھیں اندر دھنستی چلی جا رہی ہیں۔ ڈاکٹر اس کا مرض نہیں جان سکے، جان بھی نہیں سکتے کہ وہ کسی کو کیا بتائے کہ ایک عجب مخمصہ ہے، جو اسے اندر ہی اندر ادھیڑتا چلا جا رہا ہے کہ وہ کیسا بیٹا ہے جو اپنی ماں کو بھی نہیں پہچانتا ☆☆☆

غزل

ارشدعبدالحمید

مجھ سا بیتاب یہاں کوئی نہیں میرے سوا
یعنی برباد جہاں کوئی نہیں میرے سوا
روشنی تھی تو کئی سائے نظر آتے تھے
تیرگی ہے تو یہاں کوئی نہیں میرے سوا
بھیڑ میں ایک طرف گوشۂ اخلاص بھی ہے
غور سے دیکھ وہاں کوئی نہیں میرے سوا
شہر میرے ہی بھرو سے پہ ہو خفتہ جیسے
ہدف شور سگاں کوئی نہیں میرے سوا
سربلندی مری تنہائی تک آ پہنچی ہے
میں وہاں ہوں کہ جہاں کوئی نہیں میرے سوا
شعر میں غیر کی تشبیہ کہاں سے آئے
میری مانند یہاں کوئی نہیں میرے سوا
چین لکھتا ہے مرے خواب کا راوی ارشد
اس سمند میں رواں کوئی نہیں میرے سوا

محمد حمید شاہد

لذت تن

فی الحقیقت حضرت مولانا سراج الدین سحور ملالوی کے لئے خود اپنی ذات کے توسن سے جنت اور دوزخ کا سوال بے ڈھب پھیلتا اونٹ کٹارا تھا ہمارے کا سارا کانٹوں بھرا۔ قریب جاؤ تو دامن تھامے اور تھامے رہے۔ حیلہ کر کے چھڑا ئینا چاہو تو زنبور بنے اور الجھالے۔ زور آوری کرو تو دامن ہی تھگلا تھگلی کردے۔ تاہم یہ سوال ان کے وجود کے لئے یوں تھا جیسے کبوتر کے لئے اس کے پاؤں میں پڑی پنجنی۔ کبوتر چاہے جتنی دھیرج سے چلے پاؤں کی پنجنی جھن ضرور کرتی ہے۔

یہی وجہ رہی ہوگی کہ شروع شروع میں جب بھی جنت دوزخ کے سوال کے سرعت سے گھومتے پرکار کی سوئی ان کی چھاتی کو مرکز مان کر پوست ادھیڑتی، ماس چیرتی، عین من کے بیچ کھب جاتی تو دائرے کی صورت گھومتا، لکیریں ڈالتا مستہام سراپے ہی ٹھٹھک کر ٹھہر جاتا۔ مولانا ملالوی اس سوال کو سامنے پا کر الجھ جاتے۔ الجھن سے تو سر جھٹک دیتے اور بار بار جھٹکے جاتے۔ بالکل یوں جیسے پہلی جھن پر کبوتر جھل مرے کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے، پھر پاؤں جھٹکتا ہے اور جھٹکے چلا جاتا ہے۔

. کون جانے، وہ کون سا لمحہ تھا کہ ان کی روح پر پڑی چونک کی کنفی خود بخود مسک گئی تھی۔ اول اول بس اتنی ہی مسک چاہئے ہوتی ہے بعد ازاں تو روح اسی مسلسل مسک کی پھنک کی اسیر ہو جاتی ہے۔ جنت دوزخ کا سوال، غٹ غوں، غٹ غوں کرتے اور اپنے ہی محور پر رقص کرتے کبوتر کی جھن جھن کی طرح مولانا ملالوی کے لئے جھن جھنیا بن گیا جو جکڑے ہوئے بھی تھا اور حلاوت بھی دیتا تھا۔

پھر جب اسی جکڑ کی حلاوت روح کا وظیفہ ہوگئی تو رفتہ رفتہ ان کے بدن کے خلیے خلیے میں مستی بن کر سمانے لگی۔ مولانا ایسے میں بے خود ہو جاتے، دستار کلاہ سمیت دونوں ہاتھوں سے تھام کر اتارتے اور اپنے سامنے رکھ لیتے۔ مقتدی سمجھ جاتے کہ مولانا وجد میں آیا چاہتے ہیں۔ سب خاموش ہو جاتے حتیٰ کہ وہ حال کے جذب سے ابھرتے اور قبلہ رخ ہو کر سربسجود ہو جاتے۔

جب مولانا ملالوی اس استغراق حال سے نکلتے تو قال اور صدق مقال کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ سبھوں کے دل عقیدت کے بوجھ سے چھلک رہے ہوتے۔ لوگ ان کے ہونٹوں سے پھوٹتی حرف حرف کرنوں سے اپنی بطون کو اجالتے اور اپنی اپنی نگاہ میں مولانا کا قد اور رتبہ بڑھاتے چلے جاتے۔

پھر یوں ہوا کہ قامت اور مراتب اس قدر عالی ہوگئے کہ یہ سب انھیں بھی سرور دینے لگا۔ مراقبے کی کیفیت طول کھینچنے لگی۔ ایسے میں ان کی خامشی اس قدر گمبھیر ہو جاتی کہ سناٹا بولنے لگتا اور ان کا اپنا کہا، ما الانسان لولا لسان، بھی جھوٹ لگنے لگتا۔ وہ جو بولتے ہیں اور بولتے چلے جاتے ہیں، ان کی زبانیں تو ان خاک پتلوں کو منہ کے بل گرا کر پیوند خاک کر دیتی ہیں مگر یہ جو چپ ہے، بولتے سناٹے میں لمبی چپ...اور یہ جو مراقبہ ہے، کیف کی جھر جھر میں طویل مراقبہ، یہی تو سارے میں تقدس کی زبان کا رس گھولتا ہے۔ ایسا رس جو قطرہ قطرہ دل کی سماعتوں پر ٹپکتا ہے. ٹپکتا ہے اور ٹپکے جاتا ہے، حتیٰ کہ سب مسحور ہو جاتے ہیں۔

لاریب کہ نہال لمحوں کی جماعت میں بلا کا کیف اور غضب کی مستی تھی، مگر مولانا ملالوی کے بدن بیچ پڑا جنت دوزخ کا سوال بھی تو برف کی سل ایسا نہ تھا کہ طویل مراقبوں کی حدت سے گھل کر خود بخود پانی ہو جاتا۔ یہ سوال تو لوہے کی سلاخ کی طرح روح کے عین وسط میں پیوست تھا اور جہاں یہ پیوست تھا، ٹھیک وہیں سے ناقابل برداشت درد کی ٹیسیں نمیں جماتیں تو وہ بے بس ہو جاتے۔ یہی بے بسی مراقبے کا مزا کرکرا کر دیتی تھی. لہٰذا کسی اور حیلے کی بابت تفکر فرمانے لگے۔

تقویم کی ایسی ہی تسبیح کو رولتے رولتے ایک روز مطلوبہ حیلے کا دانہ ان کے ہاتھ آن لگا۔ یہ حیلہ پہلے کا متبادل نہ تھا، بالوصف آزمانے والا تھا۔ جو مولانا کہا کرتے تھے کہ، الحدید یفلح بالحدید، بہ مثل انھوں نے اپنی روح میں پیوست لوہے کی سلاخ کو لوہے سے کاٹنے کے لئے اپنی حدید اللسان پر جنت دوزخ کے تذکرے کی کاٹ کو بڑھا دیا۔ اس کے لئے انھیں خاص اہتمام کرنا پڑا تھا۔ پہلے پہل وہ گاہے گاہے بیان فرماتے تھے، اب تین اوقات مخصوص ہو گئے تھے۔ فجر، ظہر اور عشا کی نمازوں کے بعد مقتدی بیٹھے رہتے، مولانا ملالوی دو زانو

ہو کر پہلو اس قدر بدلتے کہ اقامت کہنے والے سے لے کر بائیں جانب بیٹھے آخری صف کے آخری مقتدی تک سب کو ان کے چہرے کا کچھ نہ کچھ حصہ جھلک دے جاتا۔ نگاہ اٹھا کر دیکھے بغیر دھیمے مگر دلنشیں لحن میں بیان ملاحم عطا فرمانے لگتے۔

پہلے پہل مسجد مائی مصاحب بانو میں نماز جمعہ کا اہتمام نہ ہوتا تھا کہ جامع مسجد مدنی زیادہ دور نہ تھی۔ ملحق محلے کی دوسری طرف سب کو جانا پڑتا تھا۔ مولانا بھی جمعہ کے روز نماز کے لئے وہیں تشریف لے جاتے تھے کہ ان کا عقیدہ تھا: صلوٰۃ الجمعہ کا ہر مسجد میں اہتمام ضروری نہ تھا، تاہم اب صورت حال مختلف ہو گئی تھی۔ نہ صرف جمعہ کی نماز کا اہتمام ہونے لگا، مولانا خطبہ بھی دینے لگے تھے۔

معمول کی نمازوں کے بعد روزانہ کا سہ گانہ بیان فلک پوش پہاڑوں پر پانیوں سے لدے ان بادلوں جیسا تھا جو چپکے سے اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور سارے بدن کو طراوت کے احساس سے بھر دیتے ہیں جب کہ جمعۃ المبارک کا خطبہ جل تھل کر دینے اور پوری طرح بھگو ڈالنے والی موسلا دھار بارش کا سا تھا جو پہلے پانیوں کو نچوڑنے نہ دیتا تھا اور اوپر سے چھاجوں اور برسا دیتا۔ خطبے کے دوران نہایت سلیقے سے منتخب کردہ الفاظ ایک خاص دبج سے ان کے سینے سے اچھلتے اور نرخرے پر اچھلنے کے بعد ہونٹوں سے یوں ادا ہوتے کہ پورے ہال میں گونج بھر جاتی۔

مسجد مائی مصاحب بانو کا حال بڑا نہ تھا۔ عذاب ثواب کے عظیم تذکرے پر تو یہ اور بھی چھوٹا پڑ جاتا۔ اول اول ان کے لحن میں غضب کی مٹھاس ہوتی... یوں لگتا، جیسے ادھر ادھر شیرینی کے چھینٹے اڑ رہے ہوں۔ جنت کے تذکرے کے بیچ دودھ اور شہد کی رواں نہروں انواع و اقسام کے میوہ جات، شراب طہور اور خوبصورت آنکھوں والی اٹکھیلیاں کرتی حوروں کی خوب دلنشیں آواز میں تصویر کشی فرماتے، یوں کہ جنت کی اس تصویر سے وابستہ تخیل پھیلتا پھیلتا اس قدر وسعت پالیتا کہ جنت کے آٹھوں درجات آنکھوں کے سامنے کھلتے چلے جاتے اور صاف صاف دکھنے لگتا کہ یہ دارالخلد ہے وہ دارالمقام، ادھر دارالسلام، جنت عدن اور دارالقرار واقع ہیں ادھر جنت نعیم، الماویٰ اور فردوس بریں۔ جب مولانا بتاتے کہ سات درجے تو انسانوں کی قیام گاہیں ہیں اور آٹھویں پر دیدار مطلق ہو گا تو سبھوں کے تصور کی نگاہیں جلال کبریائی کے نور سے جگ مگ جگ مگ کر اٹھتیں۔ مولانا سورۃ الرحمٰن کی تلاوت، ترجمہ اور تفسیر فرما رہے ہوتے تو عجب استغراق کا عالم ہو جاتا۔ ایسے میں انھیں سننے اور دیکھنے والے مسحور ہو کر پکار اٹھتے، **احسن الاشیاء کلام صحیح من لسان فصیح من وجہ صبیح۔**

جب مولانا دوزخ کے طبقات ستہ کی طرف سیمیائی بیان کا رخ موڑتے تو جہنم، سعیر، حطمہ، لظیٰ، سقر، جحیم اور ہاویہ کا ایندھن بننے والوں کی نشانیاں کھول کھول کر بتاتے ہیں۔ پھر جب دوزخ کے لئے النار اور نرک جیسے مترادفات بدل بدل کر استعمال کرنے لگتے تو زبان بھی شعلہ بار ہو جاتی۔ لگتا کہ دہکتی آگ ہے جو سینوں کی سمت اٹھتی ہے اور بدن کو یوں جلائے دیتی ہے کہ ہڈیوں کی چیخ تک سنائی دینے لگتی ہے۔ خصوصاً جب وہ سورۃ الاعراف کی چالیسویں آیت تلاوت فرما رہے ہوتے اور ان لوگوں کی نشاندہی کرتے جن پر آسمان کے دروازے ہرگز ہرگز نہ کھولے جائیں گے تو یوں محسوس ہوتا جیسے مسجد کی چھت مقفل دروازوں والا آسمان بن کر سب کے سروں پر جھک آیا ہے۔ مولانا تمثیلی اور تصریحی اسلوب میں مردود ٹھہرائے جانے والوں کی بابت بتاتے کہ ان کا جنت میں داخلہ ایسے ہی ناممکن ہے جیسے سوئی کے ناکے سے اونٹ گذرنا... اور یہ کہ، دوزخ ہی ان کا اوڑھنا اور دوزخ ہی ان کا بچھونا ہے۔

جب وہ سوئی کے ناکے سے اونٹ کے گذرنے یا پھر اوڑھنے بچھونے کی بابت بتاتے تھے تو ان کے وجود میں کہیں نہ کہیں ایک چبھن سی ہوتی تھی تاہم اس چبھن کا احساس اپنے ہونے کے باوصف یوں کافور ہو جاتا تھا جیسے اپنے محور پر پھیلیں ڈالتا کبوتر رفتہ رفتہ اپنی پنجی کی جھن کو قبول کر لیتا ہے اور اسے اپنے معمول کے بیچ کہیں نابود کر دیتا ہے۔

مسجد کا صحن بھی کچھ زیادہ وسیع نہ تھا۔ جہاں اس کی وسعت ختم ہوتی تھی وہیں تین مکمل اور دو نصف محرابوں والا برآمدہ تھا، جس میں طہارت گاہ بھی تھی اور وضو خانہ بھی۔ محرابوں کے اوپر نصب پھولدار جالیوں کے پیچھے خالی جگہوں کے اندر پھٹیوں کو جوڑ کر کابکیں بنا دی گئی تھیں، جن میں بسا دیئے جانے والے کبوتر سارا سارا دن مسجد کی منڈیروں پر غٹ غوں، غٹ غوں کرتے، پہلو بچا کر ادھر ادھر ہو جاتی کبوتریوں کے گرد گھمن گھیریاں ڈالتے اور موقع پا کر بغبغاتے ان پر سوار ہوتے یا پھر صحن میں ڈالا گیا چوگا چگنے میں مصروف رہتے تھے۔ یہاں وہاں بیٹوں کی خشک یا چپکتی ننھی منی گولیاں، جو اکثر بہتی یا پھیلتی سفیدی اور سیاہی مائل لیس کے بیچ ابھری اور جمی ہوئی ہوتیں جو اس امر کی نشاندہی کرتی تھیں کہ وہ جہاں جاتے چلے جاتے تھے، اس لئے کہ وہ سب مولانا ملالوی کو اچھے لگتے تھے۔

انھیں کبوتریوں اچھے لگتے تھے کہ وہ ان کی مدد سے اپنے تصور کے پکھیرو کو ایک ہی اڑان میں اس حویلی میں اتار سکتے تھے جو بعد میں جل بھن کر راکھ ہو گئی تھی۔ تاہم یاد کی بستی میں کچھ یوں بسی ہوئی تھی کہ جب وہ وہاں ہوتے تھے تو کہیں نہ ہوتے، بس وہاں ہی ہوتے، بالکل لوٹن کبوتر کی طرح جو فلک میں تارا ہو جانے کے بعد اوپر ہی کی فضا میں مست ہو جاتا ہے اور وہیں لوٹیاں لئے جاتا ہے۔ مگر جوں ہی اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ نیچے آ رہا ہے تو وہ ٹکر اڑان لیتا ہے اور پھر سے لوٹن بھرنے کو رجھ جاتا ہے۔

اجلے کبوتروں کے وسیلے سے جس حویلی سے ان کے تخیل کا سلسلہ جڑتا تھا اس کی چھتوں کی منڈیروں اور سیڑھیوں کی مملیوں سے بندھی چھتریاں ہمہ وقت اصیل کبوتروں سے آباد رہتی تھیں جب کہ اس کا آنگن پیالہ اماں جی کی محنتوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

اماں جی کو دھیان میں لانا اور انھیں ہی سوچے چلے جانا مولانا ملالوی کو اور بھی بھلا لگتا ہے۔ ایسے میں یوں ہوتا کہ ایک رس بھری آواز ابھرتی اور ہر کہیں یوں پھیل جاتی جیسے چاروں طرف سیکڑوں کبوتروں کی پنجیاں مدھر آواز میں جھن

جھن کیے جاتی ہیں۔ اس سرمدی آواز کا سلسلہ رکتا نہ تھا حتیٰ کہ پورے ماحول میں نور سا گھل جاتا۔ اس نور دھارے کے قلب سے اماں جی کا چہرہ ابھرتا تھا جو پوری طرح واضح تو نہ ہوتا، تاہم ہونٹوں کی جنبش صاف صاف دکھتی تھی۔

شفیق اماں جی کے نظیف چہرے پر تھرتھراتے مرطوب ہونٹوں کے اندر سے دودھ جیسے دانتوں کا لطیف اجالا تب سارے میں بھر جاتا تھا جب وہ انھیں پیار سے بجی میاں کہہ کر پکارتی تھیں اور قریب آنے پر اپنی گود میں بھر لیتی تھیں۔ گود کی گداز گرمی سے انھیں الجھن سی ہونے لگتی تھی۔ ایک مرتبہ جب امی جی نے انھیں کسمسا کر گود سے نکلتے پایا تو کہا تھا، بجی میاں! لگتا ہے اب تم خود کو بڑا بڑا سمجھنے لگے ہو اور بھولے جاتے ہو کہ کیسے دودھ کی دھاریں لینے کو مچل مچل یہاں گھسے آتے تھے۔

یہاں، کہتے ہوئے اماں جی نے اپنی انگلیوں کو اپنی گود کی سمت موڑ لیا تھا .. مگر ان کی نگاہ سیدھی وہاں جا پڑی تھی جہاں سے کبھی دودھ کی دھاریں امنڈا کرتی تھیں۔ ننھے بجی میاں نے دیکھا تھا، وہاں قمیص پوری طرح گداز اور سانسوں سے بھر گئی تھی، اتنی کہ اوپر چیلی اوڑھنی بھی نہیں سنبھال پا رہی تھی۔ وہ زیادہ دیر وہاں نظر نہ جما سکے تھے، شرم سے چہرہ بھی جھک گیا تھا، حتیٰ کہ وہاں ٹھہرے رہنا ان کے بس میں نہ رہا تھا لہٰذا انھوں نے وہاں سے کھسک کر آنگن پار کیا اور سیدھے ناغول میں جا بیٹھے تھے۔ تاہم وہاں یوں ہی اکیلے بیٹھے بیٹھے اس وقت کا تصور باندھنے کو آنکھیں موند لی تھیں جب اجلے دودھ کی دھاریں ان کے حلقوم میں اترا کرتی تھیں لیکن تب انھیں شدید مایوسی ہوئی تھی جب وہ ایسا تصور جما لینے میں بری طرح ناکام ہو گئے تھے۔ ہوتا یوں تھا کہ ہر بار اماں جی کا چہرہ دوسری سمت گھوم جاتا، پورے بدن سمیت .. اور ان کی پیٹھ کے اجلے پن اور مغلئی پھوڑے میں سے ایک ان کی نگاہوں پر تن جاتا اور دوسرا چبھنے لگتا، بالکل ایسے جیسے سفید کبوتروں کی ڈار آنگن میں اترنے پر بھلی لگتی ہے مگر ان کے ساتھ ہی کوئی سرمئی جنگلی کبوتر آ جاتا تو الجھن ہونے لگتی تھی۔

مسجد کے برآمدے کی کابکوں میں مقیم کبوتر پچاس سے اوپر ہی ہوں گے، مگر تھے سارے سفید، مرمر جیسے۔ اس کا خاص دھیان رکھا جاتا تھا کہ کسی اور رنگ نسل کا کوئی پرکھرا کبوتر ان میں ملنے نہ پائے۔ یوں نہیں تھا کہ سرخ، چتر ے، چینے، درباز ے، ہمنے، شار کے، کل پرے خاکی سرے، سیاہ پوتچھے، زاغے، لنگوٹ والے اور مکھی پرے ان اجلے مقدس کبوتروں سے کم معصوم دکھتے تھے بلکہ یوں تھا کہ بے داغ سفیدی اور اجلا پن اور وہ بھی دودھ جیسا مولانا ملا لوی کو بہت مرغوب تھا۔

ہر رات سونے سے قبل دودھ بھی وہ رغبت سے نوش فرمایا کرتے تھے، آبخورے یا کانچ کے گلاس میں نہیں، چینی مٹی کے بڑے پیالے میں۔ شاید اس لئے کہ یوں وہ اس کی زیادہ ہموار سطح کو دیکھ سکتے تھے۔ انھیں دودھ کو حلق میں اتار لینے کی عجلت نہ ہوتی، سامنے رکھے اسے دیر تک دیکھتے رہتے۔ جب پیالہ تھامتے تو دونوں ہاتھوں سے، بہت احتیاط کے ساتھ، جیسے انھیں اس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ انگلیوں کی پوروں کو نرمی سے پیالے کی بیرونی چکنی سطح پر پھسلنے دیتے تھے، یوں کہ جیسے وہ دودھ کی سفیدی کا لمس جانچ رہے ہوں۔ پھر بے اختیار ہو کر پیالے کے کناروں پر ایسے ہونٹ رکھ دیتے جیسے دودھ پی نہ رہے ہوں اس کے اجلے پن کو بوسے دے رہے ہوں۔

جب وہ چینی مٹی کے پیالے کو سامنے رکھ کر اس کے گول دہانے کی وسعت میں ٹھہرے دودھ کی ہموار سطح پر نظریں جمائے بیٹھے ہوتے تو تصور میں اماں جی کی شفاف پیٹھ آ جاتی تھی، جسے انھوں نے بس ایک ہی بار اور ایک ہی لمحے کو دیکھا تھا مگر اب تک دیکھے جاتے تھے۔ ہوا یوں تھا کہ ایک روز جب اماں جی بخار میں پھنک رہی تھیں، باجی زنان خانے میں آئے تھے، اور اماں جی کی ہائے وائے سن کر ہنستے ہوئے مشار مشار کر کہنے لگے تھے، تنی بیگم آخر کو مغلئی پھوڑا ہے، جب تک رہے گا اس کی تنتناہٹ میں طنطنہ تو ہوگا۔ پھر ایک پڑیا اماں جی کے سرہانے رکھتے ہوئے کہا، حکیم شرف الدین شرف سے منگوایا ہے یہ سفوف، کہتے ہیں نسخہ تیر بہدف ہے۔ اسے سرسوں کے تیل میں آمیز کر کے اوپر لپوا لینا، ایک دفعہ منہ کھل گیا تو سمجھو چین آیا۔ اباجی نے یہ کہہ کر اپنے اکلوتے بیٹے کی اور دیکھا، کہا: تھمنم میاں، ماں کا دھیان رکھنا، اور باہر نکل گئے۔

اباجی کی عادت تھی کہ وہ جب گھر میں ہوتے تو شوخی سے لفظ چبا چبا کر ادا کرتے تھے اور باہر احباب میں ہوتے تو لہجے میں تمکنت آ جاتی۔ ان کی یہ عادت بھی تھی کہ گھر میں کسی کو اس کے اصل نام سے نہ پکارتے تھے، کوشش کرتے کہ نام کا بلیتھن نکل جائے۔ ایسا نہ ہو پاتا تو خود سے کوئی عجیب سا نام رکھ چھوڑتے تھے۔ اماں کا نام جمیلہ خاتون تھا جسے انھوں نے تنی بیگم بنا ڈالا تھا۔ باہر کے کام کاج کے واسطے کلیم الدین تھا، رنگ کا کلسٹ، لہٰذا نام اور رنگ کی مناسبت سے کلو کہلایا۔ کلو کی بیوی گھر بھر کا کام کرنے کو چاروں پہر جھول پھرکی کی طرح گھومتی رہتی تھی، نام نجمہ ہوگا، تبھی تو سبھی نجو کہتے تھے، مگر اباجی کے واسطے وہ نجو تھی۔ اپنے بیٹے کو سراج الدین یا بجی میاں کہنا انھیں نہ بھایا، بیٹا تھمنم تھا، گول مٹول، چنانچہ تھمنم میاں کہہ کر پکارتے۔

جب اباجی مشار مشار کی بات کرتے یا ناموں کا بلیتھن نکال رہے ہوتے تو ان کے بیٹے کو شدید الجھن ہوتی تھی۔ اس روز بھی ہوئی تھی مگر دھیان مغلئی پھوڑے میں اٹکا ہوا تھا۔ اماں جی سے اس بابت پوچھا تو شدید تکلیف کے باعث انھوں نے ڈھنگ سے جواب نہ دیا، بس اتنا کہا تھا: جان کا روگ ہے یہ بھی۔ اور یہ جواب ان کی تشفی کے لئے بہت ناکافی تھا۔ سارا دن بجی میاں الجھن میں رہے اور شام پڑے جب سارے کبوتر چھتریوں پر آ بیٹھے تو بے دھیانی میں ڈیوڑھی سے ہوتے، بڑے کمرے جسے سب محل کہتے تھے، میں جا گھسے تھے۔ اور دیکھا تھا کہ ماں جی کی قمیص پشت سے کندھوں تک اٹھی ہوئی تھی اور صاف شفاف اجلی جلد یوں لشک رہی تھی کہ سارا لشکارا آنکھوں میں بھر گیا تھا۔ ماسی نجو بائیں بغل کے پاس، اٹھے بازو کے نیچے، قدرے پشت کی جانب، پوری طرح جھکی ایک گومڑ پر سرمئی سا لیپ کیے جاتی تھی۔

بجی میاں کو لگا تھا، وہاں سامنے اماں جی کی پیٹھ نہ تھی اجلے سفید کبوتروں کی ڈار تھی۔ اور ادھر، بغل کے پاس مغلئی پھوڑا نہ تھا، اسی اجلی ڈار میں کوئی سرمئی جنگلی کبوتر آ گیا تھا، ان کا جی چاہتا تھا، وہ آگے بڑھ کر جنگلی کبوتر کو اڑا دیں، کچھ اس

طرح چپکے سے کہ سارے اجلے کبوتر یوں ہی اپنے دھیان میں رہتے رہیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے ان کے کانوں کی لویں تک سرخ ہوگئی تھیں اور وہاں سے مست کر کانوں میں جا بیٹھے تھے۔ وہیں دیر تک لک چھپ بیٹھے وہ مغلئی پھوڑے کے کرب سے آنسو بہاتے رہے اور ان آنسوؤں کو اپنے دامن میں جذب کرتے رہے تھے حتیٰ کہ انھیں اماں جی کی پکار سنائی دی تھی اور سارے میں پنجیاں جھن جھن کرنے لگی تھیں۔

وہ بھاگم بھاگ اماں جی تک پہنچے اور مطمئن ہوئے کہ وہ اب سکون سے بستر پر دراز تھیں۔ ... اماں جی کے سرہانے جا کھڑے ہوئے تو ان کی نظر بیٹے کے اجلے لباس کے بھیگے دامن پر پڑی جس پر اب تازہ مٹی جم گئی تھی۔ انھوں نے سب جیسے سو کر قمیض کا دامن یوں تھام لیا تھا جیسے یہ داغ نہ ہو ان کی اپنی پشت کا مغلئی پھوڑا ہو۔

مولانا ملا لوی کو اجلا لباس بھلا لگتا تھا تاہم اس بات کا خاص دھیان رکھتے کہ وہ بے داغ رہے۔ اگر کہیں بھولے سے کوئی داغ لگ جاتا تو وہاں سے یوں بھاگ جاتے جیسے سفید کبوتروں کی مست ڈار میں سے اکیلے جنگلی کبوتر کو اڑا رہے ہوں۔

سفید اجلا لباس ان کے بدن پر جچتا بھی بہت تھا۔ قد مناسب درازی لیے ہوئے تھا۔ کمر سیدھی تھی۔ بھرے بھرے کندھوں کے وسط میں گردن یوں بلند ہوتی جیسے کبوتر چونک کر ٹھہرتا ہے اور سر اٹھا لیتا ہے۔ بھورے بال سیاہ خضاب میں رنگی داڑھی قدرے بڑی مگر چہرے کی گولائی کی مناسبت سے سج جانے والے ہونٹ، اٹھی ہوئی اور ذرا آگے کو جھکی ہوئی ناک، تازگی کا احساس دیتی صاف شفاف اور اجلی جلد، سرمہ لگی آنکھوں سے جھانکتی سفیدی میں سرخ ڈورے اور پلکوں ڈھکے حسن میں فلک جیسی وسعت اور سمندر جیسی گہرائی تھی۔ چوڑی اور بے شکن پیشانی مقدر کی تختی جیسی، جو اپنے حصے کی عبارت مانگتی تھی۔ دراز بال، اتنے دراز کہ خم کرنے پر کانوں کی لووں سے نیچے آ کر گردن کو چھونے اور بوسے دینے لگتے۔ عام دنوں میں قرینے سے بنی سفید ٹوپی پہنتے جس میں سے پلک کر نیچے آتی اور بال کی یوں زلفیں اور بھی بھلی لگتی تھیں۔ جمعہ کے روز عمدہ دوز کلاہ پر کلف لگی اور براق سفید ململ کی دستار کا اہتمام کرتے تھے۔ دستار کا شملہ دائیں کان کے پیچھے سے گزرتے پیچ میں یوں اڑس لیا کرتے تھے کہ بلندی پا کر درتے کے پیچھے تن کر پنکھا سا بن جاتا جب کہ دوسرا گردن سے ہوتا دونوں کندھوں کی درمیان پشت پر جھک جاتا تھا۔ مولانا ملا لوی کی اس وجاہت کی تخلیق کے لیے قدرت نے جتنا سلیقہ برتا تھا لگ بھگ اتنے ہی جتن خود انھیں بھی اسے سنوارنے اور سنبھال رکھنے کو کرنے پڑ رہے تھے کہ ان کا ایمان تھا اللہ جمیل ویحب الجمال۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ مولانا فقط اپنے ایمان کے باعث خود کو سنوارنے اور سجانے کے جتن کرتے تھے۔ یہ ایمان تو بس ان کی دھج کا جواز بن گیا تھا، یوں جیسے دو محبت کرنے والے وجودوں کے بیچ سے بغیر کسی تمنا اور طلب کے ایک نیا وجود تشکیل پا جاتا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ اوائل اوائل ساری تمکنت اور ... سے نپٹ کی

محض ایک ادائے ناز تھی جو ان کے بدن کی کھنکتی مٹی کے اندر گونج بھر رہا تھا۔ تاہم بعد ازاں ایسا دکھنا انھیں اچھا لگنے لگا تھا حتیٰ کہ یہ سب کچھ ان کی شخصیت اور معمول کا یوں حصہ بن گیا جیسے اس کے سوا وہ کچھ تھے ہی نہیں، جب کہ جو کچھ وہ تھے خود اپنی آنکھ پر بھی اسے نہاں نہ کرنا چاہتے تھے کہ ان کا یقین تھا، عین لاتری قلب لایحزن، کہ جب آنکھ نہیں دیکھتی تو دل بھی غم زدہ نہیں ہوتا۔

ان دنوں کہ جب مولانا ملا لوی بھی میاں اور تھم تھم کہلاتے تھے اور اپنی اماں جی کی جلی پیٹھ دیکھنے کے بعد ٹخول میں چھپ کر دودھ کی دھاروں کے حلقوم میں اترنے کا تصور جمانے لگتے تھے، ان کا دل لایحزن کے ایمانی حیلے سے قطعاً آگاہ نہیں تھا کہ ان دنوں ایمان تسلیم کر لینے اور بلا حیل و حجت مان لینے کا نام تھا۔ اندھیرا اس لیے اندھیرا تھا کہ وہ اندھیرا تھا۔ اس کی منطق کیا ہے، اس کے اجزائے ترکیبی کیا کیا ہیں، اور یہ کیوں ہے، سب اضافی سوالات تھے۔ اضافیت اور نسبت والے اضافی نہیں، فالتو فضول اور زائد والے اضافی۔ جیسے اجالا اس لیے اجالا تھا کہ سبھی اسے اجالا کہتے آئے تھے۔ انھیں تعلیم دی گئی تھی کہ وہ جو سب اپنے ایقان کے ساتھ کسی ایک بات کو متفق علیہ کہتے تھے، وہ اجماع کہلاتا ہے، اور اس پر اعتبار کرنا ایمان ہو جاتا ہے۔ ان دنوں یہی ایمان دانش کی بنیاد ہو جایا کرتا تھا اور استاد مکرم نے بھی یہی بتایا تھا لولا الایمان فبطلت الحکمة، یعنی اگر ایمان کالعدم ہوتا تو حکمت باطل ٹھہرتی۔

ایمان کے نور کی وہ مستقیم کرن جس کے سامنے کوئی منشور رکھا ہو نہیں تھا، تب تک کالعدم نہیں ہوا تھا، جب تک انھوں صرف ایک محرم، اجلے مگر ممنوعہ بدن کی پیٹھ دیکھی تھی۔ دوسرے محرم بدن کی جلی اور ممنوعہ پیٹھ پر نظر پڑنے سے پہلے انھیں بجھے ہوئے بے کیف اور یخ بستہ بدن کو مسلسل دیکھنا اور سہنا پڑا تھا۔ اور غالباً یہی وہ عرصہ تھا جس کے اندر کہیں وہ کفیان لمحہ پڑتا تھا جب روح پر پڑی چونک کی کفنی پہلی بار مسکی تھی۔

اگرچہ بیشتر گمان گمراہ کرتے ہیں لیکن مولانا ملا لوی کا غالب گمان یہی تھا کہ وہ کفیان لمحہ عین وہی تھا جب وہ قد آدم آئینوں کے درمیان جا کھڑے ہوئے تھے اور ایک ایک کر کے اپنے تمام بے داغ اور اجلے پہناوے، جو ساری عمر ان کے دیے پر تعمیر کی طرح رہے تھے، جھیل اتارنے پر خود کو اس باعث مجبور پایا تھا کہ بہ چشم خود وہ داغ دیکھ سکیں جو ان کو جیسے وجود سے مسلسل جڑنے کی وجہ سے ان کے تن پر ہو سکتے تھے۔ وہ داغ تو کہیں نہ تھے، بس ایک سرسبز و شاداب بدن تھا، اجلا اور تر و تازہ، جو آئینوں کے اندر جگمگا رہا تھا اور اس کی چمک آئینہ در آئینہ عکس در عکس ہوتی چلی گئی تھی۔

یوں مکمل صورت میں، پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک، ہر پہلو سے اور نظر بھر کر ان گنت عکسوں کے بیچ وہ اپنے بدن کو پہلی بار دیکھ رہے تھے اور کچھ اس طرح دیکھ رہے تھے کہ ان کی نگاہیں مستفید ہو رہی تھیں۔ خود کو بہ امر مجبوری ٹکڑوں میں اور چند ساعتوں کے لیے دیکھنے میں وہ لطف کہاں جو آنکھ بھر دیکھنے اور دکھائی دیتے چلے جانے میں تھا۔

ملک فہیم ریاست کا عقد ثانی پڑھانے کے لیے دوسرے شہر میں انھیں اگلے روز دوپہر تک ہوٹل میں ٹھہر جانا پڑا تھا۔ یہ وہی ہوٹل تھا جس میں وہ گذشتہ شب برات کے ساتھ پہنچے تھے اور [illegible] کے ساتھ کھڑے کھڑے اپنے اندر اس مسک کو روک بیٹھے تھے جس کی وجہ سے وہ [illegible] جیسا وجود بہ قصد خود پر حرام کر بیٹھے تھے جس کا کوئی داغ ان کے بدن پر نہیں تھا۔

بس کی پڑیا

گدرائے بدن سے طمث بہنے کا تیسرا دورانیہ پڑنے تک بیگم نیلوفر فہیم نڈھال ہو چکی تھیں۔ یوں نہیں تھا کہ دکھ کے وجود میں اترنے اور بدن بیچ سے رطوبتوں کے نچڑنے کا زمانہ پہلی بار ایک ساتھ آیا تھا۔ یہ بھی ہوا کہ مسلسل گرتے حزن ہی کے پانیوں سے ان کے وجود کی مٹی گندی ہوئی تھی... مگر ان دنوں ہو یہ رہا تھا کہ چیر پھاڑ ڈالنے والے اور ادھیڑ کر رکھ دینے والے دکھ سے وہ اس طور پہلی بار دوچار ہو رہی تھی۔ ہر ماہ کے معین دنوں میں آنے اور بدن سے میل کشید کرکے [illegible] دورانیہ، جہاں تک انھیں یاد پڑتا تھا، [illegible] ہی [illegible] تھا [illegible] ان معمول کے دنوں کے بیچ مگر محض اپنے طے شدہ وقت پر گذر جاتا تھا۔ [illegible] کے بارہ مہینوں کا ایک ایک دن مخصوص تال کی سورتی کے [illegible] ایسا تھا [illegible] نہیں، [illegible] اور ان کے [illegible] چھوڑ کر گذرتا تھا جیسے [illegible] زندگی بھی ہو رہی ہو [illegible] کے حیات آور سر عجب مست کر دینے والی لے میں لہر در لہر رگوں کے اندر اتر کر ان کی جلد اور جثے کو جانے اجالنے اور نکھارے چلے جاتے ہوں۔

مگر نئے دکھ کی پہلی رطوبت بہ عجلت آئی تھی۔

اور چپ چپ پوری طرح زائل نہ ہو پائی تھی کہ شرائے بھرتے لہو کی دوسری اور تیسری [illegible] تر پڑی تھی [illegible] یقین سا ہونے لگتا تھا کہ اب کے بدن تھوتھ میں بہنے کے واسطے ایک بوند بھی نہ بچی ہو گی۔

کچھ ایسی ہی بپتا ان کی آنکھوں پر پڑی تھی۔

[illegible] آنسوؤں کی [illegible] کے پیچھے [illegible] بہت [illegible] ہی میں گذر چکی تھی۔ [illegible] دشت [illegible] کی ریت اڑتی تھی اور وہ سارا منظر نامہ جوان کے جسم کے بخت چمکنے سے اس کے [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] تورعب پر خاتے کہ یہ ایمن اور بھوپالی کے سر نہاں تھے... مگر وہ سر جب اب [illegible] سنکیرن [illegible]

اعلان کر رہا تھا جیسے زندگی کے وہ سارے سر جو لذت کے مسلسل پن سے شرابور تھے، پلک جھپکنے میں بے رس ہو گئے تھے۔

اجی جی نے بتایا تھا، سنکیرن راگنیاں انھیں کہتے ہیں جن میں تمام سر تسلسل میں استعمال ہوتے ہیں۔ انھوں نے پلٹ کر دیکھا، قریب قریب سارے ہی سر اپنی اپنی لذت ان کے بدن کے اندر اتارتے رہے تھے۔ اجی جی نے یہ بھی بتایا تھا کہ [illegible] مرراگنی میں [illegible] ہوتا ہے [illegible] گردن [illegible] میں [illegible] جانے دیا، جیسے [illegible] پہلو بدلا، ہمت کی اور بیٹھ گئیں۔ سنگھار میز کے شفاف آئینے میں ان کا بدن جھانکنے لگا جس کے بیچ سے زردی فوارہ سی ابلی پڑتی تھی۔

انھیں لگا، وادی سر تو لگ چکا تھا۔

دماغ سے ٹیک سی اٹھی اور آنکھوں کے سامنے ترمرے سے ناچ گئے۔

سوچا، تو کیا تن بس یہی کچھ ہوتا ہے، بے ہڈی کی [illegible]، چیتھڑا اور چھیچھڑا، جو پیٹ پھاڑ [illegible] چھوڑنے والے کو چمکارتا ہے [illegible] میں انڈیل کر اس کی انتڑیوں سے فضلے کی طرح خارج ہو جاتا ہے۔

بدن کی بابت جب انھوں نے یوں گمان کیا تھا تو دھیان میں اجی جی پھر [illegible] گئی تھیں۔ وہ [illegible] میں ہوتا ہے مگر بدن کو اپنے دھیان کا دان دے کر اسے تنویر [illegible] ہے کہ بدن فاضل نہیں ہوتا فضل ہو جاتا ہے، جزا فضل۔

فضل، فاضل، فضلہ اور تن، تنویر، تنور جیسے الفاظ ایک دوسرے میں معدوم ہونے لگے تو اجی جی کے دھیان نے پھر سنبھالا دیا۔ اب کے وہ اصرار کر رہی تھیں کہ طبلہ، پکھاوج، مردنگ، ڈھولک، تان پورہ، سارنگی [illegible] بھی سارے تن جیسے ہوتے ہیں۔ جس طرح [illegible] کو [illegible] اور آہنی تاروں کو [illegible] اور چوبی [illegible] رکھتی بھی [illegible] اور نکھار کی طرح تن سے پھوٹتی ہے، اس وقت تک پھوٹتی رہتی ہے جب تک یہ ساز درست ہوتا ہے۔

اس نے نظر بھر کر آئینے سے جھانکتے تن کے طناز تناؤ کو دیکھا، گھونٹوں اور [illegible]

[illegible] سمیٹ کر بازوؤں سے حلقہ بنایا... ایسے کہ پنڈلیاں اپنی پھڑکتی مچھلیوں سمیت [illegible]

[illegible]

گی... اتنی شدت سے کہ سارا مزا کرکرا ہو گیا۔

بدن میں جھپک جھپاک کی جھرجھری دوڑی تو پاؤں پھر سے لکن ہو گئے۔ اگلی ہی ساعت کو یہی لکن مطراق بنی جا چکے لمحوں کے چنچل پلو سے ٹھناک ٹھناک یوں ٹکرانے لگی تھی کہ کرکرا ہو کر راکھ ہوتے ققنس مزے کی چونچ کے سارے سوراخوں میں من بھاؤنے راگوں کی جوت جاگ اٹھی تھی۔

جو لمحے جوت بن کر جاگے، اس عرصے میں پڑتے تھے جب وہ نہ تو ملک فہیم ریاست کی بیگم ہوئی تھیں اور نہ ہی ملک صاحب سے نیلوفر کا نام پایا تھا۔ تب وہ اجی جی کی نلوہ تھیں اور انھیں کے پاس رہتی تھیں... پاس کیا دل میں رہتی تھیں۔ وہ لمحہ تو بہت بعد میں آیا تھا کہ اجی جی کا چوبارہ... اور... ان کا دل۔ دونوں ایک ساتھ دھڑ دھائیں بولنے لگے تھے... اور جب تک ایسا نہیں ہوا تھا وہ سات سروں کی ستیا سے آباد رہتا تھا۔

اجی جی کہتی تھیں، سات زمینوں اور سات آسمانوں کی طرح سر بھی سات ہی ہوتے ہیں مگر اوپر والا سا، نی کے بعد لگا دینے سے آٹھواں سر بدن میں روح کی طرح جاگ اٹھتا ہے۔ یہی آٹھ سر پلٹے میں آ کر ایک دائرہ بناتے ہیں، مکمل دائرہ ...سا، رے، گا، ما، پا، دھا، نی، سا... سا، نی، دھا، پا، ما، گا، رے، سا۔ وہ سر پلٹوں کی ادائگی میں ہارمونیم کے سینے پر پڑا اور اس کی سانسوں سے کھیلتا اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر اندر کی سمت دباتیں اور پھر ایک ادا سے اوپر اٹھا کر درمیانی انگلی سے دائرہ بناتے ہوئے ہوا میں یوں اچھال دیتیں کہ ساری کائنات اس کے محیط میں آ کر لہزنے لگتی۔ ایسے میں ان کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کی پوروں تلے سات سروں میں سے آٹھواں اور پلٹوں میں سے زندگی کی لذت پلٹ پلٹ کر یوں برآمد ہوتی کہ سارے ماحول میں اس کی مدھ مہک رچ بس جاتی۔

اجی جی کا بدن لوتھا تھا اور کندھے گول۔ پیٹھ پیچھا، گات، پیٹ اور بکھیاں چربی سے لدی ہوئی تھیں۔ قد ناٹا رہ گیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ بیٹھے بیٹھے وہیں پھیل گئی تھیں۔ بازو اور ٹانگیں تو جیسے مڈھوں پر ہی لحیم ہو گئے تھے کہ اب پارے جھولتے تھے۔ رنگ ایسا کہ تیل تو اکہیں بالکل جھواں۔ نقش یوں کہ واجبی کہنے کو جی پکا کرنا پڑے۔ ناک کا بانسہ اوپر ہی سے پھرا ہوا تھا جو چیرے ہوئے نتھنوں کو دبائے اور پھیلائے رکھتا۔ کلیجی رنگ کے بڑے نگ اور باریک تار والی منی سی نتھنی ناک کے نیزھ اور نتھنوں کے چیر کو مزید نمایاں کرتی تھی، یوں کہ دیکھنے والے کو الجھن سی ہونے لگتی تھی۔ کلونسے ہونٹوں میں سے مسلسل چبائی جانے والی گلوریوں کی پیک اور سرخ ہوتے مرکے ہوئے دانتوں کی کھلی درزوں میں سے پھنسے سپاری کے جھانکتے ریزے بھی ان کی شخصیت کا گویا حصہ تھے۔

امام پورہ کو بانٹنے اور کاٹنے والی اکلوتی سڑک کے داہنے ہاتھ رنگی بازاری تھی جس میں، کم نہ زیادہ، چوالیس دکانیں اور بائیس چوبی زینے تھے... جتنے ادھر اتنے ہی ادھر۔ دکانیں دن کو کھلتیں اور زینے رات بھر باہیں کھلی رکھتے۔ کھلی دکانوں کی بغلوں میں دن بھر اونگھتے زینے جب رات پڑتے ہی انگڑائی لے کر اٹھتے تو سیدھے ان بالکنی نما چھجوں سے اٹکھیلیاں کرنے لگتے تھے جو اس وقت تک روشنی اور رنگوں میں نہانے لگتے تھے۔ بازاری قدرے تاریک تھی۔ دکانیں بند ہو جانے کے بعد نیچے کا حصہ اور بھی بجھ سا جاتا۔ تاہم بازاری میں داخل ہوتے ہی بائیس میں سے اکیس چھجے یوں لگتے جیسے روشنی کے بقچے ہوا میں معلق ہو گئے ہوں۔ وہ چھجا جس پر الگ سے روشنی کا اہتمام نہ ہوتا تھا اجی جی کے چوبارے کا تھا جہاں انھوں نے نلوہ اور سارے سروں کو ایک ساتھ بسا رکھا تھا۔

نلوہ کو وہ آٹھواں سر کہتی تھیں۔ وہی آٹھواں سر جو اوپر سے آ کر لگتا ہے اور پہلے سروں کے پلٹے سے دائرہ سا بناتا چلا جاتا ہے۔

جوں جوں دائرہ بنتا گیا، اجی جی اپنی کائنات سمیت اس میں محیط ہوتی گئیں۔ سروں کے مدور احاطے پوری طرح رچ بس جانے والی ان کی کل کائنات تھی بھی کتنی... ماضی کے جھروکے میں سے بڑے خان صاحب شومت خان اور مائی جی پرج بائی جھانکتی تھیں۔ حال میں سر ہی سر تھے جب کہ آنے والے نامعلوم لمحے نلوہ کے بدن سے ہو کر گذرتے تھے۔

اجی جی نلوہ کو پاس بٹھا لیا کرتیں اور بڑے خان صاحب اور مائی جی کا ذکر چھیڑ دیتیں، کہتیں، دونوں حسبی نسبی گائک تھے۔ خود کو خوش قسمت بتاتیں کہ ایسے گنیوں کے ہاں جنم پایا اور تفصیل سے بتاتیں کہ مائی جی خاندان والے بارہ بنکوی تھے، سات پشتوں کے مرثیہ خواں لہٰذا اسی میراث کے سبب میراثی کہلاتے۔ اسی نسبت کا فیضان تھا کہ ان کے ننہال نے ہر کہیں احترام پایا تھا۔

اجی جی بتاتیں کہ مائی جی سوز و سلام پڑھتیں تو سب کے دلوں پر رقت طاری ہو جاتی اور ہر ایک یوں رونے لگتا کہ گھگی بندھ جاتی۔ ان کا خیال تھا کربلا کے معصوموں کا دکھ مائی جی کے اندر اتر گیا تھا لہٰذا آخری سانس تک سوز و سلام سے رشتہ جوڑے رکھا۔

جب وہ بڑے خان صاحب کا تذکرہ لاتیں تو اور بھی پرجوش ہو جایا کرتی تھیں۔ پاس دھرے اگلدان کو منہ کی سیدھ میں لا کر بیچ میں پیک پچکاری مارتیں، بیچی کلوں اندر زبان پھیر کر اکٹھا کرتیں اور اگل کر پان کی ڈبیہ کے طرف متوجہ ہو جاتیں، مہوا پان کو اس کے کرارے پن کے ساتھ شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کی چٹکی سے اٹھا، ہونٹوں میں دباتیں جو اسے منہ بیچ لڑھکا دیتے۔ جب بات آگے بڑھانے کو تیار ہو جاتیں تو ابھری گات اور اچھال کر فخر سے بتایا کرتیں کہ ان کے خاندان میں ایک سے ایک بڑھ کر گنی تھا۔ تاہم جو نرتجن فن بڑے خان صاحب کے بخت کا ستارہ بنا، سب اس پر رشک کرتے تھے۔ سر کے سچے، تال کے پکے اور بول کے میٹھے تھے۔ بڑھتے ہوئے ریاض اور فن کے ساتھ سچی لگن نے انھیں سر سمندر کا شناور بنا دیا تھا۔ اتنا کہ ادھر تان بجتی ادھر راگ، راگنی بوجھ لیا کرتے کہ اوڈھو، کھڈو ہے یا سمپورن۔ گیان گمبھیر گہرا۔ دھیان میلان پختہ۔ استھائی، انترہ، آروہی، اوروہی پچی تلی۔ راگ، راگنیاں، دادرے، ٹھمریاں، گیت، غزلیں غرض جو سناتے جاتے رچاؤ سے اور لگتا کہ وہ خود نہیں گاتے تھے ان کے رسال گلے سے بھگوان گاتا تھا۔

نلوہ کو اجی جی کی ان باتوں سے کوئی رغبت نہ تھی۔ بعض اوقات تو انھیں بار بار ایک ہی تذکرہ سن کر کوفت ہونے لگتی تھی مگر جب ذرا سیانی ہو گئیں تو چہرے کی

ناگواری دبا لینے اور ظاہر نہ ہونے دینے پر قادر ہو گئیں کہ وہ میٹھا حزن جس کے پانیوں سے ان کے بدن کی مٹی گندھی ہوئی تھی اب سیدھا ان کے دل پر ایک سوال کی دھار کی صورت پڑتا تھا کہ اگر کسی بھی مرد نے اچی جی کے بدن کو نہیں چھوا تھا اور ان کے گربھ استان کے مقدر میں تخلیق کی لعبت لذت سے مانوس رہنا ہی لکھا تھا تو وہ ان کی ماں جیسی کیسے ہو گئیں؟

ماں بے شک نہ تھیں، ہو بہو ماں جیسی تو تھیں، مگر کیسے ہوئیں؟... یہ وہ خود نہ جانتی تھیں۔ تاہم ان کا خیال تھا کہ ان کا دل عین بعین مائی جی کے دل جیسا تھا، سوز و گداز میں ڈوبا ہوا... اور یہ گداز تب ان کے اندر اترنا شروع ہوا تھا جب مائی جی سوز خوانی کرتے کرتے مر گئی تھیں۔ ان کے چل بسنے کے بعد، گھر کی چھت پر دست پاک اور سیاہ جھنڈا بندھا تھا، نہ کشت کی صحنک بھری تھی۔ ذوالجناح کے گذرنے پر عین دروازے کے باہر سبیل کا سجاؤ ہوا تھا، نہ علم پاک اور تعزیہ نکالا گیا تھا۔ خاص اہتمام سے ڈیوڑھی میں چاندنیاں بچھانا ترت موقوف ہو گئی تھیں اور مجالس عزا برپا کرنے کی طرف کسی کا دھیان بھی نہ گیا تھا... مگر پھر بھی یوں لگتا کہ مائی جی اس گھر میں تھیں، ہر کہیں تھیں اور رلائے دیتی تھیں۔ ایسا کہتے ہوئے اچی جی کی آواز تھرا جاتی، حلق میں کوا پھنسنے لگتا اور آنسو اڈ کر چہرے کی سخت کھردری اور سیاہ جلد پر سے لڑھکنے لگتے تھے تاہم بڑے خان صاحب کے ذکر پر وہ پوری طرح سنبھلی رہتیں اور بتاتیں کہ طبلے پکھاوج کی سنگت کے بغیر گانا ان کے نزدیک عیب تھا، کہا کرتے تھے کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو، بگڑا گویا مرثیہ خواں،... اور شاید یہی وجہ تھی کہ مائی جی کے مرنے کے بعد مرثیہ خوانی کی بساط پھر نہ بچھی تھی۔

جب اچی جی یہاں تک پہنچتیں تو نکوہ اپنی تمام حسیات کو سماعت بنا لیتیں اور اس لمحے کا تذکرہ سننے کو سراپا منتظر ہو جاتیں جب وہ ان کی زندگی کا حصہ بنی تھیں۔

مگر خود اچی جی کو ان لمحات کے تذکرے میں مزہ آتا تھا جب سر ان کی زندگی میں داخل ہوئے تھے۔ وہ مزے لے لے کر بتاتیں کہ سوگ چالیسوں گذر جانے کے بعد جب گھر میں سونا پا سیندھ لگا کر بیٹھ گیا تھا تو وہ مسلسل ڈیوڑھی میں بڑے خان صاحب کے گھٹنے سے لگ گئی تھیں۔ مرثیہ خوانی کے سبب گلا تو پہلے ہی سے اٹھا ہوا، پکا ہوا اور رواں تھا لہٰذا بہت جلد راگ راگنیاں نک سک سے درست ادا کرنے کے قابل ہو گئیں حتیٰ کہ فن کے سمندروں کا وہ سارا پانی جو بڑے خان صاحب کے سینے میں بہتا تھا ان کے اندر بھی بہنے لگا تھا... مگر اچی جی کا اپنا خیال یہ تھا کہ ابھی تک وہ اس فن کی گہرائی کو نہ پا سکی تھیں۔ انھیں اپنے تذکرے میں تعلّی قطعاً پسند نہ تھی، لہٰذا وقت گذارنے کے سنکے تیزی سے چھوتی آگے بڑھے چلی جاتیں یہاں تک کہ اناچیتی میں وہ ان لمحوں کو انگیخت دینے لگتیں جو نکوہ کے دل پر دھار بن کر گرتے تھے، یوں کہ اس ٹیس پر وہ کچھ ایسے زور سے دھڑکتا تھا کہ سینے کے اندر کی اتھل پتھل باہر گرنے لگتی اور انگیا کی چڑیا تک اڑ جاتی تھی۔

گذرے ہوئے لمحوں کو یاد کر کے نکوہ کے سینے کی اتھل پتھل اب بھی باہر گر رہی تھی مگر طمث کے زور کا تیسرا مہینہ چترا بنے ان کا ملائم ماس بے دردی سے کاٹ رہا تھا، لہٰذا یوں ہی سوچے چلے جانا ممکن نہ ہو پا رہا تھا۔ لہٰذا یوں ہی سوچے چلے جانا ممکن نہ ہو پا رہا تھا۔ انھوں نے خیال غبار سے نکال کر آئینے میں جھانکا، انھیں لگا، بدن کی زردی خلیوں کے بیچ میں واپس گم ہو رہی تھی... اور... یقین کے ساتھ سوچا کہ ایسا اس لیے ممکن ہو پایا تھا کہ انھوں نے اچی جی کے دھیان میں تن من کو رچ جانے دیا تھا۔

یوں ہی کمر جنتہ کیے بیٹھے رہنے سے ریڑھ کی ہڈی کودچی کی دشمن ہونے لگی تھی۔ پوری طرح ہتھیلیاں کھول کر پہلوؤں کے ادھر ادھر بستر پر جمائی، پشت کو سیدھا کر کے نچلے دھڑ کو جھٹکا دیا اور کنکل کمان کو آگے کھسکایا۔ لیکن ننگے پاؤں فرش پر بچھے قالین کے ریشوں کو چھونے لگے تو تلوؤں پر یوں لگا جیسے چیونٹیاں سی رینگنے لگی ہوں۔ قدموں پر بدن کا بوجھ بڑھایا تو معلوم ہوا کہ وہ سن ہو چکے تھے، یوں جیسے کئی ماہ سے ان کے اعصاب میں موجزن وہ جھنک سن چلی آتی تھی جس میں اچی جی اپنی یادوں سمیت بسا کرتی تھیں۔

ان کی جس ڈھب سے پال پوس کر اٹھان اسار ہوئی تھی اس میں گذرے وقت کے اڑیل گھوڑے کی باگ ہنگ کو یادداشت کی ہتھیلی سے یوں سرک کھسک جانے دینے کی گنجائش تو نہ نکلتی تھی مگر وہ جو کہتے ہیں کہ تن سنگل ہو سیت سوں اور من سنگل ہو میت سوں، تو ان کے ساتھ یہ ہوا تھا کہ راجہ گھر آئی جھٹ رانی کہلائی، نکوہ نام پر لکیر پھری، بیگم نیلوفر فہیم کے نام کا ٹھپہ لگا اور ساتھ میں عجب ٹھسہ بھی لایا۔ کھنڈ جیسے چوبارے سے اتنے وسیع و عریض بنگلے میں اترنے پر پہلے تو اس کی وسعت ہی ان پر چڑھ دوڑی تھی۔ پھر بنگلے کی سج دھج ایسی کہ ہولائے دیتی تھی اور ہولائے دیتی تھی کہ کہیں یہ سب کچھ خواب تو نہیں۔ بار بار اپنے آپ کو چٹکیاں بھرتی تھیں، خود کو یقین دلاتی تھیں اور اپنی قسمت پر ناز کرتی تھیں۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ شب زفاف ملک صاحب نے وعدہ لے لیا ماضی کو بھول جاؤ... سونے کی تیز دھار کٹاری جوان کے ہاتھ لگی تھی کچھ ایسے کوندے چھوڑتی تھیں جو سیدھے دل پر پڑے تھے لہٰذا یادداشت کی نرم کج پر جھٹ رکھ دی، جو کچر کچر کرتی پہلے ہی ملبے میں پرے جا پڑی تھی۔

کچھ ایسا ہی پیمان اچی جی نے عین رخصت سے اپنی بھیگی آنکھوں اور گیلے ہونٹوں کے اصرار سے لینا چاہا تھا تو ان کا دل بے طرح بھر آیا تھا، اور پر کناروں تک... اور کہا تھا، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟... پھر جب دہلیز سے پاؤں باہر دھرتے سمے اچی جی کا بدن کٹے شجر کی طرح چٹاخ زمین پر آن پڑا تھا تو وہ پلٹ کر اس سے لپٹ گئی تھیں۔ دھک دھکی میں دم ہو گا کہ پلٹ لپٹ کے عرصے میں ہی نکل گیا تھا... مگر وہ یوں بھلک بھنک روئے جاتی تھیں جیسے بے دم وجود کے قدموں میں وہ خود بھی بے دم ہو جائیں گی، ساتھ ساتھ تکرار کیے جاتی تھیں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے... کیسے ہو سکتا ہے؟

مگر جو نہیں ہو سکتا تھا وہ ہو گیا تھا۔

اور جو نہیں ہونا چاہیے تھا، وہ بھی ہو رہا تھا۔

انھیں لگا جیسے وصل سمے کا وعدہ اور رخصت سمے کا اصرار چھل بٹا تھا، میٹھا فریب اور اپنے آپ سے دھوکا۔ ورنہ یہ تو وہ تانت ہے جو ٹوٹنے کے واسطے ہی تنی

ہے۔ ہونا اور نہ ہونا کسی کے بس میں ہوتا ہی کب ہے، ایسے ہی جیسے کچھ لمحے تک وہ خود اپنے بس وس میں نہ تھیں اور بدن پھوگ فضلہ بنا تعفن چھوڑتا تھا۔ جب کہ اب یہ عالم تھا کہ طمث طیف سے نکلتی روشنیوں، رنگوں اور مہک نے عکس در عکس انھیں زنجیر کر رکھا تھا... اور جب انھوں نے انگلیوں بیچ انگلیاں پھنسا کر ان میں سوئی پڑی جنج کو سر کے اوپر اچھالنے کو بازو اٹھائے تھے تو پاؤں کے تلووں تک کی سن بھی بدن زنجیر کی ہر کڑی کے ساتھ چھنک چھوں بول اٹھی تھی۔

اس چھنک چھوں کی لپک ایسی تھی کہ ساری کی ساری نظر چوکنے میں نہ آتی تھی۔ وہ پورے قد کے ساتھ ستواں کھڑی تھیں۔ اوپر اٹھے خوابیدہ جنج کو جگاتے اور اچھالتے بازو کہنیوں سے غائب ہو گئے تھے۔ تن کا طلسم کشا کرتے آئینے کے حاشیے میں نچلی لر میں گھٹنوں، تلے سے بھی وہ گم ہو گئی تھیں۔ اس کے باوصف جتنی وہ نظر آتی تھیں اس پر نظر پار اٹھہرتا نہ تھا۔ حتیٰ کہ اس کے سلک تن کے کھلتے تھان سے پھسلتی کٹوراسی آنکھیں سمور بنی بغلوں میں الجھ گئیں۔ نرم، ریشم رواں جیسے بالوں نے اپنی کنڈلیاں پوری طرح بنا سنوار لی تھیں۔ یہ غالباً پہلی بار اس قدر بڑھے تھے کہ بل دار ہو گئے تھے یا پھر شاید پہلی بار یوں ہوا تھا کہ وہ ایک ہی وقت میں مخمور بھی کرتے تھے اور الجھن میں بھی ڈالتے تھے۔ اسی جھونج مخمصے کی فضا میں اوپر اٹھے بازو ڈول کر تیزی سے نیچے آئے تھے اور دائیں کی ہتھیلی بائیں اور بائیں کی ہتھیلی دائیں بغل کی کنڈ میں دب کر نرم نرم گچھوں کو یوں سہلانے لگی تھی جیسے ان کا ہر ریشہ اپنے کنڈل میں منہ موڑے سہمے چھپے رہنے سے دکھنے لگا ہو۔

ہتھیلیوں کے پیالوں نے دھن کا سارا پانی بھر لیا تو انگلیوں کی پوروں کی پیاس جاگ اٹھی تھی۔ ابھی وہ پوری طرح سیراب نہ ہو پائی تھیں کہ اجی جی پھر سے یاد آ گئیں۔ اجی جی کو یوں اپنی مرضی اور سہولت سے یاد کرنا، وقفے دے دے کر، زندگی کی لگی بندھی ترتیب سے نہیں، کبھی ادھر سے کبھی ادھر سے، انھیں اچھا لگ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک وہ ان کے بے دم وجود پر رو دھو، سنبھل چکی تھیں... جب کہ اب جو یاد کیا تو یوں لگا، جیسے زندگی کی سانسوں کی طرح، پورے ماحول میں ہمکنے کو یوں چلی آتی تھیں جیسے اجی جی نہ ہوں بارہ کے بارہ کومل اور شدھ سروں والی بھیرویں راگنی کی ٹھمری ہوں جو سر، شرتیوں اور حرکتوں کی نازک ادائیگیوں کے لئے نوری گلا مانگتی ہے۔

جامیں تو سے ناہیں بولوں، بولوں گی لنگروا

انھیں یوں لگا جیسے اجی جی بچ مچ کمرے میں آ گئی تھیں، اپنی مہک کے ساتھ، اپنی سانسوں کے زیر و بم کے ساتھ، اپنے بھری بھر کم وجود کے ساتھ... اور ...اپنے نوری گلے کے ساتھ۔

اپنی گرج کو ڈھیٹ لنگروا، جامیں تو سے ناہیں

اپنی گرج سجنک کے رسیا تن میں جب سارے شدھ اور کومل سر ٹھٹھک کر ٹھہر گئے، سوائے دھیان دھیوت کے، جو جھینپ بن کر رگ رگ میں دوڑنے لگا تھا تو لمس کی لنگر وا قفلی کھٹاک سے کھل گئی تھی۔

وہ دراز کھولے چیزوں کو الٹنے پلٹنے لگیں۔ اعلیٰ درجے کا فوری اثر والا سفوف بھی دسترس میں تھا اور بڑھیا نسل کی لمحوں میں بال گالنے اور صفاچٹ کرنے والی ملہم بھی... مگر انھیں گندہ بیروزہ چاہئے تھا کہ بالوں کے اوپر لیپ کر انتظار میں بیٹھے رہنے سے انھیں بھلا یہ لگتا تھا کہ چٹکی میں اس کی لیس بھر لیں اور تھوڑے تھوڑے بالوں کی گچھیاں بنا کر اس میں چپکائیں اور جڑ سے اکھاڑتی چلی جائیں۔ ان کا خیال تھا انتظار کا روگ سفوف اور ملہم کی ناگوار بو کو ناقابل برداشت بنا دیتا ہے جب کہ چٹکی کی چپک کی مدد سے بالوں سے آنکھ مچولی گندے بیروزے کی مہک کو سانسوں میں بسا دیتی ہے۔

جب پانی کی نیم گرم پھوار میں تا دیر کھڑے رہ کر نیچے بالوں تلے کا ماس مساس کیا تھا یا پھر ایڑیوں کی چپک چکٹ کو کھر سیلے سے رگڑا تھا، صابن مل مل کر جھاگ بنایا تھا یا تن تولئے میں دبا دبا کر صاف کیا تھا۔ انگیا کی کٹوریاں گداز سے پوری طرح بھر دی تھیں یا اس کی ڈوریاں کس کس کر باندھی تھیں۔ چولی چڑھائی تھی یا ساڑی کو پوشاک کیا تھا۔ بال سنوارے تھے یا مسی کاجل کیا تھا۔ ہر ہر مرحلے پر انھیں یوں لگا تھا جیسے ساڑھ ستی کا اثر ان کے بدن پر سے ٹلے جاتا تھا اور جب زحل کا عمل پوری طرح گذر چکا تھا تو وہ اجلی ہو کر یوں قیامت ڈھاتی تھیں کہ آئینہ چٹختا تھا۔

خود سنبھل سنور گئیں تو خواب گاہ کا بکھراؤ کھلنے لگا تھا۔ گذشتہ تین ماہ سے بھی زائد عرصے میں انھوں نے اپنی خدمت پر مامور فضیلت جان کو زیادہ دیر اندر ٹھہرنے نہ دیا تھا کہ وہ اسے ڈھنگ سے درست کر دیتی۔ یوں ہی چت پڑے رہنا، گم صم، خوابوں اور خیالوں کے طویل وقفوں میں، بولے گئے اور بولے جانے کے منتظر لفظوں کے بیچ خلا جیسی وسعت میں، انھیں اچھا لگتا رہا تھا.. مگر اب نہیں ..اور وہ چاہتی تھیں کہ سب کچھ جھٹ سے ایک خاص ترتیب پا جائے، یوں جیسے وہ خود منظم ہو چکی تھیں۔

انھوں نے دروازے کی سمت دیکھا، فضیلت جان کے فوری آنے کے امکان کو وہاں خاموشی کی مکڑی کے جالے نے خود میں الجھا رکھا تھا۔ اپنے بستر پر پڑی اس نازک سی گھنٹی کی سمت نگاہ کی جس کی منی سی لٹکن چنچل پلو کو چھو کر پوری طرح ٹن نہ کر پاتی تھی کہ فضیلت یوں دوڑے آتی تھی جیسے وہ کان لگائے رکھنے، گھنٹی کی آواز سننے اور دوڑ کر پہنچ جانے کے واسطے ہی ملک صاحب نے مامور کی تھی۔ مگر دوسرے ہی لمحے گھنٹی کو اٹھاہاتھ روک لیا کہ بستر کے بکھراؤ سے زیادہ اس کے کچے ذائقے والی بکھیل امس ان کے دل کو کچپانے لگی تھی۔ کمر سیدھی کی، پلٹیں، دروازے کی سمت بڑھیں اور خواب گاہ سے باہر نکل گئیں۔

جب وہ شہ نشیں سے ہوتی، بچے تلے قدم اٹھاتے خم و چم سے نشست گاہ میں پہنچتیں تب کہیں جا کر فضیلت جان کی نظر ان پر پڑتی تھی۔ وہ پہلے تو ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم انھیں دیکھے جاتی تھیں اور پھر اسے ایسا لگا تھا کہ جیسے مدت مدید سے کسارتا سارا بنگلہ انگڑائی لے کر پوری طرح یوں جاگ اٹھا تھا کہ سارے میں کھنڈتا اجالا کھنکنے لگا تھا۔

گذرے وقتوں میں جب کبھی وہ اس طرح تراش خراش نکالے اجی جی کے سامنے آتی تھیں تو بھی ماحول مہک لہک اٹھا کرتا تھا اور اجی جی امڑتی خوشبو سے

یوں بشاش ہو جاتیں کہ دھیان ادھر ادھر ہو جاتا، سارے رواں سر بھٹکنے لگتے تھے۔ کانہڑے کا دھیوت کومل نہ رہتا شدھ ہو جاتا جس سے راگنی اپنی جون بدل کر شاہانہ ہو جاتی، گوجری ٹوڈی میں پنچم بے درنگ لگنے لگتا، گونڈ سارنگ کی آروہ میں نکھاد برجت سے وکر ہو جاتا یا پھر سمجھ ہی نہ آتا تھا کہ اجی جی جو راگنی چھیڑے ہوئے ہیں وہ شدھ سارنگ ہے،، بندرابنی سارنگ ہے یا شاہ کلیان۔ حتیٰ کہ سارے ساز چپ ہو جاتے، وہ بلائیں لینے کو دونوں ہاتھ کنپٹوں کے قریب لا کر ہتھیلیوں کو کلائی کے محور پر گھماتی اور ان کی سمت اچھال کر یہ بول گنگنائے چلی جاتیں:

تم ہی تارن جگ نستارن تم بن کون کھویا

نلوہ کے لئے اجی جی کی آنکھوں میں سدا تشکر کی لہر بہہ رہی کہ وہ اپنے بدن کو پاتال جنتر اور ان کے تن رخشندہ کو اپنی روح کے لئے کشتۂ کندن جانتی تھیں ...مگر تب ان کی آنکھیں خدا کا قہر برسانے لگتیں جب رنگی بازاری کے بائیس میں سے اکیس روشن بتیوں کی سوختنوں میں سے کوئی سر سودھن کے لئے متعین اوقات میں ان کے چوبارے بن سنور کر آ جاتی تھی۔ اپنے فن فاخرہ کو لٹانے کے لئے ہر وقت طبیعت کو طبلۂ عطار بنائے رکھنے والی اجی جی جب بھڑک اٹھتی تھیں تو زبان کا ٹانکا ٹوٹ جاتا تھا۔ سارے سر سبق بھول بھال جاتیں حتیٰ کہ سامنے مؤدب گٹھی سہی دوزانو بیٹھنے والیاں بھی آنکھ اوجھل ہو جاتیں اور ہر ایک کی بائی کو بے نقط سنائے چلی جاتیں۔ نوشابہ بائی ان کی نظر میں اختی گھوڑی تھی اور ستارہ خام پارہ، شاداں بائی اچھال چھکا تھی اور جوہی کسبن، کوئی حرافہ خایہ بوس تھی تو کوئی بڑھیل کواپری اور کوئی نائکہ جھل بجھانی نٹے سیلانی، جو اپنے اپنے کان چھدوانے اور اپنے اپنے کھٹنے میں کمی ڈلوانے کی حرص میں بے چاریوں کی ہر آڑ توڑنے کو بھیڑوں کی طرح ریلنے رولنے میں لگی ہوئی تھیں۔

اجی جی جب خوب جھال پھین جھاڑ چکتیں تو اپنے چربیلے پیٹ میں انگلی چبھو کر کہتیں، یہ سارا دھندا تختۂ بلور کا ہے پگلیو، مگر تم کیا جانو .. پھر ہتھیلی پوری طرح کھول کر اپنی تھلتھلاتی گات پر مارتیں، ایسے کہ تھاپ پڑنے کی گونج سارے میں سنسنانے لگتی تھی۔ اسی اثنا میں ان کی آنکھیں جل تھل ہو چکی ہوتیں اور ہونٹ سرگوشیاں انڈیلنے لگتے، بھاڑ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ یہاں تک کہ نیام چشم سکیٹرنے کو جی چاہنے لگتا۔ آنکھیں مچنے سے سارے آنسو دودھار میں گالوں کو نابدار بنا کر بہہ جاتے۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کے اندر موجزن سارا غصہ بھی کسی نابدان کی راہ لیتا تھا۔

پھر جو آنکھیں کھولتیں تو بالکل مختلف اجی جی ہوتیں ...وہی ... جو حقیقت میں وہ تھیں، شفیق، سبتل، متین، شستہ اور شائستہ۔ پہلے تو وہ ان سب کو جو سہمی بیٹھی ہوتیں چھدے مدے کہہ کر پیار کرتیں اور وضاحت کرتیں: "اڑیو مجھے تم سے کوئی بیر نہیں ہے کہ تم خود جلے بخت کے پھیرے میں ہو"۔ پھر نلوہ کے سر پر ہاتھ رکھتیں اور بتاتیں کہ: "ان کا مقدر بھی تمھارے بخت سے مختلف نہ ہوتا اگر یہ ان بے خصمی چیچڑیوں کے ہاتھ لگ جاتیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ بڑے خان صاحب نے انھیں میری گود میں ڈال دیا۔"

بڑے خان صاحب کے تذکرے کو وہ جان بوجھ کر طول دیا کرتی تھیں۔ موقع بہ موقع تفصیل سے بتاتیں کہ کیسے انھوں نے زندگی کی ملک ن کے تن میں بھر دی تھی، کس طرح پال پوس کر جوان کیا اور سر سنگھار سے آراستہ کیا تھا اور کیسے وہ ان کی ڈھلتی عمر پر کڑھا کرتے تھے۔ پھر وہ اس وقت کا قصہ لے بیٹھتیں جب گلی گلی سے فساد پھوٹ بہا تھا۔ لاشیں گرنے لگی تھیں اور موسیقی بھی فرقوں میں بٹ گئی تھی حتیٰ کہ ایسی لکیر پڑی تھی کہ سب کچھ تقسیم ہو گیا تھا۔ اس طرف سے ادھر آنے کا ماجرا مہاجر کیمپ میں مقیم ہونے تک لا چکتیں تو یوں ہونکنے لگتیں جیسے یہ ساری کلفت انھوں نے ابھی ابھی اٹھائی تھی۔

جب سانس برابر کر چکتیں تو یہ کہنے کے لئے حیرت کو پوری طرح چہرے پر پھیل جانے دیتیں کہ ایک کنواری، ڈھلتی عمر کی عورت کی گود میں ممتا کہاں ہوتی ہے ...مگر جانے ان کا وہ کون سا عمل تھا جو اوپر والے کو پسند آ گیا تھا اور بڑے خان صاحب اور مائی جی کے صدقے ان کی گود ممتا کے نور سے بھر دی تھی۔ پھر اپنے گرد جواں جسموں اور چمکتی جلد والی کنواریوں پر پھسلتی نگاہ ڈال کر بات آگے بڑھاتیں کہ، ایک ادھیڑ عمر عورت، جسے اپنے بے ڈھبے بدن کی رائیگانی کا روگ اندر ہی اندر سے دیمک کی طرح چاٹے جاتا ہو اور جسے حتمی یقین ہو چکا ہو کہ اس کا جسم کسی مرد کے لمس کے واسطے ہرگز ہرگز نہیں بنایا گیا تھا، اس کی گود میں ممتا جیسے لطیف جذبے کی تلاش، چیل کے گھونسلے میں ماس کی تلاش کے مترادف تھی۔ مگر بڑے خان صاحب باکمال گنی تھے، ٹوٹے ساز کی تاروں سے بھی ٹھیک ٹھیک سر نکال لانے پر پورا پورا ملکہ رکھتے تھے۔ انھیں یقین تھا، وہ ان کے بدن سے بھی زندگی کے سر نکال لائیں گے۔ مگر ان کا بس نہ چل رہا تھا، موقع ہاتھ نہ آتا تھا لہٰذا سب کچھ دیکھتے تھے، کڑھتے تھے اور اندر کی کڑھن پر قابو پانے کو گنگناتے رہتے تھے۔ روٹھی رت نہ مانی، عمر بیتی جائے، حتیٰ کہ ایک ننھی سی بچی کی آیا اسے اکیلا روتا چھوڑ کر کیمپ ہی میں مر گئی۔ یوں کہ جیسے وہ ادھر سے اس طرف اس بچی کو پہنچانے اور مر جانے کے واسطے ہی لمبی مسافت طے کر کے آئی تھی۔ بڑے خان صاحب کو تو جیسے موقع ہاتھ لگا تھا... وہی جس کی وہ تاہنگ تاک میں تھے، پھول جیسی بچی کو اٹھایا، اس کے چمکتے گالوں پر باری باری بوسے دیئے اور اپنی بیٹی کی بوڑھی گود میں ڈال دیا۔ اجی جی بتایا کرتی تھیں کہ بچی گود میں کیا آئی ممتا کے سارے سر ان کے اندر سے پھوٹ بہے تھے، اس طرح کہ وہ خود بھی نہال ہو گئی تھیں۔

اگرچہ اجی جی نے یہ بھی بتایا تھا کہ مرنے والی، بچی کے ساتھ اپنے رشتے کی وضاحت کئے بنا دم توڑ گئی تھی مگر نلوہ کے من میں ایک پھانس تھی، سو وہ کرید کرید کر ہاک نقشہ پوچھتی، ایک تصور جماتی اور اس تصور کے آئینے میں خود کو دیکھتی۔ وہ کریدے چلے جاتیں تا آنکہ اجی جی زچ ہو کر کہہ اٹھتیں .. "بھلا اس کل مکھی کا میری نلوہ سے کیا رشتہ ہو سکتا تھا، حد سے حد یہی نہ جو ہم دونوں کے بیچ ہے... م... مگر ایسا بھی کہاں. . جو ہم دونوں کے بیچ ہے ویسا تو کہیں ہو ہی نہیں سکتا۔" نلوہ اس جواب پر مطمئن تو نہ ہوتیں مگر کچھ نہ کچھ کہہ سکتی تھیں کہ کنی دب جاتی تھی۔

اس کے بعد کے قصے میں اجی جی کا اپنا بدن راگ دیپک کی طرح

متروک ہو جاتا ہے کہ جس آگ نے بھڑکنا تھا بھڑک چکی تھی اور جس چراغ کو جلنا تھا، روشن ہو چکا تھا۔ یہی اجی جی کی زندگی تھی اور یہی ان کی زندگی کا قصہ تھا جسے وہ دہرایا کرتیں اور لطف اندوز ہوا کرتیں۔ ۔اور جسے سن کر روشن تیچیوں والیاں اس لئے مجبور تھیں کہ ہر ایک کی بائی کو ان کے جواں بدنوں کے لئے کچے پکے سروں کا تانا بانا چاہئے تھا۔ جب کہ اجی جی تو سر کا سمندر تھیں...جو بھی، چاہے کچھ لمحوں کے لئے ہی سہی، ان کی صحبت میں آتا تھا، بھیگ بھیگ جاتا تھا۔

جس روز اسی سر سمندر اور انھیں محبتوں کی بارشوں سے بھیگا بدن پورے قد کے ساتھ نشست گاہ کے وسط میں ایستادہ ہو گیا تھا اور سارا جھنجھنا بنگلہ جھجھا اٹھا تھا اسی روز دوسرے شہر میں مولانا سراج الدین سحور ملالوی، ملک فہیم ریاست کا عقد ثانی پڑھا رہے تھے۔ خادمہ فضیلت جان حیرت سے مالکہ کو دیکھے جاتی تھی۔

جب ان کا تن باسی تو اسی بستر پر بے سدھ پڑا تھا تب بھی کچھ کم قیامت نہ ڈھاتا تھا مگر اب جو آئینہ تاب نہ لاتا تھا تو اس لئے کہ آب قطروں سے دھل کر وہ غضب کا آبدار ہو گیا تھا یوں کہ بناری ساڑھی کے بل بل سے بدن چھنا باہر جھلکتا تھا۔

فضیلت جان کو سجھ نہ آ رہا تھا کہ عین اس روز کہ جب ملک صاحب ان کی سوکن لانے کا بندوبست کر رہے تھے وہ یوں بن سنور کر باہر کیوں نکل آئی تھیں... اور۔ ۔اگر یوں ہی بجنا سنورنا تھا تو وہ کیا تھا جو تین ماہ سے بھی زائد خواب گاہ میں مقید رہ کر اور بستر سے لگ کر گذار دیئے تھے...وہ سوچتی رہی اور الجھتی رہی...الجھتی رہی اور سوچتی رہی یہاں تک کہ اس نتیجے پر پہنچی، آخر کو یہ عورت ہے تو کم ذات کوٹھے والی رنڈی نہ، اپنی اصل کی طرف تو اسے لوٹنا ہی تھا۔

ثانیئے کی سمٹن

لیٹی لپٹائی نیلوفر نظریں جھکائے مولانا ملالوی کے سامنے دوزانو بیٹھی ہوئی تھیں، سراپا سوال بنے، یوں کہ پنکھڑی سے ہونٹوں کی جنبش میں سر بیکراں کی دبازت تھی۔

دھیرے سے کچھ کہا تھا...ایسے کہ قلب جاں کے پاتال میں غوطم چارہ ہوا تھا...مگر سنا کس نے تھا؟...دھیان کی کائی زدہ چٹان سے لفظوں کے نرم پاؤں رپٹ گئے تھے اور جو بازگشت سماعت کے کابک میں آ بیٹھی تھی اس کے اجلے پروں کی پاستانی پھڑپھڑاہٹ اور جنگلی پنچھیوں کی جھن جھنکار سارے میں تھرائے جاتی تھی۔

مولانا ایک لمحے کے کئی ہزارویں حصے میں جہاں تھے، وہاں نہیں تھے... اور جہاں وہ تھے وہاں چاروں اور نور سا گھل رہا تھا۔ اس نور دھارے میں جو کچھ تھا وہ اگرچہ پوری طرح مستور تھا، نہ بالکل عیاں، تاہم مانوس ہونٹوں کی دلگداز لرزش صاف دکھتی تھی اور چشم ماضی کی کھڈی پر چڑھتے وہ لمحے بھی، جو ریشہ ریشہ اس لمعاتی لبادے کا تانا بانا بن رہے تھے جو ان کی شخصیت کا ستر تھا۔

کسی کو یوں دیکھنا، چاہے ایک خرد لمحے ہی میں سہی، ان کی تربیت کا حصہ نہ تھا کہ پلید دنیا اور اس کی ساری آلائشیں ان کے لئے خارش زدہ کتے کے مصداق تھیں۔ انھیں بتایا گیا کہ لذت نگاہ بھی ایسی ہی آلائش کی فرع ہے۔ انھیں سارے اسباق ازبر تھے، دانش کی تسبیح کے سارے موتی ان کی پوروں کے لمس پر رچے تھے، حکمت کے سارے ستارے ذہن کے فلک پر چمک رہے تھے...مگر وہ جو کہتے ہیں کہ **اذا کان معک لا بنالی بالنجوم**، تو ان کے ساتھ ہوا یہ تھا کہ انھیں ہر ایک نجم الثاقب کی روشن قلعی تب اچٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھی جب صرف ایک مہتاب کی ساری چاندنی نے ان کے چشم احاطے کو محیط کر لیا تھا...

یوں کہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا،
اور یوں کہ وہاں سب کچھ تھا۔

مزید تقسیم ہونے کی سکت نہ رکھنے والے اس خرد لمحے کے دریدہ دامن سے ابھی ابھی وہ سب کچھ معدوم ہو گیا تھا جو مانوس اور مہربان ہونٹوں کی جنبش سے لے کر نامانوس جواں ہونٹوں کی لرزش تک کی فترت میں پڑتا تھا۔ تاہم اس تارتار دامن کے غلول میں جو کچھ تھا وہی یوں سب کچھ کہا جا سکتا تھا کہ وہ ادراک کی وسعتوں میں نہ سماتا تھا...اور سارا بدن بھی اسی کی زد پر تھا۔

وہ بدن جو زد پر تھا، اس کا خلیہ خلیہ بصارت بن گیا تھا، نہیں وہ تو سماعت بھی تھا اور شاید شامہ، ذائقہ اور لامسہ بھی، کہ وقت کی اس ننھی اکائی میں سارے حواس ایک ہی نقطے پر مرکوز ہو گئے تھے۔ اس کلی ارتکاز کے مقابل رس بھرے ہونٹ قاشوں کے علاوہ ستواں ناک کی مہین پھنگی پر خدنگ کی انی کا سا ستارہ تھا، جو بہکاتا تھا اور نئی راہ بھی سجھاتا تھا۔ تنی ہوئی اجلی جلد تھی کہ جو تصور کے چھو لینے پر رسنے کو تھی اور اسی پوست کی وہ خاص رنگت تھی جو نہ تو نری شفق پھوار تھی اور نہ ہی صرف دودھ کی دھار۔ انھیں یوں گمان ہوا تھا جیسے شہاب ثاقب جب پہلی بار نوٹا ہو گا تو اس کے کوندوں کی کشاکش عین اسی کافر اندام کے لئے مخفوظ مرمریں مٹی پر جھکے تخلیق کے کسمسہ ہی پر ہوئی ہو گی کہ ایک ایک شاخ نہال اپنے آخری قطرے تک نچڑے جاتی تھی اور ہر ہر قطرہ صدیوں کی مسافت طے کرتا رخساروں تک، لبوں تک، گردن اور پیشانی تک حتیٰ کہ کانوں کی کچیا تک اور شاید اس بدن تک بھی جو پوری طرح لپٹا ہوا تھا، بس اس قدر پہنچ پا رہا تھا کہ شہابی رنگ کا دلآویز شائبہ سا گھول دیتا تھا۔

خرد لمحے کے تلذذ و تملق کا ٹھہراؤ سہو نظر اور قصد نظر کا تفاوت مٹائے دیتا تھا مگر حرمت و حلت کی تمیز کیسے مٹ پاتی کہ یہ ان کی مٹی میں گُندھی تھی۔ لہٰذا نظارے کی بھرپور تمتع کے ایک کھنکا سا ہوا، ایسا کھنکا جو دو متخاصم و متبادر ساعتوں کے رتق و فتق میں تب ہوتا ہے جب وہ آدمی کے اندر اتر جاتی ہیں۔ ایسے میں دھیان کا سارا ارتکاز بکھر بکھر جاتا ہے۔

مولانا ملالوی کا دھیان بھی بکھرنے لگا تھا، یوں جیسے پوروں اور ہتھیلی کے لس لعوق میں تسبیح کے دانے ہوں، گول اور پھسلواں، ایک دانے پر دباؤ بڑھے، وہ آگے کو کھسکے، ڈوری تنے، تانت سہار نہ پائے تو ڈوری ٹوٹے، دانہ پھسلے، نکلے، اچھلے اور پرے جا پڑے۔ ہاتھ اسے تھامنے کو آگے بڑھے، کھلے اور ہتھیلی میں ٹھہرے لمس انڈیلتے سارے دانے جھولتی ڈوری کے ٹوٹے سرے سے ایک ایک کر کے نکلتے اور دور لڑھکتے چلے جائیں ایسے کہ پوریں ہوا ہی میں تھر تھر کرتی رہیں۔

مولانا ادھر ادھر دیکھے جاتے تھے جیسے ان کے سارے دانے گھپ

اندھیرے کی پرات میں گر گئے ہوں۔ انھیں کچھ بھائی نہ دے رہا تھا اور سمجھ ہی نہ رہا تھا کہ دھیان کی تھکی ہوئی پوروں کو کس جانب تحرک دیں خرد لحہ کیا ٹلا تھا آنے والے وقت کی ایک ایک اکائی قرنوں پر تنے جاتی تھی۔

دوشاخ غلیل وقت سے بندھی اور تنی ربڑ جیسی ساعتوں میں عجب وسوسے کا غلہ تھا۔ تانت اترنے پر یہ غلہ چھوٹ کر زناٹے ایک شفاف کانچ پر آپڑا تھا۔ یہ کانچ وہی تھا جس میں رفتہ وقت کی نور باف ساعتیں اس عکس دل نہاد میں مخلط ہو رہی تھیں جو خرد لمحے کے ٹھہراؤ اور پھیلاؤ سے پھوٹ بہا تھا... ایک چھنا کا ہوا تھا، ان کے اندر ہی.. اور سارے میں کرچیاں بکھر گئی تھیں... وہاں، جہاں دھیان تسبیح کے پھسلواں دانے تھے۔

دھیان دھاگہ ٹوٹنے پر بدن میں صرف ٹھنک تھیرا تری تھی مگر وسوسے کا غلہ جو پڑا تو ہر کانچ کرچی سے طبل تحت کسا کی گونج سنے جاتے تھے۔

تن کے طباق میں پڑی خواہش کے طعمے پر پڑنے والا نفس بھی طباقی کتے ایسا ہوتا ہے، رکیل، مفت خور اور طفیلیا۔ شروع شروع میں اسے صرف روح کی ہمراہی کی ہٹ ہوتی ہے۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ یہ روح کے حصے کی ہنڈیا پر ہتا پھیرنے لگتا ہے اور آخر کو اپنے جبڑے رسال شہ رگ پر گاڑ کر اس سے رت رس ڈیک ڈکوس کر اسے لجلجا کر دیتا ہے، یوں کہ روح کا ہونا اور نہ ہونا ایک سا ہو جاتا ہے۔

مولانا ملالوی نجسی نفس کے حیلوں بہانوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے، نظر کو یوں نظارے کا اسیر پایا تو کھنک اور وسواس کی عصا تھام لی۔ دم ہلاتے، بدن اکڑاتے، کان اٹھا کر پھڑ پھڑاتے اور رالیں بہاتے نفس پر اندر ہی اندر چڑھ دوڑے اور من ہی من میں دردر پھٹ پھٹ تو تو کر کے اسے اس کے پچھلے قدموں پر بٹھا دیا اور اس پیش بندی کے سبب کہ وہ پھر سے نہ اٹھ کھڑا ہو، نیلوفر کے چہرے سے نظر سمیٹ کر ملک فہیم ریاست کے چہرے پر جما دی تھی۔ چپکی سادھے ہونٹوں کے پیچھے، فرش زبان کے اوپر تالو کی محراب تلے حاشا ثم حاشا کے ورد کی گونج اٹھا کر خود کو سمجھا بجھا لینا، دل کو جبر جباری سے منا لینا اور زور ازوری، زاری کرتی نظریں کہیں سے اٹھا کر کہیں نکالنا بظاہر ممکن ہو گیا تھا۔ مگر فی الاصل وہ حسا ولا افیس کے جھمیلے میں پڑے ہوئے تھے۔ ایک آواز تھی کہ جو دل سے اٹھتی تھی، اپنے زیر دم میں ہونٹوں کی کپکپاہٹ لئے اور اپنے اسراع میں نرم گرم سانسوں کا ارتعاش لئے... وہ سنتے تھے اور سنتے چلے جاتے تھے یوں کہ ساعتیں اس کا رس چاٹتی تھیں مگر اس آواز سے وابستہ چہرہ نظر کے سامنے نہ تھا... اور جو چہرہ سامنے تھا اس کی آواز کہیں درمیان میں ہی ٹوٹ کر گر گئی تھی حالانکہ وہ چاہتے تھے کہ اسے سنیں، کامل توجہ سے اور حتمی نتیجے پر پہنچیں۔

اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح یکسو ہو پاتے ملک صاحب اپنی بات مکمل کر چکے تھے اور مولانا کو یوں دیکھے چلے جاتے تھے جیسے فیصلہ چاہ رہے ہوں۔ مولانا فیصلہ کیا کرتے کہ ابھی تک فاصلے کو پاٹ نہ پائے تھے حتیٰ کہ رای العلیل علیل کے پیش نظر کچھ کہنا موخر کر دیا۔

جس آن مولانا معذرت کو مناسب الفاظ تلاش کر رہے تھے اسی آن ایک سہم کی چاپ چپکے سے ملک صاحب کے من میں اتر گئی تھی۔ فیصلے کو منتظر آنکھیں اسی چاپ کی دھمک سے بدک کر نیلوفر کو دیکھنے لگیں اور انھیں یوں لگا تھا جیسے سوئی کا پھاوڑا اپنی بات محبت کی ساری زمین کھود کر کھائی بنا رہی تھی۔ ایسی کھائی جسے ممکنہ فیصلہ سننے کے بعد اتنا چوڑا اور اتنا گہرا ہو جانا تھا کہ نہ تو اسے الانگنا نیلوفر کے بس میں رہے گا نہ وہ خود اسے چھلانگ پائیں گے۔

کچ کرچ آتے لمحوں سے جھانکتے وسوسے پھاوڑا پڑتا تھا اور تعلق کی ساری نرم نرم مٹی کاٹ کر پرے پھینک دیتا تھا۔ انھوں نے بوکھلا کر مولانا کی سمت دیکھا اور مزید سہم کر ہم زانو نیوفر کی کلائی یوں تھام لی جیسے اب جو چھوٹی تو پھر کہیں نہ تھام پائیں گے۔ ملک صاحب مولانا ملالوی کی طرف دیکھے بغیر پھولوں کی ڈالی سی کلائی کو آہنہ پنجے میں جکڑ کر اور تقریباً کھینچتے ہوئے تیزی سے اٹھے تھے کہ جیسے اب تلک حجرے میں نہ تھے جلتی آگ پر دھرے توے پر بیٹھے رہے تھے۔

چار زانو بیٹھے مولانا کو ملک صاحب کا یوں اٹھنا عجیب سا لگا تھا اور نیلوفر کا ہاتھ اتنی سختی سے پکڑ کر اور یوں بے دردی سے کھینچ کر اٹھانا سخت معیوب سہی، مگر جب ملک صاحب نے یہ کہا تھا کہ "فتویٰ لینے کو پھر آئیں گے" تو وہ قدرے مطمئن ہو گئے تھے اور ہونٹوں پر پپڑی کی صورت جمے مخمصے کو وہ اب اطمینان سے حلق میں اتار کر لمبا سانس بھر سکتے تھے۔

جب مولانا بہت سی ہوا اپنے سینے میں بھر چکے تو انھیں یوں لگا تھا جیسے وہ اپنے حجرے میں نہ تھے گذرے وقت کی ناغول میں بیٹھے ایک دل خوش کن تصور باندھنے کے جتن کر رہے تھے، ایسا تصور جس کی شیریلی دھارے بن بن کر حلقوم میں اترتی تھی، مگر ہونے یہ لگا تھا کہ جلد ہی یہ مٹھاس الکن ہو کر چبھنے لگی تھی۔ وہ یوں کہ جس اجلی صورت سے تصور جوڑتے تھے اس سے نظر پھسل پھسل جاتی تھی یا پھر کچھ ایسے ہوتا کہ نظر تو وہی جمی رہتی، منظر کی ساری امی جمی ادھر ادھر ہو ہوا جاتی۔

انھوں نے سر جھٹک کر گردن چھوتی زلفوں کے بیچ کانوں کی لوؤں تلے لرز جانے دیئے نہڑائی گردن اٹھا کر چوندمیل دیکھا اور ایک ایک شے اور اس سے وابستہ احساس کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا، چولوں میں ہک دک چھپائے دروازہ اور اس کی چوکھٹ، چوکھٹ کو خاموشی سے قابو کئے چکنے گارے سے لپی دیواریں، دم سادھے کھڑی دیواروں کے تختوں سے چمٹی چوکیوں اور چھاتی سے لگے تختوں پر اوپر تلے پڑی کتابیں، کتابوں کی بوسیدگی میں ڈوبتے چونچال لفظوں کے پرے، الفاظ کے پردوں میں چھپی مین میکھ کی تاریکی... اور وہ گاڑھی سیال تاریکی بھی جو جھلا بور ہو کر انھیں ڈبوئے جاتی تھی۔

وہ دیکھ رہے تھے اور محسوس کر رہے تھے یا پھر محسوس کئے جاتے تھے اور دیکھے جاتے تھے... حتیٰ کہ انھیں نور احمد لنیا یاد آئے جو کہا کرتے تھے کہ حسن کے اجزائے ترکیبی چاہے نظارہ، سماعت اور لمس ہوں یا خوشبو بن کر مشام جاں معطر کریں۔ لذت ہو کر روح میں اتریں یا لطف کے ارتفاع سے بدن کو مرتفع کریں۔ ایک ہی جگہ ساکت ہو جائیں یا اپنی رواں لہروں میں ارد گرد کے مظاہر کو بھی ساتھ بہائے چلیں، فی الاصل حقیقت ہی سے مستعار ہوتے ہیں۔ مستعار بھی کیا حقیقت

ہی کا مظہر اور حصہ۔ ایسا سوچ کر دراصل مولانا خرد لمحے میں اپنی آنکھ پر کھلنے والے نیلوفر کے رخ روشن کے نظارے کو تصور کے پردے پر ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھ لینے کا جواز فراہم کر رہے تھے۔

جواز انھیں مل چکا تو وہ ایک متحرک منظر کے ساکت رہ جانے والے مظہر کو حقیقت کلی سے جوڑ کر کیف کی کن من میں بھیگنے جاتے تھے۔ پوری طرح بھیگ چکتے تھے تو خود کو نچوڑتے تھے، یوں جیسے گیلے کپڑے کو بیچ ڈال ڈال کر نچوڑتے ہیں۔ نچڑ چکتے تھی تو پھر کیف کی جھمر جھمر تلے آکھڑے ہوتے تھے۔ عجب بھیگ تھی کہ روح میں اترتی تھی اور مست کئے دیتی تھی۔ اور عجب نچوڑنا تھا کہ ریشے ریشے کے بیچ کا خالی پن نئی بھیگ مانگتا تھا۔

قبل ازیں مولانا اس طرز احساس سے شعوری طور پر احتراز فرماتے تھے کہ نور احمد لنیارا سلوک پر چلتے ہوئے مجذوب اور مجنون ہو کر ان کے اندر خوف کی دہکتی ہوئی چنگاری رکھ گئے تھے۔ اگرچہ مولانا دنیاوی اعتبار سے بہر شاندار اور قابل رشک زندگی نہ گذار رہے تھے، امام مسجد اور خطیب کا وقار ان کے اندر کی طلب سے کہیں کوتاہ تھا۔ تاہم وہ سمجھوتہ کر چکے تھے اور اسے فی الحال غنیمت جان کر اس سے جڑے رہنا چاہتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ متصوف ہونے کی بجائے متکلم رہنا انتخاب کر چکے تھے اور کلام ہی کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک یہی وقت کا تقاضا بھی تھا اور حکمت بھی۔ اپنے خطبات میں ''تدبرون'' اور ''تشعرون'' جیسے الفاظ موتیوں کی صورت پرو لینے والی آیات کثرت سے تلاوت فرماتے تھے کہ وقت عشق اور محبت کی راہ ان کے نزدیک پھسلن ہی پھسلن تھی۔ وہ اسے ایمان بنائے ہوئے تھے کہ عشق و محبت کے جذبے اپنی نہاد میں انفعالیت سے مملو ہیں، جب کہ انفعالی تدبر و شعور کی بلندیوں کی طرف محو خرام ہو ہی نہیں سکتا۔ تاہم لاشعور کے کسی تقاضے کے تحت ''یومنون'' یا اس سے ملتے جلتے الفاظ والی آیات مبارکہ ان کے ہونٹوں سے یوں کمال لطف سے ادا ہوتیں کہ انسانوں کا تدبر و شعور فقط ڈھکوسلا لگنے لگتا اور ایمان ہی علت غائی اور اصل الاصول رہ جاتا تھا۔ ایسے میں ان کی گفتگو سے یہی مفہوم کشید کیا جا سکتا تھا حقیقت مطلق کی ہستی کا تعین لامعرف اور غیر انقسام پذیر ہے۔ کمال کو اس کے مظہر سے اس لئے نہیں جانا جا سکتا کہ العین کی صفات الگ ہیں اور جلوہ ہائے ذات الگ۔ ممکن ہے کسی الجھن سے بچنے کے لئے وہ معرفت کی منہاج علم اور نور کو بتایا کرتے ہیں تاہم ان کا طرز عمل ایسا تھا کہ بجا طور پر گمان ہونے لگتا تھا کہ وہ اسی صدق دل سے ایمان رکھتے تھے۔ اس کا واضح ثبوت تو وہ نادر و نایاب کتب کا خزانہ تھا جن کے چنیدہ الفاظ اکثر ان کے ہونٹوں پر رہتے تھے اور ان کے فرش دل پر تہہ جماتا وہ نور بھی، جو گاہے گاہے اٹھ کر چھاتی اندر پھیلنے لگتا تھا تو سارے میں گھنٹیاں بج اٹھتی تھیں۔

خرد لمحے میں نیلوفر کے صدقے یہی گھنٹیاں ایک بار پھر جھن جھن کرنے لگی تھیں اور ان کی یادداشت کا غالب حصہ محیط کرنے والا وقت اپنی ایک ننھی سی اکائی میں حلول کر کے عجب لذت دے رہا تھا۔ ایسی لذت جس سے وہ نکلنا چاہتے تھے، یہاں تک کہ وہ یہ تسلیم کر لینے پر مجبور تھے کہ وہ جو کہتے ہیں کہ ذات باری تعالی عین حسن ہے اور روح انسانی اس کا ایک عکس اور صدور، تو وہ بھی اپنی جگہ درست ہی کہتے ہیں۔

کمال جمال تک پوری توانائی سے تحریک دینے والی وقت کی قیامت زا اکائی کی گرفت دوسرے روز ہی ڈھیلی پڑ گئی تھی کہ انتظار کی کٹاری میں اسے لخت لخت کر دیا تھا۔ اب وہ صرف انتظار کرتے تھے اور کڑھتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جو انھوں نے دیکھا تھا، اپنی ننگی آنکھوں سے، وقت کی انتہائی محدود اکائی میں اور محسوس کیا تھا پوری شدت سے اور تسلسل کے ساتھ، وہ سب ایک خواب تھا، دھندلا سا خواب۔ یہاں تک کہ اسی کیفیت میں لگ بھگ تین ماہ سے زائد عرصہ گذر گیا، حتیٰ کہ وہ ناامید سے ہو چلے تھے کہ انھوں نے ملک فہیم ریاست کو حجرے کا دروازہ کھول کر اندر آتے دیکھا۔ مولانا پر کئی لمحے ایکدم پھوار بن کر ایک ساتھ برس پڑے تھے۔

یوں تو ملک صاحب اکیلے ہی آئے تھے مگر مولانا کو یوں لگا تھا جیسے وہ اپنے ساتھ ایک مانوس خوشبو بھی لائے تھے۔ اس خوشبو سے سارا حجرہ بھر گیا تھا۔ مست کر دینے والی خوشبو میں مولانا اس مسئلے کی بابت استفسار کرنا بھول گئے تھے جس کے وسیلے سے ان کے اندر اتھل پتھل ہونے لگی تھی کہ وہ آنے والے کا وجود بھی اسی خوشبو میں ڈوبتا دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح ملک صاحب کو نظر انداز کر دیتے، آنے والے نے اطلاع دی کہ وہ عقد ثانی کر رہے ہیں اور اصرار کیا کہ مولانا ہی کو عقد پڑھانا ہوگا۔

مولانا ملالوی ہکا بکا انھیں دیکھنے لگے تھے اور جب اصرار بڑھا تو انھیں وعدہ بھی کر لینا پڑا تھا۔ پھر وہ یوں ہوا کہ وہ بارات کے ساتھ دوسرے شہر پہنچے اور قد آدم آئینوں کے مقابل جا کھڑے ہوئے، یوں کہ بس خود ہی کو دیکھے جاتے تھے۔ ایسے میں انھوں نے خرد لمحے کو جھپاک سے عیاں بدن کی سنسناتی پوست پر تیرتے اور پھسلتے ہوئے محسوس کیا تھا اور بغیر کسی مدافعت کے اسے خلیے خلیے میں، رگوں میں، حتیٰ کہ روح تک میں اتر جانے دیا تھا ☆☆☆

اردو کا ابتدائی زمانہ

تنقید و تاریخ

شمس الرحمٰن فاروقی

قیمت : ۱۵۰ روپے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

شاہد عزیز

نظم

اچانک مل گئے ہو تو
چلو ہم تم
ذرا کچھ دور آگے ساتھ چلتے ہیں
پھر اس کے بعد تو ہم کو بچھڑنا ہے...
مجھے بھی کچھ ادھورے کام کرنے ہیں
تمھیں بھی جانے کتنی دور جانا ہو

ھجرت

یہ زمین پیاسی تھی
خون پی گئی سب کا
آؤ تم کو لے جاؤں دور ایسی دھرتی پر
خواب جس کی وادی میں
کھلکھلا کے ہنستے ہیں
دن میں پھول کھلتے ہیں
رات زرا گلتی ہے
اس کی سرحدوں پر سب
آسمان ملتے ہیں...

نقشہ دیکھ لیں لیکن
وہ زمیں کہاں پر ہے

ماضی

شاہد عزیز

بہت دشوار ہوتا ہے
ان تاریکیوں کے سخت جنگل سے نکل کر
روشنی کی سمت آجانا
چمکتے چاند کی سی ریشمی کرنوں میں کھو جانا
کبھی سورج سے ٹکرانا

بہت دشوار ہوتا ہے
مگر جب ہم نکل کر تیرگی سے روشنی کی سمت آتے ہیں
تو شاید بھول جاتے ہیں
کہ ہم تاریکیوں میں
اپنا کیا کچھ چھوڑ آتے ہیں

غزل

محمد اعظم

چاہتا یہ ہے جو ہم دل زدگاں چاہتے ہیں
نفع مطلوب ہے ایسا کہ زیاں چاہتے ہیں

لطف یک جرعہ سے ایسے میں بنے گا کیا کام
دور اول میں تو ہم رطل گراں چاہتے ہیں

چاہتے ہیں جو وہ ہوتا نہیں ہم سے بے عذر
اور بے عذر جو ہوتا ہے کہاں چاہتے ہیں

کاوش عقل سے کھلتے نہیں دل کے عقدے
یہ تو وہ گل ہیں جو کھلتے ہیں جہاں چاہتے ہیں

صبح کاذب ہیں سیہ دل یہ صبیحان سواد
ہم ہی سادے ہیں کہ اس وقت اذاں چاہتے ہیں

محمد اعظم

کہتا ہوں میں کہ غیر نے ہرگز کہا نہیں
تجھ کو نہ ہو قبول جو میری دعا نہیں

ان پانیوں کسی کو ڈبوئے نہ شرم شوق
میں آب آب اس کی طرف دیکھتا نہیں

سورج سے چومتا ہے ترا پیرہن خیال
سب میں ہوں میری جان یہ موج ہوا نہیں

حیراں کھڑا ہوں وصل وجدائی کے درمیاں
میں کس شمار میں ہوں اگر آئینہ نہیں

گذرا مرے درون سے تو ہی برنگ عمر
اب جانے وہ درون بھی میرا تھا یا نہیں

چٹکی مہک اٹھی ہے یہ کیسی امید کی
اب تک تو دسترس میں وہ بند قبا نہیں

کام و دہن کو بخش چکا ہے جو پہلے نیب
اب شہد شیر دے بھی تو کوئی مزا نہیں

دیکھا کہ چلے جاتے تھے سب شوق کے مارے
معشوق کے پہلو میں شب ہجر گذارے

ہم ہیں کہ ہوئے حلقۂ زنجیر محبت
باقی تو گئے چھوٹ گرفتار تمھارے

ہم چاہنے والوں کا نہیں کوئی ٹھکانا
ہیں آج سر نجد تو کل تخت ہزارے

آپہنچے کہاں جستجوے یار میں اس بار
مل جائے تو چل بھی نہ سکے ساتھ ہمارے

ساکن ہو یہاں کوئی تو اس سے کوئی پوچھے
میں گھوم رہا ہوں کہ ہیں گردش میں ستارے

بس دیکھ چکے خوب وہ پستی یہ بلندی
اس چرخ سے اب جلد ہمیں کوئی اتارے

تین غزلیں

احمد محفوظ

(''شب خون'' کے آخری شمارے کے نام)

یہ جو دھواں سا ہے دشت گماں کے آس پاس
کیا کوئی آگ بجھ گئی سرحد جاں کے آس پاس

شور ہوا ے شام غم یوں تو کہاں کہاں نہیں
سنیے تو بس سنائی دے دردِ نہاں کے آس پاس

بجھ گئے کیا چراغ سب اے دل عافیت طلب
کب سے بھٹک رہے ہیں ہم کوے زیاں کے آس پاس

ان کو تلاش کیجئے ہم تو ملیں گے آپ ہی
اپنی بھی جاے باش ہے گمشدگاں کے آس پاس

سینۂ شب کو چیر کر دیکھوں تو کیا سماں ہے اب
منزل دل کے درمیاں کوچۂ جاں کے آس پاس

وہ بھی عجب سوار تھا آیا ادھر ادھر گیا
پہنچی نہ میری خاک بھی اس کی عناں کے آس پاس

عالم سرد و گرم کی کیا ہو بھلا انھیں خبر
وہ جو رہے ہیں عمر بھر شعلہ رخاں کے آس پاس

اپنا سوچا ہوا اگر ہو جائے
ایک عالم ہمارے سر ہو جائے

شور دشت سکوت میں کم ہے
اے ہوا تو ہی تیز تر ہو جائے

نہ کریں گے وہ رخ ادھر اپنا
چاہے دنیا ادھر ادھر ہو جائے

درد آواز رفتہ رفتہ بنے
آہ شب نالۂ سحر ہو جائے

کتنی راہیں کھلی ہیں اپنے لیے
دیکھیے کب کدھر سفر ہو جائے

اس لیے ہوشیار رہتا ہوں
کیا خبر کب وہ بے خبر ہو جائے

یہاں سے تو اب راستہ ہی نہیں
تو کیا کوئی آگے گیا ہی نہیں

ادھر کی ہی شاید خبر کچھ ملے
ادھر کا تو کوئی پتہ ہی نہیں

وہی شہر جس کا بہت شور تھا
سنا ہے کچھ اب بولتا ہی نہیں

کہاں تک یوں ہی خود کو دیتے صدا
وہاں تو کوئی اور تھا ہی نہیں

امنگ بالی

جان اسے چلانے میں اہرمن کی کھپتی ہے
رات دن مگر دنیا نام تیرا جپتی ہے
روشنی کے جلوے ہیں پھلتے پھولتے جنگل
جن کی چھتر چھایا میں تیرگی پنپتی ہے
گونج سی یہاں شب بھر تم جو روز سنتے ہو
دشت کی پناہوں میں خامشی تڑپتی ہے
کیا کہا، کہو تو پھر، دھیان حسن سیرت کا؟
اے میاں مری مانو چھاپ لو جو چھپتی ہے
ناگہاں مگر اس میں پھول کیوں نہیں کھلتے
ریگ زار کی مانند خاک دل بھی تپتی ہے
حسن اتر کے آتا ہے یوں امنگ آنکھوں میں
جھیل جس طرح گہری روشنی ہڑپتی ہے

رہے خرام سلامت ندی کے دھاروں کا
نکل نہ جائے کہیں دم مگر کناروں کا
تھا اضطراب و تمنائے دید گل کا کرم
بہت کٹھن تھا سفر ورنہ خارزاروں کا
ستا رہی ہے دل شب کو کل کے چاند کی یاد
اڑا اڑا سا ہے کچھ آج رنگ تاروں کا
جو خوش ہے ایک تو اس کی وفا کے چرچے ہیں
دکھائے دل وہ جہاں میں بھلے ہزاروں کا
یہی ہے لطف تو پھر جور کس کو کہتے ہیں
نہ سمجھا کوئی بھی مطلب ترے اشاروں کا
تن برہنہ ہو جیسے لباس کا محتاج
ہوا ہے شعر بھی مرہون استعاروں کا
اسے تو حسن کی حرمت کا پاس تھا اتنا
کہ کائنات معما ہے پردہ داروں کا
ہو ابتلا سے جہاں عاشقی کی پیمائش
تو کیا عجب ہو وہاں جوش بے قراروں کا

علی محمد فرشی

(زیف سید کے لئے)

وہ خود اپنے خوابوں کو ری پوسٹ (۲) کرنے گئی
بات اتنی سی تھی
اور فسانہ بنی
خودکشی کا بہانہ بنی

یہ کہانی
بہت عرصہ پہلے
مجھے اپنی اسناد کے اس پلندے سے باہر ملی تھی
جسے وقت کے گرد آلود ہاتھوں نے زرد ادیا تھا
مگر وہ کنواری چمک
جو کہانی کی نس نس سے باہر لپکتی تھی
اب تک مجھے لوتی ہے

دفاتر کے دفتر میں
وہ ایک اسٹینوگرافر تھی
سولہ برس سے بہت خوبصورت
کہ صاحب کی ساری عنایات
ظالم کی ایڑی کے نیچے سسکتی تھیں
لیکن کبھی اس نے کاپی کے پھولوں سے باہر نکل کر نہ دیکھا
اسے ساری دنیا کے غم نوٹ کرنے کی عادت تھی
مصروفیت میں وہ شام وسحر یوں الٹتی پلٹتی
کہ جیسے قیامت کے آڈٹ (۳) کا دن آ گیا ہو
اسے کچھ خبر ہی نہیں تھی کہ
دفتر میں، سڑکوں پر، بس میں
اسے پوجنے والی آنکھوں میں
حسرت کے سائے گھنے ہو رہے ہیں
اسے ایک دھن تھی

خدائی کے غم مختصر کر کے
اک خط میں ڈالے
اسے پوسٹ کر دے
کہ جس نے اس مہارت کا انعام
محبت نویسی کے اول وثیقے میں لکھ کر روانہ کیا تھا

آج بالائی آفس میں ہنگامی حالت تھی
سارے، ندامت میں بھیگے، ادھر سے ادھر بھاگتے
ایک دوجے سے آنکھیں چراتے گذرتے
تو لگتا کہ جیسے کسی تیسری نیچ دنیا کے وہ لوگ ہیں
جن کو اپنے ہی بھائیوں کا خون چوسنے کی سزا مل رہی ہو

لفافے پہ نوروز پہلے کی مہریں لگی تھیں
یہ مہریں نہیں ان کی چھاتی کے وہ چھید تھے
جن سے غفلت کا غم رس رہا تھا
کسی کو یقیں ہی نہیں آ رہا تھا
آفس کے ریکارڈ میں
ایسے خط کے لئے صرف خاموشی لکھی ہوئی ہے

نوروز گذرے کہ نو سال...
گنتی تو معلوم کو اور معلوم کرنے کی کوشش میں مصروف تھی
جس نے معلوم کے غم کی مٹی کو جھاڑا
وہی جس نے محسوس کا غم اٹھایا
وہی جس نے لکھا بہت مختصر کر کے غم کو
کہاں جائے
داد ہنر قرض ہے
دو جہاں پر۔

Audit(۳)Repost(۲)Dead Letter(۱)

عشرت ظفر

(عرفان صدیقی کی یاد میں)

سیاہ خانۂ جاں میں شرار شوق کی ہے
یہ تازگی یہ دمک نوبہار شوق کی ہے

تمام سبزہ و دیوار زرد ہے پھر بھی
دبی دبی سی صدا آبشار شوق کی ہے

یہی بدن سے بدن کا ہے والہانہ کلام
مری رگوں میں جو مستی خمار شوق کی ہے

نہ تند و تیز ہوا ہے نہ موج طوفاں خیز
یہی تو عمر میاں کاروبار شوق کی ہے

ہے دیدنی درودیوار آرزو کی چمک
عجیب روشنی شمع مزار شوق کی ہے

نگاہ ناز فسوں آفریں کو ہے معلوم
کہ نوک ٹوٹی ہوئی دل میں خار شوق کی ہے

یہی ہے نقطۂ آغاز شہر گل عشرت
اسی دیار میں خوشبو دیار شوق کی ہے

میں بھی روشن ہوں جمال رخ جاناں میں کہیں
خاک پروانہ بھی ہے شعلۂ عریاں میں کہیں

کسی پیکر میں بھی پہچان نہیں ہے اس کی
کیا سراغ اس کا ملے دشت وگلستاں میں کہیں

ہجر کے داغ میں تبدیل ہوا لمحۂ وصل
تھی کمی کوئی مرے شوق فراواں میں کہیں

جل گیا باغ مگر شمع نمو خیز کی لو
سبز ہے ہر شجر سوختہ ساماں میں کہیں

مجھ کو شعلوں میں بھی جینے کا سکھاتا ہے ہنر
اک سمندر مرے آتش کدۂ جاں میں کہیں

اپنی وحشت کا غبار اٹھتے ہوئے دیکھتا ہوں
میں بھی ہوں اپنے ہی آہوے گریزاں میں کہیں

عشرت اک حرف بشارت تھی وہ آواز قدم
اک چراغ اور جلا خانۂ امکاں میں کہیں

غلام حسین ساجد

زمیں کا رنگ وہی آسماں کا رنگ وہی
وہی صباحت گل ہے بنائے سنگ وہی

جو خواب بن نہیں پایا تھا میری آنکھوں کا
ٹھہر گیا ہے مرے آئینے پہ زنگ وہی

بدن میں آگ لگاتے ہوئے دعا کے ہاتھ
لہو میں پھول کھلاتی ہوئی امنگ وہی

بدلنے والا ہی خود کو بدل نہیں پایا
وہی بہانے ہیں اس کے ہیں عذر لنگ وہی

ہزار صلح کا پرچم بلند کر دیکھو
مگر زمیں پہ مسلط رہے گی جنگ وہی

پرانی وضع سے آیا ہوں تیرے کوچے میں
بدن میں زور وہی روح میں ترنگ وہی

کچھ ایسے ڈھنگ سے تبدیل ہو رہا ہے وہ
کہ رہ نہ جائے کسی مرحلے پہ دنگ وہی

وہی نگر وہی گلیاں وہی مکیں ساجد
پڑی ہے پاؤں میں زنجیر نام و ننگ وہی

زمین میری رہے گی نہ آئینہ میرا
کہ آزمانے چلا ہے مجھے خدا میرا

مرے طلسم سے آزاد بھی نہیں لیکن
وہ پھول پہلی نظر میں ہوا نہ تھا میرا

نعیم بصرہ و بغداد ہارنے کے بعد
مرا وجود بھی شاید نہیں رہا میرا

وہ میرے پاس رہے یا کہیں چلا جائے
رہے گا اس کے خیالوں سے سلسلہ میرا

کسی کی کھوج میں نکلا تھا بے ارادہ میں
بدن نڈھال تھا سر گھومتا ہوا میرا

نہیں ہے اب مجھے انجام کی کوئی پروا
بڑھا دیا محبت نے حوصلہ میرا

ہوا ہے قطع مسافت کا سلسلہ جاری
میں رک گیا تو بدن ٹوٹنے لگا میرا

یقیں نہیں ہے مگر نقش ہے مرے دل پر
کہ اک پری نے بنایا ہے زائچہ میرا

وہ بار بار پلٹتا ہے دور جا جا کر
سو ٹوٹ ٹوٹ کے جڑتا ہے رابطہ میرا

نظر کی حد پہ جو اک نجم خواب ہے ساجد
وہی چراغ ہے اس کا وہی دیا میرا

غلام حسین ساجد

صید ہوں روز ازل سے عالم اسباب کا
اور وا رکھتا ہوں سینے میں دریچہ خواب کا

سامنے آتے ہی اس کے میری وحشت جاگ اٹھی
دھیان رہتا تھا مجھے یوں تو بہت آداب کا

کارزار عشق سے باہر نکل کر دیکھیے
ساری بستی میں اجالا ہے اسی کمیاب کا

عالم رویا میں دیکھا تھا جسے میں نے کبھی
عکس ہے اب میری آنکھوں میں اسی محراب کا

آ گیا آخر کتاب عشق کا انجام بھی
دور تک بکھرا ہوا منظر ہے پہلے باب کا

شام ہے اور سرخ پیڑوں کے دہکتے سائے بھی
نیند میں بہتا ہوا دھارا ہے جوئے آب کا

کس لئے ساجد بناتا ہوں گھروندے ریت کے
رخ بدل سکتا ہے تھوڑی دیر میں سیلاب کا

چراغ باقی رہا نہ اب آئینہ رہے گا
مگر شگفت جمال کا سلسلہ رہے گا
ہزار چوکس رہیں کڑی تیرگی کے داعی
مرے تصور میں ایک روزن کھلا رہے گا
یقین آیا ہے آج الواح سنگ پڑھ کر
کہ اس نگر میں بس ایک نام خدا رہے گا
یہی رہے گا اگر مری بے کسی کا عالم
دعائیں بچ پائیں گی نہ دست دعا رہے گا
سیاہ پڑنے لگے گی شمع وصال کی ضو
کھلا ہوا رات بھر جو رنگ حنا رہے گا
مری طرح نیند آ نہیں پائے گی اسے بھی
میں جانتا ہوں وہ صبح تک جاگتا رہے گا
کہاں مٹانے سے مٹ سکے گا وہ نقش دل سے
غبار سا آئینے پہ اک عکس کا رہے گا
خیال رہتا ہے نیند میں اب اسی پری کا
جو پھول اب شاخ پر کھلے گا کھلا رہے گا
سفر ہو پاتال کا کہ سیر فلک ہو ساجد
جہاں رہوں گا زمین سے رابطہ رہے گا

غلام حسین ساجد

میں اس پری کا اگر مدعا نہیں سمجھا
سمجھ میں کیا نہیں آیا میں کیا نہیں سمجھا
یہی بہت ہے کہ اس بار بھی میں دشمن کو
برا سمجھتے ہوئے بھی برا نہیں سمجھا
وہ مانتا ہے مرے اختلاف کے حق کو
اسے بٹھایا ہے سر پر، خدا نہیں سمجھا
چراغ و آئینہ حیران کیوں نہیں ہوں گے
کہ میں صباحت گل کی ادا نہیں سمجھا
کسی بکھرتے ہوئے خواب کے تعاقب میں
نکل پڑا ہوں مگر راستہ نہیں سمجھا
بہت سے رنج ہے اپنی جان پر لیکن
ترے وجود کو خود سے جدا نہیں سمجھا
ہزار میں نے ہر اک چیز کی وضاحت کی
مگر وہ شخص مرا مسئلہ نہیں سمجھا
اسی نے آگ لگائی تھی میرے ہاتھوں کو
جسے میں بھول سے برگ حنا نہیں سمجھا
کسی کی اڑتی ہوئی نیند کی حقیقت کو
نگر میں کوئی بھی میرے سوا نہیں سمجھا
کھڑا ہوا تھا کہیں بام عرش پر ساجد
مگر زمین کو تحت الثریٰ نہیں سمجھا

نگارخانۂ ارض و سما ملا کہ نہیں
اگر ملا تو کوئی دلربا ملا کہ نہیں
شکستہ دل کو ضرورت ہے کھلکھلانے کی
پیام گل سے تجھے حوصلہ ملا کہ نہیں
سیاہ نیند میں جلتے ہوئے چراغوں کو
کسی گلی میں کوئی جاگتا ملا کہ نہیں
رکے ہوئے تو رکے ہی رہیں گے تادم مرگ
جو چل پڑے تھے انھیں راستہ ملا کہ نہیں
کسی کو پھول کھلاتے ہوئے مرے گھر میں
کوئی دمکتا ہوا آئینہ ملا کہ نہیں
شگفت خواب سے بھیگی ہوئی ان آنکھوں میں
کوئی ستارہ مرے کام کا ملا کہ نہیں
غزل کو سب کے لئے آئینہ بناتے ہوئے
کسی پری سے ترا قافیہ ملا کہ نہیں
رکا تھا اور کہاں کاروان راحت عشق
پھر اس کے بعد وہ شیریں ادا ملا کہ نہیں
سوال کرتے ہیں اکثر مرے عدو ساجد
کہ اس نگر میں کوئی آشنا ملا کہ نہیں

غلام حسین ساجد

سوادِ شہر سے اغماض کرنا چاہتا ہوں
کہ میں اپنا سفر آغاز کرنا چاہتا ہوں

خجل ہوں گا متاعِ عشق پر شاید کسی دن
ابھی اس فیصلے پر ناز کرنا چاہتا ہوں

رگِ جاں سے بھی جو نزدیک آتا جا رہا ہے
میں کیا سچ مچ اسے ہمراز کرنا چاہتا ہوں

الٹنا چاہتا ہوں آج ماضی کے ورق میں
کہ فردا کا دریچہ باز کرنا چاہتا ہوں

کسی کے سامنے رکھے ہوئے اک آئینے کو
میں اپنی روح کا غماز کرنا چاہتا ہوں

پرندوں کو ذرا سی دیر چپ رہنے کا کہہ کر
ہوا کو زمزمہ پرداز کرنا چاہتا ہوں

منانا چاہتا ہوں روٹھنے والوں کو ساجد
مگر اک شخص کو ناراض کرنا چاہتا ہوں

کسی کی کھوئی ہوئی یاد کے اشارے پر
میں رنگ ڈھونڈنے نکلا ہوں اس ستارے پر

بھلے یہ میرا بدن ریت بن کے اڑ جائے
میں اپنے زور میں بہتا رہوں گا دھارے پر

وہی دہکتے ہوئے سرخ لب وہی آنکھیں
گمان جن کا ہوا تھا مجھے شرارے پر

جگہ جگہ سے ہوا کاٹنے لگی ہے بدن
بکھر نہ جائیں چھتوں پر کہیں ہمارے پر

مری گرفت میں آتے نہیں تھے جس کے خواب
اسی نے دی تھیں یہ آنکھیں مجھے خسارے پر

میں پار کر چکا دریائے خواب جب ساجد
تو وہ دکھائی دیئے دوسرے کنارے پر

غلام حسین ساجد

آزاد ہو چکا کوئی زنجیر ہو چکا
یعنی دیار خواب بھی تسخیر ہو چکا

پارینہ ہو چکی ہے بہت داستان عشق
اک شہر دشت نجد میں تعمیر ہو چکا

برباد کر چکا ہوں بہت کچھ بنام خویش
اور جو بچا تھا غیر کی جاگیر ہو چکا

کیا وقت آ گیا ہے مری نسل پر کہ اب
میرا عدو بھی صاحب توقیر ہو چکا

صیقل کیا ہے میں نے اسے اپنے خون سے
کس درجہ صاف اب رخ شمشیر ہو چکا

کیسی بدل کے رہ گئی ہے میری کائنات
وہ خوش مزاج پھول بھی دلگیر ہو چکا

ساجد نگاہ ڈالئے اب ارد گرد بھی
ذکر رموز رنگ اساطیر ہو چکا

بھرے پرے ہوئے سب باغ وراغ تھے اس دن
گلی میں پھول گھروں میں چراغ تھے اس دن

یہ اور بات ترے سامنے نہیں آئے
مرے جلو میں کئی بد دماغ تھے اس دن

اڑا لیا تھا کسی نے خمار آنکھوں سے
تہی صباحت گل سے ایاغ تھے اس دن

شکستہ حال پڑا تھا میں اپنے بستر پر
کھلے ہوئے سبھی رنگ فراغ تھے اس دن

کہیں لباس بدلتے ہوئے ستارے تھے
کہیں لہکتے ہوئے خانہ باغ تھے اس دن

ہمیں وہ ڈھونڈ نہ پایا تھا رات بھر ساجد
کہ ہم اسی کی طرح بے سراغ تھے اس دن

غلام حسین ساجد

دیارِ خواب کو نکلوں گا سر اٹھا کر میں
کہ شاد رہتا ہوں رنجِ سفر اٹھا کر میں
چراغ جل نہ سکے گا جو اس کی آنکھوں میں
دھروں گا اس کو کسی طاق پر اٹھا کر میں
سنا ہے تختِ مقدر سے ہاتھ آتا ہے
خجل ہوں راحتِ تیغ و سپر اٹھا کر میں
چلے جو سرو و سمن میں بھی ساتھ چل دوں گا
کھڑا رہوں گا نہ بارِ ثمر اٹھا کر میں
ترے بہشت میں دل لگ نہیں رہا میرا
کہ ساتھ لا نہیں پایا ہوں گھر اٹھا کر میں
الجھ رہا ہو اگر غیر کی نگاہوں سے
لپیٹ لیتا ہوں تارِ نظر اٹھا کر میں
الگ نہیں ہوں میں اپنی طرح کے لوگوں سے
پڑا ہوں زحمتِ دیوار و در اٹھا کر میں
نہیں سنوں گا نصیحت کسی سیانے کی
رہوں گا تہمتِ نوعِ بشر اٹھا کر میں
یقین کیسے نہیں آئے گا انھیں مجھ پر
وفا میں فرد ہوں خوف و خطر اٹھا کر میں
کہیں وصال کی صورت اگر دکھائی دی
نکل پڑوں گا نہ شمعِ سحر اٹھا کر میں
کسی پری کے تصور میں چوم لیتا ہوں
کسی گلاب کو بارِ دگر اٹھا کر میں
بہت ہیں چاہنے والے مرے جہاں بھر میں
گرفتہ دل نہیں بارِ ہنر اٹھا کر میں
مکان چھوڑ تو دوں اس حسیں کے کہنے پر
گلی میں لاؤں گا کیا کیا مگر اٹھا کر میں
مجھے وہ طیش دلاتے رہے اگر ساجد
تو گوندھ دوں گا یہ سارا نگر اٹھا کر میں

جب طلسمِ قفلِ ابجد کھل گیا
حاصلِ گفتارِ سرمد کھل گیا
ٹوٹ کر آئی ہے اس گل پر بہار
جسم لَو دینے لگا قد کھل گیا
صبح لائی ہے رہائی کی نوید
آسماں کھلتے ہی گنبد کھل گیا
کارزارِ عشق میں آنے کے بعد
رنگِ میراثِ اب و جد کھل گیا
خود بخود آیا ہے لب پر اس کا نام
روح پر عنوانِ ارشد کھل گیا
ریگِ صحرا لے اڑی بادِ شمال
دشت گم ہوتے ہی معبد کھل گیا
آ گئی ساجد زباں پر دل کی بات
آج آخر ان کا مقصد کھل گیا

غلام حسین ساجد

ٹھہرنے کو ہے بستی کے درودیوار پر پانی
کہ اب پتھر میں ڈھلتی جارہی ہے موج حیرانی

خیال آتا ہے شہر آرزو کو چھوڑ دینے کا
بہت دشوار ہوجاتی ہے جب بھی کوئی آسانی

یقیں آیا کہ ارزاں ہے متاع لطف دنیا میں
نتیجہ ہے عدو کی قدر کرنے کا پشیمانی

مسلسل بڑھ رہا ہوں جادۂ اسلام پر اب تک
مگر خوش آئے گا کس کو مرا طرز مسلمانی

وہی صورت، وہی اطوار نیک و بد، وہی لہجہ
وہ پل بھر میں کہیں سے ڈھونڈ لایا ہے مرا ثانی

مرے شعروں میں بہتا ہے سمندر میرے ورثے کا
کہ میں گلشن طراز رنگ سحباں ہوں نہ خاقانی

جدائی کی کسک مٹ جائے گی ساجد مرے دل سے
اگر پہچان لے بڑھ کر مجھے وہ دلبر جانی

کوئی گردش میں ہے کیا دشت سے گھر تک اب بھی
خاک اڑتی ہے مری حد نظر تک اب بھی

لے گئی کھینچ کے شاید انھیں مٹی کی مہک
اڑ کے پہنچے نہیں کچھ پھول شجر تک اب بھی

رزق بن جائیں گے کچھ دیر میں تاریکی کا
محو پرواز ہیں جو شمس و قمر تک اب بھی

اپنی بنیاد پہ قائم ہیں مرے ہوش و حواس
خون چڑھتا ہے مرے پاؤں سے سر تک اب بھی

جن کو پانے کی تمنا ہے ازل سے مرے ساتھ
ہاتھ پہنچا نہیں ان برگ و ثمر تک اب بھی

کھل نہیں پایا مری روح پہ صحرا ساجد
یعنی محدود ہوں میں سیر و سفر تک اب بھی

غزلیں

غلام حسین ساجد

حاصل کسی سے نقدِ حمایت نہ کر سکا
میں اپنی سلطنت پہ حکومت نہ کر سکا

ہر رنگ میں رقیبِ زر و نام و ننگ ہوں
میں وہ ہوں جو کسی سے محبت نہ کر سکا

گھلتا رہا ہے میری رگوں میں بھی کوئی زہر
لیکن میں اس دیار سے ہجرت نہ کر سکا

پڑتا نہیں کسی کے بچھڑنے سے کوئی فرق
میں اس کو سچ بتانے کی زحمت نہ کر سکا

آیا جو اس کا ذکر تو میں گنگ رہ گیا
اور آئینے سے اس کی شکایت نہ کر سکا

باقی رکھی ہے میرے لہو نے متاعِ ہوش
میں نے وفا تو کی تھی، نہایت نہ کر سکا

اب بھی شگفتِ نور سے ہے اس کو ربطِ خاص
وہ جو مرے چراغ کی عزت نہ کر سکا

ہر چند اس گلاب پہ تشبیب کھل گئی
اس پر بھی میں گریز کی ہمت نہ کر سکا

ساجد قفس کی تیلیوں کو توڑ کر بھی میں
اس دشتِ بے کنار میں وحشت نہ کر سکا

کڑی نگاہ رکھے گا وہ سیم تن مجھ پر
کہ مہرباں ہے کسی پھول کا بدن مجھ پر

میں ایک کھوئی ہوئی آگ کی تلاش میں تھا
شگفتہ ہونے لگے ہیں مگر چمن مجھ پر

پھر ایک بار وہی دھوپ اوڑھ کر نکلوں
کرے گا چھاؤں اگر آج بھی گگن مجھ پر

فراق و وصل حقیقت میں ایک ہوں کہ نہ ہوں
کسی کے عشق میں لازم ہے حسنِ ظن مجھ پر

الگ الگ ہی رہیں گے دمِ وصال بھی ہم
میں اپنے من پہ فدا ہوں نہ میرا من مجھ پر

کسی طلسم سے روشن ہے میرا دل ساجد
دیارِ غیب سے اترے گا کوئی فن مجھ پر

غلام حسین ساجد

جب کوئی پھول مسخر نہ ہو آسانی سے
کام لیتا ہوں وہاں نقد ثنا خوانی سے

روشنی دینے لگے تھے مری آنکھوں کے چراغ
رات تکتا تھا سمندر مجھے حیرانی سے

کرکے دیکھوں گا کسی طرح لہو کی بارش
آتش ہجر بجھے گی نہ اگر پانی سے

ان کو پانے کی تمنا نہیں جاتی دل سے
کیا منور ہیں ستارے مری تابانی سے

کوئی مصروف ہے تزئین میں قصر دل کی
چوب کاری سے کہیں آئینہ سامانی سے

خاک زادوں سے تعلق نہیں رکھتے کچھ لوگ
میزبانی سے غرض ان کو نہ مہمانی سے

میں اسی خاک پہ بیٹھا ہوں بڑے شوق کے ساتھ
کوئی نسبت نہیں اب تک مجھے سلطانی سے

بند ہوجائے اگر روزن امکان خیال
خواب کھلتے ہیں مرے دل میں فراوانی سے

میری صورت سے جو بیزار ہیں اب بھی ساجد
کب وہ خوش ہوں گے مرے طرز مسلمانی سے

سر پر کسی غریب کے ناچار گر پڑے
ممکن ہے میرے صبر کی دیوار گر پڑے

کیا خوب سرخ رو ہوئے ہم کار عشق میں
دوچار کام آگئے دوچار گر پڑے

اس بار جب اجل سے مرا سامنا ہوا
کشتی سے خواب ہاتھ سے پتوار گر پڑے

روشن کوئی چراغ نہیں نخل طور پر
سجدے میں کس کو دیکھ کر اشجار گر پڑے

کرتی ہے فرش خاک کو دیوار آئینہ
آنکھوں سے جب یہ دولت بیدار گر پڑے

اس پار دیکھ کر مجھے اک گلبدن کے ساتھ
جتنے مرے گلاب تھے اس پار گر پڑے

ساجد اگر عزیز تھی اپنی انا انھیں
کیا سوچ کر گلی میں مرے یار گر پڑے

غلام حسین ساجد

کچھ روز سے میں بھی بہت آسودگی کے ساتھ ہوں
اب کوئی میرے ساتھ ہے یا میں کسی کے ساتھ ہوں
پیوست ہے میرے لہو میں ظاہر و باطن کی ضو
آزردگی کے ساتھ ہوں جب سے خوشی کے ساتھ ہوں
اک بوجھ ہے اب میرے سینے پر مری موجودگی
میں ساتھ ہوں اپنے مگر اک بے رخی کے ساتھ ہوں
کیا سوچ کر میں نے قدم رکھا تھا دشتِ نجد میں
کیوں غیب سے اتری ہوئی آوارگی کے ساتھ ہوں
میں ساتھ ہوں اس کے بہر صورت طلوعِ مہر تک
سنجیدگی کے ساتھ ہوں یا دل لگی کے ساتھ ہوں
کہتا نہیں، سنتا نہیں، ہنستا نہیں، روتا نہیں
میں بھی ازل سے آج تک کیسے غبی کے ساتھ ہوں
اک موج میں بڑھتا چلا جاتا ہوں منزل کی طرف
یعنی فنا کی راہ پر میں بھی سبھی کے ساتھ ہوں
کچھ خوف کھانے کی ضرورت ہے نہ لازم احتیاط
میں لشکری ہوں آپ کا اور آپ ہی کے ساتھ ہوں
مدت ہوئی ہے خود فریبی کے زمانے کو لدے
اب جو مرا ہو کر رہے گا میں اسی کے ساتھ ہوں
ساجد ابھی تک قرض ہے مجھ پر مری پہچان کا
شامل کسی کے رنگ میں اپنی کمی کے ساتھ ہوں

دن کے پیکر میں کہیں رات میں ڈھلتے ہوئے رنگ
جانے رکتے ہیں کہاں نیند میں چلتے ہوئے رنگ
آخری شمع بجھاتے ہوئے اپنے گھر کی
میں نے دیکھے تھے کسی طاق میں جلتے ہوئے رنگ
اس پری زاد کی آنکھوں میں دکھائی دیں گے
ایک ہی پل میں کئی رنگ بدلتے ہوئے رنگ
سر اٹھاتے ہیں مرے ڈوبتے لہجے میں کہیں
گفتگو کرتے ہوئے لفظ اگلتے ہوئے رنگ
صبح دم گھر سے نکلنا ہی اگر پڑ جائے
نیند سے آنکھ چراتا ہوں مسلتے ہوئے رنگ
ہار آیا ہوں کسی آئینہ خانے میں انھیں
میرے ہمراہ نہیں آج اچھلتے ہوئے رنگ
اک بدلتی ہوئی دنیا کے مکیں ہیں ساجد
خاک پر گرتے ہوئے اور سنبھلتے ہوئے رنگ

پہلا انسان

صدیق عالم

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
ہنسنے کی عادت تھی تم کو نہ رونے کا طور تمھیں
خاموشی اک حیرت تھی اور بے معنی تھے شور تمھیں
تم کو ہونے کی تکلیف کا تھوڑا کچھ احساس تو تھا
کچھ بھی نہ ہونے کو کھونا بھی تو یکسر آسان نہ تھا

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
مٹی کی آنکھوں سے تم نے جنت کا سپنا دیکھا
تم نے جو کچھ جیسا دیکھنا چاہا تھا ویسا دیکھا
تم نے لب سی کر دیکھا الفاظ ہزاروں زندہ تھے
اور ہوئے گویا تو لفظوں کو گونگا بہرا دیکھا

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
تم میں اک ویرانی تھی جس کا رب کو احساس بھی تھا
تم میں اک تنہائی تھی جس کا سب کو احساس بھی تھا
ایک تماشا بھی تم تھے اور ایک تماشائی بھی تم
پربت بھی تم تھے اپنی آنکھوں میں اور کھائی بھی تم

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
چلنے سے تم کو رغبت کیا ہوتی جب منزل تھی ہی نہیں
بیٹھ بھی جاتے تو اس میں راحت کچھ شامل تھی ہی نہیں
کوئی صدا کیا آتی تم تک تم مفہوم سے خالی تھے
اور نہ تھے محروم جوابوں سے اور نہ کوئی سوالی تھے

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
تم نے رب سے پوچھا ہوگا آخر یہ اسرار ہے کیا
چیزیں تو موجود ہیں ساری چیزوں کے اس پار ہے کیا
کس کی خاطر یہ سب کچھ ہے اب کیا ہونا باقی ہے
لب اور آنکھیں دی ہیں جب کیا ہنسنا رونا باقی ہے

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
لاکھوں پیڑ پرندے سب بے نام یہاں پر جیتے ہیں
باغ عدن کے سارے چشمے اپنے آپ کو پیتے ہیں
ایک خموشی اور ذرا سا شور مگر بے معنی سب
پتھر پانی رنگ ہوا یہ جزر و مد بے معنی سب

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
اپنے اندر کے گلیاروں میں تم نے جانا چاہا
واپس باہر آکر بھی تم نے خود کو پانا چاہا
حکم کڑا تھا پر تم کو آزادی بھی کچھ حاصل تھی
اور تجسس میں اک عورت بھی تمھارے شامل تھی

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
کیوں اندر سے ٹوٹ گئے تم کیوں اتنے مغرور ہوئے
کیسی تھی پرواز کہ سات افلاک سے دور ہوئے
کیا تھی وہ آواز تمھارے باطن سے جو آئی تھی
وہ آواز کہ جس کو سننے پر دونوں مجبور ہوئے

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
پھر وہ اک پل جس کے بعد کے سارے پل بھی تمھارے تھے
پیڑ ہوا پانی اور بجلی آج اور کل بھی تمھارے تھے
ہر پل ہر دن ہوتی تھی تم پر یلغار سوالوں کی
آگے پیچھے گھومتے رہتا مکڑی بھوت خیالوں کی

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
آ کر اس دھرتی پر آنسو چاروں کھونٹ گرایا ہوگا
جب بھی یاد تمھیں اپنی تخلیق کا قصہ آیا ہوگا
(اپنی چھاتی تھام کے دھرتی کیسے چیخ کے روئی ہوگی
حکم رب جب نیک فرشتہ مٹی لینے آیا ہوگا)

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
تم نے دیکھا دور فلک میں چاند ستارے چلتے ہیں
ساکن ہے دریا کا پانی اور کنارے چلتے ہیں
سارے قصے وقت کے لکھے ساری حقیقت مٹی کی
آگے پیچھے سوتے جاگتے خواب تمھارے چلتے ہیں

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
چیر کے تم نے دیکھا ہوگا مٹی کے اندر ہے کیا
اس کے اندر آگ یہ کیوں ہے آخر پتھر ہے کیا
پانی کے جب پاؤں نہیں یہ کیسے چل کر جاتا ہے
کتنے سارے رنگ زمیں پر آخر یہ تیور ہے کیا

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
قطروں کے اندر کی دنیا بادل کا دیوانہ پن
ذروں کے گہنائے چہرے صحرا کا ویرانہ پن
چلتے چلتے بن گئے ہوں گے جادہ اور پھر پگڈنڈی
شکلیں ہر پل جاگتی ہوں گی جنگل جھاڑی کھیت پون

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
پھر اک دن اس آئینے میں جاگی ہوگی نقل نئی
نئی صدائیں نئی ادائیں نئے ارادے عقل نئی
خاموشی نے دی ہوگی آواز کہ آخر کون ہو تم؟
ماضی کی کشتی میں غلطاں فکر میں مستقبل کی گم

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
کالے کوسوں کی ویرانی سے گھبرا کر لوٹ آئے
خود اپنی پرچھائیں سے بھی تم اکتا کر لوٹ آئے
جاننا چاہا تم نے کیا کچھ پر کچھ بھی ہاتھ نہ آیا
پایا نہ کچھ بھی اس کو بھی آخر چھوڑ گنوا کر لوٹ آئے

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
چاروں جانب سناٹا تھا اور تم تھے رنجور بہت
پر کیا کرتے دھرتی گونگی اور فلک تھا دور بہت
اک ویرانی اندر باہر چاروں جانب پھیلی تھی
خالق کی مجبوریاں اپنی اور تم بھی مجبور بہت

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
ایک صدا جو دور افق سے از خود لوٹ کے آئی تھی
جس کے بعد کی خاموشی میں ایک عجب گویائی تھی
دھیرے دھیرے سارے لفظوں نے مفہوم نکالے تھے
چلتے چلتے پیروں نے خود اپنی منزل پائی تھی

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
وقت تھا اک بے کار کا قصہ جس کو سنتے رہنا تھا
دھاگا ادھیڑتے رہنا تھا اور پھر سے بنتے رہنا تھا
چلتے چلتے آخر لوٹ کے آنا تھا اپنے اندر
اپنے پاؤں کے گٹھوں سے بس کانٹے چنتے رہنا تھا

تم پہلے انسان تھے اور یہ پہلا پن آسان نہ تھا
جنت میں جو گذرا ہوگا وہ جیون آسان نہ تھا

سید عارف

وہ میرے ساتھ سفر میں تو چلنے والا ہے
کہیں وہ چپکے سے رستہ بدلنے والا ہے

برس بھی جائے وہ بادل تو کس کو پروا ہے
لہو تو آنکھ سے پھر بھی نکلنے والا ہے

میں اس کے خواب سے آگے بھی اس کو لے جاؤں
مگر وہ بات کو اپنی بدلنے والا ہے

جدھر بھی جاؤں میں رستے پکار اٹھتے ہیں
عذاب رات کا ہرگز نہ ٹلنے والا ہے

چلو پہاڑ کے اس پار چل کے دیکھیں گے
ہمارے نام دفینہ نکلنے والا ہے

وفا کے نام پہ میں نے جو چوٹ کھائی ہے
ترا مزاج بھی شاید بدلنے والا ہے

سیلاب قصر دل سے گذرتا ہوا سا ہے
شیشے کا یہ مکان بکھرتا ہوا سا ہے

ٹھہرے کہاں نگاہ کہ سورج ہے سامنے
آنکھوں میں دھوپ دشت اترتا ہوا سا ہے

کچھ بھی ملا نہیں ہے سمندر میں ڈوب کر
لیکن جزیرہ کوئی ابھرتا ہوا سا ہے

دھندلا رہے ہیں نقش حوادث کی مار سے
منظر تمھاری یاد کا مرتا ہوا سا ہے

گھر میں اداسیوں کا ہے میلہ لگا ہوا
موسم غموں کا اپنے نکھرتا ہوا سا ہے

لیکن مجھے یہ شام جگائے گی رات بھر
دن کا ہر ایک زخم تو بھرتا ہوا سا ہے

سید عارف

کہیں پہ خواب کہیں خواب کا گماں نکلا
یہاں بھی آدمی آخر کو بے نشاں نکلا

صنم تراشے ہیں تو نے ہی اپنی مرضی سے
جبینِ شوق ترا حوصلہ کہاں نکلا

اگر عذاب سے نکلے تو یہ بھی دیکھیں گے
زمیں کے کون سے حصے سے آسماں نکلا

گذرتی شام کے منظر پہ رات ہنس کے تو دیکھ
مرے لہو کا اگر شعلۂ نہاں نکلا

•

وہ میرا خواب جو مہتاب ہونے والا تھا
پلٹ کے دیکھا تو کم آب ہونے والا تھا

برستی آگ کا موسم بھی ساتھ چلتا ہے
مرا گمان کہ شاداب ہونے والا تھا

بلاوا مٹی کا آیا تھا سانس لینے پر
سفر تو یوں بھی مرا خواب ہونے والا تھا

امڈ کے آئے تھے آنسو کہ جلتی آنکھوں میں
وفا کا رنگ بھی نایاب ہونے والا تھا

•

ہمارے ساتھ زمانہ بھی چلنے لگتا ہے
ستارے دیکھ کے رستہ بدلنے لگتا ہے

گمان ایسا کہ منزل ملے گی رستے میں
مگر نیا نیا سا جو رستہ نکلنے لگتا ہے

گلے تو لگتا ہے وہ بے خودی کے عالم میں
ذرا جو ہوش میں آئے سنبھلنے لگتا ہے

اسی کا خواب ہے آنکھوں کے تپتے صحرا میں
اسی کی یاد میں دل بھی مچلنے لگتا ہے

کسی کی یاد ہمیشہ سنبھال رکھوں مگر
لہو کے ساتھ بدن بھی تو جلنے لگتا ہے

سید عارف

آؤ کہ کوئی خواب کریں ان کے حوالے
دیکھے ہی نہیں جن نے کبھی دن میں اجالے

پاگل سا ہوا جاتا ہے خاموش سمندر
پانی پہ برس جاتے ہیں جب چاند کے ہالے

ہم سا بھی گنہگار کوئی ہو تو بتاؤ
پتھر پہ کھلائے ہیں بہت خون سے لالے

منظر کوئی ہنستا ہوا آنکھوں میں چھپالوں
ہے کون جو اک پل کے لئے موت کو ٹالے

پھولوں سے ڈھکے راستے ہموار بہت ہیں
آزار مسافر ہیں مگر پاؤں کے چھالے

منظر یہ اپنی آنکھ میں کیسا اتر گیا
شیشے کی سمت دیکھا تو شیشہ بکھر گیا

اک خواب تھا جو مجھ سے بیاں ہو نہیں سکا
اک رنگ تھا جو دھوپ سے ٹکرا کے مر گیا

ایسا ہوا کہ نیند بھی رستہ بھٹک گئی
سورج بھی جلتی آنکھ میں سب دھوپ بھر گیا

کیسی یہ رات ہے کہ ہوا بھی لرز اٹھی
کیسی یہ روشنی کہ ستارہ بھی ڈر گیا

پتھرا گئے ہیں پھول سے معصوم لوگ بھی
بستی پہ اپنی کون سا موسم گذر گیا

سید عارف

(ناصر کاظمی کی یاد میں)

جو کچھ اپنے دل پر گذری کچھ نہ کہو تو بہتر ہے
ہنس ہنس کر ہی عارف اس کی بات سنو تو بہتر ہے

سن لو دل کے سودے میں اب جھوٹ بھی کام نہ آئے گا
اوبڑ کھابڑ رستے پر اب ساتھ چلو تو بہتر ہے

موسم بدلا بجلی چمکی منظر سارا بھیگ گیا
اپنے اپنے گھر چلنے کی بات کرو تو بہتر ہے

شیش محل کا دھوکا دینا اب اتنا آسان نہیں
ٹوٹی پھوٹی کٹیا میں خاموش رہو تو بہتر ہے

آخر کب تک دور رہو گے اس کی میٹھی باتوں سے
ٹوٹے رشتے پھر سے جوڑو ایسا ہو تو بہتر ہے

(شمیم حنفی کی نذر)

محفل میں رات رات اجالا اسی کا ہے
ساغر کی گردشوں میں حوالہ اسی کا ہے

اس رنگ چور نے تو دھنک کو چرا لیا
آیا ہے چاندنی میں تو ہالہ اسی کا ہے

ہم تو اکیلے روز الجھتے ہیں خواب سے
کچھ بوجھ زندگی کا سنبھالا اسی کا ہے

در در بھٹکتے رہنے کی عادت نہیں مگر
محفل سے یہ غریب نکالا اسی کا ہے

عارف شمیم ساتھ چلیں رات ہو گئی
رستے میں چاند تارا اچھالا اسی کا ہے

مرے خیال میں شکلیں بدل کے آتی ہیں
اسی خرابے سے پریاں نکل کے آتی ہیں

مرے زوال میں نیندوں کا کچھ تو حصہ ہے
مری تلاش میں راتیں بھی چل کے آتی ہیں

مرے بدن میں لہو چیختا ہے راتوں کو
ہوائیں آتی ہیں لیکن سنبھل کے آتی ہیں

خوشی کہاں کی ہے عارف غموں کا قصہ ہے
رفاقتیں بھی تو خوابوں میں ڈھل کے آتی ہیں

سراج اجملی

مرحلے سخت بہت پیش نظر بھی آئے
ہم مگر طے یہ سفر شان سے کر بھی آئے

واپسی ہم نے مناسب نہیں سمجھی جو چلے
گرچہ آنکھوں میں کئی دیدۂ تر بھی آئے

رخ روشن، نگہ تار، دل افسردہ
ان مراحل میں کوئی ربط نظر بھی آئے

اس سفر میں کئی ایسے بھی ملے لوگ ہمیں
جو بلندی پہ گئے اور اتر بھی آئے

صرف ہونے سے کہاں مسئلہ حل ہوتا ہے
پس دیوار کوئی ہے تو نظر بھی آئے

دل اگر ہے تو نہ ہو درد سے خالی کسی طور
آنکھ اگر ہے تو کسی بات پہ بھر بھی آئے

وہ تعلق زندگی جس میں رہا بالواسطہ میں
اس سمیت اک دن سپرد طاق نسیاں ہو گیا میں

بس یہی موسم تھا ایسا ہی سماں تھا یاد ہوگا
طاق جاں میں شمع اک روشن ہوئی اور بجھ گیا میں

ایک دن ایسا کہ تھی قربان اس پر جاں سی شے بھی
ایک دن ڈرنے لگا اک شخص سے باقاعدہ میں

داستان غم مری سننے کو اک سامع ملا جب
قہقہے پہلے لگائے اور پھر چپ ہو گیا میں

شام منبر پر فضیلت کے بہت سنجیدہ فرحاں
صبح دم افسردگی کے فرش پر بکھرا ہوا میں

واپسی کی راہ کیوں ملتی نہیں ہے ساتھ والو
گرچہ اس بازار میں آیا گیا ہوں بارہا میں

حارث خلیق

خون سر پر
سارا لشکر ہاتھیوں پر ہے سوار
ابرہہ، آمادۂ جنگ اور ہاتھی بے شمار
چیختے، چنگھاڑتے ان ہاتھیوں کا ڈیل ڈول
الاماں والحفیظ
اک نظر پڑنے سے
سارے شہر پر طاری ہے ہول
یہ مہاوت اور سارے لشکری، اصحاب فیل
کیل، کانٹے، ڈھال، تلواریں، غذا، اور وردیاں
ہر طرح سے خود کفیل
ہاتھیوں کی ایسی ہیبت ناک سونڈیں اور ستون
ایک ریگستان اڑاتی
ان کے پیروں کی دھمک
چاہیے ان کو نہ ہوگی جنگ میں کوئی کمک
جنگ میں ان کے مقابل کون ہے؟
شہر کے یہ پا پیادہ لشکری؟
کس قدر بے آسرا، بے دست و پا
بھوک جن کا میمنہ، افلاس جن کا میسرہ

قلب میں لیکن ہیں
آزادی کے خواب
ہاں مگر کیا واقعی بے آسرا ہوتے ہیں وہ؟
قلب میں جن کے ہوں آزادی کے خواب؟
شہر کے یہ پا پیادہ لشکری
ان کے خوابوں اور عمل نے کتنی ہی صدیوں کے بعد
پھر سے دھارا ہے ابابیلوں کا روپ
میں نے دیکھی ہے افق پر دور جو لمبی قطار
آگ میں پکی ہوئی مٹی کی چھوٹی گولیاں
اپنی منقاروں میں تھامے
آ رہی ہیں بے شمار
ابرہہ اور اس کے ہاتھی
یہ مہاوت اور سارے لشکری، اصحاب فیل
آگ برساتی ابابیلوں کے آگے خاک ہوں گے
شہر کے یہ پا پیادہ لشکری بے باک ہوں گے
ابرہہ اور اس کے ہاتھی
سب خس و خاشاک ہوں گے

قربان آتش

نیا لہجہ نیا منظر نیا پندار ہو پیدا
مرے نغموں سے ایسی رونق گلزار ہو پیدا

یہی تھا مصلحت اندیش موسم کا تقاضا کیا
صدائے خامشی سے اک نئی گفتار ہو پیدا

بکھر جاتا ہے سب شیرازۂ امن وسکوں آخر
اگر بستی میں کوئی آدمی خوں خوار ہو پیدا

کہاں برداشت ہو سکتا ہے یہ مجھ سے کسی صورت
ثمر پکنے سے پہلے ہی کوئی حق دار ہو پیدا

ہمیشہ چھیڑتا ہوں ساز اپنے کہنہ زخموں کا
مرے دل کے بیاباں میں کوئی گلزار ہو پیدا

یہی میں چاہتا ہوں اے غزالہ دشت وصحرا میں
کہ اب میرے جنوں سے گرمی بازار ہو پیدا

مضامیں غیب سے آتے نہیں آتش تو کیا کہیے
کہاں سے شعر کوئی بھی مرا تہ دار ہو پیدا

نگاہ فقر ہی شان سکندری جانے(۱)
وہی ہے شاہ جو راز قلندری جانے

ہوا بکھیرتی مجھ کو ہے گرد کی صورت
جہاں میں کون ہے جو میری بے گھری جانے

بس ایک تیرے سوا بے خبر نہیں کوئی
ہمارا حال تو رستے کی کنکری جانے

تری اداؤں کی پہچان خوب ہے مجھ کو
ترے کرم کی کوئی کیا ستم گری جانے

مری نگاہ میں کون ومکاں کی بستی ہے
زمانہ کیا مرا طرز قلندری جانے

تو عرش وفرش پہ آنکھیں لگائے رہتا ہے
کہاں سے تیری طرح کوئی مخبری جانے

۱نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے(اقبال)

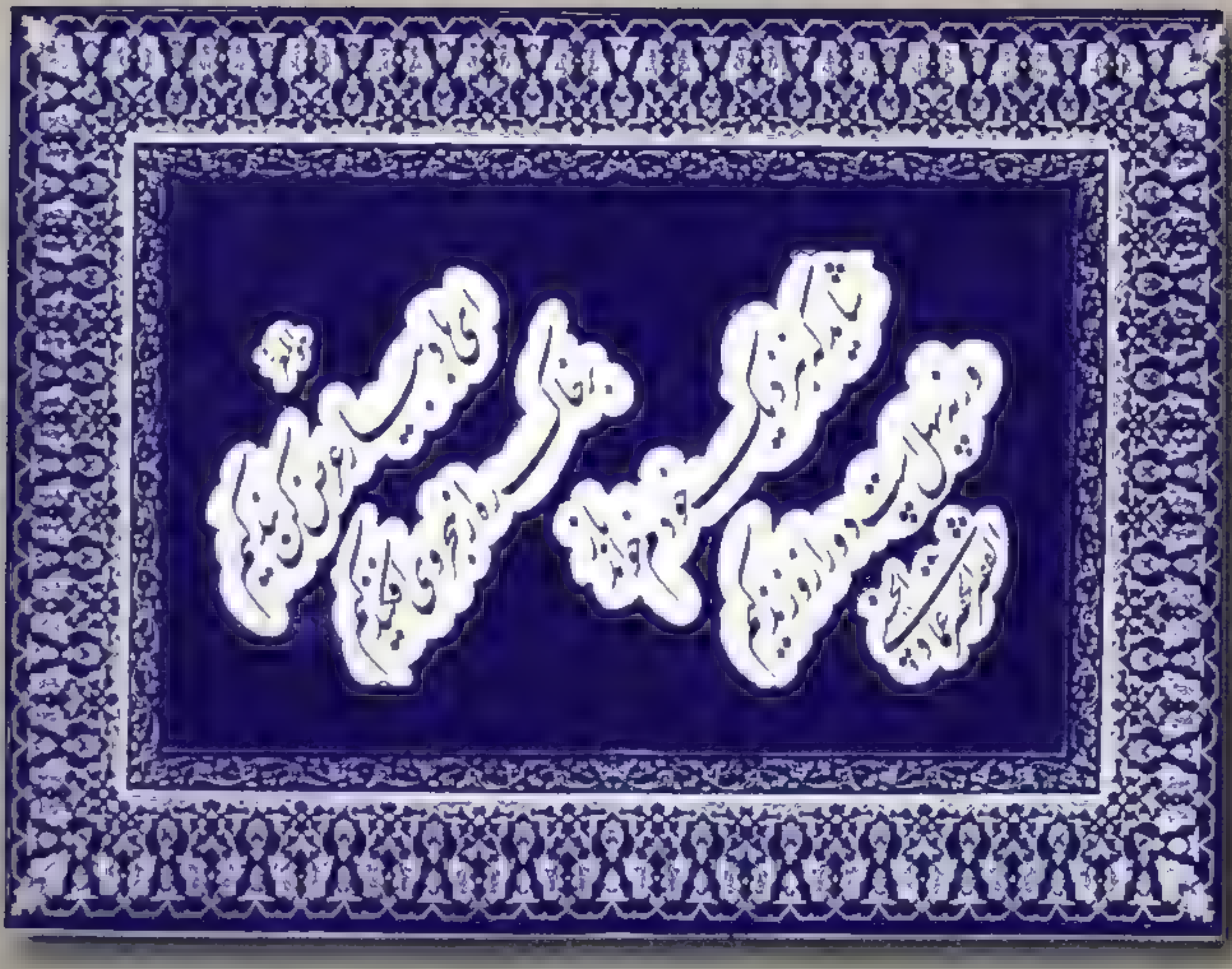

هوالعلیم

آناں کہ محیط فضل و آداب شدند　　　در جمع کمال شمع اصحاب شدند
رہ زیں شب تاریک نہ بردند بہ روز　　　گفتند فسانہ اے و در خواب شدند

غلام حسین امیر خانی ۱۳۷۳

(وہ لوگ جن کی ہستی فضل اور آداب کو محیط تھی، وہ لوگ مجمع اہل کمال میں اپنے ساتھیوں کے درمیان شمع کی طرح روشن تھے۔ لیکن اس شب تاریک میں وہ اپنے سفر کو صبح تک نہ لے جا سکے۔ انھوں نے اپنا اپنا افسانہ کہا اور محو خواب ہو گئے۔)

خطاط : غلام حسین امیر خانی (تہران)
وصلی مرسلہ : رسول مرادی (تہران)

هوالمعز

اے باد بیار عرض کن بندگیم　　　بر خاک رہ از ہجر وے افگندگیم
شاید کہ بہ نزدیک خودم خواند باز　　　ورنہ سہل است دور از و زندگیم

الفقیر الحقیر عماد الحسنی ۱۰۱۷

(اے ہوا میرے یار کی خدمت میں میرا اسلام پیش کر اور اس کے ہجر میں میرا خاک رہ پر پڑا رہنا بتا۔ شاید کہ وہ مجھے پھر اپنے پاس بلا لے، ورنہ اس سے دور رہ کر میری زندگی آسان تو ہے ہی۔)

خطاط : میر عماد الحسنی
وصلی مرسلہ : محمد احرار ہندی (شبلی باڑی، دھنباد)

شاعری کا زمانی پہلو

معراج رعنا

بڑی شاعری اس صفت سے متصف ہوتی ہے کہ اسے ہم چاہیں بھی تو کسی خاص زمانے سے موسوم نہیں کر سکتے ہیں۔ بڑی شاعری زمانے کی پابند نہیں ہوتی اور اس اعتبار سے اس کا مطالعہ بھی کسی خاص زمانی سیاق وسباق کا پابند نہیں ہوتا۔ ماضی، حال اور مستقبل کی جداگانہ زمانی تقسیم شاعری میں ممکن تو ہے لیکن بڑی شاعری کے لئے اس نوع کی تقسیم اس لیے ممکن نہیں کہ اس میں یہ تینوں زمانے ایک دوسرے سے اس طرح گتھے ہوتے ہیں کہ ان کی علیحدگی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ شاعری کی یہی انضمامی خوبی اسے بڑا بناتی ہے۔ داغ کا شعر ہے۔

دلی میں پھول والوں کا میلہ پھر آئے داغ
بن ٹھن کے آئے وہ تو قیامت کی سیر ہو

یہاں "دلی"، "پھول والوں کا میلہ" اور "سیر" جیسے الفاظ کے باہمی اشتراک سے ایک ایسے منظر نامے کی تشکیل ہوتی ہے جس کا تعلق داخلی کیفیات سے کم اور خارجی مظاہر سے زیادہ ہے۔ یعنی ہنگامہ آرائی کی عام جستجو شعر کی محرک قوت ہے۔ شاعر میلے کا آرزومند اس لیے ہے کہ میلے سے معشوق کا تصور وابستہ ہے۔ امید یہ ہے کہ جب میلہ آئے گا تو اس میں معشوق بھی اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہوگا اور اس کی دید شاعر کے لیے سیر قیامت ثابت ہوگی۔

شعر میں جو تجربہ یا مشاہدہ بیان ہوا ہے اس میں عدم اعتماد نمایاں ہے کہ تجربے یا مشاہدے کی بنیاد قیاس آرائی پر رکھی گئی ہے اور قیاس آرائی بھی ایسی کہ جس میں امید بر آنے کی گنجائش میں تذبذب کا عنصر غالب ہے۔ ممکن ہے کہ میلہ تو آئے لیکن اس میں معشوق نہ ہو۔ اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ وہ آئے تو بن ٹھن کے ہی آئے۔ ایک جلوے یا ادا کا دوسری سے ہم آہنگ نہ ہونا تو کلاسیکی غزل کے معشوق کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ لہٰذا شاعر کے لئے "میلہ" اسی وقت با معنی ثابت ہوگا جب اس میں معشوق اپنی سج دھج کے ساتھ موجود ہو۔ یعنی میلے پر معشوق کو فوقیت حاصل ہو اور معشوق پر اس سج دھج کو جو اضافی حسن کی مظہر ہوتی ہے۔ "قیامت کی سیر" کی مشروط صورت حال سے جہاں معشوق کے فطری حسن پر سوالیہ نشان قائم ہوتا ہے وہیں عاشق کی ایک خارجی مظہر (سج دھج) میں دلچسپی کی بھی توثیق ہوتی ہے۔

"قیامت کی سیر" کے علاوہ شعر میں ایک بھی لفظ ایسا نہیں ہے جو معنی پذیری کے عمل سے گذر چکا ہو۔ سارے الفاظ اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ انھیں استعارے کی رفعت حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شعر ایک عام واقعاتی سطح سے اوپر نہیں اٹھتا۔ یعنی شعر میں ایک مضمون تو ہے لیکن معنی نہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ شعر میں جس واقعاتی صورت حال کو بیان کیا گیا وہ ایک خاص زمانی حد بندی کا تابع ہے۔ دونوں مصرعوں میں "آئے" کی تکرار سے جس ملتجیانہ لہجے کی تشکیل ہوتی ہے اس سے حال رواں اور جزوی طور پر حال گذشتہ میں رونما ہونے والے واقعے کی جستجو نمایاں ہے۔ مزید بر آں، لفظ "دلی" اور اس کے انسلاکات سے نہ صرف یہ کہ جائے واقعہ کا تعین ہوتا ہے بلکہ شعر کی تفہیم ایک خاص ثقافتی حوالے کی متقاضی ہو جاتی ہے۔ یہاں "دلی" محض ایک مادی شہر ہے جہاں انسانی نقل وحرکت کی یکرخی تصویر کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ متوسط ذہن کے کسی بھی شاعر سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ خارجی اشیا کے بیان میں اس قدر متنوع ہو کہ موضوع کے ساتھ ساتھ معنی کی ایک دنیا بھی شعر میں آباد ہو جائے۔

ایسے شاعروں کے برعکس، اعلیٰ ذہن کے شاعر کی شاعری میں لفظوں کی ایک ایسی جامع ترتیب ہوتی ہے جس میں معنی کے متعدد امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ استعارے تو استعارے، وہ عام فہم لفظ کو بھی اس طرح استعمال کرتا ہے کہ بیان میں تہ داری پیدا ہو جاتی ہے۔ میر وغالب کی شاعری کا بڑا حصہ اس نوع کی شاعری کی عمدہ مثال ہے، لیکن فی الحال یہاں ناصر کاظمی کے ایک شعر کی مثال دیتا ہوں۔

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ

سرسری طور پر دیکھا جائے تو داغ کے شعر کی طرح اس شعر میں بھی خارجی مظاہر کی عکاسی نمایاں ہے۔ دلی کی تباہی و بربادی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کا حزنیہ اظہار شعر کا بنیادی نکتہ ہے۔ لیکن اس نکتے سے متصل مزید نکتے بھی ہیں۔ مثلاً لفظی مناسبتیں اور دلی کے اجڑنے اور بسنے کا

تاریخی حوالہ۔ یہ دونوں چیزیں کم وبیش داغ کے شعر میں بھی موجود ہیں لیکن داغ کے شعر کی مناسبتیں اور اس کا ثقافتی حوالہ دلی کے ایک خاص طربیاتی پہلو کو نمایاں کرنے کے علاوہ کسی گہری معنویت کو خلق کرنے سے قاصر رہا ہے۔ ناصر کاظمی کی مناسبتوں کے ذریعے خارجی حقائق کو داخلی واردات سے مربوط کر کے ایک سیدھے سادے موضوع کے گرد معنی کی ایک غیر متوقع دنیا آباد کر دی گئی ہے۔ یہاں "دلی" محض مادی شہر نہیں رہتی بلکہ کسی حسین شے کی علامت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کسی لفظ کا (Connotation) میں منتقل ہونا استعارے یا کنایے کے ظہور کی دلیل ہے۔ "دلی" دل کا استعارہ بھی ہو سکتا ہے اور کنایہ بھی، کیوں کہ اسی لفظ کے حوالے سے گلی، گھر، لوگ، آباد، بربادی اور سوگ کے وسیع تر معنی مرتب و مستحکم ہوتے ہیں۔ اس بات کی توثیق کے لیے ضروری ہے کہ شعر کے کچھ مفاہیم پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

پہلا مفہوم جو بالکل سامنے کا ہے، اور خارجی دنیا سے تعلق رکھتا ہے، یہ ہے کہ ایک شہر (دلی) جس کے گلی کوچے آباد تھے، جہاں ہر طرف ہماہمی اور رونق تھی، نامعلوم اسباب سے اجڑ جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بربادی قدرتی آفات کا نتیجہ ہو یا پھر کسی باہری حملہ آور کی لائی ہوئی تاراجی ہو۔ جو بھی ہو، شہر برباد ہو جاتا ہے تو وہ لوگ بھی معدوم ہو جاتے ہیں جن کی موجودگی کبھی گلیوں کی آبادی کی ضامن ہوا کرتی تھی۔ لوگوں کی عدم موجودگی گھر گھر میں سوگ کا سبب بنتی ہے۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے صرف اسی مفہوم پر اکتفا کر لیں تو بھی اس کے المیاتی گداز اور اسراری کیفیت میں کمی واقع نہیں ہوتی، اور شعر کی عمدگی جوں کی توں برقرار رہتی ہے۔

دوسرا مفہوم داخلی موضوعیت اور باطنی صداقت کے حوالے سے برآمد ہوتا ہے۔ ہم جوں ہی "دلی" کو "دل" متصور کرتے ہیں، شعر ایک جست میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ وہ ساری حقیقتیں جو خارجی دنیا سے متعلق تھیں، داخلی تجربے کا حصہ بن کر ایک نئی حقیقت کی بنیاد ڈالتی ہیں جس کے نتیجے کے طور پر درون ذات ایک شہر کی دریافت ہوتی ہے۔ یہ شہر بھی خارجی شہر (دلی) انبساط والم کے عمل سے گذرتا ہے۔ لیکن اب دلی وہ شہر ہے جس کی گلیوں اور مکانوں میں کبھی تمناؤں اور آرزوؤں کا بسیرا تھا۔ ان تمناؤں کی وجہ سے دل ہمیشہ دھڑکتا رہتا تھا۔ یہ دھڑکن اس کی زندگی کی ضمانت تھی، اور زندگی یہ ضمانت شہر دل کے گوشے گوشے میں موجود تھی۔ لیکن آرزوؤں کی تکمیل نہ ہونے کی وجہ سے احساس محرومی پیدا ہوا، اور وہ احساس محرومی ایک حملہ آور کی طرح شہر دل پر ٹوٹ پڑا۔ اس جابرانہ کارروائی کے بعد بیشتر آرزوؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور باقی ماندہ آرزوئیں اس خوف سے شہر دل سے کسی نامعلوم دنیا کی طرف ہجرت کر جاتی ہیں کہ کہیں ان کا بھی گلا نہ گھونٹ دیا جائے۔

اگر ناصر کاظمی اور داغ کے شعروں کا تقابل کیا جائے تو بعض چیزیں دونوں شعروں میں مشترک بھی ملیں گی۔ پہلی چیز تو ہنگامہ آرائی کا تصور ہے۔ دوسری چیز جائے وقوع کا رکی تعین اور تیسری چیز پیکر تراشی ہے۔ اول دو چیزوں کا تعلق شعر کے مضمون سے ہے اور آخر الذکر کا رشتہ اس نظام سے قائم ہے جو کسی خیال، فکر یا جذبے کو یا تو محض موضوع تک محدود رکھتا ہے یا پھر اسے معنی کے جوہر سے اس طرح ہمکنار کرتا ہے کہ اس کی آب وتاب سے چشم ادراک خیرہ ہو جاتی ہے۔

اس کا انحصار اس بات پر نہیں کہ کوئی شاعر اپنے تجربے یا مشاہدے کے اظہار کے لیے کس نوع کے الفاظ کو وسیلہ بناتا ہے، بلکہ اس بات پر ہے کہ الفاظ کی ترتیب (Order) کیا ہے۔ اگر ترتیب کو نظر انداز کر کے صرف الفاظ کو ان کے ظاہری حسن کی بنا پر اظہار کا وسیلہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ ناصر کاظمی کے شعر کے مقابلے میں داغ کے شعر میں معنوی امکانات زیادہ ہیں۔ "پھول" اور "قیامت" جیسے الفاظ کے ظاہری حسن کے آگے "گلی" "گھر" اور "سوگ" جیسے الفاظ کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی ناصر کاظمی کے شعر میں معنوی خوبیاں داغ کے شعر سے زیادہ ہیں۔ معنوی اعتبار سے یہ دونوں شعر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ داغ کے شعر میں استعارے کو کنایے میں منتقل کرنے والی وہ ترتیب موجود نہیں جو ناصر کاظمی کے شعر میں موجود ہے۔ یہی وہ لفظیاتی ترتیب ہے جو شعر کو زمانی حد بندی سے آزاد کرتی ہے۔ پھر خارجیت، داخلیت اور معروضیت، موضوعیت کی تفریق بھی ختم ہو جاتی ہے۔ انیس اور اقبال کی موضوعاتی شاعری بڑی شاعری کی مثالیں اس لیے بھی ہیں کہ ان میں داخلی معنویت کے متعدد امکانات پوشیدہ ہیں۔

اقبال کے مقابلے میں انیس کی شاعری کو رکھا جائے تو اس کا موضوعاتی دائرہ بہت محدود نظر آتا ہے۔ پھر بھی انیس کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس محدود دائرے میں بھی معنی کی وسعت پیدا کر دی ہے۔ ان کے ایک مرثیے کا یہ بند مثالاً حاضر کیا جا سکتا ہے۔

دل سوز شعلہ خو شرر انداز جاں گداز
لشکر کش و شکست رسان و ظفر نواز
خوں خوار و کج ادا و دل آزار و سرفراز
حاضر جواب تیز طبیعت زباں دراز
کج اس کی ہے پسند جہاں کو کجی نہ ہو
معشوق پھر، نہیں ہے جو اتنی کجی نہ ہو

مذکورہ معروضوں کے توسط سے ایک خارجی شے یعنی "سیف آبدار" کی غیر معمولی تعریف وتوصیف بیان کی گئی ہے۔ اس لیے مذکورہ بند میں صفاتی الفاظ (Adjectival Words) کی ایک ایسی جامع ترتیب موجود ہے جو ایک ٹھوس وجود (تلوار) کو دوسرے متغیر وجود (معشوق) میں منتقل کرتی ہے۔ مطلب یہ کہ جو تعریف "تلوار" کی گئی ہے وہی تعریف کلاسیکی غزل کے معشوق کی بھی ہو سکتی ہے۔ تلوار کی بنیادی صفت ایذا رسانی ہے اور معشوق بھی صفاتی اعتبار سے غم دہندہ یعنی Sadist ہی ہوتا ہے۔ تیسرا مصرع تو قیامت کا ہے۔ حاضر جوابی، طبیعت کی تیزی اور زبان درازی، تلوار کی تین ایسی خارجی صفتیں ہیں جو معشوق کی داخلی صفتیں بھی تسلیم کی گئی ہیں، اور اس کی متعدد شعری سندیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً

ہم جو کہتے ہیں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمھیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

(حاضر جوابی، غالب)

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز   اسی خانہ خراب کی سی ہے

(طبیعت کی تیزی، میر)

درویشوں سے تو ان نے ضدیں نکالیاں ہیں
ایدھر سے ہیں دعائیں اودھر سے گالیاں ہیں

(زبان درازی، میر)

ان مثالوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انیس نے تلوار کی جن خوبیوں کو ایک مصرعے میں بیان کیا ہے میر و غالب انھیں کے بیان میں دو مصرعے صرف کیے ہیں۔ یہ ضروری بھی تھا، کیوں کہ اس مکمل تجربے یا مشاہدے کے اظہار میں دو مصرعوں کی پابندی غزل کی ہیئت کی وہ ناگزیریت ہے جو اسے دوسری ہیئتوں سے ممتاز بناتی ہے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میر و غالب کے محولہ بالا اشعار غزل کے ہیں۔ لیکن یہاں اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ انیس کا مذکورہ مصرع کوزے سمندر کے مترادف ہونے کے باوجود مکتفی نہیں۔ اس کی معنویت اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ شروع کے تین اور آخر کے دو مصرعوں سے اپنا رشتہ استوار نہ کرلے۔ انیس کی مثال سے اس نتیجے پر پہنچنا کس قدر آسان ہوجاتا ہے کہ کوئی شعری بیان محض اس لیے اہم یا غیر اہم نہیں ہوتا کہ اس میں کسی داخلی جذبے یا کسی خارجی حقیقت کی عکاسی کی گئی ہے۔ تہ داری اور دبازت ہی وہ چیزیں ہیں جو کسی شعری بیان کو اہم یا غیر اہم بناتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو بیان تہ دار ہوگا وہ کسی خاص زمانی حد میں لازماً مقید نہیں ہوگا۔ یعنی اس کے اندر تینوں زمانوں کو ضم کرنے کی صلاحیت ہوگی، اور یہ صلاحیت استعاراتی نظام کی رہین منت ہوگی یا نہیں بھی ہوگی۔ مطلب یہ کہ اس میں لفظوں کی ایک مخصوص ترتیب ہوگی جو تشبیہات و استعارات کو ایک مکمل نظام میں تبدیل کرتی ہے۔ اگر صرف استعاروں یا تشبیہوں کے استعمال سے کوئی کلام تہ دار بن جاتا تو جوش ملیح آبادی کی غوغائی شاعری اردو کی بڑی شاعری سمجھی جاتی۔ لیکن آج وہ اوسط درجے کی شاعری میں بھی مقام حاصل نہیں کرسکی ہے تو اسی لیے کہ اس میں وہ استعاراتی نظام مفقود ہے جو نہ صرف یہ کہ کسی شعری فکر کو متشکل کرتا ہے بلکہ اس فکر کو یک زمانی حد بندی سے رہا بھی کرتا ہے۔ انیس کا مذکورہ بند دو مصرعی اشعار پر مشتمل نہ ہونے کے باوجود بھی ایک ایسی بلند آہنگی کا مظہر ہے جس کے آگے جوش کی بلند آہنگی لمحے بھر کو نہیں ٹھہر پاتی کیوں کہ انیس کی بلند آہنگی میں جو نظم و ضبط ہے اس کا دسواں حصہ بھی جوش کی بلند آہنگی کو نصیب نہیں۔ ہنگامی یا نظریاتی شاعری سے یہ توقع کی بھی نہیں جانی چاہیے کہ اس کی بلند آہنگی میں انیس یا اقبال کی سی منظم و منضبط بلند آہنگی کا آٹھواں یا دسواں بھی حصہ پایا جائے۔ یہ انیس کا فنی معجزہ ہے کہ انھوں نے رزمیہ شاعری میں بھی زمانے کی تین مختلف رووں کو یکجا کرکے اسے ایک مکمل نظام حیات تبدیل کردیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انیس کے مرثیوں میں تلوار کی تعریف ہو یا میدان کارزار کی محاکاتی منظر نگاری، یا پھر مقدس کرداروں کو پیکر تراشی کے ذریعہ اجاگر کرنے کا عمل، ہر جگہ تہ داری کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انیس نے یوں تو تمام فنی وسائل کا بھرپور استعمال کیا ہے لیکن حسن تعلیل کو وہ خاص طور پر اپنی تخلیقی کارروائی کا مرکز بناتے ہیں کہ حسن تعلیل کو معنی آفرینی کے ذرائع میں ایک موثر اور بڑا ذریعہ کہا گیا ہے۔ حسن تعلیل وہ صنعت ہے جو موضوع کو معنی اور "دال" کو "مدلول" میں تبدیل کرتی ہے۔ لہٰذا یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگرچہ انیس کے مرثیے کا موضوع ایک خاص مذہبی اور تہذیبی سیاق و سباق کا حامل ہے لیکن موضوع کے بطن میں مخفی معنی کو کسی مخصوص حوالے کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔ معنی کی ناوابستگی اس کے غیر محدود ہونے کا ثبوت بھی ہے اور زمانی تغیر کا اثبات بھی۔ اسی لیے کلاسیکی شعریات میں یہ اصول شروع سے مقبول عام رہا ہے کہ شاعری کا مدار جس قدر معنی پر ہے، اس قدر کسی دوسری چیز پر نہیں۔ کلاسیکی شاعری میں موضوع کو ہمیشہ ثانوی اہمیت دی گئی ہے خواہ وہ بیانیہ شاعری ہی کیوں نہ ہو۔ شاعری میں موضوع کو اہمیت نہ دینے کی جہاں بہت ساری وجہیں ہوسکتی ہیں وہیں ایک اہم وجہ اس کے محدود ہونے کی ہے۔ موضوع ہمیشہ ایک خاص سیاق و سباق کا رہین منت ہوتا ہے۔ اس لیے جو شعر صرف موضوع تک محدود ہوگا، ممکن ہی نہیں کہ اس میں گنجینۂ معانی کا طلسم پایا جائے۔ معنی کی عدم موجودگی میں شعر کا سیال صفت ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ مطلب یہ کہ جو شعر محض موضوع تک محدود ہوگا اس کے اندر یہ قوت ہوگی ہی نہیں کہ وہ زمانی تفریق کو ختم کرکے ایسے زمانی کل میں تبدیل ہوجائے جو پیچھے سے آگے کی طرف سفر کرتا تو ہے لیکن اس میں ماضی، حال اور مستقبل کی شرکت مساویانہ ہوتی ہے۔ داغ کے مقابلے میں ناصر کاظمی کا شعر اہم ہے تو اس لیے کہ اس میں معنی سازی کا عمل موجود ہے۔ اس میں ماضی کا تجربہ بھی ہے، حال کا مشاہدہ بھی اور مستقبل کے امکانات بھی۔ یہ تینوں عناصر ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہیں کہ انھیں الگ کرنے کی کوشش کی جائے تو بھی یہ الگ نہیں کیے جاسکتے۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے انھیں الگ کر بھی دیا جائے تو معنی کی تجسیم اس طرح ممکن نہ ہوگی جس طرح تینوں کی یکجائی میں ممکن ہے۔

ناصر کاظمی کے پہلے مصرعے میں "کہاں گئے وہ لوگ" کے فقرے میں ایک لطیف استفہامی ابہام موجود ہے۔ استفسار کا مخاطب متعین نہیں ہے۔ اس لیے شعر میں مخاطب تین مختلف صورتوں میں مجسم ہوتا ہے۔ پہلا مخاطب شہر دلی ہے، دوسرا متکلم کا دل اور تیسرا وہ گلی اور گھر کے وہ در و دیوار جن سے گم شدہ لوگوں کا براہ راست تعلق تھا۔ مخاطب کی تیسری نوع خود کلامی پر قائم ہے۔ خود کلامی سے شعر میں استعجابی سماں بندی بھی ہوتی ہے اور اسراری کیفیت کی نمو پذیری بھی۔ مخاطب کی جو تین انواع بیان کی گئی ہیں، ان میں سے کسی ایک یا سبھی کا جواب خاموشی کی صورت میں برآمد ہوگا لیکن اس میں مستقبل قریب یا مستقبل بعید کے امکانات پوشیدہ ہوں گے۔ خود مخاطبین میں ایک بھی ایسا نہیں جس میں گویائی کی صفت پائی جاتی ہو لہٰذا ان کے جواب کو شاعر یا استفسار کنندہ احساس کی سطح پر ہی محسوس کرسکتا ہے۔ قیاسی یا محسوساتی جواب میں جو امکانات ہوتے ہیں ان میں امید و یقین کم اور خوف و خدشات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ ناصر کاظمی کے اس شعر کو تین حصوں میں منقسم کرکے لگایا جاسکتا ہے۔

(الف) دلی اب کے ایسی اجڑی (ہے)...

امکانات: زلزلے سے، سیلاب سے، جنگ سے، وغیرہ۔

(ب) کہاں گئے (ہوں گے) وہ لوگ؟

امکانات: مر گئے ہوں گے، جلاوطن کردیئے گئے ہوں گے، گھر چھوڑ کر چلے گئے ہوں گے۔

(ج) (جن سے) گلی گلی آباد تھی۔

امکانات: حاکم، محکوم، عاشق، معشوق، رقیب، دوست، اعزا و اقربا۔

پہلا حصہ "حال رواں" کا عکاس ہے جس میں ماضی کے تجربے کو بیان کیا گیا ہے یعنی حال میں ماضی ضم ہے۔ دوسرے حصے سے مستقبل قریب یا مستقبل بعید کے امکانات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو تینوں حصوں میں ماضی، حال اور مستقبل کی شمولیت برابر کی ہے۔ لیکن جب ان کے امکانات پر غور کیا جائے تو عدم برابری کا احساس ہوتا ہے اور یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس نوع کے امکانات میں یقین کم اور غیر یقینی زیادہ ہوتی ہے۔ یہی غیر یقینی صورت حال ہے جو شعر کو کثیر المعانی بناتی ہے۔ استعارے کا بنیادی وظیفہ ذہن کو متحرک کرنا ہے۔ چونکہ شعر میں غیر یقینی صورت حال کی نمائندگی کا انحصار لفظوں کی مخصوص ترتیب پر ہے، لہٰذا "لفظ" اور "ترتیب" کے بظاہر الگ الگ ہونے کے باوجود، تخلیقی سطح پر ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جہاں یہ دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ داغ کا شعر ایک خاص طربیاتی پہلو کو نمایاں کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر رہا ہے لیکن ناصر کاظمی کے شعر کا انکشافی دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اس میں دوسری کیفیتوں کے ساتھ ساتھ داغ کے شعر کی طربیاتی کیفیت بھی سمٹ آئی ہے۔ "گلی گلی آباد تھی جن سے" طربیاتی کیفیت موجود ہے۔ دلی یا دل کے اجڑنے میں المیاتی گداز ہے۔ دلی یا دل کے اجڑنے کے امکانات میں سے کسی بھی امکان پر غور کیا جائے تو ممکن ہی نہیں کہ اس کی جدلیاتی صورت حال سے انکار کیا جاسکے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ناصر کاظمی جیسا اعلیٰ ذہن شاعر لفظ و ترتیب کے متناسب انجذاب سے شعر میں ایک ایسے واقعے کو نظم کرتا ہے جس پر بیک وقت طربیاتی، المیاتی اور رزمیاتی ہونے کا گمان گذرتا ہے۔

کوئی شاعری محض اس لیے اہم یا غیر اہم نہیں ہوتی کہ اس کا فکری دائرہ وسیع یا محدود ہے۔ بلکہ اس کی عظمت اس کی قوت اظہار میں مضمر ہوتی ہے۔ قوت اظہار ہی وہ ذریعہ ہے جو خیال کو شے میں تبدیل کرتا ہے۔ مثلاً عشق ایک جذبہ یا خیال ہے جس کا براہ راست تعلق دردن ذات سے ہے۔ لیکن ہر اس شعر کو جس میں عشقیہ کیفیت کا اظہار موجود ہو، اہم سمجھنا مناسب نہیں۔ اردو کے سرمایۂ سخن میں جہاں ایسے اشعار بکثرت ملتے ہیں جن میں عشقیہ کیفیت کا بیان محض بیان تک محدود ہے، وہیں ایسے اشعار بھی ہیں جن کے عشقیہ اظہار کو محدود نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس میدان میں میر کے بعد اگر کسی کو مرد میداں قرار دیا جاسکتا ہے تو وہ بجز غالب کے اور کون ہوگا؟

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

پہلے مصرع میں ایک اظہار ہے کہ شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے۔ یہاں "شمع" محض ایک شے اور شاعرانہ اظہار کی خارجی توجیہ ہے۔ اگر خارجی توجیہ نہ ہوتی تو شاعر لفظ "شمع" کے ساتھ کسی صفت کا اضافہ ضرور کرتا۔ بہر حال "شمع" کے استعمال سے پہلے مصرعے میں ایک متحرک پیکر کی تشکیل ہو جاتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں "شعلۂ عشق" اس کیفیت، جذبے یا خیال کی نمائندگی کرتا ہے جس کا تعلق داخل سے ہے۔ اس لیے یہاں "شعلۂ عشق" خیال یا جذبے کی مرئی شکل ہے۔ یہی شکل ایک مضبوط دعوے کے طور پر ابھرتی ہے جن کی دلیل پہلے مصرعے میں دی گئی ہے۔ لیکن جب دعوے کو دلیل سے مربوط کیا جاتا ہے تو "شمع" بھی شمع نہیں رہتی بلکہ "شمع دل" تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس تبدیلی کے بعد نہ صرف یہ کہ "شمع" اور "شعلا عشق" کے بیچ کی نسبت واضح ہو جاتی ہے بلکہ دونوں کی صفات مثلاً روشنی، سرخی، سوز، حرکت وغیرہ میں بھی یکجہتی پیدا ہو جاتی ہے، اور "سیہ پوشی" کی معنویت بھی دوبالا ہو جاتی ہے۔ "شعلۂ عشق" کی کیفیت کو "شمع" کی صورت میں دیکھنے کے لئے جس فن کارانہ ثبوت کو غالب نے اپنے شعر میں پیش کیا ہے اس کی ایک خوبصورت جھلک ان کے معاصر انگریزی شاعر Thomas Campbell کی نظم "عشق اور آزادی" کے مندرجہ ذیل مصرعوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

Love's a fire that needs renewal
of fresh beauty for its fuel;

لیکن اس فرق کے ساتھ کے یہاں "شعلۂ عشق" جیسے عقلی پیکر کی تجسیم کے لیے کسی مخصوص شے یا اشیا کو بروے کار نہیں لایا گیا ہے بلکہ fresh beauty کا استعارہ خلق کیا گیا ہے جس میں انسان کے جسمانی حسن لے کر کائنات کی تمام خوبصورت چیزیں شامل ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "حسن شگفتہ" کی تجدید کو شاعر "شعلۂ عشق" کا ذریعہ تسلیم کرتا ہے۔ Fuel یا ایندھن کا اشارہ اس کا بین ثبوت ہے۔

مذکورہ مثالوں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ بڑا شاعر جس خیال یا جذبے کو جس شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے وہ خیال کو شے میں اس طرح خلق کرتا ہے کہ "شے" خیال یا جذبے کا متبادل بن جاتی ہے۔ خیال کی شے میں منتقلی نظم کو ایک مکمل وجود کا درجہ بخشتی ہے۔ شعر یا نظم کی خودمختار وجودی حیثیت کے متعلق الیٹ (Eliot) لکھتا ہے:

The poem has its own existence apart from us.It was there before us and will endure after us.

الیٹ نہ صرف یہ کہ نظم کو اس کے اپنے وجود کے ساتھ قبول کرتا ہے بلکہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ نظم کا وجود ہم سے پہلے بھی تھا اور ہمارے بعد بھی تادم آخر قائم رہے گا۔ یہی وہ نظریہ ہے جو بعد ازاں "روایت اور انفرادی صلاحیت" کی بنیادی تھیسس (Thesis) بنتا ہے۔ الیٹ کے اس نظریئے سے بظاہر شاعری کے پہلوؤں پر روشنی نہیں پڑتی البتہ اس امر کا انکشاف ضرور ہوتا ہے کہ شاعری معرض ظہور میں آنے کے بعد زمانے کی قید سے آزاد ہو سکتی ہے۔ الیٹ کے نزدیک شعر یا نظم کی وجودی حیثیت کو بکھراؤ یا زوال حاصل نہیں۔ الیٹ کا یہ نظریہ ہر اس شاعری پر منطبق ہوتا ہے جو فکر سے زیادہ فن کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اور جو شاعری فن کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے وہ "شعلۂ عشق"، "خانماں خراب" اور "گل" جیسے سادہ استعاروں کے درون میں معنی کی ایسی

دنیا آباد کرتی ہے جس کے رقبے کا اندازہ لگانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔

خدا نے الاؤ جلایا ہوا ہے
اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے
ہر اک سمت اس کے خلا ہی خلا ہے
سمٹتے ہوئے دل میں وہ سوچتا ہے
تعجب کہ نورِ ازل مٹ چکا ہے
بہت دور انسان ٹھٹکا کھڑا ہے
اسے ایک شعلہ نظر آرہا ہے
مگر اس کے ہر سمت بھی اک خلا ہے

(میراجی: "سلسلۂ روز و شب")

میراجی کی اس نظم کو کسی بھی نقطۂ نظر یا کسی بھی حوالے سے پڑھا جائے ،اسے کسی خاص زمانے سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ دلیل اس دعوے کی یہ ہے کہ نظم جن استعاروں سے تشکیل پاتی ہے ان میں ایک بھی استعارہ ایسا نہیں جس میں انجمادی صفت پائی جاتی ہو۔ "خدا" "الاؤ" "نور" "شعلہ" وغیرہ ایسے استعارے ہیں جن کے متغیر و متحرک ہونے پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہم چاہیں تو نظم کا زمانۂ تخلیق دریافت کرسکتے ہیں۔ ہم یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ اس وقت کی سماجی صورت حال میں پیدا ہونے والی ذہنی روحانی الجھنوں نے نظم کی تشکیل میں کس نوع کا کردار ادا کیا ہوگا۔ اور یہ چیزیں بعض اوقات نظم کے مطالعے میں جزوی طور پر ہماری معاونت بھی کرتی یا کرسکتی ہیں۔ لیکن انکشافِ معنی میں ان چیزوں کو "حکمِ آخر" نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو میر و غالب آج بھی حوالوں سے پڑھے جاتے جو ان کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں، اور میراجی اور راشد وغیرہ کی نظموں کی وہی تعبیریں بیان کی جاتیں جو چالیس پچاس برس پہلے بیان کی جاچکی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میر و غالب کی شاعری ان کے اپنے زمانوں کے مقابلے میں آج کہیں زیادہ بامعنی ثابت ہورہی ہے۔ اس نوع کی شاعری کو نہ تو نظریوں کی زنجیر پہنائی جاسکتی ہے اور نہ ہی کسی خاص زمانے سے موسوم کرکے اس کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ایسی شاعری وقت کی اطاعت قبول نہیں کرتی بلکہ خود وقت کا بدل بن جاتی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

> اچھی شاعری آپ کو بار بار اپنی طرف کھینچتی ہے، اس کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا... معنی کی کوئی نئی جہت، تجربے کی کوئی نئی سمت، احساس کا کوئی نیا رنگ دکھائی دے جاتی ہے۔

فاروقی صاحب کی اس رائے سے ممکن ہے کہ بعض لوگ اختلاف کریں لیکن شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو ان کے اس خیال سے انکار کرسکے کہ اچھی شاعری ہر عہد میں ایک نئی معنویت کے ساتھ پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔ اچھی شاعری کے اندر لوگوں کے متوجہ کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دراصل اس نظام کی بدولت ہوتی ہے جسے ہم نظامِ اظہار کہتے ہیں۔ اچھی یا بڑی یا بڑی شاعری ان استعاروں کو قبول کرتی ہے جو زمانوں کو عبور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان میں حقیقت حال سے زیادہ مستقبل کے امکانات ہوتے ہیں۔ مثال کے لیے شیکسپیئر کے مصرعوں کو پیش کیا جاسکتا ہے:

When lofty trees I see barren of leaves,
Which erst from heat did canopy the herd,
And summer's green all girded up in
sheaves,
Borne on the bier with white and bristly
beard,
Then of thy beauty do I question make,

(Sonnet XII)

یہاں شیکسپیئر نے موسموں کے مشاہدے کو "اشجارِ بلند" کے استعارے کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ حالانکہ وہ چاہتا تو "سرو" یا اس نوع کے دوسرے درختوں کو ان کے نام کے ساتھ استعمال کرسکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا کہ ایسا کرنے سے ممکن تھا کہ استعارہ معنوی اعتبار سے مخصوص و محدود ہوجاتا۔ لیکن یہ فیصلہ صادر کرنا کہ "سرو" کا استعارہ شعر میں معنوی توسیع کا ذریعہ بن ہی نہیں سکتا، کسی اعتبار سے مناسب نہیں۔ امیر خسرو نے تو اس میدان میں بھی کمال کر دکھایا ہے۔

چمن بہ سبزہ خطے بررخ جمیل کشید
بباغ سرو رواں قامت طویل کشید

امیر نے "سرو رواں" کے استعارے کے ذریعہ شعر میں ایک ایسا پیکر خلق کیا ہے جو معشوق کی بلند قامتی کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ دوسری اشیا کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔ لیکن عام طور پر ہماری شاعری میں "سرو" کا استعارہ معشوق کی سہی قدی اور بلند قامتی کے لیے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ شیکسپیئر نے Lofty Trees کے ذریعہ جس تجربے کو متشکل کیا ہے اس کی سیال معنویت کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔ شیکسپیئر نے مذکورہ مصرعوں میں ماضی اور حال سے زیادہ مستقبل کے امکانات رکھ دیے ہیں جو مثبت بھی ہوسکتے ہیں اور منفی بھی۔ Lofty Trees سے کسی مخصوص درخت کی نشاندہی نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی آئے جب "سرو" کا درخت ناپید ہوجائے، اور اس کی جگہ دوسرے دراز قد اشجار لے لیں۔ ایسی صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ بلند قامتی کے لیے سرو کے استعارے کی وہی معنویت قائم ہو جو آج ہے؟ ظاہر ہے جب چیزیں تبدیل ہوتی ہیں تو تصورات بھی بدل جاتے ہیں۔ بدلے ہوئے تصورات کی نمائندگی وہی استعارے کرسکتے ہیں جن کے اندر بدلنے کی قوت موجود ہوتی ہے ☆☆☆

فرخ جعفری

ایسا نہیں کہ منہ میں ہمارے زباں نہیں
ہیں کم سخن ضرور پہ عاجز بیاں نہیں

ہر چند جانتے ہیں اسے ہم قریب سے
پر کیا کریں کہ پائے سخن درمیاں نہیں

اچھا تو ایک پل کے لئے ہی اٹھا کے دیکھ
اے آسماں جو بار امانت گراں نہیں

خود ہم میں تاب دید نہیں ہے یہ اور بات
رہتا ہے وہ نگاہ کے آگے کہاں نہیں

فرخ کہیں نہ سن کے کرے وہ بھی ان سنی
کہتے ہیں اس سے اس لئے درد نہاں نہیں

اسے سمجھا بجھا کے ہم تو ہارے
نہ آیا دل یہ قابو میں ہمارے

سن اے غافل جرس کیا کہہ رہا ہے
پڑا رہ تو ہم اپنی رہ سدھارے

کوئی آتا نہیں ہو جب مدد کو
سوا اس کے کوئی کس کو پکارے

حفاظت کرتے ہیں ہم شہر دل کی
کہیں سوتے کوئی شب خوں نہ مارے

سمندر کیوں ہوا تو اتنا کھاری
کوئی رویا تھا کیا تیرے کنارے

گھومتی ندی

شام زندگی (باب ۹)

وارث کرمانی

بسیار دریں جہاں چمیدیم
بسیار نعیم و ناز دیدیم
اسپان بلند بر نشیم
ترکان گراں بہا خریدیم
کردیم بسے نشاط و آخر
چوں قامت ماہ نو خمیدیم

ترجمہ

میں نے اس دنیا کی بہت سیر کی
بہت ناز و نعمت کا لطف اٹھایا
اونچے اونچے گھوڑوں پر سوار ہوا
بیش قیمت غلاموں کی خریداری کی
میں نے بہت عیش کیا اور آخر کار
نئے چاند کے قد کے مانند سرنگوں ہو گیا

کسی تغلق سلطان کی زبان پر مرتے وقت ان شعروں کا آنا تمام انسانوں کی قسمت ہے۔ مجھ پر بھی یہ سب باتیں صادق آتی ہیں بجز اس کے کہ میں نے ترکوں کی خریداری نہیں کی اور بالکل سرنگوں نہیں ہوا ہوں۔ ابھی احساسات جاگ رہے ہیں اور قلم کسی قدر چل رہا ہے۔ چاہتا ہوں ہاتھ تھک جانے سے پہلے کسی صورت اپنی خودنوشت کا آخری باب شام زندگی مکمل کر دوں۔

آپ کو یاد ہوگا اس کتاب زندگی کے پہلے باب "خوشبو کے پیرہن" میں میں نے لکھا تھا کہ میں اپنے گھر کے آنگن میں والدہ کے پلنگ پر شام کو بیز ابیز ا لیٹ جاتا تھا گویا اس وقت میرا قد چار فیٹ سے بھی کم تھا۔ میں آسمان پر ابابیلوں کو اڑتا دیکھا کرتا تھا اور بہت سے پرندے غول اور غول شمال سے جنوب کی طرف بسیرا لینے کے لئے جاتے دکھائی دیتے تھے۔ کبھی کبھی پرندہ غول سے چھٹ کر اکیلا جاتا دکھائی دیتا تھا جو وحشت میں ادھر ادھر دیکھتا یا اپنے غول کو ڈھونڈتا محو پرواز ہوتا تھا۔ اسی مشاہدے اور استغراق کے عالم میں کسی کے ہاتھ آ کر مجھے کچھ کھلا دیتے تھے، اور میں ان مہربان ہاتھوں کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتا تھا، اور اپنے تخیل کی پرواز میں عجیب عجیب شفق رنگ ٹھہرے ہوئے بادلوں کی حسین دنیا کے پہاڑوں دریاؤں اور سرخ وزرد وادیوں میں سفر کیا کرتا تھا۔ اب اسی برس کی عمر میں اسی آنگن میں عصر و مغرب کے درمیان لیٹا آسمان دیکھا کرتا ہوں، لیکن اب نہ ابابیلیں نظر آتی ہیں اور نہ پرندوں کے غول بسیرا لینے کے لئے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ میں خود کو اس پیچھے رہ جانے والے پرندے کی طرح محسوس کرتا ہوں جو اپنے غول سے جدا ہو گیا ہو۔ میرے گھر کی شہتیروں سے پٹی ہوئی چھتیں جن کی درازوں میں ابابیلیں رہتی تھیں، اب ان چھتوں کی جگہ لوہے اور سیمنٹ کی چھتوں نے ان معصوم اور بے آزار چڑیوں کو خانماں خراب کر کے نہ جانے کہاں غائب کر دیا ہے۔ اور وہ بسیرا لینے والے غول در غول پرندے اکیسویں صدی کی زہر آلود ادر تاموتی فضا سے معدوم ہو چکے ہیں۔

مجھے کھلانے والے وہ شفیق ہاتھ اور وہ مہربان آنکھیں مجھے چھوڑ کر جا چکی ہیں۔ میرا گھر تو وہی ہے وقت بھی وہی عصر و مغرب کے درمیان کا ہوتا ہے لیکن اس کی خاصیت بدلی معلوم ہوتی ہے وہ مجھے سنہرے آسمان کی سیر نہیں کراتا ہے۔

میں پلنگ پر گاؤ تکیے کے سہارے، کبھی نیم دراز کبھی تقریباً لیٹا ہوا معزول شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کا تصور کیا کرتا ہوں جو رنگون شہر کے ایک چھوٹے سے مکان میں بانس کی چار پائی پر بیٹھے، عالم ضعیفی میں حقہ پیا کرتے تھے۔ میں خوش ہو جاتا ہوں کہ بحمد اللہ اپنے آبائی مکان میں ہوں جسے میں نے پردیس میں نوکری کرنے کے بعد واپس آکر پھر سے آباد کیا ہے، جہاں خوشبو سے بھرا ہوا صحن میرے آباد اجداد کے علم اور روحانی برکتوں سے معمور ہے۔ اس نامراد بادشاہ کو تو 'دو گز زمین' بھی ابدی نیند کے لئے اس کے شہر دلی میں نہ مل سکی۔ اب مجھے بھی زندگی کی تھکن محسوس ہو رہی ہے اور دوستوں عزیزوں اور تمام علائق سے دھیرے دھیرے دوری اور بے تعلقی کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ اردو کے معروف شاعر اختر الایمان نے انتقال سے ذرا پہلے نظم کہی تھی اس کا آخری شعر میری بھی کیفیت کی ترجمانی کر رہا ہے۔

بہے جاتی ہے اپنی کشتی عمر رواں آہستہ آہستہ
خیال و خواب ہوتا جا رہا ہے یہ جہاں آہستہ آہستہ

یہ شعر ایک ڈوبتی ہوئی زندگی میں تھکے ہوئے دل و دماغ کی حالت میں کہا گیا ہے۔ لیکن میرے لئے یہ شخصی اور مادی وجود کے زوال کے ساتھ تاریخی اور سماجی حالات اور صدہا سال کی گردش روزگار کی بھی عکاسی کر رہا ہے۔ مجھے اپنا وطن بھی خواب و خیال ہوتا نظر آ رہا ہے۔ گھر کے باہر جب شام کو اپنے باغ اور کھیتوں کے درمیان گلیارے پر، جو اب اچھی پختہ سڑک بن گیا ہے، ٹہلنے کے لئے نکلتا ہوں تو پڑوسی کسانوں اور راہگیروں سے دعا سلام ہوتی ہے۔ وہ پہلے کی طرح اب خندہ پیشانی سے 'بھیا سلام' نہیں کہتے ہیں۔ اس وقت میں نو عمر تھا اور سبھی لوگ تقریباً مجھے بڑے ہوتے تھے۔ اب زیادہ تر 'بھیا سلام' کے بجائے لوگ 'چچا میاں السلام علیکم'، یا 'دادا میاں' نمستے کہتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ ان میں بیشتر لوگوں کو میں پہچانتا بھی نہیں ہوں اور نام مشکل سے چند لوگوں کے جانتا ہوں۔ ان میں زیادہ تر ہندو گاؤں والے ہوتے ہیں، معصوم اور فرشتہ خصلت، جو مسجدوں میں شام کے وقت پھونک چھڑوانے یا آستانہ وارث پاک پر زیارت کرنے جاتے ہوتے ہیں۔

میرے اپنے قصبے کے مسلمان لڑکے فیشن کی تنگ قمیص اور پتلون میں فلمی گانے گاتے ہوئے اور سیٹیاں بجاتے ہوئے یا آپس میں مذاق کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ ان کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے میں کوئی بے جان، بے حس، بلکہ نا جنس شے ہوں۔ میرے ان کے احساسات ہی نہیں، بلکہ زبان بھی بدلی ہوئی ہوتی ہے۔ افسوس یہ ہے وہ سب مقامی اسکولوں میں پڑھتے ہیں اس لئے انھیں جاہل بھی نہیں کہہ سکتا ہوں کیونکہ جب انھیں روک کر شرف ملاقات حاصل کرتا ہوں تو یہ ڈائلاگ وجود میں آتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں۔

"کس اسکول میں پڑھتے ہو؟"

جواب ملتا ہے۔ "ایل۔ ایم۔ میموریل اسکول۔"

میں پوچھتا ہوں، کہاں تک پڑھا ہے۔ ایک لڑکا کہتا ہے میں نے گیارھواں پاس کر لیا ہے۔ دوسرا کہتا ہے، میں بارھواں فیل ہوں۔ تاریخ، جغرافیہ، حساب، الجبرا اور جیومٹری کا نام بھی نہیں سمجھتے۔ البتہ کہیں کہیں ساٹھ ستر سال کے آدمی بھی مل جاتے ہیں۔ ان سے مل کر ایسا لگتا ہے جیسے کسی ہمدم دیرینہ یا ہمراز اور ہم زبان سے ملاقات ہو گئی ہو جو ملاقات مسیحا و خضر کی ملاقات سے بقول ذوق بہتر معلوم ہوتی ہے۔ ہم دونوں ٹھیٹ اردو زبان میں بات کرتے ہیں جو دیہاتی محاوروں اور ضرب الامثال سے آراستہ ہوتی ہے۔

"بھیا کچھ سکت معلوم ہوت ہو۔" (بھیا کچھ کمزور معلوم ہوتے ہو)

"نا ئیں مہتوں ٹھیک چل رہے ہن۔ اب بوڑھ ہوئن گئے ہن۔"

(نہیں مہتوں ہم ٹھیک چل رہے ہیں اب بوڑھے ہو ہی گئے ہیں)

"آجکل بھین گرم بہت پڑ رہا ہے۔" (آج کل بھیا گرمی بہت پڑ رہی ہے)

"ہاں گرم تو ہے۔ جیٹھ لگیا ہے رہا ہے۔ ملا اب ہی دونگرا نئی گرا ہے۔"

(ہاں گرمی تو ہے جیٹھ قریب آ گیا ہے مگر پہلی بارش ابھی نہیں ہوئی ہے)

"بھیا دونگرا ابھی کیسے گری۔ پروائیا کہاں چلی ہے۔ جانت نہیں ہو پرکھا کہہ گئے ہیں۔ جب چلے بھوئی لنار پروائی۔ تب جانئے کہ برکھا آئی۔" (زمین پر لوٹ کر جب پروائی چلتی ہے تو جان لیجئے کہ برسات آ پہنچی ہے)

کبھی کبھی بارہ بنکی شہر جاتا ہوں تو وہاں بھی عمر کا یہی فرق محسوس ہوتا ہے۔ وہاں میرے اسکول کے چند دوست ابھی زندہ ہیں۔ ایک دن پتہ چلا میرا جگری دوست رام چندر ابھی زندہ ہے، مجھے اتنی خوشی ہوئی جیسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔ میں خاص طور سے اس سے ملنے گیا۔ اس کی سونے چاندی کے زیورات کی دکان تھی۔ میں نے اسے ستر برس کے بعد بھی دیکھتے ہی پہچان لیا۔ دھوتی قمیص پہنے بیٹھا تھا، ماتھے پر مذہبی ہندوؤں کی طرح کچھ سفید یا زعفرانی رنگ کی دھاریاں بنائے ہوئے تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے دونوں جوان لڑکے بول اٹھے:

"آیئے آیئے پدھاریے۔ آدیش کیجئے۔"

میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا بھی نہیں اور شوق ملاقات میں کاؤنٹر کے اس پار بچھے ہوئے صاف شفاف فرش کی طرف بڑھا جہاں میرا دوست آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں نوجوان میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

"انکل آپ وہاں کہاں جا رہے ہیں؟ ادھر کاؤنٹر کے باہر کرسیاں پڑی ہیں۔ آپ ان پر آکر بیٹھئے اور اپنا کام بتایئے۔ کچھ لین دین کی بات کرنی ہے؟"

"ہاں لین دین کی بات کرنی ہے۔"

"ارے پرسرام ذرا اپنا بہی کھاتہ اٹھا لانا۔ کون زیور گرور رکھوایا تھا اور کب رکھوایا تھا؟ کہیں آیا گیا تو نہیں ہو گیا۔ آپ کو بیکار کشت اٹھانا پڑے۔ بیاج زیادہ ہو جانے پر اصل مال کی قیمت میں کچھ نہیں بچتا۔"

میں نے دیکھا یہ نوجوان اب بالکل بے لگام گھوڑے کی طرح نکلا جا رہا ہے لہٰذا اسے کنٹرول میں لانے کی کوشش کی۔

"ارے بھیا ذرا ٹھہرو تو میری پوری بات تو سنو۔ بعض مال ایسا ہوتا ہے کہ اس کے رکھوانے سے الٹا بیاج رکھوانے والے کو ملتا ہے۔ میں نے اپنا مال ستر برس پہلے رکھوایا تھا اب اسی کا منافع اصل کا ہزاروں گنا ہو گیا ہوگا۔"

دونوں بھائیوں نے مجھ سے نظریں ہٹا کر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میں ڈر گیا کہیں یہ دونوں مجھے لٹیرا تو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ پھر

انھوں نے باہر کھڑی میری موٹر کو دیکھا جس کے پاس میرا ڈرائیور اور ایک موٹا تندرست میرا بھتیجا بھی کھڑا تھا جو اکثر میرے ساتھ موٹر میں ضرور آتا ہے۔ پھر ان میں سے ایک نے تھوڑی دور پر رکھے ہوئے ٹیلیفون پر نظر ڈالی۔ ان میں سے ایک نے اتمام حجت کے لئے مجھ سے پوچھا۔

"صاحب یہ تو بتایئے کہ ستر برس پہلے یہ دکان تو تھی ہی نہیں۔ آپ نے مال کہاں رکھوایا تھا اور کس کے پاس رکھوایا تھا؟"

"وہ کیا بیٹھے ہوئے لکھ رہے ہیں۔ میں انھیں کے پاس جا رہا تھا لیکن آپ نے روک دیا۔"

"چلیے ہم لے چلتے ہیں ان کے پاس۔"

وہ دونوں مجھے حراست میں لئے ہوئے اپنے باپ کے پاس لے آئے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، دکان کے دروازے پر بندوق لئے سپاہی کھڑا تھا۔

"بتاجی یہ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔"

بتاجی نے بدقت سر اٹھا کر عینک اوپر سے میرے چہرے کو بغور دیکھا۔ میں سنجیدہ بے حس و حرکت ان کے سامنے کھڑا تھا۔ "ان کا کہنا یہ ہے کہ ستر برس پہلے انھوں نے کوئی چیز یا رقم آپ کو دی تھی۔ اس کا حساب کرنے یہ آئے ہیں اور بیاج کا مطالبہ کر رہے ہیں۔"

یہ سنتے ہی رام چندر کچھ حیرت اور غصے کی حالت میں کھڑا ہو گیا۔

"کون ہیں آپ؟ کہاں سے آئے ہیں؟"

"رام چندر تم نے مجھے پہچانا نہیں؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ آپ مطلب بتایئے۔"

"پہلے تم اپنے دونوں لڑکوں کو ہٹا دو۔ تب مطلب بتاؤں گا۔"

"لڑکوں کو ہٹا دوں؟ آخر کیوں؟ تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں حراست میں ہوں اور تم سے پرائیوٹ بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیسے سب کے سامنے کہہ دوں؟"

"تم میرے لئے اجنبی ہو، پرائیوٹ بات کیا ہو سکتی ہے؟"

"سب بتا دوں گا مگر لڑکوں کے سامنے کہنے والی بات نہیں ہے۔ اتنا ڈرتے کیوں ہو؟ میں بھی تمھاری طرح ضعیف آدمی ہوں۔"

"اچھا تم دونوں کاونٹر پر چلے جاؤ۔ اب بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"رام چندر۔ تمھارا سب سے گہرا دوست کون تھا جب تم دسویں کلاس میں پڑھتے تھے گورنمنٹ ہائی اسکول بارہ بنکی میں؟"

"مجھے سوچنے دو۔ دوست تو سبھی تھے، گہرے بھی ہلکے بھی۔"

"بہت گہرا۔ سب سے زیادہ گہرا۔ تم سے آگے والی میز کرسی کی لائن میں جو کلاس کے دروازے سے ملی ہوئی شروع ہی کی لائن میں تھی۔"

"پرکاش نرائن ٹنڈن۔"

"نہیں، ٹھیک اس کے داہنی طرف وہ مسلمان لڑکا جو تم سے دو تین سال چھوٹا تھا۔"

"وہ وارث جسے ہم پرنس آف دیوا کہتے تھے اور اس کی ترکی ٹوپی اتار کر یہ گانا گانے لگتے تھے:

A Prince of Dewa lost his cap

Some say this and some say that

I saw Mr. White."

میں نے اس کی بات میں لقمہ دیتے کہا:

"اور تم نے ایک ولایتی چوہا پال رکھا تھا جسے روز دکھانے کی دعوت دیتے رہتے تھے، مگر پرکاش منع کرتا تھا: 'اب اسے دیکھنے کہاں جائے گا وہ ولایتی چوہا نہیں بڑا بلا ہے۔' پرکاش بہت چالاک اور ڈرپوک تھا، میں بیوقوف اس کے کہنے میں آ گیا اور ایسی قیمتی چیز کے دیکھنے سے محروم رہ گیا۔ میں نے سوچا آج اس کا دیدار کر ہی لوں، اگرچہ زمانہ بہت گذر چکا ہے۔ کیا معلوم مر چکا ہو، یا اگر زندہ ہے تو مرجھا گیا ہوگا۔ مگر پھر سوچا کہ تم اسے بہت پیار سے رکھتے تھے جیسے تمھارے اپنے جسم کا حصہ ہو۔ بعض جانوروں کی عمریں بہت زیادہ ہوتی ہیں، انسانوں سے بھی زیادہ جیسے سانپ یا چرگدھ۔ چلو چلتے ہیں اور قسمت آزمائی کرتے ہیں۔"

میری اس گفتگو سے رام چندر کے چہرے پر ایسے تغیرات واقع ہوئے جن میں نہ جانے کتنے زمانے کروٹیں لیتے نظر آ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر میرے جملوں کی چوٹ سے زرد سرمئی اور نارنجی رنگوں کی لہریں اٹھتی اور ڈوبتی مجھے نظر آئیں۔ اس نے اپنا چشمہ اتار کر چپکے سے کھلے ہوئے بہی کھاتے پر رکھ دیا اور میرے زیادہ قریب آ کر میری آنکھوں کو بغور دیکھا پھر چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گیا اور "ارے وارث!" کہہ کر میرے کاندھے پر اپنا سر ڈال دیا بلکہ اپنا سارا بوجھ ڈال دیا۔ اس کے دونوں لڑکے دوڑ پڑے، میں نے ان سے پوچھا:

"تم لوگ کیوں دوڑ پڑے۔ میں تو صرف ستر برس پہلے کی رکھی ہوئی چیز کا بیاج مانگنے جا رہا تھا۔"

"چاچا جی، ہم آپ کو سب بیاج ادا کرنے پر تیار ہیں۔ یہ زیور گہنے سب لے لیجیے مگر بتاجی کو چھوڑ دیجیے۔ یہ رو رہے ہیں۔ آپ ان کا سر اٹھا کر تو دیکھیے جو آپ کے کندھے پر پڑا ہوا ہے۔ یہ آپ کو چھوڑ نہیں رہے ہیں ہم پر دیا کیجیے۔ یہ ہارٹ کے مریض ہیں۔ آپ نے کیا کہہ دیا ہے ان سے؟"

میں نے چپکے سے اسے فرش پر بٹھا دیا۔ چند منٹ بعد رام چندر نے بیٹوں سے کہا، میں ٹھیک ہوں تم لوگ گاہکوں کو دیکھو۔ اس کے بعد اس نے بہت عمدہ مٹھائی اور شربت منگوایا اور مجھ سے کھانے کے لئے کہا۔

میں نے کہا، "میں مٹھائی زیادہ نہیں کھاتا ہوں۔ کچھ کباب پراٹھا مرغ پلاؤ وغیرہ کھلاؤ۔"

"ہو نہ مچھ پرانے۔ ماس کھا کھا کر پیٹ میں قبر بناتے رہتے ہو۔ سیدھے سے مٹھائی کھاؤ۔ اب بڑے بگلا بھگت بنتے ہو، مہابیر حلوائی کی دکان بھول گئے جہاں پاؤ بھر گلاب جامن مجھے ساتھ لے کر کھلانے لے گئے تھے اور آدھے سے زیادہ مٹھائی کھا کر تم بھاگ گئے تھے اور چار آنے میں نے خود اپنی جیب سے دے کر اس حلوائی سے پیچھا چھڑایا تھا۔"

میں ہنسنے لگا اور کہا کہ ہاں مجھے یاد ہے چلو مٹھائی کھائے لیتا ہوں۔

میں نے ایک ٹکڑا مٹھائی کا لے کر اس کا آدھا اس کی طرف کھانے کے لئے بڑھایا اور آدھا میں خود کھانے لگا۔ اس نے وہ آدھا ٹکڑا مجھ سے لے کر پلیٹ میں رکھ دیا اور دوسرا ٹکڑا توڑ کر کھانے لگا۔ میں نے اس بات کو نوٹ کیا کہ اس نے میری چھوئی ہوئی مٹھائی کو نہیں کھایا۔

میں نے شکایت کے انداز میں اس سے کہا۔

"تم نے اس ٹکڑے کو جسے میں نے محبت سے تمھیں کھانے کے لئے دیا تھا، نہیں کھایا۔ آخر اس کی وجہ؟"

میں نے دیکھا آن واحد میں اس کا موڈ بدل گیا اور اندر سے ایک اور چہرہ سخت اجنبی اور نامہربان ابل کر سامنے آ گیا۔ پھر بھی اس نے خود کو چھپانے کے لئے مسکرا کر کہا۔

"اجی ہٹاؤ ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔"

"ہٹاؤ نہیں بتاؤ۔ ان باتوں میں بہت کچھ رکھا ہے۔ یہ کون ہے جس کا بھیس بدل کر تم سامنے آ گئے ہو۔ وہ رام چندر تو میرے انٹرول کے اسپشل ریفرشمنٹ کا حلوہ مجھ سے چھین کر کر کھا لیتا تھا حالانکہ وہ جھوٹا ہوتا تھا۔ بگلا بھگت میں بنا ہوں کہ تم؟ اور میرے پڑوس میں رہنے والی رادھا کو تم نے اپنی رشتہ دار بہن بتا کر مجھ کو اپنا عاشقی والا خط دینے بھیجا تھا اور وہ اردو میں ہونے کی وجہ سے جب پڑھ نہیں پائی تھی تو اپنے بڑے بھائی رمیش کو پڑھ کر سنانے کے لئے دیا تھا۔ اس نے جیب میں رکھ کر اطمینان سے سنانے کو کہا تھا۔ اتفاق سے پرکاش میرے ساتھ تھا، وہ چالاک تھا اور تاڑ گیا تھا کہ اس میں کوئی چکر ہے، اس لئے مجھے اشارے سے بھگا لایا تھا۔ ورنہ تم نے میری مرمت کا اچھا خاصا انتظام کر دیا تھا۔ برسوں بعد علی گڑھ میں ایک شاعر احمق پھپھوندوی نے جب مجھے اپنا یہ شعر سنایا تو ہنستے ہنستے مرا برا حال ہو گیا تھا۔ اسے کیا معلوم کہ میری تمھاری بدمعاشی اور اپنی بیوقوفی یاد کر کے ہنس رہا تھا، شعر یہ تھا۔

بہت چِٹا میں احمق آج اظہار محبت پر
مگر یہ خیریت گذری وہ اردو کم سمجھتے تھے"

اب کی بار پھر رام چندر نے مجھے محبت میں آ کر گلے لگا لیا اور کہنے لگا:

"وارث اب وہ زمانہ کہاں ہے، تم لڑکپن ڈھونڈ رہے ہو، اس بڑھاپے میں۔"

رام چندر تو اتنا کہہ کر کسی آنے والے سے بات کرنے میں مصروف ہو گیا، لیکن میں نے اپنی پرواز تخیل میں اس کے ذرا سے جملے کا ایک افسانہ بنا ڈالا۔ وہ ایک حقیقت پسند بات نہایت سادگی اور سچائی سے کہہ گیا تھا۔ ایسی سچائی جس میں صدیوں کا انقلاب اور بے کراں فاصلوں کا تموج اور طوفان چھپا ہوا تھا۔ میں تاریخ کے دھارے میں بہنے لگا۔ میں ترکوں مغلوں اور انگریزوں کے دور حکومت کو پار کرتا ہوا وطن کی آزادی اور اس کے بٹوارے کی دہلا دینے والی سرحد پر کھڑا ہو گیا، وہ سرحد جو انگریزوں اور ہمارے دونوں طرف کے رہنماؤں کے اتفاق رائے سے وجود میں آئی۔ میں نے سوچنا شروع کر دیا۔ ان فریقوں کے کتنے بے رحم آپریشن سے مادر وطن کے جسم کو کاٹا گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جن افسروں کو سرحد کھینچنے پر مقرر کیا تھا انھوں نے ایسی غفلت لاپرواہی اور بے دردی سے آناً فاناً سرحد کی لکیر کھینچ دی کہ کاشتکار بھی اپنے کھیتوں کی حد برآری اس طرح نہیں کرتے۔ یہ سب دونوں طرف کے لیڈروں کی دانست میں ہوتا رہا۔ ہندو مسلمان اور سکھ سب روتے رہے۔ خاندانوں کے افراد بٹتے رہے ان کے گھروں کے آنگن تک کٹتے رہے اور ان ظالم رہنماؤں نے سمجھوتہ نہ کیا۔ میرے دوست اور اردو کے ممتاز شاعر معین احسن جذبی نے اس بٹوارے کی کیسی دردناک تصویر کھینچی ہے۔

کیا یہی انقلاب ہے قلب ادھر جگر ادھر
نالۂ بیقرار ادھر شورش چشم تر ادھر
اف رے سیاست چمن رنگ کو بو سے سوئے ظن
کور ہے نرگس وطن نور ادھر نظر ادھر

پھر اس کے بعد ملک کی سماجی حالت میں ایسی تبدیلی پیدا ہوئی کہ ہم نے اور رام چندر نے جو کچھ پڑھا تھا سب حرف غلط کی طرح مٹا دیا گیا اور جو کچھ سمجھا تھا غلط قرار دیا گیا۔ سب سے پہلے ہم دونوں کی زبان کھینچ کر کاٹ دی گئی۔ ہندوستان جنت نشان کی خوبصورت بیٹی کو اسی کی گود سے زبردستی چھین کر اجنبی سرزمین پر پھینک دیا گیا اور اس کے سپوت روتے پیٹتے اور بلکتے رہ گئے۔

لب مادر نے ملا لوریاں جس میں سنائی تھیں
وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

(آنند نرائن ملا)

پھر آنند نرائن ملا جیسے ہزاروں اردو شاعروں کو بتایا گیا کہ اردو زبان جسے تم اپنی ماں سمجھتے رہے ہو وہ تمھاری نہیں مسلمانوں کی ماں ہے اور ان کی تہذیبی اور مذہبی زبان ہے، حالانکہ مغل دور حکومت میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اور اس کے بعد بھی جتنی کتابیں ہندو دھرم پر اردو زبان میں لکھی گئیں وہ مذہب اسلام سے متعلق کتابوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ مادر وطن کے آزاد کرانے اور اس کی تعریف کے گن گانے پر جتنے لاجواب شعر اس زبان نے پیدا کئے وہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں مشکل سے نکلیں گے اور اس کے وہ شعر اس کے دفن ہو جانے کے بعد بھی اس کے وطن کے بچے بچے کی زبان پر آج بھی ہیں اور اس کی یاد دلا کر مادر وطن کو رلا رہے ہیں۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

(رام پرشاد بسمل)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

(اقبال)

خود اس بدبخت نامہ سیاہ راقم نے 'اردو کی آواز' کے عنوان سے ایک نظم اسی زمانے میں (۱۹۵۳) کہی تھی اور علی گڑھ نمائش کے مشاعرے میں سنائی تھی۔ جگر صاحب اور سردار جعفری بھی موجود تھے۔ سردار جعفری نے اس نظم کو سن کر کہا تھا کہ یہ نظم مولانا حالی کے غالب پر مرثیے کی یاد تازہ کر گئی ہے۔ اس نظم کو میں نے اپنی

شروع جوانی میں کہا تھا، اسی نظم سے بحیثیت نوجوان شاعر میری شناخت ہوئی تھی۔ اس کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں ۔

اردو کی آواز

دامنِ مہر تار تار ہے آج
شاعری درد کی پکار ہے آج
خسرو و میر سربہ زانو ہیں
خاک چکبست بے قرار ہے آج
تاجدار سخنوراں غالب
مرغ بسمل تہ مزار ہے آج
مرگئی روح نغمۂ فطرت
ارض کشمیر سوگوار ہے آج
لٹ گئی کائنات حسن و جمال
روضۂ تاج اشکبار ہے آج
اٹھ گئی رونق جہاں آباد
سینۂ لکھنؤ فگار ہے آج
کیا کروں شرح درد پنہانی
تنگ ہے عرصۂ سخندانی
اے وطن تیری خاک ہے مجھ کو
مایۂ انبساط روحانی
تیرے دشت و جبل کے دامن میں
گونج اٹھی مری غزلخوانی
میرا منا تو کچھ نہیں لیکن
ہائے تیری یہ خانہ ویرانی

ملک کے انقلاب نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ شہنشاہ اکبر اور رانا پرتاپ کی جنگ یا اورنگ زیب اور شیواجی کی جنگ ہندو مسلمان کی جنگ تھی، جب کہ حقیقت یہ تھی کہ دونوں کی جنگ کا تعلق مذہب سے نہیں تھا۔ شیواجی نے اپنے علاقے میں آزاد اور خود مختار راجہ بننے کی کوشش کی تھی، جب کہ اورنگ زیب اس کی مقامی حکومت کو ختم کر کے دہلی کی مرکزی حکومت میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ اگر یہ لڑائی ہندو مسلمان کی تھی تو مرزا راجہ جے سنگھ جیسا بڑے رتبے کا راجپوت اور دوسرے ہزاروں ہندو دہلی کی مرکزی سرکار کی طرف سے کیوں لڑ رہے تھے اور شیواجی جی کی طرف سے لڑنے والوں میں مسلمان کیوں شامل تھے؟

دوسری بات یہ کہ اگر شیواجی کو مسلمانوں کے مذہب سے ایسی ہی نفرت تھی تو اس کے قلعۂ ستارہ گڑھ میں مسجد کیوں بنی تھی جس کے لئے راجہ کی طرف سے مسجد میں اذان دینے کے لئے باقاعدہ موذن کیوں مقرر تھا؟ سنبھاجی کے زمانے میں قلعۂ ستارہ گڑھ فتح ہوجانے پر اس کے اہل وعیال کو پوری عزت کے ساتھ رکھا گیا اور اس کے بیٹے ساہو جی کو اپنے بیٹے کی طرح اورنگ زیب نے محبت اور عزت دی اور اس کی شادی شاہزادوں کی طرح ایک معزز مرہٹہ سردار کو تلاش کر کے اس کی بیٹی سے کی اور حکومت کے تمام راجاؤں اور منصب داروں کو اس کی برات میں شامل ہونے کا حکم دیا۔ اسی سے منسلک دوسری بات جو جاگیردارانہ سوچ کے بجائے نئے دور کی وطن پرستی کا لبادہ پہن کر جاری رکھی گئی ہے اور پڑھے لکھے لوگ اب اس کی بات کر کے پرانے ہندو مسلم تنازعہ کو جاری رکھنا چاہتے ہیں، یہ کہی جاتی ہے کہ رانا پرتاپ سنگھ اور شیواجی بدیسی راج سے اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لئے جہاد کر رہے تھے۔ یہ بات مغل حکمرانوں پر کیسے لاگو کی جاسکتی ہے؟ ان کی رگوں میں تو ہندو مسلمان دونوں کا خون تھا۔ وہ آج کے ہندوستانی مسلمانوں ہی کی طرح تھے۔ اگر مغل حکمراں غیر ملکی تھے تو ہندوستان کی ایک تہائی آبادی غیر ملکی ہو جائے گی۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس زمانے میں وطن پرستی کا سیاسی تصور موجود ہی نہیں تھا، صرف جذباتی اور فطری طور سے لوگ اپنے وطن کو یاد کرتے تھے۔

میں اپنے بچپن کے دوست رام چندر کا ذکر کرتے کرتے سماجی اور سیاسی مراقبے میں ڈوب گیا۔ لیکن یہ مراقبہ میرے تحت الشعور میں اتر چکا ہے اور اکثر جب شام کو اپنے آنگن میں تنہا لیٹتا ہوں تو یہ خلجان مجھے ستاتا ہے اور ستم یہ ہے کہ اگر اندھیرا ہی اندھیرا ہو تو بقول گوتم بدھ اسے سویکار نے یا تسلیم کرنے میں سکون مل جائے، لیکن پھر روشنی کی کرنیں اور خوشحالی کی امید اندھیرے کو درہم برہم کردیتی ہے۔ میں سوچنے لگتا ہوں کہ جب مسلمانوں پر کوئی آفت آتی ہے تو کتنے چوٹی کے صحافیوں کے قلم ان کی مدافعت اور وکالت کے لئے تلوار بن جاتے ہیں جبکہ کتنے غدار مسلمان ظالموں کے ساتھ ہو کر مسلمان بیگناہوں کو مورد الزام قرار دیتے ہیں۔ اس خوشحالی اور بدحالی کی آویزش میں زندہ رہنے اور اس عمر میں فعال بننے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اگر میرا مزاج سیاسی ہوتا تو بھی کچھ راحت مل جاتی، کیونکہ سیاسی لوگ ہر وقت اندھیرے کو اجالا اور اجالے کو اندھیرا بنا کر خوش رہ سکتے ہیں۔ یا پھر میرا دماغ ماؤف ہو جاتا تو بقول کسی شاعر کے 'دنیا ہی میں جنت ہے اگر سر میں خلا ہے' کوئی پرابلم نہ ہوتا۔

خوش قسمتی سے عمر کی اس آخری منزل میں ایک ایسے شخص سے میری ملاقات ہوگئی جس کی وجہ سے کچھ ذہنی سکون بحال ہوگیا۔ ان سے میری ملاقات تقریباً دس سال پہلے ہوئی تھی۔ اس وقت میں ستر سال کا تھا اور میرے نئے دوست کی عمر کوئی شاید چالیس سال ہوگی۔ ان کا نام شیلندر پرتاپ سنگھ تھا۔ بیسواڑے کے تعلقدار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ راجپوتی ناک نقشہ، آنکھیں ذرا بڑی اور تیز، رنگ گندمی، لمبا قد لیکن موٹے اور تندرست ہونے کی وجہ سے اوسط درجے کا معلوم ہوتا ہے۔ ہندی زبان کے ادیب اور شاعر ہیں لیکن آئی پی ایس کے سینئر افسر ہیں۔ اسی وجہ سے میں اکثر انہیں a poet in uniform کہتا ہوں۔ ان کی شاعری کی خصوصیت گہرا طنز ہے۔ یہ طنز سماجی حالات پر ہے اور خدا اور انسان کے باہمی رشتے پر بھی۔ اس طنز نے ذاتی حیثیت کبھی اختیار نہیں کی، جیسا کہ غالب کا یہ شعر ان کی ذاتی شکایت پر مبنی ہے ۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالب اکثر اپنی بے نوائی کا شکوہ کیا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ رئیسانہ

زندگی بسر کرتے تھے مگر جب وہ اپنی ذات سے اوپر اٹھتے تھے تو ان کا طنز عظیم ترین شاعری بھی بن جاتا تھا۔ شیلندر کے طنز میں خدائے سخن میر کے اس شعر کی شباہت ہمیں ملتی ہے ۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

مگر اس کا سرچشمہ میر نہیں بلکہ گوتم بدھ کی تعلیمات میں ہے۔ شیلندر کا یہی طنز ان کے فلسفۂ زندگی میں سرایت کر گیا ہے۔ وہ ہر مصیبت اور حادثے کو سویکار نے یعنی قبول کرنے ہی میں زندگی کی فلاح سمجھتے ہیں۔ تعجب ہے اس نقطۂ نظر کے باوجود وہ نہایت زندہ دل ہیں اور اپنی گرجدار آواز سے قہقہے لگایا کرتے ہیں۔ شعری مجموعے کے علاوہ میں ان کی دو کتابوں سے واقف ہوں۔ پہلی کتاب ان کے وطن (اودھ کے اضلاع رائے بریلی، پرتاپ گڑھ، اناؤ وغیرہ) بیسواڑے کے متعلق ہے اور دوسری کتاب گوتم بدھ کے بارے میں ہے۔ دونوں کتابوں کا علمی اور تحقیقی معیار اطمینان بخش ہے۔ ہندی ادب کے علاوہ انھیں اردو غزل سے بہت دلچسپی ہے حال ہی میں انھوں نے پرتاپ گڑھ کے ایک سینئر ایڈوکیٹ امتیاز الدین خان صاحب کے تعاون سے ولی دکنی سے موجودہ زمانے تک اردو غزل کے شعروں کا انتخاب تیار کیا ہے جو دیوناگری رسم خط میں چھپنے والا ہے تاکہ اردو رسم خط نہ جاننے والے بھی بقول ان کے اس بیش قیمت خزانے تک پہنچ سکیں۔ امتیاز الدین خاں صاحب اردو فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں سے بہت اچھی واقفیت رکھتے ہیں اور بہ حیثیت ادیب اور ناقد خاصے معروف و مقبول ہیں۔ وہ شیلندر جی کے بہت اچھے دوست اور میرے بھی کرم فرما ہیں۔

شیلندر کو میں بحیثیت ایک شاعر، ادیب اور مورخ پوری طرح جانتا ہوں لیکن ان کی شخصیت مزاج اور ذات کو ابھی تک دریافت نہیں کر سکا ہوں۔ ذات اور ضمیر ویسے بھی انسان کی اوپری سطح کی چیزیں نہیں ہیں اور عرصۂ دراز تک ساتھ رہنے پر بھی سمجھ میں نہیں آسکتی ہیں۔ میں اسلام کے شروع زمانے کا ایک قصہ بیان کردوں جس سے میری بات کے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

شروع اسلام کے زمانے میں ایک بڑے صوفی بزرگ حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں کسی شخص نے بارہ برس گذار دیئے۔ اس کے بعد ایک دن وہ سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا مجھے رخصت کر دیجئے اب میں خدمت نہ کر سکوں گا۔ حضرت نے فرمایا:

"بھائی تم نے یہ فیصلہ اچانک کیسے کر لیا؟ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی جس کی بنا پر تم بارہ برس کی رفاقت اور موانست کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ہے؟"

"حضور میں نے تو آپ میں کوئی قابل شکایت بات نہیں پائی۔ دراصل میں نے آپ کو ولی اللہ سمجھ کر خدمت کی تھی اور آپ کا بڑا نام سنا تھا۔ مجھے یہ امید تھی کہ میری قسمت بھی بدل جائے گی اور میں بھی تھوڑا بہت ولی اللہ بن جاؤں گا لیکن میں نے تو آپ میں کوئی ایسی کرامت نہیں پائی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم ولی اللہ نہ بن سکے مگر یہ بتاؤ تم نے کبھی میری عبادت اور ایمانداری میں کمی پائی؟"

"جی نہیں۔"

"جو لوگ مجھ سے ملنے آئے ان سے اخلاق تواضع یا ہمدردی کوتاہی مجھ سے ہوئی؟ میری دینی ریاضت، شب بیداری، یا مجبوروں لاچاروں کے لئے دعائیں کرنے اور اپنی حیثیت بھران کی مدد کرنے میں کبھی میں نے غفلت کی؟"

"ایسا کبھی نہیں ہوا سرکار۔"

"تو پھر تم ولی اللہ سے اور کیا توقع رکھتے ہو؟ اگر تم دیانت داری اور محبت سے میری خدمت کرتے ہو تو یہ بھی ولی جیسا کام ہے۔ میری رائے ہے تم ابھی مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ اور بہتری کی امید رکھو۔ صبر اللہ کو پسند ہے۔"

یہ باتیں سن کر خادم چپ ہو گیا اور حسب سابق آپ کی خدمت کرنے لگا۔ کچھ عرصہ بعد حضرت جنید اسی خادم کو لے کر کہیں جانے کے لئے نکلے۔ راستے میں دریائے دجلہ پڑا، لیکن وہاں کوئی ملاح موجود نہیں تھا جو لوگوں کو کشتی سے پار اتارتا۔ بہت دیر انتظار کرنے کے بعد حضرت جنید نے خادم سے کہا، ہم دریا کو پار کر کے آگے چلے جائیں گے، تم یہیں انتظار کرتے رہنا۔ ہم تھوڑی دیر میں سودا سلف لے کر واپس آجائیں گے۔ یہ کہہ کر وہ دریا پار کرنے لگے۔ خادم نے دیکھا اس کے آقا 'یا اللہ، یا اللہ' کہتے ہوئے پانی کی سطح پر پاؤں رکھتے ہوئے چلے جا رہے ہیں، عجیب کرشمہ تھا! خادم نے سوچا آج وہ نسخہ ہاتھ آگیا جس سے میں بھی ولی اللہ کی طرح کرامت دکھا سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ بھی "یا اللہ، یا اللہ" کہتا ہوا دریا میں داخل ہو گیا اور ڈوبنے کے قریب تھا کہ اس نے مدد کے لئے حضرت جنید کو پکارا۔ حضرت نے ڈانٹ کر کہا، تو کیوں دریا میں پھاند پڑا؟ خادم نے بھولے پن سے جواب دیا:

"حضور میں نے یہ سوچا کہ آپ کی طرح یا اللہ یا اللہ کہہ کر میں بھی چل دوں، آپ اکیلے کیوں جائیں؟"

"ارے نالائق تو نے میرے حکم کے خلاف کیوں عمل کیا؟ تیرے لئے محض اللہ اللہ کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ اب جب تو ڈوب ہی رہا ہے تو 'یا جنید' 'یا جنید' کہنا شروع کر دے اور میرے پیچھے پیچھے چلا آ۔" اس شخص نے وہی وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا اور دریا کے پار اتر کر حضرت جنید کے قدموں پر سر رکھ کر بولا، "میں آج آپ کی ولایت اور بزرگی پر ایمان لایا۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میری بات سے غیر متعلق ہے۔ اس حکایت کے پہلے حصے میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے جو حقائق پر مبنی ہے۔ لیکن دوسرا حصہ مافوق الفطرت ہو گیا ہے اور بعید از عقل ہے۔ لیکن جو چیز میں عقل سے سمجھ نہیں پاتا، اس کی نہ نفی کرتا ہوں نہ اثبات۔ میں اس میں بلاوجہ اپنا سر نہیں کھپاتا ہوں مگر اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ فہم سے بالاتر چیزیں بھی اپنا وجود رکھتی ہیں۔ مثلاً خلائے بسیط میں مغرب کے لوگوں نے کتنا کھوج لگایا، لیکن ابھی وہاں کسی ذی روح ہستی کا پتہ نہیں چلا۔ لیکن ابھی حال میں ایک امریکن ایکسپرٹ Tom Cruise کا بیان آیا ہے کہ انسانوں کی طرح کی اجنبی مخلوق کا بھی یقیناً وجود ہے۔ اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

Are you so arrogant to believe we are alone in this universe? Yes of course, aliens exist in real life

(ترجمہ)

کیا تم اتنے پرنخوت اور اکڑباز ہو کہ اس تمام خلائے
بسیط میں خود کو اکیلا سمجھتے ہو؟ نہیں، اجنبی مخلوق بھی حقیقی
زندگی کے ساتھ رہتی ہے۔

اسی قسم کی چیزیں انسانی زندگی میں پائی جاتی ہیں جیسے ہم مادی Physical سے ماورائی Transcendtal کی حیثیتوں سے جانتے ہیں۔ میں خود شعر یا نثر لکھتے وقت اس تغیر یا ترفع Sublimation کو محسوس کرتا ہوں۔ انسانی تجربات و مشاہدات میں محنت و ریاضت اور دماغ سوزی کی شروع میں ضرورت پڑتی ہے، پھر اس کے بعد ناقابل فہم ماورائیت کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یہ ماورائیت بعض اوقات بالکل اتفاقی بھی معلوم ہوسکتی ہے۔ ایکس رے (x-ray) کا دریافت کنندہ سائنس داں کسی اور تحقیق میں اپنا سر کھپا رہا تھا کہ اسے اپنی کنجی کی ضرورت پڑی اور وہ اسے ڈھونڈنے لگا۔ ڈھونڈنے کے دوران اس کی نظر اس کتاب پر ٹھہر گئی جسے وہ کسی اور تحقیق کے سلسلے میں پڑھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی کنجی کتاب کے اوراق میں رکھی ہوئی اوراق کے اوپر جھلک دکھلا رہی ہے۔ پھر اس نے اس جھلکنے کی وجہ دریافت کرکے عکس ریز (x-ray) کی دریافت کرلی۔ میں اس اتفاق کو بھی منجملۂ ماورائیت سمجھتا ہوں۔

ایک ادیب کی حیثیت سے میں لکھنے کے وقت محنت اور عرق ریزی کے تمام مراحل طے کرتا ہوں، جیسے پرانے اساتذہ کی طرح، بحر قافیہ ردیف کا سارا اہتمام کرنا، پھر مصرع ثانی کے آخری لفظوں یعنی قافیہ ردیف کو پکڑ کر الٹا چلتا ہوں۔ اور غزل کے مطلع یا غیر مطلع کے مصرع ثانی کو تیار کرلیتا ہوں۔ پھر مصرع اولی پر محنت کرتا ہوں۔ بعض اوقات کئی کئی روز مصرع اول تیار ہی نہیں ہو پاتا ہے یا، بقول جذبی صاحب، بن نہیں پاتا ہے، یا میرے خود سوچنے کے مطابق میری (artistic sensibility) کی تسکین نہیں ہو پاتی ہے۔ بہرحال کسی غزل یا نظم کہنے میں شروع کا وقت بہت کٹھن اور جان لیوا ہوتا ہے، لیکن پھر کچھ عرصہ تک لگے رہنے کے بعد وہ غزل یا نظم پانی ہوجاتی ہے اور حیرت انگیز حد تک آسان۔ معلوم ہوتا ہے چاروں طرف سے الفاظ سر جھکائے ہوئے دست بستہ آآ کر شعر میں اپنی جگہ خود ہی بیٹھنے لگتے ہیں اور اس قرینے سے بیٹھ جاتے ہیں کہ جیسے پہلے سے یہی جگہ ان کے لئے مخصوص کرلی ہو۔ اس تمام عمل کو ماورائیت یا Sub-conscious یا الہام یا تائید غیبی ہی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یاد رکھنے کی یہ بات ہے کہ اس ماورائیت کے پیچھے کڑی ریاضت اور سمجھ میں آنے والے نیک اعمال اور خلوص قلب ونظر ضرور ہوتا ہے۔ اسی لئے جنید بغدادی نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ اگر تم دیانت داری اور محبت سے میری خدمت کرتے ہو تو یہ بھی ولی جیسا کام ہے، یعنی اس سے بھی انسانی عقل میں نہ آنے برکتیں اور کرامتیں وجود میں آسکتی ہیں۔

میں اپنے دوست شیلندر پرتاپ سنگھ کا ذکر کررہا تھا۔ میں نے ان کے اندر کے آدمی کا پتہ لگانے کی بہت کوشش کی۔ ادب اور سیاست پر میری ان سے گھنٹوں گفتگو رہی۔ دینیات، فلسفیانہ مسائل، سماجی حالات، ہندو مسلم مسائل، اور بہت سی دوسری باتیں بھی زیر غور آئیں۔ اپنی ذہنی کیفیت اور کبھی کبھی ذاتی اور گھریلو معاملات میں بھی ان کی رائے لیتا رہا ہوں کیونکہ میری ان کی دوستی اتنی گاڑھی ہو چکی ہے کہ باوجود عمر کے اتنے فرق کے میرے ان کے درمیان کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ذاتی مسائل میں ظاہر ہے میرا لکچر زیادہ ہوتا ہے اور ان کی کمنٹ یا تبصرہ کم۔ لیکن میری طویل گفتگو کے بعد ان کی ایک کمنٹ یا ایک سوال کے بعد میں خود ہی سوچنے لگتا ہوں جس سے میرا پرابلم حل ہوجاتا ہے۔ یا میرے نقطۂ نظر کا ایک اور رخ، یا اس سے نکل کر جانے والی ایک اور سڑک دکھائی دینے لگتی ہے۔ بظاہر اس میں ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہوتا ہے بلکہ میرے اندر بھڑک کر خود ہی روشنی پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ تو کوئی عملی یا کامن سنس کی بات کرکے میرا رخ موڑ دیتے ہیں، کبھی آسمان سے زمین کے حقائق کی طرف اور کبھی زمین سے ماورائیت یا مصلحت وقت کی طرف۔ اس کے بعد تفصیل سے سوچنے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا کام میرا ہوتا ہے۔ لیکن میرا مسئلہ ضرور حل ہوجاتا ہے، یا نہ حل ہونے پر بھی سکون حاصل ہوجاتا ہے۔

یہاں تک تو سب باتیں نارمل اور سمجھ میں آنے والی ہیں۔ وہ یوں کہ وہ مجھ سے زیادہ باعمل اور پولیس کے محکمہ میں رہنے کی وجہ سے مجھ جیسے پروفیسر اور ادیب اور خیالی دنیا میں رہنے والے نسان سے کہیں زیادہ دنیا کا تجربہ رکھتے ہیں۔ لیکن اندھیرا وہاں سے شروع ہوجاتا ہے جب میں ان سے ملے یا بات کئے بغیر انھیں کے بتائے ہوئے فارمولے پر عمل کرنا چاہتا ہوں تو کامیابی نہیں ہوتی اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ مجھے اپنی فہم وفراست کو بروے کار لانے کے لئے ایک فرضی شیلندر پرتاپ سنگھ کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات میں سوچنے لگتا ہوں کہ کہیں میں اس خادم کی طرح تو نہیں ہوں جو حضرت جنید سے کترا کر سیدھا خدا سے اپنا کام نکالنا چاہتا تھا۔ یہ بات میں تفریحاً لکھ رہا ہوں، کیونکہ میں شیلندر کو اچھی طرح سے جانتا ہوں وہ بالکل سادھو سنت یا ولی اللہ نہیں ہیں، بالکل گوشت پوست کے بنے ہوئے عام لوگوں کی طرح ہیں۔ البتہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ ہوشمند اور کہیں زیادہ اونچے درجے کے انسان ہیں۔ لیکن ان میں کوئی چمتکار یا کرامت میں نے نہیں دیکھی، ورنہ میں بھاگ کھڑا ہوتا، دوستی یا بے تکلفی کا کیا سوال تھا۔ میں نے انھیں عقیدت مندانہ طور سے دین دھرم کی بات کرتے بھی نہیں سنا۔ ان کا مزاج البتہ فلسفیانہ ہے، وہ اسلامی تصوف سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ بلکہ میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ زیادہ تر عام ہندو کٹر مذہبی ہوتے ہی نہیں ہیں، ان کے یہاں دوسرے مذہبوں کا بھی احترام اور عقیدہ پایا جاتا ہے اور ان کے مذہب پر فلسفہ کا غلبہ زیادہ ہے جبکہ ہمارے یہاں فلسفہ پر مذہب کی آہنی گرفت ہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی کی ملازمت ۱۹۹۰ تک قائم رہی۔ اس کے بعد میں اپنے وطن دیوا شریف میں زیادہ وقت گزارنے لگا۔ کچھ عرصہ تک مہینہ دو مہینہ دیوا شریف اور اتنا ہی عرصہ علی گڑھ رہتا تھا۔ علی گڑھ کے قیام میں دہلی اور ایران سے علمی و ادبی تعلقات اور آمد و رفت رکھتا تھا۔ اپنی رہائش گاہ اللہ والی کوٹھی میں اپنے ادبی دوستوں اور ادب کے باہر سائنس، میڈیسن، اور انجینئرنگ کے پروفیسروں اور دوستوں کی محفلیں اور ملاقاتیں جاری رکھتا تھا۔ ان دوستوں میں سرجن نسیم انصاری، اناٹمی Anatomy کے پروفیسر مہدی حسن، فلسفے کے پروفیسر جمال خواجہ، فزکس کے پروفیسر سعید الظفر چغتائی، تاریخ کے پروفیسر محب الحسن اور پروفیسر مظہر

علوی، انگریزی کے پروفیسر اسلوب انصاری، انجینئرنگ کے پروفیسر یٰسین انصاری، سائیکالوجی کے پروفیسر انور انصاری اور انجینئرنگ کے پروفیسر اظہر رضوی اور پروفیسر ہادی، اور بلیرڈ کلب کے دوستوں سے قربت رہتی تھی۔

علی گڑھ کے نوابوں اور رئیسوں میں نواب رحمت اللہ خاں شروانی خاص طور سے قابل ذکر ہیں کیونکہ ان کے ساتھ میرا وقت سب سے زیادہ گذرتا تھا۔ نواب صاحب کا ساتھ تیس سال سے مسلسل چل رہا ہے۔ میری ان کی دوستی کی اساس فارسی غزل پر ہے۔ وہ اس کے اتنے عاشق ہیں کہ زندگی بھر فارسی کی غزلیں پڑھ پڑھ کر ان کا انتخاب، یا پوری غزل، نہایت خوشخطی سے اپنی علیحدہ کاپی پر لکھتے رہے ہیں۔ ان کا حافظہ ایسا ہے کہ فارسی ضرب الامثال جو اردو زبان میں رائج ہوگئے ہیں، یا فارسی ہی تک رہ گئے ہیں، وہ بالعموم شعر کے ایک مصرع کے ہوتے ہیں، دوسرا مصرع فارسی کے استادوں کو بھی نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اسے بھی وہ بتا دیتے ہیں۔ ان کے میرے حالات اور مزاج میں بہت سی باتیں مشترک رہی ہیں۔ جیسے عمر تقریباً ایک سی، نابالغی میں والد کا انتقال، علاقوں کا کورٹ آف وارڈس میں چلے جانا اور بیکاری میں فارسی دیوانوں کا مطالعہ وغیرہ۔ ہندوستان کے فارسی شاعروں کا انتخاب کلام کرتے وقت مجھے ان سے بہت مدد ملی تھی اور یہ کام میں نے ان کے محل میں بیٹھ کر ان کی ذاتی لائبریری کے مخطوطات اور مطبوعات سے کیا تھا جو ۱۹۸۴ میں شہنشاہ ایران فنڈ سے Dreams Forgotten کے نام سے شائع ہوا تھا۔

علی گڑھ کے بہت سے دوست یاد آرہے ہیں۔ بزرگوں کا نام نہیں لے رہا ہوں جیسے پروفیسر عبدالعلیم، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر نذیر احمد وغیرہ۔ انھیں دوست کہنا بے ادبی ہوگی۔ ہمسنوں کے نام جو یاد آئے وہ درج کر چکا ہوں۔ نوجوان استادوں اور شاگردوں میں ڈاکٹر مسعود انور علوی سے خاندانی تعلقات اور ادبی ذوق کی بنا پر قربت رہی۔ پروفیسر سید طارق حسن اور ڈاکٹر معتصم عباسی کو ان کی سعادت مندی اور دلچسپ گفتگو کی بنا پر یاد رکھوں گا۔ میرے ناموروشاگردوں نے اپنی ذہانت اور قابلیت سے اطراف عالم میں اپنے ساتھ مجھے بھی مطمئن وشاد کام کیا۔ وہ کافی تعداد میں ہوں گے۔ ان میں سے عزیزی عارف محمد خاں، عزیزی مشیر الحسن اور عزیزی کلب جواد خاص طور سے میرے قلب ونظر کو روشنی اور ٹھنڈک پہنچا رہے ہیں۔ میرے لئے میرے شاگرد اب میری سب سے بڑی دولت ہیں۔ میرے والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ اس زمین جائداد اور میرے پورے تعلقہ کو ہیچ سمجھنا۔ خاتمہ زمینداری ایکٹ پاس ہونے والا ہے۔ اور یہ بھی کوئی دولت ہے، اسے چلتی پھرتی چھاؤں سمجھنا۔ علم حاصل کرو یہ وہ دولت ہے جسے کوئی چھین نہیں سکتا اور جو خرچ کرنے سے کم ہونے کے بجائے اور بڑھتی ہے۔ مجھے اپنی کتابیں اور اپنے شاگردوں کو دیکھ کر اپنے والد مرحوم کا کہنا یاد آجاتا ہے۔ ور میں ان کی تاکید اور اپنی طفلانہ لاپروائی کو سوچ کر آبدیدہ ہو جاتا ہوں۔

دیوا شریف میں اپنے زمیندار دوستوں اور کسانوں مزدوروں کے درمیان بھی وقت اچھا گذرتا تھا، بلکہ ان کی صحبت میں سکون میں زیادہ محسوس کرتا تھا۔ بعض یونیورسٹی کے رفیقوں کو تعجب ہوتا تھا کہ تم کیسے دیہات میں اپنے دن گذارتے ہو۔ وہ اپنی جگہ سچ کہتے تھے لیکن ان میں زیادہ تر لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میں اپنی سرشت میں دیہاتی تھا اور میری زندگی کے شروع کے تقریباً تیس سال اس بجز دیہاتی یا پھر قصبات کے نیم دیہاتی اور نیم شہری ماحول میں گذرے تھے، اور پڑھنے لکھنے کے بعد بھی مجھے اس ابتدائی ماحول میں وطن کا زیادہ لطف ملتا تھا۔ چنانچہ شہری یا یونیورسٹی کی سوسائٹی اور دیہات کے سماج میں میری شخصیت ایک پل کی حیثیت رکھتی تھی۔ میرے اس زمانے کے دوستوں میں میرے ہمسن خاندانی رئیس زادے تھے جو معمولی پڑھے لکھے ہوتے تھے اور غریب محلے کے لڑکے تھے جو شکار کھیلنے یا تاش کھیلنے یا باغوں میں گھومنے والے یا نہر اور تالاب میں نہانے اور تیراکی کا مقابلہ کرنے والے اور آپس میں کشتی لڑنے والے ہوتے تھے۔ میں نے اپنے گھر کے مردانہ آنگن میں بہت عمدہ اکھاڑا کھدوا رکھا تھا جس میں علی الصباح برکت پہلوان ہم سب کو ریاض کراتے تھے اور کشتی کے داؤں پیچ سکھاتے تھے۔ رمضان علی شکار کا دوست تھا۔ لکھنؤ میں بھی اعلیٰ تعلیم کے زمانے میں خالد کمال، احسن جلیل، مرتضےٰ اور ادیس سے بڑی دوستی تھی۔ اول الذکر کے عزیز حافظ محمد ابراہیم کے بیٹے عزیز میاں، منے میاں، سب ادب نواز اور علم دوست تھے جن سے اکثر بلکہ تقریباً روزانہ لطف صحبت رہتا تھا۔ خالد کمال سے تو اتنی دوستی ہوگئی تھی کہ ان کی یاد اب بھی دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔

وظیفہ یاب ہونے کے بعد جب دیوا شریف میں زیادہ قیام رہنے لگا تو میرے دل میں ایسی تحریک پیدا ہوئی کہ ضلع بارہ بنکی میں رہنے والے عزیزوں اور دوستوں کی ایک انجمن بنائی جائے جس میں میری طرح کے پنشن یافتہ اور مقامی تعلیم یافتہ لوگ ممبر بن سکیں اور ادب موسیقی اور دوسرے دلچسپ موضوعات پر تبادلۂ خیال ہو سکے۔ اس انجمن کی محفل مہینے میں ایک بار ہر ممبر کے مکان پر منعقد ہوا کرے اور میزبان ممبر سب کی پرتکلف دعوت کرے اور ایک تفریحی پروگرام جیسے مشاعرہ یا قوالی وغیرہ کا بھی اہتمام کرے۔ اس کے ممبران کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

عبید الرحمٰن قدوائی
جلیل الرحمٰن قدوائی
ثاقب قدوائی
رشاد قدوائی
عطاء الرحمٰن قدوائی
فرید قدوائی
حبیب قدوائی
عطائے وارث
خالد قدوائی
رضوان الرحمٰن قدوائی (اعزازی)
نورالرحمٰن قدوائی سکریٹری
وارث کرمانی (صدر)

اس انجمن کا نام حلقۂ شائقین ادب میں نے رکھا تھا اور اس کی محفلیں بہت دلچسپ اور رنگارنگ ہوتی تھیں لیکن ادھر ایک سال پہلے سے کوئی محفل نہیں ہوسکی

تھی۔ انشاء اللہ صحت بہتر ہوجانے پر یہ سلسلہ دوبارہ شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ وطن کے قیام کے دوران جو علی گڑھ کے تیس سال بعد پھر سے شروع ہوا، مجھے اپنے وطن والوں سے بہت محبت ملی اور جب بھی مجھے حکومت ہند کی طرف سے کوئی اوارڈ ملا جیسے پریسڈنٹ ایوارڈ یا ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، یا کسی غیر سرکاری ادارے نے اوارڈ دے کر میری عزت افزائی کی، تو اہل بارہ بنکی نے دوبارہ ضلع کی سطح پر میرے لئے جشن منایا اور مجھ پر اپنی محبت کے پھول برسائے۔

ابھی حال میں ایک شاندار جلسے میں ضلع کے پانچ سات لوگوں کو "فخر بارہ بنکی" کا ایوارڈ دیا گیا جن میں صغیر احمد صاحب جسٹس سپریم کورٹ، اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب گورنر ہریانہ، اور تین چار حضرات مزید شامل تھے۔ ان معززین کی صف میں یہ خاکسار بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ اس جلسہ کو ایجوکیشنل سوسائٹی کے صدر انور جمال قدوائی، سکریٹری شمن میاں انجینیر، عطاالرحمٰن قدوائی صاحب، راجیو چودھری صاحب سابق چیرمین میونسپل بورڈ، اور دوسرے معززین شہر نے منعقد کیا تھا۔ اس پس منظر میں جب غالب کا یہ شعر مجھے یاد آتا ہے ۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

تو میری آنکھ غالب کے لئے نم ہوجاتی ہے اور پھر جب میں اپنے یاران وطن کی نوازشیں اپنے لئے دیکھتا ہوں تو بیساختہ حالی کا یہ شعر فرط مسرت سے گنگنانے لگتا ہوں جو انھوں نے اپنے وطن کے لئے کہا تھا۔

تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

بارہ بنکی کے تاریخی قصبے ستر کھہ میں ایک میرے بہت عزیز دوست چودھری علی مبارک عثمانی رہتے ہیں۔ علی مبارک بڑے متقی پرہیزگار اور صوم وصلواۃ کے سختی سے پابند ہیں مگر اس کے ساتھ بہت اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں اور نہایت زندہ دل آدمی ہیں۔ جگر کے رنگ میں جب وہ اپنی غزلیں ترنم سے پڑھتے ہیں تو ان کے چہرے پر نور، اور آواز میں دلکشی اور سوز وگداز، میرے دل کو متاثر کرتا ہے اور ان کی ملاقات سے میری افسردگی ختم ہوجاتی ہے۔ وہ فارسی بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔

بارہ بنکی اور لکھنؤ اتنا ایک دوسرے سے قریب ہیں کہ اسے بھی میں وطن ہی سمجھتا ہوں۔ وہاں کے سابق دوستوں کے نام میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔ اب اس زمانے میں جو میرے لکھنؤ کے دوست ہیں ان میں عمر انصاری، عثمان غنی، عابد سہیل، خواجہ محمد یونس، نیر مسعود، شارب ردولوی، ملک زادہ منظور احمد، ڈاکٹر آصفہ زمانی، اچھن میاں (اجریاؤں) اور اطہر نبی سب سے کم عمر لیکن باوجود کم عمری مجھ سے بہت قریب ہوگئے ہیں اور مجھے بہت محبت دی ہے۔ افسوس کہ ان دوستوں میں ایک عظیم شاعر عرفان صدیقی ابھی سال بھر پہلے ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ بڑی بیوفائی کی میرے ساتھ ۔

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد وستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

ادبی سفر میرے قریب ترین دوستوں میں علی گڑھ والوں کو چھوڑ کر صرف چار دوست باقی ہیں۔ ان میں شیلندر پرتاپ سنگھ کا ذکر پہلے آچکا ہے، قرۃ العین حیدر میری ہم عمر ہیں، ان کے بعد گوپی چند نارنگ مجھ سے تین سال چھوٹے ہیں، اور تیسرے شمس الرحمٰن فاروقی ہیں جو شاید آٹھ دس سال چھوٹے ہوں گے۔ ان دوستوں کی وجہ سے زندگی کی تھکن دل ودماغ پر پورا تصرف نہیں کر پائی ہے بلکہ دماغ کی ادبی رگ اب پہلے سے زیادہ کارفرما معلوم ہوتی ہے اور وہی اس عمر میں میری رفاقت کر رہی ہے۔

قرۃ العین حیدر میرے بچپن کی دوست ہیں اور ایک ہی خاندان میں پرورش پانے کی وجہ سے میری حقیقی بہن کا درجہ رکھتی ہیں۔ شروع میں ان کا امیج ایک تیز طرار اور ذہین لڑکی سے زیادہ میری نظر میں نہ تھا۔ ان کی ذہنی بلوغت اور تخلیق کار بننے کا زمانہ میرے ساتھ نہیں گذرا۔ وہ وقت انھوں نے مجھ سے دور بہت سے ملکوں کی سیاحی اور سالہا سال ہندوستان کے باہر قیام میں گذارا۔ پھر وہ بمبئی آکر قیام پذیر ہوئیں، اس وقت میں علی گڑھ پہنچ چکا تھا۔ اسی اثنا میں وہ جب علی گڑھ آئیں اور آپا زہرا کے یہاں مہمان رہیں تو علی گڑھ یونیورسٹی کے حلقوں میں ایک شور سا میں نے سنا اور بہت سے ادیبوں اور پروفیسروں کو ان کی تصنیف "آگ کا دریا" کی تعریف میں رطب اللسان پایا۔ کئی بلند پایہ پروفیسروں نے مجھ سے ان کی ملاقات کرانے کی خواہش ظاہر کی۔ تب میں چکر میں پڑا کہ یہ عینی اتنی بڑی لکھنے والی ہوگئی ہے! بلکہ میرے دل میں رشک پیدا ہوا اور عینی کے مداحوں پر دل ہی دل میں حقارت بھی تھوڑی سی کسمسانے لگی کہ میں خود اس لڑکی کی عمر اور علم میں برابر درجہ رکھتا ہوں۔ میں انھیں نہیں بھائی دیتا، بس دور کے ڈھول سہانے لگ رہے ہیں۔

خود عینی کا میرے ساتھ رویہ ان عقیدت مندوں کی مرعوبیت کی تصدیق نہیں کرتا۔ وہ مجھ سے اسی لڑکپن کے زمانے کی معصومیت اور خاندانی باتوں میں وقت گذار دیتی تھیں، اگر اتفاق سے علمی یا ادبی موضوع کی بات ہونے لگتی تو جلدی سے بات کاٹ کر پھر ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگتیں۔ اس زمانے میں وہ زندہ دل بہت تھیں اور تجسس کا مادہ ان میں ہمیشہ سے تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے تاریخی واقعات کا کھوج لگانا یا انگریزی اور فارسی ادب کے بارے میں قدیم وجدید ادیبوں کی زندگی کے غیر اہم واقعات سے معنویت نکالنا، مجھ سے رائے پوچھنا، پھر اپنی معلومات بتانا، بارہ بنکی اور لکھنؤ کی ندیوں اور غیر معروف نالوں کے منبعوں اور مخرجوں کا پتہ بتانا، قصبوں اور دریاؤں کے ابتدائی ناموں اور ان کی وجہ تسمیہ کی اطلاع دینا، ان کی گفتگو کا محبوب مشغلہ تھا اور وہ اس وقت بھی جاری ہے۔ ایسی بظاہر غیر اہم گفتگو سے مجھ کو اکثر بڑا فائدہ پہنچ جاتا۔ اس سلسلے میں عینی کے ساتھ ہی ایک دوسری ذی علم اور مشہور جہاں عورت اینمری شمل (Annemarie Schimmel) کا نام لینا پڑ رہا ہے۔ میری سب سے زیادہ دلچسپ اور زیادہ پڑھی جانے والی دو کتابیں انھیں دونوں کی تجویز کردہ ہیں۔ شمل بھی مجھ سے چھوٹی چھوٹی باتوں کی تحقیق اور پوچھ گچھ کیا کرتی تھیں۔ ۱۹۷۶ میں جب وہ میرے ساتھ چند روز علی گڑھ میں رہی تھیں تو انھوں نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ تم اگر ہندوستان کے فارسی شاعروں کا انتخاب کلام مع حالات زندگی اور ایک مفصل مقدمہ یکجا کر کے چھاپ سکو تو ایک بڑا کام ہوجائے گا۔ ان کی یہ بات میرے دل کو

لگ گئی اور میں نے یہ کام چھ سال کی محنت کے بعد کر ڈالا۔ اس کتاب کا نام Dreams Forgotten ہے اور ہندوستان کی بہت سی یونیورسٹیوں میں تحقیق و تدریس میں کام آتی ہے۔ میں نے کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر شمل کا نام اعتراف کے طور پر لکھ دیا ہے۔ میری دوسری کتاب ''گھومتی ندی'' ہے جس کا آخری باب ''شام زندگی'' اس وقت آپ کے زیر نظر ہے۔ اس کی سابق قسطیں اسی رسالہ ''شب خون'' میں چھپ کر قبول عام حاصل کر چکی ہیں، اس لئے اس کتاب کو چھپنے سے پہلے میں اول الذکر انگریزی کتاب کے برابر کا درجہ دے رہا ہوں۔ ''گھومتی ندی'' کا نام ہر چند میرا رکھا ہوا ہے لیکن اس کے عقب کا سارا کام عینی کا ہے، وہ اس طرح کہ جب میرا خودنوشت لکھنا طے ہو گیا تو عینی نے مجھ سے کہا کہ خودنوشت کا نام کیا رکھو گے، میں نے جواب دیا:

''نام میں کیا رکھا ہے؟ کچھ بھی رکھ لیں گے۔''

''واہ جناب۔ بسم اللہ ہی غلط! نام ایسا ہونا چاہئے جس میں آپ کی زندگی کی سرگذشت اور اس کے اطراف کی تصویر جھلکتی ہو اور آپ کی کتاب کے خلاصے کی علامت بن جائے۔''

یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ ان کی خادمہ نے لنچ کے میز پر لگ جانے کا اعلان کر دیا اور بات ختم ہو گئی۔ لنچ کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے کمرے میں آرام کرنے چلے گئے۔ شام کی نشست میں رفیع اور بچن بھی شریک ہو گئے اور عینی نے بدستور ہمارے ضلع بارہ بنکی کے تاریخی اور جغرافیائی حالات کی چھان بین شروع کر دی۔ ستر کھ، رودولی، سید سالار مسعود غازی، اس جوار کے نوجوان بزرگ حضرت عارف میاں کے گاؤں کے قریب سے گزرنے والی چھوٹی سی کلیدنی ندی اور گومتی ندی کا ذکر چھڑ گیا اور بیشتر معاملوں میں انھوں نے اپنی انوکھی تحقیق سے ہمیں آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجھے بتایا کہ ''گومتی ندی'' کا نام بہت پہلے شروع زمانے میں ''گھومتی ندی'' تھا کیونکہ یہ سانپ کی طرح پیچتی اور بل کھاتی ہوئی شمال مغرب سے جنوب مشرق کی طرف بہتی چلی جاتی ہے۔ گومتی ندی ہمارے جوار کی سیر کرتی ہوئی جاتی ہے اور میں اسے اپنے وطن میں پیوست سمجھتا رہا ہوں۔ چنانچہ اس کا قدیم نام ''گھومتی ندی'' سن کر میرے ذہن میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور اسے میں نے اپنی سوانح حیات کا نام رکھنے کا فیصلہ کر دیا، پھر جیسے مجھے دلی سکون حاصل ہو گیا ع

روح اندر روح شد پیوست دل در دل رسید

میں شاید پچھلے کسی باب میں حمیرا آپا کا ذکر کر چکا ہوں جو عینی کی بہن تھیں اور میرے ساتھ بھی وہی رشتہ اور محبت رکھتی تھیں، بلکہ عینی سے زیادہ مجھ سے انھیں دلچسپی رہی، اور مجھ سے پانچ سال بڑی ہونے کے باوجود عینی کے مقابلے میں مجھ سے زیادہ قریب اور بے تکلف تھیں۔ اٹل بہاری باجپئی کی پاکستان بس یاترا کے بعد جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی کی شروعات ہوئی اور دونوں طرف آمد و رفت میں سہولتیں پیدا ہوئیں تو ادیبوں اور شاعروں کی باہمی ملاقاتوں کو اس تازہ دوستی کے لئے زیادہ اہمیت دی گئی۔ سردار جعفری اور دیو آنند کو شاید باجپئی جی اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے۔ اس کے بعد اتفاق سے حمیرا آپا کی سالگرہ کا وقت آ گیا جس کے لئے مجھے عینی اور ہما خاتون کو سالگرہ میں شریک ہونے کا دعوت نامہ ملا اور ہم تینوں اسلام آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔ حمیرا آپا اکیاسی برس کی ہو چکی تھیں اور میں چھہتر سال کا ہو چکا تھا۔ اسلام آباد میں ہم لوگوں کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ عینی کے لئے روزانہ ہی محفلیں منعقد کرنے کا اہتمام کیا جاتا تھا لیکن وہ روپوش ہو جاتی تھیں اور اپنی جان سے عاجز حمیرا آپا سے چپٹی بیٹھی رہتی تھیں۔ ایک دن میں نے عینی سے پوچھا۔

''عینی بی بی یہ بتاؤ کہ کتنے جلسے اور محفلیں تمھارے خیر مقدم کے لئے منتظر رہیں اور تم سب سے دامن کشاں اور گریزاں گھر میں بیٹھی رہیں۔ اور میرے لئے لے دے کر دو محفلیں ہوئیں اور ان میں بھی ایک حمیرا آپا نے اپنے گھر پر میرے اعزاز میں منعقد کی تھی۔''

وہ بات کاٹ کر بولیں:

''دو نہیں تین جلسے ہوئے۔ تمھاری شکایت الغلط۔''

''وہ ایک محفل تو خانہ فرہنگ ایران میں تھی۔ اس سے تم اردو والوں کو کیا مطلب؟''

''اچھا وہ ہی سہی۔ مگر اس میں ضیا جالندھری جیسے بزرگ ادیب اور احمد فراز اور افتخار عارف وغیرہ نہ جانے کتنے اچھے اور معیاری شاعروں نے شرکت کی تھی۔ بڑی تعریف تمھاری ہوئی تھی۔ تم شاعر لوگ کبھی داد و تحسین سے مطمئن نہیں ہوتے۔''

''اچھا مان لیا مگر یہ بتاؤ کہ تمھاری اتنی مقبولیت بلکہ تمھاری آدھی مقبولیت بھی میرے حصے میں نہیں آئی۔ آخر میں اتنا نا قابل تو نہیں ہوں۔''

''یہی تو اصل وجہ ہے۔ تم نا قابل ہوتے تو یہ شکایت پیدا نہ ہوتی۔''

''میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔ تم کہنا کیا چاہتی ہو کھل کر بتاؤ۔''

''عزیزم میں کہنا چاہتی ہوں کہ تم نا قابل نہیں، زیادہ قابل زیادہ ہو۔ جب تم غالب اور بیدل کی فلک بوس بلندیوں سے نیچے نہیں اترتے ہو تو کسی کو کیا پڑی ہے کہ تمھیں پڑھ کر یا سن کر اپنی دماغ سوزی کرے۔ ہاں غالب کے ریسرچ اسکالر یا بیدل کے محققین ضرورت پڑنے پر تمھیں کنسلٹ کر لیں گے۔''

میں ان کی یہ بات سن کر چپ ہو گیا بلکہ سوچ میں پڑ گیا۔ بات تو بظاہر صحیح کہہ رہی تھیں مگر یہ بات ہمیشہ صحیح نہیں ہوتی اور اس میں پوری صداقت بھی نہیں ہے۔ مجھے چپ دیکھ کر وہ پھر کہنے لگیں۔

''سوچ میں کیوں پڑ گئے، تمھیں میری بات میں کیا کچھ کھوٹ نظر آیا؟ اچھا میرا ایک مشورہ اور سن لو۔ تم سادہ عام فہم زبان میں نثر لکھنا شروع کر دو مگر وہ مغلق شاعروں پر تنقیدی زبان میں نہ ہو۔ میرا مطلب سادہ اور آسان زبان میں نثر لکھنے سے ہے۔''

''سادہ اور آسان زبان میں کیا لکھوں، فکشن میں نے کبھی لکھا نہیں، تنقید کو تم غیر دلچسپ قرار دے رہی ہو۔ لے دے کر رہی شاعری بچی۔ تو کیا میں اسمٰعیل میرٹھی کی طرح نظمیں لکھوں۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

میں جدید انداز کی علامت مجری نظمیں یا غزلیں بھی نہیں لکھ سکتا جن کی تعبیر وتفسیر کے لئے جدیدیت کے مفسرین کی ضرورت پڑے جو اپنی موشگافیوں سے اس کا مطلب سمجھا سکیں۔ یا پھر موجودہ شاعروں کے سامعین کی سطح پر اتر آؤں، یہ میں کبھی نہیں کرسکتا۔ میں سعدی و حافظ، میر و غالب یہاں تک (حسرت و فانی اور اقبال میرے بزرگ معاصرین) کی ہزار سالہ ریاضت وروایت کو داغدار اور دریدہ پیرہن ہرگز نہیں کرسکتا۔"

میرا التہاب اور گرمیٔ گفتار دیکھ کر حمیرا آپا نے مداخلت کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر سے کہا:

"عینی جو کچھ تم کہنے جارہی ہو اسے پورا کرو۔ شبو (وارث کرمانی) کا ان عظیم شاعروں کی وراثت اور روایت سے والہانہ عشق غلط نہیں۔"

"حمیرا آپا میں کیا کہوں۔ یہ حضرت تو وعظ دینے لگے۔ میر غالب اور اقبال کا میری بات سے کیا تعلق؟ میں شبو تم سے یہ کہہ رہی ہوں کہ تم زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچنے کے لئے زیادہ سے زیادہ عام دلچسپی کے کسی موضوع پر نثر میں کچھ لکھنا شروع کرو۔ تم فکشن وغیرہ کچھ نہیں لکھ سکتے تو کم از کم اپنی ایک سوانح عمری لکھ ڈالو۔"

عینی کی اس تجویز پر میرے دماغ میں ایک روشنی کی لکیر سی دوڑ گئی جیسے شہاب ثاقب رات میں نظر آجائے۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا:

"Great, I get it۔ مان گئے حضرت مریم الزمانی۔ میں اب سوانح عمری ہی لکھنا شروع کرتا ہوں۔"

میں نے دیکھا کہ عینی تو مسکرا رہی تھیں جیسے وہ صحیح راستے پر مجھے لگا کر مسرور ہو رہی ہوں، لیکن حمیرا آپا یہ فیصلہ ہو جانے پر کہیں کسی اور دنیا میں چلی گئیں جیسے کسی بات کو گہرائی سے سوچ رہی ہوں۔ ایسے عالم میں ان کی آنکھوں کا انداز عجیب ہو جاتا تھا جیسے کوئی اجنبی بیٹھا ہو۔ پلکوں کو تھوڑا دبا لینے سے ایسی نیم نگاہی کا احساس ہوتا تھا جسے میر نے اپنے ایک شعر میں مصور کر دیا تھا ۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

میر خدائے سخن تھے، ان کے قلم کے لمس میں جادو تھا، تاہم وہ حمیرا آپا کی اجنبیت کو نہیں پہنچ سکے تھے۔ البتہ غالب کے اس شعر میں کچھ نسبت اور رشتہ ضرور ملتا ہے ۔

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

مگر اس میں بھی وہ جادو کہاں جس کا تماشا میں اس وقت دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا حال اور استقبال سے بے خبر دور وہ کسی بیتے ہوئے زمانے کے دیکھنے یا سمجھنے میں منہمک ہوگئی ہوں۔ ایسا دیکھنا جسے دیکھ کر دیکھنے والے کو رقابت محسوس ہو کہ ان کی نیم نگاہی کا مرکز یا اس کا ہدف وہ خود ہو جائے اور اس کے گرد ہمیشہ طواف کرتا رہے اور زمین پر کبھی واپس نہ آئے اور نہ اسے آنے دے۔ غالب نے پھر میرے مفہوم کو زبان عطا کر دی ہے ۔

کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوک بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

غالب کو میں میر سے بڑا شاعر ہرگز نہیں سمجھتا۔ لیکن غالب کو میر کے مقابلہ پر زیادہ مقبولیت اس لئے حاصل ہوئی ہے کہ آخر الذکر کا تخیل اور ان کا ذہن دراک ایسی بے نام انسانی کیفیات اور محسوسات تک پہنچ جاتا ہے جہاں میر، اقبال یا کسی دوسرے اردو شاعر کا نہیں پہنچتا۔ مگر سچی عاشقانہ شاعری اور دل دماغ کو عاشقانہ جمالیات کی زبان میں ادا کرنے اور اس کی صمیمیت اور سچائی poetic truth کو قاری تک پہنچانے میں میر کا جواب آج تک کوئی شاعر نہ بن سکا۔ غالب بیچارے کیا پہنچتے۔ وہ کبھی عاشق ہوئے ہی نہیں۔

حمیرا آپا نے اسی عالم میں منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، جیسے اپنی دماغی غیر حاضری کو چھپا رہی ہوں

"ہاں تو عینی کی اس تجویز سے مجھے بھی اتفاق ہے۔ تم اپنی سوانح عمری لکھ ڈالو۔ عینی تم سننے کے موڈ میں ہو؟ پرسوں ہماری سالگرہ کے موقع پر جو نظم شاعر لاثانی فخر انوری وخاقانی حضرت وارث کرمانی نے اینجانب کی نذر کی تھی اسے اس وقت ہم پھر سننا چاہیں گے۔"

عینی نے فوراً مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

"شبو حکم بندگان عالی کی تعمیل کی جائے۔ واقعی وہ نظم بہت اچھی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا وہ نظم زیادہ اچھی ہے یا حمیرا آپا۔"

حمیرا آپا نے جواب دیا:

"پھول سے خوشبو ہمیشہ لطیف تر مانی جائے گی۔"

میں نے عرض کیا: "تو پھر اس نظم کو اپنی خوشبو (ہنس کر) یا اپنی خوشبوے پیرہن سمجھ کر سنئے گا۔"

حمیرا خاتون کی ۸۱ ویں سالگرہ

یہ ہم جو وادیِ گنگ جمن سے آئے ہیں
ترے وطن میں ترے ہی وطن سے آئے ہیں
وہ سرزمیں کہ جہاں تونے پرورش پائی
اسی کی خاک لگا کر بدن سے آئے ہیں
وہ درس گاہ علی گڑھ وہ انجمن اپنی
سلام لے کے اسی انجمن سے آئے ہیں
ترا ہی خون رواں بنت یلدرم میں ہے
یہ تیری جان لئے ہم وطن سے آئے ہیں
ہما کے سائے میں بلبل کی یہ نوا سنجی
ہم اس دیار میں گویا چمن سے آئے ہیں
ہماری عمر ہماری شگفتگی پہ نہ جا
کہ آج بھی ہم اسی حسن ظن سے آئے ہیں
ترا خلوص ترا لطف جب بھی یاد آیا
نسیم صبح کے جھونکے چمن سے آئے ہیں
کبھی جو تجھ سے ملے ہیں تو یہ ہوا محسوس
کہ جیسے محفل شعر و سخن سے آئے ہیں
شفق کی شام ہو یا صبح لالہ و گل ہو

کبھی کے رنگ ترے پیرہن سے آئے ہیں
ہزار مانی و بہزاد و حافظ و خیام
مرید ہو کے تری بزم فن سے آئے ہیں
بنے یہ سالگرہ ہند و پاک کا سنگم
دعا یہ لے کے ہم اہلِ وطن سے آئے ہیں

مگر اس نظم سے کیا ہوتا ہے، اس کے عقب میں سالہائے دراز کی ایک غمگین وخوش رنگ دنیا آباد ہے جو مٹ کر بھی، کبھی کبھی جاگ اٹھتی ہے۔ فیض اس منزل سے ضرور گزرے ہوں گے۔

کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائش دل ونظر کی وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے

اکیاسی سال کی آپا حمیرا اخلاق تو کر رہی تھیں مگر استقبال نہیں۔ مروت تو کر رہی تھیں مگر نصف صدی پہلے کی محبت نہیں۔ بظاہر تو بہت کچھ تھا مگر کچھ بھی نہ تھا۔ ماہ وسال کی گرد صرف چہرے پر نہ تھی بلکہ اندر گہرائیوں میں سرخوشی اور دل افروزی کی روشنی بھی گرد آلود ہو چکی تھی۔ حمیرا آپا نے میری بہت خاطر کی، بڑی ناز برداری سے رکھا۔ میرے اعزاز میں بڑی شاندار تقریب کی۔ میڈیا کے ذریعہ تصویریں اور روداد شائع ہوئیں۔ اتنی مدت دراز کے بعد اتنی نوازشیں۔ رخصت ہوتے وقت ہم دونوں نے تنہائی میں ملاقات سے احتراز کیا۔ کوئی غم کوئی لحاظ دامن گیر نہ تھا۔ کسی خفت یا ندامت کا سوال ہی نہ تھا۔ پھر بھی کوئی سوال، کسی انجانے خوف کا سایہ، یا کوئی اور چیز جسے میں بیان نہیں کر پا رہا ہوں، ضرور تھی۔

جب میں واپس آنے کے لئے موٹر میں بیٹھ رہا تھا تو ان کے گھر کے تمام افراد باہر لان میں موجود تھے۔ خدا حافظ کہنے سے پہلے حمیرا آپا نے مجھ سے پوچھ ہی لیا: ''تمھیں میرے پاس رہ کر کیسا لگا؟'' میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دوں، اپنی دلی حالت کیسے بیان کروں۔ آخر نثر کے بجائے شاعری ہی کام آئی۔ بے ساختہ زبان سے نکلا۔

فضا تبسم صبح بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزل جاناں پہ آنکھ بھر آئی
(فراق)

قرۃ العین حیدر کے بعد میرے موجودہ دوستوں میں گوپی چند نارنگ کا ذکر بہ اعتبار عمر پہلے آنا چاہئے۔ لیکن شمس الرحمٰن فاروقی کا ذکر ترتیب حالات کی وجہ سے پہلے کرنا پڑ رہا ہے۔ ان کا جاری کردہ رسالہ ''شب خون'' میرے جدیدیت کے نظریے کا آئینہ دار بن کر سامنے آیا۔ اس سے پہلے میں زیادہ تر ''ادب لطیف''، ''نقوش'' اور ''فنون'' جیسے معدودے چند پاکستانی رسائل میں چھپتا تھا۔ ''شب خون'' سے مجھے جدیدیت کے پرزور حامی ہونے کی وجہ سے جذباتی تعلق تھا۔ لیکن اس میں شامل بہت سے فضول گو شاعروں کو میں ناپسند کرتا تھا۔ اب سے تیس پینتیس سال پہلے رسالے پر عنفوانِ شباب کی بے اعتدالی اور کج روی کی فضا طاری رہتی اور میرے بہت سے محترم شاعروں نے غیر محترم اور ضدی شاعروں کی ہمت افزائی بھی کی۔ ظفر اقبال جیسے بڑے شاعر اور فاروقی جیسے عالم شاعر اس حمام میں 'لباس برہنگی' اختیار کرنے لگے۔ ظفر اقبال سے مجھے کیا لینا دینا تھا، وہ بہت دور رہتے تھے لیکن ہر وقت کے رفیق فاروقی ہی تھے، اور علی گڑھ کے ہمسن ادیبوں میں جیسے خلیل الرحمٰن اعظمی، شہاب جعفری، قمر رئیس اور راہی معصوم رضا، جو ترقی پسند تھے، امین اشرف جو مستی وقلندری کے شاعر تھے، یا منیب الرحمٰن اور جذبی، اور سب سے زیادہ آتش مزاج خورشید الاسلام، اور کم سخن اختر انصاری وغیرہ زیادہ عمر کے اور زیادہ سنجیدہ سخنور تھے۔ سب میں اس افراط وتفریط کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔

بڑی پرانی داستان اور ان کہی باتیں لکھنا پڑ رہی ہیں کیونکہ اب شاید اس خود نوشت کے بعد ایسا موقع اظہار حقیقت کا نہ مل سکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس عمر میں غرض مندی اور مصلحت اندیشی بھی نہیں رہتی ہے۔ بہر حال، میں جدیدیت کو پاک صاف رکھتے ہوئے کلاسیکیت سے یکسر اکھڑنا بھی نہیں چاہتا تھا، اس کے لئے مجھے اکثر لڑنا بھی پڑتا تھا۔ ایسے مضامین کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، بلکہ ابھی چند سال پیشتر فاروقی صاحب کو میں نے سخت احتجاج کا خط لکھا تھا جب انھوں نے فراق پر احمد مشتاق کو ترجیح دی تھی۔ میرے احتجاجی خط کا انھوں نے ''شب خون'' ہی میں تلخ وتند وشیریں لہجے میں جواب بھی دیا لیکن ان کے جواب اور ناراضگی کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا اور نہ میری دوستی میں کمی آئی۔ میں یہی دعا کرتا رہا۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اس خلوص اور دوستی کے باوجود ادبی ذوق کا فرق ہمارے درمیان حائل رہا ہے۔ میں اسے نظریاتی اختلاف نہ کہوں گا۔ یہ ایک مزاجی کیفیت ہوتی ہے، جس کا ملن یا اتصال کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی فراق اور مشتاق کے متعلق شعری تحسین کے فرق کو لے لیجئے، اس میں میں کیا کر سکتا ہوں؟ فاروقی تو مجھ سے زیادہ سمجھ دار انسان ہیں اور ملک کے مانے ہوئے نقاد ہیں۔ میں نے اپنی محبوبہ کے شعری تحسین کے بارے میں کبھی زبردستی نہیں کی حالانکہ اس کے ساتھ زبردستی جائز ہے۔ وہ میرے تڑپانے والے شعروں کو ''تحت تاثیر صائب'' لکھ دیتی۔ ایک دن اس کی یاد مجھے بہت ستا رہی تھی۔ اسی عالم میں رات کو غزل ہوگئی اور میں نے اسے فیکس کر دیا۔ غزل کے چند شعر لکھ رہا ہوں۔ میرا عشق اتنا شدید ہوتا ہے کہ جدیدیت یا مابعد جدیدیت کچھ نہیں بھائی دیتا، سیدھی بات کرتا ہوں۔

کس ندانست در عشق تو چہ دیدم جاناں
این نظر را ز ہمہ خلق نہفتم جاناں
آہ ازاں نالہ کہ در ہجر تو کردم ہمہ شب
آتشیں تر شدہ از گریۂ پیہم جاناں
وارث از لطف خطا پوش تو برباد شدہ
چہ کند شکوۂ بے مہری آدم جاناں

اس نے خط پاتے ہی مجھے ٹیلیفون کیا۔ حسب ذیل الفاظ سننے میں آئے:

خوبترینم (خوب ترین من) باسلام
غزلے کہ بہ اینجانب فیکس کردہ بودید امروز
ساعت چہار دریافت کردم۔ وارث خوبم غزل شما خیلے

تشنگ است۔ اماچرا ایں قدر در شعر گریہ می کنید؟ (قہقہہ) بیمار شدید؟ ناراحت ہستید؟ امیدوار باشید زود معالجہ بکنم۔ از شربت دیدار منظور شما چیست؟ من فقط شربت بنفشہ را می دانم کہ در سر ما خوردگی طبیبان سنتی می نویسند۔ ہم غزل وہم نامہ ہا رشما تحت تاثیر صائب می باشند۔ صائب شمارا رہا نمی کند۔

لطفاً مراقب سلامت خود باشید۔ پریوش۔

(ترجمہ)

وہ غزل جو آپ نے مجھے فیکس کی تھی آج چار بجے موصول ہوئی۔ فوراً ٹیلی فون سے رابطہ کر رہی ہوں۔ میرے سب سے اچھے وارث تمھاری غزل بہت خوبصورت ہے، لیکن تم شعر میں اتنا روتے کیوں ہو (قہقہہ) بیمار ہو؟ پریشان ہو۔ پرامید رہا کرو۔ میں علاج تمھارا کر رہی ہوں۔ شربت دیدار سے تمھارا کیا مقصد ہے؟ میں فقط شربت بنفشہ جانتی ہوں جسے یونانی (روایتی) حکیم نسخے میں لکھتے ہیں۔ تمھاری غزل اور تمھارے خطوط سب مرزا صائب اصفہانی کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ صائب تمھیں رہا نہیں کرتا ہے۔

براہ کرم اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔ پریوش۔

میرا جی چاہا کہ میں اس سے یہ کہوں کہ جان من تم مصر کی ملکہ قلوپطرہ سہی، زلیخا سہی، شہر سبا کی ملکہ بلقیس سہی، لیکن ہندوستان کی نفاست اور شعری مزاج سے قطعاً ناواقف ہو۔ میں تڑپ تڑپ کر شعر لکھتا ہوں اور تم قہقہے لگاتی ہو۔ تم نے صرف صائب کو پڑھ رکھا ہے جو تمھارے فوق الملیسانس کے کورس میں شامل ہوگا اور اس سے کہیں بڑے شاعروں تک تمھاری رسائی نہیں۔ میں خود تمھیں اپنے معیار سے اتر کر نوجوانی کے انداز کے شعر لکھتا ہوں، زیادہ بڑی شاعری تمھارے پلے ہی نہیں پڑے گی۔ تمھارے یہاں شاعری صفویوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد صرف مرثیوں اور منقبتوں تک محدود کر دی گئی، اس کی وجہ سے سب شاعر بھاگ کر ہمارے شہنشاہوں کے دربار میں آگئے اور تمھارے یہاں شاعری پر زوال آگیا۔ تمھاری عظیم شعری وراثت اور روایت کی پرورش و پرداخت ہمارے ملک میں ہوئی۔ تم شاعری کیا جانو۔ تم اپنا عاشق (جو پہلے تمھارا معشوق تھا) سمجھ کر کس کے شعروں سے شوخی اور مذاق کرتی ہو؟ وہ تمھارا شیفتہ و شوریدہ ایک دوسری حیثیت بھی رکھتا ہے ؎

وارث شعر دلی و شیراز
نازش دودمان کرمانی

مگر یہ ڈینگ دل ہی دل میں مار کر رہ جاتا تھا۔ اس کی "ایک نچلی ایک تبسم ایک نگاہ بندہ نواز" پر اپنی ہر چیز قربان کر دینے کا جی چاہتا تھا۔ کیا کرتا۔ بس غالب کو یاد کر کے رہ جاتا تھا ؎

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

فاروقی میری محبوبہ تو نہیں تھے لیکن گہرے دوست اور نقاد اور سخن شناس دوست ہونے کی وجہ سے وہی تکلیف وہ درجہ رکھتے تھے جو پریوش کا تھا۔

انھیں میرے شعر جب متاثر نہیں کر پاتے تھے تو مجھے برا تو نہیں لگتا تھا کیونکہ میں ان کے مزاج اور ادبی مشن کو سمجھتا تھا۔ لیکن دکھ اس بات کا ہوتا تھا کہ وہ روایت آمیز اور روایت زدہ کے نازک فرق کو نہیں سمجھ پاتے تھے یا نظر انداز کر جاتے تھے۔ روایت زدگی کا میں بھی مخالف ہوں لیکن اسلاف کی سنت کو یکسر جڑ سے اکھاڑنے کا میں متحمل نہیں ہو سکا۔ یہ ہے ادبی ذوق کا وہ فرق جو میرے اور فاروقی صاحب کے درمیان حائل رہا۔ اور یہ خلیج میرے پاٹے نہیں پٹتی۔ میری کمزوری یہ ہے کہ مدت العمر کے رفیق "شب خون" کو چھوڑے نہیں چھوڑا جاتا۔ بس اتنا ہی شکوہ ہے ؎

کمر در خدمت عمریست می بندم چہ شد قدرم
برہمن می شدم گر ایں قدر زنار می بستم

(نظیری)

مجھے یہ حسرت رہی کہ میں "شب خون" کو اپنے حسب منشا بنا سکتا۔ میں اسے یہ بتانے میں ناکامیاب رہا کہ وہ اردو ادب کا ایسا چمن بنے جس میں ہر طرز اور ہر خیال کے پھول بلا امتیاز قدیم وجدید لہلہا سکیں، اگر امتیاز ہو تو صرف خوشبو کا ہو یعنی شاعرانہ جوہر کا۔ اس میں اصناف سخن کی درجہ بندی نہ ہو مثلاً غزل نمبر ۱، نظم نمبر ۲، مثنوی قصیدہ نمبر ۳۔ اسی طرح نثر میں افسانہ نمبر ۱، تنقید نمبر ۲، اور خود نوشت نمبر ۳۔ کوئی صنف سخن بذات خود اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ اسے قلم کا جوہر عظمت اور عوام عطا کرتا ہے بلکہ نظم و نثر میں بھی یہی نظام کارفرما ہے۔ آج کتنے شاعر ہوں گے، بلکہ صف اول کے شاعر ہوں گے، جو انتظار حسین کی نثر یا وارث علوی کی نثر کا مقابلہ کر سکیں گے؟ خود غالب جیسے عظیم ترین اردو شاعر غالب نثر نگار کے سامنے جاتے ہوئے لرز جائیں گے۔ یہ تمام باتیں لکھنا ضروری تھیں کیونکہ میری عمر اپنی آخری منزلیں طے کر رہی ہے اور "شب خون" کا یہ آخری شمارہ ہے اور ہمیشہ کے لئے اس کی زبان خاموش ہو جائے گی اس لئے اتنا کچھ لکھنے سے کیا فائدہ تھا۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا ؎

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصود ہر پروانہ تھا
اب کوئی سودائی سوز تمام آیا تو کیا

(اقبال)

گوپی چند نارنگ کا ذکر اس کتاب میں کئی جگہ آچکا ہے۔ لکھی ہوئی باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا ہوں، اب جو باتیں کہنا چاہتا ہوں وہ میرے دل سے تعلق رکھتی ہیں۔ نارنگ نے مجھ سے بے غرض محبت کی ہے۔ انھوں نے مجھے اپنا ہاتھ دے کر اس وقت اٹھایا جب میں بازار ادب میں زخمی پڑا تھا۔ ادب کے بردہ فروشوں نے مجھے نہایت ارزاں اور بے قدر و قیمت سمجھ رکھا تھا بلکہ 'سرمۂ مفت نظر' بنا رکھا تھا۔ ادب میں سیاست کا زور تھا، میرے ہم عمر بیشتر ادیب ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو کر منظر عام پر مجھ سے بہت پہلے آچکے تھے اور میں اپنی ادبی ضد میں آل احمد سرور اور سجاد ظہیر جیسے بزرگ سرپرست اور سردار جعفری جیسے عظیم ڈکٹیٹر کو بھی ناراض کر چکا تھا اور اس کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔ ایسی ہی زخم خوردہ حالت میں جب مجروح سلطان پوری نے اپنے ساتھ ناانصافی کرنے کی مجھ سے بحیثیت ایک نقاد شکایت کی تو میرا دل پگھل گیا کیونکہ میں خود ناانصافی کا شکار تھا اور میں نے ایک بھر

پر مضمون مجروح کی غزل پر لکھ کر " آجکل " دہلی میں چھپوا دیا اور سخن شناسوں کو یہ بتایا کہ تم لوگ ہر وقت جو فیض کی ڈگلی بجایا کرتے ہو تو کبھی یہ بھی غور کیا ہے کہ مجروح فیض سے بڑا غزل گو ہے اور تم نے اس کو فلمی شاعر کا درجہ دے رکھا ہے؟

میرے مضمون سے اس وقت کے عام عقیدے پر ایک طمانچہ لگا۔

بہت سے گمبھیر ناقد بھنا گئے۔ مگر تین ہی چار مہینوں کی قلیل مدت میں اسلوب احمد انصاری، معین احسن جذبی حتیٰ کہ خود سردار جعفری نے میری بات یا میرے صلائے عام کی تائید میں تسلیم کر لیا کہ صنف غزل کی حد تک واقعی فیض، مجروح سے کمتر درجہ رکھتے ہیں۔ مجروح صاحب بہت بڑے غزل کے شاعر تھے مگر جس خاکساری سے انھوں نے اظہار تشکر کے خطوط اس حقیر کو لکھ کر بھیجے تھے ان کا چھپوانا میرے منصب اور معیار کے منافی ہے۔ مگر اتنا ذکر صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ یہی جذبہ تشکر نارنگ کے لئے میرے دل میں ہے۔ شیلندر، قرۃ العین حیدر اور فاروقی میرے دوست تو تھے لیکن اس افتادگی میں کوئی معاون نہ ہو سکا۔ شیلندر ہندی کے ادیب تھے، ان سے کیا توقع کی جا سکتی تھی تاہم انھوں نے بڑے بڑے جلسوں میں میری ادبی خدمات کو سراہا اور اپنی پرزور اور دل نشیں تقریروں سے اردو کے علاوہ ہندی ادیبوں کو بھی متاثر کیا۔ قرۃ العین حیدر نے بھی غالب پر میری انگریزی کتاب پر بہت اچھا مضمون لکھا تھا جب وہ السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کی مجلس ادارت میں خوشونت سنگھ کے ساتھ کام کرتی تھیں۔ فاروقی نے میری کتاب Dreams Forgotten پر ایک مفصل مضمون دہلی کے اخبار The Statesman میں تقریباً بیس سال پہلے لکھا تھا۔ انھوں نے میرے انگریزی مضامین کا ذکر بھی کہیں کہیں کیا ہے، لیکن اردو زبان جو میری اصل تخلیقی میڈیم تھی اس میں نظم و نثر پر کچھ نہیں لکھا ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے۔ میرا خیال ہے اس معاملے میں وہ اپنے ادبی مشن یا مفروضہ جدیدیت کے حصار سے مجبور تھے اور میری تخلیقات و تنقیدات کو "شب خون" کی پالیسی یا نقطۂ نظر کے منافی سمجھتے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ میرے سرمایۂ ادب سے لطف اندوز نہ ہوتے ہوں اس لئے میں انھیں تحسین ناشناس کا مرتکب نہیں کہہ سکتا۔ لیکن سکوت سخن شناس کے ذیل میں وہ ضرور آ جاتے ہیں کیونکہ بارہا انھوں نے مجھے لکھا ہے کہ آپ کی غزل بہت خوب ہے مگر ہمارے کام کی نہیں ہے۔ قرۃ العین حیدر ادبی رزمگاہ سے ہمیشہ کنارہ کش رہیں اس لئے میں انھیں مبرا سمجھتا ہوں۔ وہ میرے لئے حقیقی بہن جیسا درجہ رکھتی ہیں۔ میری بیٹی وہیں قریب جامعہ نگر میں رہتی ہے۔ خود قرۃ العین کے گھر کے پاس ہی نوئڈا میں میری گود میں پلی ہوئی ان کی بھانجی ہما حیدر اور داماد جو مجھے بیٹی ہی طرح عزیز و شریف ہیں، اپنی رہائش گاہ میں نہایت عیش سے رہتے ہیں۔ لیکن میں بیشتر قرۃ العین حیدر ہی کے گھر پر مہمان رہتا ہوں۔ ان کے ملازمین، ان کی لمبی چمکتی ہوئی موٹر اور ڈرائیور میرے لئے کمربستہ رہتے ہیں اور مجھے ہر طرح کا آرام پہنچاتے ہیں۔ مجھے اگر کوئی ان کی موجودگی میں برا کہے گا تو اسے وہ برداشت نہ کر سکیں گی۔

میرے سبھی دوست مجھ پر مہربان رہے ہیں اور میری برائی کرنے سے انھیں دکھ پہنچے گا، جیسا کہ ابھی کسی فرضی نام سے میرے شعبۂ فارسی کے کسی حاسد ملازم نے میری کردار کشی کے لئے ایک خط "شب خون" میں چھپوا دیا تھا۔ فاروقی صاحب سخت پریشان ہوئے، مجھے دو بار ٹیلی فون کیا اور اس خط کی نقل بھیجی۔ لیکن میں اس زمانے میں باہر گیا ہوا تھا، اور وہ خط انھوں نے مجبوراً سہواً چھاپ دیا اور مجھ سے اس جعلی خط کا قرار واقعی اور مناسب جواب دینے کا مطالبہ کیا۔ میں نے معذرت چاہی کہ میں ایسے لوگوں کے منھ لگنا پسند نہیں کرتا۔ مگر وہ بیحد مصر ہوئے اور جواب میری طرف سے چھپ گیا۔ ان کی پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ انھوں نے سوچا ہوگا مجھے "شب خون" سے کتنا تعلق رہا ہے اور اس کے بند ہو جانے سے ایک مدت العمر کے رفیق کے اچانک ختم ہو جانے کا سا صدمہ مجھے ہوا ہوگا اور رخصت ہوتے ہوئے میرے رفیق رسالے نے مجھے کیا انعام دیا، گویا تیس چالیس سال کی ادبی خدمات کا معاوضہ یا صلہ دشنام طرازی اور سنگ ملامت۔ "شب خون" عالم رویا میں مجھ سے ضرور کہے گا ؎

زمن بجرم ملامت 'کنارہ گیر شدی'
بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

ذکر نارنگ کا ہو رہا تھا۔ ان کی میری دوستی بہت کم مدت کی ہوتے ہوئے بازار ادب میں بہت زیادہ سکوں بخش ہوئی۔ انھوں نے میری بیماری دل کو پہچانا اور فرسٹریشن (ناامیدی) میں میرے تخلیق کار اور نقاد سخن ہونے کا یقین دلایا۔ میری ٹوٹی پھوٹی نگارشات جو بھی ہیں انھیں صرف دل سے پسند نہیں کیا بلکہ زبان سے بھرے بازار میں اقرار کیا اور داد سخن دے کر ہمت افزائی کی۔ یہ داد سخن بعض دوستوں کی طرح صرف میرے کان میں چپکے سے کہہ کر علیحدگی نہیں اختیار کی، بلکہ کھچا کھچ بھرے ہوئے ادبی جلسوں، سیمیناروں، سرکاری اور غیر سرکاری نشستوں میں نہایت تفصیل سے کی۔ مجھے حیرت بھی مسرت کے ساتھ ہوئی کہ ایسا شخص جو مجھ سے کہیں زیادہ پڑھا لکھا ہو، کہیں زیادہ کتابوں کا مصنف ہو، جس نے اپنے علمی و ادبی سرمائے سے تمام اردو دنیا کو متاثر کر لیا ہو، مجھ جیسے کم سواد سے اتنا واقف ہو اتنی قدر کرتا ہو اور اس کے بعد میری آزادی قلم کا متحمل بھی ہو۔ پھر میں نے ان کی تحریر و تقریر پر توجہ مرکوز کی اور ان کی خوبیوں سے متاثر ہوا۔ میں نے دریافت کیا کہ ان کے نظریاتی تنقید کے مضامین اور کتابیں درجنوں مغرب کے فلسفیوں ناقدوں اور لسانیات کے عالموں کو گہرائی سے پڑھ کر لکھی گئی ہیں بلکہ پڑھ کر اردو ادب اور فارسی و عربی روایات میں ڈبو دیا ہے پھر انھیں مدت دراز تک زیر غور رکھ کر ہضم کیا ہے تب جا کر جدید ادبی فضا کے لئے نظریات مرتب کئے ہیں۔ ان کا ذہن اتنا کشادہ ہے کہ جدید ترین نوجوان لکھنے والوں کے فکری رہنما ہوتے ہوئے مجھ جیسے سن رسیدہ لکھنے والوں کے قدر شناس ہیں۔

مجھے ان چار دوستوں کے ذکر کے بعد اپنی روداد حیات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے، وہ روداد حیات جو اپنے گاؤں کے ان پڑھ لڑکوں کی سنگت میں شروع ہوئی اور جوانی کے شور و شر سے گزرتی ہوئی اب شام زندگی کے انھیں چند ہم سفر ادیبوں کے علم و عرفان کی روشنی میں اپنی آخری منزلیں طے کر رہی ہے۔ گذرے ہوئے دوستوں اور سرپرستوں کی یاد تنہائی میں بہت ستاتی ہے اب کوئی دوست مزید بیوفائی نہ کرے اور مجھے چھوڑ کر نہ جائے۔

یہ چار دوست میری شام زندگی کے ہم سفر ہیں اس لئے ان کا ذکر طول پکڑ گیا

ہے۔لیکن ان کے علاوہ بھی میرے بہت سارے دوست میدان ادب میں رہے ہیں۔اتنی طویل زندگی میں ذہنی اور جذباتی تغیرات کے ساتھ دوستوں کی تعداد اور میری مزاجی کیفیت گھٹتی بڑھتی رہی ہے۔ان ادبی دوستوں میں بعض میرے حریف ونکتہ چین، بعض مجھ پر جان دینے والے ہم نوالہ وہم پیالہ وہم نوا اور مداح اور بعض میرے اعمال وافکار پر نظر رکھنے والے رہے ہیں۔ادیبوں کی دنیا بھی عجب نازک حساس اور تنگ مزاج ہوتی ہے ؎

قدم ذرا جو ہٹا جادۂ وفا سے کبھی
ہر ایک ذرہ پکارا کہ دیکھتا ہوں میں

علی گڑھ یونیورسٹی میں میں نے اپنے حلقۂ احباب کو "اخوان الشیاطین" کا خطاب دے رکھا تھا بغیر سوچے ہوئے کہ میں خود انھیں میں شامل تھا۔ہم لوگ جب الف لیلہ یا کسی دوسرے چائے کے ریستوراں میں گپ مارنے بیٹھ جاتے تھے تو راہی معصوم رضا کہتے تھے: یار بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہوں، لیکن اٹھتا اس ڈر میں نہیں ہوں کہ فوراً تم سب لوگ میری برائی شروع کر دو گے! انور معظم، شہریار اور قاضی عبدالستار کو یہ باتیں خوب یاد ہوں گی۔بعض اوقات سوچتا ہوں کہ بارگاہ ایزدی میں مرزا غالب کی طرح اپنے اعمال نامے کی مدافعت میں ایک معقول اور قانونی دلیل جو انھوں نے پیش کی اسے بھی اپنے کیس میں نہ پیش کر سکوں گا غالب نے کہا تھا ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

لیکن میرے کاندھے پر دونوں طرف نیکی اور بدی لکھنے والے دو فرشتوں کے ساتھ کئی آدم زاد نقاد بھی بیٹھے رہے ہیں، میں کس منہ سے محض فرشتوں کی یکطرفہ کاروائی کی شکایت کر سکوں گا؟

گھومتی ندی بہت سے پیچ وخم اور نشیب وفراز سے گذرتی ہوئی اپنے مخرج تک پہنچنے والی ہے۔ندی کے پانی میں غروب آفتاب کا منظر میرے سامنے ہے۔شاد عظیم آبادی کی طرح 'میں حیرت وحسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر۔' حسرت بہت کم ہے البتہ حیرت زیادہ ہے۔میری پرشور زندگی گذر چکی ہے۔اس کی بہت دھندلی سی آواز بہت دور سے کانوں میں آرہی ہے، کبھی ابھرتی اور کبھی ڈوب جاتی ہے۔میرے چاہنے والے، میرے سرپرست، رخصت ہو چکے ہیں۔میرے بے تکلف احباب صبح کے آسمان کے ستاروں کی طرح کہیں کہیں ابھی نظر آرہے۔زبان بدل گئی ہے لباس بدل گئے ہیں۔

اونچی اونچی بغیر آنگن کی عمارتیں اور اس کے خانوں اور کھڑکیوں کے اندر رہنے والی نئی نسل ایک بے حس بے تعلق اجنبی دنیا کو میرے سر پر نازل کر رہی ہے۔نہ سمجھ میں آنے والی مشینوں کی اس دنیا میں کیسی حسرتیں اور کیسی تمنائیں۔ہاں ایک کمزور سی تمنا ابھی دل میں کسمسا رہی ہے، اپنے قارئین کی پسندیدگی کی۔اگر یہ حاصل ہو گئی تو شاید قلم کچھ اور چل سکے اور قلم کے ساتھ زندگی بھی۔

تمام شد

☆☆☆

غزل

سردار آصف

نکل کے ذہن سے میرے زباں پہ آیا کب
وہ دل کا نغمہ سبھی میں نے گنگنایا کب

گئی جو دھوپ تو اب چاندنی کی باری ہے
کہ ساتھ چھوڑے گا میرا یہ کالا سایہ کب

نہ جانے ہو گیا دنیا میں تیرے جیسا کیوں
سبق حیات کا تو نے مجھے پڑھایا کب

تمام شہر تو خوشبو سے اس کی واقف ہے
کوئی تو مجھ کو بتاتا یہاں وہ آیا کب

میں تم سے پہلے ملا تھا تو اس میں دھڑکن تھی
بتاؤ سینے میں پتھر کا دل لگایا کب

میں اس کے دھیان میں اس درجہ گم ہوا اک دن
پتہ چلا ہی نہیں کب گیا وہ آیا کب

سفر یہ دھوپ کا اب ختم ہونے والا ہے
چلے گا ساتھ مرے کوئی سایہ سایہ کب

عالم خورشید

سڑک پہ دوڑتے مہتاب دیکھ لیتا ہوں
میں چلتا پھرتا ہوا خواب دیکھ لیتا ہوں

مری نظر سے پرے سیکڑوں جہاں ہوں گے
میں اک جہان تہ آب دیکھ لیتا ہوں

میں ٹوٹے بکھرے ہوئے دوستوں کی بستی میں
نئے نظام کے آداب دیکھ لیتا ہوں

عجیب دھند ہے، میں اپنی ہار میں عالم
شکست گنبد و محراب دیکھ لیتا ہوں

کبھی میں ذکر کروں دن کی شادمانی کا
فسانہ ختم تو ہو شب کی سرگرانی کا

سمٹ کے آ گیا قدموں میں کس طرح صحرا
سنا تھا شور بہت اس کی بے کرانی کا

عجب نہیں کہ نئے راستے نکل آئیں
کسی نے راستہ روکا ہے بہتے پانی کا

تمام اہل زباں باطلوں کے حق میں ہیں
مجھے ملال نہیں اپنی بے زبانی کا

جو بات کہنی تھی اب تک کہی نہیں میں نے
میں اختتام کروں کیسے اس کہانی کا

خدا سمجھتا ہے خود کو یہاں جو آتا ہے
عجیب حال ہے عالم سرائے فانی کا

بس ایک ترے خواب سے انکار نہیں ہے
دل ورنہ کسی شے کا طلب گار نہیں ہے

آنکھوں میں حسیں خواب تو ہیں آج بھی لیکن
تعبیر سے اب کوئی سروکار نہیں ہے

لہروں سے ابھی تک ہے وہی ربط ہمارا
کشتی میں ہماری کوئی پتوار نہیں ہے

کیا سحر ہوا کوئی مرے شہر پہ اب کے
دیوار تو ہے سایۂ دیوار نہیں ہے

غزلیں

عالم خورشید

اب چھت پہ کوئی چاند ٹہلتا ہی نہیں ہے
دل میرا مگر پہلو بدلتا ہی نہیں ہے

کب سے میں یہاں بت بنا بیٹھا ہوں سرِ راہ
بت ہے کہ شوالے سے نکلتا ہی نہیں ہے

سونے کی جگہ روز بدلتا ہوں میں لیکن
وہ خواب کسی طرح بدلتا ہی نہیں ہے

میں کھینچتا رہتا ہوں اسے دل سے شب و روز
وہ تیر مرے دل سے نکلتا ہی نہیں ہے

آتا ہے نظر اور ہی منظر ہے کوئی اور
کیا محوِ تماشا مرے اندر ہے کوئی اور

تبدیل ہوئی کیسے ہر اک گھر کی وراثت
در پر ہے کوئی نام پسِ در ہے کوئی اور

نظارہ کہاں ایسا کسی دشت میں دیکھا
پاؤں تو کسی کے ہیں مگر سر ہے کوئی اور

الجھی ہے مگر تشنہ لبی تشنہ لبی سے
یہ بات الگ ہے کہ سمندر ہے کوئی اور

حیران ہو رہا ہوں بصیرت کے نام پر
میں دیکھتا کچھ اور ہوں منظر کچھ اور ہے

مجھ کو ستارہ اور کوئی کھینچتا ہے کیوں
میرا علاقہ اور ہے محور کچھ اور ہے

پتھر سمجھ رہا ہے زمانہ تو کیا کروں
مٹھی میں میری جب کہ منور کچھ اور ہے

تاثیر خاک آئے گی الفاظ میں مرے
دل میں ہے اور بات لبوں پر کچھ اور ہے

عالم مجھے بھروسا نہیں زائچوں پہ اب
اس میں لکھا تھا اور میسر کچھ اور ہے

راحت حسن

کام آئے گی تری کھوج میں ظلمت ایسی
کس کو معلوم تھا بن جائے گی صورت ایسی

بے سبب پڑ گئے ہیں جان کے لالے اب کے
بے ضرورت ہی نکل آئی ضرورت ایسی

جانے ہو ریت کے صحراؤں کا کیسا عالم
جب ہے اس گلشن سرسبز میں وحشت ایسی

سانس لیتا تھا تو دیوار گری جاتی تھی
رات کچھ خواب میں دیکھی تھی عمارت ایسی

دل کے ویرانے میں کیوں حشر بپا ہے راحت
روز ہوتی ہے زمانے میں قیامت ایسی

شیش محل میں دو پل کو مہمان ہوئے تھے ہم
آئینے میں اب تک اپنا چہرہ ڈھونڈتے ہیں

نئی عمارت کے سائے میں کیسا ہے یہ ڈھیر
لوگ پرانے اس میں اپنی دنیا ڈھونڈتے ہیں

پیاس کہاں لگتی ہے اس طوفانی موسم میں
پھر بھی جنگل میں سب آہو دریا ڈھونڈتے ہیں

بستی خود ہو جاتی ہے ویرانے میں تبدیل
جوش جنوں میں دیوانے کب صحرا ڈھونڈتے ہیں

یوں بھی تو خود سے ہی باتیں کرتی ہیں دن رات
ہم بھی کوئی راحت اپنے جیسا ڈھونڈتے ہیں

جنون کرتا ہے دن رات پائمال مجھے
ہوائے شہر مرے دشت سے نکال مجھے

بنا کے بھول گیا نقش پچھلے چہروں کا
پھر ایک شکل کا آنے لگا خیال مجھے

بدن کے سائے کو دل کے قریب دیکھتا ہوں
یہ آج کس سے بچھڑنے کا ہے ملال مجھے

چلا رہا ہوں کرائے پہ آس کی کشتی
کبھی تو ڈالنے دے پانیوں میں جال مجھے

سر محاذ میسر ہوئی ہے دلداری
مرے غنیم بتاتے ہیں میرا حال مجھے

عالم کی گفتگو سے تو اتی ھے بوے خوں

سید محمد افضل

رات کے بارہ بجے ہونگے کہ وائرلیس پر یہ اطلاع ملی کہ گرزریا ڈکیت کا گروہ کھیتوں کی رکھوالی کرنے والے پانچ راوت برادری کے کسانوں کو اغوا کرکے شیتلا ماتا کے گھنے جنگلوں میں لے گیا ہے۔

اطلاع ملتے ہی تمام متعلقہ تھانوں کو ہنگامی پیغام دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں کی ناکہ بندی کرلیں۔ ساتھ ہی ساتھ علاقے کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور ایڈیشنل ایس پی دیہات کو نیم فوجی پولیس کے دستوں کے ساتھ جنگل میں تلاش و تفتیش کے لیے روانہ کردیا گیا۔ یہ سب کرتے کرتے رات کا ایک بج گیا۔

میں کیمپ آفس میں متفکر بیٹھا ہوا تھا کہ سنتری نے آکر مطلع کیا کہ آپ کا ڈرائیور ستنام سنگھ راٹھور حاضر ہونا چاہتا ہے۔ میں نے سر ہلا کر اسے اندر بھیجنے کا حکم دیا۔

اندر آکر وہ بالکل میرے قریب آکر کھڑا ہوگیا اور کچھ دیر چپ رہ کر سرگوشی کے انداز میں بولا:

"سر، گرزریا گروہ کے سردار رام بابو کا سگا بہنوئی چھدامی لال سانتو گاؤں میں رہتا ہے۔ مصدقہ ذرائع سے علم ہوا ہے کہ پھروتی کی شکل میں ملنے والی رقم کی سرمایہ کاری وہی کرتا ہے۔ بظاہر بے حد معصوم اور بھولا نظر آتا ہے مگر بباطن صحرائی کو برا سے زیادہ خطرناک ہے۔ اگر فوراً جا کر اس کو قبضے میں لے لیا جائے تو کامیابی مل سکتی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھا گویا اپنی وسیع معلومات کی شاباشی چاہتا ہو۔ میں نے بھی اسے مایوس نہیں کیا۔

"راٹھور، کیسے کیسے ہیرے ہمارے پاس ہیں اور ہم انھیں جانتے تک نہیں اور تم بھی تو کچھ مکمل کر نہیں دیتے۔"

اس نے بے حد انکسار سے جواب دیا: "حضور ہر کام اپنے وقت پر اچھا لگتا ہے۔"

مجھے امام احمد رضا خاں صاحب کا شعر یاد آیا۔

اے رضا ہر کام کا اک وقت ہے\
دل کو بھی آرام ہوہی جائے گا

یہ کم پڑھے لکھے بھی بعض وقت پتے کی بات کہہ جاتے ہیں، میں نے دل میں سوچا۔

"حضور۔ اس کام کو کسی اور پر نہ چھوڑیں، خود چلیں۔ کچھ ایسی باتیں ہیں جو شاید آپ کی جانکاری میں نہ ہوں۔ مگر بے حد ضروری باتیں ہیں۔ راوت برادری کے لوگ بہت دن سے شکایت کررہے ہیں کہ انھیں گرزریا گروہ سے خطرہ ہے کیونکہ انھوں نے ضلع پنچایت کے انتخاب میں گرزریا برادری کے امیدوار کو ووٹ نہ دیکر لودھوں کا ساتھ دیا تھا۔ ادھر راوت برادری کے پانچ ایم ایل اے حزب مخالف میں ہیں اور آجکل اسمبلی کا سیشن چل رہا ہے۔ کل وہ ہر حال میں ودھان سبھا میں ہنگامہ کرکے اس کی کاروائی کو روک کر گوالیار کی قانون ویوستھا پر بحث کرائیں گے۔"

وہ ایک لمحے کو ٹھہرا۔ اس کی تقریر اب سیاسی رنگ لے رہی تھی۔ "اس برادری کے چھوٹ بھیے نیتا، جو آپ کی... حضور معاف کیجئے گا... سخت گیری سے نالاں ہیں، راوتوں کو اکسا کر تمام شاہراہوں پر چکا جام لگا دینگے اور پل پل کی خبر موبائل فون سے بھوپال میں اپنے ایم ایل اے کو دیں گے جس سے وہ مزید چلا چونٹ کرکے حکومت کو آپ کے خلاف کاروائی کرنے پر مجبور کریں گے۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ شاید اسے توقع تھی کہ میں کچھ کہوں گا، مثلاً یہ کہ ہوم منسٹر مجھے بہت مانتے ہیں اور محکمہ منتری بھی۔ یہ نت پونجئے ایم ایل اے میرا کیا کرلیں گے۔ لیکن مجھے خاموش دیکھ کر اس نے مزید کہنا شروع کیا:

"راوتوں کراروں کرمیوں اور کمریوں کو آپ ایک نہیں بھاتے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ان کی جرائم پیشہ زندگی کے پیش نظر آپ انھیں بندوق لائسنس نہیں حاصل کرنے دیتے اور اس علاقے میں لوگ بیوی کو گردی رکھ کر بندوق خریدنے پر تیار رہتے ہیں۔"

اس نے سر اٹھا کر میری طرف ایک لمحے کو دیکھا، ورنہ اب تک وہ میری کرسی کے پیچھے ٹنگی ہوئی میری پیٹی اور پستول کو دیکھ رہا تھا۔

"اور حضور دو باتیں جو شاید آپ کو نہ معلوم ہوں وہ بھی عرض کیے دیتا ہوں۔ پہلی تو یہ کہ آپ کی ایمانداری کی وجہ سے آپ کے بہت سے ماتحت ضبط کی حدود سے باہر نکل رہے ہیں اور دوسری بات یہ کہ پڑوسی ضلع کے ایس پی گوالیار کی گدی پر اس طرح نظر جمائے بیٹھے ہیں جیسے عیاش آدمی کنواری لڑکی پر نظر جما کر بیٹھتا ہے۔ اکثر گشت کا بہانہ کرکے بہت سے افسران سرحد کے تھانے پر جا کر ان سے ملتے ہیں اور انھیں یہاں کسی بھی حال میں ایس پی بننے کے لیے زور لگانے کو کہتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی طرف سے ہر طرح کی خدمات دینے پر تیار رہتے ہیں... آپ تو جانتے ہی ہیں حضور کہ پڑوسی ضلع کے ایس پی صاحب کس قدر گھوس خور اور مکار افسر ہیں۔ مگر کیا کریں حضور ایسے ہی افسران ماتحتوں کو بھی پسند آتے ہیں اور نیتاؤں کو بھی۔ اور آپ کا یہ حال ہے کہ اگر نیتا نے سفارش کردی تو سمجھ لیجئے

اس شخص کا بیڑا تو غرق ہوتا ہی ہے جس کے لیے سفارش کی گئی ہے...''

اس کمبخت نے کچھ اس طرح سماں باندھا کہ مجھے محسوس ہوا ہے کہ میں کسی آسیب زدہ باغ سے گذر رہا ہوں اور شیطانی مخلوق ہر درخت سے نیچے کودکود کر مجھ سے لپٹنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میری خاموشی کو دیکھ کر وہ بولا:

''حضور... وقت کم ہے اور فیصلہ فوراً کرنا ہے۔''

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرا ڈرائیور جو حال میں ہی پڑوسی ضلع سے تبادلے پر آیا تھا وہاں کے ایس پی سے صرف اس لئے نالاں تھا کہ انھوں نے اسے گاڑیوں کا پٹرول چراتے ہوئے پکڑا تھا اور معطل کر دیا تھا جس سے اس کی سماجی اور مالی حیثیت پر بہت اثر پڑا تھا۔ ایس پی کے ڈرائیور کی حیثیت سے وہ تمام ڈرائیوروں کا سردار تو تھا ہی، ساتھ میں تھانے داروں کی خصوصی توجہ کا بھی حامل تھا۔ اکثر ان کا بہی خواہ بن کر جھوٹی سچی اطلاعات کچھ اس طرح دیتا کہ خود اس کی اہمیت اور تھانے دار کو تھانے دار بنائے رکھنے میں اس کا کردار واضح ہو جاتا تھا۔

انسان اگر نارمل ہے تو کسی دوسرے کی موجودگی میں چپ نہیں رہ سکتا، چنانچہ ایس پی صاحبان بھی دوران سفر ڈرائیور اور گارڈ سے گفتگو کرتے ہوئے چلتے ہیں اور یہ وہ موقع ہوتا ہے کہ سینکڑوں باتیں ان کو آپ سے آپ معلوم ہو جاتی ہیں اور خود ان کا نقطۂ نظر ڈرائیور وغیرہ کو معلوم ہو جاتا ہے۔ عقل مند ڈرائیور اس سے اپنا الوسیدھا کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور میرا ڈرائیور تو یقیناً عقلمند تھا۔ وہ تھانے داروں کو قائل کر دیتا کہ صاحب ان سے بے حد ناراض ہیں اور جلد ہی ان کا تبادلہ کرنے والے ہیں۔ یا تو کسی دور افتادہ خراب تھانے میں بھیج دیں گے، یا پھر لائن حاضر کر دیں گے۔ یہ دونوں چیزیں تھانے دار کے لئے بے حد تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ وہ لوگ جو بھینس سے اونٹنی کے برابر دودھ دوہ لینے کے ماہر ہوں اگر بکری سے بھی محروم کر دیے جائیں تو ان کا کیا حال ہوگا، اس کا اندازہ کوئی معتوب تھانے دار ہی لگا سکتا ہے۔

چالاک ڈرائیور پھر ان کو دلاسا دیتے ہوئے کہتا، آپ گھبرائیں نہیں۔ ہم تو ہیں جو آپ کو پلکوں پہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہوتے کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ پھر گارڈ کو پوشیدہ آنکھ مارتے ہوئے پوچھتا تھا کہ داروغہ جی کو بتاؤ کہ ہم نے صاحب کو کل کس طرح بچایا تھا۔ گارڈ اس کا تربیت یافتہ تھا، جھوٹے انسانوں میں رنگ بھر کر ڈرائیور کی پوزیشن کو مزید مضبوط کر دیتا تھا اور بدلے میں چوتھائی کا حقدار ہوتا تھا۔

شاطر ڈرائیور زبردست ماہر نفسیات، قیافہ شناس، اور باخبر شخص ہوتا ہے۔ تمام تھانے داروں، ڈی ایس پی صاحبان، اور ایڈیشنل ایس پی صاحبان کے بارے میں وہ ساری معلومات رکھتا ہے جس کی خبر بقول مشتاق یوسفی صرف بہترین دوستوں اور بدترین دشمنوں کو ہوتی ہے۔ وہ ایسی دل لگتی باتیں کرتا ہے کہ جھوٹ، سچ سے زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔

امرول کے تھانے دار صاحب نئی عمر کے غیر شادی شدہ لڑکے تھے، ابھی ابھی پولیس ٹریننگ کالج سے آئے تھے۔ ہمہ وقت عورتوں کے خیال یا طریقۂ حصول میں غرق رہتے تھے۔ آدی باسی لڑکیوں پر خاص نظر کرم رہتی تھی۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ یہ کام کاجی عورتیں محنت اور مشقت کی وجہ سے مضبوط اور تنا ہوا بدن رکھتی تھیں اور دوسری یہ کہ اگر ناراض بھی ہوں تو شکایت کے لیے افسران بالا کے پاس نہیں جاتی تھیں۔ مجموعی حیثیت سے بڑا محفوظ کھیل تھا جس سے تھانے دار صاحب ہفتے میں دو تین بار محظوظ ہوا کرتے تھے۔ دور دراز علاقے میں آدی باسیوں کی تیس تیس چالیس چالیس جھونپڑیاں پڑی رہتی تھیں جہاں وہ کچی شراب اتارا کرتے تھے یا تیر کمان سے چھوٹے چھوٹے جانوروں کا شکار کرتے تھے۔ ان کی غیر قانونی شراب سازی پولیس کے علم میں تھی، مگر ایک خاموش معاہدے کے تحت پولیس ان کو طرح دیتی تھی کیونکہ اگر وہ شراب بنانے سے روکے جاتے تھے تو چوریاں اور لوٹ مار شروع کر دیتے تھے اور یہ زیادہ بڑا عذاب ہوتا تھا۔

تھانے دار صاحب اکثر آدی باسی لڑکیوں کے لیے سستے قسم کے عطر، بندیاں، سرخیاں، اور چوڑیاں تحفے میں لے کر جاتے تھے۔ ان اشیا کا انتظام ان کا نائب خاص لالہ دھیرج لال کی دوکان سے کرتا تھا۔ بدلے میں لالہ دھیرج لال کو اس کے پیشے سے متعلق سہولتیں پولیس مہیا کراتی تھی۔ ست نام سنگھ کو تھانے دار کی اس فراہمی اور شب بیری کا علم تھا۔ وہ اکثر اشارتاً ان کو ایڈس کی سنگینی سے بھی باخبر کرتا رہتا تھا کہ بچ کے رہیے، پتہ نہیں کون کیسی نکلے۔

کبھی کبھی اپنی اہمیت کو مزید بڑھانے کے لیے وہ سوانگ بھی رچتا تھا۔ ایک مرتبہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے پی سی او سے امرول کے تھانے دار کو مطلع کیا کہ آج ایس پی صاحب رات میں گشت پر نکلیں گے اور یقین واثق ہے کہ آپ کے تھانے کا surprise check ہوگا۔ بھگوان کے لیے آج رات تھانے میں ہی رہیے، میں کب تک آپ کو بچاتا رہوں گا۔ صاحب بے حد ناراض ہیں۔ انھیں معلوم ہو گیا ہے کہ آپ پرسوں رات سرخ ٹی شرٹ نیلی جینس اور ایڈی ڈاس کے جوتے پہن کر خوشبو میں بسے ہوئے جنگل کے ٹھیکیدار کی جیپ میں مع تحفے تحائف پریتم آدی باسی کے گھر گئے تھے اور موٹی روٹی ساتھ خرگوش کا گوشت بھی کھایا تھا۔ آپ نے مہوے کی کچی اتنی چڑھالی تھی کہ پریتم کی بیٹی نے آپ کا ریوالور نکال کر مٹکے میں چھپا دیا تھا اور بڑی منتوں کے بعد واپس کیا تھا۔ بڑے صاحب اس اطلاع پر بہت چراغ پا ہوئے تھے اور آپ کو رنگے ہاتھ پکڑنا چاہتے تھے۔ مگر میں نے جیپ میں گڑبڑی کر دی تھی تاکہ وہ وہاں نہ پہنچ سکیں۔ مگر آج انھوں نے لائن سے دوسری گاڑی بھی منگوالی ہے۔ اب کوئی ترکیب نہیں چلے گی۔

جس شخص کے دل میں چور ہو اس پر ایسی خبر سے کیا اثر ہوگا، اس کا اندازہ ہر کوئی کر سکتا ہے۔ دوسری طرف، اس نے مجھے رپورٹ دی کہ حضور، اماوس کی راتیں شروع ہو چکی ہیں اور چھتیل اور چکارے سرکار کے اچوک نشانے کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔ کلکٹر صاحب اور بڑے جج صاحب کے ڈرائیور کہہ رہے تھے کہ ہمارے صاحب لوگ آپس میں کہہ رہے تھے کہ ایس پی صاحب کیا گوتم بدھ ہو گئے ہیں؟ پھر حضور آپ کے بڑے بھائی صاحب دہلی سے جو سرچ لائٹ لائے ہیں اس کا بھی تو امتحان ہونا ہے۔

مجھ پر اس خبر اور مشورے کا اثر نہ دیکھ کر ست نام نے مزید زوردار بات کہی:

''کل دفتر میں امرول کا منشی ملا تھا، بتا رہا تھا کہ پچاس پچاس کے ریوڑ بنا کر چیتل اور چکارے نکل رہے ہیں۔ حضور آج رات وہاں چلیں، تھانے کا دورہ بھی ہو جائے گا اور شکار بھی۔ ورنہ گاڑی کی لاگ بک کو ایڈجسٹ adjust کرنے میں بڑی دقت آتی ہے۔''

یعنی دورہ کہیں کا دکھاؤ اور جاؤ شکار میں۔ غرض اپنی انھیں باتوں سے وہ اپنی ناگزیریت اور اہمیت کا جواز فراہم کرتا رہتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو تھانے داروں تک سے ہفتہ وصول کر لیتے ہیں۔

چنانچہ اس کی مصنوعی باتوں سے مجھے اپنی بقا خطرے میں نظر آنے لگی، خدشے خطرے میں بدلتے ہوئے نظر آنے لگے۔ میں فوراً گاڑی لگانے کا حکم جاری کیا، ساتھ میں خودکار رائفل سے لیس دو گارڈ بھی لیے۔ باہر سخت جاڑا پڑ رہا تھا ہر طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ سانتو جانے کے لیے سب سے چھوٹا راستہ آنتری ہو کر جاتا تھا جو گوالیار سے تقریباً ۳۵ کلومیٹر دور تھا۔ میں اس سے پہلے بھی کئی بار آنتری معائنے کے لیے جا چکا تھا مگر ہر بار تھانے ہی سے ہو کر واپس آ جاتا تھا۔

سانتو کا راستہ تھانے کے بالکل سامنے سے جاتا تھا مگر اس دن وہ راستہ بند ملا۔ پی ڈبلیو ڈی والوں نے barrier کھڑے کر دیے تھے، شاید دن میں سڑک بنائی تھی۔ دوسرا راستہ قصبے کے اندر سے ہو کر نکلتا تھا۔ میں نے وہی راستہ اختیار کیا۔ ہر طرف ویرانی کا دور دورہ تھا۔ ٹوٹے پھوٹے مکان، متعفن نالیاں، چاندنی میں کئی منحوس اور وحشتناک کھنڈر نظر آئے۔ ایک شکستہ مسجد کے مینار اور گنبد بھی نظر آ رہے تھے۔ اور آگے بڑھے تو ایک چھوٹی سی شکستہ عمارت نظر آئی جو ایک گندے نالے کے کنارے برباد ہو رہی تھی۔ نالے کی گندگی سے سور اپنا پیٹ بھر رہے تھے۔ نالی سے تھوڑی سی اونچائی پر ایک چھوٹا سا کمزور دروازہ نظر آیا جو تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اندر بھی دو ایک سور اور کتے ٹہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایک شکستہ قبر پر میری نظر پڑی کہ اس پر ایک نوزائیدہ سورچہ محو خواب تھا۔

ڈرائیور نے مجھے مطلع کیا کہ سانتو میں مطلوبہ شخص کا گھر رنبیر سپاہی جانتا ہے، میں اس کو تھانے سے بلا کر لاتا ہوں۔ اس طرف سے تھانہ ڈیڑھ کلومیٹر ہو گا لیکن گاڑی جا نہیں سکتی۔ آپ حضور یہاں منتظر رہیں، میں پون گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ گاڑی سے اترا اور جلد ہی چاندنی کی دھند میں غائب ہو گیا۔

گارڈ کو وہیں چھوڑ کر میں گاڑی سے اتر آیا۔ عجیب ویران اور اجاڑ مقام تھا، ہر طرف ہو کا عالم، یا شاید مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ کہیں سے کتوں اور گیدڑوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں، قریب ہی کوئی لکڑ بگھا قہقہے لگا رہا تھا۔ لکڑ بگھا قہقہہ کہاں لگاتا ہے، میں نے منفی تاثرات کو دل سے جھٹکنے کی کوشش کی، لیکن ماحول میں وحشت خدا جانے کیوں بڑھتی ہی گئی۔ اوورکوٹ، اور اوپر سے ایک ہلکی سی دلائی لپیٹے ہوئے ہونے کے باوجود سردی کی شدت سے دانت بج رہے تھے۔

سردی سے کچھ تو بچاؤ ہو گا، خوف اور دہشت اپنی جگہ پر، میں نے دل میں کہا اور اس پرانی عمارت کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ قریب سے دیکھا تو قبر کی حالت اور بھی شکستہ تھی۔ میرے بوٹوں کی آہٹ پا کر سورچہ وہاں سے کود کر باہر بھاگ گیا۔ قبر کے سرہانے ایک تنگ سا دالان تھا اور پائینتی ایک بڑا سا پتھر پڑا تھا۔ میں پتھر کے اوپر بیٹھ گیا اور ڈکیتی کے نتائج میں پیدا ہونے والے ممکنہ حالات کے بارے میں سوچنے لگا... شاید میں اونگھ گیا ہوں گا.. مجھے اپنی پشت پر آہٹ محسوس ہوئی۔ خوف کی وجہ سے ریڑھ کی ہڈی میں ایک پھریری سی دوڑ گئی لیکن میں نے ہمت کر کے آواز کو سخت بنا کر پوچھا: ''کون ہے؟''

کوئی جواب نہ آیا، لیکن اچانک ایک سفید ریش، نورانی شکل وصورت کا طویل القامت اور تنومند بوڑھا شخص نہ معلوم کدھر سے میرے سامنے آ گیا۔ ممکن ہے وہ برآمدے میں پہلے ہی سے موجود رہا ہو۔ ظاہری وضع قطع سے وہ بہت بردبار اور دانشمند نظر آ رہا تھا۔ اندر آتی ہوئی تھوڑی سی چاندنی میں اس کا رنگ بہت گورا اور نمایاں لگ رہا تھا۔ علم وفضل کی متانت اس کے چہرے سے صاف ہویدا تھی۔

شاید اس قبر کا مجاور ہے، میں نے اپنے دل میں سوچا۔ مگر معاً مجھے خیال آیا کہ مجاور اتنے باوقار نہیں ہوتے۔ اب کی بار میں نے ذرا اور سختی سے پوچھا، ''کون ہو تم؟'' جواب میں اس نے فارسی میں کچھ کہا۔ میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا کہ اس علاقے میں فارسی تو بڑی بات ہے، اردو بولنے والے ناپید تھے۔ میں یہ تو سمجھتا تھا کہ وہ فارسی بول رہا ہے مگر یہ نہ سمجھ سکا تھا کہ وہ کہہ کیا رہا ہے۔ میں نے اپنے باپ کو دادا سے قدیم فارسی میں گفتگو کرتے دیکھا تھا، مگر خود اس کے حصول سے محروم رہا تھا۔

وہ شاید میری ناسمجھی کو سمجھ گیا۔ لہٰذا اس بار اردو میں بولا اور ایک بڑا عجیب سا سوال کیا:

''آپ نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے؟''

''ہاں میں نے دسویں تک تاریخ پڑھی ہے اور پھر سول سروس امتحان کے لیے تاریخ اختیاری مضمون کی حیثیت سے منتخب کی تھی۔''

وہ کچھ ناگواری سے بولا: ''اس کے باوجود آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ میں کون ہوں؟'' شاید وہ میری حیثیت سے واقف نہیں تھا ورنہ یوں اکڑ کر بات نہ کرتا۔ چمبل کی وادی میں بڑے بڑے سورما معمولی سپاہی سے بھی کنی کاٹنے میں دانشمندی سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا:

''بڑے میاں، تمھارا لہجہ بڑا گستاخانہ ہے۔ تم جانتے ہو کہ تم کس سے ہمکلام ہو؟''

وہ کچھ تلخ ہنسی کے ساتھ بولا:

''میں کس سے ہمکلام ہوں؟''

''تم اس وقت گوالیار کے سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس سید محمد افضل سے بات کر رہے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے میری آواز میں ایک خاص رعونت آ گئی تھی۔

''اچھا تو آپ سید ہیں؟ کون سے سید ہیں؟''

''کیا مطلب؟ کون سے سید سے تمھاری کیا مراد ہے؟''

''مطلب یہ کہ رضوی، نقوی، عابدی، زیدی، جلالی، ترمذی، جعفری، بخاری؟ کون سے سید ہیں آپ؟''

میں اس کے تبحر سے مرعوب ہونے لگا تھا۔ ''میں باپ کی طرف سے زیدی اور ماں کی طرف سے نقوی ہوں۔'' میں نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

اس نے پوچھا، "کس شاخ سے آپ کا تعلق ہے؟"

"میں میر سید محمد صغریٰ واسطی بلگرامی کی اولاد میں سے ہوں جو حضرت زید شہید کی اولاد میں سے تھے۔ میرے خاندان کی ایک شاخ لگ بھگ ۳۰۰ سال پہلے ضلع ایٹہ کے قصبے مارہرہ شریف میں آ کر بس گئی تھی۔ اور والدہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی اولاد میں سے ہیں۔" میرے لہجے میں پھر تھوڑا سا تفخر آ گیا تھا۔

"تو آپ شیعیان حیدر کرار غیر فرار میں سے ہیں؟" "نہیں" میں نے کچھ درشتی سے کہا۔ "میں سنی ہوں۔ البتہ میرے دادیہال اور ننھیال میں بہت سے لوگ شیعہ ہیں۔ مگر تمھیں اس سے کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں،" اس نے عجب محزوں آواز میں کہا۔ "اس بکھیڑے نے مسلمانوں کو بالعموم اور مجھے بالخصوص شدید نقصان پہنچایا ہے۔"

"وہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہو سکتی ہے، مگر تم کھل کر کیوں نہیں بتاتے کہ تم ہو کون؟"

"شاید تاریخ تم نے صرف امتحان میں کامیاب ہونے کی غرض سے پڑھی تھی۔ ورنہ کبھی ایسے حماقت آمیز سوالات نہ کرتے۔ میں ابوالفضل ہوں۔"

میں گڑبڑا گیا۔ "کون؟ کون ابوالفضل؟"

"میں شیخ ابوالفضل بن شیخ مبارک ہوں۔"

"تم تو اپنا نام یوں بتا رہے ہو گویا سارا زمانہ تم سے واقف ہے۔" میں نے جل کر کہا۔

وہ بولا، "ہاں۔ سارا زمانہ مجھ سے واقف ہے... اور جو نہیں واقف وہ جاہل ہے۔"

مجھے غصہ آ گیا۔ وہ کھلم کھلا مجھے جاہل کہہ رہا تھا۔

"بڑے میاں سیدھی طرح جواب دو ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تم عمر رسیدہ بزرگ ہو۔"

اس کے گورے چہرے پر سیاہی دوڑ گئی، کچھ شکنیں سی ابھر آئیں۔" میں وہ ہوں جس کی ایک جنبش قلم سے بدنصیبی خوش نصیبی میں بدل جاتی تھی، جس کے ایک لفظ پر لوگوں کو منصب مل جاتے تھے، جس کی تاریخ نویسی نے ایک عالم کو راستہ دکھایا۔ میں وہ ہوں کہ ایران کا شاہ عباس کہتا تھا، مجھے جلال الدین اکبر کی تلوار سے زیادہ ابوالفضل کے قلم سے ڈر لگتا ہے..."

میں چونک کر کچھ کہنے والا تھا لیکن اس نے مجھے موقع نہ دیا، کہتا گیا۔

"میں اور میرا چھوٹا بھائی ابوالفیض فیضی وقت کے سب سے بڑے علما میں سے تھے۔ میرا باپ اپنے علم و دانش فقر و رشد کے سبب پورے عالم میں مشہور تھا۔ اور تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ کون ابوالفضل؟ تم تو خیر شرطہ کے معمولی کوتوال ہو، تمھارے شعبے کے اعلیٰ ترین حاکمان مجھ سے ملاقات کے لیے ہفتوں منتظر رہتے تھے اور تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ کون ابوالفضل؟"

بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی، لیکن پولیس والے کسی پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ میں اب بھی وضاحت کا خواہاں تھا اور کچھ یہ بھی تھا کہ بات یقین کرنے والی تھی بھی نہیں۔ میں نے پھر پوچھا، "کون ابوالفضل؟ آئین اکبری والا تو کب کا مر کھپ گیا، اب تم کہاں سے آ نکلے ہو؟"

"کمسن اور ناتجربہ کار کوتوال، سن۔ میں شیخ ابوالفضل بن شیخ مبارک، شیخ فیضی کا بھائی... کیا تو نے "شعر العجم" بھی نہیں پڑھی، وہ تو تیرے زمانے سے قریب تر ایک فاضل کی تصنیف ہے؟"

"تم... تم... دکن کی فتوحات کے سپہ سالار، "آئین اکبری" اور "اکبر نامہ" کے مصنف، جلال الدین محمد اکبر بادشاہ جل جلالہٗ کو زندۂ جاوید کرنے میں خود بھی زندۂ جاوید ہونے والے... شاہی مشیر خاص اور دربار اکبری کے اہم ترین رتن؟ مگر... مگر تم یہاں...؟"

یہ کہتے کہتے میرا پورا بدن سن ہو چکا تھا، زبان اینٹھ کر تالو سے جا لگی تھی۔ اعضا اور دماغ کا تال میل تھوڑی دیر کے لیے ختم ہو گیا تھا۔ پھر میرا حال اور بھی ابتر ہوا جب میں نے دیکھا کہ چاند کی کرنیں اس کے بدن کے آر پار جا رہی تھیں۔

میری بوکھلاہٹ پر وہ ہنسا۔ "گھبراؤ نہیں میں بے ضرر ہوں۔ یہ قبر میری ہے، کبھی کبھی جی گھبراتا ہے تو باہر نکل کر ٹہل لیتا۔ ابھی تم نے بڑی رعونت سے اپنا نسب نامہ اور عہدہ بتایا تھا۔ ممکن ہے لوگ تمھارے عہدے اور نسب کی وجہ سے تمھیں بہت خوش قسمت آدمی سمجھتے ہوں مگر مجھ سے پوچھو کہ خوش قسمتی اور بدقسمتی کیا ہوتی ہے۔"

دھیرے دھیرے میرے حواس قابو میں آنے لگے۔ میں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی تیسری انگلی میں چاندی کی انگوٹھی کو دیکھا جو میرے والد نے عطا کی تھی اور جس کے اندر شب قدر میں شیر کی کھال پر لکھا ہوا تعویذ تھا جو ہر طرح کے برے اثرات سے محفوظ رکھتا تھا۔ مجھے کچھ طمانیت محسوس ہوئی۔

"شہنشاہ کی رضا کے آگے مجھے ہر چیز ہیچ نظر آتی تھی۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے احساس ہے کہ میں نے اس کی خاطر اپنا دین ترک کر کے دین الٰہی قبول کر لیا اور اس نئے دین کا مبلغ بھی بن گیا۔ حالانکہ مہارانی اور راجہ مان سنگھ تک نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر میں..."

وہ چپ ہو گیا۔ میں نے ہمت کر کے اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔ بے انت اداسی شاید اسی کو کہتے ہیں جو اس وقت اس کے چہرے پر تھی۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا اور میں نے آنکھیں جھکا لیں۔ اس دوران وہ کہتا گیا:

"...اپنے بادشاہ کو اللہ کا پرتو سمجھتا تھا اور بادشاہ بھی مجھے سب سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ میرے والد سے وہ روحانی اور مذہبی معاملات میں استفادہ کرتا تھا، میرا بھائی فیضی بھی اس کا بہت مقرب تھا، لیکن میں سمجھتا تھا کہ اکبر کو سب سے زیادہ محبت جس شخص سے ہے وہ میں ہوں..."

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ چاندنی کی ایک کرن اس کی انگلی سے نکل کر مجھ تک آ گئی ہے۔ "سومت جانا۔" اس نے فہمائش کی۔ "تم کوئی بہت اچھے سامع نہیں ہو، لیکن مجھے تم جیسا بھی مدتوں سے نہیں ملا تھا۔"

"نہیں نہیں،" میرے منھ سے بے ساختہ نکلا۔ "میں سن رہا ہوں۔"

یہ ابوالفضل ہے یا کولرج کی نظم کا عمر رسیدہ جہازی جس نے شادی میں آئے ہوئے

ایک مہمان کو پکڑ کر اسے اپنی پوری رام کہانی سنادی تھی، میں نے دل میں کہا۔

"میرے خاندان کے عروج کے باعث زیادہ تر لوگ ہم سے حسد رکھتے تھے..."

"راج دربار میں یہ سب ہوتا ہی ہے..." میں بول پڑا۔

"چپ رہو۔ سنتے جاؤ" اس نے کچھ خشک لہجے میں کہا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا... حد یہ کہ شہزادہ سلیم بھی مجھ سے پرخاش رکھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں بادشاہ کو اس کے خلاف بھڑکاتا ہوں۔ دربار میں مختلف نسلوں، قوموں اور مذاہب کے امرا تھے جو زیادہ تر باہمی مناقشوں کے شکار تھے اور سازش ان کا وطیرہ خاص تھا لیکن ہمارے مقابلے میں سب ایک ہو جاتے تھے۔"

"سن رہے ہو؟" اس نے کچھ بلند آواز میں کہا۔ "اور تو اور، عبدالرحیم خانخاناں تک میرا بہی خواہ نہ رہا حالانکہ وہ مجھے فیضی سے کم عزیز نہ تھا۔ میں سنی تھا مگر میرے باپ کے تشیع کی وجہ سے دونوں طرف کے لوگ مجھ کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے تھے۔ عبدالرحیم مجھ سے اس وقت بالکل برگشتہ ہو گیا جب احمد نگر کی فتح کے بعد میں نے شہنشاہ سے درخواست کی کہ ان علاقوں کے انصرام کے لیے مجھے مقرر کر دیں۔ چنانچہ مہابلی نے عبدالرحیم کو واپس بلوا کر مجھے وہاں بھیج دیا۔ یہ بات خانخاناں کو بری لگی۔ شاہزادہ مراد کو کثرت شراب نوشی جام مرگ پلا چکی تھی۔ شہزادہ دانیال کو بادشاہ نے صوبیدار بنا کر احمد نگر بھیج دیا تھا۔ دانیال تو عبدالرحیم کا داماد ہی تھا، اس کی آڑ لے کر عبدالرحیم بھی وہاں آ گیا اور میری تدابیر کو دانیال کی مدد سے کالعدم کراتا رہا۔"

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ لیکن میں بے چین بھی ہو رہا تھا کہ یہ قصہ کب ختم ہوگا۔ کولرج کا بڈھا جہازراں مجھے پھر یاد آیا۔ یہ بڈھا بھی ایسا ہی کچھ باتونی ہے، باتوں کا جال لگائے رہتا ہے۔ میری توجہ ایک لمحے کے لئے بھٹک گئی تھی۔ اب جو میں نے توجہ ادھر لگائی تو وہ کہہ رہا تھا:

"...یہی لیل و نہار تھے کہ اچانک ظل الٰہی کی طرف سے مجھے خفیہ پیغام ملا کہ سلیم کی نافرمانیاں حد سے تجاوز کر چکی ہیں۔ اس نے الہ آباد میں اپنے خوشامدی امیروں کو جاگیریں بانٹ دی ہیں اور اپنے نام کا سکہ جاری کر دیا ہے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ میں سلیم کو باندھ کر آستانہ عالیہ میں پیش کر دوں گا۔ مجھے پرچہ نویسوں نے خبر دی تھی کہ سلیم اپنے مقدس اور عظیم المرتبت بادشاہ کو زہر دے کر ہلاک کرنا چاہتا ہے۔

"وہ ۱۰۱۱ کی کوئی تاریخ تھی جب میں نے رخت سفر باندھا۔ مجھے پرچہ لگ چکا تھا کہ شاہزادہ سلیم کو منظور نہیں کہ آپ ظل سبحانی تک پہنچ سکیں۔ آپ کو روکنے کے لئے وہ کوئی بھی حربہ استعمال کر سکتے ہیں۔"

"افسوس،" میں نے زیر لب کہا "آپ یہاں مات کھا گئے۔"

"صاحب زادے، مات میں نے نہیں، میری خود اعتمادی نے کھائی۔ تم نے شیخ شیراز کا شعر نہیں سنا؟"

میں کچھ شرمندہ ہو کر بولا۔ "جی، میں فارسی بہت کم جانتا ہوں۔"

اس نے سنی ان سنی کر کے کہا۔ "سنو، شیخ فرماتے ہیں درین فکر بودم کہ کرماں خورم کہ ناگاہ خوردند کرماں سرم۔"

میں کچھ سمجھا، کچھ نہ سمجھا۔ لیکن "جی بہت خوب،" کہہ کر چپ ہو گیا۔

"بس یہی تو بات ہے۔ میں سلیم کو پرِکاہ سمجھتا تھا۔ مجھے اس کی مطلق پروا نہ تھی۔ مہابلی کے اقبال کے آگے کسی کی کیا مجال تھی کہ ابوالفضل کو ہاتھ لگا سکے۔

"اور چھا کا راجہ بیر سنگھ بندیلہ فطری طور پر عیار اور ظالم ڈاکو تھا۔ اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے اس نے سلیم کو شیشے میں اتارنے کی پوری کوشش کی اور اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوا..."

مجھے یاد آیا کہ جھانسی کے قریب اور چھا میں بیر سنگھ بندیلہ کا بنوایا ہوا جہانگیری محل اب بھی یوں ہی کھڑا ہے گویا کل ہی سلیم شاہزادہ ہندوستان وہاں مہمان ہوا ہو۔ میرا دھیان پھر بٹ گیا تھا۔ اب میں نے کان دھرے تو وہ کہہ رہا تھا:

"...میں گاڑھی چھننے لگی تھی۔ مخبروں نے مجھے مطلع کیا کہ بیر سنگھ کو سلیم نے بہت بڑی جاگیر کی تقریباً آزاد حکومت کا لالچ دے میرے قتل پر مامور کیا ہے... یہ دو ٹکے کے چوٹٹے ابوالفضل کو ماریں گے؟ میرے رفقا نے مشورہ دیا کہ صبح ہم اجین سے نکلیں گے، بہتر ہوگا کہ عام راستہ چھوڑ کر چاندے کی گھاٹی سے نکل چلیں۔ مجھے ان کے خوف زدہ چہرے دیکھ کر بہت ہنسی آئی۔ میں نے ان سے کہا، اس بندیلے بنڈیلے میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ میرے مقابل آئے۔ کیا وہ مہابلی شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے اقبال کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتا ہے؟ میں نابلد تھا..."

"بڑے میاں، مقدر آپ پر قہقہے لگا رہا تھا۔ دنیا کے تمام شہنشاہوں کے مالک کا ہرکارہ اپنی تختی پر آپ کا نام کاٹ چکا تھا۔" میں نے کہنا چاہا، لیکن یہ سب دل ہی دل میں کہہ کر رہ گیا۔

"...نرور کے ضلع میں جب ہم داخل ہوئے تو ایک مقام پر بہت دور دھول اڑتی نظر آئی۔ میرا جاں نثار گدائی خاں افغان بولا۔ حضور وہ دیکھیے، وہ یقیناً بیر سنگھ اور اس کے آدمیوں کی گرد سمند ہے۔ ہم پوری قوت لگا کر اسے روکنے کی کوشش کریں گے۔ آپ شاہراہ اکبری چھوڑ کر چھپتے چھپاتے نکل جائیں۔ آگے تین کوس پر آنتری ہے، وہاں رائے رایاں اور راجہ راج سنگھ تین ہزار فوج کے ساتھ موجود ہیں۔ وہاں پہنچنے پر کوئی خطرہ نہ رہے گا۔ میں نے کہا، اے مرد بے وقوف، مہابلی نے مجھے مسجد کے کونے سے نکال کر صدر مسند پر بٹھایا ہے۔ کیا یہ ان کی توہین نہ ہوگی کہ میں ایک ڈکیت کو پیٹھ دکھا کر بھاگ جاؤں؟ کیا میں چوہے کی طرح چھپتا اور بھاگتا پھروں؟ تف ہے ایسی زندگی پر۔ تم لوگ اگر چاہو تو نکل چلو، مجھے واللہ کوئی ملال نہ ہوگا..."

میرا ذہن پھر بھٹک گیا اور مجھے متنبی کا واقعہ یاد آ گیا جو میرے والد کبھی کبھی سنایا کرتے تھے، شاید علامہ شبلی نے کہیں لکھا ہے۔ جب اسے ڈاکوؤں نے گھیرا تو اس کے غلام نے کہا، وہ آپ ہی تو ہیں جن کا شعر ہے

مجھے گھوڑے، اور راتیں، اور دشت و صحرا بخوبی جانتے ہیں۔ اور حرب و ضرب بھی، اور کاغذ اور قلم بھی۔

متنبی نے کہا، ہاں خوب یاد دلایا۔ یہ کہہ کر پلٹا اور ڈاکوؤں سے لڑتا ہوا مقتول ہوا۔ کیا سب عالی دماغ ایسے ہی ہوتے ہیں؟ انجام سے بے پروا، کسی بات

پر مرجانے والے؟ میں نے دل میں کہا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے پھر دھیان لگایا تو وہ کہہ رہا تھا:

"...گدائی خان معرکے سے کبھی نہیں ہٹا۔ پر حضور، شہد کی مکھی اگر مرتبان میں بند ہو جائے تو وہ کتنی ہی فجیع کیوں نہ ہو اسے توڑ کر نہیں نکل سکتی۔ سپاہیوں کی زندگی میں بارہا ایسے مواقع آتے ہیں جہاں دانشمندی کے پیش نظر کبھی کبھی پسپائی بھی فتح کا منبع بن جاتی ہے۔ اسوقت رائے رایان اور راجہ راج سنگھ کی اعانت بے حد ضروری ہے۔ بہادری کی قدر ہم پٹھانوں سے زیادہ کون جانتا ہے مگر اس وقت یہاں رکنا بہادری نہیں اقدام خودکشی ہے..."

"میں ابھی کچھ کہہ نہ پایا تھا کہ بیر سنگھ کے برچھیت، لٹھیت، اور تلنگے ہمارے سروں پر آپہنچے۔ میرے جانثاروں نے مجھے نرغے میں لے لیا۔ میں بھی تلوار سونت کر جم گیا۔ مگر ہوا وہی جو تقدیر تھی جو مشیت الٰہی تھی۔ گدائی خاں اور اس کے ساتھیوں نے دلاوری کے وہ جوہر دکھائے کہ چشم فلک شاید پھر ویسا منظر نہ دیکھے گی۔

"میری آنکھوں کے سامنے گدائی خاں گھوڑے سے گرا... پھر اس کا ایک ایک ساتھی چن چن کر مار دیا گیا۔ بندیلہ نے اپنے نیزے کی انی میرے گھوڑے کی گردن میں چبھوتے ہوئے کہا، شیخ صاحب تم میں اتنا دم نہیں کہ صاحب عالم کو شہنشاہ عالم بننے سے روک سکو تم نے مہابلی کو بہت بھڑکایا ہے۔ مگر آج کہاں بچ سکو ہو۔ اس نے برچھی پوری قوت سے میرے جگر میں اتار دی۔ میں دلدوز چیخ مار کر زمین پر گر پڑا۔"

انجام معلوم ہونے کے باوجود میرے منہ سے نکلا، "ہائے!"

"میرا سر کاٹ کر الہ آباد بھیج دیا گیا۔ سلیم نے میرے سر بریدہ کو بیت الخلا میں ڈلوا دیا۔ مری لاش تا گور تنہا گئی۔ مہابلی میری سناونی سن کر بہت روئے۔ تین دن دربار نہیں کیا، بار بار یہی کہتے تھے کہ مارنا ہی تھا تو شیخو مجھے مار دیتا۔ ابوالفضل کو کیوں مارا؟ ہائے وہ میری شاہی کے لئے ایسا ہی تھا جیسے سکندر اعظم کے لئے ارسطو تھا۔"

وہ ایک لحہ چپ رہا۔ میری بھی ساری تیزی رخصت ہو چکی تھی۔

"آج کون جانتا ہے کہ میں اس گمنام مقام پر سر بریدہ دفن ہوں؟ کوتوال جی، آپ نے میرا مزار اور اس کا جغرافیہ ملاحظہ کیا۔ بتایئے وہ سارے عہدے، وہ سب علم و فضل، وہ نام و نسب کسی کام کے ہیں؟"

میں جواب میں کچھ نہ کہہ سکا، مجھ پر سکتہ سا طاری تھا۔ اچانک باہر ہلچل ہوئی۔ راٹھور میرے سامنے کھڑا تھا۔

"سانٹو پہنچنے میں صبح ہو جائے گی سرکار، ادھر راستہ بہت خراب ہے۔" ☆☆☆

غزل

نیر عاقل

دل کے پہلو میں نہ اتنا دکھ سمونا چاہئے تھا
استطاعت کے مطابق بوجھ ڈھونا چاہئے تھا

اس کو مٹی مل گئی ہے جس کو سونا چاہئے تھا
حرص کا شاید یہی انجام ہونا چاہئے تھا

موت کو درکار تھی اک وسعت بے حد و پایاں
زندگی کو قبر کا سنسان کونا چاہئے تھا

جو ہوا گر وہ نہ ہوتا پھر تو ہوتا جانے کیا کیا
ہم نے مانا جو ہوا سب نہ ہونا چاہئے تھا

انکار

محمد عاصم بٹ

اتنا بڑا کوئی آدھے کلو کا پتھر تو ہوگا۔ اٹھا کر دے مارا۔ کوئی اپنی جان سے جاتا۔ ان کی بلا سے۔

تمھیں اچھی طرح پتہ ہے دوپہر کو جب درخت کا سایہ باقی نہیں رہتا، یہ چاروں لفنگے پرے پلی پر سے نمودار ہوتے ہیں اور تمھارے قریب سے گزر کر ادھر بستی قاسم علی میں چلے جاتے ہیں۔ بس یہی وقت ہوتا ہے محتاط رہنے کا۔

پتھر لگنے کے بعد جیسے تم منہ بھار آگے جا پڑے تھے، میں تو یہی سمجھا کہ گئے بس کام سے۔ لیکن آئی ہوئی ٹل گئی۔ بندے کے آل دوالے کبھی کبھار کیسے ہر شے تھم جاتی ہے، جیسے کوئی سانس روک لے۔ فطرت اگر سانس لیتی ہے تو سمجھو تب اس نے اسے روک لیا تھا۔ تم نے سر ہلایا تو میری جان میں جان آئی۔

اور یہ کیسے مسخروں کی طرح دانت نکال کر ہنس رہے ہیں جیسے بڑا کارنامہ کیا ہو۔ کیا اسکول میں ان کو یہی سکھاتے ہیں؟ الو کے چرخے۔ عمریں دیکھو ان کی۔ چہرے پر ایسی نرمی ہے کہ لڑکیوں جیسے نازک لگتے ہیں، نہ داڑھی نہ مونچھ۔ سولہ سولہ سال کے سن لیکن حرکتیں اول درجے کے شہدوں جیسی۔

میرا پوچھو تو مجھے انسانوں پر ایک دھیلے کا اعتبار نہیں ہے۔ آخر ہے کیا یہ انسان، بدبودار نطفے کی پیداوار، سرشت اس کی وہی گندگی سے لبریز، سڑک پر تیز رو ٹریفک سے فضا میں کچھ دیر کے لئے بلند ہونے والی گرد راہ سے زیادہ حقیر اور پرے نشیبی علاقے میں مدتوں سے پڑے غلاظت کے ڈھیروں سے اٹھتے ہوئے تعفن سے زیادہ کراہت انگیز۔ بو بکھیرتا ہوا رذیل فانی وجود، ان کی وقعت ہی کیا ہے۔ فطرت کے لامتناہی، متنوع اور بے پناہ نظام میں ریگستان کے ایک ذرے سے کہیں کم تر اور سمندر کے ایک قطرے سے زیادہ بے مایہ۔ میں ان سے تمھاری ہر دم چمکی رہنے والی سفاک بھوک سے زیادہ نفرت کرتا ہوں۔

مجھے مت بتاؤ۔ میں جانتا ہوں۔ یہ بھوک، یہ ازلی بھوک جو ایک زہریلے کیڑے کی طرح تمھاری انتڑیوں کو اندر ہی اندر کاٹتی، ڈستی اور نوچتی رہتی ہے، تمھیں کتنی اذیت دیتی ہے۔ اور کیسے یہ بھوک گذشتہ برسوں میں بڑھتی ہی گئی ہے۔ اوہ میرے خدا! کیسے چمکتی ہے یہ بھوک کہ آنکھیں نہیں ملائی جاتیں۔ یہ بھوک تمھارا سانس کھینچ لیتی ہے۔

تمھیں یاد ہے یہاں حد نظر تک لہلہاتے کھیت تھے؟ کھلے میدان، فلک کو چھونے کی آرزو میں دیوانے ہوئے جاتے درخت اور تازہ ہوا جو بہشت سے آتی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن کوئی زہر انسانی فطرت سے زیادہ مہلک ہے بھلا؟ انھوں نے کھیتوں اور میدانوں کو بستیوں سے ڈھانپ دیا اور سڑکیں بچھا دیں۔ کولتار والی، اور درخت کاٹ کر زمین کا سینہ ننگا کر دیا۔ یہ ہے انسانی فطرت، تباہ کن، شر انگیز اور فتنہ پرداز۔

پتہ ہی نہیں چلتا کون اصل دشمن ہے۔ ایک جیسے سب کے چہرے ہیں۔ شناخت ہی نہیں ہو پاتی۔ لوگ بدلتے ہیں، وقت بدل جاتا ہے، منظر وہ نہیں رہتے اور فضا مسموم ہوئی جاتی ہے۔ لیکن نہیں بدلتا تو یہ انسان، اور اس کی فطرت۔ ابھی بچے بھاگتے پھرتے ہیں، ابھی یہ جوان ہو کر اور بچوں کو پیدا کرنے لگ جاتے ہیں۔ پہلی گندگی صاف نہیں ہو پاتی کہ اس میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تمھاری بھوک میں بھی۔ آسودگی ناپذیر، سفاک اور مسلسل بھوک۔

میں جانتا ہوں۔ سب دکھائی دیتا ہے کہ کیسے تم بے چین ہو جاتے ہو، تڑپتے ہو اور زمین پر ایڑیاں رگڑتے ہو۔ لیکن ماں کے سینے سے کوئی چشمہ نہیں پھوٹتا تو تم گھاس اور پتے کھاتے ہو، درخت کی چھال پر دانت مارتے ہو، گیلی مٹی چبا جاتے ہو۔ اور پرے نشیب میں گندگی کے ڈھیروں سے چچوڑی ہوئی ہڈیاں چباتے، چکنائی سے بھرے کاغذ چاٹتے، اور بارش کے پانی سے بنے کیچڑوں کو پی جاتے ہو۔ لیکن تمھاری بھوک نہیں مٹتی۔

مجھے یاد ہے بالکل صاف صاف وہ دن جب تمھیں بستی سے نکالا گیا تھا۔ کیسا قہر ڈھایا تھا انھوں نے تم پر۔ اے خدا! آسمان کا سینہ کیوں شق نہیں ہوا؟ ان کے پتھروں سے تمھارا جسم لہولہان تھا اور روح گھائل تھی۔ اور پیٹ میں بھوک کا الاؤ بھڑکتا ہوا ہر شے کو جلا رہا تھا۔ ہر شے کو، تمھاری بھوک سہنے کی طاقت، تمھارا اعتماد، اپنے آپ پر اور پوری انسانیت پر۔ آخر تمھارا قصور ہی کیا تھا؟ گوشت کیا وہ نہیں کھاتے؟ تم نے مردہ، سڑاند دیتے ہوئے جانوروں کا گوشت کھا لیا تو انھیں اتنی اذیت ہوئی جیسے تم نے ان کی کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ انھوں نے تمھیں بستی سے باہر لا پٹکا، اپنے زخموں سے رستی ہوئی رطوبت کو چاٹنے اور زخموں کے کھرنڈ کو نوچ کر زندگی کے بجھتے ہوئے الاؤ میں کوئی چنگاری بھڑکائے رکھنے کی ناکام کوشش کئے جانے کے لئے وہیں چھوڑ دیا۔

اگر کوئی کوا پرات میں سے گیلا آٹا لے کر اڑے تو لوگ اسے نیک شگن سمجھ کر ہنستے ہیں۔ خود چھیچھڑے لا کر چھتوں پر رکھ دیتے ہیں کہ چیلوں کو ناشتہ ملے۔ اپنی آفتوں کو ٹالنے کے لئے دوسری مخلوقات کی جان کا صدقہ دیتے ہیں۔ لیکن تمھیں، ایک بھوکے کو، تضحیک کی لات مارتے ہیں۔ جو لوگ کتوں اور چوہوں کی

بھی خاطرداری کرنے سے نہیں چوکتے وہ تم سے خار رکھتے ہیں۔

لیکن تم فکر کیوں کرتے ہو؟ تم فطرت کے بیٹے ہو، چیونٹیاں تمہارے جسم کو سہلاتی ہیں میدان کی دھول اسے شفا دیتی ہے، بارش اسے نہلانے آتی ہے۔ درخت نے اپنی چھاؤں اس پروراز کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ تم اس مٹی کے پیدا ہو۔ یہی تمہاری خدمت بھی کرتی ہے اور حفاظت بھی، اور ایک دن یہی تمہیں سب کی نظروں سے چھپا کر اپنی آغوش میں لے گی۔

میرے، دوست صبر کا دامن اپنے ہاتھوں سے جانے نہ دو، امید کی ڈور کو تھامے رکھو۔ ایک دن تمہارا بھی آئے گا۔ اس دھرتی پر اگنے والی خوراک پر ہر مخلوق کا حق ہے، تمہارا حصہ تمہیں ملے گا۔ یہ بھوک کے کیڑے، جو پیٹ کے زیریں حصوں میں کلبلاتے اور انتڑیوں کو کاٹتے ہیں، یہ باقی رہنے کے لئے نہیں ہیں۔ یہ تمہارے صبر کا امتحان ہیں۔ تمہارے نفس کی آزمائش ہیں۔ ان کے سامنے ہار مت مانو۔

میں جانتا ہوں یہ آزمائش طویل ہو چکی ہے۔ تمہارے صبر کی حد سے کہیں آگے تک پھیل گئی ہے۔ اس مسلسل آزمائش نے تمہاری ہڈیوں کو کھوکھلا، اعصاب کو ناکارہ اور حواس کو مختل کر دیا ہے۔ گیلی مٹی، گھاس، پتے اور چھال بھی اب تمہاری زندگی کے الاؤ میں ایندھن نہیں بن پاتے۔

لیکن ایسی بھی کیا مایوسی کہ انسان اپنے اطراف سے آنکھیں بند کرلے اور یہ بھی نہ دیکھ سکے کہ ایک ننھی پیاری بچی اس کے پاس کھڑی ہے۔ ذرا دیکھو یہ مصری کی ڈلی، گلاب جامن سی بچی کیسی پیار اور حیرت بھری نظروں سے تمہیں دیکھ رہی ہے۔ کیسی میٹھی اور شیرے جیسی معصومیت اس کے چہرے سے چھلک رہی ہے، جیسے پھل پک جائے تو اس میں سے مٹھاس رسنے لگتی ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں چمک ہے، تیز مرچوں والی چاٹ جیسی، جس کا تصور ہی کر کے تمہارے تن بدن میں زندگی کی حرارت بیدار ہوتی ہے۔

ضرور یہ لڑکی پلیا کے پرے کار کے پاس کھڑے ہوئے مرد کی کچھ لگتی ہوگی جو گاڑی کا بانٹ کھولے انجن کا معائنہ کرنے میں منہمک ہے اور اسے ذرا بھی خبر نہیں کہ اس کی بچی چھوٹے چھوٹے قدموں سے بھاگتی ایک پھدکتے ہوئے مینڈک کے پیچھے پیچھے کتنی دور پیپل کے درخت کے قریب چلی آئی ہے اور اب تھک کر گھاس پر بیٹھی خاموشی سے تمہیں یوں تک رہی ہے جیسے تمہیں جانتی ہو۔ لیکن مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم بھی اس سے کہیں مل چکے ہو۔ کیا واقعی یہ بچی تم دونوں کی کچھ لگتی ہے...؟

''ادھر آؤ میرے پاس۔ پیاری بچی۔'' لیکن یہ تو کچھ سنتی ہی نہیں۔ ''ارے آتیں کیوں نہیں، ڈرتی ہو کیا؟ مجھ سے مت ڈرو۔ میں تمہیں لوری سناؤں گا۔ اپنے کندھے پر اٹھاؤں گا۔ تمہیں جھلاؤں گا اور تم سو جاؤ گی۔''

بس وہ تو بٹر بٹر تکے جاتی ہے۔ اس کے منہ میں کچھ ہے۔ ضرور مٹی کھا رہی ہے۔ نرم اور گیلی مٹی۔ بالکل میری طرح بھوکی ہوگی۔ اسے کیا پتہ بھوک کیا ہوتی ہے؟ اتنی چھوٹی سی تو ہے۔ ''ادھر آؤ۔ میری بچی۔ میری پیاری بچی۔ کیا تم خوفزدہ ہو؟ کس سے ڈر رہی ہو؟''

اس سے پہلے کہ بانٹ پر جھکا ہوا شخص مرد بچی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھے اور اسے ڈھونڈتا ہوا اس درخت کی طرف چلا آئے اور پھر اسے لے کر چلتا بنے، تم اسے یہیں کہیں چھپا لو۔

اے خدا اسے ہمت دے۔ اس کا جسم بھوک کے بوجھ سے نڈھال ہے اور اس کے لئے ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر ہے۔ اسے اتنا حوصلہ دے کہ یہ خود کو اس بچی تک پہنچا سکے، اسے یقین دلا سکے کہ میں تمہارا دوست ہوں، میرا تمہارا جنم کا رشتہ ہے۔ ایک تعلق جسے بس محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ اسے لبھائے گا اور اپنے ساتھ چلنے پر، ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ رہنے پر، آمادہ کر لے گا۔

یہ لڑکی اس کی تنہائی کے اندھیرے میں قربت کی لو بھڑکائے گی اور ہر شے کو اجال دے گی۔ یہ اسے ایک پائمال وجود کی طرح بے دست و پا فنا ہونے نہیں دے گی، اسے بکھرنے سے بچائے گی۔ اسے جانے مت دو، کسی کو اسے مجھ سے چھیننے مت دو۔

بچی اٹھ کھڑی ہوئی ہے تو ضرور تمہاری طرف بڑھے گی۔ تمہاری بے تابیوں کی شدت نے اسے جھنجھوڑا ہوگا اور اس نے اپنا فیصلہ تمہارے حق میں دیا ہوگا۔ لیکن یہ تو واپس اسی طرف چل پڑی ہے جدھر اس کا باپ اب تک گاڑی کے انجن میں الجھا ہوا ہے!

اسے روکنا ہوگا۔ بس تھوڑی سی ہمت کرو۔ اٹھو۔ چلو۔ اور آگے بڑھو۔ تیز چلو۔ قدم لمبے لمبے اٹھاؤ۔ ادھر ادھر مت دیکھو۔ بس چند قدم اور۔ تمہاری حد درخت کی حد سے متجاوز نہیں ہے۔ اسے اس حد سے باہر مت نکلنے دو۔ بس جھپٹ پڑو۔ ہاں اسی طرح۔ اسے گرا لو۔ اس کے منہ پر ہاتھ رکھو۔ اس کی رونے کی آواز دور نہیں جانی چاہئے۔ اس کے باپ یا کسی بھی باپ کے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہئے۔

یوں ہی آہستہ آہستہ اسے گھسیٹتے ہوئے اسے ادھر لے آؤ۔ درخت کے اس طرف۔ اور ادھر جھاڑیوں کے درمیان، جہاں تم نے اپنے چھپنے کے لئے جگہ بنا رکھی ہے، بس وہیں لے آؤ۔ ہمیشہ اسے تھوڑی ہی رکھنا ہے وہاں۔ بس اتنی دیر، جب تک کہ وہ شخص اسے تلاش کرنے کی ناکام کوشش کے بعد تھک ہار کر لوٹ نہیں جاتا اور جب تک وہ یہ نہیں سمجھ لیتا کہ اپنی بچی کو تلاش کرنے کے لئے یہاں آنا بیکار ہے۔

زور سے پکڑنا تھا الو کے کان۔ ایک بچی کو قابو میں نہیں رکھ سکے؟ اچھلو۔ اس پر گر جاؤ۔ چوٹ لگتی ہے تو لگنے دو۔ پروا مت کرو۔ دونوں ہاتھوں سے اسے گھسیٹو۔ چیختی ہے تو اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دو، یا گردن میں دانت گاڑ دو۔ آواز کا منبع تو آخر وہیں ہے۔ کاٹتے جاؤ۔ تیزی سے، زور لگا کر۔

ہچکچاؤ مت۔ تم کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر رہے ہو۔ زندہ رہنا، فنا ہو جانے کے خلاف جدوجہد کرنا تمہارا حق نہیں ہے کیا؟ بس پیتے جاؤ یہ گرم اور نمکین سا محلول۔ پیتے جاؤ کہ تمہارے لئے اسی میں شفا بھی ہے اور حیات بھی اور فنا ہو کر بکھر جانے سے تمہارا انکار بھی ☆☆☆

محمد عاصم بٹ

میں چلتا رہا، جانے کب تک کہ یہ راستہ ایک چوڑے اور کھلے بازار میں آخر ختم ہو گیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں پرلی جانب چھوڑ آیا تھا۔ ویسا ہی بازار لیکن ذرا سا چوڑا، وہی دھوپ لیکن ذرا نکھری ہوا، ویسے ہی لوگ لیکن ذرا .

پہلے سے کم ہوتے درد کی خوشی میں مجھے ہلکا ہلکا سا یاد آیا کہ یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔ کچھ دیکھا بھالا سا، کچھ جانا پہچانا سا تھا۔ میں جان گیا کہ نہ ہی ایسا پہلی بار ہو رہا تھا۔ اور نہ ہر بار شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔

میرا تعلق شاید دستک دینے والوں کی آخری پیڑھی سے ہے۔ لیکن کیا واقعی یہ آخری ہے یا مجھے ایسا لگتا ہے۔ کون جانتا ہے۔

اپنی یادوں کے گودام میں جھانکتا ہوں تو اتنا کاٹھ کباڑ ہے وہاں کہ الجھن ہوتی ہے۔ لیکن بہت سی بے کار یادوں میں ایسے چمکدار، رنگ برنگے، دلچسپ اور تاباں ستارے بھی ہیں جن کی روشنی وہاں کبھی مکمل اندھیرا نہیں ہونے دیتی۔ اور یہی ہیں جو بار بار اس دم گھونٹی جگہ آنے پر مجھے مائل کرتے ہیں۔ دستک سے میرے اولین تعارف کی یاد بھی ایسا ہی ایک ستارہ ہے۔

مجھے یاد ہے ہمارے گھر کے پچھلے بڑے کمرے کے دروازے پر میں دیر تک ہاتھ مار مار کر روتا رہا تھا۔ حتیٰ کہ میں تھک گیا اور میرے ہاتھ دکھنے لگے۔ لیکن دروازہ نہیں کھلا۔

اس روز میں اسکول سے لوٹا تو میں نے دیکھا کہ ہمارا گھر محلے کی عورتوں مردوں اور بہت سے دور نزدیک کے رشتہ داروں سے بھرا ہوا ہے۔ اپنے گھر میں اتنا مجمع میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ باہر کا دروازہ بھی چوپٹ کھلا تھا جیسے کوئی پورا منھ کھولے لیٹا سو رہا ہو۔

عورتوں نے مجھے کھینچ کر اپنے پاس ہی بٹھانا چاہا لیکن میں نے پچھلے کمرے میں جس کا دروازہ بند کیا جا رہا تھا، اپنی ماں کو زار و قطار روتے، چھاتی پر دوہتھڑ مارتے اور پچھاڑ کھا کر گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں بستہ ایک طرف پھینک کر بھاگتا ہوا اس طرف گیا لیکن وہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی بھیڑ دیا گیا۔

عام طور پر ایسا نہیں ہوتا تھا۔ میں روزانہ اسکول سے لوٹنے پر کنڈی کھڑکاتا تو ماں جو چند ہی قدم دور باورچی خانے میں بیٹھی ہوتی، فوراً آتی اور دروازہ کھول دیتی۔ مجھے ذرا بھی انتظار نہ کرنا پڑتا۔ لیکن اس روز پہلی بار کسی نے میری دستک کا جواب نہیں دیا۔ دستکیں بے فیضی بھی ہوتی ہیں، یہ مجھے تبھی پہلی بار پتہ چلا۔

مجھے یاد ہے استاد رحمتا صاحب نے ٹوکا تھا جب ان کے سامنے میں نے یہ الفاظ دہرائے۔ "بے فیضی دستکیں"۔

"دستکیں نہیں، دروازے فیض دیتے ہیں۔ اور دروازے بھی کیا، اسے کھولنے والا، اور اسے کھولنے والا بھی کیا۔ دستک دینے والا ہی تو اسے کھولنے والا بھی ہوتا ہے۔" میرے پلے یہ باتیں نہیں پڑتی ہیں۔ لیکن استاد رحمتا کی خیر ہے۔ انھیں یہ پھبتی ہیں۔ وہ باوا لوگ ہیں۔

دوسری بار یہ دستک دروازے پر نہیں، مرے دل پر ہوئی اور اس کی گونج اب بھی ایک مسلسل شور کی طرح میرے اندر جاری ہے۔

وہ میری ماموں زاد بہن تھی۔ مجھ سے دو ایک برس بڑی ہی ہوگی۔ میں اسے کن انکھیوں سے دیکھتا تھا۔ تو ایک بار اس نے مجھ سے کہا کہ وہ اوپر میرے کمرے میں آئے گی۔ وہ دروازے پر دستک دے گی۔ میں پٹ کھول دوں گا اور پھر...

وہ اپنی ماں کے ساتھ ہمارے گھر آئی۔ شام تک وہاں رہی۔ میں اوپر کمرے میں بند دروازے کی پرلی طرف سے آنے والی ہر ہر آہٹ پر کان لگائے سارا دن بت بنا بیٹھا رہا، حتیٰ کہ میری سانس میرے گلے میں پھنسنے لگی اور میں دیوانہ وار بھاگتا ہوا دروازہ کھول کر باہر چھت پر آ گیا جہاں رات کا گہرا اندھیرا منھ پھاڑے کھڑا تھا اور نیچے تمام گھر والے سو چکے تھے۔

وہ ایک دستک جو میرے کمرے کے دروازے پر ہونا تھی، میرے دل میں گونجی اور یہ گونج وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بڑھی۔ اس دستک کے انتظار کی ڈور نے میری سانسوں کو باندھا ہوا ہے۔ یہ ڈور میرے ہر طرف ایسی شدت سے کسی ہوئی ہے کہ میرے ماس میں بھی جاتی ہے۔ مجھے بے کل رکھتی ہے۔

اس بے کلی نے مجھے کہاں کہاں خجل نہیں کیا۔ باپ کی وفات کے بعد میرے بڑے بھائی ہی نے ہم بہن بھائیوں کو پالا۔ بہنوں کو بیاہا۔ چھوٹے بھائیوں کو پڑھایا۔ مجھ سے بڑے بھائی نے تو دکان کھول لی۔ مجھ سے کوئی ڈھنگ کا کام کبھی نہیں ہو سکا۔ نہ پڑھائی لکھائی سے ہی کبھی رغبت پیدا ہوئی۔ سمجھو تو یہ ذات کی بڑی کجی ہے۔ پر میں ایسا ہی ہوں۔ سکول میں بھی پڑھائی سے بھاگا۔ پتہ نہیں نویں میں یا اس سے بھی پہلے۔ میرے والد نے مجھے سائیں بشیر کے پاس بٹھا دیا، ڈھنگ پینٹنگ کا کام سیکھنے کے لیے۔

لیکن میرا شوق پتنگیں اڑانے کا تھا۔ گڈی گراؤنڈ میں کیا پیچ پڑتے

تھے۔ اب تو اس فن کی کوئی دات نہیں پوچھتا۔ تب کی دنیا ہی اور تھی۔ بڑے بڑے استاد تھے۔ ان کے قدموں میں بیٹھ کر میں نے یہ کام سیکھا۔ پیچ پڑتا تو میرے جسم میں اپنے آپ ایسی لہریں اٹھتیں کہ لگتا یہ انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا ہے۔ پتنگ تارہ ہو جاتی۔ میں ڈور کو اک تارے کی طرح انگلی سے چھیڑتا ہوا چھوڑتا جاتا۔ لمبے پیچ پڑتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دس دس گٹوں کا پنا یوں کھل جاتا کہ پھونس جھڑنے لگتا۔

گورنمنٹ نے ریلوے اسٹیشن سے اٹھا کر بسوں کے اڈے گڈی گراؤنڈ کے پاس لا کھڑے کئے تو وہاں کا ماحول ہی بدل گیا۔ جمعے کے جمعے پیچ تو اب بھی پڑتے ہیں پر میرا دل اٹھ گیا وہاں سے، بلکہ اس کام ہی سے۔

تو میں نے للاری چائے والے کے پاس بیٹھنا شروع کیا۔ وہاں بڑا بھڑا جوا کھیلا جاتا تھا۔ دو ایک دفعہ کھیلا مگر ہار گیا۔ لیکن ایک اور کام میرے مطلب کا وہاں نکل آیا۔ میرا یار بالا ٹینٹا والا جوا کراتا تھا۔ میں اس کے کن ٹٹوں میں شامل ہو گیا۔ ایک طرف ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھے رہو۔ نظر رکھو کہ کیا ہو رہا ہے۔ اور جہاں پھڈہ، کا سماں بندھے فوراً صلح صفائی کرانے پہنچ جاؤ۔ پھڈے ہلکی پھلکی بدمعاشی کا بھی تڑکا لگانا پڑتا تھا کبھی کبھار۔ میرا دل وہاں لگ گیا اور یہ سب کچھ یونہی رہتا اگر ایک روز وہاں پولیس کا چھاپا نہ پڑتا۔ بڑی مشکل سے میں اپنی جان بچا کر بھاگا۔ بالا پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ ایک عرصے تک میں چھپا رہا۔ بالا جیل سے ضمانت پر رہا ہوا اور اس نے یہ کیس خارج از دفتر کرایا تو میری جان خلاصی ہوئی۔ اس کے بعد میں کبھی للاری کی دکان پر چائے پینے بھی نہیں گیا، جوا تو پھر دور کی بات ہے۔

لیکن اس کے بعد زندگی میں رہا بھی کچھ نہیں۔ یکبارگی جیسے کسی نے زندگی کے تختۂ سیاہ پر ڈسٹر مار کر ساری لکھت پونچھ ڈالی ہو۔ یوں لگتا جیسے کوئی بات تھی جو سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ جیسے پتنگ کٹ کر بے سمت ہو جاتی ہے۔ بس جدھر ہوا لے چلے، چلی جاتی ہے۔ ایسے ہی میں بھی ادھر ادھر پلسیٹے کھاتا پھرا۔

میں ویرانوں میں اور مزاروں پر جا کر بیٹھا رہتا۔ آنے جانے والوں کو تکتا۔ کسی کے پاس میرے درد کا دارو نہیں تھا۔ گلاب کے پھولوں، اگربتی اور جلتی ہوئی موم کی خوشبو، میرے دماغ میں رچ بس گئی۔ ہر ہر نشہ میں نے انہی مزاروں پر بیٹھ کر آزمایا۔ پیروں فقیروں کے چرنوں میں سیس نوایا، لیکن دل کا قرار جو کھو گیا تو پھر نہ ملا۔

میرے دل میں دستکوں کا شور گونجتا تھا۔ ان گنت دستکیں۔ وہ ساری دستکیں جو میں نہیں دے سکا تھا۔ میں نے اس شور سے نجات پانے کی خواہش میں خود دستکیں دینا شروع کیں اور مجھے استاد رحمتا جیسا استاد ملا جو دستکیں دینے کے فن میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ میرے دل کو چین تو تب بھی نہ آیا لیکن ایک آس تو بندھی۔ ایک راستہ تو سجھائی دیا۔ ایک آسرا تو ملا۔

چھوٹے بڑے، نئے پرانے، رنگ برنگے دروازے میں نے کھٹکھٹائے۔ میں دستک دے کر آگے گذر جاتا۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھتا۔ چاہے کوئی لاکھ بلائے۔ ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا تھا تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ بس تبھی یہ ہوا کہ کلیجے میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں اور اتنی پیڑا ہوئی کہ لگا میں مر ہی جاؤں گا۔ لیکن میں بچ گیا۔

"میرے دکھ درد کا علاج کیا ہے؟" میں نے استاد رحمت سے دست بستہ عرض کی تو وہ بولے۔ "کون جانتا ہے؟ جب تک پھل پک نہ جائے، اسے شاخ کی سولی پر لٹکا رہنا پڑتا ہے۔"

"کچھ تو حل ہو گا اس کا۔ آخر کب تک؟ مجھ سے اب یہ پیڑا، یہ کرب، یہ بے چینی برداشت نہیں ہوتی۔ سینہ دھونکنی کی طرح بجتا ہے۔"

"ہمارے پلے کچھ نہیں ہوتا چن میریا سوائے انتظار کے۔ انتظار اس دروازے کا جسے ہمارا انتظار ہو۔" لیکن انتظار کا بار مجھ سے کبھی اٹھایا نہ گیا۔

ہنی پان شاپ کے برابر رفیق واچ ہاؤس کا تھڑا میرے بے کار دنوں کی آماجگاہ ہے۔ دکان تو جانے کب سے بند ہے اور کیا پتہ کب تک بند رہے۔ مجھے تو اپنی توڑ نبھانی ہے، مجھے اس سے کیا۔ میں سر جھکائے اکڑوں بیٹھا رہتا ہوں اور میرے سر کے دراز بال میرے چہرے کو چھپائے رکھتے ہیں۔ سردیاں ہوں یا گرمیاں، میرا ٹھکانا نہیں بدلتا۔ دھوپ میرا بدن جلاتی ہے، سرد ہوا اسے یخ کر دیتی ہے۔ میری ہڈیاں اکڑ کر تڑخنے لگتی ہیں۔ نیند کی تتلیاں میری آنکھوں کے گرد منڈلاتی ہیں۔ میں نیند کے نشے میں مست رہتا ہوں پر سوتا نہیں ہوں۔ مجھے ہر وقت چوکس رہنا ہے۔

گرمیاں ختم ہوتی ہیں تو سردیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ سردیوں کے بعد پھر سے گرمیاں آ جاتی ہیں اور ان کے بعد پھر سے سردیاں موسم بدلتے ہیں۔ عمر گذرتی جاتی ہے۔ اور اگر کچھ نہیں گزرتا یا ختم ہوتا تو وہ انتظار کی گھڑی ہے۔ انتظار کا سانپ بس سے بھرے ہوئے دانت میرے اندر کھبوتا ہے۔ مجھے ڈستا ہے۔ اس کا زہر میرے خون میں شرانٹے بھرتا ہے تو میں تھڑے سے اتر آتا ہوں۔

سامنے بازار ہے حد نظر تک پھیلا ہوا۔ اور اس بازار میں لوگ ہیں، بے انت۔ لوگوں کی بھیڑ مجھے روکتی ہے۔ لیکن میں سانس لینے کو بھی نہیں رکتا۔ اس بھیڑ کو چیرتا ہوا بھاگتا ہوں۔ بار بار ٹھوکر کھاتا اور ڈھے جاتا ہوں۔ پر ہار نہیں مانتا۔ اٹھ کر پھر سے بھاگنے لگتا ہوں۔ میرے اندر لگی آگ مجھے پل پل جلاتی ہے اور کہیں مجھے چین نہیں لینے دیتی۔ تب مجھے اور کوئی راہ نہیں سجھائی دیتی سوائے اس کے کہ میں دروازے کھڑکاتا جاؤں۔

شروع میں بہت مسئلہ ہوتا تھا۔ ویسے دیکھو تو کتنا سوکھا لگتا ہے یہ کام۔ لیکن یہ ایسا ہے نہیں۔ دھیرے دھیرے میں دروازوں کی بولیاں سمجھنے لگا تو میری مشکل اور بڑھ گئی۔ میں کسی گلی میں سے گذرتا تو ایک ساتھ کتنے دروازوں کی سمت کھنچا جاتا۔ وہ مجھے اپنی اور بلاتے تو خود کو روکنا میرے بس میں نہ رہتا۔ میرا دماغ دستکوں کے شور سے پھٹنے کو ہوتا اور میرا دل تیز تیز دھڑکتا۔ یوں لگتا جیسے ابھی یہ دھڑکنا بند کر دے گا اور میری سانس رک جائے گی۔ میں پاگلوں کی طرح کبھی اس دروازے کی طرف بھاگتا، کبھی اس کی طرف۔ میرا ہاتھ دستکیں دے دے کر چھل جاتا۔ میں گندے پانی کی نالیوں میں اوندھے منہ جا گرتا، دیواروں سے ٹکراتا، تھڑے سے الٹ جاتا۔ ہر دروازے پر مجھے حاضری دینی پڑتی اور میں تھک کر چور ہو جاتا۔

کیوں کچھ دروازے بلاتے ہیں، اور کچھ نہیں؟ دروازہ تو پھر بھی نہیں

کھلتا۔ بھاویں لاکھ ہاتھ مارو۔ ایسے بوہے پر دستک دینے کا فائدہ؟ کیا چاہتا ہے مجھ سے؟ سوچوں کی عجیب گھمسن گھیری سی میرے دماغ میں چلتی رہتی۔ تب استاد رحمتا صاحب نے آکر میری بانہہ پکڑی اور یہ منزل پار کرائی۔ ورنہ کیا پتہ میں یہیں فنا ہو جاتا۔ یہیں ساری عمر گھال دیتا۔ انھوں نے فرمایا:

"ہم نہیں، دروازہ ہمارا انتخاب کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کس سے پردہ کرنا ہے، کس کو سامنے آکر اشارے سے اپنی طرف بلانا ہے۔ کب کون سا بوہا کھل جائے، کون جانے؟"

کتنے ہی بوہے تھے، مجھے تو ان کی گنتی بھی یاد نہیں رہی، جن پر میں نے دستکیں دیں۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ کتنا وقت گذر گیا اس کام میں۔ لیکن وہ ہوک، وہ جلن جو کلیجے میں اٹھتی تھی، اب بھی ویسی ہی ہے۔ تب ایک دن..

مجھے یاد نہیں ہے وہ کون سی گلی تھی۔ کوچہ لون والا تھا، یا کوچہ چابک سواراں، یا اچی گلی۔ اور بوہے کا رنگ کیا تھا، کچھ بھی یاد نہیں۔ میں نے خود کو اس دروازے کے بالکل سامنے کھڑا پایا تھا۔ بس اتنی دور کہ ہاتھ بڑھاؤں اور اسے چھو لوں۔ مجھے یاد ہے اس پر تازہ تازہ روغن ہوا تھا۔ لگتا تھا، اسے چھوا تو رنگ انگلیوں کی پوروں پر اتر آئے گا۔ میرا داہنا ہاتھ اٹھا اور میں نے پہلی دستک دی۔ تب میرے دل کی دھڑکن مدھم ہوئی۔ دستک کی آواز میرے اندر ہی کہیں، بہت زور سے گونجی۔ باہر ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ پتہ نہیں باہر کچھ تھا بھی کہ نہیں اندر ہی اندر شور برپا تھا۔

دستک کی لہر پھیلی، اور پھیلتی چلی گئی، جیسے چانن پھیلتا ہے یا خوشبو پھیلتی ہے۔ ایسا چانن جو اندھا کر دے، اور ایسی خوشبو جو سانس گھونٹ دے اور بس تب بوہا کھلا۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے آکر ٹکرایا۔ اس جھونکے میں نمی تھی کسی دور دراز جگہ ہونے والی بارش کی نمی۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا، دہلیز کے اس پار اور یوں لگا جیسے کوئی مجھ میں سے نکل کر آگے بڑھا ہو۔ اور میں کھڑا اسے تک رہا تھا، اور میں ہی دروازے کے اس طرف ایک لمبے راستے پر چل رہا تھا، جس کے ہر طرف دودھیا روشنی تھی، اور دھوپ تھی سردیوں کی دوپہروں اور کسی حسینہ کے بالوں کی چھاؤں جیسی ٹھنڈی، اور سرسراہٹیں تھیں، پتوں میں سے ہوا کے گزرنے کی، اور آہٹیں تھیں انجانے لوگوں کے قدموں کی، اور سرگوشیاں تھیں نرم لہجے میں بات کرنے والی لڑکیوں کی جو بتا رہی تھیں کہ وہ گھڑی ضرور آئے گی۔ جب میرے دل کے بند کواڑوں پر دستک ہوگی۔ اس کے پٹ کھل جائیں گے اور میں آزاد ہو جاؤں گا ☆☆☆

کھڑکی

جعفر ساہنی

اکثر میں سوچتا ہوں
ٹوٹی ہوئی یہ کھڑکی
صرصر کی زد میں آکر
کرتی ہے آہ و زاری
تیور بدل کے اک دن
روشن فضا دکھا دے
جینا ہے کیا بتا دے

ممکن نہیں گر ایسا
انجام زندگی کا
آ جائے اس سے ہو کر

حنیف نجمی

یہ ساری باتیں چاہت کی یوں ہی کرتا رہوں گا
محبت میں مگر کچھ کچھ کمی کرتا رہوں گا

مری نظروں میں ہے جغرافیہ اس کے بدن کا
تصور باندھ لوں گا شاعری کرتا رہوں گا

ملے گا جب تلک مجھ کو نہ وہ جان تمنا
میں سب کاموں کو اپنے ملتوی کرتا رہوں گا

ملوں جس سے خفا دو دن میں کر دیتا ہوں اس کو
میں آخر تا کجا یہ ابلہی کرتا رہوں گا

تو اپنا دل نہ چھوٹا کر لہو ہے تن میں جب تک
میں روز و شب تری کھیتی ہری کرتا رہوں گا

کوئی آئے نہ کھولوں گا میں اب دروازۂ دل
سنوں گا دستکیں اور ان سنی کرتا رہوں گا

جنوں میں کر کے کچھ اس کو دکھانا بھی تو ہوگا
میں کب تک اس سے وعدے کاغذی کرتا رہوں گا

بجز کار ہنر میں کر بھی کیا سکتا ہوں نجمی
یہی کرتا رہا ہوں اور یہی کرتا رہوں گا

ترا غم ہے تو یہ جذبوں کی رو میں بہہ نہیں سکتا
کسی کے حق میں میرا دل غلط کچھ کہہ نہیں سکتا

ہوا اچھی ہے اس کی اور نہ پانی اس کا اچھا ہے
میں اس شہر منافق میں تو اک دن رہ نہیں سکتا

یہ شہر دل نہیں بستی ہے یہ فتویٰ فروشوں کی
یہاں اپنے خدا کو میں خدا بھی کہہ نہیں سکتا

زمیں سورج کے چاروں سمت گردش اب بھی کرتی ہے
یہ سچ ہے پھر بھی میں اپنی زباں سے کہہ نہیں سکتا

پلٹ کر اک نہ اک دن اپنی فطرت پر وہ آئے گا
وہ کٹ کر اپنے محور سے ہمیشہ رہ نہیں سکتا

میں انساں ہوں مری فطرت زمینی ہے میاں نجمی
بہت دن تک سر بام فلک میں رہ نہیں سکتا

ندی پار کا شہر

نسیم بن آسی

جب دوسرے لوگ ہفتے میں کم سے کم ایک بار دفتر گول کر کے فردوس کا قصد کرتے تھے یا پھر گل مہر کے چھتنار پیڑوں کے نیچے ایک دوسرے کی طرف چہرہ کئے ماضی کے قصے سناتے تھے، دفتر کی عمارت کا ایک گوشہ اسے اپنی آغوش میں پناہ دیتا تھا جہاں سے وہ پھر اپنی میز پر واپس لوٹ آتا تھا اور شام کو دفتر بند ہوتے ہی بغیر کسی سے بات کئے دفتر کے صدر دروازے کی طرف چل پڑتا تھا۔

دفتر جس سڑک پر واقع تھا اس پر ہر وقت گاڑیوں کی گہما گہمی رہتی تھی۔ ایک بڑے ہال میں صحافیوں کی قطار میزوں پر جھکی اپنے کاموں میں مصروف نظر آتی تھی۔ ایک کمرہ ایڈیٹر کے لئے مخصوص تھا۔ اس میں اس کی میز کے علاوہ چار پانچ کرسیاں بھی تھیں جو شاید ہی کبھی خالی رہتی تھیں۔ ایک کمرہ مالک کے لئے تھا جہاں سارا دن ملنے جلنے والوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

وہ جس کمرے میں بیٹھا تھا، اس میں مریل سی ایک روشنی جلتی رہتی تھی۔ گرد آلود فرش پر قدم رکھتے ہی آنے جانے والے کو سب سے پہلے ایک عجیب سی بو کا احساس ہوتا تھا۔ یہ کمرے کی سیلن کی گندھ تھی۔ اس کی کرسی کے پاس ہی اخباروں کا ڈھیر آرام کر رہا ہوتا تھا۔ اس کے پیچھے دیوار تھی جس سے لگی ہوئی الماری میں گرد آلود کتابیں باہر آنے کے لئے مضطرب نظر آتی تھیں۔ کمرے کی سیدھ میں گیلری نما جگہ کے دونوں سروں پر دروازے تھے۔ ان میں سے ایک برآمدے میں کھلتا تھا، دوسرا سامنے کھلے صحن میں۔ دونوں دروازوں کے اوپر روشن دان تھے۔ ہال نما کمرے میں بھی دو کھڑکیاں تھی۔ ایک کھڑکی باہر سڑک کی طرف کھلتی تھی، دوسری پیچھے کباڑ خانے میں۔ ان کھڑکیوں کے اوپر بھی روشن دان تھے جن کے شیشے پچھلے سال بجلی اور پانی کے مسائل کے بارے میں عوامی احتجاج کے دوران ٹوٹ گئے تھے۔

سڑک پر چلتے ہوئے اس کے ساتھ جو آدمی تھا، اس کا نام کھلر کباڑیا جیسا تھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ قد اوسط اور چہرہ کچھ لمبوترا تھا۔ وہ کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھا اور اوپر سے جیکٹ یا اسے صدری کہہ لیجئے۔ اس نے جیب سے پناما کا پیکٹ نکالا، اس میں سے ایک سگریٹ لے کر لائٹر جلایا اور بڑے اطمینان سے لمبا کش کھینچنے کے بعد اس کا سارا دھواں کھلر کے چہرہ پر پھینک دیا۔

"سگریٹ پلیز؟"

"میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

"تعجب ہے، تم سگریٹ نہیں پیتے؟"

سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اس کی ناک سے دھواں پتلی دھار کی طرح نکل رہا تھا اور لہراتا ہوا کسی پہاڑی پر کہرے کی طرح اوپر اٹھ رہا تھا۔

اس نے شارٹ کٹ سے اڈے پر پہنچنا چاہا جہاں ہر وقت آٹو، جیپ، ٹاٹا سومو اور رکشے والے شور کرتے آتے جاتے رہتے تھے۔ لیکن وہ شارٹ کٹ اختیار نہ کر سکا۔ راستے میں گوالوں کی بھینسیں بندھی تھیں جو اسے دور ہی سے پھنکارنے لگ گئی تھیں۔ دوسرے راستے سے وہ جیسے ہی اڈے کے پاس آیا، آٹو والے اس کے پیچھے پڑ گئے۔ ایک ہیرو ٹائپ ڈرائیور نے آگے بڑھ کر اس کی اٹیچی پکڑنے کی کوشش کی لیکن اسے اس نے جھٹک دیا۔ دو تین ٹاٹا سومو والے کچھ دور تک اس کے پیچھے آئے لیکن مایوس ہو کر واپس لوٹ گئے۔ جب وہ اور آگے بڑھا تو ایک رکشہ والا اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"بابو جی میرے رکشے میں چلئے۔"

رکشہ چلانے والا ادھیڑ عمر کا تھا اور اس کی پیٹھ اس طرح جھکی ہوئی تھی جیسے اس پر کوئی کوبڑ نکل آیا ہو۔ اس کا جسم ایک میلی قمیص میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے سوچا، اکیلے ہی جانا بہتر ہوگا۔ کسی کے ساتھ دکھائی دینے سے بلاوجہ بدگمانی ہوتی ہے۔

"کھلر، تم اپنی طرف نکل جاؤ میرا خیال نہ کرو۔ میں اکیلا ہی چلا جاؤں

گا۔" رکشے پر بیٹھتے ہوئے اس کی نگاہیں چھوٹے چھوٹے مکانوں پر پڑیں۔ ان میں رہنے والے لوگ گاؤں کے تھے نہ شہر کے۔ یہ عام لوگ تھے۔ کوئی چہار دیواری نہ ہونے کے باعث ان مکانوں کو آخر تک دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کی نظریں بار بار ادھر گھوم رہی تھیں پھر لوٹ کر واپس آجاتی تھیں۔ گھروں کا سناٹا ماحول کو کچھ بھیانک بنا رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب کچھ عجیب سا کہرام مچا ہوا تھا۔ اس نے پہلی بار اتنے بڑے پیمانے پر صفائی کا کام ہوتے دیکھا تھا۔ میلے چیکٹ کپڑے پہنے کچھ صفائی مزدور سڑک پر جھاڑو لگا رہے تھے۔ ان کے پیچھے صفائی مزدوروں کا جھنڈ نالیوں میں فنائل کا چھڑکاؤ کرنے میں مصروف تھا۔ رات کے اندھیرے میں متولد لاوارث بچوں کا ہجوم بھی اس پورے منظر کا حصہ بنا ہوا تھا۔ یکایک فنائل کا چھڑکاؤ ہونے سے مکھیوں اور مچھروں کے مستقل ڈیرے خیمے اجڑ گئے تھے اور اب مکھیاں اور مچھر ہر طرف کالے بادلوں کی شکل میں ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ فنائل کی تیز بو نالیوں کی بدبو کے ساتھ مل کر عجیب ابکائی پیدا کرنے والی فضا کو جنم دے رہی تھی۔

وہ ناک پر رومال رکھے اس ماحول سے باہر نکلا تو اس کا سابقہ ایک دوسرے منظر سے پڑا۔ سڑک، جو جگہ جگہ گڈھوں میں تبدیل ہو گئی تھی، اس کی مرمت کا کام چل رہا تھا۔ گڈھوں میں پتھر کے بڑے بڑے روڑے ڈالے جا رہے تھے۔ گڈھے اتنے زیادہ تھے کہ گویا پوری سڑک ہی کی مرمت ہو رہی تھی۔ اس وجہ سے ٹریفک بھی درہم برہم ہو گئی تھی۔ اس نے ایک راہ چلتے سے اس کہرام کی وجہ جاننی چاہی۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے صاحب؟"

"اجی صاحب کوئی بڑا آدمی آرہا ہے۔"

اس نے آنکھیں بھینچ کر کئی بار جھپکائیں۔ کچھ دیر بعد آنکھوں کی دھندلاہٹ کم ہو گئی۔

نیا شہر شروع ہو گیا تھا۔ مہنگی دکانیں اور اونچی عمارتیں نظر آرہی تھیں۔ بھیڑ بھری سڑک پر وہ کچھ یوں چل رہا تھا جیسے اسے کہیں انٹرویو دینے جانا ہے اور وہ لیٹ ہو رہا ہے یا اسے کسی کام پر پہنچنا ہے جو اس کے بغیر شروع بھی نہیں ہو سکتا۔ کسی اسکوٹر، کار یا رکشا والے کو پروا نہیں تھی کہ اس کی گاڑی کسی کو سائڈ مار سکتی ہے، جس سے اس کا توازن بگڑ سکتا ہے۔ بھیڑ کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ کنڈوم کی ایجاد کے باوجود یہ شہر انسداد افزائش نسل کے اس طریقے پر عمل کرنے میں ناکام رہا ہے۔

ہوٹل گرین لاؤنج کی کافی شاپ میں کچھ غیر ملکی کافی کی چسکیاں لے رہے تھے اور نگاہیں گھما کر ہر آنے جانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ ہوٹل گرین لاؤنج کا شمار شہر کے مہنگے ہوٹلوں میں ہوتا تھا۔ یہاں وی آئی پی، غیر ملکی سیاح اور صنعت کار آکر ٹھہرتے تھے۔ ہوٹل اچھی سروس اور اچھے انتظام کے لئے مشہور تھا۔ روزانہ وہاں دلچسپ اور رنگین پروگرام بھی ہوتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے اس شہر نے جانے کتنی کروٹیں بدل ڈالی تھیں۔ خاک پتی لاکھ پتی اور کروڑ پتی ہو گئے تھے۔ کسی وی آئی پی بنگلے میں تعینات ایک معمولی نوکر اسٹاف کار میں اپنے پورے گھر والوں کو شہر کی سیر کرا سکتا تھا۔

آبادی بہت پیچھے چھوٹ چکی تھی۔ ہوا میں ہلکی خنکی تھی۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس نے رکشے کی چھتری پیچھے کی طرف گرا دی کہ باہر کے موسم کا نظارہ کر سکے۔ جہاں سے چڑھائی شروع ہوتی تھی وہاں سڑک کے کنارے کالے بورڈ پر سفید رنگ سے "لال عمارت" لکھا ہوا تھا۔ چاندنی رات میں تو حروف صاف دکھائی دیتے تھے لیکن اندھیری رات میں حروف کی جگہ سفید دھبہ نظر آتا تھا۔ جاننے والے جانتے تھے کہ دکھائی دینے والا سفید دھبہ "لال عمارت" ہے۔ جو نہیں جانتے تھے وہ قریب سے دیکھ کر سمجھ جاتے تھے۔ انجان اور ان پڑھ لوگوں کو علاقے کا نام پوچھنا پڑتا تھا۔

چڑھائی شروع ہوتے ہی رکشے والے کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ سڑک کے دونوں طرف چٹانیں اور جھاڑیاں بمشکل ہی سرکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ریلوے لائن سے ملحق ہونے کے باوجود اس علاقے نے اپنا چہرہ نہیں بدلا تھا سوائے اس کے کہ سڑک پر ٹریفک کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کھائیاں تھیں جن میں گاڑیوں کے گر جانے کا خدشہ ہمیشہ رہتا تھا۔ چڑھائی ختم ہوتے ہی پل کا حصہ شروع ہو گیا تھا۔ نیچے ندی کے آدھے سے زیادہ پانی کے اوپر ڈھلتی ہوئی شام کے سورج کا طلسمی رنگ پھیلنے لگا تھا۔ دو چمکتی کاریں اچانک ایک ساتھ اس کی بغل سے گذر گئیں۔ ایک کار میں کوئی ادھیڑ عمر جوڑا بیٹھا ہوا تھا، دوسری کو ایک نوجوان لڑکی چلا رہی تھی۔ دونوں کاریں رفتار سے آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ پیچھے والی کار اب آگے والی کار کے قریب آگئی تھی۔ دونوں ایک خطرناک موڑ کے قریب پہنچ چکی تھیں کہ آگے والی کار نے تیز رفتاری کے ساتھ ایک جھٹکے سے موڑ کاٹا۔ ایک لمحے کو ایسا معلوم ہوا کہ گاڑی پلٹ جائے گی لیکن وہ پلٹی نہیں اور تیزی سے بھاگتی چلی گئی۔

دوسرے ہی لمحہ اسے بھی احساس ہوا کہ ڈھلان ختم ہو گئی ہے۔ اس نے گہری سانس لے کر درختوں کو آنکھوں میں بھر کر اس طرف دیکھا جو لال عمارت کا علاقہ کہلاتا تھا۔ درختوں کے بیچ سے ایک عالی شان عمارت جھانک رہی تھی۔

منڈیلا روڈ پر اس عمارت کا محل وقوع نہایت خوبصورت تھا۔ یہاں جنگلی گلاب کے پھولوں کی مہک تھی اور میلوں دور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ اونچی نیچی چٹانوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے بعد گھنا جنگل شروع ہو گیا تھا۔ پیچھے کی طرف ایک سڑک نیچے اتر کر جانے کہاں کھو گئی تھی۔ اس گول سڑک کے کنارے کچھ فاصلے پر مولسری کے درخت کے نیچے ایک نوجوان لڑکی پتھر پر بیٹھی One Hundred Years of Solitude پڑھ رہی تھی۔ اس کے لمبے لمبے بال کھلے ہوئے تھے۔ اس کی شلوار کا رنگ پیلا تھا۔ اس کے گورے رنگ کا ذکر کئی تشبیہیں دے کر کیا جا سکتا ہے لیکن کوئی بھی تشبیہ فضول ہوگی۔ اسے دیکھنے کے بعد سب کچھ اجلا اجلا معلوم ہوتا تھا۔ ہوا میں عجیب خوشبو تھی۔

عمارت کے صحن میں متعدد ماروتی، سینٹرو، جیپ اور بولیرو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہ ان لوگوں کی گاڑیاں تھیں جن کے بچے باہر کے ملکوں میں اونچی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور جو خود کئی بار سرکاری خرچ پر ان ملکوں کا سفر کر چکے تھے۔ ان میں کچھ گاڑیاں دلالوں کی بھی تھیں جو بڑی بڑی رقمیں لے کر لوگوں کا کام رواں کراتے تھے۔

اس نے صدر پھاٹک کے اندر کھڑے ہوئے ایک چوکی دار کو اپنا

شناختی کارڈ دکھایا۔ سلاخوں کے بیچ سے اس نے شناختی کارڈ کو غور سے دیکھا پھر گیٹ ہاؤس میں سے ٹائم کیپر کو بلا لیا۔ جب ٹائم کیپر نے بھی اپنا اطمینان کر لیا تو پھاٹک ذرا سا کھول دیا گیا، بس اتنا کہ وہ اس میں سے گذر سکے۔

پھر وہ عمارت کی راہداریوں میں کھو گیا۔ ان گنت کھڑکیاں تھیں جن کے لکڑی کے فریموں میں قیمتی شیشے جڑے ہوئے تھے۔ دروازوں پر بھی شیشے تھے۔ ہر کمرے میں داخل ہونے کا راستہ الگ تھا۔

لمبی راہداریوں میں چلتے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ اس کے جیسے بہت سے لوگ صحیح راستے کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں۔ لوگوں کی حرکات وسکنات سے معلوم ہو جاتا تھا کہ کون کس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ پڑھے لکھے اور افسر قسم کے لوگ تیزی سے چلتے ہوئے دھیرے چلنے والوں کے بیچ سے آگے نکل جاتے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے ان کی گردنیں نیچی تھیں۔ سست رفتاروں میں بہت بڑی تعداد بے روزگاروں کی تھی۔ اسے ان لوگوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اور نہ وہ اسے جانتے تھے۔ پھر بھی کسی نے اسے "آداب" کہا۔ اسے تعجب ہوا۔ آداب کہنے والے آدمی کو دیکھنے کے چکر میں اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرا گیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ آداب کہنے والا آدمی شاید آگے نکل چکا تھا۔ اسے افسوس ہوا۔ یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی کہ دیکھ کر نہ چلا جائے۔

کسی کسی راہداری میں اتنے لوگ کھڑے ہوئے تھے کہ گویا اچھی خاصی بھیڑ جمع تھی لیکن ان کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ انھیں جس راستے کی تلاش ہے وہ ادھر نہیں ہے۔ وہ خود بہت دیر تک اجنبیوں کی طرح ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔ وہ جہاں بھی آگے بڑھتا، چکر کاٹ کر پھر اسی جگہ واپس آ جاتا جہاں سے چلا تھا۔ اس کوشش میں اسے پولیس والوں کی غیر ضروری اور غیر مہذب پوچھ گچھ کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ کھلر کپاڑیا سے رخصت ہونے سے پہلے اس نے یہ کیوں نہیں پوچھ لیا کہ وہ جس کمرے میں داخل ہونا چاہتا ہے، اس راستے کی صحیح پہچان کیا ہے۔

اس عمارت کے بارے میں دانشوروں میں گہرا اختلاف تھا۔ ایک گروہ اس عمارت کو تاریخی اہمیت کا حامل سمجھتا تھا۔ دوسرا اسے بدعنوانیوں اور خاندانی استحصال کی وراثت کی علامت تصور کرنے پر مصر تھا۔ کبھی کبھی دونوں گروہوں کے درمیان نوک جھونک اتنی شدید ہو جاتی تھی کہ بین الاقوامی ادارے اس بحث کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا منصوبہ بنانے لگتے تھے۔

یکا یک اس نے دیکھا کہ وہ سارے راستوں کو دیکھ چکا ہے اور اب جلد ہی کوئی بھانپ لے گا کہ وہ بھٹک گیا ہے۔ ورنہ اس جیسے آزمودہ کار صحافی کے لئے یوں جگہ جگہ پھرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ ایک دروازے کے پاس آکر ٹھٹھک گیا۔ عمارت کے اندر سے کئی جانوروں کی ملی جلی آوازیں آرہی تھیں۔ اس کے لئے یہ سب بے حد غیر متوقع تھا۔ ایسا لگا کہ اس کے قدموں کی آواز عمارت کے اندر پہنچ گئی ہے۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا، بھڑا ہوا تھا۔ دروازے کی درز سے وہ منظر اس نے دیکھا اور اس کا سر چکرانے لگا۔ دروازے کا توازن قائم نہ رہ سکا اور ہلکی سی چرمراہٹ کے ساتھ اس کا ایک پٹ یکا یک کھل گیا۔

"کون ہے......؟" بہت سے قدم ایک ساتھ اس کی طرف لپکے۔

"پکڑو! اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔"

وہ بھاگ نکلنے کی سوچ رہا تھا کہ پیچھے سے ایک پولیس والا آکر اسے پکڑ لیا۔ اس نے پولیس والے کو اپنا شناختی کارڈ دکھایا۔ "میں کوئی چور اچکا نہیں، صحافی ہوں۔" پولیس والے نے ایک تھپڑ مار کر اسے چھوڑ دیا۔ "چلو۔ جاؤ۔ انٹلکچوئل ہو کر ایسی حرکت کرتے ہو!"

اب واپس ہوتے ہوئے اس کے قدموں میں تیزی نہیں تھی، اس لئے کہ وہ کسی طے شدہ ٹھکانے تک پہنچنے کے لئے نہیں چل رہا تھا۔ ہر موڑ پر ساتھیوں کی تعداد گھٹتی جا رہی تھی۔

اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا، ایک سگریٹ سلگائی پھر پیکٹ اور لائٹر جیب کے حوالے کر دیا۔ ایک لمبا کش لے کر اس نے باہر نگاہ دوڑائی۔ دھوپ پیلی لیکن چمکدار تھی۔ سڑک کے کنارے درخت شام کی دھوپ میں نہائے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ وہ راہداری کی سیڑھیاں اتر کر بجری پر چلتا ہوا پھاٹک کی طرف بڑھا۔ راستے سے اٹھتی ہوئی دھول اور بجری کا ہلکا ہلکا غبار اس کے نتھنوں میں گیا تو اچانک اس نے دریافت کیا کہ اسے بہت تیز بھوک لگی ہے۔

پھاٹک سے باہر آکر اس نے سرسری نگاہ سے سڑک کے دونوں طرف دیکھا۔ سڑک کی دوسری طرف فٹ پاتھ پر ٹین کی چھت کے نیچے چائے کی ایک چھوٹی سی عارضی دکان تھی۔ اس میں ہلکے ناشتے کا بھی انتظام تھا۔ وقت ضرورت پر پولیس والوں کو بھی چائے ناشتے کی سہولت رہتی تھی۔ اس نے سڑک پار کی اور دکان کے باہر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ایک ادھیڑ عمر آدمی کی طرف رخ کر کے کہا۔

"چائے کے ساتھ آلو کی دو ٹکیاں بھی بھیج دو۔"

بنچ کے سامنے میز پر صبح کا اخبار پڑا تھا۔ اس کے پہلے صفحے پر ایک عالی شان ہوٹل کے لاؤنج میں کھڑے ہوئے کچھ غیر ملکیوں کی رنگین تصویریں تھیں۔ مقامی جڑی بوٹیوں سے دوائیں بنانے کے کئی سو کروڑ روپئے کے ایک منصوبے پر حکومت کا ان کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا۔ حکومت کا بیان تھا کہ اس منصوبے سے عام لوگوں کی زندگی بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔

کچھ دیر بعد چائے ختم ہو گئی اور اس نے جیب سے دس کا نوٹ نکال کر دکاندار کی طرف بڑھا دیا۔

سورج شاید تھک گیا تھا اور تھکن سے اکتا کر اس نے افق کی گہرائیوں میں آنکھیں موند لی تھیں۔ شام کے سناٹے اور اندھیرے چھانے لگے تھے۔ صرف عمارت کے پورچ میں روشنی تھی اور کچھ کھڑکیوں سے ہلکی روشنی جھانک کر سنسان پڑے ہوئے لان میں روشن لکیریں بنا رہی تھی۔ روشنی کا ایک دائرہ باہر سے عمارت کی دیوار پر پڑ رہا تھا۔ وہاں ایک بھیانک شکل عمارت کی دیوار میں تراشی ہوئی تھی۔ اس میں آنکھ، ناک، ہونٹ اور ہاتھ پاؤں موجود تھے لیکن غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا، وہ کوئی باارادہ تراشا ہوا مجسمہ نہیں ہے۔ ایک آنکھ دوسری آنکھ سے بہت بڑی تھی۔ دہانہ تنگ اور ٹیڑھا تھا۔ ایک کان تکونا تھا

اور ایک گویا تھا ہی نہیں۔اس نے ان ٹیڑھی میڑھی آنکھوں کو کھلتے ہوئے دیکھا۔ لیکن یہ جنبش کرتی ہوئی آنکھیں اس کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ پھر یکا یک اسے دیواروں میں تراشے ہوئے ہاتھ لہراتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ سہم کر اپنی جگہ سے ہٹنے لگا۔ دیواری تصویر میں آنکھوں کے سوا اور کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس میں انسانوں کی جھلک ہو لیکن وہ آنکھیں تو اسے گھور رہی تھیں جیسے اسے کھا جائیں گی۔ اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف چھلانگ لگائی اور دوڑتا چلا گیا۔ لیکن کوئی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ ایک تاریک کونے میں عمارت کی دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ مجسمے کی رفتار اور چہرے میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ ہاتھی کی طرح چنگھاڑ کر پولیس بوتھ کی طرف بھاگا۔

ایک سب انسپکٹر اس کی طرف پشت کئے کھڑا تھا۔ آواز سن کر وہ اس کی طرف پلٹا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ شک کی سی جھلک تھی۔ انسپکٹر نے نیچے سے اوپر تک اس کا جائزہ لیا۔ پچکے ہوئے گال، جن پر کئی دن پرانی اگری بے ترتیب داڑھی، پاؤں میں پالش کو ترستی ہوئی چپلیں۔ وہ جب سے 'قومی یکجہتی' میں آیا تھا اس کے اپنے وجود میں کوئی یکجہتی نہیں رہ گئی تھی۔ سب انسپکٹر نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

اس نے اپنا تعارف کرایا اور مجسمے کے بارے میں پولیس والے کو بتایا۔

"اماں تعجب ہے، تم انٹلکچوئل ہو کر..."

یہ لفظ باقاعدہ گالی کی طرح اس کی صفات میں شامل ہونے لگا تھا۔

اس نے بجلی کی روشنی میں بلندی تک پھیلی ہوئی عمارت کی دیوار پر ایک نگاہ ڈالی۔ وہاں اس کی موجودگی ٹھیک چوروں جیسی تھی...

اس نے اپنے ٹوٹے ہوئے جسم کو یکجا کیا اور منتشر خیالات کو سمیٹ کر دماغ میں انھیں ایک نئی شکل دینے کو کوشش کی۔ وہ چند قدم آگے چل کر سڑک پر آ گیا۔ ابھی اندھیرا زیادہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اتنے بڑے شہر کی سڑکوں سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ اسے صرف اتنا پتہ تھا کہ نئے شہر تک پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ پون گھنٹہ یا ایک گھنٹہ لگ سکتا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف درخت تھے۔ کچھ کے پتے جھڑ چکے تھے کچھ پر نئی کونپلیں نکل رہی تھیں۔ یہ اس نے پہلی بار دیکھا کہ سوکھ کر گرتے ہوئے پتوں کے رنگ بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ کسی کا ہرا پن کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ کسی میں ہلکی سرخی پیدا ہو جاتی ہے۔ کوئی ایک دم پیلا ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سوکھ کر بدرنگ ہو جاتے ہیں۔ جن درختوں کے پتے ابھی تک نہیں گرے تھے، وہ یوں تن کر کھڑے تھے جیسے ان کی یہ شادابی کبھی ختم نہ ہو گی۔

کچھ دیر بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ ایک سنسان سڑک پر آ گیا ہے۔ اس نے تھوڑے فاصلے پر بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑے ہوئے ایک نوجوان کو دیکھا جو سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔ وہ چہرے سے ایک دم لاپروا معلوم ہو رہا تھا پھر بھی نہ جانے کیوں اس کے حلیے سے ایسا لگا کہ وہ اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس کے جسم میں تھرتھری پیدا ہو گئی۔ اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں تھا۔ وہ اب بھی کھمبے سے ٹیک لگائے اطمینان سے سگریٹ کا کش کھینچ رہا تھا جیسے اس کا کسی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔

اس نے راحت کی سانس لی۔

آگے چل کر اسے دور ٹی۔ وی۔ ٹاور دکھائی دیا جس کی ہلکی ہلکی روشنی یہاں سے نظر آ رہی تھی۔ وہ جگہ اتنی سنسان تھی کہ اس کے آس پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس سے پہلے اس نے پیڑوں اور مکانوں سے خالی ٹاور نہیں دیکھا تھا۔

چھوٹی چھوٹی بستیوں سے نکل کر اسکوٹر اور ٹیمپو دور دراز سے آتی ہوئی گاڑیوں سے آگے نکلنے کے چکر میں تھے۔ دوسری گاڑیوں کو پیچھے چھوڑنے کی کوشش میں ان کے انجنوں پر بہت زور پڑ رہا تھا اور ان سے کثیف دھواں نکل کر چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ لیکن اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ اسے کسی منظر کو دیکھنے اور دیکھ کر بھول جانے کی عادت تھی۔ اسے یہ عادت کب اور کیسے پڑی، اسے یاد نہیں تھا۔ اسے صرف معلوم تھا کہ وہ خود ایک منظر کا حصہ ہے۔ کئی بار وہ اپنے کو اس منظر سے الگ کر لیتا تھا۔ لیکن وہ منظر اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا تھا۔

سامنے ندی کے پار نیا شہر بجلی کی تیز روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ اس کی روشنیاں ندی کے صاف پانی میں دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں۔ کچھ دیر چڑھائی پر قدم بڑھاتے ہوئے اسے محسوس ہوا، اتنی دور پیدل چلنے کے باعث وہ بہت تھک گیا ہے اور پیروں کے تلووں میں جلن پیدا ہو گئی ہے۔ وہ ایک موڑ کاٹ کر پل پر آ گیا۔ پھر وہ چند قدم چل کر رک گیا اور اپنے پیروں کو کچھ دیر آرام دینے کے بارے میں سوچنے لگا۔

فضا میں ڈیزل کی مہک کے ساتھ ندی کے پانی اور مچھلیوں کی بھی مرطوب مہک تھی۔ اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر وہ جیسے جامد ہو گیا۔ بیٹھے بیٹھے شاید اس نے ایک جھپکی بھی لے لی۔ بہت دیر بعد اس کے کانوں میں کوئی آواز سنائی پڑی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ ایک بوڑھا تھا جس کے ایک ہاتھ میں لاٹھی اور سر پر لکڑی کا گٹھر تھا۔

"بابو میرا گٹھرا اتار دو گے؟"

اس نے ہاتھ کا سہارا دے کر گٹھر اتروا دیا۔

بوڑھے کے چہرے پر اگی ہوئی چھدری داڑھی کے درمیان اس کے چہرے کی سلوٹیں جھانک رہی تھیں۔

"کیا تمھیں نئے شہر جانا ہے؟"

بوڑھے نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں۔ جانا تو ہے۔"

سنہری ندی کے پار کا افق بجلی کی چمک کے نیچے کسی جشن کا گمان پیدا کر رہا تھا اور ندی کا پانی حیرت زدہ خاموش تھا ☆☆☆

نیر مسعود کے افسانوں کا مجموعہ

طاؤس چمن کی مینا

مطبوعہ آج کی کتابیں، کراچی

قیمت : ایک سو پچھتر روپے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

ابرار اعظمی

دھوپ اتراتی ہوئی آئی ہے

کاشانے میں
سوچتی ہوگی
مرے گھر میں اجالا کردے
اس کو معلوم نہیں
تیرگی گھر میں نہیں
ذہن میں ہے

نظم

لوگ کہتے ہیں...
موسم ہے یہ رعنائی کا
نغمہ سنجی کا، گلفشانی کا
خوشبوئیں صحن چمن میں رقصاں
تتلیاں قوس قزح کے مانند
ذوق دیدار کو لذت دیتی
گل کترتی ہوئی چلتی ہے نسیم

لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
لیکن افسردگی طبع...

نظم

خزاں کا موسم ہے
جہاں خزاں ہو وہاں بہار بہت دور نہیں
پیڑوں کی شاخوں نے
پرانے دریدہ پیراہن
اتار پھینکے ہیں
نئی قبائیں، گل بوٹے
ان کے لئے آنے والے ہیں

خزاں رسیدہ مرا جسم بھی ہے
تو کیا بہار بہت دور نہیں؟

زبیر شفائی

تیز ہو جائیں ہوائیں تو بگولا ہو جاؤں
گھومتے گھومتے ہر قبۂ صحرا ہو جاؤں

خود کلامی مری عادت نہیں مجبوری ہے
یوں نہ مصروف رہوں میں تو اکیلا ہو جاؤں

دوسرا پاؤں اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے
اور میں فاتح ناہید و ثریا ہو جاؤں

بند آنکھوں سے نہ کر مشق تصور دن رات
کہ ہمیشہ کے لئے جان میں تیرا ہو جاؤں

یہ تری گلبدنی یہ تری کم پیرہنی
سیر چشمی سے کہیں اور نہ پیاسا ہو جاؤں

اک سرا ہے مگر آتا نہیں ہاتھوں میں زبیر
جس بہانے سے میں بیگانۂ دنیا ہو جاؤں

سر کبھی گردن کبھی رخسار سہلاتا رہا
ایک ہی جھونکا پلٹ کر بار بار آتا رہا

پھول پر بیٹھی ہوئی تتلی اچانک اڑ گئی
یہ خزانہ آخر اپنے ہاتھ سے جاتا رہا

شمع کی لو پر ہوا نے ہونٹ اپنے رکھ دیے
وجد میں آ کر دھواں تا دیر لہراتا رہا

اس تمنا میں کہ اہل دل مجھے تجھ سا کہیں
تیرا اک اک رنگ اک اک ڈھنگ اپناتا رہا

یوں کہ دہری زندگی جینے کی عادت تھی مجھے
خود کو سینے سے لگاتا اور ٹھکراتا رہا

در دریچے بند اور آنکھیں کھلی رکھتے ہوئے
میں بھرے گھر میں گم اپنے آپ کو پاتا رہا

غزلیں

خورشید طلب

لگتا ہے پیچ و تاب کے آگے کچھ اور ہے
اس شور انقلاب کے آگے کچھ اور ہے

بے شک مرے سوال کے پیچھے ہے اور بات
کیا تیرے اس جواب کے آگے کچھ اور ہے

ہر چند میری آنکھوں نے دیکھا نہیں ہنوز
لیکن طلسم خواب کے آگے کچھ اور ہے

جو تجھ سے خوش جمال ہے اور دل فریب بھی
دنیا ترے شباب کے آگے کچھ اور ہے

اڑتا ہوا عقاب تو آنکھوں میں قید ہے
اب دیکھئے عقاب کے آگے کچھ اور ہے

ہاں جس سے اس زمیں کا توازن ہے برقرار
دن رات کے عذاب کے آگے کچھ اور ہے

پردہ پڑا ہوا ہے مری آنکھ پر طلب
یا برق و آفتاب کے آگے کچھ اور ہے

کہاں کسی کا بنایا ہوا بناتے ہیں
نیا بناتے ہیں جب ہم، نیا بناتے ہیں

نیا بنانے کی جرأت کبھی نہیں مرتی
نئے سرے سے نئے کو نیا بناتے ہیں

کسی کا نقش بناتے ہیں لوح دل پر ہم
کسی کا عکس سر آئینہ بناتے ہیں

زمیں بھی تنگ ہوئی جارہی ہے دل کی طرح
ہم اب مکان کہاں مقبرہ بناتے ہیں

خورشید طلب

مٹائے جاتے ہیں جو بھی نشاں بناتے ہیں
ہم اپنے پیچھے کہاں کارواں بناتے ہیں

ہم اپنے ہاتھ سے اپنا جہاں بناتے ہیں
ستارے گڑھتے ہیں اور کہکشاں بناتے ہیں

مجال کیا جو کسی گل کو چھو لے بادسموم
ہم اپنے طرز عمل سے خزاں بناتے ہیں

ہمارے ہاتھ مگر بے گھری ہی لگتی ہے
زمیں بناتے ہیں ہم آسماں بناتے ہیں

انھیں سنبھال کے رکھنا ہوا نہ دینا تم
ہمارے شعر یہ چنگاریاں بناتے ہیں

یقین رکھو یہ منظر بدلنے والا ہے
شرار اڑنے سے پہلے دھواں بناتے ہیں

کنویں سے پیاس کا رشتہ کوئی نیا ہے کیا
بنانے والے عبث داستاں بناتے ہیں

نیا بنانے کی دھن میں پتہ نہیں چلتا
کہاں بگاڑتے ہیں اور کہاں بناتے ہیں

کسی بزرگ کی صحبت میں بیٹھتے ہیں طلب
بلا کی دھوپ ہے اب سائباں بناتے ہیں

نہ شہر میں نہ کسی دشت ہو میں خاک ہوئے
ہمارے خواب ہمارے لہو میں خاک ہوئے

کسی کے ہاتھ لگا کب وہ ماہتاب بدن
کئی جیالے وہیں جستجو میں خاک ہوئے

دھواں سا اٹھتا ہے دل سے جو سوچتا ہوں کبھی
وہ کون تھے جو مری آرزو میں خاک ہوئے

تھے کتنے گیت جو آواز کو ترستے رہے
ہزار راگ رگ خوش گلو میں خاک ہوئے

اب اس سے اچھا بھلا اختتام کیا ہوتا
اٹھے تھے میں سے مگر جا کے تو میں خاک ہوئے

اتل اجنبی

میرا نہیں ہے اور نہ کسی اور ہی کا ہے
پرتو جہاں کہیں ہے تری روشنی کا ہے

پنچھی درخت پھول تو منہ ڈھک کے سو گئے
جنگل میں راج پاٹ بس اب چاندنی کا ہے

لٹنے کا ڈر سہی پہ محبت کی راہ میں
جانا اسی گلی سے ہر اک آدمی کا ہے

برسوں پرانا زخم ہے، ایسا ہرا مگر
دیکھے طبیب تو وہ کہے آج ہی کا ہے

گھر جل رہا ہے سامنے اس کو بچایئے
پھر اس کے بعد اگلا مکاں آپ ہی کا ہے

جب اس کے سامنے سورج ہوا ندی کیا ہے
ہم آدمی ہیں ہماری بساط ہی کیا ہے

بچھڑ کے گھر سے یہی سوچتا ہوں میں دن رات
شجر سے ٹوٹ کے پتوں کی زندگی کیا ہے

جلے مگر جو نہ روشن ہوئے زمانے میں
وہی چراغ سمجھتے ہیں روشنی کیا ہے

بس ایک رات کا مہمان ہے پرندہ یہاں
اسے پتہ ہی نہیں شاخ چاہتی کیا ہے

ہمارے آنسو جو چاہیں تو غرق ہو دنیا
ہمارے بارے میں دنیا یہ جانتی کیا ہے

کبھی خموش کبھی تیز رو بپھرتی ہے
پہاڑ سے کوئی پوچھے ذرا ندی کیا ہے

اتل اجنبی

درخت دھوپ سے لڑتا ہے اس قدر دن بھر
پھلوں سے شاخوں سے رہتا ہے بے خبر دن بھر

نہ آبشار نہ پنچھی نہ جانور نہ درخت
عجیب دشت میں کرتا رہا سفر دن بھر

ڈھلی جو شام تو بجے سا سو گیا سورج
دکھا رہا تھا کئی طرح کے ہنر دن بھر

مرے نصیب میں کیا اور کچھ لکھا ہی نہیں
سفر میں رہتا ہوں گھر پہ میں رات بھر دن بھر

سویرا ہوتے ہی سب کام پر نکلتے ہیں
اداس اداس سا رہتا ہے میرا گھر دن بھر

قبول کیسے دعا ہو بھلا چراغوں کی
کہ اپنی جان بھی رہ جائے معتبر دن بھر

بھلی ہو یا کہ بری ہر نظر سمجھتا ہے
ہر ایک شخص کی آہٹ کو گھر سمجھتا ہے

ہر ایک در کو وہ اپنا ہی در سمجھتا ہے
مگر زمانہ اسے در بہ در سمجھتا ہے

پھل اور شاخ سمجھنے میں چوک جائیں مگر
ہے کس جگہ کا پرندہ شجر سمجھتا ہے

کچھ اس طرح سے دکھاتا ہے وہ ہنر اپنا
کہ جیسے سب کو یہاں بے ہنر سمجھتا ہے

غزلیں

قمر رضا شہزاد

لرزتے ٹوٹتے گرتے ہوئے جہاں سے نکل
زیادہ خوف زدہ ہے تو اس مکاں سے نکل

ہمارے دل کا تعلق نہیں زمانے سے
سو اپنی خواہش دنیا اٹھا یہاں سے نکل

ترے جمال کی لو تیرے بعد رہ جائے
دیے جلاتا ہوا اس جہان جاں سے نکل

میں رب نور سے محو کلام ہوں سر شام
سوائے چراغ دعا تو بھی درمیاں سے نکل

اب اس کے بعد قیامت ہے تو بھی اے شہزاد
دعائیں پڑھتا ہوا شہر بے اماں سے نکل

وجود خاک سے باہر نکال دے گا وہ
مجھے بھی اپنے سراپے میں ڈھال دے گا وہ

میں جانتا ہوں محبت میں ہارنے کے بعد
سبھی کے سامنے میری مثال دے گا وہ

شکوہ بخت پہ مسرور شخص کو آخر
کسی فقیر کے قدموں میں ڈال دے گا وہ

میں اس کے حق میں یہاں آخری دعا گو ہوں
مجھے بھی اپنی صفوں سے نکال دے گا وہ

کوئی تو شکل ہے موجود مجھ میں بھی شہزاد
میں سنگ ہوں تو مجھے خد و خال دے گا وہ

یہ جو مجھ کو گرا دیا گیا ہے
آپ کو راستہ دیا گیا ہے

کوئی تیری مثال ہی نہ رہے
آئینہ بھی ہٹا دیا گیا ہے

دکھ تو یہ ہے ترے بچھڑنے کا دکھ
آنسوؤں میں بہا دیا گیا ہے

ایک دل ہی تھا ضو فشاں سر شام
یہ دیا بھی بجھا دیا گیا ہے

مجھ کو اس دشت عشق میں شہزاد
قیس کا مرتبہ دیا گیا ہے

مسعود مرزا نیازی

(عرفان صدیقی کی یاد میں)

اک نگری سبز امنگوں کی
اک زندہ شہر خزینوں کا
اک جل تھل پیہم خوابوں کی
اک جگمگ ہار نگینوں کا
اک سچی بات زمانوں کی
اک گہرا درد مہینوں کا
اک کالی رات گمانوں کی
اک روشن پہر یقینوں کا
اک قصہ گذرے موسم کا
اک رستہ روشن زینوں کا
اک کثرت رشتے ناتوں کی
اک گھر سنسار قرینوں کا
اک سبز بشارت نصرت کی
اک جلوہ خاک نشینوں کا
اک ندی صدیوں قرنوں کی
اک چشمہ سال مہینوں کا
اک نام سے دھوپ میں برکھا رت
اک اسم طلسم جبینوں کا

☆

اک ساعت لاکھ عذابوں کی
اک مشعل خواب سرابوں کی
اک پیہنائی نظاروں کی
اک وادی اشک ستاروں کی
اک محفل ماہ جمالوں کی
اک دھرتی سبز خیالوں کی
اک طلعت جھلمل کرنوں کی

اک آہٹ میٹھے جھرنوں کی
اک موج تمازت سانسوں کی
اک جھیل شباہت آنکھوں کی
اک محفل مہر نگاروں کی
اک منزل چاند ستاروں کی
اک خاموشی آوازوں کی
اک تان شکستہ سازوں کی
اک ٹوٹی ڈار غزالوں کی
اک مشکل چاہنے والوں کی
اک خواب کہانی پریوں کی
اک بٹیا رانی پریوں کی
اک دھندلی لہر حبابوں کی
اک روشن بات کتابوں کی
اک تلخی تند شرابوں کی
اک چڑھتی دھوپ شبابوں کی
اک ہجرت بکھرے جادو کی
اک نسبت عرش نژادوں کی
اک دکھ سکھ بستی گاؤں کی
اک جھلکی دھوپ اور چھاؤں کی
اک چھائی بدلی آشا کی
اک چھٹتی دھند نراشا کی
اک اڑتی دھول سواروں کی
اک الجھی بات اشاروں کی
اک گردش تیز اڑانوں کی
اک شورش تیر کمانوں کی
اک آتش سرخ گلابوں کی

اک تابش جسم سرابوں کی
اک عمر مسافت خوابوں کی
اک راہگذر شب تابوں کی
اک میٹھی بانی حکمت کی
اک دھیمی طرز تلاوت کی

☆

اک افسوں پہلی بارش کا
اک ڈھلتا لفظ نگارش کا
اک چہرہ عکس بہاروں کا
اک آئینہ رخساروں کا
اک خیمہ ابر دعاؤں کا
اک سایہ نرم رداؤں کا
اک کھیل پرانا چاہت کا
اک درد بہانہ راحت کا
اک پیڑ گھنیری یادوں کا
اک مہکا باغ مرادوں کا
اک گھر نیچی دیواروں کا
اک زینہ چاند ستاروں کا
اک البم حسن جزیروں کا
اک سرمایہ تصویروں کا
اک تنہا سونا تن من کا
اک چڑھتا دریا جوبن کا
اک جگ مگ منظر یادوں کا
اک جلتا دیپ ارادوں کا
اک طائر دور جہانوں کا
اک صورت گر امکانوں کا
اک دور عجب نادانی کا
اک رنگیں موڑ کہانی کا
اک غول چہکتی چڑیوں کا
اک نرم بچھونا گڑیوں کا
اک شور اجڑتے شہروں کا
اک رنج سمٹتی نہروں کا
اک ڈھلتا سورج بستی کا
اک سونا آنگن ہستی کا
اک تھمتا ساز اذانوں کا
اک بڑھتا شور دکانوں کا
اک راوی اگلے وقتوں کا
اک نوحہ گر خوش بختوں کا
اک مبہم لفظ عبارت کا
اک روشن بول حکایت کا
اک گھیرا گوری بانہوں کا
اک ڈیرا نرم پناہوں کا
اک ٹھہرا پل برساتوں کا
اک جادو کالی راتوں کا
اک ڈھیر لگیا اینٹوں کا
اک تخت ٹھکانہ بیٹوں کا
اک ویرانہ گلزاروں کا
اک ریت نگر آثاروں کا
اک اڑتا رنگ مناروں کا
اک دام فنا کے تاروں کا
اک سناٹا فریادوں کا
اک قہر ستم ایجادوں کا
اک خالی جام حقیقت کا
اک سچا نام محبت کا

تاج ہاشمی

(۱)

میں نہیں چھوڑوں
تیری نگریا
آندھی، پانی، پتھر، باڑھ
چاہے جیٹھ اساڑھ
جیون بیتے یا جگ پلٹے
لوٹ کے آئے گھر پردیسی
اپنا سدا ایہی دن رین
دکھ تکلیف
جہاں سکھ چین

(۲)

سونا چمکے
دمکے مدھم مدھم
کبھی نہ ہووے ماند
بازار میں تیزی
کرے بھاؤ اچھال
گوری کے مانگ کا ٹیکا
کان کے ایرنگ سے
مکھڑا آکاش کا چاند

(۳)

بھور ہوئی پھر
پلک جھپکتے
سورج سر پر آیا
چمکیلی چمکتی دھوپ کی دوپہری
ماتھا گرمایا
آنکھ کھلی معلوم ہوا
دن اتنا بے کار گنوایا
ڈھلتے سمے کے بڑھتے سائے
سانجھ بیلا جھک آئی
اتنے میں پھر گھپ اندھیاری
رین پنکھ پھیلائے
چت کروٹ لمبی تان
سارا جگ سو جائے
سپنوں کا سنسار بسائے

ہدو کا ہاتھی

ذکیہ مشہدی

ہدو نے پیپل کے پتوں کے بڑے بڑے جھنکاڑ رکشے سے اتارے، کثیف کرتے کی جیب سے چند مڑے تڑے نوٹ اور کچھ ریزگاری برآمد کی، احتیاط سے گن کر رکشے والے کا کرایہ ادا کیا، بقیہ رقم واپس رکھی پھر بڑی محنت سے موٹی موٹی ڈالیاں کھینچ کر انھیں حاطے کے اندر لائے۔

ہاتھی نے کسل مندی سے سونڈ دائیں بائیں جھلائی، پھر کچھ تکلف سے بھاری بھرکم پاؤں آگے کو بڑھائے۔

''ارے بیٹا، ذرا رک۔ لے پہلے یہ لے لے، اس سے قبل کہ لوگ تیرا حصہ کھا جائیں۔'' ہدو نے کندھے پر لٹکے ہوئے انگوچھے کے سرے پر بندھی ہوئی پوٹلی کھولتے ہوئے ہاتھی کو محبت سے مخاطب کیا۔ پوٹلی میں چار عدد دوستی روٹیاں تھیں اور کوئی پانچ سات حلوے کی قتلیاں۔

ہاتھی نے قریب آ کر اپنا بھاڑ جیسا منھ کھول دیا تھا۔ ہدو نے چاروں روٹیاں اور حلوہ ایک ساتھ لپیٹ کر ہاتھی کے منھ میں رکھے تو اونٹ کے منھ میں زیرہ والے محاورے میں ذرا سی ترمیم کر دینے کا جی چاہا۔ لیکن ہاتھی نے تاڑ کے پتوں جیسے بڑے بڑے کان جھلے اور املی کے چیاں جیسی ننھی ننھی آنکھوں سے ہدو کو انتہائی ممنونیت اور محبت کے جذبات کے ساتھ دیکھا۔ ہدو نہال ہو گئے۔ ساتھ ہی ان کے دل میں ایک کچوٹ سی اٹھی۔ بیچارا۔ استطاعت ہوتی تو کیا آج اسے وہ ٹوکرا بھر کر حلوہ روٹی نہ کھلاتے؟ یا پھر میوے والا روٹ اور گڑ کی بھیلیاں۔

ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے بیوی چلائیں۔ ''ارے اس کم بخت کو ڈھائی گھڑی کی آئے۔ بچے کھا لیتے حلوہ روٹی جو اس کے پیٹ میں ڈال دیا۔ اس کالے پہاڑ کا بھلا نہ ہو اور بچے محروم رہ جائیں۔''

''ارے بچے ہیں کہ راون کی فوج؟ اپنا حصہ کھا چکے۔ یہ ہمارا حصہ تھا۔ ہم جسے چاہیں دیں۔'' جواب میں ہدو گرجے۔

''ہم جسے چاہیں دیں۔'' بیوی نے منھ ٹیڑھا کر کے ان کی نقل کی۔ شاید انھیں کوئی معقول جواب نہیں سوجھا تھا۔

''نیک بخت اپنی اوقات میں رہا کر۔'' منھ چڑائے جانے سے ہدو کی انا میں کئی سوراخ بن گئے تھے۔ ''صبح تین چار گھروں سے حصے آئے، سب تیرے یہ سپوت اڑا گئے۔ ہم نے ایک نوالہ نہیں کھایا۔ گئے تھے اسحٰق صاحب کے ہاں۔ ان کی اہلیہ خدا انھیں جنت نصیب کرے، بولیں۔ 'سید ہادی حسن آئے ہو تو فاتحہ تمھیں پڑھ دو۔' ہم نے فاتحہ پڑھی تو انھوں نے الگ سے اس کا حصہ دیا۔''

''اوئی نوج مردود ے۔ اسحٰق میاں کی بیوی زندہ، جوان جہان، انھیں کہہ رہا ہے خدا جنت نصیب کرے۔'' ہدو کی بیوی ایسی دہشت زدہ ہوئیں کہ ہاتھی کو حلوہ روٹی کھلا دیے جانے کا غصہ بھی ذرا دیر کو بھول گئیں۔

ہدو نے شان بے نیازی سے ہاتھ ہلایا جیسے مکھی اڑا رہے ہوں۔ ''ارے یہ تو دعا ہے جاہل عورت۔ زندہ کو دینے میں کیا حرج ہے۔ کبھی تو مریں گی اسحٰق میاں کی جورو۔ تم ہمارے لئے ابھی سے دعا مانگا کرو کہ اللہ جنت نصیب کرے۔ بڑے گناہ سمیٹ رہے ہیں۔ اپنے غریب، بے چارے ہاتو کو بھر پیٹ کھانا بھی نہیں دے پاتے۔''

پھر وہی ہاتھی، بلکہ مارے محبت کے غریب بے چارہ ہاتو۔ بیوی کی ایڑی میں لگی چوٹی میں بجھی۔ وہ جھینکیں۔

''بیوی بچوں کا پیٹ تو بھر لو پہلے۔ لٹکے رہتے ہو اس منحوس ہاتھی کی دم میں۔ شب برات کے شب برات فاتحہ خوانی کے علاوہ بھی کچھ کر لیا کرو۔ اور فاتحہ خوانی بھی کیسی۔ جب سے تبلیغی جماعت والوں نے دورہ شروع کیا ہے محلے میں فاتحہ کرانے والے بھی بس دو چار ہی گھر رہ گئے ہیں۔''

''کیوں کریں ہم کچھ اور؟ دادا پردادا کے وقت سے یہی فیلبانی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور فاتحہ کیا ہم کسی لالچ میں کرتے ہیں؟ ارے لوگوں میں عزت ہے۔ سید ہیں ہم، اور راجہ کے فیلبان ہیں۔ کبھی کبھار لوگ کہہ دیتے ہیں فاتحہ خوانی کے لئے۔'' بکتے جھکتے ہدو ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئے۔

''تمھارے دادا پردادا کو بھی کچھ اور نہ ملا تھا کرنے کے لئے، بھلا بتاؤ۔ سادات اور فیل بانی۔'' بیوی نے پھر جل کر منھ مارا۔ ''ارے تمھیں ہی کچھ اور سکھا جاتے۔ ہم تو کہیں اب بھی اس اللہ مارے اس موے راجہ کے بوڑھے بھوت کو وہیں پھینک آؤ۔ پھر کوئی ایسا کام سنبھالو کہ گھر میں چار پیسے جڑیں۔''

ہاتھی کی شان میں کسی قسم کی گستاخی ہدو کو سخت ناپسند تھی بلکہ تقریباً ناقابل برداشت۔ ہاتھی ان کے اجتماعی لاشعور کا حصہ تھے۔ ان کے اجداد میں سے ایک بزرگ سلطنت جون پور کے تیسرے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے

زمانے میں فیل خانے کے مہتمم ہوا کرتے تھے۔ شاہی وقتوں میں یہ ایک بڑا معزز عہدہ تھا۔ ہدو کے ذہن کے نہاں خانوں میں ہاتھیوں کے جھنڈ کے جھنڈ گھومتے پھرتے تھے۔ وہ ان سب کو گومتی کے پانیوں میں نہلاتے، ان کے لئے میوہ اور گڑ بھرے روٹ تیار کراتے، گنوں کی پھاندیاں اترواتے اور پیار سے ان کے سوپ جیسے کانوں میں محبت بھرے نرم شیریں الفاظ یوں اتارتے کہ اڑیل سے اڑیل ہاتھی بھی پالتو کتے کی طرح اٹھ کھڑا ہوتا۔

یہ ہاتھی کے اٹھ کھڑے ہونے کا بھی ایک قصہ تھا۔

چودھویں صدی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ لوگ باگ دہلی کے تاج سے کرکٹ کھیل رہے تھے (اگرچہ کرکٹ اس وقت رائج نہیں تھا)۔ مرکز کو کمزور دیکھ کر جو جہاں گورنر مقرر کیا گیا تھا، فرمانروا بن بیٹھا تھا یا کم از کم بن بیٹھنے کے پھیر میں تھا۔ سلطنت جون پور بھی کئی اور چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کی طرح معرض وجود میں آئی۔ بانی تھے سلطان الشرق ملک سرور خواجہ جہاں جو فیروز شاہ کے وقت میں مشرقی علاقوں کے گورنر بنائے گئے تھے اور نہایت لائق و فائق انسان تھے باوجود اس کے کہ خواجہ سرا تھے۔ صرف پانچ برس کے دور حکومت میں (کارکنان قضا و قدر نے اس سے زیادہ مہلت نہیں دی) جون پور کو دارالسرور بنا گئے۔ آگے چل کر شاہجہاں نے اسے "شیراز ہند" کے لقب سے نوازا۔

اس وقت قصبۂ فیروز شاہی میں ہاتھی گھوڑوں کی ریل پیل ہوا کرتی تھی۔ کوچ کا نقارہ بجتے پر فوجیں نکلتی تھیں۔ دمادم دمادم۔ شفاف سڑکوں پر صبح خاکروب جھاڑو لگاتے اور شام کو بہشتی مشکوں سے چھڑکاؤ کر جاتے۔ ہر طرف سوندھی خوشبو اڑتی۔ عالموں کی پالکیاں نکلتیں، خراماں، خراماں۔ ڈھال گر ٹولہ میں لوہار ڈھالیں بنانے میں مصروف ہوتے اور درسگاہوں میں طالب علم اپنے ذہنوں کو جلا بخشتے۔ درسگاہوں نے ایسی شہرت حاصل کی کہ ایک صدی بعد شیر شاہ جیسا مدبر، ذہین اور رعایا پرور بادشاہ یہاں تعلیم حاصل کرنے آیا (ڈھال گر ٹولے میں اب غریب مسلمان بیڑی بناتے اور ٹی۔ بی میں مبتلا ہو کر قبل از وقت مرجایا کرتے ہیں)۔

دہلی میں طوائف الملوکی کے اس دور میں جناب امیر تیمور صاحبقراں نے بھی اپنی ترچھی آنکھیں ہندوستان کی طرف پھیریں۔ بڑے بڑے شہر بشمول دہلی اجڑ ہوئے جیسے الو بول گیا ہو۔ صاحب علم و اوصاف لوگ عزت اور جان و مال کی حفاظت کے لئے بھاگ بھاگ کر نسبتاً پرانے علاقوں میں اکٹھا ہوئے جن میں جون پور بھی تھا (کہ دارالسرور کے بعد دارالامان بھی قرار دیا گیا تھا)۔

انھیں دنوں علی گڑھ سے ہجرت کر کے جو اس وقت کوئل کے خوبصورت نام سے جانا جاتا تھا ایک باریش بزرگ ایک مسیں بھیگتے نوجوان کے ساتھ (وہ ان کا پوتا تھا) ہاتھی پر سوار جون پور سے تین میل دور موضع فیروز شاہ پور میں وارد ہوئے۔ (جون پور پر انگریز کے قبضے کے بعد کاغذات میں اس موضع کا نام فروشہ پور درج ہوا جسے بعد میں عوام نے پڑوسی پور بنا دیا۔) یہ بزرگ ان مسلمانوں میں تھے جنھوں نے قلعے کے باہر ہندوؤں کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر تیموری سپاہ سے جنگ کی تھی اور شکست یقینی جان کر زن بچہ قتل کر کے جوہر کی رسم ادا کی تھی۔ زندگی تھی، چند لوگوں کی طرح خود بچ گئے اور یہ پوتا بھی، جو ان کے ساتھ جنگ میں ہاتھی پر سوار تھا۔

سید، عالم دین اور نہایت پاک باز ہونے کے سبب وہ بزرگ جون پور میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ اس وقت خواجہ جہاں راہی ملک عدم ہو چکے تھے۔ منھ بولا بیٹا مبارک شاہ تخت پر تھا۔ بزرگ کو مبارک شاہ نے ایک قطعہ آراضی دی جس پر انھوں نے مدرسہ قائم کیا۔ کچھ عرصے بعد ان کا ہاتھی مر گیا تو سلطان نے ہاتھی بھی عنایت کیا۔ اطراف کا ایک بیچ گوتی راجپوت بزرگ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسلام قبول کیا اور اپنی بیٹی ان کے پوتے کے نکاح میں دی۔ بزرگ ہاتھی والے سید صاحب مشہور ہو گئے کہ فیروز شاہ پور سے جون پور آتے تو ہاتھی پر سوار ہو کر ہی آیا کرتے تھے۔ جون پور اب شرقی سلطنت کا صدر مقام تھا۔

سید صاحب کا ہاتھی ایک دن جون پور میں اڑ گیا۔ اٹالہ چوک پر بیٹھا تو بس بیٹھے بیٹھے گھنٹوں کان جھلاتا رہا، اٹھنے کا نام نہ لے۔ لاکھ مہاوت نے آنکس کے ٹھوکے دیئے، پچکارا، اپنا سارا فن آزمالیا لیکن زمین جنبد آسماں جنبد نہ جنبد فیل سید۔ تب ان کے پوتے کے پانچ سالہ بیٹے نے جو ہاتھی پر دادا کے ساتھ سیر کرنے چلا آیا تھا، ہاتھی کے گلے میں ننھے ننھے ہاتھ ڈال کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ ہاتھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ قصہ کچھ ایسا زبان زد خاص و عام ہوا کہ لڑکا بڑا ہوا تو سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے اس کے پرداد کی زمینوں میں اضافہ کر کے اسے فیل خانے کا مہتمم مقرر کیا۔ سید ہادی حسن عرف ہدو میاں کے کرم خوردہ شجرے میں فیل خانے کے مہتمم اور پڑوسی پور کے زمیندار سید سنجر حسین کا نام بالکل صاف لکھا نظر آتا ہے۔

ہاتھی کے پیٹ میں اتنا سارا حلوہ اور اصلی گھی لگی دو دو روٹیاں آنکھوں کے سامنے جاتے دیکھ کر ہدو کی اہلیہ کے کلیجے میں دھواں اٹھا تھا اور اب تک اٹھے جا رہا تھا۔ خالی برتن کھڑ کا کھڑ کا کر وہ مسلسل اپنے غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔ ہدو پر کوئی اثر ہوتا نہ دیکھ کر انھوں نے پیر پٹکے۔ "اب ہم خود جائیں گے پڑوسی پور اور اس کلموہے اللہ مارے ہاتھی کو ہنک کے آئیں گے وہاں۔ کوس کوس کے تھک گئے مرا بھی نہیں۔ اب جائیے وہاں سفیدے کے درخت روندے۔ اس موئے راجہ کے سفیدوں کو کیڑے لگیں، سوکھا مار جائے۔"

یہ سفیدے کے درختوں کا بھی ایک قصہ تھا۔

ہدو کی بیوی کو سفیدے کے درختوں سے سخت چڑ تھی جس میں وہ حق بہ جانب تھیں۔ ان کی زندگی کے منظر نامے پر سفیدے کے درخت لکھے جانے سے پہلے زندگی اتنی بے ہنگم اور تاریک نہیں تھی۔ پڑوسی پور کے زمیندار بھیروں سنگھ کے یہاں ایک خستہ حویلی، کچھ زمینیں اور ایک ہاتھی خاتمۂ زمینداری کے خاصے عرصے بعد تک برقرار تھے۔ راجہ صاحب کا لقب بھی برقرار تھا جو بے وقوف رعیت نے انگریزوں کے زمانے میں ان کے بزرگوں کے ہاتھ میں زمینداری آنے پر انھیں عنایت کیا تھا۔ لیکن اس وقت حویلی نہایت حسین اور بارونق ہوا کرتی تھی۔ ڈیوڑھی پر تین ہاتھی جھولتے تھے جن پر آٹھ ملازم مقرر تھے۔ ان کے خاص مہاوت کی سفارش پر ایک نواں ملازم مقرر کیا گیا۔ یہ ہدو کے پردادا کے والد تھے۔ سید سنجر حسین مہتمم فیل خانہ شاہی اور محض تین ہاتھیوں پر

مشتمل معمولی سے فیل خانے کے ایک معمولی ملازم کے درمیان گومتی میں بہت سارا پانی بہہ چکا تھا۔

راجہ صاحب نے اپنے دوست گیا کے نواب احمد علی خاں سے سبق سیکھا تھا۔ ان کے ہاں ہاتھی کے ساتھ رولس رائس بھی تھی۔ بچپن میں نواب صاحب کے لئے انگریز گورنس ہوا کرتی تھی۔ محل میں بچپن کرے تھے۔ لیکن وہ مرے تو ان کا گھر ایک کوٹھری پر مشتمل رہ گیا تھا۔ ہاتھی اور رولس رائس محل سمیت نہ جانے کن لوگوں کی جیبوں میں سما گئے تھے۔ انگریز گورنس کی جگہ ایک چندھی سی بڑی بی نے لے لی تھی جو پرانے وقتوں کے احسانات نبھانے کے لئے دو وقت روٹی ڈال جایا کرتی تھیں۔ سبزی کافی نہ ہوتی تو نواب صاحب چائے سے روٹی کھالیا کرتے یا صرف اچار سے۔

راجہ صاحب نے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ دو تو امریکہ جا بسے اور ایک باہر سے فلم سازی کی تربیت لے کر بمبئی میں مقیم ہوا اور اشتہاری فلمیں بنانے لگا۔ اپنے پیشے میں نہایت کامیاب بیٹا چند سال پہلے گاؤں آیا تو باپ کو ضد کرکے ساتھ لیتا گیا۔ شکستہ حویلی کی چاردیواری پوری طرح گرا کر ملحق زمین سے اسے ملا دیا اور وہاں سفیدے کے درخت لگوا دیئے کہ یہ ایک نہایت منافع بخش سودا ہے۔ شاگرد پیشہ کی دو کوٹھریوں میں اپنی پسند سے دو جوان اور صحت مند کارندے مقرر کئے، باقی لوگوں کو ہدو اور ہاتھی سمیت نکال باہر کیا۔ راجہ صاحب کو ہاتھی سے بے حد لگاؤ تھا اور ہدو کو اس سے جو محبت تھی وہ اس کے بھی معترف تھے اس لئے ہاتھی کو بیچنے پر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ ہاتھی ہدو کو سونپ کر جون پور میں ایک غیر مقیم ہندوستانی دوست کے بنگلہ نما مکان کے احاطے میں اس کی رہائش کا انتظام کرایا اور ماہ بماہ اتنی رقم بھیجتے رہنے کا وعدہ کیا جو ہاتھی اور ہدو کی کفالت کر سکے۔

اب تھا یہ کہ گاؤں میں حویلی کے شاگرد پیشے میں رہنے کے بہت فائدے تھے۔ پھل پھلاری سبزی ترکاری کی بہتات تھی جو چھوٹی رانی صاحبہ فراخ دلی سے ملازموں میں تقسیم کر دیتی تھیں۔ ہدو کے بچوں کے لئے عید بقرعید میں نئے کپڑے بن جاتے تھے۔ ہدو فصل پر کٹائی اور دائیں میں مدد کر دیتے تو بہت سا نلہ مل جایا کرتا تھا۔ نقدی زیادہ ہاتھ میں نہ آنے پر بھی فراغت کی زندگی تھی۔ جو تین بچے اس دور میں حویلی میں پیدا ہوئے وہ خوب صحت مند تھے۔ جون پور آکر پیدا ہونے والے باقی تین نہایت مریل۔ اب تو تینوں بڑے بچوں کے گال بھی پچک گئے تھے۔ وہ اٹالہ مسجد کے پاس کے اقلیتی ادارے کی چھٹی کے اوقات میں چاردیواری پھلانگ کے اندر گھس جاتے اور گولیاں اور تاش کھیلتے۔ گھر واپس آتے تو ایسے بھوکے ہوتے کہ بس چلے تو ہنڈیا برتن توڑ کے کھا جائیں۔ اس وقت ہدو کی بیوی کا جی چاہتا کہ وہ سفیدے کے درختوں میں آگ لگا دیں یا ہاتھی کی تکا بوٹی کر ڈالیں جو بمبئی سے آنے والی قلیل رقم کا بیشتر حصہ کھا جایا کرتا تھا۔

ایک آدھ مرتبہ بیوی نے تجویز رکھی۔ "ہم ڈھال گر ٹولہ جا کے دیکھ کے آتے ہیں شاید کہیں بیڑی بنانے کا کام مل جائے۔"

ہدو بے حد ناراض ہوئے۔ "اب تم برقعہ اوڑھ کے گلی محلے کے لونڈوں کے درمیان سٹر پٹر کرتی گھوموگی؟ سیدانی ہو ذرا یہ تو سوچو۔"

ایک بار بیوی بھی جواب میں اسی قدر ناراض ہو کر بولیں: "ہم تمہاری طرح کھرے سید نہیں ہیں۔ ہماری اماں پٹھانی تھیں۔ اور پھر کام کرنے میں ذات کیسی؟"

"سید باپ کی بیٹی ہو اور بیوی بھی۔ بس بات ختم۔ اماں سے کیا ہوتا ہے؟ اماں سے نسل نہیں چلا کرتی۔"

"اماں سے نسل چلا کرتی تو بیچ گوتیوں کی بیٹی نے کب کا سیدوں کو راجپوت بنا دیا ہوتا۔ اور آگے جا کر مغلوں کو بھی۔"

بیوی نے حلوہ روٹی کے لئے زیادہ راڑ مچائی تو ہدو نے اس دریدہ دہن عورت سے کچھ دیر فرار حاصل کرنے میں عافیت جانی اور گھر سے نکل گئے۔ جاتے جاتے ایک نظر ہاتھی پر ڈالی جو مزے سے کڑ کڑ کرکے پیپل کی ٹہنیاں چبا رہا تھا۔ حسب دستور پتے دیکھ کر محلے کی دو چار بکریاں بھی آ گئی تھیں اور پتوں پہ منھ مار رہی تھیں۔ ہاتھی ان پر کبھی اعتراض نہ کرتا تھا بلکہ ایک شان بے نیازی سے انھیں یوں دیکھتا جیسے وہ راجہ ہو اور بکریاں اس کی غریب پرجا۔ ایک دوسرے کو سینگوں سے ٹھیلتی بکریوں میں سے ایک دو بکریاں ہاتھی کو دھکے بھی لگا دیتیں تب بھی وہ برافروختہ نہ ہوتا۔ اس کی فراخ دلی کو دیکھ کر ہدو بھی کچھ نہ کہتے۔ اس وقت بھی ایک چھوٹی سی بکری اس کے موٹے موٹے ستون جیسے پاؤں کے بیچ ہو کر پیٹ کے سائبان تلے کھڑی سر جھکائے جلدی جلدی پتوں پر منھ مار رہی تھی۔ ہدو کا دل بھر آیا۔

بھاری دل اور بھاری قدموں سے چلتے ہوئے ہدو اٹالہ چوک پر آکے کھڑے ہو گئے۔ شاندار اٹالہ مسجد سر بلند کئے کھڑی تھی۔ سبک نہیں بلکہ مست ہاتھی کی طرح مہیب، بھاری، پررعب اور مسحور کن۔ ایسا لگتا تھا ابھی یہ مسجد چلنے لگے گی اور اس کے ساتھ کل کائنات چل پڑے گی۔ دمادم، دمادم۔ اور شاہی کا وقت پھر لوٹ آئے گا۔ بارونق اٹالہ چوک پر ایک طرف کو ایک رکشا اکیلا کھڑا تھا۔ رکشے والا کہیں گیا ہوا تھا، شاید چائے پینے یا چائے پی کر پیشاب کرنے یا صبح صبح اسٹیشن سے اچھی کمائی کر لایا تھا اور کہیں بیٹھا پتے کھیل رہا تھا۔ ہدو وہیں کھڑے ہو گئے، کچھ بے دھیان سے۔ ایک برقعہ پوش عورت نزدیک آئی۔

"اے رکشے والے چلوگے؟ حمام دروازے چلنا ہے۔" اس نے ہدو کو مخاطب کیا۔

ہدو کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا۔

"ارے ہم تمھیں رکشے والے لگتے ہیں؟ ہم فیل بان ہیں فیل بان۔ وہ بھی ایسے ویسے نہیں راجہ کے فیل بان ہیں ہم۔ جا کے دیکھ آؤ۔ پرلے محلے میں راجہ صاحب کے رشتے دار کی خالی زمین ہے۔ ہم اسی پر رہتے ہیں۔ وہیں ہمارا ہاتھی کھڑا ہے۔ سب ہمیں جانتے ہیں اور ہمارے ہاتھی کو بھی۔ لگتا ہے تم کسی گاؤں سے نئی نئی آئی ہو۔"

عورت اس بوچھار سے گھبرا گئی۔ اسے یہ شخص کچھ سنکی محسوس ہوا۔ اس نے تیز تیز قدم بڑھا کر سٹک لینے میں عافیت سمجھی۔ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے

ہدو لوٹ آئے۔ عورتوں کے پیچھے لگنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ جب ان کا دل زیادہ دکھتا تو وہ ہاتھی سے باتیں کر کے جی ہلکا کرتے۔ اس وقت انھیں بڑا صدمہ پہونچا تھا۔ وہ ہاتھی پہ چڑھ گئے اور اس کی گردن سہلا سہلا کے کہنے لگے:

"سنا بیٹا۔ ایک پگلی سی عورت تھی، پاگل نہیں تو سنکی ضرور رہی ہوگی۔ ہمیں رکشے والا سمجھ رہی تھی۔ ارے ہمارے پاس رکشا کھڑا تھا تو ہم رکشے والے ہو گئے؟ ہم تو فیل بان ہیں فیل بان۔"

ہاتھی نے بڑے بڑے کان جھل کے مکھیاں اڑائیں۔

"دیکھا، ہمارا بیٹا بھی کہہ رہا ہے کہ اور نہیں تو کیا۔ سنکی نہیں پوری پاگل رہی ہوگی۔ چل بیٹا گومتی پر چل کے تجھے نہلا لائیں۔ بڑی گرمی ہے"۔ بوڑھے ہاتھی نے السائی ہوئی آنکھیں بند کیں، پھر کھولیں جیسے کہہ رہا ہو، "اب تمھارا ہی جی چاہ رہا ہے تو لے چلو۔ چلتے ہیں۔"

تیکھے نقوش اور جلی جلی سی گوری رنگت والے ہدو نے اٹالہ سے کچھ دور فیروز شاہی قلعے کی چڑھائی پر ہانپتے کانپتے رکشا آگے بڑھایا تو وہ عورت انھیں بے تحاشا یاد آئی جس نے کچھ عرصہ پہلے انھیں رکشا والا سمجھ کر حمام دروازہ چلنے کے لئے کہا تھا۔ وہ یقیناً کوئی پچھل پیری تھی اور اس کی زبان پر کالا دھبہ بھی تھا۔ لیکن کالی زبان تو ہدو کی بیوی کی بھی ہوگی جو ہاتھی یوں کھڑا کھڑا مر گیا تھا ۔ بے چارہ۔ لیکن موت کا ذائقہ تو ہر ذی روح کو چکھنا ہے، ہاتھی ہو یا چونٹی اور مرنے کے لئے صرف ایک وجہ کافی ہے، پیدا ہونا۔ اور موت اور پیدائش ان دونوں کے علاوہ اس دنیا میں کچھ حتمی نہیں ہے۔ اور پھر یہ کہ ہاتھی خاصا بوڑھا ہو چلا تھا۔ آدھا پیٹ کھا کر زندہ رہنے والے انسانوں کی طرح زیادہ دن زندہ رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن ہدو کی تسلی کے لئے ان میں سے کوئی بھی حقیقت کافی نہیں تھی۔ وہ بلک بلک کر رویا کرتے تھے۔ اس قلیل آمدنی کا ذریعہ ختم ہو جانے کی وجہ سے نہیں، بلکہ ہاتھی کے فراق میں۔ نہایت ایمانداری کے ساتھ انھوں نے راجہ صاحب کو ایک پوسٹ کارڈ لکھوا کر اس کی اطلاع دے دی تھی۔ انھوں نے ہدو کو کچھ یک مشت رقم بھیجی اور ایک جوڑا کپڑا۔ یہ ان کے لئے ضعت کا قائم مقام تھے اور ہاتھی کا آخری تحفہ۔

ساری رقم خرچ ہو چکی تھی۔ مجبوراً ہدو حاجی رضا علی کے یہاں گئے۔ ان کے یہاں رکشے چلا کرتے تھے اتفاق سے ایک کام چور ٹی بی کے مریض رکشے والے کو انھوں نے حال ہی میں چھٹی دی تھی۔ اس کا رکشا انھوں نے ہدو کو تھما دیا۔

شرمسار اور رنجیدہ ہدو جب پہلے دن گردن جھکا کر اٹالہ کے رکشا اسٹینڈ پر کھڑے ہوئے تو ان کا دل بالکل اچاٹ تھا۔ انھوں نے یاد کیا کہ ابھی کچھ دن پہلے ان کے پاس ہاتھی تھا۔ سچ مچ کا ہاتھی۔ اور ان کے شجرے میں کہیں سید سنجر حسین تھے جو شاہی کے وقتوں میں فیل خانے کے مہتمم ہوا کرتے تھے اور "شیراز ہند جون پور" کے مصنف سید اقبال حسین کا کہنا تھا کہ اس وقت شاہی فیل خانے میں ہاتھیوں کی تعداد کم از کم چھ سو ضرور تھی۔

ثبوت کے طور پر ہاتھی کے دانت ان کے گھر کی کچی دیوار پر آویزاں تھے اور شجرہ ایک ٹوٹے ہوئے بکس میں محفوظ تھا ☆☆☆

صبح کو ملاقات

علم الدین شیخ

کبھی چپ چپ سی کبھی کچھ گنگناتی
صبا ڈولتی ہوئی آتی ہے
میرے سینے سے لگ جاتی ہے۔ میں
اسے اپنی بانہوں میں بھر لیتا ہوں
اس کی اڑتی ہوئی زلفیں سنوارتا ہوں
جب جب بھی ہوا مجھ سے لپٹتی ہے
تو کہتی ہے، کیا سوچا کرتے ہو تم؟
کیوں کھوئے کھوئے سے رہتے ہو تم؟
پوچھو گے نہیں،
کس کس سے مل کر آئی ہوں میں؟
کون ہیں، کیسے ہیں وہ؟
کیا کرتے، کیا کہتے ہیں وہ؟
میں مسکرا کر اس کی آنکھیں چوم لیتا ہوں
پھر اپنی بانہیں پھیلا دیتا ہوں۔
وہ جاتے جاتے
پیچھے مڑ کر مجھ سے کہتی ہے:
دیوانے ایسے ہی ہوتے ہیں
تم جیسے۔

عبدالماجد دریابادی

ایک مختصری لیکن صاف ستھری محفل مشاعرہ لکھنؤ میں آج سے پچاس ساٹھ سال قبل آراستہ ہے۔ طرح کی زمین ہے، "ازل سے"، "کل سے"۔ ایک شاعر کے سامنے جب شمع آئی تو مطلع ارشاد ہوا

الجھا نہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے
مانگی نہ مدد دل نے مرے طول امل سے

اور داد کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں، کلام میں بانکپن تھا ہی اس غضب کا۔ اور اس شعر پر تو محفل لوٹ لوٹ گئی

ان کی نگہ مست ہے لبریز معانی
ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے

نگاہ یار کی مستی بہتوں نے باندھی ہے اور شراب سے اسے تشبیہ بارہا دی جا چکی ہے۔ حافظ کی غزل تک اس کا رتبہ پہنچا دینا یہ اسی شاعر کی جدت طبع کا کرشمہ ہے اور عجب کیا جو خود خواجہ حافظ کی روح بھی یہ اچھوتی داد سن کر وجد میں آ گئی ہو۔ اور جب اس شعر کی نوبت آئی

حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تلک چپ
ہیبت ترے پیغام کی ظاہر ہے اجل سے

اور معاً بعد اس شعر کی

درجہ متحیر کا ہے بیخود سے فزوں تر
ہے روح کو امید ترقی کی اجل سے

تو جو اہل دل تھے ان کی آنکھوں میں کچھ بوندیں آئیں اور اہل معرفت کی زبان پر بے ساختہ "مرحبا" اور "سبحان اللہ" کے نعرے جاری ہو گئے۔ لیکن شاعر نے جب اس غزل کے ایک شعر کا مصرع پڑھا کہ ؏

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے

تو سامعین میں ایک بڑے گہرے مذہبی شخص خان بہادر منشی اطہر علی کاکوروی موجود تھے، ان کے تیور پر کچھ بل سے پڑنے لگے کہ لیجیے مذہب سے بھی شوخی ہونے لگی۔ حساس شاعر معاً بھانپ گیا اور جھٹ پہلے مصرعے کو مکرر پڑھ کر پورا شعر یوں سنایا

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے
کس حسن سے، یہ بھی تو سنو، حسن عمل سے

شعر کا زبان سے ادا ہونا تھا کہ داد و تحسین کی بارش ہر طرف سے ہونے لگی اور خان بہادر نے تو بے اختیار اٹھ کر شاعر کو گلے لگا لیا۔ ان شاعر صاحب کو آپ نے پہچانا؟ یہی تھے سید اکبر حسین اکبر۔ اس وقت غالباً منصفی کے عہدے پر تھے۔ آگے چل کر خفیفہ کے جج اور پھر سشن جج ہوئے جو اس زمانہ کے لحاظ سے ہندوستانوں کی گویا ترقی کی معراج تھی۔ خان بہادر ہوئے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے فیلو ہوئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کلیات کی تین جلدوں کے مصنف۔ اپنے وقت کے ایک نامور ترین شاعر، اپنے رنگ میں فرد۔ برجستگی اور بدیہہ گوئی کے بادشاہ تھے۔ ایک نمونہ تو آپ ابھی سن چکے۔ معنی آفرینی گویا ان کا حصہ تھی۔ مضمون ہر قسم کے جیسے ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ جب جس مضمون کو چاہا بہترین لفظی صنعت کاری کے ساتھ ادا کر دیا۔ سوچنے میں معمولی بات چیت کے وقت ہم کو آپ کو کچھ نہ کچھ وقت لینا ہی پڑتا ہے۔ انھیں شعر کہتے اتنی دیر بھی نہ لگتی۔

اس نیاز مند کو مرحوم کی عمر کے آخری نو دس سال ذاتی نیاز مندی اور حضوری کا اچھا خاصا اتفاق رہا۔ یہ بات اسی تجربے کی بنا پر کہتا ہوں۔ حضرت اکبر بوڑھے ہو چکے تھے، عمر ۶۴، ۶۵ سال زائد ہو چکی تھی۔ ذہانت، شوخی، برجستگی، معنی آفرینی، لطافت زبان، حسن بیان، یہ سب اوصاف اس وقت بھی جوان تھے۔ بات میں بات پیدا کرتے اور بعض دفعہ بے بات کی بھی بات پیدا کر لیتے۔ گفتگو میں خود چہتے بہت کم تھے، دوسروں کو ہنساتے بہت زیادہ تھے۔ اور ہنساتے ہنساتے کبھی رُلانے بھی لگتے۔ کوئی چوٹ ایسی دل پر لگا دیتے کہ سننے والے کا دل درد سے بھر آتا۔ راگوں میں سنا ہے کوئی دیپک راگ بھی ہوتا ہے جو ساز کی جگہ سوز پیدا کر دینے کی تاثیر رکھتا ہے۔

پر گوئی گویا ان پر ختم تھی۔ تین کلیات تو صرف چھپے ہوئے ہیں۔ باقی جتنا حصہ چھپنے سے رہ گیا ہے وہ ایک یا ڈیڑھ کلیات سے کم نہیں۔ اور وہ شعر جو سخن گو اکبر نے کہے اور اکبر سخن سنج کو چھپنے کے قابل نظر نہ آئے، ان کی تعداد ان کے علاوہ۔ اصل ناموری غزل گوئی میں نہیں، نظم گوئی میں پائی، بلکہ اس کی بھی ایک خاص صنف یعنی ظرافت میں۔ لیکن غزلیں بھی جناب اکبر کی کسی سے کم نہیں۔ کم نہ تعداد و حجم کے لحاظ سے اور نہ حسن و معنویت کے اعتبار سے۔ ۱۰ منٹ کی مہلت میں اتنی گنجائش کہاں، ورنہ اکبر کے عاشقانہ کلام کے کثرت سے نمونے پیش کر کے فیصلہ خود آپ ہی کے ذوق سلیم پر چھوڑ دیا جاتا۔

اکبر مذہب کے بڑے حامیوں اور مشرقیت کے خاص طرف داروں میں تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب "رفارم" یا اصلاح و تجدد کا جھنڈا سید احمد خان کے ہاتھ میں تھا۔ اکبر ان کے معاصر تھے، گو سن میں ان سے کہیں چھوٹے، اور علی گڑھ میں خود منصف رہ کر رفارم کے کرشمے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ کلام میں خوب خوب چٹکیاں لیتے جاتے ہیں لیکن چٹکیاں بھی عموماً گدگدیوں کے رنگ میں ہوتی ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

حاضر ہوا میں خدمت سید میں ایک رات
افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات

بولے وہ مجھ سے ودین کی اصلاح فرض ہے
میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

کہیں کہیں یہ ظرافت ہلکی سی تشریت بھی پیدا کر لیتی ہے، جیسے یہ شعر۔

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

''گزٹ'' کے معنی سرکاری گزٹ تو بالکل ظاہر ہیں۔ تلمیح یہ ہے کہ سرسید کے ہفتہ وار اخبار کا نام بھی ''علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ'' تھا۔ یہ شعر ایک غزل کا ہے اور غزل کا مطلع ہے۔

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا
بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا

یہاں تک جب آپ آگئے ہیں تو ایک آدھ شعر اور بھی اس غزل کے ہو جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔

گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش
طالب زمزمۂ بلبل شیدا نہ ملا
بزم یاراں سے پھری باد بہاری مایوس
ایک سر بھی اسے آمادۂ سودا نہ ملا

اور ایک شعر مخصوص اکبری رنگ کا۔

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا

سیاسیات میں اکبر کا مذاق وہی تھا جو ہر خوددار مشرقی ہونا چاہیے۔ لیکن یہ میدان کے سپاہی اور اکھاڑے کے ڈنڈ پیل پہلوان نہ تھے، مجلس ادبا کے مسند نشین اور بزم ظرافت کے میر تھے۔ زبان کھولتے تو میٹھے میٹھے بولوں میں ایک ایک پھلجھڑی چھڑا جاتے۔ ہنسی کی کھلکھلاہٹ سننے والوں کی پیشانیوں پر شکن قائم ہی کب رہنے دیتی۔ ایک رباعی کے پہلے مصرعے میں فرماتے ہیں ؎

انگریز ہر ایک فن میں ممتاز بھی ہیں

کام کے مصرعے آخر کے دو ہیں:

بابو کو نچا دیا جو چابی دے کر
اس سے یہ کھلا کہ دگی باز بھی ہیں

''بابو'' کیا خوب! ایک طرف بنگالی بابو بلکہ کل انگریزی داں ہندوستانی، اور دوسری طرف دوکانوں پر بکنے والے چینی کے کھلونے، کوک سے ناچنے والے! اور چابی کی مناسبت سے دوسرے مصرعے میں ''کھلا'' کیا خوب، کیا خوب! اس چابی سے ''کھولنے'' پر تو شاید لکھنؤ کے بڑے بڑے استاد بھی ''بند'' ہو جائیں۔

اکبر ذاتی حیثیت سے بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ ہر بڑے چھوٹے سے جھک کر ملنے والے، کسی کی دل شکنی نہ گوارا کرنے والے، اور نماز و قرآن کے گویا عاشق۔ ایسا عشق جو اچھے اچھے عالموں درویشوں میں بھی کمتر ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ آج ۹ ستمبر ان کی برسی کی تاریخ ہے۔ فاتحۂ خیر پر اس ذکر خیر کو ختم کیجیے ☆☆☆

انجمن ترقی اردو (ہند)

کی چند مطبوعات

ہم سفروں کے درمیان	شمیم حنفی	۱۵۰/-
سلطان محمد قلی قطب شاہ	اسلم پرویز	۱۵۰/-
مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نادر مخطوطات	سید محمود حسن قیصر	۸۰/-
ڈاکٹر بشیر بدر کی شاعری (دیوناگری)	ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی	۶۰/-
ہماری رسمیں	ڈاکٹر نریش	۸۵/-
کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی	۸۵/-
خواجہ غلام السیدین	پروفیسر آل احمد سرور	۲۲۰/-
خواجہ غلام السیدین (مضامین اور تقریریں)	خلیق انجم	۱۰۰/-
اقبال یورپ میں	ڈاکٹر سعید اختر درانی	۲۵۰/-
لغات روزمرہ	شمس الرحمن فاروقی	۲۰۰/-
کلاسیکی ادب کی فرہنگ	رشید حسن خاں	۳۷۵/-
علی سردار جعفری کے خطوط	خلیق انجم	۱۷۵/-
اردو ہندی ڈکشنری	انجمن ترقی اردو (ہند)	۱۷۵/-
اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری	مولوی عبدالحق	۳۷۵/-
بیسویں صدی کی اردو شاعری	اوصاف احمد	۳۰۰/-
سحر البیان (میر غلام حسن حسن دہلوی)	رشید حسن خاں	۳۲۵/-

اردو گھر

اردو گھر مارگ، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ادم پربھاکر

سر پہ دست ہوا ہے صدیوں سے
غیب کا آسرا ہے صدیوں سے

صرف دو پاؤں اور وسیع زمیں
یہ بھی اک معجزہ ہے صدیوں سے

ہے کم و بیش نیلگوں ہر شے
درد کا سلسلہ ہے صدیوں سے

جیسے پانی ہوا، ہوا پانی
مجھ میں تو جتلا ہے صدیوں سے

سننے والا ہو کوئی تو سن لے
عشق نغمہ سرا ہے صدیوں سے

کچھ نظارے ہیں کچھ نظر باقی
اور کچھ کوس کا سفر باقی

رہ گیا ہے کتاب میں دن کی
شام کا باب مختصر باقی

اس خزاں میں بھی کچھ مہکتا ہے
دل ہے باقی ابھی جگر باقی

خاک ہی خاک ہوں مگر جھومت
عشق کا ہے ابھی شرر باقی

وقت رخصت پلٹ کے برسی جو
ہے نگاہوں میں وہ نظر باقی

ڈھل گئی تھی جو تیرے اشکوں سے
خط میں وہ ہی ہے اک سطر باقی

کسمساتے ہیں پاؤں کے چھالے
ہے ابھی بھی کوئی سفر باقی

شاہین عباس

پہلے تو مٹی کا اور پانی کا اندازہ ہوا
پھر مجھے اپنی پریشانی کا اندازہ ہوا

اے محبت تیرے دکھ سے دوستی آساں نہ تھی
تجھ سا ہو کر تیری ویرانی کا اندازہ ہوا

عمر بھر ہم نے فنا کے تجربے خود پر کیے
عمر بھر میں عالم فانی کا اندازہ ہوا

اک زمانے تک بدن بے خواب بے آداب تھے
پھر اچانک اپنی عریانی کا اندازہ ہوا

تیرے ہاتھوں جل اٹھے ہم تیرے ہاتھوں جل بجھے
ہوتے ہوتے آگ اور پانی کا اندازہ ہوا

صورتیں بگڑیں تو اپنی حالتوں میں آئے ہم
آئینہ ٹوٹا تو حیرانی کا اندازہ ہوا

چار سمتوں میں نظر رکھتا ہوں میں چاروں پر
تیر کب لوٹ کے آئیں گے کماں داروں پر

صبح اٹھے تو قدم کوئلہ تھے اور ہم تھے
نیند میں چلتے رہے ہجر کے انگاروں پر

داستاں میں جہاں اک دائمی دن ہوتا تھا
اب وہاں شام اتر آتی ہے کرداروں پر

نقش عبرت کا سب اسباب اٹھایا خود ہی
ہم نے یہ کام بھی چھوڑا انھیں دیواروں پر

سایہ داری کی روایت بھی کہاں آ پہنچی
موج خوں چھاؤں کیے رکھتی ہے تلواروں پر

اب کھلا خواب میں کچھ خواب ملاتا تھا میں
خاک اڑاتا تھا میں سیاروں کی سیاروں پر

رات کے ٹوٹتے تاروں میں ہمیں رکھا گیا
ہمیں پرکھا گیا گرتے ہوئے معیاروں پر

میں دنیا کی خاطر ہوں دل ہونے والا
مرا عہد ہے مستقل ہونے والا

خدا ایسا تنہا کسی کو نہ رکھے
کوئی بھی نہ ہو جب مخل ہونے والا

پس آب و گل میں دکھا بھی چکا ہوں
تماشا سر آب و گل ہونے والا

سفینے بھرے آ رہے ہیں برابر
ہے دریا کہیں منتقل ہونے والا

وہی ایک ہم ہیں وہی ایک تم ہو
یہ عالم نہیں معتدل ہونے والا

لہو کے کنارے بھی زد پر ہیں دونوں
یہ کیا، زخم ہے مندمل ہونے والا

مری راکھ دیکھو تو کیا مطمئن ہے
میں اک شخص تھا مشتعل ہونے والا

تین غزلیں

شاہین عباس

تجھ میں کتنا گم ہوں اور کتنا نظر آتا ہوں میں
آتا جاتا آئینوں کو منھ دکھا جاتا ہوں میں

اس کے بعد اگلی قیامت کیا ہے کس کو ہوش ہے
زخم سہلاتا تھا اور اب داغ دکھلاتا ہوں میں

نقش بر دیوار ہوں اور بات کر سکتا نہیں
ایسی حالت میں بھی جو کہتا ہوں منواتا ہوں میں

خاکساری ہی نہیں یہ غم گساری بھی تو ہے
پاؤں رکھتا ہوں جہاں مٹی اٹھا لاتا ہوں میں

حرف کے آوازۂ آخر کو کر دیتا ہوں نظم
شعر کیا کہتا ہوں خاموشی کو پھیلاتا ہوں میں

دن ڈھلے کچھ دیر ڈھل جاتا بھی ہوں سورج کے ساتھ
شام ہوتے ہی چراغوں سے ابھر آتا ہوں میں

دعا ہم زاد ہو سکتی دیا ہم راز ہو سکتا
میں ویرانی پہ اتنا تو اثر انداز ہو سکتا

یہ میری خامشی اس انتہا کی خامشی ہوتی
کسی بھی شام کا میں نقطۂ آغاز ہو سکتا

میں بے تابانہ ان گلیوں میں پھرتا یہ مرا حق تھا
مری دستک پہ شہر خواب کا در باز ہو سکتا

یہ دن اور رات کس جانب اڑے جاتے ہیں صدیوں سے
کہیں رکتے تو میں بھی شامل پرواز ہو سکتا

کم از کم خاک و خوں کی گم شدہ کڑیاں ہی مل جاتیں
سر دنیا یہ دل اتنا تو در انداز ہو سکتا

خواب کو خوش نما بناتے ہوئے
رات گذری دیا بناتے ہوئے

میرے لہجے سے خون رسنے لگا
خامشی کو دعا بناتے ہوئے

شہر کے شہر کر دیئے مسمار
اپنا خلوت کدہ بناتے ہوئے

اپنی سی خاک اڑا کے بیٹھ رہے
اپنا سا قافلہ بناتے ہوئے

زال دنیا کو کیا صفائی دیں
کیا بنایا ہے کیا بناتے ہوئے

خاک اور خون جمع کرتا ہوں
دشت مٹتا ہوا بناتے ہوئے

اک چنبیلی کے منڈوے تلے

اکرام خاور

مفتی شہر کے بنگلے سے متصل فٹ پاتھ سے ہوتا ہوا
وقت گذرتا چلا جاتا ہے
اور وہ کھڑی رہتی ہے
دیکھتی، بھرپور نگاہوں سے تولتی ہوئی
گذرتے ہوئے وقت اور راہگیروں کو
گل مہر کی آگ لگی شاخوں تلے
بے باک نگاہوں کے تیز گرم چاقو سے کھرچ کھرچ کر
کچھ تلاش کرتی ہوئی
کبھی بے اعتمادی سے ساری کے پلو میں انگلیاں مروڑتی
پسینے اور شرم سے شرابور
سخت فٹ پاتھ پر کھڑی کھڑی
زمین میں زندہ دھنستی ہوئی

کبھی کبھی تو وہ کھڑی رہتی ہے
بڑی دیر تک
ستاروں کے ڈھل جانے تک
سمندری ہوا کے معتدل ہو جانے تک
چاند کے گرد بنتے ہوئے ہالے کے دبیز ہو جانے تک
مندر کے پجاری کے سو جانے تک
آسمان سے مسلسل برستی ہوئی نادیدہ بارش کے
تھم جانے تک

رات کی آخری ٹرام کو الوداع کرتی ہے وہ
اکثر
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے
گذرتا ہے کوئی اس کی بغل سے
اک لمحے کو ٹھہر کر دیکھتے ہیں
دونوں اک دوسرے کو
گہری محبت اور ہمدردی سے
شب زادیٔ شہر
اور
شاعر

غلام مصطفیٰ فراز

فلک فلک میں اڑوں پاؤں میں زمیں بھی رہے
زباں سے ہاں بھی کہوں ذہن سے نہیں بھی رہے

ترے سوا بھی کسی اور کی زمین تھی کیا
چمن میں دشت میں صحرا میں یا کہیں بھی رہے

مری ہی خاک سر طور ہم کلام بھی ہو
مری ہی خاک میں آذر پنہ گزیں بھی رہے

وہ جس کے در پہ ہے یہ کائنات سجدہ ریز
اسی کے در پہ خمیدہ مری جبیں بھی رہے

نہیں یہ بات تو ممکن نہیں کسی صورت
کہ لامکاں بھی رہے دل میں اور مکیں بھی رہے

وہ جس کی لہر پہ لہرائے عالم امکاں
اسی کو حق ہے وہی زیر آستیں بھی رہے

ہنر سے جائے کسی کے نہ فن سے جاتا ہے
لہو کا داغ کہیں پیرہن سے جاتا ہے

بصد ادا نگہ سیم تن سے جاتا ہے
جگر کے پار ہر اک تیر کن سے جاتا ہے

نمود تیغ بدن معرکے کا جوہر ہے
دکھا کے پیٹھ کہیں کوئی رن سے جاتا ہے

رگوں میں سوز غم عشق سے لہو ہے رواں
سو وحشی آگے نکل کر ہرن سے جاتا ہے

مژہ پہ ہوتا ہے روشن چراغ تنہائی
اسیر زلف اگر انجمن سے جاتا ہے

نہ کوئی تیشہ نہ سنگ گراں نہ جوئے شیر
جنون عشق دل کوہکن سے جاتا ہے

غلام مصطفیٰ فراز

ایک زمانے میں جب ہم تم دونوں ہی جوشیلے تھے
اس دنیا کے سارے موسم ٹھنڈے تھے برفیلے تھے

دیکھنے والے مال و زر کیا جان لٹایا کرتے تھے
خد و خال بدن کے کتنے مہنگے تھے خرچیلے تھے

سامنے اس کے جاتے تھے تو مہر بہ لب رہ جاتے تھے
باہر سے ہم شوخ بہت تھے اندر سے شرمیلے تھے

قسمت کا یہ کھیل بھی دیکھو کھیل کی جب تک عمر رہی
کوزہ گر کے چاک سے اترے سارے کھلونے گیلے تھے

پھول سی باتیں پھول سا لہجہ پھول سے لب تھے پھول سے گال
لیکن شاخ بدن کے سارے خار بہت نوکیلے تھے

ان آنکھوں میں صحرا کی اب ریت چمکتی رہتی ہے
ان آنکھوں میں جن آنکھوں کے خواب بہت چمکیلے تھے

کیف و سرور و مستی ہم سے خود میں ہیں میخانہ ہم
شیشہ ساغر ساقی مینا جام و سبو پیمانہ ہم

ایک ذرا سی دیر ہوئی کیا اس کی گلی تک جانے میں
تنہائی کی شکل میں اب تک بھرتے ہیں جرمانہ ہم

جانے کون سا جادو تھا اس جھیل سی گہری آنکھوں میں
دل جیسی نایاب سی شے تک دے آئے نذرانہ ہم

جس نے چاہا جیسا چاہا جوڑ لیا اک رشتہ پھر
عشق میں تیرے بھول گئے جب اپنا اور بیگانہ ہم

روئے زمیں کا اک اک منظر اپنی نظر کے دم سے ہے
صحرا اور سمندر ہم ہیں گلشن اور ویرانہ ہم

رفتہ رفتہ مٹ جائیں گے نقش ہماری ہستی کے
دھیرے دھیرے ہو جائیں گے دنیا میں افسانہ ہم

اسلم محمود

جل رہا ہوں پہ عجب رنگ وہاں ہے میرا
آسماں جس کو سمجھتے ہو دھواں ہے میرا

لے گئی باندھ کے وحشت اسے صحرا کی طرف
ایک دل ہی تو تھا اب وہ بھی کہاں ہے میرا

اپنا ہی زورِ تنفس نہ مٹا دے مجھ کو
ان دنوں زد پہ مری خیمۂ جاں ہے میرا

اب افق تا بہ افق میں ہوں ہر آئینے میں
جیسے ہر سمت و جہت عکس رواں ہے میرا

رک گیا آ کے جہاں قافلۂ رنگ و نشاط
کچھ قدم آگے ذرا بڑھ کے مکاں ہے میرا

ذرۂ خاک بھی ہوتا ہے کبھی بارِ گراں
کبھی لگتا ہے کہ یہ سارا جہاں ہے میرا

رنگ سارے اپنے اندر رفتگاں کے ہیں
ہم کہ برگ رایگاں نخل زیاں کے ہیں

شیشۂ عمر رواں سے خوف آتا ہے
عکس اس میں ساعت کم مہرباں کے ہیں

ہم کو کیا لا حاصلی ہی عشق میں گر ہو
ہم تو خوگر یوں بھی کار رایگاں کے ہیں

خاک تیرے کوچے کی اب پوچھے ہے ہم سے
نام کیا ہے کیا نسب ہے ہم کہاں کے ہیں

ہم کو کیا ارض و سما کے ان خزانوں سے
ہم تو عاشق ایک اسم جاوداں کے ہیں

کیا گردشوں کے حوالے اسے چاک پر رکھ دیا
کہ بننے بگڑنے کا ہر فیصلہ خاک پر رکھ دیا

مجھے قصرِ تعبیر کی اس نے سب کنجیاں سونپ دیں
مگر چھین کر خواب آنکھوں سے افلاک پر رکھ دیا

سوا راکھ ہونے کے اب کوئی چارہ بچا ہی نہیں
شرارِ ہوس کس نے یہ میرے خاشاک پر رکھ دیا

کوئی ہے جو گرداب غم سے بچائے ہوئے ہے مجھے
کہ اک مہرباں ہاتھ پھر چشم نمناک پر رکھ دیا

کوئی کام اسلم بنا ہی نہیں وحشتوں کے بغیر
جلا کر چراغِ جنوں طاقِ ادراک پر رکھ دیا

اسلم محمود

مژہ پہ خواب نہیں انتظار سا کچھ ہے
بہار تو نہیں عکس بہار سا کچھ ہے

مجھے ملا نہ کبھی فرش گل پہ بھی آرام
یہی لگا کہ کہیں نوک خار سا کچھ ہے

تمام عمر جسے میں عبور کر نہ سکا
درون ذات مرے بے کنار سا کچھ ہے

خیال وخواب ہوئے سب وصال کے لمحے
نظر میں صرف چمکتا غبار سا کچھ ہے

یہ حال ہے کہ ہواؤں سے الجھا جاتا ہوں
لہو میں اب کے عجب انتشار سا کچھ ہے

گذر گئی مجھے چھو کر کسی خیال کی رو
افق سے تابہ افق رنگ زار سا کچھ ہے

ہر رنگ طرب موسم و منظر سے نکالا
اک راستہ پھر سعی مکرر سے نکالا

چلنے لگی ہر سمت سے جب باد خوش آثار
اک اور بھنور ہم نے سمندر سے نکالا

دیتی رہی آواز پہ آواز یہ دنیا
سر ہم نے نہ پھر خاک کی چادر سے نکالا

آثار نظر آئے نہ سیرابی دل کے
تھک ہار کے سودائے نمو سر سے نکالا

بے کیفیت و رنگ نظر آئی جو دنیا
موسم نیا اک اپنے ہی اندر سے نکالا

ہم وہ آوارہ کہ جو دشت نہ گھر کے لئے ہیں
جانے پھر کون سی دنیائے دگر کے لئے ہیں

جبر موسم کے ہیں جتنے بھی شجر کے لئے ہیں
ان کو کیا اس سے جو بیتاب ثمر کے لئے ہیں

رونقیں بھی تو بجھا دیتی ہیں آنکھیں اکثر
کچھ نظارے ہیں کہ قاتل جو نظر کے لئے ہیں

راس آتی ہے بھلا ان کو کہاں نان جویں
لوگ زندہ یہ فقط لقمۂ تر کے لئے ہیں

تم تو افلاک سے تاروں کی خبر لے آئے
ہم پریشان ابھی سمت سفر کے لئے ہیں

جہاز پر کیا ہوا

انور قمر

موٹر ویسل گاندھی (Motor Vessel Gandhi) نام کا جہاز صوبہ گجرات کی مشہور بندرگاہ کانڈلہ سے صبح سات بجے صوبہ بنگال کے تاریخی شہر کلکتہ کی جانب روانہ ہوا تھا۔ بحیرۂ عرب کی موجوں میں ہلکا سا تلاطم تھا، ذرا تیز ہوا بہ رہی تھی، اکا دکا سمندری پرندے جہاز کا طواف کرتے اب بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ گیارہ بج چکے تھے۔ کپتان عرش الرحمان اور چیف آفیسر بمل دت کے درمیان دبے دبے سے غصے کے ساتھ بحث ہو رہی تھی۔

بمل دت کہہ رہا تھا ''سر! کیا آپ نے شنڈلرز لسٹ (Schindler's List) نہیں دیکھی؟''

کپتان نے جہاز کی چرخی کو کسی قدر بائیں کو موڑتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہم تم دونوں ہی نے ساتھ دیکھی تھی، غالباً کلکتہ کے میٹرو تھیٹر میں، مگر اس فلم کا ہماری اس بحث سے کیا تعلق؟''

''تعلق ہے صاحب اور لازماً ہے۔ کیا اس میں شنڈلر کے نائب نے جو مذہب کے اعتبار سے یہودی تھا اپنے یہودی بھائیوں کی جان نہیں بچائی تھی؟''

''یقیناً بچائی تھی، مگر شنڈلر کو ان کی جانوں کا بھاری تاوان بھی تو ادا کرنا پڑا تھا۔'' کپتان نے چرخی کو راست وضع پہ قائم رکھتے ہوئے کہا۔ پھر کچھ رک کر بولا:

''اگر وہ نازیوں کو بصورت جنس یا نقد اس قدر بھاری تاوان ادا نہ کرتا تو یقیناً کئی یہودی نظر بندی ڈیروں میں مار دیے جاتے۔''

''ہاں صاحب یہی تو میں کہہ رہا ہوں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے نہ ایک ہندو کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں کہ آپ انھیں کلکتہ لے چلیے۔ وہاں دیکھیں گے کہ وہاں کی مارکسی حکومت ان کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ وہ انھیں پناہ میں لے لے گی۔''

ابھی کچھ دیر پہلے کوارٹر ماسٹر شمسی نے آ کر اطلاع دی تھی کہ جہاز پر رکھے ہوئے ایک کنٹینر (Container) کے اندر سے بچے کے رونے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ جب کپتان نے اس بات کی وضاحت طلب کی تو اس نے کہا:

''جناب میں حسب معمول ڈیک صاف کر رہا تھا۔ صفائی کرتا ہوا جب میں کنٹینر نمبر ستائیس تک پہنچا تو اس کے اندر سے مجھے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے بچے کا منھ داب دیا ہے۔ پہلے تو مجھے خوف محسوس ہوا کہ کنٹینر سے بچے کی آواز آنے کا کیا مطلب؟ کوئی بچہ تو اس کے اندر موجود نہیں؟ اگر ہے تو اس کا منھ داب دینے کا کیا مطلب؟ اس کے علاوہ بھی اس کنٹینر میں کوئی موجود تو نہیں؟ میں دبے پاؤں وہاں سے چلتا ہوا برج پر آ گیا تاکہ یہ ماجرا آپ سے بیان کر سکوں۔''

موٹر ویسل (M.V.) گاندھی ایک خستہ حال جہاز تھا۔ اسے کئی سال سے مرمت درکار تھی۔ ڈرائی ڈاکنگ (Dry Docking) کے لیے جہاز کو وزاگاپٹم لے جانے کے کپتان عرش الرحمان کو احکام مل چکے تھے تاکہ وہاں اس کی از سر نو مرمت ہو۔ مگر آخری لمحوں میں وہ احکام منسوخ کر دیے گئے تھے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ گاندھی کے مالکان کو گجرات کی ایک بڑی چرم ساز کمپنی سے مال و اسباب کی بار برداری کا بڑا ٹھیکہ مل گیا تھا۔ ''نورتم داس پرشوتم داس'' جہاز رانی کی کوئی سو سال پرانی کمپنی تھی جس کے مالکان اپنے پرکھوں کے قائم کردہ تجارتی اصولوں پر کام کرتے چلے آئے تھے۔ انھوں نے نہ تو کبھی صوبائی حکومت کے مقرر کردہ قوانین کو لانگھنا چاہا تھا، نہ مرکزی حکومت کی مرتب کردہ پالیسی کے خلاف بلاوجہ آزادی لینے کی کوشش کی تھی۔

چنانچہ جب کپتان عرش الرحمان نے کمپنی ہیڈ کوارٹر کو بذریعہ ٹیلکس اطلاع دی کہ ایک کنٹینر میں کوئی چالیس کے قریب گجرات کے مہاجر ہیں۔ ان میں نوشیر خوار بچے ہیں، پچیس عورتیں ہیں اور گیارہ ضعیف مرد۔ ان کا فہرست میں کوئی ذکر نہیں، اس لیے مجھے مطلع کیجیے کہ میں ان کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کروں۔''

کچھ دیر پہلے کپتان کے حکم دینے پر کنٹینر نمبر ستائیس کی مہر توڑی گئی تھی۔ پھر تالا کھولا گیا تھا، کنٹینر کا بولٹ اتارا گیا تھا۔ پھر شمسی نے جوں ہی 9×7×27 فٹ کے کنٹینر کا دروازہ کھولا تو اندر سے سخت بدبو کا ایک بھبکا باہر آیا۔ انھوں نے دیکھا کہ اندر بچے، عورتیں اور مرد تقریباً الگ الگ قطاروں میں بیٹھے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ان سب کی آنکھیں ان کے ہاتھوں کی آڑ میں تھیں۔ نہ جانے کتنے عرصے سے وہ گھپ اندھیرے اور غلاظت میں بند تھے۔ کپتان نے ان کو عرشے کے ایک گوشے میں لے جا کر حمام کرانے اور حمام کے بعد انھیں ہلکی غذا دینے کی ہدایت کی۔

کمپنی کے ڈائریکٹر چھبیل داس کی میز پر آفس منیجر مسٹر ڈی کوسٹا نے موٹر وےسل گاندھی سے آیا ہوا فیکس رکھ دیا اور ان کا احکام سننے کے لیے وہاں کھڑا رہا۔ انھوں نے فوراً کمپنی کے بڑے عہدے داروں کی بیٹھک طلب کی اور حاضرین کو وہ فیکس پڑھ کر سنایا اور کہا کہ موجودہ صورت میں کپتان ہی مناسب شخص ہے جو اس موقع پر صحیح فیصلہ کر سکتا ہے۔

اوبیرائے صاحب نے کہا:

"مجھے تو آج سے پچپن ساٹھ سال پرانے ملکی تقسیم کے بعد پیش آنے والے واقعات یاد آنے لگے ہیں کہ کیسے لوگوں نے چھکڑوں پر، تانگوں میں، پیدل اور مال گاڑی کے ڈبوں میں سرحد پار کی تھی۔ یہ خانماں برباد بھی انھیں کے سے بلکہ ہم جیسے دکھائی دے رہے ہیں۔ بھائی چھبیل داس جی! ٹوبہ ٹیک سنگھ سے امرتسر اور امرتسر سے دلی کے سفر کا حال کیا سناؤں۔ کیا کچھ نہ دیکھا ان آنکھوں نے، اب تو ان کے تصور ہی سے اندھیری راتوں میں اٹھ بیٹھتا ہوں اور بھوت بھوت کہہ کر چلانے لگتا ہوں۔"

چھبیل داس نے منیجر ڈی کوسٹا سے رائے مانگی۔ اس نے کہا کہ میں بین الاقوامی قوانین جہاز رانی کے مینول (manual) دیکھ رہا تھا تا کہ فوری طور پر ان سے رہنمائی حاصل کر سکوں۔ ضابطوں میں ۱۹۷۳ کے حوالے سے یہ بات درج ہے کہ بندرگاہ چھوڑ دینے کے بعد اگر کپتان کو یہ اطلاع ملے کہ اس کے جہاز پر کوئی ایسا شخص سوار ہے، جس کا جہاز کے مسافروں یا عملے کی فہرست میں نام درج نہیں تو ایسے شخص کو اپنی منزل پر پہنچ کر انتظامیہ کے حوالے کر دے یا اسے محسوس ہو کہ وہ زیادہ وقت گنوائے اسی بندرگاہ کو لوٹ کر جا سکتا ہے جہاں سے وہ شخص جہاز پر سوار ہوا تھا تو لوٹ جائے اور وہاں بندرگاہ کی انتظامیہ کے اس شخص کو حوالے کر دے۔"

چھبیل داس جی نے کہا "ٹھیک ہے وہ تو سات روز کے بعد کلکتہ پہنچیں گے۔ ان کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ واپس ہو جائیں اور کانڈلہ پر وہ کنٹینر انتظامیہ کی تحویل میں دے دیں۔"

بہتر سالہ اوبیرائے صاحب نے، کہ جن کا شمار بھی ڈائریکٹروں میں ہوتا تھا، کہا:

"چھبیل داس جی یہ ہمارے لیے سب سے سہل راستہ ہے کہ ہم ان مہاجروں کو پھر سے گجرات حکومت کے حوالے کر دیں۔ اور آپ بخوبی جانتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ میں نے مرحوم کرشن چندر کی ایک کتاب پڑھی تھی "ہم وحشی ہیں"۔ اسے پڑھ کر میں نے انھیں لکھا تھا کہ آپ نے برصغیر کے دو بڑے فرقوں سے بلند ہو کر سنہ سینتالیس کے حالات پر افسانے لکھے ہیں۔ اور انسان کے اندرون میں بسے ہوئے اس وحشی سے اپنے قاری کو متعارف کیا ہے جس سے آشنا ہو کر آپ کا قاری دم بخود رہ جاتا ہے۔

"کرشن جی نے میرے خط کے جواب میں لکھا تھا کہ دونوں ہی فرقوں کے ہاتھوں قتل وغارت ہوا، آتش زنی اور لوٹ مار کی وارداتیں دونوں ہی نے سرانجام دیں، عصمت دری اور عورتوں کو داغ دینے کے واقعات کے ذمے دار دونوں ہی فرقے کے لوگ تھے۔ لیکن اب ہمیں اتنا کچھ جھیل جانے کے بعد یہ خیال رکھنا چاہیے کہ آئندہ ایسا نہ ہو۔

"تو چھبیل داس جی آپ عرش الرحمان سے کہیے کہ وہ کنٹینر لے کر سیدھا کلکتہ چلا آئے۔ ہم یہاں دیکھیں گے کہ ہماری ہوم منسٹری ان کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔ ان کے کلکتہ پہونچنے تک ہم مسٹر اہلوالیہ ہوم سکریٹری سے رابطہ قائم کر کے اس معاملے میں مشورہ طلب کر لیں گے۔"

کمپنی کی جانب سے جب ایم وی گاندھی پر چھبیل داس جی کا دستخط کیا ہوا فیکس پہنچا تو اس وقت تک جہاز کانڈلہ کی جانب موڑ لیا گیا تھا کیوں کہ عرش الرحمان ایک سینئر کپتان تھا اور جہاز رانی کے قوانین اور احکامات سے بخوبی واقف تھا۔

اس نے بمل دت کو فیکس دکھاتے ہوئے کہا: "یہ دنیا والے کبھی کسی کو اپنے غیر جانب دار ہونے کا موقع نہیں دیتے۔ گو کہ اس کنٹینر میں آئے ہوئے تمام لوگ میرے بہن بھائی ہیں۔ مگر میں ان کے ساتھ کیوں کر امتیازی سلوک کر سکتا تھا؟ اچھا ہوا جو یہ حکم آ گیا۔"

"سر، ہمارے پاس قوت اختیار تو تھی۔ مگر آپ دوسرا حق انتخاب استعمال کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔" بمل دت نے جواب دیا۔

عرش الرحمان مسکرایا اور بولا:

اچھا جاؤ اور اسٹور میں دیکھ آؤ کہ راشن پانی مناسب مقدار میں موجود ہے کہ نہیں۔"

اسی لمحے سشی پھر دوڑتا ہوا برج میں آیا۔

"کیا بات ہے سشی، تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں لگ رہے ہو؟"

"سر! سر! کنٹینر نمبر سولہ سے بھی میں نے ابھی ابھی بچے کے رونے کی آواز سنی ہے۔" ☆☆☆

مکاتیب عسکری

مرتبہ : شیما مجید

قیمت : ۲۰۰ روپے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

فاروقی محوِ گفتگو

مرتب رحیل صدیقی

قیمت : ۱۷۵ روپے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

مظہر مہدی

جنوں چاہتا ہے

جنوں چاہتا ہے
گل کی قبا چھوڑ کر خوشبو ہو جاؤں
میرے جنوں کو پاگل مت بنا
میں تہی دست
کف افسوس سے بھی محروم
میرے رستے ناسور کو
نرم ہاتھوں سے
نرم لبوں سے چوم کر
فنا کی جانب روانہ کر
جوش خودنمو سے مجھے سبکسار کر
میرے صبر میں ایک کیل ٹھونک
بس میں تیرے خون میں رہوں
جیسے گلوں میں خوشبوؤں کا مسکن
اس زمین کو وحشتوں سے پاک کر
پھر مجھے اس سے ملا

جنوں چاہتا ہے
گل کی قبا چھوڑ کر
خوشبو ہو جاؤں
اے میری جان تو ہی یہ کرم کر

زمینوں میں مناجاتیں اتر گئیں

گل عشق
میں اس کے قدموں پر رکھتا رہا
پر اس کے قدم
زمینوں کو جکڑتے رہے
زمینوں میں دھنستے رہے
میں آرزو کی کونپل پر
مہر کی کرنوں کا متمنی
کہ آرزو حسن زیبا سے نکھر جائے
اس کی رویت
دید سے خالی رہی
میں اس کے گیسوؤں کی جالی کا اسیر
خواہشوں کے باب کھولتا رہا
دید کی شبنم ہتھیلیوں پہ جمی رہی
اس کے قدموں کی خاک کے بوسے لئے
زبان تشنہ لبی سے
آنکھ، آب سے پر ہوئی
زمینوں میں مناجاتیں اتر گئیں

زمین کی سالگرہ

چلو زمین کی سالگرہ منائیں
چاند کو مدعو کریں
اس کی راتوں کا وہی تو ایک رفیق ہے
فلک کا فرش کریں
کوہساروں کو میز
اور اونچائی پر جو برف جمی ہے
اس سے کیک بنائیں
تاروں کی شمع جلائیں
یادوں کے ہاتھوں میں چاقو تھمائیں
بجلیوں کی گھن گرج میں
سالگرہ کے نغمے گائیں
فصلوں کو
پھول کی ڈالیوں کی طرح تحفے میں دیں
جگنوؤں سے کہیں
وہ اپنے گھر بھی روشن رکھیں
آج ماں کی برسی ہے
برگ خزاں اور بارش
ماں اور زمین کی قدم بوسی کرتے ہوئے
تہنیت پیش کرتے ہیں

فیصل ہاشمی

میں کہاں تھا...

جسم کے اس طرف
روح کی دھند میں
اپنے کاندھے پہ خود کو اٹھائے ہوئے
چیختا ہی رہا

میں یہاں ہوں یہاں
میں یہاں ہوں یہاں

کوئی سنتا نہ تھا

میں دعا کے اثر سے بہت دور تھا
مردہ خانے کی وحشت میں
روزِ ازل سے ہی محصور تھا

میں واپسی کا ٹکٹ لے کر آیا تھا

بھاری بھاری بکسے اپنے
پیاری پیاری آنکھوں
اور کچھ ہنستے بولتے چہرے والے
لوگوں کے ہاتھوں میں دے کر
اڑنے کی تیاری کر لی
سر تو بوجھل ہے ہی لیکن
دل پر بوجھ بہت ہی بھاری ہے
پھر بھی واپس تو جانا ہے

کوئی سمجھا، کوئی نہیں سمجھا

اتنی زور سے چیخو
یہ دیوار و در
یہ گلیاں، سڑکیں
یہ گھر، یہ بازار
یہ پتھر، یہ جنگل
یہ بل کھاتے رستے اور پہاڑ
اس آواز سے گھل جائیں
اور پارہ پارہ ہو جائیں

وہ آدمی

اظہارالاسلام

امریکن سینٹر کے پاس وہ آدمی مجھے پہلی بار دکھائی دیتا ہے۔ اس کا حلیہ ہی کچھ ایسا ہے کہ میرے ذہن میں ایک گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے، خاص کر اس کی آنکھیں، جیسے ان میں سے ماورائے بنفشی شعاعیں خارج ہو رہی ہوں۔

میں جلدی سے مڑ کر اپنی راہ لیتا ہوں، مگر مجھے لگتا ہے اس کی آنکھیں میری پیٹھ سے چپکی ہوئی ہیں۔ میں غیر ارادی طور پر پلٹ کر دیکھتا ہوں۔ وہ اب دھیرے دھیرے میرے پیچھے آ رہا ہے۔ پتہ نہیں کوئی دہشت گرد ہے یا خفیہ پولیس کا آدمی۔

پچھلے دس سال سے میں اسی راستے سے دفتر جا رہا ہوں، مگر پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ لیکن جب سے میرا تبادلہ پرچیز ڈپارٹمنٹ میں ہوا ہے وہ مجھے ہر روز دکھائی دینے لگا ہے۔ پہلے دفتر تک وہ میرا پیچھا کرتا ہے پھر چھٹی کے بعد سائے کی طرح امریکن سینٹر تک ساتھ لگا رہتا ہے۔

میں ہر روز پیدل ہی دس پندرہ منٹ میں دفتر پہنچ جاتا ہوں۔ مجھے کلکتہ کے بسوں اور ٹراموں کی دھکم دھکا سے کوئی سروکار نہیں۔ جگہ جگہ ٹریفک پر قابو پانے کے لئے فلائی اوور بن رہے ہیں۔ اب تو عرصہ سے زمین دوز ریلیں چلنے لگی ہیں۔ کبھی کبھی میٹرو ٹرین کا سفر، اسپلینیڈ اور رابندر سدن کے درمیان دو ہی اسٹیشن آتے ہیں، پارک اسٹریٹ اور میدان۔ زیر زمین ٹھنڈے ٹھنڈے پلیٹ فارم پر معلق ٹی وی اسکرین مجھے اچھے لگتے ہیں۔ میٹرو ٹرین کے آتے ہی پل بھر میں پلیٹ فارم خالی ہو جاتا ہے۔ ٹرین چلنے سے پہلے ایک گھسی پٹی نسوانی آواز ابھرتی ہے۔

''دروازہ بند ہو رہا ہے!''

''اگلا اسٹیشن پارک اسٹریٹ!''

''پلیٹ فارم بائیں طرف!''

آج صبح سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ امریکن سینٹر کے پاس وہ آدمی حسب معمول اپنی جگہ کھڑا ہے۔ سامنے چوڑے فٹ پاتھ پر ہاکروں کی قطاریں پلفار کرتی رہتی ہیں۔ کارپوریشن نے کتنی بار انہیں ہٹایا مگر وہ پھر وہیں آ کر جم جاتے ہیں۔ اوبرائے گرینڈ کے نیچے باٹا کے شوکیس پر نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں کہ پیچھے سے کوئی آواز دیتا ہے۔

''صاحب! آپ کا میگزین مل گیا ہے۔''

میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ بائیں جانب فٹ پاتھ پر ڈھیر سارے رسائل بچھائے ایک کتب فروش مجھے فخریہ انداز سے دیکھ رہا ہے۔ میں جلدی سے اس کے پاس جاتا ہوں۔ وہ National Geographic کا شمارہ بابت جون ۱۹۸۵ میری طرف بڑھا دیتا ہے۔

سرورق پر افغانی لڑکی شربت گل کی تصویر ہے۔ مجھے اس شمارے کی عرصے سے تلاش تھی۔ ''کتنے دے دوں؟'' رسالہ پرانا ہو کر اپنی آب و تاب کھو چکا ہے۔

''بس اپنی خوشی سے جو چاہے دے دیں۔'' وہ دانت نکال دیتا ہے۔

میں پچاس کا نوٹ بڑھا دیتا ہوں۔ وہ خوشی خوشی اسے اپنی انٹی میں اڑس لیتا ہے۔

سرورق پر میں پھر ایک نظر ڈالتا ہوں۔ شربت گل کی نیلگوں سبز آنکھیں مونالیزا کی مسکراہٹ کی طرح لاینحل ہیں۔

سترہ سال پہلے روسی حملے کے بعد نصیر باغ، پشاور مہاجر کیمپ کی ایک پناہ گزیں۔ National Geographic کے تازہ شمارہ اپریل ۲۰۰۲ میں اس کی دو کلوز اپ تصویریں ہیں۔ لیکن اس عرصہ میں اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی ہے۔ وقت نے چہرے پر بھی خاصا اثر ڈالا ہے۔ نیشنل جیوگرافک کی ٹیم نے سترہ سال بعد اسے افغانستان میں دوبارہ ڈھونڈ نکالا۔

دنیا میں وحشیانہ مظالم کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا دفتر آ جاتا ہے۔ ایک بار غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھتا ہوں، وہ آدمی کچھ فاصلے پر اب بھی میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔

دفتر کے کمرے میں بریف کیس ایک طرف رکھ کر میز پر ترتیب سے رکھی ہوئی فائلوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، لیکن میرا ذہن کہیں اور بھٹک رہا ہے۔ باہر سورج بادلوں سے آنکھ مچولی کر رہا ہے۔ شاید کسی وقت بارش ہو، مگر ہوتی نہیں۔ گرمی اور حبس سے سب کا برا حال ہے۔ شام کو اچانک موسم بدل جاتا ہے۔ پچھوا آندھی کے آتے ہی درجۂ حرارت میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ شہر راحت کی سانس لیتا ہے۔ خاص کر دفتر جانے والے شاداں و فرحاں ہیں ورنہ کچھ تو گرمی سے گھبرا کر ہفتہ بھر کے لئے دارجلنگ یا گینگٹاک جانے کی سوچ رہے تھے۔ اب تو کل کا موسم بھی خوش گوار رہے گا۔ لوگوں کا محکمۂ موسمیات پر عدم اعتماد اور بھی یقینی ہو گیا۔

دوسرے دن وہ آدمی اپنی جگہ مستعد کھڑا ہے۔ میں جلد جلد اپنے قدم بڑھاتا ہوں۔ دفتر کی عمارت میں داخل ہونے سے پہلے پیچھے مڑ کر دیکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ ضرور پیچھے لگا ہوا ہوگا۔

دفتر کی کرسی پر بیٹھتے ہی بیٹھتے کہیں سے منورنجن داس آ کر سر پر سوار ہو جاتا ہے۔

''سر! چاروں ٹینڈر منظور ہو گئے ہیں، آپ بھی پروانہ جاری کر دیں۔'' یعنی آخری دستخط میرے ہوں گے۔ ٹینڈر تو محض ضابطے کی کھوکھلی کارروائی

ہے، ایک ڈھکوسلا۔ میں اس ناپاک سسٹم کا حصہ نہیں بننا چاہتا ہوں مگر عجب مجبوری ہے۔

اس دن چھٹی کے بعد اپنی میز کی دراز کھولنے پر مجھے نوٹوں کی ایک گڈی ملتی ہے جو میرے لئے رکھی گئی ہے۔ یہ گڈی اس سسٹم کا ایک حصہ بننے کی کھلی دعوت ہے۔ میں دراز زور سے بند کر کے چابی گھما دیتا ہوں۔

ایسا مہینے میں دو ایک بار خود بخود ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں کس کی حرکت ہے۔ اب تو کئی گڈیاں جمع ہو گئی ہیں، مگر میں انھیں ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔

ایک دن چھٹی کے بعد خلاف معمول میرے قدم بائیں جانب مڑ جاتے ہیں۔ وہ آدمی پتہ نہیں کب سے میرا منتظر ہے، لیکن آج پہلی بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھتا ہوں۔ سڑک پر ٹریفک کے تھمتے ہی میرے قدم زیبرا کراسنگ پر پڑتے ہیں۔ ایک بار پھر اسے مڑ کر دیکھنے پر مجھے اس کی مسکراہٹ اور بھی معنی خیز لگتی ہے۔

سڑک کے اس پار سبزہ زار اسپلینیڈ، کچھ فاصلے پر شہید مینار، آگے ریڈیو اسٹیشن، بائیں جانب وکٹوریہ میموریل، پھر نیتا جی انڈور اسٹیڈیم اور ایڈن گارڈن۔ میرے قدم آگے بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ سامنے اوٹرم گھاٹ جس کے دائیں بائیں رابندر سیتو اور ودیا ساگر سیتو اندھیرے میں جگمگا رہے ہیں۔

میں دریا کے کنارے جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ اب میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئی ہیں۔ پاس ہی رکھا ہوا میرا بریف کیس خود بخود کھل جاتا ہے۔ نوٹوں کی گڈیاں میرے ہاتھوں میں ہیں۔ میں انھیں چپ چاپ لہروں کے حوالے کر دیتا ہوں۔ کچھ فاصلے پر ایک اسٹیمر سائرن بجاتا ہوا گذر رہا ہے۔

ہر دو تین ماہ میں ایک دریا کے کنارے بیٹھنا اور نوٹوں کی گڈیاں لہروں کے حوالے کرنا میرا معمول بن گیا ہے۔ اس آدمی کی مسکراہٹ جیسے ہر بار میرا خیر مقدم کرتی ہے۔ اب مجھے اس سے کوئی وحشت نہیں ہوتی۔

گھر میں رنگ روغن تیزی سے ہو رہا ہے۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے خریدے جا رہے ہیں۔ لڑکی کی شادی کی تاریخ قریب آتی جا رہی ہے۔ شادی کی ساری ذمہ داریاں میرے کندھوں پر ہیں۔ لڑکا خلیج میں کام کرتا ہے۔ ادھر سے کوئی فرمائش بھی نہیں۔ لڑکی کا لیڈی برابورن کالج میں آخری سال ہے۔ امتحان کے بعد وہ بھی گلف چلی جائے گی۔

رات کو نیند میں الٹے سیدھے خواب دیکھتا ہوں۔ اس رات ستیہ جیت رے کی فلم "نائک" کا ایک سین خواب میں ابھرتا ہے۔ فلم کا نائک اتم کمار روپے کی دلدل میں دھنستا جا رہا ہے۔ آس پاس زمین سے ابھری ہوئی استخوانی ہتھیلیوں پر رکھے ٹیلی فون کی گھنٹیاں مسلسل بج رہی ہیں۔ اور نائک دلدل سے باہر آنے کے لئے بے سود ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔

میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ میری چیخ سے کسی کی نیند میں کوئی خلل نہیں پڑتا ہے۔ میں قریب رکھے پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیتا ہوں۔ میرا جسم پسینے پسینے ہو رہا ہے۔ نیند مجھ سے دور، بہت دور بھاگتی جا رہی ہے۔

پتہ نہیں دفتر تک یہ خبر کیسے پہنچ جاتی ہے، میں نے کسی سے ذکر تک نہیں کیا۔ اب میں ان کے روز روز کے مشورے سے تنگ آ گیا ہوں، جیسے میری لڑکی گھر سے بھاگ گئی ہو یا اس کے ساتھ اجتماعی عصمت دری کی گئی ہو۔

اس دن دفتر پہنچتے ہی اردلی نے باس کا سلام دیا۔

مجھے پتہ ہے سارے ماتحت باس کے خوشامدی اور چاپلوس ہیں۔ ان کے آگے پیچھے پھرنا روز سلام کو جانا ان کے فرض عین میں شامل ہے۔

میں باس کے کمرے میں جاتا ہوں۔

"آیئے! آپ تو خود کو لیے دیئے رکھتے ہیں، لیکن، ہم اپنے سب ماتحتوں کی خبر رکھتے ہیں۔ لڑکی کی شادی طے ہوگئی آپ نے بتایا نہیں۔"

"جی وہ... جی وہ..." میں گڑبڑا گیا۔ یہاں بھی وہی سلسلہ۔

"خیر کوئی بات نہیں، آپ اطمینان رکھیں، سب کچھ آرام سے ہو جائے گا۔ سنہا کی لڑکی کی شادی یاد ہے نہ۔ ایران سوسائٹی میں تمام باراتیوں کی کیسی خاطر داری کی گئی تھی۔"

"جی... جی ہاں..." میں انھیں تکے جا رہا ہوں۔

"اس بار بھی ایسا ہوگا۔ آپ سارے ٹھیکے داروں اور سپلائروں کو مدعو کریں۔ ان کے تحائف بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔"

میں پسینے پسینے ہو رہا ہوں۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔

باس نے دراز کھول کر ایک بڑا سا لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اسے چھوٹے موٹے اخراجات کے لئے رکھیں۔ اور کسی بات کی کمی ہو تو سنکوچ نہ کریں۔"

ایک بڑا سا لفافہ میرے اور باس کے درمیان جھول رہا ہے۔

میرا جی چاہا، لفافہ باس کے منہ پر کھینچ ماروں۔ پھر ریاض کا خیال آیا۔ پتہ نہیں اسے کیوں معطل کر دیا گیا۔ وہ اب بھی عدالتوں کے چکر کاٹ رہا ہے۔ کہیں میں بھی...؟

میں ہاتھ بڑھا کر لفافہ دبوچ لیتا ہوں۔

واپسی میں میرے قدم یوں اٹھ رہے ہیں جیسے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوں۔

لفافہ میرے بریف کیس میں آسانی سے سما جاتا ہے۔ ساتھ ہی دراز میں پڑی ہوئی گڈیاں بھی خود بخود بریف کیس میں پہنچ جاتی ہیں۔

لنچ بریک پر میں کہیں نہیں جاتا۔ میری بھوک یکسر غائب ہو گئی ہے۔

ایک کونے میں بہت سارے تازہ اخبار پڑے ہیں۔ میں انھیں سمیٹ کر اپنی میز پر واپس آتا ہوں۔

اخبار کی سرخیاں مجھے ڈنک مارتی ہیں جیسے میں ہی ان سرخیوں کا منبع ہوں۔

چھٹی پر بریف کیس لے کر میں دفتر کے پچھلے دروازے سے نکلتا ہوں۔ وہ آدمی آج مجھے اندر سے پریشان کر رہا ہے۔ اس کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ باہر زوروں کی بارش ہو رہی ہے۔ کہیں بھی جائے پناہ نہیں۔ میں کب تک اپنی نظریں چراتا رہوں۔

سامنے فٹ پاتھ پر دھواں دھار برستے پانی میں اس کی لاش بھیگ رہی ہے ☆☆☆

مہتاب حیدر نقوی

زمینِ دل پہ نئی کھلتی ہے ادائے سخن
کہ ہم کچھ اور بھی جانیں ہیں ماورائے سخن

فسانۂ دل و جاں کس پہ بار ہوتا ہے
مگر کبھی تو سخن چاہیے برائے سخن

اسی پہ کھلتے ہیں آرائشِ خیال کے در
ہے جس کے عقدِ ارادت میں دلربائے سخن

ترے بغیر بھی یہ گفتگو مکمل ہے
ترے بغیر بھی خالی نہیں سرائے سخن

سجے سجائے مکاں پل میں ہو گئے مسمار
بیانِ درد کی کس طرح تاب لائے سخن

بجز ہوائے ہنر کچھ نہیں متاعِ حیات
ہمارے بعد کہیں گے سبھی کہ ہائے سخن

کس و ناکس ہیں بہت دستِ طلب کے آگے
سرِ پندار جھکا جاتا ہے سب کے آگے

مجھ سے وابستہ ازل سے ہے یہی موجِ سراب
کب سے میں تشنہ دہن ہوں ترے لب کے آگے

اپنے سورج کو بھلا کس کے مقابل رکھیے
ماند پڑ جاتے ہیں سب تاب کے تب کے آگے

آج بھی ہوں میں اسی گریۂ شب میں محصور
جن کو جانا تھا وہ سب جا چکے کب کے آگے

بس اسی واسطے روشن ہے یہ غم خانۂ دل
اک سحر بھی ہے کہیں پر مری شب کے آگے

اور کیا دولتِ پرویز ملے گی تجھ کو
ہیچ ہیں نقد و گہر شعر و ادب کے آگے

اسے بھلائے ہوئے مجھ کو اک زمانہ ہوا
یوں ہی تمام مرے درد کا فسانہ ہوا

وہ جس کی صبح مہکتی تھی شام ہنستی تھی
سنا ہے وہ درِ دولت عذاب خانہ ہوا

ترا چراغ جو روشن ہے بجھ بھی سکتا تھا
بھلا ہوا کہ ہواؤں کا سامنا نہ ہوا

مرا بدن مرا دشمن، عدو بنی مری روح
میں ان کے دام میں آیا ہوس نشانہ ہوا

وہ لوگ خوش ہیں کہ وابستۂ زمانہ ہیں
میں مطمئن ہوں کہ در اس کا مجھ پہ وا نہ ہوا

کہ میں نے کاٹ دی گرمی میں سرد سرد سی رات
مرا جنوں بھی مرے دل سپاہیانہ ہوا

مہتاب حیدر نقوی

زندگی کیا ہے بجز وہم و گماں میرے لئے
یہ زمیں جب ہوگئی بے آسماں میرے لئے

وہ بدن صحرا بڑھا دیتا ہے پہلے میری پیاس
اور بن جاتا ہے پھر آبِ رواں میرے لئے

موسمِ دل نے بکھیرے دل کے باہر اپنے رنگ
رنگِ گل اس کے لئے رنگِ خزاں میرے لئے

شہر میں لگتی ہے پھر اک روز بجھ جاتی ہے آگ
چھوڑ جاتی ہے مگر سارا دھواں میرے لئے

اس سے ملنے کا سماں اس سے جدائی کی گھڑی
اور پھر کچھ بھی نہیں سود و زیاں میرے لئے

آسمانِ دل پہ روشن لفظ و معنی کی طرح
ہے زمینِ شعر کی یہ کہکشاں میرے لئے

یہ زمیں وہ آسماں ایسا نہ تھا
اس طرح دریا کبھی بہتا نہ تھا

زخم بھی اتنے ہرے پہلے نہ تھے
یہ چمن گل رنگ بھی ایسا نہ تھا

سر برہنہ سورجوں کے ساتھ تھے
یوں خیالِ یار بے سایہ نہ تھا

اک ستارہ دل میں روشن تھا مگر
آنکھ نے اس کو کبھی دیکھا نہ تھا

اس طرف ہی دیکھتا رہتا تھا میں
وہ دریچہ دیر تک کھلتا نہ تھا

ایک ہی صحرا کے باسی تھے سبھی
کوئی اپنا کوئی بیگانہ نہ تھا

ہر طرف تاریک تھی دنیا مگر
اک چراغِ دل تھا جو بجھتا نہ تھا

یوں ہی سر چڑھ کے ہر اک موجِ بلا بولے گی
ہم جو خاموش رہیں گے تو ہوا بولے گی

بولتا رہتا ہے جو آج سرِ شاخِ انا
چپ سی لگ جائے گی جس روز فنا بولے گی

تجھ سے امید کسے ہے مری لیلائے حیات
محملِ ناز سے کیا چشمِ عطا بولے گی

وہ تو رہتا ہے یونہی اپنے گلستاں میں گم
لبِ خاموش سے کیا برگِ حنا بولے گی

موسمِ نعرۂ بلبل بھی کبھی آئے گا
اس سے مایوس نہ ہو خلقِ خدا بولے گی

سید کی حویلی

شفیع مشہدی

"بہو۔اری او بہو!" تیز آواز۔

"جی بیگم صاحب۔" کمزور آواز۔

"میں پوچھتی ہوں تمھاری بکریاں آنگن میں کیوں آئیں۔" آواز میں بے پناہ خفگی۔

"کیا کریں بیگم صاحب غلطی ہوگئی۔" آواز میں معذرت۔

"مگر غلطی ہوئی کیوں؟ دیکھو تمھاری بکریوں نے گل داؤدی کا کیا حشر کیا ہے اتنی محنت سے میں نے پودے لگائے تھے۔ سب کتر گئیں کمبخت۔"

"کیا کریں بیگم صاحب جناور تو جناور ہی ہے۔"

"بکریاں تو جانور ہیں مگر تم کیا ہو؟ تم تو جانور نہیں ہو، بکریوں کو باندھ کر کیوں نہیں رکھتیں۔"

"باندھتی ہوں بیگم صاحب۔ غلطی سے کھل گئیں۔"

"بکریاں نہیں سنبھال سکتیں تو کمرہ خالی کردو۔ میں تمھاری بکریوں کے لئے اپنے گل داؤدی برباد نہیں کرسکتی۔" بیگم صاحب کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

بیگم صاحب اور بہو کی یہ نوک جھونک نئی نہیں تھی۔ ہفتے میں دو ایک بار ضرور بکریوں یا مرغیوں کی بابت تنازع کھڑا ہوتا تھا اور اس کا اختتامیہ عموماً "کمرہ خالی کردو" پر ہوتا، مگر بہو بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس دھمکی میں کوئی دم نہ تھا اور اس کا بہترین علاج خاموشی تھا۔ اور واقعتاً چند گھنٹوں بعد ہی بیگم صاحب بہو کو آواز دے کر رات کا سالن، بچی ہوئی روٹیاں اور بچوں کے لئے مٹھائیاں دیتی ہوئی محبت بھری باتیں کرتی نظر آتی تھیں۔

پرانی دلی کے کوچہ چیلان اور تراہا بیرام خان سے آتی سڑک کے تراہے پر کھڑی یہ پرانی حویلی سید کی حویلی کے نام سے جانی جاتی تھی۔ بیگم صاحب اور بہو کی آوازوں سے بے حد مانوس یہ حویلی ان آوازوں کو بوسیدہ دیواروں میں یوں جذب کر لیتی تھیں کہ باہر آواز تک نہ جاتی تھی۔ اور جاتی بھی کیسے کہ وسیع راہداری کے باہر لکڑی کا بلند پھاٹک ہمیشہ بند رہتا تھا جس نے اندر کی بچی کھچی رونقوں کو باہر جانے سے روک رکھا تھا۔

پھاٹک میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جس سے جھک کر اندر داخل ہونا پڑتا تھا۔ گویا ہر شخص یہیں سے بیگم صاحب کو کورنش بجالاتا تھا۔ اندر داخل ہو کر سر اٹھایئے تو منظر عجیب تھا۔ دورویہ کمروں میں بہو کا خاندان آباد تھا۔ یہ لوگ پیشے سے بھنگی تھے اس لئے کوڑے کا ٹوکرا، بکریاں، بچے بلکہ کبھی کبھی تو بیل بھی دکھائی دیتے تھے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کوڑے کے ٹوکرے اور بچوں میں زیادہ گندہ کون تھا۔ تقریباً روز ہی بیگم صاحب اور بہو کے مکالمے گونجتے تھے مگر بہو نے کبھی بیگم صاحب کے آگے زبان نہیں کھولی تھی ورنہ دلی کی بھنگن جسے عرف عام میں جمعدارن کے لقب سے مخاطب کیا جاتا ہے اتنی تیز ہوتی ہے کہ کوئی کچھ بول دے تو لکھنؤ کی بھنگن کی طرح اتنا کہکر اکتفا نہیں کرتی کہ "اتنی لچیاں ماروں گی کہ چہرے پر سیرے اگ آئیں گے"، بلکہ واقعتاً سیرے اگا دیتی تھیں۔ مگر بیگم صاحب کی یہ امت دیگر امتوں سے زیادہ وفادار تھی۔

راہداری سے آگے بڑھیں تو حویلی کا دروازہ تھا جس پر حویلی ہی اتنی پرانی تختی لگی تھی جس پر "بیگم خواجہ" لکھا تھا اور اسے وہی لوگ پڑھ سکتے تھے جنھیں معلوم تھا کہ بیگم صاحب یہیں رہتی تھیں۔ تختی پر لکھا ہوا لفظ "بیگم" تقریباً مٹ چکا تھا مگر "خواجہ" کے آثار، بھی واضح تھے۔ ان کا نام جو بھی رہا ہو مگر سارا شہر انھیں "بیگم صاحب" ہی کہتا تھا، بلکہ "صاحب" اب "بیگم صاب" میں تبدیل ہو چکا تھا۔ حویلی کے اندر داخل ہوتے ہی بڑا سا آنگن تھا جس میں خوشنما پھولوں کے گملوں کی قطاریں تھیں۔ آنگن کے تین جانب کمروں اور برآمدوں کا سلسلہ تھا۔ شمالی حصے میں برآمدے سے ملحق ایک بڑا سا سہ درہ تھا جسے خوبصورت ستونوں اور منقش محرابوں نے

سنبھال رکھا تھا۔ بیگم صاحب بتاتی تھیں کہ یہ سید صاحب کی بیٹھک تھی اور اس سے متصل کمروں میں ان کا دفتر اور سونے کا کمرہ تھا۔ اب یہی حصہ بیگم صاحب کا مسکن تھا۔ بقیہ حصوں میں لکھنؤ کے محمود صاحب، بدایوں کے ضیا صاحب، مغربی یوپی کے رئیس صاحب اور رشید صاحب، اور بہار کے بدیع صاحب بحیثیت کرایہ دار مقیم تھے۔ اس حویلی کی کل آبادی انھیں دانشوروں، بیگم صاحب، جگدیش بھنگی کے خاندان، اس کی بکریوں اور مرغیوں پر مشتمل تھی۔ اچھا خاصا چھوٹا موٹا ہندوستان تھا جو سیکولر تو تھا مگر اس میں جمہوریت نہ تھی۔ بیگم صاحب اس ملک کی مطلق العنان حاکم تھیں اور ان کا ہر فیصلہ حرف آخر تھا، جس کے آگے سارے مکین سر تسلیم خم کرتے تھے۔

بکریوں اور مرغیوں کو چھوڑ کر باقی سارے مکین بے حد سعادت مند اور بیگم صاحب کے نیاز مند تھے اس لئے ماحول بھی خوشگوار تھا۔ بیگم صاحب تنہا تھیں۔ ڈاکٹری پڑھتے پڑھتے خدا جانے کیا سانحہ ہوا کہ انھوں نے پڑھائی چھوڑ دی اور ساری زندگی مجرد رہ گئیں۔ ان کے سارے عزیز و اقارب سرحد پار جا چکے تھے مگر حویلی کے آنگن نے ان کے پاؤں تھام رکھے تھے۔ وہ بالکل تنہا تھیں اس لئے انھوں نے کرایہ داروں کو ہی اپنا خاندان بنا رکھا تھا اور خود اس کی سربراہ بن بیٹھی تھیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ ہر کسی کے معاملے میں دخیل تھیں۔ کس سے ملنے کون آیا؟ کھانا پکنے میں دیر کیوں ہوئی؟ برآمدے کا بلب دس بجے رات کے بعد جلتا کیوں رہ گیا؟ فلانی کا بچہ کیوں رو رہا؟ وغیرہ وغیرہ۔ سویرے اٹھتے ہی وہ اپنی نوٹ بک میں بجلی کا میٹر نوٹ کرتیں پھر اسے سارے کرایہ داروں میں منصفانہ انداز میں تقسیم کرتیں اور اکثر پکار کر کہتیں۔

"محمود صاحب! آپ کا ایک بلب ۲ بجے رات تک جل رہا تھا اس لئے آپ کے حصے کا ایک یونٹ زیادہ پڑا۔"

لکھنوی تہذیب کے مرقع محمود صاحب "جی بیگم صاحب" سے زیادہ کچھ کہہ نہ پاتے تھے حالانکہ آواز میں مظلوم کے احتجاج کی دھمک ضرور ہوتی تھی۔

البتہ جب بیگم صاحبہ اپنی دوست طاہرہ بیگم کے یہاں گئی ہوتیں تو حویلی میں کچھ اور طرح کی چہل پہل ہو جاتی تھی۔ بچے دوڑتے، کھلکھلاتے، ہنستے اور محمود صاحب وغیرہ بھی آنگن میں مونڈھے ڈال کر آزادی سے خوش گپیاں کرتے اور قہقہے لگاتے جیسے ساری حویلی ان ہی کی تھی۔ موضوع سخن، زیادہ تر بیگم صاحب اور ان کا خاندان ہوتا تھا۔ بیگم صاحب کا خاندانی تعلق نادر شاہ سے رہا ہوگا۔ حالانکہ یہ الزام تھا۔ ان کا تعلق تو پرانی دلی کے شرفا سے تھا۔ اوپر اوپر مزاج میں نادر شاہی ضرور تھی مگر اندر شرافت میں کچھ بھی کمی نہ تھی۔

"یار۔ ان بیگم صاحب نے تو جینا دوبھر کر دیا ہے۔ کل شام کو میرے دوست موہن سنگھ آئے تھے۔ جانے لگے تو بیگم صاحب کے گملے سے ٹھوکر لگی اور بے چارے گرتے گرتے بچے اور آپ جانتے ہیں بیگم صاحب کیا فرماتی ہیں 'آپ کے دوست نشے میں تھے۔ کیسے کیسے لوگوں سے دوستی کر رکھی ہے آپ نے۔ میں فاخرہ بیگم سے کہوں گی۔' یار جی تو چاہا کہ کھری کھری سناؤں کہ قصور تو راستے میں رکھے ہوئے گملوں کا تھا اور آپ نے ایک شریف آدمی پر الزام لگا دیا مگر..."

"مگر کیا؟ آپ کو کھل کر کہنا چاہئے تھا۔" رشید خاں صاحب نے فرمایا۔

"آپ ڈر کیوں گئے؟ کہہ دینا چاہئے تھا۔" ضیا صاحب نے بھی مفت مشورہ دیا۔

محمود صاحب کو غصہ آ گیا۔ "میں کیوں ڈروں گا؟ قسم خدا کی ایک دن جنگ ہو جائے گی۔ آپ مجھے نہیں جانتے میں نے اچھے اچھوں کی بولتی بند کر دی ہے، میں کوئی بدایوں کا للا ہوں کیا۔" محمود صاحب نے ضیا صاحب کے وطن پر وار کیا تھا۔

"نہیں بھائی آپ تو لکھنؤ کے بانکے ہیں۔ مگر ذرا بانکپن دکھائیے تو ہم جانیں۔" ضیا صاحب کب چپ رہنے والے تھے۔

یہ سب تھا، مگر لوگ جانتے تھے کہ بیگم صاحب کے آتے ہی منظر بدل جائے گا اور لوگ باگ سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جائیں گے۔

لیکن بظاہر سخت گیر بیگم صاحب کے سینے میں بے حد دردمند دل تھا۔ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونا، اور اس کے درد کو اپنا درد بنا لینا، اور یہ سب بسی شور دکھاوے کے بغیر کرنا ان کی عادت تھی۔ آزادی کے وقت جو فسادات ہوئے تھے اس کے ریلیف کیمپ میں وہ مہینوں بغیر دو وقت کا کھانا کھائے لوگوں کی خدمت کرتی رہی تھیں۔ جن بزرگوں نے ان کا وہ حال دیکھا تھا وہ آج بھی ان کے قدرداں تھے۔ ویسے سارا محلہ ہی ان کا نیاز مند تھا۔ جگدیش بھنگی سے لیکر ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے آئے ہوئے رائے بہادر صاحب تک۔ سرحد پار سے لٹے لٹائے ریفیوجی بن کر آئے ہوئے لوگوں سے محلہ آباد تھا۔ پرانے مکین محلہ چھوڑ کر جا چکے تھے اور ان کے مکانات کسٹوڈین نے شرنارتھیوں کو الاٹ کر دیئے تھے۔ بس یہی ایک پرانی حویلی بچی تھی جسے بیگم صاحب کے والد نے سید احمد کے وارثوں سے خرید کر آباد کر رکھا تھا۔ راولپنڈی کے سردار جواہر سنگھ ہوں یا جھنگ کے کشمیری لال سہگل، ساہیوال کے کوہلی صاحب ہوں یا لکڑی ٹال والا نارائن، سبھی بیگم صاحب کو دیکھتے ہی کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ جوڑ دیتے اور بیگم صاحب ان سے خیریت پوچھتیں جیسے وہ سب ان کا اپنا کنبہ ہو۔ ایک دن میں ان کے ساتھ حکیم مومن خاں کی گلی سے گذر رہا تھا تو سردار جواہر سنگھ مل گئے۔ وہ آگے بڑھے تو بیگم صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

"کبھی تم ان کے گھر گئے ہو؟"

"جی ہاں۔ سردار جی بیمار تھے تو انھیں دیکھنے گیا تھا۔ سردارنی مجھے اندر لے گئیں جہاں ایک بڑے کمرے میں سردار جی لیٹے ہوئے تھے۔ سامنے منقش دیوار پر بابا نانک کی تصویر لگی تھی جس پر پھول کے ہار تھے اور اس کے اوپر کمرے کے چاروں طرف قرآنی طغرے کے ناکلس لگے ہوئے تھے۔ میں تو حیران تھا۔ سردار جی نے میری حیرت کو محسوس کیا تو بولے 'جانتے ہو بیٹے یہ کس کا مکان تھا؟ یہ علامہ راشد الخیری کا مکان تھا۔ میں نے سب کچھ ویسے ہی رہنے دیا ہے۔ بڑی برکت والا مکان ہے۔ واہگورو کی کرپا اور علامہ کی دعا بھی ہے۔' یہ کہتے ہوئے سردار جواہر سنگھ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اسی سال کے بوڑھے سردار کو شاید اپنا گاؤں یاد آ گیا تھا۔ نہ جانے اس کے مکان میں ٹنگی ہوئی بابا گرونانک دیو کی فوٹو کا کیا ہوا ہوگا۔ مگر اس نے اپنے زخموں پر قرآنی آیات کا مرہم لگا رکھا تھا۔"

حویلی میں رہنے والے تمام لوگوں کی کارجین بیگم صاحب تھیں۔ کوئی بیمار پڑے تو ڈاکٹر سکا کو بلا کر دکھانا، دوا منگوانی، پابندی سے کھلانی، اور تیمارداری کرنی، بیگم صاحبہ کے خود اختیاری فرائض میں تھے۔ سید کی حویلی بہت پرانی ہو چکی

تھی اور اس کا ایک حصہ جس میں ضیا صاحب رہتے تھے خاصا خستہ حال بھی تھا مگر پھر بھی اس کی ایک شان تھی۔ بھائی جان اور رشید صاحب کو میں نے حویلی کی داستان سناتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ تاریخی مکان ہے مگر بیگم صاحب کے بعد نہ جانے اس کا کیا حشر ہوگا۔ ایک دن بڑی حسرت سے بھائی جان نے مجھے بلا کے محرابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"جانتے ہو۔ ان محرابوں کے نیچے بیٹھ کر قوم کی قسمت پر فیصلے کئے گئے تھے اور وہ تاریخی اقدام ہوئے تھے۔ جس نے مسلمانوں کی تقدیر بدل دی تھی مگر..." اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئے اور تب میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ میں نے اتنا ضرور دیکھا تھا کہ شیروانی پہنے ہوئے کچھ لوگ کئی بار بیگم صاحب سے باتیں کرنے آئے تھے۔ وہ لوگ اس حویلی کو سید کی یادگار بنانا چاہتے تھے۔ بیگم صاحب راضی بھی تھیں مگر پھر شیروانی والے لوگ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ شاید ان کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔

میں حویلی میں رہنے والوں میں تنہا طالب علم تھا اور سب سے چھوٹا بھی تھا اس لئے بیگم صاحب کی خاص شفقت مجھ پر تھی۔ بھائی جان کو بھی وہ بے حد مانتی تھیں اور ہمیشہ انھیں کھانے کی ترغیب دیتیں۔ پھر نزلہ بھابھی پر اترتا۔

"بھئی دلہن تم میرے بھائی کا خیال نہیں رکھتی ہو۔ دیکھو کتنے دبلے ہو گئے ہیں۔"

میں کہتا، "بھابھی موٹی کب تھیں؟" تو وہ ہنسنے لگتیں۔ "میں کب کہہ رہی ہوں کہ وہ موٹی ہیں۔ خود بھی کھائیں اور میاں کو بھی کھلائیں۔"

بیگم صاحب کی شفقتوں سے تو مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا تھا جیسے پچھلے جنم میں ہمارا ان سے قریبی رشتہ رہا ہوگا۔ بلکہ محمود صاحب تو اکثر مجھ کو چھیڑتے بھی تھے۔

"میاں لگے رہو۔ یہ حویلی تمہیں ہی ملے گی۔ اور تو کوئی ہے نہیں۔"

میں ہنس کر جواب دیتا "آپ جو ہیں۔"

"میاں مجھے تو بیگم صاحب وہ بینگی والا کمرہ بھی نہ دیں گی۔ تمہاری چاندی ہے۔"

تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب ملازمت کے سلسلے میں مجھے دلی چھوڑنی تھی تو سب سے زیادہ مغموم بیگم صاحب ہی تھیں۔ میرے جانے کے ایک دن پہلے وہ آبدیدہ ہو کر مجھ سے کہنے لگیں۔

"میاں صاحب تم چلے جاؤ گے تو میں تنہا ہو جاؤں گی۔ جلد واپس آجانا۔ میں یہ حویلی تمہارے نام کردوں گی۔"

مجھے جھٹکا سا لگا۔ "بیگم صاحب میں اگر واپس آسکا تو آپ کی محبت کے لئے آؤں گا نہ کہ حویلی کے لئے۔"

"نہیں نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میرا اپنا کوئی بھی نہیں۔ لوگ گدھوں کی طرح تاک لگائے میرے مرنے کے منتظر ہیں۔ ان کا بس چلے تو ابھی قبضہ کرلیں۔ تم تھے تو مجھے تقویت تھی مگر میں تمہیں روک بھی نہیں سکتی۔ تمہاری زندگی کا سوال ہے۔ جاؤ مگر واپس آجانا۔"

آنسو کا ایک قطرہ ان کے جھریوں بھرے منہ پر آکر ٹھہر سا گیا تھا۔ میں بھی ان گدھوں کو جانتا تھا جو منڈلا رہے تھے۔ لیکن اس وقت کسی کی ہمت نہ تھی کہ حویلی پر قبضہ کرے مگر لوگ للچائی نظروں سے حویلی کو دیکھ ضرور رہے تھے۔

ملازمت کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ برس دو برس پر میں بیگم صاحب سے ملا ضرور مگر ہر بار مجھے ایسا محسوس ہوا کہ حویلی اور بیگم صاحب دونوں ہی قدیم تر اور خستہ تر ہوتی جارہی ہیں۔ بھائی جان، ضیا صاحب، رئیس صاحب، سب حویلی سے جا چکے تھے۔ ان کی جگہ جو لوگ آئے تھے وہ مخلص نہیں نظر آتے تھے۔

کوئی پانچ برس کے بعد ایک دن میں اچانک حویلی پہونچا تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ آنگن میں چاروں طرف کباڑ پھیلا تھا، اور کباڑیوں کی موٹی موٹی عورتیں آنگن میں گھوم رہی تھیں۔ کباڑیوں نے حویلی پر قبضہ کر لیا تھا۔ آنگن میں بکرے پیپل کے پتے چبا رہے تھے اور گل داؤدی کے گملے ٹوٹ چکے تھے۔ بیگم صاحب کی حویلی برآمدے میں پڑے ہوئے اس تخت پر سمٹ آئی تھی جس پر نیم مردہ سی بیگم صاحب پڑی ہوئی تھیں۔ وہ بیمار، بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ مجھے دیکھ کر بیگم صاحب کی آنکھیں نم ہو گئیں مگر وہ خاموش رہیں۔ آنسو تھمے تو پتہ چلا کہ ان کے ایک عزیز نے، جو ان کے وکیل بھی تھے، انھیں دھوکا دے کر حویلی کباڑیوں کے نام لکھوا دی تھی۔ کباڑیوں نے آدھی رات کو حویلی پر قبضہ کر لیا تھا۔ بیگم صاحب تنہا اور بیمار حویلی کو لٹتے اجڑتے دیکھتی رہیں۔ حویلی کی جو تھوڑی سی قیمت ملی تھی وہ طاہرہ بیگم یہ کہہ کر لے گئیں کہ اتنے سارے روپئے تم کہاں رکھو گی۔ غائب ہو جائیں گے۔ اور واقعی وہ غائب بھی ہو گئے۔ مجھے شدید گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب میں نے اجازت چاہی تو وہ بلک بلک کر رونے لگیں۔

"میاں صاحب میں نہ کہتی تھی کہ تم مت جاؤ... گدھ چاروں طرف ہیں۔" وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھیں لیکن وہ آنگن میں شور مچاتے ادھ ننگے بچوں اور پیپل کے پتے چباتے موٹے موٹے بکروں کو دیکھتی رہیں، جیسے بکرے حویلی کو اور اس کی بیگم کو چبا رہے ہوں ☆☆☆

ماہنامہ "پیکر" حیدرآباد

کے بیس سال کا نچوڑ

انتخاب "پیکر"

مرتب : اعظم راہی

قیمت : پانچ سو روپے

ادارہ پیکر

۱۱۵۔ برنداون کالونی، ٹولی چوکی،

حیدرآباد ۵۰۰۰۰۸

فون نمبر: 040-55159123

شکیب ایاز

تماشا ہاے سحر کن فکاں ہم دیکھ آئے ہیں
تری شاہی کے سب راز نہاں ہم دیکھ آئے ہیں

خزاں آوارہ پتے کیوں ہوا میں رقص کرتے ہیں
یہ ہم سے پوچھ لو سب این و آں ہم دیکھ آئے ہیں

تری تصویر میں یہ رنگ حیرت خون ہے اپنا
لکھا کیا ہے سر اوراق جاں ہم دیکھ آئے ہیں

لگی تھی آگ کس گھر میں نہیں معلوم ہے لیکن
اٹھا تھا آنکھ سے کس کی دھواں ہم دیکھ آئے ہیں

جو تیرے حرف سن لیں وہ کسی کی پھر نہیں سنتے
ترے لب کا وہ اعجاز بیاں ہم دیکھ آئے ہیں

نئی رات اک مرتب ہو رہی ہے
گھنی برسات جگنو بو رہی ہے

نئے جاڑے کی کچی دھوپ تنہا
مرے گھر میں پسر کر سو رہی ہے

کہیں سیلاب تو آیا نہیں ہے
کنارے پر ٹیٹری رو رہی ہے

یہ لہریں کیوں گلے ملتی ہیں اٹھ کر
وہ کس کی ناؤ بیچ ندی سو رہی ہے

ترپنواں پتہ

عبدالصمد

اس کے ہاتھوں میں تاش کے پتے تھے۔ پورے باون پتے۔

کبھی پتے اکے سے شروع ہو کر بادشاہ تک جاتے۔ اس کی کوشش بھی ہوتی کہ ترتیب ڈھنگ سے ہو، یعنی کبھی پتے اکے سے شروع ہو کر بادشاہ ہی تک جائیں، لیکن کبھی کبھی اس میں بے ترتیبی بھی ہو جاتی اور پتے بادشاہ سے شروع ہو کر اکے تک جا پہنچتے۔ کبھی اس بے ترتیبی میں بھی مزید بے ترتیبی آجاتی یعنی شروع جہاں سے بھی ہو، درمیان میں کبھی چھکا، کبھی پنجا، کبھی.. یوں اس سے فرق بھی کیا پڑتا۔ تھے تو سبھی تاش کے پتے اور تھے تو سب اسی کے ہاتھوں میں۔

دراصل ان پتوں میں نہ کوئی ترتیب تھی نہ بے ترتیبی۔ سب کے اپنے اپنے رنگ اور سب کے اپنے اپنے مزاج۔ قدر مشترک تھی تو بس یہ کہ سبھی پتے اس کے ہاتھوں میں سمٹے ہوئے تھے، وہ جب چاہے کسی ایک میں جھانک لے، چاہے تو اپنا چہرہ دیکھ لے، چاہے تو کسی اور کا اور چاہے تو ان کے ذریعہ کسی معنویت تک بھی جا پہنچے۔

لگاتار آٹھ بیٹیوں تک اس کا باپ وہ چیز ثابت نہیں کر سکا تھا جو چیز اس کی پیدائش کے بعد خود بہ خود ثابت ہو گئی تھی۔ اس کا باپ ایک مسلسل کھانستا اور بیڑی پھونکتا ہوا، اپنی عمر سے کہیں زیادہ معمر دکھائی دینے والا، زندگی میں کبھی کوئی ڈھنگ کا کام اختیار نہیں کرنے والا، لگاتار بچہ پیدا کرنے والا اپنے بیوی کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھنے والا، اپنا اور اپنے بچوں کے مستقبل کی مطلق فکر نہیں کرنے والا، سماج میں اپنا کبھی کوئی یوگ دان نہیں دینے والا ایک ایسا شخص تھا جس کی ساری برائیاں ایک اس کی پیدائش کے بعد اچانک اچھائیوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ بلا سے وہ ایسا ہے، ایسا ہے تو ہے، ایسا نہیں ہے تو نہیں ہے، ہے تو ایک بیٹے کا باپ۔ خاص طور پر ان کی نگاہوں میں جو بہت دنوں کے بعد بھی ایک چوہے کا بچہ پیدا نہیں کر سکے تھے یا وہ جو صرف بچیاں پیدا کرنے کی مشین تھے۔

معنویت پیدا کرنے کی کوشش میں وہ اکے کے خانے میں جھانک سکتا تھا نہ بادشاہ کے۔ صرف دگی یا زیادہ سے زیادہ تگی یا پھر چوا۔ وہ اسے تاج پہنانے کی بات اس لئے بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ محض اس کا باپ تھا۔

اس کا اپنا باپ۔ جس نے کبھی اسے دنیا میں آنے کا سبب نہیں بتلایا۔

پھر وہ جو اپنی کھوئی اور نامکمل ذات کی تکمیل کے لئے، اپنے آلودہ نفس کی تسکین کے لئے، اپنی کج کلاہی کو بغیر کسی معقول وجہ کے برقرار رکھنے کے لئے، اپنے کمزور اعتماد کی زبردستی بحالی کے لئے وہ اپنے خون کے رنگ کو خواہ مخواہ دوسروں سے جدا کرنے کی ضد میں کسی کا بلا تکلف گلا کاٹ سکتے تھے، کسی کے سر کو اپنے نیزے پر اٹکا سکتے تھے، کسی ماں کے کلیجے کی ٹھنڈک میں آگ لگا سکتے تھے، کسی سیندور بھری مانگ میں بے دھڑک خاک بھر سکتے تھے۔ ان کے نزدیک گناہ اور ثواب کے معیار ہی کچھ اور تھے۔ ان کے سارے معنی و مطلب ان کے اپنے تھے۔

انھیں کس پتے سے ثابت کیا جاتا؟

دگی، تگی، چوے میں تو وہ سما ہی نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے اتنا کچھ کر ڈالا تھا کہ کچھ تو ان کے شایان شان بات کرنی تھی۔

بادشاہ اور بیگم کے تاج ان کے سر پر کسی طرح فٹ ہی نہیں ہوتے تھے اور غلام کہنا، ان کا نہیں، خود کہنے والے کا مذاق ہوتا۔ لے دے کے گنتی کے کچھ درمیانی پتے ہی رہ جاتے، پنجا، چھکا، ستا، اٹھا۔ کیا ان میں کسی ایک کے ذریعہ ان کی پہچان پیدا کر کے چین کی سانس لی جا سکتی تھی؟

پھر وہ، جنھیں کسی قیمت پر دگی، تگی، چوا، پنجا، چھکا وغیرہ میں رکھنا ممکن نہیں تھا، وہ صرف اونچی سے اونچی مسند ہی پر مطمئن ہو سکتے تھے اور اونچی سے اونچی مسند کے آس پاس یا تو اکا ہوتا یا پھر بادشاہ اور بیگم۔ یہ وہ تھے جو محض اپنی انا کی تسکین کے لئے دریاؤں کے رخ موڑ دینے کی کوشش کرتے، ہواؤں سے پنجہ لڑاتے، ایک نسل کو دوسری، اور تیسری کو چوتھی نسل میں تبدیل کرنے کے پروگرام پر عمل کرتے، اکثریت کو اقلیت میں اور اقلیت کو اکثریت میں بدلنے کے فارمولے ایجاد کرتے، تاریخ کے سفید صفحات کو سیاہ اور سیاہ صفحات کو سفید ثابت کرتے، اپنی زرق برق جھولیوں میں نفرت کے بیج لے کر چلتے، اپنے چاروں کھونٹ پھلواریوں کو آگ کے جہنم میں تبدیل کرتے۔

انھیں اگر تاج پہنا دیا جائے تو پھر بادشاہ؟

تاج کے ساتھ ایک بھیانک، کریہہ، منحوس اور خوفناک چہرہ جڑ جائے گا تاج سے جس کی کبھی کچھ بھی مناسبت نہ ہوگی۔

تو پھر یہ کہ تاش کے پتوں میں بادشاہ سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے اکا۔

لیکن اکا، اکا ہے، چاہے اس پر جو رنگ چڑھا دیا جائے، وہ اپنی اور صرف اپنی نمائندگی کر سکتا ہے کسی اور کی ہرگز نہیں۔ ان تمام الجھاووں کے باوجود تاش کے ان پتوں کو وہ برابر پھینٹتا رہتا، کبھی ترتیب دیتا کبھی الجھا دیتا۔ لال پتہ پہلے، اس کے بعد کالا، اینٹ اس کے بعد، چڑیا بعد میں۔

کبھی چڑیا پہلے۔ اس کے بعد اینٹ، پھر لال۔ کبھی کالا۔ کبھی چڑیا۔ کبھی یوں بھی کہ لال کی صف میں کالا، کالے کی صف میں لال، اینٹ میں چڑیا، چڑیا میں... کبھی یوں، کبھی یوں...

گائے کا سینگ بیل میں، بیل کا سینگ...

یہ کھیل تو کبھی ختم ہونے والا تھا ہی نہیں، ایک کھیل سے دوسرا کھیل

دوسرے سے تیسرا تیسرے سے چوتھا ایک مضبوط اور مربوط سلسلہ۔ وہ اپنی گڈی کو مضبوطی سے پکڑے رہتا اور کسی قیمت پر ایک پتے کو بھی اپنے ہاتھ سے پھسلنے نہیں دیتا تھا کہ پھر اس کے پاس رہ کیا جاتا۔

(۲)

نہ جانے کب اور کیسے وہ لوگ وہاں آ کر جم گئے تھے۔ اس کے مکین تو بہت پہلے اس مکان کو چھوڑ گئے تھے۔ پھر ان میں سے دیکھنے بھی نہیں آیا، نتیجہ کچھ دنوں کے بعد مشہور ہو گیا خالی مکان، بھوتوں کا استھان۔ یہ لوگ کبھی رات کو دن میں ملا دیتے کبھی دن کو رات میں۔ وقت بے وقت کی جھنکار، ملے جلے بلند و بام قہقہے، ہچکولے کھاتے بے سرے گیت۔ کوئی ان کے ہاں جاتا نہ وہ کسی کے ہاں آتے یعنی مقامی لوگ۔ ویسے ان کے ہاں باہر سے آنے جانے والوں کی کمی نہیں تھی۔ اجنبی اور پراسراریت کے دھندلکے میں چلتے پھرتے کچھ سائے۔ روشنیوں سے وہاں کی زمین اور وہاں کا آسمان روشن رہتے، طرح طرح کی چہ میگوئیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا اور بس، پھر خاموشی۔

کچھ عرصے کے بعد یہ چیز معمول بن گئی تو ایک ہی منظر کے بار بار طاری ہونے سے کسی کو دلچسپی نہیں رہی۔ صرف ایک چیز مستقل رہی۔ اس کے سامنے سے جو گذرتا اس پر ایک تمسخرانہ مسکراہٹ کا پیلا پھول ضرور چڑھا دیتا۔ وہ لوگ ہمیشہ گروہ میں باہر نکلتے۔ کبھی ایک آدھ شخص تنہا نظر آ جاتا تو سب کے مذاق کا نشانہ بن جاتا۔

آنکھوں سے دیکھے ہوئے روز کے اس منظر کو سمجھنے کی وہ بہت کوشش کرتا لیکن ناکام، یوں اس منظر کا وہ کبھی بھی حصہ دار نہیں تھا، اس کے پاس جو کچھ بھی تھا دور کا جلوہ۔ اس کی اپنی دنیا تو تاش کے پتوں میں بند تھی۔ جو کچھ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا۔ اسے نہایت خاموشی اور دل سوزی کے ساتھ اپنے پتوں کے گھیرے میں لے آنے کی کوشش کرتا۔

اس کے پتے باون ضرور تھے لیکن اس کے کارڈ صرف باون نہیں تھے۔ دراصل اس کی خارجی اور داخلی دنیاؤں کا کوئی شمار ہی نہیں تھا۔

دنیائیں جو اس کی آنکھوں نے دیکھی تھیں۔

دنیائیں جو اس کی سوچ نے وضع کی تھیں۔

دنیائیں، جن کا وہ تصور کرتا رہا تھا۔

اس کے پاس تاش کے باون پتے نہیں، باون اسکرین تھے جن پر وہ جب چاہتا، اپنی کسی پسندیدہ یا ناپسندیدہ دنیا کو دیکھ لیتا۔ اس نے اپنے طور پر ایک بہت بڑا خزانہ حاصل کر لیا تھا جس کا اس کی ذات سے باہر کسی کو پتہ نہیں تھا۔

وہ پتے جو ہر دم اس کی مدد کو تیار رہتے۔ اس کے ایک اشارے پر دنیا کو اس کی مٹھی میں بند کر دیتے، ان کی بدولت ساری دنیا کو وہ اپنی جیب میں لئے پھرتا۔ وہ پتے بے بسی سے اس کا منھ تاک رہے تھے۔ وہ ان کے بارے میں جتنا سوچتا، جتنا جاننے کی کوشش کرتا، اس کا ذہن اتنا ہی الجھتا جاتا۔ وہ کون سے ایسے کام کرتے ہیں جو مرد نہیں کرتے؟ وہ کون سے ایسے کام کرتے ہیں جو عورتیں نہیں کرتیں؟

اس کی آنکھیں تو روز دکھاتیں کہ مردوں کے بہت سے کام عورتیں انجام دیتی ہیں اور عورتوں کے بہت سے کام مرد اپناتے ہیں۔ ان پر کوئی انگلی نہیں اٹھاتا، انھیں کسی خاص مخلوق کے خانے میں نہیں رکھا جاتا، ان کا کوئی مذاق نہیں اڑاتا، پھبتی نہیں کستا، اکیلے دکیلے دیکھ کر کوئی چھیڑ خانی نہیں کرتا، انھیں رات کے روشن اندھیروں اور دن کے تاریک پردوں کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔

معنی کی تلاش میں وہ جتنا سر کھپاتا، بے معنی دنیاؤں کے دروازے اس پر کھلتے جاتے، بے معنویت کا ایک جال سا اس کے چاروں طرف بنتا جاتا۔ اس عالم میں اسے اپنا وجود بھی بے معنی معلوم ہونے لگتا۔ اس کی آنکھوں پر ایک ایسی عینک چڑھ جاتی جس کے شیشے بے معنویت کے پادرے سے بھرے ہوتے۔ اسے تاش کے پتے بھی بے معنی نظر آنے لگتے۔ کہاں کا بادشاہ، کہاں کی بیگم۔ نہ اکا، نہ دگی، نہ تگی، نہ چوا، نہ پنجا۔ البتہ ترپنواں پتہ یعنی جوکر جس کو کسی معنی سے جوڑنا پہلے بھی بیکار تھا، اب بھی عبث۔ جوکر کا جو کام ہے، وہ آج بھی کر رہا ہے، کل بھی کر رہا تھا اور آنے والے کل میں بھی کرے گا۔ دراصل اس کی بے معنویت میں بھی ایک معنی پوشیدہ ہے۔

کیوں نہ وہ یوں سر کھپانے کے بجائے ان کے پاس چلا ہی جائے، انھیں براہ راست سمجھنے کی کوشش کرے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے بدن میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ اسے محسوس ہوا، آبادی کے اس گہرے اور بے حد گہرے سمندر کے بیچوں بیچ ایک جزیرہ اگ آیا ہے۔ اس پر چاروں طرف سے برچھیاں حملہ آور ہو رہی ہیں۔ ان برچھیوں کا سیدھا اور تیکھا زہریلا اثر اس کے جسم کی ڈھال پر تھا۔

وہاں جانے کی بے انتہا خواہش اور وہاں نہ جانے کی زبردست روک نے اس کے اندر ایک ایسے تجسس کو جنم دیا جس کی آمد و رفت کے بھی راستے اور سوچ کے سارے دھارے اسی مکان پر جا کر ختم ہوتے تھے۔ وہ جب بھی نظر آ جاتے اور تمسخر اڑانے والوں کی ایک بھیڑ انھیں گھیر لیتی تو موقع غنیمت جان کر وہ دور ہی سے انھیں بغور پڑھنے کی کوشش کرتا رہتا۔ کوئی نہ کوئی چیز ان کے اندر اسے ایسی ضرور نظر آ جاتی جسے فی الحال وہ کوئی نام دینے سے قاصر رہتا۔ وہ مرد تھے یا عورت، اس سے اس کو کوئی مطلب نہیں تھا، وہ تو اس پہچان کو پکڑنے کی کوشش کرتا جو ان کے لئے مخصوص تھی۔ یعنی وہ چیز جو بھیڑ میں انھیں کھونے سے بچا لیتی تھی۔

وہ کیا چیز تھی؟

(۳)

لوگ کہتے کہ وہ تیسری مخلوق ہیں۔ وہ سارے وہ کام کرتے ہیں جو مرد نہیں کرتے۔ وہ، وہ کام بھی کرتے ہیں جو عورتیں نہیں کرتیں۔ اس کے کچے اور نیم بالغ ذہن میں کوئی تصویر بن نہیں پاتی تھی۔ تاش کے پتے خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے۔

(۴)

اسے اکثر محسوس ہوتا کہ وہ ایک نہایت حقیر ہلکا پھلکا، نچا نچایا، ڈال سے ٹوٹا ہوا ایک بے مصرف سا پتہ ہے جو تیز لہروں کے ساتھ، بہتے ہوئے سمندر میں تیزی سے ہچکولے کھا رہا ہے۔ اگر وہ کہیں ٹھکانے لگے گا بھی تو کوڑے کے

انبار کی صورت، بہت سے بے مصرف، ڈال سے ٹوٹے ہوئے پتوں کے ساتھ۔

بے شمار پتے اس کے ساتھ بہہ رہے ہیں۔ کوئی منزل نہیں، کوئی سمت نہیں، سمندر کی لہریں انھیں جہاں لے جائیں، کوڑے کے انبار کی صورت جہاں پٹکیں۔ سمندر کی تیز و تند موجوں کا بھی اپنا ایک مزاج ہے کہ وہ کسی کو اپنے آس پاس مستقل ٹھکانا بنانے نہیں دیتیں، ان کی تندی بالآخر انھیں فنا کر ڈالتی ہے، وہ فراخ ہوتیں تو سمندر اب تک کوڑے کے ایک بڑے انبار میں تبدیل ہو گیا ہوتا۔ سمندر کی لہروں میں پتے کی صورت بے سمت بہتے جانا۔ کوڑے کے انبار کی صورت ذرا دم لینا۔ پھر سمندر کی مضبوط لہروں کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اتر جانا۔ یہ سب اسے زندگی کا سب سے بڑا فلسفہ معلوم ہوتے۔ حالانکہ اس کی موشگافیوں سے بہرہ ور ہونا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ مٹھی بند ہوتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر کچھ ہے، مٹھی کھل جاتی ہے تو حقیقت سامنے آجاتی ہے۔

تاش کے پتے گویا سحر و ساحری کے آئینے تھے جن میں وہ ساری دنیا کو دیکھ لینے کی کوشش کرتا۔ اسے ایسا لگتا کہ ساری دنیا اس نے اپنی مٹھی میں بند کر لی ہے، لیکن کیا یہ سچ تھا؟

اس کی خواہش تھی کہ وہ ان کے قریب جائے، انھیں غور سے دیکھے، انھیں جاننے کی سمجھنے کی کوشش کرے۔ لیکن وہ اس بھیڑ کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا جو ان کے وجود سے لطف اٹھانے کے لئے اکٹھا ہو جاتی تھی۔ ان کی روشنی اور رات کی سیاہی نے ان کا جو ہیولیٰ بنا دیا تھا، ان کے پیش نظر وہ ان کے ہاں نہیں جا سکتا تھا۔ ایک ان دیکھی لیکن آہنی دیوار درمیان کھڑی تھی جسے پار کر جانا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔

اس دن تیز آندھی اور طوفانی بارش میں وہ گھر نہ جاتا اور وہ اسے کھینچ نہ لیتے تو شاید یہ دیوار قیامت تک یونہی کھڑی رہتی۔

(۵)

عورت اور مرد دونوں نظر آنے کی وہ کوشش نہ کرتے تو ان میں اور اس میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ ان کے بال بڑے بڑے تھے۔ کوئی خاص بات نہیں، بہت سے مردوں کے بال بڑے ہوتے ہیں۔ انھوں نے زنانہ لباس زیب تن کر رکھے تھے۔ یہ بھی کچھ خاص بات نہیں، مردوں اور عورتوں کے لباس کی تفریق انتہائی دقیانوسیت ہے۔

وہ عورتوں کی طرح مٹکتے ہیں۔ بہت سے مرد عورتوں کی طرح مٹکتے ہیں۔ وہ ہاتھ نچاتے، آنکھیں چمکاتے ہیں۔ ایوان قانون ساز میں یہ نظارے روز دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انداز اور آواز میں زنانہ پن۔ یہ تو فیشن ہے۔ بس یہ کہ کچھ ایسی حرکتیں ان سے سرزد ہو جاتی ہیں جو کہ لوگوں کی آنکھوں کا شہتیر بن جاتی ہیں اور کچھ لوگوں کے پیٹ میں گدگدی کرنے لگتی ہیں۔

وہ سب بڑی اپنائیت سے اسے دیکھتے رہے۔ وہ ان میں اس قدر کھو گیا کہ یہ بتانا اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ شاید انھوں نے دریافت بھی کیا ہو، لیکن وہ ایک ایسے ٹرانس میں تھا کہ اسے کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔ وہ سب عام انسان ہوتے ہوئے بھی عام انسان نہیں تھے۔ وہ عام ڈگر سے ہٹ کر جس راستے پر گامزن تھے، وہ راستہ یقیناً غیر معمولی تھا۔ مرد ہو کے مرد رہنا یا عورت ہو کے عورت رہنا اہم نہیں کہ روز ازل سے روز ابد تک کا یہ ایک مستقل عمل ہے۔ اس پردے میں بہت کچھ چھپ بھی جاتا ہے۔ لیکن مرد ہو کے عورت ہونا یا عورت ہو کے مرد ہونا ضرور کچھ خاص ہے۔

ان میں کچھ اتنے وجیہ تھے کہ انھیں مرد کا مکمل لباس پہنا دیا جاتا تو وہ یقیناً ایک خوب رو مرد نظر آتے اور کچھ اتنے دل کش تھے کہ اگر انھیں مکمل عورت بنا دیا جاتا تو اندر سے یقیناً ایک نہایت خوبصورت عورت برآمد ہوتی۔ لیکن یہ کوشش کون کرتا؟ انھوں نے دونوں طرف سے آدھے راستے طے کر لئے تھے اور آدھے راستے پر رک گئے تھے۔

کوئی اس کا سر دبانے لگا، کسی نے اس کے پیر سنبھال لئے، کوئی اس کے ہاتھوں کو ہلکے ہلکے دباتا رہا، کوئی گرم پانی لے کر دوڑا، کوئی ٹھنڈا پانی، کسی کے ہاتھ میں دودھ کا پیالہ تھا، کوئی شربت کا گلاس لئے کھڑا تھا۔ ان کے چہروں پر مہین اور گھنے حروف میں صرف ایک ہی عبارت درج تھی۔ خلوص کی۔ اسے لگا کہ وہ کسی نئی دنیا میں آ گیا ہے اور نئی دنیا والے اسے ہاتھوں ہاتھ لے رہے ہیں۔ وہ اسے خواہ مخواہ بیمار سمجھنے پر تلے تھے۔ شاید یہ بھی خلوص ہی کا ایک روپ تھا۔ جی تو چاہتا تھا کہ یہاں سے نہ جائے اور ان کے ساتھ ہی رہنا شروع کر دے۔ لیکن یہ ایک بڑا فیصلہ ہوتا جس کا وہ فی الحال متحمل نہیں تھا۔

شاید اسے اپنی جون ہی تبدیل کرنی پڑتی۔ فی الوقت اس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا۔ جانے کا۔

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں اب جاؤں گا۔“

اس نے ممنون نگاہوں سے ان کی حیرانی دور کرنے کی کوشش کی۔

انھوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور زیر لب مسکرائے۔

”تم بہت خوبصورت ہو۔“

وہ جھینپ گیا۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ اس تعریف پر اسے خوش ہونا چاہئے یا... لیکن وہ انھیں تذبذب میں چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

تم بہت خوبصورت ہو۔ تم بہت خوبصورت ہو۔

آواز دیر تک اس کا پیچھا کرتی رہی۔

نک سک سے وہ درست ہی نہیں بلکہ بہت درست تھا۔ دوست اس کا برملا اعتراف کرتے لیکن دوستوں کی آنکھیں خلوص سے ڈھکی رہتی ہیں۔ کچھ نگاہوں میں اس نے قیمتی موتی ضرور پائے تھے،، انھیں قیمتی خزانے کی طرح دل کی اتھاہ گہرائیوں میں چھپی سونے کی اس ڈبیہ میں رکھ چھوڑا تھا جو بچپن میں کہانیوں کی خوبصورت پری اسے دے گئی تھی۔

بھاگ آنے کے بعد پہلا کام جو اس نے انجام دیا، وہ آئینہ دیکھنے کا تھا۔

”تم بہت خوبصورت ہو۔“

شیشوں کی سرگوشی نے اس کے چھپے خزانے کی کئی پرتیں ہٹا دیں۔ اس کے کانوں میں یہ جملہ مسلسل گشت کرنے لگا۔

جن کی باتوں پر توجہ نہیں دی جاتی، جنھیں کچھ اہمیت نہیں دی جاتی، جن کی گواہی معتبر نہیں سمجھی جاتی۔ وہ رات کو رات کہیں تو رات کی سیاہی مشکوک ہو جائے، دن کو دن کہیں تو دن کی روشنی پر ایک سیاہ سوالیہ نشان ابھر آئے، وہ کہتے ہیں کہ ..

اس نے تاش کے پتے نکالے۔ اس وقت اچانک بادشاہ ہی ایک ایسا پتہ نکلا جو خود بہ خود اس کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ راجہ کے سینے پر راجہ ہی کا تمغہ اچھا سجتا ہے۔ دگی، تگی، چوا، پنجا۔ ان کی تو اس وقت کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ ان پر ایک نگاہ غلط انداز بھی ڈالنا اس کے لئے محال تھا۔

اسے محسوس ہوا کہ جن معنی کی تلاش میں وہ اتنے دن سر کھپاتا رہا، وہ اب بہت جلد اس کی جھولی میں آ گریں گے۔ وہ اس کے سامنے رہ کر بھی اس سے دور رہے۔ ایک ہلکا سا پردہ درمیان حائل رہا۔ یوں کہ صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں۔ اس کے اندر ایک نیا عزم بیدار ہوا۔

(۶)

"تم بہت خوبصورت ہو۔"

یہ اطلاع اسے پہلی بار نہیں دی گئی تھی۔ اس چیز نے کئی بار اسے جھینپنے پر بھی مجبور کیا تھا۔ اس کے شباب سے بھرپور پٹھوں کی تعریف کی جاتی، اس کی عقابی نگاہوں کی تعریف ہوتی، اس کے شیر جیسے سینے اور چیتے جیسی کمر کا ذکر ہوتا، اس کے مضبوط ارادوں اور ثابت قدمی کے بارے میں کچھ کہا جاتا تو شاید... لیکن کچھ جھوٹ ایسے ہوتے ہیں جنھیں سچ کا لباس بھی راس نہیں آتا۔ یہ وہ تعریفیں تھیں جو اس نے کتابوں میں پڑھی تھیں اور رشک بن کر اتنی تیزی سے اس کی آنکھوں کے سامنے جھانک جھانک کر اسے احساس کمتری میں مبتلا کرتی تھیں۔

چاند کو ہاتھ بڑھا کر کوئی چھو سکا ہے بھلا؟

بے توجہی، لاپروائی اور غربت نے جابجا اپنے نقوش چھوڑے تھے، لیکن اب بھی کچھ زیادہ نہیں بگڑا تھا۔ اس کے چہرے اور بدن کی نسوانیت اور کم سنی اس کا سرمایہ تھے۔ راہ چلتی سرگوشیوں سے اس کے کان کی لویں سرخ ہو جاتیں، چہرے پر خون کی لکیریں ابھر آتیں، آنکھوں سے گرم دھواں نکلنے لگتا۔ جب تک وہ ان چیزوں کو جمع کر کے کوئی ٹھوس شکل دے، سرگوشیاں ہواؤں میں تحلیل ہو جاتیں اور وہ ان میں ہاتھ پاؤں مار کر رہ جاتا۔ اس قسم کی باتوں کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔

سامنے والے مکان میں جو موٹریں آتیں، ان کی دھیمی چالوں اور ان کی پیٹھ پر لدی سرگوشیوں میں ایک نامعلوم سا تعلق دیکھتا۔ اسے جستجو ہوتی کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جو دبیز شیشوں اور بھاری پردوں میں چھپ کر آتے اور رات کی تاریکی میں گم ہو جاتے ہیں۔ وہ روشنی سے کیوں بھاگتے تھے، یہ بات پہلے اس کی سمجھ سے باہر تھی، اب کچھ کچھ آنے لگی تھی۔ حاشیے پر کھڑے، بظاہر بے مصرف لوگوں کے ہاں کچھ لوگوں کا یوں چپ چاپ آنا اور چپ چاپ نکل جانا یقیناً سوچنے کی بات تھی۔ سوچ تو کچھ اور لوگ بھی رہے ہوں گے اور شاید کچھ نتیجے پر بھی پہنچے ہوں گے لیکن وہ سیدھی راہ پر اس وقت گامزن ہوا جب اس کی پیٹھ کا بوجھ ہلکا ہو کے اس کے سامنے آیا۔

(۷)

اس کی کم سن سوچ اور اس کے ذریعہ معنی کا لباس پہنائے ہوئے تاش کے باون پتے اسے یہ سمجھانے میں ابھی تک قاصر رہے تھے کہ کون سی مخلوق دراصل کس کام کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ جانوروں، چڑیوں، پھولوں، درختوں، پہاڑوں، دریاؤں، صحراؤں، سمندروں، میدانوں، ہواؤں، فضاؤں، زمین و آسمان وغیرہ وغیرہ کے مقاصد تو کچھ کچھ سمجھ میں آتے لیکن اپنے مقصد کی یاوری تک پہنچنا اسے سب سے مشکل امر لگتا تھا۔ بظاہر اس جون میں دو ہی قسم تھی، تیسری قسم تو ان دونوں کے درمیان سے اچھل کر حاشیے پر جا گری تھی۔ ان مختصر قسموں کے اتنے بھانت بھانت کے رنگ تھے کہ یہ فیصلہ کرنا واقعی مشکل تھا کہ کس کا اصلی رنگ کون سا ہے۔

اس نے اسکول کی کتابوں میں جو قصے پڑھے تھے اور ان کے تعلق سے جو رنگین خوشنما تصویریں دیکھی تھیں، انھیں اپنے درمیان دیکھنے کے لئے اس کی آنکھیں آج تک ترستی تھیں، ان قصوں اور تصویروں کو نہیں دیکھنا تھا تو پھر انھیں نصاب میں کیوں رکھا گیا؟ ان پر بیش بہا وقت اور محنت کیوں صرف کی گئی؟ ان پر مشتمل سوالوں کو زندگی کے مستقبل سے کیوں جوڑا گیا؟

یہ سوالات اس کے سامنے تجریدی آرٹ کی لکیروں کی طرح کھینچے رہتے تھے۔ ان میں وہ کوئی معنویت تلاش کرنے میں سخت ناکام رہا۔ اس کے پتے بھی اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ سب کچھ آپس میں گڈمڈ تھا۔

(۸)

وہ غلیظ سا آدمی، انتہائی قیمتی، خوبصورت، امپورٹیڈ گاڑی میں آتا، رنگ برنگے بیش قیمت کپڑے پہنتا۔ گلے میں سونے کا بھاری چین، ہاتھوں میں قیمتی نگینوں سے مزین انگوٹھیاں۔ سر کے بال اور مونچھوں پر اس کمال ہنرمندی سے پالش کرواتا کہ وہ سرتاپا سیاہ معلوم ہوتے۔ چہرے اور گردن پر اس فنکاری سے فیشل کرواتا کہ جھریاں منھ چھپا کر کہیں دور بھاگ جاتیں۔ یوں وہ کوئی بدہیئت یا کریہہ شکل کا نہیں تھا۔ اتنی محنت اور سرمایہ کاری کے بعد کوئی آدمی بدصورت کیسے رہ سکتا ہے لیکن اس کی آنکھیں... دراصل اس کی آنکھیں تھیں جو اسے غلیظ بناتی تھیں۔

اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں سے پتہ نہیں کون سی شعاعیں نکلتیں کہ ان کی زد میں آ کر وہ ہمیشہ بے چینی سی محسوس کرتا۔ اسے لگتا کہ اس کے اندر جو بھی سانسیں جا رہی ہیں وہ تعفن سے بھری ہیں، اس کے اندر آکسیجن نہیں، گندی، زہریلی ہوائیں داخل ہو رہی ہیں۔ وہ آدمی زبان سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ ضرورت بھی نہیں تھی، کہنے سننے کا سارا کام تو اس کی آنکھیں انجام دیتی ہی تھیں۔ اگر وہ زبان سے بھی کام لیتا تو شاید اتنا غلیظ دکھائی نہ دیتا۔

چلتے چلتے اس کی قیمتی اور بے آواز موٹر آہستگی کے ساتھ، اس کے قدموں سے ہم آہنگ ہو جاتی تو جیسے اس کے بدن پر کوئی تیز گرم پانی انڈیل دیتا۔ اس کے جسم پر آگ کی چیونٹیاں دوڑنے لگتیں اور وہ ایک بالکل دوسرا آدمی بن کر اپنی پناہ گاہ ڈھونڈنے لگتا۔ اس وقت اتفاق سے ایک آدھ ایسا شخص ضرور کہیں سے نمودار ہو جاتا جس کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ رینگنے لگتی۔ اس وقت اس کے

جسم کی چیونٹیاں کا کروچ بن جاتیں جن کے سرسرانے کی اذیت کاٹنے سے کہیں زیادہ تھی۔ نامعلوم شخص کی مسکراہٹ اور گاڑی والے کے درمیان پتہ نہیں کون سے نامعلوم رشتے کی ڈور سلجھنے لگتی کہ اس کا دماغ اس پہاڑ کی مانند ہو جاتا جس کے اندر آتش فشاں کھول رہا ہوتا ہے۔

(۹)

اس کے ہاتھوں میں ایک بے حد الجھی ہوئی ڈور آ گئی تھی جس کو سلجھاتے سلجھاتے وہ بے دم ہو چکا تھا اور قرائن بتاتے تھے کہ وہ ساری زندگی انھیں سلجھا نہیں سکے گا۔ تاش کے پتوں میں وہ اپنے آپ کو بادشاہ سے کم دیکھنے پر کسی طور پر رضامند نہیں تھا اور ڈور اسے بار بار دگی، تگی، چوا، پنجا وغیرہ کی صف میں لا کھڑا کرتی۔ سوچ اور عمل کے تضاد نے اسے کہیں کا نہیں رکھا اور وہ بوکھلاہٹ اور جھنجلاہٹ کا استعارہ بنتا گیا۔ اس کے کان میں بھنبھناہٹ ہوتی۔ وہ بڑا آدمی آخر اس سے کیا چاہتا ہے؟

وہ تو ایک بہت ہی عام سا، جوان ہوتا ہوا بندہ ہے، صحت ذرا اچھی ہے اور شکل وصورت ایسی کہ بار بار آئینہ دیکھنے کی خواہش پیدا ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے پٹھے مضبوط ہوں، سینہ فراخ، کمر پتلی اور عزم وہ جو راجہ کو فخر اور فتح یابی کے تاج پہناتے ہیں، جہاں اس کی مسیں بھیگی ہیں وہاں دولت کا چشمہ جاری ہو جائے، لیکن یہ سب کیسے ممکن ہو سکے گا؟ یعنی وہ جس راستے پر جانا چاہتا ہے، اسے چھوڑ کر بالکل مخالف سمت میں مڑ جائے۔

اسے اپنی بند آنکھوں میں ایسا منظر دکھائی دیتا جس میں چڑیائیں دریا میں تیر رہی ہوتیں، بطخیں ہواؤں میں اڑ رہی ہوتیں، گائیں ہل میں جتی، بیل دودھ دے رہے ہوتے، سانڈ بکریوں سے دوستی گانٹھ رہے ہوتے، شیر گیدڑوں سے ڈر رہے ہوتے ہرنیاں چیتوں کے ساتھ قلانچیں بھر رہی ہوتیں، چیتے انھیں خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہوتے، کتے اور بلیاں مرغوں اور چوزوں کو دانا کھلا رہی ہوتیں اور مرغیاں شوخی سے ان کے گلے میں بار بار چونچ مار رہی ہوتیں۔

سارا منظر عجیب نامانوس واقعات سے بھرا پڑا ہوتا۔ کسی کی کوئی کل سیدھی نہیں، پشت در پشت جو چیزیں آنکھوں اور کتابوں کے سمندر میں خوشنما جزیروں کی طرح لہلہاتی رہیں، وہ غلط۔ آج تک جنھیں صحیح سمجھتے رہے وہ سب غلط، آج تک جنھیں غلط سمجھتے رہے، وہ سب صحیح۔ اس کے ذہن میں یہ سوال کلبلانے لگتا کہ سامنے والوں میں اور اس میں آخر فرق کیا ہے؟ وہ کون سا خط امتیاز ہے جو اس کے اور ان کے درمیان کھنچا ہوا ہے؟ وہ سب لوگوں میں شامل ہی رہتے تب بھی کیا فرق پڑ جاتا؟

"تم بہت خوبصورت ہو"

شاید وہ واقعی اچھا لگا اس لئے وہ بے دھڑک کہہ بیٹھے۔ اسے ان کی صاف گوئی اچھی لگی، اس کے جسم پر چیونٹیاں نہیں سرسرائیں دوسروں کی چیونٹیوں نے تو کاٹ کاٹ کر اس کے جسم کو لہولہان کر دیا تھا۔ اس سرور کے عالم میں جب اس نے اپنی سوچ کے گھوڑوں کو چابک لگانا شروع کیا تو گاؤں والے آدمی کی غلاظت اسے اچانک کم لگنے لگی۔

(۱۰)

اس کی ضروریات کسی طرح پوری ہو جاتی تھیں بس۔

بازاروں کی تیز روشنیاں آنکھوں کو چکاچوند کرتیں تو وہ اپنے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیتا کہ اس کے پاس فرار کی یہی ایک صورت تھی۔ مشکل یہ تھی کہ دونوں ہاتھوں کی دسوں انگلیاں برابر نہیں تھیں چنانچہ آنکھوں کو ڈھانپنے کی کوشش میں انگلیوں کے درمیان کوئی دراز ضرور ایسی باقی رہ جاتی جس سے باہر کی روشنیاں مہین لکیر کی صورت اندر آ ہی جاتیں۔

جسم کے سب حصوں کے تقاضے یکساں نہیں ہوتے، لیکن کچھ حصے ایسے ضرور ہوتے ہیں کہ سارا جسم ان کا تابع رہتا ہے۔ بازاروں میں آنکھوں کو چکاچوند کرنے والی روشنیاں نہ ہوتیں اور اس کی دسوں انگلیاں بھی برابر ہوتیں تو بہت سے مسئلے سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے۔

انگلیوں کے روزن سے نہ صرف باہر کی روشنیوں کی لکیر اندر آ جاتی بلکہ اس شخص کی امارت، چمک دمک، شان وشوکت، کھنکناہٹ وغیرہ بھی اور تب وہ اپنے وجود کی معنویت پر دیر تک غور کرتا رہ جاتا، خاص طور پر یہ کہ تاش کے کس پتے کو وہ مضبوطی سے پکڑے رہے۔ ادھر وہ راجہ ہی کو دیکھتا رہا تھا لیکن دیکھنے کا یقین کتنا غیر یقینی ہو گیا تھا۔

یہ غیر یقینی اس کے سامنے ایک بڑا سوالیہ نشان بن کر آ کھڑا ہوا۔ اس کی زد میں اس کا اپنا وجود ہر چہار طرف سے خطرے میں گھرا دکھائی دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے پاس ایسا کون سا جوابی نشان باقی رہ گیا ہے جسے وہ کھڑا کر سکے۔

(۱۱)

وہ جب اس قیمتی، چمک دار، اندر باہر سے مہکتی ہوئی گاڑی سے کھن کھن کرتی ہوئی ریزگاری کی طرح اترا تو اس بڑے سوالیہ نشان کے مقابلے پر اتنا ہی بڑا ایک جوابی نشان کھڑا ہو گیا تھا۔ شاید۔ سبھی باون پتے آپس میں یوں گڈمڈ ہو گئے تھے کہ انھیں پہچاننا بہت مشکل تھا۔ اکے نے دگی میں منہ چھپا لیا تھا۔ چوے نے تگی میں، پنجے نے چھکے میں۔

بادشاہ اور بیگم کے چہرے یوں مسخ ہو گئے تھے کہ پہچان میں نہیں آتے تھے۔ باقی سارے پتے جوں منہ بسورے پڑے تھے کہ کسی خانے میں ان کی کوئی گنتی ہی نہیں تھی۔ ہاں مگر ترپتوال پتہ... ترپتوال پتہ اس وقت بڑی شان سے مسکرا رہا تھا۔ مسکراہٹ تو اس کے ہونٹوں پر پہلے بھی رہتی تھی لیکن لوگوں کو نظر نہ آتی تھی۔ اب تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ صرف مسکرا نہیں رہا بلکہ قہقہہ لگا رہا ہے۔ کس قدر خوبصورتی اور چابک دستی سے وہ سب پتوں پر حاوی ہوا تھا، اس کے سامنے سب کے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔

اس نے نہایت مضبوطی سے اسے تھام لیا ☆☆☆

قمر صدیقی

پھر وہی خانۂ برباد ہمارے لیے ہے
وہی غرناطہ و بغداد ہمارے لیے ہے

پھر وہی جھیلنا ہے کرب فراموشی کا
پھر وہی سلسلۂ یاد ہمارے لیے ہے

نیند کے شہرِ طلسمات مبارک ہوں تمھیں
جاگتے رہنے کی افتاد ہمارے لیے ہے

گم ہیں آشوبِ خودی میں ہمیں ورنہ اک شہر
خوں سے تر شور سے آباد ہمارے لیے ہے

ڈھونڈیے عکسِ قمر رات کے آئینے میں
آج کی شب یہی ارشاد ہمارے لیے ہے

وہ بات بات پہ کہتا ہے بے وفا مجھ کو
سکھا دیا انھیں باتوں نے بولنا مجھ کو

میں اپنی ذات میں گم ہو گیا تھا سب سے دور
تری نظر سے ملا ہے مرا پتہ مجھ کو

حقیقتوں سے نظر کب تلک چراؤں گا
کہ بار بار دکھاتی ہیں آئینہ مجھ کو

وہ چاہتا تھا کہ میں اس کی اک جھلک دیکھوں
میں سوچتا تھا کہیں سے وہ دے صدا مجھ کو

بھلائے بیٹھا تھا جس کو میں ایک مدت سے
نہ جانے کیسے وہ پھر یاد آ گیا مجھ کو

مرے خلاف قمر جانے کس کی سازش ہے
بنایا جاتا ہے ہر روز مسئلہ مجھ کو

بر صریر دل شاهم

اسلم فرخی

شہرت کا حال بھی خوشبو جیسا ہے۔ بعض خوشبوئیں ہلکی، بھینی اور مدھم ہوتی ہیں۔ بعض تیز، بعض بہت تیز اور اعصاب شکن۔ فہیم اعظمی کے مستقل طور پر کراچی آنے اور ان سے ملاقات ہونے سے پہلے ان کی جو خوشبو مجھ تک پہنچی تھی، وہ قدرے اعصاب شکن تھی۔ ایک ادبی بوجھ بجھکو نے جو ان سے ذاتی شناسائی دعویدار تھے، مجھے بڑے رازدارانہ انداز میں بتایا تھا کہ ڈاکٹر صاحب جدیدیت کے مارے ہوئے ہیں اور اکثر بڑی تمکنت کے ساتھ کہا کرتے ہیں کہ I am a modern writer۔ ماڈرن اپنے اپنے طور پر بھی ہوتے ہیں لیکن اس شدت پسندی کے ساتھ کوئی اپنے آپ کو ماڈرن نہیں کہتا۔ ڈاکٹر صاحب کی بعض تحریروں میں بھی اسی انداز کی ہلکی سی جھلک نظر آئی، لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ "ادبی افواہ طراز" نے ان کے بارے میں غیر ضروری مبالغے سے کام لیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نئے ذہن، روشن خیالی اور جدید انداز فکر کے حامل ضرور ہیں۔ لیکن "اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے" والی بات نہیں ہے۔ انھوں نے جدید لسانی تشکیل کے فلسفیانہ اسلوب، ادب، ادیب اور قاری کے نئے رشتوں، اور ساختیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اسی فکر و نظر کی ترجمانی کو اپنا حوالہ اور شناخت قرار دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے ایک اور پہلو کا شہرہ بھی سنا تھا جس کی تصدیق بعد میں ہوئی اور میرے لئے خوشگوار حیرت کا سبب بنی۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب کے بارے میں جو اطلاعیں ملی تھیں ان کی بنا پر ذہن میں ایک مبہم اور کسی قدر منفی تصور ضرور تھا۔ جب وہ مستقل طور پر کراچی آ گئے تو میں نے ان سے ملاقات کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ان کا "شنیدہ انداز تمکنت" سرراہ تھا۔ لیکن ایک دن مڈبھیڑ ہو ہی گئی۔

جب ملاقات ہوئی تو مجھے تمکنت کے بجائے خاکساری اور انکسار کا احساس ہوا۔ میں نے انھیں بڑے غور سے دیکھا۔ مناسب قد، دہرے جسم، گول چہرے کے حامل ڈاکٹر فہیم اعظمی اگرچہ سانولے رنگ کے آدمی تھے لیکن ان کی شخصیت میں خیر اور دوسروں کی امداد و اعانت کی سفیدی واضح طور پر نمایاں تھی۔ یہ ایک مہربان اور شفیق انسان کا چہرہ تھا۔ سنجیدہ اور متین انسان کا چہرہ۔ روشن پیشانی، ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ، ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے کا انداز جس سے مزاج کی احتیاط کا اندازہ ہوتا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں بڑی محبت سے ملے۔ بڑی دیر تک گفتگو رہی۔ "صریر" کی اشاعت کا مسئلہ آیا۔ وہ "صریر" کے اجرا کے سلسلے میں بہت سنجیدہ تھے۔ اس کے لئے ایک لائحۂ عمل اور اشاعتی پروگرام مرتب کر چکے تھے۔ ملاقات میں یہ اندازہ بھی ہوا کہ انھیں فلسفے، نفسیات، لسانیات، قدیم تاریخ اور اساطیر سے غیر معمولی دلچسپی ہے۔ عہد عتیق کے آثار پر ان کی نظر بہت گہری ہے اور یہ کہ وہ ادب و شعر میں اپنا راستہ نکالنا چاہتے ہیں۔ میں ان سے باتیں کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ ڈاکٹر صاحب بڑے قاعدے قرینے اور ضابطے کے آدمی ہیں۔ خوش لباس بھی ہیں اور خوش گفتار بھی ہیں۔ ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے میں بھی حسن ادا کا پہلو نمایاں تھا۔ جب میں نے کہا کہ آپ کی شہرت آپ سے پہلے کراچی پہنچ چکی ہے اور آپ نے بے وسیلہ ادیبوں کی کتابوں کے لئے مالی امداد فراہم کی ہے تو وہ خاموش ہو گئے۔ پھر کہنے لگے:

"کہنے والے طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ ان پر دھیان نہیں دینا چاہئے۔"

اس پر میں نے کہا، "کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ نے بعض ایسے لوگوں کی بھی مدد کی ہے جنھوں نے پلٹ کر آپ ہی کو نقصان پہنچایا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کچھ سوچ کر بولے، "ایسی باتوں کو نظر انداز کرنا چاہئے۔ ان سے کیا حاصل، ہر شخص اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے۔" ڈاکٹر صاحب کے اس جواب سے مجھے احساس ہوا کہ ع

بر صریر دل شاہم شوکت گدا ایں است

(سعدی)

اور یہ کہ ان کے یہاں تحمل، بردباری اور عفو و درگذر کی صفت بھی موجود ہے۔ حوصلہ مند نقصان اور برائی کو حوصلے اور صبر سے برداشت کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے اس موضوع پر پھر بھی کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ وہ اس موضوع سے ہمیشہ

گریز کرتے رہے۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہوتا رہا کہ ڈاکٹر صاحب کا عمل خیر مسلسل جاری ہے۔

کراچی کے ادبی حلقوں میں ایک بزرگ ادیب کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کی اچھی پذیرائی ہوئی۔ جلسے بھی ہوئے، تقریریں بھی ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور شہر میں ان کی ادبی سمجھ بوجھ اور علمی تبحر کا چرچا ہوگیا۔ میں نے انھیں انجمن ترقی اردو کی تقریبوں میں مدعو کیا تو وہ بے تکلفی سے آئے اور گفتگو میں شریک ہوئے۔ ان کے خیالات توجہ اور احترام سے سنے جاتے تھے۔ گاہے گاہے وہ مختلف حوالوں کی تلاش میں بھی انجمن آتے تھے۔ کتب خانے میں بیٹھتے اور پھر میرے کمرے میں آکر ان حوالوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے۔ ان کے یہاں علمی جستجو اور دیدہ دریافت میں کوئی تکلف نہیں تھا۔ نہ کوئی انا نہ کوئی تبختر۔ لیکن ہر بات کو بے چون و چرا تسلیم نہیں کرتے تھے۔ جب مطمئن ہوجاتے تو پھر کوئی تامل نہیں کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے "صریر" کی اشاعت شروع کی۔ جدت یہ تھی کہ "زرسالانہ" یا "بدل اشتراک" کے بجائے "سہام" کا لفظ استعمال ہوا تھا۔ تعزیت کے لئے "النعی" کی اصطلاح تھی۔ اور سرورق پر قدیم اساطیر میں سے کسی اسطور کے حوالے سے ایک نقش تھا جس کی وضاحت اندر کے پہلے صفحے پر تھی۔ یہ تو "جدت پسندی" کا اظہار تھا۔ مندرجات میں بھی ایک خاص انداز اور طرح نو کی نمود تھی۔ آہستہ آہستہ "صریر" نے اپنا مقام بنالیا۔ ادبی تنقید، فنی نکات، جدیدیت اور مابعد جدیدیت اور ساختیات کی بحثیں "صریر" کا طرۂ امتیاز بن گئیں۔ ڈاکٹر صاحب کو انھیں موضوعات سے خصوصی دلچسپی تھی، چنانچہ انھوں نے "صریر" سے انھیں سلسلوں کو فروغ دیا اور "صریر" جدیدیت کا ترجمان بن گیا۔ ڈاکٹر صاحب اس بحث کے حوالے سے جو بھی مضمون شائع کرتے اسے بڑے غور سے پڑھتے اور اگر اس مضمون کی کسی شق سے اختلاف ہوتا تو حاشیے میں اپنا اختلاف درج کر دیتے۔ اس طرح قاری کو مضمون نگار اور مدیر دونوں کے خیالات سے آگاہی ہوجاتی اور مثبت و منفی دونوں پہلو سامنے آجاتے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس محنت اور دیدہ وری نے "صریر" کو علمی اور فنی اعتبار سے بہت اہم بنا دیا تھا۔

میرا اندازہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب "صریر" میں شائع ہونے والا ہر لفظ بڑی توجہ سے پڑھتے تھے۔ کتابت کی تصحیح وہ خود کرتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ انھوں نے میرے کسی مضمون کی اشاعت سے قبل دریافت کیا:

"ارے بھائی ڈاکٹر صاحب۔ یہ لفظ جو آپ نے لکھا ہے، پڑھا نہیں جارہا ہے۔ یہ کیا ہے؟"

جب لفظ کی نشاندہی کردی گئی تو کہنے لگے، "آپ الفاظ کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر لاتے ہیں!"

کبھی کبھی پوچھتے: "یہ شعر صحیح ہے؟ یہ مصرع درست ہے؟ مجھے کچھ سقم محسوس ہوتا ہے، ذرا تقطیع کرکے دیکھ لیجیے۔"

ایک دفعہ مجھ سے فون پر پوچھا، "یہ تقابل ردیفین" کیا ہوتا ہے؟" جب اصطلاح کی وضاحت کی گئی تو کہنے لگے، "اس کی کوئی سند بھی ہے؟"

میں نے کہا، "معنی بیان کی کوئی کتاب دیکھ لیجیے۔"

پوچھا، "نام بتائیے۔" میں نے کہا، "بہتر ہے کہ آپ نجم الغنی خاں کی "بحرالفصاحت" دیکھ لیجیے۔"

پھر وہ ایک دن "بحرالفصاحت" دیکھنے آئے۔ کتاب دیکھی تو بڑے متحیر ہوئے۔ کہنے لگے:

"ہمارے بزرگوں نے بھی کیسے کیسے زبردست کام کئے ہیں۔ یہ تو معنی و بیان کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ افسوس کہ ہم اپنے علمی سرمائے سے کتنے غافل ہوگئے ہیں۔"

الفاظ اور اشعار کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب اکثر فون کرتے رہتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت اچھا، حافظہ قوی اور جدید تنقید پر دسترس ماہرانہ تھی۔ اس کا بھرپور اظہار ان کی کتاب "آرا" میں ہوا ہے لیکن وہ ہر بات کو بے چون و چرا تسلیم نہیں کرتے تھے۔ بعض دفعہ اختلاف رائے بھی ہوتا تھا۔ اس اختلاف رائے میں کوئی تلخی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے تھے، میں اپنی بات کہتا۔ اس کے بعد دونوں خاموش ہوجاتے اور پھر اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں ہوتی۔ میں غور کرتا ہوں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ڈاکٹر صاحب کی عالی ظرفی تھی کہ وہ اختلاف میں بھی نرمی اور شرافت برتتے تھے۔ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ آپ نے ذرا اختلاف کیا اور آستینیں چڑھ گئیں، گلے کی رگیں پھول گئیں اور آپ نے رفع شر کے خیال سے خاموش ہوجانے میں عافیت سمجھی۔ ڈاکٹر صاحب کے اختلاف میں وقار تھا۔ تحکم اور طنطنہ نہیں تھا۔

"صریر" کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے خود کو اس کے لئے وقف کردیا تھا۔ بڑی محنت کی۔ شروع شروع میں اس کا دفتر شہر میں تھا۔ میں نے ایک دن پوچھا:

"آپ نے دفتر گھر سے اتنی دور کیوں بنایا ہے۔ آپ وہاں جاتے بھی کم ہیں۔"

کہنے لگے، "ایک ٹھکانا تلاش کرلیا ہے۔ کاموں میں آسانی ہوتی ہے لیکن خود مجھے مشکل ہوتی ہے۔"

پھر انھوں نے اپنے مکان ہی سے "صریر" کی اشاعت کا انتظام کیا۔ انھوں نے "صریر" میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کو خاص موضوع قرار دیا اور ساختیات کے حوالے سے اسے ایک موقر ادبی اور علمی رسالے کی اہمیت دی۔ لکھنے والوں کا ایک پورا حلقہ بنایا۔ فن شعر اور عروض پر بھی توجہ دی۔ بڑے معیاری مضامین شائع کئے۔ آہستہ آہستہ "صریر" نئے خیالات اور نئی فکر کا ترجمان بن گیا۔ انھوں نے کچھ نئے افسانہ نگاروں کو بھی دریافت کیا لیکن حصہ نظم کی طرف ان کی توجہ کم رہی۔ "صریر" کا شعری حصہ کوئی انفرادیت پیدا نہیں کرسکا۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب بذات خود منظومات پر بڑی محنت کرتے تھے۔ ایک ایک مصرع پڑھتے، الفاظ پر غور کرتے اور شعرا کا کلام بہت سوچ سمجھ کر شائع کرتے۔ لیکن بعض

مرتبہ ان کی ملنساہت ادارتی اصولوں پر غالب آجاتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب "صریر" کے سالنامے کے لئے بڑی محنت کرتے تھے۔ مہینوں پہلے سے اس کا اہتمام شروع کر دیتے۔ اپنے تمام لکھنے والوں کو کھٹکھٹاتے، یاد دہانی کراتے رہتے۔ مجھے وہ فون پر اطلاع دیتے کہ سالنامے کی تیاری شروع ہوگئی ہے۔ آپ کا خاکہ جلد پہنچ جانا چاہئے۔ پھر یاد دہانی کے فون آتے رہتے۔ جب خاکہ انھیں پہنچ جاتا تو خوش ہوکر مجھے فون کرتے۔ "صریر" کے متعدد سالناموں میں میرے لکھے ہوئے خاکے شائع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ان کا تذکرہ بڑی ممنونیت کے ساتھ کرتے، لیکن کبھی کبھی دبے لفظوں میں بھی کہتے کہ آپ Deconstruction کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ میں نے یہ بات اپنے ایک خاکے میں ان کے حوالے سے لکھ بھی دی اور انھوں نے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ "دبستان نظام" شائع ہوئی تو میں اس کا ایک نسخہ انھیں بھیجا۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب کو بڑے غور سے پڑھا۔ ایک سہو کی نشاندہی کی اور پھر "صریر" میں اس پر تبصرہ شائع کیا۔ "صریر" میں کسی کتاب پر شائع کرنا غالباً ان کے اصول کے خلاف تھا لیکن "دبستان نظام" کے حوالے سے انھوں نے اصول کی پروا نہیں کی۔

ریڈیو پاکستان کراچی سے ایک ہفتہ وار پروگرام "ادبی ڈائری" نشر ہوتا تھا۔ یہ خاصی پرانی بات ہے۔ عزیزی اقبال فریدی اس پروگرام کے نگراں تھے۔ میں ہفتے بھر کی ادبی سرگرمیوں کی روداد پیش کرتا یا کسی ادبی مسئلے پر اظہار خیال کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اقبال سے کہا، "مجھے یہ پروگرام کرتے ہوئے بہت دن ہوگئے ہیں اب کسی اور کی باری آنا چاہئے۔" اقبال نے دریافت کیا، "کس کی؟ آپ نام بتایئے۔" میں نے ڈاکٹر صاحب کا نام لیا۔ اقبال نے کہا، "انھیں راضی کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔" چنانچہ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ پہلے تو انھوں نے کانوں پر ہاتھ دھرے، پھر بمشکل راضی ہوئے اور پروگرام کرنے لگے۔ تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ انھوں نے مجھے فون کیا اور کہا:

"آپ کا پروگرام آپ کو مبارک۔ میرے بس کا نہیں ہے۔ اس کی تیاری میں میرا بڑا وقت صرف ہوتا ہے۔"

میں نے لاکھ سمجھایا مگر وہ تیار نہیں ہوئے اور اقبال فریدی کے تبادلے تک یہ پروگرام میرے ذمے ہی رہا۔ دراصل ڈاکٹر صاحب ایک خاص مزاج کے انسان تھے، جلسوں میں شریک ہوتے تھے، ادبی محفلوں میں بھی جاتے تھے مگر کم کم۔ رات کو دیر تک مطالعہ کرنا ان کا معمول تھا۔ صبح دیر سے سو کر اٹھتے تھے۔ صبح نو دس بجے جب بھی میں نے فون کیا تو معلوم ہوا سو رہے ہیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رات کو دیر تک جاگتے اور مطالعہ کرتے رہتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو دعوتیں کرنے کا شوق تھا۔ شہر میں جب کوئی ادیب شاعر باہر سے آتا تو ڈاکٹر صاحب کے یہاں کھانے اور گفتگو کا ایک سیشن ہوتا۔ گوپی چند نارنگ آئے، وزیر آغا آئے، ستیہ پال آنند آئے، ڈاکٹر صاحب کے یہاں بڑی اچھی تقریب ہوئی۔ پہلے مہمان خصوصی نے گفتگو کی، کچھ سوال جواب کا سلسلہ رہا۔ پھر کھانا ہوا۔ کھانے میں پورا اہتمام، میزیں لگی ہوئیں، عمدہ اور لذیذ کھانا افراط۔ ڈاکٹر صاحب خود کم کھاتے۔ مہمانوں کی تواضع زیادہ ہوتی۔ شہر کے اکثر ادیب شاعر موجود ہوتے۔ بڑی یادگار تقریبیں ہوئیں۔ ان کی بیماری کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا تھا۔ ایک دفعہ بیمار ہوئے تو ہسپتال میں داخل رہے۔ جب صحتیاب ہوکر گھر آئے تو ایک شام میں ملنے گیا۔ گلدستہ انھیں پیش کیا۔ بہت خوش ہوئے۔ ڈرائنگ روم میں رکھ دیا۔ عمر خیام کی رباعیوں کا ایک مصور ایرانی ایڈیشن بھی لے آیا تھا، وہ بھی نذر کیا۔ بڑی دیر تک دیکھتے رہے۔ میں نے کہا، "یہ اس لئے ہے کہ آپ خیام کی شاعری کے مطالعے اور ایرانی مصوری کے مشاہدے سے علالت کی کوفت کو بھول جائیں۔" ڈاکٹر صاحب یہ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے، "آپ کا خیال صحیح ہے۔ ان دنوں خیام ہی کے مطالعے سے فرحت حاصل ہوگی۔"

ڈاکٹر صاحب اس علالت سے ٹھیک تو ہوگئے تھے مگر خاصے کمزور ہوگئے تھے۔ وہ اگلی سی توانائی برقرار نہیں رہی تھی۔ ملتے جلتے تھے، آتے جاتے بھی تھے۔ بعض تقریبوں میں ان سے ملاقات ہوئی تو احساس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب بہت دبلے ہوگئے ہیں۔ دوسری بیماری جان لیوا ثابت ہوئی۔ ہسپتال سے گھر آگئے تھے۔ میں جانے کا ارادہ ہی کرتا رہا لیکن وہ پہلے چلے گئے۔ انھیں جلدی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کے مزاج میں ندرت اور اپج تھی۔ کسی تقریب میں مضمون پڑھتے تو ان کا انداز منفرد اور سب سے الگ ہوتا۔ میں نے ان سے انجمن ترقی اردو کے بعض تنقیدی اجلاسوں میں مضمون پڑھنے کی فرمائشیں کیں۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے مضمون میں ایک نادر نقطۂ نظر پیش کیا۔ وہ ستہ بند اور پیش پا افتادہ مضامین کی تکرار سے گھبراتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ جو کچھ پیش کیا جائے وہ ان کی انفرادیت کا صحیح مظہر ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے جدید تنقیدی مباحث پر بہت کام کیا ہے۔ چونکہ وہ مشرق و مغرب دونوں کے مزاج داں تھے اور دونوں کے جدید تقاضوں سے واقف تھے، اس لئے انھوں نے اپنے اور "صریر" کے قاری کو اعتماد میں لے کر علمی بصیرت، سنجیدہ اور متوازن انداز فکر اور حقیقت پسندی کو فروغ بخشا ہے۔

"صریر" سے وابستگی کو انھوں نے مرتے دم تک نبھایا۔ "صریر" کا آخری اداریہ نہیں لکھ سکے۔ بیٹے نے ان سے اداریے پر دستخط لے کر اس یادگار کو محفوظ کرلیا۔ آخری سالنامے کے قاری کے لئے یہ ایک تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے "صریر" کے لئے اشتہارات اکٹھا کرنے کی کوئی کوشش نہیں۔ خسارہ وہ اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ ہمدرد کا اشتہار "صریر" میں ضرور شائع ہوتا تھا۔ مدتوں یہ اکلوتا اشتہار "صریر" کی زینت رہا مگر اوس سے پیاس کہاں بجھتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس سیسے کو ناپسند کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے اصول اور خیالات میں بہت پختہ تھے۔ کھری بات کہنے میں بیباک تھے۔ انھوں نے بہت سے مفروضوں کی نفی کی۔ بہت سے بت پاش پاش کئے۔ ان کا انداز نظر دوسروں سے مختلف تھا۔ وہ جھوٹی شہرت سے متاثر نہیں ہوتے تھے اور نہ کسی کی بیجا تعریف کرتے تھے۔ ان کی اصول پسندی اور

صرف حق کہنے کی روش سے بعض لوگ انھیں پسند نہیں کرتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب نے اس روش پر چلنے والوں کو ہمیشہ نظر انداز کیا۔ ان کا مسلک حق جوئی تھا۔ جو صحیح سمجھتے تھے وہی برملا کہتے تھے۔ زبان خلق سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔

زمانے کی عام روش یہ ہے کہ کچھ مفروضے تراش لئے جاتے ہیں۔ انھیں پختہ تر بنایا جاتا ہے اور پھر یہ حقائق کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اردو زبان و ادب، اردو تحریک، قومی زبان کے نفاذ اور ترویج و ترقی سے متعلق بعض ایسے ہی مفروضے حقائق کا روپ دھار چکے ہیں۔ ان کے خلاف کچھ کہنا یا لکھنا یا حقیقت حال کو نمایاں کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ مگر ڈاکٹر فہیم اعظمی نے اس جان جوکھوں کو ہمیشہ خوش آمدید کہا۔ "صریر" کے اداریوں میں انھوں نے اپنے موقف کا واشگاف الفاظ میں اظہار کیا اور مفروضوں یا کلیشوں کو حقائق کا درجہ دینے پر اپنی ناپسندیدگی بھی ظاہر کی۔ سمجھ دار لوگوں نے ان کے موقف کو سراہا۔ مفروضوں کو ہوا دینے والوں نے برہمی کا اظہار کیا لیکن ڈاکٹر صاحب ہمیشہ آزاد خیالی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی عام زندگی میں شائستہ اور منکسر المزاج تھے لیکن جب اصول کی بات آن پڑتی تھی تو پھر ان کا رویہ بدل جاتا تھا۔ شائستگی اور انکسار برقرار رہتا لیکن موقف کا اظہار پوری قوت سے ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ یہ ان کا خاندانی مزاج تھا کیوں کہ یہ وصف ان کے بھائی سجاد باقر رضوی میں بھی تھا۔ وہ بھی اصول کے سامنے کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب "طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم" کے قائل تھے۔ نئی فکر اور نئے رجحانات کا خیر مقدم کرتے تھے۔ انھوں نے "صریر" کے ایک اداریے میں کھلے دل اور نیک تمناؤں کے ساتھ اکیسویں صدی کا استقبال کیا تھا۔ پرانا معاشرہ اور پرانے رویے بدل گئے ہیں۔ پرانی فکر اور خیالات بدل رہے ہیں لیکن نیا معاشرہ پوری طرح ظہور پذیر نہیں ہوا۔ نئے رویے خطرناک بھی ہیں اور مبہم بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے نئی ادبی فکر اور نئے خیالات کو فلسفے، تاریخ اور لسانیات کے حوالے سے فروغ دینے کی بڑی بھرپور کوشش کی تھی۔ مسلسل کام کرتے رہتے تھے۔ ادیبوں، شاعروں اور قارئین سب کو نئے علمی اور سائنسی تقاضوں سے آشنا کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اس وقت جب کہ ہر شخص اپنا اپنا راگ الاپ رہا ہے ہمیں ان جیسے بالغ نظر نقاد اور ادبی مفکر کی بڑی ضرورت تھی مگر وہ چلے گئے۔ انھیں شاید جلدی تھی۔ لیکن اردو ادب میں نئی فکر اور نئے رجحانات کی روایات کو مستحکم کر گئے۔

انسان عام طور پر اپنے لباس، وضع قطع، حلیے، ذہنی رویوں اور ملنے جلنے کے سلیقے سے پہچانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب خوش لباس تھے۔ کپڑے سلیقے سے پہنتے تھے۔ گرمیوں میں بالعموم سفاری سوٹ، جاڑوں میں سوٹ پہنتے تھے۔ ایک آدھ بار میں نے انھیں شلوار قمیص میں بھی دیکھا۔ عمدہ سلے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ وضع قطع اور حلیے سے نرم خو، صلح کل، اور ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔ ملنے جلنے میں گرم جوشی برتتے تھے، ملاقات ہوتی تو خوش دلی سے خوش آمدید کہتے۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ سعودی عرب میں بھی رہے، فضائیہ میں بھی اعلیٰ منصب پر مامور تھے مگر ان میں کسی قسم کا افسرانہ تبختر یا اکڑ فوں نہیں تھی۔ سیدھے سادے شریف آدمی تھے۔ میرے علم کے مطابق وہ شفیق باپ اور اچھے شوہر تھے۔ ان کے ملنے جلنے والے ان کے حق میں ہمیشہ کلمۂ خیر کہتے تھے۔ بشری کمزوریوں سے کون محفوظ رہا ہے، نہ کوئی محفوظ رہ سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب میں بھی بشری کمزوریاں ضرور ہوں گی مگر میں ان سے واقف نہیں۔ میرے نزدیک اچھا وہی ہے جسے سب اچھا کہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی مذمت میں نے کسی سے نہیں سنی۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ وہ بذات خود کسی کی مذمت نہیں کرتے تھے۔ تعلقات پرانے ہو جائیں تو کبھی کبھار کوئی نہ کوئی جملہ تفنن طبع کے طور پر ہی سہی ضرور سرزد ہو جاتا ہے جس میں کسی نہ کسی کی مذمت کا کوئی پہلو ضرور نمایاں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی زبان سے اس قسم کا کوئی جملہ کبھی نہیں سنا۔ وہ اعلیٰ ظرف انسان تھے۔ ان میں دوسروں کی مدد کرنے کا جذبہ تھا مگر انھوں نے کبھی اس کی تشہیر نہیں کی۔ ان کی دنیا میں اس نمائش کی گنجائش نہیں تھی۔

شیخ سعدی کی ایک غزل کا مطلع مجھے بار بار یاد آرہا ہے "بر صریر دل شاہم شوکت گدا ایں است"۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فہیم اعظمی بھی "صریر دل" کے شاہ تھے۔ اسی وجہ سے وہ ساری زندگی اہل سخن کی آزمائش کرتے رہے۔

☆☆☆

علمی ادبی اور لسانیاتی معیاری جریدہ

سہ ماہی **کاروان ادب بھوپال**

ہر شمارہ ملک کے نامور اہل قلم حضرات کی تازہ تخلیقات سے مزین

سالانہ قیمت صرف اسی روپے بذریعہ منی آرڈر ڈرافٹ

رابطہ : کوثر صدیقی، کاروان ادب،

گنوری روڈ، بھوپال ۴۶۲۰۰۱

ہوا جن سے شہر کا نام روشن

(ہندی)

الہ آباد کی ممتاز ادبی شخصیتوں پر سوانحی خاکے

از

فضل حسنین

قیمت : سوا سو روپے

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

کال یاترا

مشتاق اعظمی

لونی (Loney) کی ٹرگنا میٹری (Trignometry) نے ہماری دوستی کو استحکام بخشا تھا۔ اس پر میکمیلن کا 'ایم' سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ تب میں نے اس کی آنکھوں کی تیز لو کو اپنے اندرون میں محسوس کیا تھا۔ پھر میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی انگلیاں ہمیشہ حرکت میں رہتی تھیں۔

اس کا تیرنا سبھی کو اچھا لگتا تھا۔ مجھے بھی۔ لیکن جب وہ ڈبکی لگا کر دیر تک باہر نہیں آتی تو میری سانسیں رکنے لگتی تھیں۔ اکثر میں نے سوچا کہ اس کا نام بطخ ہونا چاہیے تھا۔ جہاں تک میری بات ہے، مجھے پانی سے ڈر لگتا ہے۔ اسی لیے اس کے اصرار کے باوجود میں آج تک پانی میں نہیں اترا۔ ہوا کے جھونکے ہمیں گدگداتے تھے، دھوپ گنگنی لگتی تھی، جوہی کھلتی تھی، مولسری تو راستے ہی میں تھی۔

ویسے ہماری کالونی میں پانی ٹینکر سے آتا تھا اور ہر گھر کا میٹر الگ الگ تھا۔ جھلاتے سبھی تھے۔ مگر کس کو روکتے، کس کو ٹوکتے۔ کچھ لوگ تو کبوتروں کو بھی پانی پلانے میں ہچکچاتے تھے۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے فلیٹ کی بالکونی میں پھول لگائے تھے۔ گملے کی مٹی اکثر خشک ہو جاتی۔ پھر بھی پھول پتوں کو تروتازہ رکھنے کی کوشش ہوتی تھی۔

اتوار کو سمندر کے کنارے جانا اس کے معمول میں شامل تھا۔ پہلے میں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ پھر دونوں ساتھ ساتھ جانے لگے تھے۔ میری پسند کی کتابیں لانا وہ نہیں بھولتی تھی۔ لیکن مجھے اس کی رانوں کی گولائی اور بدن کے پیچ وخم میں زیادہ دلچسپی تھی۔

ویسے میں اناڑی ہوں۔ تجربہ وقت سکھاتا ہے جو بغیر کال بیل دبائے آ جاتا ہے۔ اس کے آنے کے بارے میں ہم کبھی نہیں سوچتے۔ سوچ کا بھٹکاؤ سوکھے کھیتوں کے درمیان دھواں جیسا ہوتا ہے۔ مگر ایک اتوار کو وہ اپنے ساتھ مٹھائی کا ڈبہ لے کر سمندر کے کنارے آئی۔

"میں اب سمندر کی ان لہروں کو نہیں دیکھ پاؤں گی۔ تیرنا بھی چھوٹ جائے گا۔"

"کیوں؟"

"پہلے مٹھائی کھاؤ۔"

"نہیں، پہلے بتاؤ۔"

"پاپا ملٹری مین ہیں، یہ تم جانتے ہو۔"

"ہاں، پھر؟"

"وہ میرے لیے ملٹری مین نہیں چاہتے۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ وہ اپنے تجربے کا محاسبہ کرتے ہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"ماں کی زندگی میں فرق پڑا ہے۔"

"تب؟"

"وہ ڈاکٹر بھی نہیں چاہتے۔"

"ایسا کیوں؟"

"مریضوں سے مجھے دور رکھنا چاہتے ہیں۔"

"اوہ!"

"انجینئر بھی نہیں۔"

"آخر کیوں؟"

"ٹھیکے داروں اور مزدوروں کے بیچ اپنا وجود کھو دیتا ہے۔"

"لیکن تم کیا چاہتی ہو؟"

"جو میرے پاپا ممی چاہتے ہیں۔"

"تمھاری اپنی پسند ہونی چاہیے۔"

"شادی سے پہلے نہیں۔"

"کوئی نفسیاتی وجہ؟"

"ملٹری مین کی بیٹی ہوں نہ۔"

"لیکن سوچ تمھاری ہے، جسم تمھارا ہے، مستقبل تمھارا ہے۔"

"بیدل کی باتیں ہیں۔ میں دماغ سے کام لیتی ہوں۔"

"پھر تمھارے لیے کیسا لڑکا چاہیے؟"

"بزنس مین پر نظر ٹھہرتی ہے۔"

"ہاں، روپے کی ریل پیل رہے گی۔"

"لو، مٹھائی کھاؤ۔"

"تم نے بتایا نہیں کس خوشی میں؟"

"میری شادی ہونے والی ہے اور میں جمنا سے گنگا کی طرف چلی جاؤں گی، جہاں سمندر نہیں، آدمیوں کا جنگل ہے۔"

شانتی کیوں بھنگ ہو جاتی ہے، یہ میں نہیں جانتا۔ آج یادوں کا کھلا ہوا پیراگراف ہے۔ جس کی ہر سطر میں کلوزنگ لائن کھینچی ہوئی ہے۔ مگر ہر لفظ دھڑک رہا ہے۔ کچھ نہیں کے بیچ تھکان ہے۔ جغرافیہ اور تواریخ کے صفحے روشن ضرور ہیں۔ تاج محل میں دیکھ چکا ہوں۔

لیکن پانی کی لہروں میں ناؤ پر سوار آتے جاتے ہوئے صرف میں نے دیکھا ہے۔ چپو کوئی اور چلا رہا تھا۔

وہ کال یاترا تھی۔ انت نہیں۔

میں اپنے سفر پر ایک بار پھر نکلنا چاہتا ہوں۔ دوپہر سے شام تک۔ پانی کے مسائل سے دور۔ جہاں پلاس پھولتے ہوں اور پت جھڑ نہ آتے ہوں۔ دھوپ گنگنی لگتی ہو، جوہی کھلتی ہو اور مولسری راستے میں ہو لیکن عمر! ☆☆☆

مشتاق مہدی

ایک کہانی جاری ساری
دریا چلتا رہتا ہے
لہر کے بننے، بڑھنے اور سمٹنے
کے بعد بھی
دریا چلتا رہتا ہے
پھر لہر کا قصہ کیا ہے بتا دے

بابا نے کہا تھا
دھیان میں رہ
اگیانی سے لڑ
گیان میں رہ

بابا نے کہا تھا
اک اللہ ہے
مالک سب کا
جو کچھ ہے وہ
روپ ہے رب کا
بابا نے کہا تھا
بھول نہ جانا

اپنی خودداری
اپنی شان
تو سب کی طرح بس ایک ہی ہے
لیکن ہے تیری اک پہچان
لہریں تو بنتی چلتی ہیں
دریا میں ڈوب کے رہتی ہیں
دریا کا قصہ بنتی ہیں
دریا تو چلتا رہتا ہے
دریا کو چلتے جانا ہے

گھڑی، سمت، سوئیاں

محمد حامد سراج

کیا آپ کی کلائی پر گھڑی موجود ہے؟

اس افسانے کی تمام کڑیاں آپ کی کلائی پر موجود گھڑی سے جڑی ہیں۔ افسانہ پڑھنے سے پہلے گھڑی اور سوئیاں غور سے دیکھ لیجیے۔ افسانہ سمجھنے میں آپ کو آسانی رہے گی۔ وقت کا معلوم ہونا بھی ناگزیر ہے۔ اگر آپ نے وقت کے دائرے سے باہر بیٹھ کر افسانے کو سمجھنے کی کوشش کی تو بھی ممکن ہے کوئی سرا آپ کے ہاتھ نہ آئے۔ اس کا بھی امکان موجود ہے کہ افسانے کے کردار آپ سے آنکھیں چرائیں لیکن آپ کو ان کے ساتھ رہنا ہے۔ تاریخ پر آپ کا مطالعہ کیسا ہے؟ اگر عمیق ہے تو افسانہ آپ پر اپنے سارے دروازے کھول دے گا۔ اس میں برمودا ٹرائی اینگل کا ذکر ہے۔ آپ بحر اوقیانوس کی اس تکونی پٹی کے بارے میں کس حد تک معلومات رکھتے ہیں۔ یہ وہ پراسرار تکونی پٹی ہے جس کے حصار میں آنے والے بحری اور ہوائی جہاز غرقاب ہو جاتے ہیں۔ انسانی معلومات کی حد تک پہلے تو جہازوں کی تمام سوئیاں الٹی چلتی ہیں، پھر وہ تکونا بھنور انھیں اپنی گرفت اور شکنجے میں لے کر ہمیشہ کے لئے غرق کر دیتا ہے۔ جیسے انسان لحد میں اتر کر کوئی خبر نہیں بھیج سکتا ویسے ہی وہ تکونا بھنور ان جہازوں کو نامعلوم دنیا میں اتار دیتا ہے۔ بحر اوقیانوس سے گذرنے والی پروازوں کو کڑی ہدایات ہیں۔ یہ وہ اسرار ہے کہ انسان تمام تر سائنسی ترقی کے باوجود اس معمے کو حل نہیں کر سکا۔ اس پر دبیز پردے پڑے ہیں۔ عالمی فضائی راہوں میں اس خطے کو سرخ رنگ دیا گیا ہے تاکہ تباہی سے بچا جا سکے۔

آپ اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی سوئیاں دیکھ لیجیے۔

یونس ویر! یہ افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ اس کردار کے بارے میں یہ نہیں معلوم کہ اس میں زندگی کی رمق ہے یا نہیں۔ یہ زندہ ہے یا مردہ؟ یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جس کی سانسوں میں لیکس ہے۔ مجھے اس سے بات کرنا ہے۔ لیکن اس کا انہماک کہہ لیجیے یا غفلت کہ وہ میری بات پر توجہ ہی نہیں دے رہا۔ میں بہت دیر سے اس کے ساتھ بات کرنے کی خواہش دل میں دبائے اس کے ویڈیو سنٹر میں آتے جاتے گاہکوں کو دیکھ رہا ہوں۔

یونس ویر۔ میری بات تو سنو!

کہو۔

تم میری بات سن رہے ہو نہ...؟

یہاں تعفن بہت ہے۔

اس نے ایئر فریشنر اٹھا کر ہر طرف اس کی پھوار کر دی۔

یہ تعفن یوں دور ہونے سے رہا۔

تمھیں محسوس نہیں ہو رہا؟

نہیں تو۔

ہاں ہوگا بھی نہیں۔ تم تمبا کو فروش ہو۔ تم نے کبھی دیکھا کہ تمبا کو فروش کو کبھی اپنے کام سے گھن آئی؟ وہ اس تعفن کا عادی ہو جاتا ہے وہ اسی میں سانس لیتا ہے۔ اس کے دماغ کے خلیے مر جاتے ہیں۔ اب کام سمیٹو اور گھر کی راہ لو۔ تمھارے بیوی بچے تمھارا انتظار کھینچ رہے ہوں گے۔ دیکھو تو رات تمھارے وجود میں سے گذر رہی ہے۔

یار تم چپ نہیں رہ سکتے؟ کیا سننا چاہتے ہو مجھ سے؟ میں مکمل رات ہوں۔ اتھاہ تاریکی۔ میں نجس ہوں۔ میرا دماغ مر چکا ہے اس میں کوئی خلیہ نہیں ہے۔ میرے دماغ کے ہر خلیے میں تمھیں عورتوں کے ننگے جسم تھرکتے نظر آئیں گے۔ میں اس شہر کا مردہ انسان ہوں، میں اس گلی اس شہر کی لعنت ہوں۔ میں رات میں ایک فلم باقاعدگی سے دیکھتا ہوں۔ کیوں دیکھتا ہوں...؟ یہ میرا نجی معاملہ ہے کسی کو کوئی حق نہیں ہے وہ میری ذاتی حدود میں قدم دھرے۔ یہاں سے گھر جاتے ہوئے میں بلو فلموں کی سی ڈی ساتھ لے جاتا ہوں۔ میرا دماغ تمبا کو فروش کا کباڑ خانہ ہے۔ میں رات گئے کمپیوٹر پر ویب سائٹس کھولتا ہوں۔ ہزاروں کی تعداد میں نیوڈ ویب سائٹس جو ایک کلک پر موجود ہیں۔ اپنا وجود کسی ایک ویب سائٹ میں پھینکتا اور اپنی تباہی کا تماشا دیکھتا ہوں۔ میں تمھاری اس گلی کا مردہ انسان ہوں۔ تم مجھے کیا سمجھانا چاہتے ہو؟ یہ میرا ویڈیو سنٹر ہے۔ میرا ذاتی اثاثہ!

مجھ پر کوئی قدغن نہیں۔ مجھے یہ ڈر بھی نہیں کہ سب چھپ کر دیکھنا ہے۔ رات گئے میں ڈیکوڈر (Decoder) پر ایسے چینل تلاش کر لیتا ہوں جن میں کھو کر مجھے خبر ہی نہیں رہتی کہ کب سحر ہوئی۔ میں تمھارا معاشرہ ہوں میں رات بھر جاگتا اور دن بھر سوتا ہوں۔ دن میں چند گھنٹے روبوٹ کی طرح کام کر لیتا ہوں۔ یہ جسے تم

رات کہہ رہے ہو یہ رات نہیں دن ہے۔ اقدار بدل گئیں اور تم ایسے بے خبر انسان ہو کہ تمھیں خبر ہی نہیں اب سورج رات میں طلوع ہوتا ہے۔ دن سونے کے لئے اور رات کام کرنے کے لئے ہے۔

یونس ویر میں تمھارا دوست ہوں۔ تمھیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے تمھیں نصیحت کرنا ہے اور نہ اخلاق کا درس دینا ہے اور نہ راہ راست پر لانے کے لئے تمھارے سامنے تجربات کی پٹاری کھولنی ہے۔ مجھے تو صرف یہی کہنا...

اس نے میری بات اچک لی۔

اکیلا کہاں ہوں میں۔ ابھی تم دیکھو گے۔ بہت کچھ دیکھو گے۔ رات ڈھلنے دو۔ سورج طلوع ہوگا۔ کئی شرفا اور پردہ نشیں بلو پرنٹ کی سی ڈی لینے کو آئیں گے۔ ڈبل ایکس کا کیا ہے۔ یہ دیکھو سامنے ریک میں ہزاروں کی تعداد ہے۔ یہ فن ہے، آرٹ ہے۔ اگر تمھیں اس آرٹ کی سمجھ نہیں ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔

یار تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم صرف رات میں گھر وقت پر چلے جایا کرو۔

کیسے چلا جایا کروں؟ یہ روزی بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے ہی تو کر رہا ہوں۔ یہ آزار اور کس کے لئے کھینچ رہا ہوں؟

بیوی بچوں کے لئے محنت کرنا اور کمانا آزار نہیں فرض ہے۔

جانتے ہو یہ کاروبار حرام ہے۔

جب دماغ کا کوئی خلیہ سلامت ہی نہیں تو حلال کیا اور حرام کیا۔

یار پرندوں کو دیکھو۔ کیا تم نے کبھی سنا کسی پرندے نے اپنی چونچ سے اپنے بچوں کے منہ میں زہر انڈیلا ہو؟

یہ سب باتیں کتابی ہیں۔ میں اس سیٹ اپ سے لاکھوں کما رہا ہوں۔ کیبل نیٹ ورک کا منافع الگ، اور انٹرنیٹ کیفے میں تو ساری رات میلہ لگا رہتا ہے۔

تمھیں معلوم ہے معصوم بچے انجانے میں ویب سائٹس کلک کر کے کیا دیکھتے ہیں؟ چیٹ رومز (Chat Rooms) نے انھیں گھر سے بے گھر کر دیا ہے۔

مجھے اس سے کیا۔ میری غرض تو گھنٹے میں فی کس پندرہ روپے سے ہے۔ میں انھیں گھر سے بلا کر تو نہیں لاتا۔ اپنی مرضی سے آتے ہیں۔

لیکن جال بچھا کر تو بیٹھے ہو۔

شکار کی ممانعت تو نہیں ہے۔

یونس ویر۔ مجھے تم پر ترس آرہا ہے۔

گفتگو اس وقت رک گئی جب ایک عورت ویڈیو سنٹر میں داخل ہوئی۔

جو سی ڈی میں نے آپ سے منگوانے کو کہی تھی، کیا مل گئی۔ عورت نے سوال کیا۔

جی، بالکل۔ یونس ویر نے پیکٹ میں بندھی ہوئی ایک سی ڈی خاتون کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ اور اس کی نظر عورت کے چہرے کی بجائے ادھ کھلے گریبان کی طرف تھیں جہاں فیشن نے موسموں میں ہلچل مچادی تھی۔ عورت نے سی ڈی پیکٹ میں سے نکالی، اسے دیکھا اور قیمت پوچھی۔

پانچ سو روپے۔ یہ Latest ہے۔

عورت نے کاؤنٹر پر پانچ سو روپے کا نوٹ رکھا، سی ڈی پرس میں ڈالی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور میرے خوف کی کھڑکی کھل گئی۔

اس سی ڈی میں کیا تھا؟

بلو فلم...؟

حیا نہیں آئی تمھیں؟

ہو تو آئے۔

ایک نوجوان نے ویڈیو سی ڈی میں قدم دھرا۔ وہ کسی کالج کا اسٹوڈنٹ لگ رہا تھا۔ اس نے ویڈیو سنٹر میں آویزاں نیم عریاں پوسٹروں کو غور سے دیکھا۔ ایک اشتہار میں رقاصہ کے جسم پر صرف تین انچ کپڑے کی دھجی تھی، اس کی طرف اشارہ کر کے اس نے پوچھا:

کیا یہ نیا گرم مصالحہ ہے؟

بالکل تازہ ہے۔

یہی دے دیں۔

وہ تو جی ایسے ہے کہ مصالحہ کی ساری سی ڈیاں نکل گئیں۔ تم کل آنا میں رکھ لوں گا۔ البتہ ایک نئی انگلش موی آئی ہے Six Days and Seven Nights فلم صاف ستھری ہے۔ ایک آدھ سین تو جی ان فلموں میں ہوتا ہی ہے۔

ظاہر ہے راتیں دن سے زیادہ ہیں Six Days and Seven Nights۔ چلیں وہی دے دیں۔

گاہک آرہے تھے۔ رات جاگ رہی تھی۔ یونس ویر سو رہا تھا۔ میں ڈر رہا تھا۔

وہ سامنے جو شخص آرہا ہے کار سے اتر کر، یہ پروفیسر ہے گذشتہ برس گرمیوں کی چھٹیوں میں اس نے اکیانوے فلمیں دیکھی ہیں۔ اسے سی ڈی لے جانے دو میں تمھیں اس کا کھاتا کھول کر دکھاتا ہوں۔

پروفیسر نے سی ڈی کاؤنٹر پر رکھی۔ تعلیم اس کے وجود سے رخصت ہو چکی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نہیں تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ہونٹوں میں تیرتے لفظوں میں سے کوئی مہک تلاش کرنے کی سعی لاحاصل سے گذرا۔ بے نور چہرے پر نور کی کرن تلاش کرنے کی کوشش کی۔ یہ رشید احمد صدیقی نہیں ہے۔ لیکن یہ میرے اندر پروفیسر رشید احمد صدیقی کی آواز کیوں ابھر رہی ہے؟

پروفیسر صاحب، آپ نے گذشتہ صدی میں کہا تھا۔ ''اگر ایک طالب علم تین گھنٹے کی ایک فلم دیکھے تو اس کی شخصیت پر وہ جو منفی اثرات مرتب کرتی ہے اسے زائل کرنے کے لئے کسی بہترین ادارے کے تمام اساتذہ ایک سال تک بھی محنت کریں تو بھی اس فلم کے مضر اثرات پوری طرح زائل نہیں کر سکتے۔'' پروفیسر صاحب یہ تو آپ نے طلبا کے لئے کہا۔ ویڈیو سی ڈی سنٹر میں پروفیسر موصوف خود تشریف لائے ہیں۔ ان کے پختہ کردار کو فلم بینی سے کوئی خطرہ نہیں۔

میں نے بے وقت کی راگنی چھیڑی اور پروفیسر سے پوچھ بیٹھا۔

آپ کا شعبہ؟

اردو۔

آپ نے پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کی "گنج ہائے گراں مایہ" کا مطالعہ کیا ہے؟

پروفیسر کی پیشانی پر ہلکا سا پسینہ اترا اور شرم مجھے آئی۔ وہ بغیر سی ڈی لئے پلٹنے لگے تو یونس ویر نے کہا، یہ اس شہر میں اجنبی ہیں آپ بلا جھجک سی ڈی لے جائیں۔

رات ہمارے وجود سے گذر رہی تھی۔ میں نے وقت دیکھنے کے لئے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی تو حیران رہ گیا۔ اپنی آنکھوں کو ہتھیلی سے مسلا اور پھر گھڑی دیکھی۔ خوف سے میرے بال کھڑے ہو گئے۔ دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ یہ کیا؟ گھڑی کی سوئیاں الٹی سمت چل رہی ہیں! میرا دم گھٹنے لگا۔ ویڈیو سنٹر میں حبس ایک دم بڑھ گیا۔ میں سنٹر سے باہر نکلا۔ گہرا سانس کھینچ کر پھیپھڑوں میں تازہ آکسیجن کا اہتمام کیا۔ اپنے گردو پیش پر نظر ڈالی ایک بار پھر بے یقینی سے گھڑی پر نظر ڈالی اور دم سادھ لیا۔

میں کیا کروں؟ اس لمحے کس سے کہوں کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔

ہمت کو مجتمع کر کے میں نے ایک شخص کو روکا اور سوال کیا۔ کیا میں آپ کا نام پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟

اس شخص نے مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور کہا آپ میرا نام کیوں پوچھ رہے ہیں؟

اس کے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بلا وجہ پوچھی جانے والی بے معنی باتوں کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ میں ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگا۔ میری بے وقوفی سے لطف لیتے ہوئے اس نے کہا مجھے خاور چودھری کہتے ہیں۔

پلیز آپ وقت بتائیے گا۔

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی تو خوف سے اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے بھی ہتھیلیوں سے اپنی آنکھوں کو مل کر دوبارہ گھڑی دیکھی اور زیر لب بولا۔

ہیں ں ں ں۔ یہ کیا۔؟ سوئیاں الٹی سمت کو کیوں چل رہی ہیں۔

بھائی میں نے وقت پوچھا ہے آپ سے۔

وقت کیسے بتاؤں جی... سوئیاں الٹی سمت چل رہی ہیں۔

میرے اندر کسی نے قہقہہ مارا۔

میں نے سامنے دیکھا۔ ویڈیو سنٹر کے سامنے سڑک کے اس پار ایک ہوٹل تھا۔ اس میں ٹی وی پر تصویر الٹی چل رہی تھی۔ میں نے خاور چودھری کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

دوست گھبراؤ نہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ سامنے جو ویڈیو سنٹر ہے اس میں ایک شخص بیٹھا ہے۔ اس کا نام یونس ویر ہے۔ اس کے دماغ کے سارے خلیے مرگئے ہیں۔ یہ مردہ خلیے کا شاخسانہ ہے۔ کہ اس نے کوئی ایسا بٹن دبا دیا ہے کہ ہر چیز الٹی سمت چلتی دکھائی دے رہی ہے۔

وہ سامنے دیکھو۔ سائیکل الٹی چل رہی ہے۔ کار بھی ریورس گیئر میں آرہی ہے۔ انسان بھی الٹا چل رہے ہیں۔ تانگے کو گھوڑا پچھلی سمت دھکیل رہا ہے۔

اجنبی، کیا پہیلیاں بجھا رہے ہو؟ میرے شہر میں بیٹھا یونس ویر کیسے سارے نظام کو الٹا چلا سکتا ہے۔ خاور چودھری! فضا میں ایک سیارہ ہے جس سے پورا کرۂ ارض منسلک ہے اور ادھر زمین پر یونس ویر حشرات الارض کی طرح پھیل گئے ہیں۔ یہ کالے پہاڑی بچھو ہیں۔ یہ یاجوج ماجوج قسم کی کوئی مخلوق ہے یہ ایک کان نیچے بچھا لیتے ہیں اور دوسرا اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔ یہ رات میں اپنا کام دکھاتے ہیں۔ انسانی دماغ کو کریدنا ان کا مشغلہ ہے یہ دماغوں میں Terror Horror جنس، مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں، بلو فلم، ڈانس، گانے اور نہ جانے کون کون سی کریہہ Chips فٹ کرتے ہیں اور صبح ہونے پر چھپ جاتے ہیں یہ مخلوق رات میں جاگتی، فساد پھیلاتی ہے اور دن میں سوتی ہے۔

پیمانے بدل گئے تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ خاور چودھری وہیں کھڑا تھا، یا وہ جا چکا تھا۔ ایک موہوم سی امید ٹمٹمائی تھی۔ شاید کہیں کوئی گھڑی وقت صحیح بتلا رہی ہو۔ کوئی سائیکل سیدھی سمت جارہی ہو، کار ریورس گیئر کی بجائے سیدھی دوڑ رہی ہو۔ ٹی وی پر تصویر سیدھی اور صاف ہو۔

کیا آپ کی کلائی پر گھڑی موجود ہے؟ کیوں کہ یونس ویر کی گھڑی کے مطابق سمت ٹھیک ہے اس کا کہنا ہے کہ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ سوئیاں کس سمت کو چل رہی ہیں۔ ان کی سمت کا تعین کرنا دانشوروں اور سائنس دانوں کا کام ہے۔ ہمارے زائچے میں سمت ٹھیک ہے۔

مجھے اس ہوٹل میں بیٹھے اک عمر بیت گئی ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم میں اس ہوٹل میں انتظار کس کا کر رہا ہوں۔ مجھے تو گھر کا رستہ بھی بھول گیا۔ ہوٹل کا بیرا میرے سامنے روز اخبار رکھ جاتا ہے۔

میں شاید اونگھ رہا ہوں۔

یہ اخبار کی سرخی الٹی چھپ گئی ہے کیا؟

میں نے آئینے کی مدد سے شہ سرخی پڑھی۔

"کل رات کرۂ ارض کے کئی شہر غرقاب۔ لاکھوں انسان لقمۂ اجل بن گئے۔"

قاری!

میں خبر پوری نہیں پڑھ سکا کہ میری بینائی میں نمکین پانی حائل ہو گیا۔ شاید آپ کو معلوم ہو؟

آپ اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ لیجئے کہیں سوئیاں الٹی سمت تو نہیں چل رہی ہیں ☆☆☆

شمس فریدی

نظم

خوش رنگ پرندو
کس دنیا سے اڑ کر تم
اس جنگل میں آئے ہو؟
شاخوں پر چہک رہے ہو
تم کو معلوم نہیں ہے؟
اس جنگل میں
زہریلے ناگوں کے ڈیرے ہیں

غزل

چادر کو کھینچتے ہیں جگاتے ہیں رات میں
بے چہرے لوگ مجھ کو ڈراتے ہیں رات میں

دن بھر خموش رہتے ہیں جو طائران درد
کمرے میں آ کے شور مچاتے ہیں رات میں

دروازہ بند کر کے بھی سونا محال ہے
کس راہ سے نہ جانے در آتے ہیں رات میں

مجھ سے وہ دن میں ملتے ہیں بے اعتنائی سے
خوابوں میں آ کے مجھ کو جگاتے ہیں رات میں

استاد ولایت خان

محمد اطہر مسعود

برصغیر کی کلاسیکی موسیقی میں سازوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ گویئے کے ساتھ سنگت کے علاوہ ہر ساز کی اپنی انفرادی حیثیت بھی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ساز پھونک والا ہے یا تاروالا، اس کی بنیاد سر پر ہے یا لے پر، اگر اسے صحیح طریقے سے سر کیا گیا ہو اور بجانے والا گنی ہو تو موسیقی کا سحر دوآتشہ ہو جاتا ہے۔ ساز اور سازندے کے ایسے باہمی ربط کی بہترین مثال ستار نواز استاد ولایت حسین خان تھے۔

فن موسیقی سے تعلق رکھنے والے ہمارے اکثر فنکار مالی آسودگی کا رونا روتے پائے جاتے ہیں اور کسی حد تک یہ بات درست بھی ہے۔ ولایت حسین خان بھی اگرچہ منہ میں سونے کا چمچہ لئے ہوئے پیدا نہیں ہوئے تھے تاہم انھوں نے اپنی زندگی میں دونوں انتہائیں دیکھیں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ وہ بھوک سے نڈھال ہونے کے باعث ایک پروگرام پر نہ جا سکے اور دوسری طرف یہ بھی کہ امپالا اور مرسیڈیز سے کم گاڑی میں سفر نہیں کیا۔ ۱۹۶۰ کی دہائی میں وہ انگلستان میں کنسرٹ کا اعزازیہ پانچ ہزار پونڈ وصول کرتے تھے۔ شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے زندگی گذارنے، سرکاری اعزازات کو ٹھکرانے اور ستار نوازی میں گائیکی انگ کے موجد اور خاتم استاد ولایت حسین خان کی وفات (ممبئی، ۱۳ مارچ ۲۰۰۴) پر سرکاری تو درکنار فنون لطیفہ سے متعلق غیر سرکاری تنظیموں کی طرف سے بھی مکمل خاموشی ہمارے معاشرے کی بے حسی اور موسیقی سے عدم دلچسپی کی افسوسناک مثال ہے۔ ہندوستان کے صف اول کے جریدے "فرنٹ لائن" Frontline کے شمارہ ۷، جلد ۲۱، بابت ۲۷ مارچ تا ۹ اپریل ۲۰۰۴ میں پارتھو دت (Partho Datta) کا تعزیتی مضمون بعنوان Khan of Grace اس لحاظ سے خاصے کی چیز ہے۔ فاضل مضمون نگار بجا طور پر شاکی ہیں کہ ولایت حسین خان کے انتقال کی خبر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کراچی میں یک روزہ کرکٹ میچ میں ہندوستان کی فتح کی خبروں اور فتح پر مبارکباد کے پیغامات کی بھرمار کے باعث ایک دن بعد ہی اخبارات میں جگہ پا سکی۔

پاکستان میں استاد ولایت خان صاحب کی وفات پر جو چند اخباری شذرات سامنے آئے ان میں ممتاز صحافی عرفان حسین کا کالم بعنوان Not By Bread Alone (روزنامہ ڈان لاہور، ۸ مئی ۲۰۰۴) وطن عزیز میں بالعموم فنون لطیفہ اور بالخصوص کلاسیکی موسیقی کی صورتحال کا نوحہ ہے۔ عرفان حسین کے بقول:

> کسی غیر ملکی مہمان کے یہ پوچھنے پر کہ شام کو اگر میں کسی (میوزک) کانسرٹ میں جانا چاہوں تو کہاں جاؤں، میری خفت ناقابل بیان ہوتی ہے۔ (دنیا بھر میں) کراچی سے بہت زیادہ چھوٹے شہروں میں موسیقی کے پروگرام باقاعدگی سے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ایک کروڑ بیس لاکھ آبادی کا یہ شہر ایک بھی کنسرٹ ہال یا مستقل تھیٹر قائم رکھنے سے قاصر ہے۔ حکومتی بے اعتنائی کے ساتھ ساتھ یہ صورت حال طبقۂ امرا کی طرف سے فنون لطیفہ کی عدم سرپرستی کی بھی عکاس ہے۔ ذوق سلیم سے عاری شہر کے اکثر خوشحال لوگ دراصل نودولتیے ہیں جو محل نما کوٹھیوں اور چمچماتی ہوئی کاروں کے ذریعے اپنی دولت کی نمائش کرنا پسند کرتے ہیں۔ کلاسیکی موسیقی کی ترویج اور موسیقاروں کی سرپرستی ان کے لیے ایک بے معنی چیز ہے۔

ولایت خان صاحب مرحوم کا شمار ان خوش قسمت فنکاروں میں ہوتا ہے جو عالم شباب ہی میں شہرت کے بام عروج تک پہنچے۔ ان کی وفات نے بلاشبہ برصغیر کی موسیقی میں ایسا خلا پیدا کیا ہے جو کبھی بھر نہ سکے گا۔ ولایت خان صاحب کے نمایاں شاگردوں میں ان کے بیٹے شجاعت حسین خان کے علاوہ کلیانی رائے، کاشی ناتھ مکرجی، اور اروند پاریکھ کے نام اہم ہیں۔

نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط اپنی فعال فنی زندگی میں خان صاحب نے بیرونی ممالک کے متعدد دورے کیے اور ملکی، غیر ملکی صحافیوں کو سیکڑوں انٹرویو دیے۔ تاہم ۱۹۶۹ میں ان کے قیام لندن کا ایک انٹرویو ایسا ہے جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں پر کھل کر بات کی۔ یہ انٹرویو اختر ریاض الدین[1] نے لیا تھا جو روزنامہ "پاکستان ٹائمز" لاہور میں مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۶۹ کو شائع ہوا۔ ذیل میں اس انٹرویو کا محض ترجمہ پیش خدمت ہے:

کل تک ولایت خان سے میرا تعلق صرف لانگ پلے ریکارڈوں کی حد تک تھا... وہ بھی اس وقت جب میں کلاسیکی موسیقی سننے کو بے تاب ہو رہی ہوں... آج ولایت حسین خان میرے سامنے ایک کھلی کتاب ہیں۔ مجھے یقین نہ تھا کہ صرف تیس منٹ کے لیے طے شدہ یہ ملاقات بغیر کسی وقفے کے سات گھنٹے تک جاری رہے گی اور میں پچھلی دو دہائیوں میں نمایاں ہونے والے برصغیر کے عظیم ترین ستار نواز کی یک طرفہ گفتگو کا لطف اٹھاتی رہوں گی۔

ملکی اور غیر ملکی قدردانوں سے بے مثال داد و تحسین حاصل کر لینے کے بہت عرصہ بعد ولایت خاں کے لئے ہندوستانی حکومت کی طرف سے "پدم بھوشن" عطا کیے جانے کا اعلان ہمارے مخصوص معاشرتی حالات کے پیش نظر کوئی، جنھیں کی

بات نہیں۔ خوشی کا مقام تو یہ تھا کہ خان صاحب نے یہ اعزاز وصول کرنے سے انکار کر دیا جس پر انھیں ژاں پال سارتر کا یہ برقیہ موصول ہوا: "مبارک ہو! آج کے بعد میں خود کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہوں کیونکہ اب میں اکیلا نہیں۔"

"آپ نے اتنا بڑا اعزاز قبول کرنے سے کیوں انکار کر دیا؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے بھئی جب حکومت نے موسیقی سے وابستہ اتنے بڑے اساتذہ مثلاً استاد دبیر خان جو دھرپدیوں میں نائیک کا مقام رکھتے ہیں، باسط خاں جنھوں نے پچاس سال تک طبلہ بجایا، سکھایا، اور بالآخر نابینا ہو گئے، اسی طرح صادق علی خاں بین کار جو کچھ عرصہ پہلے گمنامی کی موت مر گئے، ان کو نظر انداز کیا گیا تو میں سمجھتا ہوں مجھے زیب نہیں دیتا کہ ایسی حکومت سے کوئی ایوارڈ حاصل کروں۔ لیکن پلیز اسے کسی جانب داری یا سیاسی وابستگی پر محمول نہ کیجیے گا۔"

اس مختصر جذباتی گفتگو کے نتیجے میں خان صاحب کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو چکے تھے جنھیں میں کسی بھی طرح محض لندن کے مرطوب موسم کا تحفہ قرار نہیں دے سکتی۔ حیرت انگیز روانی سے انگریزی زبان میں گفتگو کے دوران کہیں کہیں کرخنداری لہجے میں خان صاحب کی اردو چاندنی کے اگالدانوں اور گھڑی گھڑی عطر پاشی والی محفلوں کی یاد دلا رہی تھی۔

ولایت خاں پیدائشی نہیں بلکہ مزاجاً اشرافیہ ہیں۔ ولایت خاں کا محض نام لیجیے اور ذہن میں بیش قیمت کشمیری دوشالہ اوڑھے، ہیرے کی انگوٹھیاں پہنے ہوئے ایک شخص کی تصویر ابھرتی ہے۔ چوالیس سالہ خان صاحب کے پچیس سال شہرت کے بام عروج پر گزرے ہیں۔ ان کے اپنے بقول لوگ ولایت خاں کو کوئی ساٹھ ستر سالہ باریش بزرگ سمجھتے ہیں۔

اس انٹرویو کے دوران مجھے یوں لگا جیسے خان صاحب پوری پاکستانی قوم سے مخاطب ہیں: "بھئی وہاں جا کر سب کو بتا دینا کہ مجھے ایک ایسے ملک کا ویزا دینے سے انکار کیا گیا جو ہمیشہ میرے دل کے قریب ہے۔ کابل میں ایک احمق سفارت کار نے، جو درۂ خیبر سے متعلق کچھ معلومات کے لیے مجھے استعمال کرنا چاہتا تھا، مجھے چوری چھپے واہگہ بارڈر پار کروانے کی پیش کش کی تھی! بالائے ستم یہ کہ موصوف نے، جس کا اپنا نام بھی ولایت حسین خان ہی تھا، میری جاسوسی کے لیے ایک مسلح گارڈ کو میری مرسڈیز میں بٹھا دیا۔ یہ مسلح گارڈ بھی ولایت خان نامی تھا! مجھے کیا معلوم تھا دنیا اتنے ولایت خانوں سے بھری پڑی ہے۔" خان صاحب نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

ڈرامائی انداز میں بار بار پہلو بدلنے کے باوجود خان صاحب مجموعی طور پر زندگی سے مطمئن اور خوش باش نظر آتے ہیں۔ ان کی گفتگو بھی ان کے محبوب ساز پر ان کی نوازندگی کے مانند ہے۔ کبھی دھیمی لے میں الاپ، کبھی مدھیہ لے میں جوڑ اور کبھی درت لے کی سرمستی میں جھالے کی خوبصورتی۔

میرا پہلا سوال خاں صاحب کے پورے نام کے بارے میں تھا۔ انھوں نے بتایا: "ریکارڈنگ کمپنیوں نے ریکارڈوں پر میرا نام محض ولایت خان لکھ دیا۔ اصولاً اسے یوں ہونا چاہیے تھا: "خان صاحب ولایت حسین خان۔"

اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں انھوں نے بتایا: "بھئی ہم تو خانہ بدوش لوگ ہیں۔ گوری پور (سابقہ مشرقی پاکستان) میں پیدا ہوئے، دلی میں پلے بڑھے اور کلکتے میں شادی ہوئی۔ میرے دادا کا تعلق مالوہ سے تھا اور دادی پنجاب کی تھیں۔ اب اس کھچڑی سے آپ کیا سمجھے؟ لیکن یہ ضرور لکھیے گا کہ میں بٹھیالی (ایک بنگالی لوک دھن) بھی اسی مہارت سے بجا سکتا ہوں جس طرح سے پہاڑی یا کجری۔

"اگرچہ میں دس سال کی عمر میں یتیم ہو گیا تھا لیکن اس وقت تک میرے والد استاد عنایت حسین خان نے، جو خود بھی ستار نوازی میں داستانی (Legendary) درجہ رکھتے تھے، مجھے ستار کے ابتدائی اسباق کی مشق شروع کروا دی تھی۔ انگلیوں کا توازن، نشست و برخاست اور مختلف زاویوں سے ستار پکڑنا اور بجانا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گھنٹوں یا دنوں کے حساب سے نہیں، بلکہ ہمہ وقت ریاض۔ یہ سب چیزیں میرے والد نے ابتدائی دور میں ہی مجھے سکھا دی تھیں۔ ریاض میں تسلسل کا یہ عالم تھا کہ اکثر مجھے ہوش نہ رہتا کہ میں نے شام کے وقت ستار بجانا شروع کیا تھا یا دن میں۔ ستار ملانا ہی دراصل وہ سبق تھا جو میں نے پانچ سال تک اپنے والد کے قدموں میں بیٹھ کر سیکھا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ میں نے پانچ سال کی عمر میں ستار سیکھنا شروع کیا۔

"میرا پہلا پروگرام کلکتہ میں ہوا جب میری عمر صرف سات سال تھی۔ اور آپ جانتے ہیں طبلے پر میرے ساتھ کون تھا؟ استاد احمد جان تھرکوا! مجھے اچھی طرح یاد ہے میرے والد پہلی صف میں بیٹھے گھبراہٹ میں اپنی ٹھوڑی کھجلا رہے تھے۔ اتنا عظیم فنکار جو اپنے کسی پروگرام میں کبھی نروس نہ ہوا تھا، نوآموز بیٹے کی پہلی حاضری پر گھبراہٹ کا شکار تھا... ہاں تو میں کہہ رہا تھا میرے والد نے ہی مجھے اسٹیج پرفارمنس کے آداب سے آگاہ کیا۔ آپ جانتے ہیں نہ کہ پبلک کے سامنے اسٹیج پر تھوڑی سی اداکاری بھی کرنی پڑتی ہے۔ میرے خیال میں ہر سازندے کے لیے بھاؤ اور مدرا (رقص کی اصطلاحات) جاننا بہت ضروری ہے۔ میں تو حاضرین سے بھی اپنے لیے اسی احترام کی توقع کرتا ہوں جو ان کے لیے میرے دل میں ہوتا ہے۔ ابھی تک تو قسمت کی دیوی مجھ پر مہربان رہی ہے، لیکن یاد رکھیے اگر سامعین میں مجھے ہلکا سا گنوارپن بھی محسوس ہو تو میں اسٹیج سے اٹھ جانے میں ایک منٹ بھی نہیں لگاتا۔ ابھی کچھ روز پہلے وی آنا (Vienna) کے ایک آپیرا سنگر (Opera Singer) نے مجھے بتایا کہ انھیں حاضرین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے لیے گھٹنوں کے بل جھک کر التجا کرنا پڑی تھی۔ یہ ہے آرٹ کو حد سے زیادہ کمرشلائز کرنے کا نتیجہ!"

حد درجہ انا پرست لیکن ایک مہذب اور دلآویز شخصیت کے مالک ولایت خان فن کی دنیا میں اپنے مقام و مرتبے سے آگاہ ہونے کے باوجود کسی نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں۔ ان کی شخصیت عام انسانوں کی طرح گھمنڈ، وضعداری اور حقیقت پسندی کا حسین امتزاج ہے۔ تاہم کبھی کبھار تلون مزاجی کا مظاہرہ شاید فن موسیقی سے ان کی وابستگی کی دین ہے جس کا بے کراں پھیلاؤ فنکار کی شخصیت پر

گہرے اثرات چھوڑتا ہے۔

"حضور، چھ پشت پہلے میرا تعلق اکبر اعظم کے سنہری دور سے جا ملتا ہے۔ میرے پردادا صاحب داد خان، جو سر بہار کے موجد بھی تھے، ان کی عزت افزائی کے لیے انھیں ایک ایسے تخت پر بٹھایا گیا جس پر سوا لاکھ روپے بچھے ہوئے تھے۔ یہ حیدرآباد کا واقعہ ہے۔ لیکن ان کے پوتے یعنی میرے والد نے جب وفات پائی تو میں کوڑی کوڑی کا محتاج تھا۔ کئی دن فاقہ کشی میں گذر جاتے، بلکہ ایک بار تو بھوک کے مارے حالت غیر ہو جانے کے باعث میں پروگرام بھی نہ کر سکا۔ بہر حال ایک بات طے ہے کہ محض خوشحالی جوہر قابل کو جنم نہیں دے سکتی۔ بچپن میں معاشی عدم تحفظ نے مجھے آئندہ زندگی میں آگے بڑھنے اور دولت کمانے کا آہنی ارادہ بخشا۔

"اپنے کیریئر کے دوران منتظمین سے اکثر میرا جھگڑا بھی ہوا، لیکن میں کیا کروں۔ مجھے اپنے بچوں کو بھوکا تو نہیں مارنا۔ اگرچہ اب مجھے دولت کی کوئی پروا نہیں کیونکہ میں نے اپنے بڑھاپے کے لیے کافی جمع کر لیا ہے لیکن یقین کیجیے کہ میں مناسب وقت پر فن موسیقی سے ریٹائر ہو جاؤں گا، انشاء اللہ۔ میں "بھرا میلہ" چھوڑنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں مجھے کب اسٹیج کو الوداع کہنا ہے۔"

اس موقعے پر خان صاحب نے لحظہ بھر توقف کرتے ہوئے کلائی گھڑی پر نظر ڈالی۔ آٹھ بج چکنے کے بعد بھی سورج کی روشنی برقرار تھی۔ "ایک تو یہ مسئلہ ہے، اس ملک میں انسان کس بجے شام کا آغاز کرے۔ چلیے آیئے..." مبہوت کر دینے والے حسن کی مالک کیٹرینا (Katrina) نامی ایک پرتگالی خاتون دیر سے کمرے کے ایک گوشے میں خاموش بیٹھی تھی۔ یہ بھی اپنے گرو سے عقیدت کا ایک اظہار تھا! نگراں فرشتے کے فرائض انجام دینے والے نسیم صہبائی، جو خود تو الکحل سے مکمل پرہیز کرتے ہیں، اس شام جام بنا بنا کر پیش کرتے رہے، خان صاحب اور کیٹرینا کے لیے اسکاچ وہسکی اور میرے لیے دودھ۔

میرا اگلا سوال خان صاحب کی شخصیت کی تعمیر میں نمایاں ترین اثر رکھنے والی ہستی کے بارے میں تھا۔ مجھے یہ سن کر خوشگوار حیرت ہوئی: "میری ماں۔ نہ معلوم ان کی رہنمائی اور دعاؤں کے بغیر آج میں کہاں ہوتا، یا یوں کہیے کیا ہوتا؟ میری ماں نے شروع ہی سے میرے فنی کیریئر پر عقابی نظر رکھی اور کسی ایسے عنصر کو میری زندگی کا حصہ نہ بننے دیا جو میرے فن کے لیے نقصان دہ ہو۔ اماں بی کی مجھ پر ہمہ وقت نگرانی نے میری شخصیت پر گہرا اثر چھوڑا۔ ان کے صبر اور تحمل مزاجی کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ بعض اوقات وہ اپنے ہٹ دھرم اور جھگڑالو بیٹے کو نصیحت کرنے کے لیے مہینوں مناسب وقت کا انتظار کرتیں۔ گائیکی کی طرف میرے بڑھتے ہوئے میلان کو واپس ستار کی سمت لانے کا اعزاز بھی انھی کو جاتا ہے ورنہ میں تو کلاسیکی گائیکی کو بطور کیریئر اپنانے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ بلکہ ایک بار تو بحث کے دوران میں یہ کہنے کی گستاخی بھی کر بیٹھا کہ آپ میرے گانے سے اتنا حسد کیوں کرتی ہیں؟ وہ بولیں: 'ہاں میں تمھارے گانے سے جلتی ہوں۔ اور میں اس میں حق بجانب ہوں کیوں کہ میں تمھیں اپنے والد کے بجائے تمھارے والد کا جانشین دیکھنا چاہتی ہوں۔' دراصل اماں بی کا تعلق کلاسیکی گویوں کے ایک نامور گھرانے سے تھا۔"

"آپ کی اپنی نظر میں فن موسیقی کے حوالے سے آپ کی انفرادیت کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گائکی انگ، اور کیا؟ میں وہ پہلا ستار نواز ہوں جس نے ستار بجانے سے پہلے گا کر سروں کے اتار چڑھاؤ کو واضح کرنے کی طرح ڈالی۔" خان صاحب نے وضاحت کی اور مجھے گذشتہ ماہ شائقین سے کھچا کھچ بھرے رائل البرٹ ہال میں خان صاحب کا بجایا ہوا راگ پیلو یاد آ گیا جس کی ایسی متنوع ادائیگی پر حاضرین نے بے ساختہ کھڑے ہو کر داد دی تھی۔

اماں بی کے ذکر پر واپس آتے ہوئے خان صاحب نے اعتراف کیا کہ انھی کی بدولت وہ زندگی کے حقیقی رخ سے آشنا ہوئے۔ "پے در پے کامیابیوں نے مجھے بڑی حد تک مغرور بنا دیا تھا۔ ایک ماہ میں اوسطاً چودہ پروگرام، یہ تھا میرے عروج کا آغاز۔ لوگ میرے پاؤں چھوتے، میری گاڑی پر پھول نچھاور کرتے۔ اپنے سامعین کے لیے میری حیثیت فی الواقعہ ایک ساحر کی تھی جو کسی بھی لمحے ان کا موڈ بدلنے پر قادر تھا۔

"ایک رات اماں بی اچانک میرے کمرے میں آئیں اور حسب معمول نرم لہجے میں گویا ہوئیں: 'تم نے انسانوں کے دل تو جیت لیے، اب اس کی نظروں میں بھی اچھا بن کر دکھاؤ جو سب انسانوں کا مالک ہے۔' خان صاحب کی آواز بھرا گئی۔" ان الفاظ نے گویا میرے ستار کا گلا گھونٹ دیا۔ اگلے نو ماہ تک مجھے یوں محسوس ہوا کہ کتنے ہی بچھو مجھے مسلسل ڈنک مار رہے ہیں۔ میں اپنے حواس کھو بیٹھا۔ کسی پل چین نہ پاتا۔ بظاہر عشق حقیقی کا دعوے دار بن کر ہر لمحہ بچھوؤں سے ڈسواتے رہنا میرے بس میں نہ تھا۔"

اس موقع پر خان صاحب کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ میں نے ان کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر اپنی نوٹ بک بند کر دی اور انھیں غور سے تکنے لگی۔ اگر یہ شخص موسیقار نہ ہوتا تو تھیٹر میں بڑا نام کرتا۔ ولایت خان صاحب کی شخصیت میں ڈراما کا عنصر پیدائشی ہے۔ وہ بولے۔ "ترک دنیا میرے لیے ناممکن تھا۔ اطمینان قلب کے لیے طویل ریاضت کے نتیجے میں مجھے دو ہی چیزیں ملیں: ایک عجز و انکسار اور دوسرے بے آزاری۔ میں نے اپنی والدہ کو بتایا کہ میں ایک بار پھر خود کو پالنے میں لیٹا انگوٹھا چوستا ہوا بچہ تصور کرتا ہوں جو اپنے مالک حقیقی سے توجہ کا طالب ہے۔"

اور سچی بات تو یہ ہے کہ خان صاحب واقعی کئی لحاظ سے بڑے معصوم بھی ہیں۔ فیسٹول ہال والے کنسرٹ کے اختتام پر میں نے یونہی پوچھ لیا: "آئیوری (Ivory) کی نئی فلم میں 'گرو' کے کردار کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ہاں بھئی۔ وہ تو یوں ہے جیسے میری زندگی ہی کی کہانی ہو۔" وہ بولے۔ ایک ایسی فلم کے بارے میں جو واقعی ان کی زندگی کے واقعات سے گہری مماثلت رکھتی ہے، ان خیالات کو ان کی سادہ دلی یا بھولپن کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے ہندوستان میں ان کے معاصرین نے بھی اس فلم سے

خوب لطف اٹھایا ہوگا۔

"اچھا یہ بتائیے ہندوستانی صحافیوں میں کوئی موسیقی کا حقیقی، سچا نقاد بھی ہے یا نہیں؟"

وہ بولے: "ایک بھی نہیں۔ سب جاہل اور سازشی ہیں۔ فنکار کی خامیاں اجاگر کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ میں تو اپنے متعلق اخباری تراشے پروگرام کے وقت اپنے پاس رکھتا ہوں اور عین اس وقت جب حاضرین مجھے بے پناہ داد سے نواز رہے ہوں، انھیں شرارتاً چند ایک تراشے پڑھ کر سنا بھی دیتا ہوں!"

اپنے نقادوں کا ذکر کرتے ہوئے خان صاحب اتنے جذباتی ہوگئے کہ ان کا خوبصورت کڑھائی والا کرتا پان کی پیک کی چھینٹوں سے رنگین ہوگیا۔ معاً وہ باتھ روم میں جا کر اسے دھو آئے اور بولے "میری بیوی ایسی بے احتیاطی پر مجھے کبھی معاف نہ کرتی۔" نو بجنے والے تھے اور ابھی میرے نصف سے زیادہ سوال باقی تھے تاہم میں نے اجازت چاہی۔ "آپ آج ہمارے ساتھ کھانا کھائے بغیر نہیں جاسکتیں۔" خان صاحب کا حکم سر آنکھوں پر۔

اسی موقع پر خان صاحب نے عوام کے ذوق کی تربیت کے لیے بھارت میں ایک آرٹ سرکل کے قیام کے حوالے سے اپنی کوششوں پر تفصیل سے بات کی۔ "اگرچہ دہلی میں شعرا، گویوں، سازندوں، مصوروں، مجسمہ سازوں اور نقادوں وغیرہ پر مشتمل ایک آرٹ سرکل پہلے سے موجود ہے تاہم میرا مقصد سچے لوگوں پر، جن میں فنون لطیفہ کے نقاد اور شائقین دونوں شامل ہوں، مشتمل ایک آرٹ سرکل کا قیام ہے۔ میں فنون لطیفہ کے باہم ملاپ سے ایک ایسا ماحول تخلیق کرنا چاہتا ہوں جس میں آپ کسی راگ کو دیکھ سکیں اور تصویر کو سن سکیں۔ حواس خمسہ محض اپنے روایتی استعمال تک محدود نہ ہوں۔ کلچر کا صحیح مصرف تو یہی ہے کہ حواس خمسہ فنون لطیفہ کے باہمی امتزاج سے جنم لینے والی کیفیت کو بجا طور پر محسوس کر سکیں۔ اردو کے ایک معروف شاعر نے اپنے کلام میں "شہنائی کی جھنکار" کا ذکر کیا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے اگر فنون لطیفہ کے حوالے سے موصوف کی تربیت درست انداز میں ہوئی ہوتی تو انھیں "گونج" اور "جھنکار" کا فرق معلوم ہوتا۔ اسی لیے میری خواہش ہے کہ معاشرے کے تعلیم یافتہ طبقے میں فنون لطیفہ کی تفہیم کا ذوق پروان چڑھے۔"

"پاکستانی فنکاروں کے لیے کوئی پیغام؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولے "ہاں! انھیں یہ بتا دیجیے کہ میں ان کا بڑا چاہنے والا ہوں لیکن انھیں چاہیے کہ اپنی حکومت یا دوسرے ملک کی میزبان تنظیم کی باقاعدہ سپانسرشپ کے بغیر غیر ممالک میں پروگرام نہ کریں۔ یورپ اور امریکہ میں متعدد ایسے (پاکستانی) فنکاروں سے میری ملاقات ہوئی جو ایسی بے احتیاطیوں کے باعث وہاں خوار ہو رہے تھے... اور ہاں نزاکت سلامت کو میرا خصوصی سلام پہنچائیے گا۔ ہندوستان میں ان کی بے پناہ پذیرائی کی جاتی ہے لیکن نہ معلوم لندن آکر وہ Jazz والوں کے ساتھ مل کر کیوں گانے لگتے ہیں؟ ہمارے روی شنکر نے بھی ستار کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا اور نتیجتاً ستار کی وقعت پہلے سے کہیں کم ہوگئی ہے۔"

دس بج چکے تھے۔ خان صاحب نے کھانا لگوانے کے لیے کہا اور اس دوران خود بھی باورچی خانے کے کئی چکر لگائے۔ کھانے پینے کے بے انتہا شوقین ولایت خان صاحب دنیا بھر کے کھانوں پر بھی گھنٹوں گفتگو کر سکتے ہیں۔ میں نے خصوصیت سے یہ بات نوٹ کی کہ اعلیٰ برانڈ کے فرانسیسی سگریٹ پھونکتے ہوئے جب ولایت خان اپنے ماضی کی یادیں تازہ کر رہے تھے تو پس منظر میں ایک عجیب سماں تھا۔ ان کے لاتعداد پرستاروں کی، جن میں وکیل، طالب علم، بی بی سی والے، ڈپلومیٹ اور نہ جانے کون کون سے لوگ شامل تھے، آمد و رفت جاری تھی۔ لوگ آکر بڑے مؤدبانہ انداز میں خان صاحب سے ہاتھ ملاتے اور رسمی احوال پرسی کر کے کچھ دیر بعد رخصت ہو جاتے۔ کوئی بنارسی پان کا تحفہ نذر کرتا، کوئی لکھنؤ کا سپیشل قوام پیش کرتا اور کوئی ہیتھرو ائیر پورٹ سے عمدہ شراب لے کر سیدھا یہیں چلا آرہا تھا۔

خان صاحب سے میری اس طویل نشست کے دوران ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اگرچہ اس عرصے میں تسیم صہبائی نے انھیں مسلسل موصول ہونے والی فون کالوں سے بچائے رکھا لیکن ایک بار وہ بھی ہار مان گئے۔ تسیم نے ریسیور اٹھایا ہی تھا کہ کسی خاتون چلاتی ہوئی آواز سنائی دی:

"پرنسس زبیدہ آف رامپور کل شام سے لاپتہ ہیں۔ انھیں خان صاحب سے بات کرتے ہوئے دیکھا..."

بیچارے خان صاحب نے دوڑتے ہوئے جا کر تسیم صہبائی سے ریسیور چھینا اور کان سے لگایا ہی تھا کہ دوسری طرف سے ایک قہقہہ گونجا۔ "آپ سے بات کرنے کا بس یہی ایک طریقہ تھا!" میرے خیال میں کسی بھی بڑے فنکار کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔

ولایت خان کی شخصیت ایک خوبصورت گلدستے کی مانند ہے۔ ستار نوازی کا امام، ہندی اور اردو کا شاعر، بیک وقت پانچ زبانوں پر دسترس رکھنے والا، لاجواب گویا اور سب سے بڑھ کر ایک باذوق اور نفیس آدمی۔ ان کے استاد آرزو لکھنوی شاکی ہیں کہ ایک ابھرتا ہوا شاعر موسیقی کی نذر ہوگیا۔ تیزی سے مٹتے ہوئے کلچر کی ایک قابل ذکر نشانی ولایت خان صاحب مغرب میں بھی اسی اطمینان سے قیام پذیر ہیں جیسا کہ وہ اپنے ملک میں تھے۔ کتنے اعزاز کی بات ہے کہ وہ دنیا کے پہلے موسیقار ہیں جنھیں پچھلے ہفتے ویسٹ منسٹر ایبی (Westminster Abbey) میں تنہا ستار نوازی (Solo Performance) کی دعوت دی گئی۔

اگر مجھے ظاہری علامات کے اعتبار سے خان صاحب کا غائبانہ تعارف کرانے کے لیے کہا جائے تو میرا بیان یوں ہوگا: بنگالی معیار کے مطابق درمیانہ اور پنجابی معیار کے مطابق چھوٹا قد، گول چہرہ، ایل پی ریکارڈوں پر چھپنے والی تصویر سے کہیں کم سیاہ رنگت اور ہر دم متحرک موٹی موٹی آنکھیں۔ آپ کی مناسب موٹائی کی ترشی ہوئی انگلیاں گفتگو کے دوران بھی اتنی ہی معنی خیزی سے حرکت کرتی ہیں جتنی کہ ستار نوازی کے دوران۔ آدھی زندگی تقسیم ہند سے پہلے اور آدھی بعد ازاں گذار چکنے والے ولایت خان صاحب اپنی زندگی کے دونوں

ادوار کا موازنہ یوں کرتے ہیں "اپنے ہی ملک میں اجنبیت کا احساس! یہ ایسا تجربہ ہے جس سے آپ یقیناً ناآشنا ہوں گی۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میرا کچھ بھی نہیں۔ شملہ میں ماہِ رمضان کے دوران مسجد میں تراویح پڑھنے والا میں اکیلا آدمی ہوتا ہوں۔"

"آپ نے رہنے کے لیے شملہ کا انتخاب کیوں کیا؟" میں نے پوچھا۔ وہ بولے:

"شور اور ہنگامے سے بچنے کے لیے بھئی... اور کیا؟ معاشرتی زندگی کے تقاضے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے اور بطور ایک پروفیشنل موسیقار میں اپنے ریاض کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اور یوں بھی پہاڑ ہمیشہ سے میری کمزوری رہا ہے۔ پہاڑی ماحول میرے اعصاب کو آسودہ کرتا ہے۔ یہ "پری محل" میں نے مہاباد شاہ جبل سے خریدا ہے اور یہاں میں اپنے گھر والوں اور فن دونوں کو مناسب وقت دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرے تین بچوں میں سے سب سے بڑا شجاعت بھی ستار میں دلچسپی رکھتا ہے اور ماشاء اللہ دس برس کی عمر میں بہت ہونہار ہے۔" خان صاحب اپنی بنگالی بیوی موہنی کو بھی کسی لمحے نہیں بھولتے جس کا ذکر ان کی گفتگو میں اکثر و بیشتر در آتا ہے۔

یادِ ماضی میں کھوئے ہوئے ولایت خان صاحب کو میں نے ایک بار پھر اپنے سوالات میں الجھانے کی کوشش کی۔ "مغربی ممالک کی طرف اپنے فنکاروں کے حد سے زیادہ جھکاؤ کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟"

خان صاحب اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئے: "بدقسمتی سے کسی فنکار کے بیرونِ ممالک جا کر پروگرام کرنے کو برتری کا معیار سمجھ لیا گیا ہے۔ ہر فنکار کسی مغربی ملک میں جا کر کسی یونیورسٹی سے منسلک ہو جانے کا خواہشمند ہے۔ گویوں میں سے صرف استاد امیر خان صاحب کو کناڈا میں نسبتاً لمبے عرصے کا ایک کنٹریکٹ ملا تھا جو شاید حال ہی میں ختم ہوا ہے۔ روی شنکر اور علی اکبر خان بھی مدت ہوئی شو بز (show biz) کے مرکزی دھارے سے باہر ہیں۔ اپنے ہم وطنوں کو یوں نظر انداز کرنا میرے خیال میں ان کی توہین کے مترادف ہے۔ برا نہ مانیے گا اگر میں کہوں کہ ایک دن یہ ہم وطن ایسے فنکاروں کو بھول کر ان کی بے التفاتی کا انتقام لیں گے۔ رام گوپال ہی کو لیجیے۔ ہندوستان میں اب اسے کون جانتا ہے؟ میرے خیال میں ایسے فنکار خود غرض اور لالچی بلکہ یوں کہیے کہ لفٹ مانگ مانگ کر سفر کرنے والے بے مایہ مسافر ہیں۔ ہم اپنی موسیقی کیوں ایکسپورٹ کریں؟ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم پہلے اپنے لاکھوں ہم وطنوں کو اس کے ذائقے سے آشنا کریں؟ مثال کے طور پر مجھے دیکھیے۔ بیرونِ ملک مجھے فی کانسرٹ پانچ ہزار پاؤنڈ ملتے ہیں جبکہ اپنے ملک میں میں اس سے کہیں زیادہ کماتا ہوں۔ اور یہ ہپی... بھئی یہ تو روی شنکر اور یوگی مہارشی کو ہی مبارک ہوں! وہ جتنے چاہیں بھنگ کے لڈو کھائیں اور جتنی چاہیں 'پاپ ٹھمریاں' سنیں۔ میرے بس میں ہو تو ہپیوں کی ہندوستان آمد پر پابندی لگا دوں۔ آپ خود ملاحظہ کر لیجیے یہ وبا بنارس سے کھٹمنڈو تک پھیل چکی ہے۔"

"کہا جاتا ہے راجوں مہاراجوں کی زیرِ سرپرستی موسیقی کی نشو و نما بہتر تھی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟" میرے اس سوال پر خان صاحب نے بڑی قطعیت سے کہا۔ "نہیں، بالکل نہیں۔ کم از کم میں تو کسی بھی صورت میں راجوں مہاراجوں کی غلامی نہیں کر سکتا کہ جب وہ حکم دیں میں ان کے لیے ستار بجاؤں۔ اگرچہ سبھی فنونِ لطیفہ بدلتے ہوئے معاشرتی تقاضوں سے متاثر ہوئے ہیں لیکن میری رائے میں اچھی موسیقی کسی بھی دور میں نہیں مر سکتی۔ موسیقی کے پاس ایک ایسی لافانی قوت ہے جو اسے کبھی مرنے نہ دے گی۔ میں سمجھتا ہوں میرا فن محض چند رجواڑوں تک محدود رہنے کے بجائے ہندوستان کے ہر گوشے میں پہنچ رہا ہے۔"

"ماس میڈیا اور پاپ میوزک کی یلغار کو آپ کلاسیکی موسیقی کے لیے کس حد تک خطرہ سمجھتے ہیں؟"

اس بارے میں بھی خان صاحب کے خیالات بڑے واضح تھے۔ "میں تو ذرائع ابلاغ کی اس تیز رفتار ترقی پر بڑا خوش ہوں۔ ان کی بدولت ذہن متحرک رہتا ہے۔ ہر روز بیسیوں نئے خیالات سوچ کا حصہ بنتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو یہی نت نئے خیالات کلاسکس کو خوبصورتی اور بقائے دوام بخشتے ہیں۔

میرے اپنے خیال میں ہماری موسیقی محض تفریحِ طبع کے لیے اختراع کی جانے والی نئی اصناف کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ علی اکبر خان کا "چندر نندن" اور آرکسٹرا کے حوالے سے روی شنکر کی جدتیں اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ خان صاحب سے میرا اگلا سوال اسی موضوع پر تھا۔ "پچھلے کانسرٹ میں آپ نے ایک راگ 'چاندنی کلیان' پیش کیا تھا۔ کیا یہ راگ آپ کا ایجاد کردہ ہے؟"

خان صاحب نے وضاحت کی۔ "جی ہاں، میں نے ایمن کے نکھاد کو بنیاد بنایا، پھر نٹ اور چاندنی کیدارا کو ملا دیا۔ ویسے میں ذاتی طور پر راگوں کے ایسے ادغام کے حق میں ہوں نہیں۔ بالخصوص اگر کوئی نوآموز یا دوسرے درجے کا فنکار اس نوع کے تجربات کرے تو صورتِ حال بڑی مضحکہ خیز ہوتی ہے۔ نیز موسیقی کی تھیوری پر بحث کرنے والے مکاتبِ فکر کو بال کی کھال اتارنے کے لیے کافی مواد مل جاتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ پہلے چار لاکھ چوراسی راگ راگنیوں کی تعلیم مکمل کریں اور پھر نئے راگ اختراع کرنے کی طرف توجہ کریں۔"

"اگر آپ کو منتظمین کی طرف سے صرف تین راگ بجانے کی فرمائش کی جائے تو آپ کے انتخاب میں کون سے راگ ہوں گے؟"

"ایسا کرنا میرے لیے خاصا مشکل ہوگا کیونکہ ہر ٹھاٹھ میں سے مجھے کم از کم دو راگ بہت پسند ہیں۔ لیکن میں یہ عرض کر دوں کہ ان تین راگوں میں سے ایک بھیرویں ضرور ہوگی۔" استاد نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے میرا حال میں جاری شدہ میرا اور باری کانہڑا کا ایل پی سنا ہے؟ میرے خیال میں تا حال یہ میری بہترین ریکارڈنگ ہے، حالانکہ سٹوڈیو کا مصنوعی ماحول میری طبیعت سے لگا نہیں کھاتا۔"

خان صاحب کا موڈ خوشگوار دیکھتے ہوئے میں نے یہ پوچھنے کی جسارت کر ہی لی کہ وہ خود کو موسیقی کے میدان میں کہاں تصور کرتے ہیں؟ کیا ابھی کسی

برتر مقام پر پہنچنا باقی ہے؟ اس پر انھوں نے فرمایا:

"کچھ عرصہ پہلے تک میں نے خود کو خدا سمجھنا شروع کر دیا تھا (نعوذ باللہ)۔ روزانہ چودہ گھنٹے ریاض کرنے کے بعد میں خود کو حاضرین کا موڈ بدلنے پر قادر سمجھتا تھا۔ ستار میری بندوق تھی جس سے میں کسی کو بھی نشانہ بنا سکتا تھا۔ لیکن اب میں نہ جانے کیوں نروس ہو جاتا ہوں۔ یہ خوف دامنگیر رہتا ہے کہ کہیں کوئی غلط سر نہ لگ جائے۔ یقین کیجیے میں یہ سب کچھ اپنی عاجزی کے اظہار کے لیے نہیں کہہ رہا۔ جب میں پرانے اساتذہ کی ریکارڈنگ سنتا ہوں تو مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں میرا میدان بہت وسیع ہے۔ مجھے مزید آگے بڑھنا ہے۔"

"موسیقی کی آفاقیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔ خان صاحب نے کہا۔ "بالکل۔ میں تو سو فیصدی اس کے حق میں ہوں۔ میں کسی زمانے میں چینی موسیقی کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ لیکن جب میں نے پیکنگ میں کچھ چینی سمفنیاں (Symphonies) سنیں تو یقین کیجیے میں حیران رہ گیا۔ ہماری اپنی موسیقی بظاہر غیر ملکیوں کے لیے ناقابل فہم معلوم ہوتی ہے لیکن میں نے خود پیرس سے ماسکو اور ٹوکیو سے جوہانسبرگ تک سامعین کو اسی سے مسحور کیا ہے۔"

میرا اگلا سوال تحقیقی اور تاریخی نوعیت کا تھا۔ "ستار کی ایجاد کے بارے میں جاری بحث کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

وہ بولے۔ "اس میں تو کوئی شک نہیں کہ امیر خسرو "سہ تار" نامی ساز کے موجد تھے۔ تاہم ستار کی موجودہ شکل گذشتہ صدیوں میں ہونے والی متعدد تبدیلیوں کی مرہون منت ہے۔ میں اپنے اس دعوے کے حق میں امیر خسرو کی اپنی، اور ان پر لکھی ہوئی متعدد کتب بطور حوالہ پیش کر سکتا ہوں۔ خدا کے فضل سے پری محل میں میری ذاتی لائبریری میں کتابوں کا ایک عمدہ ذخیرہ ہے۔"

"گویا آپ کے خیال میں ستار، وینا کا تسلسل نہیں ہے؟" میں نے بات آگے بڑھائی۔

"بھئی اس طرح تو آپ بیچارے ستار کو عہد نامۂ قدیم کے دور میں پائے جانے والے ساز Lute سے بھی ملا دیں گے... نہیں نہیں، ایسا قطعاً نہیں۔ امیر خسرو نے نہ صرف ستار بلکہ طبلہ اور شہنائی بھی ایجاد کیے۔ انھوں نے موسیقی کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ میں ان کے ترتیب دیے ہوئے کئی خیال بھی ستار پر بجا سکتا ہوں۔"

رسمی انٹرویو تو بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔ ہلکے ہلکے سرور کے باعث خان صاحب کی گفتگو سیاست اور تصوف جیسے ان مل اور بے جوڑ موضوعات کا بیک وقت احاطہ کر رہی تھی۔ "معاف کیجیے گا، مرار جی یہاں نہیں ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کچھ چیزوں کا وعدہ کیا تھا۔ جانسن اور ورلڈ بینک کے اکسانے پر انھوں نے ہندوستان میں روپے کی قیمت میں کمی کر دی..."

خان صاحب کی گفتگو سے شہ پا کر میں نے ان کی سیاسی وابستگی کے بارے میں ایک سوال داغ دیا۔ وہ بولے۔ "دیکھیے، میں ایک غیر سیاسی فنکار ہوں۔ روس اور چین دونوں ملکوں نے مجھے خوش آمدید کہا لیکن اپنے ملک کے حوالے سے میرا خیال ہے کہ مغربی بنگال کی حکومت کو موجودہ صورت حال کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ اور ہاں اس سے یہ بالکل نہ سمجھ لیجیے گا کہ میں کوئی کمیونسٹ ہوں... ویسے میں کمیونسٹ ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ میں آسائش پسند ہوں۔ ساتھ ہی یہ کہ میں سرمایہ دار بھی نہیں کہلا سکتا مگر میرے تمام شوق انتہائی مہنگے ہیں، مثلاً امپالا گاڑیاں، ہیرے جواہرات، وسیع و عریض کوٹھیاں۔ کمیونزم کی زبان میں یہ سب غیر پیداواری اخراجات ہیں۔ ایک دفعہ لندن میں میں نے ایک ضیافت کی جس پر سترہ سو پاؤنڈ کا خرچ آیا تھا۔ ٹیکس کی دوہری ادائیگی بھی انسان کو فضول خرچ بناتی ہے۔ جب مجھے یہاں بھی ٹیکس دینا پڑتا ہے اور دلی میں بھی، تو پھر میں کیوں اپنی ذاتی زندگی اور آسائشوں کو قربان کروں؟ کچھ عرصہ پیشتر میری متعدد درخواستوں کے جواب میں بالآخر حکومت نے میری بیرون ملک کی آمدنی پر ٹیکس میں پچیس فیصد چھوٹ دے دی ہے۔"

آدھی سے زیادہ رات گذر چکی تھی لیکن خان صاحب ہشاش بشاش صبح کی بلبل کی مانند چہک رہے تھے۔ مجھے نسیم صہبائی پر ترس آ رہا تھا کیونکہ وہ ایک ملازمت پیشہ آدمی ہے۔ ولایت خان صاحب پوری رات بھی نہیں سوتے۔ وہ بے خوابی کے پرانے اور لاعلاج مریض ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اٹھنا، سگریٹ پینا اور پھر کوئی دھن گنگناتے ہوئے کچھ دیر کے لیے سو جانا ان کا معمول ہے۔

گفتگو جاری رکھتے ہوئے خان صاحب نے تلاش حق کے لیے اپنی طویل ریاضت کا ذکر کیا جو بالآخر ایک مرشد سے ان کی ملاقات پر ختم ہوئی تھی۔ "مدتوں تک صوفیا کی درگاہوں پر حاضری دینے کے بعد آخر کار مجھے میرے مرشد مل گئے۔ (ان کے ذکر پر انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اپنی انگلیوں کو چوما اور ماتھے سے لگایا۔) میرے مرشد حضرت امام حسین کے سلسلے کے میں سے ہیں۔ ان کا قیام کابل میں ہے۔ وہ نوجوان اور وجیہ شخصیت کے مالک ہیں۔ جب وہ مجھے اپنے حلقۂ ارادت میں لینے پر رضامند ہوئے تو انھوں نے حکم دیا کہ عرق لاؤ۔ مجھے یہ دیکھ کر نہایت حیرانی ہوئی کہ ان کے حکم کی تعمیل میں وہسکی پیش کی گئی۔

جب میں نے اسے اپنے گلاس میں انڈیلا اور چکھا تو یقین کیجیے وہ دودھ بن گئی۔ پنجتن پاک کی قسم! یہ کوئی واہمہ یا فریب نظر نہ تھا۔ میں نے بوتل دیکھی تو اصلی اسکاچ وہسکی کی بوتل تھی۔ میں نے حیران ہو کر اپنے مرشد کی جانب دیکھا۔ وہ مسکرائے اور بولے، 'اگر تم اسے شعبدہ بازی سمجھتے ہو تو میرے پاس اس طرح کے اور کرتب بھی ہیں۔ لیکن تصوف ایک بالکل الگ چیز ہے۔' میرے مرشد ہی میری زندگی کا واحد سہارا ہیں۔"

اس وقت رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ میں نے اس آخری سوال کے ساتھ خان صاحب سے اجازت چاہی: "انسان کے چاند پر جانے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

خان صاحب کا جواب بڑا دلچسپ تھا۔ "میں اب بھی چاندنی کیدارا یا چندر بدن سارنگ نہیں بجا سکوں گا۔ انسان کے چاند پر پہنچ جانے سے چاند کے ساتھ میرا رومانس جاتا رہا۔" ☆☆☆

۱۔ اختر ریاض الدین اردو اور انگریزی کی مصنفہ ہیں۔ دونوں زبانوں میں آپ کا انداز تحریر شگفتہ، رواں اور معلوماتی ہے۔ اردو میں ان کی دو کتابیں ''سات سمندر پار'' اور ''دھنک پر قدم'' شائع ہو چکی ہیں۔ موخر الذکر آدم جی ادبی انعام یافتہ ہے۔ علاوہ ازیں مختلف اخبارات و جرائد میں آپ کی تحریریں نظر نواز ہوتی رہتی ہیں۔

۲۔ ولایت خاں کے نانا استاد بندے حسن خان کا شمار اپنے دور کے اہم گویوں میں ہوتا تھا۔ ان کے ایک بیٹے زندہ حسن بھی گائیک تھے۔ ولایت خاں صاحب نے اپنے والد کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک ان حضرات سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ علاوہ ازیں بیسویں صدی کے عظیم خیال گائیک استاد امیر خاں (۱۹۱۲ تا ۱۹۷۴) ولایت حسین خاں صاحب کے بہنوئی تھے۔ گائیکی سے ولایت خاں کی حد درجہ دلچسپی انھی عوامل کی مرہون منت ہے۔ ملاحظہ ہو:

Partho Datta, Khan of Grace, Frontline, Vol 21, Issue 07, March 27 - April 2004.

حتی المقدور جستجو کے باوجود ہندوستان میں 'جبل' (Jubble، جیسا کہ متن میں درج ہے) نام کی کسی ریاست کا سراغ نہیں مل سکا جس کے بادشاہ سے خان صاحب نے ''پری محل'' خریدا۔ تاہم جبل پور، مدھیہ پردیش (بھارت) کا ایک اہم شہر ہے جو انتظامی اعتبار سے ڈویژن کا درجہ رکھتا ہے۔ کسی دور میں یہاں 'جبل' نامی ریاست موجود ہونے کی شہادت میسر نہ ہو سکی۔ (انگریزوں نے جبل پور کو انگریزی میں Jubbalpore کہنے کی رسم ڈالی تھی۔ بڑا ضلع ہے، وہاں چھوٹے موٹے راجے بھی رہے ہوں گے، ادارہ)۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ خان صاحب موصوف نے چاندنی کلیان کے علاوہ بھی چند راگ ایجاد کیے۔ مثلاً ولایت خانی کانہڑا، سانجھ سراولی، لکشمی کانہڑا، کلاوتی وغیرہ۔ راگوں کی ایجاد کے حوالے سے ولایت خان صاحب کے خیالات اور ان کے فن پر غیر جانبدارانہ تبصرے کے لیے ملاحظہ ہو:

Chetan Karnani, Listening to Hindustani Music, Orient Longmans, Bombay, 1976, p. 72-73

۵۔ امیر خسرو سے نہ صرف ستار بلکہ طبلہ اور شہنائی کی بھی ایجاد منسوب کرنے کے بارے میں ولایت خان صاحب کی طرف سے کوئی سند ریکارڈ پر نہیں۔ یہ خالصتاً علمی اور تاریخی بحث اور تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ راقم کی رائے میں ولایت خاں جیسے موسیقار کے لیے ایسا دعویٰ کرنا تو آسان تھا لیکن اس حوالے سے کوئی مستند شہادت پیش کرنا شاید ان کے بس کی بات نہیں تھی اور ان کی باتیں غالباً عوام میں مقبول روایات پر مبنی تھیں۔

۶۔ ''عرق'' کی فرمائش کے جواب میں وسکی پیش کیے جانے پر ولایت خان صاحب کی حیرانی اس بنا پر تھی کہ ایران اور افغانستان میں شراب کے لیے لفظ ''عرق'' بھی مستعمل ہے۔

''مجھ سے کہا ہوتا'' میں آنند لہر نے بڑا موضوع منتخب کیا ہے اور اسے ادا کرنے کے لئے پرانی کہانیوں اور پنچ تنتر جیسے اسلوب کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں اس ناول کی اشاعت پر لہر کو مبارکباد دیتا ہوں۔

——— شمس الرحمٰن فاروقی

امریکہ کے عراق پر فاسقانہ جبر کی لرزہ خیز داستان

مجھ سے کہا ہوتا

مشہور اور کامیاب فکشن نگار

آنند لہر

کا نیا ناول

اپنے قاری اور ناقد کو آواز دے رہا ہے۔

ضخامت : ۱۱۹ صفحات

قیمت : ۱۵۰ روپئے

مطبوعہ مارچ ۲۰۰۴

ناشر

مانوی پرکاشن

پنج تیرتھی، جموں

*

تقسیم کار

نوائے ڈگر، مبارک منڈی، جموں

فون ۲۵۶۰۴۱۹

مصطفیٰ شہاب

اجالوں کو اندھیروں سے بچانا پڑ گیا ہے
عجب یک طرفہ مشکل میں زمانہ پڑ گیا ہے

زمیں کا دوش کیسا کم نگاہی سے ہماری
پرندوں کو یہاں کم آب و دانہ پڑ گیا ہے

تحفظ کی لکیریں کھینچ کر بیٹھے تھے ہم لوگ
پر اب دیوار اک اونچی اٹھانا پڑ گیا ہے

کہا تھا میں نے کھو کر بھی تجھے زندہ رہوں گا
وہ ایسا جھوٹ تھا جس کو نبھانا پڑ گیا ہے

حقیقت کو تماشا سے جدا کرنے کی خاطر
اٹھا کر بارہا پردہ گرانا پڑ گیا ہے

شہاب اتنی ہوائیں ہو گئیں ہیں زہر آلود
کہ خود سانسوں سے اپنی منھ چرانا پڑ گیا ہے

میں سمندر نہ بنا جوے رواں ہوتے ہوئے
بن کے جگنو نہ اڑا شعلہ فشاں ہوتے ہوئے

رفتہ رفتہ بھی ہوئے کام جنھیں ہونا تھا
کیوں اندھیرے نہ چھٹے صبح عیاں ہوتے ہوئے

کل عجب بات ہوئی اوج پہ تھی تنہائی
پاس میرے ترے ہونے کا گماں ہوتے ہوئے

تو نہ بن جائے کہیں پہلا نشانہ میرا
تیرے قابو میں مرے تیر و کماں ہوتے ہوئے

باغ ویران بہاروں میں رہے اور شہاب
پھول جنگل میں کھلے فصل خزاں ہوتے ہوئے

غزلیں

محمد عابد علی عابد

ثبوت اپنی محبت کا اسے دینا ضروری تھا
اڑانا خاک کرنا چاک دامن کا شعوری تھا

شرار سنگ سے حسب ضرورت آگ روشن کی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ ناری تھا نہ نوری تھا

کنار راہ جو اشجار تھے سائے کی خاطر تھے
بتانا کام سنگ میل کا منزل سے دوری تھا

ستم ڈھانا مکرنا اور مجھے خاموش کر دینا
محبت میں رویہ اس کا چوری سینہ زوری تھا

خدا حافظ کہ آنے کو ہے اپنی منزل مقصود
قیام اپنا جہاں میں مستقل کب تھا عبوری تھا

اسے ملال ہو کیا دوست کی جدائی کا
جو سہ چکا ہو غم و رنج آشنائی کا

بھلائی میں بھی نکالا سبب برائی کا
بنا دیا ہے عدو نے پہاڑ رائی کا

یہ چاند تارے یہ سورج ہیں کیا دریچے ہیں
تجھے بھی شوق ہے گویا کہ خود نمائی کا

تڑپنا دیکھ کے چرکے لگائے بسمل کو
ستم تو ٹھیک یہ عالم تری ڈھٹائی کا

میں جب یہاں سے گیا میرے ہاتھ خالی تھے
حساب لے لیا دنیا نے پائی پائی کا

خواجہ جاوید اختر

جانتا ہوں حریف جاں ہیں سب
ہاں مگر آج وہ کہاں ہیں سب

ایک میں ہی زمیں کی صورت ہوں
اور باقی تو آسماں ہیں سب

کون میری زباں سمجھتا ہے
یوں تو کہنے کو ہم زباں ہیں سب

میں سبھی کو سمجھتا حق گو ہوں
اور مجھ سے ہی بدگماں ہیں سب

کون سی مصلحت ہے جو مجھ پر
اس قدر آج مہرباں ہیں سب

سن کے سارے ہی سانحات میرے
لوگ بولے کہ داستاں ہیں سب

مصطفیٰ ارباب

وہ لڑکی

دل اور چوڑیوں کا انجام
ٹوٹنا ہے
میرے پاس
ایک دل
اور ایک چوڑی ہے
میرا دل
ابھی سلامت ہے
چوڑی ٹوٹ کر
اس میں چبھی ہوئی ہے
وہ لڑکی
اپنی گم شدہ چوڑی
تلاش کرتے ہوئے
اس دل تک پہنچے گی
میرا دل
ایک انتظار گاہ ہے
اس لڑکی کی
جسے انتظار کی عادت ہے
انتظار
دل کے ٹوٹنے کا

انت

میں
تم سے شروع ہو کر
تم پر
ختم ہو جاتا ہوں
میری نگاہیں ہر پل
تمھارے پیروں کا
طواف کرتی ہیں
وہ
میری طرف
متوجہ نہیں ہوتے
تجھ سے
مجھ تک
آنے والے راستے اداس ہیں
یاد کی مٹی سے
گندھی ہوئی لڑکی!
تم
کہیں سے بھی شروع ہو کر
کہیں بھی
ختم ہو جاتی ہو

مصطفیٰ ارباب

تم کیا کہتی ہو

میں
اپنی چاردیواری کے
سارے دروازے
بند رکھتا ہوں
یہ کسی پر بھی
کھلنا بھول چکے ہیں
تم مجھے
ایک روز
جھماکے کی طرح
اپنے اندر دکھائی دیں
تم
چاردیواری پھلانگ کر
اندر آئی تھیں
تمھیں پاکر
میری دیواریں
اونچی ہوگئیں
تم اندر رہ کر
مجھے ضرورت سے زیادہ
جان چکی ہو
اب مجھے
تمھارا ساتھ چاہیے
ساتھ
زندگی دیتا بھی ہے
اور
لیتا بھی ہے
تم کیا کہتی ہو

ایک بار

میری آنکھیں
بہت روشن ہیں
میری باتوں سے
سورج طلوع ہوتا ہے
میرے پیروں میں
رقص کی انگڑائیاں ہیں
لوگ
میرے قریب رہنا پسند کرتے ہیں
میں
ایک پھول کی طرح
مہک رہا ہوں
ایک بار
وہ مجھے
چھوتے ہوئے گذری تھی

مصطفیٰ ارباب

کوئی بات نہیں

ہم
زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے
اپنی کھیتیوں میں مسلسل اپنے آپ کو
بوئے جاتے ہیں
اس برس بھی ہماری فصل اچھی ہوئی تھی
ہمارے اجداد
اپنی تعداد میں بے پناہ اضافہ دیکھ کر
خوش ہوئے ہوں گے
مگر یہ خوشی عارضی رہی ہوگی
ایک آندھی نے
فصل کو تباہ کر ڈالا
جو ابھی تک چل رہی ہے
کوئی بات نہیں، اسے رکنے دو۔
کسان کبھی ناامید نہیں ہوتا

التجا

موت،
تم جو کہوگی
میں مان لوں گا
میں تمھارے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے
ہنسنا چاہتا ہوں اور
ڈھیروں پھول
تمھیں پیش کرنا چاہتا ہوں
میں تمھارے لبوں سے نکلی ہوئی
کسی بھی بات سے
انحراف نہیں کروں گا
اگر ایسا ہو تو تم ہمیشہ کے لئے مجھے رد کر دینا
ابھی مجھے وہ جگہ بتادو
جہاں دھماکا ہونے والا
یا وہ سڑک
جہاں گولیوں کی بارش ہوگی

نیو ورلڈ آرڈر(۱)

تمھاری آمد پر
پھول کم پڑ گئے ہیں
اور الفاظ
جذبوں سے لد کر تھک چکے ہیں
آسمان پر
نگراں بادلوں نے
برسنے کا پروگرام ملتوی کر دیا ہے
دن کو
نیند آچکی ہے
رات اس کا خواب ہے
جس کے اندر
میں تمھیں
خوش آمدید کہہ رہا ہوں
آؤ ہم زندگی کی باتیں کریں
لطیف جذبوں کی انگیٹھی
دہک اٹھے گی
اور ہم
ڈٹ کے عمدہ کھانا کھائیں گے
ہمارے بدن بوجھل ہوئے تو
کافی بھی پی جائے گی
اس کے بعد بلا تاخیر
تم مجھے مار دینا
اگر موقع ضائع کر دیا تو
میں تمھیں مار ڈالوں گا
معاف کرنا دوست
یہ ہمارا دستور ہے

(۱) New World Order

مصطفیٰ ارباب

تم جو چاہو کرسکتی ہو

تم
جو چاہو کرسکتی ہو
میرے ہونٹوں کو شکوے کی عادت نہیں
تمھیں لگتا ہے
میرے دل سے بہتر کوئی اور دل موجود ہے
تو چلی جاؤ
تمھاری خوشی ہی میری خوشی ہے
تمھارے نکلتے ہی
میں اپنے دل پر تالا لگا کر
چابی ریگستان میں پھینک آؤں گا
تم جو چاہو کرسکتی ہو
میرے دل سے
اپنے نام کی تختی
نہیں ہٹا سکتیں
میرا دل
کرائے کا مکان نہیں

دنیا کی حد

محبت کہاں سے شروع ہوتی ہے
کوئی نہیں جانتا
وہ زندہ ہوتی ہے
یہ میں نے اس وقت جانا
جب ایک لڑکی نے
میرے وجود کو پہچان لیا
ہم ساتھ ساتھ رہے
اور بھول گئے
زندہ چیزوں کے احساسات بھی ہوتے ہیں
محبت کی بے رخی نے
مجھے بتادیا
دنیا کی حد کہاں ختم ہوتی ہے

ہم نہیں جانتے

ہم نہیں جانتے
کرسی پر بیٹھنا کیسا لگتا ہے
تیز دھاروں کا رخ کیسے تبدیل کیا جاتا ہے
رویوں کا کھیل کیسے کھیلا جاتا ہے
خواہشیں خیالوں پر کس طرح حاوی ہوتی ہیں
لوگ معاشرے کے لئے ہیں
یا معاشرہ لوگوں کے لئے ہے
ہم کچھ بھی نہیں جانتے
ہم اعلیٰ دنیا سے بہت دور
حکم کے دائرے میں قید ہیں،
جنھیں جنم لینے کے بعد
مرنے کا ہنر آتا ہے

سرکس

یہ
رونے پر آئے تو
دریا بہا سکتا ہے
محبت کرے تو
ہر شے سے ٹکرانے کی ہمت رکھتا ہے
اس کے پاس
نفرت کے ذخیرے بھی موجود ہیں
اس کے ہاتھ
آنسو پونچھتے ہوئے
شہ رگ تک پہنچ جاتے ہیں
اس کی
دلفریب مسکراہٹ پر مت جاؤ
یہ کچھ بھی کرسکتا ہے
یہ آدمی ہے

مصطفیٰ ارباب

آنسوؤں کا بادل

ایک آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا
اور ہوا میں تحلیل ہو گیا
ایک اور آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا
اور ہوا میں تحلیل ہو گیا
آنکھوں سے آنسو ٹپک کر تحلیل ہوتے رہے
اور یوں
ایک آنسو کا بادل بن گیا
یہ بادل
محبت کرنے والوں پر
منڈلاتا رہتا ہے
یہ برستا نہیں
آنکھ سے ٹپکنے والے ہر آنسو کو
اپنے وجود کا حصہ بنالیتا ہے
اس بادل کا حجم بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے
محبت زندہ رہی تو
ایک روز یہ بادل
پورے کرہ پر چھا جائے گا

آنسو تو بہیں گے

میں جانتا ہوں
وہ رو رہی ہے
اسے چپ مت کراؤ
آنسوؤں کو بہنے دو
وہ برسوں سے قید میں تھے
اس کی ہنسی کا پھول
پتی پتی ہو کر بکھر چکا ہے
نئے پھول
نئے موسموں میں کھلیں گے
اس وقت آنسوؤں کو بہنے دو
اس کی لبالب آنکھوں میں
میں
ایک پتھر کی طرح گرا ہوں

ایسا کیوں ہوا

پھولوں کے رنگ دکھائی نہیں دیتے
سوکھے پتے
ہر سمت اڑ رہے ہیں
ایک لڑکی کے آنسو
میرے دل میں جمع ہو کر چھلک پڑے
دکھ اور درندے میں کوئی فرق نہیں رہا
میرے پاؤں میرے بدن کو
کہیں لے جانا چاہتے ہیں
لیکن میں سمتوں کا تعین کھو چکا ہوں
ایسا کیوں ہوا؟
مجھ سے تو
کوئی غلطی نہیں ہوئی۔
لگتا ہے
محبت پھر سے
کسی تاریک کونے میں
سو چکی ہے

مصطفیٰ ارباب

اس وقت

مارنے والے
مرنے والے
ایک ہی شہر کے لوگ ہیں
یہ مشترکہ وابستگی
شہر کو ملول کر دیتی ہے
وہ
ہر روز
لاشوں کو وصول کرتا ہے
اور ان کو، جو یہ کر رہے ہیں
پناہ دینے پر مجبور ہوتا ہے
طویل عرصے تک ایک ہی عذاب سہنا
کیسا ہوتا ہے
یہ ہمارا شہر ہی بتا سکتا ہے
جو ہمیں تنہا چھوڑ کے کہیں چلا گیا ہے
اس وقت ہم ایک جنگل میں رہتے ہیں

میرے پاس ایک کیمرا ھے

میرے پاس ایک کیمرا ہے
اور
بہت سارا دکھ
میں اپنے دکھ سے
ایک کشتی بناتا ہوں
میرے آنسو
ایک ندی میں
تبدیل ہو جاتے ہیں
میں اپنی کشتی پر، اپنی ہی ندی میں
ایک سفر کا آغاز کرتا ہوں
زندگی ندی کے کنارے پر
مجھے دیکھنے آتی ہے اور مسکراتی ہے
میں
زندگی کی مسکراہٹوں کے
بہت سے فوٹوگراف بنالیتا ہوں
زندہ رہنے کے لئے تو
ایک مسکراہٹ بھی بہت ہے
اتنی مسکراہٹیں پاکر
میں اپنے دل سے ایک البم بنالیتا ہوں
میں اپنے کیمرے میں محفوظ
خوشی کے سارے فوٹوگراف
اس البم میں سجادوں گا
اس کیمرے کو ہاتھ مت لگاؤ
اس البم سے دور رہو
مجھے یاد مت دلاؤ
کہ اس کیمرے میں
کوئی رول(۱) نہیں ہے

Rol(۱)

مصطفیٰ ارباب

میرا لمس

تمھارا احساس
سفید ریشم سے
بنا ہوا ہے
میں
اسے چھونے سے ڈرتا ہوں
میرا لمس اسے میلا نہ کردے
احساس سے زیادہ اجلی لڑکی،
تمھاری اجلاہٹ ہی تمھارا وصف ہے
تم تو خود بھی
اپنے آپ تک نہیں پہنچ سکیں
میں تم سے پہلے تم تک کیسے پہنچوں
میرا میلا پن تسلسل
تمھیں گھور رہا ہے

مجھے لکھتی رہو

تم
مجھے لکھو
نوٹس(۱) کی صورت
جہاں جہاں
میں غیر ضروری لگوں
وہاں وہاں پر کاٹتی چلی جاؤ
میں تمھارے لئے
اتنا ہی رہنا چاہتا ہوں
جتنا تم ضروری سمجھتی ہو۔ مجھے لکھتی رہو۔ مجھے کاٹتی رہو
میں تمھارا ہوں،
ایک مشغلہ ہی سہی

تم خوبصورت ہو

تم
خوبصورت ہو
تم سے زیادہ خوبصورت ہیں
تمھارے خواب
خوابوں سے زیادہ خوبصورت ہے
تمھارا دل
تم
جب بھی لوگوں کو
دکھائی دیتی ہو
وہ لپکتے ہیں
تمھارے بدن کی طرف
مجھے تمھارے دل کے سوا
کچھ دکھائی نہیں دیتا

آدمی

میرے اردگرد
کیا ہو رہا ہے مجھے نہیں معلوم
میں اپنی آنکھیں کہیں رکھ کے بھول چکا ہوں
میرے ہمسائے
بہت اچھے ہیں
ضرورت پڑنے پر
عاریتاً ان سے آنکھیں لی جاسکتی ہیں
ساری آنکھیں
ایک جیسی ہوتی ہیں
آدمی ایک جیسے نہیں ہوتے

Notes(1)

مصطفیٰ ارباب

تم

راتیں
اور راستے
ایک جیسے ہوتے ہیں
دونوں
کہیں نہ کہیں لے جاتے ہیں
میرا راستہ ہی میری رات ہے
میری نہ ابتدا ہے نہ اختتام
میرا آغاز بیچ سے ہوا ہے
میں بیچ ہی میں ختم ہو جاؤں گا
تم
منزل دکھانے والا
ایک تیر ہو
بتاتیں کیوں نہیں میرا راستہ کدھر ہے؟
تم تو
اپنی نوک سمیت
میرے دل میں اترتی جا رہی ہو

نئی خبر

شام کے سارے اخبار
چند منٹوں میں بک گئے
ریڈیو کے ہر نیوز بلیٹن میں اس خبر کو شامل کیا گیا
ٹیلی ویژن پر خصوصی مباحثے کا بندوبست کیا گیا ہے
لوگوں کو
بولنے کے لئے
نیا موضوع مل گیا ہے
آج سارے لوگ طبعی موت مرے تھے

تم بولتی رہو

تم
بولتے ہوئے
بہت اچھی لگتی ہو
میرے کان صرف تمھاری آواز سننا چاہتے ہیں
میں تمھاری باتوں سے
خواب بنتا ہوں
تمھارے لفظ
میرے لہو میں گردش کرتے ہیں
خوبصورت لڑکی، تم
میرے دل پر پاؤں رکھ کر
بولتی رہو

شدت پسند

تمھاری
بے خبری ہی
تمھارا حسن ہے
میرا باخبر ہونا ہی میرا ہنر
میں اپنا ہنر رفتہ رفتہ
تمھیں دے دوں گا
تم
اپنی بے خبری مجھے سونپ دینا
فی الحال ہم انجان بن کر
ایک دوسرے کو
جان لیں گے

مصطفیٰ ارباب

تمھیں غصہ آتا ھے

تمھیں غصہ آتا ہے
میری بھولنے کی عادت پر
میں تمھارے پاس
نظموں کی کتاب بھول جاتا ہوں
تم
اسے لوٹا دیتی ہو
میں اپنی عینک تمھارے پاس بھول جاتا ہوں
تم
اسے لوٹا دیتی ہو
میں اپنا قلم تمھارے پاس بھول جاتا ہوں
تم
اسے لوٹا دیتی ہو
مجھے بھی
تمھاری طرح
اپنی بھولنے کی عادت پر غصہ آتا ہے
میں کچھ نہ کچھ
ہر بار بھول جاتا ہوں
اس بار
میں اپنے آپ کو
تمھارے پاس بھول آیا ہوں
تم
مجھے لوٹانا بھول گئی ہو

تم نے سچ کھا تھا

تم
مجھے اچھی لگتی ہو
تمھاری ساری چیزیں بھی
مجھے عزیز ہیں
کیوں کہ وہ تمھاری ہیں
تم نے سچ کہا تھا
مجھے خود سے محبت ہے
اس لیے کہ میں بھی
تمھاری چیزوں میں شامل ہوں

محبت غلبه پاسکتی ھے

ہمارے درمیان
دھرتی
منقسم ہو چکی ہے
ہم
وہ موقع بھی کھو چکے ہیں
جب فاصلہ دسترس میں تھا
ایک چھلانگ
ہمیں یکجا کر سکتی تھی
اب دوری
ایک دریا بن چکی ہے۔ ہم
اپنی جگہوں پر نہیں ہیں
محبت غلبہ پا سکتی تھی
اگر چیزیں اپنے وقت پر وقوع پذیر ہوتیں

مصطفیٰ ارباب

کب جان پاؤگی

تمھارے
خوبصورت ہونٹ
جملے ادا کرتے ہوئے
بوجھل ہوجاتے ہیں
تم
اپنی دلکشی سے
ناآشنا ہو
میں
متوجہ ہونے میں بے اختیار
محبت
ایک لامتناہی عمل ہے
اور تم
اپنے آپ میں محدود
مجھ میں
سجنے والی لڑکی!
تم کب جان پاؤ گی
تمھارا فریم
میں ہوں

مجھے اچھا لگتا ھے

تم
بہت بولتی ہو
مجھے
اچھا لگتا ہے
تم کو
مسلسل سننا
میرا کمرہ
تمھاری آواز سے بھر گیا ہے
میں آواز کے تالاب میں
تیرتا ہوں
تمھاری خاموشی
ایک تولیے کی طرح
مجھے پونچھتی رہتی ہے
تم
میرا تالاب ہو
تم
میرا تولیہ ہو

مصطفیٰ ارباب

میں تمھارے ساتھ مل کر

میں تمھارے ساتھ مل کر
ذیشان ساحل کی نئی نظمیں
پڑھنا چاہتا ہوں
میں تمھارے ساتھ مل کر
پھولوں کو
نئے سرے سے گننا چاہتا ہوں
میں تمھارے ساتھ مل کر
چاند کو چھونے کی
ایک اور کوشش کرنا چاہتا ہوں
میں تمھارے ساتھ مل کر
چمکتے ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں
میں تمھارے ساتھ مل کر
تتلیوں کو
اڑتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں
میں تمھارے ساتھ مل کر
دن سے رات
اور رات سے صبح کرنا چاہتا ہوں
میں تمھارے ساتھ مل کر
ایک نامکمل کہانی کی
ابتدا کرنا چاہتا ہوں
میں تمھارے ساتھ مل کر
ایک بچے کی طرح
پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا ہوں

میں خوش ہوں

میں رہتا تھا
تمھاری آنکھ میں
ایک آنسو کی صورت میں بہ گیا
ایک کمزور پل میں
کہ بہنا ہی
آنسو کا مقدر ہے
پھر بھی
میں خوش ہوں
مجھے جذب ہونے کے لئے
تمھارا تکیہ ملا
تم ہر روز
مجھ پر سر لگائے
خواب دیکھتی ہو

عرفان ستار

کوئی بتائے کہ وہ کیسے اشتباہ میں ہے
جو قید کرکے مجھے خود مری پناہ میں ہے

مقابلہ ہے مرا دوپہر کی حدت سے
اور ایک شام کا منظر مری سپاہ میں ہے

تری تمام ریاکاریوں سے واقف ہوں
یقین کر کہ بڑا لطف اس نباہ میں ہے

مرے سلوک میں شامل نہیں ہے بے خبری
ہر ایک شخص کا منصب مری نگا ہ میں ہے

وہ سادہ دل ہے اسے کیا خبر زمانے کی
خبر جوہو بھی تو کیا حرج انتباہ میں ہے

ضمیر سے تو ابھی تک ہے خاکداں روشن
یہی چراغ مرے خیمۂ سیاہ میں ہے

میں معترف ہوں روایت کی پاسداری کا
کجی تو حسب ضرورت مری کلاہ میں ہے

سپردگی مری فطرت کے ہے خلاف مگر
یہ انکسار ترے غم کی بارگاہ میں ہے

ترے لئے بھی کوئی فیصلہ میں کرلوں گا
ابھی تو شوق تمنا کی سیرگاہ میں ہے

رفتگاں کی صدا نہیں، میں ہوں
یہ ترا واہمہ نہیں میں ہوں

تیرے ماضی کے ساتھ دفن کہیں
صرف اک واقعہ نہیں میں ہوں

غالباً تیری واپسی کا سبب
صرف آب و ہوا نہیں میں ہوں

کیا ملا انتہا پسندی سے
کیا میں تیرے سوا نہیں، میں ہوں

ایک مدت میں جاکے مجھ پہ کھلا
چاند حسرت زدہ نہیں میں ہوں

اس نے مجھ کو محال جان لیا
میں یہ کہتا رہا نہیں میں ہوں

میں ہی عجلت میں آگیا تھا ادھر
یہ زمانہ نیا نہیں میں ہوں

میں ترے ساتھ رہ گیا ہوں کہیں
وقت ٹھہرا ہوا نہیں میں ہوں

گاہے گاہے سخن ضروری ہے
سامنے آئینہ نہیں، میں ہوں

سرسری کیوں گذارتا ہے مجھے
یہ مرا ماجرا نہیں میں ہوں

اس نے پوچھا کہاں گیا وہ شخص
کیا بتاتا کہ تھا نہیں، میں ہوں

یہ کسے دیکھتا ہے مجھ سے ادھر
تیرے آگے خلا نہیں، میں ہوں

عرفان ستار

تردید انا عشق میں کرنے کا نہیں میں
اب ترک مراسم سے بھی ڈرنے کا نہیں میں

زنجیر کوئی لا مری وحشت کے برابر
اک تیرے کہے سے تو ٹھہرنے کا نہیں میں

کل رات عجب دشت بلا پار کیا ہے
سو بادِ سحر سے تو سنورنے کا نہیں میں

کیوں مملکت عشق سے بے دخل کیا تھا
اب مسند غم سے تو اترنے کا نہیں میں

دم بھر کو سہی اذن سخن چاہیے مجھ کو
بے صوت و صدا جاں سے گذرنے کا نہیں میں

اب چشم تماشا کو جھپکنے نہیں دینا
اس بار جو ڈوبا تو ابھرنے کا نہیں میں

ہر شکل ہے مجھ میں مری صورت کے علاوہ
اب اس سے زیادہ تو نکھرنے کا نہیں میں

شکست خواب کا ہمیں ملال کیوں نہیں رہا
بچھڑ گئے تو پھر ترا خیال کیوں نہیں رہا

اگر یہ عشق ہے تو پھر وہ شدتیں کہاں گئیں
اگر یہ وصل ہے تو پھر محال کیوں نہیں رہا

وہ زلف زلف رات کیوں بکھر بکھر کے رہ گئی
وہ خواب خواب سلسلہ بحال کیوں نہیں رہا

وہ سایہ جو بجھا تو کیا بدن بھی ساتھ بجھ گیا
نظر کو تیرگی کا اب ملال کیوں نہیں رہا

وہ دور جس میں آگہی کے در کھلے تھے کیا ہوا
زوال تھا تو عمر بھر زوال کیوں نہیں رہا

کہیں سے نقش بجھ گئے کہیں سے رنگ اڑ گئے
یہ دل ترے خیال کو سنبھال کیوں نہیں رہا

عرفان ستار

اس طرح دیکھتا ہوں ادھر وہ جدھر نہ ہو
جیسے دکھائی دے کوئی صورت مگر نہ ہو

یہ شہر ناشناس ہے کیا اس کا اعتبار
اچھا رہے گا وہ جو یہاں معتبر نہ ہو

اس طرح چل رہا ہے رعونت کے ساتھ وہ
جیسے خرام ناز سے آگے سفر نہ ہو

میں آج ہوں سو مجھ کو سماعت بھی چاہیے
ممکن ہے یہ سخن کبھی بار دگر نہ ہو

ہونے دو آج شاخ تمنا کو بارور
ممکن ہے کل نفس کا یہاں سے گذر نہ ہو

میں بھی دکھاؤں شوق کی جولانیاں تجھے
یہ مشت خاک راہ میں حائل اگر نہ ہو

نام و نمود سے مجھے ایسے گریز ہے
جیسے یہ کار خیر ہو کار ہنر نہ ہو

اپنا پتہ بھی ڈھونڈنے جانا ہے ایک دن
فی الحال چاہتا ہوں کہ تو دربدر نہ ہو

اک یہ فریب دیکھنا باقی ہے وقت کا
دل ڈوب جائے اور دوبارہ سحر نہ ہو

یہ کیا کہ ہم رکاب رہے خاک رہ گذر
کس کام کا جنوں جو قدم دشت بھر نہ ہو

لفظوں کے برتنے میں بہت صرف ہوا میں
اک مصرع تازہ بھی مگر کہہ نہ سکا میں

اک دست رفاقت کی طلب لے کے بڑھا میں
انبوہ طرحدار میں اک شور اٹھا، میں

آ تجھ کو تقابل میں الجھنے سے بچالوں
سب کچھ ہے تری ذات میں باقی جو بچا میں

میں اور کہاں خود نگہی یاد ہے تجھ کو
جب تو نے مرا نام لیا میں نے کہا، میں؟

میں ایک بگولا سا اٹھا دشت جنوں سے
روکا مجھے دنیا نے بہت پر نہ رکا میں

یا مجھ سے گذاری نہ گئی عمر گریزاں
یا عمر گریزاں سے گذارا نہ گیا میں

معلوم ہوا مجھ میں کوئی رمز نہیں ہے
اک عمر ریاضت سے گذرنے پہ کھلا میں

جو رات بسر کی تھی مرے ہجر میں تو نے
اس رات بہت دیر ترے ساتھ رہا میں

چہرہ تو شناسا نہیں لیکن مری آواز؟
کیا تیری سماعت میں بھی آباد نہ تھا میں

عرفان ستار

کوئی نغمہ بنو، چاندنی نے کہا، چاندنی کے لئے ایک تازہ غزل
کوئی تازہ غزل پھر کسی نے کہا پھر کسی کے لئے ایک تازہ غزل
زخم فرقت کو پلکوں سے سیتے ہوئے سانس لینے کی عادت میں جیتے ہوئے
اب بھی زندہ ہو تم زندگی نے کہا، زندگی کے لئے ایک تازہ غزل
اس کی خواہش پہ تم کو بھروسا بھی ہے اس کے ہونے نہ ہونے کا جھگڑا بھی ہے
لطف آیا تمھیں، گمرہی نے کہا، گمرہی کے لئے ایک تازہ غزل
ایسی دنیا میں کب تک گذارا کریں تم ہی کہہ دو کہ کیسے گوارا کریں
رات مجھ سے مری بے بسی نے کہا بے بسی کے لئے ایک تازہ غزل
منظروں سے بہلنا ضروری نہیں گھر سے باہر نکلنا ضروری نہیں
دل کو روشن کرو روشنی نے کہا، روشنی کے لئے ایک تازہ غزل
میں عبادت بھی ہوں میں محبت بھی ہوں زندگی کی نمو کی علامت بھی ہوں
میری پلکوں پہ ٹھہری نمی نے کہا اس نمی کے لئے ایک تازہ غزل
آرزوؤں کی مالا پرونے سے ہیں یہ زمیں آسماں میرے ہونے سے ہیں
مجھ پہ بھی کچھ کہو آدمی نے کہا، آدمی کے لئے ایک تازہ غزل
اپنی تنہائی میں رات میں تھا مگن ایک آہٹ ہوئی دھیان میں دفعتاً
مجھ سے باتیں کرو خامشی نے کہا، خامشی کے لئے ایک تازہ غزل
جب رفاقت کا ساماں بہم کرلیا میں آخر اسے ہم قدم کرلیا
اب مرے دکھ سہو ہمرہی نے کہا، ہمرہی کے لئے ایک تازہ غزل

دم بخود میری انا تیری ادا بھی دم بخود
تیرے پہلو میں رہا میں اور رہا بھی دم بخود
دیکھئے پہلے لہو ٹپکے کہ پھیلیں کرچیاں
دم بخود تیری نظر بھی آئینہ بھی دم بخود
اتنا سناٹا کہ جیسے اولیں شام فراق
دم بخود ہے آسماں بھی اور ہوا بھی دم بخود
یاد ہے تجھ کو وہ پہلے لمس کی حدت کہ جب
رہ گئی تھی دفعتاً تیری حیا بھی دم بخود
ایک سے عالم میں دونوں مختلف اسباب سے
دم بخود تیرا کرم میری دعا بھی دم بخود
ایسا لگتا ہے کہ دونوں سے نہیں نسبت مجھے
دم بخود عمر رواں سیل فنا بھی دم بخود
خوف تجدید تعلق درمیاں حائل رہا
دم بخود تیرا ستم میرا گلہ بھی دم بخود
یوں گماں ہوتا ہے دونوں کی توقع ایک تھی
دم بخود تیری وفا میری سزا بھی دم بخود
جب کھلے میری حقیقت تم وہ منظر دیکھنا
دم بخود نا آشنا بھی آشنا بھی دم بخود

عرفان ستار

بہت خجل ہیں کہ ہم رایگاں بھی زندہ رہے
جہاں پہ تو بھی نہیں تھا وہاں بھی زندہ رہے

عجیب شرط ہے اس بے یقیں مزاج کی بھی
کہ تو بھی پاس ہو تیرا گماں بھی زندہ رہے

تجھے یہ ضد ہے مگر اس طرح نہیں ہوتا
کہ تو بھی زندہ رہے داستاں بھی زندہ رہے

وہ کون لوگ تھے جن کا وجود جسم سے تھا
یہ کون ہیں جو پس جسم و جاں بھی زندہ رہے

جو یہ نہ ہو تو سخن کا کوئی جواز نہیں
ضمیر زندہ رہے تو زباں بھی زندہ رہے

یہ کائنات فقط منفعت کا نام نہیں
کوئی یہاں پہ برائے زیاں بھی زندہ رہے

عدم میں جو بھی نہیں تھا وہ سب وجود میں تھا
یہ ہم ہی تھے جو کہیں درمیاں بھی زندہ رہے

یہاں جو ہے کہاں اس کا نشاں باقی رہے گا
مگر جو کچھ نہیں، وہ سب یہاں باقی رہے گا
سفر ہوگا سفر کی منزلیں معدوم ہوں گی
مکاں باقی نہ ہوگا لامکاں باقی رہے گا
کبھی قریہ بہ قریہ اور کبھی عالم بہ عالم
غبار ہجرت بے خانماں باقی رہے گا
ہمارے ساتھ جب تک درد کی دھڑکن رہے گی
ترے پہلو میں ہونے کا گماں باقی رہے گا
بہت بے اعتباری سے گذر کر دل ملے ہیں
بہت دن تک تکلف درمیاں باقی رہے گا
رہے گا آسماں جب تک زمیں باقی رہے گی
زمیں قائم ہے جب تک آسماں باقی رہے گا
یہ دنیا حشر تک آباد رکھی جاسکے گی
اگر ہم سا کوئی شعلہ بیاں باقی رہے گا
جنوں کو ایسی عمر جاوداں بخشی گئی ہے
قیامت تک گروہ عاشقاں باقی رہے گا
کنارہ تا کنارہ ہو کوئی یخ بستہ چادر
مگر تہ میں کہیں آب رواں باقی رہے گا
ہمارا حوصلہ قائم ہے جب تک سائباں ہے
خدا جانے کہاں تک سائباں باقی رہے گا
تجھے معلوم ہے یا کچھ ہمیں اپنی خبر ہے
سو ہم مرجائیں گے تو ہی یہاں باقی رہے گا
ہمارے بعد سمجھا بھی گیا ہم کو تو پھر کیا
نہ ہم ہوں گے نہ احساس زیاں باقی رہے گا

عرفان ستار

مرے خوابوں سے اوجھل اس کا چہرہ ہوگیا ہے
میں ایسا چاہتا کب تھا پر ایسا ہوگیا ہے

یہاں اب گفتگو کم ہے ملاقاتیں زیادہ
ہجوم شہر میں ہر شخص تنہا ہوگیا ہے

تری تکمیل کی خواہش تو پوری ہو نہ پائی
مگر اک شخص مجھ میں بھی ادھورا ہوگیا ہے

جو باغ آرزو تھا اب وہی ہے دشت وحشت
یہ دل کیا ہونے والا تھا مگر ہوگیا ہے

میں سمجھا تھا سیئے گی آگہی چاک جنوں کو
مگر یہ زخم تو پہلے سے گہرا ہوگیا ہے

میں تجھ سے ساتھ بھی تو عمر بھر کا چاہتا تھا
سو اب تجھ سے گلہ بھی عمر بھر کا ہوگیا ہے

ترے آنے سے آیا کون سا ایسا تغیر
فقط ترک مراسم کا مداوا ہوگیا ہے

مرا عالم اگر پوچھیں تو ان سے عرض کرنا
کہ جیسا آپ فرماتے تھے ویسا ہوگیا ہے

میں کیا تھا اور کیا ہوں اور کیا ہونا ہے مجھ کو
مرا ہونا تو جیسے اک تماشا ہوگیا ہے

یقیناً ہم نے آپس میں کوئی وعدہ کیا تھا
مگر اس گفتگو کو ایک عرصہ ہوگیا ہے

اگرچہ دسترس میں آگئی ہے ساری دنیا
مگر دل کی طرف بھی ایک در وا ہوگیا ہے

یہ بے چینی ہمیشہ سے مری فطرت ہے لیکن
بقدر عمر اس میں کچھ اضافہ ہوگیا ہے

مجھے ہر صبح یاد آتی ہے بچپن کی وہ آواز
چلو عرفان اٹھ جاؤ سویرا ہوگیا ہے

عرفان ستار

ڈرا رہا ہے مسلسل یہی سوال مجھے
گذار دیں گے یونہی کیا یہ ماہ و سال مجھے

بچھڑتے وقت اضافہ نہ اپنے رنج میں کر
یہی سمجھ کہ ہوا ہے بہت ملال مجھے

وہ شہر ہجر عجب شہر پر تحیر تھا
بہت دنوں میں تو آیا ترا خیال مجھے

میں اس خیال سے جاتا نہیں عروج کی سمت
مباد گھیر لے تنہا کہیں زوال مجھے

ہر ایک شخص کا چہرہ خود اس کا چہرہ ہے
کہیں تو کوئی ملے آئینہ مثال مجھے

تو میرے خواب کو عجلت میں رائگاں نہ سمجھ
ابھی سخن گہ امکاں سے مت نکال مجھے

کسے خبر کہ تہ خاک آگ زندہ ہو
ذرا سی دیر ٹھہر اور دیکھ بھال مجھے

کہاں کا وصل کہ اس شہر پر فشار میں اب
ترا فراق بھی لگنے لگا محال مجھے

اسی کے دم سے تو قائم ابھی ہے تار نفس
یہ اک امید کہ رکھتی ہے پر سوال مجھے

کہوں میں تازہ غزل اے ہوائے تازہ دلی
ذرا سی دیر کو رکھے جو تو بحال مجھے

خرام عمر کسی شہر پر ملال کو چل
کیے ہوئے ہے یہ آسودگی نڈھال مجھے

کہاں سے لائیں بھلا ہم جواز ہم سفری
تجھے عزیز ترے خواب میرا حال مجھے

مجھے کہاں یہ خبر ہے میں کیا ہوں کیسا ہوں
مگر ہے وجہ تسلی ترا جمال مجھے

ابھر رہا ہوں میں سطح عدم سے نقش بہ نقش
تری ہی جلوہ گری ہوں ذرا اجال مجھے

یہاں تو حبس بہت ہے سو گردباد جنوں
مدار وقت سے باہر کہیں اچھال مجھے

پھر اس کے بعد نہ تو ہے نہ یہ چراغ نہ میں
سحر کی پہلی کرن تک ذرا سنبھال مجھے

عرفان ستار

جنوں کے دم سے آخر مرتبہ کیسا ملا مجھ کو
ابھی فرہاد و قیس آئے تھے کہنے مرحبا مجھ کو

کسی صورت بھی رد ہوتا نہیں یہ فیصلہ دل کا
نظر آتا نہیں کوئی بھی تجھ سا دوسرا مجھ کو

سرکنج تمنا پھر خوشی سے گنگناؤں گا
اگر وہ لوٹ کر آئے تو پھر تم دیکھنا مجھ کو

نہ جانے رشک سے غصے سے غم سے یا رقابت سے
یہ کس انداز سے تکتا ہے تیرا آئینہ مجھ کو

کھلے تو سب زمانوں کے خزانے ہاتھ آجائیں
در اقلیم ہفت عالم ہے وہ بند قبا مجھ کو

گماں میں بھی گماں لگتی ہے اب تو زندگی میری
نظر آتا ہے اب وہ خواب میں بھی خواب سا مجھ کو

کثافت بار پاسکتی نہیں ایسی لطافت میں
کرم اس کا کہ بخشا دل کے بدلے آبلہ مجھ کو

صبا میری قدم بوسی سے پہلے گل نہ دیکھے گی
اگر وحشت نے کچھ دن باغ میں رہنے دیا مجھ کو

نہ نکلی آج گرکوئی یہاں یکجائی کی صورت
تو کل سے ڈھونڈتے پھرنا جہاں میں جابجا مجھ کو

گذرگاہ نفس میں ہوں مثال برگ آوارہ
کوئی دم میں اڑالے جائے گی باد فنا مجھ کو

وہ دل آویز آنکھیں وہ لب و رخسار وہ زلفیں
نہیں اب دیکھنا کچھ بھی نہیں اس کے سوا مجھ کو

ازل سے تا ابد دنیا سے لے کر آسمانوں تک
نظر آتا ہے تیری ہی نظر کا سلسلہ مجھ کو

مرے ہونے سے ہی کچھ اعتبار اس کا بھی قائم ہے
جنوں تم سے نمٹ لے گا جو دیوانہ کہا مجھ کو

کوئی عرفان مجھ میں سے مجھے آواز دیتا ہے
ارے تو سوچتا کیا ہے کبھی کچھ تو بتا مجھ کو

عرفان ستار

رزق کی جستجو میں کسے تھی خبر تو بھی ہوجائے گا رائیگاں یا اخی
تیری آسودہ حالی کی امید پر کر گئے ہم تو اپنا زیاں یا اخی

جب نہ تھا یہ بیابان دیوار و در جب نہ تھی یہ سیاہی بھری رہ گذر
کیسے کرتے تھے ہم گفتگو رات بھر کیسے سنتا تھا یہ آسماں یا اخی

جب یہ خواہش کا انبوہ وحشت نہ تھا شہر اتنا تہی دست فرصت نہ تھا
کتنے آباد رہتے تھے اہل ہنر ہر نظر تھی یہاں مہرباں یا اخی

یہ گروہ اسیران کذب و ریا بندگان درم بندگان انا
ہم فقط اہل دل یہ فقط اہل زر عمر کیسے کٹے گی یہاں یا اخی

خود کلامی کا یہ سلسلہ ختم کر گوش و آواز کا فاصلہ ختم کر
اک خموشی ہے پھیلی ہوئی سربسر کچھ سخن چاہیئے درمیاں یا اخی

جسم کی خواہش سے نکل کر چلیں زاویہ جستجو کا بدل کر چلیں
ڈھونڈنے آگہی کی کوئی رہ گذر روح کے واسطے سائباں یا اخی

ہاں کہا تھا یہ ہم نے بچھڑتے ہوئے لوٹ آئیں گے ہم عمر ڈھلتے ہوئے
ہم نے سوچا بھی تھا واپسی کا مگر پھر یہ سوچا کہ تو اب کہاں یا اخی

خودشناسی کے لمحے بہم کب ہوئے ہم جو تھے درحقیقت وہ ہم کب ہوئے
تیرا احسان ہو تو بتادے اگر کچھ ہمیں بھی ہمارا نشاں یا اخی

قصۂ رنج و حسرت نہیں مختصر تجھ کو کیا کیا بتائے گی یہ چشم تر
آتش غم میں جلتے ہیں قلب وجگر آنکھ تک آرہا ہے دھواں یا اخی

تو ہمیں دیکھ آکر سر انجمن یوں سمجھ لے کہ ہیں جان بزم سخن
اک تو روداد دلچسپ ہے اس قدر اور اس پر ہمارا بیاں یا اخی

عمر کے باب میں اب رعایت کہاں سمت تبدیل کرنے کی مہلت کہاں
دیکھ باد فنا کھٹکھٹاتی ہے در ختم ہونے کو ہے داستاں یا اخی

ہوچکا سب جو ہونا تھا سود وزیاں اب جو سوچیں تو کیا رہ گیا ہے یہاں
اور کچھ فاصلے کا یہ رخت سفر اور کچھ روز کا نقد جاں یا اخی

عرفان ستار

خانۂ دل کی طرح ساری فضا ہے کہ نہیں
کس کو معلوم کہ باہر بھی ہوا ہے کہ نہیں

جشن برپا تو ہوا تھا دم رخصت لیکن
وہی ہنگامہ مرے بعد بپا ہے کہ نہیں

پوچھتا ہے یہ ہر اک خار سر دشت جنوں
آنے والا بھی کوئی آبلہ پا ہے کہ نہیں

دیکھ تو جا کے مسیحائے غم عشق اسے
ہاتھ اب تک یونہی سینے پہ دھرا ہے کہ نہیں

دل کے تاریک درو بام سے اکثر ترا غم
پوچھتا ہے کہ کوئی میرے سوا ہے کہ نہیں

میں کہیں ہوں کہ نہیں ہوں، وہ کبھی تھا کہ نہ تھا
تو ہی کہہ دے یہ سخن بے سروپا ہے کہ نہیں

فیصلہ لوٹ کے جانے کا ہے کتنا مشکل
کس سے پوچھوں وہ مجھے بھول چکا ہے کہ نہیں

میں تو وارفتگیِ شوق میں جاتا ہوں ادھر
نہیں معلوم وہ آغوش بھی وا ہے کہ نہیں

جانے کیا رنگ چمن کا ہے بہ ہم صبح فراق
گل کھلے ہیں کہ نہیں بادصبا ہے کہ نہیں

اے شب ہجر ذرا دیر کو بہلے تو یہ دل
دیکھ عرفان کہیں نغمہ سرا ہے کہ نہیں

زندہ ہوں اور ہجر کا آزار تک نہیں
وہ کام کر رہا ہوں جو دشوار تک نہیں

اب میں ہوں اور تجھ کو منانے کی جستجو
کچھ بھی نہیں ہے راہ میں پندار تک نہیں

یعنی مرا وجود ہی مشکوک ہوگیا
اب تو میں اپنے آپ سے بیزار تک نہیں

دل بھی تھکن سے چور ہوا اور دماغ بھی
اور آسماں پہ صبح کے آثار تک نہیں

اقرار کر کے اس کو نبھانا کسے نصیب
اس عمر میں تو مہلت انکار تک نہیں

تھی جس کی پور پور مری لمس آشنا
اب یاد اس کے گیسو و رخسار تک نہیں

اس بیکراں خلا میں نگاہوں کو کیا کروں
اب تو نظر کے سامنے دیوار تک نہیں

عرفان ستار

بتاتا ہے مجھے آئینہ کیسی بے رخی سے
کہ میں محروم ہوتا جارہا ہوں روشنی سے
کسے الزام دوں میں رائیگاں ہونے کا اپنے
کہ سارے فیصلے میں نے کیے خود ہی خوشی سے
ہر اک لمحہ مجھے رہتی ہے تازہ اک شکایت
کبھی تجھ سے کبھی خود سے کبھی اس زندگی سے
مجھے کل تک بہت خواہش تھی خود سے گفتگو کی
میں چھپتا پھر رہا ہوں آج اپنے آپ ہی سے
وہ بے کیفی کا عالم ہے کہ دل یہ چاہتا ہے
کہیں روپوش ہوجاؤں اچانک خامشی سے
سکون خانۂ دل کے لیے کچھ گفتگو کر
عجب ہنگامہ برپا ہے تری لب بستگی سے
تعلق کی یہی صورت رہے گی کیا ہمیشہ
میں اب اکتا چکا ہوں تیری اس وارفتگی سے
جو چاہے وہ ستم مجھ پر روا رکھے یہ دنیا
مجھے یوں بھی توقع اب نہیں کچھ بھی کسی سے
ترے ہونے نہ ہونے پر کبھی پھر سوچ لوں گا
ابھی تو میں پریشاں ہوں خود اپنی ہی کمی سے
رہا وہ ملتفت میری طرف اور ان دنوں میں
خود اپنی سمت دیکھے جارہا تھا بے خودی سے
کوئی خوش فکر سا تازہ سخن بھی درمیاں رکھ
کہاں تک دل کو بہلاؤں میں تیری دلکشی سے
کرم تیرا کہ یہ مہلت مجھے کچھ دن کی بخشی
مگر میں تجھ سے رخصت چاہتا ہوں آج ہی سے
وہ دن بھی تھے تجھے میں والہانہ دیکھتا تھا
یہ دن بھی ہیں تجھے میں دیکھتا ہوں بے بسی سے
ابھی عرفان آنکھوں کو بہت کچھ دیکھنا ہے
تمھیں بے رنگ کیوں لگنے لگا ہے سب ابھی سے

عرفان ستار

میرے سوا بھی کوئی گرفتار مجھ میں ہے
یا پھر مرا وجود ہی بیزار مجھ میں ہے
میری غزل کسی کے تکلم کی بازگشت
اک یار خوش کلام و طرح دار مجھ میں ہے
حد ہے کہ تو نہ میری اذیت سمجھ سکا
شاید کوئی بلا کا اداکار مجھ میں ہے
جس کا وجود وقت سے پہلے کی بات ہے
وہ بھی عدم سے برسر پیکار مجھ میں ہے
تو ہے کہ تیری ذات کا اقرار ہر نفس
میں ہوں کہ میری ذات کا انکار مجھ میں ہے
تجھ سے نہ کچھ کہا تو کسی سے نہ کچھ کہا
کتنی شدید خواہش اظہار مجھ میں ہے
میں کیا ہوں کائنات میں کچھ بھی نہیں ہوں میں
پھر کیوں اسی سوال کی تکرار مجھ میں ہے
جس دن سے میں وصال کی آسودگی میں ہوں
اس دن سے وہ فراق سے دوچار مجھ میں ہے
میں ہوں کہ ایک پل کی فرصت نہیں مجھے
وہ ہے کہ ایک عمر سے بے کار مجھ میں ہے

مرتب اور بھی اک گوشوارہ ہورہا ہے
تو کیا ہے گرا بھی ہم کو خسارہ ہورہا ہے
ہمارے پاس تو ہم سے زیادہ تو نہیں تھا
سو تو کیا اب تو خود سے بھی کنارہ ہورہا ہے
ہمارے خواب میں اہمیت شب تھی زیادہ
سو اب وہ خواب آنکھوں میں ستارہ ہورہا ہے
تمھاری آرزو ہونے سے پہلے بھی تو ہم تھے
گذارہ ہورہا تھا سو گذارہ ہورہا ہے
حیا آلود آنکھیں ہیں نہ آنچل ہے نہ چلمن
یہ کس ویران دنیا کا نظارہ ہورہا ہے
ابھی ہم فیصلہ کرنے کی عجلت میں نہیں ہیں
مگر لگتا ہے جینے سے خسارہ ہورہا ہے
خلا سے اس زمیں پر سنگریزوں کی یہ بارش
کسی جانب سے کیا کوئی اشارہ ہورہا ہے

عرفان ستار

نظر کو پھر کوئی چہرہ دکھایا جارہا ہے
یہ تم خود ہو کہ مجھ کو آزمایا جارہا ہے
بہت آسودگی سے روز و شب کٹنے لگے ہیں
مجھے معلوم ہے مجھ کو گنوایا جارہا ہے
سرِ مژگاں بگولے آکے واپس جارہے ہیں
عجب طوفان سینے سے اٹھایا جارہا ہے
اسے بار دگر برباد کردے گی یہ خواہش
یونہی ویرانہ، دل کو بسایا جارہا ہے
مرا غم ہے اگر کچھ مختلف تو اس بنا پر
مرے غم کو ہنسی میں کیوں اڑایا جارہا ہے
بدن کس طور شامل تھا مرے کارِ جنوں میں
مرے دھوکے میں اس کو کیوں منایا جارہا ہے
وہ دیوار انا جس نے مجھے تنہا کیا تھا
اسی دیوار کو مجھ میں گرایا جارہا ہے
مری خوشیوں میں تیری اس خوشی کو کیا کہوں میں
چراغ آرزو تجھ کو بجھایا جارہا ہے
خرد کی سادگی دیکھو کہ ظاہر حالتوں سے
مری وحشت کا اندازہ لگایا جارہا ہے
ابھی اے بادِ وحشت اس طرف کا رخ نہ کرنا
یہاں مجھ کو بکھرنے سے بچایا جارہا ہے

پھر خون میں وحشت رقصاں ہے تجدیدِ ستم کرنے کے لئے
اک تازہ زخم کی خواہش ہے اک صدمہ کم کرنے کے لئے

ہم دن بھر دنیاداری میں ہنس ہنس کے باتیں کرتے ہیں
پھر ساری رات پگھلتے ہیں اک اشک رقم کرنے کے لئے

وہ وصل کہ جس نے ہم دونوں کو یکسر بے بنیاد کیا
اب فرصت ہے آ مل بیٹھیں اس وصل کا غم کرنے کے لئے

اک کاری زخم کی چاہت نے کیا کیا نہ ہمیں گلزار کیا
ہم کس کس سے منسوب ہوئے اک ہجر بہم کرنے کے لئے

انسان کے جینے مرنے کے مجبوری کے مختاری کے
یہ سارے کھیل ضروری ہیں تعمیر عدم کرنے کے لئے

عرفان ستار

خوش مزاجی مجھ پہ میری بے دلی کا جبر ہے
شوق بزم آرائی بھی تیری کمی کا جبر ہے

کون بنتا ہے کسی کی خود ستائی کا سبب
عکس تو بس آئینے پر روشنی کا جبر ہے

خواب خواہش کا عدم اثبات کا غم وصل کا
زندگی میں جو بھی کچھ ہے سب کسی کا جبر ہے

اپنے رد ہونے کا ہر دم خوف رہتا ہے مجھے
یہ مری خود اعتمادی خوف ہی کا جبر ہے

کار دنیا کے سوا کچھ بھی مرے بس میں نہیں
میری ساری کامیابی بے بسی کا جبر ہے

میں کہاں اور بے ثباتی کا یہ ہنگامہ کہاں
یہ مرا ہونا تو مجھ پر زندگی کا جبر ہے

یہ سخن یہ خوش کلامی درحقیقت ہے فریب
یہ تکلم روح کی بے رونقی کا جبر ہے

شہر دل کی راہ میں حائل ہیں یہ آسائشیں
یہ مری آسودگی کم ہمتی کا جبر ہے

جس کا سارا حسن تیرے ہجر ہی کے دم سے تھا
وہ تعلق اب تری موجودگی کا جبر ہے

جو رگ و پے میں اترتی جارہی ہے دم بہ دم
یہ مری خوش قامتی اس خستگی کا جبر ہے

جبر کی تابع ہے ہر کیفیت عمر رواں
آج کا غم جس طرح کل کی خوشی کا جبر ہے

کچھ نہیں کھلتا مرے شوق تصرف کا سبب
شوق سیرابی تو میری تشنگی کا جبر ہے

جو سخن امکان میں ہے وہ سخن ہے بے سخن
یہ غزل تو کچھ دنوں کی خامشی کا جبر ہے

عرفان ستار

ادھر کچھ دن سے دل کی بے کلی کم ہوگئی ہے
تری خواہش ابھی ہے تو سہی کم ہوگئی ہے
نظر دھندلا رہی ہے یا مناظر بجھ رہے ہیں
اندھیرا بڑھ گیا یا روشنی کم ہوگئی ہے
ترا ہونا تو ہے بس ایک صورت کا اضافہ
ترے ہونے سے کیا تیری کمی کم ہوگئی ہے
خموشی کو جنوں سے دستبرداری نہ سمجھو
تجسس بڑھ گیا ہے سرکشی کم ہوگئی ہے
ترا ربط اپنے گرد و پیش سے اتنا زیادہ
تو کیا خوابوں سے اب وابستگی کم ہوگئی ہے
سرِ طاقِ تمنا بجھ گئی ہے شمعِ امید
اداسی بڑھ گئی ہے بے دلی کم ہوگئی ہے
سبھی زندہ ہیں اور سب کی طرح میں بھی ہوں زندہ
مگر جیسے کہیں سے زندگی کم ہوگئی ہے

چاند بھی کھویا کھویا سا ہے تارے بھی خوابیدہ ہیں
آج فضا کے بوجھل پن سے لہجے بھی سنجیدہ ہیں
جانے کن کن لوگوں سے اس درد کے کیا کیا رشتے تھے
ہجر کی اس آباد سرا میں سب چہرے نادیدہ ہیں
اتنے برسوں بعد بھی دونوں کیسے ٹوٹ کے ملتے ہیں
تو ہے کتنا سادہ دل اور ہم کتنے پیچیدہ ہیں
سن جاناں ہم ترکِ تعلق اور کسی دن کر لیں گے
آج تجھے بھی عجلت سی ہے ہم بھی کچھ رنجیدہ ہیں
کانوں میں اک سرگوشی ہے بے معنی سی سرگوشی
آنکھوں میں کچھ خواب سجے ہیں خواب بھی عمر رسیدہ ہیں
گھر کی وہ مخدوش عمارت گر کے پھر تعمیر ہوئی
اب آنگن میں پیڑ ہیں جتنے سارے شاخ بریدہ ہیں
اس بستی میں ایک سڑک ہے جس سے ہم کو نفرت ہے
اس کے نیچے پگڈنڈی ہے جس کے ہم گرویدہ ہیں

عرفان ستار

ایک دنیا کی کشش ہے جو ادھر کھینچتی ہے
اک طبیعت ہے کہ آزار ہنر کھینچتی ہے

ایک جانب لئے جاتی ہے قناعت مجھ کو
ایک جانب ہوس لقمۂ تر کھینچتی ہے

اک بصیرت ہے کہ معلوم سے آگے ہے کہیں
اک بصارت ہے کہ جو حد نظر کھینچتی ہے

ہجر کا عیش کہاں ہے مری قسمت میں کہ اب
زندگی رنج بہ انداز دگر کھینچتی ہے

ایک منزل ہے جو امکان سے باہر ہے کہیں
کیا مسافت ہے کہ بس گرد سفر کھینچتی ہے

ایک خواہش ہے جسے درد کا ادراک نہیں
اک خلش ہے جو نہ معلوم کدھر کھینچتی ہے

اک طرف دل کا یہ اصرار کہ خلوت خلوت
اک طرف حسرت تسکین نظر کھینچتی ہے

آج کرنا تھی توجہ چاک داماں کی طرف
دھیان جانکلا مگر اک روئے تاباں کی طرف

جب ہوا کے نام پہنچا آمد شب کا پیام
ایک جھونکا چل دیا شمع فروزاں کی طرف

ایک چہرہ جگمگایا ہے سر دشت خیال
ایک شعلہ اٹھ رہا ہے دل سے مژگاں کی طرف

یہ بیاباں اور اس میں چیختی گاتی ہوا
ان سے دل بھر لے تو جاؤں راہ آساں کی طرف

اس طرح حائل نہیں ہوتے کسی کی راہ میں
کیوں بھلا اتنی توجہ ایک مہماں کی طرف

عین ممکن ہے کہ تو سچ بول کر زندہ رہے
میں اشارہ کر رہا ہوں ایک امکاں کی طرف

اک تقاضا بے بسی کی راکھ میں دہکا ہوا
اک تذبذب کا سفر انکار سے ہاں کی طرف

جس کے بدلے موت صدیوں کی بسر کرنا پڑے
زندگی کا قرض اتنا تو نہیں جاں کی طرف

یا ملاقات کے امکان سے باہر ہوجا
یا کسی دن مری فرصت کو میسر ہوجا

تجھ کو معلوم نہیں ہے مری خواہش کیا ہے
مجھ پہ احسان نہ کر اور سبک سر ہوجا

ارتقا کیا تری قسمت میں نہیں لکھا ہے؟
اب تمنا سے گذر میرا مقدر ہوجا

میں جہاں پاؤں رکھوں واں سے بگولا اٹھے
ریگ صحرا مری وحشت کے برابر ہوجا

اے مرے حرف سخن تو مجھے حیراں کردے
تو کسی دن مری امید سے بڑھ کر ہوجا

گل چهره مدام و گلرخ و هم صحبتی من   مشق استاد رسول مرادی (ایران)   عطیه از رسول مرادی

طغرا: شمس الرحمن فاروقی
عمل: عادل منصوری
عطیہ از مصور

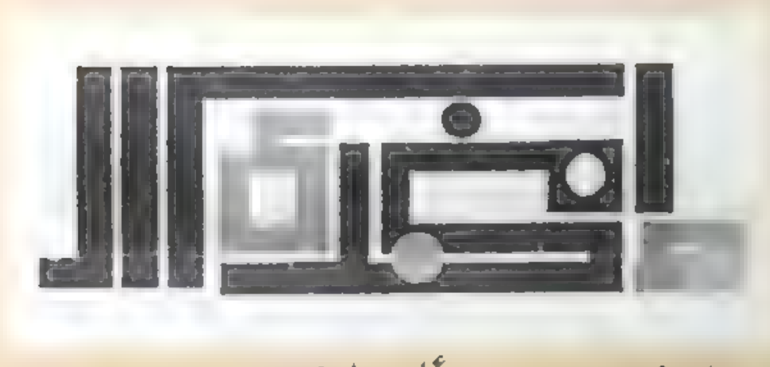

طغرا: محمد احرار ہندی   عمل: عادل منصوری   عطیہ از مصور

عرفان ستار

نذر غالب

نہ فاصلے کو نہ رخت سفر کو دکھتے ہیں
عجیب رنج سے دیوار و در کو دیکھتے ہیں

نہ جانے کس کے بچھڑنے کا خوف ہے ان کو
جو روز گھر سے نکل کر شجر کو دیکھتے ہیں

یہ روز و شب ہیں عبارت اسی توازن سے
کبھی ہنر کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

تو اس قدر بھی توجہ پہ خوش گمان نہ ہو
تجھے نہیں تری تاب نظر کو دیکھتے ہیں

فراق ہم کو میسر بھی ہے پسند بھی ہے
پہ کیا کریں کہ تری چشم تر کو دیکھتے ہیں

ہم اہل حرص و ہوس تجھ سے بے نیاز کہاں
دعا کے بعد دعا کے اثر کو دیکھتے ہیں

یہ بے سبب نہیں سودا خلا نوردی کا
مسافران عدم رہ گذر کو دیکھتے ہیں

وہ جس طرف ہو نظر اس طرف نہیں اٹھتی
وہ جا چکے تو مسلسل ادھر کو دیکھتے ہیں

ہمیں بھی اپنا مقلد شمار کر غالب
کہ ہم بھی رشک سے تیرے ہنر کو دیکھتے ہیں

دل کے پردے پہ چہرے ابھرتے رہے مسکراتے رہے اور ہم سو گئے
تیری یادوں کے جھونکے گذرتے رہے تھپتھپاتے رہے اور ہم سو گئے

یاد آتا رہا کوچۂ رفتگاں سر پہ سایہ فگن ہجر کا آسماں
نارسائی کے صدمے نکھرتے رہے دل جلاتے رہے اور ہم سو گئے

ہجر کے رتجگوں کا اثر یوں ہوا وصل جاناں کا لمحہ بسر یوں ہوا
دوش پر اس کے گیسو بکھرتے رہے گدگداتے رہے اور ہم سو گئے

کیسے تجدید عہد وفا کیجیے غم مزہ دے رہے ہیں سو کیا کیجیے
در پہ آ کر وہ اکثر ٹھہرتے رہے کھٹکھٹاتے رہے اور ہم سو گئے

اول اول تو ہر شب قیامت ہوئی رفتہ رفتہ ہمیں ایسی عادت ہوئی
گھر کے آنگن میں غم رقص کرتے رہے غل مچاتے رہے، اور ہم سو گئے

فرار ہونا حروف کا

علی حیدر ملک

حسن عابدی کے پہلے دو شعری مجموعے "نوشت نے" اور "جریدہ" نظموں اور غزلوں پر مشتمل تھے لیکن تیسرا اور تازہ مجموعہ "فرار ہونا حروف کا" صرف نظموں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اپنے مختصر پیش لفظ میں لکھا ہے کہ

> میں نے شعر کہنے کی ابتدا غزل سے کی۔ ان کے بیشتر اشعار میں میرا تجربہ بہت کم شامل ہوتا تھا۔ گردوپیش کی دنیا اور اس کے معاملات کو غزل میں سمونے کی کوشش میرے لیے تسلی بخش نہ تھی۔ بالعموم یہ ہوتا کہ میں کہنا کچھ چاہتا اور غزل کی ردیف اور قوافی مجھے گھیر گھار کر کسی اور طرف لے جاتے۔

لیکن انتظار حسین نے اپنے دیباچے میں اس معاملے کو یہ کہہ کر ٹال دیا ہے کہ "اس پر مجھے وہ شوہر یاد آتے ہیں جو اپنی دوسری بیوی کے چاؤ میں جب پہلی بیوی کو طلاق دیتے ہیں تو اس پر کچھ جھوٹے سچے الزام بھی لگاتے ہیں۔" ادھر اپنے پیش لفظ میں آگے چل کر حسن عابدی یہ بھی لکھتے ہیں کہ "میں ظالموں کے خلاف اپنی نفرت کا اعلان برملا کرنا چاہتا ہوں۔ بس میری نظم نگاری کا یہی جواز ہے۔"

ایسی صورت میں حسن عابدی "گردوپیش کی دنیا اور اس کے معاملات کو غزل میں سمونے کی کوشش" کو اپنے لیے تسلی بخش نہ پا کر اگر نظم کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنا لیتے ہیں تو شاید غلط نہیں کرتے۔ لیکن گردوپیش کی دنیا غزل میں کیوں نہیں سما سکتی؟ اس کا جواب باقی رہ گیا ہے۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ گردوپیش کی دنیا اور اس کے معاملات کیا ہیں جن کے باعث انھیں غزل کو ترک کرنے اور نظم کو اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا؟

مجموعے کی پہلی نظم "پچھلی صدی کی آخری شام" میں، جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے، شاعر بیسویں صدی کی آخری ساعتوں میں اس کے حسن اور اس کی اداؤں کو یاد کرتا ہے۔ دوسری نظم "پرندے" نئی صدی، نئے ہزاریے کے آغاز پر اس مسرت کا اظہار کرتی ہے کہ انسان ترقی کر رہا ہے لیکن اس مسرت میں تشویش اور تردد کا پہلو بھی شامل ہے کیونکہ انسان راکٹوں، میزائلوں اور دیگر تباہ کن ہتھیاروں کے استعمال کی جانب راغب ہے۔

مجموعے میں سب سے زیادہ تخلیقات (گیارہ نظمیں) تیسری دنیا میں حکمرانوں کے ظلم و جور اور عوام کی خستہ حالی اور بے چارگی سے متعلق ہیں۔

اسی طرح افغانستان، عراق اور فلسطین پر مظالم کے خلاف تو نظموں میں احتجاج کی آواز بلند کی گئی ہے۔ وطن عزیز کی سماجی اور اقتصادی صورت حال اور ترک وطن کے بارے میں سات نظمیں ہیں۔ بقیہ نظمیں انسانی اقدار کی پامالی، عورتوں اور بچوں کی خرید و فروخت، حسن کی اہمیت، محبت کی ضرورت اور ماضی کی فرحت بخش یادوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

نظموں کے موضوعات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد یہاں حسن عابدی صاحب سے چند سوال پوچھنے کا جی چاہتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ کیا کشمیریوں کو بھی عراقیوں، فلسطینیوں اور افغانیوں کی طرح مظلوم نہیں سمجھتے؟ انھوں نے نہ تو کسی نظم میں کشمیر کا ذکر کیا ہے اور نہ اپنے پیش لفظ میں۔ اسی کے ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ افغانستان کیا صرف اس وقت مظلوم قرار پایا جب امریکہ نے اس پر حملہ کیا یا اس وقت بھی یہ مظلوم تھا جب سوویٹ روس نے اس کے خلاف ننگی جارحیت کا ارتکاب کیا تھا؟

نظم "جنگ کا کوئی مذہب نہیں" کے حوالے سے بھی یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ "صلیبی عباپوش" کے یہ کہہ دینے سے کہ "ظالموں پر ہو لعنت خدا کی" یا بعض ممالک کے شہریوں کے احتجاج کے باوجود کیا یہ رائے قائم کرنا درست ہوگا کہ امریکہ مسلمانوں کے خلاف جنگ نہیں کر رہا ہے، درحالے کہ امریکی صدر نے عراق پر اپنے حملے کو "صلیبی جنگ" بھی قرار دیا ہو؟

ہیئت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک آدھ کو چھوڑ کر بقیہ تمام نظمیں آزاد نظم کے فارم میں نظر آتی ہیں۔ حسن عابدی پیکر اور کہانی پن کی آمیزش سے نظم میں تازگی پیدا کرتے ہیں۔ مکالمہ، تلمیح، تضمین کا استعمال انھوں نے بہتر سے بہتر کیا ہے۔

"فرار ہونا حروف کا" بلاشبہ اچھی اور غیر معمولی نظموں کا مجموعہ ہے اور معاصر ادب میں ایک خاص حیثیت اور اہمیت کا حامل ہے۔ غزل سے کنارہ کشی اختیار کر کے حسن عابدی نے شاید گھاٹے کا سودا نہیں کیا ☆☆☆

اشاریۂ مصنفینِ شب خون: شمارہ ۱ تا ۲۹۰

انیس صدیقی

- یہ اشاریہ ''شب خون'' کے شمارہ (۱) تا (۲۹۰) تک کے کل قلم کاروں اور ان کے شائع شدہ تخلیقات کا احاطہ کرتا ہے۔
- قلم کاروں کے ناموں کی ترتیب الفبائی نظام کے تحت کی گئی ہے۔
- اشاریہ سازی کے عام طریقہ کے برخلاف اس اشاریہ میں قلم کاروں کے نام اصلی صورت میں درج کیے گئے ہیں۔ مثلاً محمد حسن عسکری یا ن۔م۔راشد کے نام اشاریہ سازی کے طریقہ کار کے مطابق عسکری، محمد حسن اور راشد، ن۔م۔ درج کیے جانے چاہیے۔ لیکن اس اشاریہ میں یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ہے۔
- ایسے قلم کار جنھوں نے ادبی سفر کے درمیان اپنے نام تبدیل کیے ہیں اور جن کا ذکر ''شب خون'' کے کالم 'اس بزم میں' کیا گیا، ان کی قدیم نام سے شائع شدہ تخلیقات کا اندراج نئے ناموں کے ساتھ ہی کیا گیا ہے۔
- تراجم کے باب میں ترجمہ شدہ تخلیقات کے قلم کاروں کے بجائے ان کے مترجمین کے نام شامل اشاریہ ہیں۔
- اس اشاریہ میں آزاد غزل، انٹرویو اور مباحثہ کو الگ الگ اصناف کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔
- ''شب خون'' کے کالم جیسے 'صفحہ اول' 'سوانحی گوشے' 'نہیں کھیل اے داغ . ''کہ آتی ہے اردو زباں ''بے عنوان'' کہتی ہے خلق خدا' 'اخبار واذکار' اور 'اس بزم میں' کے مشمولات اس اشاریے میں شامل نہیں ہیں۔
- یہ اشاریہ تین کالموں پر مشتمل ہے۔ پہلے کالم میں قلم کاروں کے نام درج ہیں۔ دوسرا کالم ''شب خون'' کے ان شماروں کی کل تعداد بتاتا ہے، جن میں ان کی تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔ تیسرے اور آخری کالم میں شائع شدہ تخیلقات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

آرپی شوخ	۱	ایک غزل
آرتی پربھو	۱	ایک نظم
آزاد گلاٹی	۱۱	گیارہ غزلیں
آزر تمنا	۱	چھ نظمیں
آزر حفیظ	۱	دو غزلیں
آشا پربھات	۶	بارہ نظمیں
آشفتہ چنگیزی	۶	ایک تبصرہ، پانچ غزلیں، چار نظمیں
آصف جمال	۱	پانچ غزلیں
آصف فرخی	۳۸	چار مضامین، سولہ افسانے، چار انٹرویوز، دو مباحثے، ایک سفر نامہ، سات افسانوں، بائیس نظموں اور ایک انٹرویو کا ترجمہ، انیس نظمیں
آصف نعیم	۴	ایک مضمون، ایک غزل، دو نظمیں، ایک تبصرہ
آغا خالد سعید	۱	ایک افسانہ
آفتاب احمد	۳	تین مضامین
آفتاب اقبال	۱	ایک انٹرویو
آفتاب حسین	۱	بارہ غزلیں
آفتاب شمسی	۱۵	سترہ غزلیں۔ سات نظمیں
آفتاب عارف	۱	ایک غزل
آل احمد سرور	۱۴	چھ مضامین، ایک سفرنامہ، پانچ غزلیں، پانچ نظمیں
آمر صدیقی	۳	ایک غزل، دو نظمیں
آمنہ ابوالحسن	۱	ایک افسانہ
آنند لہر	۶	ایک ڈراما، پانچ افسانے
ا۔ح۔نورازل	۲	دو نظمیں
ابرار احمد	۲۴	ایک مضمون، اکتیس غزلیں، سینتیس نظمیں
ابرار اعظمی	۱۹	انیس غزلیں، آٹھ نظمیں، ایک مباحثہ، دو نظموں کے تراجم

ابرار مجیب	۳	ایک افسانہ، دو نظمیں
ابراہیم اختر	۳	تین مضامین
ابراہیم اشک	۳	دو غزلیں، ایک مذاکرہ
ابراہیم رنگلا	۵	تین نظمیں، دو مضامین کے تراجم
ابراہیم شفیق	۲	دو افسانے
ابن حسین	۲	دو مضامین
ابن فرید	۲	دو افسانے
ابوالکلام	۱	ایک مضمون کا ترجمہ
ابوالکلام قاسمی	۹	آٹھ مضامین، دو غزلیں
ابوبکر عباد	۱	ایک مضمون
ابومحمد سحر	۱	ایک مضمون
ابہام رشید	۲	چار نظمیں
اپندر ناتھ اشک	۹	چھ افسانے، ایک ڈرامہ، گیارہ نظمیں
اجتبیٰ رضوی	۲	دو غزلیں
اجلال مجید	۲	دو غزلیں، ایک نظم
اجمل کمال	۲	دو مضامین
احترام اسلام	۴	نو غزلیں، دو نظمیں
احتشام اختر	۱۲	انتیس غزلیں
احتشام الحق سید	۱	چار نظمیں
احتشام سید	۲	ایک افسانہ، چار نظمیں
احسان نظر	۱	ایک مضمون
احسن شفیق	۵	آٹھ غزلیں
احسن علی مرزا	۱	ایک مضمون
احسن یوسف زئی	۱	ایک غزل
احفاظ الرحمٰن	۱	ایک انٹرویو
احمد تنویر	۲	ایک افسانہ، دو غزلیں
احمد جاوید	۱	ایک افسانہ
احمد جاوید	۱	ایک مباحثہ
احمد جاوید	۱	دو نظمیں
احمد جمال پاشا	۲	ایک مباحثہ، ایک انشائیہ
احمد حسین خان	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
احمد داؤد	۱	ایک افسانہ
احمد رئیس	۱	تین غزلیں
احمد سلیم	۴	ایک افسانہ، ایک غزل، تین نظموں کے تراجم
احمد سوز	۳	دو غزلیں، ایک نظم

احمد سہیل	۱۶	چار مضامین، ایک انٹرویو اور اکیس نظموں کے تراجم، آٹھ نظمیں
احمد صغیر صدیقی	۲	دو غزلیں
احمد عارف	۳	تین افسانے
احمد عظیم آبادی	۵	دو غزلیں، چار نظمیں
احمد فراز	۱	دو غزلیں
احمد فواد	۳	تین نظمیں
احمد محفوظ	۱۷	ایک رپورتاژ، چار تبصرے، دو مضامین کے تراجم، تینتیس غزلیں، چار رباعیاں
احمد مشتاق	۱۹	چون غزلیں، نو نظموں کے تراجم
احمد مشکور	۱	ایک افسانہ
احمد ندیم قاسمی	۴	چار غزلیں
احمد نیاز رزاقی	۲	چار غزلیں
احمد وصی	۹	تین غزلیں، چھ نظمیں
احمد ہمیش	۲۵	ایک مضمون، آٹھ افسانے، ایک انٹرویو، دو غزلیں، بیس نظمیں
احمد یوسف	۱۴	چودہ افسانے
احمر لاری	۴	ایک تبصرہ، تین مضامین کے تراجم
اختر آزاد	۲	دو افسانے
اختر الایمان	۱۰	ایک رپورتاژ، سولہ نظمیں
اختر انصاری اکبرآبادی	۱	ایک غزل
اختر اورینوی	۲	دو نظمیں
اختر علیم انصاری	۱۸	بائیس غزلیں، تین نظمیں
اختر یوسف	۳۸	گیارہ افسانے، بہتر نظمیں
ادا جعفری	۶	پانچ غزلیں، پانچ نظمیں
ادریس صدر	۱	ایک غزل
ادھیراج	۱	ایک افسانہ
ادیب سہیل	۱	تین نظمیں
ارجن پوری	۲	دو نظمیں
ارشد جمال حشمی	۱	ایک غزل
ارشد حلیم	۲	دو افسانے
ارشد عبدالحمید	۱۰	نو غزلیں، دس نظمیں
ارشد کاکوی	۱	ایک نظم
ارشد محمود ناشاد	۱	ایک غزل
ارشد مسعود ہاشمی	۶	ایک مضمون، دس نظموں کے تراجم، تین نظمیں
ارمان شام نگری	۲	ایک غزل، ایک نظم

ارمان نجمی	۸	سات غزلیں، چھ نظمیں
اسحاق اثر	۱	ایک غزل
اسد	۲	دو افسانے
اسد اللہ خاں غالب مرزا	۱	ایک غزل
اسد اللہ غالب	۱	ایک نظم
اسد محمد خاں	۳۲	دو مضامین، انیس افسانے، ایک افسانے اور پانچ نظموں کے تراجم، سولہ نظمیں
اسرار عظمت	۱	ایک افسانہ
اسرار گاندھی	۳	دو افسانے، ایک انٹرویو
اسعد بدایونی	۲۳	ایک سو تین غزلیں، ایک نظم
اسلام پرویز	۱	ایک غزل
اسلم آزاد	۹	سات غزلیں، دو نظمیں
اسلم انصاری	۱	چار غزلیں
اسلم پرویز	۲	ایک افسانہ، ایک نظم
اسلم حنیف	۱	تین نظمیں
اسلم سلازار	۱	ایک افسانہ
اسلم عمادی	۱۳	گیارہ غزلیں، سات نظمیں
اسلم فرخی	۳	ایک مضمون، تیرہ غزلیں
اسلم محمود	۵	دس غزلیں
اسلم مرزا	۵	اٹھارہ نظموں کے تراجم، دو نظمیں
اسما راجہ	۲	بارہ نظمیں
اسماعیل پرواز	۱	ایک غزل
اسماعیل رفیع	۵	سولہ نظموں کے تراجم
اسنی بدر زبیری	۲	چار غزلیں، سات نظمیں
اشفاق احمد اعظمی	۳	ایک مضمون کا ترجمہ، ایک غزل، ایک نظم
اشفاق انجم	۱	ایک غزل
اشفاق محمد خان	۱	دو نظمیں
اشوک چوپڑہ	۱	ایک افسانہ
اشہر ہاشمی	۷	چھ غزلیں، تین نظمیں
اصغر عباس	۱	ایک مضمون
اصغر علی انجینئر	۱	ایک مضمون
اصغر ندیم سید	۲	دو نظمیں
اصغر وجاہت	۱	ایک افسانہ
اصغری زیدی	۲	دو افسانے
اطہر صابری	۱	ایک افسانہ
اطہر عزیز	۱	ایک غزل

اطہر فاروقی	۱	ایک انٹرویو
اطہر نفیس	۷	گیارہ غزلیں
اظفر جمیل	۲	چھ غزلیں
اظہار الاسلام	۲	دو افسانے
اظہار عابد	۱	تین غزلیں
اظہر افسر	۱	ایک ڈرامہ
اظہر زیدی	۱	ایک نظم
اظہر علی فاروقی	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
اظہر مسعود	۱	ایک نظم
اعجاز احمد	۷	ایک افسانہ، تیرہ نظمیں
اعجاز راہی	۳	ایک افسانہ، ایک غزل، ایک نظم
اعجاز صدیقی	۱	ایک نظم
اعجاز عبید	۱	دو نظمیں
اعجاز فاروقی	۲	دو نظمیں
افتخار آزر	۱	ایک نظم
افتخار اعظمی	۱	ایک غزل
افتخار بخاری	۱	دو غزلیں
افتخار جالب	۱۴	چھ مضامین، ایک تبصرہ، گیارہ نظمیں
افتخار عارف	۱	چار غزلیں
افتخار نسیم	۱۸	دو افسانے، سترہ غزلیں، چوبیس نظمیں
افضال احمد	۱	تین غزلیں
افضال احمد سید	۴	آٹھ غزلیں، تیرہ نظمیں
افضال نوید	۱۰	تئیس غزلیں
افضل احملی	۱	ایک نظم
افغان اللہ	۳	ایک غزل، چار نظمیں
اقبال بیجاپوری	۲	ایک غزل، ایک نظم
اقبال پٹیل	۲	چار نظمیں
اقبال صدیقی	۱	ایک ڈرامہ
اقبال طاہر	۶	پانچ غزلیں، ایک نظم
اقبال فہیم	۲	تین نظمیں
اقبال کرشن	۲۰	سات مضامین، پانچ افسانے، ایک ناول کی چار قسطوں اور نو نظموں کے تراجم، تین غزلیں
اقبال ماہر	۱	ایک غزل
اقبال متین	۱۹	آٹھ افسانے، انیس غزلیں
اقبال مجید	۱۴	دو مضامین، آٹھ افسانے، دو ڈرامے، ایک ناول، ایک نظم
اقبال منہاس	۴	پانچ غزلیں

اقتدار جاوید	۱	تین نظمیں
اکبر حیدرآبادی	۹	تیرہ غزلیں
اکبر علی خان عرشی زادہ	۳	ایک مضمون، مولانا عرشی کے چند مکاتیب، ایک فارسی غزل کا ترجمہ
اکبر معصوم	۱	دس غزلیں
اکرام باگ	۱۷	سترہ افسانے
اکرام خاور	۱	تین نظمیں
اکرم محمود	۴	انیس غزلیں
اکرم نقاش	۴	پچیس غزلیں
اکمل اجملی	۴	چھ غزلیں
اکمل حیدرآبادی	۲	دو نظمیں
الطاف احمد قریشی	۱	ایک نظم
الیاس احمد گدی	۸	سات افسانے، ایک سفرنامہ
الیاس فرحت	۱	ایک افسانہ
امان اختر	۱	ایک غزل
امان ارشد	۱	ایک نظم
امتیاز دانش ندوی	۱	ایک غزل
امتیاز علی عرشی	۲	ایک مضمون، ایک مکتوب
امجد الاسلام امجد	۱۷	گیارہ غزلیں، بیس نظمیں
امجد جاوید	۲	دو افسانے
امجد طفیل	۶	دو مضامین، چار افسانے
امجد نجمی	۲	دو نظمیں
امداد آکاش	۱	ایک غزل
امراؤ طارق	۳	تین افسانے
امرت لال ناگر	۱	ایک مباحثہ
امر سنگھ فگار	۱	ایک غزل
امروز قمر	۱	ایک غزل
امنگ بالی	۴	چار غزلیں، سات نظمیں
امیر زہرا حسین	۱	ایک افسانہ
امیر عارفی	۵	گیارہ نظمیں
آئینہ عکس	۴	ایک نظم اور تین افسانوں کے تراجم
انتخاب سید	۲	تین غزلیں، چار نظمیں
انتظار حسین	۲۲	نو مضامین، دس افسانے، ایک ڈرامہ، ایک مذاکرہ، ایک سفرنامہ
انجلا ہمیش	۴	ایک انٹرویو، چار نظمیں
انجم اعظمی	۶	ایک مضمون، پانچ غزلیں، پانچ نظمیں
انجم عرفانی	۳	ایک افسانہ، تین غزلیں، ایک نظم
اندر سروپ سری واستو	۶	اٹھارہ نظموں کے تراجم
اندر موہن کیف	۱	ایک غزل
انصار النظر	۴	ایک غزل، تین نظمیں
انصار حسین	۲	ایک غزل، ایک نظم
انعام صدیقی	۱	ایک نظم
انعام ندیم	۵	انہتر غزلیں
انوار انجم	۲	تین نظمیں
انوار رضوی	۶	تین افسانے، ایک تبصرہ، چھ نظمیں
انوار عینگی	۱	ایک افسانہ
انوپا	۴	پچاس نظمیں
انور ادیب	۲	چار غزلیں
انور اقبال	۲	ایک افسانہ، چھ نظمیں
انور امام	۴	چار افسانے
انور جمال ہاشمی	۱	تین غزلیں
انور خان	۴	تین افسانے، ایک افسانے کا ترجمہ
انور ربانی	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
انور رشید	۵	چار افسانے، تین نظموں کے تراجم
انور رضا	۲	ایک افسانہ، ایک غزل، ایک نظم
انور زاہدی	۱	ایک نظم
انور سجاد	۱۶	تین مضامین، بارہ افسانے، ایک مذاکرہ
انور سدید	۱۱	آٹھ مضامین، ایک افسانہ، چار نظمیں
انور سین رائے	۱۸	سات افسانے، نو غزلیں، تینتیس نظمیں
انور شعور	۲۳	بہتر غزلیں
انور شمیم	۱	ایک غزل
انور قمر	۴	چار افسانے
انور معظم	۳	ایک مضمون، ایک مباحثہ، ایک نظم
انور مینائی	۲	دو غزلیں، ایک نظم
انیس اشفاق	۲۱	آٹھ مضامین، چار افسانے، ایک مباحثہ، ایک رپورتاژ، ایک انٹرویو کا ترجمہ، چھبیس غزلیں، ایک نظم
انیس الرحمٰن	۱	ایک غزل
انیس انصاری	۴	چھ نظمیں
انیس رفیع	۱۲	بارہ افسانے
انیس ناگی	۶	دو مضامین، ایک نظم کا ترجمہ، سات نظمیں
اوشا کملیش	۴	پچیس نظمیں
اوم پربھاکر	۲	آٹھ غزلیں، چار نظمیں

اوم پرکاش بجاج	۳	دوافسانوں اور ایک نظم کے تراجم
اے خیام	۳	تین افسانے
ایاز رسول	۱	دوغزلیں
ایم ٹی خان	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
ایم کوٹھیاوی راہی	۱۳	اٹھارہ غزلیں، پانچ نظمیں
ایولین وراڈی	۱	ایک انٹرویو
باذل عباسی	۱	ایک غزل
باراں رحمٰن	۱	ایک تبصرہ
باقر مہدی	۲۱	انیس غزلیں، اکتالیس نظمیں، بارہ رباعیاں
باقر نقوی	۲	آٹھ غزلیں
بانی	۷	سولہ غزلیں
بیتا چانیال	۱	پندرہ نظمیں
بدرالحسن	۱	دوافسانوں کے تراجم
بدر عالم خلش	۲	دونظمیں
بدنام نظر	۸	ایک مضمون، پانچ غزلیں، سات نظمیں
بدیع الزماں	۱	ایک افسانہ
بدیع الزماں خاور	۷	ایک افسانے اور چھ نظموں کے تراجم، ایک نظم
برجیشور مدان	۳	تین افسانے
برق آشیانوی	۱	ایک افسانہ
بشر نواز	۲۶	دو مضامین، ایک مباحثہ، چوبیس غزلیں، چودہ نظمیں
بشیر باگ	۳	تین افسانے
بشیر بدر	۱۳	پچیس غزلیں
بشیر عنوان	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
بشیر فاروقی	۱	ایک مباحثہ
بلدیو مرزا	۲	ایک مضمون، تین نظموں کے تراجم
بلراج کمار	۳	تین غزلیں، دونظمیں
بلراج کومل	۷۰	دومضامین، سات افسانے، دومباحثے، نوتبصرے، سولہ نظموں کے تراجم، ایک سوپانچ نظمیں
بلراج مین را	۳	تین افسانے
بلقیس ظفیر الحسن	۲۶	ایک افسانہ، ایک افسانے اور ایک نظم کا ترجمہ، اکیس غزلیں، پچاس نظمیں
بلقیس لب	۲	دوغزلیں
بلونت سنگھ	۳	ایک افسانہ، ایک انٹرویو، ایک مضمون
بمل کرشن اشک	۱۵	دو افسانے، ایک ڈراما، تین غزلیں، چالیس نظمیں

بیدار بخت	۵	دومضامین، ایک انٹرویو، تین نظمیں
بیگم درانی	۱	ایک نظم
پال لبران	۱	ایک مضمون
پرتپال سنگھ بیتاب	۱۹	چودہ غزلیں، بیاسی نظمیں
پرکاش تیواری	۳	چار غزلیں، ایک نظم
پرکاش چندر	۱	ایک تبصرہ
پرکاش چندر گپت	۱	ایک تبصرہ
پرکاش فکری	۳۷	چھیانوے غزلیں
پرویز رحمانی	۲	ایک غزل، ایک نظم، دوآزاد غزلیں
پرویز شاہدی	۱	ایک غزل
پرویز شہریار	۱	ایک افسانہ
پروین راجہ	۵	تین غزلیں، چار نظمیں
پروین کمار اشک	۱	دوغزلیں
پریتم	۴	چار افسانے
پریتم سنگھ راہی	۱	ایک نظم
پریم پال اشک	۱	ایک غزل
پریم پرکاش	۲	دوافسانے
پریم کمار نظر	۱۵	چوبیس غزلیں، تین نظمیں
پریم ناتھ در	۳	تین افسانے
پون شریواستوا	۱	چار غزلیں
پیارے لال رتن	۱	دوغزلیں
تابش اکرامی	۱	ایک غزل
تاج پیامی	۲	تین غزلیں
تاج سعید	۲	دوغزلیں
تاج مہجور	۴	ایک نظم کا ترجمہ، تین نظمیں
تاج ہاشمی	۱۱	اٹھارہ غزلیں، سات نظمیں
تبسم کاشمیری	۱	تین نظمیں
تخت سنگھ	۱	ایک غزل
تسکین انصاری	۲	دوافسانے
تسلیم الٰہی زلفی	۲	نوغزلیں، ایک نظم
تسنیم فاروقی	۱	ایک غزل
تصدیق سہاوری	۳	دو رپورتاژ، ایک افسانے کا ترجمہ
تصور زیدی	۲	تین غزلیں
تفضیل احمد	۲	دوغزلیں
تقی حسین خسرو	۲	دوافسانے
تلوک چند محروم	۱	ایک غزل

تنویر اعجاز	۶	ایک مضمون، اکیس نظمیں
تنویر انجم	۹	چودہ غزلیں، چھبیس نظمیں
تنویر سامانی	۱۰	انیس غزلیں
توصیف تبسم	۱۱	اڑتیس غزلیں
ثروت حسین	۶	چالیس غزلیں، بیس نظمیں
ثمینہ راجہ	۲	چھ غزلیں، چھ نظمیں
ثنا سرور	۱	ایک افسانہ
ثوبان فاروقی	۱۲	اکیس غزلیں، آٹھ نظمیں
جابر علی سید	۲	دو مضامین
جاذب قریشی	۱	ایک مضمون
جالب نعمانی	۵	چھ غزلیں
جالب وطنی	۲	دو غزلیں
جاں نثار اختر	۳	تین غزلیں
جاوید	۳	تین غزلیں، ایک نظم، ایک مباحثہ
جاوید اختر	۱	چار غزلیں
جاوید اختر بیدی	۴	پانچ غزلیں
جاوید انور	۳	دو مضامین، دو غزلیں
جاوید جمیل	۲۵	پانچ مضامین، دو افسانے، ایک رپورتاژ، ایک مضمون، پانچ افسانوں، تین ڈراموں اور اٹھائیس نظموں کے تراجم
جاوید شاہین	۶	نو غزلیں، چودہ نظمیں
جاوید نبیل	۳	تین غزلیں
جاوید وششٹ	۱	ایک غزل
جبار جمیل	۱۲	پانچ غزلیں، تیرہ نظمیں
جتیندر بلو	۱۱	گیارہ افسانے
جعفر رضا	۵	ایک افسانہ، ایک رپورتاژ، تین تبصرہ، ایک افسانے کا ترجمہ، ایک غزل
جعفر ساہنی	۸	پانچ غزلیں، گیارہ نظمیں
جعفر شیرازی	۲	پانچ غزلیں
جعفر عسکری	۲	ایک افسانہ، ایک غزل
جگدیش گپت	۱	ایک نظم
جگن ناتھ آزاد	۳۱	دس مضامین، دس سوانحی مضامین، بتیس غزلیں، دو نظمیں، چار رباعیاں
جلیس نجیب آبادی	۷	چار غزلیں، گیارہ نظمیں
جلیل عالی	۱	ایک غزل
جمال احسانی	۲	بیس غزلیں

جمال احمد صدیقی	۱	ایک مضمون کا ترجمہ
جمال اویسی	۷	تیرہ غزلیں
جمال پانی پتی	۵	پانچ مضامین
جمنا پرشاد راہی	۵	پانچ غزلیں
جمیل الرحمٰن	۲۱	بہتر غزلیں، چار نظمیں
جمیل جالبی	۳	تین مضامین
جمیل شیدائی	۴	چار ڈرامے
جمیل قریشی	۳	چھ غزلیں
جمیل مظہری	۱۱	چار غزلیں، پانچ نظمیں، ایک مربع غزل، ایک آزاد مثنوی
جمیل یوسف	۱	دو غزلیں
جمیلہ فاروقی	۸	ایک افسانے اور پندرہ نظموں کے تراجم
جوگندر پال	۲۲	تین مضامین، اٹھارہ افسانے، ستائیس افسانچے، ایک مباحثہ، ایک ناول
جون ایلیا	۱	دو غزلیں
جوہر میر	۱	چار غزلیں
جے پرکاش غافل	۱	ایک غزل
جے رام داس فلک	۲	دو مضامین
جیلانی بانو	۳	تین افسانے
جیلانی کامران	۱۱	تین مضامین، اکتیس نظمیں
جینت پرمار	۱۱	چھ غزلیں، اٹھاون نظمیں
چندر پرکاش شاد	۱۰	انیس غزلیں
چندر پرکاش جوہر	۱	ایک غزل
چودھری ابن النصیر	۱۶	دو مضامین، ایک انٹرویو، چونتیس تبصرے، ایک مضمون اور ایک انٹرویو کا ترجمہ، تین نظمیں
چودھری محمد نعیم	۲۰	دو مضامین، دو افسانے، ایک رپورتاژ، دو تبصرہ، ایک افسانے، تین مکاتیب اور بارہ نظموں کے تراجم، پانچ نظمیں
ح۔ عامر	۱	ایک نظم
ح۔ م۔ اسلم عظیم آبادی	۱	ایک افسانہ
حارث خلیق	۵	انتیس نظمیں
حافظ شمس	۱	ایک انٹرویو
حامد اللہ ندوی	۱	ایک مضمون
حامد جیلانی	۲	ایک غزل، ایک نظم
حامد حسین حامد	۳۸	ایک مباحثہ، پینتالیس تبصرے، ایک افسانے کا ترجمہ، چوبیس غزلیں

حامد علی خان	۳	دو افسانوں اور پانچ نظموں کے تراجم
حامد مجاز	۵	دس نظمیں
حامدی کاشمیری	۴۴	دس مضامین، ایک افسانہ، اٹھاسی غزلیں، بائیس نظمیں
حبیب احمد صدیقی	۵	ایک مضمون، چار غزلیں
حبیب احمر	۱	ایک غزل
حبیب حق	۱۵	تین افسانے، ایک مباحثہ، نو نظموں کے تراجم، بیالیس نظمیں
حبیب کیفی	۱	ایک افسانہ
حسن اثر	۹	بارہ غزلیں، چھ نظمیں
حسن اقبال	۲	ایک مضمون، ایک غزل
حسن بشیر	۱	ایک غزل
حسن جمال	۶	چھ افسانے
حسن رضا	۴	تین غزلیں، ایک نظم
حسن عابدی	۳	سات نظمیں
حسن عباس رضا	۶	ستائیس غزلیں، دو نظمیں
حسن عرفی	۳	ایک غزل، دو نظمیں
حسن عزیز	۱۶	چوراسی غزلیں، ایک نظم
حسن فرخ	۵	دو نظموں کے تراجم، ایک غزل، چار نظمیں
حسن فیاض	۲	تین غزلیں، ایک نظم
حسن کمال	۲	دو نظمیں
حسن منظر	۳	ایک مضمون، ایک افسانہ، ایک مضمون کا ترجمہ
حسن نعیم	۱۲	تئیس غزلیں، ایک نظم
حسین صدیقی	۷	نو گجراتی غزلوں کے تراجم، گیارہ غزلیں
حسین الحق	۲۳	ایک مضمون، بیس افسانے، پانچ نظمیں
حسین عباس عابدی	۱	دو تبصرے
حسین مجروح	۱	ایک غزل
حسین مشیر علوی	۱	ایک نظم
حشمت فاتحہ خوانی	۳	دو غزلیں، دو نظمیں
حکیم شاکر	۳	ایک افسانہ، ایک غزل، ایک نظم
حکیم یوسف حسن خان	۲	دو نظمیں
حلیم ثمر	۱	ایک غزل
حمایت علی شاعر	۳	دو غزلیں، ایک نظم، چھ ثلاثیاں
حمرون عثمانی	۸	پندرہ غزلیں، چار نظمیں
حمید الماس	۳۱	چھ نظموں کے تراجم، ایک سو تین نظمیں
حمید سہروردی	۱۲	پانچ افسانے، سولہ نظمیں
حمید شیخ	۱	ایک افسانہ

حمید عثمانی	۴	چھ نظموں کے تراجم
حمیرا رحمان	۱	تین غزلیں، ایک مضمون
حنیف ترین	۲	چار نظمیں
حنیف کیفی	۲	ایک تبصرہ، دو غزلیں
حنیف نجمی	۷	تیرہ غزلیں
حنیف نقوی	۳	دو مضامین، ایک مباحثہ
حیات بادشاہ	۳	تین افسانوں کے تراجم
حیات عامر حسینی	۱	ایک مضمون
حیدر جعفری سید	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
حیدر شاہین	۱	ایک نظم
حیدر صفت	۳	ایک غزل، چار نظمیں
خاطر حافظی	۲	تین غزلیں
خالد ابراہیم	۱	ایک افسانہ
خالد احمد	۱	ایک مضمون
خالد اقبال یاسر	۴	بارہ غزلیں
خالد جاوید	۱۴	گیارہ افسانے، سات نظمیں
خالد حسین	۱	ایک افسانہ
خالد رحیم	۲	دو غزلیں
خالد سعید	۷	دو مضامین، دس غزلیں، دو نظمیں
خالد عبادی	۱۴	بائیس غزلیں، چھ نظمیں
خالد علوی	۱	دو نظمیں
خالد علیم	۱	دو غزلیں
خالدہ حسین	۱۶	سترہ افسانے
خالق عبداللہ	۱	ایک نظم
خان ارمان	۳	دو غزلیں، دو رباعیاں
خاور نقیب	۲	چھ نظمیں
خدا بخش آبڑو	۳	تیرہ نظمیں
خلش بڑودوی	۱	ایک غزل
خلیق الرحمٰن	۲	چھ نظمیں
خلیق انجم	۱	ایک مضمون
خلیل الرب	۱	ایک مضمون
خلیل الرحمن اعظمی	۱۹	ایک مضمون، دو مباحثے، دو تبصرے، تیرہ غزلیں، تین نظمیں
خلیل تنویر	۲۰	چھبیس غزلیں، بارہ نظمیں
خلیل خاور	۲	دو افسانے
خلیل دھن تیجوی	۲	چار غزلیں

خلیل مامون	۱۴	ایک مضمون، ایک نظم کا ترجمہ، اکیس نظمیں
خمار قریشی	۶	آٹھ غزلیں، تین نظمیں
خواجہ احمد عباس	۱	ایک افسانہ
خواجہ احمد فاروقی	۱	ایک مضمون
خواجہ جاوید اختر	۹	چوبیس غزلیں
خواجہ رضی حیدر	۳	تیرہ غزلیں، ایک نظم
خواجہ معنی اجمیری	۱	ایک غزل
خورشید احمد	۱	ایک مضمون
خورشید احمد جامی	۷	آٹھ غزلیں
خورشید الاسلام	۵	دو مضامین، انیس نظمیں
خورشید اکبر	۱	پانچ غزلیں
خورشید اکرم	۱	ایک افسانہ
خورشید رضوی	۱	دو غزلیں
خورشید سحر	۲	دو غزلیں
خورشید طلب	۶	گیارہ غزلیں
خورشید عالم	۲	دو افسانے
خوشبیر سنگھ شاد	۱۰	بیس غزلیں
دلکش آفریدی	۱	ایک غزل
دلکش ساگری	۴	چار غزلیں
دور آفریدی	۳	ایک غزل، ایک نظم، ایک سانیٹ
دھول	۱	ایک نظم
دیپک قمر	۲	چار غزلیں
دیوندر اسر	۸	سات مضامین، ایک افسانہ
دیوندر گوتم	۲	دس غزلیں
ذکاء الدین شایاں	۲۳	ایک تبصرہ، اڑتالیس غزلیں
ذکاء الرحمن صدیقی	۱	ایک غزل
ذکا صدیقی	۵	دو مضامین، تین غزلیں
ذکیہ مشہدی	۲	دو افسانے
ذوالفقار احمد تابش	۲	چھ غزلیں
ذیشان ساحل	۱۳	ایک غزل، ساٹھ نظمیں
راج	۱	ایک افسانہ
راجندر سنگھ بیدی	۲	ایک افسانہ، ایک مباحثہ
راج نرائن راز	۲	چار نظمیں
راجیش ریڈی	۴	سات غزلیں
راحت حسن	۱۲	اڑتیس غزلیں
راز عظیم آبادی	۱	ایک غزل
راز مناوری	۱	تین غزلیں
راشد آزر	۳	ایک مضمون، دو غزلیں، چار نظمیں
راشد انور راشد	۵	ایک انٹرویو، تین غزلیں، ایک نظم
راشد جمال فاروقی	۱۵	نو غزلیں، بیس نظمیں
راشد طراز	۱۴	اڑتیس غزلیں، ایک نظم
راشد فضلی	۲	ایک نظم کا ترجمہ، چار غزلیں
راشد مفتی	۲	تین غزلیں
رام ساگر	۱	ایک افسانہ
رام لعل	۱۵	نو افسانے، دو مباحثے، ایک ناول، ایک رپورتاژ، دو تبصرے، دو مضامین اور ایک ڈرامے کا ترجمہ
راہی فدائی	۳۰	اکیاسی غزلیں، چار نظمیں
راہی معصوم رضا	۴	ایک مضمون، چار نظمیں
رباب رشیدی	۲	دو غزلیں
رحمان جامی	۲	ایک غزل، ایک نظم
رحمان عباس	۳	دو افسانے، چار نظموں کے تراجم
رحیل صدیقی	۱	ایک مضمون
رخسانہ جبین	۱	دو غزلیں
رزاق عادل	۱	دو غزلیں
رشید اعجاز	۱	ایک غزل
رشید افروز	۶	سات غزلیں، ایک نظم
رشید الدین	۲	ایک افسانے اور ایک انشائیہ کا ترجمہ
رشید امجد	۳۳	ایک مضمون، اُنتالیس افسانے
رشید امکان	۵	گیارہ غزلیں
رشید انصاری	۱	ایک انٹرویو
رشید حسن خاں	۲	دو مضامین
رشید کوثر فاروقی	۱۱	اُنچاس غزلیں
رشید نثار	۱	ایک غزل
رضا اشک بستی پوری	۶	چھ غزلیں
رضا علی عابدی	۱	ایک انٹرویو
رضوان احمد	۴	ایک مضمون، تین افسانے
رضوان الحق	۴	چار افسانے
رضوان اللہ	۲	دو غزلیں
رضی مجتبیٰ	۳	چھ غزلیں
رعنا اقبال	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
رفعت حسینی	۱	ایک نظم
رفعت سردش	۱	ایک غزل، اٹھارہ نظمیں

رفعت نواز	۲	دو افسانے
رفیع الدین	۱	ایک نظم
رفیعہ شبنم عابدی	۱	پانچ غزلیں
رفیعہ منظور الامین	۲	ایک مضمون، ایک افسانہ
رفیق اعظم	۲	چار نظمیں
رفیق انجم	۴	چار نظموں کے تراجم، آٹھ نظمیں
رفیق راز	۳۱	ایک سو اٹھارہ غزلیں، ایک نظم
رمیش پرشاد کنول	۱	ایک غزل
روشن لال روشن	۴	پانچ غزلیں
رؤف خلش	۱۶	دس غزلیں، اڑتیس نظمیں
رؤف خیر	۱۰	اٹھارہ غزلیں، ایک نظم
رونق شہری	۶	سات غزلیں
رونق گیاوی	۱	دو غزلیں
رونق نعیم	۹	چھبیس غزلیں، بارہ نظمیں
رویندر	۱	ایک افسانہ
رویندر ناتھ تیاگی	۱	ایک نظم
رئیس فراز	۲۲	بیس تبصرے، انیس غزلیں، چار نظمیں
رئیس مالیگانوی	۱	ایک غزل
رئیس مینائی	۲	ایک غزل، ایک نظم
رئیس نعمانی	۴	دو غزلیں، دو نظمیں
ریاض پنجابی	۱	ایک نظم
ریاض جعفر	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
ریاض قاصدار	۲	دو افسانے
ریاض لطیف	۱۱	تیرہ نظموں کے تراجم، سات غزلیں، سترہ نظمیں
ریاض مجید	۳	تین غزلیں، دو نظمیں
ریحان صدیقی	۱	ایک انٹرویو
زار غازی پوری	۲	ایک غزل، ایک نظم
زاہد دارا	۱	سات نظمیں
زاہد ڈار	۳	تین نظمیں
زاہد حسن	۱	چار نظمیں
زاہد حسین	۱	ایک نظم
زاہد کمال	۳	تین غزلیں
زاہدہ حنا	۵	پانچ افسانے
زاہدہ زیدی	۱۵	ایک ڈرامے کا ترجمہ، چار غزلیں، پندرہ نظمیں
زبیدہ منیر	۱	ایک نظم
زبیر رضوی	۳۱	ایک مباحثہ، ایک تبصرہ، بائیس غزلیں، تیس نظمیں

زبیر شفائی	۱۶	ستاون غزلیں، ایک نظم
زوار محمد خان	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
زیب النسا	۱	دو تبصرے
زیب غوری	۲۶	ایک تبصرہ، پچپن غزلیں، ایک نظم
زیدی جعفر رضا	۱	ایک نظم
ساجد اثر	۳	پانچ غزلیں
ساجد حمید	۱۱	بارہ غزلیں، گیارہ نظمیں
ساجد سعید	۱	ایک انٹرویو
ساجد لطیف	۱	ایک افسانہ
ساجدہ زیدی	۱۲	ایک غزل، بیس نظمیں
ساحل احمد	۱۹	انچاس غزلیں، چھہتر نظمیں
ساحل سلطانپوری	۴	نو غزلیں
ساحرہ زیدی	۱	ایک نظم
سارا رائے	۱	ایک افسانہ
سارا شگفتہ	۴	آٹھ نظمیں
سازینہ	۳	پانچ نظمیں
ساغر	۴	تیرہ غزلیں
ساغر جیدی	۱۲	بائیس غزلیں، سات نظمیں
ساغر مہدی	۲	ایک غزل، ایک نظم
ساقی فاروقی	۳۳	ایک انٹرویو، ایک نظم کا ترجمہ، پچیس غزلیں، چھتیس نظمیں
ساگری سین گپتا	۱	ایک انٹرویو
سائرہ ہاشمی	۱	ایک افسانہ
سبط احمد	۷	تین غزلیں، چار نظمیں
سبطین اخگر	۱	چار غزلیں
ستیش بترا	۱	ایک تبصرہ
ستیش ول	۱	ایک نظم
ستیہ پال آنند	۳	چار نظموں کے تراجم، تین نظمیں
سجاتا پریم ودا	۱	دو نظموں کے تراجم
سجاد باقر رضوی	۱	دو غزلیں
سجاد سید	۴	گیارہ غزلیں
سحر انصاری	۲	دو نظمیں
سحر سعیدی	۲	چار غزلیں
سحر علی	۱	ایک نظم
سخاوت شمیم	۷	پندرہ نظمیں
سراج اجملی	۵	تیرہ غزلیں، ایک غزل مع تاریخ وفات

سراج رعنا	۱	ایک نظم
سراج منیر	۱	ایک مضمون
سرجیت	۲	دوافسانوں کے تراجم
سردار آصف	۳	نوغزلیں
سردار حسین	۹	سات افسانے، دوافسانوں کے تراجم
سردار جعفری	۵	تین مضامین، ایک مباحثہ، ایک نظم
سردار جوہر	۱	ایک غزل
سرشار بلند شہری	۶	چارغزلیں، بارہ نظمیں
سرکشا راجوت	۱	ایک مباحثہ
سرور جمال	۱	ایک مباحثہ
سرور عثمانی	۱	ایک غزل
سریش چترویدی	۱	ایک مباحثہ
سریندر پرکاش	۱۲	بارہ افسانے
سعادت سعید	۸	چار مضامین، پانچ نظمیں
سعادت نظیر	۲	دوغزلیں
سعید احمد صدیقی	۱	ایک افسانہ
سعید اختر درانی	۱	ایک افسانہ
سعید الدین	۱	نونظمیں
سعید عارفی	۱	ایک نظم
سکندر احمد	۶	چھ مضامین
سکندر علی وجد	۴	ایک مباحثہ، تین غزلیں، ایک نظم
سکندر محسن	۲	ایک غزل، ایک نظم
سلام بن رزاق	۴	تین افسانے، ایک افسانے کا ترجمہ
سلام فردوسی	۱	ایک نظم
سلام مچھلی شہری	۱۰	تین غزلیں، چودہ نظمیں
سلطان اختر	۴۵	اٹھاسی غزلیں، پانچ نظمیں
سلطان سبحانی	۱	ایک افسانہ
سلطان شاہد	۱	ایک غزل
سلیل ڈیسوزا	۱	دونظموں کے تراجم
سلیم آغا قزلباش	۱	ایک افسانہ
سلیم احمد	۷	ایک مضمون، ایک تبصرہ، نوغزلیں، پندرہ قطعات
سلیم اختر	۲۱	تین مضامین، اٹھارہ افسانے
سلیم الرحمٰن	۱	چار نظمیں
سلیم اللہ نیر	۱	ایک تبصرہ
سلیم شہزاد	۱۵	تین مضامین، ایک ڈراما، بارہ غزلیں، سترہ نظمیں

سلیم صدیقی	۱	دوغزلیں
سلیم کوثر	۵	سترہ غزلیں، چار نظمیں
سلیمان اریب	۱۵	نوغزلیں، بیس نظمیں
سلیمان خمار	۱	ایک غزل
سلیمان عامر	۱	ایک غزل
سمیع آہوجا	۳	تین افسانے
سمیع اللہ شفق	۱	ایک غزل
سنتوش کپل	۱	دونظمیں
سوزش عثمانی	۱	ایک غزل
سومترموہن	۱	آٹھ نظمیں
سونو	۱۱	چھ غزلیں، تیئیس نظمیں
سہیل احمد	۳	دوتبصرے، ایک نظم
سہیل احمد زیدی	۲۷	باسٹھ غزلیں، تیرہ نظمیں
سہیل اختر	۱	ایک غزل
سہیل عباس خان	۱	ایک نظم
سہیل عرفان	۱	ایک افسانہ
سہیل واسطی	۲	دونظمیں
سیتاورسرن	۲	دومضامین
سید ابوالحسنات حقی	۹	اکتیس غزلیں
سید احتشام حسین	۱۰	چھ مضامین، ایک رپورٹ، دوغزلیں، ایک تبصرہ
سید احمد شجاع	۱	ایک مضمون کا ترجمہ
سید احمد شمیم	۳	چارغزلیں، ایک نظم
سید ارشاد حیدر	۳۵	ایک سوستائیس تبصرے، پانچ غزلیں
سید اعجاز حسین، ڈاکٹر	۱۱	چودہ مضامین، ایک غزل
سید امین اشرف	۳۳	ترسٹھ غزلیں
سید بشارت علی	۸	تین نظموں کے تراجم، ایک غزل، تیرہ نظمیں، تین مرثیے
سید حامد	۳	ایک مضمون، دوغزلیں
سید حرمت الاکرام	۲۰	سولہ غزلیں، تیرہ نظمیں، ایک آزاد غزل، سات رباعیاں
سید رونق رضا	۱	ایک غزل
سید سراج الدین	۴	ایک مضمون، چھ نظموں کے تراجم
سید صدیق حسن	۱	ایک غزل
سید عارف	۲	چھ غزلیں
سید فضل المتین	۱۳	چونتیس غزلیں، ایک نظم
سید قاسم محمود	۱	ایک مضمون

سید قمر الحسن	۱	ایک مضمون
سید مجیب الرحمٰن	۲	ایک مضمون، ایک نظم کا ترجمہ
سید محمد اشرف	۷	پانچ افسانے، دو نظمیں
سید محمد افضل	۱	ایک افسانہ
سید محمد عقیل	۴	دو مضامین، تین تبصرے، ایک افسانے کا ترجمہ
سید مسعود حسن رضوی ادیب	۱	ایک مضمون
سید نعیم الدین	۱	ایک مضمون
سید وقار حسین	۳	دو مضامین، ایک مباحثہ
سید یاسین قدرت	۱	ایک غزل
سیف سہسرامی	۴	پانچ غزلیں، ایک نظم
سیف فاروقی	۱	ایک نظم
سیفی سرونجی	۳	چار غزلیں
سیما جبار	۱	ایک انٹرویو
سین کمل	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
سیوک نیر	۱	ایک نظم
ش۔ صغیر ادیب	۲	دو افسانے
شاد نوحی	۴	چار غزلیں
شاذ تمکنت	۱۲	آٹھ غزلیں، سات نظمیں
شارق عدیل	۱	ایک غزل
شارق کیفی	۹	تیس غزلیں
شاعر ندیم	۱	ایک نظم
شاکر برسارتھی	۱	ایک نظم کا ترجمہ
شان الحق حقی	۳۱	اکیس مضامین، ایک افسانہ، تیئیس غزلیں، دو قطعات تاریخ
شام بارکپوری	۱	ایک افسانہ
شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۱	ایک مضمون
شاہ حسین نہری	۶	چھ غزلیں، چھ نظمیں
شاہنواز فاروقی	۱	ایک انٹرویو
شاہد احمد شعیب	۴	ایک مباحثہ، دو غزلیں، ایک نظم
شاہد اختر	۱۷	پچیس غزلیں، ایک نظم
شاہد اعظمی	۱	ایک غزل
شاہد پرویز	۱	ایک افسانہ
شاہد جمال	۱	ایک غزل
شاہد جمیل	۱	ایک افسانہ
شاہد عزیز	۳۱	نو غزلیں، پینسٹھ نظمیں
شاہد عشقی	۲	تین غزلیں

شاہد فاروقی	۱	ایک ڈرامے کا ترجمہ
شاہد کامرانی	۱	ایک افسانہ
شاہد کبیر	۱۱	بارہ غزلیں
شاہد کلیم	۱۲	ایک مضمون، انیس غزلیں، انیس نظمیں
شاہد میر	۱۱	چھ غزلیں، سولہ نظمیں
شاہد ندیم اختر	۱	ایک نظم
شاہدہ حسن	۳	دس غزلیں، پانچ نظمیں
شاہین	۲۳	پندرہ نظموں کے تراجم، بیالیس غزلیں، چالیس نظمیں
شاہین بدر	۱	ایک نظم
شاہین عباس	۴	گیارہ غزلیں
شاہین مفتی	۱	چار نظمیں
شائستہ یوسف	۲	چار نظمیں
شبنم شکیل	۱	دو غزلیں
شبنم مناوری	۱	ایک نظم
شبنم نقوی	۱	ایک غزل
شمی فاروقی	۱	دو غزلیں
شبیب رضوی	۱	ایک نظم
شبیر احمد خان غوری	۱	ایک مضمون
شبیر حسن	۵	پانچ افسانے
شجاع سلطان	۲	دو غزلیں
شجاعت علی راہی	۱	چار نظمیں
شرجیل احمد خان	۳	تین مضامین کے تراجم
شرف الدین ساحلی	۲	دو مضامین
شرون کمار ورما	۱	ایک افسانہ
شریف ارشد	۴	ایک مضمون، ایک افسانہ، چار نظمیں
شعیب شمس	۶	ایک افسانہ، تین غزلیں، چار نظمیں
شعیب نظام	۱	چار غزلیں
شفق	۱۵	دو مضامین، پندرہ افسانے
شفق تنویر	۲	دو غزلیں
شفق سوپوری	۱۵	تیس غزلیں، چھ نظمیں
شفقت کاظمی	۱	ایک غزل
شفیع جاوید	۱۷	سترہ افسانے
شفیع جمال	۲	دو افسانے
شفیع شوق	۱	ایک نظم
شفیع مشہدی	۳	دو افسانے ایک مباحثہ

شفیق فاطمہ شعریٰ	۶	ایک غزل، پانچ نظمیں
شفیقہ فرحت	۳	ایک افسانہ، دومزاحیہ مضامین
شکیب ایاز	۹	تیرہ غزلیں، ایک نظم
شکوہ محسن مرزا	۱	ایک مضمون
شکیل احمد	۱	دوغزلیں
شکیل احمد شکیل	۱	ایک غزل
شکیل الرحمٰن	۲	دومضامین
شکیل اعظمی	۸	نوغزلیں، چھ نظمیں
شکیل جہانگیری	۲	ایک افسانہ، تین نظمیں
شکیل مظہری	۴	چارغزلیں
شکیلہ رفیق	۵	پانچ افسانے
شگفتہ اچھابڑہ	۱	ایک مباحثہ
شگفتہ طلعت سیما	۲	ایک غزل، چار نظمیں
شمس الحق عثمانی	۹	دومضامین، چھ افسانے، ایک تبصرہ
شمس الرحمٰن فاروقی	۲۳۱	ایک سو پندرہ مضامین، آٹھ افسانے، ایک انٹرویو، چھ مباحثے، دوسو چوہتر تبصرے، تفہیم غالب کی ایک سو چار اور شعر شور انگیز کی دس قسطیں، اکیس مضامین، ایک مکتوب، پچیس نظموں کے تراجم، چالیس غزلیں، پندرہ نظمیں، نوے رباعیاں، دوقطعاتِ تاریخ، ایک مرثیہ
شمس فریدی	۴	ایک غزل، تین نظمیں
شمس ندیم	۱	ایک افسانہ
شمشاد حیدر زیدی	۴	چھ تبصرے
شمشیر بہادر سنگھ	۱	ایک نظم
شمعون سلیم	۱	چار نظمیں
شمیم احمد	۴	چار مضامین
شمیم الدین احمد	۱	دوغزلیں
شمیم انور	۱	دونظمیں
شمیم جواروی	۲	دوافسانوں کے تراجم
شمیم حنفی	۳۲	پندرہ مضامین، دوافسانے، دوڈرامے، ایک مباحثہ، ایک مضمون کا ترجمہ، تیس غزلیں
شمیم شاہ جہانپوری	۱	ایک غزل
شمیم عثمانی	۱	ایک غزل
شمیم فاروقی	۱۲	انیس غزلیں
شمیم قاسمی	۳	آٹھ غزلیں

شمیم منظر	۱	ایک مباحثہ
شمیم ہاشمی	۳	تین غزلیں
شوکت جعفری	۱	ایک نظم
شوکت حیات	۲۲	اکیس افسانے، ایک رپورتاژ
شوکت عابد	۴	دونظموں کے تراجم، دس نظمیں
شہاب اختر شہاب	۲	تین نظمیں
شہاب اشرف	۱	ایک غزل
شہاب الدین ثاقب	۱	دوغزلیں
شہاب جعفری	۵	ایک مضمون، ایک غزل، تین نظمیں
شہاب سرمدی	۶	چار مضامین، ایک مباحثہ، ایک نظم
شہاب محمود	۱	ایک انٹرویو
شہپر رسول	۳	تین غزلیں
شہزاد	۱۴	سات افسانے، سات افسانوں کے تراجم
شہریار	۵۶	ایک مباحثہ، ترپن غزلیں، چوراسی نظمیں
شہزاد احمد	۱۳	بیس غزلیں
شہزاد اختر	۲	دونظمیں
شہزاد منظر	۲	دومضامین
شہناز نبی	۱	ایک غزل
شہنشاہ مرزا	۱	ایک نظم
شہیرہ مسرور	۱	ایک افسانہ
شیخ احمد آبادی	۲	دونظمیں
شیخ مبین اللہ	۱	تین نظموں کے تراجم
شیخ سلیم احمد	۲	ایک مضمون، ایک مضمون کا ترجمہ
شیدا رومانی	۲	دونظمیں
شیریں احمد	۳	پندرہ نظمیں
شیر شاہ سید	۲	دوافسانے
شین اختر	۱	ایک افسانہ
شین کاف نظام	۵	ایک مضمون، ایک غزل، اٹھائیس نظمیں
صابر دت	۱	ایک نظم
صابر زاہد	۱۱	سترہ غزلیں
صابر سنبھلی	۱	ایک مضمون
صابر ظفر	۳	چودہ غزلیں
صابر مرزا	۱	ایک غزل
صادق	۳۱	چار افسانے، تیرہ غزلیں، چالیس نظمیں
صادق نوید	۱	دوغزلیں
صادقین	۱	چھ رباعیاں

صالحہ عابد حسین	۱	ایک افسانہ
صائمہ بتول	۱	ایک غزل
صبا اکرام	۲۹	ایک مضمون ، تین نظموں کے تراجم، چودہ غزلیں، بائیس نظمیں
صبا جائسی	۱۵	ایک مضمون، ایک مباحثہ، پندرہ غزلیں، دو نظمیں
صدف جعفری	۱	دو نظمیں
صدیق الرحمٰن قدوائی	۱	ایک مضمون
صدیق عالم	۳۳	ایک مضمون، گیارہ افسانے، چھہتر نظمیں
صدیق مجیبی	۹	سولہ غزلیں، دس نظمیں
صدیقہ ثانی	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
صغیر احمد صوفی	۴	پانچ غزلیں
صفدر	۲	دو مضامین، تین غزلیں، آٹھ نظمیں
صفدر امام قادری	۱	تین نظمیں
صفیہ اریب	۲	ایک مضمون، ایک افسانہ
صلاح الدین پرویز	۲۹	اکیاسی نظمیں
صلاح الدین محمود	۱۸	ایک مضمون، دس غزلیں، انتالیس نظمیں
صلاح الدین نیر	۱	ایک غزل
صہبا وحید	۱۸	چار مضامین، بیس غزلیں، چھ نظمیں
ضیا آفریدی	۲	دو نظمیں
ضیاء الحق	۱	انٹرویو
ضیاء الانجم	۱	ایک نظم
ضیاء الدین شکیب	۱	ایک تبصرہ
ضیا صدیقی	۱	دو غزلیں
ضیا فتح آبادی	۱	ایک نظم
ضمیر احمد	۲۰	پینتالیس نظموں کے تراجم
ضمیر الدین احمد	۲	دو افسانے
ضمیر نیازی	۱	ایک مضمون
طارق جامی	۲	ایک افسانہ، دو غزلیں
طارق جمیلی	۱	ایک افسانہ
طارق عالم	۱	ایک نظم
طارق قمر طارق	۲	تین غزلیں، ایک نظم
طلعت عرفانی	۱	تین غزلیں
طلحہ رضوی برق	۱	ایک مضمون
ظ انصاری	۳	ایک مضمون، دو رپورتاژ
ظفر احمد	۸	انتالیس نظمیں
ظفر احمد پرواز	۱	ایک غزل

ظفر احمد صدیقی	۷	تین مضامین، چھ غزلیں، چھ رباعیاں
ظفر اقبال	۵۹	چار مضامین، دو سو ستائیس غزلیں، ایک نظم
ظفر اقبال ظفر	۲	تین غزلیں
ظفر ادگانوی	۱۱	گیارہ افسانے
ظفر حمیدی	۵	چار غزلیں، تین نظمیں
ظفر زیدی	۱	ایک غزل
ظفر صہبائی	۵	تین غزلیں، دو نظمیں، ایک نثری غزل
ظفر غوری	۲۰	تیس غزلیں
ظفر گورکھپوری	۵	تیرہ غزلیں
ظفر مرادآبادی	۱	ایک غزل
ظفر ہاشمی	۳	سات غزلیں، ایک آزاد غزل
ظہور الدین	۴	دو مضامین، دو افسانے
ظہیر احمد صدیقی	۱	ایک مضمون
ظہیر انور	۵	تین مضامین، ایک ڈراما، ایک غزل
ظہیر صدیقی	۱۲	ایک مباحثہ، چھ غزلیں، سات نظمیں
ظہیر غازی پوری	۲	دو غزلیں
عابد ادیب	۱	ایک غزل
عابد حسین عابد	۱	ایک غزل
عابد سہیل	۱	ایک مباحثہ
عابدہ احمد	۷	آٹھ غزلیں، آٹھ نظمیں
عادل اسیر	۱	ایک نظم
عادل جعفری	۱	ایک غزل
عادل منصوری	۴۸	چھ نظموں کے تراجم، چھیالیس غزلیں، نواسی نظمیں، دو مسلسل غزلیں
عارف ایوبی	۲	دو افسانے
عارف ہندی	۱	ایک مضمون
عاصم شہنواز شبلی	۷	آٹھ غزلیں، ایک نظم، پانچ رباعیاں
عالم خورشید	۱۹	ستاون غزلیں
عالم خوندمیری	۱	ایک مضمون
عالی جعفری	۱	ایک نظم
عباس ازل	۱	ایک مضمون
عباس اطہر	۵	سات نظمیں
عباس عادل	۱	ایک غزل
عبدالاحد ساز	۱۳	ایک مضمون، ستائیس غزلیں، بارہ نظمیں
عبدالحلیم	۵	ایک مباحثہ، ایک غزل، سات نظمیں
عبدالحمید	۳۰	ایک مضمون، دو تبصرے، بہتر غزلیں

عبدالرحیم نشتر	۸	گیارہ غزلیں
عبدالصمد	۱۵	پندرہ افسانے
عبدالعلیم، ڈاکٹر	۱	ایک مکتوب
عبدالقوی دسنوی	۱	ایک تبصرہ
عبداللہ کمال	۱۰	تینتالیس غزلیں، چار نظمیں
عبدالمتین جامی	۱	ایک غزل
عبدالمتین نیاز	۵	دو غزلیں، تین نظمیں
عبدالمجیب سہالوی	۱	ایک افسانہ
عبدالمغنی	۵	تین مضامین، ایک مباحثہ، ایک تبصرہ
عبیدالرحمن اعظمی	۱	ایک نظم
عبیداللہ علیم	۱	ایک غزل
عبید صدیقی	۱۲	سینتالیس غزلیں، دو نظمیں
عتیق اللہ	۳۹	ایک مضمون، ایک افسانہ، ایک ڈراما، ترپن غزلیں، چھبیس نظمیں
عثمان عارفی	۲	دو غزلیں
عثمان عامر	۱	ایک غزل
عدیم ہاشمی	۱	دو غزلیں
عذرا عباس	۱۵	تین مضامین، دو افسانے، چوالیس نظمیں
عرفان ستار	۸	اکیس غزلیں
عرفان صدیقی	۲۴	دو مباحثے، بیانوے غزلیں
عرفی آفاقی	۴	دو غزلیں، ایک نظم، تینتالیس دوہے
عزیز ابن الحسن	۱	ایک مضمون
عزیز احمد، پروفیسر	۱	دو غزلیں
عزیز احمد	۱	ایک مضمون
عزیز الرحمن	۳	دو غزلیں، ایک نظم
عزیز بانو داراب وفا	۲	گیارہ غزلیں
عزیز تمنائی	۱	ایک نظم
عزیز حامد مدنی	۲	پانچ نظمیں
عزیز عالم	۱	ایک افسانہ
عزیز قیسی	۳	تین نظمیں
عزم بہزاد	۱	چار غزلیں
عشرت آفریں	۱	ایک نظم
عشرت جالندھری	۲	دو غزلیں
عشرت ظفر	۱۵	ایک تبصرہ، چوالیس غزلیں
عصمت جاوید	۲	ایک مضمون، نظم
عصمت چغتائی	۱	ایک افسانہ

عضدالدین خاں	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
عطا عابدی	۱	ایک افسانہ
عطیہ داؤد	۱	سات نظمیں
عطیہ کوثر	۱	دو نظمیں
عفت موہانی	۱	ایک افسانہ
عقیل احمد صدیقی	۶	چار مضامین، دو مضامین کے تراجم
عقیل جامد	۹	چھبیس غزلیں
علقمہ شبلی	۲	دو غزلیں
علم الدین شیخ	۳	پانچ نظمیں
علی اصغر	۴	دو نظموں کے تراجم، تین نظمیں
علی الدین انصاری	۱	دو نظمیں
علی الدین نوید	۴	دو غزلیں، دو نظمیں
علی تنہا	۷	ایک مضمون، چھ افسانے
علی جواد زیدی	۱	ایک غزل
علی حیدر ملک	۴	ایک مضمون، ایک افسانہ، ایک انٹرویو، ایک تبصرہ
علی سعید شیرازی	۱	ایک مضمون
علی ظہیر	۲۷	دو نظموں کے تراجم، تین غزلیں، چوہتر نظمیں
علی عباس امید		دو غزلیں، دو نظمیں
علی محمد فرشی	۳	گیارہ نظمیں
علیم احمد	۲	دو افسانے
علیم اللہ حالی	۱۶	ایک مضمون، چھ غزلیں، بارہ نظمیں
علیم جہاں گیر	۱	ایک غزل
علیم صبا نویدی	۴	پانچ غزلیں، پانچ نظمیں
علیم مسرور	۱	ایک غزل
عمر انصاری	۴	نو غزلیں
عمر فاروق	۲	ایک غزل، چار نظمیں
عمیق حنفی	۲۶	دو مضامین، ایک ڈراما، ایک مباحثہ، چار غزلیں، اڑتالیس نظمیں، تیرہ رباعیاں
عنبر بہرائچی	۹	چھ مضامین، تین غزلیں، چھ نظمیں
عنبر شمیم	۱	دو غزلیں
عنوان چشتی	۳	ایک مضمون، دو غزلیں
عوض سعید	۱۲	نو افسانے، سات نظمیں
عین تابش	۱۹	ایک مضمون، تراسی غزلیں، دس نظمیں
عین رشید	۹	ایک افسانہ، گیارہ نظمیں، ایک نظم کا ترجمہ
غالب حسنین	۳	تین افسانے
غضنفر	۸	تین افسانے، گیارہ غزلیں، ایک نظم

غضنفر سلطان پوری	۱	دو غزلیں
غضنفر علی	۱	دو غزلیں
غلام الثقلین نقوی	۲	دو افسانے
غلام حسین ایاز	۱	ایک غزل
غلام حسین ساجد	۳۲	ایک مضمون، ایک سو اکتالیس غزلیں، چھ نظمیں
غلام ربانی تاباں	۲	دو غزلیں
غلام محمد	۲	دو افسانے
غلام محمد اختر	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
غلام مرتضیٰ راہی	۴۸	ایک سو گیارہ غزلیں
غلام مصطفیٰ فراز	۳	دس غزلیں
غلام مکرانی	۱	ایک نظم
غلام نبی ناظر	۲	دو نظمیں
غمگین غلام نبی	۱	ایک افسانہ
غیاث احمد گدی	۱۰	دس افسانے
غیاث اقبال	۲	دو مضامین
غیاث صدیقی	۲	ایک غزل، ایک نظم
غیاث متین	۷	پانچ غزلیں، نو نظمیں
غیور جعفری	۱	ایک غزل
ف س اعجاز	۲	ایک افسانہ، ایک نظم
فارغ بخاری	۲	تین غزلیں
فاروق انجینئر	۴	تین غزلیں، آٹھ نظمیں
فاروق راہب	۱۴	ایک مضمون، دس افسانے، تین نظمیں
فاروق سرور	۲	دو افسانے
فاروق شفق	۲۴	پچھتر غزلیں، ایک نظم
فاروق مسعودی	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
فاروق مضطر	۳	تین غزلیں، ایک آزاد غزل
فاروق نازکی	۱	چار غزلیں
فاطمہ تاج	۲	تین نظمیں
فاطمہ حسن	۷	گیارہ غزلیں، تین نظمیں
فخر الدین عارفی	۱	ایک افسانہ
فخر رضوی	۲	ایک غزل، ایک نظم
فراق گورکھپوری	۹	ایک مضمون، دو مباحثے، چھ غزلیں، دس خمسے
فرحت احساس	۱	سات غزلیں
فرحت قادری	۱	نو غزلیں
فرخ جعفری	۲۲	آٹھ تبصرے، تین افسانوں کے تراجم، چوالیس غزلیں
فرخ یار	۱	پانچ نظمیں

فرخندہ لودھی	۲	ایک افسانہ، ایک نظم
فردوس حیدر	۱	ایک افسانہ
فروغ حمکنت	۲	ایک غزل، ایک نظم
فریاد آزر	۳	سات غزلیں
فرید احمد	۱	ایک نظم
فرید پربتی	۴	چھ غزلیں، ایک رباعی
فصیح اکمل قادری	۲	دو غزلیں
فضا ابن فیضی	۲۹	تراسی غزلیں، ایک نظم
فضا کوثری	۴	چار غزلیں
فضل احمد کریم فضلی	۱	ایک غزل
فضل الرحمن	۱	ایک ڈرامے کا ترجمہ
فضل امام	۱	ایک نظم
فضل تابش	۱۷	ایک افسانہ، سات غزلیں، پندرہ نظمیں
فضل حسنین	۲	ایک تبصرہ، ایک افسانے کا ترجمہ
فضیل جعفری	۲۴	پانچ مضامین، ایک مباحثہ، تیس غزلیں
فقیر کلے	۲	ایک افسانہ، ایک افسانے کا ترجمہ
فکری بدایونی	۳	دو غزلیں، ایک نظم
فوزیہ فاروقی	۶	دو افسانے، ایک غزل، دس نظمیں
فوقیہ مشتاق	۲	دو نظمیں
فہمیدہ ریاض	۲	ایک افسانہ، تیرہ نظمیں
فہیم اعظمی	۱	ایک افسانہ
فہیم جوزی	۷	دو مضامین، آٹھ نظمیں
فیاض اختر	۵	ایک مضمون، ایک افسانے کا ترجمہ، ایک غزل، دو نظمیں
فیاض رفعت	۸	اکتیس نظمیں
فیروز	۷	چار غزلیں، تین نظمیں
فیروز اختر	۱	دو غزلیں
فیروز عابد	۱۹	ایک مضمون، پندرہ افسانے، چوبیس نظموں کے تراجم
فیصل ہاشمی	۸	سات غزلیں، اٹھارہ نظمیں
قاسم ندیم	۳	نو غزلیں
قاضی افضال حسین	۸	چھ مضامین، ایک تبصرہ، ایک مضمون کا ترجمہ
قاضی جمال حسین	۷	سات مضامین
قاضی سلیم	۲۱	ایک مباحثہ، ایک نظم کا ترجمہ، اکیس نظمیں
قاضی عبدالستار	۱	ایک مضمون
قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی	۱	ایک مضمون
قائد حسین کوثر	۱	ایک افسانہ

قدیر زماں	۵	پانچ افسانے
قربان آتش	۱۲	اٹھارہ غزلیں
قرۃ العین حیدر	۲	ایک افسانہ
قمر احسن	۲۲	دو مضامین، تیرہ افسانے، ایک ناول، بیس تبصرے، چار نظمیں
قمر اقبال	۷	سات غزلیں، دو نظمیں
قمر التوحید	۱	ایک افسانہ
قمر جمیل	۹	تین مضامین، چار غزلیں، آٹھ نظمیں
قمر رضا شہزاد	۱	چھ غزلیں
قمر ساحری	۱	ایک نظم
قمر صدیقی	۸	چودہ غزلیں
قمر عالم قاسمی	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
قمر قدیر ارم	۱	ایک نظم
قنبر علی	۳	چار نظمیں
قیصر جمیل	۱	ایک افسانہ
قیصر زماں	۱	دو غزلیں
قیصر زماں قیس	۱	دو نظمیں
قیصر سرمست	۱	ایک مضمون
قیصر شمیم	۳	ایک مضمون، دو غزلیں
قیصر ضحیٰ عالم	۳	تین مضامین
قیصر عالم	٦	ایک مضمون، ایک مباحثہ، دس غزلیں، اکیس نظمیں
قیصر قلندر	۹	ایک مضمون، دو نظموں کے تراجم، چھ غزلیں، ایک نظم
قیوم راز	۳	گیارہ غزلیں
قیوم راہی	۱	ایک افسانہ
کالی داس گپتا	۱	ایک مضمون
کامل اختر	۱۷	انتیس غزلیں، نو نظمیں
کانتی چرن سون رکشا	۱	ایک مباحثہ
کاوش بدری	۲۸	ایک سو تیس غزلیں، دو نظمیں
کاوش جذباتی	۱	ایک غزل
کرامت علی کرامت	۵	تین نظموں کے تراجم، ایک غزل، تین نظمیں
کرشن بلدیو وید	۵	پانچ افسانے
کرشن چندر	۳	ایک مضمون، ایک افسانہ، ایک ڈرامے کا ترجمہ
کرشن کمار طور	۴۵	چھیانوے غزلیں
کرشن موہن	۱۹	ایک مضمون، بارہ غزلیں، اکیس نظمیں
کرن سنگھ	۱	ایک افسانے کا ترجمہ

کشور ناہید	۲	تین نظمیں
کفیل آزر	۳	تین غزلیں
کلام حیدری	۴	دو افسانے، دو مباحثے
کلدیپ رعنا	۲	دو افسانے
کلیم الدین احمد	۲	دو مضامین
کمار پاشی	۱۰	دو افسانے، سات غزلیں، چار نظمیں
کمال احمد صدیقی	۲	تین غزلیں، ایک نظم
کمال الدین احمد	۲	دو مضامین
کنور چوہان	۱	ایک غزل
کنور سین	۵	پانچ افسانے
کوثر چاند پوری	۱	ایک افسانہ
کے۔ ایم۔ اشرف	۲	دو افسانے
کیدار ناتھ کومل	۲	تین نظمیں
کیسری کشور	۴	چھ غزلیں
کیف احمد صدیقی	۲۵	انتالیس غزلیں، ایک نظم
کیلاش ماہر	۲	ایک غزل، ایک نظم
کیمفر	۳	چھ غزلیں
گربچن سنگھ	۱	ایک افسانہ
گریش چندر	۲	تین نظموں کے تراجم
گوپال متل	۱	تین غزلیں
گوپی چند نارنگ	۱۵	چودہ مضامین، ایک سفرنامہ
گووندر شک	۴	چھ غزلیں
گیان چند	۱۱	پانچ مضامین، چار غزلیں، تین نظمیں، ایک رباعی
لطف الرحمٰن	۳۲	چھ مضامین، ایک سو سینتیس غزلیں، ایک نظم
لطف السنان	۱	ایک افسانہ
لطیف	۴	تین افسانے، ایک نظم
لطیف ساحل	۱	پانچ غزلیں
لکشمی کانت ورما	۱	ایک نظم
لیاقت علی عاصم	۱	ایک غزل
م۔ خاور	۱	ایک غزل
م۔ ق۔ خان	۸	ایک مضمون، سات افسانے
ماجد الباقری	۱۳	اکتیس غزلیں
ماجد حلیم	۲	دو نظمیں
مالک رام	۱	ایک مضمون
مبین صدیقی	۵	ایک مضمون، دو افسانے، تین نظمیں
مبین مرزا	٦	ایک مضمون، تین افسانے، چھ غزلیں، چار نظمیں

متین سید	۱	ایک مضمون
مجاور حسین رضوی	۲	پانچ تبصرے
مجتبیٰ حسین	۲	ایک خاکہ، ایک مزاحیہ مضمون
مجتبیٰ عثمانی	۱	ایک مضمون
مجید امجد	۹	تیرہ نظمیں
مجید ساقی	۱	دو غزلیں
مجید کوثر	۲	تین غزلیں
محافظ حیدر	۳	دو افسانے، ایک نظم
محب الحسن ثمر	۱	ایک نظم
محب عارفی	۳	ایک مضمون، پانچ غزلیں
محبوب الرحمٰن	۱۴	دو مضامین، دو افسانے، ایک مباحثہ، چودہ تبصرے، ایک ڈرامے کا ترجمہ
محبوب انور	۱	ایک نظم
محبوب خزاں	۲	چار غزلیں، پانچ نظمیں
محبوب راہی	۷	آٹھ غزلیں
محبوب شرف	۱	دو نظمیں
محبوب شیدائی	۱	ایک غزل
محسن بھوپالی	۱	دو غزلیں
محسن خان	۲	چار افسانے، دو تبصرے
محسن زیدی	۵	پانچ غزلیں
محسن شمسی	۱۴	چودہ افسانے
محسن علی	۱	ایک افسانہ
محفوظ اثر	۱	ایک غزل
محمد احمد رمز	۲۱	ستتر غزلیں، دو نظمیں
محمد احمد فاروقی	۱	ایک مضمون
محمد اشتیاق	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
محمد اظہار الحق	۱۲	تینتیس غزلیں، انیس نظمیں
محمد اعظم	۱۳	ستائیس غزلیں، ایک نظم
محمد اقرار حسین	۱	ایک مضمون
محمد انور خالد	۱	ایک نظم
محمد حسن	۳	تین مضامین
محمد حسن عسکری	۵	چار مضامین، چند مکاتیب
محمد حسین	۱	ایک مضمون
محمد حفظ الکبیر قریشی	۱	ایک مضمون
محمد حمید اللہ، ڈاکٹر	۱	ایک مضمون
محمد حمید شاہد	۷	چھ افسانے، ایک مباحثہ

محمد حنیف	۱	ایک مضمون
محمد خالد	۲	پانچ غزلیں
محمد رفیع رضا	۳	آٹھ غزلیں
محمد رفیق	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
محمد سلیم الرحمٰن	۱۰	دو افسانے، دو نظموں کے تراجم، بارہ نظمیں
محمد شعیب	۱	دو نظمیں
محمد شمیم رجبی	۳	تین نظمیں
محمد طاہر	۱	ایک مباحثہ
محمد عابد علی عابد	۷	پندرہ غزلیں
محمد عاصم بٹ	۸	آٹھ افسانے
محمد عبد،بقدیر	۱	ایک غزل
محمد علوی	۳۹	ستاون غزلیں، اٹھانوے نظمیں
محمد عمر میمن	۱۰	ایک مضمون، چار افسانے، ایک انٹرویو، ایک مضمون، دو افسانوں اور ایک انٹرویو کے تراجم
محمد مسعود	۲	ایک مضمون، ایک انٹرویو، تین نظموں کے تراجم، چار نظمیں
محمد منصور عالم	۲	دو مضامین
محمد یعقوب فاروقی	۱۰	اکتیس تبصرے
محمد یوسف	۳	ایک افسانہ، دو غزلیں
محمود احمد سحر	۱	ایک غزل
محمود ایاز	۱۳	ایک مضمون، ایک تبصرہ، چودہ غزلیں، پانچ نظمیں
محمود شاہد	۲	دو افسانے
محمود شکیل	۱	ایک افسانہ
محمود عشقی	۷	نو غزلیں
محمود علی محمود	۱	دو نظمیں
محمود کنور	۲	تین نظمیں
محمود واجد	۱۳	چھ مضامین، چھ افسانے، ایک مباحثہ
محمود ہاشمی	۱۸	نو مضامین، دو افسانے، دو مباحثے، دو سفرنامے، دو تبصرے، ایک مضمون کا ترجمہ، ایک نظم
محمود یاسین	۸	آٹھ افسانے
مختار احمد	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
مختار الدین احمد	۱	تین غزلیں، دو نظمیں
مختار شمیم	۳	پانچ غزلیں
مخدوم محی الدین	۲	ایک مباحثہ، ایک نظم
مخمور سعیدی	۲۲	پچیس غزلیں، آٹھ نظمیں
مدحت الاختر	۳۹	تہتر غزلیں

مراتب اختر	۲	دوغزلیں
مرتضیٰ خان	٦	انیس نظمیں
مرتضیٰ علی شاد	۲	چھ غزلیں
مرتیو بودھ	۱	ایک نظم
مرزا ادیب	۱	ایک ڈراما
مرزا حامد بیگ	۲۵	نو مضامین ، پندرہ افسانے، ایک افسانے اور چار نظموں کے تراجم
مرزا خلیل احمد بیگ	۱	ایک مضمون
مرزا سعید الظفر چغتائی	۸	اکیس نظموں کے تراجم، دوغزلیں
مرغوب حسن خان	۵	پانچ غزلیں، دو نظمیں
مرغوب علی	٦	ایک غزل، نو نظمیں
مسعود اختر	۲	دو مضامین
مسعود اشعر	۱۴	ایک مضمون، بارہ افسانے، ایک افسانے کا ترجمہ
مسعود سلمان	۲	چار غزلیں، پندرہ رباعیاں
مسعود عابد	۱	ایک نظم
مسیح الزماں	۱۱	چار مضامین، دو تبصرے، دو افسانوں اور تین ڈراموں کے تراجم
مشتاق احمد نوری	۱	ایک افسانہ
مشتاق جاوید	۱	ایک غزل
مشتاق شبنم	۱	ایک غزل
مشتاق علی شاہد	۱۱	بارہ نظمیں
مشتاق قمر	۱	ایک مضمون
مشتاق مشرقی	۱	ایک انٹرویو
مشتاق مہدی	۷	سات نظمیں
مشرف عالم ذوقی	۱	ایک افسانہ
مشکور حسین یاد	۱	ایک مضمون
مصحف اقبال توصیفی	۲٦	نو غزلیں، تیس نظمیں
مصطفیٰ ارباب	۱۱	بانوے نظمیں
مصطفیٰ شہاب	۱۰	ایک افسانہ، نو غزلیں، چار نظمیں
مصطفیٰ کریم	۵	چار افسانے، ایک افسانے کا ترجمہ
مصطفیٰ کمال	۱۵	اشاریے کی نو قسطیں، پانچ افسانے، ایک افسانے کا ترجمہ
مصطفیٰ مومن	۱	دوغزلیں
مصور سبزواری	۴۲	ایک سو گیارہ غزلیں، ایک نظم
مضطر حیدری	۲	دس غزلیں
مضطر مجاز	۱	ایک غزل

مظفر احمد لاری	۱	ایک مباحثہ
مظفر اقبال	۱	ایک افسانہ
مظفر ایرج	۲	بارہ غزلیں
مظفر حنفی	۵۷	ایک سو اکسٹھ غزلیں، پانچ نظمیں
مظفر عازم	۱	ایک نظم
مظہر الزماں خاں	۳۱	بتیس افسانے
مظہر امام	۳۵	تین مضامین، تین تبصرے، چوالیس غزلیں، پانچ نظمیں، تین آزاد غزلیں
مظہر ترمذی	۱	ایک غزل
مظہر زیدی	۱	ایک نظم کا ترجمہ
مظہر محی الدین	۱	دوغزلیں
مظہر مہدی	۲	تین غزلیں
معراج رعنا	۴	تین مضامین، ایک غزل
معصوم نظر	٦	پانچ غزلیں، چھ نظمیں
معین احسن جذبی	۱	ایک غزل
معین شاکر	۱	ایک مباحثہ
مغنی تبسم	۱۸	ایک مضمون، گیارہ غزلیں، گیارہ نظمیں
مقبول سلیم	۲	دوغزلیں
مقبول ویرے	۱	ایک غزل
مقدر حمید	۲	دو افسانے
مقصود الٰہی شیخ	۳	ایک مضمون، دو افسانے
ممتاز راشد	۱۲	بائیس غزلیں
ممتاز رفیق	۱	ایک نظم کا ترجمہ
ممتاز حسین	۱	ایک مضمون
ممتاز شیریں	۱	چند مکاتیب
مناظر عاشق ہرگانوی	۷	دو افسانے، ایک غزل، پانچ نظمیں، دو آزاد غزلیں
منشا یاد	۷	سات افسانے
منصور اعجاز	٦	بارہ نظمیں
منصور رضا	۱	ایک افسانہ
منصورہ احمد	۱	چھ غزلیں
منظر اعجاز	۱	ایک غزل
منظر امام	۲	دو افسانے
منظر امکانی	۱	ایک انٹرویو
منظر سلیم	۴	چار غزلیں، دو نظمیں
منظر کاظمی	۱۲	تین مضامین، نو افسانے

منظور اعجاز	۱	ایک مضمون
منظور الامین	۴	ایک ڈرامے کا ترجمہ، تین غنائیے
من موہن تلخ	۱۹	سینتالیس غزلیں
منیب	۲	تین غزلیں
منیب الرحمٰن	۲۱	ایک غزل، اٹھاون نظمیں
منیر الدین احمد	۲۳	دس افسانے، چھ افسانوں اور سینتالیس نظموں کے تراجم، دو نظمیں
منیر سیفی	۲	دو غزلیں
منیر فیاض	۱	ایک مباحثہ
منیر نیازی	۱۷	پندرہ غزلیں، تیئیس نظمیں
موہن کلپنا	۱	ایک افسانہ
موہن لال	۹	سات افسانے، ایک ڈراما، ایک ناول، ایک نظم
مہتاب حیدر نقوی	۱۴	پینتالیس غزلیں، چھ نظمیں
مہدی پرتاب گڈھی	۱	ایک غزل
مہدی جعفر	۱۲	نو مضامین، دو تبصرے ایک افسانے کا ترجمہ، پانچ رباعیاں
مہدی ٹونکی	۲	دو افسانے
مہر افشاں فاروقی	۷	آٹھ تبصرے، دو مضامین، دو افسانوں اور ایک نظم کا ترجمہ
مہیش اشک	۴	دس غزلیں
مہیش پٹیالوی	۱	ایک نظم
میراجی	۲	ایک نظم کا ترجمہ، آٹھ غزلیں، آٹھ نظمیں
میر ظفر حسین	۱	پانچ نظمیں
میکش کانپوری	۱	ایک غزل
ن۔ا۔ناظر	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
ن۔م۔دانش	۵	آٹھ غزلیں، نو نظمیں
ن۔م۔راشد	۱۱	ایک مضمون، پندرہ نظموں کے تراجم، تیرہ نظمیں
نادم بلخی	۱	ایک غزل
نازش پرتاب گڈھی	۱۳	گیارہ غزلیں، تیرہ نظمیں
ناز صدیقی	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
ناز قادری	۱	دو غزلیں
ناصر الدین	۱	دو غزلیں
ناصر الدین خان	۱	ایک نظم
ناصر بغدادی	۴	تین مضامین، ایک افسانہ
ناصر راہی	۲	دو افسانے، چار نظمیں
ناصر زیدی	۳	چار غزلیں

ناصر شہزاد	۱۳	اکتیس غزلیں
ناصر کاظمی	۲	چھ غزلیں
نامی انصاری	۱	دو غزلیں
ناہید اختر	۵	ایک غزل، چھ نظمیں
ناہید ثانی	۳	ایک غزل، تین نظمیں
نتیانند تیواری	۱	ایک مباحثہ
نثار احمد نثار	۴	چار نظمیں
نثار پرویز	۱	ایک نظم
نثار فدائی	۱	ایک غزل
نثار ناسک	۴	دو غزلیں، دو نظمیں
نجم باگ	۵	چار افسانے، چار نظمیں
نجم عثمانی	۲	دو غزلیں
نجم فاروقی	۱۸	چار افسانے، تین افسانوں، نو مضامین اور دو انٹرویو کے تراجم
نجم فضلی	۹	پانچ افسانے، دو غزلیں، گیارہ نظمیں
نجمہ شہریار	۲	دو افسانے
ندا فاضلی	۲۲	نو غزلیں، اٹھتیس نظمیں
ندیم گویائی	۲	تین غزلیں
نذیر آزاد	۸	گیارہ غزلیں، دو نظمیں
نذیر اختر	۳	ایک غزل، دو نظمیں
نذیر فتح پوری	۱	دو غزلیں
نسیم انصاری	۱	ایک مضمون
نسیم بن آسی	۵	پانچ افسانے
نسیم شاہد	۱	ایک انٹرویو کا ترجمہ
نسیم صدیقی	۱	ایک غزل
نسیم مظفر پوری	۳	دو غزلیں، ایک نظم
نشاط نور	۳	دو افسانے، دو نظموں کے تراجم
نشتر اکبر آبادی	۱	ایک غزل
نشتر خانقاہی	۱۹	بتیس غزلیں، نو نظمیں
نصر غزالی	۱	ایک غزل
نصیر احمد ناصر	۱۵	چوبیس غزلیں، ترسٹھ نظمیں
نصیر پرواز	۵	پانچ غزلیں
نظام الدین نظام	۲	ایک غزل، ایک نظم
نظام صدیقی	۱	ایک مضمون
نظام ہاتف	۱	ایک غزل
نظر شاہ جہاں پوری	۱	ایک غزل

نظیر صدیقی	۲	ایک مضمون، دو غزلیں
نعمان شوق	۴	چودہ غزلیں
نعیم اقبال	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
نعیم زبیری	۳	تین افسانے
نقی حسین جعفری	۳	دو تبصرے، ایک نظم کا ترجمہ
نقی علی خان ثاقب	۲	دو غزلیں
نکہت حسن	۱	ایک افسانہ
نور احمد	۱	ایک افسانے کا ترجمہ
نور الحسن ہاشمی	۱	ایک مضمون
نور الحسنین	۱	ایک افسانہ
نور الدین احمد نوری	۱	ایک افسانہ
نور الہدیٰ سید	۳	تین افسانے
نور پرکار	۱۲	دو افسانے، دو افسانوں، دو ڈراموں اور اٹھارہ نظموں کے تراجم، ایک نظم
نور شاہ	۷	سات افسانے
نوشاد حسین	۲	دو مضامین
نیاز حیدر	۱	ایک نظم
نیاز فتح پوری	۱	ایک مضمون
نیر عاقل	۴	پندرہ غزلیں
نیر مسعود	۴۰	نو مضامین، اٹھارہ افسانے، ایک انٹرویو، تین مباحثے، ایک ناول، چھ تبصرے، پانچ افسانوں اور سات نظموں کے تراجم
واجد قریشی	۲	چھ غزلیں
واجدہ تبسم	۱	ایک افسانہ
واحد پریمی	۱	ایک غزل
واحد علی بانگے	۱	ایک نظم
وارث علوی	۱۵	پندرہ مضامین
وارث کرمانی	۱۹	دو مضامین، خود نوشت سوانح کی آٹھ قسطیں، دس غزلیں، پانچ نظمیں
والی آسی	۱	دو غزلیں
وامق جون پوری	۱	ایک غزل
وجاہت علی سندیلوی	۱	ایک افسانہ
وحید اختر	۲۷	چار مضامین، ایک نظم کا ترجمہ، بیس غزلیں، تیئیس نظمیں، ایک مرثیہ
وحید الحسن	۶	تیرہ نظمیں
وحید عرشی	۱	ایک نظم
وحید واجد	۱	ایک غزل
وراثت علی شکوہ کاشمیری	۱	چار نظموں کے تراجم
وزیر آغا	۲۵	سات مضامین، گیارہ غزلیں، پندرہ نظمیں
وزیر علی	۲	دو افسانے
وفا ملک پوری	۱	ایک نظم
وقار احمد رضوی	۱	ایک مضمون
وقار خلیل	۴	تین غزلیں، ایک نظم
وقار ناصری	۹	پانچ تبصرے، چودہ غزلیں
وقار واثقی	۱۱	اکیس غزلیں
وکیل اختر	۲	تین غزلیں
وویک وشال	۲	دو نظمیں
وہاب اشرفی	۴	تین مضامین، ایک افسانہ
وہاب دانش	۲۶	ایک افسانہ، سات غزلیں، انسٹھ نظمیں
ویریندر	۲	دو نظمیں
ویریندر دیپک	۶	پانچ افسانے، ایک نظم
ہارون رشید	۱	ایک افسانہ
ہربنس لال ساہنی	۱	ایک افسانہ
ہربنس مکھیا	۱۲	چھتیس نظمیں
ہربھجن سنگھ ساگر	۱	ایک افسانہ
ہرچرن چاولہ	۳	تین افسانے
ہرش نرائن	۱	ایک مباحثہ
ہلال جعفری	۱	ایک نظم
ہمایوں ظفر زیدی	۱	ایک غزل
ہمدم کاشمیری	۱۵	بیس غزلیں
ہیمانگی راناڈے	۱	ایک افسانہ
یاسمین حمید	۱	چار نظمیں
یاسین افضال	۶	تیرہ نظمیں
یعقوب عثمانی	۱	ایک غزل
یعقوب یاور	۱	ایک نظم
یوسف اعظمی	۱	ایک نظم
یوسف تقی	۲	ایک غزل، ایک نظم
یوسف جمال	۷	بارہ غزلیں، دو آزاد غزلیں
یوسف سرمست	۲	دو مضامین
یوسف کمال	۱	تین نظموں کے تراجم
یوگ راج	۱	ایک رپورتاژ
یونس جعفری	۱	ایک افسانے کا ترجمہ

ماحصل

- ''شب خون'' کے کل ۲۹۰ شماروں میں (۱۳۲۷) قلم کاروں کی (۱۶۰۸۵) تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔
- شمس الرحمٰن فاروقی، ''شب خون'' کے سب سے زیادہ شماروں میں شائع ہونے والے قلم کار ہیں، جن کی تخلیقات کل (۲۳۱) شماروں میں شائع ہوئی ہیں۔ جب کہ دوسرا اور تیسرا مقام بلراج کومل اور ظفر اقبال کو حاصل ہے۔ جن کی تخلیقات بالترتیب (۷۰) اور (۵۹) شماروں میں شائع ہوئی ہیں۔
- صرف ایک شمارے میں جگہ پانے والے قلم کاروں کی تعداد (۵۱۲) ہے جو کل تعداد کا (۳۸) فی صد ہے۔ اسی طرح دو شماروں میں (۲۰۲) قلم کار شائع ہوئے ہیں۔ جن کا فی صد (۱۵) ہے۔
- خاتون قلم کاروں کی تعداد مایوس کن حد تک کم یعنی صرف (۸۰) ہے۔ جو کل قلم کاروں کی تعداد کا (۶) فی صد ہے۔
- (۲۹۰) کے منجملہ کم از کم (۱۵) شماروں میں شائع ہونے والے قلم کاروں کو شب خون کے مستقل قلم کار تصور کریں تو ایسے قلم کاروں کی تعداد (۱۴۸) ہے۔ شب خون کے ان مستقل قلمی معاونین کے نام یہ ہیں۔ آصف فرخی، آفتاب شمسی، ابرار احمد، ابرار اعظمی، احمد سہیل، احمد محفوظ، احمد مشتاق، احمد ہمیش، اختر علیم انصاری، اختر یوسف، اسد محمد خاں، اسعد بدایونی، افتخار نسیم، اقبال کرشن، اقبال متین، اکرام باگ، امجد اسلام امجد، انتظار حسین، انور سجاد، انور سین رائے، انور شعور، انیس اشفاق، باقر مہدی، بشر نواز، بلراج کومل، بلقیس ظفیر الحسن، بمل کرشن اشک، پرتپال سنگھ بیتاب، پرکاش فکری، پریم کمار نظر، جاوید جمیل، جگن ناتھ آزاد، جمیل الرحمٰن، جوگندر پال، چودھری ابن النصیر، چودھری محمد نعیم، حامد حسین حامد، حامدی کاشمیری، حبیب حق، حسن عزیز، حسین الحق، حمید الماس، حمید سہروردی، خالدہ حسین، خلیل الرحمٰن اعظمی، خلیل تنویر، ذکاالدین شایاں، راشد جمال فاروقی، رام لعل، راہی فدائی، رشید امجد، رفیق راز، رؤف خلش، رئیس فراز، زاہدہ زیدی، زبیر رضوی، زبیر شفائی، زیب غوری، ساجدہ زیدی، ساحل احمد، ساقی فاروقی، سلطان اختر، سلیم اختر، سلیم شہزاد، سلیمان اریب، سہیل احمد زیدی، سید ارشاد حیدر، سید امین اشرف، سید حرمت الاکرام، شان الحق حقی، شاہد اختر، شاہد عزیز، شاہد کلیم، شاہین، شفق، شفق سوپوری، شفیع جاوید، شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، شوکت حیات، شہریار، صادق، صبا اکرام، صباجائسی، صدیق عالم، صلاح الدین پرویز، صلاح الدین محمود، صہبا وحید، ضمیر احمد، ظفر اقبال، ظفر غوری، عادل منصوری، عالم خورشید، عبدالحمید، عبدالصمد، عتیق اللہ، عذرا عباس، عرفان صدیقی، عشرت ظفر، علی ظہیر، علیم اللہ حالی، عمیق حنفی، عین تابش، غلام حسین ساجد، غلام مرتضیٰ راہی، فاروق شفق، فرخ جعفری، فضا ابن فیضی، فضل تابش، فضیل جعفری، فیروز عابد، قاضی سلیم، قمر احسن، کامل اختر، کاوش بدری، کرشن کمار طور، کرشن موہن، کیف احمد صدیقی، گوپی چند نارنگ، لطف الرحمٰن، محمد احمد رمز، محمد علوی، محمود ہاشمی، مخمور سعیدی، مدحت الاختر، مرزا حامد بیگ، مصحف اقبال توصیفی، مصطفیٰ کمال، مصور سبزواری، مظفر حنفی، مظہر الزماں خاں، مظہر امام، مغنی تبسم، من موہن تلخ، منیب الرحمٰن، منیر الدین احمد، منیر نیازی، نجم فاروقی، ندا فاضلی، نشتر خانقاہی، نصیر احمد ناصر، نیر مسعود، وارث علوی، وارث کرمانی، وحید اختر، وزیر آغا، وہاب دانش، ہمدم کاشمیری۔
- ایسے قلم کار جنھوں نے ادبی سفر کے درمیان اپنے نام تبدیل کیے یا مختلف قلمی ناموں سے لکھتے رہے یا ان کے نام تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ ''شب خون'' میں شائع ہوتے رہے ان کی تفصیل اس طرح ہے۔

☆ ا۔ ح۔ نورازل، دراصل سید احتشام حسین کا ایک اور نام تھا لیکن انہوں نے کبھی ظاہر نہیں کیا۔ ☆ وارث علوی نے چند مضامین ابن حسین کے نام سے بھی لکھے ہیں۔ ☆ شہرزاد، بنی مادھو رسوا اور عمر شیخ مرزا کے نام سے شائع تخلیقات کے خالق شمس الرحمٰن فاروقی ہیں۔ ☆ اختر علیم نصاری شمارہ (۸۴)

سے پہلے علیم افسر غازی پوری کے نام سے لکھتے تھے۔ ☆ اسنی بدرز بیری شمارہ (۲۱۰) سے قبل صرف اسنی بدر تھیں۔ ☆ جاوید نبیل شمارہ (۴۳) سے پہلے جاوید اختر تھے۔ ☆ سراج اجملی شمارہ (۱۹۲) سے پہلے سید سراج الدین اجملی کے نام سے چھپتے رہے۔ ☆ شاہ حسین نہری شمارہ (۱۴۹) سے پہلے شاہ حسین کے نام سے شائع ہوئے۔ ☆ صادق کا ابتدائی نام صادق مولی تھا۔ ☆ عتیق اللہ نے ادبی زندگی کا آغاز عتیق تابش کے نام سے کیا تھا۔ ☆ محمد احمد رمز کا ابتدائی نام رمز سیتا پوری تھا۔ ☆ عقیل احمد شاداب شمارہ (۵۶) کے بعد عقیل شاداب کے نام سے شائع ہوئے۔ ☆ محمد عابد علی عابد شمارہ (۲۷۰) سے قبل محمد عابد علی کے نام سے لکھتے تھے۔ ☆ جمیل الرحمن جمیل شمارہ (۱۸۴) سے پہلے جمیل الرحمن تھے۔ ☆ حسین الحق نے شاعری کے لیے اپنا تخلص حسین اختیار کیا۔ ☆ شاہین اپنے ابتدائی دور میں شاہین غازی پوری کے نام سے لکھتے تھے۔ ☆ اختر یوسف کا نام شمارہ (۴۴) سے قبل یوسف اختر تھا۔ ☆ خالدہ حسین نے افسانہ نگاری کی ابتدا خالدہ اصغر کے نام سے کی تھی پھر خالدہ اقبال کے نام سے بھی چند افسانے لکھے۔ ☆ جتیندر بلو نے افسانہ نگاری کا آغاز بلو بیدل کے نام سے کیا تھا۔ ☆ آصف فرخی کا ابتدائی نام آصف اسلم تھا۔ ☆ انور سین رائے کا ایک افسانہ اندر سین رائے کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ☆ جعفر عسکری کا ایک افسانہ جعفر عباس کے نام سے بھی شائع ہوا ہے۔ ☆ سارا شگفتہ کی چند نظمیں شگفتہ افضال اور شگفتہ احمد کے نام سے بھی شائع ہوئی ہیں۔ ☆ ناہید ثانی کے نام سے شائع نظمیں محمود ہاشمی کی لکھی ہوئی ہیں۔ ☆ جمیل ملک پہلے جمیل یوسف کے نام سے لکھتے تھے۔

ان کے علاوہ قلم کاروں کے نام جو مختلف اشاعتوں میں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ شائع ہوئے، اس طرح ہیں۔ احتشام حسین / سید احتشام حسین، اکبر علی خان / عرشی زادہ / اکبر علی خان عرشی زادہ، رضوان احمد بارہ بنکوی / رضوان احمد، ع رشید / عین رشید، عقیل احمد / عقیل احمد صدیقی، کیف احمد / کیف احمد صدیقی، حرمت الاکرام / سید حرمت الاکرام، ابوالحسنات حقی / سید ابوالحسنات حقی، سعید المظفر چغتائی / مرزا سعید المظفر چغتائی، فضل المتین / سید فضل المتین، امین اشرف / سید امین اشرف، عبدالحکیم شاکر / حکیم شاکر، لطیف حزیں / لطیف، کبیر احمد صبا جائسی / صبا جائسی، مجیب الرحمٰن / سید مجیب الرحمٰن، شمس الحق / شمس الحق عثمانی، ظفر صدیقی / ظفر احمد صدیقی، نور الہدیٰ / نور الہدیٰ سید۔

اصناف کے اعتبار سے قلم کاروں اور شائع شدہ تخلیقات کا اجمالی خاکہ اس طرح ہے۔

حصہ نثر میں (۲۳۸) مضمون نگاروں کے (۱۴۱۷) مضامین، (۲۸۲) افسانہ نگاروں کے (۱۰۸۹) افسانے، (۱۵) ڈرامانگاروں کے (۲۰) ڈرامے، (۶) ناول نگاروں کی (۶) ناولیں، (۶) سفرنامہ نگاروں کے (۷) سفرنامے، (۵۵) مبصرین کے (۶۷۴) تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ (۲۰) انٹرویوز (۱۵) مباحثے / مذاکرے، (۱۵) رپورتاژ، (۵) شخصیتوں کے خطوط، تفہیم غالب کی (۱۰۴) اور شعر شور انگیز کی (۱۰) قسطیں بھی شائع ہوئی ہیں۔

حصہ نظم میں (۶۵۰) شعرا کی (۱۴۷۷) غزلیں، (۵۱۹) نظم نگاروں کی (۳۶۴۲) نظمیں، (۱۳) شعرا کی (۱۷۱) رباعیاں، (۷) شعراء کی (۱۲) آزاد غزلیں، ان (۲۹۰) شماروں میں شائع ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ (۲) مسلسل غزلیں، ایک ایک نثری اور مربع غزل، (۱۵) قطعات، (۳) قطعات تاریخ، (۵) مرثیے، (۱۰) خمسے، ایک آزاد مثنوی، ایک سانیٹ، (۴۳) دوہے اور (۶) ثلاثیاں بھی شامل اشاعت ہیں۔

تراجم کے باب میں (۱۴۸) مترجمین کے (۵۸) مضامین، (۱۰۹) افسانوں، (۱۵) ڈراموں، (۹) انٹرویوز اور (۵۸۴) نظموں کے تراجم شائع کیے گئے ہیں۔

''شب خون'' کے قلم کاروں اور قارئین سے ادباً التماس ہے کہ انہیں درج بالا اشاریہ میں کسی طرح کی کوتاہی یا خامی نظر آئے تو از راہ کرم نشاندہی فرمائیں تا کہ کتاب کی اشاعت کے موقع پر اس کی تصحیح کی جا سکے ☆☆☆

چار قدیم تامل نظمیں

کچپیٹونا ک ایار، اوکور ماچاتی، وینمانی پوتی، **ترجمہ:** باراں رحمٰن

نظم

کچپیٹونا ک ایار

میرا محبوب، سفید جھوٹ بولنے سے جسے کوئی عار نہیں
رات کو میرے پاس سویا
ایک خواب میں جو
سچ کی طرح کا جھوٹ تھا

میں جاگی، اسی دھوکے میں مبتلا
اور بستر پر میں نے محبت سے ہاتھ پھیرا
میں سمجھی، وہ میرا محبوب ہے

کیسا بھیانک غم ہے یہ،
میں گھل رہی ہوں
تنہائی میں
جیسے کنول کا پھول جسے پانی کا کیڑا کھائے جا رہا ہو

لڑکی کے بول

اوکور ماچاتی

بارشوں نے، جو ابھی سے پرانی پڑ گئی ہیں
کھیتوں میں نئی کونپلیں لگا دی ہیں
گھاس کے نکیلے نیزے: آہوؤں نے
انھیں تراش تراش کر کند کر دیا ہے

جنگلی بلی کی ہنسی کی طرح
چنبیلی کی بیل کی نازک پھول کٹوریوں سے
کلیاں جھانک رہی ہیں

منڈلاتی ہوئی شہد کی مکھیوں کے لئے
چنبیلی کے دیس میں شام آ گئی،
پر دیکھو، وہ ابھی تک واپس نہیں آیا

اس نے مجھے چھوڑ دیا اور چلا گیا
مال و دولت کی کھوج میں

کپیتونتاک ایّار، اوکورماچاتّی، وِنتمانی پوٹی، ترجمہ: باراں رحمٰن

اس کی سہیلی نے اس سے جو کہا

اوکورماچاتّی

چلو اس جھاڑی کی طرف چلیں جو چنبیلی کی قبا اوڑھے ہوئے ہے، اور
دیکھیں:
وہ شام کو بیلوں کے ساتھ گھر لوٹتی ہوئی
جی بھر کے چارہ کھا کر آسودہ جانوروں کے گلے کی گھنٹیاں ہی ہیں

یا یہ اس کے رتھ کی گھنٹیاں ہیں
جو جنگلی راہوں کی مرطوب ریتیلی زمین
پر سے گذرتا ہوا چلا آتا ہے،
بخوبی انجام دیئے ہوئے کام کی مباہات دل میں لئے
ہمراہ اس کے نوجوان تیر انداز؟

جو اس نے اپنی سہیلی سے کہا

وِنتمانی پوٹی

دھرتی سے بھی زیادہ عمر رسیدہ
سمندروں کے دھوئے ہوئے ساحلوں پر
چڑیوں کے چہچہوں سے بھرے ہوئے درختوں کے جھرمٹ تلے
پھولوں سے لدے ہوئے پنّئی کے درختوں
کی چھاؤں تلے ندیوں کے کناروں پر
جب ہمارے بدن ایک ہوئے
میری آنکھوں نے اسے دیکھا
اور میرے کانوں نے اسے سنا
اس کے بازوؤں میں الجھے ہوئے میرے بازو
خوبصورت ہو جاتے ہیں اور اس سے
الگ ہوتے ہی کمہلا جاتے ہیں
تو اس کا میں کیا مطلب نکالوں؟

آئرینا راتوشنسکایا، ترجمہ سلیم الرحمٰن

زمین کے لئے ایک دعا

ہر سال اپنے رنگ اگاتی زمیں رہے
سورج، ہوا، یہ چاند سمندر یہیں رہے
کھلتی ہوئی کلی کا بدن نور ہی ڈھلے
ہر جھومتے شجر کی ہری آستیں رہے
اڑتے رہیں ہواؤں میں بادل کے بادباں
نیلے سمندروں میں گہر تہ نشیں رہے
کرتی رہے سفر تاروں کی روشنی
ہر شب کی آنے والی سحر کا یقیں رہے
سر پر تنی رہے یونہی چادر ہواؤں کی
مٹی میں پھلتے بیج کی خوشبو مکیں رہے

ایک اجنبی درخت

تجھے لوٹا رہا ہوں
زندگی کا ذرہ ذرہ
عمر کی شاخوں سے جھڑتے پھول
سوکھے ہاتھ
مرجھائی رگیں
مدتوں سے
میں نے تیرے آتے جاتے موسموں کے رنگ پہنے
بادلوں کا رس پیا
روشن ہوائیں جسم نہلاتی رہیں
میرے خوابوں کی جڑوں کا
تیرے ٹھنڈے زرد سینے سے کوئی رشتہ نہ تھا

میں لکھوں گی

میں شعر لکھوں گی
ان مغموم لوگوں کے لئے جو ساحل پر ہی رہ گئے
ان لوگوں کے لئے جنھیں چپ رہنے کی سزا دی گئی
اور جو کچھ بھی لکھوں گی
اسے جلا دوں گی
میرے لکھے ہوئے مصرعے ہوا میں اڑیں گے
ہوا کے تیز جھکڑ کے زور سے
لامتناہی خلا میں جا گریں گے
یہ آگ مجھ سے بھی دور جا پہنچے گی
لیکن سمندر کی اس خاکستری جھاگ سے کچھ بھی نہیں پیدا ہوگا

آئرینا راتوشنسکایا، ترجمہ سلیم الرحمٰن

مسافر

مسافر، اس شہر کا پانی مت پینا
اس کی مٹھاس میں بہار کا ذائقہ
تمھیں ہمیشہ کے لئے اپنی محبت میں گرفتار کر لے گا
اس شہر میں ذرا بھی سستانے کے لئے سر جھکاؤ گے
تو وقت یہاں
برسوں کے لئے رک جائے گا
ابھی تمھارا راستہ طے نہیں ہوا
اس شہر کے مہرباں گھروں کی مہمان نوازی میں
اپنی منزل مت بھول جانا
دھول میں اٹی ہوئی پگڈنڈیوں کو یاد رکھنا
سنو، اس شہر کی خاموشی کو،
یہاں سے فرشتے بھی اڑ چکے ہیں
یہاں پیڑوں کے جھنڈ تلے کسی نسوانی ہاتھ کو بوسہ مت دینا
بہار کے موسم کا خیال آتے ہی ڈر جانا
اپنے ماتھے پر اپنی منزل کا نشان ہمیشہ نقش رکھنا
اپنے ہونٹوں کو تشنہ ہی رکھنا
مسافر
اس شہر سے محبت نہ کرنا

ایک نظم

ہوا نے پھیلا دیے ہیں بازو
زمیں کا چہرہ بدل گیا ہے،
نئی بشارت کا مرحلہ ہے،
مگر ابھی تک
ہمارے گھر میں وہی تصور کی مفلسی ہے
گئے زمانوں کی تیرگی ہے
خموش ماضی کے گنبدوں میں
سوچ محبوس، پھڑپھڑاتی ہے، سر پٹکتی ہے
اک دریچے سے دوسرے تک بھٹک رہی ہے
کوئی تو نیلے کبوتروں کو نئی فضا کی اڑان دے دے
کوئی تو ان زرد فاختاؤں کو دور کا آسمان دے دے

شہر اور سورج

کھڑکیوں پر جھکنے والا آسماں بدرنگ ہے
سوکھتی شاخیں
جلے دن کا دھواں، بجلی کا تار
سر جھکائے بیٹھنے والے پرندے۔
شہر اور سورج کی اس برسوں پرانی جنگ کا انجام
گہری خامشی
شام کی دہلیز پر سب کو سسکتا چھوڑ کر
وہ اندھیرے غار میں اب چھپ گیا ہے
ہم لڑائی میں ہمیشہ ہارنے والے سہی
پھر بھی روشن دن کی خواہش ہی لئے
زخم پر مٹی ملیں گے
رات بھر میں جی اٹھیں گے
وہ دہکتی آنکھ، اپنے ہاتھ میں نیزہ لئے
شہر کے رستوں پر ریزہ ریزہ کر کے
پھر ہمیں بکھرائے گا

نام یاد نہیں

گوپی ناتھ مہانتی، ترجمہ: کرامت علی کرامت

اچانک ایک دن صبح آٹھ بجے اشوک نے محسوس کیا، اس کی یادداشت کچھ گڑبڑا گئی ہے۔ نام یاد نہیں رہتا۔ اشوک مہذب سماج کا ایک معزز فرد ہے۔ باہر نکلنے سے شہر کی شاہراہوں اور گلیوں میں دن بھر میں کم از کم چھ بار اس سے ملاقات ہوگی۔ کبھی بڑی تیز رفتاری سے اپنی پرانی ہرکیولیس سائیکل پر سوار ہوکر بھیڑ کو چیر کر آگے نکل جاتا نظر آئے گا۔ صحت مند، خوبصورت ہٹا کٹا نوجوان، سائیکل چلانے میں خوب ماہر، سائیکل کے پرانے ہینڈل پر چمکتی ہوئی گول گھنٹی، گھوڑے گاڑی کی گھنٹی کی طرح اس سے آواز نکلتی ہے۔ ڈھن ڈھن۔ کہیں پان کی دکان سے وہ سگریٹ کا پیکٹ خریدتا ہوگا۔ جس وقت چند دوست نصف راستہ گھیرے ہوئے اپنی اپنی سائیکلوں پر جھکے ہوئے ملک کے مختلف مسائل پر بآواز بلند تبصرہ کرتے ہوں گے، اس وقت وہ اپنے گول چہروں کی تتلی جیسی مونچھوں کے نیچے دانت کی ریخوں سے سگریٹ کا دھواں اس طرح آہستہ آہستہ چھوڑتا ہوگا کہ اسے دور سے پہچانا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ اپنے ہم عصروں میں نسبتاً زیادہ دراز قد کا مالک تھا اور اس کا سینہ چوڑا تھا۔ کہیں وہ سائیکل کو پکڑے ہوئے جسم کو سیدھا کر کے دوستوں کے گروہ کے ساتھ مارچ کرنے کے انداز میں چلتا ہوگا۔ راستے کے بیچ سے، راستے کے کنارے سے، گھر کے برآمدے یا چلتی ہوئی گاڑی سے آواز آئی، ''نمسکار اشوک بابو، نمسکار، نمسکار۔'' لہٰذا اگر ایک ایسے شخص کی یادداشت میں اتنی کمزوری آجاتی ہے کہ اسے نام یاد نہیں رہتا تو اس کے حق میں مشکلات کا سامنا کرنا یقینی ہے۔

البتہ اس کی یادداشت میں کوئی اور فرق نہیں آیا ہے، صرف نام بھولنے کے سوا۔ اپنے ماحول کے بارے میں وہ کلیتہً باشعور ہے۔ اس کے ٹیکنکل علم میں ذرا بھی کمی نہیں آئی ہے۔ پہلے کی طرح وہ چلا رہا ہے وکالت کا پیشہ، معمولی خرید و فروخت کا سلسلہ، سی سی، بحث و مباحثہ۔ علاوہ ازیں اس نے تمام ناموں کو بھی بھلایا نہیں ہے۔ مثلاً پہاڑ کا نام ہمالہ، ملک کا نام ہندوستان، ندی کا نام کاتھ جوڑی، اسی طرح ملک کی مقتدر ہستیوں کے نام۔ بات نکلے تو اخباروں میں چھپنے والے ناموں کی تفصیل یاد ہے۔ وہ کھیرا اور کھارے ان دونوں کے بارے میں الگ الگ سب کچھ کہہ سکتا ہے۔ اسی طرح کریاپا اور کمارپا کے بارے میں بھی۔ لیکن وہ بھول جاتا ہے عام لوگوں کے نام، نہایت جانے پہچانے لوگ، دوست احباب۔ ان میں سے کوئی ہم جماعت ہے تو کوئی ہم پیشہ، کسی سے اس نے قرض لیا ہے، تو کسی کے پاس اس کی واجب الادا رقم باقی پڑی ہے، ایسے ہی روزمرہ کے تعلقات کے لوگ، جن کے بارے میں وہ سب کچھ جانتا ہے۔ اس کے حق میں وہ لوگ نہ کھیرا ہیں نہ کھارے ہیں، نہ ہمالہ ہیں نہ ہندوستان، بلکہ سانس کے ذریعہ اندر جانے والی ہوا اور تشنگی بجھانے والے پانی کی طرح روزمرہ کے لوگ، لیکن ان کے نام یاد نہیں رہتے۔

صبح کے آٹھ بجے ہیں۔ ساگ بیچنے والا بوڑھا آیا ہے۔ چائے پیتے ہوئے اشوک نے آنکھیں اٹھا کے دیکھا۔ سر پر فرسودہ کپڑے کی دستار، سینے کے بال سفید، پیٹ میں اکزیما کا نشان۔ یہی تو ہے وہ۔ کیا نام ہے اس کا؟ کوپیا؟ مدھوا؟ جگوا؟ نہیں۔ اس بوڑھے کی ایک لڑکی اپنے شوہر سے الگ ہوگئی ہے۔ ایک دن بوڑھے نے اسے کہا تھا: ''بابو، ذرا میری بات بوجھو گے نہیں؟ اپنے گھر سے میری بیٹی کو نکال دیا، ایک اور عورت کو لے آیا ہے۔ ادھر اس کی پانچوں بیٹیاں تھی میں در سر کڑھائی میں ہے ادھر یہ بھوک سے تڑپ رہی ہے۔ اس کے کان مروڑ کے تم نان و نفقہ وصول کر دیتے بابو، تو تمھارا نام بھی رہ جاتا اور بوڑھا دعائیں بھی دیتا۔''

''اچھا ٹھیک ہے، تیرے ساتھ تیرے گھر کو جاؤں گا۔ لڑکی سے ساری باتیں سن کر کوئی صورت نکالوں گا۔''

وہ اس کے ساتھ گیا تھا۔ تمام باتیں اس کے ذہن میں اب تک محفوظ ہیں۔ بھگوان بے توجہی میں سڑنے کے لئے اتنے طریقے تشکیل کرتا ہے؟ ایک ان پڑھ عام انسان کے دل میں اتنی ہوشیاری اور اتنی تخلیقی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے؟

اس طرح سال بھر تک ان لوگوں سے اس کا رابطہ برقرار رہا۔ نتیجہ:

خوراک، پوشاک کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ لڑکی نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ بوڑھا پھر بھی ساگ بیچنے میں مصروف ہے۔ اس لڑکی کا خیال ابھی تک اس کے ذہن سے محو نہیں ہوا۔ لیکن اس کا نام کیا تھا؟ اوما، رما، ملی؟ کچھ یاد نہیں۔

''ارے او بوڑھے!''

نام پوچھے گا؟ نہ جانے یہ بوڑھا کیا سوچنے لگے گا! زرق برق لباس والے تمام بابوؤں کا دل یکساں ہے۔ دور از نظر، دور از دل۔ اتنی محبت و شفقت، اتنے دنوں کی خوش آئند یادیں تحت الشعور میں اب بھی تر و تازہ ہیں۔ سوچنے پر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اس کے باوجود اس کا نام یاد نہیں آ رہا ہے۔ وہ دل ہی دل میں سوچتا ہے، نام پوچھنے سے بوڑھا معاف نہیں کرے گا۔ اپنی پہلی دھنسی ہوئی آنکھیں پھاڑ کے اس کی طرف اسی طرح دیکھے گا جس طرح اس کے داماد کا ذکر آنے پر دیکھتا تھا۔

''کیا کہتے ہو، بابو؟''

بات کو گھما کے ماضی کی یادوں میں تیرتے ہوئے بے توجہی سے اشوک نے کہا

''پوچھتا ہوں، کیا تو آمڑا بیچنے لایا ہے؟''

''آمڑا؟ آمڑا تو میں کبھی نہیں لاتا بابو۔ اس موسم میں آمڑا کہاں سے آئے گا؟ اس وقت پیڑوں میں کچا پھل بھی نہیں نکلا ہوگا۔''

متعجب ہو کر بوڑھا دیکھنے لگا۔ اشوک اٹھ کے گھر کے اندر چلا گیا۔

اس وقت سے وہ اسی ادھیڑ بن میں لگا ہوا ہے، نام یاد نہیں رہتا۔ صرف آج ہی نہیں۔ اسے محسوس ہوتا ہے چند دنوں سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ کل شام کو کسی پارٹی میں ایک مہمان سے کسی دو خواتین کو ان کے شوہروں کے تعلق سے متعارف کراتے ہوئے نام الٹ پلٹ کر دیئے تھے۔ ''یہ ہیں مسز وشوناتھم، یہ ہیں مسز پرچھیتم۔'' مسز وشوناتھم نے اس کے منہ پر ہی ٹوکا تھا۔ ''آپ غلط بتا رہے ہیں، مسز پرچھیتم وہ ہیں۔'' مہمان نے نہیں کر کے اس کی طرف دیکھا تھا، جیسے وہ کم علمی کے نتائج سمجھانا چاہتے ہوں۔

اس کے بعد آج صبح اس بوڑھے کا واقعہ۔

صرف یہی نہیں، راستے پر نکلنے سے جانے پہچانے لوگوں کو دیکھ کر ان کے نام سوچنے لگتا ہے، غور کرتا ہے، لیکن نام یاد نہیں آتا۔ جتنا زیادہ وہ سوچتا ہے اتنا ہی زیادہ غلطی کر بیٹھتا ہے۔ سامنے کھڑے ہیں مادھب بابو۔ پان خرید رہے ہیں۔ پانچ ماہ قبل دو کتابیں پڑھنے کے لئے لے گئے تھے، ابھی تک ان کے درشن نہیں۔ اشوک چلانے لگا ''شنکر بابو، او شنکر بابو'' مادھب بابو سنتے نہیں ہیں، بلا تکلف پان خرید رہے ہیں۔ ''غلطی سے تم نے کتھا دے دیا ہے۔ ایک اور پان بناؤ۔ دیکھو، اس میں چوگندی نہ ڈالنا۔'' بار بار شنکر بابو، شنکر بابو، بلانے پر بھی اس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ اشوک ان کے قریب پہنچتے پہنچتے انھوں نے پان خرید کے سائیکل پر پیر رکھ دیا تھا۔ آگے جا کر اشوک نے کہا: ''آپ کو اتنا بلانے سے بھی آپ سنتے نہیں ہیں۔ کیا بہت زیادہ مصروف ہیں؟'' ہنستے ہوئے مادھب بابو نے کہا: ''مصروفیت کی بات نہ پوچھئے جناب۔ آپ کی طرح آزاد انسان ہوتا تو کیا بات تھی؟ خیر جو بھی ہو، بہت دنوں کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔ خیریت تو ہے؟''

''ہاں، چلتی کا نام گاڑی ہے۔'' اشوک نے کہا، ''آپ کو بار بار پکارنے پر جب جواب نہیں ملا، میں نے سوچا کہ آپ مجھے بھول گئے ہیں۔''

''مجھے بلا رہے تھے آپ؟''

''ہاں، خوب زور سے۔''

''تعجب کی بات ہے۔ میرے کان دونوں کہاں تھے؟ ابھی تو سن رہا تھا ایک شخص ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے اعلان کر رہا تھا کہ میونسپلٹی کے احاطے میں گائے وغیرہ گھس جانے سے انھیں کانجی ہوس میں بند کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد ایک سبزی والا چلا رہا تھا، 'تروئی والا، تروئی والا'۔ ہاں، بھول رہا ہوں۔ کوئی شخص 'شنکر بابو، شنکر بابو' زور سے چلا رہا تھا۔ شاید پیچھے دکان ہے پان والے شنکر بابو کی، اسی کو بلاتا ہوگا۔ آج کل تو سبھی بابو ہیں۔ مجھے کب آپ نے بلایا؟''

اشوک کے چہرے سے پسینے چھوٹنے لگے۔ معلوم ہوا کہ یہ شنکر بابو نہیں ہیں۔ ان کا نام کچھ اور ہے۔ ''چھوڑیئے''، وہ بولا۔ ''میں تو چیخ نہیں رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بلا رہا تھا۔''

''تب بھی میں سنوں گا نہیں کیسے؟ کان میں خالص سرسوں کا تیل ڈالتا ہوں جناب۔ ذرا پھر سے پکاریئے، سنیں کیسے پکار رہے تھے؟''

''رہنے دیجئے۔ خیر آپ تو کان میں سرسوں کا تیل ڈالتے ہیں، ناک میں نہیں۔ لیجئے سگریٹ۔ ہاں، آپ نے دونوں کتابیں پڑھ لیں؟''

''کون سی کتابیں؟ بولئے۔''

پھر آفت آ گئی۔ کتابوں کے نام یاد نہیں۔ ''وہی دو کتابیں جو مجھ سے لے گئے تھے۔ اگر ختم ہو گئی ہوں تو واپس کر دینے سے اچھا ہوتا۔ اگر آپ نے انھیں نہ پڑھا ہو تو سات آٹھ روز رکھ رہئے۔ اس سے کیا فرق پڑے گا؟''

''بڑے تعجب کی بات ہے۔ اشوک بابو آپ یقین کیجئے، میں نے آپ سے کوئی کتاب نہیں لی ہے۔ ذرا کتابوں کے نام بتایئے۔ تمام کتابیں تو باہر کے کمرے کی الماری میں رہتی ہیں۔ میں تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''چھوڑیئے، آپ کسی دوسرے کام سے جا رہے ہیں، نام بھول جائیں گے۔ آپ کس وقت گھر پر موجود ہوں گے، بتایئے نہ۔''

''آج تو چھٹی ہے۔ ابھی بازار جا رہا ہوں۔ واپس ہو کر گیارہ بجے کے بعد ہمیشہ گھر پر موجود رہوں گا۔ آپ آیئے۔ خود تلاش کیجئے گا۔ شاید آپ کو کتاب مل جائے۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے، کتاب نہیں ہے۔ میں کوئی کتاب لایا ہی نہیں تو پھر رہے گی کیسے؟ آپ ذرا اچھی طرح یاد کیجئے۔ اجازت دیجئے، نمسکار۔''

اس کے چلے جانے کے بعد اشوک بہت دیر تک اس کی پشت کی جانب دیکھتا رہا۔ اسے غصہ آیا۔ انسان ایسا بھی جل دے سکتا ہے؟ دنیا کے اس طور طریقے پر کبیدہ خاطر ہو کر وہ چلا جا رہا تھا کہ اس کی بے خیالی ''اشوک بابو، اشوک بابو'' کی پکار سے ٹوٹی۔ بڑے اشتیاق کے ساتھ دونوں ہاتھ آگے بڑھائے ہوئے

ایک دوست۔ چلے آتے نظر آئے۔ سبز رنگ کا ہوائی شرٹ، خاکی پینٹ، سر پر بھورے رنگ کا فیلٹ کیپ، ہاتھ میں چمڑے کا ہینڈ بیگ۔

"ہلو، ہلو، یوسی، یوسی، اشوک بابو، کیسے ہیں؟ دنیا کی خبر کیا ہے؟ ہاؤ ڈو یو ڈو؟ سب کچھ خیریت ہے نہ؟" بالکل یاد نہیں آرہا ہے کہ یہ صاحب کون ہیں۔ لیکن لگتے ہیں نہایت جانے پہچانے۔ اشوک نے اپنے ذہن پر بہت زور ڈالا کہ یہ کون ہوسکتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا۔

ادھر اس دوست نے خاکی پینٹ کی پاکٹ سے سگریٹ کا ٹن نکالا اور پوچھا" کیسے ہیں؟ یوسی۔ بہت دن کے بعد ملاقات ہوئی۔ ہیوودن۔ اور بتایئے، سب خیریت ہے نہ؟"

یہ آدمی کون ہے؟ اس کی باتوں سے نہایت اپنا پن ظاہر ہے۔ لباس، بات چیت کے انداز، چہرے مہرے وغیرہ سے اشوک نے قیاس کیا: یہ غالباً اے سی ایس او ہوں گے جن کا تقرر گڑجات علاقے میں ہوا ہوگا۔ سی ایس او بھی نظر نہیں آتے اور سپروائزر بھی نہیں۔ یقیناً اے سی ایس او ہوں گے۔ لیکن یکا یک اس نتیجے کا قیاس کرلیتا، اور پھر اس کے ذہن میں ہیجان برپا ہوتا۔ اس کے بعد وہ سوچتا۔ یہی ٹھیک ہے، یہی ٹھیک ہے۔

"آپ پہلے اپنی کہئے۔ بہت دنوں کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔"

"ہاں، چل رہا ہے۔ کچھ خراب بھی نہیں، یوسی۔"

"ویسے تو چلتا رہے گا۔ اور بتایئے۔"

"یوسی۔ فادران لا اکسپائر کر گئے۔"

"ایسا تو ہونا تھا، بوڑھے ہو گئے تھے۔"

"واٹ ڈو یو مین، بوڑھے! پینتالیس سال کے انسان کو آپ بوڑھا کہتے ہیں؟"

"بوڑھا تو آج کل سب کو کہا جاسکتا ہے جناب۔ دنیا کی جو حالت ہے، اس میں نہ خالص تیل ملتا ہے نہ خالص گھی۔ پانی ملا ہوا دودھ پینے پر صحت بھی خراب ہوتی ہے۔ تنگ دستی کے بارے میں سوچتے سوچتے دل ٹوٹ جاتا ہے۔ البتہ وہ فکر آپ کی نہیں ہے۔"

دوست جیسے اس پر گفتگو کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ بولے:

"چھوڑیئے، ہم لوگ زیادہ پرسنل ہو جا رہے ہیں۔ یوسی۔"

"اچھا، اس بار ہم لوگ امپرسنل ہوں گے۔ آپ کا کام کیسے چل رہا ہے؟"

دوست ہنس کے بولے۔" ہم لوگوں کا کام آپ اخبار سے دیکھتے ہوں گے۔"

"دیکھتے تو ہیں۔ پھر بھی! آپ کیا سوچتے ہیں؟"

دوست منہ سکوڑ کے سنجیدہ انداز میں بولے۔" کام جیسے چلتا ہے چلتا رہے گا۔ میں اور سوچوں گا کیا؟"

"آپ کے کلکٹر کیسے ہیں؟"

"کلکٹر؟ واٹ ڈو یو مین؟ یوسی۔ کون سے کلکٹر؟"

یکا یک اشوک کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس کو محسوس ہوا کہ یہ شخص اے سی ایس او نہیں۔ تو یہ کیا کوئی معمولی آدمی ہے؟ نہیں، کوئی انشیورنس کا بابو ہوگا۔ "ہم لوگوں کا کام آپ اخبار میں دیکھتے ہوں گے۔" ہاتھ میں پیسے کا بیگ۔ پھر اوپر سے حملہ یعنی سگریٹ پیش کرنا، مختلف قسم کی باتوں کا پھندا۔ کافی وقت ہو چکا ہے۔ اشوک بیزار ہو کے بولا:" معاف کیجئے گا جناب، آپ کا نام کیا ہے؟ مجھے بالکل یاد نہیں آتا۔"

دوست منہ لمبا کر کے سوسو کی آواز نکال کے دومنٹ تک سگریٹ کا کش لینے لگے۔ اپنی بڑی بڑی آنکھیں اشوک بابو کے چہرے پر جمائے ہوئے تھے۔ بولے،" گڈ ہیونس۔ یوسی۔ تعجب کی بات ہے۔ بھول گئے؟ آپ کے چھوٹے بھائی کو میں ایک سال تک ٹیوشن کرتا تھا۔"

"اسے تو کئی لوگ پڑھا رہے تھے۔"

"ہم لوگوں نے ایک ساتھ لا کا امتحان دیا تھا۔"

"ویسے تو کم از کم ڈھائی سو طلبا نے امتحان دیا تھا۔"

"آپ کے والد صاحب کے ساتھ میرے اتنے گہرے تعلقات تھے۔"

"میرے والد صاحب کے احباب کی تعداد سننے سے آپ کو تعجب ہوگا۔"

"اس کے بعد تو کئی بار ہم لوگ کچہری میں ایک دوسرے سے ملے ہیں۔ کیا آپ کہہ رہے ہیں؟ کچھ یاد نہیں؟"

ان کی خودداری توہین کی آگ میں جل کر چیخ رہی ہے۔ لیکن ادھر اشوک کی بیزاری بھی بڑھتی جارہی ہے۔

سائیکل کو ذرا آگے گھسیٹتے ہوئے اس نے کہا،" جناب، لمبی چوڑی کہانی کو مختصر کر کے کہئے، آپ کا نام؟"

"او آئی سی۔" دوست نے کہا۔" میرا نام نیل، دھب داس۔ آئی اے ایس ہونے کے بعد فی الحال کشمیر میں کمشنر ہوں۔ فادران لا اچانک اکسپائر کر گئے تو میں چھٹی میں آیا تھا یوسی۔ تب آپ بھول گئے ہیں۔ خیر آپ کی مہربانی۔ نمسکار۔"

اشوک شرم سے کانپنے لگا۔ بولا" اوہ! اتنے روز و شب ایک ساتھ گذرے۔ آپ آلو چپ کھانے کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس لئے پارک ہوٹل۔ نرئی بابو... اور۔ چھوڑیئے... سب کچھ یاد ہے جناب۔ آپ کو بھول سکتا ہوں؟ آپ کو یہ جان کر افسوس ہوگا کہ میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ کیا کروں گا، کہئے۔"

لیکن دوست نے جیسے یقین نہیں کیا۔ مڑ کے بولے۔" ٹھیک ہے، نمسکار۔"

"کشمیر پہنچ کے خط لکھئے گا۔"

دوست سنی ان سنی کر کے چلے گئے۔

اس کے بعد راستے میں ہر روز کی طرح چاروں طرف سے" نمسکار، نمسکار"،" کیا اشوک بابو، کیسے ہیں؟" حسب عادت اس کی طرف سے بھی نمسکار کا جواب اور سکھ دکھ۔ لیکن آج وہ نام ڈھونڈتا ہے، نام پتا نہیں ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ اتنے تعلقات، اتنے دنوں تک ہنسی خوشی سکھ دکھ کے ساتھ زندگی کا سفر۔ پھر بھی ان کے نام یاد نہیں آرہے ہیں۔ یہ خدشہ ہے کہ اگر یہی صورت حال جاری رہی

تو وہ "ک" کو "ب" کہہ دے گا۔ اس کو کسی کو بلانا ہو تو وہ نام نہیں پکارتا، بلکہ "ارے"، "او"، "جناب"، "رے" سے مخاطب ہوتا۔

اسے اپنی دونوں کتابیں حاصل کرنی ہوں گی۔ یہی مکان ان صاحب کا ہے نہ کیا؟ دنیا میں انگنت لوگ بستے ہیں، لیکن ہجوم کے سائے کے بغیر فرد آگے بڑھ نہیں سکتا۔ ایک جیسے سارے انسان، ایک ہی قسم کے عناصر سے سبھی گڑھے ہوئے، اقتدار و اختیار ہی میں باہمی فرق ہے۔ اسی لئے کہاوت ہے:

"جتنے بھائی اتنے گھر، جتنی کنیائیں، اتنے ہی بر۔" پھر بھی نام یاد نہ رکھنے سے کام چلے گا کیسے؟ نام تو بہر حال یاد رکھنے ہوں گے، چاہے جتنا بھی براہمی گھی، ٹانک یا جتنی بھی دواؤں کی ضرورت ہو، اسے استعمال کرنا ہوگا۔ نہیں، اس تیز رفتار دنیا میں ہجوم کے ساتھ فرد کی ڈور بندھی ہوئی ہے، اس کو کسی نہ کسی طرح اٹوٹ رکھنا ہوگا۔ لیکن یہ سوچتے، سوچتے اس کی یاد ڈگمگاتی جا رہی ہے۔ اس کی ذات پہ مرکوز انا کی شدت بھاپ کی طرح اڑتی جا رہی ہے۔ سامنے ان صاحب کا مکان ہے نہ کیا!

متجسس نگاہیں ادھر ادھر دوڑا کر اشوک سوچنے لگا، نام کیا ہے؟ کیا نام ہے ان کا؟ کسی نہ کسی طرح وہ دونوں کتابیں ان سے حاصل کرنی ہوں گی۔ خیال آیا، شہر کی معزز ہستیاں ہیں یہ لوگ، کتابیں مانگ کے لے کر بھول جانا ہی ان کی عادت ہے۔ اس دفعہ دبے رہنے سے ذاتی جائداد کا تحفظ بھی ناممکن ہے۔ اس لئے...

شدید سوچ میں ڈوب کر اشوک بھول گیا کہ بڑے شہروں میں کسی کے گھر کو جا کر پکارنے کے لئے گھر والے کا نام یاد رکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ صرف "بیرا" یا "پجاری" پکارنا کافی ہوتا ہے۔ اس کے بعد کھلے بدن میں لنگی پہنے ہوئے خود گھر کے مالک بیرا یا پجاری کی شکل میں آ کر پوچھیں گے۔ "بتایئے، کسے ڈھونڈ رہے ہیں؟"

سائن بورڈ نظر آ رہا ہے۔ انگریزی میں لکھا ہوا ہے "ایم۔ سی۔ مہانتی۔" اشوک نے اطمینان کی سانس لی اور ہنس کے اسی طرف دیکھنے لگا۔ نام جیسے یاد نہیں آ رہا ہے۔ زبان کی نوک پہ رہ کے بھی جیسے گم ہو جاتا ہے۔ ایم۔ سی۔ منیش چندر، موہن چرن۔ اچانک جیسے تاریکی سے روشنی پھوٹی۔ ٹھیک.. بالکل ٹھیک 'مارکنڈ چرن۔ یوریکا! بڑی خود اعتمادی اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی آواز میں انفرادیت کی جگمگاہٹ انڈیل کر وہ چیخنے لگا: "مارکنڈ بابو، او مارکنڈ بابو۔ مارکنڈ بابو گھر میں ہیں؟"

اندر کے جھروکے سے ایک خاتون کا چہرہ نظر آیا۔ وہ متعجب نگاہوں سے دیکھتی رہیں جیسے اندر کسی سے کچھ کہہ رہی ہوں۔ ایک شخص باہر نکلا اور بغیر کسی ابتدائیہ کلام کے بولا۔ "یہاں مارکنڈ وارکنڈ کوئی رہتے نہیں ہیں، آگے دیکھئے۔"

"کیا؟ یہ مارکنڈ بابو کا مکان نہیں ہے؟ میں کیا مارکنڈ بابو کا مکان پہچانتا نہیں ہوں؟ جاؤ، کہہ دو، اشوک بابو بلا رہے ہیں۔"

"کون مارکنڈ بابو جناب؟ آپ غلطی کر رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا نہ کہ یہاں اس نام کا کوئی رہتا نہیں ہے۔ جایئے، آگے دریافت کیجئے۔" وہ آدمی کوئی دوسری بات نہ کہہ کے دور جاتے ہوئے مچھلی والے کو چلانے لگا۔ "اے مچھلی والے، ذرا ادھر آ، ادھر آ!"

اشوک بیزار ہو گیا۔ شہر کا لڑکا، شہر کی بدمعاشی کو سمجھتا ہے۔ پیچھے سے سائیکل پر ٹیک لگائے ہوئے سینہ پھلا کے سامنے کی طرف دیکھ کر بولا:

"ارے، او!"

"کیا؟"

"تمہارے ساتھ ان کی پہچان ہے؟"

"ایں، پہچان؟"

"ہاں، تم کون ہو بولو نہ؟"

"میں اس گھر کا نوکر ہوں۔"

"ہاں تو کتنی تنخواہ پاتے ہو؟"

"میں کتنی تنخواہ پاتا ہوں اس سے کسی کا کیا جاتا ہے؟"

"جاتا نہیں؟ بے وقوف نوکر رکھنے سے مالک کا سب کچھ جاتا ہے۔ بدمعاش نوکر رکھنے سے بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ سستا نوکر رکھنا بالآخر مہنگا پڑتا ہے۔ اس گھر کا کونا کونا مجھے معلوم ہے۔ تم جانتے ہو کس کے ساتھ بدمعاشی کر رہے ہو؟ مجھے کہہ رہے ہو یہ مارکنڈ بابو کا گھر نہیں ہے۔ ایں، جانتے ہو تمہارا مالک میرا پرانا دوست .. گھر کو میرا آنا جانا تھا۔ اسی باہر کے کمرے میں کتنی بار بیٹھ اٹھ کے گیا ہوں، اس کا شمار نہیں۔ تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ میرے ساتھ بدمعاشی؟"

اسے یہ تمام باتیں کہنے کی ترغیب اس گھر کے جھروکے کی طرف دیکھ کر ملی۔ ابھی تک وہ چہرہ وہیں نظر آ رہا ہے۔ غصے کے باوجود جیسے قربت کا تعارف پیش کرنے کو کہہ رہا ہے۔ گھر کے نوکر کی "ذرا دیکھو نہ"، "بھئی دیکھو نہ" کہہ کر جوابی حملے کی آواز اٹھاتے وقت اس جھروکے کی اوٹ سے ایک نسوانی آواز آئی:

"بھگیا، بھگیا، ذرا سن کے جا۔"

اندر جا کر پلک جھپکتے ہی لوٹ کر نوکر نے کہا:

"آپ کے دوست مارکنڈ بابو کب اس مکان میں تھے، مالکن پوچھتی ہیں۔"

اجنبی آدمی کے آگے "مالکن پوچھتی ہیں" کا فقرہ جوڑنے میں اسے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی۔ اپنی خودداری کی خاطر۔ مارکنڈ بابو جو بھی ہوں، اس سے اس کا کیا لینا دینا؟

"ہمیشہ تھے، ہمیشہ ہیں۔" اشوک بابو نے کہا۔ "حال ہی میں نو مہینہ پہلے ان سے ملاقات ہوئی تھی اسی مکان میں۔"

جھروکے کے اندر سے پچاک سے پان کا تھوک باہر گرا۔ اس دفعہ چہرہ صاف نظر آیا۔ اندر سے آواز آئی۔ "بھگیا، کہہ دے ہم لوگ اس مکان میں پانچ سال سے ہیں۔ یہاں مارکنڈ وارکنڈ کوئی رہتے نہیں ہیں۔ یہاں رہتے ہیں مادھب چندر مہانتی۔ سائن بورڈ میں نام لکھا ہوا ہے۔ بول دے۔"

اشوک دم بھر کے لئے نہیں رکا، سیدھے سائیکل لے کر اپنی راہ لی۔ اتنی دیر کے بعد جیسے اچانک اس کی یادوں کے کہرے سے واقعی سچ کا سورج اگا ہے۔ واقعی مادھب بابو ہی ایم۔ سی۔ مہانتی ہیں، اس کے ہر روز کے جانے پہچانے مادھب بابو۔ اور وہ خود کتنا مورکھ ہے! مادھب کو مارکنڈ! جھروکے کی اوٹ سے وہی چہرہ نظر آ رہا ہے۔ دل ہی دل میں اسے شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ وہی چہرہ جیسے

اسے دور کو دھکیل رہا تھا، جاؤ، جاؤ، دور بھاگ جاؤ۔

دور سے دیکھا، مادھب بابو خود آرہے ہیں۔ ملاقات ہونے پر دونوں کتابیں مل جاتیں۔ لیکن اگر وہ دوستی کے ناتے اپنے گھر کو کھینچ لے چلیں، تو؟ وہی جھروکا..

کتابوں کو جانے دیجئے۔ بھاگنے ہی میں نجات ہے۔

سیدھا گھر کا رخ کئے ہوئے کچھ دور جانے کے بعد دو چہرے یاد آگئے، ایک وہ چہرہ اور دوسرا چہرہ کملی کا۔ کملی پڑوسی کی بیٹی ہے، بچپن میں بھائی کر کے پکارتی تھی۔ کملی کا شادی ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ کملی کی ذات پات الگ ہے۔ اس کا ایم۔ سی۔ مہانتی کی رفیقۂ حیات کا ہونا ناممکن ہے۔

لیکن دونوں میں کتنی مشابہت ہے! جیسے ہو بہو کملی ہو۔ سوچتے سوچتے دل بھر آتا ہے۔ ماضی کے بچھڑے ہوئے پژمردہ اوراق جیسے پھر سے نشوونما پا کر اپنی جگہ پر سجے ہوئے ہوں۔ شعور مہک اٹھتا ہے۔ وہ تو سراپا کملی ہی ہے۔ بجھے ہوئے دل میں خود بخود صبر وسکون آرہا ہے۔ اوصاف ومتعلقات تو ذہن سے محو نہیں ہوتے۔ اپنے شعور کے آئینے میں منعکس بامعنی تصورات کے نقوش بھی بھلائے نہیں جاتے۔ مادی انسلاکات پر زوال آئے گا، آنے دیجئے۔ بہر حال زندگی جی سکتے ہیں۔ جسم تو ایک ہے، چاہے جو بھی ہو اس کا نام۔ انسان کا جسم یکساں بنا ہے، اس میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ سب کچھ تو قادر مطلق کی تخلیق ہے۔ حالات کے تناسب میں اس ذی روح کا یکساں ردعمل ہوتا ہے۔ وہی دل جس میں سکھ دکھ کی لہریں اور اندھیرے اجالے کے کھیل مسلسل جاری ہیں۔ اسی زندگی کا پانی تمام آبگینوں میں ہے۔ ظرفوں کے یہ انوکھے پن دل کو فلسفیانہ نظریات مسرت عطا کرتے ہیں اور اندر جھانکنے کے لئے نظر عطا کرتے ہیں۔ اسی نظر سے وہ اپنے اندر جھانکنے لگا۔ وہ خود بھی بن سکتا تھا مادھب بابو۔

اور پھر جھروکے کی اوٹ میں ہو بہو وہی کملی۔

اس نے اب تک شادی نہیں کی ہے۔ باہر کے کمرے میں ایک ننھا بچہ دوڑتا پھرتا تھا۔ وہ اس کی اپنی اولاد ہو سکتا تھا۔ ایسا نہ ہو سکا، نہ سہی۔ نام بھول جانے سے کیا ہوا، عناصر تو یکساں ہیں۔

سوچتے سوچتے اس کا دل بھر آیا۔ دن گذرتا جا رہا ہے، وہ مسلسل محو پرواز ہے، لیکن اسے رہنے کے قابل کوئی مستقر نہیں ملا۔ جوانی کے اختتام سے پہلے ہی اس پر فراموشی کا روگ نازل ہو گیا ہے۔ آخر کیوں؟ کیا اس کے داغدار دل کے شعلوں کو بجھانے کے لئے یہ فطرت کا ایک طریقہ ہے؟

وہ ایک شخص جا رہا ہے۔ اس نے اپنے آڑے وقت میں تیس روپے بطور قرض لئے تھے۔ اس کے بعد واپس کرنا بھول گیا ہے۔ اشوک نے نظریں اٹھا کے دیکھا۔ اس کا نام یاد نہیں آرہا ہے۔ وہ آدمی بڑی تیزی سے ایک گلی کے اندر داخل ہو رہا ہے۔ اشوک نے انتظار نہیں کیا۔ سائیکل کی رفتار تیز کر کے "پیں پیں" کرتے ہوئے گویا اس کے پیچھے پیچھے اڑنے لگا ☆☆☆

سہ ماہی "کاروان ادب" بھوپال

کی خصوصی پیش کش

شمس الرحمٰن فاروقی

کی ادبی خدمات کے اعتراف میں

شمس الرحمٰن فاروقی

ایک روشن کتاب

برصغیر کے چوٹی کے اہل قلم حضرات کی موقر نگارشات

اور نایاب تصاویر پر مشتمل

اہم دستاویز

ڈیمائی سائز، مجلد، ۴۷۲ صفحات

چار رنگوں میں خوبصورت سرورق

قیمت سادہ ڈاک سے : ۱۵۰ روپے

رجسٹرڈ ڈاک سے : ۱۷۰ روپے

رقم بذریعہ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ روانہ کریں۔

روپے چیک سے نہ بھیجیں۔ وی۔ پی۔ سے نہ منگوائیں۔

ملنے کا پتہ

کوثر صدیقی، ایڈیٹر "کاروان ادب"

۷۹۔ اے، گنوری، مین روڈ، بھوپال ۴۶۲۰۰۱

Kausar Siddiqui

Editor "Karwan-e-Adab"

79-A, Ginnori, Main Road

Bhopal-462001

نغمۂ آتش

موکوٹو ودکا ، ترجمہ مظہر مہدی

جب میرا لمس پاتے ہیں
وہ خوف سے چیخ اٹھتے ہیں
میں کیا جانوں
میں سرد ہوں کہ گرم
کیوں کہ مجھے لمحہ بھر کسی جگہ قرار نہیں
لمحہ قبل جو تھی
لمحہ بعد میں وہ نہیں
شعلہ پوش ہو کر رخصت ہوتی ہوں
میں تاریکی سے نبرد آزما
اس کے باوجود
بجز تاریکی، میرا کوئی مقام نہیں
وہ مجھ سے خوفزدہ رہتے ہیں
وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے
کہ میں کاغذ، لکڑی اور بدن کا وصال چاہتی ہوں
انھیں سہلاتی ہوں، چمکارتی ہوں اور خود میں ضم کر لیتی ہوں
اور پھر، میں بھی
ان کی راکھ میں فنا ہو جاتی ہوں
اس لئے کہ میں ہوسناک نہیں
جب وہ مجھے چھوتے ہیں
اور بس کراہ اٹھتے ہیں
میں قیاس کرتی ہوں
یہ میرا انس ہے ان کے لئے
جو انھیں مبہوت کر دیتا ہے

مجھے تنہا چھوڑ دو

شنتارو تانی کاوا ، ترجمہ مظہر مہدی

ذرا مجھے تنہا چھوڑ دو
میں اپنی آنکھیں بند کر لوں
ہر شے سے مبرا ہو جاؤں
اپنے کان اور منھ بھی بند کر لوں گا
پھر بھی وحشت ناکی سے چھٹکارا پا نہیں سکتا
کیوں کہ میں دل سے چھٹکارا پا نہیں سکتا
تم نے مجھے نشانہ بنایا
لیکن میں تم سے نفرت نہیں کروں گا
اگر چہ تم نے نشانہ بنایا، مجھے
پستی کی جانب ڈھکیلا
ہر کوئی کسی نہ کسی نشانے کی زد میں ہے
جنھیں ہم واقعی دیکھ نہیں سکتے
نہ ان کی نشاندہی کر سکتے ہیں
جو غیر محسوس، خود بخود نمو پاتے ہیں
بلکہ ماں کی مامتا بھی
باپ کی ہمت افزائی بھی اضمحلال کا باعث ہوئی
اس لئے میں اب تنہا رہنا چاہتا ہوں
مردے کی طرح پڑا رہنا چاہتا ہوں
بس تھوڑی دیر کے لئے
کیوں کہ حقیقت میں مر جانا
مناسب نہیں
میں اب اٹھ کر اپنے آپ اس مریخ سے چلا جاؤں گا
نہ موسیقی سے لطف اندوز ہوں گا
نہ نیلے آسماں کی جانب منھ کروں گا

سرزنش : چھ نظمیں

طارق قمر طارق

(۱)

یہ کون ہے جو طلسم جاں کے سیاہ غاروں میں آرہا ہے؟
یہ واہمہ کیوں یقیں کی حد سے گذر رہا ہے؟
کہ سوز ہجراں کا کند خنجر
لہو کے اندر اتر رہا ہے
ہوائیں کیوں بین کر رہی ہیں؟
سلیس[1] اپنی کماں اٹھاؤ، ادھر تو آؤ، ذرا بتاؤ
یہ کون شب خون مارتا ہے؟
ارے ارے یہ گماں نہیں ہے۔یقین ہے یہ
حقیقتوں کا سراب ہے یہ
مرا ہی خنجر مرے گلے پر
مرے ہی بازو اٹھا رہے ہیں
شکست تقدیر ہو چکی ہے

(۲)

یہ صحن مقتل میں لاش کس کی پڑی ہوئی ہے
مبارزت کی نوید لے کر یہ کون خیمے میں آرہا ہے
روایتوں کے مجسموں کو خدا بنانے کی جستجو میں
مرا قبیلہ لگا ہوا ہے
دیا حریف ہوا ہوا تھا...جلا ہوا تھا
بجھا ہوا ہے
حدیث دل اور حدیث جاں کی حکایتیں رائیگاں ہوئی ہیں
محبتیں بے نشاں ہوئی ہیں
کہ شمعیں بجھ کر دھواں ہوئی ہیں
مگر
قبیلے کی بوڑھی رسمیں جواں ہوئی ہیں
لہو میں اٹھی تھی جو بغاوت وہ پا بہ زنجیر ہو چکی ہے
شکست تقدیر ہو چکی ہے

---

[1] Silas

(۳)

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں
اگر محبت پہ حرف آئے تو جاں گنواؤں
روایتوں کے صنم کدوں کا طلسم توڑوں
تری وفا کی قسم اٹھا کر
انا گزیدہ بزرگ نفرت کو یہ بتاؤں
ندی کے اس پار جو قبیلہ ہے معتبر ہے
کبھی کبھی میں یہ چاہتا ہوں
جراحتوں کے چراغ لے کر ہوا میں نکلوں
کہ جہل غاروں کی تیرگی کے بھرم کو توڑوں
محبتوں اور صداقتوں کا علم اٹھا کر
طویل مدت سے تیرگی میں بھٹکنے والے
کمر خمیدہ قبیلے والوں کو یہ بتاؤں
ندی کے اس پار جو قبیلہ ہے بے ضرر ہے
میں کچھ بھی سوچوں میں کچھ بھی چاہوں
مگر یہ سچ ہے
انا گزیدہ کمر خمیدہ قبیلے والے
صداقتوں کے علم کے نیچے
رعونتوں کو نہ ختم کریں گے
جہالتوں اور کدورتوں کے سحر سے باہر نہ آسکیں گے
مرے ہی سر کو قلم کریں گے
زمین مقتل مرے لہو سے وضو کرے گی

(۴)

دشت بے چارگی
لشکر بے اماں
شور آہ و فغاں اب تحفظ کہاں
آنسوؤں نے لکھی ظلم کی داستاں
دھوپ ہی دھوپ ہے آگ ہی آگ ہے
سر چھپانے کو جائے اماں تک نہیں
دشت بے نخل میں سائباں تک نہیں
جرأتیں بجھ گئیں
حسرتیں مٹ گئیں
حوصلے تھک گئے
خواہشیں مر گئیں
آرزوؤں کا کوئی نشاں تک نہیں
بے زمینی ہے قدموں سے لپٹی ہوئی
اور سر پر کوئی آسماں بھی نہیں
اس طرح کیوں بجھے ہیں چراغ محبت؟
دھواں تک نہیں

(۵)

گناہ گارو!
فقیہ اعظم کو مت پکارو
یہ سر اتارو
تمھیں خبر ہے
جواں جسموں کی فصل پکنے سے پہلے اپنے
لہو میں اٹھتی بغاوتوں کو لگام دینے میں عافیت ہے
بڑی حویلی کی خون آلود خلوتوں میں
لگان دینے میں عافیت ہے
فقیہ اعظم! حضور والا
محبتوں کے نشے میں سرشار باغیوں نے
بدن کے گندم کو چکھ لیا ہے
روایتوں اور بغاوتوں کی حدود فاصل کو ختم کر دو
ہمارے قول و عمل پہ لبیک کہتے جاؤ
یہ سر اتارو
روایتوں کے بجسموں پر
جواں محبت کا خوں چڑھاؤ
فضا میں اک چیخ گونجتی ہے...

(٦)

کسی کی آنکھ میں جب موسم گریہ ٹھہرتا ہے
شکستہ آرزو پر آنسوؤں کی اوس پڑتی ہے
ہوائیں دف بجاتی ہیں
صف ماتم بچھاتی ہیں
فضا کے اک اشارے پر
شجر کی سبز پوشی بے لباسی اوڑھ لیتی ہے
ہزاروں زرد پتے آبرو کو خاک کرتے ہیں
زمیں پر رقص ہوتا ہے
شجر کی بے ردائی پر جو پتے رقص کرتے ہیں
شجر شاخوں سے ٹوٹے ہیں
خط تقدیر بدلا ہے
کہ اس کا رنگ بدلا ہے
فضا کے اک اشارے پر
ہواؤں کی اطاعت اس طرح بھی فرض ہوتی ہے
شجر کے سبز پتے زرد موسم اوڑھ لیتے ہیں

غالب انسٹی ٹیوٹ کی نئی مطبوعات

غالب: غالب کی سوانح سے متعلق غلام رسول مہر کی ایک اہم کتاب جسے غالب انسٹی ٹیوٹ نے دوبارہ شائع کیا ہے۔ صفحات ۴۷۸، قیمت ۲۵۰ روپے۔

غالب کی تخلیقی حسیّت: غالب کے شعری کارناموں پر پروفیسر شمیم حنفی کی ایک اہم کتاب جس میں آپ نے غالب اور عہد غالب سے متعلق چند اہم نکات پر گفتگو کی ہے۔ صفحات ۲۹۳، قیمت ۲۰۰ روپے۔

غالب جدید تنقیدی تناظرات: غالب پر مختلف دانشوروں کے لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ جسے پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے مرتب کیا ہے۔ صفحات ۲۸۰، قیمت ۲۰۰ روپے۔

یادگارنامہ یوسف حسین خاں: یادگارنامہ یوسف حسین خاں، جناب یوسف حسین خاں کی یاد میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی ایک اہم پیشکش ہے جس میں یوسف حسین خاں کی علمی اور ادبی زندگی کی تفصیلات کے علاوہ معروف محققوں کے مضامین بھی شامل ہیں۔ صفحات ۳۰۰، قیمت ۳۰۰ روپے۔

غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ: ڈاکٹر خلیق انجم کی معرکۃ الآرا کتاب جس میں آپ نے غالب سے متعلق کلکتہ سے وابستہ تمام باتوں کو ایک دستاویزی شکل دی ہے۔ صفحات ۴۵۳، قیمت ۳۰۰ روپے۔

غالب نامہ: شیخ محمد اکرام کی غالب کے حوالے سے نایاب تصنیف جسے غالب انسٹی ٹیوٹ نے دوبارہ شائع کیا ہے۔ صفحات ۴۱۴، قیمت ۲۰۰ روپے۔

غالب کی چند فارسی تصانیف: غالب کی فارسی تحریروں پر پروفیسر حنیف نقوی کی تحقیقی و تنقیدی گفتگو۔ صفحات ۱۵۴، قیمت ۲۰۰ روپے۔

ملنے کا پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی۔۲

website: www.ghalibinstitute.com - email: ghalib@vsnl.net

اسٹیفن اسپنڈر، ٹی۔ایس۔الیٹ، اور کام شاعر کا

یہ ان دنوں کی بات ہے جب اسٹیفن اسپنڈر (پیدائش ۱۹۰۹) میدان شعروادب میں ایک شرمیلے لیکن ہونہار نوجوان کی حیثیت سے معروف ہورہا تھا۔ (اس زمانے میں اسپنڈر نے ایک بار کہا تھا کہ میرے والدین مجھے اجڈ اور سخت لڑکوں سے بچا کر رکھتے تھے۔) وہ ۱۹۳۰ کا سال تھا جب الیٹ (پیدائش ۱۸۸۸) نے اپنے ہونہار دوست اسپنڈر کی چار نظمیں اپنے مشہور رسالے Criterion میں چھاپنے کے لئے منظور کیں اور اتنا ہی نہیں، بلکہ اسے اپنے ساتھ لنچ کے لئے بھی بلایا۔ اس ملاقات کا حال اسپنڈر نے خود بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ الیٹ نے پوچھا:

''تمھارے ارادے کیا ہیں؟ تم زندگی میں کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''میں شاعر ہونا چاہتا ہوں۔'' اسپنڈر نے جواب دیا۔

''میری سمجھ میں یہ تو آتا ہے کہ تم شعر کہنا چاہو۔'' الیٹ نے جواب دیا۔ ''لیکن 'شاعر ہونے' سے تمھاری مراد کیا ہے، میں سمجھا نہیں۔''

آکسفورڈ یونیورسٹی میں دوران تعلیم اسپنڈر کی دوستی ان نوجوانوں سے ہوئی جو آئندہ چل کر نمایاں شاعر ہونے والے تھے۔ آڈن (Auden)، میکنیس (MacNeice)، اشرووڈ (Isherwood)، سیسل ڈے لوئس (Cecil Day Lewis)، یہ سب اکثر یکجا نظر آتے تھے اور اس پر کچھ جھنجھلا کر جنوبی افریقی شاعر اور مترجم رائے کیمپبل (Roy Cambell) نے ان پر میک اسپانڈے (MacSpaunday) کی پھبتی کہی جو بہت مقبول ہوئی۔ بعد میں خود آڈن نے بھی اس نام کو اپنے اور اپنے ان دوستوں کی علامت کے طور پر استعمال کیا۔ یہ پانچوں سیاسی عقائد کے اعتبار سے بائیں بازو کے تھے۔ لیکن ان میں مکمل سیاسی ہم خیالی نہ تھی، اور جو تھی وہ بھی آہستہ آہستہ، بالخصوص اسپین کی خانہ جنگی کے بعد ختم ہوگئی۔ لیکن شاعری کی محبت نے انھیں دوستی کے دھاگے میں باندھے رکھا۔

ایک بار آڈن نے اسپنڈر سے پوچھا:

''اسٹیفن، تمھاری شعرگوئی کی رفتار کیا ہے؟''

''یہی کوئی تین چار نظمیں روزانہ۔'' اسپنڈر نے جواب دیا۔

''غضب خدا کا۔'' آڈن نے کہا۔ ''کتنی توانائی ہے تم میں!''

اسپنڈر نے کہا کہ ''بھلا تم دن بھر میں کتنا کہہ لیتے ہو؟'' آڈن نے جواب دیا، ''میں تین ہفتوں میں یہی کوئی ایک نظم کہہ لیتا ہوں۔''

اسپنڈر کا بیان ہے کہ اس دن سے میں نے بھی اپنی شعرگوئی کی رفتار یہی بنالی کہ کوئی تین ہفتے میں ایک نظم کہتا تھا۔

آڈن، اشرووڈ، اور اسپنڈر میں ایک اور چیز، امرد پرستی، مشترک تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہم جنسی رجحانات کو بہت برا سمجھا جاتا تھا، بلکہ انگلینڈ میں ایسے افعال بہت سخت جرم بھی تھے۔ لیکن ان لوگوں کی خصلت تمام دوستوں میں معروف تھی۔ ایک بار اسپنڈر اور اشرووڈ میں کسی بات پر سخت جھگڑا ہو گیا اور اسپنڈر نے اشرووڈ سے جھلا کر کہا، ''اچھا اگر ہم لوگوں کو اپنے تعلقات ختم ہی کرنے ہیں تو مردوں کی طرح کریں، [یعنی عورتوں کی طرح کوسنے اور جلی کٹی سنانے کا کیا فائدہ ہے؟]''

اشرووڈ نے زہر بھرے لہجے میں جواب دیا:

''لیکن اسٹیفن، ہم مرد نہیں ہیں۔''

کرناٹک میں اردو صحافت

کے بعد

ڈاکٹر انیس صدیقی

کی ایک اور تحقیقی کاوش

توضیحی اشاریہ

شب خون

سات سو سے زائد مضامین کی توضیحات

•

اشاریہ سازی کے جدید ترین اصولوں کے تحت
نظم ونثر کی مختلف اصناف کی درجہ بندی

•

کم وبیش چودہ سو قلم کاروں کی پندرہ ہزار
سے زائد تخلیقات کے اندراجات
کے علاوہ
شب خون کا مکمل تعارف اور اس کی ادبی خدمات کا احاطہ

ضخامت : کم و بیش ایک ہزار صفحات

باب : ایک
شب خون : تعارف و خدمات

- پس منظر
- اجراء
- افتتاحی شمارے کا اداریہ
- افتتاحی شمارے کا سرورق
- شب خون کی اجراء کے مقاصد
- ادارت
- سائز، صفحات اور سرورق
- طباعت وقیمت
- کالم
- شب خون کی خدمات

باب : دو
نثر

- صفحۂ اول
- مضامین
- افسانے
- ناول رناولٹ
- ڈرامے
- خاکے رخود نوشت سوانح رسوانحی مضامین
- انٹرویوز
- مباحثے رمذاکرے رسمپوزیم
- رپورتاژ
- سفرنامے
- طنزومزاح رانشایئے
- مکاتیب
- سوانحی گوشے
- تبصرۂ کتب
- متفرقات
- تصاویر

باب : تین
نظم

- نظمیں
- غزلیں
- آزاد غزلیں
- مسلسل غزلیں
- نثری غزل
- مربع غزل
- رباعیات
- قطعات
- قطعاتِ تاریخ
- مرثیے
- غنایئے
- آزاد مثنوی
- سانیٹ
- دوہے
- ثلاثیاں
- حمیے
- متفرق اشعار

باب : چار
تراجم

- مضامین
- افسانے
- ڈرامے
- انٹرویوز
- مباحثے رمذاکرے رسمپوزیم
- مکاتیب
- انشایئے

•

- نظمیں

رابطہ

ڈاکٹر انیس صدیقی، پلاٹ نمبر ۱۹، گل مہر ہلز، مقابل آدرش نگر، رنگ روڈ، گلبرگہ ۵۸۵۱۰۵، کرناٹک
MOBILE : 09342 353312

اردو رسم الخط

پر چند اہم اور بنیادی

تحریریں

فہرست

محمد الیاس برنی	اردو ہندی رسم الخط	۴۷۵
پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب	اردو زبان اور اس کا رسم الخط	۴۹۵
سید احتشام حسین	اردو رسم خط، چند خیالات	۵۱۷
فرمان فتحپوری	اردو رسم الخط : مسائل و مباحث کی روشنی میں	۵۲۲
شمس الرحمٰن فاروقی	کچھ اردو رسم الخط کے بارے میں	۵۳۶
	اردو اور اس کا رسم الخط : ایک مباحثہ	۵۴۴

محمد الیاس برنی

اردو ہندی رسم الخط

مؤلفہ
محمد الیاس برنی
سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ
حیدآباد دکن

مطبوعہ
اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد

جملہ حقوق محفوظ
باراول [غالباً ۱۹۴۶]
ہدیہ بلا قیمت

اعلان

مقالہ۔ اردو ہندی رسم الخط۔ کا حق تالیف وحق ترجمہ بنام مؤلف محفوظ ہے۔ توقع ہے کہ اس کے ہندی انگریزی ایڈیشن بھی متعاقب شائع ہوں گے۔ اگر کوئی صاحب یا بعض صاحبان علمی خدمت کے مدنظر اس مقالہ کو شائع کرنا چاہیں۔ قیمتاً یا ہدیۃً۔ تو مؤلف سے اجازت حاصل کرکے طباعت و اشاعت کا انتظام کرسکتے ہیں۔ مناسب شرائط پر اجازت دی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

اردو ہندی رسم الخط
فہرست مضامین

تمہید
(۱) حروف
(۲) حرفیات
(۳) اردو ہندی حروف
(۴) ہندی کی واقفیت
(۵) اردو ہندی ہندوستانی
(۶) رسم الخط
(۷) خلاصہ
(۸) تحقیقاتی کمیٹی
(۹) موجودہ مقالہ
(۱۰) شکریہ
فصل اول
حروف کی آوازیں
(۱۱) اردو حروف کے تلفظ
(۱۲) بعض تلفظوں کا امتیاز
(۱۳) تحریک اصلاح
(۱۴) اردو حروف علت و اعراب
(۱۶) ہندی حروف کے تلفظ

(۱۶) ہندی حروف صحیح میں دس حروف مرکب
(۱۷) ہندی میں حرف (ھ) کا پیچ
(۱۸) ہندی حروف صحیح میں خاص تین حرف مرکب
(۱۹) ہندی حروف میں صحیح مشابہ
(۲۰) ہندی حروف صحیح متبادل
(۲۱) ہندی حروف صحیح میں پانچ ورگ
(۲۲) اردو ہندی حروف صحیح کی آوازیں
(۲۳) ہندی حروف علت
(۲۴) ہندی حروف علت کی علامات
(۲۵) اردو ہندی حروف علت کا تقابل
(۲۶) اردو اعراب کی بعض خصوصیات
(۲۷) ہندی میں حرف (ن) کی طوالت
(۲۸) ہندی میں حرف (ر) کی طوالت
(۲۹) ہندی میں حرف (ڑ) مستعار
(۳۰) ہندی میں آخری حرف علت (اَہ)
(۳۱) ہندی حروف میں تلفظ وتحریر کی پیچیدگی
(۳۲) سنسکرت کی تخصیص

فصل دوم
حروف کی شکلیں
(۳۳) اردو حروف کی شکلیں
(۳۴) ہندی حروف کی شکلیں
(۳۵) ہندی حروف کی متشابہ شکلیں
(۳۶) اردو ہندی حروف میں مشابہ اور متشابہ شکلوں کا فرق
(۳۷) اردو اعراب اور ہندی ماترا کا استعمال

فصل سوم
حروف کی ترکیبیں
(۳۸) اردو حروف کی ترکیب اور اصلاح کی تحریک
(۳۹) ہندی حروف کی ترکیب
(۴۰) ہندی میں علامت تشدید (ّ) ندارد۔ لازمی طوالت
(۴۱) ہندی میں علامت جزم (ْ) ندارد۔ لازمی طوالت۔
(۴۲) ہندی میں دو حرفی مرکبات
(۴۳) ہندی میں سہ حرفی مرکبات
(۴۴) مرکبات میں دقیق ودشوار تلفظ
(۴۵) ہندی حروف کی ترکیبیں طولانی

☆☆☆

تمہید
(بھومکا)

۱۔حروف۔ظاہر ہے کہ زبان (بھاشا) بے شمار جملوں کا خزانہ ہے۔اور ہر جملہ (واکیہ) لفظوں (شبدوں) کا مجموعہ ہے۔ اور الفاظ تمامتر حرفوں (ورنوں) سے مرکب ہیں۔پس بالآخر زبان تمامتر حروف پر مشتمل ہے۔اور تعجب ہے کہ معدودے چند حروف باہم مل جل کر لاکھوں الفاظ کے ذریعے بیشمار خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔کسی بڑے سے بڑے کتب خانے میں چلے جایئے ہر زبان کے معدودے چند حروف سے علوم کے بڑے بڑے عالم آباد نظر آئیں گے۔دنیا میں لاکھوں ایجادیں ہوئی اور ہوں گی لیکن کوئی ایجاد حروف کی ایجاد کا مقابلہ نہیں کر سکتی کہ ظاہر میں انسان کی ترقیوں کا یہی خزینہ اور یہی ذخیرہ ہے۔

۲۔حرفیات۔الفاظ کے اقسام وتغیرات فن صرف (شبد وچار) سے اور جملوں کی ترکیب فن نحو (واکیہ وچار) سے متعلق ہے۔اور صرف ونحو مجموعی طور پر قواعد (ویاکرن ودیا) کہلاتے ہیں۔رہے حروف (ورن) سو ان کے تلفظ (اچارن) کی بحث فن قرأت (ورن وچار) سے متعلق ہے۔ اور ان کی تحریر (آکار) کی بحث فن رسم الخط (لپی) سے متعلق ہے اور حروف کی ترکیب (سنیوگ) دونوں فن میں شامل رہتی ہے۔لیکن کوئی سابقہ اصطلاح جامع اور موزوں معلوم نہ ہو سکی جو حروف کی تینوں بحثوں پر حاوی ہو۔لہٰذا ایک جدید اصطلاح حرفیات (ورن ودیا) وضع کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے۔تاکہ حروف کے تینوں پہلو تلفظ وتحریر وترکیب یکجا پیش نظر ہو سکیں۔اور بحیثیت مجموعی حروف کے نقص وکمال کا اندازہ ہو سکے۔لیکن چونکہ مجوزہ اردو ہندی اصطلاح ابھی معروف و مسلم نہیں ہے۔اس مقالہ کا عنوان رسم الخط (لپی) ہی رکھنا پڑا کہ آج کل یہ اصطلاح حروف کی بحث میں عام طور پر رائج ہے۔

۳۔اردو ہندی حروف۔یہ امر محتاج بیان نہیں کہ اردو حروف بیشتر عربی کے حروف ہیں۔البتہ چند حروف فارسی ہندی کے بھی شامل ہیں۔اور ہندی حروف تمامتر سنسکرت کے حروف ہیں۔البتہ اب ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ہندی حروف میں چند حرف اردو تلفظ کے بھی شامل رہیں۔

۴۔ہندی کی واقفیت۔طالب علمی کے زمانے میں ہندی پڑھی تھی اور مدت تک شوق سے پڑھی تھی۔رحیم، کبیر بلکہ سورداس، تلسی داس جیسے شاعروں کا کلام پڑھنے میں فرصت کا وقت گزرتا تھا۔بہت سے ہندی دوہے یاد تھے۔ہندی زبان میں ایسے دوہوں کی کمی نہیں جو بلحاظ زبان اردو کے قریب رہتے ہیں۔اور سچ پوچھئے تو ایسی ہندی بہت سوندھی سلونی ہوتی ہے۔جس سے ظاہر ہے کہ اردو ہندی

کے میل سے دلکش اور من موہنی زبان بن سکتی ہے۔ اور ایک حد تک بن چکی ہے۔ بہر حال ابتدا میں مدت تک ہندی سے دلچسپی رہی۔ لیکن مصروفیتیں بڑھنے کے بعد پھر مہلت نہ ملی کہ ہندی تازہ ہوتی رہتی۔ مدتوں بعد ملازمت سے فارغ ہو کر اب ادھر توجہ ہوئی تو پھر کچھ یاد تازہ ہوگئی۔

لیکن ہندی ادبیات کے قطع نظر اس دوران میں بھی ہندی حروف کے مسائل زیر غور آتے رہے۔ ہندی اور سنسکرت کے اساتذہ سے حسب توقع تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ چنانچہ گذشتہ سالوں میں انجمن ترقی اردو کے زیر سرپرستی دہلی اور ناگپور جیسے مقامات میں ہندی رسم الخط پر علمی جلسوں میں تقریر کرنے کا اتفاق ہوا۔ اور ایسے موقعوں پر احباب کا تقاضا ہوا کہ اس بحث پر باقاعدہ تالیف شائع ہونی چاہئے۔

۵۔ اردو۔ ہندی۔ ہندوستانی۔ جس زبان میں رامائن جیسی شاعری ہو اس کی ادبیت میں کیا شک ہوسکتا ہے۔ اور یوں بھی ہندی میں ادب کا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ ہندی کلام میں معنی کی لطافت اور اثر آفرینی مسلم ہے۔ خاص کر محبت و اخلاق کے بیان میں اس کا رنگ بہت دلکش ہے اور اس کی تشبیہات و تمثیلات تو فطرت کی تصویریں معلوم ہوتی ہیں۔ پھر کلام میں بحروں کا جو وسیع اہتمام ہے اس میں موسیقی کی بہت گنجائش رہتی ہے۔ راگ راگنیاں خوب جمتی ہیں، کھلتی ہیں اور موسیقی سے نظم کا اثر گہرا پڑتا ہے۔ غرض کہ ہندی ادب قابل مطالعہ ہے۔ ہندی کو نظر انداز کرنا تنگ نظری ہے۔ پھر اردو کی توسیع و ترقی کے سلسلے میں بھی لسانی اعتبار سے ہندی کا مطالعہ نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہے۔ پس ہندی کے مطالعہ پر بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ اعلیٰ معیار نہ سہی وسط یا کم از کم ابتدائی واقفیت بھی کارآمد ہوسکتی ہے۔

لیکن ہندوستان کی جو زبان اندرون ملک و بیرون ملک سب سے زیادہ بولی جاتی ہے، سمجھی جاتی ہے وہ وہی ہے جو اردو کہلاتی ہے۔ اور وہ بتناسب مختلف ملک کی بیشتر زبانوں کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ ہندی عنصر تو صاف ظاہر ہے۔ پس اردو کی وسعت جاذبیت اور جامعیت کا انکار کرنا، کھلی حقیقت کا انکار ہے۔ پھر اس میں ادب کے علاوہ علوم و فنون قدیمہ و جدیدہ کا ذخیرہ پہلے سے خاصا موجود ہے اور کچھ مدت سے علوم و فنون کا اس میں نمایاں اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت ہندوستان میں بلحاظ توسیع و ترقی کوئی زبان اردو کے ہم پلہ نظر نہیں آتی۔

بریں ہم اردو کے مقابل ہندی کے رواج کی بحث جو ملک میں پھیل رہی ہے، گویا دونوں زبانوں میں رقابت پیدا ہو رہی ہے۔ مصالحت کے مد نظر ملک کی عام زبان کا ایک تیسرا نام "ہندوستانی" تجویز ہوا ہے۔ جس میں گویا اردو ہندی دونوں زبانیں بقدر مناسب شامل رہیں۔ اگر اس سے یہ مراد ہو کہ اردو میں ہندی کا عنصر موجودہ تناسب سے بڑھا دیا جائے تو یہ تحریک اردو میں پہلے سے جاری ہے۔ اور تقویت پا رہی ہے۔ لیکن اگر مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی کے نام سے اردو کے بجائے سنسکرت کی ہندی رائج کی جائے تو یہ دوسرا سوال ہے۔ اور اصل مقصد کے مغائر بلکہ منافی ہے۔

۶۔ رسم الخط۔ اردو ہندی کے بجائے مصلحتاً ہندوستانی زبان تسلیم ہو جانے کے بعد بھی حروف کی بحث باقی رہ جاتی ہے۔ جس میں رسم الخط کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کا بھی مصلحت آمیز حل یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اردو ہندی رسم الخط ساتھ ساتھ حسب موقع محل استعمال ہوں۔ لیکن ہندی کے حامی جو دراصل اردو کے بجائے ہندی رائج کرنا چاہتے ہیں وہ اس سمجھوتہ پر بھی راضی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کو ہندی رسم الخط پر اصرار ہے۔ خیر اصرار سہی لیکن لطیفہ یہ کہ وہ ہندی حروف کو اردو حروف پر فنی لحاظ سے فائق بتاتے ہیں۔ دعویٰ یہ ہے اور اس دعوے کا شد و مد سے اعلان ہوتا رہتا ہے۔ جس کی بدولت عام مغالطہ پھیل رہا ہے۔ حتیٰ کہ حامیان اردو بھی اس مغالطے کے شکار پائے گئے کہ ہندی حروف میں تلفظ تحریر و ترکیب کے لحاظ سے جامعیت سہولت اور باقاعدگی ہے اور گویا اردو حروف میں یہ بات نہیں ہے۔ حالانکہ واقعہ بالکل برعکس ہے۔ اردو حروف لفظ میں، تحریر میں، ترکیب میں اکثر اعتبار سے ہندی حروف کے مقابل فنی فوقیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ آئندہ جو تفصیل پیش ہوگی اس سے مغالطہ خود بخود رفع ہو جائے گا۔ نیز اندازہ ہوگا کہ کثرت مشاغل میں جب کہ لوگوں کو تحقیق و توثیق کی فرصت کم ہو کسی امر کی شہرت عامہ پروپیگنڈہ کے ہاتھوں کس درجے بے بس ہو جاتی ہے۔ اور وہی مثل صادق آتی ہے کہ بد اچھا بدنام برا۔

۷۔ خلاصہ۔ تفصیل تو آئندہ فصلوں میں پیش ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ اول تو اردو کے مقابل ہندی حروف کی مجموعی تعداد ڈیوڑھی ہے، یعنی (۵۰) فی صد زیادہ۔ دوسرے حروف کی اشکال و علامات کی تعداد کا فرق اس سے بھی زیادہ ہے، یعنی اردو کے مقابل سہ چند۔ چنانچہ تشریح آئندہ فصل اول میں درج ہوگی۔ پھر بھی اردو حروف کی متعدد صاف اور واضح آوازیں ہندی میں ندارد ہیں۔ اور ہندی کی جو بعض آوازیں اردو میں کم ہیں وہ ایسی دقیق یا رقیق ہیں کہ خود ہندی میں وہ باعث تکلیف محسوس ہوتی ہیں اور باعث دشواری مانی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں اردو سے زیادہ ہندی حروف کے مختلف تلفظ مشابہ ہیں جن سے تحریر میں پیچیدگی بڑھ جاتی ہے۔ پھر ہندی حروف کی شکلیں بھی طولانی اور پیچیدہ ہیں جن کے لکھنے میں زیادہ دقت اور جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزید براں متعدد شکلیں مشابہ ہیں جو سرسری تحریر میں بآسانی اشتباہ پیدا کرتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر ہندی حروف کی ترکیبیں ہیں (سنیوگ) کہ ایک طرف تلفظ میں وہ بہت دقیق یا رقیق ہوتی ہیں تو دوسری طرف تحریر میں ان کے جوڑ بند مختلف محل بلکہ مختلف نئی نئی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ لکھنے پڑھنے میں حیرانی لاحق ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ابتدائی منزل میں جب کہ عبارت سادہ سلیس ہو ہندی کا سمجھنا پڑھنا آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جوں جوں عبارت کا معیار بڑھتا ہے تلفظ میں، تحریر میں، ترکیب میں حروف کی دقت اور پیچیدگی معمول سے بہت زیادہ بڑھتی ہے۔ حتیٰ کہ اوسط درجے میں وہ خاصی غور طلب بن جاتی ہے۔ اور علمی عبارت میں تو حرفوں کا تلفظ، حرفوں کی تحریر اور حرفوں کی ترکیب، اچھے اچھوں کو حیران کر دیتی ہے۔ چنانچہ معنی مطالب سے قطع نظر سنسکرت بلکہ ہندی کی اعلیٰ مذہبی و علمی عبارتیں

بلحاظ زبان صحیح لکھنا پڑھنا خاص مہارت کی بات ہے۔ اور جس ہندی کو رواج دینا مقصود معلوم ہوتا ہے وہ سنسکرت کی ہندی ہوگی تو لامحالہ حروف کی خصوصیات عبارت میں بافراط نمایاں ہوں گی۔

۸۔ تحقیقاتی کمیٹی۔ ہندی حروف کے ان ہی امور پر غور کرنے کی غرض سے چند سال پہلے ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر ہوئی تھی۔ جس نے غالباً رپورٹ بھی تیار کی تھی لیکن شاید وہ ہندی رسم الخط کے موافق نہ تھی اور اس میں فنی لحاظ سے ہندی حروف کی کوتاہیاں اور دشواریاں تفصیلاً پیش کی گئی تھیں۔ ہندی کے حامیوں نے اس رپورٹ کی عام اشاعت مناسب نہ سمجھی اور وہ یوں ہی روپوش ہوگئی۔ ورنہ اس کی اشاعت سے بہت کچھ مسائل واضح ہوجاتے۔ اک زمانے میں اس کمیٹی کا چرچا رہا لیکن مزید کیفیت تحقیق نہ ہوسکی۔

۹۔ موجودہ مقالہ۔ بہرحال اردو ہندی حروف کا اک خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں حروف کے تلفظ، حروف کی تحریر اور حروف کی ترکیب غرض جملہ امور کی مختصر کیفیت بیان ہوگی۔ تاکہ خصوصیات متعلقہ کا بقدر ضرورت اندازہ ہوجائے۔ شاید اسی بحث پر تفصیلی تالیف بھی متعاقب پیش ہوسکے۔ لیکن ع یک سرو ہزار سودا۔ کیا معلوم نوبت آئے نہ آئے۔ اور آئے تو کب آئے۔ سردست یہ مقالہ حاضر ہے۔

گو مباحث کو عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم اصل لطف تو ان کو آئے گا جو ہندی کی کچھ واقفیت رکھتے ہیں۔ لیکن جو ہندی سے بالکل ناواقف ہیں ان پر بھی خصوصیات حروف کا عام رجحان بخوبی واضح ہوجائے گا۔ اور عجب نہیں ان کو ہندی کی واقفیت کا بھی شوق پیدا ہوجائے تاکہ خود تصدیق کرلیں۔ اسی جماعت کے خیال سے مباحث کے دقیق اور طویل پہلو نظرانداز کردیے گئے تاکہ مطالعہ میں الجھن محسوس نہ ہو۔ ممکن ہے یہ مقالہ ہندی اور انگریزی میں بھی متعاقب شائع ہو۔

ہندی کی فنی اصطلاحات بقدر ضرورت اردو اصطلاحات کے ساتھ ساتھ مباحث میں درج ہیں۔ لیکن بنظر سہولت اردو تحریر میں درج ہیں۔ وہ بھی لیتھو کی کتابت میں خوشخط درج نہ ہوسکے کہ ہندی کتابت طولانی پیچیدہ ہے۔ اور کاتب ہندی کے مشاق نہ تھے۔ توقع ہے کہ آئندہ یہ مقالہ اردو ٹائپ میں طبع ہوگا تو ہندی حروف و الفاظ ہندی ٹائپ میں صاف خوشنما درج ہوں گے۔ تاہم جو ہندی اصطلاحات جابجا درج ہوئیں ان کی ایک جامع فہرست آخر میں بطور ضمیمہ شریک کردی گئیں۔ اور اصطلاحات ہندی میں بھی تحریر ہوئیں گویا چنداں خوشخط تحریر نہ ہوسکیں۔

۱۰۔ شکریہ۔ بعض احباب کا شکریہ خاص طور پر واجب ہے۔ ہندی کے معاملے میں پنڈت ہری ہر شاستری (بیکنٹھ باشی) پروفیسر سنسکرت جامعہ عثمانیہ جو علی گڑھ کالج کے زمانے سے دوست تھے۔ زیادہ شریک مشورہ رہتے تھے۔ لیکن مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو کی فرمائش سے اس مقالے کی ابتدا ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے دہلی والی تقریر میں بہت سرگرم دلچسپی ظاہر فرمائی اور مسٹر سجاد مرزا معتمد تعلیمات سرکار عالی وقتاً فوقتاً تقاضا کرتے رہے۔ ایسے احباب کی توجہ بالآخر کارگر ہوئی۔ اور خدا کا شکر ہے کہ مقالہ شائع ہوگیا۔

جو فنی مشورہ بغرض اصلاح و اضافہ موصول ہوں گے باعث تشکر ہوں گے۔ اور آئندہ ایڈیشنوں کے سلسلے میں وہ زیر غور آسکیں گے کہ منشاء تحقیق و توضیح ہے تاکہ رسم الخط کے تعلق سے اردو ہندی حروف کی خصوصیات بلحاظ تلفظ و تحریر و ترکیب عام طور پر ظاہر ہوجائیں۔ اور کسی مغالطے کا احتمال نہ رہے۔ کہ ایسے علمی امور میں رائے عامہ کی صحت بہت ضروری ہے اور یہی اس مقالے کا مقصد ہے۔

☆☆☆

فصل اول

حروف کی آواز

(ورڑن اچارڑن)

۱۔ اردو حروف کے تلفظ۔ اردو میں کل ۳۷ حروف ہجا ہیں۔ ان میں تیس حروف عربی کے ہیں۔ تین حروف خالص ہندی کے ہیں۔ ایک حرف خالص فارسی کا ہے، اور تین حروف ہندی فارسی میں مشترک ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو :-

ا	د	ض	م
ب	(ڈ)	ط	ن
(پ)	ذ	ظ	و
ت	ر	ع	ھ
(ٹ)	(ڑ)	غ	ء
ث	ز	ف	ی
ج	(ژ)	ق	ے
(چ)	س	ک	
ح	ش	(گ)	
خ	ص	ل	

ان میں تین حروف (ٹ، ڈ، ڑ) ہندی سے مختص ہیں۔ حرف (ژ) فارسی سے مختص ہے۔ اور تین حرف (پ، چ، گ) ہندی فارسی میں مشترک ہیں۔ باقی ۳۰ حرف عربی کے ہیں۔ آخری حرف (یا) کی دو شکلیں اردو میں لکھی جاتی ہیں۔ گول اور لانبی۔ جن کے تلفظ میں معروف و مجہول کا فرق رہتا ہے۔ لہٰذا ان کو دو حرف شمار کیا گیا۔ حرف ('لا') جو ('لام الف') کہلاتا ہے جداگانہ حرف شمار نہیں کیا گیا، کہ وہ 'ل' اور 'ا' کا مجموعہ ہے اور مجموعہ کی حیثیت سے الفاظ میں استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ بعض تلفظوں کا امتیاز۔ مندرجہ ۳۷ حروف کے منجملہ ۳۱ حروف

کی آوازیں تو بالکل صاف اور واضح ہیں کہ تلفظ میں کسی اشتباہ کا احتمال نہیں۔ البتہ بقیہ ۶ حرف کے تلفظ میں احتیاط سے امتیاز ہوتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:-

(۱) (ت۔ط) ان میں (ت) کا تلفظ تو صاف اور واضح ہے۔ لیکن (ط) کا تلفظ باحتیاط ادا کرنا ضروری ہے۔ ورنہ سرسری طور پر (ت) سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ (ط) کا تلفظ بھاری مضبوط ہے۔ اور صحیح تلفظ میں (ط) (ت) سے بالکل ممیز ہے۔ لیکن عام طور پر تلفظ میں امتیاز کم رہتا ہے۔

(۲) (ث۔س۔ص) ان میں (س) کا تلفظ تو صاف اور واضح ہے۔ لیکن (ص) کے تلفظ کو باحتیاط ادا کرنا ضروری ہے۔ ورنہ سرسری طور پر (س) سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ (ص) کا تلفظ بھی بھاری مضبوط ہے۔ اور صحیح تلفظ میں (ص) (س) سے بالکل ممیز ہے۔ لیکن عام طور پر تلفظ میں امتیاز کم رہتا ہے۔ اور (ث) کے تلفظ میں تو امتیاز لطیف ہے۔ عام طور پر (س) اور (ث) میں امتیاز نہیں رہتا ہے۔

(۳) (ذ۔ز۔ض۔ظ) ان میں (ز) کا تلفظ تو صاف اور واضح ہے لیکن (ض) کے تلفظ کو باحتیاط ادا کرنا ضروری ہے۔ ورنہ سرسری طور پر (ز) سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ (ض) کا تلفظ بھی بھاری مضبوط ہے۔ اور صحیح تلفظ میں (ض) (ز) سے بالکل ممیز ہے۔ لیکن عام طور پر تلفظ میں امتیاز کم رہتا ہے۔ (ظ) کے تلفظ کی کیفیت بھی (ض) سے ملتی جلتی ہے، اور (ذ) کے تلفظ میں تو امتیاز اور بھی لطیف ہے۔ عام طور پر (ذ) اور (ز) میں امتیاز نہیں رہتا۔

حروف کا تلفظ اور بالخصوص مندرجہ بالا (۹) حروف کا تلفظ عربی میں فن قرأت کا ایک خاص بحث ہے۔ چنانچہ فن قراءت میں اس ناچیز نے جو ایک کتاب بعنوان تسہیل الترتیل تالیف کی ہے، شائع ہو چکی ہے۔ اس میں جملہ حروف کے تلفظ کی بحث تفصیل سے درج ہے۔ یہاں مزید صراحت کی گنجائش نہیں۔

۱۳۔ تحریک اصلاح۔ حاصل کلام یہ کہ (۳) حرف کے ساتھ (۶) حرف کے تلفظ میں بالعموم ایسی مشابہت پیدا ہو جاتی ہے کہ سرسری طور پر تمیز دشوار معلوم ہوتی ہے۔ یعنی (ت) کے ساتھ (ط) اور (س) کے ساتھ (ث) (ص) اور (ز) کے ساتھ (ذ) (ض) (ظ)۔ چنانچہ اصلاح پسندوں کی رائے ہے کہ گو لسانی اعتبار سے مانع ہوں گے اہم سہولت عامہ کی خاطر یہ (۶) حرف تحریر میں ترک کر کے باقی (۳) حرف یعنی (ت) (ز) اور (س) پر اکتفا کیا جائے تو املے کی ساری دشواری رفع ہو جائے گی۔ صرف یہی (۶) حرف ہیں جن سے اردو کے املے میں شک شبہہ پیدا ہوتا ہے۔ باقی سب حرف اپنے اپنے تلفظ میں صاف اور واضح ہیں۔ کوئی اشتباہ نہیں ہوتا۔

مذکورۂ بالا اصطلاح کی صورت میں اردو حروف کی تعداد (۳۷) کے بجائے (۳۱) رہ جائے گی اور آوازوں میں بلحاظ کیفیت کی کمی۔ لیکن بلحاظ کمیت کوئی کمی محسوس نہ ہوگی۔ پوری (۳۱) آوازیں صاف اور واضح رہ جائیں گی۔ ان آوازوں کا تقابل ہندی حروف کی آوازوں کے ساتھ آگے پیش ہوگا۔ (ملاحظہ ہو پارہ ۔ ۲۲)

مجوزہ بالا اصلاح کی ایک درمیانی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مذکورہ بالا (۹) مشتبہ حروف میں (۳) حرف (ث) (س) اور (ز) عام اساسی قرار دے دیئے جائیں کہ (ط) کے بجائے (ت) لکھی جائے۔ یا (ث) اور (ص) کے بجائے (س) لکھا جائے۔ یا (ذ) اور (ض) اور (ظ) کے بجائے (ز) لکھی جائے تو عملاً اس کو صحیح مانا جائے۔ لیکن جو قابلیت رکھتے ہوں وہ حرف (ط) (ث۔ص) اور (ذ۔ض۔ظ) بھی الفاظ میں ان کے محل پر لکھ سکتے ہیں۔ البتہ ان حروف میں غلطی کی جائے تو وہ غلطی شمار ہوگی۔ نتیجہ یہ کہ عام لوگوں کو اساسی حروف ت) (س) ور (ز) سے املے میں مطلوبہ سہولت عملاً حاصل ہو جائے گی۔ اور علمی لوگ بھی ادبی املا جاری رکھ سکیں گے۔ اور فرق تسلیم ہو جانے کی صورت میں کوئی التباس نہ ہوگا۔

۱۴۔ اردو حروف علت واعراب۔ اردو میں (۳۷) حروف صحیح کے مجملہ تین حرف حروف علت کا بھی کام دیتے ہیں۔ یعنی (الف) (و)، ور (ی) جن کو مجموعی طور پر (وائے) کہتے ہیں اور حروف علت کی علامات جو اعراب کہلاتی ہیں ذیل میں ملاحظہ ہوں:-

(الف) کی مناسبت سے فتحہ یا زبر مثلاً سَر

(ی) کی مناسبت سے کسرہ یا زیر مثلاً سِر

(و) کی مناسبت سے ضمہ یا پیش مثلاً سُر

ان کے سوا بھی تین اعراب ہیں۔ یعنی:-

(۱) سکون کی علامت جزم (ْ)

(۲) سکون و حرکت کا اجتماع تشدید (ّ)

(۳) حرکت کا طول مد (ٓ)

حرف علت واعراب کی مزید تشریح ہندی حروف کے تحت آئندہ پیش ہوگی۔ جس سے تقابلی کیفیت بخوبی واضح ہو جائے گی (ملاحظہ ہو پارہ ۲۵ و ۲۶)۔

۱۵۔ ہندی حروف کے تلفظ۔ اردو حروف (۳۷) کے مقابل ہندی حروف کی تعداد (۵۳) ہے۔ یعنی تقریباً (۵۰) فیصد زیادہ یوں کہیئے کہ اردو سے ڈیوڑھی۔ چنانچہ تفصیل ملاحظہ ہو۔

حروف علت۔ سُوَر=स्वर(۱۶) عدد

अ	आ	इ	ई	उ	ऊ
اَ	آ	اِ	ای	اُ	او
ऋ	ॠ	ॡ	ऌ	ए	ऐ
رر	رری	لر	لری	اے	اَی
ओ	औ	अं	अः		
اُو	اَوْ	اں	اَہ		

حرف صحیح۔ وینجن=व्यंजन(۳۷) عدد

ک	کھ	گ	گھ	ڑن
क	ख	ग	घ	ङ
چ	چھ	ج	جھ	ین
च	छ	ज	झ	ञ
ٹ	ٹھ	ڈ	ڈھ	ڑ
ट	ठ	ड	ढ	ण
ت	تھ	د	دھ	ن
त	थ	द	ध	न
پ	پھ	ب	بھ	م
प	फ	ब	भ	म
ی	ر	ل	و	ش
य	र	ल	व	श
ش	س	ہ	ڑ	کش
ष	स	ह	ळ	क्ष
تر	گین			
त्र	ज्ञ			

۱۶۔ ہندی حروف صحیح میں دس حرف مرکب۔ اردو کے سب حرف تلفظ میں مفرد ہیں۔ لیکن ہندی کے حروف صحیح (ونجن) میں (۳۷) کے منجملہ صرف (۲۴) حرف تلفظ میں مفرد (شدھ) ہیں۔ اور باقی (۱۳) حرف تلفظ میں مرکب (سنیکت) ہیں۔ اور ان (۱۳) کے منجملہ (۱۰) حرف مرکب دس حرف مفرد سے متعلق ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہوں:-

حرف مفرد (اشدھ)	حرف مرکب (سنیکت)
क (ک)	ख (کھ)
ग (گ)	घ (گھ)
च (چ)	छ (چھ)
ज (ج)	झ (جھ)
ट (ٹ)	ठ (ٹھ)
ड (ڈ)	ढ (ڈھ)
त (ت)	थ (تھ)
द (د)	ध (دھ)
प (پ)	फ (پھ)
ब (ب)	भ (بھ)

گویا مندرجہ بالا فہرست میں جو دس حرف مفرد اول درج ہیں۔ ان کے ساتھ حرف (ھ) گھل جانے سے مزید دس حرف مرکب جدا بن گئے۔ جو ان کے مقابل درج ہیں۔ اور جن کا تلفظ مرکب ہے۔ تاہم یہ حرف بھی مفرد شمار ہوتے ہیں۔

۱۷۔ ہندی میں حرف ھ کا پیچ۔ لیکن تعجب یہ کہ ہندی کے جو باقی حرف صحیح ہیں۔ ان کے ساتھ حرف (ھ) اس طرح نہیں گھلتا۔ نہ ان سے اس طرح جداگانہ حرف مرکب بنتے ہیں۔ بلکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ یعنی حرف (ھ) کی آواز ان سے کسی طرح میل نہیں کھاتی۔ بلکہ بہر صورت جدا رہتی ہے۔ چنانچہ ہندی میں لفظ (نھ نا) لکھنا چاہیں تو نہیں لکھ سکتے۔ کیوں کہ حرف (न-ن) کے ساتھ حرف (ھ) کا تلفظ نہیں ملتا۔ پس لکھیں تو ہندی میں (نہانا) لکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح لفظ (ننھا) نہیں لکھ سکتے۔ البتہ (ننہا) لکھ سکتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا (چولھا) یا (کولھا) یا (کولھو) نہیں لکھ سکتے۔ البتہ (چولہا) یا (کولہا) یا (کولہو) لکھ سکتے ہیں۔ وجہ وہی ہے کہ حرف (न-ن) کی طرح حرف (ल-ل) کے ساتھ بھی حرف (ھ) کا تلفظ نہیں ملتا۔ حرف (ड़-ڑ) کے ساتھ بھی یہی صورت ہے۔ چنانچہ ہندی میں (ٹیڑھا) نہیں لکھ سکتے البتہ (ٹیڑہا) لکھ سکتے ہیں۔ حالانکہ سیدھا) لکھ سکتے ہیں کہ حرف (ध-دھ) مرکب موجود ہے۔ اور ایسے ہی بہت سے الفاظ ہیں جن میں (ھ) متعلقہ حرف صحیح سے نہیں ملتی۔ لہٰذا وہ لفظ ہندی میں صحیح نہیں لکھے جا سکتے۔ حالانکہ اردو میں ایسے تمام الفاظ بے تکلف لکھے جاتے ہیں۔

غرض کہ ہندی میں حرف (ھ) کی عجب کیفیت ہے۔ بعض حروف میں ایسی گھلتی ہے کہ جدا حرف مرکب بن جاتے ہیں۔ اور بعض حروف سے ایسی چھٹتی ہے کہ مرکب حرف تو درکنار مرکب آواز تک نہیں بن سکتی۔ حالانکہ اردو میں (ھ) کی آواز بلا تکلف ہر حرف کے ساتھ گھلتی ہے۔ کوئی تفریق نہیں رہتی۔ اسی سبب اردو میں ہندی کی طرح حروف مرکب کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی اور لطف یہ کہ اگر ہندی کی طرح (ھ) کی آواز کو جدا رکھنا چاہیں تو بھی اردو میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ حرف (ھ) کی شکل میں ذرا سا فرق کر دیتے ہیں (بھاری) (بہاری) یا (کھاری) (کہاری) یا (پھلی) یا (پہلی) یا (بھلانا) (بہلانا) یا کھلانا (کہلانا)۔ غرض کہ ہر (ھ) کا معاملہ ہندی میں جس درجے طویل اور پیچیدہ ہے۔ اسی درجے میں اردو میں مختصر اور صاف ہے۔ اور یہ حرف بکثرت الفاظ میں مستعمل ہے۔

۱۸۔ ہندی حروف صحیح میں خاص تین حرف مرکب۔ مذکورہ بالا (۱۰) حرف صحیح گرچہ تلفظ میں مرکب ہیں کہ ان میں (ھ) کی آمیزش ہے۔ تاہم وہ معمولاً مرکب نہیں کہلاتے۔ البتہ تین حرف اور ہیں جو باقاعدہ حرف مرکب (سنیکت ورڑن) کہلاتے ہیں۔ ان کی ترکیب زیادہ پیچیدہ ہے۔ اور ان کی آوازیں ترکیب کے سبب ایسی رقیق ہوگئی ہیں کہ تلفظ میں مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تحریر میں بھی توجہ درکار ہے۔ ورنہ غلطی کا اندیشہ ہوتا ہے:-

(۱) حرف (क-ک) اور حرف (ष-ش) کا مرکب حرف (क्ष-کش)
(۲) حرف (ग-گ) اور حرف (ञ-ین) کا مرکب حرف (ज्ञ-گین)
(۳) حرف (त-ت) اور حرف (र-ر) کا مرکب حرف (त्र-تر)

ان تینوں حروف مرکب کا تلفظ رقیق ہے اور مشق سے زبان پر جمتا ہے۔ دوسرے حرفوں کی طرح حروف علت کے ساتھ ان کی گردان کیجیے تو تلفظ کا اندازہ ہوتا ہے۔ حروف علت اور ان کی علامات آئندہ بیان ہوں گی (ملاحظہ ہو پارہ ۲۴)

یہاں ضرورتاً چند مثالیں پہلے درج ہیں:-

क्ष क्षा क्षि क्षी क्षु क्षू क्षे क्षै क्षो क्षौ क्षं क्षः

त्र त्रा त्रि त्री त्रु त्रू त्रे त्रै त्रो त्रौ त्रं त्रः

ज्ञ ज्ञा ज्ञि ज्ञी ज्ञु ज्ञू ज्ञे ज्ञै ज्ञो ज्ञौ ज्ञं ज्ञः

حرف (क्ष۔کش) کا تلفظ لفظ کے شروع میں دشوار ہوتا ہے مشکل سے گرفت میں آتا ہے۔ جیسے क्षाधा یا क्षत्री البتہ لفظ کے درمیان کچھ گرفت میں آتا ہے مثلاً लक्ष्मी یا अक्षरों۔

حرف (ज्ञ۔گین) کا تلفظ تو اور بھی رقیق ہے۔ خاص کر لفظ کے شروع میں گرفت دشوار ہے۔ البتہ آخر میں کچھ گرفت ہوتی ہے۔ جیسے कृतज्ञ تاہم ایسے تلفظ مشق کے طالب ہیں۔

حرف (त्र۔تر) کا تلفظ نسبتاً کم دشوار ہے۔ خاص کر لفظ کے درمیان میں جیسے पत्री لیکن لفظ کے شروع میں اس کا تلفظ بھی دشوار ہے۔ جیسے त्रसय۔

بہر حال تینوں حرف مندرجہ مرکب ہیں۔ اور ان کا تلفظ بھی رقیق ہے۔ غور کیجئے تو ان کے سوا تین حرف اور بھی تلفظ میں مفرد نہیں بلکہ کسی نہ کسی حد تک مرکب ہیں۔ اور ان کے تلفظ میں غنغناہٹ ہے۔ یعنی حرف (ङ۔ڑن) حرف (ञ۔ین) اور حرف (ण۔نڑ) تاہم یہ حروف مفرد ہی شمار ہوتے ہیں، اور ان کے استعمال کی بھی خاص صورت ہے جو آئندہ پارہ (۲۱) کے تحت بیان ہوگی۔

بہر حال ہندی کے حروف صحیح (۳۷) کے منجملہ (۱۳) بلکہ ایک اعتبار سے (۱۶) حرف مرکب ہیں گرچہ ان میں صرف (۳) (سنیکت ورڑن) کہلاتے ہیں۔ ایسی صورت میں صرف (۲۴) بلکہ (۲۱) حروف مفرد رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ اردو کو (۳۷) حروف مفرد حاصل ہیں۔ اور اگر ان میں سے (۶) حرف جن کا تلفظ مشابہ ہے۔ منہا کر دیئے جائیں تو بھی اردو میں حروف مفرد کی تعداد (۳۱) رہتی ہے۔ یعنی ہندی کے مقابل (۱۰) یا کم از کم (۷) حرف مفرد اردو میں زیادہ ہیں۔ اور تلفظ کی وسعت کا مدار بیشتر حروف مفرد کی تعداد پر رہتا ہے کہ ان ہی سے مرکب تلفظ بنتے ہیں۔

۱۹۔ ہندی حروف صحیح مشابہ۔ ہندی کے حروف صحیح مفرد (۲۴) یا (۲۱) کے منجملہ دو حرف تلفظ میں از حد مشابہ ہیں۔ گویا ایک ہی حرف معلوم ہوتے ہیں یعنی (श۔ش) اور (ष۔ش) لیکن ہندی میں یہ دو حرف جدا مانے جاتے ہیں۔ اور ہر دو حرف کا موقع محل الفاظ میں سمجھنا، تحریر میں بہت دشواری پیدا کرتا ہے۔ تاہم فرق مسلم ہے اور اس درجہ اہم کہ ایک حرف کی جگہ دوسرے کا استعمال غلطی شمار ہوتا ہے۔ مثلاً (آشا) میں حرف (श۔ش) کا استعمال ہے اور لفظ (بھاشا) میں حرف (ष۔ش) کا استعمال یعنی आशा اور भाषा۔ اگر اس کے خلاف لکھی تو غلطی سرزد ہوگی۔ حالانکہ دونوں لفظوں میں (شا) کا فرق محال معلوم ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا (دیش۔ देश) (بھیش۔ भेष) میں بھی (ش) کا فرق رہتا ہے۔ غرض ہندی میں دو (ش) ہیں۔ اور فرق بہت دقیق ہے۔ مزید تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ بلحاظ تلفظ اگر ایک (ش) کو بطور زائد نظر انداز کر دیا جائے تو ہندی حروف صحیح میں حروف مفرد کی تعداد پھر (۲۴) کے بجائے (۲۳) یا (۳۰) کے بجائے (۲۰) رہ جاتی ہے۔ حالانکہ اردو میں حروف مفرد کی تعداد (۳۷) یا کم از کم (۳۱) ہے۔

۲۰۔ ہندی حروف صحیح متبادل۔ مندرجہ بالا (۲۴) یا (۲۳) منجملہ (۵) حرف متبادل حروف کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ یعنی ایک ہی حرف علت (अं۔ن ساکن) کے بجائے اپنے اپنے موقع محل پر استعمال ہوتے ہیں۔ اور تلفظ میں دقیق فرق پیدا کرتے ہیں۔ اس سے لکھنے پڑھنے میں جو پیچیدگی پیدا ہوتی ہے اس کی مختصر تشریح ذیل میں پیش ہے۔ رہی خود حرف علت (अं۔ن ساکن) کی بحث سو وہ حروف علت (سور) کے تحت جداگانہ پیش ہوگی۔ (ملاحظہ ہو پارہ ۲۳ و ۲۴)

۲۱۔ ہندی حروف صحیح میں (۵) ورگ۔ ہندی حروف صحیح (۳۷) کے منجملہ پہلے (۲۵) حرف (क) سے لے کر (म) تک (سپرش ورڑن) کہلاتے ہیں۔ باقی (۱۲) حروف کے منجملہ چار حرف (य) (र) (ल) (व) (انتھ ورڑن) اور چار حرف (श) (ष) (स) (ह) اور (اوشم ورڑن) کہلاتے ہیں۔ جو چار حرف باقی رہے۔ ان میں تین تو حرف مرکب ہیں (سنیکت ورڑن) جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یعنی (क्ष) (त्र) اور (ज्ञ) اور چوتھا حرف (ड़۔ڑ) دراصل ہندی حرف نہیں ہے۔ بلکہ مرہٹی سے مستعار لے لیا گیا ہے۔ اس لئے یہ باقی چار حرف کسی قسم خاص میں شمار نہیں ہوتے۔

بہر حال یہاں فی الوقت (سپرش ورڑن) کے (۲۵) حروف سے بحث ہے۔ سو یہ (۲۵) حروف جملہ (۵) ورگوں میں تقسیم ہیں۔ اور ہر ورگ میں (۵) حرف شامل ہیں۔ علی الترتیب۔ چنانچہ:-

(۱) پہلا ورگ (क۔ک) سے شروع ہوتا ہے اور (کورگ) کہلاتا ہے۔ اس کا آخری پانچواں حرف (ङ۔ڑن) ہے۔

(۲) دوسرا ورگ (च۔چ) سے شروع ہوتا ہے اور (چورگ) کہلاتا ہے۔ اس کا آخری پانچواں حرف (ञ۔ین) ہے۔

(۳) تیسرا ورگ (ट۔ٹ) سے شروع ہوتا ہے اور (ٹورگ) کہلاتا ہے۔ اس کا آخری پانچواں حرف (ण۔نڑ) ہے۔

(۴) چوتھا ورگ (त۔ت) سے شروع ہوتا ہے اور (تورگ) کہلاتا ہے۔ اس کا آخری پانچواں حرف (न۔ن) ہے۔

(۵) پانچواں ورگ (प۔پ) سے شروع ہوتا ہے اور (پورگ) کہلاتا ہے۔ اس کا آخری پانچواں حرف (म۔م) ہے۔

پانچوں ورگ کے یہی آخری (۵) حرف یعنی (ङ) (ञ) (ण) (न) (म) حرف علت (अं۔ن ساکن) کے بجائے اپنے اپنے ورگ میں متبادل ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ (अं۔ن ساکن) کی آواز کے بعد کا حرف صحیح جس ورگ میں شامل ہو، اسی ورگ کا آخری پانچواں حرف۔ حرف علت (अं۔ن ساکن) کے بجائے لفظ میں استعمال ہوگا۔ البتہ ایک فرق ہے کہ صرف (न) (म) یعنی صورت میں صرف نصف لکھے جاتے ہیں۔ (ण) (ञ) اور باقی تین سالم رہتے ہیں۔ یا دو نصف نصف۔ مگر ایک حرف (ङ) بہر صورت سالم رہتا ہے۔

چند مثالوں سے مندرجہ بالا تقسیم بخوبی واضح ہوجائے گی۔ مثلاً اگر لفظ (پتنگ) لکھنا چاہیں تو چونکہ (अं۔ن ساکن) کی آواز کا حرف مابعد (ग۔گ) پہلے ورگ (کورگ) میں شامل ہے۔ اس لئے (अं۔ن ساکن کی علامت ं) کے بجائے پہلے ورگ کا آخری پانچواں حرف (ङ۔ڑن) استعمال ہوگا۔ یعنی पतङ्ग اور اس لفظ کا تلفظ مشق طلب ہے۔ علیٰ ہذا لفظ (پلنگ) کو لکھیں گے۔ पलङ्ग اس کے تلفظ کا بھی وہی حال ہے۔ مشق کی ضرورت ہے۔ علیٰ ہذا (گنگا) کو لکھیں گے गङ्गा۔ وہی موٹا غننا تلفظ ہے۔ اور چند لفظ لیجیے جن کا تلفظ اردو میں صاف سلیس ہے۔ مگر ورگ کے قاعدہ سے وہ ہندی میں موٹا غننا ہوجاتا ہے۔ جیسے (شنکر) शङ्कर یا (پنکھا) पङ्खा یا (کنگھا) कङ्घा۔ پھر تلفظ کی دشواری کے سوا لفظوں کی شکل دیکھئے۔ ان میں حروف (क) (ख) (ग) (घ) جس طرح حرف (ङ) کے نیچے معلق ہیں اس سے ہندی حروف کی ترکیب میں بے محلی ظاہر ہوتی ہے۔ حروف کی ترکیبوں میں بکثرت ایسی بے محل شکلیں پیدا ہوتی ہیں جن میں سے کچھ آئندہ فصل سوم میں بیان ہوں گی۔

علیٰ ہذا دوسرے ورگ (چورگ) میں مقررہ قاعدہ کے بموجب حرف (अं۔ن ساکن کی علامت ं) کے بجائے حرف (ञ۔ین) استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً अञ्जन (انجن)، मञ्जन (منجن)، कञ्जन (کنجن)۔

علیٰ ہذا تیسرے ورگ (ٹورگ) میں حرف (अं۔ن ساکن کی علامت ं) کے بجائے حرف (ण۔نڑ) استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً (پنڈت) کو لکھیں گے पण्डित۔ تکلف ظاہر ہے۔ علیٰ ہذا۔ कण्ठ (کنٹھا)، ठण्डा (ٹھنڈا)، झण्डा (جھنڈا)۔ غرض کہ تلفظ موٹا غننا ہوجاتا ہے۔

چوتھے اور پانچویں ورگ یعنی (تورگ اور پورگ) میں حرف (अं۔ن ساکن کی علامت ं) کے بجائے علی الترتیب حرف (न۔ن) اور حرف (म۔م) نصف نصف لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً आनन्द (آنند) अन्धा (اندھا)، बन्द (بند)، अम्बा (انبا)۔

پھر یہ پانچوں حرف صحیح بجائے خود بھی متحرک استعمال ہوتے ہیں گرچہ بعض کم ہوتے ہیں۔ ان میں دو حرف (न۔ن) اور (म۔م) کا تلفظ تو صاف ہے۔ لیکن پہلے تین حرف (ङ) (ञ) اور (ण) کے تلفظ میں غنناہٹ ہے۔ اور مشق کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ مثلاً دوسرے حرفوں کی طرح حروف علت کے ساتھ ان کی گردان کیجیے تو تلفظ کا اندازہ ہوتا ہے۔ حروف علت اور ان کی علامات آئندہ بیان ہوں گی۔ (ملاحظہ ہو پارہ ۲۴)

یہاں ضروریاً چند مثالیں درج ہیں:-

ङ ङा ङि ङी ङु ङू ङे ङै ङो ङौ ङं ङः

ञ ञा ञि ञी ञु ञू ञे ञै ञो ञौ ञं ञः

ण णा णि णी णु णू णे णै णो णौ णं णः

ان میں حرف (ण۔نڑ) بطور حرف صحیح متحرک باقی دو حرفوں کے مقابل زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً स्मरण یا ब्राह्मण یا बाण۔ سب لفظوں میں غنناہٹ ہے۔ اور جب یہ حرف (ण) ترکیب میں دو مرتبہ متصل واقع ہو تو تلفظ کی غنناہٹ مشکل سے گرفت میں آتی ہے۔ مثلاً निवण्ण یا विषण्ण۔ ایسے الفاظ کے تلفظ میں اچھے اچھوں کی مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ باقی دو حرف (ङ) اور (ञ) بیشتر اپنے اپنے ورگوں میں (अं۔ن ساکن) کے بجائے بطور حرف متبادل استعمال ہوتے ہیں۔ بطور حرف صحیح متحرک بہت کم استعمال ہوتے ہیں۔ گویا عملاً یہ دونوں ایک ہی حرف علت (अं۔ن ساکن) کے قائم مقام رہتے ہیں۔

۲۲۔ اردو ہندی حرف صحیح کی آوازیں۔ حاصل کلام یہ کہ (۳۷) حروف صحیح (ونجن) کے منجملہ کم از کم (۱۳) حرف تو مرکب (سنیکت) ہیں۔ باقی زیادہ سے زیادہ (۲۴) جو مفرد (شدھ) ہیں۔ ان میں بھی دو کی آواز (ش) از حد مشابہ ہیں۔ گویا عملاً دونوں حرفوں سے ایک ہی آواز نکلتی ہے، البتہ حرفوں کے استعمال میں فرق رہتا ہے۔ جس سے لامحالہ حیرانی پیدا ہوتی ہے۔ ان کے سوا حرف صحیح (ङ) اور (ञ) جو خود بھی ایک حد تک حرف مرکب ہیں۔ بیشتر حرف علت (अं۔ن ساکن) کے بجائے الفاظ میں کام دیتے ہیں۔ گویا معمولاً اس کے بدل یا قائم مقام ہیں۔ پس ہندی میں عملاً حرف صحیح مفرد (۲۱) رہ جاتے ہیں۔ اور اگر حرف (ण۔نڑ) بھی تلفظ کے مدنظر مرکب مان لیا جائے تو پھر ہندی میں حروف صحیح مفرد صرف (۲۰) قرار پاتے ہیں۔ اور یہ وہی ہندی حرف ہیں جو اردو حروف میں شامل ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:-

ب	ब	س	स
پ	प	ش	श یا ष
ت	त	ک	क
ٹ	ट	گ	ग
ج	ज	ل	ल
چ	च	م	म
د	द	ن	न
ڈ	ड	و	व
ر	र	ہ	ह
ڑ	ड़	ی	य

غرض اردو کے (۳۷) یا کم از کم (۳۱) حروف صحیح کے منجملہ (۲۰) حرف صحیح حسب تفصیل بالا ہندی میں ملتے ہیں۔ رہے اردو کے باقی (۱۷ یا ۱۱) حروف سو ان میں اول تو ہندی کا ایک حرف (य۔ی) اردو کے دو حرف (ی معروف و ے مجہول) کی جگہ شمار ہوا ہے۔ دوسرے حرف (الف) ہندی کے حروف علت کے تحت شامل ہے۔ اور باقی (۱۵) یا (۹) اردو حروف حسب تفصیل ذیل ہندی میں ندارد ہیں۔ حالانکہ ہندی حروف کی مجموعی تعداد اردو کے مقابل ڈیوڑھی ہے۔ یعنی (۳۷) کے مقابل (۵۳) اور حروف صحیح بھی دونوں زبانوں میں برابر ہیں (۳۷)(۳۷)۔

(ا) عام صاف اور واضح آوازیں (۹)۔ (ح) (خ) (ذ) (ز)

(ع)(غ)(ف)(ق) اور حرف (ہ) ختم لفظ پر جیسے سینہ۔ شیشہ۔

(ب) دیگر خاص متشابہ آوازیں (۶)۔ (ط) (ذ۔ظ۔ض) (ث۔ص)۔

گویا یوں تو اردو ہندی کے حروف صحیح بلحاظ تعداد (۳۷)(۳۷) مساوی ہیں۔ تاہم (۱۵) یا کم از کم (۹) صاف اور واضح آوازیں اردو حروف کی ہندی حروف میں نادار ہیں جو اردو میں بکثرت مستعمل ہیں۔

اس کے مقابل سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کچھ ہندی حروف صحیح کی آوازیں اردو حروف میں بھی نادار ہیں۔ یا سب کی سب ادا ہوتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندی کے (۲۰) حرف صحیح مفرد کی آوازیں اردو حروف میں موجود ہیں۔ چنانچہ صراحت اوپر درج ہو چکی ہے۔ حروف صحیح مرکب میں (۱۳) کے منجملہ (۱۰) آوازیں جو حرف (ھ) کی مرکب ہیں۔ اردو میں بے تکلف استعمال ہوتی ہیں۔ بلکہ (ھ) کی مرکب آوازیں تو اردو میں ہندی سے کہیں بڑھ کر ادا ہوتی ہیں۔ چنانچہ تفصیل اوپر درج ہو چکی ہے۔ (ملاحظہ ہو پارہ ۱۷) بہر حال ہندی حروف صحیح کی (۳۰) آوازیں (۳۷) کے منجملہ اردو حروف میں ملتی ہیں۔

البتہ تین حرف مرکب یعنی (क्ष۔کش) (त्र۔تر) اور (ज्ञ۔گین) کی آوازیں اردو حروف میں نہیں ملتیں۔ اور خود ہندی میں بھی یہ آوازیں خالی از تکلف نہیں ہیں۔ کہ رقیق ہیں۔ جن کے لکھنے پڑھنے میں احتیاط درکار ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا (مزید تین حرف یعنی (ङ۔ڑن) (ञ۔ین) اور (ण۔نڑ) جو کسی نہ کسی حد تک مرکب ہیں۔ گو مفرد شمار ہوتے ہیں۔ یہ بھی اردو حروف میں نہیں ملتے۔ خاص وجہ یہ کہ اردو حروف تلفظ میں تمام تر مفرد ہیں۔ جن سے مرکب آوازیں بن سکتی ہیں لیکن خود حروف کی آوازیں ہندی کی طرح مرکب نہیں ہیں۔ مزید براں مذکورہ تینوں حروف کی آواز میں جو غنغناہٹ ہے۔ وہ بھی ہندی زبان کی ایک خصوصیت ہے۔

المختصر ہندی حروف صحیح (۳۷) کے منجملہ (۲۰) حروف مفرد کی آوازیں اردو حروف میں معمولاً ملتی ہیں۔ مزید براں (۱۰) حروف مرکب جن میں حرف (ھ) کی آمیزش ہے، ان کی آوازیں بھی اردو میں بے تکلف استعمال ہوتی ہیں۔ البتہ (۶) ہندی حروف صحیح کی مرکب آوازیں جو یا تو رقیق ہیں یا غنغنی ہیں۔ اردو میں بے تکلف ادا ہو سکتی ہیں۔ اور خود ہندی میں بھی خالی از تکلف نہیں ہیں۔ نیز حرف (ش) ہندی میں دو مرتبہ شمار ہوتا ہے۔ حالانکہ اردو میں ایک مرتبہ شمار ہوا ہے۔ اس طرح ہندی حروف صحیح کی تعداد (۳۷) پوری ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اردو حروف کی (۱۵) یا کم از کم (۹) مفرد آوازیں ہندی حروف میں نادار ہیں۔ اور ہندی حروف کی (۶) مرکب آوازیں اردو حروف میں نہیں ملتیں۔ البتہ بہ تکلف ادا ہو سکتی ہیں۔ اور خود ہندی میں بھی خالی از تکلف نہیں ہیں۔

اردو حروف کی جو صاف اور واضح آوازیں ہندی حروف میں نہیں ملتیں ان میں سے بعض آوازیں شامل کرنے کے واسطے ہندی حروف پر نقطوں کا اضافہ تجویز ہوا ہے۔ یعنی:

(خ) کے واسطے (ख۔کھ) پر نقطہ جیسے (ख़۔خ)

(ز) کے واسطے (ज۔ج) پر نقطہ جیسے (ज़۔ز)

(ع) کے واسطے (अ۔اَ) پر نقطہ جیسے (अ़۔ع)

(غ) کے واسطے (ग۔گ) پر نقطہ جیسے (ग़۔غ)

(ف) کے واسطے (फ۔پھ) پر نقطہ جیسے (फ़۔ف)

(ق) کے واسطے (क۔ک) پر نقطہ جیسے (क़۔ق)

علیٰ ہذا باقی دو حرف بھی نقطوں کے ذریعے ہندی میں لا سکتے ہیں۔ یعنی:

(ح) کے واسطے (ह۔ہ) پر نقطہ جیسے (ह़۔ح)

(ژ) کے واسطے (ज۔ج) پر دو نقطے جیسے (ज़़۔ژ)

البتہ حرف (ھ) یا (ہ) کا معاملہ ٹیڑھا ہے۔ چنانچہ پارہ ۱۷ اور نیز اسی پارہ میں اس کی کیفیت اوپر بیان ہو چکی ہے۔

بہر حال ہندی حروف میں نقطوں کا استعمال بہت کم تھا۔ چنانچہ اپنے محل پر یہ صراحت درج ہے۔ لیکن زبان کی ضرورتوں نے بالآخر ہندی کو بھی حرفوں میں نقطے استعمال کرنے پر مجبور کر دیا۔

۲۳۔ ہندی حروف علت۔ اردو حروف علت تحت پارہ (۱۳) اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ ہندی میں (۵۳) حروف کے منجملہ حروف علت (سور) (۱۶) ہیں۔ جو اس فصل میں تحت پارہ (۱۵) پہلے درج ہو چکے ہیں۔ اعادے ضرورت نہیں۔

حروف صحیح (ونجن) کی طرح حروف علت (سور) کی بھی ہندی میں دو قسم ہیں۔ یعنی (شدھ) اور مرکب (سنیکت) سچ پوچھئے تو حروف مرکب ہی نے ہندی حروف کی تعداد بہت بڑھا دی۔ شکلیں بہت بڑھا دیں۔ ترکیب میں پیچیدگیاں بڑھا دیں۔ ورنہ اردو میں حروف کی تمام آوازیں مفرد ہیں۔ اور مفرد آوازوں سے بیشتر مرکب آوازیں حسب ضرورت بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں ہندی کے مقابل حروف کی مجموعی تعداد کم ہے یعنی (۵۳) کے مقابل (۳۷) لیکن آوازوں کی تعداد زیادہ ہے۔ آوازوں کی ترکیب میں سہولت زیادہ ہے۔ اور ترکیب کی شکلیں بھی سادہ مختصر ہیں۔ چنانچہ کچھ صراحت اوپر پیش ہو چکی ہے۔ مزید آئندہ پیش ہوگی۔

سولہ (۱۶) حروف علت کے منجملہ (۱۰) حروف میں (۵)(۵) حرف مفرد مرکب ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:-

شدھ سور	سنیکت سور
अ - اَ	आ - آ
इ - اِ	ई - ای
उ - اُ	ऊ - اُو
ऋ - رِ	ॠ - رری
ऌ - لِر	ॡ - لری

مندرجہ بالا تقسیم کے سوا باقی (۶) حرف علت بھی مرکب (سنیکت) ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہوں:-

ए - اے	ऐ - ائی
ओ - او	औ - اؤ

अं ـ ان   अः ـ اہ

المختصر (۱۶) حرف علت (سور) کے منجملہ صرف (۵) حرف مفرد (شدھ) ہیں اور باقی ۱۱) مرکب (سنیکت) ہیں۔ حالانکہ اردو میں ان تفریقات کی ضرورت نہیں۔ تین حرف علت جو مفرد ہیں۔ اور ان کے چند اعراب تقریباً تمام آوازیں ادا کردیتے ہیں۔ سوائے (ر) کی مندرجہ بالا چار آوازوں کے جو خود ہندی میں بھی رقیق ہونے کے سبب باعث تکلف شمار ہوتی ہیں۔ اور یوں بھی وہ تلفظ کے معیار پر حرف (ऋ۔ر) سے متعلق ہیں۔ حروف علت میں ان کا شمار خالی از تکلف نہیں ہے۔

الحاصل حرف صحیح ہوں یا حرف علت۔ اردو میں سب مفرد ہیں۔ لیکن ہندی میں بلحاظ تلفظ تقریباً نصف حروف مفرد ہیں۔ اور باقی نصف مرکب۔ نتیجہ یہ کہ ہندی حروف کی مجموعی تعداد اردو سے ڈیوڑھی ہے۔ لیکن مفرد آوازیں اردو حروف کی ہندی سے ڈیوڑھی ہیں۔ اور ان سے حسب ضرورت مرکب آوازیں بن جاتی ہیں۔ چنانچہ تفصیل اوپر درج ہوچکی ہے۔

۲۴۔ ہندی حروف علت کی علامات یعنی ماترا۔ پھر ہندی حروف علت کی علامات (ماترا) بھی ہیں جو حروف صحیح کے ساتھ استعمال ہوتی ہیں۔ صرف پہلے حرف علت (अ) کی کوئی ماترا نہیں کہ وہ ہر حرف کے آخر میں مضمر رہتا ہے۔

حرف علت (سور)	علامت (ماترا)	مثال
(الف) अ (ا)	ضرورت نہیں	क (ک)
आ (آ)	ा	का (کا)
इ (اِ)	ि	कि (کِ)
ई (ای)	ी	की (کی)
उ (اُ)	ु	कु (کُ)
ऊ (اُو)	ू	कू (کُو)
ए (اے)	े	के (کے)
ऐ (اَی)	ै	कै (کَی)
ओ (او)	ो	को (کو)
औ (اَو)	ौ	कौ (کَو)
(ب) ऋ (رِ)	ृ	कृ (کِر)
ॠ (رری)	ॄ	कॄ (کری)
ऌ (لر)	ॢ	कॢ (کلر)
ॡ (لری)	ॣ	कॣ (کلری)

(ج) باقی رہے دو حرف علت (अं۔ان۔ن ساکن) اور (अः۔اہ۔ہ ساکن) پہلے حرف کی علامت (ं) ہے جو (نسوار) کہلاتی ہے۔ اور دوسرے حرف کی علامت (ः) ہے جو (وسرگ) کہلاتی ہے جیسے कं اور कः خلاصہ یہ کہ حروف علت کی علامات (ماترا) کی تعداد بھی حروف کے برابر (۱۶) ہے۔

یہاں یہ یاددہانی بے محل نہ ہوگی کہ حرف علت (अं۔ن ساکن) کے استعمال کی پانچ صورتیں وہ ہیں جو (۵) ورگوں کے تعلق سے تحت پارہ (۲۱) اوپر بیان ہوچکی ہیں۔ اور ہر صورت میں یہ حرف بطریق بدل ایک جداگانہ شکل اختیار کرتا ہے۔ مزید صورتیں اس حرف (अं) کے استعمال کی ذیل میں تحت پارہ (۲۷) بیان ہوں گی۔ جس سے واضح ہوگا کہ ہندی میں حرف (अं) کا استعمال کس درجے دقیق و پیچیدہ ہے کہ اس کے استعمال میں اچھے اچھے حیران ہوتے ہیں۔

علیٰ ہذا حرف (ऋ۔ر) کا استعمال بھی ہندی میں دقیق اور پیچیدہ ہے کہ بڑے بڑے عاجز رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ متعدد صورتوں کے منجملہ چار صورتیں تو اوپر اسی پارہ میں اور نیز پارہ (۲۳) میں بیان ہوچکی ہیں۔ یعنی حرف علت ऋ (رر)، ॠ (رری)، ऌ (لر) اور ॡ (لری) اور ان کی چار ماترا جو اوپر درج ہوچکی ہیں۔ تلفظ میں تحریر میں ترکیب میں طوالت و پیچیدگی پیدا کرتی ہیں۔ بلکہ الفاظ کو چیستاں بنادیتی ہیں۔ ان کے سوا مزید صورتیں آگے درج ہیں۔

بہر حال دو حروف (ङ۔ن) اور (ऋ۔ر) کی طوالت اور پیچیدگیوں کی مزید تفصیل اسی فصل میں آئندہ پیش ہوگی۔ (ملاحظہ ہو پارہ ۔۲۷ و ۔۲۸)

۲۵۔ اردو ہندی حروف علت کا تقابل۔ تفصیل بالا سے واضح ہوگا کہ ہندی میں حروف علت اور ان کی علامات کا سلسلہ بھی خاصا طویل ہے۔ اور ایک حد تک دقیق و پیچیدہ ہے۔ اس کے مقابل اردو میں حروف علت صرف (۳) ہیں۔ یعنی (الف) (و) اور (ی) جن کا مجموعہ (وائے) کہلاتا ہے۔ پھر (و) اور (ی) میں ہر ایک کی دو قسم ہیں۔ (معروف) و (مجہول)۔ اردو میں معروف (ی) لکھتے ہیں اور مجہول (ے) چنانچہ اسی بنا پر یہ دو حرف (ی) جداگانہ شمار ہوئے۔ البتہ (و) معروف ہو یا مجہول ایک ہی شکل میں لکھا جاتا ہے۔ اور حرکت ماقبل سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا علامات (اعراب) بھی ان حرفوں کی مناسبت سے (۳) ہیں یعنی (زبر) (زیر) (پیش) حرکات میں حرف (ء) کو بھی شریک کرلیا جاتا ہے۔ اور اس مختصر مجموعہ سے ہندی کے دس (۱۰) حروف علت اور (۱۰) علامات کا کام بیشتر نکل جاتا ہے۔ اور کہیں بالفرض کچھ خفیف فرق رہ جائے تو سہولت و اختصار کے مدنظر وہ چنداں قابل لحاظ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی خاطر تلفظ میں دقت و پیچیدگی بڑھائی جائے۔ جس کی اصلاح میں خود ہندی والے فکرمند ہیں۔

باقی رہے (۶) حرف علت جو مد (الف) کے بعد مد (ب) اور مد (ج) میں پارہ (۲۴) کے تحت اوپر درج ہوچکے ہیں۔ اول تو بلحاظ تلفظ ان کو حرف علت شمار کرنا ہی غور طلب ہے۔ دوسرے ان میں سے (۴) حرف مد (ب) کی آوازیں جو حرف (ऋ۔ر) سے متعلق ہیں۔ اوپر بیان میں آچکی ہیں کہ وہ کس درجے باعث طوالت ہیں۔ اور ان کے رقیق تلفظوں میں فرق کس درجے دشوار ہے۔ تاہم یہ حروف سنسکرت ہندی کی خصوصیت ہیں۔ ان کے سوا باقی دو حرف علت (अं) اور (अः) اردو میں یوں ہی بلا تکلف ادا ہوتے ہیں۔

۲۶۔ اردو اعراب کی بعض خصوصیات۔ غرض کہ ہندی حروف علت کا کام بڑی حد تک چل جاتا ہے اور بآسانی چل جاتا ہے۔ لیکن اردو اعراب کی بعض خوبیاں اور سہولتیں ہندی میں بالکل ندارد ہیں۔ مثلاً تشدید (ّ) کے استعمال سے

ہندی ناواقف ہے۔ نتیجہ یہ کہ ایک ہی حرف دو مرتبہ لکھنا پڑتا ہے، جس سے طوالت کے سوا تحریر میں بدنمائی پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو:-

اِکّا इक्का یا اڈّا अड्डा گلّا गल्ला یا ٹھٹّی ठट्ठी

غرض کہ ہندی میں علامت تشدید (ّ) نہ ہونے سے تحریر میں عجیب عجیب طوالتیں پیش آتی ہیں۔ جن کی مزید کیفیت ترکیب حروف کے تحت فصل سوم میں بیان ہوگی۔

علیٰ ہذا ہندی میں (ہ) کا استعمال بھی ندارد ہے۔ جو لفظ کے آخر میں لگتی ہے۔ اور اعراب میں فتحہ یعنی زبر کا ساتھ دیتی ہے۔ مثلاً (شیشہ)۔ لیکن ہندی میں لکھنا چاہیں تو (شیش) لکھیں گے یا (شیشا) یا (شیشاہ) یا (شیشھ) لیکن (شیشہ) نہیں لکھ سکتے۔ علیٰ ہذا سینہ، آئینہ، راجہ جیسے الفاظ نہیں لکھ سکتے۔ جن کے آخر میں (ہ) شامل ہو۔ اور زبر کا ساتھ دیتی ہو۔

ہندی میں علامت جزم (ْ) بھی ندارد ہے۔ متعلقہ حروف کو بالعموم نصف کر کے سکون کا کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً (عَلَم) (अलम) اور (عِلْم) (इल्म) یا (مَلَک) (मलक) اور (مُلْک) (मुल्क) بہر حال نصف حرف کی بے محلی ظاہر ہے۔ اس کے سوا بھی جزم نہ ہونے کے سبب ترکیب میں حروف میں ترکیب کی بے محل شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ جن کی ضروری کیفیت فصل سوم میں بھی تحت پارہ (۳۷) درج ہے۔

۲۷۔ ہندی میں حرف (ن) کی طوالت۔ ہندی میں حرف (न۔ن) کے تلفظ میں اور تحریر میں جو پیچیدہ فرق پیدا ہوتے ہیں ان کی کیفیت ذیل میں ملاحظہ طلب ہے:-

اول تو ہندی میں حرف (न۔ن) کی دو کیفیتیں ہیں۔ ایک تو وہ حرف صحیح ہے (ونجن) اور حرف متحرک ہے۔ (اَجنت ورڑن) یعنی (ن متحرک) دوسرے وہ حرف علت ہے۔ (سور) اور حرف ساکن ہے (ہلنت ورڑن) یعنی (ن ساکن) پہلی حیثیت میں اس کی شکل (न) ہے اور دوسری حیثیت میں اس کی شکل ہے (अं) اور اس کی علامت ہے (ं) جو (انسوار) کہلاتی ہے۔

اول (अं۔ن ساکن) کی حیثیت ملاحظہ ہو۔ ہندی حروف صحیح (۳۷) کے منجملہ پہلے (۲۵) حرف (سپرس ورڑن) کہلاتے ہیں اور وہ (۵) ورگوں میں مساوی طور پر (۵) (۵) تقسیم ہیں۔ اور ہر ورگ میں حرف علت (अं) یا اس کی ماترا (ं) کے بجائے ورگ کا آخری پانچواں حرف استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ صراحت اوپر تحت پارہ (۲۱) درج ہو چکی ہے۔ تاہم خلاصہ ملاحظہ ہو:-

(۱) کو ورگ میں (अं یا ं) کے بجائے حرف (ङ۔ڑن)
(۲) چو ورگ میں (अं یا ं) کے بجائے حرف (ञ۔ین)
(۳) ٹو ورگ میں (अं یا ं) کے بجائے حرف (ण۔ڑ)
(۴) تو ورگ میں (अं یا ं) کے بجائے حرف (न۔ن لیکن نصف)
(۵) پو ورگ میں (अं یا ं) کے بجائے حرف (म۔م لیکن نصف)

ورگوں کے (۲۵) حرفوں کے سوا جو باقی حروف ہیں ان کے ساتھ ترکیب میں (ن ساکن) کے واسطے چار شکلیں مستعمل ہیں:-

(۱) अं جیسے अंजन (انجن)
(۲) ं (ماترا) جیسے निंदी (نندی)، फंदा (پھندا)
(۳) न (نصف) جیسے हिन्दी (ہندی)، बिन्दी (بندی)، कन्था (کنتھا)،
(۴) ँ (علامت چندر بندو) جیسے बाँस (بانس)، बँगला (بنگلہ)

غرض کہ (अं۔ن ساکن۔ ं ماترا) کی ہندی میں (۹) شکلیں رہتی ہیں۔ (۵) شکلیں (۵) ورگوں میں اور (۴) شکلیں ان کے سوا باقی حروف صحیح کے ساتھ حسب صراحت بالا۔ اور ہر شکل کا موقع محل سمجھنا ضروری ہے۔ بعض شکلوں کے موقع محل میں امتیاز کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ جب کہ تلفظ میں ذرا بھی فرق معلوم نہ ہو جیسے निन्दी (نندی) اور बिन्दी (بندی)۔

پھر (۳) حروف مرکب (سنیکت ورڑن) کے منجملہ ایک حرف (ज्ञ گین) میں بھی حرف (ञ۔ین) شامل رہتا ہے اور خود حرف (ञ۔ین) بھی حرف (न۔ن) کی ایک خاص شکل ہے جو دوسرے ورگ (چورگ) میں بجائے (अं یا ं) کام آتی ہے۔

پس تفصیل بالا سے واضح ہوگا کہ حرف علت (अं۔ن ساکن۔ ं ماترا) ہندی میں (۱۰) شکلیں اختیار کرتا ہے اور ہر شکل کا موقع محل جدا ہے۔ اور ہر شکل میں تلفظ جدا ہے۔ لیکن اکثر تلفظ ایسے دقیق یا رقیق ہیں کہ یا تو ان کا ادا کرنا دشوار ہے یا ان میں امتیاز کرنا دشوار ہے۔ چنانچہ صراحت اوپر درج ہو چکی ہے۔

حرف صحیح (न۔ن) اگر کسی لفظ کے آخر میں واقع ہو تو بحالت سکون اس کی دو آوازیں ہو سکتی ہیں۔ ایک خالی ایک بھری۔ خالی میں (न) کے نیچے ایک علامت لگاتے ہیں جیسے मान् (ماں) اور بھری میں کسی علامت کی ضرورت نہیں۔ جیسے मान (مان) اردو میں یہ فرق (ن) کے نقطے سے ظاہر کرتے ہیں۔ بھرے (ن) میں نقطہ لگاتے ہیں جیسے (مان) خالی (ں) میں نقطہ نہیں لگاتے جیسے (ماں)۔

خلاصہ یہ کہ ہندی میں بلحاظ تلفظ و تحریر و ترکیب حرف (न۔ن) کی جملہ دس بارہ شکلیں ہیں۔ جن کے استعمال میں مبتدی تو کیا متوسط بھی حیران رہتے ہیں۔ اور منتہی کو بھی توجہ درکار ہوتی ہے۔

۲۸۔ ہندی میں حرف (ر) کی طوالت۔ پھر حرف (र۔ر) کا استعمال ہندی میں حرف (न۔ن) سے بھی زیادہ طویل و پیچیدہ ہے۔ چنانچہ مختصر کیفیت ملاحظہ طلب ہے۔

اول تو حرف (र۔ر) خود ایک حرف صحیح ہے (ونجن) اور حرف متحرک ہے (اجنت ورڑن) پھر حرف صحیح (त्र۔تر) جو حرف مرکب ہیں (سنیکت ورڑن) اس میں بھی حرف (र۔ر) مضمر ہے اور وہ تلفظ میں آتا ہے مثلاً मात्रा (ماترا) پھر چار حرف علت ہیں (سور) جن میں (र) داخل ہے۔ ان چار میں بھی دو مفرد ہیں (شدہ) اور دو مرکب (سنیکت) چنانچہ صراحت پہلے درج ہو چکی ہے۔ وہ چار حرف

یہ ہیں۔

حرف مرکب	حرف مفرد
ॠ (رری)	ऋ (رر)
ॡ (لری)	ऌ (لر)

گویا حرف (र۔ر) کی (۲) شکلیں ہیں۔ ایک صحیح مفرد۔ ایک صحیح مرکب۔ دو علت مفرد۔ دو علت مرکب اور پھر ان کے تلفظ میں۔ ان کی تحریر میں ایسے دقیق فرق ہیں کہ اچھے اچھے چکراتے ہیں۔ غریب مبتدی یا متوسط کا تو ذکر کیا ہے۔

بہر حال (र۔ر) بحیثیت حرف (۲) شکلیں اختیار کرتی ہے۔ پھر (र) سے متعلق جو علامات (ماترا) استعمال ہوتی ہے وہ بھی قابل ملاحظہ ہیں:-

(الف) اول تو خود حرف صحیح (र) کی (۳) ماترا استعمال ہوتی ہیں۔ جن میں نصف (र) کی آواز نکلتی ہے اور ہر ایک کی شکل مختلف ہے۔

(۱) ماترا (र्) جب حروف کے درمیان حرف (र) ساکن آئے تو یہ ماترا حرف مابعد کے اوپر آخر میں لگتی ہے جیسے चर्खा (چرخا) वर्तन (برتن)۔

(۲) ماترا (्र) جب حروف کے درمیان حرف (र) متحرک آئے اور مفتوحہ ہو تو یہ ماترا حرف ماقبل کے پہلو میں جانب چپ لگتی ہے۔ جیسے प्राण (پرانڑ)، प्रेम (پریم) لیکن واضح ہو جن حروف میں علامت (ا پائی) شریک ہو ان ہی حروف میں یہ ماترا لگتی ہے۔ جیسے حرف (प) یا (म) لیکن جن حروف میں علامت (ا۔ پائی) شریک نہ ہو، جیسے (ड) یا (ट) ان میں (र) کی ماترا دوسری لگتی ہے۔ جو درج ذیل ہے۔ علامت (ا پائی) کی مزید تشریح فصل دوم میں تحت پارہ (۳۴) پیش ہوگی۔

(۳) ماترا (्र) جب حروف کے درمیان حرف (र) متحرک آئے اور مفتوحہ ہو تو یہ ماترا حرف ماقبل کے نیچے لگتی ہے۔ لیکن واضح ہو یہ ماترا ان ہی حروف میں لگتی ہے جن میں علامت (ا۔ پائی نہ ہو) مثلاً ट्रम (ٹریم) کہ حرف (ट) میں علامت پائی ندارد ہے۔

(ب) پھر حرف علت (سور) جن میں حرف (र) مضمر ہے۔ ان کی بھی (۴) علامت (ماترا) ہیں۔ مثلاً:

ماترا	حرف علت
ृ	ऋ (رر)
ॄ	ॠ (رری)
ॢ	ऌ (لر)
ॣ	ॡ (لری)

ان میں پہلا حرف علت (ऋ) لفظ کے شروع میں متحرک مکسورہ رہتا ہے۔ جیسے ऋषि (رشی) یا ऋण (رنڑ) اور اس کی ماترا (ृ) حروف کے درمیان متحرک مکسورہ رہتی ہے جیسے۔ कृपा (کرپا)، कृष्ण (کرشنڑ)، मृग (مرگ) علیٰ ہذا لفظ کے آخر میں بھی اس کا تلفظ مکسورہ رہتا ہے مگر رقیق جیسے पितृ (پتر)، मातृ (ماتر)۔

باقی (۳) حروف تلفظ و تحریر میں زیادہ رقیق و پیچیدہ ہیں۔ الجھن کے خوف سے تفصیل ترک ہے۔

الحاصل حرف (र) کی (۷) علامات (ماترا) اوپر بیان ہوئی۔ ان کے سوا بھی بعض حروف کے ساتھ حرف (र) ترکیب میں خاص خاص شکلیں اختیار کر لیتا ہے جو علامات کی حیثیت میں داخل ہیں، مثلاً

(۱) حرف (ह) کے ساتھ (र) ملے تو (र) کی خاص شکل بنتی ہے۔ ह्र جیسے ह्रद (ہرد)۔

(۲) حرف (द) کے ساتھ (र) ملے تو (र) کی خاص شکل بنتی ہے۔ द्र جیسے द्रग (درگ)۔

(۳) حرف (क) کے ساتھ (र) ملے تو (र) کی خاص شکل بنتی ہے۔ क्र جیسے चक्र (چکر)۔

الحاصل حرف (र) کی (۲) شکلیں بحیثیت حرف اور (۱۰) شکلیں بحیثیت علامات (ماترا) استعمال ہوتی ہیں۔ گویا (۱۲) شکلیں ہیں۔ حروف علت کی ماترا (۴) کے بجائے (۲) رکھیں کہ باقی دو خود حروف متعلقہ کی ہم شکل ہیں۔ تو بھی تعداد (۱۴) رہتی ہے۔ اور دقیق نظر میں تعداد بڑھ سکتی ہے۔ لیکن طوالت منظور نہیں۔ عام شکلوں پر اکتفا کی گئی اور ان ہی شکلوں کے تلفظ میں فرق کرنا۔ تحریر میں فرق کرنا۔ کافی حیران کن ہے۔ تاہم یہ فرق اپنی جگہ محکم و مسلم ہیں۔ ان کو نظر انداز کرنا غلطی کا موجب ہوتا ہے۔

۲۹۔ ہندی میں حرف (ڑ) مستعار۔ ہندی زبان حرف (ڑ) نہیں ہے بلکہ حرف (ळ۔ڑ) جو حروف صحیح کی فہرست میں درج ہے وہ دراصل مرہٹی زبان کا حرف ہے۔ البتہ ہندی میں دو حرف ایسے ہیں جن کے تلفظ میں (ن غنہ) اور نرم (ڑ) کی آواز (ر) کے قریب ملی رہتی ہے۔ ان حروف کا بھی صحیح تلفظ دشوار ہے۔ کافی تکلف درکار ہوتا ہے یعنی (ङ۔ڑن) اور (ण۔نڑ)۔ ان کی مزید کیفیت سابق میں بیان ہو چکی ہے۔ ان کی حیثیت بھی تقریباً حرف مرکب (سنیکت ورڑن) کی ہے۔ گرچہ یہ حرف مفرد (شدھ ورڑن) شمار ہوتے ہیں۔

۳۰۔ ہندی میں آخری حرف علت (اہ)۔ سولہ (۱۶) حروف علت کے منجملہ آخری حرف علت ہندی میں (:अ۔اہ) ہے۔ اول تو تلفظ کے معیار سے اس کا حرف علت ہونا غور طلب ہے۔ دوسرے یہ حرف بھی بعض دیگر حروف علت کی طرح مفرد نہیں مرکب ہے۔ تقریباً یہی آواز اردو میں حرف (ہ) سے نکلتی ہے۔ جیسے पुनः (پنہ) اور (گنہ)۔

ہندی میں حرف (ः۔ہ) کے تلفظ میں تحریر میں کیا دقت اور طوالت پیش آتی ہے اور اردو کے مقابل کیا خامی اور کمی ہے سابق میں تحت (۱۷) کیفیت درج ہو چکی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

المختصر ہندی کے (۱۶) حروف علت کا بیشتر کام اردو کے (۳) حروف علت سے بعض دیگر حروف کے ساتھ بڑی حد تک نکل جاتا ہے۔ رہی حرف (ر) کی

دقت سو وہ تلفظ و تحریر میں خود ہندی پر بار ہے اردو حروف میں ایسے تلفظ کی کمی عملاً کمی نہیں سمجھی جاتی۔

۳۱۔ ہندی حروف میں تلفظ و تحریر کی پیچیدگی۔ اوپر جو کچھ کیفیت پیش ہوئی اس سے اندازہ ہوگا کہ ہندی حروف کے تلفظ میں اور تلفظ کے تحت تحریر میں کیا طوالت و پیچیدگی لاحق ہوتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ طوالت و پیچیدگی کی صرف عام شکلیں بیان کی گئی ہیں۔ ورنہ ان کے بعد اور بھی مراحل پیش آتے ہیں۔ چنانچہ ان مراحل کا علم و عمل ایک خاص فنی شعبہ ہے جو ہندی قواعد میں (سندھی) کہلاتا ہے۔ حروف علت کے (گن) اور (وردھی) اور پھر حروف علت کی تفریق و ترکیب۔ اور ان کے تلفظ و تحریر میں تغیر و تبدل۔ علیٰ ہذا حروف صحیح کی تفریق و ترکیب اور ان کے تلفظ و تحریر میں تغیر و تبدل۔ اور ان کے ساتھ آخری دو حرف علت (अं) اور (अः) اور ان کی ماترا (ं و ः) کا استعمال۔ یہ جملہ مباحث فنی حیثیت سے علم و عمل میں طویل و پیچیدہ ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ایک فنی شعبہ شمار ہوتے ہیں۔ (سندھی) جس پر اچھے اچھوں کو عبور کم حاصل ہوتا ہے۔ اسی سبب سنسکرت عبارت لکھنے پڑھنے میں بڑی احتیاط اور توجہ درکار رہتی ہے۔ پھر بھی چیستان معلوم ہوتی ہے۔ یہاں فن (سندھی) کے متعلق سرسری اشارہ پر اکتفا کی گئی۔ تفصیل کا تو ذکر کیا اجمال کی بھی گنجائش نہیں کہ ناواقفوں کو حیرانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جن کو شوق ہو سنسکرت کی قواعد کا مطالعہ کریں۔ چونکہ ہندی کی بنیاد سنسکرت ہے۔ عبارت میں بھی اور رسم الخط میں بھی۔ لہٰذا سنسکرت کی خصوصیات ہندی میں منتقل ہوتی ہیں۔ بہ مدارج مختلف حسب معیار عبارت۔

۳۲۔ سنسکرت کی تخصیص۔ سنسکرت میں تلفظ، تحریر اور ترکیب کی تفریقیں اور پیچیدگیاں جو حیران کن پائی جاتی ہیں۔ ممکن ہے کسی حد تک اس کا باعث قدامت کی خامی ہو۔ تاہم بڑی حد تک وہ ارادی معلوم ہوتی ہیں۔ وجہ یہ کہ سنسکرت ایک قدیم مذہبی مقدس زبان ہے۔ جس کا لکھنا پڑھنا بھی ایک مذہبی مقدس جماعت کا مخصوص کام تھا۔ وہی جماعت زبان کی دقیق و طویل پیچیدگیوں کی ماہر ہو سکتی تھی۔ اور لوگوں کو دھرم کا گیان دے سکتی تھی۔ اسی سبب اپنے زمانے میں بھی سنسکرت عام زبان نہ تھی۔ بلکہ خاص مذہبی مقدس زبان تھی۔ اور مذہب کے طفیل میں ادبی و علمی شعبوں میں بھی خاص اہتمام سے استعمال ہوتی تھی۔ گویا اپنے مقصد و مرتبہ کے لحاظ سے دقت و پیچیدگی سنسکرت کی خوبی تھی کہ زبان ماہرین کے واسطے مخصوص تھی اور دوسروں سے محفوظ۔

حاصل کلام یہ کہ ہندی حروف تلفظ میں، تحریر میں، ترکیب میں، تفریقوں اور پیچیدگیوں کے طویل سلسلے رکھتے ہیں۔ جن کی مختصر کیفیت کچھ اوپر بیان ہوئی۔ اور کچھ آگے بیان ہوگی، تاکہ رسم الخط کی نوعیت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

☆☆☆

فصل دوم

حروف کی شکلیں

(ورڑن آکار)

۳۳۔ اردو حروف کی شکلیں۔ یوں تو اردو میں حروف کی مجموعی تعداد (۳۷) ہے۔ لیکن حروف کی شکلیں تعداد میں صرف (۲۰) ہیں۔ اس کفایت کا راز یہ ہے کہ مشابہ حروف میں نقطوں سے خوب کام لیا گیا ہے۔ دو ایک حروف میں دوسرا فرق رہتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:

(۱) ا (الف)
(۲) ب (پ ت ٹ ث)
(۳) ح (ج چ خ)
(۴) د (ڈ ذ)
(۵) ر (ڑ ز ژ)
(۶) س (ش)
(۷) ص (ض)
(۸) ط (ظ)
(۹) ع (غ)
(۱۰) ف
(۱۱) ق
(۱۲) ک (گ)
(۱۳) ل
(۱۴) م
(۱۵) ن
(۱۶) و
(۱۷) ہ
(۱۸) ء
(۱۹) ی
(۲۰) ے

اردو میں کمی تعداد کے سوا اشکال حروف کی تین خصوصیات اور بھی ہیں جو ہندی حروف کے مقابل فائق ہیں۔ اول یہ کہ ہر حرف کی ایک ہی شکل ہے۔ یہ نہیں کہ بعض حروف کی دو دو شکلیں ہوں۔ دوم یہ کہ شکلیں سادہ مختصر ہیں۔ طولانی پیچیدہ نہیں ہیں۔ تیسرے حروف کی شکلیں ایک دوسرے سے بخوبی مختلف اور ممیز ہیں۔ کچھ حروف مشابہ ضرور ہیں جن میں نقطوں وغیرہ کے ذریعے صاف امتیاز رہتا ہے۔ لیکن اردو میں یہ نہیں کہ حروف شکلوں میں مشابہ ہوں اور لکھنے پڑھنے میں اشتباہ پیدا کریں۔ اس کی مزید تشریح ہندی حروف کے ساتھ آگے پیش ہوگی۔ اگر علیحدہ

سرسری طور پر لکھے جائیں تو اردو میں صرف دو حرف مشابہ ہو سکتے ہیں یعنی (د) اور (و) لیکن ترکیب میں یہ حرف بھی ممیز ہو جاتے ہیں مثلاً والد خالو۔

۳۴۔ ہندی حروف کی شکلیں۔ ہندی حروف کی مجموعی تعداد (۵۳) ہے۔ اور ان کی شکلیں بھی جدا جدا (۵۳) ہیں۔ چنانچہ فصل اول میں تحت پارہ (۱۵) درج ہیں۔ بلکہ شکلیں (۵۳) سے زیادہ ہیں کہ بعض حروف دو دو شکلیں رکھتے ہیں۔ چنانچہ جن حروف کی دو دو شکلیں رائج ہیں ذیل میں ملاحظہ ہوں:-

अ یا अ	ल یا ल
छ یا छ	झ یا झ
ऋ یا ऋ	क्ष یا क्ष
ण یا रा	ञ یا

غرض کہ سات آٹھ حرف دو دو شکلیں رکھتے ہیں۔ اگر ان کی مزید شکلیں بھی شامل کی جائیں تو اشکال حروف کی مجموعی تعداد کم و بیش (۶۰) ہو جاتی ہے۔ گویا اردو اشکال (۲۰) کے مقابل سہ چند۔ وجہ یہ کہ نقطوں سے امتیاز حرف میں کام نہیں لیا گیا۔ ہندی میں صرف (۳) حروف کے ساتھ نقطہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی دو حرف علت (अं) (अः) اور ایک حرف صحیح (ड़)۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ حروف علت میں (۱۶) کے منجملہ (۹) حروف میں باقی (۷) حروف کے ساتھ قریبی مشابہت ہے۔ اس مشابہت کے مدنظر اشکال کی مجموعی تعداد (۶۰) کے بجائے (۵۱) بھی شمار ہو سکتی ہے۔ پھر بھی اردو سے ڈھائی گنا رہتی ہے۔

پھر ایک ہی نظر میں واضح ہو جاتا ہے کہ ہندی حروف کی شکلیں طولانی اور پیچیدہ ہیں۔ حروف دیکھنے میں بیل بوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ جن کی نقشہ کشی کے لئے مشق کی ضرورت ہے۔ اور بہر صورت تحریر کے واسطے زیادہ وقت اور زیادہ جگہ درکار ہے۔ یہ نہیں کہ تھوڑی جگہ میں جلدی سے صاف صاف حرف لکھ لیں۔ اس مجبوری سے بعض جماعتیں خاص کر ساہوکار، مہاجن اپنے کاروبار میں ہندی کو مروڑ کر مختصر لکھتے ہیں، اور یہ مہاجنی تحریر دوسرے ہندی داں بہت کم سمجھ سکتے ہیں۔

ذیل کی چند مثالیں بطور نمونہ درج ہیں۔ جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ اردو ہندی تحریر میں بلحاظ شکل اور بلحاظ اختصار و طوالت کیا فرق ہے۔ ملاحظہ ہو:-

ہندستان	हिन्दुस्तान
الہ آباد	इलाहआबाद
دلی	दिल्ली या दिल्ली
شملہ	शिमला
آرام	आराम
آدم	आदम
بلبل	बुलबुल
کشمش	किशमिश

غرض کہ اردو کے مقابل ہندی تحریر کئی گنی زیادہ طویل اور پیچیدہ ہوتی ہے۔ جو زیادہ وقت اور جگہ لیتی ہے۔ اور مشکل سے ذہن میں جمتی ہے۔ مشق کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

ہندی حروف کی شکلوں میں دو علامات مشترک ہیں۔ ایک تو حرف کے اوپر پٹ لکیر کھینچتے ہیں۔ مثلاً (—) جس کو اصطلاحاً (ریکھا) کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ (ریکھا) پر (ماترا) بھی لگتی ہے۔ اس کی ہمواری برقرار نہیں رہتی مثلاً (गी)۔

دوسری علامت یہ کہ بعض حروف کے آخر میں کھڑی لکیر بھی لگی رہتی ہے جیسے (ग) (ज) (न) (म) اس لکیر کو اصطلاحاً (پائی) کہتے ہیں۔ لیکن بعض حروف میں یہ لکیر نہیں رہتی۔ جیسے (छ) (ट) (द) (ड)۔ واضح ہو کہ وہی کھڑی لکیر پائی مانی جاتی ہے۔ اور جو حرف کے آخر میں لگی ہو۔ اگر حرف کے وسط میں لگی ہو تو وہ پائی شمار نہ ہوگی۔ مثلاً (क) (ऋ) (फ) میں کھڑی لکیر موجود ہے۔ لیکن وسط میں ہے۔ آخر میں نہیں ہے۔ اس لئے وہ پائی شمار نہ ہوگی۔ اور حرف (झ) میں تو لکیر آخر میں واقع ہونے کے باوجود پائی نہیں مانی جاتی۔ بعض حروف دو شکل میں لکھے جاتے ہیں۔ ایک شکل میں پائی رہتی ہے۔ دوسری میں نہیں رہتی جیسے (ल) اور (ल) حروف میں پائی ہونے نہ ہونے کا اثر حروف کی ترکیب پر بہت پڑتا ہے۔ چنانچہ کچھ کیفیت بہ تعلق حرف (ट) اور اوپر پیش ہو چکی ہے۔ (ملاحظہ ہو پارہ ۲۸) مزید آگے فصل سوم میں پیش ہوگی (ملاحظہ ہو پارہ ۳۹)۔

جملے کے ختم پر جو کھڑی لکیر الگ بنا دیتے ہیں۔ بطور فل اسٹاپ اس کو اصطلاحاً (ورام) کہتے ہیں۔

۳۵۔ ہندی حروف کی متشابہ شکلیں۔ ہندی میں حرف کی شکلیں کثیر اور طولانی ہونے کے سوا۔ متشابہ بھی زیادہ ہیں۔ سرسری تحریر میں ان کی تمیز دشوار ہوتی ہے اور اکثر اشتباہ ہوتا ہے۔ جو صرف عبارت کی مدد سے حل ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک حرف ہے (र۔ر) اور ایک حرف ہے (व۔و) اور دونوں کا تلفظ جدا ہے۔ جیسے रवा (روا) لیکن ان دونوں حروف کی شکل ملا کر ایک تیسرا حرف بنا لیا گیا (ख۔کھ) جیسے खा (کھا)۔ گویا ہندی میں لکھنا چاہیں تو (روا) اور (کھا) کی ایک ہی شکل ہوگی (खा) دوسرے حروف کی شکلوں میں بھی اشتباہ کی کافی گنجائش رہتی ہے۔ مثلاً

घ(گھ) اور ध(دھ)	ब(ب) اور व(و)
ङ(ڑن) اور ड(ڈ)	ब(ب) اور ष(ش)
ट(ٹ) اور ठ(ٹھ)	भ(بھ) اور म(م)
ढ(ڈھ) اور द(د)	स(س) اور रा(را)
त(ت) اور न(ن)	ख(کھ) اور स्व(سو)

علیٰ ہٰذا भ(بھ) اور श(ش)، थ(تھ) اور य(ی)، क(ک) اور ढ(ڑ) ट(ٹ) اور ढ(ڈھ) ञ(ین) اور ज(ج) میں بھی اشتباہ قریب رہتا ہے ड(إ) اور झ(جھ) کی مشابہت بھی نمایاں ہے۔

غرض کہ ہاتھ روک کر نوک پلک کے ساتھ حروف لکھے جائیں تو دوسری بات ہے۔ ورنہ معمولاً سرسری طور پر تیز لکھئے تو ہندی حروف شکل میں بہ آسانی متشابہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ تلفظ اور ترتیب حروف ہجا میں بہت مغائر ہیں۔ پس یہ عام

خیال صحیح نہیں ہے کہ ہندی میں غلط پڑھنا ممکن نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس غلط پڑھنے کا امکان زیادہ رہتا ہے۔ اور غلط لکھنا تو اور بھی آسان رہتا ہے کہ صحیح لکھنا دشوار ہے۔

۳۶۔ اردو ہندی حروف میں مشابہ اور متشابہ شکلوں کا فرق۔ اس موقع پر ایک امر کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ جس کی طرف اوپر اشارے ہو چکے ہیں۔ وہ یہ کہ اردو کے متعدد حروف شکل میں مشابہ ہیں۔ بالعموم نقطوں سے یا بعض دیگر علامات سے ان میں تفریق و تمیز ہوتی ہے۔ مثلاً (ب) (پ) یا (ت) (ٹ) (ث) یا (ج) (چ) یا (د) (ڈ) یا (ک) (گ) لیکن ان حرفوں کا مشابہ ہونا خود باقاعدہ مقرر و مسلم ہے۔ اور ترتیب حروف ہجا میں بھی ایسے مشابہ حروف کو متصل رکھا ہے۔ تا کہ ان کی مقررہ و مسلمہ مشابہت اور تفریق بخوبی ذہن نشین رہے۔ پس نقطہ ہو یا نہ ہو مقررہ و مسلمہ ربط کے سبب عبارت میں بہ آسانی ان کی تمیز ہو جاتی ہے۔ پھر اس مشابہت کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ حروف کی شکلیں تعداد میں گھٹ گئیں۔ چنانچہ پارہ (۳۳) کے تحت صراحت درج ہو چکی ہے۔ لیکن ہندی میں حروف مشابہ نہیں بلکہ متشابہ ہیں۔ یہ حروف اپنی اپنی جداگانہ شکلیں رکھتے ہیں۔ اسی سبب شکلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ان کے باہم اردو کی طرح مشابہت کا کوئی ربط مقرر و مسلم نہیں ہے۔ اسی سبب شکلوں میں بھی کمی نہ ہو سکی۔ ترتیب میں بھی اردو کی طرح ایسے متشابہ حروف ایک دوسرے سے متصل نہیں ہیں کہ ان کے باہم کوئی ربط ملحوظ رہے۔ بلکہ حروف ہجا کی ترتیب میں منتشر ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بے ربط متشابہ حروف کی سرسری تحریر میں بہ آسانی اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔

۳۷۔ اردو اعراب اور ہندی ماترا کا استعمال۔ اردو ہندی حروف علت اور ان کے علامات ضروری تفصیل کے ساتھ فصل اول میں تحت پارہ جات (۲۶ تا ۳۳) بیان ہو چکے ہیں۔ پھر ان کے علاوہ حرف (ऋ۔رِ) اور حرف (ऱ۔ر) کی بعض شکلیں ترکیب میں ماترا جیسی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ چنانچہ ان کی صراحت بھی فصل اول میں تحت پارہ جات (۲۷ و ۲۸) درج ہے۔

مذکورہ بالا حوالہ جات سے واضح ہوگا کہ اردو میں حرف علت صرف (۳) ہیں۔ اور اعراب کی تعداد بھی صرف (۶) ہے۔ ان کے مقابل ہندی میں حروف علت کی تعداد (۱۶) ہے اور ان کی علامات (ماترا) بھی (۱۶) ہیں۔ جن میں دو حرف خود ہی بطور ماترا بھی استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی (ऌ۔لر) اور (ॡ۔لری)۔ پھر ان میں حرف (ऋ) اور (ऱ) کی بعض شکلیں بھی جو ماترا جیسی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ شامل کریں تو علامات کی تعداد کم و بیش (۲۴) ہو جاتی ہے۔ یعنی اردو علامات (۶) کے مقابل چار گنا۔ بریں ہم ہندی علامات کے تقریباً تمام تلفظ اردو میں ادا ہو جاتے ہیں۔ سوائے چند رقیق اور پیچیدہ تلفظ کے جو بیشتر حرف (ऋ) اور حرف (ऱ) سے تعلق رکھتے ہیں اور خود ہندی میں بھی باعث طوالت و دشواری محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ اصلاح پسند جماعت خود طوالت اور پیچیدگی رفع کرنے کی فکر میں ہے۔ تا کہ ہندی کی نوشت و خواند میں دشواری کم ہو۔

مزید براں اردو اعراب کی بعض خوبیاں بھی ہندی میں مدارد ہیں۔ مثلاً علامت تشدید (ّ) نہ ہونے سے تحریر و ترکیب میں بہت طوالت بڑھتی ہے۔ جس کی مختصر کیفیت اوپر تحت پارہ (۲۶) بیان ہو چکی ہے۔ اور مزید فصل سوم میں بیان ہوگی۔ علامت جزم (ْ) کا استعمال بھی ہندی میں باقاعدہ نہیں ہے۔ حرف (ہ) بھی لفظوں کے آخر میں بالفتحہ نہیں رہتی۔ جس کے سبب بعض عام تلفظ ہندی میں ادا نہیں ہوتے جیسے راجہ۔ باجہ۔ سینہ۔ شیشہ۔

پھر اعراب اور ماترا کے محل بھی قابل ملاحظہ ہیں اردو میں اعراب کے دو محل مقرر ہیں۔۔ متعلقہ حروف کے اوپر جملہ اعراب لگتے ہیں۔ صرف ایک اعراب (کسرہ یا زیر) حرف کے نیچے لگتا ہے۔ لیکن ہندی میں ماترا کے محل متعدد رہتے ہیں۔ اوپر لگتے ہیں تو حرف متعلقہ کے قبل لگتے ہیں جیسے (कि) یا حرف متعلقہ کے بعد لگتے ہیں جیسے (की) یا حرف متعلقہ کے حرف مابعد کے بعد فصل سے لگتے ہیں۔ جیسے (र) کی علامت (f) مثلاً वर्तन (برتن)، कर्ता (کرتا) علیٰ ہذا اگر ماترا نیچے لگے۔ تو اکثر حروف متعلقہ کی نوک سے متصل لگتی ہیں جیسے कु कू یا रु रू۔ لیکن بعض صورتوں میں نیچے کی ماترا کا محل مختلف رہتا ہے۔ مثلاً ہر دو مندرجہ بالا ماترا نیچے کے بجائے حرف (र) کے بیچ میں لگتی ہیں یعنی (रु) اور (रू) جیسے (गुरु) اور (रूप) بعض ماترا متشابہ ہیں جیسے (ी) اور (ो) مثلاً की (کی) को (کو)۔

بہرحال اردو کی طرح ہندی میں ماترا کے محل سہل اور معین نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف محلوں پر ماترا لگتی ہیں۔ جن کو سمجھنا یاد رکھنا ضروری ہے۔

اردو اعراب اور ہندی ماترا میں ایک عملی فرق یہ بھی ہے کہ اعراب لگانا اردو امر اختیاری ہے۔ حسب ضرورت اعراب لگا سکتے ہیں لیکن لگانا لازم نہیں اور چونکہ اردو میں تلفظ تحریر اور ترکیب نسبتاً صاف اور سہل ہیں۔ اعراب کی ضرورت کم پیش آتی ہے۔ اس کے برعکس ہندی تحریر میں ماترا لگانا لازم ہے۔ تلفظ کے اعتبار سے ماترا ضرور لگاتے ہیں۔ ترک نہیں کر سکتے۔ اس سبب سے بھی ہندی تحریر میں طوالت بڑھی رہتی ہے۔

☆☆☆

فصل سوم

حروف کی ترکیبیں

(ورڑن سنیوگ)

۳۸۔ اردو حروف کی ترکیب اور اصلاح کی تحریک۔ اردو میں ترکیب حروف کی شکلیں سہل اور مختصر ہیں۔ بہ آسانی عبور حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:-

(۱)۔ (الف) (د) (ڈ) (ذ) (ر) (ڑ) (ز) (ژ) اور (و) یہ (۹) حروف جن کی صرف (۴) شکلیں ہیں۔ یعنی (ا۔ د۔ ر۔ و) کسی حرف مابعد سے تحریر میں نہیں ملتے۔ البتہ حرف ماقبل سے ملتے ہیں۔ اور آپس میں تو کسی صورت میں

نہیں ملتے۔تحریر میں جدا جدا رہتے ہیں۔

(۲) مندرجہ بالا (۹) حروف کے سوا باقی جملہ حروف حرف ماقبل اور حرف مابعد سے تحریر میں بے تکلف ملتے ہیں۔صرف دو حرف یعنی (ع) (غ) کی شکل درمیان میں اور آخر میں کسی قدر بدل جاتی ہے۔جیسے (معطل۔ طمع) یا مغل یا بلیغ) اور (ک) کی شکل بھی (الف) اور (ل) کے ماقبل گول بنتی ہے جیسے (کام) (کل۔ شکل)۔باقی حروف کی شکل ترکیب میں وہی اصل قائم رہتی ہے۔

الفاظ میں جو حروف کی ترکیب پیش آتی ہے۔تو ترکیب میں حروف کی کرسی اور نشست ایک اہم بحث بن جاتی ہے۔اردو بصورت ترکیب حرف (ح) اور اس کے ہم شکل حروف (ج۔چ۔خ) کے ماقبل ہر حرف کی کرسی ایک درجہ اونچی رہتی ہے۔اور بحیثیت حرف مابعد خود ان حروف کی کرسی ایک ایک درجہ نیچی رہتی ہے۔باقی جملہ حروف باہم ایک نشست قبول کر لیتے ہیں۔

ترکیب میں اردو حروف کی چند دیگر خصوصیات بھی قابل ذکر ہیں۔مثلاً بعض حروف کے آخر میں دائرے ہیں۔جیسے (ح) (س) (ع) (ق) (ن) (ی) اگر ایسے حروف ترکیب کے شروع میں یا درمیان میں واقع ہوں تو دائرے ترک ہو جاتے ہیں۔اور اگر آخر میں واقع ہوں تو دائرے برقرار رہتے ہیں۔جن سے تحریر میں یک گونہ خوشنمائی پیدا ہو جاتی ہے اور نظر کو بھی قیام کا موقع ملتا ہے۔

اردو میں بلحاظ شکل صرف (۴) حرف ایسے ہیں جو ترکیب میں کرسی سے اونچے اٹھتے ہیں۔یعنی (ا) (ط۔ظ) (ک۔گ) اور (ل) حالانکہ انگریزی میں (۷) حرف کرسی سے اونچے اٹھتے ہیں۔یعنی (بی) (ڈی) (ایف) (ایچ) (کے) (ال) اور (ٹی) علیٰ ہذا اردو میں صرف ایک حرف ہے جو کرسی سے نیچے اترتا ہے۔یعنی (م) سو وہ بھی ترکیب کے شروع میں یا درمیان میں کرسی پر ٹھہر جاتا ہے۔صرف ترکیب کے آخر میں کرسی سے نیچے اترتا ہے۔حالانکہ انگریزی میں (۵) حرف بہر صورت کرسی سے نیچے اترتے ہیں۔یعنی (جی) (جے) (پی) (کیو) اور (وائی)۔

ہندی میں حروف کے سر پر جو پٹ لکیر کھینچتے ہیں۔جس کو (ریکھا) کہتے ہیں۔اس کے سبب حروف کی بالائی سطح ہموار رہتی ہے۔البتہ علامات حروف علت (ماترا) جو اوپر لگتی ہیں۔ان سے ہمواری میں فرق آ جاتا ہے۔لیکن نیچے کی طرف ہندی حروف بلا تکلف کرسی سے اترتے ہیں۔اور ترکیب میں ایک دوسرے سے لپٹ کر عجب عجب شکلیں بناتے ہیں۔جن کی مختصر کیفیت اس فصل میں آگے بیان ہوگی۔

گرچہ اردو حروف میں یوں بھی سادگی اور باقاعدگی ہے۔تاہم مزید سہولتوں کی غرض سے اصلاح زیر غور آتی رہتی ہے۔مختلف حلقوں سے جو تجاویز پیش ہوتی رہی ہیں۔ان کے منجملہ مسٹر سجاد مرزا نے حیدر آباد میں جو جدید ٹائپ وضع کیا۔اس میں سادگی اور سہولت سب سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔اور عجب نہیں کہ قدامت پسندی کا جذبہ کمزور ہو تو اس طرز کا رسم الخط رائج ہو جائے۔چنانچہ اس سلسلے میں چند تجاویز ذیل میں عرض ہیں۔ممکن ہے ان میں سے بعض قبول ہو جائیں۔

(۱) بعض حروف کے ساتھ جو دائرے ہیں۔اور وہ نیچے اترتے ہیں۔اگر طوالت معلوم ہو تو وہ مختصر ہو سکتے ہیں۔مثلاً (ح) کی جگہ (ح) یا (س) کی جگہ (س) یا (ع) کی جگہ (ع)۔البتہ تین حرف کا معاملہ خاص ہے۔(ق) (ل) اور (ن)۔سو ان کا حل بھی آسان ہے۔یعنی (ق) کو لکھیں (ق) گویا (ف) اور (ق) میں صرف نقطوں کا فرق رہے۔علیٰ ہذا (ل) کو لکھیں (ل) گویا (ک) اور (ل) میں صرف مرکز کا فرق رہے۔اور (ن) کو لکھیں (ن) گویا (ب) اور (ن) میں نقطہ کی اونچ نیچ کا فرق رہے۔

(۲) حرف (ح) اور اس کے ساتھ ہی حروف (ج) (چ) (خ) کی جو کرسیاں ترکیب میں اوپر نیچے جمتی ہیں۔ذرا سی تبدیلی سے وہ ایک سطح پر رہ سکتی ہیں مثلاً (عجب) کے بجائے (عجب)، (حجت) کے بجائے (حجت) یا (حج) کے بجائے (حجج)۔

(۳) اول تو حرف (ک) خود ہی کرسی سے اونچا رہتا ہے۔پھر اس کا مرکز اور بھی اونچا لگتا ہے۔مرکز ترچھا ہونے کے بجائے پٹ لگایا جائے تو بلندی گھٹ جائے مثلاً (بکس) کے بجائے (بکس)، (کمال) کے بجائے (کمال)۔البتہ (الف) اور (ل) کے ماقبل ترکیب میں (ک) کی شکل گول بنتی ہے۔جیسے (کام) (کل) ان دو صورتوں میں (ک) کا مرکز حسب سابق ترچھا رہے گا کہ کرسی میں جگہ موجود ہے۔

(۴) حرف (م) جو نیچے اترتا ہے۔اگر عربی طرز میں (م) لکھی جائے تو نیچے اترنے کی ضرورت نہیں رہتی مثلاً (کم) کے بجائے (کم) البتہ آخری کشش میں ذرا سی گولائی رہنی ضرور ہے تا کہ حرف (ر) کا شبہ نہ ہو۔مثلاً (کمر) اور (کمر)۔

(۵) حرف علت (یاء) کی دو صورتیں ہیں معروف و مجہول۔اردو میں معروف کو گول لکھتے ہیں جیسے (کی) اور مجہول کو پٹ جیسے (کے)۔دوسرے دائروں کی طرح اگر (ی) کا دائرہ بھی نکال دینا چاہیں تو اس کو بھی دوسرے رخ پر پٹ لکھ سکتے ہیں جیسے (کی) کے بجائے (کی)۔ترکیب میں بھی (یاء) معروف و مجہول کا فرق ظاہر ہو سکتا ہے۔وہ اس طرح کہ معروف کے نقطے پٹ لگیں۔جیسے (ریت۔ جیت۔ پیت) اور مجہول کے نقطے کھڑے لگیں جیسے (ریت۔ جیب۔ پیٹ) اور (یاء) بطور حرف صحیح استعمال ہو تو اس کے نقطے بھی پٹ لگیں جیسے (یاد) (یوم)۔

(۶) حرف علت (و) کی بھی دو صورتیں ہیں معروف و مجہول شکل میں ذرا سا فرق کر دینے سے دونوں صورتیں ظاہر ہو سکتی ہیں۔وہ اس طرح کہ (و) معروف کی کشش حسب معمول خمدار رہے۔جیسے (خوب۔ خون) اور (و) مجہول کی کشش سیدھی رہے جیسے (خوف)۔جوش) اور (و) بطور حرف صحیح استعمال ہو تو اس صورت میں بھی اس کی کشش حسب معمول خمدار رہے جیسے (وکیل۔ ولی)۔

(۷) عربی ترکیبوں کے الفاظ اردو میں تلفظ کے مطابق سادہ لکھنے کی اجازت رہے۔اور جو چاہیں عربی ترکیب کے مطابق لکھیں۔دونوں صورتیں درست مانی جائیں مثلاً (بالکل) یا (بلکل) (کالعدم) یا (کلعدم)، (فی الفور) یا

(لِلفور)، (فی الحقیقت) یا (للحقیقت)، (فی النار) یا (فنار)، (فی الستر) یا (فستر) علیٰ ہذا (اعلیٰ) یا (اعلا)، (ادنیٰ) یا (ادنا)، (معنیٰ) یا (معنا)، (مرتضیٰ) یا (مرتضا)۔ اس طریق سے عام لوگوں کے واسطے املے میں سہولت بڑھ جائے گی۔ اور ذی علم لوگ عربی املا بھی جاری رکھ سکیں گے۔

المختصر یہ چند تجاویز قابل غور معلوم ہوتی ہیں۔ عجب نہیں ان میں سے بعض قبول ہو جائیں۔

۳۹۔ ہندی حروف کی ترکیب۔ بہر حال اردو کے مقابل ہندی میں حروف کی ترکیب زیادہ رقیق اور پیچیدہ ہے۔ اور ترکیب کی تفصیل اس درجے طویل ہے کہ جداگانہ تالیف کی طالب ہے۔ چنانچہ علامات (ماترا) کی مختصر کیفیت تو حروف علت اور حروف (क۔ن) و (ج۔ر) کے تحت اوپر بیان ہو چکی ہے۔ پھر بلحاظ تلفظ ترکیب حروف میں تغیر و تبدل ہوتا ہے۔ اس کا بھی حوالہ فصل اول میں تحت پارہ (۳۱) مختصراً موجود ہے۔ اور یہ بحث ایک خاص فنی شعبہ سے متعلق ہے۔ جس کو اصطلاحاً (سندھی) کہتے ہیں۔ اس پر اچھے اچھوں کو تلفظ و تحریر و ترکیب میں عبور کم رہتا ہے۔ پھر ترکیب میں بلحاظ تحریر حروف عجب عجب نئی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ جن کی تعداد کثیر ہے۔ اور صحت تحریر میں ان کا پیش نظر رہنا لازم ہے۔ تفصیل کی تو گنجائش کہاں بطور تمثیل کچھ مرکب شکلیں ذیل میں پیش ہوں گی۔ جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ اردو کی سادہ و سلیس ترکیبوں کے مقابل ہندی میں حروف کی ترکیبیں کس درجے طویل و پیچیدہ ہیں۔ جن کے لکھنے پڑھنے میں اچھے اچھوں کو غور و توجہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

تاہم ایک عام فرق ترکیب میں مسلّم ہے۔ جن حروف میں علامات (پائی) رہتی ہے وہ حروف نصف نصف لکھے جائیں تو یہ علامت ساقط ہو جاتی ہے۔ اور جن حروف میں علامت (پائی) نہ ہو ان کو نصف لکھیں تو مزید پیچیدگی پیش آتی ہے۔ چنانچہ ذیل کی مثالوں میں یہ فرق واضح ہو جائے گا۔

۴۰۔ ہندی میں علامت تشدید (ّ) ندارد اور لازمی طوالت۔ واضح ہو کہ تشدید میں ایک حرف ساکن اور متحرک رہتا ہے۔ تلفظ ساکن میں نصف اور متحرک میں سالم رہتا ہے۔ اردو کی طرح ہندی میں علامت تشدید (ّ) استعمال نہیں ہوتی جس کا لازمی نتیجہ تحریر میں طوالت ہے۔ چنانچہ تشدید لگانے کے بجائے۔ متعلقہ حرف کو لفظ میں دہراتے ہیں۔ اور دہرانے میں مختلف شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ جن سے حیرانی لاحق ہوتی ہے۔ چنانچہ چند عام شکلیں ذیل میں ملاحظہ ہوں۔:-

(۱) اول نصف حرف نصف۔ دوسرا سالم حرف سالم

اُگّا जैसे उग्गा ग+ग=ग्ग

اُچّا जैसे उच्चा च+च=च्च

لجّا जैसे लज्जा ज+ज=ज्ज

ڈبّا जैसे डिब्बा ब+ब=ब्ब

اَنّا जैसे अन्ना न+न=न्न

مَمّا जैसे मम्मा म+म=म्म

پِشّا जैसे पिश्शा श+श=श्श

دُسّا जैसे दुस्सा स+स=स्स

دِلّی जैसे दिल्ली ल+ल=ल्ल

مندرجہ بالا ترکیب ان حروف سے متعلق ہے جن میں علامت (پائی) لگی ہوئی ہے۔ لیکن بعض حروف دو طرح لکھے جاتے ہیں۔ ایک شکل میں پائی رہتی ہے جیسے (ल) اور ( ) ہر دو (ل) کی شکلیں ہیں۔ دونوں شکلوں میں حسب قاعدہ عمل جدا جدا ہوتا ہے۔ گرچہ حرف ایک ہی رہتا ہے۔

(۲) اول نصف حرف سالم۔ اور دوسرا سالم حرف اس کے تابع سالم

اِکّا जैसे इक्का क+क=क्क

اَچّھا जैसे अच्छा ट+ट=ट्ट

ٹھٹّھا जैसे ठिट्ठा ठ+ठ=ट्ठ

اَڈّا जैसे अड्डा ड+ड=ड्ड

کھڈّھا जैसे खड्ढा ड+ढ=ड्ढ

دِلّی जैसे दिल्ली ल+ल=ल्ल

مندرجہ بالا ترکیب ان حروف سے متعلق ہے جن میں علامت (پائی) نہیں رہتی۔ لیکن جن حروف میں علامت (پائی) رہتی ہے کبھی ان کو بھی سالم سالم مندرجہ بالا ترکیب کے مطابق لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً

اُچّا जैसे उच्चा च+च=च्च

لجّا जैसे लज्जा ज+ज=ज्ज

دِلّی जैसे दिल्ली ल+ल=ल्ल

(۳) اول نصف حرف سالم۔ اور دوسرا سالم حرف تابع بہ شکل نصف یا بتبدیلی شکل جیسے

پرسِدھ जैसे प्रसिद्ध द+ध=द्ध

گدّی जैसे गद्दी द+द=द्द

(۴) اول نصف حرف کی شکل میں خفیف تبدیلی۔ مثلاً

اُتّم जैसे उत्तम त+त=त्त

غرض کہ ایک علامت تشدید (ّ) نہ ہونے سے ہندی کی تحریر و ترکیب میں طرح طرح کی شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ جو پیچیدگی اور طوالت پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ چند عام مثالیں اوپر درج ہوئیں۔ ان کے سوا بھی شکلیں نکلتی ہیں۔ حالانکہ اردو میں علامت تشدید (ّ) کی بدولت تحریر و ترکیب بہت سادہ سہل عام فہم رہتی ہے۔

۴۱۔ ہندی میں علامت جزم (ْ) ندارد اور لازمی طوالت۔ تشدید کی طرح ہندی میں علامت جزم (ْ) بھی ندارد ہے کہ ترکیب حروف میں اس سے سکون کا کام لیا جا سکے۔ نتیجہ یہ کہ متعلقہ حروف نصف تحریر ہوتا ہے۔ اور اس تحریر کی مختلف شکلیں ہیں۔ چنانچہ ان میں سے چند عام ذیل میں پیش ہیں:-

(۱) نصف حرف نصف اور سالم حرف سالم اپنے اپنے محل پر

بکس जैसे बक्स क+स=क्स

آتما जैसे आत्मा त+म=त्म

گپتا प+त=प्त जैसे गुप्ता

شبد ब+द=ब्द जैसे शब्द

وَلگ ल+ग=ल्ग जैसे वल्गु

پُشکل ष+क=ष्क जैसे पुष्कल

(۲) نصف حرف سالم اور سالم حرف سالم کے تابع:-

شکل क+ल=क्ल जैसे शक्ल

پکوان क+व=क्व जैसे पक्वान

کھڈگ ड+ग=ड्ग जैसे खड्ग

(۳) نصف حرف سالم اور سالم حرف سالم۔ لیکن آخر کا حرف سالم اول اور اول کا حرف نصف آخر تابع یعنی ترتیب معکوس جیسے

یاچیاں च+ञ=ञ्च जैसे याच्ञा

(۴) نصف حرف سالم۔ اور سالم حرف نصف اس کے تابع مثلاً

شدھ द+ध=द्ध जैसे शुद्ध

پرسدھ प्रसिद्ध

(۵) نصف حرف سالم۔ اور سالم حرف سالم بہ خفیف تبدیلی شکل مثلاً

ناٹئے ट+य=ट्य जैसे नाट्य

ایڈے ड+य=ड्य जैसे ईड्य

پدم द+म=द्म जैसे पद्म

ودیا द+य=द्य जैसे विद्या

(۱) اول نصف حرف کی شکل تبدیل۔ سالم حرف سالم مثلاً

آشچریہ श+च=श्च जैसे आश्चर्य

پرشن श+न=श्न जैसे प्रश्न

اشلیل श+ल=श्ल जैसे अश्लील

ایشور श+व=श्व जैसे ईश्वर

(۷) نصف حرف سالم۔ سالم حرف کی شکل تبدیل مثلاً

اُگر ग+र=ग्र जैसे उग्र

وَجر ज+र=ज्र जैसे वज्र

(۸) حرف نصف و حرف سالم مل کر ایک جدید شکل مثلاً

بھکت क+त=क्त जैसे भक्त

سنیکت संयुक्त

چکر क+र=क्र जैसे चक्र

(حرف مرکب) اکشر क+ष=क्ष जैसे अक्षर

" ग+ञ=ज्ञ या ज+ञ=ज्ञ

" ماترا त+र=त्र जैसे मात्रा

" آشرم श+र=श्र जैसे आश्रम

غرض کہ علامت جزم (ْ) نہ ہونے کے سبب بھی ہندی حروف کی ترکیب میں عجب طوالت و پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ جن کی چند عام مثالیں اوپر درج ہوئیں۔ اردو میں جزم کے استعمال سے ترکیب حروف سادہ سہل اور عام فہم رہتی ہے۔ چنانچہ اردو حروف کو ہندی حروف پر جو گوناگوں فوقیتیں حاصل ہیں ان میں اعراب، تشدید و جزم کا استعمال بھی داخل ہے۔

(۴۲) ہندی میں دو حرفی مرکبات۔ یوں بھی ہندی میں حروف کی ترکیب سنیوگ) گوناگوں شکلوں کے سبب بہت طویل و پیچیدہ مانی جاتی ہے کہ دو دو تین تین حرف مل کر عجب عجب شکلیں بناتے ہیں کہ لکھنے پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ مثلاً ذیل میں چند دو حرفی ترکیبیں درج ذیل ہیں:-

برہم ह+म=ह्म जैसे ब्रह्म

باہیہ ह+य=ह्य जैसे बाह्य

ہرد ह+र=हृ जैसे हृद

آہلاد ह+ल=ह्ल जैसे आह्लाद

آہوان ह+व=ह्व जैसे आह्वान

۴۳۔ ہندی میں سہ حرفی مرکبات۔ دو حرفی مرکبات سے بڑھ کر ہندی میں سہ حرفی مرکبات پیچیدہ ہوتے ہیں۔ بلحاظ تلفظ و بلحاظ تحریر و ترکیب چنانچہ ذیل میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

क+त+र=क्त्र जैसे वक्त्र

ङ+क+त=ङ्क्त

च+छ+व=च्छ्व

त+स+न=त्स्न

द+ब+र=द्ब्र

द+र+म=द्र्म

द+ध+र=द्ध्र

श+च+य=श्च्य

ष+ट+व=ष्ट्व

(۴۴) ہندی مرکبات میں رقیق و دشوار تلفظ۔ یوں بھی سنسکرت اور ہندی میں بہت سے تلفظ دشوار رہتے ہیں۔ خاص کر وہ جن میں ناک سے موٹی آواز غنغنی نکالنی پڑتی ہے۔ اور ایسے الفاظ معمولاً استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً

ण्ण जैसे निषण्ण या विषण्ण या ण्य या प्रणाश या क्षुधा

(۴۵) ہندی حروف کی ترکیبیں طولانی۔ الحاصل ہندی میں حرف کی ترکیبیں کثیر ہیں۔ جن کا تلفظ بالعموم رقیق یا غنغنہ رہتا ہے اور جن کی تحریر میں غور طلب پیچیدگی پیش آتی ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے کچھ مثالیں اوپر بیان ہوئیں۔ سنسکرت اور ہندی کی کتابیں جو تعلیم زبان سے متعلق ہوتی ہیں۔ ان میں ایسی ترکیبوں کی فہرستیں درج رہتی ہیں تاکہ لکھنے پڑھنے میں ان کو دیکھ کر مدد ملے۔ ہندی میں اردو کی طرح ترکیب حروف کے قاعدے ایسے جامع اور واضح نہیں ہیں کہ یہ

سہولت نوشت وخواند عمل میں آسکے۔ مشق اور تجربہ کے بعد بھی ترکیب حروف کی صحت پر توجہ رکھنی پڑتی ہے۔ اسی سبب پیچیدہ ترکیبوں کی فہرستیں تعلیم زبان کی کتابوں میں درج رہتی ہیں۔ بطور مثال مبتدیوں کے واسطے دو کتابوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے ایک تو پنڈت ہری ہر شاستری کی کتاب (ہندی اردو املا) کا دوسرا حصہ۔ اور ایک سر رام کشن گوپال بھنڈارکر کی پہلی کتاب بابت سنسکرت (فرسٹ بک آف سنسکرت) جن میں تعلیم زبان کے ابتدائی امور درج ہیں ان دونوں میں بھی ترکیب حروف کی مختصر فہرستیں شریک ہیں۔ اور آخر الذکر انگریزی کتاب میں ترکیب حروف کے متعلق فن (سندھی) کے کچھ ابتدائی اصول وقواعد بھی درج ہیں۔ جن سے ترکیب حروف کی طوالت وپیچیدگی کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔

اگر لوگ ہندی کا مطالعہ شروع کرنا چاہیں۔ یوں تو مبتدیوں کے واسطے بہت سی کتابیں بازار میں ملتی ہیں۔ لیکن پنڈت ہری ہر شاستری کی (ہندی اردو مالا) پنڈت بال کرشن لاہوٹی کی (سرل ہندی پرائمر) ودیا ساگر ودیاس رائے شاستری کی (سنسکرت بالا ورش)، چترویدی دوارکا پرشاد کی (ہندی بال بدھ) اور پنڈت شیو دیال اپادھیہ کی ہندی ویاکرن سار) یہ کتابیں مبتدیوں کے واسطے زیاہ کارآمد ہوں گی۔

شمالی ہند سے ہندی کا زیادہ تعلق ہے۔ دکن میں دوسری زبانیں اپنا اپنا ادبی سرمایہ رکھتی ہیں مثلاً تامل، تلنگی، کنڑی، مرہٹی اور اردو کی توسیع وترقی کے سلسلے میں وہ بھی کسی نہ کسی حد تک مطالعہ کی مستحق ہیں۔ کیوں کہ اردو کا ملک کی زبانوں سے خاص وعام تعلق ہے اور اسی سبب اس میں ملک کی مشترک زبان پائی جاتی ہے۔

☆☆☆

ضمیمہ

اصطلاحات جو کتاب میں استعمال ہوئیں۔

حرف	ورڑن	वर्ण
حرف صحیح	وینجن	व्यञ्जन
حرف علت	سور	स्वर
حرف مفرد	شدھ ورڑن	शुद्ध वर्ण
حرف مرکب	سنیکت ورڑن	संयुक्त वर्ण
حروف کی ترکیب	سنیوگ	संयोग
	سپرش ورڑن	स्पर्श वर्ण
	انتستھ ورڑن	अन्तस्थ वर्ण
	اوشم ورڑن	ऊष्म वर्ण
	ورگ	वर्ग
حرف متحرک	اجنت ورڑن	अजन्त वर्ण
حرف ساکن	ہلنت ورڑن	हलन्त वर्ण
شکل حرف	آکار	आकार
تلفظ حرف	اُچارڑن	उच्चारण
لفظ	شبد	शब्द
جملہ	واکیہ	वाक्य
زبان	بھاشا	भाषा
فن قرأت	ورڑن وچار	वर्ण विचार
فن صرف	شبد وچار	शब्द विचार
فن نحو	واکیہ وچار	वाक्य विचार
فن قواعد	ویاکرن ودیا	व्याकरण विद्या
اعراب	ماترا	मात्रा
	انسوار	अनुस्वार (ं)
	وسرگ	विसर्ग (ः)
	چندر بندو	चन्द्र बिन्दु (ँ)
	ریکھا	रेखा (-)
	پائی	पाई (ा)
	ورام	विराम (।)

کتاب میں ایک جدید اصطلاح حرفیات تجویز کی گئی ہے جس کا ہندی ترجمہ (ورڑن ودیا) اور انگریزی ترجمہ (اسکرپٹالوجی) ہوسکتا ہے۔

حرفیات Scriptology वर्ण विद्या

☆☆☆

تالیفات وتراجم

پروفیسر الیاس برنی

سابق صدر شعبۂ معاشیات وناظم سررشتہ تالیف وترجمہ

(جامعۂ عثمانیہ، حیدرآباد دکن)

(الف) شعبۂ دینیات

(۱) اسرار حق۔ حقائق ومعارف قرآنیہ۔ جو بہ اصطلاح قرآن صدق۔ اور عام اسلامی اصطلاح میں تصوف کہلاتے ہیں۔ پہلا ایڈیشن مدت سے نایاب ہے۔ جدید ایڈیشن باضافۂ مضامین طباعت طلب ہے۔

(۲) تسہیل الترتیل۔ فن قرأت کی تعلیم بہ ترتیب وتفہیم جدید۔ قرآن کی تقریباً تمام آیات متعلقہ اپنے اپنے محل پر بطور مثال درج ہیں۔

(۳) حزب اللہ۔ دنیا کی اور بالخصوص عالم اسلام کی سیاسیات حالیہ پر قرآن کی روشنی میں تبصرہ۔ مع اوراد قرآنی۔

(۴) مالک الملک۔ اسلامی حکمرانی کے اصول وضوابط از روئے قرآن کریم۔ (زیر تالیف)

(۵) مشکوٰۃ الصلوٰۃ۔ رسول کریمؐ پر درود وسلام ماخوذ از قرآن وحدیث وکلام اولیاء کرام۔ جملہ سات (۷) حزبوں کا مجموعہ۔

(۶) تحفۂ محمدی۔ نعتوں اور سلاموں کا مجموعہ بزبان اردو، فارسی۔ چار حصے۔

(۷) معروضہ۔ الیاس برنی کا نعتیہ کلام۔ پانچ مختصر حصے شائع ہو چکے ہیں۔ مزید متعاقب شائع ہوں گے۔ ہدیہ بلا قیمت۔ صرف تھوڑے نسخے باقی ہیں۔ محصول ڈاک ۱ر

(۸) ہدایت الاسلام۔ اسلامی عبادات واخلاقیات بموجب قرآن وحدیث۔ (زیر تالیف)

(۹) فتوح الحکم۔ حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کے ارشادات شریف بہ تنقیح وترتیب خاص۔ (طباعت طلب)

(۱۰) فتوحات قادریہ۔ حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے اوراد شریف بہ تنقیح وترتیب خاص۔ (طباعت طلب)

(۱۱) سلطان مبین۔ حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے حالات شریف بہ تنقیح وترتیب خاص۔ (زیر تالیف)

(۱۲) مکاتیب المعارف۔ حضرت مرشدی مولانا شاہ محمد حسین قبلہ قدس سرہٗ قادری چشتی نقش بندی کے مکتوبات شریف کا مجموعہ۔ (طباعت طلب)

(۱۳) صراط الحمید (جلد اول)۔ عراق شام۔ فلسطین وحجاز۔ مقامات مقدسہ اور حرمین شریفین کا سفرنامہ باتصویر۔

(۱۴) صراط الحمید جلد دوم)۔ دوسرے حج کا سفرنامہ بابت حرمین شریفین وحجاز۔

(۱۵) قادیانی مذہب۔ قادیانیوں کے عقائد واعمال کی تفصیل خود قادیانی کتابوں سے پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب قادیانی تحریک کی قاموس مانی جاتی ہے۔ چنانچہ پانچواں ایڈیشن حجم ۱۲۰۰ صفحات تقطیع کلاں) مدت سے نایاب ہے۔ جدید ایڈیشن اضافۂ مضامین کے ساتھ شائع ہوگا۔ (زیر نظر ثانی)

(۱۶) قادیانی قول وفعل۔ اس میں بھی قادیانی تحریک کے خاص پہلو پیش ہوئے ہیں۔ پہلا ایڈیشن نایاب ہے۔ دوسرا ایڈیشن اضافۂ مضامین کے ساتھ شائع ہوگا۔ (زیر نظر ثانی)

(۱۷) اسلام۔ اسلام کی تشریح وتوضیح از روئے قرآن بزبان انگریزی۔ پہلا ایڈیشن نایاب ہے۔ جدید ایڈیشن طباعت طلب ہے۔

(ب) شعبۂ ادبیات

سلسلۂ منتخبات نظم اردو۔ بارہ (۱۲) جلدیں بہ تفصیل ذیل:۔

(۱) معارف ملت ۴ جلد

(۲) مناظر قدرت ۴ جلد

(۳) جذبات فطرت ۴ جلد

(۱۳) جواہر سخن۔ فارسی شاعری کا انتخاب۔ زیر تالیف)

(۱۴) اردو ہندی رسم الخط۔ بلحاظ تلفظ وتحریک وترکیب اردو ہندی حروف کا مطالعہ اور مقابلہ مع امثلہ۔

(۱۵) اردو ہندی لپی۔ رسم الخط کی بحث بزبان ہندی۔ (تالیف طلب)

(۱۶) اردو ہندی اسکرپٹ۔ رسم اخط کی بحث بزبان انگریزی۔ (تالیف طلب)

(ج) شعبۂ معاشیات

(۱) علم المعیشت۔ اکنامکس یا معاشیات کے اصول کی تفصیلی بحث۔ عام مطالعہ کے واسطے۔

(۲) اصول معاشیات۔ معاشی مسائل کی بحث درس جامعات کے واسطے۔ چنانچہ یہ کتاب جامعہ عثمانیہ کے نصاب میں شریک ہے۔

(۳) معیشت الہند۔ معاشی مسائل کا مطالعہ بحوالہ ہندوستان۔ یہ کتاب بھی جامعہ عثمانیہ کے نصاب میں داخل ہے۔

(۴) مالیات۔ پبلک فنانس میں سلطنتوں کے مداخل ومخارج کی فنی بحث۔ (زیر تالیف)

(۵۔۷) مقدمۃ المعاشیات۔ معاشیات ہند اور برطانوی حکومت ہند۔ تین انگریزی کتابوں کا ترجمہ۔

الحمدللہ۔ حسب صراحت بالا چالیس (۴۰) کتابوں کے منجملہ جو تالیف یا ترجمہ ہوئیں یا ہو رہی ہیں۔ شعبہ جات دینیات وادبیات ومعاشیات میں کل اکتیس (۳۱) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جو باقی ہیں۔ اللہ مالک ہے۔ ان کے سوا بھی بعض علمی کام جاری ہیں جن کا اعلان متعاقب ہوگا۔ ان شاء اللہ۔

☆☆☆

اطلاع

جب تک اردو ہندی رسم اخط کے نسخے باقی رہیں (ہدیہ بلا قیمت) دست بدست حاصل ہو سکتا ہے۔

یا

محصول ڈاک (۳ر) وصول ہونے پر ارسال ہو سکتا ہے۔ بہ صورت آخر ڈاک ٹکٹ (۳ پائی والے ہندوستانی یا ۴ پائی والے حیدرآبادی) لفافہ میں رکھ کر بھیج دیے جائیں اور پورا پتہ صاف لکھ دیا جائے۔ فقط

بیت السلام
سیف آباد
حیدرآباد، دکن

الیاس برنی

☆☆☆

اردو زبان اور اس کا رسم الخط

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب

بار اول...........جولائی ۱۹۴۸
بار دوم. .... ستمبر ۱۹۶۱

ناشر
کتاب نگر، دین دیال روڈ، لکھنؤ

مطبوعہ
نظامی پریس، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ

قیمت : ایک روپیہ آٹھ آنے

طبع دوم کا دیباچہ

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۴۸ میں شائع ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک کی تقسیم نے اہل ملک میں وہ جذباتی ہیجان پیدا کر دیا تھا کہ کسی مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس وقت کی فضا اردو کے لئے بے حد ناسازگار تھی اور اردو کی حمایت کرنا گویا ملک سے غداری کرنا تھا۔ ان حالات میں ایسی کتاب پیش کرنا بڑی ہمت کا کام سمجھا گیا تھا۔ چنانچہ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک اخبار نے لکھا تھا:-

> اس وقت اردو کو فنا کرنے کا جو طوفان بپا ہے اس میں اچھے اچھے مضبوط دل والے ہمت ہار بیٹھے ہیں اور ہر چہار طرف عجز اور شکست خوردگی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی کے صدر پروفیسر مسعود حسن رضوی مستحق مبارکباد ہیں کہ اس فضا سے متاثر ہوئے بغیر انھوں نے ایک قابل قدر اور ٹھوس دلائل سے پر مقالہ اس اہم موضوع پر تحریر فرمایا...... اردو کی حمایت کا جذبہ بہت سے لوگوں کے دل میں ہے لیکن اردو دشمنوں کا مخالفانہ پروپگنڈا اس زور و شور سے جاری ہے کہ یہ حمایت کا جذبہ مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ اس رسالے کا مطالعہ جو ہرگز مناظرانہ اور مجادلانہ انداز میں نہیں اور نہ اس میں سیاسی اختلافات کو کوئی جگہ دی گئی ہے، اس باطل پروپگنڈے کے اثرات کو زائل کر دے گا اور اردو کے حامیوں کو اردو کی تائید کے قومی اور موثر دلائل ہاتھ آ جائیں گے۔
>
> (اخبار "تنویر" لکھنؤ، مورخہ ۳۰/۱۰ اکتوبر ۱۹۴۸)

اب ملک کی فضا اردو کے لئے پہلے سے بہت بہتر ہو گئی ہے۔ ایک طرف جذباتی ہیجان میں کمی ہو رہی ہے اور ملک کا سنجیدہ طبقہ محسوس کرنے لگا ہے کہ اردو والوں کو اپنی زبان کے مستقبل کے بارے میں جو بے یقینی ہے اور اس کے نتیجے میں جو بے چینی ہے وہ ایک انصاف پسند جمہوریت کے شایان شان نہیں ہے اور ایسی بے چینیاں ملک کی بے روک ترقی میں مخل ہوتی ہیں۔ دوسری طرف ادو کے حامی اپنا مقدمہ جس سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتے رہے ہیں اور انجمن ترقی اردو، ہند جس خوش تدبیری کے ساتھ اس مقدمے کی پیروی کرتی رہی ہے اس سے اردو کے بارے میں غلط فہمیاں دور ہو رہی ہیں اور اس کے مطالبات حق بجانب تسلیم کئے جا رہے ہیں۔ اب امید کی جا سکتی ہے کہ وہ دن دور نہیں ہے جب تعلیمی نظام اور سرکاری کاروبار میں اردو کو اس کا صحیح مقام مل جائے گا۔ لیکن صرف اس امید کا سہارا کامیابی کی ضمانت نہیں ہے۔ اردو کے مسئلے کا قابل اطمینان حل مسلسل جد و جہد پر موقوف ہے اور اس جد و جہد کو صحیح راستے پر چلانے کے لئے اردو زبان اور اس کے رسم خط سے متعلق مسائل کو علمی اور منطقی طور پر ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب دوبارہ شائع کی جا رہی ہے۔

اس کتاب پر تبصرے شائع ہوئے تھے، ان میں سے صرف دو، کتاب کے شروع میں نقل کئے جا رہے ہیں، جن سے کتاب کی نوعیت اور افادیت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب

۳ مارچ ۱۹۶۱

☆☆☆

تبصرے

اخبار "صدق"، لکھنؤ، ۸ مئی ۱۹۴۹ء

"اردو کے خلاف جب سے یلغار شروع ہوئی ہے، چھوٹے بڑے متعدد رسالے اور مقالے اردو کی صحیح منزل اور مرتبے کی توضیح پر شائع ہو چکے ہیں۔ ان سب میں بہت ہی ممتاز اور بہت ہی بلند درجہ اس رسالے کو حاصل ہے، جو 'قامت' میں کم تر اور مختصر اور 'قیمت' میں کہیں بہتر اور جامع ہے۔ نام سے یہ دھوکا نہ ہو کہ یہ کوئی وقت کی چلتی ہوئی سرسری چیز اور پروپیگنڈے کے کام کا رسالہ ہے۔ حقیقت میں اپنے بحث پر یہ ٹھوس، پرمغز اور اطراف و جوانب پر حاوی ایک مستقل تصنیف ہے۔ اور مصنف کا کمال یہ ہے کہ ساری بحثوں کو ۷۶ مختصر صفحات کے اندر سلیس و شگفتہ عبارت اور دلکش انداز میں سمیٹ لیا ہے۔

"بحث زبان اور رسم خط دونوں پر ہے اور اسی مناسبت سے رسالہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ہر بحث اپنی جگہ پر سنجیدہ و مدلل و مکمل۔ صدق اپنی تنگ دامانی سے معذور ہے، ورنہ یہ رسالہ تھا اس قابل کہ پورے کا پورا ان صفحات میں نقل ہوتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔ بلکہ ممکن ہو تو اس کے ہندی اور انگریزی ترجمے بھی ضرور شائع کیے جائیں۔ غیر اردو دانوں میں آخر کچھ تو منصف مزاج اور تحقیق پسند ہوں گے۔ دشوار ہے کہ وہ اس کے دلائل سے غیر متاثر رہیں۔"

☆☆☆

رسالہ "ماہِ نو" کراچی۔ مارچ ۱۹۴۹ء

"یہ مختصر کتاب فاضل مصنف کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو آپ نے آل انڈیا اورینٹل کانفرنس ۱۹۴۶ء کے شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے کانفرنس میں پڑھا تھا۔ صدارتی خطبوں میں سے اکثر کی حیثیت مقامی اور اثر وقتی ہوتا ہے۔ لیکن یہ خطبہ ان معدودے چند خطبوں میں سے ہے جو وقت اور مقام کی حدود سے بالاتر ہو کر اپنے لئے ایک مستقل اور دوامی مقام پیدا کر لیتے ہیں۔ اردو زبان اور رسم خط کے مسئلے پر انگریزی اور اردو میں چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں اور ان سے کہیں زیادہ مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن یہ بحث اب تک جاری ہے اور لوگ اب تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ مسعود صاحب کا یہ رسالہ الجھے ہوئے خیالات کو واضح کرنے اور زبان اور رسم خط کے متعلق کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

"رسالے کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں "اردو زبان" اس کی تاریخ، اس کے ترکیبی عناصر، اس کی تمدنی اور قومی اہمیت، اس کی صوتی خصوصیات، پر ایک جامع تبصرہ ہے۔ دوسرے حصے میں رسم خط اور اس کے سلسلے میں پیدا ہونے والے بے شمار مسائل کی فاضلانہ، غیر جانبدارانہ اور منطقی بحث ہے، اور پڑھنے والا کتاب پڑھنے کے بعد ایک طرح کا سکون اور اطمینان محسوس کرتا ہے کہ اتنے تھوڑے سے وقت میں اس پیچیدہ مسئلے کا ایک واضح حل اس کے سامنے آگیا۔

"اردو کے متعلق کچھ لکھتے وقت عموماً یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں موجودہ حالات کی تلخی لکھنے والے کے تصورات میں جذباتی ہیجان اور بیان میں غیر منطقی جوش نہ پیدا کر دے۔ مسعود صاحب کا یہ رسالہ اس عیب سے بالکل پاک ہے۔ اردو سے دلچسپی رکھنے اور اس کے مستقبل کو تابناک دیکھنے کی تمنا رکھنے والوں کے لئے اس رسالے کا مطالعہ ضروری بھی ہے اور یقیناً مفید بھی۔"

☆☆☆

پیش نامہ

آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا تیرھواں اجلاس ۱۹، ۲۰، ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو ناگپور میں ہوا تھا۔ کانفرنس کے اجلاس میں مشرقی علوم و ادبیات کے سولہ شعبے تھے، جن میں ایک شعبہ اردو کا بھی تھا۔ اس شعبے کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ میں نے ۲۱ اکتوبر کو پڑھا تھا وہ اب کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

جس زمانے میں یہ خطبہ لکھا گیا تھا ہندوستان دو حصوں میں تقسیم نہ ہوا تھا۔ مشرقی بنگال، مغربی پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحدی صوبہ سب ہندوستان میں شامل تھے۔ ہمارا ملک اس وقت تک آزاد نہ ہوا تھا، مگر آزادی کی منزل سامنے تھی۔ حصول آزادی کے بعد کے اہم مسائل میں ملکی زبان کا مسئلہ بھی تھا۔ اور انڈین نیشنل کانگریس کی منظور کی ہوئی قراردادوں اور ہماری جنگ آزادی کے سالار اعظم مہاتما گاندھی کے بیانوں سے اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ آزاد ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی ہوگی، جو آسان اردو اور آسان ہندی کا مجموعہ ہوگی اور ناگری اور فارسی دونوں حرفوں میں لکھی جائے گی۔

اب حالات میں بڑی تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ ہمارے صوبے کی حکومت نے سنسکرت آمیز ہندی کو سرکاری اور تعلیمی زبان قرار دیا ہے اور اردو زبان اور فارسی حرفوں کو کچہریوں، دفتروں اور تمام سرکاری کاروبار سے بالکل خارج کر دیا ہے۔ یہ صورت حال اردو زبان والوں کے لئے بے حد پریشان کن ہے۔ اردو ہماری مادری زبان ہے۔ اس سے ہم کو جتنی محبت ہو کم ہے۔ مگر ہندی سے بھی ہم کو مخالفت نہیں۔ میں نے تو آج سے کوئی تیس برس پہلے ہندی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ ہندی کی قدیم شاعری سے مجھ کو ہمیشہ دلچسپی رہی۔ تلسی داس کی رامائن کو میں ایک بے نظیر شعری شاہکار سمجھتا ہوں اور اس کے بعض مقامات آج بھی میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ اور اسی طرح نہ معلوم کتنے آدمی ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے مگر انھوں نے اپنے شوق سے ہندی ادب کا مطالعہ کیا ہے۔ اب ہندی کے سرکاری زبان قرار پا جانے سے اس کی تحصیل ہر شخص کے لئے ناگزیر ہو گئی ہے اور اس کو اس صوبے کے نظام تعلیم میں لازمی مضمون کی حیثیت دینا درست ہے۔ لیکن اس سے اس صوبے کی دوسری وسیع اور سرمایہ دار زبان اردو کے ساتھ ناانصافی کرنے کا کوئی جواز نہیں نکلتا۔

اردو اقلیت کی زبان سہی۔ مگر اقلیت کے حقوق کا تحفظ ہی تو وہ معیار ہے جس سے کسی جمہوری حکومت کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اقلیت کے حقوق کا پامال کرنا کسی حکومت کے لئے نہ کوئی دشوار کام ہے، نہ کوئی قابل فخر کارنامہ۔ اس

صوبے کے باشندوں کی ڈیڑھ سو برس کی مسلسل کوششوں سے اردو جس مقام پر پہنچ چکی ہے اس سے نیچے گرانے کے لئے اس وقت اس پر ایسے ایسے الزام لگائے جار ہے ہیں جو کبھی کسی کے وہم میں بھی نہ آئے تھے اور جن کو سن کر یہ مشہور مصرع یاد آجاتا ہے۔

"قصور ڈھونڈھ کے پیدا کئے جفا کے لئے"

ہم نے اس خطبے میں ایک جگہ یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ ملک کے آزاد ہوجانے کے بعد احیائی ذہنیت کے زور پکڑ جانے کا امکان ہے۔ ہمارا یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ احیائی ذہنیت کی بنیاد ایک نیک مقصد پر ہوتی ہے۔ وہ قوم کی گذشتہ عظمت کو واپس لانا چاہتی ہے۔ مگر حصول مقصد کے جوش میں اس حقیقت کو نظر انداز کردیتی ہے کہ صدیوں پہلے کے حالات اب واپس نہیں لائے جاسکتے۔ اور اگر واپس لائے بھی جاسکیں تو اس زمانے میں وہ قومی عظمت کا معیار نہیں بن سکتے۔ بہر حال احیائیت ایک دفعہ ماضی کو واپس لانے کی کوشش ضرور کرتی ہے۔ مگر جب اپنے تجربے سے اس کوشش کو بے نتیجہ اور حصول مقصد کے لئے بے سود پاتی ہے تو رفتہ رفتہ ترقی پسندی میں تبدیل ہونے لگتی ہے اور جو قدم پیچھے ہٹ رہے تھے وہ آگے بڑھنے لگتے ہیں۔ کاش ہماری قوم دوسری قوموں کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر بے نتیجہ کارروائیوں میں اپنا وقت ضائع کرکے اپنے نام کو دھبہ نہ لگائے اور وہ صورتیں اختیار کرے جو دنیا میں اس کی سربلندی کا باعث ہوں۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب

۲۱ جون ۱۹۴۸

پہلا حصہ

اردو زبان

اردو کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی۔ اس مسئلے میں علمی اور لسانی نقطۂ نظر سے جو اختلافات بھی ہوں مگر اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مختلف زبانیں بولنے والی قوموں اور ان کی زبانوں کے میل جول سے اسی ملک میں اردو کی بنیاد پڑی اور رفتہ رفتہ وہ مختلف جماعتوں کے لئے اظہار خیال کے ایک مشترک وسیلے کا کام دینے لگی۔

اردو زبان نہ یکا یک پیدا ہوگئی تھی، نہ کسی دہی بادشاہ کے ناگہانی حکم سے کسی مقررتاریخ سے اس کا استعمال شروع ہوا تھا، نہ کسی جماعت نے کوئی کانفرنس کرکے اس کے رائج کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا بلکہ وہ تاریخی اسباب اور معاشرتی ضرورتوں کے ماتحت بنتی اور رواج پاتی رہی۔ اردو اصل میں شمالی ہند کی ایک عوامی بولی تھی، جس میں تاریخی حالات کے ماتحت سنسکرت، قدیم ایرانی، قدیم یونانی، تورانی، فارسی، عربی، ترکی، فرانسیسی، پرتگالی، انگریزی اور نہ معلوم کن کن زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے رہے۔ ہندوستان کے دوسرے صوبے، جو ایک زمانے میں مختلف ملکوں کی حیثیت رکھتے تھے، ان کی زبانوں کے یعنی پنجابی، گجراتی، بنگالی وغیرہ کے الفاظ بھی اس میں ملتے رہے۔

یہ عمل صدیوں جاری رہا۔ یہاں تک کہ آج سے چار پانچ سو برس پہلے عالموں اور ادیبوں نے اس زبان سے کام لینا اور اس کے سرمائے میں اضافہ کرنا شروع کیا۔ ایک مدت کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کے صرف و نحو کے قاعدے بنائے جائیں، صحت کے معیار اور فصاحت کے اصول مقرر کئے جائیں۔ لفظوں کے معنی اور محاوروں کا مفہوم معین کیا جائے یعنی اس کا لغت مرتب کیا جائے۔ یہ سب کام بھی تین چار سو برس سے ہوتے چلے آتے ہیں۔

مختصر یہ کہ فطری اسباب، تاریخی حالات اور انسانی کوششیں مل کر صدیوں تک کام کرتی رہی ہیں تب جاکر اردو زبان اس قابل ہوئی ہے کہ خیالات کی پیش رفت اور علوم کی ترقی کا ساتھ دے سکے۔

اردو عوامی زبان ہے اور عوام ہی کے تعلیم یافتہ طبقے کی کوششوں سے اس نے ترقی کی ہے۔ بادشاہوں، راجاؤں اور امیروں کی سرپرستی کا احسان اس کے سر پر نہیں ہے۔ مغل بادشاہ ادب اور شعر کی سرپرستی کے لئے دور دور مشہور تھے۔ وہ اگر ایک طرف فارسی کے ایک ایک شعر پر شاعر کا منہ موتیوں سے بھر دیتے تھے یا شاعر کو سونے میں تول دیتے تھے تو دوسری طرف ہندی کے شاعروں پر بھی انعام و اکرام کی بارش کرتے تھے اور ان کو ملک الشعرائی کا منصب عطا کرتے تھے۔

یہ داستان بہت طویل ہے۔ یہاں صرف ایک شاعر کی شہادت پیش کی جاتی ہے۔ سندر کوی نے اپنی کتاب "سندر سنگار" میں شاہجہاں کی نوازشوں کا ذکر اس طرح کیا ہے:

شاہجہاں تہہ کون کو دینو اگنت دان
تن میں سندر سکوی کو کیو بہت سنمان
تگ بھوکھن منصب دیئے ہے ہاتھی سرو پاے
پرتھم دیو کو راج پد بہر مہا کوی راے

یعنی شاہجہاں جس نے شاعروں کو بے شمار انعام دیئے، ان میں اچھے شاعر سندر کی بہت عزت افزائی کی۔ جواہرات، زیور، منصب، گھوڑے، ہاتھی، خلعت عطا کئے۔ اس کو پہلے کوی راج یعنی ملک الشعرا کا درجہ عنایت کیا پھر مہا کوی راے یعنی شہنشاہ شعرا کا۔

ادب و شعر کے ان سرپرستوں نے اردو کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا۔ اس لئے کہ اس وقت تک اردو میں نہ ادب تھا نہ شعر۔ جب یہ زبان ترقی کرتے کرتے ادب و شعر کی سرحد میں داخل ہوئی تو مغل بادشاہوں نے اس سے کچھ دلچسپی ضرور لی، مگر یہ وہ وقت تھا کہ مغلیہ سلطنت کا چراغ جھلملا رہا تھا۔ اس وقت کی برائے نام بادشاہی میں نہ کسی زبان کی سرپرستی کا دم تھا، نہ اس کی سرپرستی سے کسی خاص فائدے کی امید تھی۔ اس لئے اگر شاہ عالم آفتاب، بہادر شاہ ظفر اور خاندان شاہی کے دوسرے افراد نے اردو میں شعر کہے یا کوئی کتاب لکھی تو ان کے اس کام کی

حیثیت انفرادی کوشش سے زیادہ نہیں قرار پا سکتی۔

مغلیہ سلطنت کے دور انحطاط میں اودھ کی خود مختار سلطنت کی بنیاد پڑی۔ اودھ کے بعض فرماں روا اردو شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے، اردو میں شعر کہتے تھے اور اردو کے شاعروں کی کبھی کبھی ہمت افزائی بھی کرتے تھے۔ مگر یہاں بھی سلطنت کی طرف سے اردو کی ترقی اور اشاعت کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا اور اردو کو علمی، ادبی، دفتری اور درباری زبان کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ اودھ کے امیروں، شریفوں اور شاعروں نے اردو کو ایک بااصول اور علمی زبان بنانے اور اس کے ادب کو ترقی دینے کے لئے بہت کچھ کیا۔ اودھ کی ادبی خدمات پر ابھی تعصب اور ناواقفیت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ جب محققین ادب کی کوششوں سے یہ پردے ہٹیں گے تو اودھ کے کارنامے اردو ادب کی تاریخ میں ایک نہایت درخشاں باب کا اضافہ کردیں گے۔

اردو جس ضرورت کے لئے وجود میں آئی تھی اس کو پورا کرتی رہی اور ایک جمہوری زبان ہونے کی حیثیت سے اپنی اندرونی طاقت سے بڑھتی اور پھیلتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ ایسا آیا جب اردو ملک کی عام زبان تسلیم کرلی گئی۔ چنانچہ سترہویں صدی کے آخر میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے انگریز ملازموں کو اس ملک کی عام زبان سکھانا ضروری سمجھا تو اردو ہی کو اختیار کیا۔ ۱۸۳۵ میں یا اس کے قریب جب دفتروں میں فارسی کی جگہ ملکی زبان کو دی گئی تو اردو ہی اختیار کی گئی۔ غیر ملک کے عیسائی مشنریوں نے جب اپنے مذہب کو ہندوستان کے عوام میں پھیلانا چاہا تو اپنی کتابیں اردو ہی میں شائع کیں۔

اس وقت بھی اگر کسی دوسری زبان کو اردو کے مقابلے میں ہندوستان بھر کی عام زبان بننے کا دعویٰ ہے تو وہ صرف ہندی ہے۔ مگر ہندی بھی اردو ہی کی ایک شکل ہے۔ دونوں کی صرف ونحو بالکل ایک ہی ہے، خیالات وجذبات کے اظہار کے طریقے ایک سے ہیں، افعال وحروف بالکل یکساں ہیں، بے شمار الفاظ مشترک ہیں۔ غرض کہ ہندی کا پورا ٹھاٹھ وہی ہے جو اردو کا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس صورت میں یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ اردو ہندی کی ایک شکل ہے، مگر یہ سمجھنا تاریخی حیثیت سے صحیح نہ ہوگا۔

ہندی کا لفظ ایک مدت تک اردو ہی کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ ایسی اردو جس میں فارسی عربی لفظوں کی آمیزش حد مناسب سے زیادہ ہوتی تھی، وہ بھی ہندی کہلاتی تھی۔ ثبوت کی ضرورت ہو تو بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اسی زبان کو ریختہ بھی کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ دونوں نام متروک ہوگئے اور اردو کا لفظ عام طور سے استعمال ہونے لگا۔

جب ۱۸۰۰ میں فورٹ ولیم کالج کلکتے میں قائم ہوا اور وہاں اردو نثر کی متعدد کتابیں لکھی جا چکیں تو انگریزوں کی تجویز سے پہلی کتاب ایسی اردو میں لکھی گئی جس میں فارسی عربی کے کچھ الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت اصل کے لفظ رکھ دیئے گئے اور اس کے لئے ناگری رسم خط اختیار کیا گیا۔ کچھ زمانے کے بعد اس نئی شکل کی اردو کو رائج الوقت اردو سے ممیز کرنے کے لئے ہندی کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ لفظ ہندی کے معنی میں وسعت پیدا ہوتی گئی یہاں تک کہ وہ شمالی ہند کی ان تمام زبانوں پر حاوی ہوگیا جو ناگری حرفوں میں لکھی جاتی تھیں۔ ایک مدت کے بعد یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندی کی اس شکل کو جس کی بنیاد فورٹ ولیم کالج میں پڑی تھی برج بھاشا، اودھی، بھوج پوری، راجستھانی، میتھلی وغیرہ سے ممتاز کرنے کے لئے اس کا کوئی مخصوص نام ہونا چاہئے اور کھڑی بولی اس کا نام قرار دیا گیا۔ وہ ہندی جو اردو کے مقابلے میں سارے ہندوستان کی زبان بننے کا دعویٰ کرتی ہے یہی کھڑی بولی ہے۔[1]

اس ہندی یعنی کھڑی بولی کی نثر کو پیدا ہوئے ابھی ڈیڑھ سو برس بھی نہیں ہوئے تھے۔ ہندوستانی لسانیات کے ماہر ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کی تحقیق کے مطابق خالص کھڑی بولی کا سب سے پہلا ہندو لکھنے والا سدا سکھ تھا، جس نے اٹھارہویں صدی کے آخر میں بھاگوت پران کا ترجمہ نثر میں سکھ ساگر کے نام سے کیا۔ یہ پہلی کتاب تھی جس میں ناگری حروف، جو برج بھاشا اور اودھی کے لئے پہلے سے مستعمل تھے، کھڑی بولی کے لئے استعمال کئے گئے اور علمی الفاظ سنسکرت سے لئے گئے۔ اس کے بعد ۱۸۰۳ میں اس طرح کی دو کتابیں فورٹ ولیم کالج، کلکتہ میں لکھی گئیں، للوجی لال کی پریم ساگر اور سدل مسر کی ناسکیتو پاکھیان۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کی رائے میں للوجی لال اور سدل مسر علمی ہندی کے قدیم ترین نثر نگاروں میں تھے۔[2]

اس ہندی کی نظم کی عمر اس کی نثر سے بھی کم ہے اور اس میں ابھی تک کوئی سورداس، کوئی تلسی داس، کوئی بہاری، کوئی کبیر اور کوئی جائسی پیدا نہیں ہوا۔ اردو زبان اپنی اسی صورت میں یعنی فارسی عربی لفظوں کی آمیزش کے ساتھ اس نئی ہندی یعنی کھڑی بولی سے کئی سو برس پہلے پیدا ہوچکی تھی۔ اردو میں نظم ونثر کی بیسیوں کتابیں اب بھی موجود ہیں جو آج سے تین چار سو برس پہلے تصنیف کی گئی تھیں۔ ان میں بعض کتابیں اتنی ضخیم ہیں کہ کئی کئی سو صفحوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان حقیقتوں کی روشنی میں صاف نظر آتا ہے کہ نئی ہندی (کھڑی بولی) اردو ہی سے نکلی ہے اور اسی کی ایک شکل ہے، جس میں بہت سے فارسی، عربی اور ہندی لفظوں کی جگہ سنسکرت لفظوں کو دے دی گئی ہے۔

اردو ہی نے سیکڑوں برس کے مسلسل استعمال سے کھڑی بولی کو اس قابل بنادیا کہ وہ ہندی کے روپ میں ملک کی سرکاری زبان قرار دی جاسکی۔ اگر اردو کی سی ترقی یافتہ زبان موجود نہ ہوتی تو نئی ہندی کو ہندوستان گیر دفتری زبان بنانے کا خیال پیدا ہی نہ ہوتا۔ اردو نے ہندی لفظوں کے معنی میں بڑی وسعت پیدا کردی ہے۔ بے شمار محاورے جو صرف ہندی لفظوں سے بنے ہیں، ہزاروں خیالوں کے مختصر اور مکمل اظہار کا بہترین ذریعہ ہیں۔ لیکن ہند ہی میں علیحدگی پسندی کا جو رجحان پیدا ہوگیا ہے وہ اردو محاوروں کا کیا ذکر ان ہندی لفظوں سے بھی پرہیز کرتا

---

[1] ہندوستان کے آئین میں یہی ہندی ملک کی سرکاری زبان مان لی گئی ہے۔

[2] انڈین آرین اینڈ ہندی (بزبان انگریزی) مصنفہ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی، ۱۹۴۲، صفحہ ۱۸۹۔

ہے جو اردو زبان کا جز بن چکے ہیں۔ آنکھ کو نیتر، ماتھے کو مستک، کپڑے کو بستر، بھائی کو بھراتا کہنا اسی رجحان کا نتیجہ ہے۔

اردو میں یوں تو بہت سی بدیسی زبانوں کے الفاظ شامل ہو گئے ہیں، لیکن ان میں فارسی لفظوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ فارسی کو ہمارے ملک میں کوئی سات سو برس تک سرکاری اور تعلیمی زبان کی حیثیت حاصل رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ لوگ اپنے نج کے تمام کام بھی فارسی ہی میں کرنے لگے۔ عزیزوں سے خط کتابت اور گھر کا حساب کتاب تک فارسی میں ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ فارسی کا ذوق عام ہو گیا اور بلا مبالغہ فارسی کے ہزاروں شاعر اور انشا پرداز پیدا ہو گئے۔ ان حالات میں کیوں کر ممکن تھا کہ ہندوستان کی زبانوں میں فارسی لفظوں کی آمیزش نہ ہو جائے۔ انگریزی زبان کو ہمارے ملک کی سرکاری زبان قرار پائے ہوئے ابھی پورے سو برس بھی نہیں ہوئے، لیکن اس کے سیکڑوں لفظ ہماری زبان کا جز بن چکے ہیں۔

ہر زبان کسی کلچر یا تہذیب کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اردو ہندوستان کی اس مخلوط تہذیب کا مظہر ہے جو ہندوستانیوں، عربوں، ترکوں اور ایرانیوں کے مدت دراز کے میل جول سے وجود میں آئی تھی۔ اس کا یہ تہذیبی پس منظر اس کا متقضی تھا کہ اس میں ہندی، عربی، فارسی، ترکی لفظ ملے جلے ہوں۔ چونکہ مختلف قوموں کے لفظوں کی یہ آمیزش تاریخی اسباب کے ماتحت فطری طور پر عمل میں آئی تھی، اس لئے اردو میں ان زبانوں کے الفاظ اسی نسبت سے ہیں جس نسبت سے ان کے بولنے والوں کا اس مخلوط تہذیب میں حصہ ہے۔ اردو سے بدیسی لفظوں کو نکالنے کے درپے ہونا فطری اسباب سے جنگ کرنا اور تاریخ کو جھٹلانے کی کوشش کرنا ہے۔

ہندوستان مختلف نسلوں، مختلف مذہبوں اور مختلف تہذیبوں کی نمائش گاہ ہے۔ یہاں کسی ایسی تہذیب کو جو کسی ایک جماعت سے مخصوص ہو دوسری جماعتوں پر ان کی مرضی کے خلاف عاید کرنا بدگمانیوں اور نزاعوں کا باعث ہے۔ اور متحدہ قومیت کا ارتقا ایک ایسی مشترک تہذیب کے بغیر ممکن نہیں، جو مختلف تہذیبوں کے عناصر سے بنی ہو۔ ایسی مخلوط تہذیب ہندوستان میں انگریزی حکومت سے پہلے موجود اور ہر طبقے میں مقبول تھی۔ اس نے اتحاد و اتفاق کے جو روح پرور مناظر پیش کئے تھے وہ ابھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوئے ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی ضروری تبدیلیوں کے ساتھ اس تہذیب کا احیا ہماری بہت سی پریشانیوں کا علاج اور بہت سی مشکلوں کا حل ہے۔

اگر یہ خیال صحیح ہے تو پھر اردو زبان جو اسی مخلوط تہذیب کی پیداوار اور اسی کی روایتوں کی خزینہ دار ہے، اس کی اہمیت اور افادیت میں کیا شبہہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر کوئی محکوم قوم جب بیدار ہو کر آزادی کی راہ چلنے لگتی ہے تو کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب مدت دراز کے مسلسل احساس کمتری کا رد عمل ایک طرح کا احساس برتری پیدا کر دیتا ہے۔ اس وقت دور محکومی کی ہر یادگار سے، خواہ وہ کتنی ہی کار آمد اور مفید ہو، بیزاری پیدا ہو جاتی ہے اور اس دور سے پیشتر کی ہر چیز، خواہ وہ موجودہ حالت میں کتنی ہی بے کار یا مضر ہو، محبوب نظر آنے لگتی ہے۔ یہ عہد قدیم کے احیا کا زمانہ احیائی دور کہلاتا ہے۔ ابھی کچھ بہت مدت نہیں ہوئی کہ ایران اسی دور سے گذر رہا تھا۔ ایرانیوں نے اپنی زبان سے عربی کے عام فہم الفاظ نکال کر فارسی کے غیر مانوس لفظوں کو داخل کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر کچھ زمانے کے تجربے کے بعد اس تحریک کو زبان کے حق میں مضر پا کر آخر کار ترک کر دیا گیا۔

ہمارا ملک اس وقت اسی احیائی دور سے گذر رہا ہے۔ ایک بڑی جماعت ہندوستان کی قدیم تہذیب کے احیا کی خواہش مند ہے اور قومی تفاخر کے جوش میں ہر اس چیز سے کنارہ کشی کرنا چاہتی ہے جو غیر ملکی اثرات کی پیداوار یا یادگار ہیں۔ اسی جذبے کے ماتحت وہ جماعت عربی، فارسی، ترکی لفظوں کو اردو زبان سے خارج کر کے ان کی جگہ سنسکرت لفظوں کو دے رہی ہے۔ ممکن ہے کہ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد احیائیت کا زور کچھ دنوں کے لئے اور بڑھ جائے۔ مگر احیائی ذہنیت عقل سے کم اور جذبات سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ اس لئے امید کی جاسکتی ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا اور ملک داری کی ضرورتیں دل میں وسعت اور نگاہ میں بلندی پیدا کرتی جائیں گی اسی مناسبت سے افادی نقطۂ نظر احیائی رجحانات پر غالب آتا جائے گا۔ اس وقت شاید یہ بات سمجھ میں آسکے کہ فارسی، عربی اور انگریزی کی سی جان دار اور بڑھتی پھیلتی ہوئی زبانوں سے قطع تعلق کر کے صرف سنسکرت سے رشتہ جوڑنے کی کوشش ہم کو پیچھے پلٹا دینے والی تحریک ہے۔

سنسکرت زبان کی عظمت اور اس کے قدیم علمی سرمائے کی قدر و قیمت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مگر اس حقیقت کا انکار بھی ممکن نہیں کہ سیکڑوں برس سے سنسکرت دنیا کے کسی حصے میں نہ بولی جارہی ہے نہ ادبی اور علمی زبان کی حیثیت سے استعمال کی جارہی ہے۔ ایسی زبان اس زمانے کے نئے نئے خیالوں کا ساتھ کیوں کر دے سکتی ہے اور اس کے لفظوں کی کثرت ہماری زبان سمجھنے والوں کا حلقہ وسیع کرنے میں کیوں کر مفید ہو سکتی ہے۔

فارسی، عربی لفظوں کی آمیزش سے اردو میں یہ خصوصیت پیدا ہوئی ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں صرف یہی ایک زبان ہے جو ایشیا کے کئی ملکوں کی زبانوں سے بہت قریب ہے، جس کو بولنے اور سمجھنے والے ان ملکوں میں بھی موجود ہیں اور جس کو ان ملکوں کے باشندے بھی آسانی سے سیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح اردو جاننے والوں کے لئے فارسی، عربی اور ترکی کا سیکھ لینا اوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسان ہے۔ اس صورت حال سے صاف ظاہر ہے کہ اردو زبان ہندوستان اور متعدد ایشیائی ملکوں کے درمیان تمدنی اور تہذیبی تعلقات قائم کرنے کا بہت اچھا ذریعہ ہے اور اس میں سے فارسی عربی لفظوں کو نکال کر سنسکرت الفاظ داخل کرنا اس کو اس صفت سے محروم کر دینا ہے۔

کسی ملک کی زبان میں غیر ملکی زبان کے لفظوں کا شامل ہو جانا کوئی عیب نہیں ہے، جن کو دور کرنا ضروری ٹھہرے۔ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن دنیا کی سب سے بڑی زبانیں ہیں۔ ادبیات اور علوم و فنون کے جو خزانے ان کے قبضے میں ہیں ان کا دسواں حصہ بھی کسی اور زبان کو میسر نہیں۔ لیکن ان زبانوں کا بڑا حصہ لاطینی اور

یونانی لفظوں پر مشتمل ہے۔ اور خود ان میں سے ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں کثرت سے موجود ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری یورپی زبانوں بلکہ عربی، فارسی، ترکی، عبرانی تک کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو قوم جتنی زیادہ متمدن اور مہذب ہوگی اور اس کے تجارتی، سیاسی، علمی، ادبی، تہذیبی تعلقات دوسری قوموں سے جتنے زیادہ ہوں گے اتنا ہی اس کی زبان میں دوسری زبانوں کا میل زیادہ ہوگا۔ اس وقت ہندوستان دوسرے ملکوں سے ہر طرح کے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے یہ تعلقات جتنے بڑھتے جائیں گے اتنے ہی زیادہ غیر ملکی الفاظ ہماری زبان میں شامل ہوتے جائیں گے۔

ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ اردو ایک مخلوط تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہ تہذیب یوں وجود میں آئی کہ دوسرے ملکوں کے لوگ ہندوستان میں آکر آباد ہوگئے اور ہندوستانیوں میں گھل مل گئے۔ یہی حال اردو زبان کا ہے کہ دوسری زبانوں کے الفاظ آکر یہاں کی زبان میں بس گئے اور گھل مل گئے۔ یہی سبب ہے کہ اگرچہ اردو میں کئی زبانوں کے، خاص کر فارسی اور عربی کے الفاظ کثیر تعداد میں شامل ہیں، مگر ہندی لفظوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ کتاب کی کتاب ایسی عبارت میں لکھی جا سکتی ہے جو فارسی عربی سے بالکل خالی ہو اور اس کو ٹکسالی اردو کہہ سکیں لیکن ایک جملہ بھی ایسا نہیں بنایا جا سکتا جو ہندی لفظوں سے بالکل خالی ہو اور اس کو اردو قرار دے سکیں۔ سید انشا کی کتاب رانی کیتکی کی کہانی اور حضرت آرزو لکھنوی کی کتاب سریلی بانسری ایسی اردو نثر و نظم کے نمونے ہیں جن میں ہندی لفظوں کے سوا فارسی عربی کا ایک لفظ بھی نہیں ہے۔

اردو کے ترکیبی عناصر میں ہندی کے بعد فارسی کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ اور یہ بھی تاریخی اسباب کا لازمی نتیجہ ہے۔ جن حالات میں اردو پیدا ہوئی، پلی، بڑھی اور بولی کی حد سے نکل کر ادبی زبان بنی ان کا مقتضا یہی تھا کہ اس میں فارسی کے لفظ اور فارسی ہی کے توسط سے عربی الفاظ کثرت سے شامل ہو جائیں اور اس میں فارسی ادب کا رنگ آجائے۔

اس زمانے میں فارسی زبان و ادب ہندوستان پر چھایا ہوا تھا اور دنیا کی نظر میں خاص امتیاز رکھتا تھا۔ فارسی کی کلاسیکی شاعری تو آج بھی کسی زبان کی شاعری سے کم تر نہیں سمجھی جاتی۔ اردو والوں کا احسان ہے کہ انھوں نے سیکڑوں حسین تشبیہیں، خوبصورت استعارے، پرمعنی تلمیحیں، دل نشیں اسلوب، فارسی شاعری سے لے کر ہمارے ملک کی ملک بنا دیے اور ہمارے لسانی ذخیرے کو مالا مال کر دیا۔ مگر اب اسی بنا پر بعض لوگوں کو اردو ادب میں بدیسی پن دکھائی دینے لگا ہے، ہیچ ہے۔

ہنر بہ چشم عداوت بزرگ تر عیبے ست

انگریزی شاعری یونانی دیومالا کی تلمیحوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر کیا اس وجہ سے انگلستان والوں نے اس پر کبھی غیر ملکی یا غیر قومی زبان ہونے کا شبہ بھی کیا؟

فارسی زبان صدیوں سارے ہندوستان میں ہر طرح کے خیالات کے ادیبانہ اظہار کا ذریعہ رہ چکی ہے۔ اس لئے فطری طور پر ہندوستان کی ہر زبان فارسی ادب سے متاثر ہوئی اور فارسی عربی الفاظ ہر زبان میں شامل ہو کر ہندوستانی زبانوں کا مشترک سرمایہ بن گئے۔ اب احیائی رجحانات کے ماتحت ان لفظوں کو نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مگر ان مشترک الفاظ کا اخراج ملک کے لسانی اتحاد کے لئے کیوں کر مفید ہو سکتا ہے؟

اردو سو برس سے زیادہ دفتروں اور عدالتوں میں رائج رہ چکی ہے۔ اس میں تمام قانونی اور دفتری اصطلاحیں اور محاورے موجود ہیں۔ ان میں سے اکثر چیزیں سیکڑوں برس پہلے سے، یعنی اس زمانے سے جب فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی استعمال ہوتی چلی آرہی ہیں۔ اور اتنی طویل مدت تک استعمال میں رہنے سے اس قدر عام فہم ہوگئی ہیں کہ جاہل دیہاتی بھی ان کو اپنی ضرورت بھر سمجھ لیتے ہیں۔ یہ اصطلاحیں زیادہ تر فارسی عربی سے لی گئی ہیں۔ مگر چونکہ یہ عام فہم ہوگئی ہیں اور ہندوستان کی اکثر زبانوں کا جز بن چکی ہیں۔ اس لئے ان کو بدلنے کی کوشش کرنا فعل عبث ہوگا۔ اور جو نئی اصطلاحیں وضع کی جائیں گی ان کا بالکل صحیح مفہوم ایک مدت تک خواص کی سمجھ میں بھی نہ آسکے گا۔ عوام کو تو ان کے سمجھنے میں بہت زیادہ زمانہ لگ جائے گا۔ انگریزی زبان میں قانونی اور علمی اصطلاحیں زیادہ تر لاطینی اور یونانی سے لی گئی ہیں۔ مگر اس سے ان کی شان میں کیا کمی ہوگئی؟

اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ عربی فارسی کے جو لفظ ہندوستان کی زبانوں میں شامل ہوگئے ہیں ان میں سے اکثر صرف اپنی اصل کے اعتبار سے عربی فارسی کہے جا سکتے ہیں۔ مگر ان کے تلفظ، معنی اور محل استعمال میں اتنا فرق ہو گیا ہے کہ کوئی عرب یا ایرانی ان کو نہیں سمجھ سکتا۔ یہ لفظ بالکل ہندوستانی بن چکے ہیں۔ اب ان کو بدیسی سمجھنا غلطی ہے اور ان کو نکالنے کی کوشش کرنا زبان کو نقصان پہنچانا ہے۔

ہندی کے اکثر حمایتی اس وقت اس کو تمام خارجی عناصر سے پاک کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ بعض لوگ اس معاملے میں حد سے گذر گئے ہیں کہ عربی فارسی لفظوں کے ساتھ ہندی کے ان عام فہم اور کثیر الاستعمال لفظوں کو بھی نکال رہے ہیں جو ہندی اور اردو میں مشترک ہیں۔ مثلاً لڑکا، لڑکی، پہاڑ اور پانی کے سے لفظ تو کسی دوسرے ملک سے نہیں آئے تھے۔ پھر ان کو چھوڑ کر بالک، مہما، پربت اور جل کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ مانوس اور آسان لفظوں کو نکال کر اجنبی اور مشکل لفظوں کو ان کی جگہ دینا کسی زبان کی ترقی میں کیوں معین ہو سکتا ہے؟ بعض لوگ اردو والوں پر بھی یہی اعتراض کر دیتے ہیں۔ مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اردو میں لڑکے کی جگہ طفل یا کودک، لڑکی کی جگہ دختر یا صبیہ، پہاڑ کی جگہ کوہ یا جبل اور پانی کی جگہ آب یا ماء لکھنا بہتر سمجھا جاتا ہے، یا اس طرح کی کوئی تحریک کبھی شروع کی گئی، یا ایسی کوئی تجویز کبھی کسی نے پیش کی؟

ہندی میں ایک طرف سنسکرت کے الفاظ بے امتیازی سے بھرے جا رہے ہیں، دوسری طرف لفظوں کا تلفظ صحیح کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے یعنی سنسکرت لغت کو ہندی لفظوں کی صحت کا معیار بنایا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اردو والوں نے سنسکرت لفظوں کا تلفظ جان بوجھ کر بگاڑ دیا ہے۔ یہ الزام

غلط بھی ہے اور غلط فہمیوں پر مبنی بھی۔ اردو میں ہندی لفظوں کا جو تلفظ اختیار کیا گیا ہے وہ وہی ہے جو عوام میں رائج ہو چکا تھا اور جس کو ہندی کے بڑے بڑے شاعر استعمال کر چکے تھے۔ یہ الزام لگانے والے سنسکرت اصل کے ہندی لفظوں کو آج بھی سنسکرت لفظ سمجھ رہے ہیں اور ان لفظوں کو سنسکرت سے چل کر ہندی تک پہنچنے میں پراکرتوں اور اپ بھرنشوں وغیرہ کی جتنی منزلیں صدیوں میں طے کرنا پڑی ہیں ان سب کو نظر انداز کر رہی ہیں۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ اردو کا ایک جملہ ہے۔ "تم ایک بڑا گھوڑا دیکھو۔" لسانیات کے ماہروں کی تحقیق یہ ہے کہ یہ قدیم سنسکرت سے نہیں نکلا ہے۔ بلکہ بنیادی پراکرت کا ایک جملہ ڈھائی ہزار برس میں بہت سی منزلیں طے کر کے اس صورت تک پہنچا ہے۔ ان میں سے چند منزلیں، جن کا لسانی طریقوں سے پتہ لگایا جاسکا ہے حسب ذیل ہیں:-[1]

ویدک سنسکرت۔ یُویم ایکم بری ہتم گھوٹکم پشیئت

تقریباً ۱۲۰۰ق۔م۔

۱۔ بنیادی پراکرت تُمھے ایکم بڈرم گھوٹکم دری شتھ

تقریباً ۶۰۰ق۔م۔

۲۔ قدیم پراکرت۔ تُمھے ایکم وڈم گھوٹکم دِکھتھ

تقریباً ۲۰۰ق۔م۔

۳۔ ثانوی پراکرت۔ تُمھے اِکم وَڈم گھوڑآم دِکھہ

تقریباً ۲۰۰ء

۴۔ اختتامی پراکرت۔ تُمھے اِک وڈ گھوڑا دِکھہ

یا اَپ بھرنش۔

تقریباً ۴۰۰ء

۵۔ قدیم بنگالی۔ تُمھے اِک بڑا گھوڑا دیکھہ

تقریباً ۶۰۰ء

۶۔ درمیانی بنگالی۔ تُمھی اِیک بڑا گھوڑا دیکھہ

تقریباً ۱۴۰۰ء

۷۔ جدید بنگالی۔ تُمی آیک بڑو گھوڑا دیکھو

تقریباً ۱۸۰۰ء سے

۸۔ اردو یا ہندوستانی تم ایک بڑا گھوڑا دیکھو

جو لوگ اردو والوں پر سنسکرت لفظوں کا تلفظ بگاڑنے کا بے بنیاد الزام لگاتے ہیں وہ اس بات کو بھی بھلا دیتے ہیں کہ تدبھو الفاظ کسی زبان کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ ہر زبان کے عام بولنے والے قدیم لفظوں میں سے رفتہ رفتہ وہ سب چیزیں نکال ڈالتے ہیں جو تلفظ میں دشواری پیدا کرتی ہیں، ثقیل اور بوجھل معلوم ہوتی ہیں اور بے ضرورت یا ضرورت سے زیادہ ہوتی ہیں۔ یہ عمل وہ اپنے مذاق اور اپنی سہولت کے مطابق فطری طور پر بلا ارادہ کرتے رہتے ہیں۔ تدبھو الفاظ اسی فطری عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

ہندی اور اردو میں استعمال ہونے والے بے شمار تدبھو لفظوں میں سے چند مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں اور ان کے سامنے ان کا تت سم روپ بھی لکھا جاتا ہے:-

تدبھو	تت سم		تدبھو	تت سم
گھر	گرِہ		اَچرج	آشچریہ
گھی	گھرِت		جوبن	یَوَوَنَ
دودھ	دُگدھ		بَن	وَنَ
رات	راتری		آگ	اَگنِ
سورج	سُوریہ		آسرا	آشرَے
کان	کرنو		جمنا	یَمنا
سونا	سُورنو		برس (سال)	وَرش
برکھا	وَرشا		بیاہ	وواہ

تدبھو لفظ صورت میں یعنی تلفظ اور املے میں تو اپنی اصل سے مختلف ہو ہی جاتے ہیں، بعض حالتوں میں ان کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ مثلاً جس لفظ کا تلفظ سنسکرت میں چُورنو اور معنی سفوف ہیں وہ ہندی میں چُورَن ہو گیا اور اس کے معنی ہو گئے ہاضمے کو درست کرنے والی دوا۔ اسی طرح سنسکرت کا چکشُ جس کے معنی ہیں آنکھ، ہندی میں چاکسُو ہو گیا جو آنکھ کی ایک دوا کا نام ہے۔

تدبھو لفظوں کی جگہ تت سم[1] الفاظ کو داخل کرنے کی کوشش زبان کی مستقل حیثیت کو صدمہ پہنچاتی ہے، اس کو کسی قدیم زبان کی غلامی میں مبتلا کرتی ہے، اور زبان کو عوام سے دور کر کے ان کو علم و ادب کی برکتوں سے محروم کرتی ہے۔ یہ سب باتیں نظر میں ہوں تو آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ہندی لفظوں کا جو تلفظ اردو میں اختیار کیا گیا ہے وہ فلسفۂ زبان کی رو سے کسی طرح قابل اعتراض نہیں ہے۔ ان کے تلفظ کو سنسکرت کے مطابق بنانے کی کوشش کرنا زبان کے دھارے کو پیچھے پلٹانے کی خواہش کرنا ہے اور ساون، اگہن، بنارس، نیمار کے سے ہلکے پھلکے لفظ جو سیکڑوں برس سے ہر شخص کی زبان پر ہیں ان کو غلط قرار دے کر ان کی جگہ شراونو، اگرہائنو، وارانوسی اور نیمی شارنو یہ لکھنا ہندی کی آزاد لسانی حیثیت کو بیدردی سے ختم کرنا ہے۔ جس زبان کی اپنی گرامر اور اپنا لغت نہ ہو وہ کوئی مستقل بالذات زبان نہیں ہو سکتی۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اردو ادب تاریخی حالات کے نتیجے میں ابتدائی

---

1. Indian Linguistics—Turner Jubilee Volume Edited by Sukumar Sen —Published by the Linguistic Society of India—1959-Page 113

---

[1] تت سم اور تدبھو سنسکرت کی اصطلاحیں ہیں۔ وہ الفاظ جو اپنی اصل پر قائم یعنی ان کے تلفظ اور معنی میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی ہو وہ تت سم کہلاتے ہیں۔ وہ جن لفظوں کے تلفظ یا معنی یا دونوں میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہو وہ تدبھو کہلاتے ہیں۔ ہماری اصطلاح میں تت سم کو دخیل اور تدبھو کو مہند کہتے ہیں۔

سے فارسی کے سانچے میں ڈھلتا رہا ہے۔ اردو نے معنی، بیان، بدیع، عروض، شاعری کی صنفیں، شعر کا معیار، شاعرانہ تخیل، شاعرانہ بیان، اصطلاحیں، تشبیہیں، استعارے، تجنیسیں اور بعض صرفی اور نحوی صورتیں فارسی سے لے لی ہیں۔ اردو کے ہزاروں فقرے، محاورے، مثلیں وغیرہ فارسی کا ترجمہ ہیں۔ اردو کے نثر نگار ایک مدت تک فارسی نثر کو اپنے لئے نمونہ قرار دیتے رہے اور اردو کے بے شمار شاعر اب تک فارسی کے شاعروں کے نقش قدم پر چلتے رہے ہیں۔ اردو نے ہزارہا لفظ فارسی سے لئے ہیں اور چونکہ فارسی زبان میں عربی کے ہزاروں لفظ شامل ہو کر اس کا جز بن چکے تھے اس لئے بہت سے عربی لفظ بھی فارسی کی راہ سے اردو میں آ گئے۔ اردو کو اپنی پیدائش سے لے کر آج تک فارسی سے بلاواسطہ اور عربی سے بالواسطہ جو تعلق رہا ہے اس نے اس کو ایک جاندار اور طاقت ور زبان بنا دیا ہے اور اب بھی ان زندہ اور پائندہ زبانوں سے رشتہ قائم رکھنا اس کی زندگی اور تنومندی کا ضامن ہے۔

ادھر چند سال سے زندگی کے ہر شعبے میں نئے نئے نظریئے قائم ہو رہے ہیں اور نئے نئے تصورات پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کے اظہار میں ہم کو جب کوئی دقت پڑی تو فارسی اور عربی لفظوں کی بروقت امداد نے اس دقت کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ اور ابھی تو ہم کو دنیا بھر کے علوم و فنون اپنی زبان میں منتقل کرنا ہیں۔ اس کام میں عربی اور فارسی سے ہم کو بڑی مدد ملے گی۔ عربی اور فارسی اپنے لفظی ذخیروں، اشتقاقی اور ترکیبی خصوصیتوں اور دوسری لسانی خوبیوں کی بدولت دنیا کی عظیم ترین زبانوں میں ہیں۔ ان سے قطع تعلق کرنا اردو کی رگ حیات قطع کرنے کے برابر ہے۔ جس چشمے سے وہ ہمیشہ سیراب ہوتی رہی ہے اس کو بند کر دینا اس کی زندگی کو خطرے میں ڈالنا ہے۔

فارسی سے اردو کا تعلق قائم رکھنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ فارسی عربی کے الفاظ بے ضرورت اردو میں داخل کر دیئے جائیں۔ مقصد فقط یہ ہے کہ فارسی عربی کے وہ الفاظ جو اردو کے جزو ذات بن چکے ہیں اور صدیوں کے استعمال سے عام فہم ہو چکے ہیں ان کو زبان سے خارج کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور جب علمی ضرورتوں کے لئے ہمارے موجودہ ذخیرۂ الفاظ سے کسی طرح کام نہ چل سکتا ہو تو فارسی عربی لفظوں سے مدد لینا چاہئے۔ زبان کی سادگی اور عام فہمی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے اور بڑا ادیب وہی ہے جو ہر طرح کے مطالب سادہ زبان میں ادا کر سکتا ہو۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فارسی ترکیبوں اور عربی لفظوں کے بغیر بیان میں زور پیدا نہیں ہوتا۔ مگر یہ خیال وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اردو لفظوں اور محاوروں پر کافی عبور نہیں رکھتے اور ان کے استعمال پر قادر نہیں ہیں۔ اپنے اپنے محل پر ہندی لفظ بیان میں وہ زور پیدا کر دیتے ہیں جو اس جگہ پر عربی فارسی لفظوں سے ممکن نہیں ہوتا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

(۱) سب سے پہلا معرکہ جو اکبر کو پیش آیا یہ تھا کہ ہیموں ٹڈی دل فوج لے کر چڑھ آیا۔ بڑے بڑوں کے جی چھوٹ گئے۔ مگر نوجوان بادشاہ جی کا مضبوط ہمت کا دھنی تھا مقابلے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پانی پت کے میدان میں رن پڑا۔ بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ہیموں جی توڑ کر لڑا مگر اکبری فوج کے آگے ایک نہ چلی۔ اور ہیموں کے پاؤں اکھڑ گئے اور اس کی جمی جمائی فوج دم بھر میں تتر بتر ہو گئی۔

(۲) کہاں مقدونیہ کہاں پنجاب! مگر سکندر اور اس کے سپاہیوں کی ہمت تو دیکھو مصیبتیں جھیلتے، لڑائیاں لڑتے ایران کے جنگلوں میں گھستے، افغانستان کے میدانوں کو لپیٹتے، دریاؤں کو لانگھتے، پہاڑوں کو روندتے یونان سے ہندوستان تک چلے آئے۔

نثر میں ہندی لفظوں کا زور دیکھ چکے۔ اب ایک نمونہ نظم کا بھی ملاحظہ ہو۔ جناب آرزو لکھنوی نے میدان کربلا میں حضرت عباس کی جنگ ایک طولانی نظم میں اس شرط کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ عربی فارسی کا ایک لفظ بھی نہ آنے پائے۔ اس نظم کے چند شعر سنئے اور ہندی لفظوں کا زور دیکھئے :-

رن میں گھوڑا جو اڑاتے ہوئے آئے عباس
چوکیاں گھاٹ پہ بیٹھی تھیں رکا تھا پانی
وہ دھواں دھار گھٹا چھائی ہوئی ڈھالوں کی
آگ جس سے کہ برس پڑتی ہے کیسا پانی
برچھیاں تانے بڑھے آگے لہو کے پیاسے
ہو جنھیں دیکھ کے پتھر سا کلیجا پانی
وہ لچکتی ہوئی ڈانڈیں وہ چمکتے ہوئے پھل
دھوپ سے اور بھی کھولا ہوا جن کا پانی
ایک سے ایک یہ کہتا تھا کہ ہاں بھائیو، ہاں
اس جگہ آج لہو ہو کے بہے گا پانی
بے دھڑک باگیں اٹھا دیں جو یہ کہہ کر سب نے
دیکھا اب سر سے ہوا جاتا ہے اونچا پانی
بل پڑے تیوریوں پر ہو گئی چتون کچھ اور
تمتمانے لگا منھ ماتھے سے ٹپکا پانی
کھنچ کے باہر ہوئی کاٹھی سے تڑپتی ناگن
لہریں لینے لگا تلوار کا ٹھہرا پانی
جو تھے سامنت بڑے ان کے بھی جی چھوٹ گئے
منچلوں کا بھی ہوا ڈر سے کلیجا پانی
آگے جو بڑھ کے تھے ان کے اکھڑنے لگے پاؤں
جیسے ٹکرا کے پلٹ جاتا ہے چڑھتا پانی

بعض لوگ اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کے لئے اپنی اردو تحریروں میں عربی

لفظ اور فارسی ترکیبیں بے ضرورت داخل کر دیتے ہیں۔ مگر اس سے ان کی عربی فارسی کی قابلیت نہیں بلکہ اردو سے ناواقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ اگر عربی فارسی میں قابلیت دکھانا ہو تو انھیں زبانوں میں کوئی ادبی شاہکار پیش کرنا چاہئے، ورنہ "پیش شاعر ملا، پیش ملا شاعر" والی مثل صادق آئے گی۔

اردو کو آسان اور عام فہم بنانا ہر بہی خواہ اردو کا اہم فریضہ ہے۔ یہ زبان جتنی عام فہم ہوگی اسی قدر اس ضرورت کو پورا کرے گی جس کے ماتحت یہ وجود میں آئی اور جب تک یہ اس ضرورت کو پورا کرتی رہے گی اس وقت تک کوئی طاقت اس کو فنا نہیں کر سکتی۔

ہندوستان کی بعض اور زبانوں نے بھی کافی ترقی کی ہے۔ مگر وہ اپنے اپنے دائرے میں محدود ہیں۔ ان کے بولنے اور سمجھنے والوں کا حلقہ اتنا وسیع نہیں ہے جتنا اردو کا ہے۔ اگر مختلف صوبوں کے رہنے والے ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو باہمی مبادلۂ خیال کے لئے اردو ہی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اردو کی بین صوبائی حیثیت دیکھنا ہو تو کلکتہ، بمبئی کے سے بڑے شہروں میں جا کر دیکھئے۔ پھر اس میں کوئی شبہ نہیں رہے گا کہ اگر کوئی زبان سارے ہندوستان کی زبان ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے تو وہ صرف اردو ہی ہے۔

اس دعوے کا ایک عملی ثبوت اور بھی ہے۔ ہندوستان کے ہمسایہ ملکوں سے اکثر سوداگر آتے ہیں جو عوام کے کام کی چھوٹی موٹی چیزیں بیچتے ہوئے ہندوستان کے مختلف حصوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ یہ ان پڑھ لوگ کتابوں سے کوئی زبان سیکھ ہی نہیں سکتے، نہ کوئی زبان سیکھنا ان کا مقصد ہوتا ہے۔ مگر کچھ زمانے کے بعد ہندوستانیوں سے بات چیت کرنے کا ایک ذریعہ ان کے ہاتھ آجاتا ہے اور وہ ذریعہ بھی اردو زبان ہے۔ اردو کے عام ملکی زبان ہونے کا یہ بہت بڑا اور ناقابل انکار ثبوت ہے۔

قومی اتحاد کے لئے ایک عام ملکی زبان کی سخت ضرورت ہے اور مختلف طبقوں میں اتحاد پیدا کرنے کی جو صلاحیت اردو زبان میں ہے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر کوئی شخص باہمی اتحاد کی ضرورت ہی نہ سمجھتا ہو تو وہ اس وسیلۂ اتحاد کی قدر کیوں کرنے لگا اور اس سے اردو کی حمایت کی توقع کیوں کر کی جا سکتی ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایک جماعت احیائی اور افتراقی ذہنیت کا شکار ہو کر مشترک زبان کی طرح مشترک لباس، مشترک سلام، مشترک نام اور تہذیب و تمدن کے دوسرے مشترک عناصر سے بھی دست بردار ہو رہی ہے۔ جو لوگ ہندوستان کے تہذیبی اتحاد کے قائل ہیں اور اسی بنا پر ہندوستان کی قومی وحدت کے دعویدار ہیں وہ بھی بیشتر اسی جماعت میں شامل نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ قول اور عمل کے اس تضاد کا ان کے پاس کیا جواب ہے۔

اردو زبان کی ترقی اور اردو ادب کی تعمیر میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی شریک رہے ہیں۔ اور اب بھی جب کہ فرقہ بندی کی ہواؤں سے ہندوستان کی قومی وحدت کا شیرازہ بکھر رہا ہے، مختلف فرقوں اور مختلف صوبوں کے لوگ اردو سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کی ترقی میں حصہ لے رہے ہیں۔ یہ ہر دل عزیزی اور عام پسندی ہندوستان کی کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں ہے۔ اور اس کا سبب یہی ہے کہ اردو کسی مخصوص خطے یا کسی خاص فرقے کی زبان نہیں ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں جو زبانیں رائج ہیں ان کے بولنے والوں کا جہاں پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی اپنی زبان کو ترقی دیں، وہاں دوسرا فرض یہ بھی ہے کہ سب مل کر اردو کی ترقی میں کوشاں ہوں۔ اس لئے کہ ہندوستان کی ملکی زبان اور ایشیا کے بہت سے ملکوں کی بین قومی زبان بننے کی صلاحیت اردو ہی میں ہے۔

میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ ہندوستان کی دو ہی زبانیں ہیں جو ملکی زبان ہونے دعویٰ کرتی ہیں، اردو اور ہندی۔ اردو زبان اس مشترک اور مخلوط تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے جو ہندو مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی تھی۔ اور جس میں تاریخی حالات کے مطابق مسلمانی تہذیب کا حصہ ہندووانی تہذیب سے زیادہ تھا۔ اور ہندی زبان ہندو تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ اگر ہندو مسلمانوں کو اس ملک میں ساتھ ساتھ رہنا ہے اور امن و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لئے ایک دوسرے کی محبت اور ہمدردی حاصل کرنا ہے تو ایک دوسرے کی تہذیب کو بخوبی سمجھنا ضروری ہے۔ اور چونکہ کسی جماعت کی تہذیب سمجھنے کا بہترین ذریعہ اس کے ادب کا مطالعہ ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہندو مسلمان دونوں ہندی بھی پڑھیں اور اردو بھی۔

یہ تجویز جو صوبۂ متحدہ (موجودہ اتر پردیش) میں وقتاً فوقتاً پیش ہوتی رہی ہے، نہایت مناسب تھی کہ ہائی اسکول کی منزل تک ہر طالب علم کے لئے اردو اور ہندی دونوں کا پڑھنا لازمی کر دیا جائے۔ اس کے بعد کے درجوں میں بھی ہندی پڑھنے والوں کے لئے کچھ اردو اور اردو پڑھنے والوں کے لئے کچھ ہندی پڑھنا لازمی ہو۔ ملک کے جن حصوں کی مادری زبان نہ اردو ہے نہ ہندی، وہاں کے طالب علموں کو اپنی زبان کے علاوہ ہندی یا اردو پڑھنا بھی لازمی ہو اور ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب طالب علم کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح ہندوستان بھر کے تمام طالب علموں کو اپنی مادری زبان کے علاوہ اردو اور ہندی میں سے کوئی ایک زبان لازماً پڑھنا پڑے گی۔

اس تجویز پر عمل کیا جاتا تو ہندی زبان اور ناگری حروف ایک جماعت سے اور اردو زبان اور فارسی حروف دوسری جماعت سے مخصوص نہ ہو جاتے، اردو اور ہندی میں کوئی رقابت نہ ہوتی، اور ایک عام ملکی زبان، جو ضروریات زندگی کے جبری قانون کے ماتحت بنتی جا رہی ہے، اس کے فطری ارتقا کا راستہ صاف ہو جاتا۔ زبان کی یکسانی قومی اتحاد کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس تجویز کو اب بھی وہی اہمیت دینا چاہئے جس کی وہ مستحق ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دو زبانوں کی تعلیم لازمی کر دینے سے طالب علموں کے دماغ پر بہت بار پڑے گا۔ لیکن اگر دوسرے مضمونوں کا نصاب کسی قدر ہلکا کر دیا جائے یا انگریزی کی تحصیل پر اتنا زور نہ دیا جائے تو یہ اعتراض باقی نہ رہے گا۔

ہندوستان کے ہر صوبے میں مختلف زبانیں بولنے والے آباد ہیں۔ اس لئے ہر صوبے کا تعلیمی نظام ایسا ہونا چاہئے کہ اقلیتوں کی زبانیں بھی بخوبی ترقی کرتی

رہیں اور کسی جماعت کو اپنی زبان چھوڑنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ یہ توقع کرنا بڑی زیادتی ہوگی کہ کوئی جماعت صرف اس بنا پر اپنی زبان ترک کردے کہ اس سے بڑی ہمسایہ جماعت کوئی دوسری زبان بولتی ہے۔ کسی جماعت کی زبان کوئی خارجی چیز نہیں ہوتی۔ اس کا گہرا تعلق اس کی زندگی کے ہر شعبے سے ہوتا ہے۔ وہ اس کے دل و دماغ کی بہترین ترجمان ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذہن کی تربیت اور فکر کی تہذیب کا بہترین ذریعہ بھی ہوتی ہے۔ وہ اس کے طرز زندگی، افتاد مزاج، انداز فکر، معیار اقدار، میزان اعمال، بیک لفظ اس کے کلچر کی آئینہ دار بلکہ خزینہ دار ہوتی ہے۔ اس لئے کسی زبان کو مٹانے کی کوشش کرنا اس کے بولنے والوں کو اپنے کلچر سے محروم کرنے اور ان کی روحانی ہستی کو فنا کردینے کی خواہش کرنا ہے۔ اور یہ کوئی معمولی ظلم نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ملک کی سب زبانوں کی تعلیم کا انتظام کرنا مصارف کی زیادتی کا باعث ہو۔ لیکن کفایت شعاری کی خاطر کسی ظلم کو تو روا نہیں رکھا جاسکتا۔ اسی طرح ممکن ہے کہ ہر زبان میں تعلیم دینا بہت مشکل نظر آتا ہو۔ لیکن اگر نیک نیتی سے کوشش کی جائے تو کوئی گتھی ایسی نہیں ہے جو سلجھ نہ سکتی ہو۔ زبان کا مسئلہ مذہب کے مسئلے سے کچھ ہی کم اہمیت رکھتا ہے۔ جس طرح اکثریت کا اقلیت کے مذہب میں دخل دینا بالکل ناجائز ہے، اسی طرح اکثریت کا اقلیت کو اپنی زبان چھوڑنے پر مجبور کرنا سخت بے انصافی ہے۔

ہندوستان کی بعض زبانیں ایسی ہیں جو کسی ایک صوبے میں محدود نہیں ہیں۔ وہی زبان جو ایک صوبے میں اقلیت کی زبان ہے کسی دوسرے صوبے میں اکثریت کی زبان ہے۔ اگر ان دونوں صوبوں میں اس زبان کی اعلیٰ تعلیم دینے اور اس کے ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے وسیلے موجود ہوں تو ان دونوں صوبوں میں ایسے پرخلوص تہذیبی تعلقات قائم ہوسکتے ہیں جو کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ اس طرح اگر ہر صوبہ دوسرے صوبوں سے ایسے ہی تعلقات قائم رکھے تو سارے ملک میں باہمی تعلقات کا ایک مضبوط جال بچھ جائے گا۔ اقتصادی، تجارتی، دفاعی ضرورتیں بھی ملک کے مختلف حصوں میں تعلقات پیدا کرسکتی ہیں۔ مگر یہ تعلقات وقتی، سطحی، جبری اور خودغرضی پر مبنی ہوں گے۔ ویسے گہرے، دلی، اختیاری اور دیرپا تعلقات نہ ہوں گے جیسے زبان اور ادب کے رشتے سے قائم ہوسکتے ہیں۔

اگر ہندوستان کی مرکزی اور صوبائی حکومتیں زبان کے مسئلے پر وسعت نظر، کشادہ دلی اور نیک نیتی کے ساتھ غور کریں گی تو ملک کی تمام اہم زبانوں کو ترقی دینا ضروری سمجھیں گی اور کسی ایسی زبان کو نظرانداز نہ کریں گی جس کے بولنے والے ان کے حدود حکومت کے اندر بڑی تعداد میں آباد ہیں اور جس میں کافی ادبی ذخیرہ فراہم ہوچکا ہے۔ اردو اپنی عمر، اپنی افادیت، اپنی بین فرقہ داری اور بین صوبائی حیثیت، اپنے لفظی ذخیرے کی وسعت، اور اپنے کتابی سرمایے کی قدر و قیمت کے لحاظ سے ہندوستان کی اکثر زبانوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اور اس لئے حکومت کی خاص توجہ کی مستحق ہے۔

کسی زبان کی ترقی کی رفتار پر حکومت کی توجہ اور بے توجہی کا بہت اثر پڑ سکتا ہے۔ لیکن اس کو ترقی دینے کا فرض سب سے زیادہ اس کے بولنے والوں پر عاید ہوتا ہے۔ اور کسی زبان کی شان کا اندازہ اس سے کیا جاتا ہے کہ اس میں کس کس مضمون کی کتنی کتنی اور کیسی کیسی کتابیں موجود ہیں۔ اردو کا کتابی سرمایہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان سے کم درجے کا نہیں ہے۔ اس میں ادب اور شعر کے علاوہ قدیم و جدید علوم و فنون کی کتابیں کثرت سے موجود ہیں اور سیکڑوں بلند پایہ کتابیں دنیا کی دوسری زبانوں سے ترجمہ کی جاچکی ہیں۔ پھر بھی ہم کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اردو کے کتابی ذخیرے میں اضافہ کرنے کے لئے انفرادی کوششوں کے علاوہ انجمن ترقی اردو دہلی[۱]، دارالمصنفین اعظم گڈھ، دارالترجمہ حیدرآباد[۲]، جامعہ ملیہ دہلی، ہندوستانی اکیڈمی[۳] الہ آباد اور دوسرے متعدد چھوٹے بڑے اداروں نے بہت کچھ کام کیا ہے اور کررہے ہیں۔ لیکن اردو کی ترقی اور اشاعت کے لئے اس سے بہت زیادہ وسیع پیمانے پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں جو کام فوری توجہ کے مستحق معلوم ہوتے ہیں ان میں سے بعض کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

اردو زبان و ادب کی تاریخ تحقیق اور تصنیف کا ایک بہت بڑا میدان مہیا کرتی ہے۔ اس موضوع پر چھوٹی بڑی کئی کتابیں لکھی جاچکی ہیں، مگر ان میں وہی باتیں جو مدت ہوئی معلوم ہوچکی ہیں الٹ پھیر کرکے پیش کردی گئی ہیں۔ تاریخ ادب کی کتابیں لکھنے والے اپنی ذاتی تحقیق سے معلومات کے پرانے ذخیرے میں کوئی اضافہ نہیں کررہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے ادب کی کوئی مستند اور جامع تاریخ اس وقت تک مرتب نہیں ہوسکتی جب تک اس کے متعلق مسائل میں سے ایک ایک مسئلے پر تحقیقی رسالے نہ لکھے جائیں۔ ابھی تو ہمارے ادب کے بہت سے بڑے بڑے ارکان گم نامی کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں۔ نہ ان کی کوئی مستند سوانح عمری لکھی گئی ہے اور نہ ان کی تصنیفوں کے صحیح اور معتبر ایڈیشن نکلے ہیں۔ نظم و نثر کی ابتدائی اور قدیم کتابیں جو کثیر تعداد میں منتشر ہیں ان میں سے بہت تھوڑی سی اب تک ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے صحیح ایڈیشن تحقیقی مقدموں اور توضیحی حاشیوں کے ساتھ تیار کئے جائیں۔ جب ہم اپنے ادبی ذخیرے کا مکمل طور پر جائزہ لے چکیں گے، اپنے ادیبوں اور شاعروں کے حالات زندگی صحت اور تفصیل کے ساتھ معلوم کرچکیں گے اور ادبی تحریکات اور ان کے اسباب کو بخوبی سمجھ

---

۱ اب مرکزی انجمن ترقی اردو کا دفتر علی گڈھ میں ہے۔

۲ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں ہر مضمون کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی اور ہر علم و فن کی معیاری کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے دارالترجمہ قائم کیا گیا تھا۔ ملک کی آزادی کے بعد ذریعہ تعلیم ہندی ہوجانے سے سیکڑوں کتابیں جو لاکھوں کے صرف سے اردو میں ترجمہ کی گئی تھیں بےکار ہوگئیں اور دارالترجمہ ختم کردیا گیا۔

۳ یو۔ پی۔ گورنمنٹ نے اردو اور ہندی کی ترقی کے لئے ہندوستانی اکیڈمی قائم کی۔ جو مالی امداد سرکار سے ملتی تھی وہ آدھی آدھی دونوں زبانوں کے حصے میں آتی تھی۔ قومی حکومت قائم ہونے کے بعد اردو کا حصہ کم ہوتے ہوتے اب صفر کے قریب پہنچ گیا ہے۔

لیں گے، تب کہیں ہمارے ادب کی صحیح تاریخ مرتب کی جاسکے گی۔[1]

اردو ادب کے ساتھ اردو زبان کی مستند تاریخ لکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ اردو کیوں کر بنی، اس کے ذخیرۂ الفاظ میں کیا کیا اضافے اور اسلوب بیان میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی رہیں اور کن اسباب سے ہوتی رہیں۔ یہ سب چیزیں تفصیلی بحث چاہتی ہیں۔ اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں چند نظریے پیش کئے گئے ہیں، مگر اس مسئلے پر کوئی فیصلہ کن بحث اب تک نہیں ہوئی ہے۔ اس مسئلے کو طے کرنے کے لئے ہمیں اردو کے ترکیبی عناصر بالخصوص اس کے ہندی اجزا کی تحقیق کرنا ہے کہ کون جز کہاں سے آیا ہے۔ اس تحقیق کے بغیر اردو کی بنیاد اور اردو کی ساخت کے بارے میں ہم کسی یقینی نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے، صرف قیاس آرائیاں کرسکتے ہیں۔ اردو کی اصل اور بنیاد کے متعلق گھر میں بیٹھے بیٹھے مضامین لکھتے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ اس کے لئے ہندوستان کے مختلف لسانی خطوں کی زبانوں کو اصولی طریقے سے مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس مطالعے کے لئے شہروں کی زبان زیادہ کارآمد نہ ہوگی۔ اس لئے کہ اس میں خارجی عناصر کثرت سے شامل ہوجاتے ہیں۔ اس کے لئے شہروں سے دور کے گاؤں میں جاکر وہاں کی زبانوں پر غور کرنا ہوگا۔ اس تلاش وتجسس سے ہم اردو کی اصل کا پتہ بھی لگا سکیں گے۔ اور اردو صرف ونحو کے مشکل اور لاینحل مسئلوں کا حل بھی نکال لیں گے۔

درسی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اردو قواعد کی بیسیوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ مگر ان میں ایک کتاب بھی ایسی نہیں ہے۔ جس کو صحیح معنوں میں اردو کی قواعد کہہ سکیں۔ ان کے مؤلفوں نے بالعموم فارسی وعربی صرف ونحو کی کورانہ تقلید کی ہے۔ کسی نے بہت جدت کی تو اردو قواعد کو انگریزی کے سانچے میں ڈھال دیا۔ سید انشا اور حضرت آرزو لکھنوی صرف ان دو بزرگوں نے اردو زبان کی ساخت پر گہری نظر ڈال کر اردو کے لئے قاعدے بنائے ہیں۔ مگر سید انشا کی دریائے لطافت اردو قواعد کی مکمل کتاب نہیں ہے اور حضرت آرزو کی نظام اردو میں ان مسائل سے بحث کی گئی ہے جو معمولی صرف ونحو کے قاعدوں سے بالاتر ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نے چند مضمون رسالۂ اردو میں اس پائے کے شائع کئے تھے جو اردو کی جامع قواعد لکھنے والوں کے لئے نمونے کا کام دے سکتے ہیں اور ان کو صحیح راستے پر لگا سکتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب موصوف ان مضامین کا سلسلہ جاری رکھتے تو اردو صرف ونحو کے لئے بہت قیمتی مواد جمع ہوجاتا۔

لسانیات اور صوتیات کی کتابوں کی بھی اردو میں بہت کمی ہے۔ مگر یہ بڑی محنت کے کام ہیں اور ان کے لئے وسیع قابلیت اور خاص دماغی تربیت درکار ہے۔ تاہم ان موضوع پر مغربی زبانوں میں جو بلند پایہ کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا ترجمہ تو اردو میں کیا ہی جاسکتا ہے۔ بعض لوگ ترجمے کو معمولی یا دوسرے درجے کا کام سمجھتے ہیں۔ مگر ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کسی اعلیٰ درجے کی کتاب کا ترجمہ کرنا ایک ادنیٰ درجے کی کتاب تصنیف کرنے سے کہیں بہتر اور کہیں زیادہ مفید ہے۔ اور اس وقت اس کی بڑی ضرورت ہے کہ دوسری زبانوں کی بلند پایہ کتابوں کا ترجمہ کرکر کے اردو کا خزانہ بھر دیا جائے۔

اردو کے ایک جامع اور صحیح اصول پر مرتب کئے ہوئے لغت کی بھی بہت ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں جو کوششیں اب تک ہوچکی ہیں ان میں امیر اللغات، فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے پہلی کتاب کی صرف دو جلدیں شائع ہوکر رہ گئیں۔ اس مستند لغت کی بقیہ جلدوں کا تلف ہوجانا اردو زبان کی تاریخ میں ایک افسوس ناک حادثہ ہے۔ ان کتابوں کے مؤلفوں کا جتنا شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ ان کئی کئی جلدوں کی ضخیم اور حجیم کتابوں میں اردو الفاظ اور محاورات بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں، جس سے اردو زبان کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ کتابیں بھی اردو کے کل لفظوں پر مشتمل نہیں ہیں ہزاروں لفظ ابھی ایسے باقی ہیں جو ان کتابوں میں نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ یہ کتابیں ایک بلند پایہ لغت کی کل شرطوں کو پورا نہیں کرتی ہیں۔ اب ہماری نگاہیں اس لغت کی طرف لگی ہوئی ہیں جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی نگرانی میں کئی سال سے انجمن ترقی اردو تیار کر رہی ہے۔ بہتر ہے کہ انجمن زیر تالیف لغت کا ایک نمونہ شائع کردے تاکہ اس کی نوعیت کا اندازہ کیا جاسکے اور اس کو بہتر اور مکمل بنانے کے لئے ضروری مشورے دیئے جاسکیں۔[1]

اردو میں ایک انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کی ضرورت بھی مدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ کوئی تیس برس ہوئے جب لکھنؤ میں مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں بہادر والیٔ ریاست محمود آباد کی سرپرستی میں اس کام کی ابتدا بڑے پیمانے پر کی گئی تھی، مگر کسی وجہ سے وہ انجام نہ پاسکا۔ چند سال ہوئے حیدرآباد دکن کے ادارۂ ادبیات اردو نے بھی اس کی ابتدا کردی تھی، مگر وہ بھی اسے پورا نہ کرسکا۔ اس کام کے لئے بہت سے عالموں کے اتحاد عمل اور کثیر سرمائے کی ضرورت ہے۔ دیکھیں اس کی تکمیل کا وقت کب آتا ہے۔

اب ایک بات خاص طور پر اردو کے نئے ادیبوں سے کہنا ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ ادیب کے لئے علوم ادبیہ کی تحصیل بہت ضروری ہے۔ کوئی شخص کسی زبان کا کامل ادیب نہیں قرار دیا جاسکتا جب تک اس نے اس کی صرف ونحو، معنی، بیان، بدیع، عروض، لغت، لسانیات، صوتیات، تنقید کے اصول، ادب کی تاریخ اور ادیبوں اور شاعروں کے حالات کا علم باقاعدہ حاصل نہ کیا ہو اور اس زبان کے ادب اور شعر کا مدت تک گہرا اور وسیع مطالعہ نہ کیا ہو۔

یہ سچ ہے کہ بعض لوگ ان علوم سے واقف ہوئے بغیر اچھے اچھے مضامین

---

[1] اردو ادب کی مستند تاریخ مرتب کرنے کے وہ لوازم ابھی مہیا نہیں ہوئے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ بہر حال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اہتمام میں متعدد ادیبوں کے اشتراک عمل سے اردو ادب کی مفصل تاریخ کئی جلدوں میں لکھی جارہی ہے۔

[1] ملک کی تقسیم کے بعد مولوی عبدالحق صاحب کراچی چلے گئے اور لغت کی تالیف کا کام بند ہوگیا۔ اب انجمن ترقی اردو (ہند) ایک جامع لغت تیار کروا رہی ہے۔

لکھ لیتے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کو خوش تحریر یا زیادہ سے زیادہ انشا پرداز کہہ سکتے ہیں، ادیب نہیں کہہ سکتے۔ وہ عبارت کے حسن و قبح وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کرسکتے۔ اور صاف تو یہ ہے کہ وہ نہ بالکل صحیح زبان بول سکتے ہیں نہ بالکل صحیح عبارت لکھ سکتے ہیں۔ ان کی زبان پر غلط الفاظ ضرور جاری ہوتے ہیں اور ان کے قلم سے غلط محاورے اور غلط فقرے اور جملے ضرور نکلتے ہیں۔

فنون لطیفہ میں کوئی شخص محض طبعی مناسبت کی بنا پر ماہر فن نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس کا ذوق کتنا ہی صحیح ہو مگر اصولی واقفیت اور عملی مہارت کے بغیر اس کا شمار اتائیوں ہی میں رہے گا۔ یہی حال ادب کا بھی ہے۔ آج کل ایسے نام نہاد ادیبوں کی کمی نہیں جو علوم ادبیہ سے بہت کم واقفیت رکھتے ہیں اور ناواقفیت یا جہالت سے جو جرأت پیدا ہوتی ہے اس سے کام لے کر زبان وادب کے ہر مسئلے میں رائے زنی کرنے لگتے ہیں۔ اس سے جو ادبی بدنظمی پیدا ہو رہی ہے وہ ہماری زبان کے لئے کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ اردو کا مستقبل نوجوان ادیبوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان کو ادبی علوم کی طرف خاص توجہ کرنا چاہئے تاکہ وہ ہر ادبی اور لسانی معاملے میں خوب جچی تلی رائے قائم کرسکیں اور ان کی رہنمائی میں اردو شک وشبہہ کی راہوں میں ادھر ادھر بھٹکتی نہ پھرے، بلکہ ترقی کی یقینی اور سیدھی راہ پر گام زن رہے۔

مدت تک ہمارا نظام تعلیم ایسا رہا ہے کہ اعلیٰ تعلیم میں اپنی زبان کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ وسیلۂ تعلیم انگریزی زبان تھی۔ انگریزی لکھنے اور بولنے کی بڑی قدر اور بہت عملی ضرورت تھی۔ اردو پر عبور حاصل کرنے کے نہ موقعے تھے نہ اس کی کوئی خاص ضرورت تھی۔ انگریزی پڑھتے، لکھتے اور بولتے رہنے سے ہماری تقریر اور تحریر پر انگریزی رنگ چڑھ گیا۔ ہم اپنی زبان کی اصلی خوبیوں اور ذاتی لطافتوں سے بیگانہ ہوگئے اور اپنے الفاظ، محاورے، مثلیں وغیرہ بہت کچھ بھول گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے نئے لکھنے والوں کی زبان میں اردو کے ذاتی حسن کی جگہ انگریزی سے مستعار لی ہوئی آرائش نظر آتی ہے۔ اس لئے یہ اب اور بھی زیادہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہمارے نئے ادیب علوم ادبیہ کی طرف خاص توجہ کریں۔ اردو لفظوں، محاوروں، مثلوں کے لغت اور فرہنگیں ہمیشہ اپنے مطالعے میں رکھیں اور زیادہ سے زیادہ لفظوں اور محاوروں کے صحیح استعمال کی قدرت پیدا کریں۔ لفظوں کے معین معنوں اور ان کی مقرر ترکیبوں کی نگہداشت، زبان کے ڈھانچے کا تحفظ، غیر زبانوں کے حملے کا دفاع، اور نئے لفظوں، نئی ترکیبوں اور نئے محاوروں کے استعمال میں احتیاط، نئے ادیبوں کے اہم فرائض میں داخل ہیں۔

آج کل جو لوگ اردو کے ادیب بننا چاہتے ہیں وہ اردو ادب کا مطالعہ کرنے کی جگہ انگریزی ادب کا کم اور انگریزی تنقید کا زیادہ مطالعہ کرتے ہیں۔ اس لئے ان میں وہ ذہنی پس منظر اور وہ فکری انداز پیدا نہیں ہونے پاتا جو اردو کے ادب وشعر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے۔ ان کو اردو کا تمام کلاسیکی ذخیرہ بے وقعت معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ اردو کے بڑے سے بڑے ادبی اور شعری شاہکار بھی ان کی نگاہوں میں نہیں جچتے۔ وہ مشرقی ادب میں مغربی ادب کی کیفیتیں تلاش کرتے ہیں۔ مگر جب دو ملکوں کی تاریخ، تمدن، تہذیب، روایات، تحریکات، مناظر، طبائع، ماحول، سب میں اختلاف ہو تو دونوں کا ادب، جس میں ان سب چیزوں کا عکس پڑتا ہے، اپنے کیفیات وتاثرات میں یکساں کیوں کر ہوسکتا ہے؟ ہماری تعلیم وتربیت ایک مدت سے اس طرح ہو رہی ہے کہ ہم اپنے ادب کی روح سے بیگانہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب یہ کیفیت جو کچھ دن پہلے عام تھی، بہت کم دیکھنے میں آتی ہے کہ کوئی اچھا شعر سن کر لوگوں پر وجد کا عالم طاری ہو جائے۔ اس کیفیت کا مٹ جانا دلی مسرت کے ایک چشمے کا خشک ہو جانا ہے۔ اور یہ صورت حال حکیم ڈارون کے قول کے مطابق ہمارے ذہن اور اخلاق کے لئے مضر ہے۔ جب تک ہماری تعلیم وتربیت صحیح اصول پر نہ ہوگی اس وقت تک ہم کو مغرب کی ذہنی غلامی سے نجات نہ ملے گی اور ہماری اصلی مشرقی روح بیدار نہ ہوگی۔ اور جب تک یہ نہ ہوگا ہم اپنے فنون لطیفہ اور اپنے ادب وشعر سے پورے طور پر لطف اندوز نہ ہوسکیں گے۔

☆☆☆

اردو کا رسم الخط

ہماری زبان کے موجودہ مسائل میں رسم خط کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بعض لوگ ناگری تحریر کو فارسی رسم خط پر ترجیح دیتے ہیں اور اردو کی موجودہ تحریر میں یہ نقص نکالتے ہیں کہ اس میں ایک ہی لفظ کئی طرح سے پڑھا جاسکتا ہے۔ ظاہر میں یہ اعتراض بہت وزنی معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا وزن بہت گھٹ جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حقیقت میں یہ دقت بہت کم پیش آتی ہے۔ ممکن ہے کہ اگر تنہا ایک لفظ یا ایک فقرہ کہیں لکھا ہو تو اس کے پڑھنے میں کبھی غلطی ہو جائے۔ مگر بالعموم لفظ کسی جملے میں اور فقرہ کسی عبارت میں ہوتا ہے اور اس لفظ کے گرد وپیش کے لفظ اور اس فقرے کے آس پاس کے فقرے اس کے پڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ایک بات اور بھی ہے جو ایک مثال سے سمجھ میں آجائے گی۔ فرض کیجئے کہ کہیں لفظ خط لکھا ہوا ہے۔ اسے تین طرح پڑھ سکتے ہیں خط، خط، خط۔ مگر خط اور خط سے ہمارے کان آشنا نہیں اور خط پہلے سے ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ اس لئے جہاں کہیں ہم خط لکھا ہوا دیکھیں گے اسے بلا تامل خط ہی پڑھیں گے۔ اگر کبھی ہمارا ذہن بھٹک کر خط یا خط کی طرف چلا جاتا ہے تو یہ خیال کہ ہماری زبان میں خط یا خط کوئی لفظ نہیں ہے اسے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ اس موقعے پر وہ لوگ نظر انداز کردیئے گئے ہیں جو اردو زبان سے واقف نہیں۔ مگر صرف حروف سیکھ کر کسی زبان کی تحریروں کا بالکل صحیح پڑھ لینا ممکن نہیں۔ اس میں اردو کی کیا تخصیص ہے۔ پھر یہ اتفاق تو شاذ ونادر ہی ہوگا کہ جو شخص اردو نہ جانتا ہو وہ اردو کی تحریریں پڑھنا چاہے۔ ایسے نادر اتفاقات کے خیال سے اردو کے رسم خط میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ اس کے علاوہ اگر لفظوں پر اعراب لگے ہوئے ہوں تو ایک حرف شناس آدمی بغیر مطلب سمجھے ہوئے بھی اردو کی عبارت پڑھ سکتا ہے۔ آخر اعراب بھی تو ہمارے رسم خط کا ضروری جز ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ابتدائی درسی کتابوں کے علاوہ اعراب کا استعمال بہت کم کرتے

ہیں اور یہ مہارت پیدا کر لیتے ہیں کہ بغیر اعراب کے کسی تحریر کو روانی کے ساتھ پڑھ لیں۔

یہ مہارت پیدا کرنے میں اردو رسم خط کی ایک خاص خصوصیت سے بہت مدد ملتی ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ اردو تحریر میں لفظ کا اصل ڈھانچا صرف حروف صوت (consonants) سے بنتا ہے۔ اعراب (Vovels) اس ڈھانچے کے اندر بیٹھے ہوئے نہیں ہوتے، بلکہ حرفوں کے اوپر یا نیچے الگ سے لگا دیے جاتے ہیں۔ کسی لفظ کے پڑھتے وقت نگاہ اور توجہ کا مرکز اس کا اصل ڈھانچا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا نقش جو دماغ میں بنتا ہے اس میں اس کا ڈھانچا بہت اجاگر ہوتا ہے اور اعراب دھندلے، اور چونکہ اعراب کو ترک کر دینے سے لفظوں کے ڈھانچے میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا اس لئے اردو عبارت بغیر اعراب کے آسانی سے پڑھ لی جاتی ہے۔ یہ بات ان تحریروں میں پیدا نہیں ہو سکتی جن میں اعراب لفظوں کے ڈھانچے میں سمائے ہوئے ہوتے ہیں، جیسا کہ ناگری اور رومن تحریروں میں ہوتا ہے۔

اب رہی گھسیٹ لکھائی تو اس کا پڑھنا ناگری تحریر میں اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے جتنا اردو تحریر میں۔ جو شخص اردو لکھنا پڑھنا جانتا ہے وہ تھوڑی سی مشق کے بعد گھسیٹ میں لکھی ہوئی اردو عبارت آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔ اردو تحریر کوئی سوا سو برس سے کچہریوں اور دفتروں میں استعمال کی جا رہی ہے اور اس سے بھی پہلے جب کچہریوں اور دفتروں کی زبان فارسی تھی تب بھی یہی حروف سیکڑوں برس استعمال میں رہ چکے تھے۔ پولیس اور کچہری والوں کی گھسیٹ لکھائی لفظوں کی صورت ہی بگاڑ دیتی ہے۔ پھر بھی ان حرفوں کی وجہ سے کوئی خاص دقت کبھی پیش نہیں آئی۔ کبھی سننے میں نہیں آیا کہ اس رسم خط کی خرابی سے ایک فریق کی جگہ دوسرے پر ڈگری ہو گئی ہو یا مجرم کی جگہ کوئی بے قصور سزا پا گیا ہو۔ صدیوں کے ان عملی تجربوں کے مقابلے میں خیالی اعتراض اور فرضی دشواریاں کیا اہمیت رکھتی ہیں؟

فارسی حروف ایک زمانے میں اس قدر مقبول ہو گئے تھے کہ ہندی زبان کی کتابیں بھی انھیں حرفوں میں لکھی جاتی تھیں۔ ملک محمد جائسی کی پدماوت کو ہندی ادب میں جو بلند درجہ حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کتاب کے جتنے قدیم نسخے دستیاب ہوئے ہیں وہ سب فارسی حرفوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ اور یہ کوئی تنہا مثال نہیں ہے۔ ایسی بہت سی کتابیں میری نظر سے گذر چکی ہیں اور خود میرے مختصر کتابی ذخیرے میں ہندی کی کئی کتابیں فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی موجود ہیں جن کے نام یہ ہیں:-

(۱) سندر سنگار۔ مصنفہ سندر کوی، جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

(۲) رسارلو۔ مصنفہ سکھ دیو کوی۔ ناٹکا بھید۔ گنگا دھر نے ۱۲۱۳ھ میں نقل کی۔

(۳) بھاکھا بھوکھن۔ النکار۔ ۱۲۱۳ھ میں نقل کی گئی۔

(۴) امر چندر کا۔ بلاغت۔ مصنفہ امریس۔

(۵) رسک پریا۔ مصنفہ کیشو داس۔

(۶) رس راج۔ مصنفہ متی رام۔ منالال، شیو پرشاد، امید علی اور طالب حق نے ۱۲۱۸ھ میں نقل کی۔

(۷) رام چندر چندر کا۔ مصنفہ کیشو داس۔ سمبت ۱۸۶۰ میں نقل کی گئی۔

(۸) انیکارتھ۔ مصنفہ نند داس۔

(۹) نام مالا۔ ۱۲۱۵ھ میں نقل کی گئی۔

(۱۰) انور چندر کا۔ مصنفہ انور کوی۔

(۱۱) لیلاوتی ٹیکا۔ مصنفہ ودیادھر۔

(۱۲) بھگود گیتا۔ مصنفہ ہری بلبھ۔ سمبت ۱۸۷۴ میں نقل کی گئی۔

(۱۳) و (۱۴) دو رسالے ناٹکا بھید پر۔

(۱۵) ایک منظوم کتاب۔ مصنفہ بہاری لال۔

(۱۶) ایک مجموعہ جس میں رحیم، احمد، تلسی داس وغیرہ کے دوہے شامل ہیں۔

یہ بات اکثر سننے میں آتی ہے کہ ناگری کے مقابلے میں اردو کی تحریر بہت مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ ناگری کا سیکھنا نسبتاً کچھ آسان ہو مگر اتنا آسان نہیں ہے جتنا بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ اردو اور ناگری تحریروں کا مقابلہ کرنے کے لئے تفصیلی اور طولانی بحث درکار ہے۔ اس سلسلے میں اس وقت صرف چند باتیں کہنا ہیں۔

(۱) اردو حروف ناگری حرفوں سے بہت زیادہ آوازیں ادا کر سکتے ہیں۔

(۲) اردو کے مفرد حروف بہت سادے اور مختصر ہیں اور جب وہ دوسرے حرفوں سے ملا کر لکھے جاتے ہیں تو اور بھی مختصر ہو جاتے ہیں۔

(۳) ناگری کے مفرد حرفوں کی شکلیں اردو حرفوں سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں اس لئے ان کو سیکھنے میں بھی زیادہ دیر لگتی ہے اور لکھنے میں بھی۔

(۴) ناگری میں دس مختلف آوازوں کی خفیف اور ثقیل یعنی ہلکی اور بھاری دونوں صورتوں کے لئے الگ الگ حروف مقرر کئے گئے ہیں۔ حالانکہ ثقیل آوازیں حقیقت میں نئی آوازیں نہیں ہیں، بلکہ خفیف آوازوں میں ھ کی آواز شامل ہونے سے بن جاتی ہیں۔ اردو تحریر میں اس حقیقت پر نظر رکھی گئی ہے اور ثقیل آوازوں کے لئے علیحدہ علامتیں مقرر کر کے حرفوں کی تعداد میں بے ضرورت اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کو ظاہر کرنے کے لئے معمولی حرفوں کے ساتھ ھ لکھ دی جاتی ہے۔ رومن رسم خط میں بھی یہی کیا جاتا ہے۔ مثلاً ت کی ثقیل صورت تھ کے لئے T کے ساتھ H لکھ دیا جاتا ہے، جیسے Theme, Thin, Mathew, Thorax, Thursday, Thught, Thank۔ ناگری میں بھی جن ثقیل آوازوں کے لئے مخصوص حرف موجود نہیں ہیں وہ اسی طرح لکھی جاتی ہیں کہ معمولی حرفوں کو ह کے ساتھ ملا کر لکھتے ہیں۔ مثلاً کولھو، چولھا، آلھا، کلھاڑی، کمھار، تمھاری، ننھا، کنھیا، میں لھ، مھ، اور نھ کی آوازیں یوں ظاہر کی جاتی ہیں ल्ह, म्ह, न्ह۔ اسی طرح کل ثقیل آوازیں ظاہر کی جا سکتی تھیں۔ ان کے لئے علحدہ علحدہ

علامتیں مقرر کرنے سے ناگری حرفوں کی تعداد بلا ضرورت بڑھ گئی۔ اس کے باوجود راور ھ کے ملنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے جیسے سرھانا وہ ناگری تحریر میں ادا نہیں کی جاسکتی۔ یہی حال ڑاور ھ کی مخلوط آواز کا ہے جیسے گاڑھا، کڑھائی، چڑھنا، گڑھ۔

(۵) ناگری میں زبر کی حرکت ہر حرف کی ذات میں شامل سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حرفوں کی تمام حرکتوں کے لئے علامتیں موجود ہیں جو ماترے کہلاتی ہیں، مگر زبر کے لئے کوئی ماترا نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کسی حرف میں زبر کی حرکت کو غیر موجود دکھانا ہوتا ہے تو اس کو اس کے بعد والے حرف سے ملا کر لکھتے ہیں اور اس حالت میں کبھی پہلے حرف کی کبھی دوسرے حرف کی اور کبھی دونوں حرفوں کی صورت بدل جاتی ہے۔ اس طرح دو دو حرفوں کے ملانے سے جو نئی صورتیں یا مرکب حرف بنتے ہیں ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ بعض موقعوں پر تین تین حرف ملا کر لکھے جاتے ہیں تو اور بھی زیادہ پیچیدہ اور مشکل صورتیں بن جاتی ہیں۔ میڈیکل ہال پریس، بنارس میں ۱۸۷۷ء کی چھپی ہوئی ہندی پرائمر[1] میں ناگری کے دہرے اور تہرے حرف دیئے ہوئے ہیں۔ دو دو حرفوں کے ملنے سے جو شکلیں بنتی ہیں ان کی تعداد ۳۸۲ اور تین تین حرفوں کے ملنے سے جو شکلیں بنتی ہیں ان کی تعداد ۶۷ ہے۔ اس طرح ناگری کے مرکب حرفوں کی مجموعی تعداد ۴۴۹ ہوئی۔ دو تین حرفوں کو ملا کر ایک کرنے کا کوئی اصول بھی مقرر نہیں ہے۔ اس لئے ان سب صورتوں کو یاد کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

(۶) ناگری میں تشدید کے لئے کوئی علامت نہیں ہے۔ مشدد حرف ادھورا لکھ کر پورے حرف سے ملا دیا جاتا ہے۔ ادھورے حرفوں کی صورتیں اور ان کو پورے حرفوں سے ملانے کے طریقے تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ ان سب کو یاد رکھنے کے لئے بہت محنت اور مشقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو تحریر میں حرف پر تشدید کی چھوٹی سی علامت بنا دینا کافی ہوتا ہے۔

(۷) ناگری میں حرف ر کی آواز کو ظاہر کرنے کے لئے متعدد علامتیں ہیں جو مختلف حالتوں میں مختلف جگہوں پر مختلف صورتوں سے لکھی جاتی ہیں۔ اسی طرح نون غنہ کے لئے کئی علامتیں ہیں جو مختلف حرفوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ حرف شین کی آواز کے لئے بھی ناگری میں دو حرف ہیں۔ بعض لفظوں میں ایک حرف لکھا جاتا ہے بعض میں دوسرا۔

(۸) بعض آوازوں کے لئے دو دو حرف ہیں جن میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں ہے۔ خواہ ایک حرف لکھا جائے خواہ دوسرا جیسے अ اور अ۔ झ اور झ۔ रा اور ण۔

(۹) کھ کی آواز کے لئے جو حرف ہے وہ ر اور و کی علامتوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے بڑی خرابیاں پڑ سکتی ہیں۔ مثلاً دوا کھانا ہے لکھا جائے تو اس کو دوا روانہ ہے بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اور اب خ کی آواز کو ظاہر کرنے کے لئے کھ کے نیچے نقطہ بھی لگا دیا جاتا ہے اس لئے اب اس فقرے کو 'دواخانہ ہے' بھی پڑھ سکتے ہیں۔

یہ چیزیں ناگری تحریر میں اچھی خاصی دشواری پیدا کرتی ہیں اور ان سب پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی کے تمام لفظوں کو بھی فقط ان کر ناگری حرفوں میں صحیح طور پر لکھ لینا ممکن نہیں ہے۔ سیکڑوں لفظوں کا املا یاد رکھنا پڑتا ہے اور اس کے لئے بڑی مدت اور کافی محنت اور مشقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ناگری کے بعض حرف جو صرف سنسکرت لفظوں میں آتے ہیں ان کی صورت بہت پیچیدہ اور تلفظ نہایت مشکل ہے۔ یہ حروف ہندی الف بے سے تقریباً خارج کر دیئے گئے تھے۔ مگر اب جب کہ ہندی لفظوں کا تلفظ اصل سنسکرت کے مطابق کیا جا رہا ہے اور سنسکرت کے نئے الفاظ ہندی میں کثرت سے داخل کئے جا رہے ہیں تو وہ حروف بھی استعمال میں آئیں گے اور تحریر کی دقتوں کو بڑھائیں گے۔

ناگری رسم الخط کے طرفدار اکثر ان دقتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اردو تحریر سیکھنے میں ناگری سے کچھ زیادہ وقت صرف ہوتا ہے تو بھی آخر میں اردو ہی کی تحریر زیادہ نفع بخش ثابت ہوگی۔ یعنی اگر آدمی تیس چالیس برس تک برابر اردو حرفوں میں لکھتا رہے اور دوسرا ناگری حرفوں میں تو اردو میں لکھنے والے کے کام کی مقدار کہیں زیادہ نکلے گی اور اس کو ابتدا میں جو تھوڑے سے وقت کا نقصان پہنچا تھا اس سے کہیں زیادہ نفع ہوگا۔ اردو کی تحریر ایک طرح کی مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) ہے جس کو تھوڑی سی مشق سے ہر شخص پڑھ لکھ سکتا ہے۔ اس میں یہ خوبی ہے کہ لکھنے میں وقت بھی کم لگتا ہے اور کاغذ بھی۔ اور اس عجلت پسندی اور اقتصادی کشمکش کے زمانے میں یہ وقت اور کاغذ کی بچت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

ناگری کے طرف دار اکثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے ہر زبان کی تمام آوازیں ظاہر کی جاسکتی ہیں۔ یہ دعویٰ حقیقت سے بہت زیادہ دور ہے۔ دوسری زبانوں کو چھوڑ کر صرف انگریزی کے لفظوں پر نظر کیجئے تو معلوم ہوگا کہ world, dog, pen, was, mirage, bird کے سے معمولی لفظوں کا تلفظ بھی ناگری حرفوں سے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ عربی اور فارسی لفظوں کے معاملے میں بھی ناگری حرفوں کا یہی حال ہے۔ دوسری زبانوں کا کیا ذکر، خود ہندی کے بہت سے لفظ ایسے ہیں جن کا صحیح تلفظ ناگری حرفوں سے نہیں ادا ہوسکتا۔ مثلاً یہ، وہ، چھاؤں کھڑاؤں، چناؤ، پھیلاؤ، دکھ ؤ، سناؤ، سرھانا، جواہر، نہرو۔ ان حالات میں یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے کہ ہر زبان کے الفاظ ناگری حرفوں میں لکھے جاسکتے ہیں۔ اردو رسم خط کے لئے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ مگر اتنا تو بے خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اردو حرفوں میں ناگری حرفوں سے کہیں زیادہ آوازیں ظاہر کی جاسکتی ہیں۔

ناگری میں ژ اور ڑھ کے لئے کوئی حرف نہیں ہے۔ ڈ اور ڈھ کے نیچے ایک نقطہ لگا کر یہ آوازیں ادا کر لی جاتی ہیں۔ اسی طرح چند قریب المخرج حرفوں کے نیچے نقطہ لگا کر ذ، ز، ض، ظ، ف، ق کی آوازیں ادا کرنے کا نہایت آسان

[1] یہ پرائمر کلکتہ اسکول بک سوسائٹی کے لئے چھاپی گئی تھی۔ اس کا ایک نسخہ مکرمی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ادیب

طریقہ رائج تھا۔ لیکن اتر پردیش کی ریاستی حکومت اور ملک کی مرکزی حکومت نے تعلیم، کتابت، طباعت وغیرہ کے بڑے بڑے ماہروں کے مشورے سے ناگری خط میں جو اصلاحیں کی ہیں ان کی رو سے اب یہ طریقہ ترک کر دیا گیا ہے۔ اس طرح متعدد آوازیں ناگری رسم خط سے خارج ہو گئیں اور اردو کے ہزاروں اور انگریزی، فرانسیسی وغیرہ کے سیکڑوں لفظ جن میں یہ آوازیں شامل ہیں اگر ناگری خط میں لکھے جائیں تو ان کی ہیئت ہی بگڑ جائے گی۔ فیض، پھیض، غالب گالب اور غزل گجل ہو جائے گی۔ خزانہ کھجانا، خربوزہ کھربوجا اور افریقہ اپھریکا بن جائے گا۔ ٹیلی فون ٹیلی پھون، فرانس پھرانس، فزکس پھجکس ہو جائے گا۔ اس طرح اب اردو کے لئے ناگری رسم خط اور زیادہ ناموزوں ہو گیا ہے۔

اگر کسی حیثیت سے ناگری تحریر اردو تحریر سے بہتر ٹھہرے تو بھی اس حقیقت کا انکار نہ کیا جا سکے گا کہ ناگری خط ہندوستان کے بعض حصوں کے سوا دنیا کے کسی اور خطے میں مستعمل نہیں ہے اور اردو کا رسم خط وہ ہے جو ایشیا کے کئی ملکوں یورپ کے بعض خطوں اور افریقہ کے ایک بڑے حصے میں رائج ہے اور دنیا کی کئی زبانیں انھیں حرفوں میں لکھی جاتی ہیں۔ اس لئے اگر ہندوستان کو ان تمام ملکوں سے سیاسی، تجارتی اور تہذیبی تعلقات قائم کرنا ہے تو اردو زبان کے ساتھ فارسی خط کو باقی رکھنا بھی ضروری ہے۔ فارسی خط تو ہندوستان میں صدیوں سے رائج ہے اس کو ترک کرنے کا کیا ذکر، اگر ہندوستان کو اپنے پاس پڑوس کے ملکوں سے ہر طرح کے تعلقات قائم کرنا ہیں، تو اس کو برمی، چینی، جاپانی، روسی وغیرہ کے رسم خط بھی سیکھنا پڑیں گے۔

اردو کی تحریر کو اور زیادہ آسان بنانے کے خیال سے بعض لوگوں کی تجویز ہے کہ ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع۔ یہ آٹھ حرف اردو کے حروف تہجی سے خارج کر دیے جائیں۔ اس لئے کہ جو آوازیں ان حرفوں سے ادا کی جاتی ہیں ان کے لئے دوسرے حروف موجود ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان میں کا ہر حرف ایک مخصوص آواز کی علامت ہے جو کسی دوسرے حرف سے ظاہر نہیں کی جا سکتی۔ ان حرفوں کی مخصوص آوازوں کو ہم ادا بھی کر سکتے ہیں مگر بالعموم ایسا نہیں کرتے، بلکہ ث اور ص کو س کی طرح، ذ، ض، ظ کو ز کی طرح، ح کو ہ کی طرح اور ع کو الف کی طرح ادا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ آٹھ حرف زائد اور بے ضرورت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہ حرف تحریر میں کچھ دشواریاں بھی پیدا کرتے ہیں، مگر وہ کون سا رسم خط ہے جس میں اس طرح کی دشواریاں نہیں ہیں اور جس کے صرف حروف سیکھ لینے سے تمام الفاظ صحیح لکھے اور پڑھے جا سکتے ہیں؟ ان حرفوں کی وجہ سے اردو کے بہت سے لفظوں کا املا یاد رکھنا پڑتا ہے اور اس کے لئے کافی مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہی دقت ناگری تحریر میں بھی ہے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اور یہی دقت اردو اور ناگری دونوں سے کہیں زیادہ رومن تحریر میں موجود ہے جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا۔

یہ حروف جو بظاہر بے کار معلوم ہوتے ہیں ان کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ لفظ جو تلفظ میں یکساں اور معنوں میں مختلف ہیں جب لکھ دیے جاتے ہیں تو املے کے اختلاف سے اپنے معنی خود بتا دیتے ہیں جیسے نال اور نعل، نظیر اور نذیر، ثواب اور صواب، کسرت اور کثرت، علم اور الم، عام در آم، حائل اور ہائل، لعل اور لال، ذکی اور زکی، اسیر اور اثیر، سریر اور صریر، ہار اور حار، ثور اور سور، جعل اور جال، صدا اور سدا، باد اور بعد، صد اور سد، تان اور طعن، باز اور بعض، عرض اور ارض، عیال اور ایال، سفر اور صفر، حال اور ہال، تانا اور طعنہ، زن اور ظن، مامور اور معمور، صورت اور سورت، صور اور سور، حل اور ہل، جالی اور جعلی، عرضی اور ارضی۔ جن لفظوں کے تلفظ یکساں اور معنی مختلف ہیں اگر ان کا املا بھی یکساں ہو جائے تو جو غلط فہمیاں ابھی صرف کانوں کے ذریعے سے ہوتی ہیں وہ آنکھوں کے ذریعے سے بھی ہونے لگیں گی۔

یہی حرف ہم کو اس بات کا پتہ لگانے میں مدد دیتے ہیں کہ کون لفظ کس لسانی خاندان کا ہے اور کس ملک سے آیا ہے۔ لفظوں کے خاندانی، ملکی اور نسلی امتیازات پر غور کرنے سے بیش قیمت تاریخی اور جغرافی معلومات حاصل ہوتی ہے اور قوموں اور ملکوں کے باہمی تعلقات کا پتہ لگتا ہے۔ ان حرفوں کو ترک کر دینے سے بہت سے لفظوں کی صورت بدل جائے گی اور اس سے ایک طرف اس طرح کی معلومات اور انکشافات کا ایک دروازہ بند ہو جائے گا اور دوسری طرف جب لفظوں کی اصل کا پتہ نہ لگ سکے گا تو نہ ان کے بنیادی معنی معلوم ہو سکیں گے، نہ لغوی اور مجازی معنوں کا تعلق نظر آئے گا، نہ عام اور خاص مفہوم کا ربط سمجھ میں آئے گا۔ اس طرح اردو رفتہ رفتہ وہ خصوصیتیں کھو بیٹھے گی جو ایک بلند پایہ علمی، ادبی اور معیاری زبان کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں اور جو ادیبوں، شاعروں، نقادوں، ورزبان دانوں کی صدیوں کی مسلسل کوششوں سے اردو کو حاصل ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کچھ کم مقدار میں وہ تمام نقصانات پہنچیں گے جو کوئی نیا رسم خط اختیار کرنے سے پہنچ سکتے ہیں اور جن کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔

ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ ان حرفوں کو نکال ڈالنے سے لفظوں کی صورت کیا سے کیا ہو جائے گی۔

موجودہ صورت	مجوزہ صورت
حضرت	ہزرت
عرض	ارز
صاحب	ساہب
طرح	ترہ
حفیظ	ہفیز

جن لوگوں کی نگاہیں ترہ، ارز اور ہزرت کی عادی ہو جائیں گی وہ طرح، عرض، حضرت کو کیوں کر پڑھ سکیں گے۔ اگر ان کی تعلیم کی اعلیٰ منزلوں میں یہ خارج کیے ہوئے حرف سکھا بھی دیے جائیں تو بھی ان لفظوں کو ان صورتوں میں پڑھنا ان کے لئے بہت دشوار ہوگا۔ بات یہ ہے کہ کوئی لفظ ایک ایک حرف کو ٹٹول ٹٹول کے اور ہجے لگا لگا کے نہیں پڑھا جاتا، بلکہ اس کی معین صورت اس کے تلفظ کی ایک مستقل علامت بن کر ذہن میں نقش ہو جاتی ہے اور صورت، تلفظ اور معنی میں ایسا ربط پیدا ہو جاتا ہے کہ ادھر لفظ کی صورت آنکھوں کے سامنے آئی ادھر وہ پڑھ بھی لیا

گیا اور سمجھ بھی لیا گیا۔ صورت بدل جانے سے لفظ کا پڑھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور اس کے سمجھنے میں بھی دیر لگ جاتی ہے یعنی اس کو پڑھنے اور سمجھنے میں دماغ پر معمول سے زیادہ زور دینا پڑتا ہے۔

بعض لوگ اردو حرفوں کے ناموں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حروف مفرد آوازوں کی علامتیں ہیں، ان کے ناموں کا کئی کئی آوازوں سے مرکب ہونا درست نہیں۔ مثلاً آ کی آواز کو ظاہر کرتے والے حرف کا الف نام رکھنا مناسب نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ناگری میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ درست ہے کہ حرف جس آواز کو ظاہر کرتا ہے وہی آواز اس حرف کا نام ہے۔ مثلاً اُ کی آواز کے لئے جو حرف ہے اس کا نام بھی اُ ہے۔ یہ اعتراض ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو میں الف اُ کی آواز کا نام نہیں ہے بلکہ اس علامت کا نام ہے جو اس آواز کو ظاہر کرتی ہے جو اَ، آ، اِ، اِی، اُ، اُو، اے، اَے، اَو، اَو میں مشترک ہے۔ یہ سب صورتیں ایک ہی آواز کی مختلف حرکتوں سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس مجرد آواز کی علامت ا ہے اور اس علامت کا نام الف ہے۔ یہی حالت اور سب حرفوں کی ہے۔ مثلاً میم، کہ یہ م کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس علامت کا نام ہے جو اس آواز کو ظاہر کرتی ہے جس سے ان لفظوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ مَن، ماش، مِس، میر، مُل، موٹھ، میخ، مَیل، مُوچ، مَوج۔ یہ سب لفظ ایک ہی آواز سے شروع ہوتے ہیں۔ مگر اس کی حرکت ہر جگہ مختلف ہے۔ جس سے اس ایک آواز کی دس صورتیں ہو گئی ہیں۔ ان میں سے صرف پہلی صورت کو م کہنا درست ہے۔ زیادہ سے زیادہ دوسری صورت کو بھی م کہہ لیجئے۔ اس لئے کہ م کی حرکت کو کھینچئے ہی سے مَا بن جاتا ہے۔ ان دو صورتوں کو چھوڑ کر باقی اور صورتوں کو مَ کہنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ ناگری میں حرفوں کی جو آوازیں ہیں وہی ان کے نام ہیں کہاں تک درست ہے۔

جس طرح اوپر دی ہوئی مثالوں میں مِس، میر، مُل، مُوٹھ، میخ، مَیل، موچ، موج کی ابتدائی متحرک آواز مَ نہیں ہے اسی طرح نام، رام، کام کی آخری ساکن آواز بھی مَ نہیں ہے اس لئے ناگری میں ان آوازوں کو ظاہر کرنے والے حرف کا نام بھی مَ نہ ہونا چاہئے تھا۔ اس سلسلے میں ہندی اور اردو تلفظ کا ایک اصولی فرق توجہ کے قابل ہے۔ ہندی میں لفظ کی آخری آواز متحرک ہوتی ہے۔ جیسے رام، شیام۔ اس لئے ہندی میں ان لفظوں کے آخری حرف کو مَ کہنا درست ہے۔ لیکن اردو میں اسم کی آخری آواز ہمیشہ ساکن ہوتی ہے۔ اس لئے رام اور شیام کی آخری آواز کو بھی مَ نہیں کہہ سکتے۔

ناگری میں ساکن آوازیں نظر انداز کر دی گئی ہیں اور زبر کی حرکت ہر آواز کی فطری حرکت مان لی گئی ہے۔ اسی وجہ سے آوازوں کے نام ایسے رکھے گئے ہیں جن سے زبر کی حرکت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ ہندی میں بھی ہر آواز دس مختلف حرکتیں اختیار کر سکتی ہیں اس لئے وہ نام بیشتر حالتوں میں آوازوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ ہر آواز کو متحرک ماننے اور زبر کو اس کی فطری حرکت قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً م پر اُ کا ماترا اور گ پر ائی کا ماترا لگانے سے مُو اور گئی کی آوازیں نکلنا چاہئے۔ ان کو مُو اور گی پڑھنا اصولاً صحیح نہ ہوگا، بلکہ ان آوازوں کا ناگری حرفوں سے ادا کرنا ممکن ہی نہ ہوگا۔

اردو میں دنیا کی اور زبانوں کی طرح متحرک اور ساکن دونوں طرح کی آوازیں ہیں اور حروف غیر متحرک آوازوں کی علامتیں ہیں اس لئے حروف کے نام ایسے رکھے گئے ہیں جو آوازوں کی کسی حرکت کو ظاہر نہیں کرتے اور اس طرح اردو رسم خط ناگری تحریر کی ان بے اصولیوں اور دشواریوں سے محفوظ ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اس بات کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں ہر حرف کا نام اسی آواز سے شروع ہوتا ہے، جس کی وہ علامت ہے اور اس طرح حرفوں کے نام ان کی آوازوں کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔

اس مختصر بحث سے واضح ہو گیا ہوگا کہ نہ ناگری حرفوں کے نام تعریف کے لائق ہیں نہ اردو حرفوں کے نام اعتراض کے قابل۔

بعض لوگ رومن رسم خط کی تائید کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اردو اور ہندی دونوں کے لئے رومن خط اختیار کر لیا جائے تو ان زبانوں کے افتراق کا ایک بڑا سبب دور ہو جائے گا اور دونوں کے مل کر ایک ہو جانے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ مگر جب ان دونوں زبانوں کے قریب لانے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی ہے، بلکہ کوئی خواہش بھی معلوم نہیں ہوتی اور جب ہندی کے بعض بڑے ذی اثر حامی بالاعلان کہہ رہے ہیں کہ ہندی میں سنسکرت کی آمیزش کرنا چاہئے اور سنسکرت آمیز ہندی کو ملک کی عام زبان ہونا چاہئے، تو صرف رسم خط کی تبدیلی سے کیا فائدہ ہوگا۔ اس حالت میں اگر ہم رومن حروف اختیار کر لیں تو اردو اور ہندی کے میل سے ایک عام فہم زبان تو پیدا نہ ہوگی البتہ اردو اپنی انفرادیت کھو بیٹھے گی اور اس کی ہستی خطرے میں پڑ جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ رومن رسم خط اختیار کرنے سے غیر ملک اور غیر زبان والوں کو اردو سیکھنے میں آسانی ہوگی۔ لیکن کسی زبان کا رسم خط معین کرتے وقت اس زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کی آسانی اور فائدے کا خیال اصل اصول ہونا چاہئے۔ جب ہم اس اصول پر اس مسئلے کو طے کرنا چاہتے ہیں تو موجودہ رسم خط کو اردو کے لئے سب سے زیادہ مناسب پاتے ہیں۔ مدت دراز کے تجربے سے اپنی ضرورتوں کے موافق جو ترمیمیں اس رسم خط میں ہوتی رہی ہیں، انھوں نے اس کو اردو کے لئے سب سے زیادہ موزوں بنا دیا ہے۔ اب اگر اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا خط اختیار کیا جائے تو اس کی ضروری ترمیم و اصلاح کے لئے پھر ایک طویل مدت درکار ہوگی۔ پھر بھی اس کو اردو کے مزاج سے ہم آہنگ بنا لینا مشکوک ہی رہے گا۔

رومن رسم خط اختیار کر لینے کا ایک فائدہ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس کو سیکھ کر ہم کو مختلف تحریروں کے سیکھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ ہم اردو، ہندی، انگریزی اور دوسری مغربی زبانیں رومن خط کی مدد سے بہ آسانی پڑھ سکیں گے۔ یہ بات صرف اس حد تک صحیح ہے کہ اگر تمام زبانیں رومن حرفوں میں لکھی جانے لگیں تو ہم کو کوئی نئی زبان سیکھنے کے لئے نئی صورتوں کے مفرد حروف کم سیکھنا پڑیں گے۔ اور اس سے وقت کی کچھ بچت ہوگی۔ مگر اس زبان کی مخصوص آوازوں کو ظاہر کرنے کے لئے کبھی دو تین حرفوں کو ملا کر ایک حرف بنانا ہوگا، کبھی نئے حروف بنانا اور نئی علامتیں مقرر کرنا

ہوں گی، کبھی پرانے حرفوں سے نئی آوازیں ادا کرنا ہوں گی اور کبھی ایک پرانا اور ایک نیا حرف ملا کر لکھنا ہوگا۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں اس کثرت سے واقع ہوں گی کہ مفرد حرفوں میں بہت کچھ یکسانی ہونے کے باوجود ہر زبان کا رسم خط بدل جائے گا اور یہ ممکن نہ ہوگا کہ بغیر کسی زبان سے واقفیت پیدا کئے ہوئے اس کی لکھی ہوئی عبارت صحیح پڑھ لی جائے۔

تجربہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ جو لوگ ساری عمر رومن حرفوں میں لکھی ہوئی فرانسیسی یا جرمن عبارت کا ایک جملہ بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ جو لوگ اردو اور انگریزی دونوں زبانیں بخوبی جانتے ہیں اور فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی اردو اور رومن حرفوں میں لکھی ہوئی انگریزی کو بڑی روانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں ان کو رومن میں لکھی ہوئی اردو کو پڑھنے میں بڑی دیر لگتی ہے اور بڑی دماغی محنت کرنا پڑتی ہے۔ زبان نہ جاننے کی حالت میں تو اکثر لفظوں کا پڑھنا صرف دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ مثلاً کوئی شخص جس نے رومن حرف سیکھ لئے ہوں مگر نہ انگریزی زبان سے واقف ہو نہ اردو سے، وہ اگر کسی عبارت میں Maze لکھا ہوا دیکھے تو وہ کسی طرح یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس کو میز پڑھنا چاہئے یا مزے۔ اسی طرح میل کے بارے میں یہ طے نہیں کر سکتا کہ اس کو مِیل پڑھے یا مَیل۔ لیکن جو شخص یہ دونوں زبانیں جانتا ہو وہ ان لفظوں کو انگریزی عبارت میں میز اور مِیل پڑھے گا اور اردو عبارت میں مزے اور مَیل۔ ایک دوسری صورت ملاحظہ ہو۔ اگر کہیں اردو کے لفظ لوگ اور تھے لکھے ہوئے ہوں یعنی Log اور the اور ان کو کوئی ایسا شخص پڑھے جو صرف انگریزی زبان جانتا ہو تو یقیناً وہ ان کو لاگ اور دی پڑھے گا، لوگ اور تھے ہرگز نہ پڑھے گا۔ ایسی ہی نہ معلوم کتنی دقتیں پیش آئیں گی جن کا حل زبان کے علم کے بغیر ممکن نہ ہوگا۔ پس یہ دعویٰ کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ رومن حرفوں کے ذریعے سے ان حرفوں میں لکھی ہوئی تمام زبانوں کی عبارتیں پڑھی جا سکتی ہیں۔

رومن حروف سیکھ کر ان حرفوں میں لکھی ہوئی تمام زبانوں کی عبارتوں کا پڑھ سکنا تو ایک خیال محال ہے۔ اگر انگریزی داں حضرات غور کریں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ صرف انگریزی عبارت پڑھ لینے کی قابلیت جو ان میں پیدا ہوئی ہے وہ بھی فقط رومن حروف سیکھ لینے کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ قابلیت پیدا کرنے کے لئے وہ لفظوں کا املا، تلفظ اور معنی سالہا سال تک یاد کرتے رہے ہیں اور اس کے بعد بھی جب کوئی نیا لفظ دیکھنے یا سننے میں آجاتا ہے تو اس کو صحیح تلفظ یا املا ڈکشنری سے پوچھنا پڑتا ہے۔ خود سے نہ اس کو صحیح طریقے سے بول سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔

اب تک دنیا میں کوئی ایسا رسم خط ایجاد نہیں ہوا جو کل زبانوں کا کیا ذکر کسی ایک زبان کی تمام آوازوں کو بھی پورے طور پر ادا کر سکتا ہو۔ خالص صوتیاتی اصول پر بنایا ہوا رسم خط بھی تمام آوازوں کو ادا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ مگر اس میں زیادہ سے زیادہ آوازوں کو ظاہر کرنے کی صلاحیت ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی یہ صلاحیت ہی اس کو ناقابل عمل بنا دیتی ہے۔ صوتی رسم خط جتنا زیادہ مکمل ہوگا اتنا ہی زیادہ ناقابل عمل ہوگا۔ یہ بات بظاہر قابل قبول نہیں معلوم ہوتی۔ اس لئے اس کی کچھ توضیح کی جاتی ہے۔ ایک ہی شخص ایک ہی لفظ بولتا ہے تو مختلف موقعوں پر اور مختلف حالتوں میں اس کا لہجہ بدلتا رہتا ہے۔ ایک ہی جگہ کے رہنے والے لوگ ایک ہی لفظ کو مختلف لہجوں سے ادا کرتے ہیں۔ مختلف مقاموں کے رہنے والوں میں تو لہجے کا اختلاف بہت ہی نمایاں ہو جاتا ہے۔ صوتی رسم خط اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ہی لفظ کو لہجے کے ہر تغیر کے ساتھ ایک نئی صورت سے لکھنا ہوگا۔ اس طرح کسی لفظ کی کوئی معین صورت ہی باقی نہ رہی ہوگی، بلکہ ایک ایک لفظ کی بہت بہت سی صورتیں ہو جائیں گی۔ ان سب مختلف تحریری صورتوں کو ایک ہی لفظ سمجھنا بھی مشکل ہوگا اور وہ دماغی پریشانی پیدا ہوگی کہ پڑھنا لکھنا ایک مصیبت بن جائے گا۔

صوتی رسم خط کو جتنا مکمل کرنے کی کوشش کی جائے گی اتنی ہی حرفوں اور علامتوں کی تعداد بڑھتی جائے گی اور اتنا ہی ان کا یاد رکھنا مشکل ہوتا جائے گا۔ انھیں دقتوں سے بچنے کے لئے ہر زبان کی تحریر میں عملی آسانی کو صوتیاتی صحت پر مقدم رکھنا پڑتا ہے۔ تلفظ حقیقت میں ایسی نازک چیز ہے کہ لکھا ہوا لفظ زیادہ سے زیادہ اس کے قریب پہنچ سکتا ہے، اس کو پورے طور پر ادا نہیں کر سکتا۔ حرفوں کی آوازوں اور ان کی حرکتوں میں ایسے ایسے باریک فرق ہوتے ہیں کہ ان کو علامتوں کے ذریعے سے بالکل ٹھیک ٹھیک ظاہر نہیں کر سکتے، اسی لئے صوتیات کے ماہروں کی بھی یہی رائے ہے کہ ہر لفظ کی معیاری مکتوبی صورت صرف ایک ہونا چاہئے یعنی لفظ کی تحریری صورت کو اس کے تلفظ کا بالکل صحیح عکس نہیں، بلکہ صرف ایک علامت سمجھنا چاہئے جو تلفظ کی طرف ہمارے ذہن کی رہنمائی کرتی ہے۔ اردو کے رسم خط کو بھی اسی عملی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے۔

ایک مدت تک ہندوستان کی عدالتی، دفتری، تجارتی، سیاسی اور علمی زبان انگریزی رہی ہے۔ انگریزی پڑھنے والے اس ملک میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں اور انگریزی ہی کے ذریعے سے ہم رومن حرفوں سے آشنا ہوئے ہیں۔ جو لوگ اردو کے لئے رومن رسم خط تجویز کرتے ہیں انھوں نے بھی رومن حرفوں کا استعمال انگریزی سے ہی سیکھا ہے۔ اس لئے انگریزی کے رسم خط پر ایک نظر ڈالنا اور اردو کے رسم خط سے اس کا مقابلہ کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

انگریزی زبان صدیوں سے رومن حروف میں لکھی جا رہی ہے اور اس کے رسم خط میں اصلاحیں بھی ہوتی رہی ہیں مگر اب بھی اس میں اتنی خرابیاں موجود ہیں کہ اردو کا موجودہ رسم خط اس سے کہیں بہتر ہے۔ اس دعوے کی تفصیلی بحث بہت پھیلاؤ چاہتی ہے۔ یہاں صرف چند باتیں مختصر طور پر بیان کی جاتی ہیں۔

(۱) کہا جاتا ہے کہ اردو کی تحریر میں جو چیز سب سے زیادہ دشواری پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں بعض آوازوں کے لئے کئی کئی حرف استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ بات صرف اس حد تک صحیح ہے کہ اردو میں تین آوازوں کے لئے دو دو حروف، ایک کے لئے تین حرف اور ایک کے لئے چار حرف ہیں۔ مگر ایک حرف بھی ایسا نہیں ہے جو ایک سے زیادہ آوازوں کو ظاہر کرتا ہو۔ اس لئے بعض لفظوں کو لکھنے میں تو کچھ دقت ہو سکتی ہے مگر ان کو پڑھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ صرف چند

لفظ ایسے ہیں جن میں نون کا حرف میم کی آواز دیتا ہے۔ مگر ایسا صرف اس صورت میں ہوتا ہے جب کسی لفظ میں ساکن نون کے بعد متحرک ب آتی ہے جیسے منبر، عنبر، سنبل۔ اس کے خلاف انگریزی کی تحریر میں جہاں ایک ایک آواز کے لئے کئی کئی حرف ہیں وہاں ایک ایک حرف کی کئی کئی آوازیں بھی ہیں۔ اس لئے جو دقت بولے ہوئے لفظوں کے لکھنے میں پیش آتی ہے وہی لکھے ہوئے لفظوں کے پڑھنے میں بھی پیش آتی ہے اور انگریزی لکھنا پڑھنا اردو لکھنے پڑھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔

(۲) اردو میں ہر آواز ایک منفرد حرف سے ادا کی جاتی ہے۔ انگریزی مین مرکب اور دہرے حرفوں سے بھی بہت کام لیا جاتا ہے اور ایسے حرفوں کی آوازیں بھی ہمیشہ ایک سی نہیں رہتیں۔ مثلاً ch کہیں چ کی آواز دیتا ہے کہیں ک کی اور اور کہیں ش کی۔

(۳) اردو میں عربی لفظوں کی ابتدا میں کبھی کبھی الف لام لگا دیا جاتا ہے جو تعریف اور تخصیص کا فائدہ دیتا ہے۔ اور ان دو حرفوں میں کبھی ایک بھی دونوں کوئی آواز نہیں دیتے۔ اسی طرح فارسی کے چند لفظ ہیں جن میں واؤ کا حرف کوئی آواز نہیں دیتا جیسے خواب، خواہش۔ مگر ان دونوں چیزوں کے لئے قاعدے مقرر ہیں۔ انگریزی میں خاموش حروف جو بالکل بے ضرورت ہوتے ہیں، کثرت سے آتے ہیں، ہر جگہ آسکتے ہیں اور کسی مقررہ قاعدے کی پابندی بھی نہیں کرتے۔

(۴) اردو میں حرفوں کی حرکتوں کو ظاہر کرنے کے لئے تھوڑی سی منفرد علامتیں ہیں۔ ہر علامت صرف ایک حرکت کے لئے اور ہر حرکت کے لئے صرف ایک علامت ہے۔ انگریزی میں حرکتوں کی یہ علامتیں، جو حرفوں کی شکل میں لکھی جاتی ہیں، وہ حروف صحیح کی طرح مفرد، مرکب، دہری اور بے ضرورت بھی طرح کی ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کے باوجود نہ کسی حرکت کے لئے کوئی ایک علامت مخصوص ہے نہ کسی علامت کے لئے کوئی ایک حرکت مخصوص ہے۔ مثلاً Grow, Road, Toe, Go, Shoulder ان پانچ لفظوں میں ایک ہی حرکت کے لئے پانچ علامتیں استعمال کی گئی ہیں۔ یعنی ow, oa, oe, o, ou اس کے خلاف Shoe, Poet, Does اور foe ان چار لفظوں میں ایک ہی علامت oe چار مختلف حرکتوں کا کام دے رہی ہے۔[1]

(۵) اردو میں حرکت کی علامت ہمیشہ متحرک حرف کے ساتھ آتی ہے۔ انگریزی میں اس کے خلاف بھی ہوتا ہے۔ مثلاً Date, Joke, Fine ان لفظوں میں D, J, F متحرک حرف ہیں۔ اس لئے حرکتوں کی علامتیں صرف انھیں حرفوں کے بعد ہونا چاہئے تھیں۔ K, N اور T ساکن حرف ہیں۔ ان کے بعد حرکت کی ایک علامت یعنی E کا آنا خلاف اصول بات ہے۔

اردو کے فارسی رسم خط اور انگریزی کے رومن رسم خط کا مقابلہ جو مختصر اور سرسری طور پر یہاں کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ اردو میں تحریر کی جو دقت بیان کی جاتی ہے وہ انگریزی میں بدرجہا زیادہ ہے۔ مثلاً انگریزی کا ایک معمولی اور کثیر الاستعمال لفظ ہے Conceive اس میں ابتدائی حرف c کی جگہ k اور ch بھی لکھ جا سکتا ہے۔ o کی جگہ u بھی آسکتا ہے، دوسرے c کی جگہ s بھی ہو سکتا ہے۔ ei کی جگہ ee، ie اور ea بھی لکھ جا سکتا ہے اور آخری حرف e کو حذف بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ بارہ تبدیلیاں ہیں جو اس ایک لفظ کی تحریری صورت میں کی جا سکتی ہیں۔ یعنی ان میں سے ایک یا زیادہ تبدیلیوں کے ساتھ اگر یہ لفظ لکھا جائے تو انگریزی کے موجودہ رسم خط کے اعتبار سے اس کا یہی تلفظ باقی رہ سکتا ہے۔ اب اگر ایک ہی آواز کے حرفوں کو بدل بدل کر اس لفظ کو لکھیں تو اس کی چھیانوے صورتیں بن سکتی ہیں۔ اس بحث سے صاف ظاہر ہے کہ رومن حرفوں کی ذات میں یہ صفت داخل نہیں ہے کہ ان کو اختیار کر لینے سے پڑھنے لکھنے کی ساری دقتیں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔

انگریزی کے رسم خط کی خرابی کی مثال میں جو لفظ اوپر پیش کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ تمام لفظوں کی حالت بالکل اسی کی سی نہیں ہے۔ مگر انگریزی کے تقریباً اسی فیصدی الفاظ ایسے ضرور ہیں جو ایک سے زیادہ اور بعض حالتوں میں بہت زیادہ صورتوں سے لکھے جا سکتے ہیں۔ یعنی ان کا جو املا صحیح سمجھا جاتا ہے وہ کسی قاعدے پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ صرف ایک رسمی اور روایتی چیز ہے۔

اگر انگریزی کے رسم خط کی ان تمام بے قاعدگیوں پر جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اصولی حیثیت سے نظر کی جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ انگریزی میں تھوڑے سے لفظوں کو چھوڑ کر باقی تمام الفاظ کی حالت یہ ہے کہ ان کو سن کر صحیح صورت سے لکھ دینا یا لکھا ہوا دیکھ کر صحیح تلفظ سے پڑھ لینا ممکن نہیں۔ اس طرح انگریزی کا رسم خط اتنا مشکل دکھائی دے گا کہ اس کا پڑھنا لکھنا تقریباً محال معلوم ہونے لگے گا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسی رسم خط کے ساتھ انگریزی ان عظیم زبانوں میں ہے جن کے پڑھنے والے اور لکھنے والے تعداد میں دنیا کی بیشتر زبانوں سے زیادہ ہیں اور دنیا کے بہت سے حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اصولی طور پر جتنی دشواریاں نظر آتی ہیں عملی طور پر اتنی پیش نہیں آتیں۔

بات یہ ہے کہ انسان کے دماغ میں ایسی قوتیں موجود ہیں جن سے بہت سی دشواریاں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔ ابتدا میں کچھ لفظوں کا املا یاد کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد مشاہدے کی تکرار سے بہت سے لفظوں کے نقش بغیر کسی خاص کاوش کے طالب علم کے ذہن میں اتر آتے ہیں۔ اور پھر وہ مماثلت، مشابہت، تقابل، اشتقاق وغیرہ کی رہنمائی میں ان لفظوں کے قیاس پر دوسرے لفظوں کی مکتوبی صورت کا اندازہ کر لیتا ہے۔ اس طرح اصولی دشواریاں عمل کی منزل میں، بہت کچھ آسان ہو جاتی ہیں۔ یہیں سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اردو کا فارسی رسم خط جو اصولی حیثیت سے بھی انگریزی کے رومن رسم خط سے کہیں زیادہ آسان ہے، اس کو برتنے میں کوئی غیر معمولی دشواری پیش نہیں آسکتی۔

اس تمام بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رومن رسم خط کو اردو کے موجودہ رسم خط پر ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنا

---

[1] یہ مثالیں پروفیسر جونس کے ایک رسالے سے لی گئی ہیں۔

چاہئے کہ غیر ملکوں کے عیسائی مشنریوں نے، جو نہ اردو کے طرف دار تھے نہ ہندی کے اور جنھیں نہ اردو کو فروغ دینا تھا نہ ہندی کو، جب شمالی ہند میں اپنے مذہب کی تبلیغ کا کام شروع کیا تو ایک مدت تک اپنا تبلیغی لٹریچر رومن حرفوں میں چھاپتے رہے۔ مگر جب رومن رسم خط کسی طرح مقبول نہ بن سکا تو آخر کار اس کو چھوڑ کر اردو اور ناگری حرفوں میں اپنی کتابیں چھاپنے لگے۔ جو تجربہ ایک مرتبہ کیا جا چکا ہے اس کو دہرانے کی کیا ضرورت ہے۔

رسم خط بدلنے سے زبان کی ہیئت ہی بدل جاتی ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ موجود ہو تو بحث کی ضرورت نہیں۔ مِشرَ، گُپت، سریواستَو کے سے کثیر الاستعمال لفظوں کو، جو ہندوؤں کے مختلف فرقوں کے نام ہیں، اور تو اور خود ہندو اور وہ بھی تعلیم یافتہ ہندو، مسرا، گپتا، سریواستوا بولنے لگے ہیں۔ یہ رومن رسم خط ہی کی برکت تو ہے۔ تانگا کو ٹانگا، تاتا کو ٹاٹا اور دالمیا کو ڈالمیا کر دینا بھی رومن حروف کا کارنامہ ہے۔ صرف یہی چند مثالیں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ رومن حروف ہمارے لفظوں کی صورت بگاڑ کر زبان کی شکل ہی بدل دیں گے۔

اگر رومن خط ہمارے لفظوں کا صحیح تلفظ باقی رکھ سکے تو بھی اس سے طرح طرح کے نقصان ضرور پہنچیں گے۔ ایک تو وہ اس رشتے کو قطع کر دے گا جو ہماری زبان کے حال کو اس کے ماضی سے جوڑتا ہے۔ دوسرے وہ بہت سے لفظوں کی اصل اور حقیقت پر پردہ ڈال دے گا اور یہ سمجھنا ممکن نہ رہے گا کہ کون لفظ کس خاندان کا ہے اور کس ملک سے آیا ہے۔ یعنی اردو خط میں سے چند حرفوں کو خارج کر دینے سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے اور جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں وہی نقصان رومن رسم خط سے اس سے کہیں زیادہ مقدار میں پہنچے گا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اردو کا موجودہ رسم خط وہ ہے جو ایشیا کے کئی ملکوں میں رائج ہے۔ اگر ہم ایشیائی ملکوں اور ایشیائی زبانوں سے رشتہ توڑ کر یورپ اور یورپی زبانوں سے ناتا جوڑنا چاہتے ہوں تو اس خط کو چھوڑ کر رومن خط اختیار کرنے کا مشورہ ہمارے لئے قابل قبول ہو سکتا ہے۔

فارسی زبان اردو کے لئے ایک بنیادی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں اور اردو میں ماں بیٹی کا تعلق ہے۔ عربی سے بھی اردو کو برابر تقویت پہنچتی رہی ہے۔ ان دونوں زبانوں کا رسم خط تقریباً بالکل وہی ہے جو اردو کا ہے۔ اس لئے اگر اردو کا تعلق فارسی عربی سے باقی رکھنا ہے تو اس کے موجودہ رسم خط کا باقی رکھنا بھی ضروری ہے۔ رومن ہو یا کوئی دوسرا رسم خط وہ اس تعلق کو قطع کر دے گا اور یہ اردو کے لئے بے حد مضر ہوگا۔

اردو زبان و ادب کا فارسی زبان و ادب سے جو قریبی تعلق ہے اس کی بنا پر اردو کا با اصول مطالعہ فارسی کی واقفیت کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اردو قواعد اور لغت کی قدیم کتابیں فارسی میں ہیں، اردو شاعروں کے قدیم تذکرے اور ہزاروں قطعات تاریخ جو اردو ادب کی تاریخ کے قیمتی ماخذ ہیں فارسی میں ہیں اور ہندوستان کے عہد وسطی کی تاریخ جس کا اردو زبان و ادب سے گہرا تعلق ہے اس کا تقریباً کل ذخیرہ فارسی میں ہے۔ اس لئے اردو میں ادبی تحقیق کے واسطے فارسی کا علم ضروری ہے اور ان دونوں زبانوں کے لسانی اور ادبی تعلقات کی وجہ سے اردو جاننے والوں کے لئے فارسی کا سیکھ لینا آسان ہے۔ اگر اردو کا رسم خط بدل دیا جائے تو اس آسانی میں بہت کمی ہو جائے گی اور صرف یہی نہ ہوگا بلکہ فارسی کی تحصیل کا ایک بہت بڑا محرک جاتا رہے گا۔

حروف کی تبدیلی سے ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوگا کہ ہزارہا کتابیں جو اب تک لکھی جا چکی ہیں اور لاکھوں روپے کے صرف سے چھاپی جا چکی ہیں وہ بیکار اور رفتہ رفتہ مفقود ہو جائیں گی۔ اردو کے کل کتابی ذخیرے کو نئے رسم خط میں منتقل کرنا عملاً محال ہے۔

ایک نقصان یہ ہوگا کہ بہت سے غیر معمولی ذہانت اور ظرافت والے شاعروں اور انشا پردازوں نے لفظی صنعتوں کے استعمال میں جو کمال دکھایا ہے وہ نظر نہ آسکے گا۔ لفظی صنعتوں کا استعمال بذات خود کوئی ادبی کمال نہ سہی لیکن اس کا انکار تو نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بجائے خود ایک ایسی صنعت یا آرٹ ہے جس کے لئے ادبی کمال کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس کا شمار بھی بالواسطہ ادبی کمالات میں کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال وہ ایک آرٹ تو ضرور ہی ہے، ادبی ہو یا غیر ادبی۔ اور کسی آرٹ کے بہترین نمونوں کو مٹانا کیوں کر گوارا کیا جا سکتا ہے۔ لفظی صنعتوں کا مٹ جانا کوئی بہت بڑا نقصان نہ سہی، پھر بھی نقصان تو ہے ہی، اور بغیر کسی بڑے فائدے کی امید کے کوئی چھوٹا سا نقصان بھی کیوں برداشت کیا جائے۔

حرفوں کی تبدیلی سے ایک نقصان یہ بھی ہوگا کہ حساب جمل کا وجود نہ رہے گا اور وہ بے شمار تاریخی نام اور قطعات تاریخ جو جودت طبع اور قوت تلاش کے حیرت خیز مظاہرے ہیں اور گذشتہ حالات و واقعات کا زمانہ معین کرنے میں بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں سب بے کار ہو جائیں گے۔

یہ چند باتیں جو ابھی بیان کی گئی ہیں ان پر غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ کسی زبان کے لئے جو رسم خط صدیوں تک استعمال ہوتا رہتا ہے اس میں اور اس زبان میں طرح طرح کے بڑے گہرے اور دور تک پہنچنے والے تعلق قائم ہو جاتے ہیں اور زبان کے رگ ریشے میں اس طرح بھد جاتا ہے کہ اس کو بدل دینے سے زبان کی صورت کے ساتھ اس کی روح کا بدل جانا بھی ضروری ہے۔

مختلف پہلوؤں سے نظر کرنے کے بعد یہ ضروری ٹھہرتا ہے کہ اردو کا موجودہ رسم خط برقرار رکھا جائے۔ اپنی خاص ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اس میں اصلاحیں کی جا سکتی ہیں، مگر صرف ایسی جو اس کی صورت کو مسخ نہ کر دیں۔ آج کل بعض لوگ اردو کے لئے نئے نئے خط ایجاد کر رہے ہیں۔ ان صاحبوں سے درخواست ہے کہ وہ ایجاد کی زحمت میں نہ پڑیں، اصلاح کی مناسب صورتیں تجویز کریں۔

اردو رسم خط میں ضرورت زمانہ کے مطابق اصلاحیں ہوتی رہی ہیں اور اب بھی ہو سکتی ہیں۔ اس کام کے لئے ماہرین کی ایک نمائندہ کل ہند کمیٹی بنانا چاہئے جو مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر کر کے ادیبوں، ناشروں، طابعوں، کاتبوں اور معلموں سے مشورہ کرنے کے بعد اردو رسم خط کے قاعدے معین کر دے۔ یہ

قاعدے کثیر تعداد میں چھاپ کر اردو کتابوں کے چھاپنے اور شائع کرنے والوں، اردو کے رسالوں اور اخباروں کے ایڈیٹروں، اردو میں مقالے اور کتابیں لکھنے والوں اور سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی اداروں کے پاس بھیج دیئے جائیں اور سررشتۂ تعلیم کی منظوری کے بعد درسی کتابوں میں ان کی پابندی لازمی کردی جائے۔ مدرسین طلبہ کی روزانہ مشقوں میں اور ممتحن امتحانوں کی کاپیوں میں ان قواعد کی خلاف ورزی کو اسی طرح غلطیوں میں شمار کریں جس طرح املے کی دوسری غلطیوں کو۔ یعنی جس طرح طاقت کی جگہ تاقت لکھنے کو غلطی قرار دیتے ہیں اسی طرح کہار کو کھار لکھنا بھی غلطی سمجھیں اور اس غلطی کے نمبر کاٹیں۔ اس سلسلے میں نشانات اوقاف اور استعمال اعراب کے اصول اور محل مقرر کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ یہ اصول مقرر ہو جائیں تو اعراب کی ضرورت بہت ہی کم رہ جائے اور اردو کی عبارت کا صحیح پڑھنا بہت آسان ہو جائے۔

کسی زبان میں تحریر کے بعد ایک بہت اہم مسئلہ طباعت کا ہے، جو زبان کی ترویج واشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اردو کتابیں اب تک بالعموم لیتھو میں چھپتی رہی ہیں۔ لیکن یہ زمانہ عجلت کا ہے اور لیتھو کی چھپائی اس زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ چھاپے کی نئی نئی مشینیں اور نئے نئے طریقے جن سے چھپائی کے کام میں بڑی خوبی، بہت آسانی اور نہایت عجلت کے ساتھ ہو سکتے ہیں ان سے لیتھو کی چھپائی میں کام نہیں لیا جا سکتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ دوسری زبانوں کی طرح اردو کی کتابیں بھی ٹائپ میں چھاپی جائیں۔ مگر اب تک ہندوستان میں اردو ٹائپ کا اچھا مطبع ایک بھی نہیں ہے، جہاں ہر طرح کا ٹائپ اور ہر طرح کی مشینیں موجود ہوں۔

ٹائپ کے ذکر کے ساتھ وہ کوششیں ضرور یاد آجاتی ہیں جو نستعلیق ٹائپ بنانے کے لئے کی گئیں۔ بہت سا وقت اور کثیر سرمایہ ان کوششوں میں صرف کیا گیا، مگر کامیابی کی منزل دور ہی رہی۔ ٹائپ میں نستعلیق خط کی خوبیاں باقی رکھنا اور وہ بھی اس طرح کہ چھپائی میں کوئی دشواری نہ ہو، ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ نستعلیق ایران میں ایجاد ہوا۔ وہاں کے بادشاہوں اور امیروں نے بڑی فیاضی کے ساتھ اس کی ترقی میں مدد دی۔ ایران میں خطاطی کی قدر مصوری سے کم نہ تھی۔ وہاں سیکڑوں بڑے بڑے خطاط گذرے ہیں جیسا ہندوستان میں شاید ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔ وہاں کے لوگ عام طور پر نستعلیق خط ہندوستان سے کہیں بہتر لکھتے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود ایرانیوں نے ضرورت زمانہ کو دیکھ کر اپنی کتابیں معمولی ٹائپ میں چھاپنا شروع کردیں۔ انھوں نے نستعلیق ٹائپ بنانے کی کوشش میں اپنا وقت اور روپیہ برباد نہیں کیا۔ پھر آخر ہم کو نستعلیق کی محبت اس قدر کیوں دامن گیر ہوگئی تھی کہ ایک غیر ممکن کام کو ممکن بنانے میں لگے رہے۔ اتنی کوشش اگر موجودہ ٹائپ کو خوبصورت اور مقبول بنانے میں کی جاتی تو بہتر نتائج برآمد ہوتے۔ ہندوستان میں نستعلیق ٹائپ آج سے کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے تیار ہو چکا تھا اور متعدد مطبعوں نے اس سے کام لینا شروع کردیا تھا۔ مگر غالباً طباعت کی دشواریوں سے مجبور ہو کر اہل مطبع نے کچھ مدت تجربہ کرنے کے بعد اس ٹائپ کو ترک کردیا۔ نستعلیق ٹائپ کے مطبعے زیادہ تر کلکتے میں قائم کئے گئے تھے۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ مطبع محمدی، مطبع احمدی، مطبع نبوی، مطبع طبی، مطبع کریمی، مطبع انوری، مطبع مراۃ الاخبار، مطبع محمد فیض اللہ۔ ان مطبعوں کی چھپی ہوئی دو درجن کتابیں میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔

چھپائی میں آسانی کے خیال سے حرفوں کی صورت میں کسی قدر تبدیلی بھی کی جاسکتی ہے۔ مگر یہ تبدیلی ایسی ہونا چاہئے کہ چھپے ہوئے اور لکھے ہوئے لفظ صورت میں ملتے جلتے ہوں تاکہ جو کوئی چھپا ہوا لفظ پڑھ سکتا ہو وہ لکھا ہوا لفظ بھی آسانی سے پڑھ لے۔

☆☆☆

ضمیمہ۔ ۱

سری بشن سروپ الہ آبادی کا ایک خط اخبار ناردرن انڈیا پتریکا الہ آباد کے ایڈیٹر کے نام اسی اخبار میں ۱۷ مارچ ۱۹۶۰ کو شائع ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ وہ ہندی کیا ہے جو ہندوستان بھر میں سب زبانوں سے زیادہ سمجھی جاتی ہے اور جس کو ہندوستان کے آئین نے سارے ملک کی سرکاری زبان قرار دیا ہے۔ اس کا یہ بیان ایسا ہے کہ تنگ نظری اور تعصب کے مریضوں کو چھوڑ کر ہر وطن پرست ہندوستانی اس کی تائید کرے گا۔ اس خط کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-

> جناب والا! ہمارے آئین نے ہندی کو سارے ملک کی سرکاری زبان قرار دیا ہے۔ اور قرینہ کہتا ہے کہ آگے چل کر ہندی ہی کو قومی زبان ہونا ہے، اس لئے کہ ہندی دوسری زبانوں کے مقابلے میں ہندوستان کے بہت زیادہ حصے میں سمجھی جاتی ہے اور بہت آسانی سے سیکھی جاسکتی ہے۔ اپنی ملازمت کے ابتدائی زمانے میں مجھ کو اڑیسہ اور بنگال میں سالہا سال رہنا پڑا لیکن میں نہ اڑیا بولنا سیکھ سکا نہ بنگالی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میری ہندی ہر جگہ سمجھ لی جاتی تھی۔ مگر وہ ہندی کیا تھی؟ میں اتر پردیش کا رہنے والا ہوں۔ اس لئے وہ ہندی بولتا تھا جس کی بنیاد برج بھاشا ہے اور جو شورسینی اور ماگدھی پراکرتوں کی ایک مقامی شکل ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کے کئی سو آسان لفظ شامل ہیں جو انتظامی معاملات میں استعمال کئے جاتے ہیں یا مختلف عہدوں کے نام ہیں یا سائنس کی اصطلاحیں اور سائنس کے آلات کے نام ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس میں افعال کے آخری سرے وہ ہیں جو اردو میں آتے ہیں اور کھڑی بولی کہلاتے ہیں۔ یہ ان افعال سے کسی قدر مختلف ہیں جو دیہات میں بولے جاتے ہیں

لیکن یہ سب دیہات میں بھی آسانی سے سمجھ لئے جاتے ہیں۔

یہ زبان جو کوئی سو برس سے ہندوستانی بھی کہلاتی ہے اپنے تمام عربی، فارسی اور انگریزی لفظوں کے ساتھ ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ لفظ مسلمانوں اور انگریزوں کی حکومت میں سیکڑوں برس استعمال میں رہ چکے ہیں۔ یہی وہ ہندی ہے جس کو ہندوستان کی سرکاری زبان بنانا آئین کے پیش نظر ہے۔

آئین اس ہندی کو ترقی دینا بھی لازمی قرار دیتا ہے، غالباً اس لئے کہ اس کو بالآخر ہندوستان کی قومی زبان بنانا ہے۔ آئین کی دفعہ ۳۵۱ یہ ہے: "یونین کا فرض ہوگا کہ ہندی زبان کی وسعت کو ترقی دے کر وہ ہندوستان کے مخلوط کلچر کے جملہ عناصر کے لئے وسیلۂ اظہار کا کام دے سکے۔ [یونین کا فرض ہوگا کہ] ہندوستانی زبان اور دوسری زبانیں جن کی تصریح [آئین کی] آٹھویں شیڈول میں کر دی گئی ہے ان کے لفظوں کی ساخت، بیان کے اسلوب اور اظہار کے طریقے ہندی میں اس طرح شامل کر کے اس کا مزاج نہ بدلنے پائے اور جہاں ضروری یا مناسب ہو ترجیحاً سنسکرت سے اور ثانیاً دوسری زبانوں سے الفاظ لے کر اس کو مالا مال کرے۔"

میرا خیال ہے کہ [اس دفعہ میں] ہندی کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرنے کے لئے "دوسری زبانوں" سے صرف آٹھ شیڈول والی زبانیں مراد نہیں ہیں۔ بہر حال موجودہ ہندی یا ہندوستانی جس کی شرح اوپر کر دی گئی ہے، اس میں خلل انداز ہونا نہیں ہے بلکہ آئین کے بتائے ہوئے طریقے سے اس کو سرمایہ دار بنانا ہے۔ لیکن اس کے بجائے ہندی کے بعض عالموں اور جوشیلے حامیوں نے سنسکرت کے الفاظ ڈھونڈھنا اور گڑھنا شروع کر دیا ہے تاکہ وہ ان عربی، فارسی، انگریزی لفظوں کی جگہ لے سکیں جو موجودہ ہندوستانی میں استعمال کئے جا رہے ہیں اور اسی ہندوستانی کو ترقی دے کر [ملک کی] سرکاری زبان بنانا مقصود ہے۔ اس چیز نے یو۔پی کے ہندی بولنے والے باشندوں کے لئے بھی اس [زبان] کا سمجھنا مشکل بلکہ تقریباً ناممکن کر دیا ہے اور دوسرے صوبوں کے لوگ جو اس زبان کو سرکاری زبان بنانے پر اعتراض کرتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔"

☆☆☆

ضمیمہ۔۲

نئی دہلی کے سری موہن آنند کا ایک خط اخبار نیشنل ہرالڈ، لکھنؤ میں یکم اکتوبر ۱۹۶۱ کو شائع ہوا ہے۔ یہ خط شمالی ہند کی عام زبان کے بارے میں غلط رجحانات کے خلاف جرأت مندانہ تنبیہ ہے۔

جناب والا کہا جاتا ہے کہ وزیر اعظم پنڈت نہرو نے کانگریس کے ایک حالیہ جلسے میں کہا کہ ہندی بولنے والی ریاستیں پچھڑی ہوئی ہیں۔ اگرچہ انھوں نے جلدی سے یہ بھی کہہ دیا کہ "میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ ہندی پچھڑا پن لاتی ہے" لیکن ان کی اس بات نے جنتا کی توجہ اس سوال کی طرف موڑ دی کہ کیا کسی علاقے کے پچھڑے پن سے زبان کو کچھ تعلق ہے، اور اگر ہے تو اس کا سبب کیا ہے۔

نئی ہندی کا اپنی موجودہ صورت میں نویں صدی تک وجود نہ تھا۔ تلسی داس اور سورداس کے عظیم شعری کارنامے اودھی اور برج بھاشا کی مقامی بولیوں میں تھے، جن کا کوئی اپنا نثری اسلوب نہ تھا۔ پندرھویں صدی سے نثر کا صرف ایک مسلمہ اسلوب تھا اور وہ تھی فارسی خط میں لکھی ہوئی کھڑی بولی، اس کا رقبہ اتنا وسیع تھا کہ شمالی ہند کے تقریباً سبھی شہر اس میں شامل تھے۔ اور وہ پھیل کر دکن تک پہنچ گیا تھا۔ اس زبان نے شہروں کے مہذب لوگوں کے لئے اپنے خیالات ایک دوسرے تک پہنچانے کا وسیلہ بہم پہنچایا اور ترقی کے نظم و نسق، تجارت اور کاروبار کی زبان بن گئی۔ دیہات کے خواندہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد بھی اس زبان کو سمجھنے اور پڑھنے لکھنے لگی۔

یہ زبان برابر تیزی سے ترقی کرتی رہی، یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخری حصے میں آریہ سماج تحریک اٹھ کھڑی ہوئی، جس کا نعرہ تھا "ویدوں کی طرف پلٹ چلو"۔ ہندو قوم کو متحد کرنے کے جوش میں یہ تحریک ایک گئے گذرے زمانے کی عظمت کے راگ الاپنے لگی۔ آریہ سماجیوں کے خیال میں اس عظمت کی بازیافت کا واحد طریقہ یہ تھا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیانی دور کے اثرات کو دور کیا جائے۔ ویدوں کا مطالعہ اور دیوناگری رسم خط کی ترویج جس میں وید لکھے ہوئے تھے آریہ سماجیوں کے پروپیگنڈے کے خاص مقصد بن گئے، اور بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ پروپیگنڈا فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی اردو ہی میں

کیا جاتا تھا۔ پنجاب میں ہندی کے حامی آج بھی فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی اردو ہی کے ذریعے سے اردو اور گرمکھی کے خلاف جنگ کررہے ہیں۔

آریہ سماجیوں کا کہنا تھا کہ کوئی زبان جو بدیسی خط میں لکھی جاتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی عام فہم کیوں نہ ہو، ہندو قوم کو قبول نہ کرنا چاہئے اور زندگی کے ویدی طریقے اختیار کرنا چاہئے۔ اب ایک نئی زبان بنانا ضروری ہوگیا اور اس کا سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ رائج الوقت زبان میں بدیسی لفظوں کی جگہ سنسکرت، تدبھو کی جگہ تت سم الفاظ رکھ دیئے جائیں۔ اس طرح جدید ہندی پیدا ہوئی، صورت میں دوغلی اور متنوں میں منتشر جدید ہندی اپنے احیائی پس منظر کے ساتھ زمانے کی بڑھتی ہوئی آگاہی کے قدم بہ قدم نہیں چل سکی۔ وہ اپنے اندر کی طرف دیکھتی ہے اور لفظوں اور خیالوں کو، سوا ان کے جو گذشتہ عظمت سے وابستہ ہیں، جذب کرنے کی تمام کوششوں سے علیٰحدہ رہی ہے اور مستقبل کے ذخیرۂ الفاظ کا کوئی تصور پیش نہیں کرتی۔ جیسی زبان ہوگی ویسے اس کو بولنے والے ہوں گے۔ ایسی جماعتوں سے یہ توقع کرنا بے کار ہے کہ ان میں خیال اور عمل کے وہ جدید طریقے اختیار کرنے کی کوئی خواہش ہوگی جو اقتصادی اور تہذیبی ترقی کی راہ دکھاتے ہیں۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ہندی کو ریاستی زبان ماننے کے ساتھ ہی ہندی بولنے والے علاقے بھر میں احیائی سیاسی سرگرمی کا ایک سوتا پھوٹ نکلا۔ آر ایس ایس نے ہندو راج قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور ہندی کو اس راج کی قومی زبان کی حیثیت سے اختیار کیا ہے۔ ہندی کا تحفظ ہندو کلچر اور مادر ہند کے تحفظ کا لازمی جزو سمجھ لیا گیا ہے۔۔۔۔۔ اب بہت کم لوگوں کو یاد رہا ہوگا کہ شمالی ہند میں ہندی تحریک کے، اصلی مزاج سے ناواقفیت کی حالت میں مہاتما گاندھی اس صدی کی تیسری دہائی میں ہندی ساہتیہ سمیلن میں شریک ہوگئے تھے۔ لیکن انھوں نے جلد ہی اس تحریک کا مطلب سمجھ لیا اور سمیلن سے اپنا قطع تعلق کرلیا۔ یہ زیادہ تر اسی ہندی کے خطرے کا توڑ تھا کہ مہاتما ہندی کے مقابلے میں فارسی اور دیوناگری دونوں خطوں میں لکھی ہوئی ہندوستانی کو مقبول بنانے میں لگ گئے تھے۔ بدقسمتی سے سیاست نے ایسے پلٹے کھائے کہ ہندوستانی کی تحریک اپنے بانی کے ساتھ تہ تیغ کردی گئی۔

وزیر اعظم نے ان کے پچھڑے پن کا ذکر کرکے اس علاقے کے اونگھتے ہوئے لوگوں کو چونکانے کی کوشش کی ہے۔ جتنا اپنی زبان کے ساتھ ساتھ ہی ترقی کرسکتی ہے اور اگر ہندی کو ترقی کرنا ہے تو اس کو اپنے رجعت پسند ماضی سے علیٰحدہ ہونا پڑے گا۔ اس کے لئے ضرورت ہے پرجوش مصنفوں کے ایک گروہ کی جن میں اس سائنسی عہد کی روح موجود ہو۔ مصنفین کا یہ گروہ شاید ہندی نہ بولنے والے علاقوں میں پیدا ہو۔"

☆☆☆

"آپ کی شاعری نئی حسیت کی آئینہ دار ہے اور اس دور کا سوز و ساز اور درد و داغ آپ کے یہاں ساری رعنائی کے ساتھ ملتا ہے۔"

—— آل احمد سرور

"مصحف اقبال توصیفی اپنے موضوعات کے انتخاب اور انداز بیان میں مکمل طور پر آزادی کے قائل ہیں...ان کے موضوعات اور طرز بیان ان کی انفرادیت کی نشان دہی کرتے ہیں۔"

—— ضیا جالندھری

مصحف اقبال توصیفی کا نیا شعری مجموعہ

دور کنارا

ضخامت: ۱۳۶ صفحات قیمت: ۱۵۰ روپئے

ناشر: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹۔ گولہ مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ہندوستان میں غیر سرکاری سب سے سستا ماہنامہ

ادبی مضامین، افسانے، معیاری نظمیں غزلیں، دوہے، بچوں کا گوشہ، مختلف ادبی خبریں اور کئی منفرد و دلچسپ مستقل کالم

ماہنامہ سبق اردو

سائز ۲۰×۳۰/۸ ۶۴ صفحات

بہترین کاغذ، رنگین سرورق (Four Colour)

قیمت: ۱۰ روپئے سالانہ: ۸۴ روپئے

رابطہ: ماہنامہ سبق اردو، جامع مسجد، گوپی گنج، بھدوہی (یو۔پی۔) ۲۲۱۳۰۳

اردو رسم الخط، چند خیالات

سید احتشام حسین

شمارہ ۵۴،
نومبر ۱۹۷۷

جس طرح وہ تمام الفاظ جو اردو میں رائج ہیں اور عام استعمال کی وجہ سے اردو زبان کا جز بن گئے ہیں، چاہے ان کی اصل عربی، فارسی، سنسکرت، ترکی، پرتگالی اور انگریزی کیوں نہ ہو، اردو ہی کے لفظ سمجھے جاتے ہیں اور اردو ہی کے قواعدی اصولوں کا اطلاق ان پر ہوتا ہے، اسی طرح وہ رسم خط جس میں اردو زبان بالعموم لکھی جاتی ہے اردو رسم خط کہا جائے گا چاہے اس کی اصل عربی اور فارسی کا وہ رسم خط ہو جو ابتدائی سامی رسم خط سے وجود پذیر ہوا یا کوئی اور۔ اسے اس وجہ سے بھی اردو رسم خط کہنا ہی مناسب ہوگا کہ اس کی بہت سی صوتی علامتیں وہ ہیں جو نہ عربی میں پائی جاتی ہیں نہ فارسی میں، ان کی تخلیق نہ صرف یہ کہ اردو ہی کے لئے ہوئی ہے بلکہ اردو زبان کے آغاز اور ارتقا سے اس کا گہرا رشتہ ہے۔ اس لئے اگر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اردو ایک آزاد اور مستقل زبان ہے تو اس کے رسم خط کو بھی اسی طرح آزاد اور مستقل ماننا چاہئے۔ کیوں کہ تقریباً آٹھ سو سال سے یہی رسم خط اردو کے تحریری اظہار کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔

اردو رسم خط پر کوئی گفتگو کرنے سے پہلے اس حقیقت کو بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ جب اردو زبان کا آغاز ہوا اس وقت اس کے لئے بولنے والے وہ لوگ تھے جو یا تو ایران، عرب، ترکستان، منگولیا وغیرہ سے آئے تھے اور اپنی زبانیں رکھتے تھے یا ہندوستان کے وہ باشندے تھے جن کی اپنی اپنی علاقائی بولیاں یا زبانیں تشکیلی حالت میں موجود تھیں۔ یہ صرف تاریخ کا تقاضا تھا کہ بول چال کی ایک نئی مشترک زبان پیدا ہو۔ مخصوص سماجی اور تہذیبی ضروریات نے ایک ایسی زبان کو جنم دیا جو کئی زبانیں بولنے والوں کی مشترک تمناؤں کی مظہر تھی۔ ہوسکتا تھا کہ جب اسے تحریری شکل دینے کی ضرورت پیش آئی اس وقت یہاں کی مختلف لکھاوٹوں میں سے کوئی ایک لکھاوٹ اس کے لئے اختیار کر لی جاتی لیکن جس طرح یہ بات ہو کر رہی کہ یہاں کی ایک بولی تغیرات سے گذر کر اردو بنی اسی طرح اس نے ترمیم و تغیر کر کے اپنے لئے ایک رسم خط کا بھی انتخاب کیا جو املا اور صوتی علامات کے لحاظ سے اس رسم خط سے مختلف ہے جس پر وہ مبنی ہے۔ ہندوستانی رسم خطوں میں سے کوئی رسم خط اختیار نہ کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہاں اس وقت کوئی معیاری اور عام رسم خط مستعمل نہ تھا، جو تھے بھی ان میں بہت سی وہ صوتی علامتیں موجود نہ تھیں جو اردو زبان کی تشکیل میں شامل ہو چکی تھیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی کمی تو اس رسم خط میں بھی تھی جس پر اردو رسم خط کی بنیاد ہے لیکن تاریخی اور تہذیبی اسباب کا شعور رکھنے والے بڑی آسانی سے اس انتخاب کی حقیقت سے بھی واقف ہو سکتے ہیں۔ ایک سامنے کی بات تو یہی ہے کہ ہندوستان کے کئی رسم خط میں ث، ح، خ، ذ، ز، ژ، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق کی آوازوں کے لئے تحریری علامتیں موجود نہ تھیں، اس کے برعکس عربی اور فارسی رسم خط میں ہائیہ آوازوں کے علاوہ صرف ٹ، ڈ، ڑ کے لئے علامتیں نہیں تھیں۔ ہائیہ کے لئے بہت سی علامتوں کے بجائے جہاں ضرورت ہوئی حرف صحیح میں ھ لگا کر ہائیہ آوازوں (ک + ھ = کھ، گ + ھ = گھ، ڈ + ھ = ڈھ، ت + ھ = تھ وغیرہ) کی علامتیں بنائی گئیں اور ٹ، ڈ، ڑ، کی ضرورت بھی ایک ہی قسم کی معمولی تبدیلی سے پوری کر لی گئی (پہلے چار نقطے لگا کر، پھر دو نقطے اور ایک مختصر سا خط کھینچ کر اور پھر ط کی علامت کا اضافہ کر کے) یہ سارا عمل ضرورت اور وقتی سوجھ بوجھ کے تابع تھا۔ اس طرح ایک رسم خط جس سے بہت سے لوگ مانوس تھے، ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ اردو کی ابتدائی شکل سے وابستہ ہو گیا۔ ہر زبان کو ایک منزل پر کسی نہ کسی رسم خط کی ضرورت پڑتی ہے کیوں کہ زبان ملفوظی اور صوتی حیثیت سے پہلے وجود میں آجاتی ہے اور تحریری حیثیت سے بعد میں۔

رسم خط کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ایک پہلو اور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ کسی زبان کے پاس کوئی رسم خط ہونا ایک بات ہے اور برا بھلا کوئی رسم خط ہو، اس کا بدلنا بالکل دوسری بات ہے۔ لاکھوں سال پہلے جب انسان نے بولنا شروع کیا تو اس کے پاس کوئی رسم خط نہ تھا صرف بولی جانے والی زبان تھی جو کئی منزلوں سے گذر کر آوازوں کی بنیاد پر وسیلۂ اظہار بنی تھی۔ تحریر تک پہنچنے کی منزل کیوں کر آئی اس کے متعلق میں اپنے ہی ایک بیس سال پہلے کے لکھے ہوئے مضمون کی کچھ سطریں نقل کرنا چاہتا ہوں:

> اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ زبان پہلے وجود میں آئی۔ اس کی ابتداءً جو شکل بھی رہی ہو، وہ اظہار خیال اور اظہار جذبات کا ایک ذریعہ تھی، اس کا مقصد

> اظہار و ابلاغ تھا۔ اس سے وہ ضرورت پوری ہوتی تھی جس سے سماج کے ذہن میں کسی حد تک یکسانیت اور وحدت پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بحث بھی اٹھتی ہے کہ سب سے پہلے زبان کہاں اور کن لوگوں میں پیدا ہوئی، ابتدا میں ایک زبان تھی یا کئی زبانیں؟ یہاں اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں... ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ زبان انسانوں میں پیدا ہوئی اور ایک زبردست اجتماعی اساس کی حیثیت سے ابتدائی تمدن کو منضبط کرنے میں معین ہوئی... جب زبان اجتماعی زندگی کی تشکیل میں اتنی اہم ثابت ہوئی، جب اس نے ارتقا میں مدد دی تو اس کی خود بھی ترقی ہوئی اور انسانی ذہن نے اس عجیب و غریب ایجاد کو دوام بخشنے کے لئے رسم خط ایجاد کرنے کی کوشش بھی کی... جہاں تک رسم خط کے سلسلہ میں تحقیقات ہوئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ابتدا تصویری حروف کی مختلف شکلوں سے ہوئی۔ مصری، بابلی، چینی اور ہندوستانی فن تحریر کو دیوتاؤں سے منسوب کرتے تھے اور یہودی حضرت موسیٰ سے۔ اس میں شک نہیں کہ تحریر کی ایجاد بھی تسخیر فطرت کا ایک ذریعہ تھی اور اپنی قوت یادداشت کو دیرپا اور قوی تر بنانے کے لئے انسان نے اپنے خیالات کو جانی بوجھی تصویروں میں منتقل کر لیا تا کہ تلازمۂ ذہنی کی مدد سے وہ اپنے خیالات اور تجربات کی باز آفرینی پر قادر ہو سکے۔ یہ اہم سماجی کارنامہ سحر اور ٹوٹکے کے تصور پر مبنی تھا لیکن جب اس پر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ سحر کی مدد سے بھی فطرت کو شکست دینے یا اس پر قابو پانے ہی کی کوششیں کی جاتی تھیں کیوں کہ انسان اپنی ابتدائی زندگی ہی سے فطرت کے خلاف جدو جہد کرنے لگا تھا اور اپنے محدود مادی وسائل سے کام لے کر آگے بڑھ رہا تھا۔ تحریر آگے بڑھنے کا ایک ذریعہ تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ یادداشت میں سب سے زیادہ مدد قریب ترین مماثلت سے ملتی ہے اس لئے چیزوں کی تصویریں سب سے زیادہ فطری تحریر کہی جا سکتی ہیں... لیکن زبان محض اشیا کے ناموں کا مجموعہ تو نہیں۔ متحرک زندگی میں بنی بنائی چیزیں کم ہیں، خیالات کی رفتار عمل کی مختلف صورتوں اور حالتوں میں ربط پیدا کر لیتی ہے اسی لئے تصویری تحریر کے علاوہ تصوری تحریر بھی پیدا ہوئی یعنی الفاظ خیالوں کی ملفوظی اور صوتی علامات بھی بن گئے...
>
> تصویری تحریر خیالات کی علامت مقرر کرنے کی ابتدائی اور بھدی کوشش تھی لیکن جب انسانی ذہن استوار ہوا اور اس کی تجریدی طاقت بڑھی تو اس نے آوازوں کی علامتیں مقرر کرنے کی کوشش کی... حروف تہجی یا صوتی علامتیں انھیں تصویری یا تصوری تحریروں کی ارتقائی شکل ہیں۔ عبرانی اور یونانی حروف تہجی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر حرف کوئی معنی رکھتا ہے اور ان کی ابتدائی شکل اس مفہوم یا معنی سے صوری مماثلت رکھتی ہے۔ جب لکھنے کا فن ایجاد ہوا تو تاثر اور ردعمل کو دوام بخشنے کے لئے صوتی تصویروں کو جو سامعہ کی مدد سے ذہن میں بنتی تھیں، تحریری علامتوں میں منتقل کر دیا گیا اور وہ تاثر باصرہ کی مدد سے ذہن پر منعکس ہونے لگا...

اس عبارت کو نقل کر کے ذہن کو دو باتوں کی جانب متوجہ کرنا ہے۔ ایک یہ کہ جب تک کسی زبان کے لئے کوئی رسم خط معین نہ ہو اس کے لئے رسم خط اختیار کرنے یا بنانے کا معاملہ اور ہے اور جب زبان کا کوئی رسم خط موجود ہو تو اسے بدلنے کا مسئلہ بالکل دوسرا ہے۔ تقریباً پچاس سال پہلے روس کے مختلف علاقوں میں کئی زبانیں ایسی بولی جاتی تھیں جن کا کوئی رسم خط نہ تھا کیوں کہ وہ کبھی لکھی ہی نہیں گئی تھیں، اس لئے ماہرین نے روسی رسم خط میں ترمیمیں اور اضافے کر کے ان زبانوں کی صوتیات کے مطابق ان کے لئے رسم خط بنا دیے اور وہی رائج ہو گئے لیکن جب کسی زبان کے لئے کوئی رسم خط برابر استعمال ہوتا رہا ہو اس وقت اس کا رسم خط بدلنے میں اکثر و بیشتر دشواریاں پیدا ہوئی ہیں اور ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا ہے جیسا کہ ترکی اور بعض دوسری زبانوں کے لئے رومن رسم خط اختیار کرنے کے سلسلہ میں ہوا۔ دوسری بات جسے سمجھنا ہے وہ یہ ہے کہ زبان اور رسم خط تاریخ و تہذیب کی دین ہیں، ان میں کوئی بڑی تبدیلی اسی وقت ہو سکتی ہے جب تاریخ اور تہذیبی سانچے میں ایسی تبدیلی ہو جائے کہ اس کے اندر زبان و رسم خط کی سمائی نہ ہو سکے۔

اردو رسم خط کا مسئلہ انھیں علمی، تاریخی اور نفسیاتی حقائق سے وابستہ ہے۔ ماہرین رسم خط کی بڑی تعداد اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ تصویری یعنی ہیروغلیفی اور تصوری تحریروں کے بعد تجریدی علامتوں کا آغاز شمالی یا سامی قوموں کے یہاں ملتا ہے۔ انھیں کی مختلف شاخیں کنعانی، عبرانی، فنیقی، ارامی، جنوبی سامی اور یونانی کے روپ میں بڑھیں اور پھیلیں۔ ارامی رسم خط خاص طور سے معمولی اور بڑے تغیرات اور اضافوں کے ساتھ مختلف علاقوں میں پہنچا۔ چنانچہ بعض اہم علماء کا خیال ہے کہ وہ براہمی رسم خط بھی اسی کے اثرات سے وجود میں آیا جسے ہندوستان کے قدیم رسم خطوں کا مخرج اور منبع سمجھا جاتا ہے۔ یقین سے کچھ کہنا اسی لئے مشکل ہے کہ ایک طرف تو ابھی تک وہ دراوڑی تحریریں ٹھیک سے پڑھی نہیں جا سکی ہیں جو موہنجوداڑو اور ہڑپا میں ملی ہیں اور جن کا رشتہ سمیری اور بابلی سے جوڑا جا سکتا ہے اور دوسری طرف گوتم بدھ سے پہلے فن تحریر کے متعلق کوئی حوالہ قدیم ہندو صحیفوں میں نہیں ملتا۔ تحریر کا انقلابی فن گو ابتداءً بادشاہوں، پروہتوں اور مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ مضبوط

کرتا رہا اور کبھی زبان کی طرح عام نہ بن سکا لیکن اس نے زبان کی حفاظت کی، اس کی بے ترتیبی میں نظم پیدا کیا اور آوازوں کو با معنی شکل میں ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کیا۔ تحریر ہی لسانی اور معنوی تغیرات کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ جب آوازوں کو محفوظ رکھنے کے سائنسی ذرائع وجود میں نہیں آئے تھے اس وقت صرف تحریر زبان کو استحکام بخشنے اور گذری ہوئی نسلوں سے رابطہ قائم کرنے کا ذریعہ تھی بلکہ دوسرے ذرائع کے مقابلہ میں آج بھی عمومی اہمیت رکھتی ہے۔ غرض کہ زبان ہی کی طرح رسم خط کی کہانی بھی دلچسپ اور دائرۂ عمل وسیع ہے اور تہذیبی تسلسل کو برقرار رکھنے کی سب سے مضبوط اور سب سے اہم کڑی۔

زبان بدلتی رہتی ہے اور گو اسی رفتار سے نہیں لیکن رسم خط میں بھی تغیر اور ارتقا ہوتا ہے جس کی مثال ہر زبان اور اس کے رسم خط سے دی جاسکتی ہے۔ اردو اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اس میں بھی تغیرات ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں لیکن کوئی تغیر کسی قسم کے جبر یا دباؤ کا نتیجہ نہیں تھا، کسی تبدیلی کے پیچھے کوئی سیاسی مصلحت نہیں تھی، ضرورت کے احساس نے تبدیلیاں کرائیں اور لوگوں نے بحث مباحثہ کے بغیر عام طور سے انھیں قبول کرلیا۔ لیکن گذشتہ چالیس برسوں کے اندر اردو رسم خط میں ترمیم، اصلاح یا تبدیلی کے متعلق جو خیالات پیش کئے گئے ہیں ان کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ خالص علمی اور سائنٹفک محرکات کے علاوہ کئی اور باتیں ایسی بھی شامل ہوگئی ہیں جن کا تجزیہ آسان نہیں۔ تبدیلی چاہنے اور نہ چاہنے والے دونوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو غیر علمی، جذباتی، مذہبی یا سیاسی مصلحت پسندانہ رویہ کا شکار ہیں، وہ یا تو عام پہلوؤں پر نگاہ ڈالے بغیر ترمیم اور تبدیلی کے متعلق تجویز پیش کر رہے ہیں یا ہر تجویز کی مخالفت خالص جذباتی انداز میں کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ صورت حال کا تجزیہ سنجیدگی سے کیا جائے۔ مختصراً میں اپنے خیالات ان معروضات کی روشنی میں پیش کرتا ہوں جو گذشتہ صفحات میں ظاہر کئے گئے۔

چھوٹی چھوٹی موشگافیوں کو چھوڑ کر اردو رسم خط کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ہمیں پانچ قسم کے خیالات سے سابقہ پڑتا ہے:

۱۔ اردو رسم خط میں نقائص ہیں، معمولی ترمیمیں کر لینے سے کام چل سکتا ہے جیسے عربی کے ال کو نظر انداز کرنا، ہم صوت حروف میں سے صرف ایک حرف منتخب کر لینا، مجہول واو اور ی کے لئے علامتیں مقرر کر لینا وغیرہ۔

۲۔ اردو رسم خط یکسر غیر صوتیاتی ہے، محض انداز سے پڑھتے ہیں کیوں کہ حروف علت کا کوئی نظام نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ کوئی صوتیاتی رسم خط اختیار کر لیا جائے جیسے بین الاقوامی صوتیاتی رسم خط۔

۳۔ رومن رسم خط بعض اضافوں کے ساتھ اپنا لیا جائے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ دنیا کی بہت سی زبانوں کے رسم خط سے رشتہ آسانی سے قائم کیا جاسکے گا۔ ایک رسم خط سیکھ لینے سے کئی زبانوں کے سیکھنے میں آسانی ہوگی۔ ٹائپ کے استعمال کے لئے راہ ہموار ہوگی۔

۴۔ اگر اپنا رسم خط چھوڑنا ہی ہے تو دیوناگری میں کیا خرابی ہے جو صوتیاتی اعتبار سے خاصا سائنٹفک ہے۔ ہندی اردو کا خاندان ایک ہی ہے، رسم خط ایک ہی ہو جائے تو کبھی دونوں قریب آکر ایک ہو جائیں گی، اپنی ادبی برتری کی وجہ سے اردو کا پلہ بھاری ہو جائے گا اور ہندی اردو آمیز ہو کر دیوناگری رسم خط میں زندہ رہے گی یعنی رسم خط نہ رہا تو کیا اردو کا بڑا حصہ بچ جائے گا۔ تاریخ اردو کا ساتھ چھوڑ رہی ہے، ہندی رسم خط اردو کے مقابلہ میں آسان بھی ہے اور ہندی کے سرکاری زبان ہو جانے کے بعد سے ہر پڑھے لکھے کو سیکھنا ہی پڑتا ہے، اس لئے کیوں نہ ایک ہی رسم خط سے ہندی اور اردو دونوں کا کام چلایا جائے وغیرہ۔

۵۔ اردو رسم خط مکمل، بے عیب، خوبصورت اور باکفایت ہے۔ اس میں کسی قسم کی اصلاح کی ضرورت نہیں۔ ہم دیوناگری رسم خط کیوں اختیار کریں۔ اس میں بہت سے نقائص ہیں، رسم خط زبان کا لباس نہیں اس کی روح ہے، رسم خط مٹے گا تو زبان بھی مٹ جائے گی۔ بنگالی، پنجابی، تامل تلگو والے اپنا رسم خط دیوناگری کیوں نہیں کرتے، ہمیں کیوں کہا جاتا ہے؟

ان مختلف نقاط کے حامی کبھی منطقی استدلال کے ساتھ اور کبھی مخصوص جذباتی انداز میں اپنی باتیں پیش کرتے ہیں۔ اگر ہم منصفانہ ان پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر پہلو میں تھوڑی بہت صداقت اور وزن ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو رسم خط کی بنیاد حروف تہجی پر ہے جن میں حروف علت کی کمی ہے۔ عام استعمال میں (عربی تجوید کے نقطۂ نظر سے نہیں) کئی حرف ہم صوت ہیں اور کم پڑھے لکھے عربی سے ناواقف اور زبان کو محض کاروباری ضرورتوں کے لئے سیکھنے والوں کے لئے دشواری پیدا کرتے ہیں۔ اسی لئے اگر چند ترمیمیں کردی جائیں تو آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اس کے برعکس یہ بھی درست ہے کہ اس طرح ایک ہی رسم خط کی دو شکلیں ہو جائیں گی: ایک کم پڑھے لکھے کاروباری لوگوں کے لئے اور دوسری زبان کو بہ حیثیت زبان اور ادب کے استعمال کرنے والوں کے لئے۔ اس صورت حال سے سخت انتشار پیدا ہوگا۔

رومن رسم خط کی حمایت کرنے والوں میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اگر محض ان چھبیس حرفوں پر اکتفا کریں جو رومن حروف تہجی میں پائے جاتے ہیں تو اردو کی بعض آوازیں یا تو لکھی نہ جاسکیں گی یا التباس پیدا کریں گی۔ اگر کچھ نئی علامتیں بنائی جائیں تو حروف کی تعداد خاصی بڑھ جائے گی اور وہ آسانی باقی نہ رہے گی جو مدنظر ہے۔ گذشتہ چند برسوں کے اندر امریکہ، کناڈا اور انگلستان سے رومن خط میں جو اردو تحریریں شائع ہوئی ہیں ان میں نہ تو یکسانیت ہے اور نہ کوئی معین اصول۔ ہر شخص نے تقریباً اپنے حروف ابجد الگ الگ بنالئے ہیں۔ پھر قدیم مستشرقین نے جو علامتیں وضع کی تھیں وہ اب استعمال میں نہیں ہیں۔ غرض کہ یہاں بھی انتشار اور افراتفری کی صورت ہے۔ جب تک علمی طور پر کوئی رومن نظام ابجد تسلیم نہ کرلیا جائے اردو کے لئے اسے استعمال کرنا فائدے کے بجائے نقصان پہنچائے گا۔ اس کے علاوہ جو یہ فائدہ پیش نظر ہے کہ اس سے کئی یورپی اور امریکی زبانوں کے سیکھنے میں مدد ملے گی، وہ ہمیں مشرق وسطی اور وسط ایشیا کی بہت سی زبانوں کے لئے استعمال کئے جانے والے رسم خط سے محروم کردے گا، اس طرح

فائدہ نقصان کا حساب برابر رہے گا، بلکہ شاید نقصان کا پلہ زیادہ بھاری ہو جائے۔

اس وقت اردو کے لئے دیوناگری رسم خط استعمال کرنے کی ضرورت پر سب سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے، حالات کے پیش نظر یہ بحث کسی قدر فطری بھی ہے۔ اردو ہندی کے نزاع کی تاریخ سو سال سے زیادہ پرانی ہے اور رسم خط کا مسئلہ اس کا جز ہے جو موجودہ سیاسی اور تاریخی موقف اور علمی آسانیوں اور دشواریوں کی وجہ سے ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔ بیس پچیس سال پہلے اس مسئلہ پر عملی نقطۂ نظر سے غور کرنا اور اس کے نتائج پیش کرنا بحث کے دروازے نہیں کھولتا تھا۔ آج اس کے ساتھ ایسے عناصر وابستہ ہو گئے ہیں کہ انھیں الگ کرنا محال ہے۔ تقریباً بائیس سال پہلے میں اپنے مطالعہ کی بنیاد پر اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ مادری زبان فطری سہی لیکن دو تین نسلوں کی تعلیم و تربیت سے وہ بھی بدل سکتی ہے یا بدلی جا سکتی ہے (جسے علمی حیثیت سے میں آج بھی صحیح سمجھتا ہوں) اسی طرح رسم خط سے متعلق میرا خیال تھا کہ یہ زبان کے ساتھ بنیادی یا فطری طور پر وابستہ نہیں، اگر بالکل ابتدا ہی سے کوئی زبان کسی خاص رسم خط میں لکھی جانے لگے تو وہی اس کا رسم خط بن سکتا ہے (اسے آج بھی میں عملی حیثیت سے درست سمجھتا ہوں) میں نے یہ بھی کہا تھا کہ جب تمام لوگ اردو اور ہندی دونوں رسم خط سیکھ لیں تو انھیں اس کی آزادی دے دی جائے کہ وہ جو رسم خط چاہیں اختیار کریں، اس طرح اگر کوئی شخص اردو کو ہندی رسم خط میں لکھنا چاہے تو اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت ان خیالات پر نہ کسی نے تنقید کی اور نہ مجھے بدنیتی کا مجرم ٹھہرایا لیکن آج حالات دوسرے ہیں، خود میرے خیالوں میں بھی معمولی تغیرات ہوئے ہیں۔ آزادی کے بعد جب اس بات پر زور دیا جانے لگا کہ اردو ہندی ہی کا ایک روپ ہے، اسے ہندی ہی کہنا چاہئے، اسے ہندی کی اکثریت میں شامل ہو جانا چاہئے (کیوں کہ بنیادی طور پر دونوں ایک ہیں) دونوں میں فرق صرف رسم خط کا ہے، یہ فرق مٹ جائے تو قومی زبان کا مسئلہ حل ہو جائے اور تعلیمی ارتقا کی راہ ہموار ہو جائے، تو اس پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ پندرہ سال پہلے ہندی کے ایک بڑے ادیب رام نریش ترپاٹھی نے، جو اردو سے بھی خوب واقف تھے اور اس کی بعض خوبیوں کو سراہتے بھی تھے، یہاں تک کہا کہ اردو اور ہندی کے درمیان صرف رسم خط کی دیوار حائل ہے، اگر یہ دیوار گرادی جائے تو اردو بھی اسی طرح ہندی میں سما جائے گی جیسے اودھی، برج بھاشا، بندیلی، بھوج پوری اور دوسری زبانیں یا بولیاں۔ یہ بھی کہا گیا کہ اردو کو اس کے رسم خط میں زندہ رکھنے کی کوشش فرقہ وارانہ ہے اور مشترک کے تہذیب کے بننے میں حائل۔ ذمہ دار اور غیر ذمہ دار قسم کے لوگوں کی بہت سی ایسی ہی باتیں یہ سوچنے پر مجبور کرنے لگیں کہ اب زبان اور رسم خط کے فطری تغیر و تبدل اور فطری ارتقا کا سوال نہیں رہا بلکہ جو کچھ سوچا اور کہا جا رہا ہے اس میں ایک ایسی رجعت پسندانہ، فاسسٹ اور احیائی خواہش شامل ہے جو ان تمام صحت مند تہذیبی عناصر کا بھی خاتمہ کر دینا چاہتی ہے جنھیں وہ اپنا نہیں سمجھتی۔ اس جذبہ کی زد پر صرف رسم خط نہیں زبان، تہذیب، تاریخ، روایات، طرز زندگی، عقیدہ، پسند اور ناپسند، علم اور یقین ہر چیز ہے، اس کے سامنے سر جھکانے کے معنی ہوں گے ترقی پسندی کے تصور سے دست برداری، عقل اور عقیدے سے دست برداری، تہذیبی روایات کے اس تسلسل سے دستبرداری جو زندگی کی راہوں کو آسان بناتا ہے۔ یہ جذبہ حد سے بڑھ کر خود زندگی کا گلا گھونٹ دیتا ہے اسی لئے اپنی بقا کے نقطۂ نظر سے اس کا مقابلہ ضروری ہے۔ اس کے سامنے بعض اوقات سائنس، منطق، استدلال سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ ماننے کے باوجود کہ زبانیں بنتی بگڑتی، تبدیل ہوتی رہتی ہیں، مادری زبان بھی حالات کے بدل جانے سے بدل سکتی ہے، میں یہ کہتا ہوں کہ اردو ایک آزاد مستقل، ترقی پذیر اور لسانی حیثیت سے ہر دوسری زبان کی طرح مکمل زبان ہے، اس میں جو تبدیلیاں ہوں گی وہ ناگزیر ضرورتوں کے ماتحت ہوں گی۔ جنھیں اس زبان کے ذریعہ اظہار خیال میں آسانی ہے وہ اسے چھوڑنے یا جبر کے ماتحت بدلنے پر کبھی آمادہ نہیں ہو سکتے۔ اپنے ذوق اور پسند کی بات اور ہے۔ تاریخی اعتبار سے اردو کا ارتقا ہندی سے بہت پہلے ہوا، موجودہ ہندی اردو کی بگڑی ہوئی شکل ہے، اس کا دائرۂ اثر بھی وسیع رہا ہے۔ اور یہی پہلے ملک کی عام زبان تھی۔ یہ کوئی مذہبی زبان نہیں بلکہ ہندوستان کی مشترک سیکولر تہذیب کی نمائندگی زیادہ واضح شکل میں کرتی ہے۔ یہ ہندی کے مقابلہ میں ایک الگ آزاد اور مستقل زبان ہے جس کے پیچھے بہت سے لسانی، ادبی، تاریخی اور تہذیبی اسباب اور افکار ہیں جنھیں ایک بہت بڑی لسانی اقلیت کو کچلے اور درہم برہم کئے بغیر بدلا نہیں جا سکتا۔ یہی صورت اس کے رسم خط کی بھی ہو گئی ہے جو تقریباً آٹھ سو سال سے اس کے تحریری اظہار کا ذریعہ بنا ہوا ہے اور نفسیاتی طور پر اس زبان سے وابستہ ہو گیا ہے، جس کا وہ مظہر اور تحریری پیکر ہے۔ اس کی کشش، دائروں، نقطوں اور صوری علامتوں سے ذہن میں جو تصویریں بنتی ہیں ان کے پیچھے صدیوں کا ساحرانہ اور نفسیاتی عمل ہے اس لئے اب وہ زبان ہی کی طرح زندگی کا جز ہے۔

جیسا کہ کہا گیا رسم خط آوازوں کی علامت ہے اور علامت بھی اپنے تلازمۂ ذہنی کی وجہ سے وہی پیکر ذہن میں ابھارتی ہے جو اصل سے یا چیزوں کی تصویروں سے ابھر سکتا ہے۔ اس لئے ان علامتوں سے دست بردار ہو کر اردو کا پڑھنے والا کبھی آسانی سے وہ مانوس فضا حاصل نہ کر سکے گا جو اس وقت حاصل ہے اور نتیجہ انتشار کے سوا اور کچھ نہ ہو گا۔ کسی رسم خط سے مانوس نگاہیں ہر حرف اور ہر لفظ کو نہیں پڑھتیں بلکہ صرف اچٹتی سی نگاہ صفحات پر تصویروں اور خیالوں کے مرقع بناتی جاتی ہے جس سے علم کے علاوہ جمالیاتی آسودگی بھی حاصل ہوتی ہے۔ یہ سہولت دوسرے رسم خط سے حاصل نہیں کی جا سکتی تاوقتیکہ مشق و ممارست کی وجہ سے صدیوں میں ذہنی فضا بدل نہ جائے۔

تفصیلات اور غیر ضروری علمی اصطلاحات سے بچ کر میں نے جو خیالات پیش کئے ہیں ان سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مجھے یہ یقین ضرور ہے کہ اس سے رسم خط کے مسئلہ پر سوچنے کی نئی راہیں کھلیں گی۔ اگر گذشتہ صفحات میں پیش کئے ہوئے خیالات کا خلاصہ بیان کرنا ہو تو میں کچھ اس طرح کروں گا:

۱۔ جہاں تک زبان و ادب کے مستقبل کا سوال ہے ہمیں نہیں معلوم کہ

مستقبل بعید میں کیا ہوگا۔ ہمارے اخلاف کون سی زبان بولیں گے یا بولنا پسند کریں اور اس کا رسم خط کیا ہوگا، آج کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ کیا بولیں اور کس طرح لکھیں ہم انھیں اس کا پابند کسی قسم کی وصیت سے بھی نہیں بنا سکتے، یہ فیصلہ تاریخ کرے گی۔ اس لئے ہمارے سامنے زبان اور رسم خط کا جو مسئلہ ہے وہ آج کا اور مستقبل قریب کا ہے۔

۲۔ آج اردو بولنے والے نہ تو اپنی زبان سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں نہ اپنے رسم خط سے۔ انفرادی طور سے کوئی اپنے لئے کسی دوسری زبان یا رسم خط کا انتخاب کرلے تو یہ دوسری بات ہوگی۔

۳۔ اگر کچھ لوگ یہ چاہیں بھی کہ رسم خط میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے آسان بنا دیا جائے تو سوال یہ ہوگا کہ وہ اپنی بات عامۃ الناس سے کس طرح منوائیں گے؟ ملک کے تمام ذرائع طباعت واشاعت، تعلیم وتعلم پر کس اقتدار اعلیٰ کے ذریعہ تبدیلی کا حکم نافذ کیا جا سکے گا؟ دوسری بات یہ کہ تبدیلیوں کی حد کیا ہوگی، پرانی کتابیں کب اور کس طرح ترمیم شدہ رسم خط میں شائع ہوسکیں گی؟ درمیانی مدت میں قدیم سرمایہ کا مطالعہ کرنے کے لئے تو موجودہ رسم خط کا سیکھنا اور جاننا ضروری ہوگا۔ کیا ایسا ہوگا کہ کم پڑھے لکھے اور کاروباری لوگوں کے لئے ایک رسم خط ہوگا اور ادیبوں، عالموں اور محققوں کے لئے دوسرا جس میں کچھ تحریری علامتیں زیادہ یا کم ہوں گی؟

۴۔ یہی بات رومن اور دیوناگری رسم خط اختیار کرنے میں بھی ہے۔ زبردست آمرانہ جبر وقہر کے بغیر اسے نافذ نہیں کیا جا سکے گا اور اس سے بھی چند نسلوں کے بعد ہی مفید نتائج برآمد ہوسکیں گے۔ اس کے علاوہ قدیم کتابوں کے مطالعہ کے لئے اردو رسم خط کا سیکھنا پھر بھی ضروری ہوگا۔

۵۔ اردو رسم خط یقیناً صوتیاتی اعتبار سے ناقص اور لکھاوٹ کے اعتبار سے مشکل ہے (اس کی کئی خوبیوں سے انکار نہیں) لیکن دنیا میں اور بہت سے رسم خط ناقص اور مشکل تھے اور ہیں اور انھیں کے استعمال کرنے والوں میں افلاطون اور ارسطو، چاسر اور شیکسپیئر، کونگ فوزی اور لاؤتسے، فردوسی اور مولانا روم پیدا ہوئے۔ خود اردو رسم خط کے ناقص یا مشکل ہونے کی شکایت ولی، میر، غالب، انیس نے نہیں کی۔ اس لئے جسے اردو زبان کو علمی حیثیت سے استعمال کرنا ہوگا وہ اس کا رسم خط بھی سیکھ لے گا۔ غیر ملکی عالم تو جب سیکھنے پر آتے ہیں تو، ہندوستان کی راگ راگنیوں اور مذہبی اساطیر اور رمزیات سے بھی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں اور مردہ زبانوں کے رسم خط پڑھ لیتے ہیں، اگر وہ چاہیں گے تو اس رسم خط کا سیکھ لینا ان کے لئے مشکل نہ ہوگا۔

۶۔ طباعت اور اشاعت کے لئے جدید عہد کی سائنسی آسانیاں فراہم ہو جائیں تو کیا کہنا ہے لیکن آج جب نصاب کے علاوہ اچھی سے اچھی کتاب کا پانچ سو اور ہزار نسخوں کا ایڈیشن برسوں میں فروخت ہوتا ہے تو پریشانی کیا ہے اور جلدی کس بات کی ہے! پاکستان کے اردو اخبارات تو ہندوستان کے اخباروں سے زیادہ تعداد میں چھپتے ہیں، وقت پر اور خاصے اچھے چھپتے ہیں۔ بہر حال جب زیادہ چھپنے کی ضرورت ہوگی تو ذہن اس کی سہولتیں پیدا کرلے گا۔

۷۔ اس موضوع پر جو لوگ اظہار خیال کر رہے ہیں انھیں اس کا موقع ملنا چاہئے۔ ان کی نیت پر شک کرنا مناسب نہیں، اس کے پیچھے کوئی سازش دیکھنا بھی تنگ نظری ہے۔ کوئی کتنا ہی اہم اور بڑا ادیب کیوں نہ ہو اس مسئلہ پر مضمون لکھ کر تبدیلیاں نہیں لا سکتا، اظہار خیال کر سکتا ہے اس لئے مضامین سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے، بحث مباحثہ سے ذہن صاف ہوں گے اور آنے والی نسلوں کے لئے بھی غور وفکر کا سرمایہ بہم پہنچے گا۔

۸۔ اگر اردو ادب کا کچھ حصہ دیوناگری رسم خط میں چھپتا ہے اور اس سے اردو کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوتا ہے یا اردو کا پیام اس کے حلقہ کے باہر پہنچتا ہے یا اردو لکھنے والوں کو مادی منفعت حاصل ہوتی ہے تو اس کی مخالفت کرنا غلط ہوگا۔ ہمیں اردو رسم خط کو چھوڑ کر ہندی رسم خط اختیار کرنے اور ہندی رسم خط میں اردو کی کتابیں شائع کرنے میں فرق کرنا چاہئے۔ ☆☆☆

"اردو چینل"
شمس الرحمٰن فاروقی نمبر
مدیر قمر صدیقی
قیمت : ۱۰۰ روپئے
شب خون کتاب گھر، الہ آباد

کلیات
احمد مشتاق
قیمت : ۲۵۰ روپئے
شب خون کتاب گھر، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

یہی تو وقت ہے سورج ترے نکلنے کا
(۲۲ کہانیاں)
رضا جعفری
قیمت : ۴۰ روپئے
دانش محل بک سیلرز، امین الدولہ پارک، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

اردو رسم الخط
(مسائل و مباحث کی روشنی میں)

فرمان فتحپوری

ماخوذ "اردو املا اور رسم الخط۔ اصول و مسائل"
سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۷۷

اردو رسم الخط میں اصلاح و ترمیم کرنے کے یا اسے سرے سے بدل دینے کی کوششوں کا سلسلہ انگریزوں کے سیاسی استحکام کے بعد سیاسی اغراض کے تحت شروع ہوتا ہے۔ پہلے انگریزوں کی شہ پر متعصب ہندوؤں کی طرف سے اس پر اعتراضات اٹھائے گئے بعد ازاں اس کے معترضین میں بعض ایسے حضرات بھی دانستہ یا نادانستہ شامل ہو گئے جو خود کو اردو کا دوست کہتے ہیں۔ پہلی صورت، اردو کے حق میں کچھ ایسی مہلک و مضر نہ تھی اس لئے کہ اردو خواں طبقے کے نزدیک ان کے اعتراضات سیاسی اغراض و تعصبات پر مبنی تھے۔ لیکن جب اردو رسم الخط کو اردو ہی کے بعض ادیبوں اور ناقدوں کی طرف سے تنقیص و تنقید کا نشانہ بنایا گیا تو اردو رسم الخط کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو گئی اور وہ عام و خاص میں ایک طرح کا موضوع بحث بن گیا اور اس بحث نے اگرچہ اردو کو کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچایا لیکن اس کی ترقی ورمقبولیت کی راہ میں ایک طرح کی رکاوٹ ضرور ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کا اس کے پورے پس منظر میں تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔

ہمارے یہاں انگریزوں کے اشارے پر اردو رسم الخط کو ناقص ٹھہرانے کا سلسلہ دراصل فورٹ ولیم کالج میں اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ للو لال جی کی "پریم ساگر" نامی کتاب اردو رسم الخط کی بجائے ناگری یعنی ہندی رسم الخط میں شائع کی گئی۔ یہ ناگری رسم الخط میں ہندی کی پہلی کتاب تھی۔ بعد کو بنگال، بہار، یوپی اور پنجاب کے ہندوؤں نے انگریزوں کی لسانی حکمت عملی کے تحت اردو کے رسم الخط کو ناگری میں تبدیل کر دینے کی منظم تحریک کا آغاز کر دیا، جس نے صرف یہی نہیں کہ ہندی اردو کے جھگڑے کو جنم دیا بلکہ مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنے ملی تشخص اور ثقافتی تحفظ کے لئے پاکستان کے نام سے اپنے لئے ایک الگ مملکت کا مطالبہ کریں۔ ابتدا میں ہندوؤں کا مطالبہ صرف اس قدر تھا کہ اردو رسم الخط فارسی کے بجائے ناگری کر دیا جائے۔ اس میں بھی ان کی غرض مندانہ دور اندیشی اور دانائی کو بڑا دخل تھا۔ وہ جانتے تھے کہ رسم الخط اور زبان میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور جیسے ہی اردو کے رسم لخط میں ترمیم و تنسیخ ہوئی یا اسے فوری سے ناگری میں بدلا گیا اردو خود بہ خود کچھ دنوں میں ختم ہو جائے گی اور ہندی ابھر کر سامنے آجائے گی۔ بات یہ ہے کہ ہندی، کوئی الگ سے زبان نہ تھی اس کا نحوی ڈھانچہ اور قواعد کے اصول وہی ہیں جو اردو کے۔ البتہ سنسکرت الفاظ کے بکثرت استعمال سے یہ ہندی بن جاتی تھی۔ ہندوؤں کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا، چنانچہ پہلے انھوں نے اردو کو ناگری رسم الخط میں لکھنے کا مطالبہ کیا۔ پھر، اس میں سے عربی و فارسی کے الفاظ نکال کر، سنسکرت الفاظ داخل کر دیئے اور اسے ہندی کا نام دے دیا حتیٰ کہ ۱۸۹۸ میں اردو کے خلاف جو طویل عرضداشت ہندوؤں کی طرف سے، لفٹننٹ گورنر میکڈانل کو دی گئی اس میں بھی صرف 'ناگری' کو رائج کرنے کی گذارش کی گئی تھی۔ چنانچہ میکڈانل صاحب جو کہ اردو کے جانی دشمن اور ہندی کے طرف داروں میں تھے خود بھی ابتداءً یہی کہتے تھے کہ اردو کو ختم کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف اردو کے رسم الخط کو ناگری میں بدل کر اسے آسان بنانا ہے[1] میکڈانل اچھی طرح جانتے تھے کہ کسی زبان کے لئے جو رسم الخط صدیوں تک استعمال میں رہتا ہے اس میں اور اس زبان میں طرح طرح کے بڑے گہرے اور دور رس تعلقات قائم ہو جاتے ہیں اور وہ زبان کے رگ و ریشہ سب میں اس طرح بندھ جاتا ہے کہ رسم الخط کو بدل دینے سے زبان کی صورت کے ساتھ اس کی روح کا بدل جانا بھی لازمی امر ہے۔ یہی حال اس قوم کا ہے جو اپنی زبان کے لئے ایک رسم الخط رکھتی ہے اگر اس رسم الخط کو مطلقاً بدل دیا جائے تو وہ قوم اپنے ماضی، روایات، ادب، ثقافت، علوم، فنون سب سے بے گانہ ہو جائے گی گویا صدیوں کی ترقی کے بعد وہ پھر اپنے بچپن کی جانب لوٹے گی اور اس طرح اسے ایک ایسے عظیم خسارے سے واسطہ ہو گا جس کی کسی طرح تلافی نہیں کی جا سکتی۔[2]

چنانچہ ہندوؤں نے خاص اسی غرض سے کہ "ناگری" کے استعمال سے نہ صرف اردو بلکہ مسلمانوں کے سارے ثقافتی و تہذیبی سرمائے کا رفتہ رفتہ خاتمہ ہو جائے گا۔ ہندی زبان سے پہلے ناگری رسم الخط کو جاری کرنے پر زور دیا۔ ہندی کے بعض حامیوں نے ہی ۱۸۵۷ کے فوراً بعد ہی یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا تھا کہ

---

[1] مضامین سلیم، جلد اول، ص ۱۶۴، مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۶۱

[2] خیابان (خاص نمبر) ص ۷۰، مطبوعہ شعبۂ اردو، پشاور یونیورسٹی، دسمبر ۱۹۶۴

ناگری رسم الخط، فارسی رسم الخط سے بہتر ہے اور اس کا رواج مروجہ فارسی خط سے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ ہندی کے سرگرم حامی راجندر لال متل نے ۱۸۶۴ میں کہا تھا کہ ہندوستانی زبان سچ پوچھو تو دو رسوم خط میں لکھی جاتی ہے، ناگری اور فارسی، فرق یہ بتاتا ہے کہ فارسی رسم الخط، مسلمانوں کی ہندوستانی (اردو) اور ناگری رسم الخط، ہندوؤں کی ہندوستانی (اردو) کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ گارسان دتاسی نے ۱۸۶۵ کے خطبے میں اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو کو ناگری رسم الخط میں لکھنے سے عربی و فارسی الفاظ کو پڑھنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہو جائے گا جتنا کہ سنسکرت الفاظ کو فارسی رسم الخط میں۔ [۱]

اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے سلسلے میں ناگری ہی نہیں رومن یا لاطینی رسم الخط کو بھی زیر بحث لایا گیا، گارسان دتاسی کے مذکورہ بالا خطبے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے جس سال راجندر لال متل نے ناگری کو رائج کرنے کے سلسلے میں مضمون لکھا اسی سال ایک مستشرق ماہر لسانیات نے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے رسالے میں اردو کو رومن میں لکھنے کا مشورہ دیا، دلیل یہ دی کہ "اردو کا کوئی اپنا مخصوص رسم الخط نہیں ہے۔ فارسی رسم الخط ہندی نژاد نہیں ہے اور دیوناگری رسم الخط میں جو ہندوؤں میں بالعموم مروج ہے یہ صلاحیت نہیں کہ اس زبان کے فارسی عناصر کا بخوبی احاطہ کر سکے۔ گارسان دتاسی نے اس کے جواب میں لکھا کہ اردو کو لاطینی خط میں لکھنا مفید نہ ہوگا اس واسطے کہ لاطینی حروف کے ساتھ مزید ایسے حروف کی ضرورت ہوگی جن پر مخصوص علامتیں لگی ہوں گی۔ یہ ایک نیا نظام ہجی ہوگا۔ اور ان کا سکھانا ہندی کے حروف ہجی سے بھی زیادہ دشوار ہوگا۔ [۲]

گارسان دتاسی نے اور بھی کئی خطبوں میں، زور دے کر کہا ہے کہ زبان اور رسم الخط ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہوتے ہیں اس لئے اردو کے رسم الخط کو ناگری یا رومن میں بدلنا اس کے حق میں تباہ کن ثابت ہوگا۔ اپنی مشہور "تاریخ ادب ہندوستانی" کے مقدمے میں بھی اس نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "گذشتہ کئی برسوں سے ہندوستان میں وہی رجحان پیدا ہو گیا ہے جو یورپ میں قومیت کے نام پر پیدا ہوا تھا۔ ہندوؤں نے اردو پر حملے شروع کر دیئے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ملک کی زبان اردو نہیں ہندی ہے لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اردو ایک دلکش ادبی سرمایہ رکھتی ہے اس کے برعکس ہندی کا ادبی حیثیت سے عدم و وجود برابر ہے۔ یہ مسئلہ ادبی نوعیت کا ہے جیسے فرانس میں تنگ نظر قوم پرستوں نے صوبائی بولیوں کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش میں اٹھایا تھا۔ اسی طرح ہندو اردو رسم الخط کے مخالف ہیں اور دیوناگری کو ترجیح دیتے ہیں لیکن ایسا کرنا آنکھ سے اندھے ہونے کے مترادف ہے۔ بہر حال مسلمانوں نے حوصلہ مندی سے ان کے حملوں کا مقابلہ کیا اور ایسی دلیلیں پیش کیں کہ میرے نقطہ نظر سے وہ کامیاب رہے۔ یہ اختلاف دراصل نسل و مذہب کے

---

[۱] خطبات گارسان دتاسی حصہ دوم، ص ۲۲

[۲] خطبات گارسان دتاسی، حصہ دوم، ص ۲۳

اختلاف سے پیدا ہوا ہے۔ کون جانے کہ انگریزی حکومت رومن حروف تہجی کو رواج دے کر اس اختلافی مسئلے کو ختم کر دے گی یا باقی رکھے گی لیکن اگر ایسا ہوا تو یہ علمی و ادبی حیثیت سے ایک افسوس ناک واقعہ ہوگا۔ [۱]

غرض کہ اردو کے لئے فارسی خط کے بجائے ناگری یا رومن رسم الخط کی تجویزیں بہت پرانی ہیں۔ ان تجویزوں پر بحث کا سلسلہ سیاسی، علمی اور ثقافتی ہر سطح پر ایک مدت سے جاری ہے۔ انیسویں صدی تک یہ بحث عموماً انفرادی حیثیت کی تھی۔ یا زیادہ سے زیادہ علمی و ادبی انجمنوں کی نمائندگی تک محدود تھی۔ لیکن بیسویں صدی میں ہندو مسلم سیاست کا ایک جز بن گئی اور علمی و ادبی شخصیتوں کے ساتھ اس بحث میں سیاسی مفکرین اور قومی رہنما بھی شریک ہو گئے۔ دھواں دھار تقریریں ہوئیں، مقالات لکھے گئے۔ اخبارات میں اداریے اور کالم چھپے۔ علمی و ادبی اور تعلیمی و سماجی انجمنوں نے قرار دادیں منظور کیں۔ سیاسی جماعتوں کے درمیان مشترکہ قومی زبان اور مشترکہ رسم الخط کی تلاش میں مذاکرات ہوئے لیکن یہ ساری چیزیں عموماً بے نتیجہ ثابت ہوئیں اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ اس لئے کہ ایک زبان کے متعلق رسم الخط کو خارج کر کے اس پر کسی دوسری زبان کے رسم الخط کو منطبق کرنے یا مروجہ رسم الخط کو پنچایت یا حکم احکام کے ذریعے شعوری طور پر آسان بنانے کا عمل ایک غیر فطری عمل تھا۔ زبان چھوٹی ہو یا بڑی، رسم الخط اس کا جزو بنیادی ہوتا ہے۔ نہ تو رسم الخط کو زبان سے جدا کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی زبان بغیر اپنے مخصوص رسم الخط کے بہت دنوں تک زندہ رہ سکتی ہے۔ ان کا باہم تعلق جسم و جان کی طرح ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں کہ:

"یوں تو روح کے لئے ہر جسم برابر ہے کوئی بھی ہو جسم اگر صالح، توانا اور کامل ہے تو روح کو ترقی کرنے اور اندرونی توانائی حاصل کرنے کی بڑی آسانیاں ہیں۔ زبان کو بھی رسم الخط چاہئے، وہ رسم الخط کی محتاج ہے اور رسم الخط کی صلاحیت اور کاملیت کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے۔ ایک اور مثال درخت و زمین کی ہے۔ درخت کو زبان سمجھئے اور زمین کو رسم الخط۔ درخت ایک خاص قطعہ زمین سے متعلق ہوتا ہے، جس میں اس کی جڑیں پیوست ہوتی ہیں۔ درخت کی نشو و نما میں ایک قطعہ زمین کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ رسم الخط کو زبان کی نشو و نما میں تو کوئی دخل نہیں لیکن وہ زبان کے مزاج اس کی گوناگوں تبدیلیوں اور ارتقائی منزلوں کا حامل ہوتا ہے۔ رسم الخط زبان کا آئینہ ہے، جس میں اس کے خط و خال نظر آتے ہیں۔ اس کی زندگی کا مقیاس ہے، ایک کتاب ہے، جس میں زبان کی پوری تاریخ لکھی ہوتی ہے۔

درخت، جو زمین جڑ پکڑ چکا ہے آسانی کے ساتھ اکھاڑا نہیں جا سکتا ہے اور اگر کسی تختہ زمین سے اکھاڑ کر دوسری جگہ اس کو جما دیا جائے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ درخت خشک ہو جاتا ہے۔ اور اگر دوسری جگہ جم بھی جاتا ہے تو اچھے پھل نہیں دیتا۔ یہ اثر اس زمین سے الگ کرنے کا ہوتا ہے جہاں وہ عرصے سے لگا ہوا تھا۔ یہ تو ایک مثال ہے۔

---

[۱] مقدمہ تاریخ ادب ہندوستانی، (اردو ترجمہ قلمی) ص ۴

کسی زبان کے قدیم رسم الخط کو ترک کرنا، اور اس کی جگہ کوئی دوسرا خط اختیار کرنا ایک فطری عمل ہے اس میں زمین کا مزاج بدل جاتا ہے۔ اس کی تاریخ مٹ جاتی ہے۔ لفظ بے جان ہوجاتے ہیں۔ اور زبان میں وہ اثر اور جادو نہیں رہتا جو جگر پینے پر اس نے حاصل کیا تھا۔[1]

بایں ہمہ اس غیر فطری عمل کو بعض حضرات برصغیر کی تقسیم کے بعد بھی ہندوستان و پاکستان میں آزمانے کی کوششیں کرتے رہے گرچہ کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ پروفیسر سید احتشام حسین نے یہ عنوان "زبان اور رسم الخط کا تعلق" میں اس بات کا اظہار کیا کہ:

"یہ بات طے شدہ ہے کہ زبان پہلے پیدا ہوئی، اور اس کا رسم خط بعد میں۔ میں اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ زبان اور رسم الخط میں کوئی باطنی تعلق نہیں ہے بلکہ رسمی ہے۔ پھر جو یہ خیال بار بار دہرایا جاتا ہے کہ کسی زبان کا رسم الخط بدلا گیا تو وہ زبان بھی ختم ہوجائے گی۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

اگر یہ بات طے ہوجائے کہ زبان اور رسم الخط الگ الگ نہیں اور کوئی زبان کسی رسم الخط میں لکھی جاسکتی ہے تو پھر اردو کے لئے دیوناگری، لاطینی اور فارسی رسم الخط میں سے کسی ایک کے منتخب کرنے کا سوال دوسری نوعیت اختیار کر لے گا۔ فطرت، مزاج اور نفسیات کے نام پر بہت سے علمی مغالطے تیار کئے گئے ہیں انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر رسم الخط بدل دیا جائے گا تو زبان بدل جائے گی یا خراب ہوجائے گی۔[2]

پروفیسر سید احتشام حسین نے رسم الخط تبدیلی کے سلسلے میں جو دلائل دیئے تھے اول تو وہ بہت کمزور تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ خود بھی رسم الخط اور زبان کے گہرے رشتے سے خوب واقف تھے اور انھوں نے انجان بن کر اس موضوع کو محض بحث ومباحثے کے لئے چھیڑا تھا۔ اس لئے جیسے ہی ان کے مضمون کے جواب میں علامہ نیاز فتحپوری اور دوسرے ادیبوں نے قلم اٹھالیا وہ اپنے موقف سے دست بردار ہوگئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بہت پرانے مسئلے کو ایک نئے شوشے کے طور پر چھوڑا اور اردو املا کو آسان بنانے کی غرض سے بعض آوازوں کو اردو کے حروف تہجی سے خارج کرنے کی تجویز پیش کی۔[3] اس کے رد میں بھی بہت کچھ لکھا جاچکا تھا۔ پھر بھی کئی مضامین لکھے گئے۔ ہر طرف سے مخالفت ہوئی۔ مولانا حامد حسن قادری نے لکھا۔

"میرے نزدیک اردو کو آسان کرنے کی یہ تجویز نہایت خرابی کا باعث ہے۔ جب تک ہند و پاک میں مسلمان ہیں اسلامی کلچر سے بے نیاز نہیں رہ سکتے اور کلچر کے اجزائے ترکیب واستحکام وترقی میں عربی، فارسی، اردو تینوں زبانیں شامل ہیں۔ اس لئے یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ صدہا لفظ جو تینوں زبانوں میں مستعمل ہیں، عربی و فارسی میں صحیح لکھے جائیں اور اردو میں ث، ز، ض، ظ وغیرہ بدل کر لکھے جائیں۔"[4]

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے لکھا "زبان وہ چیز نہیں کہ حاکم حکم کردے اور دوسرے ہی دن نیا آسمان نئی زمین بن جائے۔ یہ ان چیزوں میں ہے کہ ع

نہ بزورے نہ بزاری نہ بزری آمد[5]

پاکستان کے سابق صدر محمد ایوب خان کے اقتدار میں آنے کے بعد ۱۹۵۸ میں رسم الخط کا مسئلہ پھر شد ومد کے ساتھ اٹھایا گیا۔ وہی سو سال پرانی تجویز جس کا مقصد فارسی رسم خط کو رومن خط سے بدلنا تھا۔ اور جس کی مخالفت گارساں دتاسی نے ۱۸۶۵ کے خطبے میں کی تھی، سامنے لائی گئی۔ اخبارات ورسائل کے ذریعے دوسروں کی رائیں طلب کی گئیں۔ کراچی کے اخبار جنگ نے اس پر رائے شماری کا سلسلہ شروع کیا۔ نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہئے تھا۔ یعنی چند ایک کے سوا عام وخاص سب نے اردو کو رومن رسم الخط میں لکھنے کی تجویز کو رد کردیا۔

ان مباحث سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اردو رسم الخط دو چار سال نہیں پورے ڈیڑھ سو سال معرض بحث میں رہا ہے اور آج بھی اس کے خلاف، بعض گوشوں سے آوازیں سننے میں آجاتی ہیں۔ اس آواز کے خلاف سیکڑوں مدلل و مضبوط مضامین اردو کے مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے خطبات اور گارساں دتاسی کے مقالات وخطبات میں تو مخالفین کی آرا کے ساتھ رسم الخط کا مسئلہ جگہ جگہ زیر بحث آیا ہے۔ انجمن ترقی اردو کے ترجمان، قومی زبان، میں اس موضوع سے متعلق کم وبیش وہ ساری بحثیں موجود ہیں جو کانگریس اور مسلم لیگ کے موقف کے طور پر موضوع سخن رہیں۔

زبان وادب کے بہت سے عالموں نے اس طرف خاص توجہ کی اور اردو رسم الخط کی مدافعت میں نہایت کارآمد مضامین لکھے۔ پروفیسر مسعود حسین رضوی، علامہ نیاز فتحپوری، ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی، پروفیسر معین الدین دردائی، سید عبدالقدوس ہاشمی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور بعض دوسروں نے صرف یہی نہیں ناگری، رومن اور اردو رسم الخط کی بحث میں ساری نئی پرانی دلیلوں کو سمیٹ لیا، بلکہ بعض نئے دلائل کا اضافہ بھی کیا، لیکن اس طویل داستان اور تکرار بے جا سے پر بحث کو اس کے جملہ حوالوں اور تفصیلات کے ساتھ اس جگہ دہرانا ممکن نہیں۔ البتہ رسم الخط کے موضوع کا ایک جائزہ اس جگہ پیش کیا جارہا ہے۔ جسے اس موضوع سے متعلق سارے مباحث کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں۔

رسم الخط سے مراد وہ نقوش وعلامات ہیں جنھیں حروف کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جن کی مدد سے کسی زبان کی تحریری صورت متعین ہوتی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زبان کی تحریری صورت کا نام رسم الخط ہے۔ زبان خود کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں اس جگہ مختصراً کہنا کافی ہے کہ زبان نام ہے

---

۱ نگار، (لکھنؤ) بابت اگست ۱۹۵۱، ص ۳۱

۲ نگار (لکھنؤ)، بابت جون ۱۹۵۱، ص ۳۵ تا ۳۸

۳ خاور (ڈھاکہ) بابت مئی ۱۹۵۲، ص ۳۹ تا ۴۲

۴ خاور (ڈھاکہ) بابت جولائی ۱۹۵۲، ص ۳۰

۵ خاور (ڈھاکہ) بابت جولائی ۱۹۵۲، ص ۳۰

مجموعہ الفاظ کا۔ الفاظ مرکب ہیں اصوات سے اور اصوات نام ہے ان تصاویر، خطوط اور نشانات کا جو ارتقا کی منزلیں طے کر کے آج حروف کے نام سے ہمارے سامنے ہیں۔ یہی حروف جو تلفظ کے ادا اور معنی کے اظہار کے لئے استعمال ہوتے ہیں، اپنی مربوط صورت میں کسی زبان کا رسم الخط کہلاتے ہیں۔

زبان کی طرح رسم الخط کے وجود میں آنے کے بھی اسباب ہیں۔ زبان کی ابتدائی منزلوں میں جب کوئی آواز کسی کی زبان سے نکلی ہوگی تو آواز دینے والے نے مخاطب پر اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے اصل چیز دکھائی ہوگی یا پھر جس چیز کی طرف توجہ دلانی مقصود رہی ہوگی اس کی نشان دہی کے لئے کوئی تصویر، نقش یا علامت بنا دی ہوگی، ٹھوس چیزوں کے سلسلے میں نقوش وعلامات یا تصاویر سے بڑی مدد ملی ہوگی۔ لیکن جذبات وکوائف کو سمجھنے سمجھانے میں خاصی دشواری پیش آئی ہوگی، اس لئے کہ جذبات وکوائف کا تعلق عالم خارجی سے نہیں عالم محسوسات سے ہے۔ پھر بھی آج جب کہ ہر قسم کے اظہار خیال کے لئے رسم الخط ہی سے کام لیا جارہا ہے یہ کہنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ انسان نے بہت جلد جذبات و محسوسات کے لئے بھی علامتیں وضع کرلی تھیں۔ یہی علامتیں ہزاروں سال کی مسافتیں طے کر کے حروف کے نام سے موسوم ہوئیں اور آج انھیں کا دوسرا نام رسم الخط ہے۔ زبان اور رسم الخط دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ رسم الخط کو کسی زبان کا محض لباس سمجھنا غلطی ہے۔ لباس کو اتار کر پھینکا جاسکتا ہے، بدلا جاسکتا ہے۔ رسم الخط زبان کا لباس نہیں بلکہ اس کی جلد کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اسے زبان سے الگ کرنے کا نتیجہ زبان کی تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہ خیال گمراہ کن ہے کہ کسی زبان کو دوسری زبان کے رسم الخط میں پوری صحت کے ساتھ لکھا جاسکتا ہے یا اور زبان کے مطالب کسی دوسری زبان کے رسم الخط میں من و عن ظاہر کئے جاسکتے ہیں اگر یہ ممکن ہوتا تو ہر زبان کے لئے ایک جداگانہ رسم الخط کی ضرورت نہ ہوتی۔ ساری زبانیں ایک ہی قسم کے حروف یا رسم الخط سے اپنا کام چلا لیتیں۔ لیکن ایسا ممکن نہیں مثال کے طور پر مندرجہ ذیل الفاظ دیکھئے۔

(1) Head, (2) Hid, (3) Hell, (4) Hill

اگر انھیں اردو میں لکھا جائے تو ''ہڈ'' اور ''ہل'' کے سوا کسی اور طرح لکھنا ممکن نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ مجبوری ادائے تلفظ میں حارج ہوگی۔ مثلاً ذیل کے الفاظ دیکھئے:

(1) Eye, I

(2) Hear, Heir

(3) Birth,

(4) Hole, Whole

(5) Die, Dye

(6) Foul, Fowl

(7) Lose, Loose

(8) Lawyer, Liar

(9) For, Far

(10) See, Sea

(11) Sun, Son

انھیں اردو میں علی الترتیب آئی، ہیر، برتھ، ہول، ڈائی، فاؤل، لوز، لائر، فار، سی اور سن لکھا جائے گا۔ اور یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ انگریزی کا کون سا لفظ اس جگہ مراد ہے۔ انگریزی میں ہم تلفظ الفاظ ایک دو نہیں ہزاروں ہیں۔ اس لئے وہ اردو رسم الخط میں معنوی الجھن پیدا کریں گے۔ ایک مثال اور دیکھئے:

Main, Mean, Man

میں سے انگریزی میں ہر ایک اپنا جدا تلفظ اور معنی رکھتا ہے لیکن اردو رسم الخط میں یہ سب ''مین'' کی صورت میں لکھے جائیں گے۔ اور ان کے تلفظ اور معنی تک پہنچنا دشوار ہوگا۔ بعض انگریزی الفاظ تو ایسے ہیں کہ انھیں کسی طرح اردو میں لکھا ہی نہیں جاسکتا۔ مثلاً:

Sure, Cure, Pure

اردو میں پیور، کیور، شیور کی شکل میں لکھے جائیں گے اور اپنا تلفظ یکسر کھو بیٹھیں گے۔ انگریزی کے Catch, Badge, and Batch کی صورت میں اردو میں ترتیب وار کیچ، بیج اور بیچ ہو جائیں گے اور یہ اردو کے بامعنی لفظ بن جائیں گے۔

انگریزی میں حروف علت (Vovel) یعنی a, e, i ,o اور u کی آوازیں اکثر الفاظ میں ایک سی ہوجاتی ہیں۔ مثلاً Ought, Early, All اور Ugly وغیرہ ظاہر ہے کہ انھیں اردو رسم الخط میں الف یا ع سے لکھا جائے گا۔ اور تلفظ و معنی دونوں کے سمجھنے میں دقت ہوگی۔ اس جگہ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ انگریزی میں حروف تہجی یا آوازیں صرف ۲۶ ہیں۔ اس کے برعکس اردو میں حروف یا آوازوں کی تعداد تقریباً دوگنی ہے۔ بایں ہمہ اردو رسم الخط میں انگریزی کا لکھنا ممکن نہیں ہے۔ عربی اور فارسی رسم الخط میں انگریزی لکھنے کی کوشش کی جائے تو اور زیادہ دشواریاں پیش آئیں گی۔ وجہ یہ ہے کہ انگریزی کے D اور T کی آوازیں پیدا کرنا عربی اور فارسی حروف کے ذریعے ممکن ہی نہیں۔ اس قسم کی دشواریاں اردو کو انگریزی حروف میں لکھنے سے پیدا ہوں گی۔ اردو میں حروف تہجی یعنی آوازوں کی تعداد کثیر ہے۔ ظاہر ہے کہ انگریزی کے ۲۶ حروف ان کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اردو کی بہت سی آوازیں ایسی ہیں جو انگریزی یا رومن رسم الخط میں موجود نہیں مثلاً۔

د، ڑ، ٹ، ط، ع، غ، خ وغیرہ کی آوازوں کو لیجئے۔ اور دل، پہاڑ، تمام، طالب، وسیع، غریب، خدا، کو انگریزی میں لکھئے تو بالترتیب ان کی صورتیں ہوں گی۔

Khuda, Gharib, Wasi, Talib, Tamam, Pahar, Dil

یعنی دل کو ڈل، پہاڑ کو پہار، تمام کو ٹمام، طالب کو ٹالب، وسیع کو وسی، غریب کو گریب اور خدا کو کھدا لکھا جائے گا۔ اس سے تلفظ و معنی دونوں بری طرح مجروح ہوں گے۔ د،

غ اور خ کی آوازیں تو رومن میں کسی طرح پیدا ہی نہیں کی جاسکتی ہیں اگر That کی مثال دے کر یہ کہا جائے کہ ذ کی آواز Th سے غ کی آواز Gh سے اور خ کی آواز Kh سے پیدا کرلی جائیں گی۔ تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ دھ، گھ، کھ وغیرہ کی آوازیں کہاں سے آئیں گی؟ چنانچہ اگر مندرجہ ذیل الفاظ انگریزی میں لکھے جائیں۔

غل، گھل، دم، تھم، خر، کھر وغیرہ

تو ان کی صورتیں یہ بنیں گی اور اوپر کے لفظوں میں سے صرف ایک ہی سمجھا جائے گا۔

Khar, Tham, Ghul

ایسی مشکلات ا، ع، ح اور ہ، ث، س، ص اور دوسرے مشابہ الصوت حروف کی آوازوں میں پیش آئیں گی اور ان کے ذریعے تلفظ و معنی کا اخذ کرنا ناممکن ہوگا۔

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ ہر زبان کا رسم الخط اس کے اپنے مزاج اور ساخت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ اسی میں صحیح طور پر پڑھی جاسکتی ہے اور اسی میں لکھی جاسکتی ہے، کسی دوسری زبان کے رسم الخط میں منتقل کرنے سے اس کی صورت اس قدر مسخ ہوجائے گی کہ پہچاننا مشکل ہوجائے گا۔ اسی لئے رسم الخط کو زبان کا لباس نہیں جلد کہا جاتا ہے۔ جلد اتار دینے سے زبان اصل صورت میں باقی نہیں رہ سکتی۔ رہ گیا یہ سوال کہ اردو کا رسم الخط کس قسم کا ہے اور اس میں کیا خامیاں اور خوبیاں ہیں سو اس سلسلہ میں یہ بتانا ضروری ہے کہ کسی زبان کے رسم الخط کی اچھائیوں اور برائیوں کو دو طریقوں سے پرکھا جاسکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ کس حد تک مفید اور آسان ہے اور دوسری یہ کہ دیکھنے میں کتنا خوبصورت ہے۔ اوپر بتایا جاچکا ہے کہ ہر زبان کے نظام ہجی میں اتنے ہی حروف یا نشانات ہوتے ہیں جتنی اس کے بولنے میں آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان حروف کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ وہ ساری آوازوں کو آسانی اور خوبصورتی کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے لے آئیں۔ اس لحاظ سے اردو کا رسم الخط بہت جامع اور کامیاب رسم الخط ہے کہ وہ اس زبان کی ساری مروج آوازوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

اردو رسم الخط میں حروف تہجی یعنی ا، ب، ت، ٹ، ث، وغیرہ کی تعداد ۵۰ ہے۔ انگریزی میں صرف ۲۶ ہیں، ہندی میں یا ناگری رسم الخط میں ان کی تعداد ۴۲ ہے، عربی میں ۲۹ اور فارسی میں ۳۳ ہے۔ یہ حروف چونکہ ان زبانوں میں استعمال ہونے والی آوازوں کی تعداد کا تعین کرتے ہیں اس لئے آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان میں آوازوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو علاقائی اور بین الملکی مزاج کی زبان ہے۔ اس نے اپنے نظام ہجی میں عربی، فارسی اور ہندی یعنی آریائی اور سامی دونوں خاندانوں کی زبانوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس میں انگریزی سے لے کر علاقائی زبانوں تک کی ساری زبانیں اس طرح سما گئی ہیں کہ وہ دنیا کی تقریباً ہر زبان کا مجموعہ بن گئی ہے۔ ہر اردو جاننے والا عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی کو ان کے حقیقی تلفظ کے ساتھ بول سکتا ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ایک آواز بھی ایسی نہیں جو اردو میں موجود نہ ہو یا جس کو ادا کرنے پر اردو داں طبقہ قادر نہ ہو۔ گویا جس طرح اردو اپنے ذخیرۂ الفاظ اور صرف و نحو کے اصول کے لحاظ سے ایک مخلوط زبان ہے اسی طرح اس کا رسم الخط بھی مخلوط ہے۔ وہ دائیں سے بائیں کو لکھی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ عربی و فارسی رسم الخط سے بہت قریب ہے لیکن اردو کے رسم الخط کو عربی یا فارسی کا رسم الخط خیال کرنا درست نہ ہوگا۔ اردو کے حروف تہجی میں ہندی اور انگریزی کی ایسی آوازیں بھی شامل ہیں جو عربی فارسی میں نہیں ہیں۔ ان آوازوں کی تعداد ایک دو نہیں خاصی ہے مثلاً

ڈ، ٹ، ڑ، بھ، تھ، ٹھ، کھ، جھ، دھ، ڈھ، وغیرہ کی آوازیں نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں۔ ظاہر ہے کہ عربی و فارسی داں حضرات کو ان آوازوں کے نکالنے اور ہندی یا انگریزی کو صحیح تلفظ کے ساتھ لکھنے پڑھنے میں سخت مشکل ہوگی۔ لیکن اردو داں افراد کو کسی زبان کے سیکھنے یا اسے لکھنے پڑھنے میں بہت آسانی رہے گی۔ نتیجتاً کہنا پڑتا ہے کہ اردو کا رسم الخط بہت وسیع ہے اور اس کی وسعت ساری زبانوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

سر ولیم جونز نے کہا تھا کہ :

"مکمل زبان وہ ہے جس میں ہر وہ خیال جو انسانی دماغ میں آسکتا ہے۔ نہایت صفائی اور زور کے ساتھ ایک مخصوص لفظ کے ذریعے ظاہر کیا جاسکے۔ خیالات اگر سادہ ہوں تو الفاظ بھی سادہ، اور اگر خیالات مشکل ہوں تو وہ بھی مشکل، اس طرح مکمل رسم الخط وہ ہے جس میں اس زبان کی ہر آواز کے لئے ایک مخصوص نشان ہو۔"

رسم الخط کی اس تعریف پر اردو کا رسم الخط پورا اترتا ہے۔

اردو رسم الخط کی جامعیت و ہمہ گیری سے قطع نظر اس کا بڑا وصف یہ بھی ہے کہ وہ ناگری اور انگریزی رسم الخط کے مقابلے میں جگہ بہت کم لیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ وقت اور کاغذ دونوں کی بچت ہوتی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ دیکھنے میں دیدہ زیب ہے۔ انگریزی اور ہندی زبانوں کے حروف کے ساتھ اردو حرف پر ایک نظر ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ سادگی کے ساتھ اردو کے حروف نگاہ کے لئے ایک خاص قسم کی کشش رکھتے ہیں۔ چوتھی خوبی یہ ہے کہ اردو میں اعراب کی ضرورت نہیں پڑتی۔ رومن میں a, e, i, o, u کے حروف زیر زبر اور پیش کی آواز کیلئے جگہ جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ یہی حال ناگری یا ہندی رسم الخط کا ہے۔ अ, आ, इ, ई, उ, ऊ, ए, ऐ, ओ, औ وغیرہ ان کی ماترائیں اعراب کی حرکتیں پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ جگہ جگہ ان حروف اور ان کی علامتوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اردو میں آسانی یہ ہے کہ اعراب کے لئے الگ سے حروف نہیں بلکہ اعراب کا کام زیر زبر پیش کے مختصر نشانات سے لیا جاتا ہے۔ اس کی ضرورت بھی کچھ دنوں کے لئے رہتی ہے۔ بعد کو جب مشق بہم پہنچائی جاتی ہے تو ان نشانات کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ جملے کی ساخت اور مفہوم کے لحاظ سے ہر لفظ کے اعراب خود بہ خود ذہن میں ابھر آتے ہیں۔ یہ اردو کا ایسا وصف ہے جو دوسری زبانوں میں بہت کم نظر آتا ہے۔

پانچویں امتیازی بات یہ ہے کہ اردو رسم الخط دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا ہے اور اس کے حروف اور ان کی آوازیں عربی و فارسی سے بہت قریب ہیں۔ یہ قربت اردو والوں کو عربی اور فارسی سیکھنے میں مدد دیتی ہے۔ عربی و فارسی والے بھی

بہ آسانی اردو میں مہارت حاصل کرلیتے ہیں۔ عربی و فارسی سے ہمارا جو ثقافتی اور تہذیبی اور اسلامی و دینی رشتہ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اردو کا رسم الخط ان رشتوں کو استوار کرنے میں معاونت کرتا ہے۔ اس طرح کی کئی باتیں اردو رسم الخط کی خصوصیات میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ان اوصاف کے باوجود اردو رسم الخط پر اعتراض کئے گئے، خاص اعتراضات یہ تھے۔

۱۔ اردو رسم الخط میں حروف تہجی کی تعداد دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اس لئے اس کا سیکھنا اور سکھانا بہت مشکل ہے۔ اس کے برعکس دوسری زبانوں کے حروف تعداد میں بھی کم ہیں اور لکھنے میں بھی سادہ ہیں اس لئے بچے ان میں جلد مہارت حاصل کرلیتے ہیں۔

۲۔ اردو کے حروف کئی شکلیں بدلتے ہیں۔ کبھی پورے لکھے جاتے ہیں، کبھی آدھے اور کبھی کبھی صرف ان کا چہرہ بنا دیا جاتا ہے۔ یہ تبدیلی، اردو لکھنا، پڑھنا سکھانے میں حارج ہوتی ہے اور اردو پر قابو پانے کے لئے دوسری زبانوں کے مقابلہ میں زیادہ وقت ضائع ہوتا ہے۔

۳۔ اردو میں ہم صوت یعنی ایک ہی قسم کی آواز رکھنے والے حروف متعدد ہیں۔ مثلاً ا، ع۔ ت اور ط۔ ث، س، ص۔ ذ، ز، ظ اور ض۔ ح اور ہ وغیرہ یہ آوازیں لکھنا سکھانے میں خاص طور پر الجھن پیدا کرتی ہیں۔ طلبا کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کون سا لفظ ث سے لکھیں، کون سا س سے لکھیں اور کون ص سے۔ چنانچہ املا کی غلطیاں ایک عرصہ تک ان سے سرزد ہوتی رہتی ہیں اور وہ اس پر بمشکل قابو حاصل کرپاتے ہیں۔

۴۔ اردو میں اعراب کی دشواریاں ہیں۔ یہاں ناگری اور رومن کی طرح زیر، زبر، پیش کی طرح حروف نہیں ہیں۔ صرف قیاس سے زیر، زبر، پیش لگا کر کام چلایا جاتا ہے۔ یہ چیز تلفظ اور املا کے تعین میں مشکلات پیدا کرتی ہے۔

۵۔ اردو رسم الخط میں بہت سے حروف لکھے جاتے ہیں لیکن پڑھے نہیں جاتے مثلاً خواب و خواہش کو "خاب" اور "خاہش" بولا جاتا ہے اور "و" کی آواز کہیں ظاہر نہیں ہوتی۔ لکھنے میں یا املا میں اس کا لانا ضروری ہے۔ یہی حال "عبدالرشید" اور "فی الحقیقت" وغیرہ کے الفاظ کا ہے۔

یہ سارے اعتراضات، فارسی اور عربی رسم الخط پر بھی وارد ہوسکتے ہیں۔ اس لئے کہ اردو زبان کا رسم الخط ان دونوں سے بہت قریب ہے۔ صرف بعض آوازیں اور ان کے نشانات یعنی حروف کی تعداد تو اردو میں زیادہ ہے لیکن جہاں تک جوڑ، شوشہ، مرکز، کشش اور دائروں کا سوال ہے۔ وہ بالکل ایک جیسے ہیں۔ تینوں زبانیں دائیں سے بائیں بالکل ایک ہی ڈھب سے لکھی جاتی ہیں۔ تینوں میں خط نسخ اور نستعلیق سے کام لیا جاتا ہے۔ اور سب میں ٹائپ و طباعت کے مسائل ایک جیسے ہیں لیکن آج تک کسی نے فارسی یا عربی رسم الخط کو ناقص بتانے کی ہمت نہیں کی۔ خود ایرانی اور عربی علمائے زبان نے اس قسم کا خیال ظاہر نہیں کیا کہ ان کے رسم الخط کے سبب فارسی اور عربی کی ترقی رکی ہوئی ہے۔ بلکہ عملاً یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ عربی اور فارسی کی کتابیں خوبصورت ٹائپ اور نستعلیق میں اعلیٰ درجے کی طباعت کے ساتھ منظر عام پر آرہی ہیں اور مقبول ہو رہی ہیں۔ کسی نے رسم الخط کو کتابوں کی اشاعت میں حائل قرار نہیں دیا۔ پھر آخر اردو رسم الخط ہی کو اعتراضات کا نشانہ کیوں بنایا گیا؟ صرف اس لئے کہ ہندوؤں کو ہندی کے نام سے اپنی قومی زبان کو فروغ دینا اور اردو کو ختم کرکے مسلمانوں کے ثقافتی آثار کو برصغیر سے ختم کرنا تھا۔ پھر بھی آیئے سارے اعتراضات کا ایک ایک کرکے جائزہ لیں اور دیکھیں کہ معترضین اپنے موقف میں کس حد تک حق بجانب ہیں۔

۱۔ پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اردو میں حروف تہجی کی تعداد زیادہ ہے اور ان کا سیکھنا سکھانا آسان نہیں ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ حروف کی تعداد دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ہے لیکن یہ چیز اردو کی سرشت اور مزاج کے مطابق ہے۔ بتایا جاچکا ہے کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اس کا خمیر مختلف زبانوں اور بولیوں کی مدد سے تیار ہوا ہے۔ اس نے علاقائی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کا بہت گہرا اثر قبول کیا ہے، یہ اثر الفاظ پر بھی ہے اور اصوات یعنی حروف پر بھی۔ اس نے فارسی کے خاص حروف پ، گ، ژ کو، عربی کے خاص حروف ث، خ، ذ، ض، ط، ظ، ع وغیرہ کو اور سنسکرت و ہندی کے خاص حروف ڈ، ڑ، تھ، ٹھ، پھ اور جھ وغیرہ کو بھی اپنے اندر جذب کرلیا ہے اور اسی جذب و اخذ کی بدولت اسے بین الاقوامی مزاج ملا ہے۔ اس مزاج کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ عربی، فارسی اور ہندی وغیرہ کی ساری آوازوں کی متحمل ہے۔ اگر آوازوں کی یہ کثرت اردو رسم الخط میں نہ ہوتی تو اس کا مزاج وہ نہ ہوتا جو آج ہے۔

ایسی صورت، آواز یا حروف کی کثرت کو اس کا عیب نہیں ہنر کہنا چاہئے۔ اسی ہنر کی بدولت تو اسے قبول عام نصیب ہے۔ اگر اس میں یہ ہنر نہ ہوتا تو وہ اب تک زندہ نہ رہتی، کب کی مرگئی ہوتی، اس لئے کہ اسے عربی و فارسی یا ہندی و انگریزی کی طرح کبھی سرکاری سرپرستی حاصل نہیں رہی بایں ہمہ اس نے ترقی دوڑ میں بہت سی زبانوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ یہ گویا عملاً اس بات کا ثبوت ہے کہ رسم الخط نے کبھی اس کی راہ میں روڑا نہیں اٹکایا بلکہ اس کی بدولت دوسری زبان کے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔

اب رہ گئی سادگی اور سہل الحصول ہونے کی بات تو سب جانتے ہیں کہ بچوں کو لکھنا سکھانے کے سلسلے میں جو بڑی دقت پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ حروف کے نشانات کے مطابق ان کی انگلیاں آسانی سے نہیں چلتیں۔ ایک ایک حرف کو بار بار ان سے لکھوایا جاتا ہے تب کہیں جاکر وہ اس کے بنانے پر قابو حاصل کرپاتے ہیں۔ ماہرین تعلیم نے اسی دقت کے پیش نظر یہ مشورہ دیا ہے کہ بچوں سے ابتدا میں چاک سے سیدھی سادی لکیریں کھنچوائی جائیں اور ہاتھ رواں ہوجانے کے بعد ان کی توجہ حروف تہجی کی طرف مبذول کرائی جائے۔ اس بنیادی اصول کو ذہن میں رکھ کر ہندی و انگریزی اور اردو حروف کے چند حروف پر ایک ساتھ نظر ڈالئے۔

اردو	ہندی	انگریزی
ا	आ	A

ب	ब	B
ک	क	K
ڈ	ड	D
ف	फ	F

ان حروف کو بچوں سے لکھوایئے اور خود لکھ کر دیکھئے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو حروف ہندی و انگریزی کے مقابلے میں آسان ثابت ہوں گے اور کم وقت اور کم جگہ میں بنائے جاسکیں گے۔ یہاں ایک اور پہلو کی وضاحت ضروری ہے، اردو میں حروف تہجی کی تعداد زیادہ سہی لیکن تعداد کی زیادتی کے باوجود ان کا بنانا اور ان پر قابو پالینا آسان ہے۔ نیچے لکھے ہوئے حروف ذرا غور سے دیکھئے۔

۱۔ا	۹،ع،غ
۲۔ب،پ،ت،ٹ،ث	۱۰۔ف،ق
۳۔ج،چ،ح،خ	۱۱۔ک،گ
۴۔د،ڈ،ذ	۱۲۔ل
۵۔ر،ڑ،ز،ژ	۱۳۔م
۶۔س،ش	۱۴۔ہ
۷۔ص،ض	۱۵۔ی
۸۔ط،ظ	

ان میں صرف پندرہ شکلیں بنیادی ہیں اگرچہ ان پندرہ حروف پر قابو پا جائے تو وہ ان کی مدد سے سارے دوسرے حروف خود بہ خود بنالے گا۔ اس لئے کہ باقی حروف نقطوں یا مرکز کے اضافے سے بن جاتے ہیں۔ جو بچہ "ب" لکھ سکتا ہے وہ اس سلسلے کے سارے حروف بنالے گا اور پہلے ہی دن یہ محسوس کرلے گا کہ وہ استاد کی مدد کے بغیر اپنی طرف سے بہت کچھ کرلیتا ہے۔ حروف کے سارے مندرجہ بالا سلسلے اسی نوعیت کے ہیں۔ ان کا پہلا حرف سکھایا جائے تو باقی حروف بچے خود بنالیں گے۔ ایسی صورت میں محض تعداد کی بنیاد پر یہ کہنا کہ اردو کے حروف تہجی کا سکھانا مشکل ہے صحیح نہیں ہے۔ اردو کے حروف بناوٹ کے لحاظ سے حد درجہ سادہ اور اشکال کے اعتبار سے ناگری اور انگریزی سے بھی تعداد میں کم ہیں اور ایک اچھا استاد چند دن میں سارے حروف بچوں کے ذہن نشین کراسکتا ہے۔

۲۔ اردو رسم الخط پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حروف کئی کئی شکلیں بدلتے ہیں، اس لئے ان کے پہچاننے اور لکھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ یہ اعتراض بھی غور و فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ رسم الخط کی ظاہری صورت کو دیکھ کر وارد کردیا گیا ہے۔ اردو میں حروف یقیناً اپنی شکلیں بدلتے ہیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل لفظوں کو دیکھئے۔

باسط	طیب	رباب
لباس	سامان	تسلیم
قلم	عقل	اخلاق

ان میں "ب" اور "ق" کی شکلوں پر غور کیجئے لفظ کے آخر میں پورا حرف آیا ہے۔ یعنی اصل شکل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لفظ کے آغاز اور وسط میں شکل بدلی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی دونوں جگہ ایک سی ہے۔ گویا حروف نے صرف ایک شکل بدلی ہے۔ پھر یہ تبدیلی ایسی بھی نہیں کہ حروف پہچاننے یا اس کے بنانے میں دقت ہو۔ پچھلے صفحات میں کسی جگہ اس کی وضاحت کی جاچکی ہے کہ اردو کے حروف افراد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ افراد اپنے چہرے سے پہچانے جاتے ہیں، جسم سے نہیں۔ اگر چند آدمی اپنے اپنے سر ڈھانپ کر سامنے آجائیں تو ان کا پہچاننا مشکل ہوگا۔ عدالتوں میں ملزمان کی شناخت کے لئے پریڈ ہوتی ہے۔ اصل ملزمان چند دوسرے افراد کے ساتھ سامنے لائے جاتے ہیں۔ گواہان سے نشان دہی کرنے کو کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ ملزمان اپنے چہروں میں خاصی تبدیلیاں کرکے پریڈ میں شامل ہوتے ہیں اس لئے گواہ انھیں اکثر شناخت کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چہرے کی تبدیلی ایسی چیز ہے جو شناخت میں حارج ہوسکتی ہے لیکن اردو کے حروف کسی جگہ بھی اپنا چہرہ مسخ نہیں کرتے۔ اصل چہرے کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ خواہ انھیں لفظ کے شروع میں جگہ دی جائے یا وسط یا آخر میں۔ اوپر دیئے ہوئے الفاظ بطور مثال پیش کئے جاسکتے ہی۔ دوسرے الفاظ کے ذریعہ بھی اس دعوے کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

یہ خیال بھی غلط ہے کہ سارے حروف شکلیں بدلتے ہیں۔ اردو کے حروف تہجی میں ا،د،ڈ،ذ،ر،ڑ،ز،ژ،ط،ظ،و ایسے ہیں جو ہر صورت میں پورے لکھے جاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل الفاظ پر نظر ڈالئے۔

۱۔اسیر	تالاب	ناتا
۲۔دوڑو	کدورت	اولاد
۳۔ڈول	کبڈی	ٹھنڈا
۴۔ذکر	تذکرہ	کاغذ
۵۔رشید	کرنال	افکار
۶۔پیڑ	گڑبڑ	پہاڑ
۷۔زہرہ	مزار	مرکز
۸۔ژالہ	مژدہ	رپورتاژ
۹۔طلب	مطلب	ربط
۱۰۔ظاہر	مظہر	لفظ
۱۱۔وحید	توحید	قابو

ہر گروہ کے لفظوں کے آغاز، وسط اور آخر میں جو حروف آئے ہیں وہ اپنی پوری شکل کے ساتھ آئے ہیں اور ذرا سی توجہ سے ان حروف کی شناخت کرائی جاسکتی ہے۔ رہ گئے باقی حروف، ان کے متعلق بتایا جاچکا ہے کہ اصل چیز حروف کا چہرہ ہے۔ یہ چہرہ اردو میں ہمیشہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس لئے حرف کی شناخت میں دقت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بعض حروف مثلاً۔

ب، ن، ک اور ع

جب کسی دوسرے حرف سے مل کر آتے ہیں تو ان میں معمولی سا تغیر ہوتا ہے۔ مثلاً۔

بس　　　بط

نس	نص
کل	کا
بغداد	مغرب

اور "ب" اور "ن" کو "ل" کی شکل میں س اور ص وغیرہ سے ملایا گیا لیکن لفظوں کے ذریعہ انھیں پہچان سکتے ہیں اس لئے کہ اردو میں "ن" کے سوا کوئی حرف ایسا نہیں جس کے اوپر ایک نقطہ آتا ہو۔ یہی حال "ب" کا ہے۔ کسی دوسرے حروف کے نیچے ایک نقطہ نہیں آتا۔ "ب" اور "ن" کی شکلوں کی یہ تبدیلی بھی صرف چند حروف کے ساتھ ہوتی ہے۔ باقی جگہوں پر وہ اصل چہروں ہی کے ساتھ آتے ہیں۔ ک اور گ صرف "ل" اور "ا" سے مل کر قدرے بدل جاتے ہیں۔ "مرکز" کے ذریعے انھیں آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔ رہ گئے ع اور غ میں نستعلیق میں ان میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ نسخ میں یہ بھی پورے چہرے کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی معمولی تبدیلیاں ایسی نہیں جس کی بنا پر کہا جاسکے کہ اردو رسم الخط کا سیکھنا، سکھانا بہت مشکل ہے۔ اس سے کہیں زیادہ مشکلیں انگریزی حروف سیکھنے میں پیش آتی ہیں۔

انگریزی میں سب سے پہلے بچے کو اے سے لے کر زڈ تک بڑے حروف (Capital Letter) لکھائے جاتے ہیں حالانکہ ان کا مصرف انگریزی میں صرف اتنا ہے کہ وہ کسی اسم معرفہ (Proper Noun) اور جملے (Sentence) کے آغاز میں بالعموم استعمال ہوتے ہیں۔ دو چار مقامات پر اور ان کا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ مقامات بھی اسم خاص اور جملے ہی کے تحت آجاتے ہیں۔ بڑے حروف (Capital Letter) کے بعد ان حروف سے بالکل مختلف شکل کے حروف یعنی a,b,c,d,e وغیرہ بنوائے جاتے ہیں جن کا پہلے قسم کے حروف سے ذرا بھی تعلق نہیں ہوتا، چنانچہ جتنا وقت پہلے حروف کے سکھانے میں صرف ہوگا اتنا ہی ان کے سکھانے میں لگے گا۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی، یہ حروف تو صرف لکھنے کے لئے سکھائے گئے ہیں۔ پڑھنے کے حروف ٹائپ میں مندرجہ بالا دونوں حروف سے الگ ہوں گے۔ گویا جب تک کوئی شخص انگریزی کے چھبیس حروف کو تین طرح سے لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو وہ انگریزی حروف تہجی جاننے کا دعویٰ ہی نہیں کرسکتا۔

ذیل کے انگریزی حروف دیکھئے۔

A	a	*a*
B	b	*b*
D	d	*d*
E	e	*e*
F	f	*f*
G	g	*g*
H	h	*h*
I	i	*i*

اس سے ظاہر ہے کہ اکثر حروف کم از کم تین طرح اور بعض چار طرح سے لکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ جب تک کوئی آدمی انگریزی کے چھبیس حروف کو الگ الگ شکلوں میں پہچاننا اور لکھنا نہ جانتا ہو، وہ انگریزی لکھنے پڑھنے کے لائق نہیں ہوسکتا۔

اب ذرا ناگری (ہندی) رسم الخط کو لیجئے۔ یہ سہل ترین رسم الخط سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ ہندی سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس میں بعض حروف اپنی کئی کئی شکلیں بدلتے ہیں۔ مندرجہ ذیل الفاظ دیکھئے۔

(کرشن) कृष्ण ، (آدرش) आदर्श ، (سرکار) सरकार ، (پرکاش) प्रकाश۔

ان لفظوں میں ہندی کا حرف र (ر) چار خاص شکلوں میں استعمال ہوا ہے اور، ہر شکل ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اسی طرح ہندی میں الف کی آواز اور अ دو شکلوں میں ظاہر کی جاتی ہے اور دونوں میں سے جس کو چاہیں استعمال کرسکتے ہیں۔ یعنی आदर्श کو आदर्श کی شکل میں بھی لکھنا درست ہوگا۔

نون غنہ کی آواز بھی ہندی میں کئی شکلوں سے پیدا کی جاتی ہے۔ ان لفظوں کو دیکھئے۔

(چاند) चाँद ، (گنگا) गंगा ، کرشن किष्ण ہر لفظ میں نون غنہ کی آواز الگ الگ شکلوں سے پیدا کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں جس طرح اردو میں بعض حروف صرف اپنا چہرہ ظاہر کرتے ہیں اسی طرح ہندی میں بھی حرف کا صرف ابتدائی حصہ بنایا جاتا ہے۔ جیسا کہ حسب ذیل الفاظ سے ظاہر ہے۔

(کوّا) कव्वा (لڈو) लड्डू (کلن) कल्लन

یعنی اردو میں جہاں تشدید کا استعمال ہوتا ہے ہندی میں وہاں آدھا حرف لکھا جاتا ہے لیکن ان کے علاوہ بھی ہندی میں آدھا حرف اکثر لکھا جاتا ہے اور مشکل یہ ہے کہ اس کا کوئی بھی اصول مقرر نہیں ہے جیسے۔

(کشٹ) कष्ट (گند) गन्द (ویاکل) व्याकुल (آتما) आत्मा (شبد) शब्द وغیرہ

اس لئے حروف کی شکلوں میں بعض تبدیلیوں کا سہارا لے کر اردو رسم الخط کو ناقص بتانا کسی طرح مناسب نہیں۔ اس قسم کی دشواریاں ناگری اور دوسری زبانوں میں اردو سے بھی زیادہ ہیں۔

(۳) تیسرا اعتراض اردو رسم الخط پر یہ وارد کیا جاتا ہے کہ اس میں ہم صوت (ایک ہی قسم کی آواز والے) حروف املا میں الجھن پیدا کرتے ہیں اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس لفظ کو ث سے لکھا جائے اور کس لفظ کو س یا ص سے۔ بظاہر یہ اعتراض بہت وزنی ہے اور اردو میں چند حروف ایسے ہیں جو ایک ہی قسم کی آواز رکھتے ہیں اور لکھتے وقت ان میں امتیاز کرنا کچھ عرصہ تک نو آموز کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ یہ حروف مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ ا، ع
۲۔ ت، ط
۳۔ ث، س، ص
۴۔ ذ، ز، ض، ظ
۵۔ ح، ہ

ان میں سے ہر گروہ کی نمائندگی کے لئے ایک ایک حرف کو رکھنا ہی پڑے گا۔ صرف نو حروف یا ان کی آوازیں ایسی رہ جاتی ہیں جن کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ یہ اردو رسم الخط میں دقت کرتی ہیں، لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اردو ایک مخلوط اور بین الاقوامی مزاج کی زبان ہے اس میں جگہ جگہ کے اور بھانت بھانت کے الفاظ شامل ہیں۔ اس کا اصل رشتہ آریائی زبانوں سے ہے لیکن سامی خاندان خاص طور پر عربی کے بھی بکثرت الفاظ اس میں پائے جاتے ہیں۔ مختلف زبانوں میں کسی ایک چیز کے لئے ایک یا دو سے زیادہ الفاظ نہ ملیں گے لیکن اردو میں ایک ہی چیز کے لئے متعدد الفاظ موجود ہیں مثلاً "چاند" کا لفظ لے لیجئے، اس کے لئے۔

چاند، چندا، چندرما، قمر، ماہ، ماہتاب، ہلال، بدر وغیرہ سبھی استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح تارے کے لئے۔

تارہ، ستارہ، سیارہ، اختر، انجم، نجم، نجوم وغیرہ کے الفاظ مستعمل ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب الفاظ دوسری زبانوں سے آئیں گے تو وہ اپنی آوازیں بھی ساتھ لائیں گے۔ چنانچہ اردو میں جو بعض آوازوں کے کئی کئی حروف ملتے ہیں وہ اس کی فطرت اور مزاج کے عین مطابق ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اردو اپنے ذخیرۂ الفاظ کو اصل آوازوں کے ساتھ ادا کرنے سے قاصر رہتی۔ کیا کامل اور بہترین رسم الخط وہ کہلاتا ہے جو ان ساری آوازوں کی نمائندگی کرتا ہے جو کسی خاص زبان کے بولنے میں نکالنی پڑتی ہے۔ اردو رسم الخط کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ اردو میں بولی جانے والی تمام آوازوں کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھنا آسان ہوگا۔ انگریزی میں

چ، د اور ش

کی آوازیں مستعمل ہیں، سینکڑوں ہزاروں الفاظ ہیں جن میں یہ آوازیں آتی ہیں۔ مثلاً۔

۱۔ Future, Picture, Match, Chapter وغیرہ
۲۔ Those, This, That وغیرہ
۳۔ Admission, She, Motion

لیکن چ، د اور ش کی آوازوں کے لئے کوئی حرف مقرر نہیں ہے۔ حالانکہ یہ آوازیں طرح طرح سے پیدا کی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی رسم الخط کا کھلا ہوا نقص ہے۔ اردو رسم الخط اس نقص سے پاک ہے۔ وہ ساری مستعمل آوازوں کے لئے مستقل حروف رکھتا ہے۔ اس خوبی کے نتیجے میں یہ ضرور ہوا کہ بعض آواز کے لئے کئی کئی حروف داخل ہوگئے ہیں لیکن اردو میں، ہم صوت حروف زیادہ نہیں صرف تیرہ ہیں۔ ان تیرہ کو ہم نے اوپر پانچ گروہوں میں تقسیم کیا ہے، ہر گروہ سے ایک ایک حرف کو رکھنا ہی پڑے گا۔ چنانچہ صرف نو حروف ایسے رہ جاتے ہیں جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ املا میں مغالطہ پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کا مغالطہ پیدا کرنے والے حروف دوسری زبانوں میں اردو سے بھی زیادہ ہیں۔ انگریزی زبان میں تو آوازوں کا کوئی نظام ہی نہیں ہے۔ نشانات کچھ ہیں آوازیں کچھ نکلتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس زبان کے املا (Spelling) اور تلفظ (Pronunciation) پر قابو پانا سخت مشکل ہے جب تک ہر لفظ کے معنی کے ساتھ اس کا املا بھی اچھی طرح ذہن میں محفوظ نہ ہو لکھنا مشکل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ شروع ہی سے اس کے معنی کے ساتھ اسپیلنگ بھی رٹائی جاتی ہے۔ جس شخص کو جتنے لفظوں کی اسپیلنگ یاد ہوگی۔ عام طور پر وہ اتنے الفاظ لکھنے پر قادر ہوگا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ انگریزی کے الفاظ جو ہمارے استعمال میں آتے ہیں صرف انھیں کی اسپیلنگ ہمیں یاد رہتی ہے اور انھیں کو ہم آسانی سے لکھ سکتے ہیں۔ باقی الفاظ کے املا میں ہمیں بار بار ڈکشنری کی ضرورت ہوتی ہے۔ انگریزی ڈکشنری میں ہر لفظ کے ساتھ ان کا تلفظ (Pronunciation) اسی لئے تو لکھا جاتا ہے کہ لفظ میں جو حروف استعمال ہوتے ہیں، ان کے متعلق یہ معلوم کرلینا کہ وہ کس قسم کی آواز پیدا کریں گے بہت مشکل ہوتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے۔

۱۔ انگریزی میں س کی آواز کے لئے بظاہر ایس کا حرف استعمال ہونا چاہئے اور اکثر ہوتا ہے جیسا کہ Sense, See, Sun میں لیکن Receipt اور Centre میں "س" کی آواز "C" سے پیدا کرلی گئی ہے۔

۲۔ "ش" کی آواز بظاہر Sh سے پیدا کی جاتی ہے جیسا کہ Shoe, She, Cash سے ظاہر ہے لیکن "ش" کی آواز اس کے علاوہ بھی متعدد طریقوں سے پیدا کی جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل لفظوں کو دیکھئے۔

۱۔ Admission (اڈمیشن)
۲۔ Tution (ٹیوشن)
۳۔ Patient (پیشنٹ)
۴۔ Ocean (اوشن)
۵۔ Sure (شیور)
۶۔ Machine (مشین)
Pressure (پریشر)
۸۔ Fashion (فیشن)
۹۔ Schedule (شیڈول)

جس شخص کو یہ بتایا گیا ہو کہ "ش" کی آواز "Sh" سے پیدا ہوتی ہے وہ کس قیاس پر سمجھ لے گا مندرجہ بالا لفظوں میں "ش" کی آواز کن کن حروف سے پیدا ہوگی۔ چنانچہ جب تک اسپیلنگ رٹی ہوئی نہ ہو ان الفاظ کا لکھنا محال ہے۔ اگر اس طرح کے ایک دو لفظ ہوتے تو کوئی بات نہ تھی، ہزارہا الفاظ ہیں جن میں یہ دشواری پیدا ہوگی۔

۳۔ "ک" کی آواز کے لئے K اور Q حروف موجود ہیں۔ اس کے باوجود Tact, Cat میں "ک" کی آواز "C" سے ظاہر کی گئی ہے۔

۴۔ "ز" کی نمائندگی کے لئے "Z" موجود تھا لیکن Has اور Please میں ز کی آواز S کی مدد سے پیدا کی گئی ہے۔

۵۔ "ف" یہ آواز صرف الیف (F) سے نہیں بلکہ Ph اور ough سے بھی ظاہر کی جاتی ہے۔ جیسے Prophet اور Rough میں۔

۶۔ "ج" کی آواز کی نمائندگی G اور J دونوں حرف کرتے ہیں جیسے

General اور Judge میں۔

۷۔ "چ" کی آواز کے لئے کوئی حرف موجود نہیں ہے۔ پھر بھی کبھی ch سے اور کبھی ture سے اسے ظاہر کیا جاتا ہے۔ مثلاً

Picture & Match وغیرہ میں۔

اس طرح کی اور نہ جانے کتنی باتیں ہیں جو انگریزی رسم الخط کے بارے میں کہی جا سکتی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ انگریزی میں حروف سے آواز کا کچھ زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔ اسی لئے کسی خاص لفظ میں جو حروف استعمال ہوتے ہیں انھیں حافظے میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ حروف اور آوازوں کی ایسی بدنظمی شاید کسی اور زبان میں پائی جاتی ہو۔ سیکڑوں الفاظ ہیں جن میں حروف لکھے جاتے ہیں لیکن آواز نہیں دیتے جیسے Match میں اور Knife میں k یہ چیزیں عام طور پر ایسی الجھن پیدا کرتی ہیں کہ ہر لفظ کی اسپیلنگ پر قابو پائے بغیر انگریزی کے دو جملے بھی بچہ نہیں لکھ سکتا۔ بایں ہمہ کسی طرف سے کبھی یہ آواز بلند نہیں کی گئی کہ انگریزی کا رسم الخط بہت مشکل ہے اور اس مشکل کے سبب اس کی ترقی رکی ہوئی ہے۔

اوپر ہم صوت حروف کی دقتوں کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ دقتیں کم و بیش دنیا کی ہر زبان میں موجود ہیں۔ بطور مثال ہندی کو لے لیجئے۔ اس میں بھی بعض آواز کے لئے کئی کئی نشانات سے کام لیا جاتا ہے۔

(۱) ش کی آواز کے لئے श اور ष

(۲) نون غنہ کے لئے ँ ं

(۳) ت کی آواز کے لئے त اور ट

اسی طرح "ز" کی آواز کے لئے متعدد نشانات ان کی مثالیں پچھلی سطور میں دی جا چکی ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں چند ہم صوت حروف کی بنیاد پر اردو رسم الخط کو ناکارہ بتانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

(۴) اردو رسم الخط کی چوتھی کمزوری یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں اعراب کا تعین کرنا مشکل ہے۔ کسی لفظ کا تلفظ کرتے وقت یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ کس جگہ زیر پڑھا جائے اور کس جگہ زبر یا پیش متصور کیا جائے اس لئے کہ اردو میں اعراب کے نشانات زیر، زبر، پیش بہت کم استعمال ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایک خاص منزل تک اس سلسلے میں دقت ہوتی ہے لیکن تھوڑی سی مشق کے بعد اس پر قابو اس لئے پالیا جاتا ہے کہ تلفظ کا تعلق لکھنے سے اتنا نہیں جتنا بولنے سے ہے۔ اگر صحیح تلفظ کے ساتھ کوئی شخص اردو بولتا ہے تو اسی قیاس پر وہ اردو لکھے گا، اور صحیح لکھے گا۔ پڑھنے کی بھی یہی صورت ہے۔ جن الفاظ کے تلفظ سے لوگوں کے کان آشنا ہیں۔ ان الفاظ کو پڑھنے میں وہ کوئی خاص الجھن محسوس نہ کریں گے۔

اردو رسم الخط کا خاص وصف یہ ہے کہ اس میں حروف علت صرف تین ا، و، ی ہیں۔ یہ بھی اعراب کا کام کرتے ہیں۔ لیکن ان کے لئے زیادہ تر زیر، زبر، پیش کے معمولی نشانات بطور اعراب استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے فائدہ ہے کہ اردو تحریر جگہ بہت کم گھیرتی ہے۔ اردو کے برعکس ہندی میں جگہ جگہ ماترائیں، اوپر کی لکیریں اور پائیاں لگانے کے لئے بار بار ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے اور حروف جگہ بھی خاصی گھیرتے ہیں۔ جگہ زیادہ لینے کا مطلب یہ ہوا کہ وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔

انگریزی میں کہنے کو تو i, e, y, u, o کو حروف علت کہا جاتا ہے اور اعراب کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن عملاً انگریزی تحریر میں ان کی صورت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ کوئی قیاس کام نہیں کرتا اور صحیح تلفظ تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ چند الفاظ بطور مثال دیکھئے۔

۱۔ Shoot : Cood

۲۔ Read : Red

۳۔ Put : Shut : Unity : Ugly

۴۔ Sir : Pin

۵۔ Escape : Early

۶۔ Ice : Eye

۷۔ Yes : By

ان الفاظ میں i, u, e, o اور y کی آوازوں پر غور کیجئے۔ نہ کوئی اصول ہے، نہ کوئی تنظیم، ایک ہی حرف کی ایک ہی آواز کہیں زیر کا کام دے رہی ہے کہیں زبر کا اور کہیں پیش کا۔ ایک ہی حرف کہیں کھینچ کر پڑھا جاتا ہے کہیں یوں ہی اور کہیں سرے سے خاموش ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ خیال کرنا کہ انگریزی الفاظ کا تلفظ متعین کرنا آسان ہے، صحیح نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ حروف کی آوازیں جس بے ربطی اور بے معنویت کے ساتھ انگریزی رسم الخط میں استعمال ہوتی ہیں مشکل سے کسی دوسری زبان میں نظر آئیں گی۔ اردو رسم الخط اس سے ہزار گنا بہتر ہے۔ اس میں اعراب کی ایسی دشواریاں نہیں ہیں کہ لکھنا پڑھنا مشکل ہو۔

۵۔ پانچواں اعتراض یہ ہے کہ اردو میں بعض حروف آواز نہیں دیتے پھر بھی لکھے جاتے ہیں جیسے "خواہش" کی "و" اور "الرشید" میں "ال"۔ معترضین کو جاننا چاہئے کہ اردو میں اس قسم کے الفاظ کی تعداد کثیر نہیں ہے۔ تھوڑے سے الفاظ ہیں جو اس زمرے میں آتے ہیں۔ حروف تو صرف دو یا تین ہیں۔ جہاں تک "ال" کے آواز دینے یا نہ دینے کا تعلق ہے اس کے متعلق اگر حروف شمسی اور حروف قمری کی تقسیم چند مثالوں کے ذریعے طلبہ کو سمجھا دی جائے تو پھر یہ دقت خود بہ خود دور ہو جائے گی۔ بات یہ ہے کہ ال کا استعمال صرف عربی ترکیب میں ہوتا ہے اور عربی ہی کے اصولوں کے مطابق وہ بولے اور پڑھے جاتے ہیں، لیکن انگریزی میں تو آواز نہ دینے والے (Silent) حروف بے شمار لفظوں میں آتے ہیں اور ایک نہیں کئی کئی آتے ہیں جیسے Committtee اور High میں بایں ہمہ اس میں دشواری محسوس نہیں کی جاتی۔ پھر محض چند الفاظ کی بنا پر اردو رسم الخط کو مورد الزام کیوں گردانا جائے؟

ان تفصیلات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک زبان کا رسم الخط دوسری زبان پر منطبق نہیں ہو سکتا اور نہ پختہ و مقبول ہو جانے کے بعد کسی زبان کا رسم الخط غیر ضروری اصلاحات و ترمیمات کو قبول کر سکتا ہے اور اگر اس میں کسی سبب سے تبدیلیاں لائی گئیں تو اپنے وجود کو من وعن قائم نہ رکھ سکے گی اور اس کا سرمایہ تباہ ہو جائے گا۔

پھر بھی بعض لوگوں کی طرف سے اردو رسم خط میں اصلاح و تبدیلی کی تجویزیں پیش کی گئیں۔ آیئے دیکھیں یہ تجویزیں کیا تھیں اور انھیں قبول کر لینے سے اردو کو کیا نفع یا نقصان پہنچ سکتا ہے تھا۔

اردو رسم الخط کے سلسلے میں ایک اصلاحی تجویز یہ پیش کی گئی تھی کہ اس میں لکھنے کے عمل کو صوتی بنیادوں پر قائم کیا جائے یعنی کسی لفظ کے بولنے میں جو آوازیں نکلتی ہیں صرف انھیں کا لحاظ رکھ کر اس لفظ کو لکھا جائے اور غیر ضروری آوازوں کو تحریری عمل سے خارج کر دیا جائے۔ مثالیں یہ دی گئیں کہ:

۱۔ ہما اور شمع میں ا اور ع کی آوازیں۔

۲۔ تالاب اور طالب میں ت اور ط کی آوازیں۔

۳۔ سالم، ثابت اور صادق میں ث، س اور ص کی آوازیں۔

۴۔ حاصل اور ہاشمی میں ح اور ہ کی آوازیں۔

۵۔ ذاکر، زائر، ظاہر، ضامن میں ذ، ز، ض، اور ظ کی آوازیں۔

ایک سی ہیں۔ عربی والوں کے نزدیک ان آوازوں میں فرق ہو تو ہو، اردو والے ان آوازوں میں کوئی فرق نہیں کرتے،

۱۔ ا، ع

۲۔ ت، ط

۳۔ س، ث، ص

۴۔ ذ، ز، ظ، ض

۵۔ ہ، ح

میں سے صرف ا، ت، س، ز، ہ کو لے لیا جائے باقی آٹھ حروف یعنی ع، ط، ظ، ث، ص، ذ، ض، اور ح کو اردو رسم الخط سے خارج کر دیا جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اردو املا کی وہ دقتیں ختم ہو جائیں گی جو آوازوں کی کثرت کے سبب محسوس ہوتی ہیں اور اردو کی ترقی کی رفتار تیز ہو جائے گی۔

اوپر جن حروف کو حروف تہجی سے خارج کر دینے کی تجویز پیش کی گئی ہے وہ تعداد میں صرف آٹھ ہیں۔ گویا ان آٹھ آوازوں میں التباس کے سبب اردو املا میں دشواری پیدا ہوتی ہے۔ حالانکہ پچھلی سطور میں ہم بتا چکے ہیں کہ آوازوں کا سب سے خراب نظام انگریزی میں ہے اور جب تک لفظ کے ہجے پوری طرح رٹی ہوئی نہ ہو کوئی شخص انگریزی لکھ ہی نہیں سکتا۔ اس کے باوجود انگریزی برابر ترقی کرتی جا رہی ہے اور کسی ایک فرد نے کبھی یہ آواز نہیں اٹھائی کہ انگریزی کے رسم الخط کو بدل دیا جائے۔ لیکن بعض نے اردو کے مندرجہ بالا آٹھ حروف اور ان کی آوازوں سے بڑی الجھن محسوس کی اور ان آوازوں کو اردو رسم الخط سے خارج کر دینے کی کوشش کی گئی اس سلسلے میں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اور اس نے کم و بیش دنیا کی ہر زبان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس پر ہندی، فارسی اور عربی کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ یہ اثر اس کے رسم الخط پر صاف نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں کوئی قومی زبان صرف اس غرض سے نہیں پڑھائی جاتی کہ اس قوم کے بچے اس میں صرف شد بد پیدا کر کے دال روٹی کما سکیں، یقیناً یہ بھی ایک مقصد ہے لیکن جیسا کہ اس سے پہلے بھی اس پر روشنی ڈالی جا چکی ہے قومی زبان کی تدریس کا ایک اعلیٰ مقصد ہے اور وہ یہ کہ جو بچے آج اردو پڑھ رہے ہیں انھیں میں سے کوئی آگے چل کر اعلیٰ درجے کا ڈاکٹر، انجینئر، ماہر قانون، ریاضی داں، سائنسداں،، عالمِ ادب، عالمِ زبان، ماہر لسانیات، محقق اور نقاد بن سکے۔۔ ان میں سے کئی حیثیتیں ایسی ہیں جن کے لئے اسے اردو کا غائر مطالعہ کرنا ہوگا، اس کے حروف اس کے نظام صوتیات اور اس کے دخیل الفاظ سب کا حقیقی جائزہ لینا پڑے گا۔ اس کام کے لئے اردو کا موجودہ رسم الخط ہی مفید مطلب ہوگا۔ یہ مانا کہ اردو میں:

ع، ط، ث، ص، ز، ظ، ض، ت

کی آوازیں (جنھیں خارج کر دینے کا مشورہ دیا جاتا ہے) شروع میں بعض الفاظ کے املا میں طلبہ کے لئے الجھن کا سبب بن سکتی ہیں۔ لیکن اگر بچوں کو ابتدائی اور ثانوی منزل ہی میں یہ بات بتا دی جائے کہ یہ حروف خاص عربی کے ہیں اور اردو میں استعمال ہونے والے الفاظ میں سے کسی میں بھی ان میں سے کوئی حرف نظر آئے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ لفظ عربی سے اردو میں آیا ہے۔ اس سے آگے چل کر زبان دانی اور اردو کے لسانی مطالعے میں انھیں خاصی مدد مل جائے گی۔ اور اردو الفاظ کی شناخت کے ساتھ ساتھ الفاظ کے معنی تک پہنچنے میں بھی چنداں دقت نہ ہوگی۔ عربی کے ہر لفظ میں تین حرف بنیادی ہوتے ہیں۔ ان حرفوں کو اس لفظ کا مادہ کہتے ہیں۔ جس مادہ سے کوئی لفظ بنتا ہے اس کا اس مادہ سے تعلق بہر حال باقی رہتا ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل الفاظ پر نظر ڈالئے:

۱۔ علم، معلم، تعلیم، تعلم، معلّمہ، معلوم، عالم، علیم، متعلم، علام، علامہ، علوم۔

۲۔ عقل، عقیل، معقول، تعقل، عقیلہ، عاقل، عاقلہ، عقلیت۔

ان میں "ع" کی شمولیت سے بچے سمجھ جائیں گے کہ یہ الفاظ اصلاً عربی کے ہیں۔ پہلے گروہ کے الفاظ میں "ع، ل، م" اور دوسرے گروہ کے الفاظ میں "ع، ق، ل" بنیادی حروف ہیں۔ چنانچہ اگر کسی طالب علم کو "علم" اور "عقل" کے معنی بتا دیئے جائیں یا اسے ان دونوں لفظوں کے معنی پہلے سے معلوم ہوں تو پھر وہ باقی الفاظ کے معنی تک خود بہ خود پہنچ جائے گا۔ گویا ایک لفظ کے ذریعے وہ اس لفظ سے بنے ہوئے درجنوں الفاظ کی تفہیم پر قابو پالے گا۔ اس سے زبان دانی میں بچوں کو جو مدد ملے گی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان کے ذخیرۂ الفاظ میں تیزی سے اضافہ ہوگا۔ ان میں خود اعتمادی پیدا ہوگی۔ وقت کم لگے گا۔ اور معلم یا لغت سے مدد لئے بغیر بھی طلبہ اس قسم کے لفظوں کے معنی تک پہنچ جائیں گے۔ جو لوگ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ع کو خارج کر کے "ع" والے الفاظ بھی ا سے لکھے جائیں، اس تبدیلی سے پیدا ہونے والی مشکلات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اگر "علم" اور "عقل" کو "ا" سے لکھیں تو "الم" اور "اقل" ہو جائیں گے، الم اور اقل کے لفظ خود عربی کے ہیں اور اردو میں مستعمل ہیں مثلاً "رنج و الم" اور "ذو اضعاف اقل" میں اسی طرح علیم اور عقلیت کو "ا" سے لکھا جائے تو ان کی صورت "الیم" اور "اقلیت" کی ہو جائے گی۔ مشکل یہ ہے کہ یہ الفاظ بھی اردو میں مستعمل ہیں۔ اندازہ کیجئے کہ اس سے کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ "ا" اور "ع" کے استعمال سے تو آدمی ان کے معنی میں فرق کر لیتا

ہے لیکن جب یہ فرق مٹ جائے گا تو جگہ جگہ معنی کی تفہیم میں الجھن پیدا ہوگی۔ دو چار الفاظ کا مسئلہ ہوتا تو کہہ دیا جاتا کہ کچھ دنوں بعد بچے معنی کے تعلق سے ان پر قابو پالیں گے لیکن اردو میں ہم صورت یا مشابہ الصوت الفاظ کثرت سے ہیں اور املا کا فرق ختم ہوجائے تو ان کے معنی متاثر ہوں گے۔ یعنی جب:

اہل و عمل، تحمل و تائل، امارت و عمارت، توسل و توصل، سدا و صدا، سفر و صفر، ماثوم و معصوم، ثواب و صواب، نذیر و نظیر، ظرف و ثرف،، زن و ظن، کسرت و کثرت، عام اور آم، لعل اور لال، سریر اور صریر، تال اور تعل، جعل اور جال،، باد اور بعد، باذ اور بعض، عرض اور ارض، حال اور ہال،، جالی اور جعلی، صورت اور سورت، مامور اور معمور، تانا اور طعنہ، ذکی اور زکی وغیرہ کے املوں میں یکسانگی پیدا ہوجائے گی تو صرف یہی نہیں کہ ان کے ماخذ کا پتہ لگانا مشکل ہوگا بلکہ ان کے معنی تک پہنچنے میں بھی دقت ہوگی۔

بالفرض اس تجویز کو قبول بھی کرلیا جائے تو اردو جس بلند منزل پر پہنچ گئی ہے اس میں یہ تبدیلی خوشگوار ثابت ہوگی، اس وقت کروڑوں آدمی ہیں جو صرف املا دیکھ کر لفظوں کی قرأت روانی اور تیزی سے کرلیتے ہیں یعنی ان کی نظریں الفاظ کو خاص خاص املوں میں دیکھنے کی عادی ہوچکیں لیکن جب :

حضرت کو ہزرت

صاحب کو ساہب

حفیظ کو ہفیز

طرح کو ترہ

عرض کو ارز

وغیرہ کی صورت میں دیکھیں گے تو انھیں ایک طرح کی الجھن ہوگی اور پوری روانی کے ساتھ عبارت کو نہ پڑھ سکیں گے، جو لوگ خارج شدہ حروف کی شکلوں سے یکسر ناواقف ہوں گے وہ شاید اس کی مشق بہم پہنچالیں لیکن عربی اور قرآن سے جو رشتہ استوار ہے وہ ختم ہوجائے گا۔

علاوہ ازیں جس وقت اردو حروف تہجی سے مندرجہ بالا آٹھ آوازیں خارج کردی جائیں گی اور لفظ کے تلفظ یا آواز دینے والے حروف و حرکت ہی کی بنیاد پر اس کا املا لکھا جائے گا تو اردو کے ہزاروں الفاظ کی ظاہری صورت مسخ ہو کر کچھ سے کچھ ہوجائے گی۔

۱۔ فی الحال کو فلحال، فی الواقع کو فلواقع اور فی الوقت کو فلوقت لکھا جائے گا۔

۲۔ عبدالرشید، خواہش، والصلوٰۃ کو عبدرشید، خاہش اور سلات لکھا جائے گا۔

۳۔ سمیع، تجمیع، اور وقیع وغیرہ سمی، تجی، وقی ہوجائیں گے۔

۴۔ رکعت، وقعت، بدعت وغیرہ کا لکھنا مشکل ہوجائے گا اور اگر لکھا گیا، وہ رکات، وقات اور بدات ہوجائیں گے اس لئے کہ "ع" کی جگہ الف استعمال ہوگا۔

۵۔ قاعدہ، مشاعرہ اور معتمد وغیرہ کو قاادہ، مشاارہ اور ماتمد لکھا جائے گا۔

۶۔ عربی کے مروجہ الفاظ شریف، مجید وغیرہ کو شریفن، مجیدن لکھا جائے گا۔

۷۔ فوراً، ابتداً، اور سہواً وغیرہ کا املا فورن، ابتدن اور سہون ہوجائے گا۔

۸۔ عیسیٰ، توسیع، اسماعیل وغیرہ، ایسا توسی اور اسمایل میں بدل جائیں گے۔

غرضکہ لاکھوں الفاظ کا املا بدل جائے گا۔ اور اردو زبان و ادب کا چار سو سالہ ذخیرہ خاک میں مل جائے گا۔ نہ کوئی اس کا پڑھنے والا ہوگا نہ لکھنے والا۔ سارے کتب خانوں اور علمی و ادبی ذخیروں کو دریا برد کر کے ایک نئی زبان کے لئے کام شروع کرنا ہوگا۔ ہم بتا چکے ہیں زبان اور رسم الخط کی ترقی و تبدیلی عام طور پر زندگی کے تقاضوں کے مطابق خود بہ خود ہوتی رہتی ہے۔ کسی شخص یا گروہ کی شعوری کوشش اس پر بہت کم اثر انداز ہوتی ہے۔ بفرض محال ایسی کوشش کی بھی جائے تو صدیوں کے بعد بار آور ہونے کے امکان ہوسکتے ہیں۔

ایک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

آج کا ایٹمی دور بھلا اس کی اجازت کہاں دے گا؟ زبان رسم الخط کی تبدیلی کے ساتھ ہی ہمارا ثقافتی و تہذیبی سرمایہ خود اپنے ہاتھوں خاک میں مل جائے گا۔ تجربہ کرنا ہو تو کسی علمی و ادبی کتاب کا ایک پیراگراف لے لیجئے اور اسے نئے املا کے مطابق لکھ کر دوبارہ پڑھنے کی کوشش کیجئے۔ وہ پیراگراف آپ کی نظروں کے لئے اتنا اجنبی ہوگا کہ پڑھنا مشکل ہوجائے گا۔ ایسی صورت میں اردو رسم الخط کو معمولی دقتوں کی وجہ سے بدلنا اور اردو کی لاکھوں علمی و ادبی کتابوں کو نئی نسل کے لئے مہمل بنانا کہاں کی دانش مندی ہوگی۔

اردو رسم الخط کی اصلاح کے سلسلے میں دوسری تجویز یہ پیش کی جاتی ہے کہ موجودہ رسم الخط رومن رسم الخط سے بدل دیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اردو زبان وہی ہے جو ہم لکھتے پڑھتے اور بولتے ہیں لیکن اسے ا، ب، پ، ت وغیرہ کے بجائے A,B,C,D وغیرہ کے حروف میں لکھا جائے۔ رومن رسم الخط کی تائید میں جو باتیں اردو کے حق میں کہی جاتی ہیں وہ یہ ہیں کہ اگر رومن کو اپنا لیا گیا تو اردو املا آسان ہوجائے گا۔ بین الاقوامی اتحاد میں اس سے مدد ملے گی۔ علمی و ادبی ذخیرہ میں اضافہ ہوگا۔ اور اردو تیزی سے ترقی کرکے دنیا کی بڑی زبانوں میں شمار ہونے لگے گی۔

یہ باتیں جتنی آسانی سے کہہ دی گئی ہیں اتنی آسانی سے ہاتھ آنے والی نہیں ہیں۔ ہم پچھلی سطور میں وضاحت سے بتا چکے ہیں کہ زبان اور رسم الخط میں جسم و جان کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ ساتھ ساتھ جی سکتے ہیں اس لئے انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ان کے ساتھ کھلی دشمنی ہوگی۔ ہم یہ بھی واضح کرچکے ہیں کہ اردو میں حروف کی تعداد پچاس سے زیادہ اور رومن میں صرف چھبیس ہے۔ ظاہر ہے کہ چھبیس آوازیں کسی طرح بھی پچاس آوازوں کی نمائندگی نہیں کرسکتیں۔ مثلاً "چ" اور "ش" کی آوازوں کے لئے رومن میں کوئی حرف نہیں ہے۔ حالانکہ یہ آوازیں Picture and Admission وغیرہ قسم کے ہزاروں الفاظ میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ طے کرنا مشکل ہے کہ کن کن حروف سے یہ آوازیں پیدا ہوں گی

میں "چ" کی آواز الگ الگ طریقوں سے پیدا کی گئی ہے۔ "ش" کی آواز آٹھ دس طریقوں سے پیدا کی جاتی ہے۔ یہی حال دوسری آوازوں کا ہے۔ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس رسم الخط میں اردو کا لکھنا کتنا مشکل ہوگا؟

سب جانتے ہیں کہ رومن میں حروف کی رسم الخط آوازوں اور الفاظ کے تلفظ کا کوئی مستقل نظام نہیں ہے۔ ہر لفظ کی اسپیلنگ ازبر کرنی پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں اردو کو رومن میں لکھ کر اس کے اصل، تلفظ اور لہجے کو برقرار رکھنا مشکل ہوگا۔ سینکڑوں الفاظ کا تلفظ مسخ ہوگا۔

علاوہ ازیں اردو میں عربی اور ہندی کی آوازیں بہت سی شامل ہیں ان آوازوں کو علامتوں کے ذریعہ ہم پہچان لیتے ہیں کہ کون لفظ کس زبان سے آیا ہے مثلاً ڑ، بھ، پھ، کھ وغیرہ کو لے لیجئے۔ جن لفظوں میں یہ آوازیں اور ان کے نمائندہ حروف آئیں گے وہ ہندی اور عربی زبانوں کے لفظ ہوں گے۔ رومن میں ان کی آوازیں کہاں سے لائی جائیں گی؟ اور بالفرض اگر انھیں ظاہر بھی کیا جائے تو وہ علامتیں کہاں ہوں گی جن کے ذریعے ان کے لسانی رشتے کی شناخت کر لی جاتی ہے۔ غرض کہ اردو کو رومن رسم الخط میں اول تو لکھا ہی نہیں جا سکتا اور اگر ایسا کیا جائے تو اس سے فائدہ کے بجائے سخت نقصان پہنچے گا۔

اردو کے پارکھوں اور زبان کے عالموں نے اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے اور بار بار سوچا ہے تائید و تردید کی دلیلوں کو نظر میں رکھا ہے، سود و زیاں کے تناسب کا اندازہ کیا ہے اور آخرکار پرزور طریقے سے رومن رسم الخط کی مخالفت کی ہے۔ ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ رومن رسم الخط میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ اس میں اردو زبان کی ساری آوازیں ادا کی جاسکیں۔

۲۔ رومن میں تلفظ اور ہجے کی مشکلات اتنی زیادہ ہیں کہ اس کے ذریعے اردو لکھنا پڑھنا آسان ہونے کے بجائے اور مشکل ہو جائے گا۔

۳۔ رومن رسم الخط اردو رسم الخط کے مقابلے میں زیادہ جگہ گھیرتا ہے۔ چنانچہ اس سے کتاب کا حجم خواہ مخواہ بڑھے گا اور لاگت زیادہ آئے گی۔

۴۔ اردو رسم الخط کا فارسی اور عربی سے گہرا رشتہ ہے۔ رومن کو اپنانے سے یہ رشتہ ختم ہو جائے گا۔ اور ہمارے ثقافتی و تہذیبی مشترک سرمائے کو نقصان پہنچے گا، عربی زبان سے ہم دور ہو جائیں گے اور اس کے سیکھنے میں ہمیں بڑی دقت ہوگی۔

۵۔ ہمارے اسلاف نے تحریری شکل میں جو کارنامے یادگار چھوڑے ہیں ان سے ہمارا رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ اور ہم اپنی جڑوں کو کاٹ کر من حیث القوم زندہ نہ رہ سکیں گے۔

یہ ہیں وہ اسباب جن کے تحت آل پاکستان اردو تدریس کانفرنس منعقدہ کراچی ۲۶ تا ۳۰ دسمبر ۱۹۶۱ میں متفقہ طور پر رومن رسم الخط کی تجویز رد کی گئی تھی اور اسے اردو زبان کے وجود کے لئے خطرہ بتایا گیا تھا۔ واقعہ بھی یہی ہے رومن رسم الخط اپنے ناقص صوتیات کے تحت اردو الفاظ کے تلفظ کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ ہر لفظ اس طرح مسخ ہوگا کہ اس کا صحیح پڑھنا مشکل ہو جائے گا۔ اردو کیا خود انگریزی الفاظ کا تلفظ رومن رسم الخط کی پیچیدگی کے سبب، صحت کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر مستند لغت میں ہر لفظ کے ساتھ اس کا صحیح تلفظ قوسین کے اندر لکھ دیا جاتا ہے۔

برنارڈ شا نے رومن رسم الخط کی اس خرابی کے سبب اس میں اصلاح کی تجویز پیش کی تھی۔ انھوں نے سات سو الفاظ تیار کر کے ماہرین انگریزی کو دیئے تھے اور کہا تھا کہ اس نہج پر انگریزی رسم الخط کی از سر نو تشکیل کی جائے اور جن آوازوں کے لئے رومن میں حروف نہیں ہیں ان کے لئے حروف ایجاد کئے جائیں۔ چنانچہ ماہرین زبان کی ایک جماعت نے برنارڈ شا کی تجویز پر سنجیدگی سے غور کر کے اسے قبول بھی کر لیا تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم پچھلے صفحات میں بتا چکے ہیں، کسی زبان کا رسم الخط خواہ کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہو اسے بدلنا یا اس میں تبدیلی لانا جس سے ماضی کے علمی و ادبی سرمائے کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو بہت مشکل کام ہے۔ چنانچہ رومن رسم الخط اپنی ہزار خرابیوں کے باوجود اپنی پرانی ڈگر ہی پر قائم ہے۔

ان مباحث کی روشنی میں جو لوگ رومن رسم الخط کو اردو کے لئے تجویز کر رہے ہیں وہ بالغ نظری کا ثبوت نہیں دے رہے ہیں۔ ان کی نظر میں اس تبدیلی کے وہ مضر نتائج نہیں ہیں۔ جن کا اوپر مفصل ذکر کیا گیا ہے اور اگر ان نتائج سے باخبر ہوتے ہوئے بھی وہ رومن رسم الخط کی تائید کر رہے ہیں تو یہی کہنا پڑے گا کہ وہ اردو کے دوست نہیں دشمن ہیں۔

اردو رسم الخط کے سلسلے میں یہ بات بھی اکثر زیر بحث رہتی ہے کہ نستعلیق کو اپنایا جائے یا نسخ کو۔ اب تک نستعلیق اور نسخ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی زیادہ توجہ نستعلیق پر دی گئی ہے۔ اور کتابوں کی طباعت عموماً اسی میں ہوئی ہے۔ نظام تعلیم میں بھی کسی خاص خط کو مستقلاً نہیں اپنایا گیا۔ کبھی نسخ کا انتخاب کیا گیا ہے کبھی نستعلیق کا۔ کبھی ایک ہی نصابی کتاب نصف نستعلیق میں چھاپی گئی ہے اور نصف نسخ میں۔ اس شتر گربگی کا یہ نتیجہ ہوا کہ نہ تو طلبہ کسی خط پر عبور حاصل کر سکے اور نہ طباعت کا کام فروغ پا سکا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ نسخ اور نستعلیق کے انتخاب کے مسئلے نے اردو کی اشاعت میں بڑی رکاوٹ ڈالی۔

نسخ اور نستعلیق میں سے کس خط کو اپنانا چاہئے اور کیوں اپنانا چاہئے؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں خطوں کے بارے میں بنیادی باتیں معلوم کر لی جائیں۔

خط نسخ، سامی زبانوں، خاص طور پر عربی رسم الخط کی وہ ترقی یافتہ صورت ہے، جس کی ایجاد کا سہرا ابن مقلہ کے سر ہے۔ ابن مقلہ ۲۷۲ھ میں پیدا ہوا۔ خلیفہ القاہر باللہ عباسی کا وزیر رہا اور ۳۱۰ھ کے قریب اس نے جدید خط کوفی اور معقلی کے امتزاج سے ایک نیا خط نسخ کے نام سے رائج کیا۔ عہد وزارت میں اس نے خلیفۂ وقت کے خلاف سازش کی، گرفتار کیا گیا اور اس کا دایاں ہاتھ اور زبان کاٹ لی گئی۔ تقریباً ۵۶ سال کی عمر میں ۳۲۸ھ میں انتقال کیا۔ ابن مقلہ کا کمال یہ تھا کہ جب دایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا تو وہ کہنی میں پنچی باندھ کر لکھتا تھا۔ اور لاجواب لکھتا تھا۔ اس نے ایک روشنائی بھی ایجاد کی تھی اور اس سے اس کا خط مزید

روشن ہوجاتا تھا۔ خط نسخ کو مزید سنوارنے بنانے کا کام ابن بواب اور یاقوت نامی خطاطوں نے کیا۔ ابن بواب، نسخ کا مشہور ترین خطاط تھا۔ وہ ابن مقلہ کی وفات سے تقریباً ۸۴ سال بعد پیدا ہوا اور خطاطی میں نام روشن کر کے ۴۱۳ھ مطابق ۱۰۳۱ء کے لگ بھگ بغداد میں وفات پائی۔ ابن بواب کے بعد یاقوت کے نام کے تین خطاطوں نے نسخ میں نام پایا اور آخری یاقوت متوفی ۱۲۹۹ء مطابق ۶۹۸ھ نے خط نسخ کو حد کمال تک پہنچا دیا۔

"خط نسخ" ترچھے حروف میں لکھا جاتا ہے۔ نسخ کا ہر دائرہ شروع سے آخر تک یکساں ہوتا ہے اور حرفوں میں کسی قدر ناہمواری پائی جاتی ہے۔ یعنی دائرے گول ہونے کے بجائے اپنا نچلا حصہ چپٹا رکھتے ہیں جن کی وجہ سے ان میں زاویئے پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہ خط ٹائپ کے لئے نہایت موزوں ہے چونکہ قرآن بھی اسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے اس لئے اسے قرآنی رسم الخط بھی کہتے ہیں۔ عربی اور فارسی میں اسی رسم الخط کو اپنالیا گیا ہے۔ نتیجۃً ٹائپ اور طباعت کی مشکلات پر قابو پالیا گیا ہے اور نسخ ٹائپ میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

"نستعلیق" کا لفظ "نسخ" اور "تعلیق" سے مرکب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امیر علی تبریزی نے ان دونوں خطوں کو ملا کر ایک نیا خط ایجاد کیا۔ "نسخ" کا "خ" ثقالت کے سبب غائب ہوگیا اور اس نئے خط کا نام "نستعلیق" پڑ گیا۔ نستعلیق ایرانیوں کی ایجاد ہے اور ان کی لطافت طبع وخوش ذوقی پر دلالت کرتا ہے اس میں مصورانہ شان اور نقاشی کا بانکپن ہے۔ اس کے حروف کی نوکیں، گردنیں اور نیچے کا حصہ باریک ہوتا ہے، دائرے خوشنما اور گول ہوتے ہیں، صحت تلفظ کے لئے اعراب (زبر، زیر، پیش) کا استعمال ان کے حسن کو کچھ اور بڑھا دیتا ہے۔ لیکن اردو والے دونوں خطوں سے شناسا ہیں اور دونوں کا لکھنا پڑھنا ان کے لئے کچھ ایسا مشکل نہیں ہے۔ لیکن ٹائپ اور طباعت کے لئے نستعلیق اتنا کارآمد نہیں جتنا کہ نسخ ہے۔

بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، نستعلیق حروف ٹائپ کی کلید (Key Board) کے لئے کچھ زیادہ موزوں نہیں ہیں۔ وہ طباعت واشاعت کے سلسلے کی جدید مشینی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتے، اس کے دائرے، شوشے، کرسی اور نشست قائم رکھنے کے لئے ٹائپ کے اتنے جوڑوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ کمپوزنگ میں ہاتھ آسانی اور تیزی سے نہیں چلتا۔ ٹائپ میں بھی یہی دقت ہے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ نستعلیق کے خوبصورت شوشے اور دائرے مشین میں جلد ٹوٹ جاتے ہیں اگر انھیں مضبوط بنانے کے لئے عام سیسے کی جگہ کوئی اور مضبوط دھات استعمال کریں تو خرچ زیادہ ہوگا اور کاروباری نقطۂ نظر سے مفید و مقبول نہ ہوگا۔ نستعلیق اس وقت تک تھا جب تک لیتھو یعنی پتھر کی چھپائی کا رواج تھا اور کاتب عبارت کو ہاتھ سے لکھتا تھا۔ مشینی دور میں لیتھو کی چھپائی عام طباعت کے لئے اختیار نہیں کی جاسکتی۔ ایک تو اس میں دیر لگتی ہے دوسرے بڑی تعداد میں طباعت نہیں ہوسکتی، حرف اڑنے لگتے ہیں، موسم کا اثر پڑتا ہے۔ مختلف کاتبوں کی وجہ سے یکسانگی نہیں رہتی۔ غلطیوں کی اصلاح میں دقت ہوتی ہے۔"

اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہوگا کہ خط نستعلیق، دور حاضر کی مشینی طباعت کا ساتھ پوری طرح نہیں دے سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ نستعلیق حروف کے ٹائپ اب سے بہت پہلے حیدرآباد میں تیار کئے گئے تھے اور طباعت کا کام بھی لیا گیا تھا، لیکن آخر اس کی مشکلات محسوس ہونے لگیں اور عہد حاضر کے برق رفتار زمانے کے لئے ناکام قرار پایا۔ ایسی صورت میں نسخ ہی کو اپنانے سے اردو کی ترقی کے امکانات روشن ہوسکتے ہیں۔ نستعلیق کی دیدہ زیبی کا سب کو اعتراف ہے لیکن محض آرائش سے کام نہیں چل سکتا۔ خط کے افادی پہلو کو بھی پوری طرح نظر میں رکھنا ہوگا۔

"خط نسخ" اردو داں طبقے کے لئے اجنبی نہیں ہے۔ ہزاروں کتابیں خط نسخ میں پہلے بھی چھاپی گئی ہیں اور آج بھی چھاپی جارہی ہیں۔ خاص طور پر عربی فارسی نے نسخ کو اپنا کر طباعت وٹائپ کے کام کو جس قدر آسان اور تیز تر بنا دیا ہے وہ ہمارے آپ کے سامنے کی بات ہے۔ چنانچہ مزید وقت ضائع کئے بغیر اردو کے لئے نسخ کو اپنا لینا مناسب ہوگا۔ جیسا کہ ابھی کہا جاچکا ہے خط نسخ ہمارے لئے نیا نہیں ہے۔ قرآن کے توسط سے چھوٹے بڑے سبھی اس سے آشنا ہیں۔ عربی و فارسی ہی میں نہیں خود اردو میں نسخ کے نہایت کامیاب تجربے کئے جاچکے ہیں۔ سرسید تحریک کا آرگن "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" نسخ ٹائپ میں شائع ہوتا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" اور مولانا محمد علی جوہر کا "ہمدرد" نسخ ٹائپ ہی میں نکلتا تھا۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو نسخ کی تائید میں جاتی ہیں۔ چنانچہ اگر ہمیں اردو کو واقعی ترقی دینا ہے تو مزید بحثوں میں پڑنے کے بجائے متفقہ طور پر اردو کی طباعت و اشاعت کے لئے نسخ ٹائپ کو اپنا لینا چاہئے۔

لیکن محض نسخ کو اپنا لینے سے اردو ٹائپ اور طباعت کی اصل دقتیں دور نہیں ہوسکتیں، اردو ٹائپ رائٹر چونکہ کم بنتے ہیں اور کم بکتے ہیں۔ اس لئے گراں ملتے ہیں۔ اس لئے ان پر لاگت بھی زیادہ آتی ہے۔ یہی صورت طباعت کی ہے۔ نتیجتاً اردو کتابوں کی طباعت و اشاعت اور تیز رفتاری کے ساتھ ممکن نہیں جو انگریزی یا فارسی وعربی کو میسر ہے۔ اس سلسلے میں نسخ کو اپنانے کے ساتھ ضرورت اس بات کی ہوگی کہ ٹائپ رائٹر بنانے والوں کے ساتھ حکومت ترجیحی سلوک کرے۔ یعنی انھیں ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائے اور کام کرنے والوں کی ہمت افزائی کرے۔ ٹائپ نویسوں کی تعلیم وتربیت کے لئے انسٹی ٹیوٹ کھولے جائیں اور ٹائپ نویسی کو پبلک کے لئے ارزاں بنایا جائے۔ لیکن ان اقدامات سے بھی پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ سرکاری و نیم سرکاری اداروں، عدالتوں و دفتروں اور کاروباری حلقوں میں اردو ٹائپ کو مروج کرنے اور انگریزی کی جگہ قومی زبان اردو کو اپنانے کے احکامات جاری کئے جائیں۔ ساری خط وکتابت اردو میں کی جائے۔ ہر قسم کی ملازمتوں کے امتحانات میں اردو کو ذریعۂ جوابات بنایا جائے۔ زبانی اور تحریری دونوں قسم کے امتحانوں میں اردو کو انگریزی پر ترجیح دی جائے۔ جب تک ایسا نہ کیا جائے گا اردو حقیقی ترقی سے محروم رہے گی۔ نہ ٹائپ مقبول ہوگا نہ اس کی طباعت۔ انھیں مقبول اور ارزاں بنانے کے لئے زندگی کے ہر شعبے میں اردو کو عملاً نافذ کرنا ہوگا۔ ☆☆☆

کچھ اردو رسم الخط کے بارے میں

شمس الرحمٰن فاروقی

شمارہ ۲۵۰
نومبر ۲۰۰۱

یہ ہماری زبان کی بدنصیبی ہی کہی جائے گی کہ اس کا رسم الخط بدلنے کی تجویزیں بار بار اٹھتی ہیں، گویا رسم الخط نہ ہوا کوئی ایسا داغ بدنامی ہوا کہ اس سے جلد از جلد چھٹکارا پانا بہت ضروری ہو۔ کبھی اس کے لئے رومن رسم خط تجویز ہوتا ہے، کبھی دیوناگری۔ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ رسم خط میں تبدیلی کی بات کہنے والے اکثر خود اہل اردو ہی ہوتے ہیں۔ جب سے انگریز بہادر کی نگاہ کرم اس بات پر پڑی، اس کے دوست نما دشمنوں کی تعداد بڑھتی ہی گئی ہے۔ انگریزوں نے پہلے تو اس کا نام "ہندی" سے بدل کر "ہندوستانی" رکھنا چاہا۔ جب وہ نہ چلا تو ان کی خوش قسمتی سے لفظ "اردو" ان کے ہاتھ آ گیا۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر تک "زبان اردوے معلیٰ" کا خطاب فارسی کے لئے عام تھا۔ اور لفظ "اردو" کے معنی تھے "شاہجہاں آباد کا شہر" یا "قلعۂ معلیٰ شاہجہاں آباد" جب دہلی (یعنی اردو بمعنی "دہلی شہر") میں ہندی (یعنی آج کے معنی میں اردو زبان) عام ہوئی تو اس کو (یعنی "ہندی" کو) "زبان اردوے معلیٰ" کہا جانے لگا۔ پھر مختصر ہوتے ہوتے یہ فقرہ "زبان اردو"، یا "اردو کی زبان" اور پھر صرف "اردو" رہ گیا۔ انگریزوں کو بھی یہ بات موافق آتی تھی، کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ ہندوؤں کی کوئی الگ زبان ہو اور وہ "ہندی" کہلائے۔ لہٰذا انھوں نے "ہندی" کا نام ہماری زبان سے چھین کر ایک نئی زبان کو دے دیا، اور ہماری زبان کا نام صرف "اردو" رہ گیا۔ یعنی انگریزوں کی مہربانی سے ہماری زبان سارے ہندوستان کی زبان کے بجائے "اردو" یعنی "لشکر بازار" یا "شاہی کیمپ اور دربار" کی زبان ٹھہری۔

انگریزوں نے دوسرا ستم یہ کیا کہ انھوں نے لفظ "اردو" کے معنی "لشکر بازار، شاہی کیمپ اور دربار" نہیں، بلکہ "فوج، لشکر" بیان کئے۔ آہستہ آہستہ یہ بات اتنی مقبول ہوئی کہ سب اردو والے بھی یہی سمجھنے لگے کہ ہماری زبان دراصل ایک فوجی اور لشکری زبان ہے۔ ابھی حال ہی میں "ہماری زبان" میں ایک نظم چھپی ہے جس میں یہ بات کم و بیش فخریہ کہی گئی ہے کہ اردو "لشکری" زبان ہے۔ احسن مارہروی نے ۱۹۱۰ میں ایک طویل نظم "اردو لشکر" کے نام سے لکھی اور طبع کرائی تھی۔ میں نے اس کا ایک نسخہ نظامی بک ایجنسی بدایوں کے یہاں سے بڑے اشتیاق سے منگوایا کہ دیکھیں۔ آج سے کوئی سو برس پہلے احسن مارہروی نے اردو زبان کے نام کے بارے میں شاید کوئی دلچسپ بات کہی ہو، یا شاید یہ بتانا چاہا ہو کہ اردو دراصل "لشکری" زبان نہیں ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اس نظم میں وہی عام بات دہرائی گئی ہے کہ اس زبان کی پیدائش اور ترقی مسلمانوں کے زمانے میں اور ان کی فوج وغیرہ میں ہوئی۔ لفظ "اردو" کے غلط لیکن مقبول معنی "لشکر" کی مناسبت سے احسن مرحوم نے اپنی نظم کا نام "اردو لشکر" رکھ دیا، اور ولی دکنی سے لے کر اپنے زمانے تک کے بڑے ادیبوں کو "اردو لشکر کے سردار" قرار دیا۔

ابتدا اس کی ہوئی ہے اس زمانے میں یہاں
جب مسلمانوں کا تھا ہندوستاں میں خوب راج
گو عدالت کی زباں اردو نہ تھی پھر بھی بہت
فوج میں بازار میں چلتا تھا اس سے کام کاج

اس پر طرہ یہ کہ اردو کو انگریزوں کا احسان مند ٹھہرایا گیا ہے۔ احسن مارہروی کہتے ہیں۔

ہے گورنمنٹ اپنی عادل ہم کو ہے اس سے امید
وہ ہمارے حال پر فرمائے گی بے شک کرم
کی حمایت جس قدر اردو زباں کی آج تک
وہ نہیں کچھ کم جو آسانی سے ہو جائے رقم
عدل پر اس سلطنت کے ناز کرنا چاہئے
ایسے عادل ایسے منصف تھے نہ کسریٰ اور جم

ایسی صورت میں اگر گلکرسٹ (Dr. John Gilchrist) کو اردو کا محسن اعظم قرار دیا گیا تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ اگر ہماری زبان کا اصل نام، یعنی "ہندی" برقرار رکھا جاتا تو یہ افسانہ گھڑنا اور رائج کرنا ممکن نہ تھا کہ یہ لشکری زبان ہے۔ بھلا کون تھا جو تسلیم کرتا کہ جس زبان کا نام "ہندی" ہو، اسے لشکریوں اور فوجیوں نے رائج کیا تھا؟ میر امن نے جب "باغ و بہار" میں "اردو" (یعنی دہلی) کی زبان کی "تاریخ" اپنے لفظوں میں بیان کی تو انھوں نے سب سے بڑی ناانصافی اس زبان کے ساتھ یہ کی کہ انھوں نے یہ کہیں کہا ہی نہیں کہ یہ زبان (جسے وہ "اردو" کی زبان کہہ رہے ہیں) دراصل "ہندی" کے نام سے جانی جاتی ہے۔ انھوں نے یہ تو کہا کہ اس زبان کو "اردو" (یعنی دہلی) کے سارے لوگ بولتے ہیں، کیا ہندو کیا مسلمان، کیا عورتیں کیا مرد، کیا بچے کیا بوڑھے، لیکن

انھوں نے یہ بتانے سے گریز کیا کہ اس زبان کا نام "ہندی" ہے۔ جب میر کہتے ہیں۔

کیا جانے لوگ کہتے ہیں کس کو سرور قلب
آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زبان کے بیچ

تو ان کی مراد جے شنکر پرشاد اور رام چندر شکل کی ہندی سے نہ تھی، اور نہ ٹی وی اور آکاش وانی کی ہندی سے تھی۔ لفظ "ہندی" سے میر وہی زبان مراد لے رہے تھے جس میں وہ شعر کہتے تھے اور جسے ہم آج "اردو" کہتے ہیں۔

جب ہماری زبان کا نام "ہندی" سے "اردو" بنا دیا گیا تو انگریزوں اور انگریزوں کے حمایتی "قوم پرست" ہندوؤں کی توجہ رسم خط پر زیادہ زور وشور سے ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ اپنی خوبصورتی، کم جگہ میں زیادہ الفاظ کھپا دینے کی صلاحیت، فنکارانہ تنوع کے امکانات، اور فارسی، عربی، سنسکرت سے اس کے ربط کے سبب سے اردو کا رسم الخط ہندوستانی تہذیب کی شانوں میں ایک شان ہے۔ اور اردو کے مخصوص حالات کو مد نظر رکھیں تو اسے اردو زبان کی جان کہا جا سکتا ہے۔ یعنی موجودہ حالات میں اردو کا رسم الخط بدلنے کی تجویز درحقیقت اردو کو موت کے گھاٹ اتارنے کی تجویز ہے۔ رنج کی بات یہ ہے کہ اردو کے مخالفین، اور دوست نما دشمن، مدت دراز سے اس کے رسم الخط کو اپنی دشمنی کا ہدف بنائے ہوئے ہیں۔

اردو کا رسم الخط بدل کر اسے رومن میں لکھنے کی تجویز سب سے پہلے حضرت گلکرسٹ (Gilchrist) نے رکھی تھی۔ افسوس ہے کہ ہم میں سے اکثر اب بھی گلکرسٹ کو اردو زبان کے محسنین میں شمار کرتے ہیں، جب کہ حقیقت برعکس ہے۔ اپنی کتاب The Oriental Fabulist مطبوعہ ۱۸۰۳ میں گلکرسٹ نے بخیال خود یہ "ثابت" کیا تھا کہ اردو ہی نہیں، بلکہ اور بھی کئی ہندوستانی زبانوں کو رومن رسم خط میں "آسانی اور صحت کے ساتھ" لکھا جا سکتا ہے۔ اس معاملے پر تھوڑی سی بحث مرحوم عتیق صدیقی نے اپنی کتاب Origins of Modern Hindustani Literature مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۶۳ میں پیش کی ہے۔ لیکن گلکرسٹ کی تجویز میں جو سامراجی تکبر اور حاکمانہ تنگ نظری پنہاں ہے، اس کی طرف عتیق صدیقی نے اعتنا نہیں کیا۔ اس تجویز پر اعتراض کے بجائے صدیقی مرحوم نے اسے "ہندوستان کو متحد کرنے کی قابل تعریف کوشش" کا نام دیا ہے۔

گلکرسٹ کی بات پر اس وقت شاید زیادہ توجہ نہ دی گئی۔ لیکن جب انگریزوں کے زیر اثر اردو اور "ہندی" کی تفریق قائم ہونے لگی، اور "ہندی" زبان کو ہندوؤں کے "قومی تشخص" کی پہچان بنایا جانے لگا، تو ملک کے ایک طبقے نے، جو انجانے میں انگریزی سامراج کا شکار بن چکا تھا، اردو کی مخالفت کو بھی "ہندی" کے قیام کے لئے ضروری جانا۔ اردو کی مخالفت جن بنیادوں پر کی جانے لگی، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ اردو کا رسم خط "ناقص ہے" یا/ اور غیر ملکی ہے۔ چنانچہ راجندر لال مترا نے ۱۸۶۴ میں ایک مضمون بزبان انگریزی لکھا اور اپنے تئیں ثابت کیا کہ ناگری رسم الخط کو اردو رسم الخط پر فوقیت ہے۔ اس زمانے میں اردو رسم خط کو رومن کر دینے کی بات اتنے زور شور سے اٹھائی جا رہی تھی کہ گارساں دتاسی نے خدشہ ظاہر کیا کہ کہیں سیاسی مصلحت اور دباؤ کے تحت انگریز لوگ اردو کا رسم خط رومن کر ہی نہ ڈالیں۔ دتاسی نے لکھا کہ ایسا ہوا تو بہت برا ہوگا۔ اس معاملے کی تفصیل کے لئے فرمان فتحپوری کی کتاب "اردو املا اور رسم الخط" مطبوعہ اسلام آباد ملاحظہ ہو۔

راجندر لال مترا نے اپنے زمانے کے "ہندو قوم پرست" حلقوں پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ بھارتیندو ہریش چندر سے بھی ان کے مراسم تھے۔ کچھ عجب نہیں کہ اگر بھارتیندو کو اردو سے ناگری رسم خط والی "ہندی" کی طرف راغب کرنے میں "ہندو قوم پرست" حلقوں کا ہاتھ تھا، تو انھیں اردو سے متنفر کرنے، اور اس کے رسم الخط میں کیڑے نکالنے کی طرف راجندر لال مترا نے مہمیز کیا ہو۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ وہی بھارتیندو ہریش چندر جنھوں نے ۱۸۷۱ میں لکھا تھا کہ میری اور میرے گھرانے کی عورتوں کی زبان اردو ہے، دس سال بعد ایجوکیشن کمیشن کے سامنے یہ کہتے ہوئے پائے جائیں کہ اردو رسم الخط ایک طرح سے مسلمانوں کی سازش ہے، کہ اس میں "لکھئے کچھ اور پڑھئے کچھ" کی آسانی ہے۔ اس طرح عام سادہ لوح رعایا کو دھوکا دینے کے لئے یہ رسم خط نہایت موزوں ہے! ان معاملات کی تفصیل کے لئے وسودھا ڈالمیا کی کتاب ملاحظہ ہو جو ۱۹۹۷ میں دہلی آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی ہے۔ : The Nationalization of Hindu Tradition Bharatendu Harishchandra and Nineteenth Century-Banaras اس کے علاوہ ساگری سین گپتا کی پی ایچ ڈی تھیسس بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے اجزا Annual of Urdu Studies No. 91 میں شائع ہوئے ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اردو پر "لکھیں کچھ، پڑھیں کچھ" کا الزام دھرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ خود دیوناگری اس عیب سے خالی نہیں۔ (اگر یہ عیب ہے) انگریزی وغیرہ کا تو پوچھنا کیا ہے، کہ جہاں معمولی آوازوں، مثلاً چ، ش، ف، وغیرہ کو بیان کرنے کے آٹھ آٹھ نو نو طریقے ہو سکتے ہیں۔ دیوناگری کا حال یہ ہے کہ یہاں کھ (Kha) اور ر و (ra va) میں کوئی فرق نہیں۔ "رواتا" لکھئے اور "کھاتا" پڑھئے۔ دھ (dha) اور گھ (gha) میں اتنا کم فرق ہے کہ ذرا سی لرزش قلم سے گھر کی جگہ "دھر"، "دھان" کی جگہ "گھان" ہو جاتا ہے۔ تھ (tha) اور ی (ya) میں بھی اسی قدر کم فرق ہے کہ "تھان" کو "یان" پڑھ لینے کا پورا پورا امکان ہے۔ نون غنہ لکھنے کے لئے طرح طرح کے پاپڑ بیلے جاتے ہیں۔ اس ایک ہی آواز کو تین چار طرح لکھا جاتا ہے۔ "چندر بندو" کچھ ہے، "ڈاں" اور طرح سے ہے، صرف "بندی" اور طرح کی ہے، اور کہیں آدھا ma (م) لگا دیتے ہیں۔ اس رنگ کے الجھاوے اور بھی ہیں، لیکن مثال کے لئے اتنے کافی ہوں گے۔ پھر اس دعوے کے کیا معنی کہ دیوناگری میں غلط پڑھنے کی گنجائش نہیں؟

کھڑی بولی کے متعدد الفاظ دیوناگری میں لکھے ہی نہیں جا سکتے، مثلاً مندرجہ ذیل الفاظ کی لکھائی سے دیوناگری قاصر ہے:

کوا، لئے، گاؤں، ڈیوڑھا، بھن، کواڑ، کوئی، بر وزن فَعَل [وتد مجموع] یا بروزن فع [سبب ثقیل] وغیرہ۔

اسی طرح یہ بھی ہے کہ انگنت الفاظ ایسے ہیں جن میں وسطی یا آخری حرف ساکن ہے لیکن دیوناگری انھیں متحرک لکھنے پر مجبور ہے۔ چنانچہ، چلنا chalana فاصلہ fasala چکنا Chikana گھاس ghasa، جنتا janata وغیرہ لکھنا اور چلنا، راستہ، چکنا، گھاس، جنتا وغیرہ میں متحرک لکھے ہوئے حرف (ل، س، ر م، ک، س، ن) کو ساکن پڑھنا پڑتا ہے جو ناگری رسم تحریر کی روح کے خلاف ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کھڑی بولی (یعنی اردو) اور ناگری رسم خط میں کوئی مناسبت نہیں۔ کھڑی بولی جو بعد میں اردو ہندی یعنی اردو کہلائی، وہ ناگری میں لکھی جانے کا تقاضا ہی نہیں کرتی۔ دیوناگری رسم الخط اور کھڑی بولی میں باہم مناسبت ہوتی تو یہ مشکلات بھی نہ ہوتیں اور یہ عدم مناسبت نہ ہوتی۔

عام اردو والوں نے رسم خط کی تبدیلی، یا املا میں "اصلاح" کی تجاویز کو بھی لائق توجہ نہ جانا۔ یہ ان کی سلامتی طبع کی دلیل ہے۔ لیکن اردو کے بعض "خیر خواہ" حضرات کو خواہ مخواہ ہی کریدگی رہتی ہے کہ اس بے چاری غریب کی جورو کو اپنی بھاوج بنا کر چھیڑتے رہیں۔ آزادی کے فوراً بعد ترقی پسند حلقوں سے آواز اٹھائی گئی کہ اس زبان کو زندہ رہنا ہے تو اسے اپنا رسم الخط بدل کر دیوناگری کر لینا چاہئے۔ جب اس بات پر کسی نے کان نہ دھرے تو آزادی کے دو دہائی بعد پھر بعض لوگوں نے، جن میں کچھ بہت بڑے ترقی پسند نام بھی انفرادی طور پر شامل تھے، یہی نعرہ بلند کیا۔ اس بار احتشام صاحب جیسے جید مفکر اور صائب الرائے ترقی پسند ادیب نے بھی اس آواز کو سختی سے دبا دینے کا مشورہ دیا۔ لیکن اردو کی بے چارگی اس کے "دوستوں" کو ایسی دلکش لگتی ہے کہ وہ اسے بار بار رسوا کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی سیاسی لوگوں کو شوق چراتا ہے کہ اردو کی "اصلاح" فرمانے والوں میں اپنا بھی نام لکھوا لیں۔ چنانچہ آج ایک طرف تو ہمارے کچھ بہت بڑے ادیب کسی نہ کسی عنوان سے اردو کے رسم الخط میں تبدیلی لانے کی بات کرتے ہیں، تو دوسری طرف مولانا ملائم سنگھ بھی اردو والوں سے کہتے ہیں کہ رسم الخط بدل ڈالو، فائدے میں رہو گے۔ (یہی بات مرارجی دیسائی بھی کہتے تھے) فائدہ کیا ہوگا، اس کا حساب تو آسان ہے، کہ بہت ہی کم فائدہ ہوگا۔ لیکن نقصان کتنا ہوگا، اس کا حساب ناممکن ہے، کیوں کہ رسم الخط کی تبدیلی کسی بھی زبان کے لئے خسران عظیم کا باعث ہوتی ہے۔ اردو جیسی بتیس دانتوں میں دبی ہوئی ایک زبان بچاری کا تو پوچھنا ہی کچھ نہیں کہ رسم خط کھو کر وہ کس قعر مذلت میں جا گرے گی۔

اہل اردو براہ کرم اپنے تاریخی سرمائے پر نظر ڈالیں، انگریزوں کی سیاست کو خیال میں لائیں۔ اردو کے رسم خط میں تبدیلی کی ہر سفارش کے ڈانڈے انگریزوں کی ان سازشوں سے ملتے ہیں جو انھوں نے اردو رہندی کا جھگڑا پیدا کر کے اس ملک کے ہندو مسلمان میں تفرقہ ڈالنے کی غرض سے رچی تھیں۔

گلکرسٹ نے اپنی کتاب The Oriental Linguist مطبوعہ ۱۸۰۲ (اول ایڈیشن ۱۷۹۸) میں لکھا ہے کہ میں جس زبان (یعنی اردو) کو "ہندوستانی" کا نام دینا چاہتا ہوں، اس کا اصل نام تو "ہندی" یا "ہندوی" ہے، لیکن اس سے ہمارا خیال ہندوؤں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ "ہندی رہندوی" وہ زبان ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے "حملوں" کے پہلے بولی جاتی تھی۔ [بہت خوب، اسی تحقیق کے بل بوتے پر ہم اہل اردو مسٹر گلکرسٹ کو السنۂ ہند کا ماہر گردانتے ہیں! بہر حال آگے سنئے]۔ گلکرسٹ نے مزید فرمایا کہ یہ بات تو ہے کہ اس [یعنی جس زبان کا نام میں "ہندوستانی" رکھنا چاہتا ہوں] زبان کے بولنے والے اسے "ہندی رہندوی" ہی کہتے ہیں، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ ہندوستانی بیوقوف لوگ ہیں، انھیں ان باریکیوں کی طرف متوجہ بھی کیا جائے تو وہ خاک نہ سمجھیں گے۔ یہ نام ("ہندی") تو ہندوؤں کی زبان کا ہونا چاہئے۔ رفتہ رفتہ "ہندی" کا وہ روپ بھی نمودار ہوگا جس میں سنسکرت اور دیگر "ہندوستانی" عناصر کی کثرت ہوگی۔ مسلمان "ہندوستانی" کو، اور ہندو لوگ "ہندی" کو اختیار کر لیں گے۔ یہ دو طرز اس ملک میں مقبول ہو جائیں گے۔

مندرجہ بالا بیانات کی لغویت کی طرف آپ کو متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ان باتوں کی تردید کرنے کے بجائے خود ہم نے بھی اپنی ہی زبان کی برائیاں شروع کر دیں۔ لیکن ایک بات یہاں ضرور ذہن نشین کر لینی چاہئے۔ گلکرسٹ کی باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ اردو والوں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ وہ فارسی عربی سے بھری ہوئی زبان لکھیں۔ بلکہ "ہندی" والوں کو سمجھایا گیا کہ تم سنسکرت بھری زبان لکھو۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تاراچند کی کتاب The Problem of Hindustani (مطبوعہ الہ آباد ۱۹۴۴) کا مطالعہ سودمند ہوگا۔ انگریزوں کی خوشامد کے باوجود احسن مارہروی کو قومی یکجہتی کا اس قدر پاس ہے کہ انھوں نے اپنی طویل نظم "اردو لشکر" (جس کا ذکر اوپر ہوا) میں فارسی عربی لفظوں کو مع عطف و اضافت لکھنے سے گریز کیا ہے۔ اور انشا تو بہت پہلے "رانی کیتکی کی کہانی" لکھ کر ثابت کر چکے تھے کہ فارسی عربی الفاظ کو برتے بغیر بھی اردو لکھی جا سکتی ہے۔ (اور لطف یہ ہے کہ آج ہندی والے اس کتاب کو اپنی نثر کے شاہکاروں میں گنتے ہیں!) انگریزوں کی سیاست کس کس طرح اردو زبان اور اس کے بولنے والوں پر کارگر ہوئی، اس کو سمجھنے کے لئے آلوک رائے کی کتاب Hindi Nationalism مطبوعہ Longmans سنہ ۲۰۰۱ ملاحظہ ہو۔ آلوک رائے صاحب فرزند ہیں امرت رائے کے، لیکن انھوں نے اس کتاب میں امرت رائے کی بدنام زمانہ کتاب A House Divided کے بیانات کی قلعی کھول دی ہے۔

ادھر کچھ دنوں سے ولایت میں رہنے والے بعض اہل اردو کی طرف سے آواز اٹھی ہے کہ اردو کا رسم خط رومن کر دیا جائے۔ وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ انگلستان میں رہنے والے اہل اردو کے بچے اردو بول تو سکتے ہیں لیکن لکھ نہیں سکتے۔ لہٰذا اگر اردو کا رسم الخط رومن کر دیا جائے تو وہ بخوبی اردو پڑھ اور لکھ بھی سکیں گے۔ ممکن ہے یہ تجویز کسی ایک فرد واحد کو، یا کسی گروہ کو اچھی معلوم ہوتی ہو، لیکن اس کے پس پشت دراصل سہل انگاری اور کاہلی ہے، کہ ہم اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کی زحمت کا ہے

مول لیں، کیوں نہ اردو کو انگریزی کر دیں، ہرے لگے گی نہ پھٹکری اور رنگ (ان کے خیال میں) چوکھا آئے گا۔

میں جاننا چاہتا ہوں کہ اگر یورپ اور امریکہ کے سیکڑوں مقامات میں پھیلے ہوئے لیکن مٹھی بھر یہودی اپنی زبان Yiddish کو اتنا فروغ دے سکتے ہیں کہ اس میں بڑے بڑے ادیب پیدا ہوں، اور ہر یہودی، وہ جا ہے جہاں بھی رہتا ہو، یدش پڑھ اور لکھ لیتا ہو، تو اردو والے جو صرف انگلستان میں لاکھوں کی تعداد میں ہیں، ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

جب بنارس اور الہ آباد کے بنگالی یہاں چار سو برس سے رہتے رہنے کے باوجود اردو کے مذکر مونث، واحد جمع میں اب بھی غلطی کرتے ہیں، کیوں کہ بنگالی میں مذکر مونث نہیں ہے، اور اردو کے واحد جمع کے قاعدے بنگالی میں نہیں چلتے، تو اردو کے لوگ چند ہی برسوں میں اپنی زبان سے اتنے دور کیوں ہو جاتے ہیں کہ انھیں اسے لکھنا یا پڑھنا دشوار ہو جاتا ہے؟ پھر الہ آباد میں تو متعدد ایسے بنگالیوں سے بھی میری ملاقات ہے جو اردو اور بنگالی میں مکمل طور پر ذو لسان ہیں۔ ممکن ہے وہ اردو پڑھ نہ سکتے ہوں، لیکن ان کا شین قاف اتنا ہی درست ہے جتنا کسی اردو والے کا ہو سکتا ہے۔ اور آپس میں وہ اس دھڑلے سے بنگالی میں بات چیت کرتے ہیں کہ ہم لوگ منھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ جو قومیں اپنی زبان اور تہذیب پر افتخار رکھتی ہیں ان کے یہی طور ہوتے ہیں۔ نہ معلوم ہم لوگ اپنی زبان کے بارے میں اس قدر مدافعانہ اور اعتذاری رویہ کیوں اپنائے بیٹھے ہیں؟

خیر، اب ان باتوں سے قطع نظر مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اردو کا رسم الخط رومن کر دینے میں کئی طرح کے نقصانات عظیم ہیں۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

(۱) اردو کا رسم الخط بدلنا اردو زبان اور ادب دونوں کے لئے نقصان دہ ہے۔ بدلا ہوا رسم خط خواہ رومن ہو یا ناگری، اس سے اردو زبان اور ادب دونوں کو ایسا دھکا پہنچے گا کہ ممکن ہے کہ وہ جاں بر ہی نہ ہو سکیں۔ وہ گراں قدر ادبی سرمایہ جو گذشتہ پانچ چھ سو برس سے اردو کے اپنے رسم خط میں لکھا گیا ہے، تقریباً سارے کا سارا ضائع ہو جائے گا۔ ہم اپنے کلاسیکی متون، اور کلاسیکی ہی کیوں، گذشتہ پانچ دہائی کے بڑے متون کے بھی اچھے ایڈیشنوں کے معاملے میں بہت مفلس ہیں۔ جو تہذیب اور معاشرہ اپنے بڑے ادیبوں کے اہم ترین متون کو بھی بازار میں دستیاب نہیں رکھتا، اس سے توقع کرنا فضول اور خام خیالی ہے کہ وہ اپنے سارے گذشتہ سرمائے کو نئے رسم الخط میں منتقل کر کے اسے عام اور متداول کرے گا۔ رسم الخط بدلا گیا تو دس برس بھی نہ گذریں گے کہ زبان اور ادب دونوں پر خاک اڑنے لگے گی۔ اور اردو کے دشمن دل و جان سے یہی چاہتے ہیں۔ اس وقت تو یہ عالم ہے کہ نہ میر کا کوئی معتبر کلیات بازار میں ملتا ہے، نہ میر انیس کا، نہ نصرتی یا باقر آگاہ کا۔ پریم چند، نذیر احمد، منٹو، راشد الخیری، حسن نظامی، بیدی، امجد حیدرآبادی وغیرہ کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ لیکن ان کے پرانے ایڈیشن موجود ہیں اور پڑھنے والے انھیں پڑھ بھی سکتے ہیں۔ جب اردو کا رسم خط رومن یا ناگری ہو جائے گا تو آہستہ آہستہ ان کے پڑھنے والے عنقا ہو جائیں گے۔ کچھ دن بعد اردو کا پرانا سرمایہ اردو میں پڑھنے والا کوئی نہ ہوگا، حتیٰ کہ یہ پرانے، گلے سڑے ایڈیشن بھی کچھ لائبریریوں اور کچھ کباڑیوں کے علاوہ کہیں اور نہ ملیں گے۔ اور رومن یا ناگری میں یہ متون دستیاب ہوں گے نہیں۔ پھر نتیجہ ظاہر ہے۔

(۲) فرض کیا کوئی صورت ایسی نکل آتی ہے کہ اردو کا سارا ادب نہ سہی، سارا اعلیٰ ادب پہلے رومن یا ناگری میں منتقل کر لیا جائے، پھر رسم الخط بدلا جائے۔ اول تو یہ ممکن نہیں اس کام کے لئے روپیہ ہی اتنا درکار ہوگا کہ ایک پوری حکومت کا خرچ اس سے چل جائے گا۔ لیکن مان لیا یہ ممکن ہوا بھی تو ہم جس رسم خط کو اختیار کریں گے، اس کے اپنے مسائل ہمارے سامنے آئیں گے، اور ان کا اب تک کوئی حل نہیں بہم ہو سکا ہے۔ دوسری مشکل یہ ہوگی کہ جب اردو رسم خط ہی میں ایسے ایڈیشن نہیں ملتے جن کو پوری طرح صحیح نہیں تو کم و بیش لائق اعتماد کہا جا سکے، تو اردو سے ناگری یا رومن میں منتقل کرنے کے لئے کس ایڈیشن کو معتبر مانا جائے گا؟ اور بہت سی اہم کتابیں یا اہم شعرا کے کلیات تو ابھی طباعت پذیر بھی نہیں ہوئے۔ ان کے کس نسخے کو بنیادی متن قرار دیا جائے، اور کیوں؟

(۳) رسم الخط بدلنے سے پہلے سب سے بڑا سوال یہ طے ہونا چاہئے کہ نئے رسم الخط میں اردو الفاظ کا محض تلفظ ظاہر کیا جائے گا، یا املا بھی ظاہر کیا جائے گا؟ اگر صرف تلفظ ظاہر کیا جائے گا تو نئے رسم الخط میں اردو کے بہت سے حروف تہجی باقی نہ رہیں گے۔ مثلاً س، ص، ث سب کو ایک ہی علامت کے ذریعہ ظاہر کیا جائے گا۔ اسی طرح ع اور الف میں ایک قائم رکھا جائے گا، ایک ترک ہوگا۔

(۴) جن لوگوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اردو کا رسم الخط رومن کر دیا جائے ان سے درخواست ہے کہ اس تجویز میں مضمر خرابیوں، اور اس پر عمل درآمد ہونے کے خاص نقصانات کو دھیان میں لائیں۔ ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

(۵) اردو کو رومن رسم الخط میں لکھنے کے لئے کوئی ایسا نظام ابھی تک نہیں ہے جسے سب قبول کرتے ہوں۔ بہت سے لوگ من مانی کرتے ہیں، بہت سے لوگ Library of Congress کے نظام پر عمل کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ Library of Congress کے نظام میں تھوڑی بہت تبدیلیاں کر کے اسے برتتے ہیں۔ بہت سے لوگ کم و بیش وہ نظام استعمال کرتے ہیں جو عربی سے رومن کرنے کے لئے متداول ہے۔ بہت سے لوگ کوئی اور نظام بکار لاتے ہیں۔ مثال کے طور پر، خ لکھنے کے لئے حسب ذیل مختلف طریقے مستعمل ہیں:

چھوٹا ایکس (small x)

چھوٹا کے اور چھوٹا ایچ (kh)

چھوٹا کے اور چھوٹا ایچ، لیکن دونوں حرفوں کے نیچے لکیر (<u>kh</u>)

بڑا کے (K)

لہٰذا سوال یہ ہے کہ جب مختلف لوگ ایک ہی حرف کو رومن رسم خط میں مختلف طرح ادا کریں گے، کوئی کچھ لکھے گا، کوئی کچھ، تو بچے کی تعلیم کس طرح ہوگی؟

یا پھر یہ ہوگا کہ کم وبیش ہر گھر میں رومن اردو اپنی ہی طرز کی ہوگی۔ کسی کا کسی سے میل نہ ہوگا۔ اور اس کا امکان زیادہ ہے کہ ہر با اثر طبقہ اپنے طور پر اپنے قاعدے اختیار کرے گا۔ جس زبان کے بولنے والے ابھی تک اس بات پر متفق نہ ہو سکے کہ "دعویٰ" لکھیں یا "دعوا"، "گذر" لکھیں یا "گزر"؛ "توتا" لکھیں یا "طوطا"؛ "وطیرہ" لکھیں یا "وتیرہ"؛ "رحمٰن" لکھیں یا "رحمان"؛ "تمغا" لکھیں یا "تمغہ"؛ "معمہ" لکھیں یا "معما"؛ "مہینہ" لکھیں یا "مہینا"؛ "پیسہ" لکھیں یا "پیسا"، "تماشہ" لکھیں یا "تماشا"؛ "گئے" لکھیں یا "گیے"، وغیرہ صدہا مثالیں ہیں)، اس کے بارے میں یہ توقع کرنا خام خیالی ہے کہ سب لوگ کان دبا کر ایک ہی قاعدے پر اتفاق کرلیں گے اور جھگڑا نہ کریں گے۔ یہاں تو ابھی یہ عالم ہے کہ یہی فیصلہ کرنے میں سر پھٹول ہورہی ہے کہ "کھ"، "بھ" وغیرہ مخلوط آوازوں کو اردو حروف تہجی مانا جائے کہ نہیں؟ اور اگر مانا جائے تو انھیں کہاں جگہ دی جائے؟ "ب" کے فوراً بعد "بھ" آئے یا بڑی "ے" کے بعد؟ لغت میں پہلے "بیٹا" کا اندراج ہو یا "بھاری" کا؟ ابھی تو اسی پر تکرار ہے کہ لغت لکھتے وقت الف مد (آ) والے لفظ پہلے آئیں گے کہ خالی الف والے؟ بظاہر تو یہ بات ایسی ہے کہ اس میں کسی بحث یا اختلاف کی ضرورت ہی نہیں، لیکن اگر آپ اردو کے "مستند" لغات ملاحظہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس باب میں "نور اللغات" کا عمل کچھ ہے، "آصفیہ" کا کچھ اور ہے، فیلن کا کچھ دوسرا ہی ہے، اور ترقی اردو بورڈ، پاکستان، کے عظیم الشان "اردو لغت، تاریخی اصول پر" کے خیالات دیگر ہیں۔ ایسی صورت میں یہ امید کرنا کہ سب لوگ تبدیل خط (Tranliteration) کے ایک ہی اصول پر اتفاق کرلیں گے، یا جلد اتفاق کرلیں گے، محض امید پرستی ہے۔

(۶) اردو میں بہت سی آوازیں ایسی ہیں جنھیں رومن رسم الخط ادا نہیں کرسکتا۔ مثال کے طور پر، حسب ذیل الفاظ کو رومن میں صحیح لکھنا غیر ممکن ہے۔

بہن، قاعدہ، کہنا، کوا، کواں، دودھاری (بمعنی دودھاروں والی، مثلاً دودھاری تلوار)، دعا وغیرہ۔

ان الفاظ میں زیر زبر پیش کی جو آوازیں ہیں وہ رومن یا ناگری میں نہیں ادا ہوسکتیں۔

(۷) اگر صرف لفظ کو ادا کرنا ہے (اور بظاہر مقصد یہی معلوم ہوتا ہے) تو اردو کے ہزاروں الفاظ کا تلفظ بگاڑ کر رومن میں لکھنا ہوگا۔ مثلاً مندرجہ ذیل الفاظ کو دیکھیں:

پردہ، اگر اسے parda لکھیں تو لفظ غلط ہوجاتا ہے۔ اگر pardah لکھیں تو اور بھی غلط ہوجاتا ہے۔ اگر اسے pard لکھیں تو کوئی لفظ ہی نہیں بنتا۔ (ملحوظ رہے کہ بعض اوقات اسے انگریزی لفظ قرار دیتے ہیں تو اسے purdah لکھتے ہیں)۔

گناہ، اسے اگر gunah لکھیں تو h کی آواز انگریزی میں غائب ہوجائے گی، صرف "گنا" سنائی دے گا۔ انگریزی میں کوئی طریقہ ایسا نہیں کہ آخر میں آنے والی ہائے ہوز کی آواز کو ملحوظ رکھ سکیں۔ مجبوراً اسے gunaha لکھنا پڑے گا جو تلفظ کے قطعاً منافی ہے۔

کارواں، اگر اس کے نون غنہ کے لئے کوئی ایک علامت سب لوگ مقرر کر بھی لیں تو رومن میں اس لفظ کو یا تو karvan لکھیں گے، یا karavan لکھیں گے۔ اردو کے لحاظ سے دونوں تلفظ غلط ہیں۔ اردو میں "کارواں" کی رائے مہملہ ساکن ہے، لیکن اس پر ہلکا سا زبر بھی ہے۔ رومن میں وسطی سکون ظاہر کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے اور جس طرح سکون/حرکت "کارواں"، "فیصلہ" جیسے بے شمار لفظوں میں ہے، اس کے لئے رومن میں کچھ بھی انتظام نہیں۔

میر (یائے معروف)، دور (واؤ معروف) جیسے کتنے ہی الفاظ ہیں جو بہ اعتبار تلفظ رومن میں ادا نہیں ہوسکتے۔ انگریزی میں mir کا تلفظ me'ar اور duur کا تلفظ du'ar ہے، کیوں کہ انگریزی تلفظ کے اعتبار سے آخری R نہیں بولا جاتا۔ اگر اسے بولنا ہے تو اس کے پہلے یا بعد حرکت دینی ہوگی، جو اردو تلفظ کے منافی ہے۔ اردو جاننے والے تمام انگریز اور امریکن اپنی زبان کی مجبوری کے باعث "میر" کو mere بروزن fear بولتے ہیں۔ ایک مدت ہوئی جب میں (زیادہ تر طالب علمی کے دنوں میں) انگریزی میں فلمیں دیکھ لیا کرتا تھا۔ اب فلم کا نام یاد نہیں رہا، لیکن اس میں ایک ہندوستانی کردار "کبیر" نامی تھا۔ مجھے اس کا تلفظ kabi'ar سن کر تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ بعد میں مغربی ممالک میں ہر جگہ میں نے یہی صورت پائی۔ "کشمیر" کے پرانے ہجے اسی وجہ سے Cashmere تھے۔ اور ایک خاص طرح کا اونی کپڑا آج بھی Cashmere کہلاتا ہے۔ اسی طرح، ایک خاص طرح کے ریشمی کپڑے کو Madras کہتے ہیں، اور چونکہ اس ہجے میں دونوں A کی قیمت غیر معلوم ہے، لہٰذا اس لفظ کو انگریزی قاعدے کے مطابق آج بھی "میڈرس" ("میڈ" بروزن sad اور "رس" بروزن fuss) کہتے ہیں۔

(۸) عربی فارسی، خاص کر عربی کے انگنت الفاظ ہیں اردو میں جن کے تلفظ کے بارے میں اختلاف ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جن کے بارے میں اختلاف نہیں، لیکن اردو میں ان کا تلفظ عربی/ فارسی سے مختلف ہے۔ خیر، جہاں اختلاف نہیں، وہاں تو ممکن ہے کہ رومن میں بھی اردو کے تلفظ کو اپنا لیا جائے (حالانکہ بہت سے لوگ نہ مانیں گے) لیکن جہاں اختلاف ہے وہاں کیا کیا جائے، مثلاً:

rivayat لکھیں کہ ravayat؟ murawat لکھیں کہ muruu'at؟ hisab لکھیں کہ hesab یا hasab؟ mihdi لکھیں کہ mahdi یا mehdi؟ (یہ خیال رہے کہ انگریزی میں Mihdi/Mahdi/Mehdi جو بھی لکھیں، حرف h پڑھنے میں نہ آئے گا اور بچے کو یہ سیکھنے میں بہت مشکل ہوگی کہ یہاں حرف h صاف صاف بولا جائے گا۔) taqii'ah لکھیں یا taqaiyah یا taqayyiah؟ sayyid لکھیں یا sayyad یا saiyad یا syed؟ janaza لکھیں یا janazah؟ zimam لکھا جائے کہ zamam؟ qabool لکھنا بہتر ہے کہ qubool؟ اسی طرح، sha'oor درست مانا جائے یا shu'oor؟ furogh اچھا ہے کہ farogh؟

(۹) ایک مشکل ان لفظوں میں ہوگی، اور ایسے لفظ بہت ہیں، اور رائج بھی ہیں، جن کو شعر میں تو اصل تلفظ کے اعتبار سے نظم کیا جاتا ہے، لیکن بول چال میں ان کا تلفظ کچھ اور ہے۔ مثلاً:

شمع، شکل، ذبح، شہد، برج، طرح، اطمینان، حرکت، کلمہ، صدقہ، وغیرہ۔

(۱۰) بہت سے ایسے لفظ ہیں جو موقعے یا رواج کے اعتبار سے کئی طرح بولے جاتے ہیں۔ ان کا کیا ہوگا؟ مثلاً یہ الفاظ رومن میں کس طرح لکھے جائیں گے؟

کہ: اس کے تین تلفظ ہیں۔ (۱) کاف کے بعد ہلکی یاے معروف، (۲) کاف کے بعد ہلکی یاے مجہول، (۳) کاف کے بعد لمبی یاے مجہول۔ اور اگر ضرورت ہو تو کبھی کبھی کاف کے بعد طویل یاے معروف بھی بولی جاتی ہے۔

لیلیٰ، اور اس قسم کے تمام الفاظ جن کا تلفظ کبھی کبھی یاے معروف سے کرتے ہیں (بروزن "پہیلی") اور کبھی خاص کر اضافت کی حالت میں الف مقصورہ کے ساتھ (بروزن "پھیلا")۔

چیونٹی: اس کے تین تلفظ ہیں۔ (۱) چیں اونٹی بروزن فاعلن، (۲) چوں ٹی بروزن فع لن، (۳) چیوں ٹی، یاے مخلوط کے ساتھ، بروزن فع لن۔

حد، خط، کف، حج اور اس طرح کے دوسرے عربی لفظ جن کے آخری حرف پر تشدید ہے، لیکن وہ صرف اضافت کی حالت میں کبھی کبھی بولی جاتی ہے۔

مچھر، چپراس وغیرہ بہت سے لفظ ہیں جنھیں دلی والے اور بہت سے مشرقی ہندوستان والے، راے ہندی سے بولتے ہیں (مچھڑ، چپڑاس)، اور باقی لوگ سادہ راے مہملہ سے۔

(۱۱) اب بعض باتیں اور دیکھ لیجیے۔

اگر املا نہیں ظاہر کرنا ہے تو بہت جگہ تلفظ بھی غلط ہو جائے گا۔ مثلاً مندرجہ ذیل پر غور کریں:

ضعف، سعید، معذور، معقول

ضد کی اور بات ہے، لیکن ان لفظوں میں عین کا تلفظ سراسر الف یا ہمزہ کا نہیں۔ حسب ذیل سے مقابلہ کریں:

زور، لئیق، ماجور، ماقول

صاف ظاہر ہے کہ ضعف/زور، سعید/لئیق، معذور/ماجور اور معقول/ماقول کے تلفظ ایک نہیں ہیں۔ اول الذکر لفظوں میں تھوڑی سی آواز عین کی سنائی دیتی ہے۔ رومن اسے کس طرح ادا کریں گے؟

جن لفظوں میں واو معدولہ مع الف ہے (خوان، خواب) ان کا تلفظ ان لفظوں سے مختلف ہے۔ جن میں واو معدولہ بے الف ہے (خوش، خود)۔ ایسے الفاظ میں املا ظاہر کریں تو تلفظ ہاتھ سے جاتا ہے، اور تلفظ ظاہر کریں تو املا کا خون ہوتا ہے۔

رومن میں ہمزہ کا متبادل کچھ نہیں۔ رومن رسم خط میں ہمزہ اور ع اور الف سب ایک ہو جائیں گے۔ مثلاً:

عکس/aks، تاسف/tassuf، عالم/alam

رومن میں پڑھنے والا ان الفاظ میں فتحہ کی آوازوں کا کچھ امتیاز نہ کر سکے گا۔ آہستہ آہستہ ان کا تلفظ بدل جائے گا، اور پھر شاعری کو موزوں پڑھنا تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔

استدلال ابھی اور بھی ہیں۔ لیکن جو ماننا چاہے اس کے لیے اتنے بہت ہیں، اور جو نہ ماننا چاہے اس کے لیے پوری کتاب بھی کافی نہ ہوگی۔ بہر حال، رسم الخط کی تبدیلی کے موئیدین سے میری درخواست ہے کہ وہ مسعود حسن رضوی ادیب کی چھوٹی سی کتاب "اردو زبان اور اس کا رسم الخط" پڑھ لیں۔ اور اگر توفیق ہو تو اسی موضوع پر محمد حسن عسکری اور احتشام حسین کے مضامین بھی دیکھ جائیں۔ شان الحق حقی نے حال میں اچھی بات کہی ہے:

> رسم الخط اپنی زبان کے لیے اور زبان اپنے بولنے والوں کے لیے ہوتی ہے۔ چند غیر ملکیوں کی سہولت کے لیے اپنی زبان کی کایا پلٹ کرنا مضحکہ خیز حرکت ہوگی۔ دنیا کو اردو کی طرف متوجہ کرنا ہو تو ہمیں اس کے اندر بہتر سے بہتر ادب پیدا کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ اس کی دم میں گھنگھنا باندھنے کی۔

اس پر میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ اردو کا رسم خط اگر رومن کر دیا جائے تو جتنی سہولتیں حاصل ہوں گی ان سے کہیں بڑھ کر مشکلیں پیدا ہوں گی۔ اور یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ اگر ایک بار رسم خط کی تبدیلی پر ہم راضی ہو گئے تو یہ تقاضا بار بار اٹھے گا۔ آج لوگ دیوناگری یا رومن کے لیے کہہ رہے ہیں، کل کو کسی اور رسم الخط کے لیے مانگ ہوگی کہ اردو لکھنے کے لیے اسے بھی استعمال کیا جائے۔ خود ہندوستان میں لوگ کہیں گے کہ دیوناگری قبول ہے تو بنگالی کیوں نہیں؟ بنگالی قبول ہے تو تمل کیوں نہیں؟ پھر یہ سلسلہ ختم نہیں ہونے والا۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا، اپنے رسم الخط یا املا میں تبدیلی کا تقاضا کرنے کی بیماری صرف اردو والوں میں ہے۔ اگر کسی اور زبان والے سے کہیے کہ "میاں تمھارا رسم خط یا املا ناقص ہے، اسے بدل ڈالو تو وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اور ایسا نہیں ہے کہ مغرب میں تیسری دنیا سے آئے ہوئے صرف اردو کے ہی لوگ بستے ہوں۔ ہندوستان اور افریقہ اور ایشیا کی اکثر زبانیں بولنے والوں کی کثیر تعداد مغرب میں مقیم ہے۔ ان میں سے تو کسی کی بھی زبان سے نہیں سنا گیا کہ ہمارے بچوں کو اصل رسم خط میں دقتیں پیش ہوتی ہیں، کیوں نہ اپنی زبان مثلاً مراٹھی، بنگالی، ملیالم، تمل، سواحیلی، ہوکسا) کا رسم خط بدل کر رومن کر دیا جائے۔

کچھ دن ہوئے ایک صاحب کی تجویز نظر سے گذری کہ اردو میں حرف ملا کر لکھے جاتے ہیں۔ اس سے کمپیوٹر کو بڑی مشکل ہوتی ہے۔ دنیا کی اکثر زبانوں کی طرح اردو کے حرف بھی الگ الگ لکھے جائیں تو کمپیوٹر کے میدان میں آسانی ہو جائے گی۔

اول تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ الگ الگ حرف لکھنے سے کمپیوٹر کو کون سی آسانی ہو جائے گی؟ کمپیوٹر غریب اردو کا نقاد تو ہے نہیں کہ عقل سے عاری ہو۔ وہ تو ایک بہت ہی نازک اور حساس مشین ہے جو سکھائے گا سیکھ لے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ کمپیوٹر جب اردو فارسی عربی لکھتا ہے تو اسے معلوم رہتا ہے کہ یہ انگریزی یا فرانسیسی نہیں ہے، اور اس میں مجھے بڑی مشکل ہونا چاہئے۔ کمپیوٹر تو حکم کا بندہ ہے۔ اس میں اقداری فیصلے کی صلاحیت نہیں۔ لیکن بنیادی سوال یہ کہ اردو میں حرفوں کو الگ الگ کیوں نہیں لکھا جاتا، جب کہ مثلاً رومن اور ناگری میں ایسا ممکن ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جن زبانوں میں حرف الگ الگ لکھے جاتے ہیں ان میں اعراب بالحرف یا اعراب صریح، یا موقع موقع سے دونوں کا التزام ہوتا ہے۔ موخر الذکر کو سنسکرت/ہندی میں "ماترا" کہتے ہیں۔ اعراب بالحرف کے لئے وہاں شاید کوئی اصطلاح نہیں ہے۔ ان دونوں اصطلاحوں کے عمل کو یوں واضح کر سکتے ہیں۔ فرض کیجئے آپ نے اردو میں لکھا:

ہم

اب آپ سے کہا گیا کہ اچھا اس کے حرف الگ الگ کر کے رومن رسم خط میں لکھئے، جس طرح انگریزی لکھی جاتی ہے۔ تو آپ نے لکھا:

HM

اب ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا پڑھئے۔ ظاہر ہے کہ انگریزی میں کوئی لفظ اس قماش کا ہے ہی نہیں جس میں صرف یہ دو حرف ہوں۔ لامحالہ آپ کہیں گے، "لفظ 'ہم' کے اعراب کیا ہیں؟ یہ معلوم ہو تبھی تو انگریزی میں لکھوں گا۔" آپ کی بات وزنی ہے، لہٰذا آپ کو بتایا گیا کہ یہاں 'ہم' میں اول مفتوح ہے۔ "بہت خوب، ابھی لیجئے" آپ نے جھٹ کہا اور لکھا:

HAM

اس بات سے قطع نظر کہ لفظ Ham کے انگریزی میں کئی معنی ہیں، اور بھی معنی اردو لفظ 'ہم' کے معنی سے مطابقت نہیں رکھتے، آپ یہ ملاحظہ کریں کہ پڑھنے/سیکھنے والے کو کتنی مشکل ہوگی (اور آپ کے کمپیوٹر غریب کو شاید کتنی 'مشکل' ہوگی) جب یہ لفظ

ہم

رومن رسم خط میں، اردو رومن طرز کے مطابق، حرف الگ الگ کر کے لکھا جائے گا؟ اگر آپ اعراب بالحرف نہ دیں گے تو کوئی پڑھ ہی نہ سکے گا کہ لکھا کیا ہے؟ اردو میں تو رسم بن چکی ہے، پڑھنے والے کو معلوم ہے کہ شروع شروع کی اکا دکا منازل کے بعد اعراب صریح (زیر، زبر، پیش) میرا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ لہٰذا مجھے خود ہی معلوم کرنا ہے کہ مثلاً حسب ذیل شعر میں الفاظ پر اعراب کیا ہیں۔

کئی گذرے سنہ ترا کم تھا سن جو لئے تھے بن ترے گھونگرو
گیا سینہ چھن گئے ہوش چھن جو بجے تھے چھن ترے گھونگرو

چنانچہ جب میرا سابقہ اردو زبان اور رسم خط میں لفظ 'ہم' سے پڑا تو میں نے یہ پکار نہ لگائی کہ ارے بھائی اس پر اعراب کیا ہیں؟ میں نے خود کو سکھا لیا ہے کہ یہاں اول حرف پر تین میں سے ایک حرکت ہوگی، اور مجھے قیاس اور تجربے سے کام لے کر معلوم کر لینا ہے کہ اس وقت کون سی حرکت ہے۔ اگر مجھے صرف HM دکھایا جائے گا تو میں مرتے مرتے مر جاؤں گا لیکن مجھے اعراب نہ ملے گا۔ اچھا اگر یہ طے کر لیں کہ میاں، جس طرح اردو میں اٹکل سے پڑھتے ہو، اسی طرح رومن میں اٹکل سے پڑھ لو۔ جان لو اس زبان میں اعراب بالحرف نہیں ہیں۔ اس پر التمس یہ ہے کہ کیا معنی، اردو زبان میں اعراب بالحرف نہیں؟ تو پھر اسی لفظ "نہیں" میں ہائے ہوز کے بعد کیا ہے؟ حرف دوم یہاں مکسور ہے اور حرف سوم پر کوئی حرکت نہیں، وہ لمبی 'ای' کی آواز ظاہر کر رہا ہے، کہنے کو چھوٹی 'ی' ہے۔ یہ اعراب صریح ہے، یعنی کسی حرف کو علامت میں بدل کر اس سے اعراب کا کام لیا جا رہا ہے۔ یہی چھوٹی 'ی' جب لفظ "ادھر" میں آئے گی تو اور طرح لکھی جائے گی، جب لفظ "پیلی" میں لکھی جائے گی تو اور طرح لکھی جائے گی۔ اب ذرا "بانگ درا" کا پہلا مصرع حرفوں کو الگ الگ کر کے رومن طرز میں صرف اردو کے اعراب کے مطابق لکھئے:

اے م ال و اے ف ص ی لؔ ک ش ور و ن دو س ت اں

میں نے لفظوں کے درمیان فاصلے رکھے ہیں، لیکن کوئی بندہ خدا اس مصرعے کو پہلے سے اردو میں پڑھے بغیر پڑھ ہی دے تو دیکھوں، صحیح اور موزوں پڑھنا تو دور رہا۔ کہیں پر اعراب غائب ہیں، کہیں اعراب صریح ہے، لیکن پھر بھی مبہم (مثلاً پتہ نہیں چلتا کہ 'ہندوستاں' میں واؤ معروف ہے کہ مجہول؟)

معلوم ہوا اردو میں کہیں کہیں اعراب صریح ہے، زیادہ تر فقدان اعراب ہے، اور جہاں اعراب ہیں وہاں اکثر مبہم ہیں۔ ایسی زبان کو آپ انگریزی کی طرح الگ الگ حرفوں اور التزام اعراب کے ساتھ کس طرح لکھیں گے؟

ایک بات اور بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انگریزی میں اعراب بالحرف بالکل نہیں ہے۔ اور نہ ایسا ہے کہ اعراب بالحرف کی امداد سے تلفظ قطعی اور واضح ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں جہاں جہاں (مثلاً) حسب ذیل حرف آخر لفظ میں ساتھ آتے ہیں، وہاں اعراب بالحرف ہے:

BLE (aBLE), DLE (bunDLE), GLE (buGLE), KLE (tacKLE)

مگر مشکل یہ ہے کہ ان تینوں میں حرف L اور اس کے ماقبل کے درمیان حرکت یکساں نہیں ہے۔

Table میں b اور L کے بیچ میں ہلکا سا ضمہ ہے۔
Bundle میں d اور L کے بیچ میں ہلکا سا کسرہ ہے۔
Bungle میں b اور L کے بیچ میں کچھ نہیں ہے، فتحہ مان سکتے ہیں، لیکن وہ اس قدر ہلکا ہے کہ ہونا نہ ہونا مساوی سمجھئے۔
Tackle میں k اور L کے بیچ میں بہت ہلکا سا ضمہ ہے، ذرا کسرہ کی طرف مائل۔

لہٰذا وہاں بھی تلفظ کی مشکلیں اعراب کے ہونے یا نہ ہونے کی بنا پر ہیں، خواہ حرف کتنی ہی دور دور کیوں نہ لکھے جائیں۔ انگریزی کی نقل کرنے سے یہاں

اردو کو کچھ نہ ملے گا۔

خلیل دھمن تجوی کی یہ بات باوزن ہے۔ "اگر غیر اردوداں طبقہ بھی اردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیتا ہے تو اردو کی آبیاری کرنے والوں کے بچوں کو [یہ کام] کیوں نہیں سکھایا جاسکتا؟" ہم اردو والوں کی یہ ادا خوب ہے کہ جس درخت سے پھل حاصل کرنا مشکل نظر آئے، اس درخت کی جڑ ہی کاٹ دینے پر تل جائیں گے، خود تھوڑی سی محنت نہ برداشت کریں گے۔ اسی طرح، رام پرکاش کپور نے بھی کچی بات کہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم لوگوں کو خود بینی سے فرصت ہی نہیں کہ ان الفاظ کے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں:

> اردو کی لڑائی خود ان لوگوں سے ہے جو اردو بولتے ہیں، اردو کے مشاعرے پڑھتے ہیں، اردو کی مجالس میں شریک ہوتے ہیں، اردو کے نام کی روٹی کھاتے ہیں، اردو کے کارواں کو چلاتے ہیں اور کبھی کبھی اردو کو سرکاری زبان بنا دینے کی مانگ کرکے عوام کو گمراہ بھی کرتے ہیں۔ اردو میں فلمیں لکھ کر ہندی کے نام سے بیچتے ہیں۔ اردو کے گانوں پر ہندی سرٹیفکیٹ برداشت کرتے ہیں۔ ان تمام بڑے بڑے اردو داں حضرات کے بچے اردو نہیں پڑھتے، نہیں بولتے، نہیں لکھتے، نہیں جانتے۔ نہ ہی خود یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے اردو جیسی زبان سیکھیں۔

گذشتہ چالیس برس سے میں اردو کے بڑے بڑے ادیبوں اور پروفیسروں کی خدمت میں حاضری دیتا رہا ہوں، اور میں نے حتی المقدور اس بات پر ٹوکا بھی ہے کہ آپ کے بچے، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اردو نہیں پڑھتے۔ یہ اچھی بات نہیں، اور کچھ نہیں تو یہ خیال فرمایئے کہ آپ کی تحریروں سے آپ کے اخلاف محروم رہیں گے، یہ منطقی سے عاری ہے کہ نہیں؟ لیکن مجھے افسوس ہے کہ اکادکا کے سوا کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔ اور یہی لوگ ہیں جن کی صدائے ماتم سب سے زیادہ بلند سنائی دیتی ہے کہ ہائے اردو مرگئی، یا مر رہی ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو، انھوں نے اپنے گھر سے اردو کو بدر کردیا ہے، اس لئے وہ یہی کہنے میں عافیت سمجھتے ہیں کہ اردو کا خاتمہ ہو گیا، یا ہونے والا ہے۔

حقیقت، ظاہر ہے کہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ لیکن اردو کی بقا کے لئے سب سے زیادہ تعاون اور قربانیاں غریب غربا کی طرف سے، یا پھر ان علاقوں سے آئی ہیں جنھیں ہم یو۔پی۔ والے اردو کے علاقے نہیں سمجھتے، اور وہاں کے اردو بولنے والوں کو "اہل زبان" نہیں تصور کرتے۔ اردو کے لئے سعی اور جہد سب سے زیادہ بہار میں کی گئی اور کی جارہی ہے۔ پھر مہاراشٹرا ہیں، جہاں اردو مخالف حکومتوں کے باوجود اردو ذریعۂ تعلیم کی درس گاہیں خوب برگ و بار لا رہی ہیں، اور اردو میڈیم سے تعلیم پائے ہوئے بچے مسلسل ہائی اسکول کے امتحان میں سارے صوبے میں پہلی پوزیشن لاتے ہیں۔ یو۔پی۔ والے سمجھتے ہیں کہ ہم نے اردو پڑھنا چھوڑ دیا تو سب نے چھوڑ دیا۔ وہ بہار اور مہاراشٹر کیا، مدھیہ پردیش، کرناٹک، آندھرا، ہماچل پردیش جا کے دیکھیں تو انھیں معلوم ہو۔ یو۔پی۔ والے اپنے گلے میں "اہل زبان" کا تمغا لٹکائے رہیں اور سمجھتے رہیں کہ اردو کا قتل ہوچکا۔ دنیا ان پر ہنس رہی ہے، ابھی اور ہنسے گی۔

رام پرکاش کپور نے اپنی تحریر مطبوعہ "شاعر" ممبئی میں ہاشم علی اختر صاحب (سابق وائس چانسلر، عثمانیہ یونیورسٹی، اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی) کا حوالہ دیا ہے کہ ان کے دوستوں، رشتہ داروں میں "چالیس کی عمر سے کم والا ایک بھی فرد اردو رسم الخط نہیں جانتا"، لہٰذا ہاشم علی صاحب چاہتے ہیں کہ اردو کا رسم الخط بدل دیا جائے یہ تو ایسا ہی ہوا کہ اگر کسی معاشرے میں چالیس سے کم عمر والے افراد جاہل ہوں تو ہاشم علی صاحب کی منطق کے مطابق اس معاشرے میں خواندگی (Laterary) کو منسوخ قرار دیا جائے اور اس کو "زبانی" (Oral) معاشرے کی سطح پر قائم کیا جائے۔ اور اگر کسی معاشرے میں چالیس سے کم عمر والے افراد کو کوئی بیماری ہے تو اس بیماری کا علاج کرنے کے بجائے اسے نارمل حالت صحت قرار دیا جائے اور سب لوگوں کے لئے اس بیماری میں مبتلا ہونا ضروری قرار دیا جائے۔

میں کئی گذشتہ تحریروں میں رومن اور ناگری رسم الخطوں کی کمی اور کمزوریاں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں، لہٰذا یہاں ان باتوں کا اعادہ نہیں کرتا۔

یہاں آخری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حکومت سے مراعات کی بھیک مانگنے کے بجائے ہم اردو والوں کو خود اپنی زبان کے فروغ اور استحکام کی کوشش کرنا چاہئے۔ میں تو کہتا ہوں کہ حکومتوں نے جتنا کیا ہے اور جو کر رہی ہیں، اس سے زیادہ کی امید آپ کو کیوں ہو؟ خود ہمارا بھی کچھ فرض ہے کہ نہیں۔

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مور بے پر حاجتے پیش سلیمانے میر

☆☆☆

کلیات میر
جلد اول
نظر ثانی اور تصحیح : احمد محفوظ
(عباسی ایڈیشن)
نگرانی : شمس الرحمن فاروقی
قیمت : مجلد ۴۰۲ روپئے
غیر مجلد ۳۳۶ روپئے
شب خون کتاب گھر، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

اردو اور اس کا رسم الخط: ایک مباحثہ

''کہتی ہے خلق خدا''، شمارہ ۲۵۲، جنوری ۲۰۰۴

● شمارہ ۲۵۰ کے ''شب خون'' میں مضمون ''کچھ اردو رسم خط کے بارے میں'' نظر نواز ہوا۔ پورا مضمون پڑھا اور پڑھنے کے بعد بس ایک خیال نے چند جملے لکھنے پر مجبور کیا۔ بقول فیض

وہ بات جس کا فسانے میں کوئی ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

میں پورے مضمون پر نہیں بلکہ صفحہ ۳۷ کے دوسرے کالم کے آخری پیراگراف پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں جہاں سے آپ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ''کچھ دنوں سے ولایت میں رہنے والے بعض اہل اردو کی طرف سے یہ آواز اٹھی ہے کہ اردو کا رسم الخط رومن کر دیا جائے۔''

مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ کسی نے بھی حضرت عیسیٰ سے یہ دریافت کیا کہ عیسیٰ کیا تم خدا کے بیٹے ہو؟ کسی فرد نے گاندھی جی سے یہ پوچھا کہ گاندھی جی کیا تمھاری آتما، مہا آتما ہے؟ کاش آپ اس سے پیشتر کہ یہ جملے تحریر کرتے یہاں ان لوگوں سے ضرور دریافت کرتے کہ حقیقت کیا ہے؟ بہر حال بات جب چھڑ گئی ہے تو اسے پوری ہونے دیجئے۔ سب سے پہلے میں یہ بات بغیر کسی حیل و حجت کے بتا تا چلوں کہ برطانیہ میں یہ بات کسی فرد یا جماعت یا گروہ نے نہیں کہی کہ اردو کا رسم الخط تبدیل کیا جائے۔ بلکہ بات یوں چلی کہ انٹرنیٹ کے آنے کے بعد جو بچے یا بزرگ انٹرنیٹ استعمال کرتے ہیں وہ سب کے سب رومن میں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں۔ یہ صرف یہیں نہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہی نہیں بلکہ بالی ووڈ فلم انڈسٹری میں کئی ہزار گانے ویب سائٹ پر رومن رسم الخط میں ڈالے ہیں۔ ساتھ ہی اب تقریباً فلم کا ٹائٹل رومن میں تحریر ہو رہا ہے۔ اگر میں یوں کہوں کہ کسی حد تک رسم الخط تبدیل ہو چکا تو غلط نہ ہوگا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ جس طرح یہ لکھا جا رہا ہے وہ بہت غلط ہے۔ ہم نے یہاں سے جو آواز بلند کی ہے وہ اس سلسلے میں ہے کہ اسے آپ جیسے حضرات مل کر ایک ایسی صورت عطا کریں جو سب کے لئے قابل قبول ہو۔

یہ آپ بہتر جانتے ہیں کہ جب بھی کوئی زبان پھیلتی ہے تو اس کا تلفظ ایک جیسا نہیں رہتا بلکہ علاقائی زبانوں کی آمیزش سے ردو بدل کا ہونا قدرتی عمل ہے۔ اور ہمیں اس عمل کو قبول کر لینا چاہئے۔ مثال کے طور پر انگریزی، انگریزوں کی زبان ہے اور برطانیہ ایک ایسا جزیرہ ہے جو شاید یو۔ پی۔ میں سما جائے۔ مگر پھر بھی یہاں شمال میں رہنے والوں کا ایک ہی لفظ کا تلفظ جنوب میں رہنے والوں سے علیحدہ ہے۔ مثلاً آپ شمال میں اگر کسی سے گفتگو کریں تو وہ Butter کو بہ ضم اول ادا کرے گا۔ اسی طرح وہ Buto کو بھی بضم اول کہے گا، اور جنوب کا رہنے والا دونوں الفاظ کو بفتح اول کہتا ہے۔ اور یہاں دونوں طرح سے جائز مانا جاتا ہے۔ دراصل ہم بچپن میں جن آوازوں کو سنتے ہیں، جو لہجہ ہمیں وراثت میں ملتا ہے، وہ ہم تمام زندگی یاد رکھتے ہیں۔ بات صرف یہیں نہیں ختم ہوتی۔ اہل پنجاب ہمیشہ ''ہاں جی'' بولتے ہیں اور یو۔ پی۔ اور دہلی والے ''جی ہاں'' کہتے ہیں۔ اس میں کسی کی خطا نہیں ہے۔ جسے جو بھی وراثت میں ملا وہ اسی کو حرف آخر سمجھ بیٹھا۔ تقریباً ایک سال قبل میں نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ زبان اپنے سفر میں کن کن مدارج سے گذرتی ہے۔ میرا یہ مضمون ''ہماری زبان'' نے دو قسطوں میں چھاپا تھا۔ میں نے اس میں کہا تھا کہ اگر اردو کو رومن رسم الخط کے ذریعہ تھوڑی تقویت ملتی ہے تو ہم اسے قبول کر لیں۔ اس مضمون میں میں نے کہیں نہیں لکھا کہ اردو کا رسم الخط تبدیل کیا جائے۔ ہاں اضافی طور پر رومن بھی اپنانے میں کوئی حرج نہیں۔

جناب عالی، ابھی تک ہماری زبان تشنہ ہے اور ہر زبان ترقی کے مدارج طے کر رہی ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں آپ کسی بھی زبان میں لکھیں، پڑھنے والا اسے پوری طرح سمجھ جائے گا۔ صرف ٹائی کی گرہ کو لیجئے۔ اسے چاہے آپ انگریزی میں لکھیں یا اردو فارسی عربی میں، اسے کسی ایسے شخص کو دے دیجئے جو ٹائی کی گرہ باندھنا نہ جانتا ہو پھر تماشا دیکھئے۔ اس قسم کی ہزاروں ایسی مثالیں آپ کے سامنے موجود ہیں، اسی لئے یہاں Technical Drawing کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ اگر حروف لکھنے سے یہ سمجھ میں آ جاتا تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

یہ بات ادبی دنیا کا ہر شخص جانتا ہے کہ آپ تحقیقی دنیا کے فرماں روا ہیں، آپ جو بھی لکھتے ہیں اس میں تحقیق کا عنصر پوری طرح شامل ہوتا ہے۔ اس بات کی مثال آپ کا یہ مضمون ہے۔ مگر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جس سلسلے میں آپ تحقیق کریں اس کے علاوہ بھی جو وسیع تر میدان باقی رہ جاتا ہے اور جسے آپ سر دست اسے الگ رکھ دیتے ہیں، اس پر بھی آپ کچھ لکھیں۔ آپ نے بالکل سچ لکھا کہ رومن میں لکھنے سے اردو کا تلفظ ختم ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں آپ کی بات کو کاٹنے والا شاید ہی کوئی ہو۔ لیکن کیا آپ نے کبھی غور فرمایا کہ ہم خود لکھتے کچھ اور ہیں، اور پڑھتے کچھ اور ہیں۔ مثال کے طور پر ہم ''کنواں'' لکھتے ہیں اور اسی وزن کا دوسرا لفظ ''دھواں'' لکھتے ہیں جب کہ آواز دونوں میں ایک طرح کی ہے۔ تو ہم کیوں

دونوں کو ایک ہی طرح نہیں لکھتے؟ جناب عالی، ہم اپنے بچپن سے جن لفظوں کو جس طرح سنتے آئے ہیں انھیں بولتے بھی اسی طرح ہیں۔ اسی صورت میں، ہم جس طرح کسی چیز کو لکھا ہوا دیکھتے ہیں اس کی شکل دماغ میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ ایک اور مثال یہاں درج کرتا ہوں۔ محترم گوپی چند نارنگ صاحب نے اردو املا پر کتاب تحریر فرمائی۔ اس میں انھوں نے لفظ ''قصائی'' ص سے لکھا جب کہ اردو میں عربی سے ''قصاب'' موجود تھا تو ''قصائی'' کی ضرورت نہیں تھی۔ لفظ ''قسائی''، ''قساوت'' سے نکلا ہے اس بات کا میں نارنگ صاحب سے ذکر بھی کر چکا ہوں۔ مگر اب تمام اہل اردو لفظ ''قصائی'' ص سے ہی لکھتے ہیں اور یہ نارنگ صاحب کی دلیل اگر سب قبول کریں تو ٹھیک ہے لیکن میرا ذہن اسے ماننے کو تیار نہیں ہے۔

یورپ میں ہماری تیسری نسل پروان چڑھ رہی ہے اور آپ کا مشورہ ہے کہ انھیں پہلی نسل کی طرح اردو لکھنا پڑھنا سکھایا جائے۔ کبھی آپ نے ہندوستان کی تیسری نسل کو دیکھا ہے؟ وہ خود اردو کے حروف تہجی سے ناواقف نظر آتے ہیں، مگر بولتے اردو ضرور ہیں۔ وجہ بہت معمولی ہے اور بہت گمبھیر بھی۔ اردو میں بچوں کے لئے کتابوں کی یعنی دلچسپ کتابوں کی کمی، بچوں پر اسکول کالجوں کے کام کا بوجھ اور وقت کی کمی۔ ہمارے چاروں طرف دل کو لبھانے والے مشاغل۔ پھر صحت کو برقرار رکھنے کے لئے صحت مند کھیل۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ ماں اور باپ کے پاس خود وقت کی قلت۔ گھر کو چلانے کے لئے زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا۔ یہ چاہے مغرب ہو یا مشرق، دونوں جگہ کا المیہ ہے۔ ان حالات میں اگر بچہ خود رو ہو کر وہی کچھ سیکھتا ہے، جس سے اسے مستقبل میں روٹی کپڑا میسر آئے گا تو آپ اسے الزام نہیں دے سکتے۔ میرا یا آپ کا ہر مشورہ صرف کتابی تو ہو سکتا ہے مگر حقیقی نہیں کیوں کہ ہر بچہ زندگی کی دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ یہ تھے حالات جن کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے یہاں یہ آواز اٹھائی کہ پچاس سال کے عرصہ میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ اگر ہم اپنی راہ میں تھوڑی بہت لچک پیدا نہیں کریں گے تو آج جو بول سکتے ہیں کل یہ بولنا بھی چھوڑ دیں گے۔ بلکہ مجھے تو ایسے بہت سے بچے برطانیہ میں ملے جو اردو، ہندی، پنجابی، گجراتی اور بنگالی سے ناآشنا نظر آتے ہیں مگر ہندوستانی فلمیں اور پاکستانی ڈرامے ابھی ان کو اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور انھیں آج رومن میں لکھنے کی دعوت دیں، تو ممکن ہے کل وہ اردو کے املا سے بھی دلچسپی لینا شروع کریں۔ فاروقی صاحب ستم تو یہ ہے کہ ابھی حال میں ایک فلم ''زبیدہ'' مارکیٹ میں آئی ہے اور اس میں ''ضبیدہ'' لکھا گیا ہے پھر چونکہ ''ز'' کی آواز کے لئے D کا انتخاب بالی وڈ نے کیا ہے اور آپ بتائیے جب رومن میں ''مجھے چھوڑ دو'' لکھا جائے گا تو کتنا مضحکہ خیز ہوگا؟

ارباب اختیار جن کو خدا نے قلم کی دولت عطا کی ہے ان سے میری گذارش ہے وہ سب مل کر اس مسئلے پر غور کریں اور اردو پر اس حملے کے تدارک کے لئے کوئی لائحۂ عمل دریافت کریں۔ صرف یہ کہہ دینے سے کہ صاحب اردو کے رسم الخط کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا، مسئلہ حل نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ جو اس وقت رائج ہو چکا ہے اور ہزاروں مرد و زن اسے استعمال کر رہے ہیں، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو بالکل غلط ہے، لیکن ہم اسے کسی طرح قریب ترین تو لا سکتے ہیں۔

لندن

اقبال مرزا

● رسم الخط سے متعلق مضمون اردو دوستوں کے حقیقی جذبات سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ غیر جذباتی اور نہایت مدلل بھی ہے۔ البتہ اردو کی ابتدا کے سلسلہ میں ایک بات تشریح طلب ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ لفظ اردو کے معنی تھے ''شاہجہاں آباد کا شہر'' یا ''قلعۂ معلّی شاہجہاں آباد'' اور جب دہلی (یعنی اردو بمعنی ''دہلی شہر'') میں ''ہندی'' (یعنی آج کے معنی میں اردو زبان) عام ہوئی تو اس زبان کو (یعنی ہندی کو) ''زبان اردو'' کے معنی میں کہا جانے لگا۔ پھر مختصر ہوتے ہوتے یہ فقرہ ''زبان اردو'' یا ''اردو کی زبان'' اور پھر صرف ''اردو'' رہ گیا۔ دریافت طلب لفظ ''اردو'' کو شہر کے بجائے زبان کا نام لینے میں کتنا وقت صرف ہوا ہوگا؟ کیوں کہ میر (جن کا شعر آپ نے سند کے طور پر پیش کیا ہے) کے فوراً بعد غالب کے مکاتیب کے مجموعوں کے نام ''عود ہندی'' اور ''اردوے معلّی'' ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اس زمانہ میں اس زبان کے لئے لفظ ''ہندی'' بھی استعمال ہوتا تھا، اور لفظ ''اردو'' بھی داغ نے زبان ہی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

مطلب یہ کہ اردو کے کئی نام تھے۔ مثلاً ہندوی، ریختہ، ہندوستانی، ہندی، اردو وغیرہ۔ ان میں سے صرف لفظ ''اردو'' باقی رہ گیا۔ باقی نام غیر مقبول ہوتے گئے۔ یہی بات ذہن میں بیٹھی ہوئی ہے۔ ''اردو'' بمعنی ''شہر دہلی''، تسلیم کرنے کے لئے شہادت درکار ہے۔

امید ہے آپ میرے طالبعلمانہ استفسار کو اعتراض یا بحث نہ سمجھیں گے، خط کی اشاعت بھی مقصود نہیں ہے۔ بس اس گرہ کو کھول دیجئے۔

ممبئی

شمیم طارق

● ''کچھ اردو رسم الخط کے بارے میں'' آپ کا مضمون پڑھ لینے کے بعد کوئی معقول پسند ایسا نہ ہوگا جو اردو کے رسم الخط کو دیوناگری یا رومن خط میں منتقل کرنے پر اصرار کرے۔ جو بھی ایسا کرے گا تو وہ اس کی صرف ہٹ دھرمی ہوگی۔ میرے سامنے قازقستان کی مثال ہے یہاں دو بار رسم الخط بدلا گیا۔ ایک بار رومن میں اور دوسری بار روسی میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا بیشتر ادبی سرمایہ ضائع ہو گیا۔ اب پھر سے وہ اپنے اصلی رسم الخط کی طرف لوٹے ہیں اور اپنے ادب کی بازیافت میں لگے ہیں۔

حیدرآباد

قدیر زماں

● زیر نظر شمارے میں آپ نے اردو رسم الخط کے بارے میں جس استدلال کے ساتھ مسائل کی وضاحت کی ہے، مجھے یقین ہے کہ اس سے ان سازشی عناصر کے عزائم کو صدمہ پہنچے گا جو اردو رسم الخط تبدیل کرنے کی آڑ میں دراصل اردو زبان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے منصوبے مرتب کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی بھی تھی کہ نہ صرف ایسے عناصر کی حوصلہ شکنی کی جائے بلکہ اپنے

لوگوں کے ضمیر کو جگانے کی بھی کوشش کی جائے۔ آپ نے دونوں فرائض انجام دیئے ہیں۔

اردو کے خلاف یہ جنگ اولین مراحل میں در پردہ نوعیت کی تھی، مگر اب ایسا لگ رہا ہے کہ گویا ڈنکا بج چکا ہے۔ چنانچہ ماہنامہ "شاعر" کے گذشتہ کئی شماروں میں اس مسئلے پر بہت طویل بحث چلی آرہی تھی، لیکن جب بعض دوستوں نے لسانی مسائل کو مذہبی رنگ دے کر تصویر کو بگاڑنے کی کوشش کی تو مجبوراً افتخار امام صدیقی کو ملتمس ہونا پڑا کہ اس سلسلے کو اب ختم کیا جائے۔ ایک دوست نے علاقائی تعصب کے ڈانڈے مذہب کے ساتھ ملا کر یہ مفروضہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی کہ اہل نقد نے پریم چند، فراق وغیرہ کے ساتھ اچھا سلوک روا نہیں رکھا، انھیں فراموش کرنے کی شعوری کوشش کی گئی اور ایسا ہی موجودہ دور میں کرشن کمار طور وغیرہ کے ساتھ روا رکھا جارہا ہے۔ پھر میرے خیال میں، اس صورت حال پر بہتر تبصرہ قبلہ جگن ناتھ آزاد کرسکتے ہیں۔ علاقائی تعصب تو بہر حال کارفرما ہے اور میری دانست میں ایک وسیع مقصد کے لئے اسے تحمل کے ساتھ برداشت کرنا ناگزیر ہوگیا ہے۔ یوں نہ ہو کہ ہماری خاموش شکایت کو اردو کے دشمن اردو بیزاری سمجھ کر ہمیں اپنے لشکر میں شمار کر بیٹھیں۔

آپ نے اردو کی بقا کے سلسلے میں غیر اہل زبان کے تعاون، ان کی قربانیوں اور مسائل کا جس طرح اعتراف کیا ہے وہ آپ کی روشن ضمیری، وسیع القلبی اور منصفانہ رویے کی واضح دلیل ہے۔ ایسا کرنے سے نہ صرف غیر اہل زبان کے عزائم پختہ ہوجائیں گے بلکہ انھیں اردو کی خدمت کا حوصلہ بھی عطا ہوگا۔ لیکن ایک بات دل کو لگی کہ بہار، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، کرناٹک اور ہماچل پردیش کا ذکر کرتے وقت آپ جموں و کشمیر کی خدمات بھول گئے۔ جہاں تک اس ریاست کا تعلق ہے سرکاری اور عوامی سطح پر اردو کی خدمت کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ کشمیری عوام اپنے بچوں کو اردو زبان کسی مجبوری کے تحت نہیں پڑھاتے بلکہ اس پر عمل کے پیچھے ایک مقدس جذبہ کارفرما ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بچے گھر، بازار، اسکول ہر جگہ اردو زبان میں ہی گفتگو کرتے ہیں۔ ہمارے بعض ان پڑھ بزرگ بھی اپنی ضرورت کے حساب سے اردو زبان بول سکتے ہیں۔

سری نگر — شفق سوپوری

● رسم الخط کے بارے میں آپ کا مضمون بہت ساری غلط فہمیوں کا ازالہ کردیتا ہے۔ اردو موجودہ رسم الخط میں ہی زندہ ہے اور زندہ رہ سکتی ہے۔ اردو الفاظ نہ تو آج کی ہندی اور نہ ہی رومن میں صحیح طور پر لکھے یا پڑھے جاسکتے ہیں۔ افسوس کہ آج اردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد میں روز افزوں کمی ہوتی جارہی ہے۔ بہار میں ایسے اسکول کی تعداد بہت ہے جہاں اردو کے استاد تو ہیں مگر اردو کا طالب علم نہیں۔ کہیں طالب علم ہیں مگر استاد نہیں۔ اردو کو زندہ رکھنے کے لئے اسے نچلی سطح سے مضبوط کرنا ہوگا۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ عام قاری اردو کے رسالوں کتابوں سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ یہ چیزیں صرف ادیب و شاعر کے مطالعے تک ہی محدود ہیں۔ وہی لکھتے بھی ہیں، پرچے خریدتے بھی ہیں اور پڑھتے بھی ہیں۔ "نئی صدی" لندن کو چاہئے کہ اردو کو رومن رسم الخط میں لکھنے کے بجائے اردو رسم الخط میں ہی لکھنے اور پڑھے جانے پر زور دیں۔

سہسرام — شمیم فاروقی

● میں نے اپنے مضمون میں کسی کا نام نہیں لیا تھا کہ مغرب کے فلاں فلاں صاحبان یا اداروں نے اردو کا رسم الخط رومن کرنے کی مانگ کی ہے۔ لیکن میری اطلاع کے مطابق ایسا تقاضا کرنے والے وہاں موجود تھے اور اب بھی موجود ہیں۔ اقبال مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ برطانیہ میں کسی فرد یا جماعت یا گروہ نے اردو رسم الخط کو رومن کردینے کی بات نہیں کی۔ یقیناً ایسا ہوگا۔ میں کسی کا نام لے کر اسے رسوا نہیں کرنا چاہتا، لیکن "شب خون" کے اسی شمارے میں ایک نام موجود ہے۔ خیر، اگر یہ مانگ مغرب سے نہیں اٹھی ہے تو ہم سب کے لئے خوشی کی بات ہے۔ لیکن خود اقبال مرزا صاحب کے مکتوب سے تو کچھ اور مترشح ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اقبال مرزا صاحب کے ارشادات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انٹرنیٹ اور دوسرے ذرائع کو استعمال کرنے والوں کی بدولت اردو کو رومن میں لکھنے کی ایک طاقتور لہر اٹھ چکی ہے اور یہ کہ اب اردو کا رسم الخط" کسی حد تک تبدیل ہو ہی چکا ہے۔" اگر ایسا ہے تو میرا یا کسی اور کا کچھ کہنا سننا بے کار ہے۔

اقبال مرزا صاحب کا خیال درست ہے کہ زبان میں بہت سی تبدیلیاں آرہی ہیں اور انھیں قبول کیا گیا ہے، اور ہر شخص زبان کو اپنے ماحول اور میراث کے اعتبار سے استعمال کرتا ہے۔ ان کی رائے میں برطانیہ (اور ہندو پاک) میں بچے بوڑھوں کا انٹرنیٹ پر رومن استعمال کرنا بھی اسی طرح کی تبدیلی ہے۔ اب وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ رسم الخط کی اس تبدیلی کو منضبط شکل دی جائے، یعنی اسے Regulate کیا جائے۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ زبان میں جو تبدیلیاں اپنے آپ آتی ہیں انھیں کوئی Regulate نہیں کرتا اور نہ کرسکتا ہے۔ اگر لوگ خود بخود کثیر تعداد میں رومن رسم الخط استعمال کررہے ہیں (میرے خیال میں ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہے) تو پھر انھیں کسی کے Regulate کرنے کی ضرورت نہیں۔ استعمال عام آہستہ آہستہ خود ہی طے کردے گا کہ (مثلاً) غین یا ہمزہ یا طوے کے لئے رومن میں کیا علامت استعمال کی جائے۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی رسم الخط زبان کی تمام آوازوں کو تو بیان کرسکتا نہیں، (خود اردو کی مثال سامنے کی ہے) اس لئے رومن رسم خط بھی اپنے تمام نقائص اور عیوب کے ساتھ اردو میں رائج ہوجائے گا۔

اقبال مرزا صاحب کا خیال ہے کہ اگر رومن رسم الخط سے اردو کو تقویت ملتی ہے تو اسے اضافی طور پر استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس جملے کو یوں کردیجئے: "اگر عربی رسم الخط سے انگریزی کو تقویت پہنچتی ہے تو اسے اضافی طور پر استعمال کرنے میں انگریزوں کا کچھ حرج نہیں۔" اب اس تجویز کو برطانوی پارلیمنٹ سے منظور کرادیجئے۔ میں اردو کے لئے رومن اور دیوناگری کیا، قدیم یونانی اور فنیقی بھی رسم الخط اختیار کرنے کی حمایت دل و جان سے کروں گا۔

اقبال مرزا صاحب کا خیال ہے کہ انٹرنیٹ وغیرہ پر رومن رسم الخط کا ایک سیلاب ہے جو اردو رسم خط کو بہائے لئے جارہا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندو پاک میں

بھی ایسا ہی ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ انٹرنیٹ پر رومن میں اردو وہی لوگ لکھتے ہیں جنھیں انگریزی ٹھیک سے نہیں آتی۔ اور ایسے لوگ صرف ہندوپاک ہی میں نہیں، بلکہ برطانیہ اور امریکہ، کناڈا میں بھی کثرت سے ہیں۔ میں درجنوں لوگوں کو جانتا ہوں جو سالہا سال سے ان ممالک میں رہ رہے ہیں۔ وہ کام چلانے کی بھر کی انگریزی بول تو لیتے ہیں لیکن لکھنے میں بہت ہی کچے ہیں۔ میں مغربی ممالک میں یونیورسٹیوں کے پروفیسروں، بینکوں کے عہدہ داروں اور کمپنیوں کے افسروں تک کو جانتا ہوں جو کام چلانے بھر کی انگریزی بولنے سے زیادہ نہیں جانتے، عام ہندوستانی پاکستانی کا تو سوال ہی کیا ہے۔ یہی لوگ انٹرنیٹ پر رومن اردو لکھتے ہیں۔ اقبال مرزا صاحب ان لوگوں کو انگریزی سکھادیں، اردو کے رسم خط کو رومن بنانے کی ضرورت ختم ہوجائے گی۔

یہ بات بالکل غلط ہے کہ اردو کا رسم الخط رومن کردینے سے معاش کے مسائل حل ہوجائیں گے۔ اقبال مرزا صاحب نے وضاحت نہیں کی ہے کہ ہندوستان پاکستان، بلکہ خود مغرب میں اردو بولنے والوں کو کون سا معاشی فائدہ پہنچے گا اگر وہ رومن رسم خط میں اردو لکھیں گے۔ اس سے انھیں انگریزی تو نہ آجائے گی، نہ ہندی، نہ کوئی اور زبان۔

یہ بات بھی غلط ہے کہ اردو پڑھنے والے اب کم ہو رہے ہیں۔ یہ قول صرف ان لوگوں کا ہے جن کے اپنے بچے، پوتی پوتے، نواسی نواسے، اردو نہیں پڑھتے۔ ورنہ اور جگہ تو تصویر کچھ اور ہی ہے۔ مثلاً شمیم فاروقی کا یہ کہنا درست ہے کہ بعض جگہوں پر اردو کی تعلیم کے انتظامات درست نہیں ہیں۔ یہ بات بھی ایک حد تک (صرف ایک حد تک) صحیح ہے کہ اردو تہذیب میں کتابیں اور رسالے خریدنے کا رواج کم ہے۔ یہ اتنا کم بھی نہیں جتنا اقبال مرزا صاحب یا شمیم فاروقی سمجھتے ہیں۔ پاکستان کا حال میرے خیال میں اردو کتابوں رسالوں کی کھپت کے بارے میں بہت اچھا ہے۔ اور ہندوستان میں بھی پہلے سے بہت ہی بہتر ہے۔ پبلشر لوگ مصنف کو روپیہ نہ دینے کے لئے بہانے تراش لیتے ہوں گے کہ اردو کی کتاب فروخت نہیں ہوتی۔ میں پوچھتا ہوں کہ ہندوستان میں اگر اردو کتابوں رسالوں کی کھپت نہیں تو اتنی بہت سی کتابیں چھپ کیوں رہے ہیں؟ کتابوں کے لئے مان لیجئے کوئی ادارہ امداد دے دیتا ہوگا، لیکن رسالوں کو تو کوئی امداد نہیں دیتا۔

"قسائی" کو درست کہنا، اور اس کے لئے یہ دلیل لانا کہ اس کی اصل عربی لفظ "قساوت" ہے، کئی اعتبار سے غلط ہے۔ اول تو "قسائی" کو صحیح قرار دے کر اقبال مرزا صاحب اپنی ہی بات کی نفی کر رہے ہیں کہ زبان وہی ہے جو انسان اپنے معاشرے اور وراثت میں حاصل کرتا ہے۔ اب اگر اردو والوں نے "قسائی" کی جگہ "قصائی" کو رائج کرلیا اور وہی ان کے ماحول میں ہے تو مرزا صاحب معترض کیوں ہوتے ہیں؟ دوسری بات یہ کہ اگر "قسائی" کی اصل "قساوت" بھی ہو تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اردو میں اس کا املا بدل نہیں سکتا، یا نہ بدلنا چاہئے۔ "شکوی" کا املا بدل کر ہم نے "شکوہ" کرلیا۔ "ذرہ" کا املا بدل کر ہم نے "ذرا" کرلیا، تو "قسائی" کا املا بدل کر "قصائی" کرنے میں کیا عیب؟ تیسری بات یہ کہ اگر یہ لفظ "قساوت" سے بنتا تو "قساوتی" ہوتا۔ جیسے "زیادت" سے "زیادتی"؛ "شرارت" سے "شرارتی"؛ "شکایت" سے "شکایتی" وغیرہ۔ "قساوت" سے "قسائی" بننے کا کوئی قرینہ یا طریقہ نہیں۔

برسبیل تذکرہ یہ بھی بتادوں کہ "املا نامہ" کے دوسرے ایڈیشن کے مصنف نارنگ صاحب نہیں ہیں۔ اس ایڈیشن کی اشاعت کے پہلے ایک کارگاہ منعقد ہوئی تھی۔ اس کی صدارت میں نے کی تھی، گوپی چند نارنگ، نثار احمد فاروقی اور رشید حسن خاں اس کے اراکین تھے۔ "املا نامہ" اول ایڈیشن پر جو استدراکات اور تبصرے ہوئے تھے، اور مزید تجویزیں جو سامنے آئی تھیں، ان پر غور کرکے اور نئی باتوں کو دھیان میں رکھ کر مذکورہ کارگاہ نے سفارشات کیں۔ "املا نامہ" کا دوسرا ایڈیشن ان سفارشات پر مبنی ہے۔

میں نے ان علاقوں کا ذکر کیا تھا جہاں اردو کی ترقی کے لئے کوششیں ہو رہی ہیں اور ہوئیں۔ شفق سوپوری صاحب کا نکتہ درست ہے کہ میں نے کشمیر کا نام نہیں لیا تھا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کشمیر واحد ریاست ہے اردو جہاں کی سرکاری زبان ہے۔ لیکن شفق صاحب کی اس بات میں بھی صداقت ہے کہ وہاں بہت سے بچے بوڑھے جوان اپنی رغبت سے کشمیری کے علاوہ اردو کو بھی اختیار کرتے ہیں۔ میرا مضمون جب کتابی شکل میں چھپے گا تو میں کشمیر کا اضافہ اپنی فہرست میں کردوں گا۔

قسیم طارق صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں کہ "ریختہ"؛ "ہندی/ہندوی"، "دکنی"، "گجری" وغیرہ کی طرح "اردو" بھی ہماری زبان کے پرانے ناموں میں سے ایک نام ہے اور آہستہ آہستہ دوسرے نام ترک ہوگئے، صرف "اردو" باقی رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ "اردو" بالکل نیا نام ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخری بیس برسوں کے پہلے اس کا سراغ نہیں ملتا۔ اور پہلا حتمی سراغ تو اور بھی بعد کا، یعنی گلکرسٹ کی کتاب میں ہے، جو ۱۷۹۶ میں چھپی۔ جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے، یہ پورا فقرہ تھا "زبان اردوے معلاے شاہجہاں آباد" اور اس سے شروع شروع میں فارسی مراد لیتے تھے۔ جب شاہ عالم نے دہلی میں قیام اختیار کیا (۱۷۷۲) تو آہستہ آہستہ "ہندی" کا چلن وہاں بڑھا اور اسے ہی "زبان اردوے معلاے شاہجہاں آباد" کہنے لگے۔ پھر کثرت استعمال سے "زبان اردوے معلی"؛ "زبان اردو"، "اردو کی زبان"، اور پھر صرف "اردو" رہ گیا۔ انیسویں صدی کی تیسری چوتھائی تک "ہندی" نام زیادہ مقبول تھا، پھر "اردو" مقبول تر ہوا۔ اس کے پیچھے انگریزوں کی حمایت بھی رہی ہوگی۔

قسیم طارق صاحب کو "اردو" بمعنی "دہلی شہر/شاہجہاں آباد کا شہر" کے لئے سند درکار ہے۔ پہلی سند تو خان آرزو کی ہے۔ پھر انشا نے جگہ جگہ لکھا ہے۔ اور انیسویں صدی کے تمام اہم لغات اردو، مثلاً Shakespear, Duncan Forbes, Fallon, Platts کے لغات ملاحظہ ہوں۔

شمس الرحمٰن فاروقی
الہ آباد

غالب انسٹی ٹیوٹ کا مجلہ

غالب نامہ

مدیر اعلیٰ: پروفیسر نذیر احمد

مدیران: پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، شاہد ماہلی

''اُردو میں ادبی تحقیق اور تنقید کی رفتار کا آئینہ''

پہلا اور دوسرا مشترکہ شمارہ	۲۰/روپے	جنوری ۱۹۹۲ء (عرشی نمبر)	۵۰/روپے
پہلا اور دوسرا مشترکہ شمارہ	۱۰/روپے	جولائی ۱۹۹۲ء	۵۰/روپے
جنوری ۱۹۸۱ء	۲۵/روپے	جنوری ۱۹۹۳ء (مسعود حسین رضوی نمبر)	۵۰/روپے
جولائی ۱۹۸۱ء	۳۰/روپے	جولائی ۱۹۹۳ء	۵۰/روپے
جنوری ۱۹۸۲ء	۳۰/روپے	جنوری ۱۹۹۴ء	۵۰/روپے
جولائی ۱۹۸۲ء	۳۵/روپے	جولائی ۱۹۹۴ء	۵۰/روپے
جنوری ۱۹۸۳ء	۳۰/روپے	جنوری ۱۹۹۵ء	۵۰/روپے
جولائی ۱۹۸۳ء	۳۰/روپے	جولائی ۱۹۹۵ء	۵۰/روپے
جنوری ۱۹۸۴ء	۳۰/روپے	جنوری ۱۹۹۶ء (سلور جوبلی نمبر ۱)	۵۰/روپے
جولائی ۱۹۸۴ء	۳۰/روپے	جولائی ۱۹۹۶ء (سلور جوبلی نمبر ۲)	۵۰/روپے
جنوری ۱۹۸۵ء	۳۰/روپے	جنوری ۱۹۹۷ء	۵۰/روپے
جولائی ۱۹۸۵ء	۳۰/روپے	جولائی ۱۹۹۷ء (احتشام حسین نمبر)	۵۰/روپے
جنوری ۱۹۸۶ء	۳۰/روپے	جنوری ۱۹۹۸ء (غالب کا دوصد سالہ جشن ولادت نمبر ۱)	۶۰/روپے
جولائی ۱۹۸۶ء	۳۰/روپے	جولائی ۱۹۹۸ء (غالب کا دوصد سالہ جشن ولادت نمبر ۲)	۶۰/روپے
جنوری ۱۹۸۷ء (قاضی عبدالودود نمبر)	۴۰/روپے	جنوری ۱۹۹۹ء	۶۰/روپے
جولائی ۱۹۸۷ء	۳۰/روپے	جولائی ۱۹۹۹ء	۶۰/روپے
جنوری ۱۹۸۸ء	۴۰/روپے	جنوری ۲۰۰۰ء	۶۰/روپے
جولائی ۱۹۸۸ء	۴۰/روپے	جولائی ۲۰۰۰ء	۱۰۰/روپے
جنوری ۱۹۸۹ء	۴۰/روپے	جنوری ۲۰۰۱ء	۶۰/روپے
جولائی ۱۹۸۹ء	۴۰/روپے	جولائی ۲۰۰۱ء	۱۰۰/روپے
جنوری ۱۹۹۰ء	۴۰/روپے	جنوری ۲۰۰۲ء	۶۰ روپے
جولائی ۱۹۹۰ء (حافظ محمود شیرانی نمبر)	۴۰/روپے	جولائی ۲۰۰۲ء	۱۵۰/روپے
جنوری ۱۹۹۱ء	۴۰/روپے	جنوری ۲۰۰۳ء	۶۰/روپے
جولائی ۱۹۹۱ء	۴۰/روپے	جولائی ۲۰۰۳ء	۱۲۰/روپے

ملنے کا پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی۔۲

پہلے قدم کی یادیں

جعفر رضا

"شب خون" نے اردو کی ادبی صحافت، بلکہ برصغیر کی ادبی صحافت کی تاریخ میں عہد آفریں کارنامہ انجام دیا ہے۔ کم و بیش چار دہائیوں تک اردو کی ادبی صحافت کی تعیینِ قدر کا مرحلہ سرانجام دینے کے بعد از خود نئی نسل کے لیے میدان خالی کر دینا، کہ ہم نے اپنی سی کی، اب تمھاری باری ہے، اردو ادبی صحافت میں ایک نئی روایت کی ابتدا ہے۔ انتالیس، بلکہ چالیس سال تک کسی ادبی رسالے کا کسی سرکاری یا نیم سرکاری امداد کے بغیر جاری رہنا اور معیار کے معاملے میں کبھی سمجھوتا نہ کرنا معجزہ گر نہ اسے کہیے تو ہے سحرِ حلال!

"شب خون" اور شمس الرحمٰن فاروقی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔ حالانکہ شمس الرحمٰن فاروقی رسمی طور پر "شب خون" کے مدیر نہیں رہے ہیں۔ ابتدائی دور کے خاصے بعد سے ان کا نام 'ترتیب و تہذیب' کے حوالے سے "شب خون" کی زینت بنتا رہا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی علمی، ادبی اور تنظیمی صلاحیتوں سے "شب خون" کو اردو صحافت کی تاریخ میں وہ اعلیٰ مقام دلایا کہ "شب خون" میں کسی تخلیق کا شائع ہونا اس کے معیاری ہونے کی دلیل مانا جانے لگا۔ "شب خون" نے تخلیقی اور ادبی قدروں کی ایسی بھرپور آبیاری کی کہ جس کے فیض سے شاعروں، ادیبوں اور ناقدوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہوئی جو دیگر عصری زبانوں کے شاعروں، ادیبوں اور ناقدوں کے مقابلے میں تخلیقی و ادبی معیاروں کے لحاظ سے اپنی انفرادیت رکھتی ہے۔ آج اردو کے کئی نام جو بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں، ان کی ابتدائی شعری و ادبی شخصیت کی تلاش کریں تو وہ "شب خون" ہی میں نظر آئے گی۔

"شب خون" سے میرا رشتہ اس کے عالمِ وجود میں آنے سے وابستہ ہے۔ یہ حکایتِ لطیف دراز ترگفتن کا تقاضا کرتی ہے، لیکن میں مختصر کہتا ہوں۔ اس طرح ہے کہ ۱۹۶۵/۱۹۶۶ میں شمس الرحمٰن فاروقی کی تعیناتی الہ آباد کے محکمۂ ڈاک میں تھی تو دوستوں کی محفلیں ان کے ساتھ جمتی تھیں۔ ایسی ہی کسی محفل میں ایک دن یہ خیال ابھرا کہ الہ آباد سے ایک علمی و ادبی رسالہ جاری کیا جائے اور اس میں معیار کی بلندی کے ساتھ نئے خیالات کی ترویج، اور نئے لکھنے والوں، خاص کر الہ آباد کے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کا بھی اہتمام کیا جائے۔ استاد مرحوم ڈاکٹر سید اعجاز حسین سے ذکر کیا گیا۔ جو لوگ ان مرحوم سے واقف ہیں وہ میری تائید کریں گے کہ ان کی زندگی نئی نسل میں ادبی ذوق کی ترویج اور آبیاری کی مساعی سے عبارت تھی۔ الہ آباد سے ایک نئے ادبی رسالے کے اجرا میں انھیں اپنے دیرینہ خواب کی تعبیر نظر آئی جو اپنا رسالہ "کارواں" بند کر دینے کے بعد ان کے دل میں ایک کسک کی طرح باقی تھا۔ انھیں کی زبانی سنیے:

> کوئی ادبی تنظیم ایسی نہیں جو تمام بکھرے ہوئے دانوں کو ایک رشتے میں پرو دے۔ مختلف و متعدد اہلِ فکر کے افکار و محسوسات کو ایک اچھی صورت میں منظرِ عام پر لا سکے، پرانے لکھنے والوں کی اچھی تخلیقات چھاپے، اور نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرے۔ یہ کمی اردو دوستوں کے ہر دیار میں محسوس کی جا رہی ہے۔ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ الہ آباد کے کچھ باہمت ادیبوں اور ادب دوستوں نے یہ ماہنامہ ["شب خون"] نکالنے کی فکر کی۔ نوجوانوں اور جوانوں کی اس مختصر محفل میں دو ایک بوڑھے بھی شریک کیے گئے جن سے رہنمائی و مزید تعاون کی درخواست کی گئی۔ بوڑھوں نے بھی لبیک کہا۔ مگر اس احساس و عمل کی منزل میں جو چیز سب سے زیادہ سدِ راہ تھی وہ وہی تھی جس کو دنیا نے ستار عیوب و قاضی الحاجات سمجھا ہے۔ اپنے اپنے طور پر سبھی اس مرحلہ کو طے کرنے کے طریقے پر غور کر رہے تھے، مگر باوجود خلوص و فکر کے مالی دقت کی مہم سر ہوتی ہوئی نظر نہ آتی تھی۔ اربابِ علم و فن کی اس کشمکش کو دور کرنے کے لیے جمیلہ فاروقی (پرنسپل قدوائی گرلز کالج الہ آباد) نے اپنی آواز بلند کی۔ نہایت متین و حوصلہ افزا لہجہ میں اطمینان دلایا کہ اگر صرف روپیہ کی کمی سے یہ کارِ خیر رک رہا ہے تو آپ لوگ اس کی فکر میں وقت نہ ضائع کریں، اس کا انتظام ہو جائے گا۔ چنانچہ اسے آوازِ غیب سمجھ کر کشتی منجدھار میں ڈالی جا رہی ہے (پہلا شمارہ، اداریہ از ڈاکٹر سید اعجاز حسین)۔

شب خون کی تشکیل ایک مختصر مجلس، یعنی شمس الرحمٰن فاروقی، جمیلہ فاروقی (بیگم شمس الرحمٰن فاروقی)، حامد حسین حامد، (پرانا نام، حامد بہکاوی) اور راقم السطور پر مبنی تھی۔ بزرگوں میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین، پروفیسر سید احتشام حسین اور ڈاکٹر مسیح الزماں مرحومین شامل تھے۔ اب "شب خون" نام اختیار کرنے کی روداد بھی اعجاز صاحب کی زبانی سنیے:

> اپنی نوعیت کے اعتبار سے رسالے کا نام کبھی تعجب، کبھی تنفر، کبھی تردد کا باعث ہوگا۔ نام اچھا ہے یا برا، بہر حال دلچسپی کا

سامان ضرور ہے۔ ادارہ نے منجملہ اور ناموں کے پہلا نام
"تیشہ" تجویز کیا تھا، اس کے بعد دوسرا نام "شب خون" تھا۔
پہلا نام نامنظور ہوا، دوسرے نام یعنی "شب خون" کی
اجازت دی گئی (پہلا شمارہ، اداریہ از ڈاکٹر اعجاز حسین)۔

بزرگوں کا پسندیدہ نام "تیشہ" تھا لیکن ہماری ترجیح "شب خون" ہی تھا۔ اصلاً ہمارے پیش نظر بعض مشہور انگریزی جریدے تھے جن کے طرز پر ہم اردو میں رسالہ نکالنا چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ "شب خون" نام نے ابتدا میں لوگوں کو خاصے پس و پیش میں مبتلا کیا، لیکن چند شماروں کی اشاعت کے بعد صورت حال تبدیل ہوگئی اور یہ نام بہت مانوس و مشہور ہوگیا۔

"شب خون" کے اول بارہ شماروں (جون ۱۹۶۶ تا مئی ۱۹۶۷) میں راقم السطور نائب مدیر اور ڈاکٹر سید اعجاز حسین مدیر رہے۔ اس کے بعد میں نے "شب خون" سے اپنا رشتہ نائب مدیر کی حیثیت سے منقطع کرلیا لیکن میرے اور شمس الرحمٰن فاروقی کے درمیان مخلصانہ رشتہ پہلے ہی جیسا رہا اور یہی رشتہ بفضلہ ہنوز برقرار ہے۔ اس میں صرف اتنی تبدیلی آئی ہے کہ پہلے میں انھیں "فاروقی بھائی" کہتا تھا، اب صرف "بھائی" کہتا ہوں۔ مزید چند شماروں کے بعد ڈاکٹر اعجاز حسین نے بھی علیحدگی اختیار کرلی۔ لیکن اعجاز صاحب مرحوم سے بھی شمس الرحمٰن فاروقی کے مراسم استاد مرحوم کے دم آخر تک ویسے ہی نیاز مندانہ اور مخلصانہ رہے اور اعجاز صاحب مرحوم بھی ان پر حسب سابق کرم فرماتے رہے۔ اس کے بعد سے "شب خون" کے سفید و سیاہ کے مالک تنہا شمس الرحمٰن فاروقی رہے ہیں۔ البتہ "شب خون" کی ادارت کا منفرد انداز جو ابتدائی شماروں میں مقرر ہوا تھا، کم و بیش اسی طرح برقرار رہا۔ اعلیٰ علمی و ادبی مضامین، نئی شاعری، نیا افسانہ، ہر تخلیق کو سالمیت کے ساتھ جگہ دینا، یعنی "باقی کے لئے دیکھیے فلاں صفحہ"، وغیرہ یکسر ممنوع، خالی جگہیں پر کرنے کے لیے بے تکے اقتباسات سے مکمل پرہیز، ہر تخلیق کو اس کے مرتبہ کے اعتبار سے جگہ دینا، ہر اہم تخلیق، خاص کر تنقیدی مضمون اور افسانے کو طاق صفحے سے شروع کرنا، ترتیب میں اس بات کا بھی لحاظ رکھنا کہ کون سی تخلیق کس تخلیق کے بعد یا پہلے زیادہ لطف دے گی، جگہ کا بے جا صرف نہ کرنا، لیکن تنگی پیدا کئے بغیر ایسا اہتمام کرنا کہ ۸۰ صفحوں میں ۸۰ سے زیادہ صفحوں کی عبارت آجائے، قارئین کے خطوط میں ادبی مباحث پر گفتگو کو بیش از بیش اہمیت دینا، اداریہ کے بجائے کسی ادبی بین الاقوامی ادبی مسئلے یا صورت حال کے بارے میں فکر انگیز اطلاع یا اقتباس، اور سب سے بڑھ کر نئے اور گمنام اہل قلم کی حوصلہ افزائی، یہ صفات "شب خون" میں روز اول سے تھیں اور اب تک ہیں۔

کسی ادبی مسئلے پر بین الاقوامی صورت حال کی فکر انگیز اطلاع کی ضمن میں پہلے ہی شمارے میں "ادب اور احتساب" عنوان سے ادیب و فن کار کی آزادی تحریر و خیال کے مسئلے پر اداراتی نوٹ کی بنا پر ایک حلقے کو غلط فہمی ہوئی کہ "شب خون" ترقی پسندوں کی مخالفت میں جاری کیا گیا تھا۔ یہ الزام سراسر بے بنیاد تھا۔ جدید ادب کے فروغ اور ادیب کی آزادی کو محترم قرار دینا اگر ترقی پسندی کے خلاف سمجھا گیا ہو تو اور بات ہے، ورنہ "شب خون" کے ہر شمارے میں ترقی پسند لکھنے والے موجود رہے ہیں۔ البتہ نئے اہل قلم بھی نظر آئیں گے، اور یہی مناسب بھی تھا۔

"شب خون" کی اشاعت سے اردو میں ایک اور ادبی 'بدعت' کی ابتدا ہوئی۔ ہندی میں تو تھی، لیکن اردو میں کسی کتاب یا رسالے کے اجرا کی تقریب میں نے دیکھی، نہ سنی تھی۔ "شب خون" کے اجرا کی تقریب بڑی شان دار ہوئی تھی۔ رسالے کے مدیر کی زبانی سنیے:

> بہر حال تاریک فضا میں ایک جگنو نظر آیا۔ "شب خون" منظر عام پر آگیا۔ اجرا کی رسم افتتاح کے سلسلہ میں ۱۹ اپریل [کذا، دراصل مئی] کو ایک ایسا جشن منایا گیا [کہ جس] جشن کی مثال کم از کم الہ آباد کی ادبی دنیا میں مشکل سے ملے گی۔ دانشوروں کے ہجوم میں مختلف زبانوں کے نمائندے شامل تھے۔ ہندی، انگریزی، بنگلہ، فارسی، عربی، فرانسیسی زبانوں کے جاننے والے گزدر ریستوران کے پر فضا و خوبصورت سبزہ زار پر رسالے کا استقبال کرنے میں سرگرم تھے۔ جہاں تک ہم کو یاد ہے، الہ آباد کے مشہور سول لائن کے اس دلکش لان پر اس سے پہلے کوئی علمی و ادبی جلسہ اس اہتمام سے کبھی نہیں ہوا تھا۔ الہ آباد میں تین سو سے زیادہ اہل علم کا ایک رسالے کے خیر مقدم کو جمع ہونا آسان بات نہ تھی۔ ہندوستان کے مایۂ ناز نہرو خاندان کے چشم و چراغ رتن کمار نہرو صاحب (وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی) نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔ اردو کے مشہور و معروف شاعر فراقؔ نے خیر مقدم کے لیے لب کشائی کی۔ پروفیسر احتشام حسین نے صدر کا تعارف کراتے وقت ان کی ہمہ گیر شخصیت کا ذکر کیا۔ مدیر رسالہ نے صدر کو رسالے کا پہلا شمارہ نذر کیا۔ جعفر رضا نائب مدیر جو اب تک پروگرام کے مطابق مقررین کو ڈائس پر بلا رہے تھے، بالآخر صدر سے ملتجی ہوئے۔ صدر جلسہ نے زبانوں کے عروج و زوال اور مسائل پر بڑی پر مغز تقریر کی۔ خاتمہ پر جمیلہ فاروقی نے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا (دوسرا شمارہ، اداریہ از ڈاکٹر سید اعجاز حسین)۔

اعجاز صاحب نے اداریے کے آخر میں لکھا تھا کہ پہلا شمارہ ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ یہ بات بالکل درست تھی، اور "شب خون" کی مقبولیت کی یہ کیفیت بڑھتی ہی گئی۔ اس وقت ہم لوگوں میں سے کسی کے ذہن میں اس کی عمر کے بارے میں کوئی تاثر نہ تھا۔ اس وقت ہم میں سے کوئی اس بات پر سوچنے کو بھی تیار نہ تھا کہ "شب خون" بند بھی ہوسکتا ہے۔ آج جب یہ بند ہو رہا ہے تو شاید شمس الرحمٰن فاروقی کے بھی دل میں وہی کسک ہو جو اعجاز صاحب مرحوم کے دل میں 'کارواں' بند کرتے وقت تھی ☆☆☆

"شب خون" اور میں

مہر افشاں فاروقی

الٹی ہوگئی سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

کچھ لکھنے کا خیال عام طور پر میرے دل میں جھنجھلاہٹ، الجھن اور خلش کی ملی جلی کیفیت پیدا کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ لہٰذا مجھے خود اپنے آپ پر حیرت ہوئی جب میں نے "شب خون" کے آخری شمارے کے لئے لکھنے کی تجویز کی۔ مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ جھنجھلاہٹوں کے بجائے یادِ ماضی نے ناسٹیلجیا کی ایسی کیفیت پیدا کی جس نے زورِ تخیل سے پرانی یادوں کو پھر سے تازہ کیا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف میرے خیالات کا رخ یوں موڑا کہ میرے دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ میں انھیں لکھ ڈالوں۔

جب میں بچی تھی تو مجھے سیکڑوں اشعار حفظ تھے۔ ان میں سے چند میرے پسندیدہ تھے کیونکہ ان کے اور میرے درمیان معنی کا عجیب رشتہ تھا۔ ان اشعار کے تشریحی معنی ظاہر ہے کچھ اور ہی تھے۔ میرا رشتہ ان سے ایک غیر فہمیدہ لیکن دلی تعلق کا تھا اور وہ کسی غیر محسوس طریقے سے میرے دل و دماغ، شخصیت اور مزاج میں پیوست تھے۔ جب میں بافہم ہوئی اور ان اشعار کی تفہیم کو ٹھیک سے جانا، تو وہ پرانا رشتۂ معنی بھی اس دلی تعلق کے ساتھ جڑ گیا، اس سے الگ نہیں ہوا۔ کچھ ایسا ہی رشتۂ معنی میرا "شب خون" کے ساتھ بھی تھا اور ہے۔ "شمارہ"، "پرچہ"، "شب خون"، یہ سب میرے لئے نئے الفاظ تھے۔ ان کے لغوی نکات اور اصطلاحی معنی کی مجھے پروا نہ تھی۔ میرے پاس تو ایک نرالا گنجینۂ معنی کا سرمایہ تھا جسے میں نے یقیناً ورثے میں پایا تھا۔

ہر طرف شور اٹھا مار چلا مار چلا

"شب خون" میرے تصور میں اس مصرعے سے منسلک تھا۔ آخر اسے شمارہ یا پرچہ کیوں کہتے ہیں؟ رسالہ کیوں نہیں کہتے؟ یہ سوال میرے ذہن میں اکثر اٹھا کیونکہ شمارہ میرے لئے نیا لفظ تھا اور پرچے کے معنی میرے لیے محض کاغذ کا ٹکڑا تھے۔ میں نے خود سوچ لیا کہ اگر "شب خون" اسمِ کتاب ہو تو "رسالہ" اس کی تعریف کے لئے بہت کمزور، بودی سی اصطلاح ہے۔ یا پھر اس کا "جدیدیت" سے کچھ نہ کچھ تعلق ہوگا کیونکہ "ترقی پسندی" اور "جدیدیت"، یہ لغات بھی میرے شعور میں انھیں دنوں کی یادوں کے ساتھ اور انھیں دنوں سے وابستہ ہیں۔ ہمارے گھر کے ملاقاتی کمرے میں گفتگو کے موضوعات اکثر یہی ہوا کرتے تھے۔ ملاقاتی کمرے میں محوِ گفتگو شخصیتوں کے چہرے میری یادوں میں بہت دھندلے ہو گئے ہیں۔ صرف کچھ چہرے اچھی طرح یاد ہیں۔ لفظ "مدیر" بھی ان میں شامل ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کے گھر میں باغیچہ تھا جس میں سنہری مچھلیوں والا حوض تھا۔ اس میں کنول کے پھول بھی تھے جنھیں چھوا جا سکتا تھا۔ ان کے برآمدے میں ایک پنجرے میں مٹھو کچھ کچھ بولتا رہتا تھا۔ اعجاز صاحب کی آواز میں غیر معمولی گرج اور لرزش یکجا تھی۔ وہ ہمیشہ چوڑے پائنچوں کا پاجامہ پہنتے تھے۔ جب کبھی ہمارے یہاں تشریف لاتے تو برآمدے سے "فاروقی صاحب" پکارتے۔ ان کی آواز، جیسا کہ میں نے کہا، ان سے اس قدر مخصوص تھی کہ کوئی نہ کوئی دوڑ کر ملاقاتی کمرے کا دروازہ کھول کر ان کا استقبال کرتا۔ میری عمر کوئی سات یا آٹھ برس کی ہوگی۔ مجھے دھندلا سا یاد آ رہا ہے کہ شاید "شب خون" کے شروع کے شماروں میں ان کا نام "شب خون" کے مدیر کی حیثیت سے درج ہے۔

میلی شلوار قمیص پہنے، کھچڑی ڈاڑھی والے صاحب اکثر دانتوں میں خلال دبائے دبائے باتیں کیا کرتے تھے۔ میرے والدین ان کی خطاطی پر فریفتہ تھے۔ مجھے تو بالکل یقین نہیں آتا تھا کہ چکنے، شفاف کاغذ پر سیاہ خط میں یہ حروف ان کے قلم یا کسی انسان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہو سکتے تھے۔ سلیم اللہ صاحب "شب خون" کے کاتب، اور بڑے باتونی شخص تھے۔ اب میں نے ایک نیا لفظ اور سیکھا، "فرما"۔ "شب خون" کے ماحول کے سوا میں نے اس لفظ کو استعمال ہوتے کبھی نہیں سنا۔ اس قسم کے الفاظ میرے اور "شب خون" کے رشتے کی ایک طرح سے پہچان ہیں۔ یہ جملہ لکھتے ہوئے میں نے آج پہلی دفعہ اس کے معنی لغت میں تلاش کئے اور یہ دیکھ کر اطمینان کیا کہ یہ لفظ لغت میں موجود تھا حالانکہ مجھے شک تھا کہ اب متروک ہو چکا ہے۔

سلیم اللہ صاحب فرمے لکھ کر لایا کرتے اور میرے والد اس نازک چکنے پھسلتے کاغذ پر خاص قسم کی پنسل سے کتابت کی غلطیاں صحیح کرتے۔ وہ پرچے کی ادارت کا قریب قریب سارا کام خود انجام دیتے تھے۔ ملازمت کی مصروفیات کے باوجود یہ سب کچھ وہ کس طرح وقت نکال کر کرتے ہوں گے، اس پر تو پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ خیر، کاتب صاحب اکثر فرمے لانے میں تاخیر کرتے۔ کئی دفعہ صبح سویرے یا رات گئے وہ دروازہ کھٹکھٹاتے یا گھنٹی بجاتے، پھر گھنٹوں برآمدے میں کرسی پر بیٹھے انتظار کرتے۔ کاتب صاحب کا آنا جانا، "شب خون"، اس کا چھپ جانا، ہمارا سونا جاگنا، سب کچھ آپس میں گتھا ہوا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار کاتب سلیم اللہ صاحب سے عاجز آ کر ریاض احمد صاحب کو کام سونپا گیا۔ سلیم صاحب کے مقابلے میں ریاض صاحب کے حروف کھلے نہیں تھے، اتنے روشن نہ لگتے تھے۔ پتلون قمیص پہنے، دبلے پتلے، کلین شیو، کالے فریم کا چشمہ لگائے، بغل میں بیگ دبائے، نوجوان ریاض صاحب خاموش طبع تھے۔ وہ اب بھی "شب خون" کی خطاطی سے منسوب ہیں۔ آج کل وہ کمپیوٹر پر کام کرتے ہیں۔ اب انھوں نے ڈاڑھی رکھ لی ہے، جس کے بال کھچڑی ہو چکے ہیں۔ ایک مدت کے بعد میں نے انھیں پچھلے برس دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ

بالکل سلیم اللہ کاتب لگ رہے تھے اور باتیں بھی خوب کر رہے تھے۔

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

ہمارے ہاں ادبی نشستیں اکثر ہوا کرتیں۔ ان نشستوں میں بیشتر شاعر حضرات اور کچھ افسانہ نگار تشریف لاتے۔ الہ آباد میں شاعرات نہ رہی ہوں گی۔ سننے والوں میں بھی محض دو چار خواتین ہوتی تھیں جن میں سے ایک ظاہر ہے میری والدہ تھیں۔ ان کے علاوہ مسیح الزماں صاحب کی بیگم اور ان کی بڑی بیٹی شبنم ضرور ہوتی تھیں۔ بیگم مسیح الزماں ان گنی چنی ادب دوست خواتین میں تھیں جو ہمارے گھر کے ملاقاتی کمرے میں تشریف فرما ہوتی تھیں۔ وہ بچوں سے بھی بات کیا کرتی تھیں۔ ان کا انداز گفتگو اور ان کی آواز کی مٹھاس میں انوکھا ٹھہراؤ تھا۔ اب مجھے لگتا ہے کہ ان کی زبان میں لکھنؤ پن رہا ہوگا۔ ہم الہ آباد والوں کا لہجہ ان سے مختلف ہے۔ وہ دھیمی سریلی آواز میں فیض، اقبال (ان غزلوں کو میں پہچان گئی تھی) کی چیدہ غزلیں فرمائش پر ترنم سے سناتی تھیں۔ یہ بتائے مجھ سے رہا نہیں جاتا کہ ان کو غیر معمولی طرح سے جوڑوں کی ہڈیاں چٹکانے کا فن آتا تھا۔ کلائی، گردن، کبھی یہاں تک کہ بلی کے پاؤں اور دم! موقع پاتے ہی ہم اپنی بلی ان کی گود میں رکھ دیتے اور وہ اس کی دم چٹخا دیتیں۔ سب لوگ ان کو بجیا کہتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس لئے کہ وہ نیر مسعود صاحب کی بڑی بہن تھیں۔ میری والدہ بھی غالب اور فیض کا کلام بے حد سریلی آواز میں سناتی تھیں۔ کتنے ہی اشعار مجھے اس طرح یاد ہو گئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، میر کی غزلیں کوئی نہیں گاتا تھا۔ ہر طرف غالب، اقبال، فیض تھے یا جدید شعرا۔

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

ان دنوں الہ آباد میں گزدر کی آئس کریم بہت مشہور تھی۔ وہاں کی آئس کریم یقیناً بہت اچھی رہی ہوگی، آئس کریم کا ذائقہ تو مجھے یاد نہیں لیکن سبز، زمردیں گھاس والا لان، سفید میز پوش سے ڈھکی ہوئی میزیں اور ان پر شیشے کے پیالوں یا طشتریوں میں آئس کریم اچھی طرح یاد ہے۔ گرمیوں کی شام، تازہ تراشی ہوئی گھاس کی خوشبو، سفید پھولوں کے گلدستے، آئس کریم اور ملاقاتی کمرے میں جمع ہونے والے کچھ مانوس شکلوں والے افراد، اور بہت سارے نئے چہرے۔ کیا وہ "شب خون" کی رسم اجرا تھی؟ دماغ پر زور دینے کے بعد صرف آئس کریم اور پہلے شمارے کے سرورق کے رنگ یاد آئے۔ پہلے دوسرے تیسرے شمارے کے سرورق کے رنگ اور ڈیزائن ویسے بھی یاد تھے۔ کاش کہ اس محفل سے وابستہ کچھ اور باتیں میں یاد میں لا سکتی۔ "شب خون" کی رسم اجرا کے بارے ضرور لکھا گیا ہوگا۔ ہاں اس کی اجرائی اور مقبولیت کے بعد تو ضرور بہتوں نے پرچے کی آمد کو اردو ادب میں جدیدیت کی پرچم کشائی قرار دیا۔

کہ بن گئے مرے دیوار و در در و دیوار

"شب خون" کا دفتر ۳۱۳ رانی منڈی چوک میں میرے نانا نانی کے مکان کے باہری کمرے میں تھا۔ کمرہ لمبائی کی مناسبت سے چوڑا کم تھا اور اس میں باہر کی طرف کھلنے والے تین دروازے تھے۔ چوتھا دروازہ ڈیوڑھی میں کھلتا تھا اور پانچواں اس کے پیچھے والے کمرے میں۔ کمرے کی مناسبت سے ایک یا شاید دو لمبوتری میزیں اور چند بے میل کرسیوں کے علاوہ ایک طرف کتابوں سے لدا ہوا ایک تخت تھا۔ ہاں ایک آرام کرسی بھی تھی جس پر میرے والد جب وہاں جاتے تو بیٹھتے اور "شب خون" کی ڈاک وغیرہ ملاحظہ کرتے۔ چونکہ اوپر کی منزل میں میرے ننہالی رشتہ دار رہا کرتے تھے اس لئے میرے لئے خاص کر "شب خون" کے دفتر جانے کی دعوت کا مطلب جی بھر کر مزے کرنے کی دعوت ہوا کرتا تھا۔ دفتر عموماً شام کو کھلتا تھا کیونکہ اس کی دیکھ ریکھ کرنے والے بھی لوگ روزگار و دیگر سے فرصت پا کر وہاں کا رخ کرتے تھے۔ الہ آباد کے بہتیرے ادیب و شاعر وہاں جمع ہوتے ہوں گے۔ موضوعات گفتگو کیا رہے ہوں گے، اس بارے میں ضرور ان لوگوں میں سے کسی کو لکھنا چاہئے۔ میرے ذہن میں محض کمرے کا نقشہ، دیواروں کے رنگ، کتابوں کے پلندے، گوند کی شیشی، لیئی بھرا برتن، ستلی، لاکھ، خاکی کاغذ، ادھ کھلی الماریاں رہ رہ کر ابھر رہی ہیں۔ اس بے ترتیبی میں منطقی ربط، معنی، اور معقولیت پیدا کرنا صرف میرے والد کے بس کا کام تھا۔ شاید مجھے وہاں کی بے ترتیبی اس لئے بھی یاد ہے کہ خود میرے والد کے مزاج میں فنکارانہ نظم و ترتیب بہت ہے۔ جب "شب خون" کا مرکز اور دفتر دونوں ہمارے ہیسٹنگز روڈ والے گھر میں یکجا ہوئے تو اس کا حلیہ بدل گیا۔

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں

جب میرے والد کا تبادلہ الہ آباد سے لکھنؤ ہوا تو "شب خون" کے دفتر کی تنظیم کی ذمہ داری میری والدہ نے سنبھالی۔ پرچہ الہ آباد سے چھپتا رہا۔ روزمرہ کے انتظامات درست رکھنے کے لئے کئی حضرات آئے اور گئے۔ پرچہ کبھی دیر سے آتا مگر اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔ اب ہم لوگ گرمی کی چھٹیاں لکھنؤ میں گذارتے تھے۔ وہاں پر ہم دونوں بہنوں کو جم کر اردو ادب پڑھایا جاتا۔ میں نے اس دور میں غالب اور بہت سارا اقبال پڑھا۔ پریم چند کے افسانوں کے مجموعے، پھر حیات اللہ انصاری کے ناول "لہو کے پھول" کی پانچوں جلدیں۔ میں نے دو چار تراجم انگریزی سے اردو میں کئے۔ ان میں سے ایک آدھ "شب خون" میں چھپ بھی گئے۔ لیکن ان دنوں ہم سے "شب خون" پڑھنے کی توقع نہ کی جاتی تھی۔ مجھے جدید افسانہ اور شاعری کی چند سطریں خود پڑھنا بڑا مشکل لگتا تھا۔ لیکن بغیر کچھ پڑھے ہی اٹھتے بیٹھتے کچھ نہ کچھ واقفیت میں نے لامحالہ حاصل کر لی۔ کبھی "شب خون" اٹھا کر الٹ پلٹ لیا۔ ۱۹۷۰ سے ۱۹۸۵ تک یوں ہی کام چلتا رہا۔ جدید شاعری خاص کر غزل کا ذوق بمشکل پیدا ہوا۔

آج سے پہلے ہم بھی سمجھے تھے اس کو برگ گل
تجربۂ جلالت روئے نگار کس کو تھا

"گنج سوختہ" کی یہ غزل مجھے منہ زبانی یاد تھی (اور ہے)۔ میں اسے والد صاحب کے مخصوص انداز میں تحت اللفظ سنایا کرتی تھی۔ اس کے معنی برسوں بعد یکایک خود بخود سمجھ میں آ گئے۔ پچھلے دس سال سے میں "شب خون" باقاعدہ پڑھ رہی ہوں۔ خوش قسمتی سے نہ صرف پڑھ رہی ہوں بلکہ پڑھا بھی رہی ہوں۔ "شب خون" کے آخری شمارے کے لئے چند جملے لکھتے ہوئے مجھے افسوس نہیں بلکہ ایک طرح سے مکمل ہونے کا احساس ہو رہا ہے۔ ارادہ ہے کہ پہلے شمارے سے پڑھنا شروع کروں اور اس کی تاریخ کے مختلف ادوار پر مفصل مضمون لکھوں ☆☆☆

شب خون

A Valediction: Forbidding Mourning

آصف فرخی

Beware the Ides of March۔ مارچ کے ان دنوں سے خبردار رہنے کی تاکید شیکسپیئر کی روایت میں جولیس سیزر کو بھی کی گئی تھی۔ مارچ کے مہینے میں عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے جناب شمس الرحمٰن فاروقی اسلام آباد تشریف لائے تو انھوں نے اس خبر کی تصدیق کر دی کہ وہ "شب خون" بند کر رہے ہیں۔ "شب خون" کا فروری ۲۰۰۵ کا شمارہ (نمبر شمار ۲۸۹) پاکستان پہنچا تو اس میں یہ اعلان نظر آیا: "شب خون کا کوئی شمارہ جون ۲۰۰۵ کے بعد شائع نہ ہوگا۔"

اس تکلیف دہ فیصلے کی وجہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اپنی خرابیِ صحت بتائی جس کی وجہ سے وہ روزانہ مسلسل اسی طرح کام نہیں کر سکتے کہ جو "شب خون" جیسے معیاری اور باقاعدہ پرچے کی ضرورت ہے، اور وہ زیادہ وقت اپنے زیرِ تکمیل منصوبوں کو دینا چاہتے ہیں جس میں ان کا زیرِ تصنیف ناول بھی شامل ہے اور جس سے ہمیں خاص طور پر بڑی دلچسپی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ نجی اور ذاتی بنیادوں پر کیے جانے والے فیصلے کی مخالفت میں بولنے کا ہم میں سے کسی کو حق نہیں، اور اپنے قیمتی وقت کے بہتر مصرف کا دارومدار بھی ہر شخص کی اپنی ترجیحات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ فاروقی صاحب کے قلم سے نکلنے والی ہر نئی تحریر کے لیے ہم چشم براہ رہیں گے مگر "شب خون" کو چھوڑنا بھی آسان نہ ہوگا کہ یہ نہ جانے کتنے قارئین کی عادت بن چکا ہے۔ "شب خون" کا سلسلہ رک جانے کے تصور سے ہی ہمیں ایک فوری اور ذاتی نوعیت کے صدمے کا سا احساس ہونے لگا۔ "شب خون" ان معدودے چند رسالوں میں سے ایک ہے جس کا ہمیں انتظار رہا کرتا ہے... اور پھر عالمِ شوق میں ہر نئے شمارے کو پڑھنا کہ اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا اور اس بار کون سے گہرہائے آب دار ہاتھ آتے ہیں۔ دورِ آغاز کے کسی ایک شمارے سے لے کر... وہ شمارہ آج بھی یاد ہے جس کے سرورق پر رات کے دائرہ در دائرہ پیکر پر شب خون مارنے والے پرندے کی شبیہ تھی۔ اب تک ہر آنے والے شمارے کا ہم ایک ایک لفظ پڑھتے چلے آئے ہیں اور اگر ہم سے پوچھا جائے کہ برا بھلا جو بھی ادبی ذوق جس طرح فروغ پاتا رہا، اس کی تشکیل پر اثر انداز ہونے والے نام دھیان میں لائے جائیں تو لامحالہ "شب خون" کا نام فوراً ذہن میں جگمگا اٹھے گا کہ یہ اپنی نوعیت کا واحد پرچہ رہا ہے۔

زیادہ پرانی بات نہیں ہوئی کہ "شب خونی جدیدیت" کو مطعون کرنے کا ایک فیشن سا چل پڑا اور خود "شب خون" ہی کے کسی تازہ پرچے میں جناب ظفر اقبال نے لکھا ہے کہ "شب خون" میں جن پاکستانی شعرا کی غزلیں باقاعدگی سے شائع کی جا رہی ہیں، ان میں نہ تو "تازگی ہوتی ہے نہ جان" اور اس کو وہ فاروقی صاحب کی "ادارتی مجبوریوں" پر محمول قرار دیتے ہیں۔ مدیر کی پسند ناپسند کا یہ "عیب" تو ہر رسالے میں نکالا جا سکتا ہے مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ "شب خون" رجحان ساز ادبی رسالہ ہے اور اس میں شائع ہونے والی تحریروں کا اس طرح نوٹس لیا جاتا رہا ہے گویا ایسے مؤقر جریدے میں شائع ہونا بجائے خود ایک معیار اور استناد بن گیا ہو۔

قابلِ مطالعہ نظموں، غزلوں اور افسانوں پر مشتمل رسالے تو نکلتے ہی رہتے ہیں اور آئندہ بھی نکلتے رہیں گے۔ لیکن "شب خون" کا ایک اختصاص یہ بھی رہا ہے کہ اس کے صفحات پر سینکڑوں ادبی آرا کا اظہار کیا گیا اور ان پر بحث بھی ہوئی۔ کتابوں پر بے لاگ تبصروں کے ذریعے سے، حد تو یہ ہے کہ "اخبار و اذکار" تک کے ذریعے سے یہ پرچہ ہمارے لیے عصری آگہی کا نبض شناس بنا رہا ہے۔ آڈن کے الفاظ اگر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ "شب خون" ایک رسالہ ہی نہیں، a climate of opinion ہے اور اس کے اثرات ابھی بہت دن تک محسوس کیے جاتے رہیں گے۔ یہ رسالہ نہ ہوگا تو یہ فریضہ بھلا اور کون انجام دے سکے گا؟ مستقبلِ قریب میں اس کی جگہ لینے والے کسی رسالے کے آثار بھی دکھائی نہیں دیتے۔

ہماری اس بات کو نہ تو مبالغہ سمجھا جائے نہ مایوسی کا بے جا اظہار، بلکہ یہ موجودہ ادبی صورتِ حال کا ایک اور افسوسناک پہلو ہے۔ ایسی صورتِ حال جس میں "شب خون" جیسے متین و سنجیدہ پرچے کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ جان ڈن (John Donne) کی نظم ہی نہیں (جس کا عنوان اس وقت اس تحریر کا بھی عنوان ہے)، ہمیں اس وقت وہ اداریہ یاد آ رہا ہے جو ٹی ایس ایلیٹ نے اپنے قائم کردہ جریدے The Criterion کے اس شمارے کے لیے لکھا تھا جب سترہ سال مسلسل اشاعت کے بعد اس کے بند ہونے کی نوبت آ ہی گئی۔ اس پرچے کے بارے میں خود ایلیٹ نے بعد میں لکھا کہ اس میں a definite character اور cohesion تھا۔ "آخری الفاظ" کے عنوان سے اداریے میں اس نے جو الفاظ لکھے وہ آج ہمیں "شب خون" کو الوداع کہتے ہوئے یاد آ رہے ہیں:

For this immediate future, perhaps for a long way ahead, the continuity of culture may have to be maintained by a very small number of people indeed___ and these not necessarily the best equipped with worldly advantages. It will not be the large organs of opinion, or the old periodicals, it must be the small and obscure papers and reviews, those wheih hardly are read by anyone but their own contributors, that will keep critical thought alive, and encourage authors of original talent.

"شب خون" بند ہو گیا، "شب خون" زندہ باد☆☆☆

کتابیں جو زندگی کا سرمایہ ہیں

آج، مدیر اجمل کمال	شمارہ ۳۰ تا ۳۶، ۳۹، ۴۹ تا ۵۲ فی شمارہ	۱۲۵ روپے
آصف فرخی	عالم ایجاد (تنقیدی مضامین)	۳۰۰ روپے
ابوالنصر خالدی	مضامین خالدی (تنقید، تاریخ، تحقیق)	۳۰۰ روپے
احمد زین الدین	رنگ شناسائی (شخصیات)	۲۷۵ روپے
احمد عثمانی	زندگی تیرے لئے (ناول)	۱۰۰ روپے
احمد مشتاق	کلیات	۲۵۰ روپے
اختر آزاد	ایک سمپورن انسان کی گاتھا (افسانے)	۱۵۰ روپے
اختر یوسف	جلتا ہوا سیارہ (افسانے)	۱۴۰ روپے
اردو چینل، مدیر قمر صدیقی، شمس الرحمٰن فاروقی نمبر		۱۰۰ روپے
ارشد عبدالحمید	صدائے آب جو (مجموعۂ کلام)	۱۵۰ روپے
اسد محمد خاں	زبدا اور دوسری کہانیاں	۲۲۵ روپے
اسرار گاندھی	رہائی (افسانے)	۱۰۰ روپے
اسلم فرخی	لال سبز کبوتروں کی چھتری (خاکے)	۳۰۰ روپے
اظہار الاسلام	واپسی (افسانے)	۱۴۰ روپے
اقبالیات کے سو سال (تنقیدی مضامین)		۵۰۰ روپے
اکرم نقاش، انیس صدیقی	افلاک (گلبرگہ کے جدید ادیبوں کا انتخاب)	۲۰۰ روپے
الطاف فاطمہ	جب دیواریں گریہ کرتی ہیں (افسانے)	۱۷۵ روپے
الطاف فاطمہ	وہ جسے چاہا گیا (افسانے)	۲۰۰ روپے
انتساب،	ایوب واقف نمبر	۵۰ روپے
انتظار حسین	آگے سمندر ہے (ناول)	۳۲۵ روپے
انتظار حسین	شہزادے کے نام (افسانے)	۲۲۵ روپے
انتظار حسین	علامتوں کا زوال (مضامین)	۱۰۰ روپے
انعام حنفی	وادی افکار الہ آباد کے ۲۵ شعرا کا انتخاب	۱۰۰ روپے
انور خاں	آئینوں کی نگری (افسانے)	۱۰۰ روپے
انور سین رائے	چیخ (ناول)	۷۵ روپے
انور شعور	اندوختہ (مجموعۂ کلام)	۲۵۰ روپے
انیس صدیقی	کرناٹک میں اردو صحافت	۲۰۰ روپے
این گوپی (ترجمہ غیاث متین)	گوپی کی سو نظمیں	۱۵۰ روپے
پرتپال سنگھ بیتاب	موج رنگ (غزلیات)	۲۵۰ روپے
پرکاش فکری	ایک ذرا سی بارش (مجموعۂ کلام)	۲۵۰ روپے
پرویز شاہدی	تثلیث حیات، نیا ایڈیشن، مرتبین: مظہر امام اور یوسف امام	۲۵۰ روپے
جمیل الرحمٰن	زمین جب آنکھ کھولے گی	۱۲۰ روپے
جون ایلیا	شاید (مجموعۂ کلام)	۲۰۰ روپے
جون ایلیا	یعنی (مجموعۂ کلام)	۲۰۰ روپے
جینت پرمار	اور (مجموعۂ کلام)	۱۵۰ روپے
چودھری محمد نعیم	Ambiquities of Heritage	۲۲۵ روپے
حسن عابدی	فرار ہونا حروف کا (مجموعۂ کلام)	۲۰۰ روپے
حسن منظر	ایک اور آدمی (افسانے)	۱۰۰ روپے
خالد حسن	قرۃ العین حیدر کے خطوط ایک دوست کے نام	۲۲۵ روپے
خوشبیر سنگھ شاد	ذرا یہ دھوپ ڈھل جائے (مجموعۂ کلام)	۲۰۰ روپے
خلیل تنویر	گل لاجورد (مجموعۂ کلام)	۱۵۰ روپے
دنیازاد	۱۴ تا ۱۶ مدیر، آصف فرخی فی شمارہ	۲۲۵ روپے
ذکیہ مشہدی	صدائے بازگشت (افسانے)	۱۲۵ روپے
راہی فدائی	نبراس (مجموعۂ کلام)	۱۰۰ روپے
رحیل صدیقی فاروقی	محو گفتگو (گفتگوئیں اور مکالمے)	۱۸۰ روپے
رفیق راز	انہار (مجموعۂ کلام)	۳۳۰ روپے
روشنائی، مدیر احمد زین الدین	۲۳ تا ۲۵	۱۲۵ روپے
روشنائی، مدیر احمد زین الدین۔ شمس الرحمٰن فاروقی نمبر	غیر مجلد	۲۰۰ روپے
	مجلد	۲۵۰ روپے
زاہد حسین	عشق کے مارے ہوئے (ناول)	۱۷۵ روپے
زاہدہ حنا	عورت: زندگی کا زنداں (مضامین)	۳۰۰ روپے
زہرہ فاروقی	اودھ کے فارسی گو شعرا	۲۰۰ روپے
ساقی فاروقی	غزل ہے شرط (کلیات غزل)	۳۰۰ روپے
سعادت حسن منٹو	منٹونما (مضامین، خاکے)	۹۵۰ روپے
سعادت حسن منٹو	منٹو راما (افسانے)	۹۵۰ روپے
سید امین اشرف	جادۂ شب (مجموعۂ کلام)	۱۰۰ روپے
سید رفیق حسین۔	آئینۂ حیرت اور دوسری تحریریں افسانے	۴۷۵ روپے
سید محمد اشرف	بادِ صبا کا انتظار (افسانے)	۱۵۰ روپے
"شب خون" کا ضخیم شمارہ ۲۹۳ تا ۲۹۹ مع انتخاب		۷۵۰ روپے
شرجیل احمد خاں	یونان کے اساطیری قصے	۱۵۰ روپے
شفق سوپوری	موسیقی، شاعری اور لسانیات (تنقید)	۲۰۰ روپے
شفیع جاوید	رات، شہر اور میں (افسانے)	۱۶۰ روپے
شفیع فاطمہ شعریٰ	گلۂ صفورہ (مجموعۂ کلام)	۱۵۰ روپے
شمس الرحمٰن فاروقی	سوار (افسانے)	۲۰۰ روپے
شمس الرحمٰن فاروقی	شمس کبیر (مکاتیب فاروقی، بنام کبیر احمد جائسی	۲۵۰ روپے
شمس الرحمٰن فاروقی	اردو کا ابتدائی زمانہ (تنقید و تاریخ)	۱۵۰ روپے
شمس الرحمٰن فاروقی	شعر، غیر شعر اور نثر (نیا ایڈیشن)	۲۵۴ روپے
شمس الرحمٰن فاروقی	غالب پر چار تحریریں	۱۰۰ روپے
شمس الرحمٰن فاروقی	لغات روزمرہ	۲۰۰ روپے

دیر سے نکلنے والا دن ◆ جاوید شاہین ◆ فکشن ہاؤس، لاہور ◆ ایک سو بیس روپے

"آٹھ غزل گو" کے مرتب جاوید شاہین نے جب اپنا پہلا مجموعہ ("زخم مسلسل کی ہری شاخ" ۱۹۷۰) شائع کیا تھا تو یہ بات کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ رہی ہوگی کہ ان کے اگلے ہی مجموعے "صبح سے ملاقات" میں چھبیس نثری نظمیں ہوں گی اور غزلوں کی تعداد گھٹ کر صرف آٹھ رہ جائے گی۔ تب سے اب تک جاوید شاہین کے چار اور مجموعے "محراب میں آنکھیں"، "نیکیوں سے خالی شہر"، "جاگتا لمحہ" اور "دیر سے نکلنے والا دن" شائع ہو چکے ہیں۔ غزل اور نظم، ہر دو صنف سخن سے یکساں سروکار رکھنے کی بنا پر ان پر کسی ایک صنف کا شاعر ہونے کا لیبل چسپاں نہیں کیا جاسکتا۔

جاوید شاہین کا ادبی سفر ناصر کاظمی، احمد مشتاق، ظفر اقبال، سلیم شاہد اور منیر نیازی کی ہمراہی میں شروع ہوا اور "زخم مسلسل کی ہری شاخ" اس لحاظ سے توجہ کے لائق تھا کہ یہ ساٹھ کی دہائی میں اٹھنے والی آوازوں کا نقطۂ عروج تھا اور سقوط مشرقی پاکستان کے باعث پاکستان کے دولخت ہونے اور تاریخ سے بے گانگی کا سفر آغاز ہونے سے پہلے کی آخری دستاویز۔ یہ مجموعہ جدید غزل بانی غزل کے داعی شعرا کی آخری نشانی بھی ہے کیوں کہ اس وقت لسانی تشکیلات کے اثرات سمٹنے لگے تھے اور سنہ ستر کی دہائی کے شعرا کے سامنے ایک نیا، زرخیز، شاداب اور کشادہ علاقہ ظاہر ہو رہا تھا۔ یعنی یہ وقت تہذیبی اور روحانی اساطیر کے کھوج میں نکلنے کا تھا لیکن اردو غزل اس سفر میں نکلنے پر ابھی آمادہ نہیں تھی۔ اسی لئے جاوید شاہین نے ظفر اقبال کی طرح چبائے ہوئے لقموں کی جگالی کرتے رہنے اور کم خوراک سے زیادہ جھاگ پیدا کرتے رہنے کے بجائے اپنے وجود اور موجود کی شکست و ریخت کی پہچان اور تفہیم نثری نظم کے حوالے سے کی۔ کسی نئی صنف سخن سے معاملہ کرنا نئی محبت سے معاملہ کرنے کی طرح ہوتا ہے جو آدمی کو مٹا دینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے اور از سر نو زندہ کرنے پر قادر بھی ہوتی ہے۔ جاوید شاہین خوش قسمت تھے کہ اپنے اندر کی توڑ پھوڑ اور خاموشی اور صبر کے ساتھ اپنی روح پر جھیل گئے۔ ان کے اندر کا شاعر نثری نظم کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنا کر پہلے سے زیادہ طاقتور اور تازہ دم ہو کر "صبح سے ملاقات" میں الگ ہی روپ میں سامنے آیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ نثری نظم کو اپنے ہونے کا جواز "صبح سے ملاقات" کی اشاعت کے بعد ملا۔

ایک نئے شعری لحن کی دریافت نے کچھ دیر کے لئے جاوید شاہین کی غزل کو ذریعۂ اظہار بنانے سے گریز کرنے پر مجبور تو رکھا مگر "محراب میں آنکھیں" کے ساتھ ہی آہنگ اور لے کی زنجیریں توڑ کر باہر نکلنے کی آرزو کی تکمیل ہوئی۔ اگلی تینوں کتابوں "نیکیوں سے خالی شہر"، "جاگتا لمحہ" اور "دیر سے نکلنے والا دن" میں غزل اور نظم کو ایک جیسی جگہ حاصل ہوئی۔ لہٰذا جاوید شاہین کا نثری نظم کی طرف رجوع، صنف غزل کو ذریعۂ اظہار بنانے میں ناکام رہنے کے باعث نہیں تھا۔ یہ بات آج ایک کلیے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے کہ ہر صنف سخن اپنے وجود میں آنے کا جواز رکھتی ہے مگر اس کے تمام تر امکانات کو بروئے کار لانا عام شاعر کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

ستائیس نظموں اور اٹھارہ غزلوں پر مشتمل یہ کتاب "دیر سے نکلنے والا دن" جاوید شاہین کے کلیات شعر "عشق تمام" (۱۹۹۳) کے بعد، لگ بھگ آٹھ برس پہلے شائع ہوئی تھی۔ سال ۲۰۰۱ کے اواخر میں اس کا نیا ایڈیشن سات نظموں اور انتیس غزلوں کے اضافے کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ اس اضافے نے کتاب کی ضخامت میں اضافہ کرنے کے علاوہ اس کے باطن کو بھی بدل کر رکھ دیا ہے۔ کسی کتاب کو اس قدر اضافے کے ساتھ شائع کرنے کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ شاعر اپنی کتاب کی پہلی صورت کو نامکمل محسوس کرتا ہو اور اس کے نقوش کو مزید پختہ کرنے اور اس کی طاقت کو اور بڑھانے کا خواہش مند ہو اور ایک ضمنی سبب یہ کہ نئے مجموعے کی اشاعت کا سامان موجود نہ ہونے پر پہلے سے موجود کتاب میں اضافہ کر لینا بہتر خیال کیا گیا ہو مگر۔ "دیر سے نکلنے والا دن" کی ضخامت کو لگ بھگ دگنا کرنے میں اشارہ کتاب کے تاثر اور طاقت میں اضافہ کرنے کی طرف ہی جاتا ہے۔

"دیر سے نکلنے والا دن" جاوید شاہین کی دوسری کتابوں کی طرح ایک ایسی دستاویز ہے جو عصر حاضر کے تمام تر عذاب اور انتشار کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ جاوید شاہین کی شاعری مشق سخن کرتے چلے جانے کا نام نہیں۔ وہ اپنے عہد، اپنے عصر اور اپنے موجود سے مکالمہ کرنے والے شاعر ہیں اور ان کے یہاں شاعری بہتے ہوئے اور گزرتے ہوئے وقت کو اپنی گرفت میں لے کر ایک نئی صورت اور معنویت کا ثمر بن کر ظہور کرتی ہے۔ کبھی موجود و میسر اور کبھی کھوئی ہوئی یا مستقبل میں ہاتھ آنے والی نعمتوں کے باطنی ادراک سے وہ کل کو آج اور آج کو کل میں تبدیل کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔

سراج منیر نے اپنے مضمون "یہ خواب ہے اور کہیں کا" میں لکھا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد اور سقوط ڈھاکہ سے پہلے کی نسل کا مشترک استعارہ "یاد" تھا اور اس کے بعد کی نسل کا مشترک استعارہ "خواب" ہے۔ میں سراج منیر سے اتفاق کرتے ہوئے یہ اضافہ کرنے کی جسارت کروں گا کہ آج کے شاعر کا مشترک استعارہ، خواہ وہ کسی بھی نسل سے متعلق ہو، "خواب" ہی ہے۔ بلکہ یہ "خواب" اب استعارے کی سطح سے بلند ہو کر ایک علامت، ایک اسطورہ میں ڈھل گیا ہے۔ "دیر

سے نکلنے والا دن" کی سب سے نمایاں علامت بھی "خواب" ہی ہے، جس کے لطف اور جمال کو طویل تر ہوتی ہوئی رات اور دیر سے نکلنے والے دن کے انتظار کی اداسی نے گہنا دیا ہے۔ اس کتاب کی پہلی دو نظموں کے یہ چند مصرعے دیکھیں:

سوادِ چشم میں
ٹھہرا ہوا ہے جو خواب کب سے
میں بس اس خواب کی تعبیر میں
مصروف رہتا ہوں

(بہت مصروف رہتا ہوں، ص ۱۶)

کوئی خواب تھا
بڑا خوشنما
جسے اوڑھ کر
میں پڑا رہا
وہ جو خواب تھا
اسی میں کہیں تھا
چھپا ہوا
کوئی جھوٹ بھی
اسی خواب کا

(دیر سے کھلنے والا راز، ص ۱۷)

ان مصرعوں سے ملا کر اس کتاب کی پہلی غزل کا مطلع دیکھئے ۔

یہ جو خاک میں ہے ملا ہوا سرِ رہ گلاب گرا ہوا
ذرا دیکھنا کہیں یہ نہ ہو ترا میرا خواب گرا ہوا

اس سے میری بات کی صداقت ہی ظاہر نہیں ہوتی، اس حقیقت کا ادراک بھی ہوتا ہے کہ "دیر سے نکلنے والا دن" کس نوعیت کے خوابوں کا ثمر ہے اور اس دن کے انتظار نے ہمارے خوابوں کے جمال او صباحت کو کس کس طرح پامال کیا ہے۔

جاوید شاہین ایک خوش فکر شاعر ہونے کے باوصف، اپنے عہد، اپنی تاریخ اور اپنی ثقافت سے وابستہ رہ کر آگے بڑھنے والے شاعر ہیں۔ شاد اسی لئے ان کے شعری مجموعوں کے نام ایک خاص معنویت کے حامل ہوتے ہیں۔ "زخمِ مسلسل کی ہری شاخ" ہو یا "صبح سے ملاقات"، "نیکیوں سے خالی شہر" ہو یا "دیر سے نکلنے والا دن"، ان سب کتابوں کی تخلیق کا زمانہ، ان کے نام اور شعری اثاثے کی معنویت کو جاننے کے لئے کلیدی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ اس کی کتابوں کے نام کہیں نہ کہیں ارضِ پاکستان کی تاریخ اور سیاسی و ثقافتی سفر سے جڑے ہوئے ہیں۔ اپنے عصر سے ہم آہنگ ہونے کی یہ خصوصیت کتابوں کے صرف ناموں تک محدود نہیں بلکہ ان کی شاعری کے مکمل وجود پر محیط ہے۔ تاہم اس پہلو کی طرف دھیان بہت کچھ غور و فکر کے بعد ہی جاتا ہے۔ ورنہ شاعر کے اسلوب کی تہ داری، رمز و کنایہ سے کام لینے کی عادت اور پیش پا افتادہ مضامین سے گریز اور نئے اور انوکھے تجربات کی فراوانی اور تنوع نے اس حقیقت پر ہنرمندی سے پردہ ڈال رکھا ہے۔

جاوید شاہین کے ناقدین ان کے سیاسی اور سماجی ادراک اور ان کے لہجے کی تازہ کاری کے بارے میں دو رائے نہیں رکھتے۔ نت دن بدلتی ہوئی دنیا کی سرد مہری کو دھوپ کا ٹکڑا بچھا کر گرمانے والے شاعر کے کان لاحاصلی سے ہار کر آہ بھرنے والے دن کی مشکل سے سنائی دینے والی آواز پر لگے ہیں تو بے وجہ نہیں لگے ہیں۔ مگر اس کے اندر کہیں باطن میں یہ احساس بھی جاگزیں ہے کہ اس کوشش کا ثمر موجود کی بے معنویت کو معنی عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اس بے معنویت کو کسی نہ کسی سطح پر برقرار رکھنے کی آرزو بھی ہے کہ اس سے خواب ہوتے ہوئے خوابوں کی طرف دیکھتے رہنے اور گم ہوتی ہوئی آسائشوں سے یک گونہ نسبت محسوس ہونے کے علاوہ خود ترحمی کا پہلو بھی نکلتا ہے جو مقدر سے ہارے ہوئے لوگوں کی پسندیدہ سوغات ہے۔

جاوید شاہین کی شاعری کی اصل شناخت بے معنویت اور لاحاصلی کے احساس کا فروغ نہیں، اس کا سدباب ہے۔ وہ تو نامکمل دنوں کے کاٹھ کباڑ کو استعمال میں لا کر، جوڑ کر کوئی نیا دن بنانے کے متمنی ہیں۔ ہر چند کہ زوالِ عمر میں یہ کوشش اضافی اور بے کار بھی محسوس ہوتی ہے لیکن اسی احساسِ زیاں سے بچ نکلنے کے لئے وہ بولتے رہنے کا سہارا لینے پر مجبور ہوتے ہیں، خواہ بالآخر خود کلامی ہی کیوں نہ بن جائے:

دیکھو!
ایسے گھبرانے سے
اور دل چھوٹا کرنے سے
یہ جو باقی عمر پڑی ہے
کیسے کٹے گی
یہ جو پیچھے رہ جانے کا پچھتاوا ہے
اپنے ضائع ہونے کا دکھ جو اتنا ہے
یہ سب کیا ہے؟
اس پر ٹھنڈے دل سے کبھی کیا سوچا ہے۔
کتنی دفعہ انصاف سے خود کو پرکھا ہے
کتنے پانی میں ہو
کبھی یہ دیکھا ہے
ایک دفعہ ہمت سے ایسا کر لیتے
یہ بیکار کے دکھ
جو تم کھاتے رہتے ہیں
اس کا مداوا کر لیتے۔

(خود کلامی)

مگر شاعر اپنی ہمت کو اس طرح مجتمع کر پائے تو اسے کوئی پچھتاوا ہی کیوں ہو! اسی لئے "کرنے والے کام" اس ساری کتاب میں بھی "ان کئے" ہی

رہتے ہیں اور جاوید شاہین کے لئے شاعری کرتے رہنے کا جواز باقی رہتا ہے۔ روز مرہ کے دکھ اور قابو میں نہ آنے والی آسائشیں، اندر کی توڑ پھوڑ اور انتشار کو نمایاں کرتے ہیں اور شاعر اپنے تخلیقی کمال کی جادوگری سے ان دونوں دنیاؤں کو آپس میں ایک ہوتے اور علیحدہ کر کے واپس اپنی اپنی جگہوں پر آویزاں کرتا دکھائی دیتا ہے، کبھی دیر تک رہنے والی رات کی تاریکی کو کاٹ کر اور کبھی دیر سے نکلنے والے دن کے اجالے کو نمایاں کر کے۔ مگر ہر دو سطحوں پر یہ کتاب شاعر کے باطن کے اسرار اور اس کے جمال کی خبر دیتی ہے۔

چمٹا ہے بادباں سے جو طوفاں اتار دوں
بیٹھا ہوا سفینے میں دریا نکال دوں
دریا جو چپ ہے اس قدر بتا نہیں ہے کچھ خبر
پانی ہے یا کہ سطح پر صرف سراب رہ گیا
کیا کار عشق تمام جب، جو تھا اس میں جھوٹ وہ سب کا سب
کہیں اپنی ذات پہ لے لیا، کہیں تیرے نام پہ رکھ دیا
ایسی بدلی ہے بود و باش یہاں
گھر بنانا پڑا مکاں سے پرے
کسی بھی رت کو اجازت نہ تھی ٹھہرنے کی
خلل عجب سا کوئی ماہ و سال میں رکھا

حنیف رامے نے جاوید شاہین کی شاعری کو سچ کی خوشبو کا حامل قرار دیا ہے تو کچھ غلط نہیں کہا کہ ان کی ہر ادا، آج کے انسان کے طرز عمل کا پرتو محسوس ہوتی ہے۔ ان کا ہر مصرع اپنے عصر، اپنے موجود اور اپنے زمان میں پیوست ہے اور اس کی بنیاد کسی نہ کسی صداقت پر ہے۔ اس نوعیت کی سچائی اور راست گوئی کو شعار بنانے میں خطرہ اس بات کا ضرور تھا کہ شاعری کہیں "آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی" کی مثال بن کر نہ رہ جائے مگر اپنے اسلوب کی ندرت اور انفرادیت کو ظاہر کرنے کی سعی کے باعث، سچ اور صرف سچ سے علاقہ رکھنے کے باوجود جاوید شاہین کی شاعری یک سطحی اور عومی نہیں ہو پائی۔ جاوید شاہین کی شاعری کی دنیا ہماری ہی دنیا ہے مگر اس دنیا کے شب و روز، فضا، رنگ اور موسم کچھ اور ہی طرح کے ہیں۔ اس کے کردار ہماری طرح کے انسان ہو کر بھی کسی نہ کسی طرح ہم سے الگ اور مختلف ہیں اور اسی بنیاد پر ان کے سچ اور ان کے جھوٹ بھی۔

کونیات اور کائنات کی حقیقت اور کیفیت کا ادراک اور اس میں کوئی کردار ادا کرنے کی کوشش، جاوید شاہین کی شاعری کا مرکزی حوالہ ہے۔ لیکن شاعر دنیا کو بدلنے کی خواہش رکھتا ہے، طاقت نہیں۔ جاوید شاہین بھی یہ سب کچھ بدلنے پر قادر نہیں، پھر بھی جاوید شاہین کی غزل تکرار معنی کا شکار نہیں ہو پائی۔

جاوید شاہین کی شاعری کا ایک بہت واضح استعارہ "کھڑکی" (دریچہ) ہے۔ کبھی یہ کھڑکی دن اور رات کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے اور کبھی باہر اور اندر کی دنیا کو۔ جاوید شاہین کا ٹھکانا ہمیشہ اس کھڑکی کے اس طرف رہا ہے۔ اس لئے باہر کی دنیا سے اس کا تعلق کمزور اور بصری منظر نامے تک محدود محسوس ہوتا ہے۔

محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کھڑکی کے شیشے سے آنکھیں لگائے باہر کی دنیا اور اس کے مظاہر کو دیکھ تو رہے ہوں مگر اس کی ماہیت کو جاننے اور اس کو چھو کر دیکھنے سے معذور ہوں۔ ایسے زندانی کی طرح جو اپنے وجود کی قید سے آزاد ہوئے بغیر باہر کی دنیا میں قدم رکھنے پر قادر نہ ہو، ماسوا خواب کے وسیلے کے، جاوید شاہین نے خواب سے اپنے رشتے کو کبھی کمزور پڑنے نہیں دیا اور ان کی شاعری میں ناموجود اور نابود کا در وا کرنے کی یہ کوشش، بے تکلف بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔

اشجار ، سائے، راہگذر سب ہیں خواب میں
اور ان کے ساتھ اہل سفر سب ہیں خواب میں
یہ بحر، یہ ہوا، یہ پہاڑوں کے سلسلے
بیدار لگ رہے ہیں مگر سب ہیں خواب میں

جو اٹھ گیا ہے، اصل میں ہے اعتبار ذات
میں ہوں مگر نہ ہونے کا ڈر چھوڑتا نہیں
اسی نے مجھے ہے مری حدوں میں رکھا ہوا
مرے دیکھنے کو جو آئینہ یہیں ہے کہیں
غرض حاصل نہیں بے مصرفی اپنی چھپانے کو
برائے باغبانی کوئی صحرا ساتھ رکھتا ہوں

میں نے جاوید شاہین کی ذات کو زندانی کہا ہے۔ اس سے قارئین کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ باہر کی دنیا اور کائناتی مظاہر کا مشاہدہ ان کے یہاں بہت محدود ہوگا۔ لیکن اس روز بروز بدلتی ہوئی کائنات سے ان کا تعلق کسی نہ کسی سطح پر ان کے باطن سے وابستہ محسوس ہوتا ہے۔ ان کے لہجے میں جو ذرا سی کڑواہٹ ہے، وہ شاید اندر کی کائنات اور باہر کی کائنات کو یکجا کرنے کی کوشش کے باعث ہے۔ ان دونوں کائناتوں میں فاصلہ کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی جاتا ہے اور شاعر کے لئے ان میں سے کسی ایک کو آئینہ بنا کر، دوسرے کے رنگ ڈھنگ، خوشبو اور ذائقے کی شناخت کرنا دشوار تر ہوتا جاتا ہے۔

پرندوں کے آنے کا ہے منتظر
صداؤں سے خالی مکاں شام کا
میں کرتا رہا جمع ہر پیاس کو
کہیں ایک دریا نظر میں رہا
میں ہی بنتا ہوں فساد آب و گل کا ہر سبب
کس قدر نقصان میرا میرے ہونے سے ہوا
لیٹے تھے سائے گھاس پر اور ان کے پاس ہی
ستا رہی تھی دھوپ بھی اشجار کی طرف
حیراں تھا محنتوں کا پھل، جاتا کہاں ہے سب کا سب
دیکھا تو دست بے ہنر شاخ ثمر کے پاس تھا

"دیر سے نکلنے والا دن" کی شاعری کا خمیر اسی دنیا، اسی زمین سے اٹھا ہے۔ یہ

شاعری ایک کشادہ دل اور کھلا ذہن رکھنے والے شخص کی شاعری ہے جو جبر اور یکسانیت کے ماحول کو بدلنے کی تمنا رکھتا ہے۔ اس کتاب میں رات کی سیاہی کہیں بھی دن کے اجالے پر غالب آتی محسوس نہیں ہوتی۔ دیر ہی سے سہی مگر جاوید شاہین کی اس کتاب میں وہ دن بالآخر نکل آیا ہے، جس کی نوید "صبح سے ملاقات" کے دنوں میں ملی تھی اور جسے "محراب میں آنکھیں" اور "نیکیوں سے خالی شہر" جیسی کتابوں میں در آنے والی تیرگی نے، جسے جیلانی کامران نہ جانے کیوں تخلیقی نثر کا المیہ قرار دیا تھا، اسے دھندلانے اور بے چراغ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر جاوید شاہین ایک "جاگتا لمحہ" کی انگلی پکڑ کر رات کے دوسرے کنارے پر آن پہنچے ہیں اور رات ان کے لئے ماضی کا حوالہ بن گئی ہے ۔

وہ حرکت سے عاری کڑی رات تھی
کوئی میخ بن کر گڑی رات تھی
تھکا چاند لیٹا تھا دن کو جہاں
وہیں دھوپ اوڑھے پڑی رات تھی
مرے گھر کی دہلیز پر صبح دم
کسی لاش صورت پڑی رات تھی
بندھے جس میں تھے سب مظاہر یہاں
اسی سلسلے کی کڑی رات تھی

اب توقع کی جاسکتی ہے کہ جاوید شاہین کا اگلا شعری مجموعہ اس احساس زیاں سے پاک ہوگا جس کا سایہ ان کی اب تک کی شاعری پر کسی نہ کسی سطح پر موجود رہا ہے اور جس کی جھلک کہیں نہ کہیں "دیر سے نکلنے والا دن" کے صفحات میں بھی دکھائی دے جاتی ہے ☆☆☆

—— غلام حسین ساجد

لغاتِ روزمرہ • شمس الرحمٰن فاروقی • اشاعت اول، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، اشاعت دوم، کراچی • رابطہ، شب خون کتاب گھر، الہ آباد ۲۰۰۳ • قیمت ۱۰۰ روپے

موجودہ عہد میں اردو اور اردو والوں کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ صارفیت کے غلبے اور تہذیبی انتشار کی وجہ سے زبان و تہذیب کے وہ ادارے شکست و ریخت کا شکار ہو گئے ہیں جہاں ادبی مزاج اور ذوق سلیم کی تربیت ہوتی تھی۔ ابتدائی اور ثانوی سطح پر اسکولوں سے اردو کے اخراج کی بنا پر ایک طرف اردو سے واقفیت کا دائرہ تنگ سے تنگ تر ہوتا جارہا ہے تو دوسری جانب ہندی کے غلبے اور تسلط کی بنا پر معیاری اردو کی صاف چمکیلی سطح روز بروز داغ دار ہوتی جارہی ہے۔ دوسری افسوس ناک بات یہ بھی ہے کہ آزادی کے بعد نشوونما پانے والے اساتذۂ اردو کی اکثریت اپنی جڑوں سے نا آشنا ہے۔ قوت نمو سے محروم یہ بریدہ شاخیں نونہالان ادب کو معیاری زبان سکھانے اور ان میں ادبی ذوق کو پروان چڑھانے اور سرسبز کرنے سے بالکل قاصر ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی پیش نظر کتاب اردو کے اساتذہ و طلبہ کے لئے خصوصاً اور اردو زبان کے ہر طالب علم کے لئے عموماً گنجینۂ علوم و معارف ہے۔ یہ زبان کے غیر معیاری استعمالات کی نشان دہی بھی کرتی ہے اور ان محفلوں کا بدل بھی ہے جن سے ادبی ذوق کی تربیت ہوتی تھی۔ یہ تلفظ و املا کے مباحث میں رہنمائی بھی کرتی ہے اور بہت سی ایسی اصطلاحات و تلمیحات پر روشنی ڈالتی ہے جو ہمارے ادب کی تفہیم و تعبیر میں معاون ہیں۔

مصنف نے اس کتاب میں اپنی توجہ کا اصل مرکز زبان کے معیاری استعمال کو قرار دیا ہے۔ انھیں بجا طور پر اصرار ہے کہ اردو کے الفاظ اور فقرے خوش وضع اور خوبصورت اور ان کی تعبیریں بلیغ اور پر از معنی ہیں۔ لہٰذا ان سے صرف نظر کر کے ہندی کے انگھڑ اور غیر فصیح مفردات اور اردو کے مزاج سے مختلف بلکہ منحرف تعبیرات کو اردو میں داخل کرنا نادانی اور بدذوقی کی علامت ہے۔ مصنف نے اس باب میں جاں کاہی و محنت پژوہی سے کام لیتے ہوئے ایسے تمام واجب الترک استعمالات کے حتی الامکان احاطہ و استیعاب کی کوشش کی ہے۔ ارباب ذوق کے لئے یہ تمام مباحث بصیرت افروز اور چشم کشا ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

آگ زنی : اردو میں اچھا خاصا لفظ "آتش زنی" موجود ہے۔ ہندی والے خدا جانے کہاں سے "آگ زنی" اٹھا لائے اور افسوس کہ ان کی دیکھا دیکھی اردو والے بھی "آگ زنی" لکھنے لگے ہیں۔ یہ لفظ غیر ضروری تو ہے ہی یہ غلط بھی ہے اور بدصورت بھی۔ اسے بالکل ترک ہونا چاہئے۔

جان کاری/ جانکاری : اطلاع، معلومات، واقفیت کے معنی میں یہ لفظ کم پڑھے لکھے ہندی والوں کی اختراع ہے۔ اس سے معنی یا معنویت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور یہ بھونڈا اور بدصورت الگ ہے۔ معلومات، اطلاع کے معنی میں یہ لفظ پچپن ستاون برس پہلے میں ہندوستانی عیسائیوں کی زبان سے سنتا تھا۔ پھر اسے ہندی نے اپنا لیا، اور اب یہ غیر ضروری اور فضول لفظ اردو میں بھی سنا جانے لگا ہے۔ اسے ترک ہونا چاہئے۔ اس کا ایک صرف اور بھی ہے اور وہ بھی ہندی والوں کی اختراع ہے کہ اسے "جانتے ہوئے" کے معنی میں بولا جائے۔

غلط اور قبیح : میں اپنی جانکاری میں تو ایسا نہ ہونے دوں گا۔
صحیح : میں اپنے جانتے ہوئے تو...
غلط اور قبیح : یہ بات میری جانکاری میں نہیں ہے۔
صحیح : یہ بات میرے علم میں نہیں ہے۔

جانے مانے : "مشہور و معروف" کے مفہوم میں یہ بدصورت فقرہ ہندی والوں کی غیر ضروری اختراع

ہے۔اردو میں اسے نہ برتنا چاہئے۔

"جارہے"، "گھس بیٹھیا"، "سراہنا"، "گولی باری"، "گراوٹ"، "گھوٹالا"، "لکھاری"، "لے کر"، "لوٹ پاٹ"، "مان دان"، "منڈرانا"، "بچولیا"، "کھوٹا" اور "مہلوک" جیسے الفاظ پر بھی اسی انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔

اس ضمن میں ہندی کے علاوہ انگریزی کے غیر ضروری مفردات یا اردو کے مزاج سے مختلف فقروں پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔مثلاً :

> اسٹے آرڈر : "حکم امتناعی" جیسے عمدہ لفظ کے ہوتے ہوئے بعض لوگ "اسٹے آرڈر" لکھ رہے ہیں۔ یہ محض عجز بیان ہے اور اردو کے ساتھ زیادتی ہے۔ یہ بھونڈا انگریزی لفظ واجب الترک ہے۔
>
> چاہوں گا/چاہیں گے : انگریزی کا روزمرہ ہے I would like to یا I should like to اس کا اردو میں کوئی بدل نہیں اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔اردو میں انگریزی کے مقابلے میں بہت زیادہ نفیس اور پرتکلف جملے ایسے موقعوں کے لئے ہیں۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان دونوں کی اردو میں ان انگریزی فقروں کا ترجمہ رائج ہونے لگا ہے۔ یہ بدعت بھی ہندی نے شروع کی ہے۔

یہ صرف چند مثالیں ہیں، ورنہ اس قسم کے مباحث سے یہ کتاب بھری ہوئی ہے۔اس طرح کے تازہ مسائل پر مشتمل کوئی دوسری کتاب میری معلومات کی حد تک منظر عام پر نہیں آئی ہے۔

اس کتاب میں بہت سے لغات کے تلفظ، املا اور جنس کو بھی موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ مثلاً آتَش/آتِش ، زَبان/ زُبان، شُغل ۸ شَغل، خِلعت/خَلعت، تماشا/تماشہ، طمانیت/طمانینت وغیرہ کئی الفاظ کے تلفظ پر عمدہ گفتگو ہے۔

بعض ایسے الفاظ جو عربی و فارسی میں موجود نہیں، لیکن اردو نے انھیں اپنے طور پر وضع کر لیا ہے ان کی صحت اور درستگی پر بھی عمدہ گفتگو کی گئی ہے۔ مثلاً اَتش اَتش، ارقام، تنقید، راشی، عادی، عرصہ، غالیچہ، غشی، متلاشی، نزاکت وغیرہ۔ اسی طرح، عربی الاصل لغات کے باب میں اردو کے لفظی و معنوی تصرفات کو بھی جائز بلکہ مستحسن قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً جُراحت بجائے جِراحت، آصِف بجائے آصَف، افعی بجائے اُفعیٰ، اَخْر با بجائے اِقْربا وغیرہ۔

مفرد لغات اور فقروں کے علاوہ اس کتاب میں متعدد ایسے موضوعات و مسائل بھی زیر بحث لائے گئے ہیں جن سے دوسری کتب لغات بالعموم خالی ہیں۔ مثلاً :

- اردو کے حروف تہجی کی تعداد
- اردو کے حروف تہجی کی ترتیب
- اردو کے حروف تہجی کی جنس
- اضافت اور واو عطف ہندی اور غیر ہندی الفاظ کے مابین
- اضافت کی علامت میں تعقید
- انگریزی الفاظ اردو میں
- الفاظ کے جوڑے
- جانوروں کے نام اردو میں
- جس اور جو بطور حرف اشارہ
- جمع انگریزی الفاظ کی
- جمع عربی الفاظ کی
- جمع نون پر ختم ہونے والے الفاظ کی
- حروف ابجد
- غیر زبانوں کے الفاظ
- فاعل اور فعل کا توافق
- فک اضافت
- فعل مجہول کا استعمال
- والا/والی/والے بہ طور صفت
- ہائے مختفی

ان میں سے ہر موضوع پر مصنف نے بہت غور و خوض کے بعد اظہار خیال کیا ہے اور ان کے بیشتر مباحث فکر انگیز ہیں۔ خاص طور پر "ہائے مختفی" کی بحث نہایت معرکہ آرا ہے۔اس کا صحیح لطف تو اصل کتاب میں پوری بحث پڑھ کر ہی اٹھایا جاسکتا ہے۔ مختصر یہ کہ مصنف نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ ہائے مختفی فارسی الفاظ کے ساتھ خاص نہیں، ہندی الاصل الفاظ میں بھی اس کا وجود ہے۔دوسرے دلائل کے علاوہ اس کی ایک قوی دلیل یہ بھی ہے کہ حافظ نے "لالہ" و "غسالہ" کے ساتھ "بنگالہ" کا قافیہ بھی باندھا ہے۔لہٰذا "بنگالہ" میں ہائے مختفی کا وجود قدیم الایام سے ہے۔

مصنف کی تائید کرتے ہوئے یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خسرو نے بھی متعدد ہندی الاصل الفاظ کو ہائے مختفی کے ساتھ قافیے کے طور پر نظم کیا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی غزل ملاحظہ ہو :

سروے چو تو دراچہ و در ہتہ نباشد — گل مثل رخ خوب تو البتہ نباشد
دوزیم قبا بہر قدت از گل سوری — تا خلعت زیبائے تو از لتہ نباشد
ایں شکل و شمایل کہ تو کافر بچہ داری — در چین و ختا و ختن و ختہ نباشد
بد خواہ ترا در دو جہاں روئے سیہ باد — در دیدۂ خصم تو بجز ستہ نباشد
در جنت و فردوس کسے را نہ گذارند — تا داغ غلامی تواش پتہ نباشد
چوں موے شد از فکر میانت تن خسرو
تا ہیچ رقیبت خنک و کتہ نباشد

اس غزل میں "ستہ" (=ٹھٹھہ)، "پتہ" (=پٹہ) اور "کتہ" (=ہٹا کٹا) محل استشہاد ہیں۔ "اچہ" اگرچہ قافیے کے طور پر نہیں آتا ہے لیکن دیگر قوافی کی طرح ہائے مختفی سے ہی لکھا گیا ہے۔

افادۂ عام اور تنشیطِ طبع کے لئے اس کتاب میں بعض ایسے لغات بھی شامل کر لئے گئے ہیں، جو لغات روز مرہ کے ذیل میں نہیں آتے لیکن کلاسیکی ادبیات کے فہم میں معاون ہیں مثلاً توڑ، شکرخورا، ثلاثہ، غسالہ، ہاضمہ، سبعہ، نائمہ، آئینہ، زانو وغیرہ۔ یہاں صرف اول الذکر سے متعلق اندراج ملاحظہ ہو:

توڑ : واو مجہول۔ تیر اندازی کی اصطلاح میں (۱) اس فاصلے کو کہتے ہیں جہاں تک تیر اپنے نشانے کے اندر دھنس سکتا ہو، اور (۲) تیر کی قوت دخول۔ ظاہر ہے کہ اس لفظ کو آج کے آتشی اسلحہ کی ضمن میں بھی برت سکتے ہیں: ''اکثر تیر ہوائی جاتے تھے، یا ان میں زیادہ توڑ نہ رہ گیا تھا'' (آفتاب شجاعت، جلد چہارم، از شیخ تصدق حسین، ص ۵۱۹) ''جو تیر جاتا تھا دو دو تین تین کو گرا لیتا تھا۔ ایک تو کمان کا زور، دوسرے ہوا کی قوت، تیر کا توڑ چوگنا ہو گیا تھا۔'' (تورج نامہ، جلد دوم از شیخ تصدق حسین، ص ۷۵)

اس کتاب کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں علاقائی لغات کو بھی مناسب نمائندگی اور اہمیت دی گئی ہے اور کسی شہر یا علاقے کی زبان کو دوسروں پر فوقیت دینے کے رجحان کو غلط کہا گیا ہے۔ مثلاً:

سردی : زکام کے معنی میں یہ لفظ دہلی اور بہار کا روزمرہ ہے۔ ان علاقوں کے باہر اس لفظ میں یہ معنی نہیں ہیں۔ اپنے اپنے علاقوں میں سردی/ زکام دونوں درست ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔

لفاف : اول مکسور، علاقہ بہار میں ''لفافہ'' نہ کہہ کر ''لفاف'' کہتے ہیں۔ اسے پوربی اردو کا علاقائی تلفظ سمجھنا چاہئے۔

معنی کر : بمعنی ''معنی میں''، ''مطلب سے'' دہلی اور پوربی اردو کا روزمرہ ہے۔ ملحوظ رہے کہ اس فقرے میں ''معنی'' مع الف مقصورہ بروزن ''مالا'' بولتے ہیں۔

از غیب : اول سوم مفتوح، بمعنی ''علم غیب'' علاقۂ مشرق میں عام ہے۔ اسے پوربی اردو سے مخصوص سمجھنا چاہئے۔ دوسرے علاقوں میں ''علم غیب'' ہی بولتے ہیں۔

''لغات روز مرہ'' کے وہ مندرجات بھی دلچسپ اور قابل توجہ ہیں جہاں ملتے جلتے الفاظ کے باہم فرق پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔ مثلاً الگ/ الگ تھلگ، نہ/ نہیں، شک/ شبہہ وغیرہ۔ ان میں موخرالذکر سے متعلق کسی قدر تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو۔

شبہہ : بوزن رتبہ۔ آج کل لاعلمی یا عدم احتیاط کے سبب اس لفظ کو بعض یوں لکھتے ہیں گویا یہ اور ''شک'' ہم معنی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ شبہہ بمعنی Suspicion اور شک بمعنی doubt ہے۔

غلط : مجھے شبہہ ہے کہ یہ آدمی ویسا نہیں جیسا خود کو بیان کر رہا ہے۔

صحیح : مجھے شک ہے...

غلط : ایسا خوبصورت کہ گلاب کے پھول کا شک ہو۔

صحیح : ایسا خوبصورت کہ گلاب کے پھول کا شبہہ ہو۔

مصنف مزید کہتے ہیں: ''''شک'' میں برائی اور بے اعتباری کا عنصر ''شبہہ'' سے زیادہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات زور کلام کے لئے ''شک و شبہہ'' اکٹھا بول دیتے ہیں، لیکن یہ فقرہ پورا زور وہیں حاصل کرتا ہے جہاں نوعیت اور کیفیت دونوں کا بیان یا ان کی طرف اشارہ ہو۔''

آخر میں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی باک نہیں کہ ایک ایسی کتاب جس میں تین ہزار کے قریب لغات مندرج ہیں، مصنف کے ہر بیان اور ہر اندراج سے اتفاق ضروری نہیں۔ لغت نویسی کا عمل یوں بھی مسلسل ریاض، ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ کا طالب ہے۔ اس ضمن میں راقم کے چند معروضات درج ذیل ہیں:

(۱) مصنف کے بیان کے مطابق آوازہ، موجہ، سطحہ، نگینہ میں اصل لفظ آواز، موج، سطح اور نگین ہے اور فارسی والوں نے ان کے آخر میں ہائے زائدہ کا اضافہ کر لیا ہے اور اب یہ تمام الفاظ بے تکلف درست اور فصیح ہیں۔ یہی صورت ''مومیائی'' اور ''دوائی'' کی بھی ہے، یعنی ان دونوں میں یائے زائدہ کا اضافہ بھی فارسی والوں کی ایجاد ہے۔

سوال یہ ہے کہ ''تقرری'' اور ''تنزلی'' کو بھی اسی پر قیاس کرتے ہوئے اہل اردو کا تصرف مان کر یائے زائدہ کے ساتھ کیوں نہ قبول کر لیا جائے؟ اسی طرح مصنف نے جب ''ناراضگی'' کو درست اور صحیح مان لیا ہے (حالانکہ حالی و شبلی اپنی تحریروں میں بالالتزام ''ناراضی'' لکھتے تھے) تو ''رہائش'' کو نادرست اور غیر فصیح کیوں قرار دیا جائے؟

(۲) ''آنجہانی'' اور ''مرحوم'' کو مرادف قرار دینے کی تجویز میرے خیال میں نامناسب ہے۔

(۳) ''دل بدلو'' اور ''دل بدلی'' کے بجائے ''خروجی'' اور ''مخارجت'' کی تجویز نہایت ثقیل اور خالصۃً مولویانہ ہے۔ اس کا کوئی دوسرا متبادل ڈھونڈنا چاہئے۔

(۴) ''استفادہ حاصل کرنا'' کے جواز سے متعلق مصنف کی بحث بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے، لیکن اسے رواج اور قبول عام کی سند حاصل نہیں اور خود بقول مصنف لغات کے رد و قبول میں رواج عام کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

(۵) ''بصرہ'' کے تحت یہ بتایا گیا ہے کہ ''عربی میں الف مقصورہ سے ہے [بصریٰ]'' یہ بیان درست نہیں۔ معتبر عربی لغات کے مطابق یہ عربی میں بھی ہائے ہوز کے ساتھ ''بصرہ'' ہے۔

(۶) ''تکیہ'' بہ معنی ''قبر'' کی سند میں صبا کا یہ شعر پیش کیا گیا ہے:

شہید عشق کی مٹی بہت خراب ہوئی
نہ تکیہ کا مرا مردہ ہوا نہ مرگھٹ کا

ناچیز کی رائے میں یہاں "تکیہ" بہ معنی "قبر" نہیں بلکہ "قبرستان" ہے اور اس کا قرینہ لفظ "مرگھٹ" ہے، جو "تکیہ" کے بالمقابل رکھا گیا ہے۔

(۷) "ثلاثۂ غسالہ" کے تحت درج ہے: "ثلاثۂ" میں اول مفتوح ہے اور "غسالہ" میں اول مضموم۔ شراب کے تین پیالے جو صبح کو خالی پیٹ بطور قبض کشا پئے جاتے ہیں۔ حافظ۔

ساقی حدیث سرو وگل ولالہ می رود

ویں بحث با ثلاثۂ غسالہ می رود"

ناچیز کا خیال ہے کہ حافظ کے شعر میں "غسالہ" کو اول مضموم لکھنا درست نہیں۔ یہ "غَسّالہ" بروزن "قتالہ" غسل سے مبالغے کا صیغہ ہے۔

(۸) "جدوجہد" کے تحت مصنف نے لکھا ہے:

"عربی میں یہ لفظ حرف اول اور حرف چہارم کے کسرہ سے بولا جاتا ہے۔"

عربی میں "جہد" کو بہ کسر اول بتانا سہو قلم ہے۔ عربی میں "جُہد" (بہ ضم اول) اور "جَہد" (بہ فتح اول) تو ہے، لیکن "جہد" (بہ کسر اول) نہیں ہے۔

(۹) "خالو" کے تحت بتایا گیا ہے: "اردو میں خالہ کے شوہر کو کہتے ہیں لیکن عربی فارسی میں خالہ کے بھائی یعنی ماموں کو "خالو" کہتے ہیں۔"

صحیح یہ ہے کہ عربی میں ماموں کو "خال" کہتے ہیں، نہ کہ "خالو"۔

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا اس کی حیثیت محض طالب علمانہ قیل وقال کی ہے، ورنہ سچ یہ ہے کہ یہ کتاب بیش بہا اور نادر معلومات کا خزینہ ہے۔ راقم نے جب بھی اس کی ورق گردانی کی، اپنی علمی تہی مائیگی اور بے بضاعتی کا احساس ہوا۔

آخری بات یہ ہے کہ بعض ایسے لغات اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں جن پر گفتگو کی ضرورت تھی۔ مثلاً "خامہ فرسائی"۔ متعدد حضرات اسے مطلق تحریر وتسوید کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں، حالانکہ اسے صرف بہ طور انکسار یا بطور تحقیر ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

"خدوخال": نثار احمد فاروقی مرحوم کی تحقیق کے مطابق یہ "غالباً حضرت جوش ملیح آبادی کا تصرف ہے، ورنہ اساتذہ کے کلام میں اس کی سند نہیں مل سکتی۔ صحیح ترکیب "خط وخال" ہے اور حسن کے اجزائے ترکیبی یا نوک پلک کا اظہار اس ترکیب سے اچھی طرح ہوتا ہے۔ "خد" (گال) کہہ کر ایک دم "خال" (تل) کہنا اتنا شعریت سے بھرپور نہیں جتنا "خط وخال" کا تصور۔ ممکن ہے کہ غزل کی قدیم روایات سے انحراف کرتے ہوئے "خط" سے اعراض کیا ہو (جو محبوب کی تذکیر کا غماض ہے۔) بہر حال غالب نے یوں ہی باندھا ہے۔

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا

شور سودائے خط وخال کہاں

اور حافظ کہتا ہے ع

بہ آب ورنگ وخال وخط چہ حاجت حسن زیبا را"

میرا خیال ہے یہ معاملہ مزید تحقیق طلب ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ کتاب ہر طالب علم اور ہر استاد کے لیے مسلسل مطالعے کی شے ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے دو بنیادی اصول ایسے قائم کیے ہیں جنھیں ان کی اجتہادی قوت کا کارنامہ کہنا چاہیے۔

(۱) روزمرۂ زبان کے معاملے میں کوئی علاقہ یا شہر کسی اور علاقے یا شہر پر فوقیت نہیں رکھتا۔ ہر علاقے کا روزمرہ اپنی جگہ مستند ہے۔

(۲) عربی فارسی الفاظ کو اسی طرح لکھنا اور بولنا چاہیے جس طرح وہ اردو میں مروج ہیں۔ عربی یا فارسی کی طرز پر جو الفاظ اردو والوں نے وضع کیے ہیں اور وہ مروج ہو گئے ہیں وہ سب مستند ہیں۔

پہلا اصول تو اردو میں شاید کسی نے نہیں بیان کیا، اگرچہ یہ علم لسان کا متفق علیہ اصول ہے۔ دوسرے اصول کو مختلف اوقات میں مختلف علما نے بیان کیا ہے، لیکن جس تفصیل اور خود اعتمادی اور وسعت کے ساتھ مصنف نے اسے برتا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔

"لغات روزمرہ" کا ہندوستانی ایڈیشن صاف ستھرا چھپا ہے لیکن اغلاط سے خالی نہیں۔ کراچی ایڈیشن مجلد بھی اور غیر مجلد بھی اور دونوں نہایت خوبصورت ہیں۔ کراچی ایڈیشن میں بعض مطالب اور مباحث ہندوستانی ایڈیشن سے زیادہ ہیں۔ امید ہے اگلے ہندوستانی ایڈیشن میں کراچی ایڈیشن کے مزید مطالب اضافہ کر دیے جائیں گے ☆☆☆

—— ظفر احمد صدیقی

تعبیر کی شرح ◆ شمس الرحمن فاروقی ◆ اکادمی بازیافت، کتاب مارکیٹ، اردو بازار، کراچی، پاکستان ◆ دو سو پچاس روپے

شمس الرحمن فاروقی اپنی بات کو واضح کرنے کے لئے طرح طرح سے سوالات اٹھاتے ہیں، پھر ان سوالات سے ضمنی سوالات، اور وہ بھی اس طرح کہ برآمد شدہ نتیجے پر پھر کوئی سوال نہ اٹھ سکے۔ اس بات کا امکان ضرور ہے کہ "زمان ومکان" کی تبدیلی سے کچھ نئے سوالات کھڑے ہو جائیں لیکن جو بنیادی سوالات شمس الرحمن فاروقی اٹھا چکے ہیں وہ اپنی جگہ ہمیشہ قائم رہیں گے۔ اردو تنقید میں شمس الرحمن فاروقی اب تک پہلے اور آخری شخص ہیں جنھوں نے اپنے اظہار خیال کے لئے یہ طریقہ اپنایا ہے۔ ان کے اس طرز کی بنا پر ان کی تنقید پر آج تک کوئی منطقی اعتراض نہیں اٹھ سکا ہے۔ اور ان کی یہ خصوصیت انھیں اردو کے تمام ناقدوں سے ممتاز کرتی ہے۔

شمس الرحمن فاروقی کے آٹھ تنقیدی مضامین کے زیر تبصرہ مجموعے کے ایک مضمون، جس کا عنوان ہی سوالیہ ہے ("نظم کیا ہے؟") کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

> اس سوال کا مدعا یہ معلوم کرنا نہیں کہ وہ چیز کیا ہے جسے نظم (یعنی منظوم کلام) کہتے ہیں یعنی اس سوال کا مقصد یہ نہیں کہ نظم کی وجودیات (Ontology) سے بحث کی جائے۔ نظم بامعنی ہوتی ہے کہ نہیں؟ نظم کے معنی اس کے اندر ہوتے ہیں کہ باہر؟ نظم کے موضوع کو اس کے معنی کہہ سکتے

ہیں کہ نہیں؟ نظم کے ذریعہ ہمیں علم حاصل ہوتا ہے یا تجربہ؟ اگر تجربہ تو اس تجربہ کو کسی طرح کا علم (یعنی ایسی معلومات جس کی روشنی میں عام احکامات لگائے جا سکیں) کیوں نہیں کہہ سکتے؟ اگر نہیں تو کیا نظم میں جو کچھ بیان ہوتا ہے، اس کا سچ ہونا بھی ضروری نہیں؟ اگر نہیں تو پھر نظم کے صحیح پن (validity) کے لئے ہمارے پاس کیا دلائل ہیں؟ پھر نظم میں جو بات بیان ہوتی ہے کیا وہ بات اور لفظ کا لفظی بیان ایک ہی حکم رکھتے ہیں؟ وغیرہ۔۔

ان سوالات کے جوابات کے ساتھ ساتھ وضاحت اور اپنے سوال و جواب کی تصدیق کے لئے شمس الرحمٰن فاروقی مغرب و مشرق کے مشاہیر کی تخلیقات اور افکار بھی پیش کرتے جاتے ہیں اور تب درست نتیجہ خود بخود برآمد ہوتا جاتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی تنقید کے لئے یا تو نئے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں یا پھر ایسے موضوعات جن پر پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہو لیکن لکھنے والوں نے نتائج غلط برآمد کئے ہوں اور انھیں نتائج کو اردو والوں نے درست مان لیا ہو۔ ایسے موضوعات پر لکھتے ہوئے وہ اپنے سوال و جواب اور مثالوں کے ذریعہ اسے دلائل کے ساتھ غلط ثابت کر کے قارئین کو درست نتیجے تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ زیر تبصرہ مضمون میں انھوں نے کلیم الدین احمد کے تصور نظم کو انھوں نے دلائل کے ساتھ غلط ثابت کر کے غزل پر کلیم الدین احمد کی تنقید ہی کو مشکوک ثابت کر دیا ہے۔ ''نظم کا اسلوب'' میں نظم کے اسلوب سے بحث کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے پہلی بار یہ انکشاف کیا ہے کہ Pattern Poetry مشرق سے مغرب گئی جسے فرانس میں Calligramme اور سوئس میں Concrete Poetry کے نام سے جانا جاتا ہے۔

''ہماری کلاسیکی غزل کی شعریات'' اس کتاب کا سب سے اہم مضمون ہے۔ فاروقی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مشرقی شعریات کی بازیافت کر کے اردو والوں کو ان کے پرانے ورثے اور ادبی تاریخ کی اصل باتوں کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس موضوع پر ''شعر شور انگیز'' کے دیباچوں میں تفصیلی بحث ہے۔ بقول دیویندر اسر ''مشرقی شعریات کی بازیافت کلاسیکی ادب کا ازسر نو مطالعہ اور اردو تنقید کے انسلاک اور تناظر میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے فاروقی نے پیشہ ورانہ منعیت کے خلاف ادبی (تخلیقی) تحیر جستجو اور قوت کو بحال کرنے کی کوشش کی ہے۔'' زیر نظر مضمون میں انھوں نے جوش کی مشہور نظم ''جنگل کی شہزادی'' کے پانچ اشعار کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ''صرف پانچ اشعار کو دیکھیں تو پچیس الفاظ میں عدم مناسبت ہے اور سترہ الفاظ تکرار کے ہیں۔ محض نو الفاظ ایسے ہیں جن میں مناسبت ہے۔'' انھوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ جوش کا کلام عدم مناسبت سے بھرا پڑا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم فوری اثر تو شاید پیدا کر لیتی ہے لیکن دیرپا اثر نہیں چھوڑتی۔

''تعبیر کی شرح'' اس کتاب کا آخری مضمون ہے۔ یہاں شمس الرحمٰن فاروقی نے تعبیر، تفسیر، تفہیم، تشریح اور اظہار خیال جیسے الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے ''تعبیر'' کے معنی متعین کئے ہیں۔ اس مضمون کے بارے میں اجمل کمال نے اپنے عمدہ مضمون ''متن کی تعبیر اور شمس الرحمٰن فاروقی'' میں تحریر کیا ہے کہ ''اس مضمون کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بیان کئے گئے خیالات کا اطلاق نہ صرف ادبی متن کی تعبیر پر بلکہ معاشرے کو ان سے زیادہ براہ راست انداز میں متاثر کرنے والے متون اور کہیں وسیع تر بیانیوں کی تعبیر پر بھی کیا جا سکتا ہے۔''

''مرثیہ کی معنویت'' میں فاروقی نے مرثیہ کی شعریات کے بعض اہم پہلوؤں سے بحث کی ہے جن پر آج تک روشنی نہیں ڈالی گئی تھی اور ایسے سوالات اٹھائے ہیں جن کا جواب تلاش کئے بغیر مرثیہ کی شعریات کا تعین کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ''ادبی تحقیق اور ادبی تنقید'' میں تحقیق برتر ہے یا تنقید، پر بحث کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں کہ نقاد کی بالادستی اور میر کارواں ہونے کے تصور کو ختم ہونا چاہیئے اور تخلیقی فن کار کو نقاد سے برتر ماننا چاہیئے۔

فاروقی صاحب کے مضامین کی ایک اور انفرادیت جو انھیں تمام ناقدین سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے ان کی گٹھی ہوئی عمدہ نثر۔ عام اردو نقاد کے مضمون سے ایک پیراگراف یا کچھ سطریں بلکہ بعض اوقات پورے صفحے اگر حذف کر دیئے جائیں تو نفس مضمون پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن فاروقی صاحب کے کسی مضمون سے کوئی پیراگراف تو دور کی بات ہے ایک سطر یا ایک جملہ بھی حذف کر دیا جائے تو نفس مضمون پر فرق پڑ سکتا ہے۔

کتاب کے آخر میں ''پس نوشت'' کے عنوان سے فاروقی صاحب نے اپنے نظریۂ تنقید کا خود ذکر کیا ہے:

> اپنی روایت کو سمجھنا، اس کی بازیافت اور اس کا دوبارہ بیان اب میرے لئے سب سے اہم وظیفۂ فکر و عمل ہیں... مغرب کے تخلیقی ادب کی مزید فہم کے لئے میں محمد حسن عسکری کی طرح اپنی روایت اور وراثت کی امداد ضروری جانتا ہوں۔

اس کے بعد مغربی تنقید کی متلون صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی تہذیبی میراث کی قدر و قیمت کو پھر سے قائم کرنے اور کلاسیکی شعریات کو اسٹیج کے مرکز میں لے آنے کے لئے وہ پہلی بار اس انداز سے مخاطب ہوتے ہیں:

> ہماری پہلی ضرورت اپنے کھوئے ہوئے تہذیبی وقار اور خود اعتمادی کو بحال کرنے کی ہے چاہے اس کام کے دوران ہمیں مغرب پرستوں سے یہ طعنہ ہی کیوں نہ سننا پڑے کہ ہم قدامت پرست ہوئے جا رہے ہیں... مغرب (یا کسی بھی غیر تہذیب) سے آئی ہوئی ہر بات کو بے چون و چرا قبول نہ کیا جائے... نوآبادیاتی دباؤ کے تحت ہمارے یہاں جس طرح کی تعاون پذیر اور انگریزی کی ہاں میں ہاں ملانے والی شعریات بنی، اسے پوری طرح چھانٹنے پھٹکنے کی ضرورت ہے۔

''پس نوشت'' انتہائی پر مغز مضمون ہے۔ مغربی تنقید کی بدلتی ہوئی صورت

حال اور بدلتے ہوئے افکار کا جائزہ اس مضمون کے سوا کہیں نظر نہیں آیا۔ یہ مضمون آج کے نام نہاد نقادوں کے لئے لمحۂ فکریہ فراہم کرتا ہے۔

"تعبیر کی شرح" کی کتابت، طباعت اور گٹ اپ سب نہایت خوبصورت ہیں۔

— سید ارشاد حیدر

ماہنامہ اردو چینل ◆ شمس الرحمٰن فاروقی نمبر ◆ مدیران: عبید اعظم اعظمی، قمر صدیقی ◆ ۳/۱۲۱/۷، گجانن کالونی، گووندی، ممبئی ◆ صفحات، ۱۶۰ ◆ سو روپے

شمس الرحمٰن فاروقی کی شخصیت اور فن پر سب سے پہلے شاہد علی خاں نے "کتاب نما" کا خاص نمبر نومبر ۱۹۹۴ میں شائع کیا تھا۔ گذشتہ دس بارہ برس میں شمس الرحمٰن فاروقی نے تنقید اور شاعری کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور انگریزی کتابوں کے علاوہ ان کی کئی کتابیں شائع ہوئیں جن میں "اردو کا ابتدائی زمانہ" ۱۹۹۹ (تحقیق)، "سوار اور دوسرے افسانے" (افسانے) ۲۰۰۱ اور "لغات روزمرہ" (لغت) ۲۰۰۳ بھی شامل ہیں، ضرورت اس بات کی تھی کہ شمس الرحمٰن فاروقی کے فن اور ان کی کثیر الجہت شخصیت کا از سر نو جائزہ لیا جائے۔ مدیران "اردو چینل" مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے "اردو چینل" کا شمس الرحمٰن فاروقی نمبر دسمبر ۲۰۰۳ میں شائع کیا۔

قمر صدیقی نے شمس الرحمٰن فاروقی کے ادبی کارناموں کو مد نظر رکھتے ہوئے عمدہ اداریہ تحریر کیا ہے اور انھوں نے اپنے اداریہ میں یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ "اس نمبر میں فاروقی صاحب کے فن اور شخصیت کا احاطہ پوری طرح نہیں ہوسکا کیوں کہ ایسی بھاری بھرکم اور کثیر الجہت شخصیت کا احاطہ کسی ایک کتاب کے بس میں ہے ہی نہیں۔" لیکن ایک بات یہ بھی ہے کہ "جغادری قسم کے پروفیسران، نت نئے دن جاری ہونے والے ادبی پرچوں میں مسلسل شائع ہونے والے ادیبوں اور اپنی ادبی عظمت کے مقبروں میں سوئے ہوئے دانشور نما قلم کاروں سے ہمیں وعدوں اور مایوسیوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔"

مندرجہ بالا سطروں سے واضح ہے کہ مدیران نے شمس الرحمٰن فاروقی کے معاصر نقادوں اور پروفیسران سے مضامین لکھنے کی گذارش کی لیکن بے حد اصرار کے باوجود کسی نے بھی انھیں قلمی تعاون نہیں دیا۔ "کتاب نما" کے "شمس الرحمٰن فاروقی نمبر" میں بھی ان لوگوں سے قلمی تعاون حاصل نہیں ہوسکا تھا۔ اس کے دو اسباب ہوسکتے ہیں۔ (۱) اپنے آپ کو شمس الرحمٰن فاروقی جیسی شخصیت پر لکھنے کے اہل نہ پاتے ہوں یا (۲) یہ سوچتے ہوں کہ فاروقی پر لکھنے سے ان کی اہمیت کہیں اور نہ بڑھ جائے۔ دونوں ہی خیالات غلط ہیں۔ اس خاص نمبر نے یہ ثابت کردیا ہے کہ بعد کی نسل کے لکھنے والے بڑی حد تک فاروقی کے فن اور شخصیت کے ساتھ انصاف کرسکتے ہیں۔ پھر یہ "جغادری" قسم کے لکھنے والے کیوں نہیں لکھ سکتے؟ کم سے کم وارث علوی نے تو عرصہ ہوا "شعر غیر شعر اور نثر" پر بہت خوب لکھا تھا اور ثابت کردیا تھا کہ وہ شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید پر بھرپور لکھ سکتے ہیں۔ وارث صاحب نے کہیں لکھا ہے کہ فاروقی پر لکھنے کے لئے فاروقی جیسا ہم بھی چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ خود وارث علوی اس صفت سے متصف ہیں۔ رہا سوال فاروقی کی "اہمیت" گھٹنے یا بڑھنے کا، تو کسی بڑے شاعر یا ادیب پر مضمون لکھنے سے مضمون لکھنے والے کی اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے نہ کہ اس شاعر یا ادیب کی، جس پر کہ مضمون لکھا گیا ہے۔

زیر تبصرہ "شمس الرحمٰن فاروقی نمبر" کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے: احوال، افکار، ربط، آثار، اثرات اور متفرقات۔ باب اول میں نیر مسعود، ابرار اعظمی، محبوب الرحمٰن فاروقی اور مہر افشاں فاروقی کے تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ انجم فضلی نے "حیات نامہ" کے عنوان سے شمس الرحمٰن فاروقی کا مکمل سوانحی خاکہ مرتب کیا ہے۔ صرف ایک کتاب "لغات روزمرہ" کا نام غالباً "سہواً" فہرست کتب میں شامل نہیں ہوسکا۔ باب دوم میں خود شمس الرحمٰن فاروقی نے "میرا ذہنی سفر"، "اسلامیہ کالج گورکھپور" اور "مجھے کن لوگوں سے کچھ ملا ہے" عنوانات سے اپنے اور اپنے ذہنی سفر کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ دونوں ابواب کے مطالعے سے شمس الرحمٰن فاروقی کی ذاتی زندگی اور ادبی شخصیت کی مکمل تصویر روشن ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کے تین بہت اہم مضامین ("اردو، سائنس اور مسلمان"، "جدیدیت آج کے تناظر میں" اور "طنز و مزاح نگاری") بھی دوسرے باب میں شامل اشاعت ہیں۔

تیسرے باب میں قاسم ندیم اور رحیل صدیقی کی شمس الرحمٰن فاروقی سے دلچسپ گفتگوئیں شامل ہیں۔ اردو فکشن، قرۃ العین حیدر اور "آگ کا دریا" پر رحیل صدیقی کے سوالات کے جواب میں شمس الرحمٰن فاروقی نے اہم خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چوتھے باب میں "شعر شور انگیز"، "تفہیم غالب"، "شعر غیر شعر اور نثر"، "ساحری، شاہی صاحب قرانی"، "اردو کا ابتدائی زمانہ"، "آسماں محراب"، "عروض، آہنگ اور بیان"، "لغات روزمرہ" اور "سوار اور دوسرے افسانے" کے حوالوں سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ دیویندر اسر کے مضمون "فن پارہ، تہذیب اور شعریات" میں "شعر شور انگیز" جلد اول، دوم اور بالخصوص جلد سوم کے دیباچوں کے اقتباسات کے حوالے سے تہذیب اور شعریات پر فکر انگیز بحث کی گئی ہے۔ یہ مضمون حاصل باب ہے۔ لیکن یہ مضمون "کتاب نما" کے شمس الرحمٰن فاروقی نمبر میں شائع ہوچکا ہے۔

مظفر علی سید کا "تفہیم غالب" پر تبصرہ بھی جسے احمد محفوظ نے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے، "کتاب نما" کے شمس الرحمٰن فاروقی نمبر میں شائع ہوچکا ہے۔ قاضی جمال حسین کے مضمون "کلاسیکی جمالیات کی نئی تعبیر: آسماں محراب" میں نئی شعری جمالیات اور قاضی افضال حسین کے مضمون "داستان کی نئی قرأت" میں داستان کی شعریات بیان کی گئی ہے۔ قاضی جمال حسین نے شمس الرحمٰن فاروقی کی شاعری کا بالخصوص ان کی دو طویل نظموں "نامکمل سوانح حیات" اور قصیدہ "شہر شب" کا عمدہ تجزیہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "آسماں محراب" کی تخلیقات مشرق،

مغرب کی شعری روایت فاروقی کی کمال آگہی کی آئینہ دار ہیں اور ان کا شعری طریقہ کار اور بیان کی صلابت معاصر شعرا میں ان کی ایک علیحدہ شناخت قائم کرتی ہے۔

"عروض، آہنگ اور بیان" (۱۹۷۷) وہ بھاری پتھر ہے جسے اٹھانے کی ہمت غالباً کسی میں نہیں۔ عبید اعظمی قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کے ایک باب "تسکین اوسط کے اسرار" پر اظہار خیال کیا ہے۔ زیب غوری مرحوم نے "شب خون" (ستمبر ۱۹۸۰) "عروض، آہنگ اور بیان" پر تبصرہ کرتے ہوئے محقق طوسی کے اس بیان پر کہ "جہاں تین حرکتیں جمع ہو جائیں وہاں تسکین اوسط روا ہے، بشرطیکہ اس کے نتیجے میں بحر کی تبدیلی کا دھوکا نہ ہو" تحریر کیا تھا کہ "اگر بحر کی تبدیلی کا دھوکا ہو تو بھی کوئی حرج نہیں"۔ عبید اعظم اعظمی نے "تسکین اوسط" پر شمس الرحمٰن فاروقی کے خیالات کی مدلل تائید کی ہے اور ان کی جرأت مردانہ پر مبارک باد پیش کیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی افسانہ نگاری پر رحمٰن عباس کا مضمون اس لئے قابل ذکر ہے کہ فاروقی کی افسانہ نگاری پر یہ غالباً پہلا مضمون ہے۔ البتہ محمد منصور عالم کی کتاب "حریدورنگ" ابھی شائع ہوئی ہے جس میں فاروقی کے افسانوں پر مفصل گفتگو ہے۔

پانچویں باب میں ابرار رحمانی کا مضمون "جدیدیت اور فاروقی"، قمر صدیقی کا مضمون "اردو تنقید کی روایت در فاروق" اور عتیق اللہ کا مضمون "تنقید در تنقید" قابل ذکر ہیں۔ باب ششم میں شمس الرحمٰن فاروقی کی شاعری اور تبصروں کے نمونے اور شمس الرحمٰن فاروقی کے نام مشاہیر کے خطوط شائع کئے گئے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ خاص نمبر شمس الرحمٰن فاروقی کی شخصیت، ان کی تنقید، تحقیق، تفہیم غالب و میر، شاعری اور افسانہ نگاری کا احاطہ کرتا ہے۔ صرف ان کی تبصرہ نگاری اور "شب خون" کی چالیس سالہ خدمات پر کوئی مضمون نہیں۔ اگرچہ شمس الرحمٰن فاروقی کی سبھی کتابیں گہرے اور تفصیلی مضامین کی متقاضی ہیں اس کے باوجود یہ خاص نمبر شمس الرحمٰن فاروقی کے فن اور شخصیت کے مطالعے کے لئے بڑی حد تک کامیاب ہے اور اردو کے تمام قارئین بالخصوص شمس الرحمٰن فاروقی پر ریسرچ کرنے والے طلبا کے لئے بے حد کارآمد ہے۔

کتابت، طباعت اور گٹ اپ عمدہ ہیں۔

—— سید ارشاد حیدر

سہ ماہی کاروان ادب ◆ شمس الرحمٰن فاروقی نمبر ◆ مرتبین: کوثر صدیقی، جاوید یزدانی ◆ زیب ولا، اے/۷۹، گنوری مین روڈ، بھوپال ◆ صفحات، ۴۷۲ ◆ ایک سو پچاس روپئے

"کاروان ادب" اور "اردو چینل" کے شمس الرحمٰن فاروقی نمبر ایک ہی وقت (دسمبر ۲۰۰۳) میں شائع ہوئے۔ مدیران "کاروان ادب" نے پوری کوشش کی ہے کہ فاروقی صاحب کے فن اور شخصیت کا کوئی گوشہ چھوٹنے نہ پائے اس لئے انھوں نے زیادہ سے زیادہ مضامین دستیاب کرنے کی کوشش کی اور ۴۷۲ صفحات پر مشتمل اس نمبر میں نو شعرا کے گلہائے عقیدت، شخصیت پر تیرہ، تنقید پر بارہ، شاعری اور فن پر تین تین، افسانہ نگاری اور تحقیق پر ایک ایک مضمون، ایک گفتگو، پانچ متفرق مضامین، کچھ غیر مطبوعہ کلام، جاوید جمیل کے نام سے کئے گئے کچھ ترجموں کے نمونے، کچھ خطوط اور فاروقی کے تعلق سے بعض نادر تصویریں شامل اشاعت ہیں۔

منظوم گلہائے عقیدت کے باب میں عرفان صدیقی مرحوم کی غزل جس کا مطلع ہے۔

حرف کو حسن نظر سے معتبر اس نے کیا
کوئے معنی میں عجب کار ہنر اس نے کیا

بے حد پر اثر اور خوبصورت ہے۔ یہ غزل "کتاب نما" کے فاروقی نمبر میں بھی شائع ہوئی تھی۔ حیات و شخصیت کا باب بھرپور ہے۔ نجم الرحمٰن فاروقی کا مضمون 'بھیا' سب میں نمایاں ہے۔ یہ مضمون بڑی محنت سے اور پورے حوالوں کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس مضمون میں شمس الرحمٰن فاروقی کے خاندانی پس منظر سے لے کر ان کی پیدائش سے اب تک کے واقعات تاریخ وار بیان کئے گئے ہیں اور شمس الرحمٰن فاروقی کی پوری شخصیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی شاعری ("آسماں محراب" کے پس منظر میں) پر بلراج کومل، مظفر حنفی اور علیم صبا نویدی کے مضامین میں سے بلراج کومل کا مضمون "کتاب نما" کے فاروقی نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ "اردو چینل" کے نمبر میں شامل قاضی جمال حسین کا مضمون ان تینوں مضامین سے بہتر ہے کیوں کہ شمس الرحمٰن فاروقی کی شاعری کا سرا قاضی جمال حسین کی گرفت میں آ گیا ہے۔

مظفر حنفی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ "ادبی حلقوں میں یہ خیال عام تھا کہ فاروقی جتنے بڑے نقاد ہیں اتنے ہی چھوٹے شاعر ہیں۔" میں نے کسی اور شخص کی زبان یا قلم سے یہ خیال ادا ہوتے ہوئے سنا نہ دیکھا۔ یہ زبردست اور نادر خیال مظفر حنفی ہی کا ہو سکتا ہے۔ "ادبی حلقوں" کے سر الزام کیوں؟ آل احمد سرور، احتشام حسین، احمد مشتاق، احمد ندیم قاسمی، اعجاز حسین، بلراج کومل، پریم کمار نظر، جوگندر پال، زیب غوری، سید حامد، شہریار، صبا اکرام، عرفان صدیقی، علی سردار جعفری، قاضی جمال حسین، محمد منصور عالم، ن۔م۔ راشد، نیر مسعود، ان سب بزرگوں نے مختلف موقعوں پر اپنے اپنے انداز میں شمس الرحمٰن فاروقی کی شاعری کو زبردست خراج تحسین ادا کیا ہے۔ غالباً یہ لوگ "ادبی حلقوں" سے باہر ہیں۔ مظفر حنفی یہ بھی بھول گئے کہ اگرچہ فاروقی نے بہت کم کہا ہے لیکن ان کی متعدد غزلوں پر معاصر شعرا نے کثرت سے غزلیں کہی ہیں۔ یہ امتیاز جدید شعرا میں معدودے چند ہی کو حاصل ہوا ہے۔ مظفر حنفی کے ہاتھ شمس الرحمٰن فاروقی کی شاعری کا سرا لگا ہی نہیں، پتہ نہیں انھوں نے فاروقی کے "شہر آشوب" کو اردو کے اہم شہر آشوبوں میں کیسے شمار کر لیا؟

شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری پر بارہ مضامین میں سے چھ مضامین (نثار احمد فاروقی، دیویندر اسر، قسیم حنفی، عقیل احمد صدیقی، عتیق اللہ اور مظہر جمیل کے مضامین) "کتاب نما" اور "اردو چینل" کے فاروقی نمبر میں شامل ہیں۔ بقیہ مضامین میں سے فضیل جعفری کا مضمون "تنقید کو نئی سمت بتانے والا نقاد" بہت عمدہ ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے مختلف مضامین کے حوالوں سے ان کی تنقید کا درجہ متعین

کرتے ہوئے مدلل لکھا ہے کہ "فاروقی نے نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ تنقیدی ایک نئی بوطیقا ترتیب دینے کی کوشش کی ہے... انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس کو پڑھے اور غور کئے بغیر، اردو ادب، خصوصاً اردو شاعری پر بات نہیں کی جاسکتی۔"
لیکن ۲۶ صفحات پر مشتمل اس عالمانہ مضمون کے آخر میں اچانک ان کو اپنے محبوب شاعر فراق کی یاد آگئی اور وارث علوی کے بیان کی مدد سے انھوں نے اس بات پر اپنی اور وارث علوی کی آزردگی کا اظہار کیا کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے فراق کی ایک رباعی کے کچھ الفاظ اور ایک شعر۔

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہوگئی ہے

میں "اس دور میں" اور "بشر کی" کو "حشو" کیوں لکھا۔ فاروقی پر وہ یہاں "جذباتی انتہاپسندی" اور "ذاتی پسند ناپسند" کا مرتکب بتاتے ہوئے فضیل صاحب شاید اس بات کو نظر انداز کر گئے کہ گذشتہ بیس بائیس صفحوں میں وہ کیا ثابت کرتے آئے ہیں۔ محمود واجد نے اپنے مضمون "فکشن کے نقاد شمس الرحمٰن فاروقی" میں فاروقی صاحب کی کتاب "افسانے کی حمایت میں" اور ان کے مضمون "آج کا مغربی ناول کے حوالے سے فاروقی کی فکشن کی تنقید" کا عمدہ تجزیہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ فاروقی صاحب کی فکشن کی تنقید میں بھی شاعری کی تنقید کی طرح بڑی توانائی، رنگارنگی اور وسعت نظر شامل ہے، وہ اپنے فکری تجزیے کو فطری انجام سے دوچار کرتے ہیں اور نتائج تک پہنچنے میں معاون ہوتے ہیں۔"
خلیق انجم نے شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب "اردو کا ابتدائی زمانہ" (جو دوسو صفحات پر مشتمل ہے) کے صرف ۴۲ صفحات پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ "بیسویں صدی میں اس معیار و مرتبے کے بس دو تین ہی نقاد ادیب اور محقق پیدا ہوئے ہیں، جن میں آزادی کے بعد کے منظر نامے پر اب بس تنہا شمس الرحمٰن فاروقی ہی نظر آتے ہیں۔" کاش خلیق انجم نے پوری کتاب پر مضمون لکھا ہوتا۔
پچھلے شمس الرحمٰن فاروقی نمبروں میں ان کی تبصرہ نگاری پر کوئی مضمون شامل نہ تھا۔ مرتبین نے فاروقی صاحب کی تبصرہ نگاری پر صبا اکرام کا مضمون شامل کر کے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ صبا اکرام کا مضمون بے حد مختصر ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی تبصرہ نگاری پر اور گہرائی سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔
شمس الرحمٰن فاروقی کی افسانہ نگاری پر حنیف فوق کا مضمون "سوار اور شہ سوار" فکشن کے سوئے ہوئے نقادوں کو متوجہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ انھوں نے فاروقی صاحب کے افسانوں میں "تحقیق، داستانی اثرات، تاریخ، ادبی تاریخ اور تخلیقی عمل" کا اجتماع دریافت کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حنیف فوق صاحب ان افسانوں کو افسانہ نہیں مانتے۔ محمد منصور عالم نے فاروقی کی شاعری اور افسانہ نگاری کو سمجھنے اور سمجھانے کی جو کوشش کی ہے اسے آئندہ کی تنقیدوں کا نقش اول کہا جاسکتا ہے۔
جس دن شمس الرحمٰن فاروقی کی تحریروں کو شمس الرحمٰن فاروقی ہی جیسا ناقد مل جائے گا اس دن ان کی تحریروں کے ساتھ پورا انصاف ہوگا اور وہ پوری اردو دنیا کے لئے خوشگوار اور حیرت انگیز انکشاف کا حکم رکھے گا۔

مجموعی طور پر یہ شمارہ شمس الرحمٰن فاروقی کے فن اور ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا جائزہ ہے اور زیر تبصرہ دونوں ہی فاروقی نمبر ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔

—— سید ارشاد حیدر

سہ ماہی روشنائی ◆ فاروقی نمبر ◆ مدیران: احمد زین الدین، نگہت بریلوی ◆ نثری دائرہ، ۸۰/رائے، ندیم کارنر، بلاک این، نارتھ ناظم آباد، کراچی، پاکستان ◆ صفحات، ۳۸۴ ◆ ایک سو پچاس روپے

شاید ہی ایسا کوئی شاعر یا ادیب ہو جس کے فن اور شخصیت پر اس کی حیات میں پے در پے مختلف رسائل کے نمبر شائع ہوئے ہوں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے فن اور ان کی شخصیت پر ایک ہی وقت میں ہندو پاک کے تین رسائل کے نمبر شائع ہوئے۔ زیر تبصرہ "روشنائی" کا فاروقی نمبر غالباً مدیران "کاروان ادب" بھوپال کے تعاون سے شائع ہوا ہے کیوں کہ اس شمارے میں "منظوم خراج تحسین" "فکر و فن" اور تبصرہ نگاری کے باب میں شائع ہونے والے سبھی مضامین "شخصیت"، "انداز نظر" اور "شاعری" کے باب میں شامل زیادہ تر مضامین مدیران "کاروان ادب" بھوپال سے ہی حاصل کئے گئے ہیں، حالانکہ رسالے میں مدیر "کاروان ادب" کے تعاون کا کوئی ذکر نہیں۔
متذکرہ مضامین کے علاوہ جو چار چھ مضامین مدیران کو دستیاب ہوئے، مختصر اور سطحی ہیں، صرف اجمل کمال کا ایک مضمون "متن کی تعبیر اور فاروقی" جو شمس الرحمٰن فاروقی کے ایک مضمون "تعبیر کی شرح" ("شب خون" جولائی ۱۹۹۴) کے حوالے سے لکھا گیا ہے، پر مغز ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے "تعبیر" کی جو شرح پیش کی تھی اس "شرح" کے کچھ اقتباسات کو اصل متن مان کر اجمل کمال نے ان کی تشریح پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اجمل کمال کا یہ مضمون حاصل شمارہ ہے۔
امید تھی کہ پاکستان سے شائع ہونے والا فاروقی نمبر ہندوستان کے فاروقی نمبروں سے بہتر ہوگا کیوں کہ اس وقت پاکستان میں بعض زبردست لکھنے والے موجود تھے۔ لیکن "روشنائی" کے اس فاروقی نمبر نے ہندوستان قارئین کو بے حد مایوس کیا۔ اس شمارے میں ان کے لئے صرف اجمل کمال کا مضمون اور شمس الرحمٰن فاروقی کے چھ مضامین ("میں کون ہوں اے ہم نفساں"، "چند کلمے بیانیہ کے باب میں"، "غالب کا محبوب تصور اور پیکر"، "تنقید بطور اکتشاف"، "ادبی نشستیں اور تخلیقی عمل" اور "دیباچۂ افلاک") ہیں۔ مدیران "روشنائی" بھی غالباً اسی مشکل سے دوچار تھے جس کا ذکر مدیران "اردو چینل" نے کیا ہے، کہ اکثر لوگ شمس الرحمٰن فاروقی پر لکھنے سے جی چراتے ہیں۔ یہ شمارہ قارئین کے لئے شمس الرحمٰن فاروقی کی شخصیت، تنقید، تحقیق، افسانہ نگاری، شاعری اور تبصرہ نگاری کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کر سکتا ہے جو "کاروان ادب" بھوپال میں دستیاب نہیں۔
کتابت، طباعت اور گٹ اپ اچھے ہیں۔

—— سید ارشاد حیدر

سفال □ عشرت ظفر □ خرام پبلیکیشنز، کانپور □ سو روپے

جدید غزل کو نئے انوکھے ذائقے سے آشنا کرنے والوں میں عشرت ظفر بھی شامل ہیں۔ ان کے تازہ مجموعے "سفال" کے نام سے معاً ہمارا خیال غالب کے "جام سفال" سے ہو کر "جام جم" کی طرف جاتا ہے کہ جس میں ایک شعری کائنات پوری بوقلمونی، معنی کی جہات اور جمالیات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ عشرت ظفر کا اسلوب کئی پرتوں والا اسلوب ہے۔ اس میں نابود اور گم گشتہ حقائق کی عقدہ کشائی کے ساتھ دروں بینی، عصری حسیت اور آفاقی دردمندی کے عناصر نمایاں ہیں۔ ان کے پیکر ماورائی بھی ہیں اور ارضی بھی۔ ان غزل کی ایمائیت اور رمزیت ان کی شعریات کا فطری عمل ہے۔ ان کی لفظیات و تراکیب میں ان کی شاعری کا "میں" زندہ اور متجسس جدید کردار بن کر سامنے آتا ہے۔

میں نے اپنے شعلے کو مرنے نہ دیا
میرا سارا رنگ خس و خاشاک ہوا

ہو گئے سنگ خد و خال مرے
تو نے کیا گردش ایام کیا

تھا مری خاک قدم کی تخلیق
جو بگولا مری زنجیر ہوا

خاک اڑانے کی طلب جب بھی مجھے ہوتی ہے
میرے اندر سے نکل آتا ہے صحرا میرا

جہاں کسی کی ضرورت نہیں، وہاں کوئی ہے
مجھے یقین ہے مرے اس کے درمیاں کوئی ہے

کیا ہے سلطنت دل پہ حکمراں اس کو
نوازشوں کا سلیقہ مگر کہاں اس کو

عشرت ظفر کے کلام میں زبان و بیان کا ایسا آہنگ و اسلوب کارفرما ہے جو گہری فارسیت اور روشن تراکیب سے عبارت ہے۔ ان کی سطح کو چاک کر کے ہی قاری تصورات و تخیلات کے گہرہائے آبدار سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

جس کی مستی سے ہے سیراب مری کشت انا
کیسے اس کو اسی زہراب سے باہر لے جاؤں
کھلی جو آنکھ تو کچھ بھی نہ تھا نہ شب نہ الاؤ
چہار سو مری خاکستر حکایت تھی
وہ جس نے مجھ کو زمانے میں سرفراز کیا
رگ گلو اسی شمشیر آبدار کے نام

یوں ہی شناور دریائے غم نہیں مرا دل
یہ شعلہ اپنی کثافت کو دور کرتا ہے
اسی نے سر سے مجھے پاؤں تک نہال کیا
کہ مجھ کو ریگ سراب سفر اسی سے ملی

"سفال" میں شامل شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے کے مطابق:

شاعرانہ طرز فکر کے اعتبار سے وہ (عشرت ظفر) نئی غزل کی اس لہر کے لائے ہوئے گوہر شاہوار ہیں جس کو زیب غوری، بانی اور ظفر اقبال کی طبع مواج نے پیدا کیا تھا، لیکن انھوں نے ان سے الگ ہٹنے اور اپنے میدان بھی متعین کرنے کی سعی بلیغ کی۔

کوئی شک نہیں کہ عشرت ظفر کا ذہن تقلیدی نہیں تخلیقی ہے۔ ان کی آواز کا چہرہ دوسروں سے ممتاز اور منفرد ہو کر ہر طرف پہچانا جانے لگا ہے۔ ان کی غزل جہاں فارسی اور اردو کی کلاسیکی روایات سے مربوط ہے وہیں وہ جدید شعری آہنگ اور عصری میلانات شعر و فکر سے پوری طرح منسلک بھی ہے۔

نہ جانے کون تھا پتھر کی قید میں جس نے
رہائی کے لیے تیشے سے التماس کیا

دل میں وہ برق نگہ جذب ہوئی
آگ نے خاک میں آرام کیا

کریدتے ہی مری انگلیاں جل اٹھتی ہیں
عجیب چیز ہے خاکستر جوانی بھی

وہ چاہتا ہے کہ قائم رہے وجود مرا
چہار سمت سے میں دوں یہی صدا کہ میں ہوں

"سفال" کو غزل کی عظیم الشان تخلیقی روایت کا علم بردار یا سنگ میل کہنا غلط نہ ہوگا۔ اس مجموعے کے بارے میں عشرت ظفر ہی کا یہ شعر دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔

مرے سفر کے اسالیب میرے ہیں عشرت
مری زمام، مرا رخش، تازیانہ مرا

——غلام مرتضیٰ راہی

ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب ◆ گیان چند جین ◆ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ◆ دو سو پچھتر روپے

ہمارے نامور دوست، بزرگ محقق، مورخ ادب، شاعر اور بزعم خود ماہر لسانیات پروفیسر گیان چند جین نے تاحیات اردو زبان و ادب کی تدریس اور خدمت کی ہے، ان کی کئی کتابوں کے بارے میں بے خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں ان کی جگہ مدت مدید تک قائم رہے گی۔ اور تصنیف و تعلیم کے اس محترم اشرافی پیشے سے انھوں نے نام اور عزت بھی خوب کمائی ہے۔ اب وہ عمر کی آخری منزلیں طے کر رہے ہیں اور انھیں شاید یہ خیال آرہا ہے کہ ساری عمر اردو پڑھ پڑھا کر انھوں نے کوئی گناہ کیا ہے اور اب اس کا پرائشچت یوں کیا جانا چاہیے کہ اردو کو، اور اس کے بولنے والوں کو، لسانی تنگ نظری، سماجی استحصال، اور سیاسی علیحدگی پسندی، اور بالآخر پاکستان نوازی کے جرائم کا مرتکب ٹھہرایا جائے۔

کتاب کے عنوان سے کسی ہندی کتاب، یا کرسٹوفر کنگ کی کتاب One Language, Two Scripts کے ترجمے کا گمان گذرتا ہے۔ لیکن یہ کتاب نہ تو کرسٹوفر کنگ کی کتاب کا ترجمہ ہے اور نہ ہی یہ کتاب ہندی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو کتاب کا نام ہندی میں رکھ کر مصنف علام نے ہندی کو اردو پر فوقیت دینے کی کوشش کی ہے، ورنہ اردو زبان اور اردو رسم الخط میں لکھی گئی اس کتاب کا نام "ایک زبان، دو رسم الخط، دو ادب" بھی رکھ سکتے تھے۔ لیکن سچ پوچھیے تو اس کتاب کے لئے یہ عنوان بھی غلط ہے۔ یہ کتاب اردو ہندی تنازع پر نہیں، بلکہ ہندو مسلم تنازع پر لکھی گئی ہے، بلکہ ہندو مسلم افتراق کو ہوا دینے اور ابنائے وطن کے درمیان غلط فہمیوں کو فروغ دینے کے لئے لکھی گئی ہے۔

پروفیسر گیان چند جین نے اس کتاب کا انتساب امرت رائے اور گوپی چند نارنگ کے نام کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی ادب دوست شخص کے لئے یہ دونوں نام نہایت محترم ہیں اور ان کے نام کسی کتاب کا انتساب موجب مسرت ہونا چاہیے۔ لیکن ذرا انتساب کی عبارت ملاحظہ ہو:

انتساب بہ
دشمنان ہندی کے معتوب اول
امرت رائے
کاش کوئی اردو والا تاریخی لسانیات میں ان کی انگریزی کتاب
A House Divided کے برابر یا نصف یا کم از کم
ایک چوتھائی علمیت کی کتاب تصنیف کر سکتا
اور
پدم بھوشن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
صدر، ساہتیہ اکیڈمی
جن کی کتابوں 'امیر خسرو کا ہندوی کلام' (طبع دوم) اور 'ہندوستانی
قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں' (طبع دوم) نے بڑے بڑے محققوں
کے ہوش اڑا دئے ہیں اور وہ انھیں اپنا ہمسر ماننے پر مجبور ہیں

انتساب کی بچکانہ اور اسکولی لڑکیوں کی cheer leader جیسی زبان سے قطع نظر کر بھی لیا جائے تو اس کی عبارت سے نکلنے والے حسب ذیل نتائج سے قطع نظر کرنا غیر ممکن ہے:

(۱) امرت رائے کی کتاب بنیادی طور پر اردو کے خلاف ہے، اور اردو کو تقسیم ہند کا ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ گیان چند جین صاحب ہی نکال سکتے ہیں کہ جو شخص اس کتاب سے اختلاف رکھے وہ "دشمنان ہندی" میں سے ہے اور امرت رائے ان "دشمنان ہندی" کے "معتوب اول" ہیں۔ یعنی کسی اردو مخالف کتاب سے علمی اختلاف کرنے کے معنی ہیں "دشمنان ہندی" میں شمار کئے جانے کا مستوجب ٹھہرنا، اور اس کے مصنف کو اپنا "معتوب اول" قرار دینا۔

(۲) پروفیسر موصوف شاید نہیں جانتے کہ امرت رائے کی کتاب کے خلاف، بہت ہی کم اردو والوں نے احتجاج کیا اور جو کیا وہ بھی غیر موثر۔ اس کتاب کے سب سے بڑے مخالف خود امرت رائے کے صاحبزادے اور مشہور ہندی اور انگریزی کے ادیب آلوک رائے ہیں۔ لہٰذا گیان چند جین در اصل یہ کہہ رہے ہیں کہ آلوک رائے ابن امرت رائے ابن پریم چند "دشمنان ہندی" میں ہیں اور خود آلوک رائے کے باپ ان کے "معتوب اول" ہیں۔

(۳) پروفیسر گیان چند کے پاس کوئی پیمانہ ہے جس کے ذریعہ وہ ناپ سکتے ہیں کہ کس کے پاس کتنا علم ہے، اور ان کا دعویٰ ہے کہ کسی اردو والے کے پاس امرت رائے کا نصف یا چوتھائی علم بھی نہیں۔ جین صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے علم کو بھی من سیر چھٹانک یا روپیہ آنہ پائی کی مقدار میں ناپنے کا پیمانہ ایجاد کر لیا ہے۔ ہم اردو والوں کے علم کی مقدار متعین کرنے سے پہلے وہ "دشمنان ہندی" کے سرفہرست آلوک رائے کے علم کے بارے میں معلومات حاصل کرلیں۔ آلوک رائے آکسفورڈ یونیورسٹی میں روڈز اسکالر (Rhodes Scholar) رہے ہیں۔ یہ اعزاز دنیا میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ کیمبرج کے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ہیں اور ان کی کتابیں آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے مطبعوں سے چھپتی ہیں۔ وہ آئی۔ آئی۔ ٹی۔ دلی میں انگریزی کے پروفیسر رہے ہیں۔ اس وقت وہ دہلی یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہیں اور دنیا کی مختلف بڑی یونیورسٹیوں میں لکچر یا تعلیم دے چکے ہیں۔ پروفیسر گیان چند اپنے پیمانے میں ناپ لیں کہ آلوک رائے کا علم اپنے باپ کے علم کا چوتھائی ہے یا نصف، یا اس سے کچھ کم۔ اب رہے بچارے اردو والے، تو ان میں کوئی روڈز اسکالر یا کیمبرج کا پی۔ ایچ۔ ڈی۔ نہیں ہے، لیکن اگر گیان چند جین صاحب اردو کے ایک دو علما، مثلاً بزرگوں میں گوپی چند نارنگ اور مختار الدین احمد، رشید حسن خاں، انصار اللہ نظر، اور نوجوانوں میں سراج منیر مرحوم، تحسین فراقی اور سہیل احمد ہی کی تحریریں پڑھ لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ صاحب علم کسے کہتے ہیں۔ اور جہاں تک سوال "تاریخی لسانیات" کا ہے، تو اس فن میں گیان چند جین صاحب کا مبلغ علم اس بات سے ظاہر ہے کہ وہ ماکس میولر اور شوکت سبزواری کو تاریخی لسانیات میں مستند سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ کسی

اور کے علم کا کیا محاکمہ کر سکیں گے۔

(۴) دنیا جانتی ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کو اردو کی ساری دنیا سے جتنے اعزاز، اکرام، ایوارڈ، اور انعام ملے ہیں، اتنے اردو کے کسی ادیب کو نہیں ملے، اور نہ شاید آئندہ مل سکیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے ممدوح گوپی چند نارنگ کو اردو کی دنیا میں اپنے بزرگوں اور معاصروں کے ساتھ کسی گھوڑ دوڑ میں مبتلا بیان کرنا پسند کرتے ہیں، کہ ان کی تیز رفتاری نے اردو کے ''بڑے بڑے محققوں'' کے ''ہوش اڑا دیئے ہیں'' اور ''وہ انھیں اپنا ہمسر ماننے پر مجبور ہیں۔'' اصل صورت حال تو یہ ہے کہ اردو والے گوپی چند نارنگ کو اپنا ہمسر تو کیا، اپنے سے برتر مانتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ اس کی وجہ ''امیر خسرو کا ہندوی کلام'' نہیں، جو گوپی چند نارنگ کی کمزور کتابوں میں سے ہے۔ ''دیباچۂ غرۃ الکمال'' میں خود خسرو نے تحریر کیا ہے کہ انھوں نے ہندی کلام کو کبھی جمع نہیں کیا بلکہ دوستوں کے تفنن کی خاطر کبھی کبھی ہندوی میں بھی طبع آزمائی کی۔ امیر خسرو کے معتبر ترین محقق وحید مرزا نے اپنی کتاب ''امیر خسرو'' میں تحریر کیا ہے کہ بدقسمتی سے خسرو کا زیادہ تر ہندی کلام دستبرد زمانہ سے غارت ہو گیا، اس لئے کہ خود انھوں نے یا ان کے کسی ہمعصر نے اسے محفوظ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اور خود گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب میں شامل پہیلیوں کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ اس کتاب میں شامل زیادہ سے زیادہ دس پہیلیاں ایسی ہیں جن کا ''مستند ہونا زیادہ قرین صحت ہے'' (''امیر خسرو کا ہندوی کلام''، ص ۵۲)۔ یعنی یہ دس بھی بے شک و ریب خسرو کی تصنیف نہیں ہیں۔ خود مصنف/محقق کے اس اعلان کے بعد اس غیر معتبر کلام کو جرمنی کی کسی لائبریری سے نکال کر شائع کرنے سے کس محقق کے ہوش اڑ گئے؟

دوسرا افسوس ہمیں یہ ہے کہ جین صاحب نے بے وجہ اور بے دلیل یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ اردو کے محققوں اور گوپی چند نارنگ کے درمیان کوئی معاندتی رشتہ اور مقابلہ تھا اور گوپی چند نارنگ نے ان ''محققوں'' کو ''مجبور'' کر کے اپنی وقعت ان سے منوالی۔ گویا ادب کا میدان نہ ہوا داستان امیر حمزہ کا اکھاڑا ہوا جہاں دو سرداروں میں تین تین، بلکہ کبھی کبھی تو سات سات شبانہ روز کشتی ہوتی ہے، پھر کوئی فاتح اور کوئی مفتوح قرار پاتا ہے۔ تیسرا افسوس یہ ہے کہ ایک مدت ٹھوس علمی کاموں میں مشغول رہنے کے باوجود جین صاحب کا دماغ علمی معاملات میں بھی طالب علمانہ مقابلوں، امتحان میں اول آنے، اور ''حریفوں'' کو زک دینے کے بچگانہ خیالات سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔

انتساب کی اس بدمذاقی اور غیر علمی انداز کو دیکھنے کے بعد کتاب پڑھنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی، کہ یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ اس کتاب سے علم تو کیا، معلومات بھی نہ حاصل ہو سکے گی۔ لیکن تبصرے کا حق ادا کرنے کی خاطر مجھے یہ کتاب پوری پڑھنی پڑی۔

سترہ ابواب پر مشتمل زیر تبصرہ کتاب کا باب اول ''تمہید'' پوری کتاب کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں نہ تو زبان کے بارے میں کوئی علمی یا تحقیقی بحث ہے، نہ رسم الخط پر، اور نہ ہی ادب پر۔ پورے باب میں غیر ضروری باتیں اردو زبان، اردو کے مصنفین اور بالخصوص اردو کے مسلمان مصنفین اور مسلمانوں کے خلاف بغیر کسی حوالے یا ٹھوس ثبوت کے یکجا کی گئی ہیں۔

پروفیسر جین ''تحقیق کا فن'' نامی ایک لمبی چوڑی کتاب کے مصنف ہیں۔ اس کتاب میں وہ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ محقق کو غیر جانب دار، سچائی کا جویا، حق پرست، اور غیر متعصب ہونا چاہیئے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے کوئی بات پوری چھان بین اور اصل ماخذ کا حوالہ دیئے بغیر نہ لکھنی چاہیئے۔ اس کتاب میں بھی وہ فرماتے ہیں (ص ۱۳) کہ ''اہل علم کی وفاداری صرف سچ سے ہوتی ہے'' اور (ص ۱۵) ''اہل قلم کی وفاداری کسی علاقے، مذہب، زبان، یا رسم الخط سے نہ ہو کر صرف سچ سے ہونی چاہیئے۔'' اور خود ان کا عالم یہ ہے کہ یہ پورا باب بے حوالہ اور بے دلیل اور متعصبانہ بیانات سے بھرا پڑا ہے۔

''حرف اول'' میں پروفیسر جین صاحب خود تحریر کرتے ہیں:

''میرے اردو شاگردوں اور دوستوں کو شاید اس بات کا قلق ہو کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایسے ہے جیسے میں کوئی اردو دشمن یا مسلمان دشمن ہوں۔'' یعنی انھوں نے یہ کتاب خوب جان کر لکھی ہے کہ اس کے بعد انھیں اردو دشمن اور مسلمان دشمن سمجھا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کو، بلکہ اردو کے ہندو اور مسلم مصنفین کو بھی ایک دوسرے سے متنفر کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ مسلمانوں اور اردو کے خلاف جتنا بھی مواد مل سکا، انگریزی، ہندی اور اردو کے مصنفین کے اقتباسات، خواہ وہ کسی کتاب کے ہوں یا تقریر کے، یا خطوط کے، وہ کتاب کے موضوع سے متعلق ہوں یا نہ ہوں، شامل کئے گئے ہیں۔ اور ہوشیاری یہ کہ ان باتوں کے معتبر یا غیر معتبر ہونے، درست یا نادرست ہونے پر کوئی بحث نہیں ہے۔ دیگر یہ کہ یہ باتیں کن سیاق و سباق میں کہی گئی ہیں، اس کا بھی پتہ نہیں۔ اس کے علاوہ، اکثر معاملات میں راوی یا تو خود جین صاحب ہیں یا ان کا کوئی شاگرد یا دوست، یا ان کا کوئی قریبی رشتہ دار۔

اب کتاب کے باب اول ''تمہید'' (ص ۱۳ تا ص ۴۳)، سے کچھ جواہر ریزے ملاحظہ ہوں:

(۱) میری ایک نہایت قریبی رشتہ دار سکھ خاتون...نے دہلی اور یوپی میں رہنے والے مسلمانوں کو دیکھ کر کہا کہ یہ تو ملک کی تقسیم چاہتے تھے، پھر یہ یہاں کیوں ہیں؟ (ص ۲۵)۔

(۲) میری نگرانی میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے لئے ریسرچ کرنے والے ایک ریسرچ اسکالر نے مجھے بتایا کہ...اس نے اتحاد المسلمین کے امیدوار کے حق میں چار بار ووٹ دیا (ص ۲۵)۔

(۳) دو تین سال پہلے ستیہ پال آنند پاکستان گھوم کر آئے۔ وہاں انھوں نے اسکولی نصاب کی کتابیں دیکھیں۔ تاریخ کی کتابوں میں عام طور پر لکھا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کے آنے سے پیشتر یہاں کے باشندے جاہل اور غیر مہذب تھے...محبوب صدر نے پاکستان کے اسکولی نصاب کی تفصیل دی ہے۔ اس میں اسلام کی ستائش اور غیر مسلموں کی جھوٹی ہجو کے سوا کچھ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے یہ نصاب افغانستان کے طالبان نے تیار کیا ہے (ص ۲۴)۔

(۴) کالی داس [گپتا رضا] نے [میرے نام] ۵ جنوری ۲۰۰۰ کو

خط لکھا...'میں نے دیکھا ہے کہ کسی ہندو مشہور شاعر یا ادیب کو بخشا نہیں گیا۔ دیا شنکر نسیم، چکبست، فراق، مالک رام، گیان چند، گوپی چند نارنگ اور اب میں، سبھی پر کیچڑ اچھالی گئی ہے۔ صرف جگن ناتھ آزاد بچے ہیں کیونکہ انھوں نے اقبال کی پرستاری میں سب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے' (ص ص ۲۱ تا ۲۲)۔

(۵) [اردو کی] چھوٹی آسامیوں کے لئے ہندوؤں کی بہت تعریف اور آؤ بھگت کی جاتی ہے لیکن بڑے مقامات کے لئے امیدوار کا مذہب بھی دیکھا جاتا ہے (ص ۲۳)۔

(۶) مسلم بڑے ادیب پر کوئی چھوٹا ادیب درشتی کا لہجہ اختیار کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا، لیکن ایک بڑے ہندو ادیب کے خلاف چھوٹا ادیب بھی اپنے قلم کو بے لگام چھوڑنے کے لئے آزاد ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ رسالے کے قارئین اور ادارتی عملے کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں (ص ۲۳)۔

(۷) بڑے سے بڑے ہندو ادیب کو خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اردو دنیا میں جینا ہے تو مسلمانوں کی خوشنودی پر نظر رکھے (ص ۲۶)۔

(۶) اردو میں زبان کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں (ص ۱۴)۔

(۷) تاریخ میں مسلمانوں کی یہ پالیسی رہی ہے کہ جن علاقوں کو فتح کیا جائے وہاں کی زبان، بالخصوص رسم الخط کو ختم کر کے اپنی زبان اور لپی (رسم الخط) کو ان پر مسلط کیا جائے... ہندوستان میں بھی ایسی پالیسی پر عمل کرنے کی کوشش کی گئی... سندھی، پنجابی، کشمیری وغیرہ کی لکھاوٹ پوری طرح بدل دی گئی (ص ۱۶)۔

(۸) اردو کو ہندو مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ کہا گیا لیکن قیام پاکستان کے بعد اس کا بھانڈا پھوڑ دیا گیا... ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی ضخیم تصنیف 'ہندی اردو تنازع' میں انکشاف کیا کہ ابتدا ہی سے انجمن ترقی اردو اور مسلم لیگ سے گہرا ربط تھا... تقسیم ملک سے پہلے ایسے فرقہ وارانہ خیالات کو اردو والوں کا ہندوؤں سے پوشیدہ رکھنا کہ اردو تحریک کا بنیادی مقصد پاکستان بنوانا ہے، ایسی غداری ہے جس پر میں افسوس کرتا ہوں (ص ص ۱۸ تا ۱۹)۔

(۹) امریکہ اور کینیڈا میں پاکستانی انگریزی ہفتے وار ہیں۔ ان سب کی وفاداری پاکستان سے ہے۔ ان میں کھل کر ہندوستان اور ہندوؤں کو گالیوں سے نوازا جاتا ہے... جب ہر ملک کے اہل اردو اتنی شدت سے پاکستان نواز ہیں تو ممکن ہے ہندوستان کے مسلمان بھی ان کے ہم نوا ہوں لیکن ہندوستان میں ہندو اکثریت کے خوف سے شاید مصلحت سے کام لیتے ہوں (ص ص ۲۳ تا ۲۴)۔

(۱۰) میں اپنے اردو والے مسلمان دوستوں کی تحریریں دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ ان میں اب بھی وہی علیحدگی پسندی دکھائی دیتی ہے جو پہلے تھی۔ ابنائے وطن کے بارے میں ان کے جذبات وہی ہیں جو ہندوستان کے باہر کے اردو والوں کے ہیں (ص ۳۳)۔

(۱۱) اردو کے متعدد بڑے شعرا مثلاً مومن، داغ، جگر اور اصغر وغیرہ کی زندگیوں کے ساتھ طوائفوں کے معاملات لپٹے ہوئے ہیں (ص ۳۸)۔

(۱۲) گوپال کرشن مانک ٹالہ نے [مجھے] اپنی ۲۸ نومبر ۲۰۰۱ کی چٹھی میں لکھا 'آپ نے اردو کے مسلم ادیبوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل سچ ہے لیکن... آپ کچھ بھی کر لیجئے یہ لوگ سدھرنے والے نہیں بلکہ وہ آپ کو ignore کرنا شروع کر دیں گے' (ص ص ۳۹ تا ۴۰)۔

(۱۳) ہندوستان میں مسلمان اردو والے اپنی کمر پر دو قومی نظریے کا بھاری گٹھر اٹھائے پھرتے ہیں... ایک عام ہندو کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ملک میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر کیوں رکھا جائے (ص ۳۳)۔

(۱۴) اردو ادب... میں غیر مسلموں بالخصوص ہندوؤں کے دینی عقائد، معاشرے اور معاصر شخصیتوں پر اتنی سیاہی پوت دی گئی ہے کہ کوئی ہندی معاصر اسے قبول نہیں کر سکتا۔ وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ میرا ادب نہیں، کسی دوسری ملت کی چیز ہے (ص ۲۰)۔

(۱۵) ہندوستان میں اردو کے ہندو مصنف اتنے گھبرائے ہوئے ہیں کہ وہ مسلمان اردو ادیبوں کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں (ص ۳۹)۔

یہ تحقیقی جواہر پارے اور "حق پرستانہ" شہپارے کسی علمی ادبی کتاب کے بجائے وشو ہندو پریشد یا شیو سینا کے انتخابی منشور یا نریندر مودی کی تقریر کا اقتباس معلوم ہوتے ہیں۔

یہ کتاب علم سے کتنی دور ہے، اس کی ایک مثال مصنف علام کا یہ بیان ہے کہ مسلمان جس علاقے کو فتح کرتے ہیں وہاں کی زبان، بالخصوص رسم الخط کو ختم کر دیتے ہیں۔ گیان چند جین صاحب نے راجا رام موہن رائے کی ایک مبینہ تحریر فرمان فتح پوری کے حوالے سے نقل کی ہے کہ "ہندوستان کا بڑا حصہ کئی صدیوں سے مسلمان حکمرانوں کے زیر نگیں چلا آ رہا ہے... بنگالی چونکہ جسمانی طور پر کمزور تھے وہ اسلحہ اٹھانے سے گریز کرتے تھے... ان کی جائیدادیں تباہ کی جاتی رہیں۔ ان کے مذہب کی توہین ہوتی رہی..." اگر یہ صحیح ہے کہ سب سے زیادہ غلامی بنگال میں رہی تو سات سو سال کی مسلمانوں کی حکمرانی کے باوجود بنگال کی زبان اور اس کا رسم الخط مسلمانوں نے ختم کیوں نہیں کر دیا؟ زبان نہیں تو رسم الخط تو ضرور ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ پھر ایسا کیوں نہیں ہوا؟

جین صاحب کے عقیدے کے مطابق سندھی، پنجابی، اور کشمیری کے رسم الخط مسلمانوں نے تبدیل کر دیئے۔ لیکن جین صاحب یہ نہیں بتاتے کہ مسلمانوں کے آنے سے قبل ان زبانوں کا رسم الخط کیا تھا اور اس کی تبدیلی کس زمانے میں ہوئی، اور کشمیریوں، پنجابیوں اور سندھیوں نے کن حالات میں اسے قبول کیا، اور رسم الخط کتنے عرصے میں پوری طرح تبدیل ہو سکا۔

پروفیسر جین کو ان سوالوں سے غرض نہیں، انھیں تو اردو کی مخالفت کے بہانے مسلمانوں کی ہجو لکھنی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> بیرونی حملہ آوروں نے اپنے اقتدار اور احساس برتری کے نشے میں ہندوستانی زبان اور لپی کو قبول نہ کر کے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنائی... قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے جب دوسرے ممالک کو فتح کیا، سب سے پہلے وہاں کی

> زبان اور رسم الخط پر ضرب کاری لگائی...اس کی بہترین یا
> بدترین مثال فتح ایران ہے (ص ۱۵۳)۔

سوال از آسماں جواب از ریسماں شاید اسی کو کہتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے، دعویٰ تھا ہندوستان کے بارے میں، اور دلیل لائے ایران کے بارے میں۔ وجہ ظاہر ہے، مصنف علام کو معلوم ہے کہ ہندوستان کے بارے میں ان کا دعویٰ سراسر پادر ہوا ہے، لہٰذا وہ بھاگ کر ایران میں پناہ لیتے ہیں۔ یہاں بھی وہ ایران کی حقیقت نہیں بیان کرتے کہ مسلمانوں کے حملے کے وقت ایران میں تحریری زبان، یعنی پہلوی، بیشتر کاہنوں اور مذہبی رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی۔ ہزوارش کی بے تحاشا آمیزش کے سبب تقریری زبان سے اس کا رشتہ اس قدر ٹوٹ چکا تھا کہ خود مذہبی رہنما صاحبان لکھتے کچھ تھے اور پڑھتے کچھ تھے۔ عربوں کے یہاں زبان اور رسم الخط پر کوئی پابندی نہ تھی، تحریر سب کی میراث تھی۔ اب جن لوگوں کو علم کا شوق تھا انھوں نے لامحالہ عربی رسم الخط اختیار کیا۔ اس کے باوجود، خود انگریزوں کے بیان کے مطابق ایران کو مکمل طور پر عربی رسم الخط اختیار کرنے میں کوئی تین سو برس لگ گئے۔ فارسی زبان باقی رہی، صرف رسم الخط بدل گیا۔ ہم جانتے ہیں کہ جس فارسی زبان سے ہم واقف ہیں، اس زبان میں ادب کی متفرق پیداوار آٹھویں صدی سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ یہ کیونکر ممکن ہوتا اگر زبان ختم کرنے کا کوئی منصوبہ عربوں کے پاس تھا اور اس پر وہ عمل درآمد کر رہے تھے؟

مصر کا حال سب پر عیاں ہے۔ مسلمانوں کے آنے کے بہت پہلے وہاں کی زبان مصری تھی (جسے Demotic بھی کہتے ہیں)، قبطی اس کا رسم الخط تھا، اور رسم الخط بیش از بیش تر کاہنوں اور مذہبی رہنماؤں کے پاس تھا۔ عیسائی مبلغوں نے اپنی آسانی کی خاطر قبطی کو ترک کر کے یونانی کو رائج کیا۔ زبان وہی مصری رہی۔ ساتویں صدی کے وسط میں جب عرب وہاں پہنچے تو انھوں نے عربی کو سرکاری زبان قرار دیا اور سرکاری نوکریوں کے حصول کے لئے قبطی عیسائیوں نے عربی پڑھنی شروع کی۔ لیکن ان کی اپنی زبان وہی یونانی رسم الخط میں قبطی (یا درست تر کہیں تو مصری) رہی۔ یہ سلسلہ کوئی پانچ سو برس چلا۔ اس دوران قبطی عیسائیوں پر قسطنطینی اور شامی عیسائیوں کے مظالم اس قدر بڑھ گئے تھے کہ قبطیان عیسائی نے صلیبی جنگوں کے زمانے میں عربی زبان قبول کر لی، صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ہم ان صلیبی جنگوں والے عیسائیوں سے اظہار برأت کرتے ہیں۔ لہٰذا عربی کو مصر میں پھلتے پھولتے اور عمومی طور پر قائم ہوتے کوئی سات سو برس لگ گئے اور یہ تلوار کی نوک پر نہیں ہوا۔ بعد میں قبطی عیسائیوں نے بے تکلف اسلام بھی قبول کیا لیکن وہ الگ بحث ہے۔

مصر کے چند ہی سال بعد اسپین پر مسلمان قابض ہوئے اور وہاں کم و بیش آٹھ سو برس رہے، لیکن وہاں کے لوگوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ وہاں کی زبان وہی رہی جو پہلے تھی۔ عربی علمی زبان البتہ ہو گئی، لیکن اس میں حیرت کی کیا بات ہے جب اس وقت آدھی دنیا کی علمی زبان عربی ہو چکی تھی یا ہو رہی تھی۔

شمالی اور مشرقی افریقہ میں عربوں کی آمد کے وقت قبائلی زبانیں رائج تھیں جن کا کوئی رسم الخط نہ تھا۔ جب عربوں کی ہمت افزائی کے باعث وہاں علم کا چرچا ہوا تو لامحالہ عربی کا چلن بڑھا۔ کچھ علاقوں نے عربی زبان بھی اختیار کر لی۔ لیکن نائیجیریا، سینیغال وغیرہ خطوں میں پرانی ہی زبانیں رائج رہیں اور اب بھی رائج ہیں۔ نائیجیریا میں دو اہم قبائلی زبانیں اب بھی رائج ہیں، لیکن وہاں کی سرکاری زبان انگریزی ہے، عربی نہیں۔ سینیغال میں بھی قبائلی زبانیں موجود ہیں، لیکن وہاں کی سرکاری زبان عربی نہیں، فرانسیسی ہے۔

سوڈان کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں قبائلی زبانوں اور عربی کے میل ملاپ سے کئی زبانیں پیدا ہوئیں جو عربی النسل ہیں لیکن اکثر ایسی ہیں کہ جن میں آپسی مفہومیت (comprehensibility) نہیں ہے، لہٰذا انھیں الگ زبانیں سمجھنا چاہئے۔ گیان چند جین صاحب ماکس میولر اور شوکت سبزواری جیسے غیر سائنسی "ماہرین" کے حوالے سے بار بار کہتے ہیں کہ دو زبانوں کے اختلاط سے نئی زبان نہیں پیدا ہوتی۔ وہ اور کچھ نہیں تو یہودیوں کی زبان یدی (Yiddish) کو دیکھ لیتے جو عبرانی حرفوں میں لکھی جاتی ہے لیکن جس میں مصوتوں کو ظاہر کرنے والے حرف بھی ہیں اور جس کی بنیادی لفظیات اور صرف و نحو نویں صدی کی جرمن کی ہیں۔ گیان چند جین صاحب لسانیات میں اپنی تربیت کا بار بار حوالہ دیتے ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ ایک زبان پنسلوانیا ڈچ (Pennsylvania German) یا پنسلوانیا (Pennsylvania German) جرمن بھی ہے، جو امریکہ کی ریاست پنسلوانیا میں بسنے والے جرمن اور سوئس آج بھی بولتے ہیں۔ یہ زبان جرمن اور انگریزی کے امتزاج کا براہ راست نتیجہ ہے۔ جین صاحب گھر کے قریب آئیں تو ماپلا عورتوں کی ملیالم ملاحظہ کریں جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور معیاری ملیالم سے بہت مختلف ہے۔ تامل ناڈو میں ایک زبان "اروی" نامی ہے جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور جس میں تامل اور عربی لفظیات کو بخوبی برتتے ہیں۔

زبانوں کے اختلاط سے نئی زبان نہیں بنتی، یہ دعویٰ گیان چند جین صاحب اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں بعض "اردو والے مسلمان" کہتے ہیں کہ مسلمانی زبانوں اور ہندوستان کی مقامی زبانوں کے اختلاط سے اردو پیدا ہوئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس ذمہ دار ماہر لسانیات یا ماہر تاریخ نے یہ بات کہی ہے۔ جین صاحب کی عادت یہ ہے کہ سیاسی پلیٹ فارم سے دیئے گئے بیانات اور غیر علمی لوگوں کے غیر ذمہ دارانہ اقوال کو "مسلمان اردو والوں" کے "علمی نظریات" کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ ایک دنیا جانتی ہے اور اس بات پر فخر کرتی ہے کہ اردو ہندوستانی زبان ہے اور "فوجی لشکروں" وغیرہ سے اس کا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ جین صاحب رائی کا پہاڑ بناتے ہیں پھر لات مار کر اسے گرا دیتے ہیں اور پھر بغلیں بجاتے ہیں کہ وہ مارا، دیکھو میں "ہندو" ہوں اور کتنا عقل مند اور انصاف پسند ہوں اور "مسلمان" کتنے احمق اور بے ایمان ہیں۔

دنیا میں مسلمانوں کی حکومت مغرب و مشرق کے اور بھی کئی ممالک میں رہی اور آج بھی ہے۔ کتنے ممالک ایسے ہیں جہاں کی زبان اور رسم الخط کو مسلمانوں نے ختم کیا؟ وسطی اور مشرقی یورپ میں یونان و بلقان تک کے وسیع علاقے پر مسلمان صدیوں قابض رہے۔ لیکن وہاں کی سب زبانیں اور سب رسم الخط موجود ہیں، عربی تر کہیں بھی نہیں۔ یوگوسلاویہ کے خطوں بوسنیا، کوسوو، کو

دیکھئے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ لیکن ان کی زبان اور رسم الخط اب بھی وہی ہیں جو مسلمانوں کے پہلے تھے۔ البانیہ میں مسلمان نوے فی صدی سے بھی زیادہ ہیں، لیکن وہاں بھی زبان اور رسم الخط مقامی ہیں، عربی یا ترکی نہیں۔ انڈونیشیا اور ملیشیا کو دیکھئے جہاں کی زبانیں قبل اسلامی ہی ہیں، حالانکہ مسلمان وہاں بھاری اکثریت میں ہیں۔ رسم الخط البتہ دونوں زبانوں کا رومن ہے، اور یہ کرم فرمائی بیچارے مسلمانوں کی نہیں، ڈچ حاکموں کی ہے۔ چین کے مشرقی علاقے میں مسلمان حضرت عثمان کے وقت سے ہیں اور اکثریت میں ہیں۔ انھوں نے مقامی چینی زبان اور رسم الخط کو حسب سابق قائم رکھا ہے۔

کالی داس گپتا یا جین صاحب کا عقیدہ ہے کہ اردو کے مسلمان ادیبوں کے ہاتھوں اردو کے ہندو شاعروں اور ادیب کی تذلیل کی گئی اور ان پر کیچڑ اچھالی گئی۔ لیکن کالی داس گپتا رضا صاحب نے جن لوگوں کے نام لئے ہیں وہ سب ہندو ادیب اور شاعر اردو کے ابتدائی درجے سے لے کر ایم۔ اے۔ تک کے نصاب میں شامل رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ ان پر ریسرچ کل بھی ہو رہی تھی اور آج بھی ہو رہی ہے۔ اگر ان کا یہ عقیدہ درست ہے کہ اردو زبان صرف مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے، تو اس کے ذمہ دار ہندو حضرات ہیں جنھوں نے اردو کو ترک کر دیا۔ ورنہ ہندو ادیبوں کی قدر اردو ادب اور اردو کے ادبی معاشرے میں اب تو پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ فراق صاحب کو میر سے بھی برتر سمجھنے والا کوئی ہندو نقاد نہیں، اسلام پسند اور مولانا تھانوی کے عقیدت مند محمد حسن عسکری تھے۔ پریم چند کے بارے میں یہ کہنے والے کہ وہ بڑے بڑے لکھنوی اور دہلوی علما سے بہتر اردو لکھتے ہیں، کوئی جٹادھاری پنڈت نہیں بلکہ علامہ شبلی تھے۔ بیدی کی اہمیت منوالے والے ماسٹر تارا سنگھ نہیں، آل احمد سرور تھے۔ گوپی چند نارنگ کو امریکہ میں مقیم علی گڈھ کے سابق طالب علموں نے "محسن اردو" کا خطاب اور ایوارڈ دیا۔ یہ وہی علی گڈھ ہے جہاں جین صاحب کے بقول ہندو دشمنی کے "خلیفہ" سر سید احمد خاں نے اپنی "ہندو دشمنی" کی روایت قائم کی تھی۔ مثالیں بے شمار ہیں، یہ صرف چند نمونے ہیں۔ جین صاحب عالم فاضل اور ادب کے مورخ ہیں، مجھ سے زیادہ جانتے ہوں گے۔

فاضل مصنف نے ہندوؤں کی تذلیل کرنے والوں میں سر سید احمد خاں کا نام اس لئے بھی رکھا ہے کہ ان کے کالج میں ہندو طلبا کو سرخ ٹوپی پہننی پڑتی تھی۔ کیا سرخ ٹوپی پہننے سے غیر مسلموں کے مذہب پر کوئی ضرب پڑتی ہے؟ دنیا جانتی ہے کہ تعلیمی اداروں میں ڈریس ہندو اور مسلمان کے لئے الگ الگ نہیں ہوتے۔ آج پورے ملک میں انگریزی اسکولوں میں طالب علموں کو ٹائی لگانی پڑتی ہے اور لڑکیوں کو انگریزی لباس بھی پہننا پڑتا ہے۔ ان بچوں میں کثیر تعداد ہندوؤں کے بچوں کی ہے، اس سے بہت کم تعداد میں مسلمانوں کے بچے ہیں، اور عیسائی تو نام کے ہیں۔ نہ کبھی ہندوؤں نے اعتراض کیا کہ یہ لباس عیسائیوں کا ہے نہ مسلمانوں نے۔ اور نہ اس مغربی لباس کے پہننے سے کسی ہندو کی رگ ہندویت پھڑکتی ہے۔ پھر یہ سرخ ٹوپی کی شکایت کیوں؟ سرخ ٹوپی کوئی اسلام کی علامت تو نہیں۔ اور اب تو یہ ٹوپی اور شیروانی دونوں ہی علی گڈھ سے خارج ہو گئے ہیں۔ مصنف علام یہ بھول گئے کہ جب ۱۸۸۸ میں پنجاب کے مسلمانوں نے علی گڈھ میں ایک سونے کا تمغا قائم کیا جو مسلمانوں کے درمیان بی۔ اے۔ میں اول آنے والے لڑکے کو ہر سال دیا جاتا تھا تو سر سید نے اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے ایسا ہی تمغا ہندو طالب علموں کے لئے بھی قائم کیا۔

مسلمانوں کے خلاف جین صاحب کے دل میں (اور اب زبان پر) شکوؤں کا ایک طومار ہے۔ اس کو دیکھ کر ایک یہودی لطیفہ یاد آتا ہے جسے مشہور یہودی رپورٹر ٹامس فریڈمین (Thomas Friedman) نے بیان کیا ہے:

> دو یہودی کسی غیر ملک میں پہنچتے ہیں۔ وہاں سرحد پر پاسپورٹ کنٹرول افسر ان سے پاسپورٹ اور ویزا طلب کرتا ہے۔ اس پر ایک یہودی اپنے ساتھی سے سرگوشی میں کہتا ہے، "دیکھا، یہاں کے لوگ بھی کس قدر اینٹی یہودی ہیں، ہم سے پاسپورٹ اور ویزا طلب کر رہے ہیں۔"

جہاں تک سوال ہے اس بات کا کہ بڑے سے بڑے ہندو ادیب پر کوئی بھی چھوٹا موٹا مسلمان ادیب درشت لہجے میں تنقید کر سکتا ہے، لیکن کسی ہندو ادیب کی مجال نہیں کہ کسی بڑے مسلمان ادیب پر کچھ تنقید تو کر دیکھے، تو ہمارے پروفیسر صاحب ذرا اس بات کو ذہن میں لائیں کہ ابوالکلام آزاد، کلیم الدین احمد، اور آل احمد سرور سے بڑھ کر عالی مرتبت اردو ادیب کون ہیں، اور پھر یہ غور کریں کہ اسلوب احمد انصاری صاحب ان تینوں حضرات کو مسلسل سب وشتم کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن کو آل احمد سرور نے ایک انتخاب میں رضیہ سجاد ظہیر پر فوقیت دی تھی، لیکن اس کے باوجود محمد حسن صاحب نے سرور صاحب کے بارے میں کیا کیا دل آزار باتیں نہیں لکھیں؟ خود محمد حسن کے خلاف گوپال متل نے نہایت سخت لکھا لیکن "مسلمان اردو والوں" نے گوپال متل کو کچھ بھی نہ کہا۔ رشید حسن خاں نے "علیگڈھ تاریخ ادب اردو" کے مصنفین کے خلاف کیا سخت ترین تنقید نہیں کی؟ رضوان احمد نے عابد رضا بیدار کو کئی سال تک اپنے قلم کے نشانے پر رکھا۔ کیا گیان چند جین صاحب کو نہیں معلوم کہ ذکی کاکوروی نے مسعود حسن رضوی ادیب کو کس کس طرح طنز وتعریض کا نشانہ بنایا؟ اور بھی مثالیں ہیں، گیان چند جین صاحب اگر ایمان داری سے غور کریں گے تو انھیں خود یاد آ جائیں گی۔ (میں پاکستان سے مثالیں نہیں دے رہا ہوں، ورنہ فوری طور پر کئی باتیں میرے ذہن میں موجود ہیں۔)

جین صاحب کے "دل میں خیال آتا ہے کہ... ممکن ہے ہندوستان کے مسلمان بھی" پاکستان نواز ہوں، لیکن "ہندوستان میں ہندو اکثریت کے خوف سے شاید مصلحت سے کام لیتے ہوں۔" یعنی ہندوستان کے اردو لکھنے والے مسلمان پاکستان نواز اور غدار ہیں۔ خیر، یہ تو جین صاحب کا خیال تھا، اور ایسے خیالات آر۔ ایس۔ ایس۔، وشو ہندو پریشد، اور شیو سینا وغیرہ کے عالم فاضل لوگوں کے بھی دل میں آتے ہوں گے۔ لیکن ان کے اس ارشاد کی دلیل کیا ہے کہ ان کے "اردو

والے مسلمان دوستوں کی ''تحریروں میں'' اب بھی وہی علیحدگی پسندی دکھائی دیتی ہے جو پہلے تھی'' (ص ۳۳)۔ جین صاحب نے اپنے کئی ''اردو والے مسلمان دوستوں'' کا ذکر اس کتاب کے صفحہ vi پر کیا ہے۔ کچھ مزید دوستوں کا ذکر متن کتاب میں بھی ہے۔ بھلا وہ ان میں سے ایک کی کوئی تحریر کیا، ایک جملہ ہی دکھا دیں جس میں ''علیحدگی پسندی'' ہو اور ''ابنائے وطن [= ہندوؤں]'' کے تئیں ان کا وہی رویہ نظر آتا ہو جو ''ہندوستان کے باہر اردو والوں [= پاکستانیوں]'' کا ہے۔ اور لگے ہاتھوں اپنے انھیں دوستوں کی کسی تحریر کا ایک جملہ بھی ایسا دکھا دیں جس میں ''وہ علیحدگی پسندی'' نظر آئے ''جو پہلے تھی''، اور اس ''پہلے تھی'' کی بھی تھوڑی سی تفصیل وہ پیش کر دیتے تو اور بھی خوب ہوتا۔

زیر تبصرہ کتاب کے بقیہ ابواب میں اسی قسم کے نظریات اور عقائد کی تفصیل ہے۔ کہیں کہیں عنوانات سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہاں شاید کوئی علمی بحث ہو گی۔ مثلاً تیسرے باب کا عنوان ہے ''اردو اور ہندی کے آغاز کی تلاش اور محققین''۔ لیکن پورے باب میں، ''وہابیت''، شاہ ولی اللہ کی تحریک، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی تحریک، ''تحریک اتحاد اسلامی'' سے لے کر بھارتی جنتا پارٹی تک کا ذکر ہے۔ اور آخر میں حسب ذیل گل افشانی کی گئی ہے:

> ہندوستان کے مسلمان طلبہ اور اساتذہ کا اہل پاکستان سے کافی رابطہ رہتا ہے اپنے عزیزوں سے ملنے ملانے کے لئے۔ ان پر پاکستان کے طرز تعلیم اور نصاب کا اثر ضرور پڑتا ہوگا (ص ۶۵)۔

معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں آباد ہونے کے بعد جین صاحب کے علمی اور تحقیقی طریق کار میں گمان، ظن (خاص کر سوء ظن)، اور عقلی گدے کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ ورنہ وہ ''ضرور پڑتا ہوگا'' جیسے فقروں کو علمی بحث میں جگہ نہ دیتے۔ اور یہیں نہیں، انھوں نے کئی جگہ ایسا کیا ہے۔ جین صاحب کو غالباً یہ بھی معلوم نہیں کہ اپنے عزیزوں سے ملنے ملانے کے لئے پاکستان کے لئے عموماً ایک ماہ کا ویزا ملتا ہے اور ہندوستان سے پاکستان جانے والے زیادہ تر سن رسیدہ لوگ ہوتے ہیں۔ نئی نسل والوں میں سے اکثر نے تو اپنے اعزا کو دیکھا بھی نہیں۔ وہاں یہ سن رسیدہ یا نوعمر لوگ (اگر کوئی ہوں) ایک ماہ میں نہ تو اسکول میں کچھ پڑھ سکتے ہیں اور نہ پڑھا سکتے ہیں۔ پھر ان پر پاکستان کا زہریلا اثر کہاں سے اور کتنا پڑتا ہوگا؟

جین صاحب کے باب ہشتم ''ہندی کے ماضی پر اہل اردو کے دو سوالات'' میں مسلم لیگ کے بارے میں ارشاد ہے:

> ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کا ہریجنوں کے لئے پریم دکھانا حب علی کی وجہ سے نہیں، بغض معاویہ کے سبب تھا۔ ہندوؤں میں پھوٹ ڈالنے کی خاطر (ص ۱۱۹)۔

جین صاحب نے ''ظاہر ہے'' کہہ کر تاریخی تحقیق کا حق ادا کر دیا، لیکن یہ نہ واضح کر سکے کہ اس باب میں (بلکہ اس پوری کتاب میں) اس بحث کی ضرورت کیونکر ظاہر سمجھی جائے۔ وہ آگے چل کر ہندی کی برتری اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ہندی کے علما کی تحریریں دیکھئے کس قدر عبور اور قدرت کے ساتھ، سنسکرت، پالی، پراکرت اور اپ بھرنش کے الفاظ اور قواعد کو پانی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ان کے مقابل ناواقف اردو کو دیکھئے جو اپنی لسانی عصبیت کو عدم واقفیت اور جہالت کا جواز سمجھتے ہیں (ص ۱۲۵)۔

پروفیسر گیان چند جین یہ بات کہتے نہیں تھکتے کہ ''اردو کا مزاج تنگ نظری کا ہے'' (ص ۱۲۴)۔ پھر اگلے باب میں آگے اردو کو میل جول کی زبان نہ مانتے ہوئے لکھتے ہیں:

> فاتح اور مفتوح میں کہاں کا میل، کیا ہندو سومناتھ کے مندر توڑنے والوں، جزیہ لگانے والوں، ہندو کلچر کو تباہ کرنے والوں پر ملتفت ہوتے۔ اردو میل جول کی نشانی ہے یا ہندوستان کی زبان سے الگاؤ برتنے کی علامت (ص ۱۴۷)۔

دسویں باب ''ہندی اردو تنازع اور فرقہ وارانہ سیاست'' میں بھی پیٹ بھر کر زہر اگلا گیا ہے۔ مندروں کو توڑنے اور مسلمان بادشاہوں کی ہندو بیویوں وغیرہ کا ذکر کرنے سے شوق ستم نہ پورا ہوا تو بھارتیندو کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ ''یہ [اردو] طوائفوں کی زبان ہے، ہندو رئیسوں کے بدچلن لڑکے طوائفوں اور دلالوں سے گفتگو کرنے کو اس میں مہارت حاصل کرتے ہیں'' (ص ۱۸۰)۔ جین صاحب کا عقیدہ ہے کہ بھارتیندو نے ''طوائفوں کی زبان'' والا لقب بنگال کے گورنر سے سیکھا ہوگا۔ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔ جین صاحب نے یہی طوائفوں کی زبان (اردو) نہ صرف پڑھی بلکہ تیس چالیس سال تک یونیورسٹیوں میں پڑھائی اور پچیسیوں کتابیں لکھیں۔ اسی کی روٹی کھائی، اسی سے نام و نمود کمایا۔ انھیں کس بنگال کے گورنر نے گمراہ کیا تھا؟

گیارہویں باب، ''اردو کی ادبی تاریخ کے کچھ موضوعات'' میں صرف ایک موضوع ہے اور وہ یہ کہ اردو کی کچھ مثنویوں میں (سب میں نہیں، یہ جین صاحب بھی مانتے ہیں) ہیرو مسلمان ہوتا ہے اور ہیروئن ہندو۔ جین صاحب کے خیال میں یہ ہندوؤں کی توہین ہے، ''اس موضوع میں مذہبی تفوق کے ساتھ ایک رکیک جنسی جارحیت ہے'' (ص ۱۹۲)۔ جین صاحب یہ ملاحظہ کرنا بھول گئے کہ وہ غالباً پہلے محقق ہیں (اور وہ ہندو بھی نہیں، جین ہیں) جنھیں یہ نکتہ سوجھا ہے۔ مثنویوں کے کردار تو فرضی ہوتے ہیں۔ حقیقی دنیا میں کہیں اور نہیں، ہندوستان کے سیاسی حلقوں، فلم انڈسٹری، اور میٹروپولیٹن شہروں کو دیکھئے، بہتیرے ایسے مسلمان ملیں گے جن کی بیویاں اور محبوبائیں ہندو ہیں۔ اور بہت سے ایسے ہندو ہیں جن کی بیویاں مسلمان ہیں۔ جین صاحب کو فرضی کہانی پر اعتراض ہے، حقیقی زندگی پر نہیں۔

پروفیسر موصوف کی مسلمان دشمنی کا یہ عالم ہے کہ اختر حسین رائے پوری کے ترجمہ ''شکنتلا'' پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں ''ابا''، ''امی جان''، ''بڑی بی'' اور ''میاں'' (شوہر) جیسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو

خالص ''اسلامی معاشرت'' کے الفاظ ہیں اور ''ہندو حکمرانوں کے لئے بھی یہ الفاظ بالکل اجنبی اور بیگانہ ہیں'' (ص ص ۲۰۷/۲۰۸)۔ لیکن اگر جین صاحب کو اختر حسین رائے پوری کی ''ذہنیت'' پر اعتراض ہے کہ انھوں نے اپنے دیباچے میں ایک جملہ ایسا لکھا ہے جو نازیبا ہے، تو انھیں گوپی چند نارنگ کی بیگم پر بھی اعتراض ہے کہ انھوں نے جین صاحب کے سوال، ''آپ کیسی ہیں؟'' کے جواب میں ''خدا کا شکر'' کہا۔ انھیں ''بھگوان'' یا ''ایشور'' کہنا چاہیئے تھا (ص ۲۸)۔

گیارہویں باب کے آخر میں پورا ایک صفحہ ''بابری مسجد'' پر ہے۔ پیراگراف شروع ہوتا ہے اس جملے سے: ''عام اردو پڑھنے والے محمود غزنوی کے موید ہیں'' (ص ۲۱۵)۔ بابری مسجد کا ذکر جین صاحب نے اس لئے کیا کہ ان کے عقیدے کے مطابق جب ۱۹۴۹ میں اس مسجد میں رام چندر جی کی مورتی رکھ دی گئی تھی تو جو ''عمارت'' توڑی گئی وہ مسجد تھی ہی نہیں، ''وہ تو مندر میں تبدیل ہو چکی تھی''۔ لیکن ''بابری مسجد ٹوٹنے کے انتقام کے طور پر بنگلہ دیش میں ہزاروں مندر توڑے گئے۔'' جین صاحب نے یہ واقعہ کہیں پڑھا ہوگا کہ ۱۹۴۹ میں بابری مسجد کا دروازہ کھول کر اندر مورت رکھ دی گئی۔ پھر انھوں نے ۱۹۹۲ میں مسجد کے انہدام کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ اس انہدام کے ساتھ ساتھ اور فوراً بعد جو کثیر تعداد میں مسلمان جان و مال ضائع ہوا، اس کا ذکر شاید انھوں نے کہیں پڑھا نہ سنا۔ بنگلہ دیش میں مندر توڑے جانے کا واقعہ انھوں نے بے شک پڑھا ہوگا یا پھر سنا ہوگا۔ لیکن وہ کسی قسم کا حوالہ دینے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا راوی ستیہ پال آنند، بنگلہ دیش نہیں، پاکستان میں توڑے گئے مندروں کی تعداد ''سیکڑوں'' بیان کرتا ہے، لیکن یہاں بھی ستیہ پال آنند صاحب کی کسی تحریر کا حوالہ نہیں۔ جین صاحب ثانوی حوالے دینے کے ماہر ہیں (ان کی یہ کتاب بیشتر ثانوی حوالوں کی مرہون منت ہے اور کسی بھی ثانوی حوالے کی انھوں نے بچشم خود تصدیق نہیں کی)، لیکن یہاں وہ ثانوی حوالہ دینے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ بابری مسجد اگر ۱۹۴۹ میں مندر میں تبدیل ہو چکی تھی تو جین صاحب کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہندوؤں نے اپنا ہی مندر توڑا۔ سومناتھ کے مندر کا بھی جین صاحب کو نہایت غم ہے۔ اس کا ذکر وہ بار بار کرتے ہیں۔ کاش وہ رومیلا تھاپر کی کتاب اس موضوع پر پڑھ لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ سومناتھ کے مندر کی محمود غزنوی یا کسی بھی مسلمان کے ہاتھوں انہدام کی کوئی معاصر یا قریبی شہادت نہیں ہے۔

پروفیسر گیان چند ہم طالب علموں کو قدم قدم پر ہدایت کرتے ہیں کہ حق بات کے سوا کچھ نہ کہو، تعصب سے کام نہ لو، سچائی کو مت چھپاؤ۔ لیکن خود وہ جگہ جگہ ان باتوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اور کتمان حق کی یہ ادا انھوں نے آغاز کتاب ہی سے اختیار کر لی ہے۔ ملاحظہ ہو، اپنی ''تمہید'' میں فرماتے ہیں:

> میں نے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی 'تاریخ زبان وادب اردو' پر ایک مضمون لکھا۔ ہندوستان کے کسی بھی اردو رسالے نے یہ مضمون نہیں چھاپا لیکن اتنا احترام کیا کہ تحریر میں انکار لکھ بھیجنے کو بھی تیار نہ ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ امریکہ آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہندوستان کا کوئی رسالہ میرا مضمون نہیں چھاپ رہا۔ انھوں نے کہا کہ وہ مضمون دیکھ کر بتائیں گے۔ وہ مضمون دیکھنے کے لئے لے گئے۔ کچھ دن بعد انھوں نے فون کیا کہ مضمون چھپ جائے گا۔ یہ قومی اردو کونسل کے رسالے میں چھپا۔ اس کی وجہ سے مملکت پاکستان میں آسمان ٹوٹا نہ ہندوستان میں کوئی جوالا مکھی پھوٹا، ہاں ہندوستان کے اردو پریس کی آزادی ضرور بے نقاب ہو گئی (ص ۳۳)۔

ابواللیث صدیقی کی تاریخ کے بارے میں گیان چند صاحب کا کوئی ''مضمون'' نہیں ہے۔ ہاں ان کی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' کا ایک باب ضرور ابواللیث صدیقی کی تاریخ کے بارے میں ہے۔ اس باب (یا مضمون ہی کہہ لیجئے) کے بارے میں جین صاحب کا یہ ارشاد بالکل غلط ہے کہ ''ہندوستان کا کوئی رسالہ میرا مضمون نہیں چھاپ رہا۔'' کم از کم ''شب خون'' میں اشاعت کے لئے یہ مضمون کبھی نہیں آیا۔ لیکن اگر اس تحریر کی عدم اشاعت کا سبب ''مسلمانی تعصب'' ہوتا، یا گیان چند جین صاحب کے ''اردو والے مسلمان دوستوں'' کی ''علیحدگی پسندی'' ہوتا تو اس بات کی کیا وجہ ہے کہ جین صاحب کا یہ ''مضمون'' ہی نہیں، بلکہ پوری کتاب ہی پاکستان میں انجمن ترقی اردو نے سنہ ۲۰۰۰ میں شائع کر دی ہے۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ جین صاحب اس حقیقت کو پردہ پوش رکھتے ہیں۔ اور وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ یہ وہی انجمن ترقی اردو ہے جسے وہ زیر تبصرہ کتاب کے صفحہ ۱۹ پر ''غداری'' کا مرتکب قرار دے چکے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ یہ کتاب ہندوستان میں بھی زیر اشاعت ہے اور اس کے پاکستانی ایڈیشن میں ابواللیث صدیقی کے بارے میں حسب ذیل الفاظ گیان چند جین صاحب نے استعمال کئے ہیں:

> [ابواللیث صدیقی] جب تک چند صفحات میں ہندوؤں پر سب وشتم نہ کر لیں انھیں چین نہیں آتا (ص ۷۵۲)؛ افسوس کہ وہ ہندوؤں کی محترم ترین ہستیوں اور ہادیوں کا ذکر کرتے ہیں تو کمال بے حرمتی کے ساتھ (ص ۷۶۲)؛ کتاب کا انداز تحقیقی نہیں... خود اشتہاری کثرت سے ہے (ص ۷۵۳)؛ [مصنف میں] ہندو کشی [کا رجحان ہے] (ص ۷۵۳)؛ [مصنف کی] کس غضب کی ناواقفیت ہے۔ وہ نہ یہ جانتے ہیں کہ شدر کسے کہتے ہیں، نہ ہندوستان کی قدیم تاریخ جانتے ہیں (ص ۷۵۴)؛ [مصنف کو] آریوں اور سنسکرت سے بغض [ہے] ص ۷۵۷؛ [مصنف] کی طبیعت میں موزونیت نہیں تھی (ص ۷۷۵)؛ وغیرہ۔

یہ باتیں بالکل صحیح ہیں، بلکہ میرے خیال میں تو ابواللیث صدیقی اور بھی زیادہ سخت الفاظ میں مطعون کئے جانے کے مستحق ہیں۔ جب پاکستانیوں کو ایسی تحریر چھاپنے پر اعتراض نہیں تو ہندوستانیوں کو کیوں ہوگا۔ پھر ''ہندوستان کے اردو پریس کی آزادی ضرور بے نقاب ہو گئی'' (یعنی یہ ثابت ہو گیا کہ ہندوستان کا اردو پریس پاکستان کا غلام ہے)، کہنے سے جین صاحب کا کیا مطلب ہے؟

تین سو سے کچھ اوپر صفحات پر مشتمل اس کتاب کا چودھواں (آخری) باب "اردو ہندی اور رومن رسم الخط پر ایک طائرانہ نظر" صرف دس صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ہندو مسلم تنازع کے موضوع سے پاک ہے اور اپنے عنوان کے مطابق ہے، لیکن اس میں اردو کے رسم الخط کی "برائیاں" اور ناگری رسم الخط کی "خوبیاں" بیان کرنے میں خاصے جوش سے کام لیا گیا ہے۔ "اردو رسم الخط کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ صرف اسی کے کام کا ہے جو اس زبان کو جانتا ہو" (ص ۲۵۱)۔ سبحان اللہ، پھر تو یہ "سب سے بڑی خرابی" دنیا کی اکثر زبانوں میں ہے۔ بھلا جین صاحب ان زبانوں کو جانے بغیر صرف حرفوں کو پہچان کر تامل یا تیلگو یا ملیالم کا ایک فقرہ پڑھ کر دکھا دیں، روسی اور چینی کی تو بات ہی نہ کیجیے۔ "رومن رسم الخط جاننے والا تو ڈچ یا جرمن کو بھی بمشکل ہی پڑھ سکتا ہے۔" "پاکستانی علاقے کے... ایک مولوی صاحب پنڈت پنت کو پنڈت نپت (ن پ ت npat) پڑھتے تھے" (ص ۲۵۱ / ۲۵۲)۔ درست، ہمارے ایک استاد انگریزی میں Gokhale کو مدتوں "گوکھیل" پڑھتے رہے۔ ایک اور استاد نے مجھے silhouette کا تلفظ "سلوٹی" بتایا، نہ "سلوئٹ" جو صحیح تلفظ ہے۔ جین صاحب کے ملاقاتی ایک دو ہائی کورٹ کے جج ضرور ہوں گے۔ ذرا وہ ان سے پوچھ دیکھیں کہ ہائی کورٹ کے عام جج کو Puisne جج جو کہا جاتا ہے تو اس کا تلفظ "پیونی" کیونکر ہوا؟ یقیناً یہ رسم الخط ہی نہیں، پوری انگریزی زبان کی "خرابی" ہے۔ تو کیا جین صاحب قبلہ اپنے نئے ہم وطنوں کو مشورہ دیں گے کہ وہ انگریزی زبان نہ سہی، رومن رسم الخط ہی ترک کر دیں؟

اس کتاب کا طرز بیان، در طریق کار غیر علمی اور مناظرانہ ہے۔ اس کی توقع گیان چند جین جیسے استاد تو کیا کسی معمولی درجہ کے سیاسی اکھاڑے کے داؤں پیچ بیان کرنے والے سے بھی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ مصنف علام کی تمام گہر افشانیوں سے ہمیں کیا حاصل ہوتا ہے؟ یہ نتیجہ لابدی ہو جاتا ہے کہ اردو بولنے والوں اور اردو کے مصنفین کی برائی کے پردے پردے میں مسلمانوں کی برائی کی گئی ہے کہ لوگوں کے دل میں مسلمانوں اور اردو زبان کے خلاف بد گمانیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہوں۔ اردو کا تو محض بہانہ ہے، مصنف اردو سے در اصل مسلمان مراد لیتے ہیں، فرماتے ہیں:

> یہ حقیقت ہے کہ تہذیبی اعتبار سے مسلمانوں کے تشخص کا جو اظہار اردو زبان و ادب میں ہوتا ہے، وہ ہندی میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہندوؤں کے تہذیبی تشخص کا اظہار جو ہندی ادب میں ہوتا ہے، اس قدر اردو میں نہیں ہوتا۔ اردو زبان و ادب کا لسانی تہذیبی پس منظر عربی فارسی اور اسلام سے نزدیک ہے، ہندی زبان و ادب کا سنسکرت اور ہندو دھرم سے (ص ۲۷۹)۔

پوری کتاب میں پروفیسر صاحب نے دو باتوں کی تکرار کی ہے:

(۱) لسانیاتی اعتبار سے اردو اور ہندی ایک ہی زبان ہیں۔

(۲) اردو کو مسلمان اپنے ساتھ نہیں لائے تھے۔ اردو کے بنیاد گذار اور اولین معمار ہندو ہیں۔

اس بات سے قطع نظر سے کہ "ہندوؤں" نہیں، "ہندوستانیوں" کو اردو کا بنیاد گذار اور اولین معمار قرار دینا چاہیئے، جین صاحب کی دونوں باتیں بالکل صحیح ہیں۔ لیکن یہ نئی دریافتیں نہیں ہیں۔ شاید ہی کوئی صاحب ہوش اردو والا ہوگا جسے ان باتوں سے انکار ہو۔ خود پروفیسر جین نے ان باتوں کی تائید میں اردو کے متعدد معتبر بزرگوں کے اقوال پیش کئے ہیں جن میں آل احمد سرور، احتشام حسین، ابو محمد سحر، مسعود حسین خاں، سہیل بخاری اور گوپی چند نارنگ کے نام نمایاں ہیں۔ میرا ابھی ہمیشہ سے یہی موقف رہا ہے کہ اردو اور جدید کھڑی بولی ہندی صرف سیاسی اور بعض تاریخی وجوہ سے دو الگ زبانیں قرار پائی ہیں ورنہ لسانیات کے اصول سے دونوں میں کوئی فرق نہیں، اور اردو کسی غیر ملک سے نہیں آئی، یہیں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی کہ ان دو بدیہی باتوں کو بیان کرنے کے لئے جین صاحب کو یہ کتاب لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی، ایسی کتاب جس میں از اول تا آخر مسلمانوں اور اردو کے خلاف زہر اگلا گیا ہے۔ جین صاحب کے کچھ ارشادات ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ اب مزید عبرت کے لئے یہ چند اور ملاحظہ ہوں:

(۱) [عربی زبان کے] اس لے پالک [اردو زبان] کا فرضی جد عربی، اس کے صلبی جد سنسکرت سے علیحدگی اور آویزش پر عمل کرتا رہا ہے (ص ۵۷)۔ (۲) ہندی کا مزاج مرکز گریز وسعت کا ہے، اردو کا مزاج تنگ نظری کا (ص ۸۹)۔ (۳) اردو کا مزاج تنگ نظری کا ہے (ص ۱۲۴)۔ (۴) ہندی اپنا دائرہ زیادہ سے زیادہ بڑھانا چاہتی ہے، اردو اپنا دائرہ تنگ سے تنگ تر کرنا چاہتی ہے، عوام سے ہٹ کر والیان ملک اور روسا کی جاگیر بنا [کذا] کر (ص ۱۲۵)۔ (۵) سات سو سال مسلم حکومت نے... ہندو تہذیب کو دبا کر تیسرے درجے کی چیز بنا دیا تھا (ص ۱۷۶)۔ (۶) اس صدی میں اردو تحریک کے سالار علیحدگی پسند یا مسلم لیگی مسلمان رہے ہیں (ص ۲۴۲)۔ (۷) اگر آپ سرسید کی طرح اردو کے محافظ ہیں تو یہ بھی جان رکھئے کہ اردو کے تمام یا بیشتر ہندو ادیب اپنے سینے میں ایک راجہ شو پرشاد لئے ہوئے ہیں (ص ۲۷۸)۔

یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے شائع کی ہے۔ یہ ادارہ اردو اشاعت کا ایک معتبر ادارہ ہے۔ اس کے مالک جمیل جالبی کے بھائی ہیں، وہی مشہور محقق اور ادبی مورخ جمیل جالبی جن کے معتقد ہمارے فاضل مصنف بھی ہیں اور جن کو انھوں نے اپنی کتاب "اردو کی ادبی تاریخیں" یہ لکھ کر معنون کی ہے کہ "جمیل جالبی" ادبی تاریخ کے سب سے اچھے اہل قلم" ہیں۔ حیرت ہے کہ اردو کے صریحاً خلاف جھوٹ اور اغلاط اور تعصب سے بھری ہوئی یہ کتاب ایک اردو ادارہ سے کیسے اور کیوں شائع ہوئی؟

---شمس الرحمٰن فاروقی

● آپ کے موقر جریدے کے شمارہ نمبر ۲۹۱، بابت اپریل ۲۰۰۵ میں آپ کے ذاکر حسین یادگاری خطبے کے اردو ترجمے کا متن نظر سے گزرا۔ صفحہ ۱۶ کے پہلے کالم کے وسط میں آپ نے سہ لسانی فارمولے کا ذکر کیا ہے۔ آپ نے ہندی میڈیم اسکولوں کے سیاق وسباق میں لکھا ہے کہ اردو خواں بچہ زبان اول مادری زبان کی حیثیت سے تیسری جماعت سے اردو پڑھے گا۔ اصولاً ہر بچے کو پہلی جماعت ہی سے مادری زبان پڑھنے کا حق ہے اور اس کے ذریعے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کا بھی۔ اسے یہ آئینی حق ملنا ہی چاہیے۔ ہندی میڈیم اسکول میں اگر وہ اردو پڑھتا ہے تو دوسری زبان کی حیثیت سے، کیوں کہ ہندی میڈیم کے ابتدائی درجات والے اسکولوں میں پہلی زبان کی حیثیت سے اردو پڑھنے پڑھانے کا کوئی نظم نہیں ہے۔ یہ اس کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس مسئلے کا علاج یہی ہے کہ اردو خواں بچہ اردو میڈیم سے ابتدائی تعلیم حاصل کرے اور پہلی جماعت سے اردو پڑھے، پھر دو تیسری جماعت سے ہندی اور پانچویں جماعت سے انگریزی بھی پڑھے۔

آگے چل کر آپ نے اسی سہ لسانی فارمولے کی تشریح کی ہے۔ اصلاً تو یہ تھا کہ دوسری زبان غیر ہندی علاقوں میں ہندی یا علاقائی زبان اور ہندی علاقوں میں ہندی یا کوئی دوسری ہندوستانی زبان ہو، بعد میں اسے تبدیل کر دیا گیا۔ اس کا سب سے زیادہ نقصان اردو کو ہوا۔

نئی دہلی — سید شہاب الدین

● میں جناب سید شہاب الدین کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مضمون کا غائر مطالعہ کر کے اہم نکات کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ میرے مضمون کے اردو ترجمے میں کئی مقامات پر پروف کی غلطیوں کی وجہ سے شہاب الدین صاحب کو زحمت ہوئی مگر انھوں نے جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے، ان سے متعلق میرے معروضات درج ذیل ہیں تاکہ قارئین ''شب خون'' بھی صحیح صورت حال سے واقف ہو سکیں۔

کمپوزنگ یا پروف ریڈنگ تسامحات کی وجہ سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ میں ہندی ذریعۂ تعلیم کے سکولوں میں سہ لسانی فارمولے کے مطابق اردو مادری زبان والے بچوں کے لیے زبان اول اور مادری زبان کے طور پر تیسرے درجے سے اردو کی تعلیم کے حق کی بازیافت کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ مادری زبان کی تعلیم ہر بچے کا بنیادی حق از روے اعلامیۂ اقوام متحدہ (۱۹۴۸) ہونے کے ساتھ ہندوستان میں اس کا آئینی حق بھی ہے۔ اصولی بات یہ ہے کہ آئین کی ہدایت کے مطابق جو دفعہ ۳۵۰-الف میں مندرج ہے، بچوں کی ابتدائی تعلیم صرف مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ اردو والوں کو مسلسل اپنے اس حق کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ سہ لسانی فارمولے کا کوئی تعلق ابتدائی تعلیم سے نہیں ہے۔ اصولاً اس کا نفاذ چھٹے درجے سے دسویں درجے تک ہوتا ہے۔ شمالی ہند کی متعدد ریاستوں میں گیارہویں اور بارہویں کے درجات اسکول کے تعلیمی نظام کا ہی حصہ ہیں۔ اس طرح ان ریاستوں میں سہ لسانی فارمولے کی ضرورت بارہویں درجے تک ہو جاتی ہے۔

تاریخی طور پر سہ لسانی فارمولے کی تشکیل Central Advisory Board of Education (CABE) نے ۱۹۴۹ میں کی تھی۔ یہ ادارہ آج بھی ثانوی سطح تک کی تعلیم کے متعلق پالیسیاں وضع کرنے والا اعلیٰ ترین مقتدرہ ہے جسے بی جے پی نے اپنے دور اقتدار میں تقریباً معطل کر دیا تھا۔ سہ لسانی فارمولا (۱) مادری زبان، (۲) کوئی دوسری جدید ہندوستانی زبان، اور (۳) انگریزی پر مشتمل تھا۔ اس میں یہ گنجائش رکھی گئی تھی کہ وہ طلبہ جن کی مادری زبان ہندی نہیں ہے، ہندی کا مطالعہ دوسری زبان کی حیثیت سے کریں گے۔ ایسا کرنے میں جنوبی ہند کی ریاستوں میں ہندی کا فروغ مقصود تھا، اور شمالی ہند میں جنوبی ہند کی زبانوں کا۔ سہ لسانی فارمولے کو اسی طرز پر National Policy on Education, 1968 میں بھی شامل کیا گیا۔ سہ لسانی فارمولے کا دیانت دارانہ نفاذ، خصوصاً اردو کے سیاق و سباق میں، کبھی ہوا ہی نہیں۔ شمالی ہند کی فسطائی سیاسی قوتوں نے، ہندی جن کی سیاست کا اہم ترین آلہ کار تھی، شمالی ہند کے نصاب میں جنوبی ہند کی کسی زبان کو جگہ نہیں دی۔ ہندی کی اس سیاست کو اردو دانشور بالکل نہ سمجھے اور اپنے اہل اردو ہونے کے احمقانہ احساس برتری اور جنوبی ہند کی زبانوں کو حقیر سمجھنے کے باعث میں وہ اس معاملے میں ہندی والوں کے ساتھ برابر کے شریک رہے کہ جنوبی ہند کی زبانوں کو دبا کر رکھا جائے۔ اردو والوں سے میری اب بھی یہی درخواست ہے کہ وہ اپنی زبان کے لئے رونے کے بجائے اپنی زبان کے لئے کام کرنے پر آمادہ ہوں۔ ہندی یا جنوبی ہند کی زبانوں کو تحقیر سے نہ دیکھیں اور اپنی زبان سے محبت ضرور رکھیں۔

الہ آباد — شمس الرحمٰن فاروقی

● شمارہ ۲۹۰ میں مسعود اشعر کا افسانہ ''اللہ حافظ'' غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ میں کاہلی کی بنا پر اپنا ردعمل پہلے نہیں بھیج سکا مگر ساجدہ زیدی (شمارہ ۲۹۲) کا ردعمل پڑھ کر تشفی ہوئی کہ افسانہ ردعمل کے بغیر نہ گیا۔ ساجدہ زیدی نے اس کا مختصر مگر بامعنی تجزیہ کیا ہے۔ افسانے کا موضوع پاکستانی معاشرے میں بڑھتی ہوئی جارحانہ بنیاد پرستی ہے جس کا علامیہ فقرہ ''اللہ حافظ'' ہے جسے ''خدا حافظ'' کے علی الرغم قائم کیا جا رہا ہے کہ ''خدا حافظ'' ہندوستانیوں کی زبان ہے۔ مجھے جہادیوں کے ''اللہ حافظ'' سے سنگھیوں کے ''جے شری رام'' کی بو آتی ہے۔ اپنی معنی خیزی کی بنا پر افسانے کا عنوان انگوٹھی میں نگینے کا حکم رکھتا ہے۔

پتہ نہیں مسعود اشعر کی نگاہ میں ہیرو کا کردار بناتے وقت پانچویں صدی عیسوی کے اسکندریہ کی فاضل عورت حباطیا (Hypatia) تھی کہ نہیں۔ مگر مجھے بے ساختہ وہی یاد آئی۔ پادری سرل (Cyril) اور اس کے ساتھی جنونی عیسائیوں نے اسکندریہ کے بازار میں حباطیا کو بگھی سے کھینچ لیا تھا۔ انھوں نے پہلے اس کے لباس کے ٹکڑے کیے اور پھر اس کے جسم کے۔ اس کے بعد بلوائی گروہ اسکندریہ کے کتب خانے گیا اور اس نادر روزگار کتب خانے کو جلا کر راکھ کر دیا۔ حباطیا کا قصور یہ تھا کہ وہ علم اور خاص کر ریاضی کی دلدادہ تھی، نوجوان اور خوبصورت اور متمول خاتون تھی۔ وہ اپنے زمانے کے عظیم دانشوروں کی دوست تھی اور علم وکمال کے حصول کے لیے جیتی تھی۔ عیسائیت نے اپنے نئے مذہبی جوش میں یونانی علوم وتعلیم کو ملحدانہ عمل قرار دیا تھا اس لیے پادری سرل نے حباطیا کا سرعام بہیمانہ قتل کرایا اور کتب خانے کو جلوا دیا۔ برٹرنڈ رسل (Bertrand Russell) کا کہنا ہے کہ اس ایک واقعے کے نتیجے میں یورپ اگلے ایک ہزار سال کے لیے تاریکی اور جہل میں جا پڑا۔

"اللہ حافظ" کا انجام دل کو دہلانے والا ہے۔ مسعود اشعر کی کہانی بے شک سال کی بہترین کہانیوں میں شمار ہوگی۔ مسلمانوں کو فی زمانہ بہت سخت مطالعۂ باطن کی ضرورت ہے اور ان کے دانشور طبقہ کو حوصلے کی بھی بہت ضرورت ہے۔ ان کو جارحانہ بنیاد پرستی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی ہی ہوگی اور "اللہ حافظ" ایسی ہی ایک صدائے احتجاج ہے۔

نئی دہلی — انوار رضوی

● "شب خون" میں میرا یہ خط چھپ جائے تو وائے حسرت کہ یہ میرا آخری خط ہوگا۔ مسعود اشعر کے دونوں افسانوں "میں نے جواب نہیں دیا" اور "اللہ حافظ" پر اظہار خیال کر چکا ہوں۔ کیا خوب افسانے ہیں۔ فن کار نے نہایت ہی بلیغ اشاروں میں مذہبی کٹر پنتھیوں کا پول کھولا ہے۔ میں انھیں اردو کے اہم ترین افسانوں میں شمار کرتا ہوں۔ اس وقت مجھے سکندر احمد کے مضمون "افسانے کے قواعد" پر چند باتیں عرض کرنا ہیں۔ مضمون پڑھتے وقت مجھے خیال ہوا کہ میں نے ۱۴، ۱۵ سال کی عمر میں پہلا افسانہ لکھا تو اس وقت میں افسانہ کی مبادیات سے بھی واقف نہیں تھا۔ شاید اس کا شعور دوسروں کے افسانے پڑھ کر ہوا ہوگا لیکن اس وقت میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ افسانے میں پلاٹ کیا ہوتا ہے، ہوتا بھی ہے کہ نہیں؟ نہ ہی میں یہ جانتا تھا کہ برائیوں کے بغیر کہانی ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ میرے خیال میں عبادت بہ نفسہ نیکی نہیں ہے، نیکی کا وسیلہ ہو سکتی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو ماننا پڑے گا کہ نیکی کا تصور برائی ہی کے وجود سے ہے۔ سکندر احمد نے بات پکی اور سچی کہی ہے۔ آگے انھوں نے مزید کارآمد خیالات کا اظہار کیا ہے، جیسے: "افسانے میں وحدت تاثر ہوتی ہے اور افسانہ اپنے آپ میں ایک مکمل، ناشکستہ اکائی ہوتا ہے۔" لیکن جب وہ افسانے میں قواعد وضوابط کی بات کرنے لگے تو مجھے بے ساختہ ملیالم زبان کے وائکم محمد بشیر یاد آ گئے۔ ان کے بڑے بھائی انھیں ہمیشہ ٹوکا کرتے تھے کہ تمھاری زبان میں قواعد کی بڑی غلطیاں پائی جاتی ہیں اور یہ کہ افسانے کو یوں نہیں، یوں ہونا چاہیے۔ وغیرہ۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ وائکم بشیر اپنے بھائی کے مشوروں کی پروا کیے بغیر لکھتے رہے اور وہ ہندوستان کے چیخوف اور موپساں کہلائے جب کہ ان کے بڑے بھائی زندگی بھر ایک اسکولی استاد ہی رہے۔ کوئی بھی تخلیقی فن پارہ کسی قواعد وضوابط کے چوکھٹے میں جکڑا نہیں جا سکتا۔ وہ اپنے قواعد اپنے ساتھ لاتا ہے۔

اس کے باوجود سکندر احمد کی بہت سی وضاحتوں سے ہمیں اتفاق کرنا پڑے گا۔ مثلاً یہ کہ کہانی میں ایک سے زیادہ پلاٹ لائن ہو سکتی ہیں اور یہ کہ کسی افسانے میں اصل کے مقابلے میں فروعات زیادہ ہوتی ہیں اور کسی دوسرے افسانے میں اصل کا گراف بڑا ہوتا ہے۔ اس بات کو انھوں نے بڑے اور چھوٹے دائروں کی وساطت سے خوب سمجھایا ہے۔ لیکن طلب ورسد والی بات کا تعلق معاشیات سے تو ہو سکتا ہے فن کار کی طلب سے نہیں۔ تخلیقی لمحات طلب ورسد کے ناپ تول کے اسیر نہیں ہو سکتے۔ "شب خون" کے ۲۲ صفحات پر یہ مضمون پھیلا ہوا ہے۔ اسے اگر کتابی شکل میں شائع کیا جائے تو یہ کم از کم اسی، پچاسی صفحات لے گا اور ایک چھوٹی سی کتاب کا حکم رکھے گا۔

خلق خدا کا دکھ اتنا گہرا ہے کہ اس کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا۔ یہ برادری صرف پڑھنے اور سمجھنے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اپنے ردعمل کا اظہار بھی کرتی ہے۔ اس طرح کئی پڑھنے والوں کی تربیت بھی ہوتی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میں نے شمارہ ۲۹۲ میں کچھ زیادہ ہی جگہ لے لی ہے لیکن آپ تو کسی اظہار کو ادھورا یا مجروح ہونے نہیں دیتے۔

اس دفعہ مسعود بیک پر سوانحی گوشہ فکر انگیز ہی نہیں بلکہ کئی اختلافی مسائل پر بحث کی بھی دعوت دیتا ہے۔ لیکن اب "شب خون" کے بند ہو جانے پر خلق خدا کی محرومی کہ اس برادری کے لیے آپس میں تبادلۂ خیال کا موقع ہی نہ رہا۔ میں اس گوشے کو پڑھ کر تذبذب میں پڑ گیا۔ شاید یہ پہلا موقع ہے کہ "شب خون" میں تصوف کے موضوع پر کوئی تحریر شائع ہوئی ہے۔ حسن اتفاق کہ ادھر دو ڈھائی مہینوں سے تصوف پر چند اردو اور انگریزی کتابیں میرے زیر مطالعہ رہیں۔ سمندر کی تہ تو ناپی جا سکتی ہے لیکن تصوف کی گہرائی نہیں! اس کا سبب شاید یہ ہوگا کہ تصوف کوئی اجتماعی تحریک یا اجتماعی رجحان نہیں ہے۔ وہ ہر ذہین اور زیرک طبع شخص کو اس کی بھول بھلیاں میں داخل ہو کر منزل کا پتہ لگانے کا حوصلہ فراہم کرتا ہے۔ وہی جائے جسے منزل پانے کا جنون ہے۔ بہر حال، شاید اس سبب سے روحانیت کے مسائل شریعت سے کٹ جاتے ہیں۔ مسعود بیک کی "مرآۃ العارفین" ملفوظات کی تعریف میں تو نہیں آتی لیکن حضرت چراغ دہلی کا جو واقعہ انھوں نے بیان کیا ہے اسی طرح کا ہے جس طرح "کشف المحجوب" میں حضرت داتا گنج بخش نے حضرت بایزید بسطامی کے حوالے سے لکھا ہے۔ حضرت بایزید بسطامی نے ایک دن اپنے متعلق فرمایا: "میں پاک ذات ہوں۔ میری شان کا کیا کہنا!" (سبحانی ما اعظم شانی)۔ حضرت داتا گنج بخش آگے فرماتے ہیں: "یہ کہنے والا حق تعالیٰ ہے لیکن وہ عبد میں ہے۔" مسعود بیک کا ایک اور بیان "شب خون" میں درج ہے: "جاننے والا اور جو جانا جائے درحقیقت دونوں ایک ہی ہیں۔" یہ وحدت الوجودی مسلک ہے جو قرآنی آیات کے منافی ہے۔ خالق ومخلوق، یا فانی ولافانی، ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟ ویسے یاروں نے اسے بھی برحق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

حیدرآباد **قدیر زماں**

● "شب خون" ۲۹۰ میں "جدیدیت کل اور آج" کے عنوان لاہور میں آپ کی تقریر نے بہت متاثر کیا۔ اس باب میں آپ کے کئی مقالات و مباحث ایک عرصے سے نظر سے گذرتے رہے ہیں۔ آپ جس کشادگی اور وضاحت کے ساتھ اور جس منطقی و معروضی طور پر اپنے نکات کو اجاگر کرتے ہیں اس سے قارئین کے ذہن کی کئی الجھی ہوئی گرہیں یقیناً کھل جاتی ہیں۔ شعری حصے میں عشرت ظفر کی غزلوں نے خصوصاً متاثر کیا۔ ادم پربھاکر کی غزلوں میں ندرت اور تازگی متوجہ کن ہے۔ ساجدہ زیدی نے اپنی نظم میں معلوم الجھنوں اور استفہامیوں میں کچھ تھوڑا سا زاویہ بدل کر نیا رنگ اجاگر کردیا ہے۔ مصطفی ارباب کی نثری نظمیں نوک پلک سے درست ہیں۔ جہانگیری کی خوب صورت نظموں نے دل میں اک ہوک سے اٹھا دی کہ یہ پیارا شاعر اس قدر جلد ہم سے بچھڑ گیا۔ خدا اس کی روح کو آسودہ رکھے۔

ممبئی **عبدالاحد ساز**

● ندا فاضلی کی غزل نئی غزل کی سرشاری اور وضع داری میں اضافہ کررہی ہے۔ باقر مہدی کی دوسری نظم "میرا جنم دن" غالباً ان کے اندر کے روگ کا یوگ ہے۔ پرارتھنا ہے کہ خدا انھیں صحت کاملہ کے ساتھ اس روگ سے نکالے۔ جاوید شاہین، آفتاب حسین اور شاہین عباس خاصے منجھے ہوئے شاعر ہیں۔ اب کے بھی انھوں نے اپنی اپنی غزلیات میں غضب کے شعر اجالے ہیں۔ ادم پربھاکر نے بڑی تابندہ اور رخشندہ نظمیں کہی ہیں۔ برصغیر میں عورت پر جبر و استبداد کی پوری روداد ان نظموں میں آباد ہے۔

اب میں جس شاعر سے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں وہ ہیں جینت پرمار، بیک وقت مصور اور شاعر، فن کی دونوں بارگاہوں میں طاق اور مشاق مگر محبت کے معاملات میں بے تپاک۔ نہ خود خط لکھتے ہیں اور نہ احباب کے خطوط کا جواب دیتے ہیں۔ ان کی دس کی دس نظمیں اردو کی نئی نظم کی خوشبو اور آبرو سے مزین ہیں۔ فرخ یار کی دوسری اور آخری نظم، خیال کے عمدہ جمال کی مثال ہیں، ایک ناگہانی درد کی زندانی اور طوفانی نظمیں۔ شمیم حنفی نے منیر نیازی کے لئے خاصا امتیازی مضمون رقم کیا ہے۔ اسی طرح ضیاء الحسن نے جیلانی کامران کے لئے بڑا بابیچان مضمون لکھا ہے۔ جیلانی کامران ہمارے عہد کے مہان شاعر تھے۔ سوانحی گوشے قارئین کے درمیان قیمتی توشے تقسیم کررہے ہیں۔ یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہنا چاہیے۔

مسعود اشعر کی کہانی ان کی افسانوی معجز بیانی کی ترجمانی کررہی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا خطباتی مضمون کائناتی داد کا متقاضی ہے، بیحد جائز اور فائز۔ میں ذاتی طور پر تو نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان میں اردو کی کیا گت بن رہی ہوگی، مگر جذباتی اور تجرباتی طور پر یہ جانتا ہوں کہ اردو اسی خطہ میں نظر انداز ہورہی ہے جس کی مقامی زبانیں اس کی کاسہ لیسی کرکے اپنے گیان اور اپنی پہچان تک پہنچیں۔ فاروقی صاحب کا یہ مضمون وقت کی آواز بھی ہے اور اس آواز کا غماز بھی۔ آصف فرخی کا افسانہ "کہر" ادھر میں نے محمود واجد کے پرچے "آئندہ" میں پڑھا تھا۔ قند مکرر کے طور اس نے مجھے اتنا ہی مزہ دیا جتنا کہ پہلے اپنے اس شعر کی طرح ۔

یاد آئے تو مجھ کو بہت جب پو پھٹے جب شب کٹے
جب وادیوں میں دور تک کہرا دکھے بے انت سا

شکیل جہانگیری کا افسانہ، افسانے کی خوب رو اور مشکبو منازل کا متلاشی ہو رہا ہے۔ تحریر میں وہ تفسیر ہے جو مرگ ناگہانی کے مراحل کی جاگیر بنتی ہے۔ ہمیں تو وہ ایک دائم کہانی دے گئے مگر خود قائم نہ رہے افسوس صد افسوس۔

ساہی وال **ناصر شہزاد**

● جناب سید امین اشرف نے کلام حافظ کے فال نکالنے پر لکھا ہے کہ باوضو ہو کر دیکھنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر داہنے صفحے اور سات کے عدد کی شرط ان کی فہم کے بالاتر ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دیوان حافظ نعوذ باللہ قران ہے نہ شاہ ولی اللہ کی پیش گوئی۔ پھر ایسا کیوں ہے؟ لیکن کوئی بات تو ہے۔ اردو شاعری کی آبرو کلام غالب کی آفاقیت مسلم ہے، پھر اسے دیکھنے سے اس قسم کے نتائج کیوں نہیں برآمد ہوتے؟

اس سلسلے میں عرض یہ کرنا ہے کہ اگر باوضو ہو کر دیکھنا تسلیم ہے تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ کام کو داہنے طرف سے شروع کرنا سنت کا طریقہ ہے۔ رہا سات کا عدد تو یہ رمزیہ یا علامتی ہے۔ چنانچہ وقت جس کی ابتدا معلوم ہے نہ انتہا اس بظاہر لا محدود شے کو جب ہم نے شمار کی غرض سے محدود کرنا چاہا تو ہم نے سات کا ہی ہندسہ اختیار کیا۔ ہفتے میں سات دن ہیں، وہی سات دن بار بار اپنے کو دہراتے رہیں گے۔ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں، مثلاً سبع سموٰت۔ اللہ کے گھر کی پاسبانی کے لئے اگر ہم سات مرتبہ اس کے گرد چکر لگائیں تو یہ ابدی طور پر اپنے فریضے کی انجام دہی کے ہم معنی ہوجاتا ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب "خطبات بہاول پور" صفحہ ۲۱۵)۔ لامحدود صرف اللہ کی ذات ہے جس کی ابتدا معلوم ہے نہ انتہا۔ لہٰذا ساتویں شعر کی تلاش **بلسمک اللھم** کے ہم معنی ہوجاتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ کلام حافظ ہی کیوں، کلام غالب کیوں نہیں؟ اس کا جواب مراسلہ نگار نے خود ہی اپنے خط میں دے دیا ہے۔ شریعت میں قرآن کے علاوہ حدیث، اجماع و اجتہاد سے بھی نتائج اخذ کرنے کی اجازت ہے۔ لہٰذا اسے بھی ایک طرح کا اجماع کہہ سکتے ہیں۔

لکھنؤ **نجم فاروقی**

● میری سمجھ میں اب تک نہ آسکا کہ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے مابین وجہ الافتراق کیا ہے؟ دونوں ہی جدید تحریکیں ہیں۔ کیا وجہ الافتراق محض بھیمڑی کانفرنس ہے، یا کمیونزم یا مارکسزم سے نفرت؟ ایک ترقی پسند ادیب سوویٹ کمیونزم کو مکمل طور پر رد کر کے بھی نظریاتی طور پر ترقی پسند رہ سکتا ہے۔ ہر وہ فرد میرے حساب سے ترقی پسند ہے جو انسان کی معاشی و معاشرتی بھلائی کا خواہش مند ہے، جو بنی نوع انسان کو منزل سعادت کی جانب چلاتے رہنے کا خواہش مند ہے، اور جو ادب اور دیگر فنون میں نئے تجربات سے دوچار ہونے کا خواہش مند ہے۔ کرشن چندر اور مخدوم محی الدین اتنے ہی جدیدیت کے نمائندے ہیں جیسے راشد اور قرۃ العین حیدر۔ دراصل جھگڑا تنگ نظری اور فلسفیانہ بنیادوں سے ناواقفیت کا ہے۔ ممتاز حسین کیوں کر شمس الرحمٰن فاروقی سے بہتر یا بدتر ہوسکتے ہیں؟

غلطی کرنا ذہن انسانی کا خاصہ ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم حضرت نظام الدین اولیا کی سی وسعت قلب، رواداری، اور انسانیت کو ذرا بھول گئے ہیں، دوڑ لگا کر درخت کے میٹھے پھل پر قبضہ کرلینے کی سعی میں ہوش وحواس کھو کر جامۂ زریں کو سنبھالنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔

مابعد جدیدیت کے مریدین سے ایک زبردست غلطی سرزد ہوگئی کہ انھوں نے اس تحریک کو جدیدیت کی عین ضد گردانا۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس تحریک کے فرانسیسی حامیوں نے اس قسم کا اعلان کبھی نہیں کیا۔ وہ انتہائی ذہین تھے، عمدہ فرانسیسی لکھا کرتے تھے، بنیادی طور پر سوویت کمیونزم سے بدظن تھے۔ یہ لوگ آندرے ژید (Andre Gide) اور آرتھر کوسلر (Arthur Koestler) کے مانند نہ تھے۔ فرانسیسی مابعد جدیدیوں سے کئی غلطیاں سرزد ہوگئیں۔ اول، وہ روشن خیالی، عظمت پرستی اور سائنسی طرز فکر کے یکسر مخالف ہوگئے، گو تھے وہ اسی دنیا کے پروردہ، اور اسی کے اصول وضوابط کو کام میں لایا کرتے تھے۔ دوم، متن خواہ ستارہ شناسوں کی شعبدہ بازیاں ہوں، چاہے شیکسپیئر کے ڈرامے، چاہے حسن وعشق کی کشمکش، سب کو قاری اپنے طور پر پڑھنے کی قوت رکھتا تھا، یعنی بقول فوکو (Michel Foucault) ایک وسیع کتب خانہ تھا جہاں سے قاری اپنی پسند کے متون دستیاب کرسکتا تھا۔ سوم، اگر قاری یوں آزاد تھا، تو پھر معنی لایعنی سی شے ہوجاتی ہے۔ جو چاہے، جس طور پر چاہے، جن نفسیاتی پس وپیش کے پس منظر میں چاہے، معنی اخذ کر سکتا تھا۔ سوم، منشائے مصنف کی کوئی اہمیت نہیں، گویا شیکسپیئر کا "ہیملٹ" جس سے بہتر تحریر آج تک رقم نہیں ہوئی ہے، مصنف سے الگ، خود بخود وجود میں آ بھی گیا ہے اور موجود بھی ہے۔

آپ نے شمارہ ۲۹۱ میں محمد حسن عسکری صاحب کے ایک مکتوب کا عمدہ اقتباس شائع کیا ہے۔ پچھلے شمارے میں جناب آصف فرخی صاحب کا عمدہ مضمون تھا۔ گاہے گاہے آپ عسکری پر مضامین شائع کیا کرتے ہیں، کہ آپ ان سے دلی عقیدت رکھتے ہیں۔ ایک لاجواب نقاد دوسرے لاجواب ناقد کی یوں توصیف کرے، بڑی بات ہے۔ عسکری صاحب کے بارے میں میں گومگو میں مبتلا رہا ہوں۔ میں نہیں کہتا کہ میں نے ان کی جملہ تحریروں کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوا کہ موصوف نے عمر کا زیادہ حصہ شذرات ہی لکھنے میں صرف کیا۔ ان کے زیادہ تر مضامین جو میں نے دیکھے ہیں مجھے شذرات کی اعلیٰ قسم سے لگے۔ عسکری مرحوم ازحد ذہین تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ وہ بے باک و خوددار تھے۔ لیکن مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوا کہ انھوں نے ٹھوس کام نہیں کیا، جیسے مثلاً کلیم الدین احمد نے کیا تھا۔ انھوں نے ہمیشہ ایورسٹ کی بلندیوں سے راندۂ درگاہ طلبا کو مخاطب کیا اور ورجینیا وولف (Virginia Woolf) کے ہاتھی دانت کے مینار (Ivory Tower) میں ہی جلوہ افروز رہے۔ ہر کوئی ڈاکٹر جانسن، یا کم وبیش قاضی صاحب، نہیں بن سکتا۔ کولرج بننے کی سعی کرسکتا ہے۔

میں ہرگز ہرگز یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ عسکری صاحب نے کوئی خاص کام نہیں کیا۔ بلاشبہ وہ ایک معتبر، پڑھے لکھے جدید نقاد ہیں، جن کی سعی رہی کہ وہ ان دروازوں کو کھولیں جنھیں ان سے پہلے کے نقادان فن وا کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ان کا ذہن صاف تھا اور جولانی طبع ولولہ خیز۔ وہ اور فراق صاحب غالباً ان اولین نقادوں میں سے ہیں جنھوں نے جدید شعرا اور قارئین کی آنکھیں بسلسلۂ میر کھولیں۔ اپنے وقت میں انھوں نے زبردست افسانے تحریر کیے اور افسانوں پر عمدہ تنقید کی ہے۔ محض ناک سکوڑنا ان کی سرشت میں نہ تھا۔ ان کی ناقدانہ عظمت سے ہرگز انکار مقصود نہیں۔

کولکتہ — حبیب حق

● شمارہ ۲۸۸ اور ۲۸۹ میرے سامنے ہیں۔ "افسانے کے قواعد" پڑھا۔ اس معرکۃ الآرا مضمون کو پڑھ کر محسوس ہوا کہ افسانوی تنقید نے اب آخر ایک کروٹ بدلی ہے کہ لوگ چونک اٹھیں گے۔ آپ کا مضمون "امیر خسرو اور ہم" بھی معرکے کی چیز ہے۔ ارمان نجمی کی دو نظمیں بھی خوب ہیں۔ ۲۸۹ میں وارث کرمانی کی "گھومتی ندی" (آٹھواں باب) بھی غضب کی چیز ہے۔ اس کی ہر قسط بلند سے بلندتر پائے چھوتی دکھائی دیتی ہے۔

پٹنہ — احمد یوسف

● شمارہ نمبر ۲۹۱ میں جو ادب پارے انتخاب کیے گئے ہیں وہ سب "شب خون" کے پڑھنے والوں کے شایان شان ہیں۔ آپ نے اپنے پڑھنے والوں کا معیار اور ذوق اتنا بلند کر دیا ہے کہ "شب خون" کی اشاعت رک جانے کے بعد وہ اپنے ادبی مطالعے کی پیاس بجھانے کے لئے پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹکیں گے۔ اس بار "سوانحی گوشے" کے لئے اقتباسات میکش اکبرآبادی کی کتاب "آگرہ اور آگرہ والے" سے لئے گئے ہیں۔ میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے اپنے پڑھنے والوں کے لئے کتاب سے بہترین اقتباسات کا انتخاب کیا۔ میں ایک عرصے سے غزل میں استعمال ہونے والے ایسے قافیوں کے بارے میں سوچتا رہا ہوں جو غلط نہ ہونے کے باوجود بھی غلط جیسے لگتے ہیں۔ اس مسئلے کی طرف فانی صاحب کے حوالے سے میکش صاحب نے اپنی کتاب میں اشارہ کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں غزل کہنے کا مطلب ہے غزل کی تمام تر پابندیوں اور بندشوں کے ساتھ شاعری کرنا۔ غزل میں ایسا کوئی لفظ نہیں آنا چاہئے جو غزل کے مزاج پر گراں گذرے۔ آپ نے خود کیا خوبصورت بات اپنی تقریر میں کہی ہے جو "شب خون" کے شمارہ نمبر ۲۹۰ میں شامل اشاعت ہے کہ "جب تک شعری تقاضے پورے نہیں ہوتے کوئی شعر، شعر نہیں ہوسکتا۔" غزل میں یہ پابندی بھی ہونی چاہئے کہ صرف "ہم وزن وہم آواز" قافیے ہی غزل میں استعمال کئے جائیں۔ جیسے ردیف ہے "گئے"، اور قافیہ ہے "کھلکھلانے"، تو ہم وزن اور ہم آواز ردیف قافیہ ہوا "جھلملانے" مگر لوگ "آنے، ولانے" بھی استعمال کرلیتے ہیں۔ ایسے قافیے جو ہم وزن تو ہوتے ہیں مگر "ہم آواز" نہیں ہوتے جیسے "ہمت" کے ساتھ "صداقت"، یہ غلط تو نہیں ہے مگر غزل جیسی نازک صنف کے ساتھ یہ غلط سا لگتا ہے۔ غزل پابندیوں کا نام ہے، اسی لئے فانی صاحب کو بھی "جانتا" کے ساتھ "دیکھتا" میں نقص نظر آیا۔

اس بار میں نے یہ طے کرلیا تھا کہ میں "شب خون" میں شائع شدہ کسی تخلیق کے بارے میں کچھ بھی نہ لکھوں گا کہ پچھلے شماروں میں میرے خط متواتر

شائع ہوتے رہے ہیں۔ ممکن ہے کسی کو میرے خطوط سے یہ محسوس ہونے لگا ہو کہ مجھے ظفر اقبال صاحب سے کوئی ذاتی پرخاش ہے۔ مگر نہ چاہتے ہوئے بھی میں ان کی تخلیقات کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ تازہ شمارے میں جس تخلیق نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ اقبال مجید کا افسانہ "رمنہ" ہے۔ یہ افسانہ طویل ہوتے ہوئے بھی بہت مختصر لگا کہ ابھی کچھ اور اسے لکھا جانا باقی ہے اور یہ اپنے اختتام تک بھی مکمل نہیں لگتا ہے۔ ظفر اقبال کے مختصر مضمون "جدید غزل اور معنی کا معاملہ" سے مجھے کوئی شکایت نہیں کیوں کہ اس مضمون کی زیادہ تر باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ مگر یہ خوب رہی کہ ظفر اقبال صاحب نے ایک مصرع کسی کا اور دوسرا کسی اور کا ملا کر اپنے مطلب کا شعر بنالیا۔ اس پر ادارے کا نوٹ بہت خوب ہے۔ خطوں میں ایک مختصر خط محمد عابد علی عابد کا ہے جناب نے یہ تو صحیح لکھا ہے کہ ہاتھ کاندھوں پر رکھا جاتا ہے مگر ان کو یہ کیسے سمجھایا جائے کہ بازو "پر" ہاتھ نہیں رکھا جاسکتا، بازو کو پکڑا جاسکتا ہے۔

پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ زاہدہ زیدی کی دونوں نظموں نے مجھے متوجہ کیا۔ مگر شمیم حنفی کی غزل پڑھی تو ان کے مصرعے "وہ دور کنارہ ہے وہیں جا کے رکیں گے" کے ساتھ ہی شکیب جلالی کا شعر یاد آ گیا

وہیں پہنچ کے گرائیں گے بادباں اب تو
وہ دور ایک جزیرہ دکھائی دیتا ہے

کسی شعر کے مضمون سے متاثر ہونا کوئی بری بات نہیں مگر "کنارے" کا تعلق تو سمندر سے ہوتا ہے "بستی" سے نہیں۔

اودے پور — شاہد عزیز

● قافیے کے جو اصول جناب شاہد عزیز نے بیان فرمائے ہیں وہ دلچسپ تو ہیں لیکن کلاسیکی علم قافیہ پر مبنی نہیں ہیں۔ "جھلملانے/کھلکھلانے" قافیے بالکل درست ہیں، لیکن "جھلملانے/آنے"، "جھلملانے/دلانے" قافیے بھی درست ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ اگر مطلع میں قافیے "جھلملانے/کھلکھلانے" یا "جھلملانے/دلانے" رکھے گئے ہیں تو باقی غزل میں بھی "لانے" کو مقید قرار دے کر تمام قافیے ایسے ہونے چاہئیے جن میں "لانے" کا ماقبل حرف مکسور ہو، مثلاً "تلملانے/بلبلانے/کھلانے" وغیرہ۔ لیکن اگر مطلع غزل میں قافیہ "جھلملانے/آنے" وغیرہ ہے، یعنی "لانے" کو مقید نہیں رکھا گیا، اور نہ اس کے ماقبل حرف کو مکسور مقید کیا گیا، تو یہ قافیے بالکل درست ہیں اور باقی غزل میں "کھلکھلانے/جانے/پانے" وغیرہ قافیے ہو سکتے ہیں۔ "صداقت/ہمت/محبت/است" وغیرہ قافیے بھی بالکل صحیح ہیں۔ فنی صاحب کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ "جانتا/دیکھتا" میں "تا" مشترک تھا، لیکن اس کے ماقبل کا حرف ساکن ہونے کی وجہ سے قید پوری نہیں ہوتی اور قافیہ غلط ہو جاتا ہے۔ "جانتا/مانتا" درست قافیے ہیں اور "دیکھتا/پھینکتا/سینکتا" بھی درست ہیں۔ "جانتا/دیکھتا" درست نہیں ہیں۔

الہ آباد — شب خون

● سونامی قہر سے منسوب نئے "شب خون" (۲۹۱) کا سرورق شاداب مسیح الزماں کے حساس ذہن کی غمازی کرتا ہے اور "شب خون" کی عظمت کو زیب دیتا ہے۔ مسعود اشعر کے گذشتہ افسانے "اللہ حافظ" کی طرح ان کا تازہ افسانہ "ناخواندہ ورق" بھی زندگی میں ناآسودگی اور ریاکاری کا سچا اظہار ہے۔ اردو کی بقا کے لئے اسکولی تعلیم کی اہمیت کو آپ نے ذاکر حسین یادگاری خطبے کے وسیلے سے جس مدلل اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے اس سے کسی روشن دماغ کو انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ آج اردو زبان و ادب کا مستقبل ایک اہم سوال بن کر ہمارے سامنے آ گیا ہے جس کے حل کے لئے اسکولی تعلیم کی طرف عملی توجہ کی خاص ضرورت ہے۔ شمیم حنفی کے قلم سے منیر نیازی کی شاعری کا بصیرت افروز جائزہ اچھا لگا۔ آصف فرخی کا افسانہ "کہر" بھی خاصے کی چیز ہے۔

کولکتا — جعفر ساہنی

● نیب الرحمٰن کا مضمون جذبی صاحب سے ان کے دیرینہ مراسم کے پس منظر میں کچھ بجھا بجھا سا لگتا ہے۔ آپ کی رباعیاں "چار سمت کا دریا" کی یاد دلاتی ہیں۔ "امڈا ہے چار سمت کا دریا آ"۔ شمیم حنفی صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اتنی خوبصورت غزل کے ساتھ، سید خالد قادری کے علاوہ میر نام بھی لکھ دیا۔ ان تخلیقات کے علاوہ عرفان ستار، زاہدہ زیدی، شفیق فاطمہ شعریٰ، تقی حسین جعفری، غلام مرتضیٰ راہی، غلام حسین ساجد اور مدحت الاختر کی غزلیں پسند آئیں۔ جہاں تک ظفر اقبال کا سوال ہے، اتنے اچھے شاعر کے کلام میں فنی اسقام کی تلاش مجھے ایک بے فیض سا عمل لگتا ہے۔

حیدر آباد — مصحف اقبال توصیفی

● "شب خون" کے بند ہونے کی خبر بہت ہی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ اتنا خوبصورت اور معیاری پرچہ میں نے آج تک نہ دیکھا ہے نہ سنا ہے۔ اب ہم خوبصورت اور معیاری نظمیں غزلیں افسانے اور مضامین کہاں پڑھیں؟ یوں ادبی ماہنامے تو ہمارے یہاں کئی ہیں لیکن خالص اور معیاری ادب کا ترجمان پرچہ میری نظروں میں تو اس وقت کوئی نہیں ہے۔

"شب خون" میں کتنی گونا گونی ہے اس کی مثال تازہ شمارے کی غزلوں سے ایک ہی مضمون یعنی "فرصت" پر تین شاعروں کے تین شعر نقل کرتا ہوں

تمھیں فرصت ہو دنیا سے تو ہم سے آ کے مل لینا
ہمارے پاس فرصت کے سوا کیا رہ گیا ہے
(عرفان ستار)

محبت میں نہ جانے کیوں ہمیں فرصت زیادہ ہے
ہمارا کام تھوڑا ہے مگر مہلت زیادہ ہے
(شاہین عباس)

کوئی بھی کام نہیں ہو سکا ہے فرصت میں
کہ کم پڑے ہیں بہت ماہ و سال میرے لئے
(ہمدم کاشمیری)

جموں — آفاق بھٹی

• یہ خبر اندوہناک ہے کہ جون ۲۰۰۵ کے بعد رسالہ شائع نہ ہوگا۔ بہت دیر تک میں اس خبر کو ذہن سے جھٹکتا رہا اور دھیان کو کسی دوسری طرف لگانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن آپ سے ایک ناقابل بیان جذباتی تعلق کی بنا پر خاموش نہ رہا گیا۔ سوچ رہا ہوں کیا لکھوں، کہاں سے شروع کروں، کہاں ختم کروں، اور آپ سے کیا کہوں کہ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے پر مائل ہوجائیں؟ اس جریدے نے آپ کی قابلیت اور زورِ قلم کے سبب اردو دنیا میں ایسا رتبہ حاصل کرلیا ہے کہ آپ کے بے شمار قدرداں (جن میں میں بھی شامل ہوں) ''شب خون'' کے بند ہوجانے کا غم بہت زمانے تک برداشت نہ کرپائیں گے۔

اگر مال وزر کا معاملہ ہے جس کی کمی (شاید میرا قیاس غلط ہو) اس کی ہلاکت کا باعث ہو رہی ہے، تو میں فی الفور آپ کو ۵۰۰۰۰ (پچاس ہزار) روپے کا چیک روانہ کردوں گا تاکہ یہ صحیفہ اسی آن بان کے ساتھ برصغیر میں اردو زبان کے سر کا تاج بنا رہے۔

ایک خیال یہ آتا ہے کہ شاید آپ کی صحت اس اعلان کی وجہ ہو۔ تو یہ مسئلہ اس طرح حل ہوسکتا ہے کہ آپ ایک نئی تشکیل کردیں، کچھ صفحات کم کردیں اور اپنے مقررہ معیار کے مطابق ''شب خون'' جاری رکھیں۔ الٰہ آباد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو آپ کی سربراہی میں نہایت عمدہ طریقے سے ''شب خون'' جاری رکھ سکتے ہیں۔ میں ہر چھ مہینے کے بعد آپ کو مبلغ ۵۰۰۰۰ (پچاس ہزار) روپے کا چیک بھیجتا رہوں گا تاکہ آپ کا لگایا ہوا یہ درخت سارے عالم میں آپ کی شہرت پھیلاتا رہے۔

نئی دہلی — طاہر صدیقی

• یہ مت سمجھئے کہ آپ کی طرف سے غافل ہوں۔ اور غافل آپ کی طرف سے رہ بھی کیسے سکتا ہوں۔ اب تک یہ ہوتا رہا کہ ہر مہینے یاروں نے پوچھنا کہ ''شب خون'' آیا؟ نہیں آیا۔ کب آئے گا؟ پھر کوئی آکر بتاتا کہ آیا ہے۔ آپ کو نہیں ملا؟ نہیں۔ کیوں نہیں ملا؟... بس ایک ہی تو رسالہ تھا کہ اس کا اس شدت سے انتظار کیا جاتا تھا۔ پھر اس کی آمد کی خبر شہر میں افواہ کی طرح پھیلتی تھی۔ آپ کو عجب وقت میں عجب سوجھی۔ ارے بھائی، یہ تو پلوں کی تعمیر کا موسم ہے۔ یار لوگ اپنے اپنے رنگ میں ہندوستان پاکستان کے درمیان پل بنا رہے ہیں۔ آپ کے جی میں کیا آئی کہ اچھی بھلی پلیا کو توڑ ڈالا۔ اس پلیا کے ہوتے ہوئے مجھے الٰہ آباد کتنا قریب نظر آتا تھا۔ اور میرے ساتھ تو معاملہ ایک اور بھی تھا۔ میرے لئے تو ''شب خون'' الٰہ آباد کے امرودوں کا بدل تھا۔ الٰہ آباد کے امرود نہ کھائے، ''شب خون'' پڑھ لیا۔ الٰہ آباد کے پاس اکبر الٰہ آبادی اور امرود تو پہلے ہی سے تھے۔ اب اس میں ''شب خون'' کا اضافہ ہوگیا تھا۔ مگر اب پھر کر اس نگر کے پاس وہی دو چیزیں رہ گئیں، اکبر الٰہ آبادی اور امرود۔ انھیں کو دھرو اور اٹھاؤ۔

اب شہر میں جس سے ملو پوچھتا ہے۔ کیا واقعی ''شب خون'' بند ہو رہا ہے۔ اچھا؟ واقعی؟

مرنا بھی میرجی کا تماشا سا ہوگیا

اب تک یہ ہوتا آیا تھا کہ ادبی رسالے دھوم سے شروع ہوتے تھے اور خاموشی سے بند ہوجاتے تھے۔ کبھی کسی بھلے مانس مدیر نے نہ بتایا کہ ہم بھر پائے، اب رسالے کو بند کررہے ہیں۔ آپ پہلے مدیر ہیں کہ اپنے ''شب خون'' کو ڈنکے کی چوٹ بند کررہے ہیں۔ ٹھیک کررہے ہیں۔ عاشق کا جنازہ نکلنا ہی ہے تو پھر دھوم سے نکلے۔ جب اس نے جاری رہتے ہوئے ہماری دنیائے ادب میں اتنی دھوم مچائی تھی تو مرتے ہوئے بھی تو دھوم مچانی چاہئے۔ دل میں ہم نے سوچا کہ ع

تو بھی تقریب فاتحہ کو چل

تو لیجئے ایک ٹوٹی پھوٹی کہانی نذر ہے۔ آخر یہ اختتامی شمارہ ہے۔ یہاں آکر اتنے سالوں کی تاریخ جو اپنی آغوش میں کتنے ادبی معرکوں، تنازعوں، شہپاروں کو لئے ہوئے ہے، تمام ہوتی ہے۔ اس کے آخری ورق پر میرا نام بھی تو درج ہونا چاہئے۔

والسلام۔ ''شب خون'' کو سلام آخر۔

لاہور — انتظار حسین

• دو صدمے ایسے پہنچے کہ میں اب تک ابھر نہیں پایا۔ ایک تو مشفق خواجہ کا انتقال اور دوسرا ''شب خون'' کے بند ہونے کا اعلان۔ اتفاق سے دونوں کا تعلق اپنی اپنی طرح مجھے ادب فراہم کرنے کا تھا۔ خواجہ صاحب نہ ہوتے تو میں پوری زندگی پاکستانی ادب سے بے بہرہ رہتا۔ یہی نہیں، پاکستان میں مجھے روشناس کرانے کا سہرا بھی انھی کے سر ہے۔ ''شب خون'' نہ ہوتا تو شاید میں ادب میں آتا ہی نہیں، نقاد بنتا ہی نہیں، کیونکہ ہر شخص ایک ایک موج کے سہارے ان پچھلے پانیوں سے، جن میں وہ تیر رہا ہوتا ہے، ابھر کر آتا ہے اور فکر و نظر کے ان نئے جزائر کی سیر کرتا ہے جن سے یہ موج ہو کر گزرتی ہے۔ ''شب خون'' کے صفحات سے اٹھی ہوئی جدیدیت کی تحریک ایسی ہی موج تھی۔

لیکن یہ تو ایک معمولی بات ہے کہ ''شب خون'' کی وجہ سے میرا ورود نامسعود ادب میں ہوا۔ اہم بات تو یہ ہے کہ ''شب خون'' ایک ایسا رسالہ ہے جس میں بیسویں صدی کی نصف آخر کی روح عصر جھلکتی ہے۔ کسی ایک رسالے میں پورا دور سما جائے، اس کے اہم ترین ادبی اور تہذیبی رجحانات کے ساتھ، اس کے اعلیٰ ترین تخلیقی اور تنقیدی کارناموں کے ساتھ، یہ کسی بھی رسالے کے لئے بڑے فخر کی بات ہوسکتی ہے۔ جدیدیت ''شب خون'' میں ثابت اور سالم رہی۔ اس نے آرٹ

کی خودمختاری، تخیل کی آزادی، اور موضوع اور ہیئت کی یک آہنگی پر زور دیا۔ اس نے فرد کی تنہائی، اس وسیع، مخالف اور خاموش کائنات میں فرد کے اجنبی، المناک، تنہا، بے مقصد اور بے معنی ہونے کے احساس کو شعروں میں ڈھالنے کے پیرائے بجھائے، اعلیٰ ادبی کلچر کی جمالیاتی قدروں کا تحفظ کیا، ریاستی کلچر، کمرشیل کلچر، مذہبی فنانسزم کا لایا ہوا فرقہ پرستانہ کلچر، سب کی مخالفت کی۔ اس بات پر زور دیا کہ کوئی بھی سیاسی سماجی اخلاقی مسئلہ ہو، آرٹ کی مصفا دو آتشہ شراب میں ڈھل کر، گھل کر، حل ہو کر آرٹ کا مسئلہ بن جاتا ہے، جس پر غور کرنے کے آداب وہ نہیں ہیں جو مدرسانہ تنقید، سماجی تنقید، سیاسی تنقید ہمیں سکھاتی ہے۔ اسی لئے جدیدیت کی زقند ایک بڑی زقند تھی۔ اتنی بڑی کہ ابھی تک ہم اسی کی فضاؤں میں اڑ رہے ہیں۔

خط لکھنے میں میرا تساہل ایک بری خبر کو ٹالتے رہنے کا بہانہ تھا۔ ہر پرچے میں اس خبر کا انتظار تھا کہ بحران کی گھڑی ٹل گئی اور ''شب خون'' جاری رہے گا۔ لیکن بند ہونے کی گھڑی آ ہی گئی۔ پتہ نہیں اس خلا کو اردو والے کیسے برداشت کریں گے۔ اور سب سے زیادہ فکر تو مجھے تمھاری ہے کہ تم تو ''شب خون'' کے ایک ایک صفحے، ایک ایک سطر میں سانس لیتے تھے۔ پرچے کے ذریعہ پورا مہینہ تم سے باتیں کرتے گذرتا تھا۔ تمھاری ذات سے پورا پرچہ آئینہ خانہ تھا۔ اب محسوس ہوگا کہ ہم وقت کی کال کوٹھری میں مقید ہو گئے ہیں۔ خدا ان صبر آزما دنوں کو ہم پر آسان کرے۔

احمد آباد — وارث علوی

● سنجیدہ ادب کے ہر قاری پر ''شب خون'' کی بندش کی خبر بجلی بن کر گری ہے۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مستقبل میں کبھی اس تاریخ ساز کامیاب جریدے کی بندش کی نوبت آسکتی ہے۔ آپ نے عین عروج پر اسے بند کرنے کا اعلان کر کے ادبی دنیا کو سکتے کا شکار کر دیا ہے تو یقیناً اس کی غیر معمولی وجوہات ہوں گی اور بلاشبہ آپ کا فیصلہ راست ہونے کے باوجود آپ کے لیے بھی مشکل ضرور رہا ہوگا۔ ویسے تو ''شب خون'' کے تمام احباب کی طرح میری بھی یہی خواہش ہونی چاہیے کہ آپ اسے کسی نہ کسی طور جاری رکھیں۔ اس سلسلے میں آپ کو بہت سی تجاویز موصول ہو رہی ہوں گی اور یقیناً ان میں سے کئی قابل عمل بھی ہوں گی اور بعض ایسی بھی ہوں گی جو آپ کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے پر آمادہ بھی کر لیں۔ لیکن مجھے اندازہ ہے کہ آپ فیصلہ تبدیل نہ کر پائیں گے، کیونکہ کوئی بہت بڑا مقصد ہی آپ کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر رہا ہوگا اور وہ مقصد یقیناً ''شب خون'' سے کہیں بڑا ہوگا۔ یوں ادب تو بہر حال فائدے میں رہے گا، البتہ ہم ادیبوں کا جو نقصان ہوگا اس کی تلافی کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی۔ شاید آپ واحد مدیر اور ادیب ہیں جن کی شناخت ادارت سے نہیں تنقید و تخلیق سے قائم ہے۔ (''شب خون'' کا طاقتور دیو بھی آپ کی علمی ادبی شناخت پر شب خون نہیں مار سکا ورنہ بڑے بڑے لوگ اپنے رسالے کے سائے تلے آ گئے۔) یہ ایک ادیب کی داخلی ضرورت کا معاملہ بھی ہے اور خارجی ترجیحات کا سوال بھی۔ ''شب خون'' نے اپنا تاریخی کردار نبھانے کے بعد رخصت چاہی، حیرت زدہ کیا اور اداس چھوڑ گیا۔

اسلام آباد — علی محمد فرشی

● فاروقی صاحب، آپ نے اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے۔ کوئی ناگہانی حادثہ، کوئی غیر متوقع سانحہ، کوئی ناخوشگوار واقعہ، کوئی جاہا ان چاہا تنازعہ، کسی معقول یا نامعقول وجہ، کسی قابل قبول یا ناقابل قبول جواز، کسی قوی حیلے، یا عذر لنگ کا کہیں کوئی اتا پتہ نہیں۔ کچھ بھی نہیں، نہ استعاراتی انداز بیان نہ علامتی پیرایۂ اظہار۔ سیدھے سادے غیر جذباتی قطعی تجارتی، سپاٹ اور ٹھیٹ لہجے میں بس لکھ دیا کہ چالیسویں (جیسے ہمارے ہاں چہلم کیا جاتا ہے) سال کا پہلا شمارہ ''شب خون'' کی زندگی کا آخری شمارہ ہوگا۔ اور اس گردن زدنی محضر نامے پر آپ تمام بندگان خدا یعنی پروردگاران ''شب خون'' نے بیک قلم دستخط ثبت فرما دیئے۔

شدت جذبات میں سرزد ہونے والی گستاخیوں کے لیے پیشگی معذرت طلب کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ آپ کو بیٹھے بٹھائے بالآخر یہ کیا سوجھی اور کیوں سوجھی؟ حضور والا، ایسے سخت، اسقدر ظالمانہ اور جابرانہ، اتنے بے رحمانہ فیصلے اور عمل درآمد سے قبل آپ نے اتنا بھی نہ سوچا کہ ''شب خون'' کو ختم کر کے آپ کتنے جاری و ساری سلسلوں کو ختم کرنے جا رہے ہیں؟ مجھ جیسے کتنے ناتوانوں کی سانسیں رک جائیں گی؟ آپ ''شب خون'' بند کر کے تشنگان علم پر فرات علم و دانش کو مستقلاً بند کرنے کا اقدام فرما رہے ہیں۔ آپ سراسر بلا ضابطہ ہزاروں دلدادگان فکر و فن کو بے جرم و خطا اس محور و مرکز فکر و فن سے محروم کر دینے کی سزا دینا چاہتے ہیں جس سے وہ پچھلے چالیس برسوں سے اکتساب فیض کر رہے تھے۔ آپ کو بالآخر کس نے یہ حق دیا ہے؟ خیر اگر آپ کسی طرح سزا یا جزا دینے کے لیے مامور کیے بھی گئے ہیں تو کیا آپ کو یہ بھی اختیار حاصل ہے کہ آپ بے جرم و خطا ہم جیسے بے خطاؤں، بے گناہوں اور معصوموں کو تختۂ محرومی پر چڑھا کر مصلوب کر دیں؟ جرم و خطا کا ثبوت فراہم کیے بغیر تو دنیا کے کسی بھی دستور میں سزا کے احکامات جاری کرنا روا نہیں۔ پھر آپ ''شب خون'' کا قتل ناحق فرما کر کیوں اتنے سارے شائقین کو سزائے محرومی دینے کے درپے ہیں؟

مجھ جیسے، بلکہ اس معاملے میں مجھ سے بدرجہا بہتر قربانیاں دینے والے سیکڑوں ہزاروں ہوں گے۔ آپ کو اگر ''شب خون'' کے لیے اس کے دیوانوں کی مزید قربانیاں درکار تھیں تو ایک آواز لگا دیتے اور دیکھتے کہ کئی سرفروش لبیک لبیک! کہتے ہوئے سر ہتھیلیوں پر لیے حاضر ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے کسی ہنگامی صورت حال نے آپ کو یہ انتہا پسندانہ فیصلہ کرنے پر مجبور کیا ہو۔ وہ صورت حال عارضی بھی تو ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں آپ کے جارحانہ فیصلے کو کم از کم مجھ جیسا ناقص الفہم تو دانشمندی سے تعبیر نہیں کر سکتا (حالانکہ آپ کی دانشمندی پر انگلی اٹھانا میرے نزدیک گناہ عظیم کے مترادف ہے)۔ قانونی اعتبار سے آپ ''شب خون'' کے مالک و مختار کل سہی، قلبی، روحانی اور جذباتی اعتبار سے ''شب خون'' تمام ارباب اردو کی ملکیت بن چکا ہے۔ لہٰذا کیا عوامی ملکیت کے بارے میں کوئی قطعی اور حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے عوام کی رائے جان لینا ضروری نہیں؟ اگر ''شب خون'' ختم ہو جاتا ہے تو باقی کیا رہ جاتا ہے کہ ہم ناز کر سکیں؟ لے دے کر اب یہی ایک پرچہ تو رہا ہے جسے ہم اردو شعر و ادب، اردو تہذیب و ثقافت کی آبرو، وقار، اردو صحافت کی آن بان اور شان یا پہچان، جو چاہیں سو کہا جا سکتا ہے۔ اگر یہ بھی ختم ہو گیا تو کیا رہ جائے گا؟

اب کیا یہ بات بھی یاد دلانی ہوگی کہ ''شب خون'' کو آپ نے محض

ایک رسالہ نہیں رہنے دیا۔ "شب خون" جدیدیت کی انقلاب آفریں تحریک کا بانی رہنما اور معلم ہی نہیں، تربیت گاہ بھی رہا ہے۔ آپ نے اس کے وسیلے سے اردو شعر و ادب میں جاری و ساری بوسیدہ رجحانات اور سکہ بند نظریات کے دھاروں کو موڑ کر ایک نیا رخ جدیدیت کے نام سے دیا۔ آپ نے چار دہائیوں تک اس پرچے کے وسیلے سے تمام اردو دنیا کے تخلیق کاروں، تنقید نگاروں اور تحقیق کرنے والوں کی ذہن سازی کی ہے۔ خود میں نے کبھی اس پرچے میں اپنی کسی تخلیق کے چھپنے کے لیے اصرار نہیں کیا کہ جانتا تھا "شب خون" میں شامل ہونے والی تخلیقات کا ایک مخصوص مزاج، ایک خاص رنگ و آہنگ، ایک منفرد ذائقہ ہوتا ہے۔ جن تخلیق کاروں نے اپنے ذہنوں میں معیار اور مزاج و آہنگ کے ان سانچوں کو خاص ترتیب، تہذیب اور تربیت کے بعد قائم کر لیا ہے وہی اس رسالے کے مخصوص پیمانوں پر پوری اترنے والی تخلیقات تخلیق کر لیتے ہیں۔

آپ تو خود اردو زبان، اردو شعر و ادب، اردو تہذیب، اردو ثقافت اور صحافت کے پاسبان ہیں، ان تمام قبیلوں کے سالار اعظم ہیں، رہبر کامل و اکمل ہیں۔ آپ ایک اچھے خاصے سرسبز و شاداب، جاندار اور شاندار، صحت مند و توانا رسالے کی زندگی کے درپے کیونکر ہو سکتے ہیں، بالخصوص ایسی صورت میں کہ چالیس برس قبل آپ ہی کے ہاتھوں لگایا ہوا یہ پودا اب ایک تناور چھتنار شجر سایہ دار بن چکا ہے، جس کی زندگی اور شادابی کے لیے آپ نے اپنی تمام زندگی لگا دی ہے، اپنے خون قلب و جگر سے اسے سینچا ہے، زمانے کی سرد و گرم سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی تمام تر ذہنی اور حس کی توانائیاں صرف کر دی ہیں۔ آپ اسے ختم کر دینے کا فیصلہ کس دل جگر کے ساتھ کر سکتے ہیں؟ خدا کرے یہ آپ لوگوں کا محض مذاق ہو۔ اور اگر واقعی مذاق ہی ہے تو بڑا بھیانک، جان لیوا، دلگداز اور روح فرسا ہے۔ اور اگر خدانخواستہ حقیقت ہے تو خدارا اس حقیقت کو ایک مذاق بنا دیجیے اور فوری طور سے تمام اخبارات و رسائل میں اعلان شائع کرا دیجیے کہ آپ نے اپنا سابقہ فیصلہ واپس لے لیا ہے۔ "شب خون" یونہی جاری رہے گا کم از کم آپ کی زندگی تک۔ اور خدا آپ کو عمر خضر عطا فرمائے۔ اس دعا کے ساتھ تسلی بخش اعلان کا منتظر ہوں۔

محبوب راہی
بارسی ٹاکلی، اکولہ

● پہلے سنا تھا، پھر "شب خون" کا تازہ شمارہ ملا۔ "شب خون" کے بند ہونے کی خبر نے ملال دیا۔ یہ کیسی بات ہے؟ کیا معاملہ ہے؟ چالیس سال کی مدت کم مدت نہیں ہوتی۔ سب کیا کرایا دھرا رہ گیا۔ یہ دیوار بلند کر کے ڈھا دینے والا فعل ہے۔ ایک لائق فائق مدیر و مصنف کی کاوشیں انفرادی گھیرے سے نہ نکل سکیں، قائم رہ جانے والے ادارے کا روپ نہ لے پائیں! ملال تو ہوگا ہی۔ مجھے بے حد رنج اور افسوس ہو رہا ہے۔ یہ تو وہ طوطا تھا جس میں فاروقی ایسے مدیر شہیر و باکمال کی جان تھی! ہمیں تو وسوسوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس کے بغیر آپ کیوں کر زندہ رہیں گے؟ لاکھ تصنیف تالیف کریں گے مگر اس مشقت کا مزہ کہاں سے اور کیوں کر نصیب ہوگا؟

اردو کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ ادھر ایڈیٹر گیا ادھر رسالہ بند۔ پھر بھی دل نہیں مانتا کہ اچھا بھلا "شب خون" چل رہا تھا، آخر کیا بن آئی کہ بند کرنے کی سوجھی؟ انگریزی میں کہتے ہیں کہ ایڈیٹر چل بسے تو دوسرے دن اخبار میں خبر آجاتی ہے، یعنی اخبار/رسالہ چلتے رہنا چاہیے۔ گستاخی معاف ایک اچھے خاصے فعال رسالے پر یوں قلم پھیرنا تو جہاز ڈبو دینا ہو گیا۔ کیا پورے ہندوستان/الہ آباد میں کوئی دوسرا نہیں جو یہ ذمہ داری اٹھا لے؟

میرا خیال ہے کہ اب میرے صدمے میں غصہ بھر آنے کو ہے اس لئے بس کرتا ہوں۔

آپ کا یہ اعلان بہت اچھا لگا جو آپ نے زر سالانہ کے حوالے سے لکھا ہے۔ میں جب "راوی" سے ریٹائر ہو رہا تھا تو ہم نے بھی ایسا ہی کیا تھا اور یوں پالا مارا تھا کہ بعد میں میرے مرنے کے گھر سے یقیناً جو سامان نکلے گا اس میں وہ خطوط ہوں گے جن میں ہماری ایمانداری اور چندہ واپس کرنے کی ادا سراہی گئی ہے۔ یہ تو یہاں کی بات تھی۔ کیا ہندوستان میں بھی اب لوگ آپ کی طرح سوچیں اور تقلید کریں گے؟ اردو رسالوں پر اکثر ہی پیغمبری وقت رہتا ہے۔ ایڈیٹر لوگ "قرض" کی لے کر چھپتے ہیں۔ خدا ایسا مشکل وقت کسی پر نہ لائے۔ آمین۔ دنیا آپ کو پتہ نہیں کس کس حوالے سے یاد کرے گی؟ میں تو سوچا کروں گا آپ نے رسالہ خوب چلایا مگر جب اسے چھوڑا تو اپنی ادارت کی طرح بڑی مشکل مثال قائم کرتے گئے جس پر چلنا دل گردے والوں کا کام ہوگا۔ خدا یہ سعادت اوروں کو بھی نصیب کرے کہ آزادی کے ستاون سال بعد وہ سائے دکھائی دے رہے ہیں جب اردو کے معیاری ادبی ماہناموں کا زندہ رہنا معجزہ ہوگا۔

مقصود الٰہی شیخ
بریڈفورڈ

● آپ کے حکم پر یہ افسانہ پیش کر رہا ہوں۔ مگر نہایت ہی دکھی دل کے ساتھ، کہ یہ "شب خون" کے آخری شمارے میں شائع ہوگا۔ گویا اس کے کفن دفن میں یہ حقیر بندۂ پرتقصیر بھی شامل ہوگا۔ کتنا ہولناک خیال ہے۔ ہائے ہائے، آخر آپ نے رسالے کی موت کا پروانہ جاری کر ہی دیا۔ کم سے کم اس کے پڑھنے والوں اور اس کے لکھنے والوں کے دل سے تو پوچھ لیا ہوتا۔ چالیس سال کے بعد "شب خون" اب آپ کا رسالہ نہیں رہا بلکہ یہ دنیا بھر میں اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کا اپنا جریدہ بن گیا ہے۔ "شب خون" رسالہ نہیں، ایک فورم اور ایک پلیٹ فارم ہے جہاں ہر خیال اور ہر مزاج کا لکھنے والا بلا روک ٹوک اپنی بات کر سکتا ہے۔ اس میں چھپنے والے مضامین اور شعر و افسانہ کی اہمیت تو اپنی جگہ، اس میں تو شامل ہونے والے مراسلات بھی اپنی جگہ پر ایک محفل مذاکرہ و مکالمہ کا مزہ دیتے ہیں۔ اور یہ محفل نئے نئے مباحث کو جنم دیتی ہے اور نئے سے نئے رجحانات کے دروازے کھولتی ہے۔ اب میں کیا کہوں، سب جانتے ہیں کہ "شب خون" نے ادب میں نئے رجحانات کی آبیاری ہی نہیں کی بلکہ نئے رجحانات تخلیق بھی کیے ہیں۔

بہر حال، یہ تمام باتیں وہ ہیں جو ہم سب جانتے ہیں۔ بلکہ یہ کہتے ہوئے میرا دل کٹ رہا ہے کہ یہ سب باتیں آپ بھی بخوبی جانتے ہیں۔ اس لئے میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اس کے باوجود آپ "شب خون" کا گلا کاٹنے پر کیوں مصر ہیں؟ خیر، آپ کی مصلحت آپ ہی جانیں لیکن اس سے اردو کے پڑھنے والے--اور یہ پڑھنے والے ساری دنیا میں موجود ہیں--اپنے فورم، اپنے پلیٹ

فارم، اپنی زبان سے محروم ہو جائیں گے کہ "شب خون" ان کی زبان کو اظہار کا وسیلہ فراہم کرتا ہے۔ کہہ لیجئے کہ ہم ایک قوت متحرکہ سے محروم ہو جائیں گے۔

لاہور — مسعود اشعر

● میں ہمیشہ "شب خون" کا پہلا صفحہ سب سے پہلے پڑھتا ہوں۔ آج جب پہلا صفحہ پڑھا تو دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ فاروقی صاحب! یہ تو بڑا غضب ہوگا۔ "شب خون" کا جاری ہونا بیسویں صدی کے نصف آخر کا بڑا واقعہ تھا، اسی طرح اس کا بند ہونا اکیسویں صدی کے نصف اول کا بڑا حادثہ ہوگا۔ ایسا آپ بخدا نہ کریں۔ کوئی راستہ نکالیئے ہم سب جانتے ہیں کہ ہر چند آپ کی صحت اب ساتھ نہیں دیتی مگر انشاءاللہ خدا آپ کی مدد کرے گا۔

"شب خون" کے قارئین کا حلقہ بڑا وسیع ہے۔ ان میں سے بعض اپنی چیزیں "شب خون" میں چھپتی ہوئی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور ہم "شب خون" کو دیکھ خوش ہوتے ہیں۔ امید ہے آپ کوئی معاون تلاش کر لیں گے جس کے فہم و ادراک پر آپ بھروسا کرتے ہیں۔ اگر ماہانہ نہیں تو کم سے کم اسے سہ ماہی کر دیجئے مگر اسے ضرور جاری رکھئے گا۔ وارث علوی، محمد علوی، جینت پرمار، سب یہی چاہتے ہیں اور سلام عرض کرتے ہیں۔

احمد آباد — محی الدین بمبئی والا

● صاحب آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ کو ایسا کرنا ہی نہیں چاہیے۔ جون کے بعد "شب خون" کا کوئی شمارہ شائع نہیں ہوگا مگر جی کیوں نہیں ہوگا؟ یہ پرچہ اب صرف آپ کا نہیں رہا، ہمارا بھی تو ہو چکا ہے۔ اردو کی ادبی تہذیب کا استعارہ۔ تو جب یوں ہے تو پھر یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ آپ اعلان فرما دیں کہ... کیا یہ صرف آپ کی ذات کا معاملہ ہے؟ نہیں صاحب نہیں، ہم آپ کو ایسا نہیں کرنے دیں گے۔

اسلام آباد میں آپ نے اس طرف اشارہ ضرور کیا تھا مگر آپ کی طبیعت کے اضمحلال سے یہ گمان ہوا تھا کہ ایسی بات سب کرتے رہتے ہیں، تخلیق کاروں پر ایسے کمزور لمحے آتے رہتے ہیں مگر ایسی کیفیت سے انھیں بخیر و خوبی نکلتے بھی دیکھا گیا ہے۔ مگر... شمارہ ۲۸۹ کے اعلان سے تو کلیجے پر ہاتھ پڑا ہے۔

دیکھئے اس باب میں آپ کو دامے درمے سخنے جیسی بھی معاونت درکار ہو، فوراً کہہ دیجئے۔ آپ ہمیں حاضر پائیں گے۔ بس یوں کیجئے کہ اپنا فیصلہ واپس لے لیجئے۔

اسلام آباد — محمد حمید شاہد

● "شب خون" کے بند ہونے کے اعلان نے محزون و مغموم کر دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے رنج و ملال کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔ "شب خون" کے میرے اوپر بڑے احسانات ہیں۔ جس تناور اور ثمر بار درخت کے سائے میں میں نے اپنے ادبی سفر کے تقریباً پچیس برس گذارے، اب اس کا سایہ میرے سر سے اٹھ رہا ہے۔ میں خود کو بے بس، بے کس اور مفلس تصور کرنے لگا ہوں۔ مجھے وہ دن یاد آ رہا ہے جب ڈاکٹر نے میرے والد بزرگوار کے مرض کی تشخیص مرض الموت کے طور پر کی تھی اور ان کی حیات کا عرصہ صرف دو ماہ بتایا تھا۔ میں اسی کیفیت، اسی اداسی اور احساس زیاں سے پھر ایک بار دو چار ہوا ہوں۔

"شب خون" ایک رسالہ ہی نہیں، ایسا مکتب ہے جہاں اہل علم و ادب نے نسل در نسل درس حاصل کیا ہے۔ اس عظیم الشان رسالے کی خدمات کو اردو ادب کی تاریخ میں سنہرے الفاظ میں لکھا جائے گا۔ اردو ادب کو ایک دور تذبذب اور انتشار میں صحیح اور صحت مند سمت عطا کرنے میں "شب خون" نے غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے۔ آپ نے "شب خون" کو جاری رکھنے میں جس ہمت، دلیری اور ایمانداری کا مظاہرہ کیا ہے وہ اپنے آپ میں ایک عظیم کارنامہ ہے۔ انتظامی امور میں آپ کی مصروفیت ہو یا صحت کی ناسازی، آپ نے "شب خون" کی اشاعت اور اس کے معیار میں کسی چیز کو حارج ہونے نہ دیا۔ ہمیں اس بات کا پورا احساس ہے کہ "شب خون" کو بند کرنے کا سب سے بڑا سبب آپ کی صحت کی خرابی ہے۔

میں نے یہ اعلان پڑھتے ہی کشمیر سے باہر کے محبان "شب خون" سے بات کی۔ سب کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں۔ بعض تو فرط غم سے رونے لگے۔ سو میں ان سب اور اپنی طرف سے گذارش کرتا ہوں کہ آپ اس فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ "شب خون" کی ضرورت ابتدا اور انتہا دونوں مرحلوں میں لوگوں کو درپیش ہے۔ جس طرح بچے کو چلنے کے لئے والد کی شفیق انگلی اور بزرگ کو لاٹھی کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ بھلے "شب خون" کو سہ ماہی، شش ماہی یا سالانہ بنا دیں، مگر شب خون کے سائے سے ہمیں محروم نہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ جملہ محبان "شب خون" کی آپ سے یہی گذارش ہوگی۔ میرے لئے "شب خون" اردو ادب اور شمس الرحمن فاروقی ایک ہیں اور میں ان میں سے کسی کو کھو نہیں سکتا۔

سری نگر — شفیق سوپوری

● "شب خون" ڈاک سے موصول ہوا اور اس دن مجھے فرصت بھی ہو تو پھر وہ وقت بڑی آسودگی کا ہوتا ہے۔ آج بھی فرصت تھی لیکن جیسے ہی پہلے صفحے پر نظر پڑی، نہ جانے بجلی سی گر گئی۔ "شب خون" بند ہو رہا ہے۔ خدا جانے اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ کی مصروفیت، علالت یا لوگوں کی بے توجہی۔ یہ قیاس میں بھی نہیں تھا کہ دوسرے رسالوں کی طرح وقت کے ہاتھوں وہ "شب خون" بھی شکست کھا جائے گا جس کی حیثیت عہد ساز اور جس کی شناخت منفرد ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ خبر آخری صفحے کے "اخبار و اذکار" میں وفیات کی خبروں کا ایک حصہ ہے جو پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک پھیلی ہوئی ہے۔

آپ اسے اچانک بند نہیں کر رہے ہیں، بلکہ کئی مہینوں کی مہلت لے کر بند کر رہے ہیں۔ تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے بہت ہی سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہوگا اور اب شاید کوئی گنجائش اس رائے کی تبدیلی کے لئے نہیں رہ گئی ہے۔ یہ شمارہ جو آئندہ شمارے کا انتظار کراتا تھا وہ رخصت ہو رہا ہے۔ یہ واقعہ بڑا سخت ہے۔

لارنس ویل، جارجا — وحید الحسن

● ایک طرح سے مجھے اس بات کی خوشی ہی ہے کہ آپ "شب خون" بند کر رہے ہیں کیونکہ اس کا تعب کا آپ پر بہت تھا۔ لیکن میرا خیال ہے آپ نے اس سوال پر غور ضرور کیا ہوگا کہ "شب خون" کی مشعل کسی اور کے ہاتھ میں دے دی جائے، لیکن پھر آپ نے اس کے خلاف فیصلہ کیا ہوگا۔ اغلب ہے کہ آپ کو ہر طرف سے خطوط اور التماس مل رہے ہوں گے کہ "شب خون" بند نہ کیا جائے، خواہ اس کی ادارت کسی اور کو تفویض کیوں نہ کر دی جائے۔ میں بھی ان

دوستوں کی آواز سے آواز ملانا چاہتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ آپ اور "شب خون" ایک طرح سے ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ آپ کے رسالے کا بند ہونا برصغیر کی اس تکلیف دہ روایت کے ہی مطابق ہے کہ یہاں کے ادارے اشخاص پر منحصر ہوتے ہیں اور اشخاص کے الگ ہوتے ہی ادارے ختم ہوجاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مسلمان معاشروں میں حرکیاتی اداروں کی کمی براہ راست اس روایت سے متعلق ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ "شب خون" کا مرجھا جانا ہندوستان میں اردو والوں کی دانشورانہ زندگی کے مرجھانے کا حکم رکھتا ہے۔ خدا کرے ایسا نہ ہو۔

رچمنڈ، ورجینیا — اسامہ خالدی

• "شب خون" کی اشاعت بند کرنے کا اعلان کرکے آپ نے "محبان شب خون" کے سروں پر بم چھوڑ دیا۔ اس اچانک اور قطعی غیر متوقع فیصلے نے مجھے تو حیرت زدہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس وقت جب کہ یہ رسالہ پورے برصغیر میں بلندیوں کو چھو رہا ہے، اس کی اشاعت بند کرنے کا فیصلہ سمجھ سے باہر ہے۔ آرتھر کانن ڈائل نے ایک روز تنگ آکر اپنے شہرۂ آفاق کردار شرلاک ہومز کو مار ڈالا تھا۔ مگر شرلاک ہومز کے چاہنے والوں کی زبردست تحریک کے نتیجہ میں کانن ڈائل کو پھر سے شرلاک ہومز کو زندہ کرنا پڑا تھا۔ آپ کو بھی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا پڑے گی۔ میرے خیال میں "شب خون" کے چاہنے والے آپ کو چھوڑنے والے نہیں۔ آپ کا فیصلہ پوری ادبی دنیا کے لئے ایک بڑے سانحے اور شاق سے کم نہیں ہے۔

سوپور — ابن اسماعیل

• کیا واقعی ہمیں "شب خون" سے محروم کر دیا جائے گا؟ یہ کیسی سزا ہے؟ ویسے ہم آپ کے مجرم ہیں۔ "شب خون" کے حالات پر ہمیں جو توجہ دینی چاہئے وہ ہم دے نہیں پائے اور کبھی یہ نہیں سوچا کہ "شب خون" چل رہا ہے تو کیسے چل رہا ہے اور اسے نکالنے میں آپ کو کن کن مراحل سے گذرنا پڑتا ہوگا۔ آپ نے نہ تو آنکھوں کے بڑھتے ہوئے نمبر کی فکر کی، نہ دل کی صحت کا خیال کیا، نہ عمر کا دن دیکھا نہ رات، ہر دن ہر پل اردو کی اور اردو ادب کی بدحالی پر خون کے آنسو روتے رہے اور اردو کی خدمت میں مصروف رہے۔ اس کے عوض میں ہم نے آپ کو کیا دیا؟ جھوٹی تہمتیں اور بہتان آپ پر برسائے، آپ کی تمام اچھائیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف ایک "بکری" اور ایک "جمپر" کا حوالہ دے کر بار بار آپ کو کوستے رہے۔ ہم نے کبھی یہ نہ سوچا کہ آج کی غزل کے روپ رنگ اور مزاج ہمارے پیش رووں کی غزل سے نمایاں طور پر مختلف ہیں تو یہ آپ کی بنا کردہ جدیدیت کا ہی نتیجہ ہے۔ لیکن وہ تمام گستاخیاں معاف کی جاسکتی ہیں۔

بقول آپ کے، "شب خون" کی عمر اس وقت ۳۹ سال کی ہے۔ تو جناب یہی تو اس کا دور شباب ہے۔ یہی تو عمر ہوتی ہے اپنی کارگذاریوں کا پھل کھانے کی۔ پچیس سال کی عمر کو ہمارے یہاں "گدھا پچیسی" کہتے ہیں۔ اس گدھا پچیسی میں لاابالی پن ہوتا ہے۔ یہ اچھل کود کی عمر ہوتی ہے۔ یہ عمر ہڑدنگ مچانے کی ہوتی ہے، تو "شب خون" نے بھی اپنی گدھا پچیسی کے دور میں غزل کے شبستان میں کچھ گستاخیاں کیں تو غزل کی چھاونی پر کون سا لشکر ٹوٹ پڑا تھا؟ اور اس کے بر عکس، ادب کے میدان میں باشعور فنکاروں کا ایک جم غفیر جو "شب خون" نے لا کھڑا کیا ہے، اسے کس شمار میں لایا جائے گا؟ اور یہ سب اس لئے ہوا کہ خود غزل کو اور افسانے کو نئی سمتوں کی تلاش تھی۔ اور آپ نے سمتیں مہیا کرنے کے لئے راہ ہموار کرادی تو یہ کارنامہ لائق تحسین ہی کہا جائے گا۔ اب ایسا تو نہیں کہ قدم اٹھاتے ہی انسان صحیح راستے پر آجائے۔ کئی گلی کوچوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ وقت درکار ہے۔ کبھی کبھی تاعمر لوگ بھٹکتے ہی رہتے ہیں۔

"شب خون" نے ہزاروں کو ناموری عطا کی ہے۔ ہزاروں کو صف اول میں لا کھڑا کیا ہے اور ایسا کرنے میں وہ کئی کہنہ پرستوں سے لڑتا رہا ہے اور اس کے باوجود اپنی منزل کی طرف آگے بڑھتا ہی رہا ہے اور آج اچانک اسے سزائے موت سنائی جاتی ہے! ہم سمجھ سکتے ہیں کہ "شب خون" بند کرنے کا آپ کا فیصلہ بلاوجہ نہیں ہوگا۔ ضرور کئی مشکلیں رہیں ہونگی۔ مگر صاحب عین دور شباب میں اسے مار ڈالنا بھی مناسب نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا، اور انشاءاللہ جون کے بعد بھی "شب خون" اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہے گا۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ آپ کو اپنا فیصلہ بدلنے کی توفیق اور ہمت عطا کرے۔

بڑودہ — خلیل دھنتیجوی

• "شب خون" جاری رکھنے کی کوئی صورت ضرور نکالئے، خواہ سہ ماہی بنا دیجئے۔ "شب خون" ایک مکمل ادبی رسالہ ہے بلکہ یہ ایک مکمل ادبی رسالہ ہی نہیں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اجمل کمال، آصف فرخی، کتابی صورت میں اچھا ادب پیش کرتے ہیں۔ لیکن "شب خون" کی بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ اپنے تمام قارئین کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ "شب خون" نے دونسلوں کی آبیاری کی ہے۔ ہزار ہا تنقیدوں کے باوجود "شب خون" اپنے راستے پر چلتا رہا۔ آپ کے دیگر ادبی کارناموں میں "شب خون" بھی ایک بہت اہم کارنامہ ہے۔ اس ادبی اور تاریخی دستاویز کا بند ہونا ادب کا بہت بڑا المیہ ہوگا۔ میں مانتا ہوں کہ آپ کی صحت آپ کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ لیکن آپ کے چاہنے والوں کی دعائیں انشاءاللہ آپ کو صحت عطا فرمائیں گی۔ کوشش کیجئے کہ جون ۲۰۰۶ تک "شب خون" جاری رہے۔ انشاءاللہ جون ۲۰۰۶ کے بعد میرے لئے "جواز" نکالنا ممکن ہوجائے گا۔ "جواز" کو "شب خون" کا بدل بنانا ممکن نہ سہی، تو بھی نئے رجحانات پیش کرنے کے لئے ہمیں جدید رسالہ ہی درکار ہوگا۔ آج کل جو دو تین پرچے نکل رہے ہیں وہ کسی مصلحت کے تحت ترقی پسند ادب کا پلیٹ فارم بنتے جارہے ہیں۔

مالیگاؤں — سید عارف

• "شب خون" کی اشاعت کو انتالیسویں سال کے تکملہ پر بند کرنا سمجھ میں نہیں آیا۔ نئی فکر اور امکانات کا پیامبر اگر شان پیمبری کے ساتھ چالیسویں سال میں قدم رکھتا تو کیا خوب ہوتا۔ یوں Divine Wisdom نے چالیسویں سال کو اہمیت دی ہے۔ آپ کے لئے اطمینان و سکون تو "شب خون" کی ہنگامہ خیزیوں ہی میں مضمر ہے۔ رزم گاہ زندگی میں اطمینان کی آرزو باطل ہے اور باطل آرزووں کا تکملہ گناہ ہے۔ شائقین "شب خون" کی نظر میں "شب خون" کی اشاعت بند کرنا گناہ کبیرہ ہوگا۔ صحت، آسانیاں، اطمینان، دشواریاں، حالات

کا جبر، اپنے معنی اور اثر کے اعتبار سے آب رواں پر بنتی بگڑتی لہروں سے زیادہ اہمیت کے حامل نہیں۔

کانپور — قاضی نورالسلام

● شمارہ نمبر ۲۸۹ ملا۔ خوبصورت اور معنی خیز سرورق سے گذر کر اداریے پر نظر پڑی تو دل کی خوشیوں اور شادمانیوں کے سارے تاروپود بکھر کر رہ گئے۔ جناب والا آپ کو شاید ابھی تک اپنی شخصیت اور ماہنامہ "شب خون" کی بے پایاں اور غیر محدود خوبیوں پر غور کرنے کا موقع نہیں مل سکا ہے آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ خدانے اپنے فضل خاص سے آپ کی ذات میں علمی و ادبی جا بکدستیوں اور ہنرمندیوں کا حیات بخش جوہر پیوست کر رکھا ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ پوری علمی و ادبی دنیا دیوانہ وار آپ کی طرف جھکتی ہے۔ "شب خون" سے لوگوں کو جو خاص دلچسپی ہے تو محض اس لئے کہ آپ اس کے مدیر ہیں، اور جب آپ جیسا کوئی مدیر کسی رسالے کو خوش قسمتی سے ہاتھ آجائے تو پھر خریداروں کی کمی کے باعث وہ رسالہ ہرگز ہرگز بند نہیں ہوسکتا۔ ترقی پسند ہوں یا جدیدیت کے حامی یا پھر مابعد جدیدیت کے طرفدار، سب کے سب "شب خون" پر جان چھڑکتے ہیں۔ اس مقبولیت کو میں صرف اور صرف عطیۂ خداوندی کا نام دیتا ہوں۔ آپ نے اسے بند کرنے کا فیصلہ کر کے اس عطیۂ خداوندی سے انکار کیا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ آپ کی صحت کی خرابی نے آپ کو ایسا شدید قدم اٹھانے پر مجبور کیا ہے لیکن آپ تو خدا کی خدائی پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ خدا اپنے بندے کے ناتواں اور کمزور ہاتھوں سے بھی ایسے ایسے کام لے لیتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ آپ جن پر بھروسا کرتے ہیں ان کی ایک کمیٹی بنا دیں جو "شب خون" کا ادارتی کام آپ کی نگرانی میں انجام دے؟ آپ کی سرپرستی میں "شب خون" کی عمر بڑھ جائے، یہ ایک بہتر کام ہوگا۔ لہٰذا خدا کے واسطے اپنے فیصلے کو واپس لے لیں۔ اگر آپ نے یہ فیصلہ واپس نہ لیا تو اردو کا جو نقصان ہوگا اس کی تلافی کبھی نہ ہوسکے گی۔

نئی ممبئی — محمد ایوب واقف

● "شب خون" کا بند ہو جانا اکیسویں صدی کی شروعات میں اردو زبان و ادب کے لئے ایک بہت بڑا حادثہ قرار دیا جائے گا۔ اردو کے سچے قلم کاروں کے لئے یہ سب سے بڑا پلیٹ فارم تھا اور اردو کے زیادہ تر نئے قلم کار "شب خون" کی بنیاد پر ہی آج اتنے روشن ہو سکے ہیں۔ فی الحال اس کے متبادل کی تلاش ناممکن نظر آتی ہے۔ گذشتہ چالیس برسوں کی ادبی خدمات کے بعد اگر آج آپ نے اپنی صحت کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے تو اس کا جائز حق آپ کو ہے۔ کم از کم اردو کی تاریخ میں دوسری ایسی کوئی شخصیت مجھے نظر نہیں آتی جس نے تنہا ایک ادارے کا مقام حاصل کر لیا ہو۔ میرے لئے تو آپ واقعی ایک علمی ادارہ بھی ہیں کہ آپ نے میری تحریروں کے کھردرے پن کو نہ صرف صاف کیا ہے بلکہ ایک طرح سے میرے ادبی سفر میں رہبر کا کام کیا ہے۔ آپ لمبی عمر جئیں فکروں سے آزاد ہو کر اپنی شرطوں پر ادب کی خدمت کرتے رہیں (میں نہیں سمجھتا آکسیجن کے بغیر آپ کے لئے ایک بھی دن گذارنا ممکن ہوگا۔) اردو ادب کو اگر صحیح معنوں میں زندہ رہنا ہے اور بلندی کی طرف قدم بڑھاتے رہنا ہے تو اسے "شب خون" کے معیار کے رسالے منظر عام پر لانے ہوں گے۔ آپ نے چالیس برس میں جو بیج بوئے ہیں وہ تناور درختوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور یہی اکیسویں صدی میں اردو ادب کے خدوخال بھی وضع کرتے رہیں گے۔

کولکتہ — صدیق عالم

● دل کو دھکا لگا کہ جون کے بعد سے آپ "شب خون" بند کر رہے ہیں۔ یہ بے حد افسوسناک ہے۔ میرے ہی نہیں اردو دنیا کے لئے "شب خون" اور شمس الرحمن فاروقی مترادف تھے۔ اس پرچے کے ذریعہ سے آپ نے سوچ کے آفاق کو جس طرح وسعت دی اور نئے افکار و اسلوب کی تحریروں کی پذیرائی کی وہ معاصر ادبی تاریخ کا اہم وقوعہ ہے اگر اس فیصلہ سے مجھے اور لاتعداد ادبا اور قارئین کو اتنا دکھ ہوا ہے تو خود آپ کے دل پر کیا نہ گذری ہوگی۔ اسلام آباد میں آپ کے ساتھ جو ہفتہ گزارا وہ خوشگوار یادوں کا امین ہے وہیں میں نے یہ نوٹ کیا تھا کہ محترمہ بھابھی صاحبہ آپ کی صحت کے بارے میں خاصی پریشان رہتی تھیں۔ کہیں پرچے کی بندش کی وجہ آپ کی خرابی صحت تو نہیں؟

میرا اور "شب خون" کا ساتھ تقریباً "شب خون" کی عمر جتنا ہی ہے، میں ان دنوں ملتان میں لیکچرار تھا اور قلم کاری کا آغاز بھی تھا کہ "شب خون" سے تعلق استوار ہو گیا جو ہنوز برقرار ہے۔ وقت بڑا ظالم ہے۔ ایک ایک کر کے دوست اور دوست ادبی پرچے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ "افکار" اور صہبا لکھنوی، "صریر" اور فہیم اعظمی، پھر مشفق خواجہ اور اب "شب خون"۔ اللہ آپ کو صحت و سلامتی کے ساتھ تر و تازہ رکھے تاکہ آپ دل لگا کر نئے تصنیفی منصوبوں پر کام کر سکیں۔

لاہور — سلیم اختر

● میں اردو رسائل باقاعدگی کے ساتھ بہت کم دیکھتا ہوں۔ لیکن عرصۂ دراز سے، اس وقت بھی جب رسالہ خاصی دیر دیر سے نکلا کرتا تھا، تسلیم کرتا آیا ہوں کہ ہندوپاک میں "شب خون" سے بہتر رسالہ شائع نہیں ہوتا، اور یہ سب آپ کی بدولت ہے۔ میں بچپن میں "ادب لطیف" باقاعدگی سے دیکھا کرتا تھا، جسے ان دنوں مرزا ادیب مرتب کرتے تھے۔ "سویرا" بھی دیکھا۔ "نقوش" نے آنکھیں کھولیں۔ "نگار" اور "ساقی" کے چند پرانے شماروں نے مجھے بہت سی اہم باتوں سے آگاہ کیا۔ "نیرنگ خیال" نے بھی روشنی دی۔ اب جب کہ ذرا فہم آئی ہے، میرا یقین پختہ ہو گیا ہے کہ "شب خون" ان تمام مایۂ ناز جریدوں کا ہم پلہ ہے، اگر چند امور میں افضل نہیں۔ اس رسالے نے نہ صرف جدیدیت کے چند پہلوؤں کو ممتاز کیا بلکہ کلاسیکی ادب سے بہتر طور پر ہمیں روشناس کرایا۔

میرا تعلق "شب خون" سے اس وقت ہوا جب کہ آپ نے امام جعفر الصادق کے ایک رسالے سے افلاطون اور افلاطونیت پر اقتباس شائع کیا تھا۔ میں Encyclopedia Brittannica کے ذریعہ اس امر سے واقف تھا کہ امام صاحب سے منسوب تینوں رسالے جعلی ہیں۔ یہ بات کسی مغربی مستشرق نے نہیں بلکہ ایران کے ایک مایۂ ناز شیعی عالم سید حسین نصر نے لکھی ہے۔ میں نے آپ کو خط لکھا۔ آپ نے خط شائع کیا اور یہ نوٹ دیا کہ جناب نیر مسعود صاحب ان

رسالوں کو جعلی نہیں تصور کرتے۔ میں نے سر تسلیم خم کیا اور اس وقت سے میں تحریری طور پر رسالے سے وابستہ رہا ہوں۔

مجھے کلاسیکی یونانی علوم سے تھوڑی بہت دلچسپی رہی ہے۔ ہمارے خاندان کے بزرگ فارسی و عربی نحو و قواعد کے دل دادہ رہے ہیں۔ علامہ شوق نیموی ہمارے یہاں سے بہت ساری کتابیں بٹور کر لے گئے تھے (ان کی بھانجی صاحبہ میری دادی تھیں)۔ میں نے اپنی (ناقص) معلومات کی بنا پر نتیجہ اخذ کیا کہ ابتدائی دور میں، جب حضرت علی اور دیگر اصحاب کی سرپرستی میں قرآنی الفاظ پر غور و فکر کا آغاز ہوا، تو رواقی (یونانی) نحو و قواعد سے مدد لی گئی۔ اس سلسلے میں میں نے ایک طویل مضمون لکھا۔ آپ اس سے متفق نہ تھے، پھر بھی آپ نے ایک صاحب (۱) سے رائے لے کر جو غالباً عربی نحو و قواعد سے باخبر تھے میرا مضمون شائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے سر تسلیم خم کر دیا، لیکن میں ایک اہم امر سے واقف ہو گیا کہ آپ "شب خون" میں چیزوں کی شمولیت انتہائی سوچ سمجھ کر، جانچ پڑتال کے بعد ہی کرتے ہیں۔ میں چند امریکی اور انگریز ایڈیٹروں کے متعلق جانتا ہوں، وہ بھی آپ ہی کی مانند احتیاط برتتے ہیں۔

"شب خونی جدیدیت" کا شہرہ رہا ہے۔ آپ نے رسالے میں کبھی ایسی چیزیں شامل کر دیں جو محض دکھاوے کی تھیں۔ ان میں نہ تو مواد نہ تھا، نہ فکر کی گہرائی۔ جدید غزلیں آپ نے اس قدر پابندی کے ساتھ شائع کیں کہ اکثر مجھے تعجب ہوا۔ ظفر اقبال ایک طور پر جدید غزل کی علامت بن کر رہ گئے۔ لیکن ان کے کلام کا کوئی اسی فی صد حصہ کالعدم ہو کر رہ جائے گا۔ علامتی افسانے جو شائع ہوئے بے سر پیر کے تھے، حالانکہ عمدہ علامتی افسانے بھی ایک زمانے میں لائق توجہ رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ جدیدیت کے سلسلے میں مغالطے میں مبتلا تھے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ایک واضح ادبی پروگرام کے تحت کام میں مشغول تھے۔ ہر نئی چیز نہ تو مکمل طور پر اچھی، قابل تقلید، اور روایت کی دنیا میں شامل ہونے کی قوت رکھتی ہے، اور نہ یکسر دریا برد کرنے کے لائق ہوتی ہے۔ لیکن جدیدیت ہے کیا؟ سولھویں صدی میں کیا فارسی زبان میں سبک ہندی جدید نہیں تھا؟

میں اتنی ساری باتیں کہہ گیا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ آپ جیسا شخص، جس کے ہاں قدیم و جدید کا اس قدر عمدہ، دلچسپ اور غیر معمولی امتزاج ہے، اور جس نے ایک مدت تک "شب خون" کو مرتب کیا ہے، جس کی دھوم چار دانگ عالم میں ہے، وہ کیوں تلا ہوا ہے کہ اس سلسلے کو منقطع کر دے؟ ماہ نامہ نہ رکھیں، دو ماہی، سہ ماہی، شش ماہی نکالیں کہ ہم جیسے لوگ کچھ تو مستفید ہوتے رہیں۔

کولکتہ — حبیب حق

• اردو میں جدید تحریر کا عہد "شب خون" کے بند ہونے کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ برصغیر میں کوئی ایسا رسالہ نہیں جو اس معیار، مقبولیت اور توقیر کو پہنچ سکتا ہو۔ شمس الرحمن فاروقی، بطور نقاد جن کی شہرت ہمارے زمانے میں افسانہ بن چکی ہے، یہ سب ان کی لائق رہنمائی کا فیض تھا۔ جب میں نے "شب خون" کے بند ہونے کی خبر پڑھی تو میرے تاثرات کئی طرح کے تھے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ہم نے ایک ایسا رسالہ کھو دیا ہے جو ہمیں تمام دنیا کے اردو ادب سے مربوط رکھتا تھا۔

"شب خون" ایک عجب عدیم النظیر ڈھنگ سے ہم دور و نزدیک کے اردو ادیبوں کو ایک رشتے میں منسلک رکھتا تھا۔ لیکن مجھے یہ بھی خیال آیا کہ اب فاروقی صاحب کو آرام اور وقفے کی ضرورت ہے۔ اس آرام اور وقفے کا انھوں نے پوری طرح استحقاق حاصل کر لیا ہے کہ انھوں نے زندگی بھر اس رسالے کو نئے اور پرانے لکھنے والوں کے لئے روشنی کا مینار بنا کر رکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس رسالے نے ان چالیس برسوں میں ان مقاصد کو حاصل کر لیا ہے، بلکہ میل دو میل بھر آگے ہی تک حاصل کر لیا ہے، جن مقاصد کو لے کر یہ رسالہ شروع ہوا تھا۔

میرا خیال ہے کہ "شب خون" کو کسی اور کے ہاتھوں میں دے دینے کے مقابلے میں اسے بند کرنا بہت درست فیصلہ تھا۔ کوئی اور شخص اس پیکر اور معیار کو باقی نہیں رکھ سکتا تھا جو "شب خون" نے اتنی مشقت سے حاصل کیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ "شب خون" شاید اب بند گلی کی طرح ہو گیا تھا جہاں سے نئی راہیں پھوٹنے کے امکان نہ تھے۔ ممکن ہے اب کوئی اور رسالہ وہ کام انجام دے سکے، ورنہ آگے تو ایک طویل سرد موسم ہی ہے۔

باسٹن، امریکہ — منیب

• فروری کا شمارہ ہاتھ میں آیا تو اس کے پہلے صفحے پر یہ خبر دیکھی کہ اب "شب خون" کی عمر طبیعی کے صرف تین شمارے باقی ہیں اور مئی کا شمارہ اس پرچے کا آخری شمارہ ہوگا۔ میرا تعلق "شب خون" سے کچھ بہت پرانا تو نہیں لیکن پچھلے تین چار برس سے ایک دلی تعلق سا ہو گیا تھا (جس میں آپ کی شخصیت کا بھی بڑا دخل ہے) اور اب اس کا بند ہونا ایسا لگتا ہے جیسے کسی عزیز دوست سے جدا ہو رہے ہیں۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ علاوہ اس لطف کے جو "شب خون" کے مضامین افسانے اور نظمیں غزلیں پڑھنے سے حاصل ہوا، یہی پرچہ ہے، جس کے ذریعہ میرا تعارف شمالی ہند اور پاکستان کے پڑھنے والوں سے ہوا اور جو داد مجھے اس پرچے کے ذریعہ ملی اس نے مجھے اپنے آپ پر ایک اعتماد بخشا۔ اس لحاظ سے میں آپ کا ذاتی طور پر اور "شب خون" کا ادبی طور پر ممنون ہوں۔ "شب خون" ہی کے ذریعہ کچھ لوگوں سے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔ گو میری ملاقات آپ سے پہلے بھی تھی لیکن "شب خون" کی وجہ سے اور اس مراسلت کے سبب جو میں نے آپ سے کی ایک تعلق خاطر آپ سے استوار ہوا جو انشاء اللہ آئندہ بھی رہے گا۔ یہ تعلق اس وجہ سے اہم ہے کہ یہ ایک ایسے شخص سے ہے جس کے کارنامے اردو علم و ادب کا اہم حصہ بن چکے ہیں اور جو خود اپنی ذات میں ایک نہایت شریف اور بے لاگ انسان ہے۔ سوال اب یہ ہے کہ اپنی نگارشات جو ایسی ہی قطرہ قطرہ ہیں جیسے آج کل حیدرآباد میں پانی کا انتظام ہے، اگر بھیجیں تو کس پرچے کو بھیجیں اور خود آپ کے مضامین کن پرچوں میں پڑھنے کو ملیں گے؟

حیدرآباد — سید سراج الدین

• اس بار "شب خون" کا پہلا صفحہ ہی دل توڑ دینے والا نکلا۔ ادبی تاریخ کا ایک باب ختم ہوتے دیکھنا کتنا بڑا غم ہے اس کا اندازہ یوں تو ہم لوگوں کو زندگی میں بار بار ہوا مگر یہ ایک نیا سانحہ اس لئے اور بھی سخت ہے کہ بدلتی ہوئی دنیا

(۱) ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی (ادارہ)۔

میں اسی طرح کے رسالے ان لوگوں کا سہارا بھی ہیں جو زندگی سے مایوس نہیں ہونا چاہتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں شروع شروع میں "حلقۂ بیرون در" میں رہا مگر اس کے باوجود اندرون سے آشنا، اور اس میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کی قدر و اہمیت سے واقفیت بھی رکھتا تھا اور اس کے ذریعے خاص طور سے آپ سے عقیدت بڑھتی گئی۔ بہر حال، اب کیا لکھوں اور کہاں تک لکھوں۔ ایک دو دن تو میں نے آپ کے بیان کو کئی طرح سے Deconstruct کرنے کی کوشش کی مگر "منشائے مصنف" کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا! کاش کہ اب بھی کوئی صورت نکل آتی۔ مگر آپ کی صحت اور رسالے کے معیار کو برقرار رکھنے کی مشقت میں بیر بڑھتا رہا ہے اس لئے کچھ کہہ نہیں سکتا۔

نئی دہلی — صدیق الرحمٰن قدوائی

● آدمی حال سے زیادہ اپنے ماضی میں جیتا ہے۔ یہ جان لینے کے بعد بھی کہ "شب خون" کی اشاعت موقوف ہو رہی ہے، ہم اپنے موجودہ شب و روز کو بھول کر پچھلے چالیس برسوں کے، اور اپنے باطن میں جیتے ہیں۔ یہ پچھلے چالیس سال "شب خون" کے سال ہیں، ادب سے میری عملی وابستگی اور "شب خون" سے گہری وابستگی کے سال ہیں۔ اور میں یہ کہوں کہ میرے ادبی سفر میں اگر "شب خون" کا ساتھ نہ ہوتا تو آج میں کہیں نہ ہوتا تو یہ ہرگز غلط نہ ہوگا۔

آج ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو سب کچھ بہت تابناک دکھائی دیتا ہے، تابناک اور سنہرا۔ وہ ۱۹۶۰ کی دہائی تھی۔ ادب کا منظر نامہ تبدیل ہو رہا تھا۔ ترقی پسندی گھٹن پیدا کرنے لگی تھی۔ نئی آوازیں اور نئے لہجے سنائی دینے لگے تھے۔ تخلیقی ادب کا روپ رنگ بدل رہا تھا۔ ہر طرف نئے پن کا جشن تھا۔ نئے نئے رسالے بھی نئی نئی تحریروں اور نئے نئے ناموں کے ساتھ منظر عام پر آ رہے تھے اور جو نیا ہو رہا تھا، بہت اچھا ہو رہا تھا۔ اور یہ ادب جدید ادب کے نام سے جانا جا رہا تھا۔ اسی دور میں مطلع ادب پر "شب خون" نمودار ہوا، اور ہمیں ایسا لگا اور غلط نہیں لگا کہ ہمیں گوہر مقصود مل گیا۔ "شب خون" اپنے منہاج اور مزاج میں از سر تا پا نیا تھا۔ "شب خون" ادب کی نئی نسل کے لئے اظہار کے بامعنی کھلے پن کا پروانہ راہداری ثابت ہوا۔ اس رسالے نے اردو ادب کی کائنات ہی بدل ڈالی، وژن بدل دیا، سوچ بدل ڈالی، معیار بدل دیا۔ ادب میں معنویت کی عمیق ترین گہرائیاں ڈھونڈ نکالیں۔ اس نے ادب ہر صنف اور تمام ادبی فرقوں کو متاثر کیا۔ "شب خون" نے نئی نئی صلاحیتوں کے انبار لگا دیے۔ پرانی صلاحیتوں کو نئی جلا بخشی۔ ادب کے پرانے خزانوں سے کتنے ہی ایسے جواہرات ڈھونڈ نکالے جن کا ہمیں علم نہ تھا اور علم بھی تھا تو نہایت سرسری تھا۔ "شب خون" ہی نے ہمیں بتایا کہ ماضی کی دریافت کے بغیر حال کی تعبیر نہیں ہو سکتی ہے۔ اس رسالے نے ادبی حوالے سے ترسیل اور ابلاغ کے معنی سمجھائے اور ادبی رویوں پر اتنے گہرے اثرات مرتسم کئے کہ ان کی حیثیت دوامی ہو گئی۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اسی دور میں میں نے بھی "شب خون" سے رشتہ جوڑا۔ وہ میری شاعری کے ابتدائی سال تھے۔ یہ "شب خون" کی کشادہ دلی تھی کہ اس نے ہم جیسے لوگوں کے لئے بھی اپنے دروازے وا کئے اور ہماری شعری دنیا کی آبیاری کی۔ اس فیض سے فیضیاب ہونے والے ہم اکیلے نہ تھے۔ آج کتنے ہی نام ہیں جو ادبی بزم میں پختگی کی عمر کو پہنچ گئے، اور وہ "شب خون" ہی کی دین ہیں۔ "شب خون" کا ہر شمارہ نئے ناموں سے مزین ہوتا تھا اور ہم حیران ہوتے تھے کہ یا رب، ہمارے خاکستر میں اتنی چنگاریاں ہیں۔ ادب کا پورا معاشرہ ابھی اس تماشے میں کھویا ہی ہوا تھا کہ "شب خون" نے تمت بالخیر کا اعلان کر دیا۔ اور ہمیں بس یہی لگا کہ ہمارے سروں سے محبت اڑ گئی۔

شاید "شب خون" نے اپنا کام پورا کر لیا۔ مگر اس نے اب تک جو کچھ کیا اس کا تذکرہ اور تجزیہ آئندہ مدتوں تک ہوتا رہے گا اور لوگ سوچتے رہیں گے کہ آخر وہ کون سے عوامل تھے جس نے "شب خون" کو اتنی کامیابی بلکہ بے پناہ کامیابی عطا کی۔ "شب خون" کے پہلے ادب ایک پٹی پٹائی لکیر تھا۔ "شب خون" نے اسے دریائے شور انگیز میں تبدیل کر دیا۔ ایسی کامیابی اور کامرانی جو "شب خون" کو ملی کہاں ملتی ہے اور کسے ملتی ہے؟

اب جب کہ "شب خون" تاریخ کے عجائب گھر میں محفوظ ہو چکا ہے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی عذر نہیں کہ انیسویں صدی اگر غالب کی وجہ سے جانی جاتی ہے تو بیسویں صدی کے ہم اردو والے "شب خون" اور شمس الرحمٰن فاروقی کے نام سے جانیں گے کہ "شب خون" دراصل شمس الرحمٰن فاروقی کا دوسرا نام ہے۔

رانچی — پرکاش فکری

● جب یہ اطلاع ملی کہ جون ۲۰۰۵ کے شمارے کے بعد ہم "شب خون" کے دیدار سے محروم رہیں گے تو ایسا محسوس ہوا کہ کوئی قیمتی چیز ہم کھونے جا رہے ہیں۔ یہ رسالہ دیگر ادبی رسالوں سے اپنی ایک الگ شناخت کا حامل رہا ہے۔ رسالے کے پہلے صفحے پر اداریہ کے بجائے معلومات سے بھرپور نکات ہوتے۔ کبھی اصطلاحات کی تشریح، کبھی مختلف ادوار میں نظریات یا نظریے کے متعلق مثبت رویوں پر مبنی معلومات۔ پھر انگریزی اور دیگر زبانوں کے بعض اہم ادبی مسائل و موضوعات سے روشناسی کا ایک وسیلہ "شب خون" ہی رہا۔ مثلاً "شب خون" ۲۶۵ بابت فروری ۲۰۰۳ میں سرقہ یا توارد سے ہٹ کر ایک نئی بات سے آگاہی ہوئی، یعنی نقادوں کی غیر صحت مند تنقید کے خوف سے مصنفوں کا کسی دوسرے معروف مصنف کے نام سے جعلی کتاب تیار کرنا، یا اپنی ہی تصنیف کو "مصنف نامعلوم" کہہ کر شائع کرنا۔ ہم میں سے اکثر اس سے لاعلم رہے ہوں گے کہ عظیم عربی مصنف اور مفکر جاحظ کا بھی یہ طرز عمل رہا ہے۔ اس طرح کی نادر معلومات انگریزی، فرانسیسی، عربی، سنسکرت وغیرہ زبانوں سے اخذ کر کے ترجمے کے ذریعے "شب خون" کے قارئین تک پہنچائی جاتی تھی۔ اسی طرح کی ایک اور مثال شمارہ ۲۸۸ جنوری ۲۰۰۵ ہے جس میں William Darlymple کے مضمون The truth about Muslims سے ایک اقتباس بہ شکل ترجمہ ہم تک پہنچایا گیا ہے۔

اردو زبان و ادب کی تاریخ ہو یا "تضمین اللغات"، یا عمر شیخ مرزا اور بنی مادھو رسوا کے افسانے، غرض ہمیشہ نئے رنگ ڈھنگ سے "شب خون" کی محفل آراستہ ہوا کرتی تھی۔ آج کے سب سے گمبھیر مسئلے یعنی اردو رسم الخط کی مدافعت آپ نے "شب خون" کے محاذ سے ایک طاقتور، نڈر، اور بے باک سپاہی کی طرح کی اور بڑے موثر انداز میں کی۔

"کہتی ہے خلق خدا" کے تحت ادبی، معلوماتی، تحقیقی مباحث بعض

اوقات قارئین ''شب خون'' کے درمیان ہوتے اور کبھی کبھی خود مدیر کی شرکت ان مباحثوں میں ہونے کے باعث مدلل اور تشفی بخش جوابات سے قاری کی تشفی اور یکسوئی ہو جایا کرتی تھی۔ قارئین کی معلومات میں اضافہ اور شکوک و شبہات میں ازالہ ان بحثوں کا مزید فائدہ تھا۔

اس زمانے میں چالیس سے زائد عمر کے افراد ہی تک اردو زبان و ادب کا ذوق باقی رہ گیا ہے۔ لیکن خدا نظر بد سے بچائے آپ کی نسل کو کہ آٹھ سالہ تضمین آمنہ نے اپنے نانا جان کے رسالے کا سرورق ''سیر ساحل'' کے عنوان سے تیار کیا تھا (شمارہ ۲۵۳، فروری ۲۰۰۲)۔

''شب خون'' کے ساتھ اردو ادب کا ایک دور ختم ہوتا ہے، افسوس۔

حیدرآباد — لئیق صلاح

● آپ کو فون کیا تو معلوم ہوا آپ دہلی میں ہیں۔ ''شب خون'' کی تعزیت پیش کرنا تھی۔ یہ کس طرح ہوا؟ حالانکہ میں کب سے کہہ رہا تھا کہ اسے بند کر کے اپنا کام کیجئے لیکن اب بند ہونے کی خبر سے عجب طرح کا صدمہ ہو رہا ہے۔ خود آپ کا کیا حال ہوگا۔

لکھنؤ — نیر مسعود

● نیا ''شب خون'' دیکھا۔ خوشی ہوئی اور قلق بھی۔ خوشی ''شب خون'' کے جمال و کمال کو دیکھ کر قلق اس لئے کہ یہ بہار اب اپنے آخری دور سے گذر رہی ہے۔ علی گڈھ اور بیرون علی گڈھ سے کچھ لوگ اس حقیر فقیر سے بار بار پوچھتے ہیں کہ مشورہ دیں کہ ہم کہاں چھپیں۔ میں کہتا ہوں کہ میں خود تذبذب کے عالم میں ہوں۔ پھر ان حضرات کا تاثر میرے بارے میں یہ ہوتا ہے کہ یہ تو ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلا۔ اس ناچیز کو شہرت اور عزت اسی سے ملی ہے، اس لئے بے تاب ہوں کہ کم سے کم دو غزلیں کسی طرح ہو پائیں جو معیاری تو ہوں۔ بس ذہنی انتشار و اضمحلال مانع ہے۔

علی گڈھ — سید امین اشرف

● کوئی سرگوشی کرتا ہے۔ اب کیا لکھوگے؟ کس کے لئے لکھوگے؟ کون کہے گا، شفیع یہ تمہارا افسانہ نہیں ہے، اس میں تمہاری زبان نہیں ہے، وہ حزن و ملال کا سایہ کہاں ہے؟ وہ ہلکا سا اسرار کہاں ہے، جو تمہارے افسانوں کی خصوصیت ہے؟ یار واپس تو نہیں کرتا، فائل میں رکھ لیتا ہوں، تم چاہو تو کہیں اور چھپوا لو۔ آپ بتائیں اب ہم لوگ کیا کریں؟ لگ بھگ چالیس برس کے بعد لگتا ہے کہ یکا یک دشت کے سناٹے میں کھڑا ہوں، خالی ہاتھ، خالی دل لئے ہوئے۔ مجھے ڈر لگنے لگا ہے کہیں یہ لرزتا ہوا خالی دل میرا ساتھ نہ چھوڑ دے۔ لیکن اس سے قبل میں اپنا خون معاف کرتا ہوں۔ اللہ کریم آپ کو لمبی عمر عطا فرمائیں اور بہترین صحت کے ساتھ تادیر آپ کا سایہ ہم جیسے دور افتادہ پر قائم رکھیں۔ صدمے تو میں نے بہت سہے ہیں، کچھ سے آپ واقف بھی ہیں۔ لیکن ''شب خون'' کا بند ہو جانا صدمہ عظیم ہے۔ لگتا ہے سر پر آسمان نہ رہا۔

پٹنہ — شفیع جاوید

● ''شب خون'' کا پہلا صفحہ پڑھ کر مجھ پر رنج و غم کا جو پہاڑ ٹوٹا ہے، جو قیامت گذری ہے، بس میں ہی جانتا ہوں اور میرا خدا۔ آخر اس زبان و ادب کو اور کتنی مصیبتوں سے دوچار ہونا ہے۔ یہ سب کچھ میرے لئے اور ہزاروں مجھ جیسوں کے لئے ایک عجب سانحہ ہے۔ کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ خدا جانے کن حالات کے تحت آپ نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ شاید اللہ تبارک تعالیٰ کوئی صورت نکال دے اور آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی زحمت کریں۔

نجیب آباد — جلیس نجیب آبادی

● آپ نے ''شب خون'' بند کرنے کا فیصلہ کر لیا اور وہ بھی ایسے وقت میں جب ''سویرا'' سکڑ گیا، ''نیا دور'' بند ہوا، ''نقوش'' محمد طفیل کے بعد زندہ در گور، ''فنون''، ''اوراق'' اور ''ادب لطیف'' سست ہیں، ''ماہ نو'' کا معیار خواب و خیال ہوا۔ یہ سب دیکھ کر فیصلہ کیجئے گا۔ اگر واقعی ''شب خون'' بند ہو رہا ہے تو بھی اپنا تازہ افسانہ میں ''شب خون'' کو پڑھنے کے لیے بھجوا رہا ہوں (بے شک شائع نہ ہو) اس یاد کے ساتھ کہ میرا پہلا افسانہ ن۔م۔ راشد صاحب کی معرفت ''شب خون'' تک پہنچا تھا، ایران سے ہوتا ہوا، اور یہ چونتیس برس ادھر کی بات کی ہے۔

لاہور — مرزا حامد بیگ

● ''شب خون'' بند ہونے کا افسوس ہے۔ کچھ آدمی کو بھی مجبوریاں ہیں دنیا میں۔

علی گڈھ — شہریار

● ''شب خون'' کے بند ہونے کا اعلان پڑھ کر اس قدر صدمہ تھا کہ خط لکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی مجھے یقین تھا کہ آپ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کریں گے، لیکن شمارہ نمبر ۲۹۲ میں ''شب خون کا آخری شمارہ'' کی تفصیلات نے مجھے دوبارہ ایک گہرے صدمے سے دوچار کر دیا۔ اتنا بڑا دکھ تو ''کتاب'' اور ''پیکر'' بند ہونے پر بھی نہیں ہوا تھا۔ ادب کے جمود کو توڑنے کے دعوے کے ساتھ ''شب خون'' آسمان ادب پر آفتاب نو کی مانند نمودار ہوا تو خواب و خیال کی وادی میں جینے والے ادیبوں اور قارئین میں ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ ارض ادب کی اس نئی کروٹ نے انھیں چونکایا ہی نہیں، متاثر بھی کیا۔ زنگ آلود قلم میں نئی چمک آئی تو ہر لفظ کو نئی زندگی ملی۔ بھولے بسرے پرانے لوگوں کے ساتھ نئے نئے لکھنے والوں کو بھی کاروان ''شب خون'' میں شامل ہونے کا موقع ملا اور ایسا عظیم و درخشاں سلسلہ قائم ہوا کہ مخالفین بھی اس میں جگہ پا کر فخر محسوس کرتے تھے۔

''شب خون'' نے اپنے معیار و مزاج سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ اس کے باوجود نئے ادیبوں کی ایک لمبی قطار ہے جسے ''شب خون'' نے جہان ادب میں روشناس کرایا اور آج وہ اپنے معیاری تخلیقات کے سبب جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ یقیناً وہ تمام حضرات بھی میرے اس درد میں شامل ہوں گے۔ ویسے اس کا بے حد افسوس و ملال ہے کہ بند کرنے کے اعلان سے پہلے آپ نے ہم سے مشورہ نہیں کیا۔ بس اچانک ہی بند کرنے کا فیصلہ...؟ کیا آپ ہمیں اپنے دکھ درد کا ساتھی نہیں سمجھتے؟

موتی ہاری — فاروق راہب

● ''شب خون'' کے بند ہونے کی خبر پڑھ کر بہت رنج ہوا۔ اسے بند نہ کریں۔ اگر مالی وسائل کی کمی کے باعث پرچہ بند ہو رہا ہے تو میں اپنی حیثیت کے مطابق اعانت کرنے کو تیار ہوں۔

حیدرآباد — ہوشنگ مرچنٹ

● آپ "شب خون" کو بند کرنے کے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ اس وقت کوئی دوسرا ایسا معیاری ادبی پرچہ نہیں ہے جو ہر مہینے باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہو۔ آپ کی مصروفیات اور مجبوریاں اپنی جگہ مگر "شب خون" جیسا معیاری اور وقیع پرچہ اردو زبان وادب کو دوبارہ شاید ہی میسر ہو سکے گا۔ کاش ہم قریب ہوتے اور آپ کا ہاتھ بٹا سکتے۔ لیکن مالی تعاون کے لئے ہم اب بھی تیار ہیں۔ اس سلسلے میں یقیناً آپ کو بھی احباب اور اہل ادب نے "شب خون" بند کرنے کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی درخواستیں بھیجی ہوں گی۔ امید ہے آپ ان کو لائق اعتنا سمجھیں گے۔ آپ نے جب سے "شب خون" کو بند کرنے کا اعلان کیا ہے، بھی احباب پریشان ہیں۔

اسلام آباد — منشایاد

● "شب خون" کی اشاعت بند ہونے کا اعلان پڑھ کر بہت رنج ہوا ہے۔ گذارش ہے کہ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی فرمائیں اور اسے بند کرنے کے بجائے اس کی اشاعت کو جاری رکھنے کا جلد اعلان فرمائیں۔ اگر کسی وجہ سے "شب خون" کو ماہنامے کی شکل میں جاری رکھنا ناممکن ہو تو اسے سہ ماہی، ششماہی یا سالانہ کر دیا جائے۔ ایک صورت "ادب لطیف" اور "نقوش" جیسی بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی اس کے ضخیم نمبر ہی شائع کیے جائیں۔ کیوں نہ ایک سہ ماہی، ششماہی یا سالانہ سلسلہ ہو جس "شب خون" میں شائع شدہ تحریروں کو دوبارہ شائع کیا جائے؟ مثلاً افسانہ اور ناول، میر، غالب، اقبال وغیرہ پر جو مضامین "شب خون" میں شائع ہو چکے ہیں ان کی دوبارہ اشاعت ہو اور ساتھ میں موضوع سے متعلق نئے اور تازہ مضامین بھی شامل اشاعت کیے جائیں۔

"شب خون" کو زندہ رہنا چاہئے۔ آپ نے اس کو باد مخالف میں جاری کیا اور زندہ رکھا۔ "شب خون" اب ایک شناخت، ایک روایت بن گیا ہے۔ اس کو بند کرنا ایک المیہ ہوگا۔

اجین — نصرت سلطانہ

● "شب خون" سے اپنی محبت کے تیس سالہ سفر میں، میں اس ناخوشگوار تصور سے کبھی آشنا ہی نہیں ہوا کہ شیطان کے کان بہرے، "شب خون" کبھی بند بھی ہو سکتا ہے۔ یہ نہ صرف میرے لئے بلکہ پوری اردو دنیا کے لئے تشویشناک خبر ہے کہ "شب خون" اب اپنا سفر موقوف کرتا ہے۔ جہاں تک آپ کی ادبی سرپرستی کا سوال ہے تو وہ تقریباً دو نسل کے لئے ایک اسطور بن چکی تھی جس کے اعتراف میں سارا عالم یک زبان ہے۔ آپ کی اساطیری شخصیت کی بدولت "شب خون" نے ادبی صحافت میں ایک ایسی تاریخ قائم کی جو کسی دوسری شخصیت کے لئے ممکن العمل نہ ہوگی۔ صبر آزما مراحل، نامساعد حالات، مخالفانہ آندھیوں میں بھی چراغ "شب خون" کا فروزاں رہنا ایک مثال نہیں، یہ وہ بنیادی معیار ہے جس پر صادق اترنا ادارت کی بنیادی شرط ہے۔

دانشورانہ، عالمانہ دیانتداری اور منصفانہ انتخاب واختیار کے پیمانے پر آپ کی قد آور شخصیت جس طرح صادق اتری وہ ماضی میں بھی نقید المثال ہے۔ آپ کی وسیع القلبی، روشن خیالی اور بے لوثی ادب کی محبت کے ذاتی سفر میں کتنوں کی معاون ثابت ہوئی اور آپ کو ایک نئی تاریخ کا خالق بنا گئی۔ غیر جانبداری، کسی بھی وابستگی کی انتہا پسندی اور جماعت بندی کے چھوٹے بڑے معاملات سے اوپر آپ کی شخصیت معاصرین اور بعد کی نسلوں کے لئے تقویت کا نادر سامان رہے گی۔

یوں تو ماضی کے ادبی رسالے مثلاً "نگار" و "نقوش" بھی مشہور رہے مگر کہیں بھی "شب خون" کے پہلے ورق کی مثال نہیں ملتی جہاں مشرقی اور مغربی ادبیات کے اقتباسات پوری جاں فشانی سے ترجمہ یا تلخیص کر کے پیش کئے جاتے رہے۔ بلکہ یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ اپنے پہلے ورق سے مکتوبات کے آخری کالم تک "شب خون" ہم لوگوں کو معاصر ادبی جہانوں کی سیر کراتا رہا ہے۔ نسلوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ ادب کے تخلیقی عمل میں "شب خون" جس طرح ادبا و شعرا کو مطالعے کی گہرائی پر مجبور کرتا رہا اس سے کم از کم دو نسلیں تو ضرور اردو میں مستفید ہوئیں۔

ایسا نہیں کہ میں یہاں پر آپ کی منہ دیکھی مدح خوانی کر رہا ہوں۔ میں فریادی ہوں کہ للہ آپ ہمیں "شب خون" سے محروم نہ کریں، خدانہ خواستہ یہ منحوس خبر اگر حقیقت بن گئی تو یہ میری زندگی کا یقیناً سب سے بڑا سانحہ ہوگا۔

مونگیر — راشد طراز

● میں ان متعدد قارئین میں سے ہوں جنھوں نے "شب خون" کے ہر شمارے کے مطالعے کو اپنا فرض جانا ہے۔ اور میرے علاوہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں قارئین اس بات کا اعتراف کرنے میں تامل نہ کریں گے کہ "شب خون" نے ان کی ذہنی تربیت کی، انھیں مشرق ومغرب کے ادب سے استفادہ کرنے کی سہولت فراہم کی، ان کی ادبی بصیرت وبصارت میں اضافہ کیا۔ پرچے کے بند ہو جانے کا قلق رہے گا۔ کاش یہ فیصلہ آپ ملتوی کر سکتے یا اسے منسوخ فرماتے۔

پونے — نور منیری

● "شب خون" کے بند ہونے کی خبر ایک المیہ سے کم نہیں۔ اس سے جدیدیت کی تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ "شب خون" اور "اوراق" دو ہی تو ایسے پرچے تھے جنھوں نے جدید ادب کی شمع روشن رکھی۔ اپنے فیصلے پر غور کیجئے یہ محض ایک پرچے کے بند ہونے کی بات نہیں، ایک بڑی تحریک کو دھچکا پہنچنے کا معاملہ ہے۔

اسلام آباد — رشید امجد

● ٹھیک ہے۔ رموز مملکت خویش خسرواں دانند۔ "شب خون" سے آپ ہمیں محروم کر دینا چاہتے ہیں، اس کی کوئی نہایت معقول وجہ تو ہوگی ہی۔ مگر قارئین کی آنکھیں جو اس کے انتظار میں بچھی رہتی تھیں ان کا کیا ہوگا؟ اتنی حواس باختہ تو میں اپنے معذور بیٹے سعدی کا ایکسیڈنٹ ہو جانے پر رہی ہوئی تھی۔

دہلی — بلقیس ظفیر الحسن

● میری دانست میں "شب خون" کا کوئی خاص نمبر نہیں شائع ہوا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ "شب خون" کا عام شمارہ بھی خاص نمبر کا درجہ رکھتا تھا۔ قارئین کا یہی تاثر رہا کہ "شب خون" کا دوسرا نام شمس الرحمن فاروقی، اور شمس الرحمن فاروقی کا دوسرا نام "شب خون" ہے۔ کچھ دنوں تک اس کی اشاعت میں بے قاعدگی رہی، لیکن ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ نے اس کے لئے اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کر دیا۔ اردو میں ادبی رسالہ کس قدر جان جوکھم کا کام ہے، اس کا اندازہ مجھے "شاخسار" کے زمانے سے ہے۔ "شب خون" آپ ہی کا

رسالہ بلکہ ہم سب کا رسالہ تھا۔ اس کے بند ہونے کا ہم سب کو قلق اور رہے گا۔

"شب خون" کا نیا شمارہ ہاتھ آتے ہی سب سے پہلے ہماری نگاہیں آپ کی تحریر تلاش کرتی تھیں۔ کسی شمارہ میں آپ کی تخلیق نہ ہو تو ہمیں بڑی مایوسی ہوتی تھی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ کی گوناگوں ادبی شخصیت کا اہم ترین ترجمان "شب خون" ہی تھا۔ آپ کا انداز نقد نیاز فتح پوری کے بعد کسی کو نصیب نہ ہوا۔ لیکن آپ نے خود کو محض تنقید تک محدود نہ رکھا، بلکہ تحقیق، علم العروض، تبصرہ نگاری، اصول تالیف لغت، تاریخ ادبیات، اصول داستان گوئی، میر و غالب و اقبال شناسی کے علاوہ تخلیقی سطح پر شاعری، افسانہ نویسی اور ناول نگاری کے بھی میدان میں نوادر روزگار پیش کئے۔ آپ نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس کا حق ادا کر دیا۔

"شب خون" میں چھپنے والی ہر تخلیق دعوت غور و فکر دیتی تھی۔ مثلاً اداریہ کے بجائے آپ پہلے صفحے پر کسی بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب، یا پھر ہماری اپنی روایت کے بڑے لکھنے والوں کی مفکرانہ تحریروں کا ترجمہ یا اقتباس پیش کرتے تھے جس سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا تھا۔ "سوانحی گوشے" کا سلسلہ بھی گویا معلومات کا انمول خزانہ تھا۔ مثلاً شمارہ ۲۹۲ میں آپ نے مسعود بک کا ذکر کیا ہے۔ ان کے نام سے میں واقف بھی نہ تھا۔

"شب خون" کے صفحات پر جو ادبی مباحث پھیلے ہوئے ہیں وہ ادب اردو کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ لہٰذا آپ خصوصی شمارے میں ان مباحث کی تلخیص ضرور پیش کیجئے گا۔ یوں تو آپ نے طرح طرح کے تجربوں کے لئے "شب خون" کے صفحات وقف کر دیئے تھے لیکن آپ کے ثقافتی فکشن کی بات اور تھی۔ اسے شروع کرنے پر ختم کرنے تک ہمیں چین نہ آتا تھا۔ محسوس ہوتا تھا آپ کے کردار ہمارے گرد و پیش کے چلتے پھرتے جیتے جاگتے کردار ہوں۔ ان کرداروں کے ماحول اور ہمارے اپنے معاشرے کے مابین بعد زمانی کے باوجود کسی قسم کی دیوار حائل نہیں نظر آتی تھی۔

آپ سے فون پر جو گفتگو ہوئی تھی اس میں آپ نے بتایا تھا کہ آپ کو داستان پر کام مکمل کرنا ہے، "تضمین اللغات" کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے، اور ناول کو مکمل کرنا ہے۔ انھیں کاموں کے سبب آپ "شب خون" کو بند کر رہے ہیں۔ ہم بارگاہ الٰہی میں دعا گو ہیں کہ آپ اپنے مقاصد کی تکمیل میں کامیاب ہوں۔ آپ سے یہ بھی درخواست ہے کہ یہ کام ختم ہو جائیں تو "شب خون" کے دور ثانی کا آغاز کیجئے گا۔

کٹک — کرامت علی کرامت

● کوئی چالیس سال پہلے اپنے دور طالب علمی میں جب میں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا تب "شب خون" میرے ساتھ تھا اور آج تک ساتھ رہا ہے۔ "شب خون" سے جو ذہنی لگاؤ مجھے ہے اس کا اظہار ممکن نہیں۔ آپ نے اچانک اس کے بند ہونے کا اعلان کیا تو میرے ذہن پر بجلی سی گر گئی ہے۔ میں نہیں جانتا وہ کون سے حالات ہیں، وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بنا پر آپ نے یہ فیصلہ کیا۔ پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ فاروقی کو "شب خون" کی ضرورت نہ ہو لیکن "شب خون" اور فاروقی کی ضرورت ہم کو ہے۔ "شب خون" کا بند ہونا میرے لئے ایک بہت بڑا المناک سانحہ ہے۔ براہ کرم آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔

حیدر آباد — یٰسین احمد

● "شب خون" نہ صرف یہ کہ ایک شاندار ماہنامہ ہے بلکہ میرے نزدیک نقاد ادبی اور نئے ادب کا بھی نظریہ ساز پرچہ رہا ہے۔ بہت مخالف حالات میں "شب خون" کا اجرا ہوا۔ اس نے بہت سے معرکے سر کئے اور بالآخر ایک واضح اور عہد ساز روش اختیار کی۔ آپ کی ادارت میں اس پرچہ کا معیار اعلیٰ اور سب سے جدا تھا۔ کاش یہ بند نہ ہوتا۔ مجھے تو شروع سال اشاعت ہی سے اس رسالے کا قاری ہونے کا شرف حاصل ہے اور آپ کی ذہانت اور طباعی اور مدبرانہ تدبر کا میں بہت قائل ہوں۔

دہلی — رفعت سروش

● یقین نہیں آتا کہ "شب خون" ۲۸۹ کے صفحۂ اول پر جو کچھ پڑھا، وہ واقعی سچ ہے۔ دل سے کئی بار آواز نکلی، خدا کرے یہ سطور کسی بھول چوک کی بنا پر چھپ گئی ہوں۔ مگر "شب خون" جیسے سنجیدہ، باوقار اور محترم پرچے میں ایک لفظ بھی بغیر کسی احتیاط کے نہیں چھپتا تو پھر یہ پوری تحریر کیسے چھپ سکتی ہے۔ باور کرنا پڑ کہ "شب خون" سے جون ۲۰۰۵ کے بعد ہم واقعی محروم ہو جائیں گے۔ یقین کیجئے، اس خبر سے ذہن کو ایسا جھٹکا لگا ہے کہ میں ابھی تک سنبھل نہیں پایا ہوں۔ "شب خون" ہی ایک ایسا پرچہ ہے جس کا میں انتظار کرتا ہوں اور جس دن پرچہ آتا ہے میں سارا دن خوش رہتا ہوں۔ افسوس کہ اب اس خوشی سے محروم ہو جاؤں گا۔ میں رسماً نہیں کہہ رہا ہوں، یہ حقیقت ہے کہ "شب خون" ایک مکمل ادبی پرچہ ہے۔ میرے ذہن میں ادبی رسالے کا جو تصور ہمیشہ سے رہا ہے، "شب خون" اس کے عین مطابق ہے، ایسا رسالہ جس کی تقلید نہ صرف دوسرے ادبی پرچے کرنے پر مجبور ہوتے ہیں بلکہ جو پڑھنے والوں کے ساتھ ساتھ لکھنے والوں کی بھی ذہنی تربیت کرتا ہے، ایسا پرچہ جو رجحان ساز ہے۔ اور اسے اس بلندی پر آپ کے اعلیٰ ذوق اور شبانہ روز محنت و جستجو نے پہنچایا ہے۔ آپ خود ہی غور فرمائیے، پورے برصغیر میں "شب خون" جیسا کوئی دوسرا پرچہ کہاں ہے؟ اور پھر بھی آپ اسے بند کر رہے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسباب کیا ہیں۔ اتنا قیاس کر سکتا ہوں کہ آپ نے پرچہ بند کرنے کا فیصلہ جن وجوہ سے کیا ہوگا، وہ بہت مضبوط ہوں گی۔ اگر آپ ان اسباب کا اظہار بھی کر دیتے تو شاید "شب خون" کے قارئین کو کچھ اطمینان نصیب ہو جاتا۔

ادبی پرچے نکل رہے ہیں۔ نئے جریدے بھی نکلتے رہیں گے۔ لیکن اتنا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ "شب خون" جیسا پرچہ اب شاید نہ نکلے گا اور اس منفرد رسالے کی کمی اس کے چاہنے والے ہمیشہ محسوس کریں گے۔ میرے پاس "شب خون" کے جتنے بھی شمارے ہیں میں نے انھیں بہت سنبھال کر رکھا ہے اور اکثر انھیں پڑھتا ہوں اور آئندہ بھی پڑھتا رہوں گا کیونکہ "شب خون" میں چھپنے والے مضامین نظم و نثر مستقل نوعیت کے ہیں۔ اور ان کی افادیت و اہمیت کبھی ماند نہیں پڑے گی۔ ذرا غور کر لیجئے، شاید کوئی صورت ایسی ہو کہ "شب خون" کی اشاعت جاری رہ سکے۔

بلیک برن، انگلستان — ش صغیر ادیب

● "شب خون" کا تازہ شمارہ کیا ہاتھ میں آیا کہ ہاتھوں کے طوطے اڑ

گئے، پیروں تلے زمین کی پرتیں سرک گئیں، پینتیس چھتیس سالہ "شب خونی" نشہ ہرن ہوگیا۔ ایسا لگا کہ ذہن مفلوج ہوگیا ہو۔ صفحہ نمبر ایک پر اس اطلاع کو پڑھنے کے بعد اس تازہ شمارے میں مزید کیا ہے، یہ دیکھنے کی بھی خواہش نہیں رہی۔ دل پر عجب طرح کی اداسی چھا گئی۔ ظاہر ہے اکیسویں صدی کے اردو ادب پر اس سے بڑا سانحہ کیا ہو سکتا ہے کہ اس کے آغاز میں ہی بیسویں صدی کے منفرد ادبی جریدے "شب خون" کے بند کرنے کا اعلان سنا دیا جائے۔ میں نے اپنے چھوٹے سے کتب خانے میں محفوظ تقریباً پینتیس برسوں کے شماروں پر حسرت سے نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ "شب خون" اپنے قارئین کی ضرورت نہیں بلکہ عادت بن گیا ہے۔ کوئی چار دہائیوں پرانی اس عادت کو ایک اعلان نامے کے تحت ایک لمحہ میں بھلا کیسے الگ کیا جا سکتا ہے؟ یہ عادت صرف میری نہیں بلکہ "شب خون" کی پروردہ ایک نسل کی عادت ہے۔

"شب خون" کی ترتیب و تزئین میں یقیناً آپ کی قیمتی زندگی کا بہت بڑا حصہ صرف ہوا ہے۔ لیکن جہاں تک میرا ناقص خیال ہے آپ کی دستار بندی کا باعث بھی بہت کچھ یہی "شب خون" رہا ہے۔ ممکن ہے اب آپ کو وقت کی کمی درپیش ہو اور اس قیمتی وقت کے مناسب ترین مصرف کا کوئی اور بڑا منصوبہ یا مشن آپ کے ذہن میں موجود ہو کیوں کہ آپ کا قلم نئے نئے میدان تلاش کرنے کا عادی ہے۔ ایسی صورت میں بھی سرسید کے "تہذیب الاخلاق" کے التوا اور تجدید اشاعت کی تاریخ دہرائی جا سکتی ہے۔ یعنی "شب خون" کے کسی شمارے کے آخری ہونے کا اعلان کرنے کے بجائے کچھ وقت کے لیے اس کو موقوف رکھنے کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔

واجد قریشی
اجین

● آپ کا خط پا کر بہت خوشی ہوئی لیکن ساتھ ہی دکھ بھی کہ "شب خون" بند کیا جا رہا ہے۔ مگر "شب خون" کی لامتناہی مہک ہمیشہ ادب کی اقلیم میں پھیلی رہے گی، جب تک اردو ادب ادھر، ادھر زندہ رہے گا تب تک "شب خون" بھی تابندہ رہے گا۔ "شب خون" کے ادب نے بڑے جادواں اور نکہت فشاں ادوار دیکھے ہیں ترقی پسندی سے لے کر امتزاجیت تک، اور ہر تحریک سے سرخرو ہو کر نکلا ہے۔ آپ کے کسی اور کام پر نظر جائے کہ نہ جائے، مگر "شب خون" کی ادارت سدا آپ کے لئے ان مٹ امارت بنی رہے گی۔

ناصر شہزاد
اوکاڑہ

● اچانک علم ہوا کہ آپ "شب خون" کی اشاعت کسی وجہ سے بند کر رہے ہیں۔ بخدا مجھے ایسا دھکا لگا جیسے کسی عزیز دوست کی موت کی خبر سن کر لگتا ہے۔ عموماً پولیس والے بے حد شقی القلب سمجھے جاتے ہیں مگر یقین جانیے میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے حالانکہ میں راسخ العقیدہ سنی بھی ہوں۔ اشاعت کا سلسلہ ترک کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں لکھی گئی ہے۔ اگر کوئی ایسا معاملہ ہو جو میری خدمت سے سلجھ سکتا ہو تو میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔

گذشتہ چالیس برس میں اس موقر رسالے نے ادب اور تنقید اور تحقیق کی جو خدمت کی ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی سے ممکن نہیں ہے۔ آپ نے اپنی بے حد مصروف زندگی اس کی نذر کر دی ورنہ ممکن ہے کہ "شعر شور انگیز" جیسی اور کئی کتابیں ادب کے طلبا اور علما کے علم میں وقیع اضافہ کرتیں۔ میں ادب کا بے حد معمولی طالب علم ہوں مگر دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے "شب خون" کے ذریعے جو معائیر قائم کیے وہ بڑے بڑے نہیں نباہ سکتے۔ ادارت، دیانتداری کی جو مثال آپ نے قائم کی وہ بے نظیر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ آپ اردو میں جدیدیت کے امام ہیں لیکن آپ نے بلا تفریق تحریر و نظریات سب کی کاوشوں کو اپنے رسالے میں جگہ دے کر نہ صرف بہتوں کو بڑا بنایا بلکہ اردو ادب میں گرانقدر اضافوں کے بھی موجب ہوئے۔

میری آپ سے ایک مرتبہ پھر درخواست ہے کہ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی فرمائیں۔

سید محمد افضل
گوالیار

● حیرت اس بات پر ہے کہ آپ نے کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ "شب خون" کیوں بند کر رہے ہیں۔

آپ کا ہر قاری یہ ضرور پوچھے گا کہ:

کیا مالی خسارہ ہو رہا ہے؟

کیا نظم و نسق میں کچھ دشواریاں ہو رہی ہیں؟

کیا آپ کو معیاری مضامین نہیں مل رہے ہیں؟

اور جب آپ کے حلقے کا ہر فرد اس نتیجے پر پہنچے گا کہ ایسی کوئی بات نہیں، تو پھر وہ پوچھے گا کہ حضرت عالی مقام آپ پھر کیوں یہ ظلم ڈھا رہے ہیں؟ آپ نے یہ سوچا ہی نہیں کہ "شب خون" کے پڑھنے والوں میں ہر صف ماتم بچھ جائے گی۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ "شب خون" کے لئے ان کے دل میں کتنی محبت ہے۔ "شب خون" کے عاشقوں کا یہ حال ہے کہ وہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ سے "شب خون" کا انتظار شروع کر دیتے ہیں۔ بڑی بے قراری سے گھر میں پوچھتے ہیں "شب خون" آیا؟ ڈاکیے سے پوچھتے ہیں، آج کی ڈاک میں "شب خون" تو نہیں آیا؟ ڈاک خانے جا کر پوچھتے ہیں، بھئی "شب خون" کیوں نہیں آ رہا ہے؟

اب سوچئے کہ اس اعلان کے بعد ہمیں کیا کہنا باقی رہ جائے گا۔ چپ سی لگ گئی ہے۔ ذرا سوچئے کہ دو تین شماروں کے بعد "شب خون" بند ہو جائے گا تو پھر لوگ کیا پڑھیں گے؟ کیا ہم لوگ الٹے قدموں چل کر چالیس سال پہلے کی دنیا میں آ جائیں گے؟

احمد یوسف
پٹنہ

● ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ "شب خون" سے تمام تر جذباتی رشتوں کے باوجود ہمارے لئے آپ کی صحت اور سلامتی مقدم ہے اور جب مسئلہ آپ کو زحمت میں ڈالنے اور "شب خون" کی زندگی کے درمیان ایک کو منتخب کرنے کا ہو تو فیصلہ آپ کے حق میں ہوگا ور "شب خون" یا اس جیسی کوئی بھی قیمتی شے گنوا دینا نقصان کا سودا نہ ٹھہرے گا۔ لیکن کوئی درمیان کا راستہ بھی اگر نکل سکے اور آپ کے مزاج پر اس کا ناگوار اثر نہ ہو تو اس پر غور کر لینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔ اس موضوع پر ہم لوگوں نے غور کیا اور ایک خیال یہ آیا کہ اگر ماہنامہ "شب خون" سہ ماہی یا تھوڑے اور وقفے کے ساتھ آپ کو زحمت میں ڈالے بغیر نکل سکے یا اس طرح کا کوئی اور راستہ ہو جس میں آپ کم سے کم زحمت میں پڑیں اور "شب خون" بھی نکلتا رہے تو کیا حرج ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس طرح "شب خون" نے ہمارے مزاج کی تہذیب اور ہماری تربیت کی ہے وہ سلسلہ جاری رہے تو ہم

سب کے لئے بہتر ہوگا۔ یہ بات بھی طے ہے کہ آپ سے زیادہ محبت ہم "شب خون" سے نہیں کر سکتے پھر اس (رسالے نہیں تحریک) کو بند کرنے کا اعلان کرنے کے لئے آپ کو کس کرب سے گذرنا پڑا ہوگا۔

آپ "شب خون" میں اشاعت کے لئے موصول شدہ تخلیقات پر جتنا غور اور جتنی محنت صرف کرتے ہیں (اور اس باعث جو تعب برداشت کرتے ہیں) اتنی محنت شاید ہی کوئی مدیر کرتا ہو یا کر سکتا ہو۔ ایسی اطلاعات ہیں کہ آپ سے کچھ زیادہ ہی "محبت" کرنے والے حضرات اس اعلان پر خوش بھی ہیں۔ لیکن علی گڑھ میں تو اس اعلان پر ہر ایک افسوس کا اظہار ہی کرتا نظر آیا کچھ بڑی حسرت سے کہہ رہے تھے کہ اب ہم اشاعت کے لئے اپنی چیزیں کہاں بھیجیں گے اور کس رسالے میں شائع ہونے پر فخر کریں گے؟

علی گڑھ — سراج اجملی

● تازہ "شب خون" میں یہ اعلان پڑھ کر بے حد قلق ہوا کہ تم اسے بند کر رہے ہو، پتہ نہیں تم یہ فیصلہ کرنے پر کیوں مجبور ہوئے، لیکن ایک وجہ تو یہی ہے کہ تم صحت کی تکالیف کے باوجود کیسے ہی اس کی دیکھ ریکھ کرتے رہے ہو، اور رسالہ کی ایڈیٹنگ کے ایک پیچیدہ اور صبر آزما کام کو انجام دیتے رہے ہو۔ اور یہ اب شاید تمھارے لئے بیحد مشکل ثابت ہو رہا ہو۔ میرا بھی اس قبیل کا ایک چھوٹا سا تجربہ رہا ہے۔ "جہات" کے اجرا کو تقریباً پانچ سال ہو گئے، لیکن دو ہی چار سال کے بعد ہی میری سانس پھول گئی۔ "شب خون" بند ہونے کا رنج سب کو ہوگا، ایسا رجحان ساز رسالہ کہاں ملے گا؟

سری نگر — حامدی کاشمیری

● "شب خون" کے بند ہونے کی خبر مجھے ساقی فاروقی اور پھر شمارہ ۲۸۹ سے ملی۔ یہ خبر بے حد شاق گذری کہ اڑتالیس سال کے بعد یہ رسالہ بند ہو جائے گا۔ ہزاروں لوگوں کی طرح مجھے بھی آپ کی خیال افروز، خلاقانہ اور فیض رساں تحریروں کی کمی محسوس ہوتی رہے گی۔ بے شک "شب خون" کے بند ہونے سے جو خلا پیدا ہوگا وہ کبھی بھی بھر نہ سکے۔ بہر حال، مجھے امید ہے کہ "شب خون" کتاب گھر کے توسط سے آپ کی تحریریں ہم تک پہنچتی رہیں گی، خاص کر ان موضوعات پر جن میں آپ سے بہتر کیا، آپ کے برابر اس وقت کوئی نہیں ہے۔ میں آپ کی اور آپ کے اہل خانہ کی طویل زندگی اور صحت اور مسرت کی دعا کرتا ہوں۔

لندن — عدیل یوسف صدیقی

● یہ روح فرسا خبر ملی کہ "شب خون" بند کیا جا رہا ہے۔ یقین نہیں آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کیا کبھی دل دھڑکنا بھی چھوڑ سکتا ہے یا سانسیں چلنا بھی موقوف ہو سکتی ہیں؟ "شب خون" تو ہماری عادت بن چکا ہے۔ ہم اس کے بغیر کیسے جی سکتے ہیں؟ میری اہلیہ جو خود بیمار ہیں انھیں بھی بڑا قلق ہوا۔ خدا کرے یہ خبر جھوٹی ہو۔ فاروقی صاحب یہ کیا ظلم کر رہے ہیں، ایک تاریخ ساز رسالہ بند کر رہے ہیں۔ ہمیں حکم دیں، ہم "شب خون" کے وجود کے لئے اپنی جانیں لڑا دیں گے۔ خدا ہم سب پر اپنا رحم کرے۔

کوٹا — عقیل شاداب

● "آج کی تاریخ سے کوئی نیا سالانہ خریدار بنایا جائے گا نہ کسی پرانی خریداری کی تجدید کی جائے گی۔" یہ فیصلہ کرتے ہوئے آپ کو اور آپ کے ہم کاروں کو کس قدر دکھ ہوا ہوگا دوسروں کو اس کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا۔ "شب خون" کے قلم کار اور قارئین بھی اس دکھ میں بہ قدر ظرف، یا بہ قدر احساس شراکت داری، شامل ہیں لیکن اب اس اظہار کا کیا حاصل؟

اپنا ہی ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ گذشتہ چند برسوں سے میرے گملوں میں پان کے پتوں جیسا ایک پودا بھی تھا۔ میری حرص کہ میں نے اسے زیادہ پھیلانا چاہا۔ اسے زیادہ کھاد دی، وہ سوکھ گیا۔ آج شام "شب خون" کا مطالعہ جاری تھا کہ گھر کی دیکھ بھال کرنے والی خاتون آئیں اور اس پودے کے اوصاف گنوائے: "اس کے پتے ہاضمہ درست کرنے کے کام آتے تھے، سردی زکام کو دور کرنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ کھانسی اور بلغم میں اکسیر کا کام کرتے، مضمحل اعضا کو توانا بناتے، دماغ کو طراوت بخشتے اور... اور..." میں نے کہا، "بس، بس۔ جب تک پودا زندہ تھا مجھ سے کسی بھی صفت کا ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ اب جب کہ وہ نایاب ہو چکا تو اس کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔"

مجھے یقین ہے کہ "شب خون" پر الزام تراشنے والے ہاتھ ملتے رہ جائیں گے کہ اب ان کے الزام کے لیے کوئی نشانہ باقی نہ رہا اور اب وہ "شب خون" کی صفات ہی بیان کرتے رہیں گے۔

حیدر آباد — قدیر زماں

● میرا اپنا خیال ہے کہ یہ خبر کہ "شب خون" اب بند ہو جائے گا، آپ کی صحت کے اور تندرستی کے ٹھیک رہنے کے مقابلے میں کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ مجھے یاد ہے ایک بار آپ نے مجھے لکھا تھا کہ سردی کا موسم آپ کے لئے بطور خاص پریشان کن ہوتا ہے۔ میں تو ہر وقت یہ سودا کرنے کو تیار ہوں کہ "شب خون" نہ ہو لیکن آپ صحت مند رہیں۔ درست کہ "شب خون" کا نہ ہونا تمام ادبی دنیا کے لئے زبردست دھکا ہوگا، لیکن وقت سارے زخم بھر دیتا ہے اور کبھی نہ کبھی کوئی شخص "شب خون" جیسا پرچہ پھر نکالے گا۔ لیکن اس وقت میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ اگر "شب خون" کو قائم رکھنے کے لئے میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں دل و جان سے تیار ہوں۔ ہر چند کہ میدان ادب میں آپ کے کارنامے بے شمار ہیں لیکن میں جب یہ خیال کرتا ہوں کہ آپ "شب خون" پر کس قدر توجہ اور وقت صرف کرتے تھے تو سکتہ سا ہو جاتا ہے۔ "شب خون" نکالنے پر آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لائق میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

نیپین، کناڈا — امنگ بالی

● میں "شب خون" کا قدیمی قاری ہوں۔ اس کی اشاعت بند ہونے کی خبر سے دل پر کیا گذر گئی کیا بتاؤں۔ گذشتہ تیس سال سے پوری اردو دنیا کے ادبی ماحول میں جدیدیت، "شب خون" اور آپ جس شان اور دھوم دھام سے موجود رہے ہیں اس کی مثال ناپید اور "شب خون" کا اسہام (Contribution) بے حد و حساب ہے۔ "شب خون" کے مخالف بھی یہ نکتہ خوب جانتے اور مانتے ہیں۔ "شب خون" نے جس قدر اعلیٰ سے اعلیٰ مباحث، شگفتہ سے شگفتہ تخلیقات، جدید سے جدید ترین تحریریں شائع کی ہیں وہ تنہا کسی فرد، جریدے یا ادارے کے

ذریعے یکجا نہیں ہوسکتی تھیں۔ "شب خون" نے ہمارے سنجیدہ علمی ادبی قارئین کی ذہنی تربیت کی ہے۔

علی گڑھ — مسعود مرزا نیازی

● آج کی ڈاک سے فروری کا شمارہ مل گیا۔ اعلان پر نظر پڑتے ہی سکتہ سا طاری ہوگیا۔ شرمسار ہوں کہ "شب خون" کی علمی یا عملی مدد نہ کرسکا۔ مگر صرف شرمسار ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ جگر صاحب نے شاید ایسے ہی موقع کے لئے کہا تھا

دل مطرب سمجھ سکے شاید — اک شکستہ رباب کا عالم

علی گڑھ — کبیر احمد جائسی

● شدید افسوس ہوا کہ آپ جون ۲۰۰۵ سے ہمارے محبوب جریدے "شب خون" کی اشاعت موقوف کررہے ہیں۔ آپ کے اس فیصلے کی وجوہات جو بھی ہوں لیکن آپ ہمیں ایک بہترین جریدے سے اور اعلیٰ وارفع نگارشات سے محروم کررہے ہیں۔ آپ نے اور "شب خون" نے مجھ جیسے بے حساب گمنام اور دور افتادہ لکھنے پڑھنے والوں کی مسلسل رہنمائی اور ہمت افزائی فرمائی ہے۔ آپ کی یہ بے لوث خدمت ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ "شب خون" جیسا عہد ساز رسالہ بند ہورہا ہے یہ سوچ کر رقت طاری ہورہی ہے۔ ہم مجبور محض ہیں کیا کرسکتے ہیں۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش وخرم اور صحت مند رکھے۔

اورنگ آباد — اسلم مرزا

● چالیس سال قبل آپ نے اردو ادب کے خلاف محاذ پر گویا شب خون مارا تھا۔ آج اگر حالات دیکھیں تو حالات مزید ابتری کی طرف ہی جارہے ہیں۔ ایسے میں "شب خون" کا بند ہونا، کیا کہا جاسکتا ہے، بہت بڑا سانحہ ہوگا۔ افتخار امام اور منصورہ احمد کی طرح کا کوئی شخص کاش آپ کو مل جائے جو معیار قائم رکھنا جاننے کے ساتھ کاروباری امور میں بھی بہت ہی بہتر ہو۔ میں کچھ کہوں گا تو چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی مگر کبھی کبھی بڑوں کو چھوٹوں سے بھی کچھ مل جاتا ہے۔ ایک بزرگ نے کسی بچے سے کہا، ذرا سنبھل کر چل نہیں تو گر جائے گا۔ بچے نے جواب دیا، مجھ سے زیادہ آپ سنبھل کر چلیں کیونکہ آپ کے پیچھے ایک ہجوم چل رہا ہے۔

اللہ کرے آپ اپنا ارادہ بدل دیں۔

ممبئی — محمد فاروقی

● "شب خون" کی اشاعت منقطع ہونے کی خبر سے زبردست دھکا لگا۔ تقریباً چار دہائیوں سے "شب خون" عالمی سطح پر اردو کی معتبر اور مستند ترین آواز تھا۔ اس امر کا اعتراف وہ لوگ بھی کرتے ہیں جن کا آپ سے نظریاتی اور ذاتی اختلاف رہا ہے۔ "شب خون" کے حوالے سے شعراء، افسانہ نگاروں اور دیگر قلم کاروں کی دو نسلوں نے اعتبار اور استناد حاصل کیا۔ "شب خون" کے بند ہونے سے یہ کڑی کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ مجھے پورے امید ہے کہ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں گے۔

مظفر پور — سکندر احمد

● پہلے صفحے پر نظر پڑتے ہی سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ یقین ہی نہیں آیا کہ کیا پڑھ رہا ہوں۔ بار بار پڑھا کہ شاید اس کا کوئی اور مطلب ہو، لیکن بے سود۔ فاروقی صاحب آپ کو شاید اندازہ نہ ہو کہ مذکورہ اعلان کرکے آپ نے ہم اور اردو والوں پر کیسی بجلی گرائی ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ کسی عزیز کے اچانک انتقال کی خبر سننے پر جو حال ہوتا ہے وہی کیفیت تھی۔ میرا خیال ہے کہ آپ اپنی خرابی صحت کی وجہ سے مجبور ہوں گے۔ ممکن ہے اور دوسرے مسائل بھی ہوں، پھر بھی آپ سے تہ دل سے درخواست ہے کہ اگر ذرا بھی گنجائش ہو تو خدارا اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ انتہائی مجبوری کی حالت میں یہ بھی تو ہوسکتا ہے رسالے کو دو ماہی کردیں، یہ بھی نہ ہوسکے تو سہ ماہی سہی، لیکن کم از کم اپنی حیات تک ہم لوگوں کو "شب خون" سے محروم نہ ہونے دیں۔

حالی سے "مسدس" لکھوا کر سرسید اتنے خوش ہوئے تھے کہ اسے اپنے لئے آخرت کا ذخیرہ سمجھ رہے تھے اور یوں لکھا تھا کہ خدا جب پوچھے گا کہ کیا لے کر آئے ہو تو کہوں گا کہ حالی سے "مسدس" لکھوا کر لایا ہوں۔ ہم بھی یہ توقع کرتے ہیں کہ اگر آپ ہم اردو والوں کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے "شب خون" کو جاری رکھ سکیں تو آپ کا یہ عمل آپ کے لیے بھی آخرت کا توشہ بن سکتا ہے۔

نئی دہلی — ارشد کمال

● یہ جان کر بے حد دکھ ہوا کہ "شب خون" کا کوئی شمارہ جون ۲۰۰۵ کے بعد شائع نہ ہوگا۔ میں یہ رسالہ تب سے پڑھ رہا ہوں جب اس کی قیمت محض ایک روپیہ تھی۔ آٹھویں دہائی میں اسے بحران سے گذرتے دیکھا تو نویں دہائی کے شروع سے اسے پابندی سے شائع ہوتے ہوئے بھی۔ اس تاریخ ساز رسالے نے اپنے ۳۹ برسوں میں نہ جانے کتنے قلم کاروں کی ذہنی آبیاری کی اور بے شمار قارئین کی ذہنی تربیت بھی کی۔ اس فیصلے کے پیچھے یقیناً کوئی بہت بڑی مجبوری رہی ہوگی۔

رانی گنج — اظہار الاسلام

● یہ خبر سن کر نہایت افسوس ہوا کہ "شب خون" بند ہورہا ہے۔ یہ پرچہ ادب کی ناقابل فراموش خدمات انجام دے رہا تھا۔ "شب خون" نے غزل کا جو معیار قائم کیا ہے اس سے شعرا کو نئی جہت ملی ہے۔ "شب خون" نے روایتی شاعروں کو جام و مینا اور گل وبلبل کی تنگنائے سے نکال کر نئے استعاروں سے روشناس کرایا اور غزل کو ایسا طرز عطا کیا جو فیشن ایبل جدیدیت اور ترقی پسندی کے انتہا پسند رویوں سے پاک ہے۔ اس رسالے کو بند کرنے سے جو خلا پیدا ہوگا اسے برصغیر ہندو پاک کا کوئی بھی دوسرا رسالہ پر نہیں کرسکے گا۔

سیکر — رشدہ سراج ارشد

● "شب خون" کے بند ہونے کا اعلان دلی صدمے کا باعث ہوا ہے۔ اس عہد ساز رسالے کے بند ہونے کے جو بھی اسباب ہوں، وہ میں تو کیا، کسی بھی قاری کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتے۔ "شب خون" نے نہ صرف قاری کی ذہن سازی میں اہم کردار ادا کیا بلکہ جدید قلم کاروں کو زبان وادب کے نت نئے آفاق سے روشناس بھی کرایا۔ شمس الرحمن فاروقی نے ہمارے کلاسیک کی بازیافت کی، تنقید کے قدیم وجدید سرمائے کو آئینہ دکھایا۔ اب یہ کام کون کرے؟ کئی چاند تھے سر آسماں، مگر "شب خون" جیسا چاند اردو ادب کے آسمان پر جدید ادب کے چاہنے والے بھلا اور کہاں ڈھونڈ سکیں گے؟

بیدر — حشمت فاتحہ خوانی

● یہ جان کر دلی رنج ہوا کہ "شب خون" کو بند کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا

ہے۔ یہ رسالہ تو اردو کی ادبی صحافت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے نہ ہونے سے جو خلا پیدا ہوگا وہ کس طرح پر ہو سکے گا، یہ سوچ کر دل پریشان ہے۔

علی گڑھ — زاہدہ زیدی

● میں اس ماہ "شب خون" کا انتظار کر رہا تھا کہ اسلم مرزا نے اطلاع دی، "شب خون" بند ہو رہا ہے۔ پھر انھوں نے تازہ شمارہ بھجوایا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے برسوں کا دوست بچھڑ رہا ہو۔ پرچے کا نکلنا، اس کی تیاریاں، اورنگ آباد اور دوسرے مقامات کا آپ کا دورہ، پھر الٰہ آباد کانفرنس، "شب خون" کے مباحث، ہنگامے، ایک پورے دور کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ ہم لوگوں کو صحیح معنی میں متعارف تو "شب خون" نے ہی کرایا۔ اس سے پہلے ہم یعنی وحید اختر، شاذ تمکنت، قاضی سلیم، شفیق فاطمہ شعریٰ، زبیر رضوی، چھپنے چھپانے تو لگے تھے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہماری الگ پہچان (وہ جیسی بھی کچھ ہو) بنانے میں "شب خون" کا بڑا حصہ ہے۔ آپ پرچہ بند کر رہے ہیں، آپ کی مجبوریاں ہوں گی۔ لیکن میری طرح کئی لوگوں کا دل چاہتا ہے کہ پرچہ نکلتا رہتا تو اچھا تھا۔ ویسے ہم لوگوں نے کیا کچھ نہیں پرچے کے لئے۔

اورنگ آباد — بشر نواز

● "شب خون" نے اپنے عرصۂ اشاعت میں ایک تاریخی ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کی عدم اشاعت مجھے ہمیشہ افسردہ کرتی رہے گی۔

نئی دہلی — بلراج کومل

● تازہ "شب خون" میں یہ خبر پڑھ کر دل افسردہ ہوا کہ "شب خون" اب بند ہو جائے گا۔ لیکن تمام اچھی چیزیں کبھی نہ کبھی ختم ہو ہی جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مدت مدید کی محنت کے بعد آپ چھٹی اور آرام کے پوری طرح حق دار ہو گئے ہیں۔ سبک دوش ہو جانا تو آپ کا انداز نہیں ہے اور آپ سبک دوش کبھی نہ ہوں گے۔ بس یہ ہے کہ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ کچھ دن ہوئے منیب الرحمٰن صاحب سے میری بات ہو رہی تھی۔ چالیس سال تک "شب خون" نے ادب کے میدان میں جو عظیم کردار ادا کیا ہے وہ زیر بحث رہا۔ میری دعا ہے کہ آپ اور آپ کے اہل خانہ تندرست رہیں، خوش رہیں اور آپ کے دن ایسے ماحول میں گذریں جس میں ذہنی یا جسمانی تعب نہ ہو۔

آٹوا، کناڈا — شاہین

● ادبی رسائل بہت ہیں اور رہیں گے۔ ایسے ماہنامے بھی بڑی تعداد میں ہیں جو سنجیدگی سے ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ لیکن ایسا کوئی رسالہ نہیں ہے، جس میں شائع شدہ سبھی مضامین ایمان کی حد تک یقین دلاتے ہوں، خود اعتمادی پیدا کرتے ہوں اور مختلف مواقع پر جن کی نظیر پیش کی جا سکتی ہو۔ "شب خون" واحد رسالہ ہے جس میں یہ خوبیاں موجود ہیں۔ رسالہ بند کرنے کے پس پشت مجھے جو اسباب نظر آتے ہیں وہ (الف) آپ کی علالت اور (ب) دیگر مصروفیات۔ لیکن "شب خون" بند ہونے کی خبر پڑھ کر ایسا صدمہ پہنچا کہ چند سکنڈ کے لئے حرکت قلب رک گئی۔ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ جو لوگ آپ سے، مجھ سے زیادہ قریب ہیں، مجھ سے زیادہ عقیدت رکھتے ہیں، ان کا کیا حال ہوا ہوگا۔ جریدے کو بند کرنے کے بجائے سہ ماہی کر دیا جائے تو بھی ہم تشنگان ادب سیراب رہ سکتے ہیں۔ آپ سے دست بستہ گذارش ہے کہ ہمیں اس تناور، سایہ دار اور باثمر درخت سے محروم نہ کریں۔ "شب خون" سے محرومی ہمیں یتیم بنا دے گی۔

گوپی گنج — دانش الٰہ آبادی

● صمیم قلب سے ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو پوری طرح صحت مند کر دے، آپ کی عمر میں اضافہ ہو، آپ حسب سابق پوری تندہی کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام انجام دیتے رہیں، "شب خون" کی اشاعت کے لیے ضروری مالی وسائل اور دیگر سہولیات ہمیشہ حاصل رہیں آمین۔ للہ "شب خون" کو بند نہ کریں۔ اس کی نہ صرف ہمیں بلکہ اردو کو سخت ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے لائق جو خدمت ہو، ہم حاضر ہیں۔ امید ہے "شب خون" بند کرنے کے فیصلے پر نظر ثانی فرمائیں گے اور اسے جاری رکھیں گے۔

ہم ہیں ٹونک کے طلبہ اور اراکین انجمن قارئین "شب خون"۔

ٹونک — حسن اقبال، ارشد عبدالحمید، صابر حسن رئیس، مہدی ٹونکی، سخاوت شمیم، شوق احسنی

● اس خبر سے ادبی دنیا میں مایوسی کی لہر پھیل گئی کہ "شب خون" جیسے اہم اور معتبر رسالے کی اشاعت بند کر دی جائے گی۔ چالیس سال تک شان دار ادبی خدمات انجام دینے کے بعد یہ فیصلہ ناقابل فہم ہے۔

کولکتہ — فراغ روہوی

● پہلے صفحے پر نظر پڑتے ہی جی دھک سے ہو گیا۔ میں خود "سربز" نکالتا ہوں اور ہر شمارے پر ہزاروں روپے کا خسارہ برداشت کرتا ہوں۔ "شب خون" نکالنے میں آپ کو بھی مالی دشواریوں کا یقینی طور پر سامنا ہوگا۔ نقصان بھی ہوتا ہوگا کہ رسالہ نکالنا کوئی منافع بخش سودا نہیں ہے اور پھر آپ کی صحت بھی تو اب اس کی اجازت نہیں دیتی کہ آپ اس کی طرف پورا دھیان دے سکیں۔ بہر کیف، وجہ جو بھی ہو اس عہد آفریں رسالہ کا بند ہونا اپنے آپ میں ایک دور کی موت ہے۔ کاش کوئی ایسی صورت نکل سکتی کہ اسے جاری رکھا جا سکتا۔

دھرم سالہ — کرشن کمار طور

● "شب خون" بند کئے جانے کی خبر ابھی نظر سے گذری۔ ایسا لگا جیسے ہم لوگ کچھ کھونے جا رہے ہیں۔ اللہ نعم البدل کی سبیل پیدا کرے (آمین)۔ ہماری تو یہ جرأت نہیں کہ عرض کریں کہ آنجناب اپنے فیصلے پر نظر ثانی فرمائیں، البتہ چپ چاپ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

سنت کبیر نگر — حماد انجم

● اردو ادب کے آج کے سب سے اہم جریدے "شب خون" کا بند ہو جانا آج نہ صرف ادب کے سنجیدہ قاری کا بلکہ اردو زبان ادب کا بھی بہت بڑا نقصان ہے۔ آپ کی اپنی نگارشات پر بھلا میں کیا لب کشائی کر سکتا ہوں، لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ آپ نے "شب خون" کے توسط سے گذشتہ چالیس سال میں اردو ادب کے سنجیدہ قاری کی جو ذہنی تربیت کی ہے وہ ناقابل فراموش رہے گی۔

ممبئی — وقار قادری

● آپ "شب خون" کو بند کر کے اردو زبان اور اردو کے محبین اور مصنفین پر ظلم کر رہے ہیں۔ مجھے آپ کی مشکلات اور خرابی صحت کا احساس ہے لیکن پھر بھی، کیا کوئی ایسی راہ نہیں نکل سکتی کہ "شب خون" نکلتا رہے؟ میں نے اس بات پر غور کیا۔ چھوٹا منہ بڑی بات تو ہوگی لیکن عرض کئے ہی دیتا ہوں۔ میں علی گڑھ میں رہ کر آپ کے رہنمائی میں اس کی ادارت کی ذمہ داری کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں۔ "شب خون" کتاب گھر باقی معاملات دیکھ سکتا ہے۔

علی گڈھ — حیات عامر حسینی

● لوگوں نے پرچہ بند ہونے پر جانے کیا کچھ لکھا ہوگا، میرے پاس تو الفاظ نہیں ہیں سوائے اس کے کہ آہ بھروں اور سر جھٹک کر "شب خون" کے اصل مقصد کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہو جاؤں (یا رہوں)۔ ایک اور ادبی رسالہ بند ہوا، ایک اور آفتاب گل ہوا۔ اللہ کرے کچھ نئے آفتاب ہی جگمگائیں اور اندھیرا نہ ہو۔ میں خود سہ ماہی "اقدار" کراچی سے وابستہ ہوں یا یوں کہہ لیجئے کہ وابستہ رہا ہوں اور اب نوکری کے سلسلے میں کیلیفورنیا میں مقیم ہوں اس لئے "اقدار" کے لئے وہ نہیں کر رہا ہوں جو کرنا چاہئے تھا۔ لہٰذا "شب خون" کے بند ہونے کا ذمہ دار بھی میں اپنے آپ کو ٹھہراتا ہوں کیونکہ یہ "شب خون" نہیں بلکہ تمام ادبی رسائل کا مشترکہ دکھ ہے۔

سین ہوزے، کیلیفورنیا — فیصل عظیم

● روزنامہ "قومی خبریں" لکھنؤ میں یہ افسوسناک خبر دیکھی کہ عالمی شہرت یافتہ اور نہایت علمی تحقیقی و تنقیدی معیار کا جریدہ "شب خون" جون ۲۰۰۵ سے بند ہونے جا رہا ہے۔ یہ خبر اردو محققین اور ناقدین اور خاص طور سے ہندوستان کے اہل قلم کے لئے بہت ہی تکلیف دہ ہے۔ تمام علم دوست اور مخلصین اردو کی طرح میری بھی گذارش ہے کہ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی فرما کر اردو ادب کو ممنون کریں، نوازش ہوگی۔

سیتاپور — رضوان انصاری

● "شب خون" کے بند ہونے کی خبر سن کر بے حد افسوس ہوا، لیکن کوئی اور "شب خون" کو اس طرح شائع بھی نہیں کر سکتا۔ آپ "شب خون" میں [illegible] دیکھتے ہیں اور جس طرح ہر چیز پر غور کرتے ہیں کوئی اور [illegible] "شب خون" [illegible] جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ آپ کی تحریر نے مجھ جیسے کئی لکھنے والوں کے لیے نئی راہیں ہموار کیں۔

احمد آباد — جینت پرمار

● "شب خون" باقاعدہ مل رہا تھا۔ اسے بند کرنے کا کیا جواز ہے اس کی وضاحت آپ نے نہیں کی پھر بھی اردو ادب کے لئے یہ بہت بڑا حادثہ ہے۔ لیکن میں ان خوش بختوں میں ہوں جنھوں نے "شب خون" کا پہلا شمارہ بھی خریدنے کی سعادت حاصل کی تھی اور انشاء اللہ آخری شمارہ بھی حاصل کروں گا۔

دھنباد — شان بھارتی

● سیفی سرونجی نے بتایا کہ "شب خون" بند ہو رہا ہے۔ یہ صدمہ عام نوعیت [illegible] شاید [illegible] سکتے ہیں [illegible] آپ نے آج آسمان ادب کی بلندیوں پر پہنچا دیا، ہم مجھ جیسے [illegible] کے لئے یہ صدمہ بہت شاق گذرا کہ ادبی دنیا میں صرف "شاعر" اور "شب خون" ہی تو ہیں جنھیں پڑھ کر میں اپنے آپ کو ایک ادنیٰ طالب علم سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی صحت زیادہ کام کا بار اٹھانے کی سکت نہیں رکھتی۔ خدارا اس کا کچھ حل نکالئے کہ "شب خون" زندہ رہے۔ آپ کے خون سے سینچا ہوا یہ باغ اجڑنے سے بچ جائے۔ مجھ جیسے ہزاروں قارئین کی یہی دعا ہے۔

سرونج — محمد توفیق خاں

● اس خبر سے بے حد دکھ ہوا کہ "شب خون" بند کرنے کا فیصلہ آپ کو کرنا ہی پڑا۔ چالیس سال کی اس طویل مدت میں اس رسالے کے ذریعہ آپ نے کیسے کیسے معرکے سر کئے اور کس دلجمعی سے ادب و تہذیب کی خدمت کی۔ مگر اب شاید آپ کی صحت اس کی اجازت نہ دیتی ہو۔ بہتر ہے کہ یکسو ہو کر آپ مستقل تصانیف کی طرف توجہ فرمائیں۔

ٹانڈہ — سید عبدالباری

● "شب خون" نے چالیس برس کی مدت میں اردو والوں کا ایک حلقہ تیار کر لیا ہے اور ایسی اعلیٰ فکری غذا قارئین کو فراہم کر رہا ہے کہ اس کے بند ہونے سے نہ معلوم کیسا بحران اور کیا خرابیاں پیدا ہوں۔ اردو قاری کی جو تربیت اس جریدے کے صفحات پر ہو رہی ہے اور ہوئی ہے اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ کم از کم قارئین سے تو مشورہ طلب کیا جاتا، شاید کوئی بہتر صورت پیدا ہو جاتی۔ ہم کہتے ہیں کہ ماہنامہ نہ صحیح سہ ماہی یا شش ماہی ہی سہی۔ لیکن اسے جاری رہنا چاہئے۔ اور اگر کوئی تکنیکی خرابی ہو تو آپ ماہنامہ ہی لکھیں اور شائع چاہے آپ چھ ماہ کے بعد ہی کریں۔ ہم لوگ اسے اپنے تئیں ماہنامہ سمجھتے رہیں گے۔ بہتر ہے کہ فاروقی صاحب کو نسل کا کام دیکھیں، وہ بہت ضروری ہے۔ لیکن جب مواد فراہم ہو جائے تو دو چار مہینے میں "شب خون" کو بھی دیکھ لیا کریں۔ بہر حال ہم لوگوں کو اس طرح بے دست و پا اور بے یار و مددگار چھوڑنا اچھی بات نہیں ہے۔ جو ادب اور معیار اور معلومات ہمیں "شب خون" میں مل جاتی تھیں وہ ہم کہاں تلاش کریں گے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ فاروقی صاحب کی حیات تک تو "شب خون" ضرور جاری رہنا چاہئے بعد میں خدا حافظ۔

محمود آباد — وحید الزماں

● "شب خون" پڑھتے ہوئے مجھے دس سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ اب اس عادت کو چھوڑنے میں تکلیف ہوگی۔ آپ "شب خون" کیوں بند کر رہے ہیں، وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر یہ آپ کی تندرستی کی وجہ سے ہے تو بھی اسے بند نہ کریں، کسی سے مدد لے لیں۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے اور "شب خون" جاری رہے۔ یہی دعا ہے۔

ٹونک — محمد راشد خان

● جناب ارشد عبدالحمید صاحب سے سنا کہ آپ "شب خون" بند کر رہے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ "شب خون" کبھی بند نہ ہو۔ آپ اس فیصلے پر نظر ثانی کریں تو بہتر ہے۔ ہم یہاں بیٹھے کچھ مدد تو نہیں کر سکتے لیکن دعا گو ہیں کہ آپ اور "شب خون" ہمیشہ سلامت رہیں۔

ٹونک — سید زاہد علی

● "شب خون" کے تازہ شمارے سے معلوم ہوا کہ آپ اس کی اشاعت بند کر رہے ہیں۔ خدارا اپنے اور "شب خون" کے مداحوں پر ایسا ظلم نہ

کیجئے۔ ممکن ہے اس فیصلے کے پیچھے آپ کی کچھ مجبوریاں ہوں۔ لیکن آپ کی صحت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری آپ سے یہ درخواست بھی ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو اس کار عظیم کو آپ جاری رکھیں۔

ٹونک — صابر حسن رئیس

* "شب خون" کے بند ہونے کی خبر پڑھ کر چند لمحوں تک دل کی دھڑکن ہی رک سی گئی۔ اردو ادب میں یوں بھی معیاری رسائل کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ "شب خون" کے بند ہونے سے اردو زبان و ادب کو جس نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا آپ نے شاید اس کا اندازہ نہیں کیا ہے۔

"شب خون" مالی مشکلات کے باعث یا کسی اور وجہ سے بند کیا جا رہا ہے؟ کیا آپ اپنے اس (قابل افسوس) فیصلے پر نظر ثانی کر کے اردو زبان و ادب کو اس گراں مایہ رسالے کی معدومیت اور محرومی سے بچا نہیں سکتے ہیں؟ اردو زبان کو "شب خون" کی بے حد ضرورت ہے۔

سری نگر — محمد اشرف

* "شب خون" کا شمارہ نمبر ۲۸۹ اردو دانوں کے لئے ایک شاک بھی ساتھ لایا۔ میں گھبرا کر یہ بھی دیکھا کہ شاید یہ اپریل کا شمارہ ہو اور آپ کے ادارے نے ہمیں سب کو اپریل فول تو نہ بنایا ہو، لیکن یہ شمارہ تو فروری ۲۰۰۵ کا ہے۔ چالیس سال سے قائم اس کلاسیک ادبی رسالے کو ہمیشہ کے لئے بند کر دینا اردو کی شکستہ سی عمارت پر ایک کاری چوٹ لگانے کے مترادف ہے۔ شاید آپ کی کچھ مجبوریاں ہوں گی۔ اگر مالی پریشانی ہو تو رسالے کی قیمت بڑھائی جا سکتی ہے۔ چالیس پچاس روپیہ فی شمارہ بھی دستیاب ہو تو اردو کے شیدائی تیار ہوں گے۔ یا پھر صاحب استطاعت لوگوں سے ہزار دو ہزار تین چار پانچ ہزار حیاتی خریداری کے طور پر بھی لیا جا سکتا ہے۔ کسی حال میں بھی "شب خون" کی اشاعت بحال رکھیں۔ چار دہوں پہلے جب یہ رسالہ جاری ہوا تھا تب سے ہم لوگ اس کے مداح رہے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں جدید نظمیں اپنی سمجھ میں نہ آتی تھیں لیکن افسانوں کا کلاسیکی ڈھنگ، زبان اور انداز بیان "شب خون" کے علاوہ اور کہیں بھی میسر نہ تھا۔

میسور — راشد فریدی

* "شب خون" کا تازہ شمارہ "شب خون" کی موت کے اعلان کے ساتھ موصول ہوا۔ یہ خبر ادب کی دنیا کے لئے سونامی کے اندوہ ناک سانحے سے کم روح فرسا نہیں۔ پتہ نہیں کتنے جیالے جو "شب خون" کی سرپرستی میں اپنے فکر اور فن کے خد و خال روشن کر رہے تھے، آج آپ کا اعلان سننے کے بعد یقیناً وہ اپنے آپ کو یتیم محسوس کر رہے ہوں گے۔ آپ نے اچانک ہی اتنے بڑے فیصلے کا اعلان کر دیا، "شب خون" کے بے شمار قارئین کو یہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ اس اعلان کے پیچھے آپ کی کون سی مجبوری ہے۔ خدا کے لئے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔

بوکارو اسٹیل سٹی — خورشید طلب

* "شب خون" نے سینکڑوں کی ادبی اور ذہنی تربیت کی۔ بہت سے ایسے چراغوں کی حفاظت کی جو آندھیوں کی زد میں تھے۔ ان کی لو تیز کی اور لاتعداد نئے چراغ بھی روشن کئے اور اس طرح چراغوں کا ایک پورا شہر آباد کیا۔ آپ کے خلوص اور محبت نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی اور میں بھی مطمئن ہوں کہ میں نے بھی اپنے ضمیر کی حفاظت کی۔ بیشک آپ نے مجھ سے بے لوث محبت کی، میں تو آپ کے خلوص محبت کا رائی برابر بھی حق ادا نہیں کر سکتا۔ اب "شب خون" کو آپ نے بند کر دینے کا اعلان کیا ہے تو میرے نزدیک شاید یہ اقدام مناسب ہی ہے کیونکہ آپ نے جو شکل "شب خون" کو دی ہے اسے کوئی اور باقی نہیں رکھ سکتا تھا کہ "شب خون" پورے نئے ادب کا پورا چہرہ بن چکا ہے۔

حیدرآباد — مظہر الحسان خاں

* "شب خون" جیسا کوئی دوسرا رسالہ نظر نہیں آتا۔ اس کا بند ہونا اردو کے لئے بڑا سانحہ ہوگا۔ اس رسالے کے مقبولیت کے پیش نظر یہ تو یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تعداد اشاعت اس کا مسئلہ نہیں ہو سکتا۔ تو پھر ایسی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ جمی جمائی بساط الٹ دی جائے؟ آپ اپنے فیصلے پر پھر سے غور کیجئے۔ اگر اس سلسلے میں ہم سے کچھ ممکن ہو تو بتائیں ہم طلبا اپنی سطح پر جو کچھ کر سکتے ہیں اس کے لئے حاضر ہیں۔

نئی دہلی — جاوید رحمانی

* آج "شب خون" ۲۸۹ ملا۔ دل کی دھڑکن قابو میں آگئی کہ بھیانک خواب گذر گیا۔ "شب خون" کا جو ایک صفحے کا اداریہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ ذہن کو جلا بخشتا رہا ہے۔ لیکن اس شمارے کا اداریہ تو ذہن کو ماؤف کر گیا، سچ کہوں تو آج عشائیہ کی اشتہا ہی نہ تھی۔ سخت جاں ہوں کہ یہ صدمہ سہ گیا ورنہ یہ تحریر ممکن نہ تھی۔

چالیس برس میں "شب خون" نے کتنے ذہنوں کے افق وسیع کئے، ان کا حساب ہزاروں میں ہوگا۔ جون کے بعد اردو ادب میں ایک خلا پیدا ہو جائے گا اور یہ خلا پر نہ ہوگا۔ جس وقار سے "شب خون" طلوع ہوا تھا اسی وقار سے یہ اپنے غروب کا بھی اعلان کر رہا ہے۔ کسی اور رسالے نے اپنے اختتام کا اعلان اس اہتمام سے نہیں کیا۔ یہ بھی "شب خون" کا طرۂ امتیاز رہے گا۔

حیدرآباد — مظہر مہدی

* جناب والا، یہ اچانک کیا ہوا کہ "شب خون" جیسے منفرد و بے مثال رسالے کو بند کرنے کی نوبت آگئی؟ ابھی پچھلے ماہ تو کچھ بھی نہ تھا۔ زیر نظر شمارے میں "شب خون" حسب سابق موجود ہے اپنے پرانے رنگ و آہنگ کے ساتھ۔ کیا فاروقی صاحب کے قومی کونسل برائے فروغ اردو کی نائب صدر نشینی قبول کرنے میں "شب خون" رکاوٹ بن رہا تھا؟ بہر حال جو بھی ہو، اسے بند کرنے کا فیصلہ اتنی جلد بازی میں نہ لینا چاہئے تھا۔ ایک متحرک و فعال اور تاریخ ساز رسالے کو اچانک بند کر دینا پوری اردو دنیا کے لئے باعث رنج ہے۔ براہ مہربانی اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر کے ہمیں شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

خیرآباد، مئو — صغیر احمد اعظمی

* "شب خون" کا شمارہ نمبر ۲۸۹ آیا۔ سرورق پلٹتے ہی میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ ابھی تک اس قلق سے دل مملو ہے کہ "شب خون" بند ہو رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے کسی بچے کو اس کا محبوب کھلونا دے کر پھر اچانک چھین لیا ہو۔ آپ کی محفل سے اٹھ کر ہم کس ساقی کا دروازہ کھٹکھٹائیں؟

شبلی باڑی، دھنباد — محمد احرار ہندی

● "شب خون" کے بند ہونے کا اعلان بجلی بن کر گرا۔ یہ خبر آپ کی صحت کی تشویشناک صورت حال کی غمازی کر رہی ہے۔ بہرنوع آپ کی صحت و طمانیت مقدم ہیں، "شب خون" تو کرر سہ کرر بھی جاری ہو سکتا ہے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ نئی نسل کے قدکاروں کو "شب خون" ہر رسالے سے زیادہ عزیز ہے اور ہم جیسوں نے تو خیر "شب خون" کے ساتھ ایک عمر گذاری ہے۔ یہی تمنا ہے کہ "شب خون" "ماہنامہ" سے "سہ ماہی" بھلے ہی ہو جائے مگر بند نہ ہو۔

فتح پور — غلام مرتضیٰ راہی

● یہ اعلان پڑھ کر انتہائی افسوس ہوا کہ "شب خون" کا شمارہ ۲۹۳ آخری شمارہ ہوگا۔ بہت دیر تک عجیب و غریب ذہنی کیفیت میں مبتلا رہا۔ "شب خون" محض ایک جریدہ نہیں ہے۔ یہ ایک عہد ہے، جس کے بند ہونے سے ادب کا ایک سنہرا زمانہ ختم ہو جائے گا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ غیر متوقع فیصلہ لینے کی ضرورت کیوں؟ میں تو آپ سے یہی گذارش کروں گا کہ آپ اپنے فیصلے پر دوبارہ غور فرمائیں۔

مغل سرائے — نسیم بن آسی

● ایک ایسا جریدہ جو عقل و فہم رکھنے والوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتا تھا، اس کا منقطع ہو جانا ایسا ہی ہے جیسے جسم کا جان سے تعلق ٹوٹ جانا۔ مانا کہ اس دور میں جب اردو زبان کے جاننے والے کم ہو رہے ہیں اور خرید کر پڑھنے والے اور بھی عنقا ہیں، اردو رسالے کا چلانا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ لیکن "شب خون" کی وجہ سے منفرد لکھنے والے ادیب اور شعرا سے ایک تعلق سا بن گیا تھا۔ افسوس کہ وہ بھی ٹوٹ جائے گا۔

میسور — واجد علی خاں

● "شب خون" بند ہونے والا ہے، خدا کی قسم یہ خبر بجلی بن کر مجھ پر گری۔ اسی لمحے سے جسم و جاں پر عجیب قہر افسردگی طاری ہے۔ آپ حد درجہ مجبور ہوں تو اور بات ہے ورنہ خدا کے لئے "شب خون" بند نہ کریں۔ اگر کسی ذی لیاقت معاون سے کام چل سکے تو آپ کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ "شب خون" کا بند ہونا اردو شعر و ادب کی تاریخ کا ایک افسوس ناک واقعہ ہوگا۔ کتنے ہی غنچے ناشگفتہ رہ کر خاک میں مل جائیں گے۔ توقع ہے کہ اپنی چہیتی اردو زبان کے مفاد کے پیش نظر آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی فرمائیں گے۔

دھمتری، چھتیس گڑھ — حنیف مجمی

● "شب خون" کے بند ہونے کی اطلاع ہمارے لئے انتہائی شاق ہے۔ اس قدر امتیازی و معیاری رسالہ جس سے اردو ادب کا ایک دور، ایک تاریخ، ایک پورا ادبی عمل وابستہ ہے اور جس کے تحت اردو شعر و ادب کی تسلسل پروان چڑھی ہیں، منقطع ہو جائے، یہ بات ہمارے ذہن و دل قبول ہی نہیں کر سکتے۔ میرے ادنیٰ خیال سے مالی مشکلات تو نہ ہونی چاہئیں کہ "شب خون" کے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کے وسیع حلقے برصغیر اور بیرونی ممالک میں ہیں۔ اگر آپ اس کی قیمت میں اضافہ کر دیں اور کچھ اشتہارات کی فراہمی کی تجویز رکھیں تو "شب خون" کے چاہنے والے میں سمجھتا ہوں اسے بہ صد خلوص قبول کر لیں گے۔ اگر کوئی انتظامیہ دقت ہو یا جس مرکوز شخصی توجہ اور دقت نظر سے آپ تخلیقات و نگارشات کو دیکھتے ہیں، وہ صحت اور مصروفیات کے سبب بالکل اسی طرح ممکن نہ ہو، تو تھوڑی ذمہ داری اپنے شرکائے کار اور نائبین کو بڑھا دیجئے۔ "شب خون" کا انقطاع میرے اور میرے جیسے سینکڑوں لکھنے والوں کے لئے ایک شخصی نقصان ہوگا۔ امور و معاملات کے ضمن میں تو میں خیر کیا کہہ سکتا ہوں بس اپنی تمنا کا اظہار ہے کہ "شب خون" جاری وساری رہے۔

ممبئی — عبدالاحد ساز

● یہ اعلان دیکھ کر کہ "شب خون کا کوئی شمارہ جون ۲۰۰۵ کے بعد شائع نہ ہوگا" حیرت و استعجاب کی انتہا نہ رہی۔ دل و دماغ ماؤف ہو گئے۔ "شب خون" کی اشاعت آئندہ کیوں نہ ہوگی اس کی کوئی وضاحت بھی نہیں کی گئی ہے۔ آخر ایسی کون سی مجبوری ہے کہ "شب خون" کے چالیسویں سال میں اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جائے؟ یہ عمر تو "شب خون" کے شباب کی عمر ہے۔ اسے بند کرنے کا اعلان دنیا کے اردو ادب اور قارئین "شب خون" کے لئے اندوہ ناک بات ہے۔ "شب خون" اردو زبان کا وہ معتبر ادبی جریدہ ہے، جس نے اردو زبان و ادب کا وقار بلند کیا ہے۔ اردو کی ادبی صحافت میں اس کا ایک مقام ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ "شب خون" نے چالیس سال کے عرصے میں جو سفر طے کیا ہے وہ ایک تاریخی تہذیبی ثقافتی اور شاندار ادبی کارنامے سے کم نہیں۔ "شب خون" نے بے شمار نئے لکھنے والوں کو صرف متعارف ہی نہیں کیا، بلکہ ان کو ان کی اپنی پہچان بھی عطا کی ہے۔ میں اپنی اور تمام قارئین کی جانب سے "شب خون" کے مدیران سے التجا کرتا ہوں کہ خدارا "شب خون" کی اشاعت جاری رکھئے۔

جمشید پور — سمن زیدی

● "شب خون" کی اور میری تقریباً پچیس سالہ رفاقت ایسی رہی ہے کہ جیسے ایک پیاسا اور ایک کنواں۔ کوئی پیاسا کسی کنویں کو بھلا دے کیا سکتا ہے، بجز شکر گذاری کے۔ میں نے بھی اس چاہِ شیریں سے حسب توفیق بہت پایا ہے، جو نہ پا سکا وہ میری بدتوفیقی۔ لیکن یہ کنواں ایک دن پاٹ دیا جائے گا، یہ بھی سوچا نہ تھا۔

پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک طلسمی ماضی جھل مل جھل مل کرتا نظر آتا ہے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو گھر میں ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، مخدوم محی الدین، مجروح سلطان پوری، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری کو اپنے گرد و پیش پایا۔ "بیسویں صدی" اور "شمع" سے دوستی ہوئی۔ برادر محترم نعمان احمد فاروقی کو مطالعے کا جنون تھا اور والد صاحب کے ذاتی کتب خانے میں کلاسکی کتب کا بڑا ذخیرہ تھا لیکن نعمان احمد صاحب اور ان کے ہم عمر دوست اسعد جمیل فاروقی (جو بعد میں پولیس افسر ہوئے) معاصر ادب کے قتیل تھے۔ ان کے ذوق مطالعہ نے ہمارے گھر کو اس وقت کے ترقی پسند ادب کی بہترین کتابوں سے بھر دیا تھا۔ گھر پر "سوویت دیس" بھی آتا تھا، لینن ہمارا ہیرو تھا اور ترقی پسند ادب پر میرا ایمان پختہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

ترقی پسند شاعری اور فکشن نے مجھے طویل عرصے تک اپنا گرویدہ رکھا، اور آج بھی میں ترقی پسند ادب کی افادیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ ہر چند کہ ترقی پسندوں میں بھی چند جعلی شعرا و ادبا شامل ہو گئے تھے اور ایسا ہر تحریک کے ساتھ ہوتا

ہے۔ لیکن جدیدیت تو کوئی تحریک بھی نہیں تھی، وہاں بھی ایسا ہوا کہ کوری جذباتیت اور انتہا پسندی لئے ہوئے کچھ لوگ در آئے۔ میں ترقی پسند تحریک کے صالح کردار کا قائل تھا اور آج بھی ہوں لیکن شدت پسندی مجھے کبھی پسند نہیں آئی۔ پھر میں جدیدیت کا بھی دل سے قائل ہوا اور ہوں۔ مجھے ان دونوں معاملات میں کبھی کوئی ٹکراؤ نظر نہیں آیا۔

وقت کے ساتھ نہ جانے کب ذوق وجدان بدل گئے، کچھ اس درجہ آہستگی سے کہ مجھے خود پتہ نہیں چلا کہ کب شکیب جلالی، ظفر اقبال، اختر الایمان، کمار پاشی، ساقی فاروقی، شہر یار، منیر نیازی، احمد ہمیش، عادل منصوری، ندا فاضلی اور محمد علوی مجھے پسند آنے لگے۔ یہ ایک نیا ذائقہ تھا۔ ’’شب خون‘‘ کے مطالعے نے ذہنی افق وسیع تر اور روشن تر کر دیا تھا۔ اردو کے علاوہ دیگر ادبیات عالم کو بھی تجسس کی نظر سے دیکھنے اور ان کے مطالعے کی خواہش دل میں جاگی۔ سکہ بند موضوعات، مروجہ لفظیات، اور روایتی اصناف سے پرے دیکھنے کی نظر بھی ’’شب خون‘‘ نے دی۔ میں ’’شب خون‘‘ کے لفظ لفظ کو چبا چبا کر پڑھتا تھا کہ لفظ کی حرمت کا قائل ہو چکا تھا۔ شروع میں بہت دنوں تک بہت کچھ میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مجھے اب بھی اعتراف ہے کہ ’’شب خون‘‘ سارے کا سارا میں آج بھی سمجھنے سے قاصر رہتا ہوں۔ وجہ ظاہر ہے کہ قاری سے جس سنجیدگی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا اس کے عادی ہم نہیں تھے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی عالمانہ تحریروں اور ان کی ادبی فتوحات نے میری ادبی تربیت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ میں ذاتی طور پر فاروقی صاحب اور ’’شب خون‘‘ کا احسان مند ہوں کہ جب جب میں نے بغرض اشاعت کچھ بھیجا تو اسے میری رضامندی کے ساتھ ضروری ترمیم و اصلاح کے بعد ’’شب خون‘‘ میں شائع کیا گیا۔ یہ ترمیمات و اصلاحات میں نے ہمیشہ بسر وچشم قبول کیں۔ دور درشن کے ایک مشاعرے میں دور درشن کے ڈائرکٹر فیاض رفعت نے بتایا کہ وہ اپنی شعری تخلیقات میں مدیر ’’شب خون‘‘ کی اصلاحات کو قطعی پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ شاید فیاض رفعت صاحب کی خود اعتمادی تھی اور وہ میری مرعوبیت، لیکن میں نے ہر بار یہ دیکھا کہ جو ترمیمات فاروقی صاحب نے میری غزلوں یا نظموں کے مصرعوں میں کی ہیں وہ مجھے ناگزیر ہی لگی ہیں اور میں نے ہر بار خود کو ان کا احسان مند پایا۔ آج اگر میں تمام رسائل میں چھپتا ہوں تو یہ اعتماد بھی ’’شب خون‘‘ میں چھپ کر ہی حاصل ہوا۔

ایک مزے کی بات یاد آ گئی ہے۔ جلیس نجیب آبادی کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لئے میں نجیب آباد گیا ہوا تھا۔ جلیس بھائی نے اپنے مہمانوں سے میرا تعارف کچھ یوں کرایا۔ یہ ہیں جناب راشد جمال فاروقی، یہ میرے لئے انتہائی اہم مہمان ہیں۔ آخر یہ ’’شب خون‘‘ میں جو چھپتے ہیں۔‘‘ پھر نشتر خانقاہی صاحب سے بھی اسی شادی میں ملاقات ہوئی۔ وہ بھی مجھے اسی حیثیت سے جانتے تھے۔ ادبی دنیا میں پہچان لئے جانے کا اطمینان مجھے ہے تو ’’شب خون‘‘ کی وجہ سے۔ ابھی دو سال قبل جب میرا ایک کام سے الٰہ آباد جانا ہوا تو وہاں کئی اہم ادبی شخصیات سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ اور یہ بات باعث شکر تھی کہ یہ تمام لوگ مجھے پہلے سے جانتے تھے۔ یہ اطلاع میری لئے باعث مسرت تھی کہ جب فون پر فاروقی صاحب کو میری الٰہ آباد میں آمد کی خبر دی گئی تو انھوں نے خود مجھے اپنے دولت خانے پر بلا بھیجا۔

فاروقی صاحب کی گرتی صحت اور بڑھتی ہوئی ذمہ داریاں ہی ’’شب خون‘‘ کے بند ہونے کا سبب ہو سکتی ہیں۔ وہ قومی اردو کونسل کے وائس چیرمین ہیں اور یہ بظاہر ’’شب خون‘‘ کی ادارت سے عظیم تر کام ہے۔ لیکن ’’شب خون‘‘ بجائے خود ایک بڑا ادارہ رہا ہے۔ یہ ایک ایسا دبستان ادب رہا ہے، جس کی آغوش میں نسلیں پروان چڑھی ہیں۔ آج اگر اردو دنیا میں ایسے لوگ وافر تعداد میں ہیں جن کی ادبی بصیرت بے پایاں وسعتوں کی حامل ہے تو وہ یقیناً درس گاہ ’’شب خون‘‘ سے فارغ التحصیل ہیں۔ تحقیق کی عمیق سطحوں تک رسائی، متعدد علوم وفنون کو ادب کے دائرے میں لے آنے کی سعی، کلاسیکی شعروادب سے سرسری گذر جانے کی بجائے اس کے قلب تک اتر جانے کی کوشش، اور آئندہ تخلیق ہونے والے ادب کے لئے مثبت راہیں استوار کرنے کی نیک نیت جیسے کاموں کی چہل پہل آج اگر اردو ادب میں نظر آ رہی ہے تو اسکا سہرا بھی ’’شب خون‘‘ کے سر ہے۔

میری دعا ہے کہ ’’شب خون‘‘ ققنس کی طرح اپنی راکھ سے پھر اٹھے اور ’’شب خون‘‘ کی زندگی ایک بار پھر ہو۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔

راشد جمال فاروقی
رشی کیش

● مجھ جیسے ہزاروں قاری ’’شب خون‘‘ کے خصوصی معیار کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس کے خالص ادبی معیار نے برسوں ذہن سازی کا کام انجام دیا ہے۔ ادب کے فروغ، بازیافت، اور زبان کی ترویج واشاعت میں اس رسالے کا تاریخی کردار بے مثال ہے۔ کسی رسالے کی بقا اور اس کی بلندی معیار کے لئے جس احتیاط، بلند ہمتی اور نظر کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب فاروقی صاحب کی ذات سے منسوب ہے۔ ایسے رسالے کے بند ہونے پر ہمیں دکھ ہی ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے بعد ادبی اور فکری تحریکوں اور مسائل کا سارا منظر نامہ بے رنگ ہو جائے گا، ادب کو ادب وفن کے معیار پر پرکھنے والوں کی تہذیبی جنت ان کے ہاتھ سے چھن جائے گی۔ آپ کی خدمات کو زمانہ یاد رکھے گا۔ طویل مدت تک ادب کی خدمت اور نسلوں کی ذہن سازی کے بعد وقت گذراں میں موجود صورت حال کے پیش نظر یہ رسالہ بند ہو رہا ہے تو کسی کو بھی آپ سے شکایت نہیں ہو سکتی۔ ذہنوں میں ’’شب خون‘‘ اور آپ کی تحریروں کے حوالے سے جو چراغ روشن ہوئے ہیں وہ آخر دم تک روشنی دکھاتے رہیں گے۔

ظہیر انور
کولکتہ

● ’’شب خون‘‘ کے بند ہونے کی خبر میرے لئے جاں کاہ ہے۔ یہ وہ میثاق ہے جو مجھ جیسے طالب علموں کے لئے تعویذ جاں سے کم نہ تھی اور پھر بھی تو وہ شجر سایہ دار ہے جس کے سائے میں پل کر میں ہی نہیں بلکہ ایک نسل جوان ہوئی ہے۔ میری دعا تو بس یہی ہے کہ آپ صحت مند ہو جائیں اور ’’شب خون‘‘ بند نہ ہو۔ اس قادر مطلق کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے۔ مجھے پر یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول کریمؐ کے صدقے میں میری دعا قبول فرمائیں گے اور آپ پھر سے

صحت مند توانا اور سرگرم ہو جائیں گے انشاء اللہ۔ میں تو ہمیشہ ہی یہی کہتا ہوں اور حقیقت بھی ہے کہ آج میں جو کچھ ہوں اس میں آپ کی نگاہ عنایت اور ''شب خون'' سے وابستگی شامل ہے۔

کانپور — عشرت ظفر

● ''شب خون'' کے بند ہونے کی خبر سن کر دلی افسوس ہوا۔ ''شب خون'' کی اور میری عمر تقریباً برابر ہے اور میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے ''شب خون'' پڑھتا رہا ہوں۔ اس رسالے سے مجھ جیسے طالب علموں کو بہت کچھ سیکھنے کا اور ہر شمارے سے کچھ نیا حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ مجھے علم ہے کہ آپ کی بڑھتی ہوئی مصروفیت کی وجہ سے اسے جاری رکھنا ممکن نہیں ہے۔ مگر کیا ہم لوگ اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکتے ہیں کہ ''شب خون'' جیسا معیاری رسالہ جاری رہ سکے؟ اگر اس سلسلے میں ہم برطانیہ میں رہنے والے لوگ کچھ کر سکتے ہیں تو ضرور لکھئے گا۔ ''شب خون'' نے ایک بڑے حلقے کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور پچھلے آٹھ دس سال سے تو برطانیہ کے وہ فنکار جو اپنے کو خالص ترقی پسند کہتے تھے اور ''شب خون'' کو ترچھی نگاہ سے دیکھتے تھے ان کے نام بھی ''شب خون'' کی فہرست میں نظر آنے لگے تھے۔

برمنگھم — پرویز مظفر

● یہ خبر میرے لئے کسی سانحے سے کم نہیں کہ ''شب خون'' اپنا اشاعتی سلسلہ بند کر رہا ہے۔ جناب یہ ظلم مت کیجئے۔ وجہ کچھ بھی ہو، آپ کی مصروفیتیں ہوں، کاروباری معاملات ہوں، یا اور۔ کچھ مگر براہ خدا ''شب خون'' کے سفر کو جاری رکھیے۔

سری نگر — مشتاق مہدی

● میں جانتا ہوں کہ ''شب خون'' کے بند ہونے کی خبر اردو دنیا پر بجلی بن کر گری ہوگی۔ لیکن بات کا دوسرا پہلو بھی نظر میں رکھنا چاہئے۔ ''شب خون'' جن مقاصد کے ساتھ شروع کیا گیا تھا ان کے حصول میں اسے جو کامیابی ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس رسالے نے ایک تاریخ بنائی ہے اور اس کا ذکر اردو زبان و ادب کے ذکر کے ساتھ ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ اپنی ساری عمر اس نیک کام کے لئے آپ نے وقف رکھی اس کے لئے چھوٹے منہ سے ہی سہی، میری مبارکباد قبول کریں۔

الہ آباد — احترام اسلام

● ''شب خون'' نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو آپ اس کو بند کر رہے ہیں؟ یہ تو ممکن ہے کہ ماہنامہ نہ رہے لیکن سال میں دو اشاعتیں تو ہو سکتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طور یہ باقی رہے، جاری رہے۔ کوئی صورت ضرور کریں۔ ''شب خون'' کی افادیت مسلم ہے۔ اس کا منکر، منکر اردو ہوگا۔ تو آپ کم از کم ہم لوگوں کا خیال کیجئے اور کم سے کم اسے ششماہی شائع کیجیے۔ ایک مشورہ یہ بھی ہے کہ کسی سے اس کا ایک مبسوط انتخاب شائع کرا دیجئے۔

پٹنہ — شکیب ایاز

● ''شب خون'' کے ساتھ بیس سالہ تعلق ہے۔ لکھنے کا نہیں، صرف پڑھنے کا۔ اگر لکھنے کا تعلق ہوتا تو شاید آپ مجھ سے شناسا ہوتے۔ چونکہ آج کل عام قاری کے ساتھ کسی ادبی پرچے کا تعلق نہ ہونے کے برابر ہے اس لئے گرم دعووں کے باوجود تعلقات مختصر بھی رہے ہیں اور سمٹ بھی رہے ہیں۔ ''شب خون'' کے ساتھ ایک تعلق خاطر تھا، ایسا رشتہ جو تعلق خاطر کی بنا پر اور مصلحتوں کے بغیر جوڑا جاتا ہے۔ صد افسوس کہ آپ نے اسے بیک جنبش قلم توڑ دیا۔

سری نگر — علی محمد قاسمی

● بالآخر آپ نے میرے پیارے ''شب خون'' کے بند ہونے کا اعلان کر ہی دیا۔ کیا عرض کروں کہ اس خبر سے مجھے کتنا صدمہ ہوا۔ شاید بابری مسجد کی شہادت کے بعد یہ دوسرا ہوش ربا اور دل کو چور چور کر دینے والا سانحہ ہے۔ کاش کہ یہ سانحہ میری موت کے بعد ہوتا۔ اگر اسے آپ مبالغہ اور شاعری نہ سمجھیں تو عرض کروں کہ بقول غالب جس طرح تیشے نے فرہاد کو شیریں سے ہم سخن کر کے اپنے کمال کی داد پائی تھی، بعینہ اسی طرح ''شب خون'' ہمارے لئے آپ سے ہم سخن ہونے کا ایک واحد وسیلہ تھا، جو نہ رہا۔ میں کتنا خوش نصیب تھا کہ استاذی مرحوم ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب نے اپنے دولت کدے ''نشیمن'' میں مجھے ''شب خون'' کا افتتاحی شمارہ عنایت فرمایا تھا، لیکن افسوس کہ حرماں نصیبی کے ساتھ آج میں اس عہد ساز کے آخری شمارے کو حاصل کرنے کے لئے زندہ ہوں۔

کوسامبرا، تھانے — مجاہد حسین حسینی

● افسوس کہ ہم جیسے طالب علمان ادب کے سر پر اب ''شب خون'' کا سایہ نہیں رہے گا۔ یوں تو اس بات کا علم اب سے چھ مہینے پہلے ہو گیا تھا لیکن ہم لوگ دل کو تسلی دیتے رہے کہ کاش پڑھنے والے جاگ اٹھیں اور اردو دنیا عملی اقدام اٹھاتے ہوئے اس خریداری کو دوگنا کر دیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور اب ہم اس دور جدیدیت کے لاثانی جریدے سے محروم ہو گئے۔ پڑھنے والے تو سو گئے پھر بھی کاغذوں پر مدیر زندہ رہے گا۔ اردو والے سوئیں یا جاگیں لیکن ''شب خون'' ابدی نیند سو چکا ہے کاش ہم اب سے ذرا دیر پہلے بیدار ہو جاتے۔

نئی دہلی — حبیب سیفی آغا پوری

● یہ خبر پڑھ کر ذہن و دل کو شدید ذہنی جھٹکا لگا کہ شمارہ ۲۹۳ ''شب خون'' کا آخری شمارہ ہوگا۔ تقریباً ۴۰ سال سے ادب کی آبیاری کرنے والا یہ جریدہ بند ہو رہا ہے۔ یہ سوچ کر کچھ عجیب درد سا محسوس ہوتا ہے۔ ''شب خون'' نے جدید تحریک کو فروغ دینے میں جو کارنمایاں انجام دیا اسے ادب کا قاری فراموش نہیں کر سکتا۔ نہ ہی برصغیر کا کوئی اور جریدہ ''شب خون'' کے مماثل ہو سکتا ہے۔ ''شب خون'' نے ادب کے ایک عہد کی تعمیر کی ہے اور تاریخ مرتب کی ہے جو زندۂ جاوید بن گئی ہے۔ آپ کا یہ فیصلہ جہاں انتہائی افسوسناک ہے وہیں انتہائی دانشمندانہ بھی ہے کہ اس طرح ''شب خون'' ہر قاری کے دل زندہ رہے گا۔

فتح پور — ظفر اقبال ظفر

● چار دہائیوں پر پھیلا ہوا یہ سفر ایک عہد کا نام ہے جسے ہم ''شب خون عہد'' کہہ سکتے ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف اول کی علمی و ادبی تاریخ اس کے صفحات پر بکھری پڑی ہے۔ ''شب خون'' اردو ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے ہر ماہ روحانی اور ذہنی غذا فراہم کرتا تھا۔ لاکھوں کا قبیلہ اس کے ذریعہ ایک دوسرے سے ہم رشتہ تھا۔ ''کہتی ہے خلق خدا'' میں نہ جانے کتنی بولیوں آوازیں گونجتی تھیں اور

ذہن ودل کو سیراب کرتی تھیں۔

اردو ادب کا یہ ایک مخصوص سماج تھا جو "شب خون" کی پیداوار تھا اور "فاروقیت" اسے دوسرے اردو طبقہ سے ممیز کرتی تھی۔ ان سے ذرا بلند سطح پر اردو ادب والوں کی اعلیٰ برادری تھی۔ ان میں شامل وہ بھی شامل ہیں جن کی کوئی آواز نہیں تھی، خاموش قاری، ور وہ جن کی آواز کبھی کبھی خطوط کے کالم میں سنائی دے جاتی تھی۔ اس سماج کے علاوہ قلم کاروں، ادیبوں اور شاعروں کا طبقہ تھا جو "شب خون" کے جلو میں پروان چڑھا۔ انھوں نے "شب خون" کے ذریعہ اپنی پہچان بنائی۔ بڑوں اور بزرگوں کا وہ جم غفیر بھی تھا جو اپنے علمی خزانوں سے اس رسالے کو مالا مال کرتے رہے، اس کی آرائش کرتے رہے۔ ان کے زیر سایہ لکھنے والوں کی ایک نسل سامنے آئی۔ پڑھنے لکھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ بنا۔ ادبی گہما گہمی پیدا ہوئی۔

"شب خون" نے ہند و پاک کے اہل اردو کے درمیان پل بنایا۔ "شب خون" وہ رسالہ ہے جس نے کبھی بھی، کہیں بھی معروضیت کا دامن نہیں چھوڑا، معیار سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ حضرات کتنے خوش نصیب تھے اور قابل رشک بھی جو "شب خون" کے اوراق میں چاند ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔

نوئڈا — شیخ سلیم احمد

● بے حد افسوس ہے کہ "شب خون" جون کے بعد نہیں شائع ہوگا۔ چالیس سال اردو ادب کی خدمت انجام دینے کا سہرا آپ ہی کے سر پر ہے۔

برلی، انگلستان — سلیم الرحمٰن

● مستقبل میں "شب خون" کی اشاعت نہ ہوگی، یہ پڑھ کر ہمیں سخت افسوس ہوا۔ دوسرے ادبی رسالوں کے مقابلے میں اس رسالے کی ایک مخصوص حیثیت ہے۔ اس کے قارئین ہمیشہ اس کی اگلی اشاعت کے منتظر رہتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اس کا زر سالانہ روانہ کرنے میں کوتاہی نہ برتتے ہوں گے۔ پھر یہ پرچہ کیوں بند ہوا؟

بیجاپور — اے۔ اے۔ جاگیردار

● "شب خون" بند کرنے کا فیصلہ آپ کے لئے بہت تکلیف دہ ہوگا۔ ادبی منظر سے "شب خون" کے ہٹ جانے کا تصور کرنا بھی محال ہے۔

پٹنہ — عبدالصمد

● آپ نے گذشتہ پانچ برس میں "شب خون" کے ذریعہ مجھے ادبی دنیا میں روشناس کرایا ورنہ میں تو ایک گم نام آدمی تھا۔ آپ میں ادبی دیانت داری ہے ورنہ دوسرے رسائل لفافہ اور غزلیں سب رکھ لیتے ہیں اور جواب تک نہیں دیتے۔ اب آپ "شب خون" بند کر رہے ہیں لیکن یہ رسالہ بند ہونے کے بعد بھی ذہنوں اور دلوں پر "شب خون" مارتا رہیگا۔

علی گڈھ — محمد عابد علی عابد

● اداریے کو کئی بار پڑھ گیا لیکن یہ واضح نہ ہوسکا کہ آخر "شب خون" کو کیوں بند کرنا پڑ رہا ہے؟ حسن اتفاق یہ ہے کہ مئی ۱۹۶۶ میری بھی پیدائش کا مہینہ اور سال ہے۔ اس لئے "شب خون" کے بند ہونے کی خبر ایسی ہے جیسے کہ (میرے لئے) کسی نے میری تاریخ انتقال کی پیش گوئی کردی ہو۔ یہ اعلان کہ آئندہ شمارہ "آخری" ہوگا ایسا ہے جیسے کوئی کہے، فلاں شخص کو فلاں تاریخ اور وقت پر "سزائے موت" کودی جائے گی۔ فضا ابن فیضی کے شعر ؎

مدیر عصر اسے احتیاط خاص سے رکھ
ترے جریدے کا ہوں آخری شمارہ میں

کے ساتھ خدا حافظ۔

آسنسول — محمد وجیہ الدین جمال

● "شب خون" کے متعلق بری خبر سن کر دل پر چوٹ لگی ہے اور اس تصور سے ہراساں ہوں کہ "شب خون" کے بغیر ادبی منظر نامے کی شکل کیسی ہوگی۔ میں آپ کے حالات سے بخوبی واقف ہوں اور حالات کے پیش نظر آپ کا فیصلہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس فیصلے تک پہنچنے میں آپ پر کیا گذری ہوگی اسے بھی محسوس کرتا ہوں۔ اس فیصلے میں جو شان بے نیازی جھلکتی ہے اس کی تعریف میں ہی نہیں، ہر شخص کرے گا۔ مگر "شب خون" کی اشاعت بند ہو جانے سے جو سناٹا چھا جائے گا اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ استدعا ضرور کروں گا کہ آپ اس فیصلے پر ایک بار نظر ثانی کریں۔ ماہنامہ نہ سہی، دوماہی یا سہ ماہی کی شکل میں اس کی اشاعت ہوتی رہے۔ یہ خواہش صرف میری نہیں بلکہ پوری اردو دنیا میں پھیلے ہوئے آپ کے دوستوں اور چاہنے والوں کی بھی ہے اب تو رسالے نے ایک طرح سے تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے۔ آپ کو بے شمار خطوط ملے ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ سب میری بات کی تصدیق کریں گے۔

پٹنہ — عالم خورشید

● ادب میں کچھ اس طرح کی تحریک نہیں چلتی، ہم احتجاج بھی نہ کر پائیں گے۔ چالیس سالہ زندگی ایک معنی رکھتی ہے اور آپ کو یہ حق حاصل ہے دلوں سے کھیلنے کا۔ خون کے آنسو سے بھی چند سطور لکھے جا سکتے تھے۔ لیکن آپ نے اپنے اعلان کے مطابق پہلے ہی طے کر لیا ہے کہ "شب خون" کے ایک ضخیم شمارے کے بعد ہمیشہ کے لئے اس کی اشاعت بند کر دی جائے گی۔ ان دنوں آپ بیمار رہنے لگے ہیں۔ عمر بھی بہت ہوگئی ہے۔ مصروفیت بھی بڑھ گئی ہے۔ لیکن آپ تجربہ کار ہیں، سوچئے کیا آپ کچھ ایسا نہیں کر سکتے کہ اسے جاری رکھا جا سکے؟ ہم نے آپ کے ساتھ ایک عمر گذاری ہے۔ "شب خون" بند کرنے کا فیصلہ اچھا نہیں ہے۔ ہم رونے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔ اللہ آپ کو صحیح راہ دکھائے۔ آمین۔

موتی ہاری — رفیع احمد آفتاب

● یہ پڑھ کر اور احباب سے سن کر میں بہت رنجیدہ و غمگین ہوں کہ آپ نے "شب خون" نہ جاری کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ کے چند مخالفین تو اسے اسٹنٹ سمجھتے ہوں گے مگر کثیر تعداد میں آپ کے مداح آپ کی ایمانداری، ادبی دیانت داری، آپ کے عزم و حوصلہ کو دل سے تسلیم کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آپ اس معاملے میں نہایت سنجیدہ ہیں۔ آپ کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ میں بھی آپ کے مداحوں میں سے ایک ہوں۔ آپ کا یہ چھوٹا بھائی ناقابل اعتنا ہی سہی، آپ سے ادباً گذارش کرتا ہے کہ آپ "شب خون" کو

جاری وساری رکھئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک کے صدقے میں آپ کو صحت و تندرستی، جوش وولولہ اور ہر وہ چیز جو آپ کو "شب خون" جاری رکھنے میں ممد و معاون ہو عطا کرے (آمین ثم آمین۔)

حیدرآباد — انور سلیم

● "شب خون" کے بند ہونے کو میں ایک سانحہ سمجھتا ہوں۔ اوروں کے دلوں کا حال تو مجھے معلوم نہیں مگر میں "شب خون" کی کمی ہمیشہ محسوس کرتا رہوں گا۔ میرا دل اس اعلان کو قبول نہیں کر رہا ہے گویا کسی عزیز کی موت واقع ہو گئی ہو اور میرا دل اس خبر کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہو۔ مجھے "شب خون" سے روحانی غذا ملتی رہی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ میں اس قدر کھل کر لکھ رہا ہوں۔ پہلے یوں نہیں لکھ پایا کہ کہیں آپ اسے خوشامد نہ سمجھیں۔ "شب خون" کا بند ہونا ایک ادبی المیہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا ہے کہ "شب خون" کی ادارت کے نتیجے میں آپ کے بہت سارے کام پچھڑے جا رہے ہیں۔ مگر کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ اسے شش ماہی یا سالانہ کتابی صورت میں پیش کریں؟ میں اس رسالے کو نئی شعریات کا نقیب وامین سمجھتا ہوں۔ ایسے وقت میں جب اردو شعر وادب کی دنیا نئی اور بڑی حد تک جعلی ترقی پسندی کے نرغے میں پھنستی نظر آرہی ہے آپ کی علمی و ادبی مساعی کی از حد ضرورت بڑھ گئی ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔

کولکتہ — جاوید ہمایوں

● یہ اعلان پڑھ کر سخت صدمہ ہوا کہ جون کے بعد رسالہ بند کیا جا رہا ہے۔ یہ معاصر اردو ادب کا بہت بڑا سانحہ ہوگا۔ "شب خون" نے ذہن سازی اور ادب شناسی کا جو کارنامہ انجام دیا وہ ناقابل فراموش ہے۔ آپ اسے بند نہ کریں۔ مجھے توقع ہے کہ قارئین کے غیر معمولی اصرار کے سامنے آپ اپنا فیصلہ بدل دیں گے۔

بجنور — نشتر خانقاہی

● تازہ شمارہ ملا، شکریہ۔ اس بار اس کی اشاعت کی موقوفی کے بارے میں پچھلے اعلان کا اعادہ نہیں ہے۔ خدا کرے تم نے "شب خون" کو بند کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہو۔ "شب خون" جیسے پرچے کو جاری رہنا چاہئے۔ اس کے بند ہونے کے اعلان سے میرا حوصلہ بھی پست ہو گیا۔ چالیسویں "ذہن جدید" کی اشاعت کے بعد میری تو سانس اکھڑنے لگی ہے۔ تم نے تو "شب خون" کو تن تنہا چالیس برس زندہ رکھا۔ آفریں۔

نئی دہلی — زبیر رضوی

● پرچے کے بند ہونے کا اعلان دیکھ کر بہت افسوس ہوا اور حیرت بھی ہوئی۔ اس فیصلے کے پیچھے وجہ جو بھی ہو لیکن یہ سچ ہے کہ ایسے اعلیٰ ادبی معیار اور عظمت کے حامل پرچے کا بند ہو جانا المیہ ہی ٹھہرے گا۔ "شب خون" نے لگ بھگ چار دہائیوں تک نئے قلمکاروں کی جو ذہنی آبیاری کی ہے اور ادب کو جس نئی سوچ اور سمت سے آشنا کیا ہے وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ اس موقر جریدے کے وسیلے سے آپ نے جس طرح علم و آگہی کے خزانے لٹائے ہیں اور جس سے بے شمار قلمکاروں اور ادب دوستوں نے استفادہ کیا ہے اس خدمت کو کون فراموش کر سکتا ہے؟ پرچے نکلیں گے، بند ہوں گے لیکن "شب خون" کی جگہ ہمیشہ خالی رہے گی۔

ممبئی — ظفر گورکھپوری

● یہ اعلان پڑھ کر حیرانی بھی ہوئی اور افسوس بھی کہ آپ "شب خون" بند کر رہے ہیں۔ یہ اردو زبان کا واحد جریدہ ہے جو نئے اسلوب کی تحریروں اور محققانہ مضامین کی اشاعت میں پیش پیش رہا ہے۔ اس کے بند ہو جانے سے اردو زبان اور ادب میں ایک ناقابل عبور خلا رہ جائے گا اور قارئین کا ایک بڑا حلقہ محروم ہو جائے گا۔ "شب خون" کو بند کرنے کے فیصلے کی جو بھی وجوہات ہوں، مگر یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ یہ قارئین ادب پر ایک ظلم ہوگا۔

جھانسی — اندر موہن کیف

● "شب خون" کی اشاعت جون ۲۰۰۵ کے بعد بند ہو جائے گی۔ بات دکھ کی ضرور ہے لیکن شاید کوئی چارہ بھی نہیں۔ "شب خون" نے ۳۹ سال کے عرصے میں جو یاقوتی اور الماسی کام کئے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ "شب خون" نے جدید ادب کو جو اعتبار بخشا ہے وہ نہ صرف قائم رہے گا بلکہ جدید ادب نگار نئے جہانوں کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہیں گے۔

رانچی — اختر یوسف

● "شب خون" کے بند ہونے کا بے حد دکھ ہے۔ اگر آپ کی نئی ذمہ داریوں کے سبب یہ رسالہ الٰہ آباد سے نہیں نکل سکتا تو دہلی سے اس کی اشاعت کے بارے میں سوچیں۔ کسی ایسے ادیب یا شاعر کو سارا کام سونپ سکیں جو آپ کی مرضی اور ہدایت کے مطابق رسالہ ترتیب دے اور پابندی سے رسالہ شائع کرتا رہے تو بہت خوب ہوگا۔ "شب خون" بند نہیں ہونا چاہئے۔

حیدرآباد — مصحف اقبال توصیفی

● چند روز پہلے مجھے "شب خون" کا شمارہ ۲۹۲ ملا۔ اس شمارے میں سرورق کے بعد اعلان تھا کہ یہ آخری پرچہ ہے۔ یہ اعلان دیکھ کر دل کو ایسا دھکا لگا کہ میں کئی گھنٹے فکر میں ڈوبا رہا۔ یہاں نرسنگ ہوم میں کوئی ہم نفس تو ہے نہیں۔

اگر رسالہ "شب خون" سے نہیں تو تحریک "شب خون" سے مجھے ضرور پوتڑوں کا ساتعلق ہے۔ ۱۹۶۰ کے بعد کسی سال میں جگن ناتھ آزاد نے مجھے لکھا کہ "اب اردو میں جس نئی شاعری کا رواج ہے اسے دیکھتے ہوئے تو ہم پرانے ہو گئے ہیں۔" میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کون سی نئی شاعری ہے کہ جس میں جگن ناتھ آزاد کی بھی سمائی نہیں۔ بعد میں خود میں اس کی طرف کھنچا اور اس قسم کی ایک غزل کہہ کر اشاعت کے لئے "شب خون" کو بھیج دی۔ فاروقی صاحب نے اسے چھاپ ضرور، لیکن ذاتی خط میں میرا خاصا مذاق اڑایا۔ میں اس زمانے میں جموں یونیورسٹی میں ملازم تھا۔ میں نے ادارۂ "شب خون" کے ایک شعری مجموعے "نئے نام" کو ایم۔اے۔ اردو کے نصاب میں رکھا اور ایک ریسرچ اسکالر کو تحقیق کے لئے نئی شاعری کا موضوع دیا۔

ایک نیا رسالہ نکالنا بڑا جان جوکھم کا کام ہے۔ اور ایسا رسالہ نکالنا جس کی ایک مخصوص روح اور رنگ ہو، اور بھی مشکل ہے۔ اس زمانے میں نیاز

صاحب کا رسالہ ''نگار''، دارالمصنفین اعظم گڈھ کا رسالہ 'معارف''، انجمن ترقی اردو ہند کے رسالے ''ہماری زبان''، اور ''اردو ادب''، ان کی مثال کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔ فاروقی نے نہ صرف رسالہ نکالا بلکہ اس کے ساتھ ہندوستان میں ایک نئی ادبی تحریک کے سب سے بڑے کھیون ہار بھی ٹھہرے۔ رسالے کو اس کامیابی کے نصف النہار تک پہنچا دینے کے بعد یکا یک بند کردینے کا فیصلہ کیوں کیا، سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ سال دو سال پہلے جب فاروقی صاحب کی صحت زیادہ خراب ہوئی تھی، میں نے دل میں سوچا تھا کہ اب فاروقی کو صاحب کو ''شب خون'' بند کردینا چاہئے کہ اس کو چلانے میں بڑی محنت کرنی پڑتی ہوگی اور رسالے کے مقابلے میں صحت زیادہ اہم ہے۔ لیکن میں نے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ فاروقی صاحب نے بڑی ہمت کرکے یہ فیصلہ کیا ہوگا۔ مجھے اس کی نظیر میں مہاتما گاندھی کے بلیدان کی یاد آتی ہے جب وہ ملک کے لیڈروں میں سب سے بڑے تھے، انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے اپنی جان تک کی پروانہ کی۔ فاروقی نے بھی اپنے رسالے کے لئے اپنے دل و جان کی بازی لگادی۔

مجھے اس موضوع پر بہت کہنا تھا، لیکن میں لکھ نہیں سکتا، قلم رکھنے پر مجبور ہوں۔ انھوں نے تو رسالہ بھی تن تنہا چلایا ہے، وہی بہتر جانتے ہیں۔ وہ بہر حال اردو کے اہم مدیروں میں جگہ پا گئے ہیں۔ اب انھوں نے اپنے قارئین پر شب خون مارا ہے۔

اروائن، کیلیفورنیا　　　　گیان چند

● ''شب خون'' بند ہونے کے اعلان سے ایک ایسا صدمہ ہوا ہے جیسے کوئی یار دیرینہ اچانک کسی ایسے ملک کو ہجرت کر جائے جہاں سے واپسی کا ویزا نہ ملتا ہو۔ برادرم محترم امین بھائی نے فون پر اطلاع دی۔ افضل سلمہ کا تشویش بھرا فون آیا۔ امین بھائی نے آپ سے بات بھی کی۔ اسباب بتائے۔ لیکن دل کو اطمینان نہیں ہوا۔ جس وقت چودھری ابوالنصیر ''شب خون'' کے کاموں سے دست کش ہوئے تھے، اس وقت اگر ''شب خون'' بند ہوجاتا تو ایک فطری بات لگتی۔ لیکن اس کے بعد کے سارے شمارے زیادہ آب و تاب کے ساتھ نکلے۔ اب آپ نے اسے بند کرنے کا اعلان کیا۔ کسی ماہانہ رسالے کی، خصوصاً ''شب خون'' جیسے متنازعہ فیہ رسالے کی ادارت کتنا محنت طلب اور وقت طلب کام ہوتا ہے، اس کا اندازہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ آپ نے پچھلے چالیس پچاس شمارے صحت کی قیمت پر ترتیب دیئے، سب کو اس کا علم ہے۔ ''شب خون'' اور آپ کا معاملہ یک جان و دو قالب والا معاملہ ہے۔ لیکن بہر حال ''شب خون'' آپ سے ہے، آپ ''شب خون'' سے نہیں۔ خدائے تعالیٰ آپ کو صحت مند اور زندہ اور خوش و خرم رکھے۔ آمین۔

''شب خون'' کے شروع سے اب تک کے مشمولات کو موضوعات کے تعین کے لحاظ سے ترتیب دیں تو بیس شمارے تیار ہوسکتے ہیں۔ تین چار غزل نمبر، تین چار افسانہ نمبر تیار ہوسکتے ہیں۔ اگر ترتیب میں تھوڑی سی دقت نگاہ بھی شامل کر دی جائے تو مختلف ادبی معاملات پر رد و قبول، ادعائیت اور مفاہمت، جدت اور روایت کے مختلف ادوار کی داستان بھی تیار ہوسکتی ہے۔ اس کام میں آپ کو بہت زیادہ محنت نہیں کرنا ہوگی۔ تمام شماروں کی فہرست لے کر مختلف عنوانات کے تحت مضامین اور ادب پاروں اور تحریک کی ابتدا، عروج، اور ایک خوبصورت انجام ہوتا ہے۔ زندگی اور ادب دونوں میں نئی نئی کونپلیں پھر یہاں وہاں سے اپنے سر سبز چہرے دکھاتی ہیں اور زندگی اور ادب دونوں آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ آپ اپنے ادبی سفر پر نگاہ کریں تو احساس ہوگا کہ آپ کی ادبی شخصیت مختلف ادوار سے گذری ہے۔ افسانے پر آپ کے مضمون بھی یاد ہیں اور آپ کے افسانے بھی جی کو اچھے لگتے ہیں (حالاں کہ دونوں میں بہت بعد ہے)۔ آپ نے ظفر اقبال کو بھی چھاپا اور اسی شوق کے ساتھ عرفان صدیقی کو بھی۔ آپ نے ترقی پسندی کی ادعائیت کے خلاف بھی لکھا اور سردار جعفری کے جملے بھی اقتباس کیے۔ یہ سامنے کی چند مثالیں ہیں۔ پھر آپ نے لگاتار میری کہانیاں منگا کر ''شب خون'' میں سرفہرست شائع کیں۔ کیا یہ مثالیں اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہیں کہ ''شب خون'' نے اگر ادیبوں اور قارئین کے ذہنوں کو بدلا تو قارئین اور ادیبوں نے بھی ''شب خون'' کے مشمولات اور آپ کے خیالات کو یکساں نہیں رہنے دیا۔ نیر مسعود، شفیع جاوید، خالد جاوید کو آپ نے بہت اہتمام سے شائع کیا لیکن ان ادیبوں نے ہمیشہ اپنی طرح کی کہانیاں لکھیں۔

اس طول بیانی کا مقصد صرف یہ ہے کہ ''شب خون'' نے ایک زندہ زبان کے زندہ رسالے کی طرح اپنا وجود باقی رکھا۔ خود کو پتھر کی طرح جامد نہیں کیا کہ جذب کی صلاحیتیں ہی فوت ہوجائیں۔ جدیدیت کے بارے میں دیگر رسالوں میں یہ بات میں نے لکھی اور آج آپ کے نام اس خط میں بھی لکھ رہا ہوں کہ جدیدیت نے ادب کے انجماد اور یکسانیت پر ایک بہت کاری ضرب لگائی تھی اور اردو ادب سے متعلق ادیبوں کو ایک نیا شعور دیا اور نیا راستہ دکھایا۔ جدیدیت اور ''شب خون'' ایک دوسرے کے مترادف بن گئے اور ادب کے کارواں کا ایک معتد بہ حصہ ان کی بانہیں پکڑ کر مدتوں سفر طے کرتا رہا۔ تھیوری، افسانہ، غزل اور نظم میں ایک ایسا نیا پن آیا جس نے تھوڑا یا بہت سب کو مستفید کیا۔

جدیدیت اور ''شب خون'' کی کارگذاریوں سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ چالیس برس تک ادب کی ایک شاندار روایت کو تخلیق کرنے والے ہاتھوں کو میں دل کی گہرائیوں سے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ ادب کے معاملات کے فیصلے دس پانچ سال میں نہیں ہوتے۔ اردو ادب کی تاریخ کا مورخ اگر متعصب نہیں ہوا تو جدیدیت اور ''شب خون'' کی خدمات کو فراموش گاری کے سپرد نہیں کر پائے گا۔ سر سید تحریک، حلقہ ارباب ذوق، رومانیت، ترقی پسندی، جدیدیت، یہاں تک کہ مابعد جدیدیت بھی... یہ سب معاملات زندہ زبان اور زندہ ادب میں ہی ممکن ہیں۔ ان کی بنیادوں پر گروہ بندی کرنا یا دل برے کرنا اچھا نہیں لگتا۔ جب ادب پارے تخلیق ہوجاتے ہیں تب نظریات اور تصورات وجود میں آتے ہیں۔ میں اس بات پر ایمان تو رکھتا ہوں کہ تنقیدی تصورات و نظریات ادب کے ان قارئین کے لئے بہت مفید ہوتے ہیں جو ادب پارے سے ایک سے زیادہ طرح کے حظ اٹھانا چاہتے ہیں۔ بنیادی طور سے یہ ادب پارہ ہی ہوتا ہے جو بڑے بڑے تنقیدی نظریات کی تصدیق بھی کرتا ہے اور کبھی کبھی ان نظریات کو الٹ پلٹ کر مسمار بھی کر دیتا ہے اور پھر نئے تصورات اور نظریات کے لئے راہ بناتا ہے۔ کاش

ہمارے سارے بڑے اور چھوٹے نقاد تخلیقی ادب کی اس قوت کو سچے دل سے قبول کر سکیں۔

علی گڈھ — سید محمد اشرف

بڑھاپے کے کارن ہوش و حواس معطل ہو چکے ہیں۔ دو فقرے بھی مربوط نہیں لکھ پا رہا۔

بہت عرصہ نہیں گذرا میرے ہاں اردو ہندی انگریزی کے چھبیس رسائل آتے تھے۔ آج "شب خون" سمیت تین آ رہے ہیں۔ "شب خون" کو آپ نے بند کر دیا۔ طبیعت بے حد رنجیدہ ہوئی۔ کاش آپ نے قارئین کو اعتماد میں لیا ہوتا۔ میں جاگتے میں اکثر یہ خواب دیکھا کرتا تھا کہ حکومت نے اس کی اشاعت اپنے ذمہ لے لی ہے۔ اب ایڈیٹروں کا ایک بورڈ بنے گا، "شب خون" کی اشاعت اس بورڈ کے ذمہ ہوگی۔ فاروقی اکاڈمی کا قیام عمل میں آئے گا اور فاروقی صاحب کی سبھی تصانیف کے یکرنگ (Uniform) ایڈیشن شائع ہوں گے۔ "شب خون" اب سہ ماہی چھپے گا۔ ہر شمارہ ریکسین کی جلد سے مجلد ہوگا، جان لیمان John Lehmann کی انتھالوجی New Writing کی طرز پر جو تقسیم وطن کے زمانے میں لندن سے شائع ہوتی تھی۔

"شب خون" میرے پسندیدہ رسائل میں سے تھا، دوسرے دو رسالے انگریزی اور ہندی کے دو پرچے ہیں، جو ساہتیہ اکاڈمی نکالتی ہے۔ چوتھا پرچہ مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا۔

تقسیم کے پہلے میں امرتسر کالج میں پڑھتا تھا۔ میرا معمول تھا، ہر سنیچر کی دوپہر کو لاہور چلا جاتا اور باقی دن بیدی صاحب کے پاس ان کے اشاعتی ادارہ سنگم پبلشرز میں ان کے پاس بیٹھتا تھا۔ یہ سلسلہ ڈھائی سال کے قریب چلا۔ پھر تقسیم کا سانحہ رونما ہوا۔ لاہور کے اس زمانہ کے کئی اہل قلم بیدی صاحب سے ملنے کے لئے آتے تھے۔ ان صحبتوں میں بہت کچھ سننے، سمجھنے کا اتفاق ہوا۔

جالندھر میں بلراج کومل سے ملاقات ہوئی، یہ بات ۱۹۴۹ کی ہے۔ اور موصوف سے میرے مراسم تادم تحریر بدستور ہیں اور میرے اوقات کا بیشتر حصہ اس کی معیت میں گذرا ہے۔ اس نصف صدی سے زیادہ عرصہ میں ان گنت بار دلی گیا۔ پہلے بلراج کے پاس ٹھہرتا، پھر بہن کے پاس بھی ٹھہرنے لگا۔ اس عرصے میں دیگر اصحاب کے علاوہ فکر تونسوی، مخمور جالندھری، نریش کمار شاد، دیوندر ستیارتھی، و دیگر کئی اہل قلم سے ملاقاتوں کے مواقع ملے اور خط و کتابت رہی۔ بلراج کومل کے ڈھائی صد سے زیادہ شفقت نامے فقیر کے پاس محفوظ ہیں۔

زندگی کا بالغ حصہ بٹالہ کے دور افتادہ اور غیر ادبی ماحول میں گذرا ہے۔ اس لئے گوشہ نشینی اختیار کرنا پڑی۔ یہاں رسالوں اور کتابوں کے سوا میرا کوئی غمگسار نہ تھا۔ ادب کے بارے میں کئی سوال مجھے پریشان کرتے تھے۔ "شب خون" کے مطالعے سے مجھے بیشتر کا جواب ملا۔ "شب خون" کے مشمولات کو متعدد بار پڑھتا تھا۔ فاروقی صاحب کی تحریروں کا بین السطوری مطالعہ کرتا تھا۔ خصوصاً "شب خون" کے صفحہ اول کے Write-ups اور "شعر شور انگیز" کے ابتدائی مقالات کو کرید کرید کر پڑھا۔ کیا "شب خون" کو جاری رکھنے کا کوئی حیلہ نہیں ہو سکتا؟ حکومت لچر قسم کی کتابوں کی اشاعت پر عوام کا روپیہ برباد کر رہی ہے۔ بھلا آغا حشر کاشمیری کے کلیات کا سیٹ چھاپنے میں کیا تک ہے؟

بٹالہ، پنجاب — کرشن کانت

● شروع اپریل کا کوئی دن تھا۔ ڈاک آئی تو اس میں "شب خون" ۲۹۰ بھی تھا۔ پہلے سرورق دیکھا، پھر صفحۂ اول پر نظر ڈالی۔ عنوان پڑھا اور میں منجمد ہو کر رہ گیا۔ لکھا تھا: "شب خون کا کوئی شمارہ جون ۲۰۰۵ کے بعد شائع نہ ہوگا۔" شمارہ ۱ (جون ۱۹۶۶) سے لے کر شمارہ ۲۹۰ (مارچ ۲۰۰۵) کی اشاعت کے عرصے میں "شب خون" میرا ذہنی ہم سفر رہا ہے۔ معمول یہ رہا ہے کہ پہلے سرورق پر ایک نظر ڈالی، صفحۂ اول دیکھا، پھر فہرست مندرجات کو بہ نظر غائر دیکھ کر طبیعت کے حضور اور پسند کے لحاظ سے مختلف مشمولات پڑھے۔ صفحۂ اول کا مطالعہ ہمیشہ آخر میں کیا۔ لیکن اس بار صفحۂ اول پہلے پڑھا، ایک نہیں دو بار، اور رسالہ بند کر کے رکھ دیا۔ شاید یہ ایک عہد کے خاتمے کے احساس کا ردعمل تھا۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اس غیر معمولی فیصلے کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔ بتانی چاہئے تھی۔ قارئین کا بھی تو کچھ حق ہے۔ "بھرپور تعاون اور تاریخ ساز پشت پناہی" کا شکریہ ضرور ادا کیا اور اصول دیانت کے تحت اس منظم و منضبط "پسپائی" کا لائحہ عمل بھی پیش کیا۔ ویسے، انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر سفر ترک کر دینے کے حوصلے کو مستحسن ہی کہنا چاہئے۔ فاروقی کے تحت شعور میں یقیناً یہ بات ہوگی، شعوری طور پر وہ جو بھی جواز پیش کریں۔

"شب خون" کی ابتدا ایک علمی اور ادبی جریدے کی شکل میں ہوئی مگر گذرتے ماہ و سال کے ساتھ اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی، ایک نظریاتی اور ادبی تحریک۔ جس کا مقصد اردو زبان و ادب کو ایک نئے تناظر سے آشنا کرانا تھا، مثبت انداز فکر و نظر پیش کرنا، اور نئے سے نئے تجربات و رجحانات کو فروغ دینا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ معروضیت کو روبہ عمل لا کر تخلیق اور تنقید دونوں کو انفعالیت سے بچانا تھا۔ بلاشبہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں "شب خون" کی اشاعت کی چار دہائیوں کو "شب خون" کا عہد کہا جائے گا۔

خالص پور، اعظم گڈھ — ابرار اعظمی

● آپ نے اور "شب خون" نے فاتحانہ ایک عہد کا سامنا کیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ شمس الرحمٰن فاروقی پوری اردو تاریخ کا سب سے بڑا نام ہے۔ ایک نصف صدی کی اردو دنیا شمس الرحمٰن فاروقی کے نور سے منور رہی ہے۔ سرسید کے بعد آپ دوسرے شخص ہیں جو ایک عظیم تحریک کے روح رواں رہے ہیں۔ میں آپ کی درازی عمر اور صحت و تندرستی کے لئے اللہ رب العزت سے دعا کرتا ہوں۔ "شب خون" کو آخری سلام۔

امراوتی — سید صفدر

*** اداریہ: ماہنامہ ''سبق اردو''، شمارہ ۷، جنوری، ۲۰۰۵**

اردو رسائل کے جاری ہونے اور بند ہونے کی خبریں اکثر سننے اور پڑھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ کچھ روز قبل بھی ایک رسالے کے بند ہونے کی خبر پڑھنے کو ملی لیکن یہ رسالہ کوئی عام رسالہ نہیں ہے کہ چند منٹ کے افسوس کے بعد بات ذہن سے نکل جائے۔ اس خبر نے اردو ادب سے رغبت رکھنے والے ہر خاص و عام کو فکر و تشویش اور رنج کے عمیق سمندر میں غوطہ زنی کے لئے مجبور کردیا ہے۔ یہ وہ اہم تاریخ ساز رسالہ ہے جسے ہم اور آپ ''شب خون'' کے نام سے جانتے ہیں۔

اردو رسائل کے افق پر ماہنامہ ''شب خون'' ایک درخشاں ستارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس رسالے نے اردو ادب کو ایک نیا اور پختہ ذہن دیا جسے جدیدیت کے نام سے موسوم کیا گیا جس کے علم بردار شمس الرحمٰن فاروقی صاحب ہیں۔

چالیسویں برس میں داخلہ کے ساتھ ہی یہ رسالہ ہم سے رخصت ہونے کو ہے۔ اس طویل عرصے میں ''شب خون'' نے جو عظیم کارنامے انجام دیے ہیں ان سے لوگ واقف ہیں۔ ''شب خون'' پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کو چاہئے کہ ''شب خون'' کے مکمل سرمائے کو مختلف زاویوں سے دیکھیں اور اس سے متعلق مضوعات پر ریسرچ اسکالروں سے تحقیقی کام کرائیں تاکہ اس رسالہ کی اہمیت اور افادیت کو مزید استحکام حاصل ہو اور فاروقی صاحب کی برسوں کی ناقابل فراموش ادبی خدمات کا کچھ حق ادا ہوسکے۔ ادارہ ''سبق اردو'' خود بھی ''شب خون اور شمس الرحمٰن فاروقی نمبر'' شائع کرے گا۔

فاروقی صاحب ''شب خون'' ہی تک محدود نہیں ہیں ادب کے مختلف موضوعات پر ان کی ڈھیر ساری تصانیف ہیں جنھیں پڑھ کر باشعور ادیب و شاعر بنا جاسکتا ہے۔ آپ اس وقت قومی کونسل برائے فروغ اردو کے وائس چیرمین کے عہدے پر فائز ہیں۔ چونکہ وہ نہایت فعال شخصیت کے مالک ہیں اس لئے اردو والوں کو ان کے اس عہدے سے بھی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

دانش الٰہ آبادی

*** مہمان اداریہ: ماہنامہ ''سبق اردو''، شمارہ ۷، جنوری، ۲۰۰۵**

یہ خبر پوری اردو دنیا کے لئے غیر معمولی حیثیت کی حامل ہے کہ ماہنامہ ''شب خون'' الٰہ آباد کی اشاعت جون ۲۰۰۵ کے بعد بند ہوجائے گی۔ ''شب خون'' کے گذشتہ چند شماروں میں جو اعلان شائع ہو رہا ہے اس کے مطابق اس ماہنامے کا باقاعدہ آخری شمارہ بابت مئی ۲۰۰۵ اشاعت پذیر ہوگا اور ماہ جون کا شمارہ (جو آخری شمارہ ہوگا) ضخیم نمبر کی صورت میں سامنے آئے گا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں ''شب خون'' کا اجرا مئی ۱۹۶۶ میں عمل میں آیا تھا اور اس کے پہلے شمارے پر جون ۱۹۶۶ کی تاریخ درج تھی۔ اس طرح یہ رسالہ ۳۹ سال کی طویل مدت پوری کر کے بند ہو رہا ہے۔ ان چار دہائیوں کے پورے عرصے میں شمس الرحمٰن فاروقی ''شب خون'' سے جس طرح وابستہ رہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے فاروقی اور ''شب خون'' کو لازم و ملزوم کہنا ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ ''شب خون'' کی اشاعت اول سے لے کر اب تک محترمہ جمیلہ فاروقی کا بھی اس رسالے سے بڑا گہرا تعلق رہا ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس تاریخی ماہنامے کی انھوں نے شروع سے آج تک سرپرستی کی ہے۔

اردو علم و ادب کی دنیا میں ''شب خون'' کا کیا مقام و مرتبہ ہے اور اس نے کیا کیا کارنامے انجام دیئے ہیں، اس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ''شب خون'' ان معدودے چند رسالوں میں ہے کہ جن کی اہمیت و افادیت کے بے شمار پہلو ہوتے ہیں جن کا احاطہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ''شب خون'' کی تاریخ پر تفصیل سے کام کرنے والے ہی بتا سکیں گے کہ اردو زبان و ادب کے میدان میں اس رسالے نے کیا کیا خدمات انجام دی ہیں اور ان خدمات کے غیر معمولی اہمیت اختیار کرنے کے کیا اسباب رہے ہیں؟ یہاں ان باتوں کی طرف محض چند اشارے کرنا مقصود ہے۔

''شب خون'' کے آغاز سے پہلے ہی اردو کی ادبی دنیا میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر پہنچ کر زوال کی طرف مائل ہوچکی تھی اور جدید رجحان (جسے بعد میں جدیدیت سے موسوم کیا گیا) پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ چنانچہ تخلیقی سطح پر ایسی تحریریں بڑی اہمیت اختیار کرنے لگی تھیں جو ترقی پسند نظریۂ ادب کے بجائے جدید نظریۂ ادب سے نہ صرف زیادہ قریب تھیں بلکہ ان تحریروں سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے لکھنے والے ترقی پسند فکر سے بڑی حد تک منکر ہوچکے ہیں۔ دوسری طرف ترقی پسند فکر سے وابستہ افراد یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان کا نظریۂ علم و ادب از کار رفتہ اور بے معنی نہیں ہوا ہے۔ اس صورت حال میں جدید رجحان کے حامل افراد کے لئے یہ بات ناگزیر ہوگئی کہ وہ اپنی فکری اور نظریاتی بنیادوں پر نہ صرف اصرار کریں بلکہ ان نظریاتی مباحث کے لئے زمین بھی ہموار کریں جن سے ان کے افکار و خیالات کی توسیع ہوسکے۔ چنانچہ یہی وہ زمانہ ہے جب شمس الرحمن فاروقی صاحب اور ''شب خون'' جدید رجحان کے سب سے اہم نمائندے کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ پھر تھوڑے عرصے میں ہی شمس الرحمٰن فاروقی، ''شب خون''، اور جدیدیت کا ایسا مثلث وجود میں آیا جسے آج غیر معمولی تاریخی اہمیت حاصل ہوچکی ہے۔

''شب خون'' کی حیثیت ایسے پلیٹ فارم کی رہی ہے جس پر فاروقی

صاحب نے علم وادب سے متعلق بے شمار مباحث کے راستے کھولے۔ اس سلسلے میں یہ بات بے حد اہم ہے کہ یہ معاملہ صرف بحث برائے بحث والا نہیں رہا، بلکہ ان مباحث میں ایسے ایسے امور سامنے آئے جن سے علم وادب کی محبوس فضا میں تازہ ہوا کے جھونکے آئے اور روشنی کی نئی نئی کرنوں سے تیرہ وتاریک ماحول روشن ہوا۔ اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ حالی نے "مقدمۂ شعر وشاعری" میں شعر وادب سے متعلق معاملات ومسائل پر جس طرح نظریاتی گفتگو کا آغاز کیا تھا اسے باقاعدہ صورت میں بڑھانے کا کام حالی کے بعد کم وبیش آدھی صدی تک نہیں ہوا۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں مسعود حسن رضوی ادیب نے "ہماری شاعری" میں حالی کے اٹھائے ہوئے سوالات پر کچھ بحثیں ضرور قائم کیں۔ لیکن وہ بہر حال محدود نوعیت کی حامل تھیں۔ ساتویں دہائی میں "شب خون" کے اجرا اور جدیدیت کے پھیلاؤ کے ساتھ شمس الرحمٰن فاروقی نے از سرنو ان سوالات پر گہرائی سے توجہ کی اور ان امور کو باقاعدہ نظریاتی بنیاد فراہم کی کہ ادب کیا ہے؟ ادب اور غیر ادب میں امتیاز کے کیا پیمانے ہیں؟ ادب کی تحسین قدر کن بنیادوں پر ہوتی ہے یا ہونی چاہئے؟ فاروقی صاحب نظری مباحث کی چھان بین کرتے ہوئے اس سوال تک بھی گئے کہ کیا نظریاتی تنقید ممکن ہے؟ چنانچہ ان کی مشہور کتاب "تنقیدی افکار" کا پہلا مضمون ہی اس عنوان کے تحت لکھا گیا ہے۔ بحث ومباحثہ کے یہ سارے سلسلے سب سے پہلے "شب خون" کے صفحات پر ہی جلوہ گر ہوتے رہے۔ ان میں فاروقی صاحب کے علاوہ دوسرے جدید لکھنے والے بھی شامل تھے جن کی فاروقی صاحب ذہنی وفکری تربیت کرتے رہے۔

جدیدیت کے بارے میں باقاعدہ غور وفکر کا سلسلہ بھی "شب خون" ہی سے شروع ہوا۔ باقاعدہ میں نے اس لئے کہا ہے کہ جدیدیت کے بارے میں اس سے پہلے بھی اگرچہ گفتگو ہوئی تھی اور اس سلسلے میں سب سے اہم نام محمد حسن عسکری کا ہے۔ لیکن اس گفتگو کا اردو شعر وادب کی جدید روایت سے بہت کم تعلق رہا۔ عسکری صاحب نے جدیدیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے زیادہ تر مغربی ادبی روایت کو ہی پیش نظر رکھا۔ لہٰذا ان کے خیالات اردو زبان کے تناظر میں بہت زیادہ بامعنی ثابت نہیں ہوسکتے تھے۔ "شب خون" کو چونکہ جدیدیت کے نمائندہ رسالے کی حیثیت حاصل ہوچکی تھی اس لئے یہاں جدیدیت سے متعلق مسائل کو اردو کی ادبی روایت کے تناظر میں زیادہ سے زیادہ جانچا اور پرکھا گیا۔ اس سلسلے میں فاروقی صاحب نے جدیدیت کے بنیادی سروکار اور اس کی امتیازی خصوصیات پر تفصیل سے لکھا اور دلائل کے ساتھ ان اعتراضات کو غلط ٹھہرایا جو جدیدیت کے مخالفین وقتاً فوقتاً کرتے رہتے تھے۔ جدیدیت کے بنیادی سروکاروں میں ایک یہ بھی ہے کہ ادیب وشاعر اپنے اظہار کی سطح پر بالکل آزاد ہیں۔ انھیں خارجی سطح پر کسی طرح کی پابندی قبول نہیں کرنی چاہئے۔ یعنی انھیں ادب تخلیق کرتے وقت کسی نظریے، فلسفے یا عقیدے وغیرہ کا پابند نہیں ہونا چاہئے۔ وہ ذاتی طور پر جو کچھ اور جیسا کچھ سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں اسی کے مطابق انھیں شعر وادب تخلیق کرنا چاہئے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ چونکہ ادیب وشاعر تخلیقی ذہن کا مالک ہوتا ہے اور اپنے اظہار میں پوری طرح آزاد ہے اس لئے ضروری ہے کہ تخلیقی کارگزاری کے دوران وہ طرح طرح کے تجربے بھی کرے۔ ظاہر ہے یہ باتیں بالخصوص ترقی پسند نقطۂ نظر کے حامل لوگوں کے خلاف جاتی تھیں، لہٰذا ان کی طرف سے خوب مخالفتیں بھی ہوئیں۔ چنانچہ "شب خون" میں نہایت اہم تخلیق کاروں کی بہت سی ایسی تحریریں بھی شائع ہوتی رہیں جو بطور تجربہ وجود میں آئی تھیں۔ ان میں سے کچھ ایسی بھی تھیں جنھیں قبول عام حاصل نہیں ہوا اور وہ مسترد کردی گئیں۔ جیسا کہ تجربہ پسندی کے عمل میں اکثر ہوتا ہے کہ دس تجربے کرنے کے بعد کبھی کبھی صرف ایک یا دو کامیاب ہوتے ہیں اور زیادہ تر ناکام ٹھہرتے ہیں لیکن اس ایک یا دو تجربے کا کامیاب ہونا ہی تجربہ پسندی کے عمل کو حد درجہ مفید ثابت کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ "شب خون" کے ذریعہ شعر وادب میں اظہار واسلوب کی سطح پر جو تجربے کامیاب ہوئے ان کی طرف جدیدیت کے مخالفین نے اتنی توجہ نہیں کی جتنی توجہ وہ ان تجربات کی طرف منعطف کرتے رہے جو ناکام رہے تھے۔ ان لوگوں نے عام طور سے انھیں کو بنیاد بنا کر جدیدیت اور "شب خون" کے خلاف محاذ قائم کیا۔ لیکن حقیقت بہت دنوں تک پس پردہ نہیں رہتی اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ پچھلی تقریباً چار دہائیوں سے انھیں لکھنے والوں کو اعتبار حاصل ہے جو فکری طور پر جدید ہیں اور "شب خون" سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے ہیں۔

"شب خون" کی اہمیت اور اس کے اعتبار کا یہ عالم رہا ہے کہ اس میں کسی تحریر کا چھپ جانا اس کے معیاری ہونے پر دلالت کرتا ہے اور کسی ادیب کا "شب خون" میں مسلسل چھپنا اس ادیب کے معتبر ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ فاروقی صاحب نے "شب خون" کے معیار سے کبھی مفاہمت نہیں کی۔ انھوں نے بسا اوقات اہم ادیبوں کی بھی بعض ایسی تحریروں کو ناقابل اشاعت قرار دیا جو "شب خون" کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں۔

تقریباً ۳۰۰ شماروں پر مشتمل "شب خون" کا مکمل ذخیرہ ایسا خزانہ ہے جس میں جدید اردو ادب کی تاریخ کا نہ صرف بہت بڑا حصہ جمع ہے بلکہ اس میں مشرق ومغرب کی قدیم اور جدید روایات، افکار وخیالات اور ان کی عملی صورتیں بھی آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اس رسالے نے اردو دنیا کی دو تین نسلوں کی جس طرح ذہنی وفکری تربیت کی ہے اور شعر وادب کی شاہراہ میں جو نئی نئی راہیں نکالی ہیں انھیں کبھی نظر انداز نہ کیا جاسکے گا۔

خوشی اور اطمینان کی بات یہ ہے کہ "شب خون" انتہائی عروج کی منزل پر پہنچ کر بند ہو رہا ہے۔ یقیناً اس کے بند ہونے کی ابھی عمر نہیں تھی۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ "شب خون" کی باقی ماندہ عمر بھی فاروقی صاحب کو مل جائے تاکہ پوری اردو دنیا کو ان کا فیض اور دیر تک پہنچتا رہے۔ آمین

احمد محفوظ

● اداریہ، ماہنامہ "اردو میلہ"، ناگپور، مئی ۲۰۰۵

اردو دنیا کے لئے یہ خبر افسوس ناک ہے کہ ہندوستان کے معیاری ادبی رسالے "شب خون" کی اشاعت جون ۲۰۰۵ کے بعد نہیں ہوگی۔ انتالیس برسوں تک اردو داں طبقہ کو معیاری ادبی مواد فراہم کرنے والا رسالہ "شب خون" اب نظر نہیں آئے گا۔

محترم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے "شب خون" کو اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔ ور زندگی کے نشیب وفراز سے گذار کر اسے ایک تناور درخت کی شکل عطا کی ہے۔ "شب خون" کی اشاعت بند کردینے کا اعلان اس کے شمارہ نمبر ۲۸۹ (فروری ۲۰۰۵) میں ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر عقیلہ شاہین ورفقا کی جانب سے کیا گیا ہے۔ پرچہ بند کرنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی ہے۔ "وجہ" ہمارے خیال میں محترم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی عمر یا ناسازی طبیعت یا حال ہی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے وائس چیرمین کے عہدے پر ان کی تقرری کے باعث ان کی بے پناہ مصروفیات ہوسکتی ہیں جس کی وجہ سے وہ "شب خون" پر اپنی توجہ مرکوز نہ کرسکیں۔ یا پھر وجہ کوئی اور ہو، ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ ۳۹ برسوں تک اردو زبان کی خدمت کرتے والا صحت مند ادب فراہم کرنے والا معیاری رسالہ "شب خون" کسی بھی صورت میں بند نہ ہونے پائے۔ اور اس کے لئے ہم درخواست کرتے ہیں اردو کے دانشوران سے کہ وہ محترم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے استدعا کریں کہ پرچہ کسی بھی صورت میں بند نہ کریں اور انھیں اپنا عملی تعاون پیش کریں۔ تاکہ "شب خون" ۳۹ برسوں کی طرح آئندہ بھی اسی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتا رہے اور اردو داں طبقہ اس سے فیض یاب ہوتا رہے۔

انصاری اصغر جمیل

❁ اداریہ، ماہنامہ "لاریب" لکھنؤ، جون ۲۰۰۵

ہمیں کہنا ہے کچھ ...

جون ۲۰۰۵۔ یہ مہینہ ادبی دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ اس ماہ کے آغاز کے ساتھ ماہنامہ "شب خون" الہ آباد کی اشاعت بھی بند ہوجائے گی۔

تقریباً چالیس سال کے طویل عرصہ پر محیط "شب خون" کی تاریخ پر ایک اجمالی نگاہ ڈالی جائے تو واضح ہوگا کہ یہ رسالہ ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد گذشتہ صدی کے چھٹے دہے میں منظر عام پر آیا تھا، جس نے پوری اردو دنیا کو تہ و بال کردیا تھا۔ "شب خون" کے ابتدائی دور میں سید احتشام حسین، اعجاز حسین، مسیح الزماں جیسی بلند قد شخصیات کے علاوہ اس دور کے بہت سے اہم نام اس میں شامل تھے اور اس وقت جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا نام بالکل نیا تھا۔

تجریدیت اور پھر جدیدیت/ مابعد جدیدیت کے گذشتہ چالیس سالہ دور میں "شب خون" نے ایک بہت بڑا کنبہ بنالیا اور گذشتہ تین نسلوں میں ابھرنے والے بیشتر نقاد، افسانہ نگار اور شاعر "شب خون" سے ہی جانے اور پہچانے گئے۔

"شب خون" ابتدا سے ہی ایک Class کا رسالہ رہا اور آخیر تک معیار کے معاملہ میں محترم شمس الرحمٰن فاروقی نے کسی طرح کا سمجھوتہ نہیں کیا۔

"شب خون" نے اردو دنیا کو جو کچھ بھی دیا اس کا محاسبہ آنے والے دنوں میں ہوتا رہے گا لیکن خوب سے خوب تر کی تلاش اس ادبی جریدہ کا ایک اہم مشن تھا، اور کم، بیش بھی ادبی جریدوں کو اس کی تقلید کرنا چاہئے۔ ہرچند کہ اب "شب خون" نہیں شائع ہوگا مگر اس کا مشن پوری قوت کے ساتھ جاری رہے گا۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی محنت شاقہ کے طفیل نئی نسل ہر لمحہ نئے پن کی جستجو میں مصروف ومشغول رہے گی۔

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی ایک عالم نقاد کی حیثیت سے اعتبار کا درجہ رکھتے ہیں اور بلاشبہ ان کے قد کا مقابل فی زمانہ اردو دنیا میں اور کوئی نہیں۔

"لاریب" کو فخر ہے کہ فاروقی صاحب اس کے مستقل قاری رہے ہیں اور اکثر انھوں نے اپنے تاثرات سے بھی "لاریب" کو نوازا ہے۔

رشید قریشی

❁ اداریہ، "الانصار"، حیدرآباد، جلد ۳، شمارہ ۳

اب کی بار ہم "الانصار" کو "شب خون" کے نام معنون کررہے ہیں۔

کیونکہ "شب خون" ہمارے عہد کا ایسا رسالہ ہے (ہم "تھا" نہیں کہیں گے) جس نے اپنی ایک روشن تاریخ بنائی ہے۔ چھٹی دہائی میں لسان الصدق شمس الرحمٰن فاروقی کے ہاتھوں وجود پانے والا یہ رسالہ (دراصل غالب کی ادبی دہائی سے شروع ہوتا ہے) اتنی تیزی سے ایک تناور درخت بن گیا کہ اس کی شاخیں پوری ادبی دنیا میں پھیل گئیں اور اس رسالے کو پروان چڑھانے اور پھیلانے میں جس کا ہاتھ رہا وہ ایسا ذہن ہے جس نے ہماری ادبی تاریخ کو نیا موڑ دیا اور ان ساری فرسودہ روایتوں اور نعروں کو یک لخت ادب سے خارج کردیا جو پامال ہوچکی تھیں اور جن میں نئی آواز اور لہجوں کو سننے کی ساعت موجود نہ تھی اور نہ اس دور بلاخیز اور اس کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے بہت سے ذہنوں کو صیقل کیا اور ان کی سوچ اور فکر کے دھاروں کو نئی شکل عطا کی۔ انھوں نے پہلے منزل کا تعین کیا، پھر چالیس سال تک پورے استحکام کے ساتھ کہیں بھی لڑکھڑائے بغیر اس منزل تک ان ادیبوں کی رہنمائی کی جن کی نگاہوں کے سامنے صرف پامال راستے تھے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے "شب خون" کے ذریعہ ان بہترین ذہنوں کو نہ صرف روشنی دی بلکہ انھیں "شب خون" کے ذریعہ حقیقت تک پہنچانے کی ان تھک کوشش کی۔ یہ اور بات ہے کہ بعض ادیب اور شاعر منزل پر پہنچنے کے بعد ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں، یہاں وہاں جھانک رہے ہیں تو یہ ان کی اپنی کم نہی ہے، اس میں فاروقی صاحب یا "شب خون" کا کوئی قصور نہیں۔ یہ ان کا اپنا ذاتی تماشا ہے جو ادب کو کٹ پتلی کا کھیل سمجھتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر راہی فدائی، "جن کے مزاجوں میں صلاحیت موجود تھی وہ صراط مستقیم پا گئے اور جو کج مزاج تھے انھیں فاروقی کی رہنمائی راس نہیں آئی۔ اور جو نئے ہم ہمنوا تھے مگر بہ اطن ان کے دماغ میں بے نوائی کی فضا طاری تھی، وہ دو چار قدم چل کر آخر کار تھک ہار کر نہ صرف بیٹھ گئے بلکہ رجوع قہقرہ کرتے ہوئے اپنے ہم مزاجوں سے جاملے۔"

اسد ثنائی

گذشتہ "شب خون" سے لے کر اب دنیائے ادب اس قدر کثرت اور تیزی سے بڑے ناموں سے خالی ہوئی ہے کہ اردو ادب میں تو قیامت کا منظر درپیش معلوم ہوتا ہے۔ ہم امید اور دعا کرتے ہیں کہ یہ نیا سال ۲۰۰۶ ہمارے لئے کچھ بہتر ثابت ہو۔

● ڈاکٹر آفتاب احمد (پیدائش ۱۹۲۳) کی شگفتہ نثر کا جواب ان کی باغ و بہار شخصیت ہی میں تھا۔ ادبی شخصیتوں کے بے مثال خاکہ نما تجزیہ کار، بے حد ذی علم نقاد، ادبی ذوق کے معاملے میں فراخ دل، نوجوانوں کی ہمت افزائی میں سب سے آگے، آفتاب احمد کا ثانی اب ملنا مشکل ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ مولانا ظفر علی خاں کے بھتیجے اور نہایت باعلم اور باحیثیت گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ لیکن انھوں نے ادب میں جو کچھ حال کیا اپنی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر کیا۔ ● کچھ دن ہوئے ہم نے انھیں صفحات میں ڈاکٹر مارٹن لنگز (Martin Lings) یعنی شیخ ابوبکر سراج الدین کا ذکر کیا تھا کہ انھوں شیکسپیئر اور تصوف کے بارے میں ایک لکچر دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ شیکسپیئر کے کلام میں تصوف کے بعض نکات ملتے ہیں اور ممکن ہے شیکسپیئر کو متصوفانہ علوم سے کچھ واقفیت رہی ہو۔ افسوس کہ دنیائے اسلام اور دنیائے علم و ادب کا یہ پرخلوص خدمت گذار اور عالم بے بدل چورانوے سال کی عمر میں ہم سے رخصت ہوگیا۔ ● امرتا پریتم (پیدائش ۱۹۱۹) کا ماتم ہر طرف ہے، اور کیوں نہ ہو، جب وہ برصغیر میں عورت افسانہ نگار اور عورت مصنف کی انتہائی طاقتور علامت تھیں۔ وہ محض ایک مصنف نہیں بلکہ ایک عالمی حقیقت تھیں جو افسانہ بن گئی تھی۔ انھیں ساہتیہ اکادمی سے لے کر گیان پیٹھ ایوارڈ تک بے شمار اعزازات ملے۔ ان کا رسالہ "ناگ منی" آج بھی اپنی اہمیت رکھتا تھا۔ ان کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔ ● امید فاضلی (پیدائش ۱۹۲۳) عمدہ غزل گو تھے، بعد میں انھوں نے مرثیے کے میدان میں بھی اپنے جھنڈے گاڑے۔ ان کی غزل ہر طرح نک سک سے درست ہوتی تھی، مضمون آفرینی میں وہ بہت ممتاز تھے اور ان کی یہ صفت ان کے مراثی میں بھی نظر آتی ہے۔ ● جمال پانی پتی (پیدائش ۱۹۳۵) مکتب عسکری کے آخری نمائندہ ہی نہیں، عسکری صاحب کے سچے عاشقوں میں بھی تھے۔ وہ تنقید کے علاوہ شعر میں بھی درک رکھتے تھے۔ ان کی موت نے ہم سے محمد حسن عسکری کی آخری یادگار بھی چھین لی۔ اس شمارے میں شامل ان کی غزل ہمیں مبین مرزا سے ملی ہے۔ ہم ان کے ممنون ہیں۔ ● حسن عابدی (پیدائش ۱۹۳۱) اچانک ہی چل بسے۔ وہ نئی طرز کے عمدہ ترقی پسند شاعر اور پرانی شرافتوں کے امین تھے۔ ● دکتورہ زینب الغزالی دنیائے عرب کی ان غیر معمولی عورتوں میں تھیں جن کا وقتاً فوقتاً نبوغ مخالفین کو حیرت میں ڈالتا رہتا ہے۔ وہ ملک مصر میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئیں جہاں علم کا کچھ بہت زیادہ چرچا نہ تھا۔ لیکن انھوں نے اپنی کوششوں سے تعلیم حاصل کی اور قرآن حدیث و فقہ کے ساتھ اصلاح و آزادی نسواں کے میدانوں میں بھی سرگرم رہیں۔ بہتر سال میں ان کا انتقال تمام دنیائے اسلام کو رنجیدہ کر گیا۔ ● پروفیسر سید معین الرحمٰن (پیدائش ۱۹۴۲) ابھی نسبتہً کم عمر تھے اور توقع تھی کہ غالبیات کے میدان میں وہ مزید کارنامے انجام دیں گے لیکن افسوس کہ موت نے انھیں بھی آلیا۔ جب وہ زندہ تھے تو وہ کچھ بہت تکلیف دہ قسم کے تنازعات میں مبتلا کر دیئے گئے تھے اور دیوان غالب کے ایک نادر نسخے کے بارے میں ان کی دریافتوں اور اس کی تدوین دونوں پر بہت کچھ شور غل ہوا تھا۔ بہر حال، اس میں کوئی شک کہ تمام کمزوریوں کے باوجود وہ انتھک محنت اور دلی لگن کے آدمی تھے۔ ان کے جانے سے ایک بڑا خلا دنیائے ادب میں پیدا ہوگیا۔ ● ڈاکٹر شان الحق حقی (پیدائش ۱۹۰۷) کی ذات مستغنی عن الشناخت تھی۔ لغت نویسی ان کا خاص میدان تھا، لیکن سچ پوچھئے تو ان کے کئی خاص میدان تھے۔ گیتا اور ارتھ شاستر کے براہ راست سنسکرت ترجمے سے لے کر دلی کی خالص ٹکسالی زبان میں شگفتہ افسانہ نگاری تک سب میدان ان کے تھے۔ شعر، تحقیق، غالبیات، انجمن ترقی اردو کی بے مثال خدمت، انھوں نے ایک عمر مستعار میں اتنا کچھ کر لیا جس کے لئے دوسروں کو عمریں درکار ہوں اور پھر بھی وہ اس قدر خوش اسلوبی سے یہ سارے کام انجام نہ دے سکیں۔ ● پروفیسر عبد الحلیم ندوی (پیدائش ۱۹۲۵) مدتوں کیرالا یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ ان کی دو جلدی "عربی ادب کی تاریخ" اب بھی بہت مقبول ہے۔ ● معروف صحافی عثمان غنی (پیدائش ۱۹۲۰) بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔ انھوں نے "قومی آواز" کی سربراہی بڑے مشکل وقتوں میں کی تھی اور اپنے بے لاگ قلم کی بدولت ہم چشموں میں انتہائی توقیر کے مالک بن گئے تھے ● پروفیسر غلام مصطفٰی خاں (پیدائش ۱۹۱۲) کو انسان کی شکل میں فرشتہ کہا جاتا تھا۔ نہایت منکسر المزاج، اور اتنے ہی بڑے عالم، انھوں نے پہلے ناگپور میں اور پھر کراچی اور حیدرآباد سندھ میں کئی نسلوں کی ادبی و علمی تربیت کی۔ "اقبال اور قرآن" ان کا ناقابل فراموش کام ہے۔ انھوں نے حالی پر بھی بہت اچھی کتاب لکھی تھی۔ ● کوٹھیاوی راہی (پیدائش ۱۹۳۵) ایک مدت سے سرطان کا مقابلہ، فلاس اور نامساعد حالات کے باوجود مردانہ وار کرتے رہے اور آخر کار لقمۂ اجل بن گئے۔ خوش فکر شاعر، افسانہ نگار، صحافی، کئی ادبی تنظیموں کے روح و رواں، راہی بہت دن تک یاد رکھے جائیں گے۔ ● محمد حفظ الکبیر قریشی (پیدائش ۱۹۳۳) کو کناڈا کا بابائے اردو کہا جاتا تھا۔ انھوں نے کناڈا میں اردو ادب اور صحافت کے فروغ کے لئے بہت کام کیا۔ وہ خود بھی عمدہ شاعر تھے اور انھوں نے جدید اردو شاعری کے تراجم انگریزی میں شائع کر کے اردو کو کناڈا کے وسیع تر حلقوں میں متعارف کیا۔ ● گیان پیٹھ اور دیگر متعدد قومی اور بین الاقوامی اعزازات یافتہ نرمل ورما نے ہندی ہی نہیں، اردو اور دوسری زبانوں کے فکشن کو بھی متاثر کیا تھا۔ انھیں بجا طور پر ہندوستان میں جدیدیت کے معتبر ترین ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے فکشن میں تجرید اور واقعیت کا لطیف امتزاج ملتا ہے۔

ادارہ تمام مرنے والوں کے غم میں سیاہ پوش ہے اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتا ہے۔

● مشہور انگریز جدید ڈراما نگار ہیرلڈ پنٹر (Harold Pinter) کو اس سال کا نوبل انعام ملا ہے، اور حق یہ ہے کہ بہت صحیح ملا ہے۔ پنٹر کے ڈراموں میں تکلم اور خاموشی دونوں اپنے معنی رکھتے ہیں، اور یہی فن ڈراما میں اس کی سب سے بڑی دین ہے۔ "شب خون" کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ پہلا اردو رسالہ ہے جس میں ہیرلڈ پنٹر کا ذکر ہوا۔ پنٹر بوجہ علالت اپنا انعام لینے خود نہ جا سکا لیکن اس کی تقریر قبولیت جو انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے، امریکی سامراج، استحصال، صارفیت، اور عالم کاری کے بہانے مغربی استعمار کو فروغ دینے کی کوششوں پر سخت تنقید ہے اور اپنی طرز کی تحریروں میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ ● اس سال کا گیان پیٹھ انعام مراٹھی کے شاعر وندا کرندیکر کو ملا ہے۔ ستاسی سالہ وندا کرندیکر کو مراٹھی میں جدیدیت کا امام قرار دیا جاتا ہے۔ "شب خون" شاید پہلا اردو رسالہ ہے جس نے وندا کرندیکر کی نظمیں شائع کیں۔ ہم انھیں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ● افسوس کہ اس سال کے ساہتیہ انعامات کے بارے میں ہم زیادہ گرم جوشی کا اظہار نہیں کر سکتے۔ ارندھتی رائے کو انگریزی کا [illegible] تھا، اور بالکل ٹھیک [illegible] تھا۔ انھوں نے یہ انعام واپس کر دیا ہے کہ وہ حکومت کی کئی پالیسیوں سے متفق نہیں ہیں۔ انعام واپس کرنا ان کا حق ہے اور ہم انھیں مبارک باد دیتے ہیں۔ اردو کا انعام اس سال جابر

حسین کو اور کشمیری کا انعام اردو کے مشہور نقاد اور شاعر حامدی کاشمیری کو ملا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دو انعامات کی کنہ تک ہم نہ پہنچ سکے۔ لیکن ادھر کئی سال سے ساہتیہ اکادمی کے اردو انعامات نے اکثر شائقین ادب کو نا مطمئن ہی چھوڑا ہے۔ ● غالب انسٹیٹیوٹ کا انعام برائے تنقید اس سال فضیل جعفری کو، برائے افسانہ عابد سہیل کو، مجموعی ادبی خدمات کے لئے کمال احمد صدیقی کو، برائے شاعری اختر سعید خاں کو اور سائنسی ادب کے لئے ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کو ملا ہے۔ ہم انھیں مبارک باد دیتے ہیں کہ وہ ہر طرح اس اعزاز کے مستحق تھے۔ ● آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے مخدوم ایوارڈ اس سال اقبال متین اور حسن الدین احمد کو ملے ہیں۔ ہم ان کو مبارک باد دیتے ہیں اور درست انعامات پر اظہار مسرت کرتے ہیں۔ ● امریکہ میں علی گڈھ کے سابق طالب علموں کی انجمن نے اس سال منیب الرحمن کو اپنے انعام کے لئے منتخب کیا ہے۔ نصف صدی سے زیادہ مدت سے اردو نظم کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے اس شاعر کی خدمات کے اعتراف پر ہمیں دلی مسرت ہے۔

اس بزم میں

● احمل اجنبی کا اصل وطن لکھنؤ ہے، لیکن اب وہ گوالیار میں رہتے ہیں۔ اردو انھوں نے شاعری کی محبت میں سیکھی ہے، زندہ باد۔ ● احمد جاوید یوں تو اقبال اکیڈمی، پاکستان، لاہور کے ڈپٹی ڈائرکٹر کی حیثیت سے ہم سب کے لئے بہت محترم ہیں، لیکن "شب خون" کے لئے ان کی جداگانہ اہمیت ہے کہ وہ نہ صرف الٰہ آباد، بلکہ رانی منڈی کے متولد ہیں جہاں سے "شب خون" بھی چالیس سال پہلے طلوع ہوا تھا۔ غزل میں جس کلاسیکی ملاہت اور اس کے ساتھ جس بے تکلف قادر الکلامی کا اظہار احمد جاوید کے یہاں ہوا ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ ● انیس صدیقی نے گلبرگہ کے نئے ادیبوں کا ایک مقبول انتخاب "افلاک" کے نام سے شائع کیا تھا۔ انھوں نے "شب خون" کا مکمل توضیحی اشاریہ بھی ترتیب دیا ہے جو ترقی اردو کونسل سے شائع ہو رہا ہے۔ ● باراں رحمن جامعہ ملیہ میں انگریزی کی ریڈر ہیں۔ انھوں نے یہ تراجم اے کے رامانجن کی مشہور زمانہ کتاب تراجم The Interior Landscape کے توسط سے کئے ہیں۔ ● باقر نقوی نے سائنسی موضوعات پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ "مصنوعی ذہانت" پر ان کی ایک کتاب جلد آنے والی ہے۔ ● بلقیس ظفیر الحسن کی یہ غزلیں ان کے نئے مجموعے "شعلوں کے درمیاں" سے لی گئی ہیں۔ ● حامدی کاشمیری کی نئی تنقیدی کتاب "جدید نظم کی دریافت" کچھ عرصہ ہوا منظر عام پر آئی تھی۔ ● خالد اقبال یاسر ان دنوں اردو سائنس بورڈ، لاہور کے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ "گردش" کچھ عرصہ ہوا شائع ہوا تھا۔ ● عربی ادب کی تاریخ پر خورشید رضوی کی کتاب جلد شائع ہونے والی ہے۔ ● ڈاکٹر سلیم الرحمن نے مشہور آفاق روسی شاعرہ آنّا اخماتووا کے یہ تراجم ڈیوڈ میک ڈف کے انگریزی ترجمے کے توسط سے کئے ہیں۔ ● سرمد صہبائی اسلام آباد میں ٹی وی سے متعلق ہیں۔ جدید نظم اور غزل دونوں میں ان کا نام روشن ہے۔ ● نوعمر مصور سنکیت مہاپاتر کے فن کے یہ نمونے ہمیں ان کے والد جینت پرمار نے بھیجے ہیں۔ ● سہیل احمد خاں نے محمد سلیم الرحمن کے ساتھ مل کر ابھی حال ہی میں "منتخب ادبی اصطلاحات" کے نام سے ایک بہت عمدہ کتاب شائع کی ہے۔ ● سید ارشاد حیدر نے گھر بدل لیا ہے۔ اب انھیں ۲۲، اے/ ۱۲ بی، کرامت کی چوکی، الٰہ آباد کے پتے پر خط لکھا جائے۔ ان کے فون نمبر ہیں: 91-532 2550895, 09450610099 ● ہمیں خوشی ہے کہ سید عارف طویل علالت کے بعد صحت یاب ہو گئے ہیں اور جون ۲۰۰۶ سے "جواز" کی دوبارہ اشاعت کا ارادہ رکھتے ہیں ● سید محمد افضل جو کچھ دن پہلے تک گوالیار میں ڈی۔ آئی۔ جی۔ پولیس تھے، اب جامعہ ملیہ میں رجسٹرار تعینات ہوئے ہیں۔ ● طارق قمر طارق نے اس قدیم اطالوی نظم کا ترجمہ انگریزی کے توسط سے کیا ہے۔ ● کرشن کمار طور کا تازہ مجموعۂ غزلیات "سرمایۂ گماں نظری" چند دن ہوئے منظر عام پر آیا ہے۔

● مولانا عبدالماجد دریابادی نے یہ تقریر ۹ ستمبر ۱۹۴۱ کو لکھنؤ ریڈیو سے نشر کی تھی۔ اس نایاب متن کی بازیافت اور "شب خون" میں اشاعت کے لئے ہم مولانا کے بھتیجے جناب عبدالعلیم قدوائی کے ممنون ہیں۔ قدوائی صاحب نے مولانا کے تبصروں کو بھی مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو کی طرف سے شائع ہوگا۔ ● عرفان ستار کی یہ غزلیں ان کے پہلے مجموعے "تکرار ساعت" سے اخذ کی گئی ہیں۔ ● جے پرکاش غافل نے قانون اصول عقلی The Law of Intellectual Property Rights پر انگریزی میں ایک عمدہ کتاب شائع کی ہے۔ ● غیاث متین نے مشہور تیلگو شاعر این۔ گوپی کی نظموں کا ترجمہ چند ہفتے ہوئے ایک مجموعے "این۔ گوپی کی نظمیں" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ ● فاطمہ صوفیہ تاج مشیکن، امریکہ میں رہتی ہیں۔ وہ علامہ فضل حق آزاد کے اخلاف میں ہیں اور مصوری کے علاوہ شاعری سے بھی شغف رکھتی ہیں۔ ● کرامت علی کرامت نے مشہور اڑیا فکشن نگار گوپی ناتھ مہانتی کا یہ ترجمہ بطور خاص "شب خون" کے اس آخری شمارے کے لئے کیا ہے۔ ● محمد حامد سراج پاکستان کے نوآمدہ افسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ ● نامور مصور، افسانہ نگار، سیاست داں محمد حنیف رامے نے ابھی حال میں ایک طویل ناول انگریزی میں لکھا ہے۔ محمد حنیف رامے کی فنکاری کے یہ نمونے ہم "سویرا" لاہور سے اخذ کر کے جناب رامے کے شکریے کے ساتھ یہاں شامل کئے ہیں۔ ● پروفیسر مختار الدین احمد نے غالب کے یہ خطوط بطور خاص "شب خون" کے لئے بہت کم وقت میں مرتب اور مدون کئے تا کہ "شب خون" کا آخری شمار غالبیات میں اس اہم اضافے سے مزین ہو سکے۔ ہم ان کے ممنون ہیں۔ ● مسعود مرزا نیازی علیگڈھ یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر ہیں۔ ● مصحف اقبال توصیفی اپنی نظم "ابن انشا کی طرح" کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "ابن انشا کی موت کے کچھ دن پہلے قدرت اللہ شہاب ان سے ملنے گئے۔ ابن انشا نے ان سے پوچھا کہ اگر آپ کو دوبارہ انھیں حالات میں جینے کا موقع ملے تو آپ کس طرح کی زندگی چاہیں گے۔ قدرت اللہ شہاب نے جواب دیا کہ میں اپنی زندگی سے، جیسی کہ میں نے گذاری ہے، مطمئن ہوں۔ توصیفی کا نیا مجموعہ "دور کنارہ" کچھ دن ہوئے شائع ہوا ہے اور ارباب نظر کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ ● مظہر امام نے یوسف امام کے تعاون سے پرویز شاہدی کا مجموعہ کلام "تثلیث حیات" نئے اضافوں اور تصحیح کے ساتھ حال ہی میں پاکستان سے شائع کیا ہے۔ مظہر امام کے مضامین کا ایک مجموعہ "تنقید نما" بھی کچھ عرصہ ہوا منظر عام پر آیا ہے۔ ● مظہر مہدی نے بودلیئر کے بہت کامیاب تراجم کئے تھے۔ ممتاز جدید جاپانی شعرا شنتارو تانیکاوا (Shuntaro Tanikawa) اور ماکوتو اوکا (Makoto Ooka) کے یہ تراجم انھوں نے انگریزی کے توسط سے کئے ہیں۔ ● مہتاب حیدر نقوی کا نیا مجموعۂ کلام "ماورائے سخن" چند ہفتے ہوئے شائع ہوا ہے۔ ● لدمیلا واسیلووا ماسکو میں اردو کی پروفیسر ہیں۔ حالی اور فیض پر ان کا کام قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ مضمون انھوں نے اسلام آباد کی عالمی کانفرنس میں پڑھا تھا (مارچ ۲۰۰۵)۔ ● نوعمر مصورہ ودیشا مہاپاتر کے فن کے یہ نمونے ہمیں ان کے والد جینت پرمار نے بھیجے ہیں۔

● معزز معاصر "سویرا" لاہور کے چند حالیہ شماروں میں بہت عمدہ غزلیں نظر آئی تھیں۔ ہم نے سرمد صہبائی، سہیل احمد خاں، صابر ظفر، اور ظفر اقبال کی غزلیں وہیں سے اخذ کی ہیں۔ محمد حنیف رامے کی مصوری اور خطاطی کے بھی نمونے "سویرا" میں چھپے تھے۔ ان تمام بیش قیمت مشمولات کے لئے ہم "سویرا" کے شکر گذار ہیں۔

الباطن

قلم اور روشنائی، عمل: محمد حنیف رامے

عطیہ از مصور۔ بشکریہ سویرا، لاہور

النور، الباقی
قلم اور روشنائی، عمل: محمد حنیف رامے
عطیہ از مصور۔ بشکریہ ''سویرا'' لاہور

کتابیں جو زندگی کا سرمایہ ہیں

شمس الرحمن فاروقی	لغات روزمرہ	۲۰۰روپے
شمس الرحمن فاروقی	تنقیدی افکار (نیا اضافہ شدہ ایڈیشن)	۱۸۶روپے
	غیر مجلد	۱۴۸روپے
شمس الرحمن فاروقی،	تعبیر کی شرح پاکستانی ایڈیشن	۲۵۰روپے
شمس الرحمن فاروقی	افسانے کی حمایت میں پاکستانی ایڈیشن	۳۰۰روپے
شمس الرحمن فاروقی	آسماں محراب	۲۱۰روپے
شمس الرحمن فاروقی	ساحری، شاہی، صاحب قرانی	۱۸۰روپے
	داستان امیر حمزہ کا مطالعہ جلد اول	
شمس الرحمن فاروقی	شعر شور انگیز (۴ جلدیں)	۶۰۰روپے
شمس الرحمن فاروقی	عروض آہنگ اور بیان (نیا ایڈیشن)	۱۴۴روپے
شمس الرحمن فاروقی، بیدار بخت، لیزلی لاوین		
	The Colour of Black Flowers	۲۵۰روپے
شمس الرحمن فاروقی	How to read Iqbal	۴۰روپے
شمس الرحمن فاروقی	The Flower-Lit Road	۶۴۰روپے
شہریار	شام ہونے والی ہے (مجموعۂ کلام)	۲۰۰روپے
شیما مجید	مکاتب محمد حسن عسکری	۲۰۰روپے
صبا اکرام	جدید افسانہ، چند صورتیں (تنقید)	۱۹۰روپے
ضمیر نیازی	زمین کا نوحہ	۲۵۰روپے
عادل منصوری	حشر کی صبح درخشاں ہو (مجموعۂ کلام)	۲۵۰روپے
عبدالاحد ساز	سرگوشیاں زمانوں کی (مجموعۂ کلام)	۱۵۰روپے
عذرا عباس	راستے مجھے بلاتے ہیں (مجموعۂ کلام)	۱۰۰روپے
عشرت ظفر	سفال (مجموعۂ کلام)	۷۵روپے
عقیل جامد	گل دیگر شگفت (مجموعۂ کلام)	۱۰۰روپے
غلام مرتضٰی راہی	لاکلام (مجموعۂ کلام)	۱۲۵روپے
فاطمہ حسن	یادیں بھی اب خواب ہوئیں (مجموعۂ کلام)	۲۵۰روپے
فاطمہ حسن	کہانیاں گم ہو جاتی ہیں (افسانے)	۱۹۰روپے
فرخ جعفری	حرف آغاز (مجموعۂ کلام)	۶۰روپے
ید پرتی	ابرتر (مجموعۂ کلام)	۵۰روپے
ید پرتی	آب نیساں (مجموعۂ کلام) ،	۱۰۰روپے
فنون، مدیر احمد ندیم قاسمی ۱۲۴تا۱۲۶ فی شمارہ		۱۶۰روپے
قدیر زماں	ادبی نگارشات (منتخب تراجم)	۱۵۲روپے
قدیر زماں	تلاش اقبال (تنقید)	۱۵۹روپے
قدیر زماں	کھلونے والا (افسانے)	۲۰۰روپے
قرۃ العین حیدر	داستان عہد گل (مضامین)	۴۵۰روپے
کاروان ادب، شمس الرحمن فاروقی نمبر مدیر کوثر صدیقی مجلد		۱۵۰روپے

کرشن کمار طور	سرنامۂ گماں نظری (مجموعۂ کلام)	۲۵۰روپے
کلیات میر جلد اول عباسی ایڈیشن مجلد		۴۰۲روپے
نظر ثانی اور تصحیح احمد محفوظ، نگرانی شمس الرحمن فاروقی غیر مجلد		۲۳۲روپے
کوثر صدیقی	ہریالی (بچوں کے لئے نظمیں)	۲۵روپے
محمد عسکری	مجموعۂ محمد حسن عسکری	۹۵۰روپے
محمد حسن عسکری	عسکری نامہ (افسانے اور مضامین)	۶۵۰روپے
محمد حسن عسکری	مقالات عسکری (دو جلدیں)	۷۵۰روپے
محمد شاہد حمید	مرگ زار (افسانے)	۲۰۰روپے
محمد کاظم	عربی ادب کی تاریخ	۱۱۲۵روپے
مخمور سعیدی	راستہ اور میں (شاعری)	۱۵۰روپے
مدحت الاختر	میری گفتگو تجھ سے (مجموعۂ کلام)	۲۲۵روپے
مظفر حنفی	طلسم حرف (مجموعۂ کلام)	۵۰روپے
مظہر امام	تنقید نما (مضامین)	۱۷۵روپے
معین الدین	جینابڑے تعبیر (افسانے)	۱۵۰روپے
مغنی تبسم	مٹی مٹی میرا دل (مجموعۂ کلام)	۱۰۰روپے
مکالمہ مدیر: مبین مرزا شمارہ ۱۲ تا ۱۵ فی شمارہ		۲۰۰روپے
منشایاد	شہر افسانہ (افسانے)	۳۰۰روپے
من موہن تلخ	لاپتہ (مجموعۂ کلام)	۱۵۰روپے
من موہن تلخ	وسیلہ (مجموعۂ کلام)	۱۵۰روپے
مہدی جعفر	افسانہ بیسویں صدی کی روشنی میں (تنقید)	۲۰۰روپے
مہدی جعفر	کیمیائے سامری (مجموعۂ کلام)	۱۴۴روپے
مہدی جعفر	نئی افسانوی تقلیب (تنقید)	۱۵۰روپے
میرابائی ترجمہ سردار جعفری، پریم بانی		۲۵۰روپے
میراجی	سہ آتشہ (مجموعۂ کلام)	۱۵۰روپے
میراجی	مشرق و مغرب کے نغمے (تنقید و ترجمہ)	۲۵۰روپے
میراجی	اس نظم میں (تنقید)	۳۰۰روپے
ناصر راہی	دھوپ کی بالکونی سے (نظمیں)	۲۰۰روپے
ندا فاضلی	دیواروں کے بیچ (خودنوشت)	۱۵۰روپے
نریندر جادھو (ترجمہ از ممتاز نکہت) سونو (خودنوشت)		۳۰۰روپے
نسیم بن آسی	لفظوں کے درمیان (افسانے)	۲۰۰روپے
نشاط فاطمہ	جدید اردو تنقید (تنقید)	۱۴۰روپے
نصیر احمد ناصر	پانی میں گم خواب (مجموعۂ کلام)	۱۹۰روپے
نقوش "گولڈن جوبلی نمبر" پچاس سالہ انتخاب، دو جلد		۵۰۰روپے
نیر مسعود	عطر کافور (افسانے)	۱۰۰روپے
نیر مسعود	طاؤس چمن کی مینا (افسانے)	۱۷۵روپے

Regd. with the Registrar of Newspapers No. 12476/66

Urdu Monthly
Shabkhoon

Postal Regd. No. PMG-AD/117
Validity 2005-2008

June - December 2005

P.O. Box No. 13
313, Rani Mandi
Allahabad - 211003

Licensed to Post without Pre-Payment
Lic. No. WP-1 Dtd. 15-6-2001

Annual Subscription Rs. 240/-
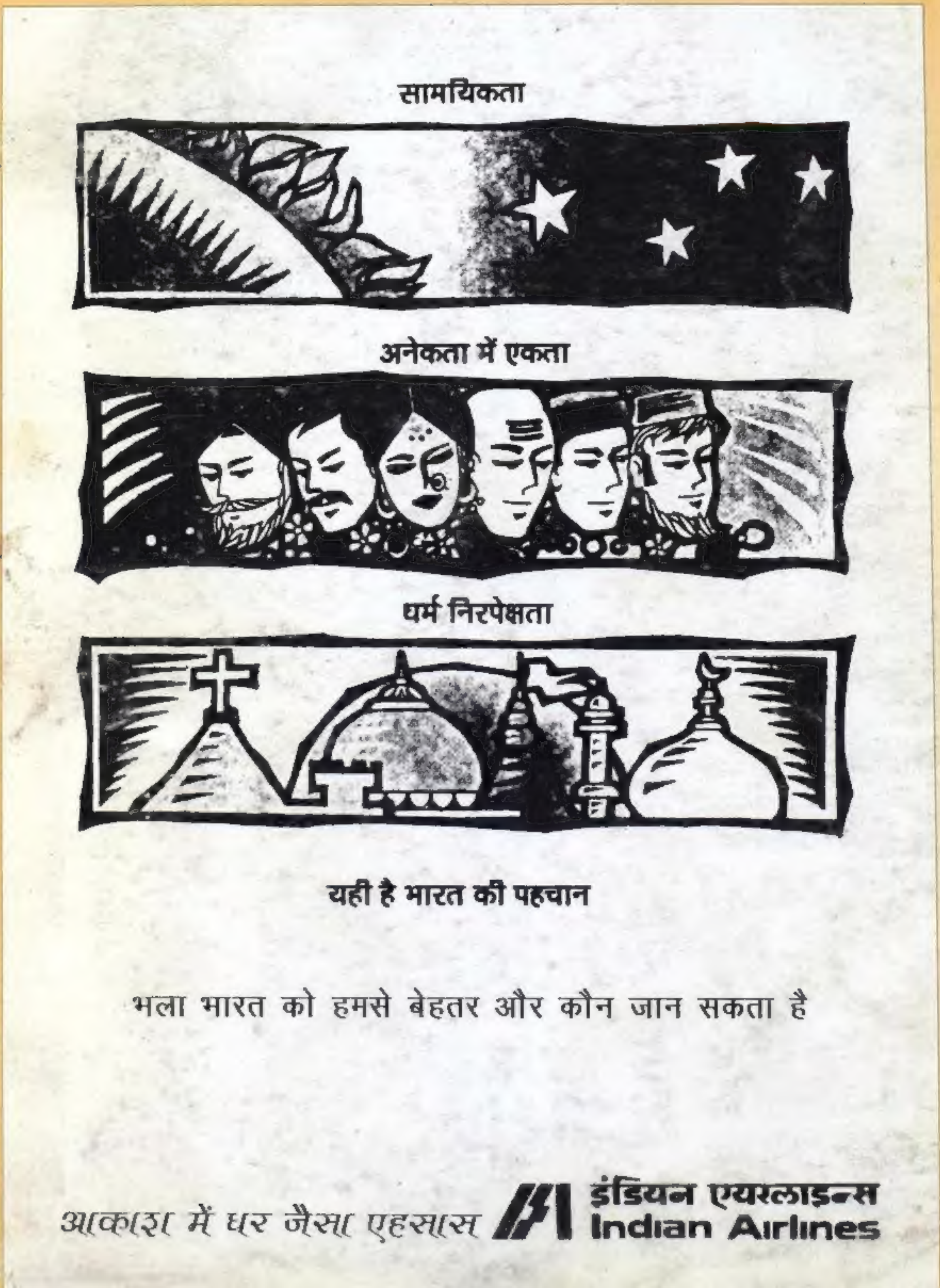
Price Per Set Rs. 750/-